ماہنامہ

امربیل

لاہور

نوبل کہانی نمبر

100 Years of Nobel Prize in Literature (1901-2001)

Monthly
AMBER BAIL

A SHORT STORY MAGAZINE

فروری مارچ 2005ء

جلد 8 شمارہ 3-2

قیمت 100 روپے

پبلشر وایڈیٹر یونس حسرت نے

انتخاب جدید پریس ایبٹ روڈ سے چھپوا کر

A 126 گلی نمبر 4 تیغ کلاں

ملک پارک لاہور سے شائع کیا۔

E-mail: amberbail@hotm

مصری ادب سے مختصر مگر پُر اثر

جنگی وردی کا قیدی

ایک خوانچہ فروش کا مآل، اُسے مول تول کا بہت چسکا تھا

نجیب محفوظ / محمود رحیم 66

جرمن ادب سے مصری کی ڈلی

مسمی زگلر

ایک نستعلیق شخص کا قصہ، وہ جانوروں کی زبان سمجھنے لگا تھا

ہرمن ہیسے / عبدالوحید 61

رُوسی ادب کے خزینے سے

آخری ملاقات

جنگل، چاندنی، اوس، زرد اُداس چاند! محبت کے دو متوالوں کی دُھواں دُھواں داستان

ایوان بیونن / وجاہت مسعود 69

دُنیا کے عظیم افسانوں میں سے ایک

دیوار

ایک انقلابی کی سرگزشت، اُس نے تقدیر کے مقابل تدبیر آزمائی

جین پال سارتر / صغیر ملال 455

فرانسیسی ادب کے دفینے سے

نٹ

ایک بازی گر کی کہانی، وہ مقدس مریم کی پاکی اپنے طریقے سے بیان کرنا چاہتا تھا

اناطول فرانس / محمد رضا انصاری 449

گیبریل گارشیا مارکیز کی بیاض سے

آخرکار

ایک دندان ساز کا احوال، ایک روز دشمن اُس کی ڈاڑھ تلے آ گیا تھا

ترجمہ: فاروق حسن 74

سکینڈے نیوین ادب کی پہچان

شادیٔ مرگ

ایک آدمی کی رُوداد، سرِراہ چلتے چلتے اُسے کوئی مل گیا تھا

نٹ ہمسن / خاقان ساجد 509

لاطینی امریکہ سے مختصر مختصر

نیلا گلدستہ

ایک آدم زاد کا تحیر، کسی راہزن کو اُس کی نیلی آنکھیں درکار تھیں

اوکتاویو پاز / وجاہت مسعود 465

سیاہ دیس سے ایک روشن تحریر

ہجرت

بے زمین آدم زادوں کی رُودادِ سفر، گِدھ بھی اُن کے ہم رکاب تھے

ناڈین گورڈیمر / نکہت حسن 77

سونار دیش کا جادو

کابلی والا

ایک بابل کا ماجرا، اُس کے آنگن میں چڑیوں کا چنبہ بھی تھا

رابندر ناتھ ٹیگور 57

سرزمینِ رُوس سے ایک خوفناک تحریر

نیلگوں میدان

ایک غلام کی سرگزشت، اُسے اپنی آئندہ نسلوں پر کوئی اختیار نہ تھا

میخائل شولوخوف / وجاہت مسعود 500

پولینڈ کے ایک عظیم تخلیق کار کی عطا

موت

ایک گھر کی کہانی، اُس کے مکین ایک بوجھ اُتارنا چاہتے تھے۔۔۔ جیتا جاگتا بوجھ!

ولادی سلاو ریموں / محمد سلیم اختر

فرانسیسی ادب کے خزینے سے

سیاہ روٹیاں

فلورنس کے ایک بینکار کی کہانی، مرنے کے بعد اُس کے اعمال میزان میں رکھے گئے

اناطول فرانس / وجاہت مسعود 452

فنون لطیفہ کے دیس سے

نرم گھاس

ایک بوڑھے کا سوزِ دروں، وہ آخری عمر میں یتیم ہو گیا تھا

لیوگی پرانڈیلو / وجاہت مسعود 479

امریکی ادب کا سوز و گداز

روشن گاہ

ذکر کچھ چاک جگر سینے کا سُن سُن اپنے
دیکھ کر زخم کو، میں دیکھوں ہوں ناخن اپنے

ارنسٹ ہیمنگوے / صغیر ملال 506

قصۂ مختصر

آیئے، اک بار پھر یہ بزم سجاتے ہیں کہ بہت دیر ہوئی جاتی ہے۔ بہت تاخیر ہوگئی ہے۔ آنکھیں ترس گئی ہیں اور غنچہ ہائے دل کھلانے کو ہیں۔ مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے۔۔۔ جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

آیئے، اک بار پھر یہ بزم سجاتے ہیں کہ ابھی روشنیاں گُل نہیں ہوئیں، دُودِ چراغِ محفل اُٹھ رہا ہے اور شعلۂ عشق سیاہ پوش نہ ہوا ہے۔

آیئے، اک بار پھر یہ بزم سجاتے ہیں کہ عالم یہ ہے: دل میں پھر گریے نے اِک شور اُٹھایا غالب۔۔۔ آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا۔۔۔ اور فقط یہی نہیں بلکہ اب رہا نہ جائے ہے: پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم۔۔۔ برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے۔۔۔ اور۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب۔۔۔ عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامہ مژگاں بخونِ دل۔۔۔ سازِ چمن طرازی، داماں کیے ہوئے

یہ جو ایک طویل غیاب ہوا ہے، ہرگز ہونا نہ چاہیے تھا کہ نہ یہاں بے حوصلگی کا معاملہ تھا، نہ بات تھی بے نیازی کی۔ نہ کوئی قصہ تھا بے جا خواہشوں کا اور نہ مسئلہ تھا کسی تغافل کا۔ کچھ ستاروں ہی کی چال کے کرشمے ہیں کہ شبِ ہجراں دراز ہوئی۔ پہلوتہی کے لیے یہ عُذر بڑا ناروا ہوگا کہ ''ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا'' ہاں البتہ اس میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر ضرور تھا یا پھر کچھ ''ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے'' ان کارفرمائیوں کے مقابل رجائیت اور اُمید ہی وہ پناہ گاہیں تھیں کہ جہاں اپنے جوشِ جنوں نے فروغ پایا اور جذبوں کو نئی تب و تاب ملتی رہی۔

ادب کی پرداخت کا سودا سر میں سمایا ہو تو اس خطے میں زندگی کسی خارزار میں برہنہ پا سفر کے مصداق ہے۔ ادب و آرٹ کی قدر دانی کے معاملے میں ابھی بہت سے مدارج طے کرنا باقی ہیں۔ ابھی تو فہم و ادراک کے وہ دریچے ہی وا نہیں ہوئے جہاں سے یہ دیکھا جا سکے کہ زندگی کا ترجمان اور انسانی تفکر کو گہرائی بخشنے والا ادب کسی قوم کے درخشاں مستقبل کے لیے کتنا لازم ہے۔ ہمارے ادیب اور شاعر قاری کی تلاش کے بحران سے دوچار ہیں۔ اچھی کتابیں فٹ پاتھوں کی زینت ہیں۔ لائبریریاں دفتری اوقات میں کھلتی ہیں اور کتاب کا ایڈیشن سکڑ سمٹ کر پانچ سو پر آ ٹکا ہے۔ یہ قوم کے فکری اضمحلال کی نشانیاں ہیں اور پس پردہ عوامل ایک سے زیادہ ہیں۔۔۔ لیکن سب سے بڑا عامل یہ ہے کہ کتاب کی قدر و قیمت اور اہمیت کو اُجاگر کرنے کی کوششوں کا گلا گھونٹا گیا، کتاب پڑھنے کے کلچر کو پنپنے نہیں دیا گیا۔ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ کتاب اور قاری کے مابین فاصلے بڑھائے گئے۔ ایسے میں ادب سے دل بستگی رکھنا خسارے کا سودا ہے۔۔۔ لیکن ہم ایسے آشفتہ سروں

کے لئے یہ خسارہ انفرادی سطح کا ہے جس کے بطن سے اجتماعی فائدہ جنم لیتا ہے۔ اپنے معاملے میں ایک پہلو احسان شناسی کا بھی ہے۔ یوں تو کئی حوالوں سے وہ شخص جو اپنی ذات میں ایک انجمن تھا، بنی نوع انسان کا محسن قرار پاتا ہے، لیکن شائقین ادب پر اس کا خاص احسان ہے۔۔۔ وہ شخص کہ جس کا نام الفریڈ نوبل تھا۔

الفریڈ نوبل اسٹاک ہوم (سویڈن) میں ایک ان پڑھ مگر ذہین انجینئر ایمینوئل نوبل کے ہاں 21۔ اکتوبر 1833ء کو تولد ہوئے۔ پیشہ آباکھیتی باڑی تھا اور خاندان کو سماج میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، چنانچہ اسی نیک نامی کے سبب نوبل کہلائے جاتے تھے۔ والد کو سائنس سے شغف تھا اور وہ شب و روز نت نئے سائنسی تجربات میں منہمک رہتے تھے۔ یہ شغف والد سے الفریڈ کو بھی منتقل ہوا اور وہ ''ڈائنامائٹ'' کے موجد قرار پائے، چنانچہ انہیں وہ سب کچھ مل گیا جس کی آرزو کسی شخص کو ہو سکتی ہے یعنی شہرت، عزت اور بے پناہ دولت۔۔۔ سب سے بڑھ کر بقائے دوام۔ لیکن اس بقائے دوام کے سزاوار شاید وہ کبھی قرار نہ پاتے اگر بات محض ان کی ایجادات کی ہوتی جو بیک وقت مہلک بھی تھیں اور مفید بھی۔ قصہ قدرے مختلف ہے۔

کہتے ہیں ایک روز اخبارات نے اُن کی موت کی خبر اُچھال دی۔ شہ سرخیاں جمائی گئیں کہ ''موت کا شہنشاہ'' چل بسا جس نے انسانیت کو اُس کی تباہی کا ہتھیار ''ڈائنامائٹ'' تھمانے میں زندگی کے روز و شب ایک کر دیے تھے۔ خبر اُس نابغہ دہر کی نظر سے گزری تو صدمے نے اُسے نڈھال کر دیا۔ اس کی ایجاد کے افادی پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ کیا وہ سچ مچ انسانیت کا دشمن تھا؟ ایک کشمکش اس کے اندر چھڑی جس نے آخر کار ذیل کی وصیت کے رقم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا: ''میں کہ جسے دُنیا نے تباہی کا شہنشاہ تصور کیا ہے، اپنی ساری دولت دُنیا میں امن اور انسانی فلاح کے علم برداروں کے لیے وقف کرتا ہوں۔''

اسی وصیت کی اساس پر نوبل انعام کی عمارت اُٹھائی گئی ہے۔ سویڈش اکیڈمی کی زیر سرپرستی عالمی سطح پر مسلمہ حیثیت کا یہ معتبر اور قابل عزت انعام ہر برس 10 دسمبر کو ان بلند مرتبہ شخصیات کو پیش کیا جاتا ہے جنہوں نے اُس برس ادب، کیمیا، طبیعات، طب اور امن کے میدانوں میں انسانیت کے لئے اعلیٰ خدمات سرانجام دی ہوں اور 1901ء سے یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

دو برس پہلے ہم نے ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے ایک عاجزانہ کاوش کی اور ''امبر بیل'' کا ''نوبل کہانی نمبر'' نذرِ قارئین کیا۔ تبھی یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اس سلسلے کو مستقل بنیادوں پر آگے بڑھایا جائے گا اور ہر سال نوبل ادب پر کم از کم ایک جلد ضرور شائع کی جائے گی۔ بوجوہ اس میں تاخیر در تاخیر ہوئی اور اب کہیں جا کر یہ دوسری جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہونے جا رہی ہے۔ اس میں ایک صدی کی نوبل تاریخ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ نئے ناول اور نئے افسانے شاملِ اشاعت ہیں ماسوائے ان تین شہرۂ آفاق ناولوں کے جنہیں ایک تو قندِ مکرر کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اور دوسرے یہ کہ جلد اوّل کی طباعت تو ایک مرحلۂ دُشوار ہے۔ چند افسانوں اور کچھ سوانحی خاکوں کے لیے بالترتیب جناب وجاہت مسعود اور سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی گورنمنٹ کالج لاہور کا شکریہ ہم پر واجب ہے۔ ہم ان دیگر مترجمین کے بھی شکر گزار ہیں جن کے تراجم اس خصوصی شمارے کی زینت بنے ہیں اور آخر میں ہم اپنے قارئین کی بے پناہ محبتوں کے ممنون ہیں جنہوں نے اس طویل غیاب میں فراموش نہیں کیا۔۔۔ اب شاید اتنی تاخیر نہ ہو کہ: اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

آپ کا اپنا

یونس حسرت

1901ء سے 2001ء تک نوبل انعامات کی تقسیم بلحاظ ممالک

ملک	انعامات کی تعداد	ملک	انعامات کی تعداد
فرانس	9	جاپان	2
امریکہ	9	فن لینڈ	1
جرمنی	7	بلجیم	1
سویڈن	7	سوئٹزرلینڈ	1
روس	5	لاطینی امریکہ	3
برطانیہ	6	یوگوسلاویہ	1
اٹلی	6	چیکوسلاویکیہ	1
سپین	4	بلغاریہ	1
ناروے	3	آسٹریلیا	1
ڈنمارک	3	آسٹریا	1
پولینڈ	4	آئس لینڈ	1
آئرلینڈ	4	انڈیا	1
یونان	2	مصر	1
جنوبی امریکہ	2	نائجیریا	1
چلی	2	الجزائر	1
ویسٹ انڈیز	1	جنوبی افریقہ	1
پرتگال	2	چین	1

مندرجہ ذیل ممالک اس اعزاز سے ہنوز محروم ہیں:

☆ شمالی کوریا، جنوبی کوریا اور ہندچینی کے تمام ممالک، (کمبوڈیا، برما، تھائی لینڈ، ویت نام وغیرہ)

☆ مشرق بعید کے تمام ممالک (فلپائن، ملائشیا، انڈونیشیا وغیرہ)

☆ جنوبی ایشیاء کے تمام ممالک (پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، بھوٹان، نیپال، مالدیپ) تاہم بھارت میں ٹیگور کو یہ اعزاز مل چکا ہے۔

☆ تمام عرب ممالک ☆ تمام افریقی ممالک (ماسوائے جنوبی افریقہ، مصر، نائجیریا اور الجزائر)

☆ ایران، ترکی، افغانستان۔

☆ کینیڈا، نیوزی لینڈ۔

☆ مسلمان ممالک میں مصر، الجزائر، نائجیریا اس اعزاز کے حامل ہیں۔

☆ مسلمان مصنفین میں سے صرف نجیب محفوظ (مصر) کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔

آسٹریلیا کے واحد نوبل انعام یافتہ ادیب پیٹرک وائٹ لندن میں پیدا ہوئے اور کیمبرج یونیورسٹی کے گریجوایٹ تھے۔ وہ رائل ایئر فورس میں بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں انہوں نے آسٹریلیا کی شہریت اختیار کر لی تھی، جہاں وہ آسٹریلوی ادیب کی حیثیت سے اس انعام سے نوازے گئے۔ اگر انہیں برطانوی سمجھا جائے تو براعظم آسٹریلیا (بشمول نیوزی لینڈ) اس اعزاز سے محروم ہے۔

جنہیں مشترکہ انعام ملا

☆ تھیوڈور موم سین اور بجورن سٹرین بجورسن (1902)
☆ جوزایچی گارے اور فریڈرک مسترال (1904)
☆ کارل جیلرپ اور ہنرک پونٹوپیڈن (1917)
☆ شموئیل اگنون اور نیلی ساشز (1966)
☆ ہیری مارٹینسن اور آئیونڈ جونسن (1974)

جنہوں نے خودکشیاں کیں

1-ارنسٹ ہیمنگوے
2-یسوناری کاواباتا

جنہوں نے اعزازات ٹھکرائے

نوبل انعام:

1- ایرک ایکسل کریفیڈٹ (1918)
2- بورس پاسترناک (1958)
3- ژاں پال سارتر (1964)

دیگر انعام:

1- مارئیس میترلنک
2- رومین رولاں
3- سنکلیئر لیوس
4- جان گالزوردی
5- ولیم بٹلر ژیٹس
6- البرکامیو

ملحد یا آزاد خیال

1- بجورن سٹرین بجورسن
2- تھیوڈور موم سین
3- ایساندرو کارڈوچی
4- رڈولف کرسٹوف ایوکین
5- سلیما لیگراف
6- مارئیس میترلنک
7- کارل ہیڈن شام
8- کارل جیلرپ
9- ہنرک پونٹوپیڈن
10- کارل سپٹیلر
11- نٹ ہیمسن
12- اناطول فرانس
13- ولیم بٹلر ژیٹس
14- برٹرینڈ رسل
15- فے بان لیگر کیوسٹ
16- البرکامیو
17- ژاں پال سارتر
18- گبریل گارشیا مارکیز
19- ولیم گولڈنگ
20- کلائیڈ سائمن

جو باقاعدہ تعلیم یافتہ نہ تھے

1- بجورن سٹرین بجورسن
2- ہنرک سینکیوز
3- رڈیارڈ کپلنگ
4- گرہارٹ ہاپٹمن
5- ٹیگور
6- کارل جیلرپ
7- ہنرک پونٹوپیڈن
8- نٹ ہمسن
9- جینیئو بیناونٹی
10- ولادی سلاوریموں
11- جارج برنارڈ شا
12- گرازیا ڈیلیڈا
13- تھامس مان
14- سیگرڈ انڈسیٹ
15- یوجین اونیل
16- فرانز سیلا اینا
17- ہرمن ہیسے
18- فے بان لیگر کوسٹ
19- جان سٹین بک
20- میخائل شولاخوف
21- شموئیل اگنون

22- پابلونرودا

23- ہنرخ بوئل

24- آئیونڈ جونسن

25- یوجینو مونٹیل

26- بی شیوز سنگر

27- اوڈیسیس ایلیٹیں

28- باروسلاف سیفرے

29- ہالڈورلیک سنس

30- کلائڈ سائمن

جن کے ناولوں پر فلمیں بنیں

	مصنف	کہانی/ناول پر فلم بنی
2-	ہنرک سینکیور	قوواڈیس
3-	رڈیارڈ کپلنگ	دی مین ہواز اے کنگ / کم، گنگادین
4-	اناطول فرانس	تائیس (بھارتی فلم چتر لیکھا)
5-	سنکلیئر لیوس	مین سٹریٹ
6-	ہرمن ہیسے	سدھارتا
7-	ولیم فاکنر	دی ہیملٹ
8-	نے بان لیگر کیوسٹ	دی براباّ
9-	ارنسٹ ہیمنگوے	اولڈ مین اینڈ دی سی، سنوز آف کلیمن جارو، اے فیئر ویل ٹو آرمز
10-	بورس پاسترناک	ڈاکٹر ژواگو
11-	کامیلو جوزسیلا	لی ہائیو
12-	نجیب محفوظ	اکثر ناولوں پر فلمیں بنی ہیں
13-	اوکنزابرو	جلتا ہوا سبز درخت

خواتین

1- سلیمالیگراف

2- گرازیاڈیلیڈا

3- سیگرڈ انڈسیٹ

4- پرل ایس بک

5- گبریلامسترال

6- نیلی ساشز

7- ناڈائن گورڈیمر

8- ٹونی موریسن

9- وسلاوازمبروسکا

شاعر

1- رینے سلی پرودھم

2- بجورن سٹرین بجورسن

3- فریڈرک مسترال

4- ایساندروکارڈوچی

5- رڈیارڈ کپلنگ

6- سلیمالیگراف

7- پال ہیسے

8- ٹیگور

9- کارل ہیڈن سٹام

10- ایرک ایکسل کریفیڈٹ

11- کارل سپٹیلر

12- ولیم بٹلرژیٹس

13- ولادی سلاوریموں

14- گالزوردی

15- جوہانیز جینسن

16- گبریلامسترال

17- ٹی ایس ایلیٹ

18- جوآن ریمون جیمیز

19- بورس پاسترناک

20- سلواٹورقاسیمڈو

21- سینٹ جان پرس

22- اوکتاویوپاز

23- ڈیرک والکاٹ

24- ہینے سیمس

25- وسلاوازمبروسکا

26- یارگوس سیفریز

27- نیلی ساشز

28- میگوئل آستوریاس

29- پابلونرودا

30- ہیری مارٹینسن

31- یوجینو مونٹیل
32- ونسنٹ الیکسندر
33- اوڈیسیس ایلس ٹس
34- سلاوٗ میلوز
35- باروسلاف سیفرے
36- جوزف بروڈسکی

ڈراما نگار

1- بجورن سٹرین بجورسن
2- جوزا ایچیگارے
3- سلیما لیگراف
4- پال ہیسے
5- مریکس میترلنک
6- گرہارٹ ہاپٹمن
7- جیغو بیناونٹی
8- جارج برنارڈ شا
9- جان گالزوردی
10- یوجین اونیل
11- روجر مارتن ڈوگارڈ
12- ٹی ایس ایلیٹ
13- فے بان لیگر کوسٹ
14- ژاں پال سارتر
15- نیلی ساشز
16- میگوئل آستوریاس
17- سیموئل بیکٹ
18- ہیری مارٹینسن
19- سلاوٗ میلوز
20- وول سوئینکا
21- کامیلو جوز سیلا
22- ڈاریو فو

ناول نگار/افسانہ نگار

1- ہنرک سینکیور
2- بجورن سٹرین بجورسن
3- ایساندرو کارڈوچی
4- رڈیارڈ کپلنگ
5- سلیما لیگراف
6- پال ہیسے
7- گرہارٹ ہاپٹمن
8- ٹیگور
9- رومین رولاں
10- کارل جیلرپ
11- ہنرک پونٹو پیڈن
12- نٹ ہیمسن
13- اناطول فرانس
14- ولادی سلاو ریموں
15- جارج برنارڈ شا
16- گرازیا ڈیلیڈا
17- سیگرڈ انڈسیٹ
18- تھامس مان
19- سنکلیر لیوس
20- جان گالزوردی
21- آئیوان بنن
22- لیوگی پیرانڈیلو
23- روجر مارٹن ڈوگارڈ
24- پرل ایس بک
25- فرانز سیلا اینا
26- ہرمن ہیسے
27- آندرے ژید
28- ولیم فاکنر
29- برٹرینڈ رسل
30- فے بان لیگر کیوسٹ
31- فرانسو ماریس
32- ارنسٹ ہیمنگوے
33- ناڈائن گورڈیمر
34- اوکنزابرو
35- جوزسارا ماگو
36- ٹونی موریسن
37- ہالڈور لیکسنس
38- البرکامیو
39- آئیوو آندریک
40- جان سٹین بک
41- ژاں پال سارتر
42- میخائل شولاخوف
43- شموئیل اگنون
44- میگوئل آستوریاس
45- یسوناری کاواباتا
46- سیموئل بیکٹ
47- الیکساندر سولزے نیتسن
48- ہنرخ بوئل
49- پیٹرک وائٹ
50- آئیونڈ جونسن
51- ہیری مارٹینسن
52- ساوٗل بیلو
53- بشیوز سنگر
54- سلاوٗ میلوز
55- الیاس کینٹی
56- گبریل گارشیا مارکیز
57- ولیم گولڈنگ
58- باروسلاف سیفرے
59- کلائیڈ سائمن
60- وول سوئینکا
61- نجیب محفوظ
62- کامیلو جوز سیلا

جن پر اعتراضات ہوئے

1- ٹیگور (1913ء)
2- بورس پاسترناک (1958ء)
3- یسوناری کاواباتا (1968ء)
4- الیکساندر سولزے نیتسن (1970ء)
5- آئیونڈ جونسن (1974ء)
6- ہیری مارٹینسن (1974ء)

7- ولیم گولڈنگ (1983ء)

8- جوزف بروڈسکی (1987ء)

9- وی ایس ناپال (2001ء)

جو کنوارے یا بے اولاد تھے

کنوارے:

1- رینے سلی پرودھم

2- سلیما لیگراف

3- ولادی سلاو ریمونٹ

4- نیلی ساشز

5- پیٹرک وائٹ

6- ونسنٹ الیگزینڈر

7- اوڈیسیس ایلیٹس

بے اولاد:

1- کارل ہیڈن سٹام

2- آئیو وآندریک

3- یارگوس سیفریز

4- ژاں پال سارتر

نقاد

1- بجورن سٹرین بجورسن

2- جینیو بیناوٹی

3- لیوگی پیرانڈیلو

4- ٹی ایس ایلیٹ

5- فرانسو ماریکس

6- ژاں پال سارتر

7- یوجینو مونٹیل

8- سلاؤ میلوز

فلسفی / مفکر

1- رڈولف کرسٹوف ایوکین

2- ٹیگور

3- برگساں

4- برٹرینڈ رسل

5- ژاں پال سارتر

جو سفارت کار رہے

1- ونسٹن چرچل (وزیر اعظم)

2- سینٹ جان پرس (سفارت کار)

3- آئیو وآندریک (سفارت کار)

4- یارگوس سیفریز (سفارت کار)

5- میگوئل آسٹوریاس (سفارت کار)

6- پابلو نرودا (سفارت کار)

7- سلاؤ میلوز (سفارت کار)

8- اوکتاویو پاز (سفارت کار)

1961ء۔۔۔آئیو وآندریک

1961ء کا نوبل انعام، یوگوسلاویہ کے مصنف آئیو وآندریک کو دیا گیا۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے والدین کون ہیں۔ اس نے اس کمی اور محرومی کے باوجود زندگی کو گزارا اور ایک ایسا مصنف بنا جسے دنیا کے سب سے بڑے ادبی انعام سے نوازا گیا۔

وہ 10 اکتوبر 1892ء کو یوگوسلاویہ کے ایک قصبے میں پیدا ہوا۔ اس نے گراز یونیورسٹی آسٹریا سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس نے شادی کی لیکن وہ کسی بچے کا باپ نہ بن سکا۔ اس کی معنوی اولاد اس کی تصانیف ہی ہیں۔

اس نے 1923ء سے 1941ء تک یوگوسلاویہ کے سفارت کار کی حیثیت سے مختلف عہدوں پر کام کیا اور 1946ء سے 1952ء تک یوگوسلاویہ کی سیاست میں حصہ لیا۔

آندریک ایک عظیم ناول نگار تھا۔ اس کے ہاں زندگی کا رزمیہ بڑی شدت اور قوت کے ساتھ اظہار پاتا ہے۔ اس کی کتاب ''بوسنین کرانیکل'' ایک سہ جلدی (ٹریولوجی) ناول ہے۔ یہ اس کا عظیم تخلیقی کارنامہ ہے۔ اس ناول میں اس نے سربیا اور اس کے باشندوں کو سولہویں صدی کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ وہ اعلیٰ انسانی اقدار کو ذہنی عوامل اور نفسیاتی کشمکش کے حوالے سے پیش کرتے ہوئے ایسی سچویشنز فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے کہ یہ صورت حال مقامی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی ترجمانی کرتی ہے۔

آئیو وآندریک کا انتقال 13 مارچ 1975ء کو بلغراد میں ہوا۔

گارشیا مارکیز سے مکالمہ

گبریل گارشیا مارکیز کی نئی تخلیق ''وبا کے دنوں میں محبت'' (Love in the Time of Cholera) دو ایسے افراد کی کہانی ہے جن کی محبت جوانی میں ناکام رہ کر اس وقت پھلتی پھولتی ہے، جب وہ تقریباً اسی برس کے ہو جاتے ہیں۔

مارکیز نہ صرف پیدائشی بلکہ ادبی تحریک کے حوالے سے بھی کولمبین ہیں۔ گو وہ عمر کی چھٹی دہائی میں جلد ہی قدم رکھنے والے ہیں لیکن ہمیشہ کی طرف مصروف، توانائی سے بھرپور اور خوش طبع نظر آتے ہیں۔ 1980ء کے اوائل میں کولمبیا کی حکومت اور بائیں بازو کے گوریلوں میں مصالحت کرانے کے لیے وہاں بڑے پیمانے پر جاری تشدد کی وجہ سے وہ کولمبیا واپس نہیں گئے۔ ان دنوں وہ اور ان کی بیوی مرسیڈز اپنا وقت میکسیکو سٹی میں گزارتے ہیں (جہاں وہ پچھلے کئی برس سے مستقلاً رہتے ہیں) اور ہوانا آتے جاتے رہتے ہیں جہاں مارکیز نے ''فاؤنڈیشن آف نیو لیٹن سنیما'' نامی ادارہ کھول رکھا ہے۔ فلم اس انعام یافتہ ادیب کا پرانا شوق ہے اور ٹیلی وژن کے ڈرامائی امکانات بھی انہیں گرویدہ رکھتے ہیں۔

گو عام طور پر انہیں بائیں بازو کی سیاست کا عملی آدمی سمجھا جاتا ہے، لیکن دوستوں کے نزدیک وہ فقط ایک ایسے غیر قدامت پسند قصہ گو ہیں، جو جریدہ سازی اور عمومیت پسندی پر معترض ہے اور زندگی سے اسی غیر متوقع حکائتی انداز میں نمٹنا پسند کرتا ہے جو اس کی اصل ہے۔ حال ہی میں (ستمبر 1988ء) ہم نے ان سے میکسیکو سٹی میں گفتگو کی جو ادب و فن کے دوسرے مسائل کے علاوہ ان کی تازہ تخلیق پر بھی محیط تھی۔ میں نے ان سے ان کی غیر معمولی تخلیق کے بارے میں پوچھا:

☆ آپ نے ابھی ایک ڈراما مکمل کیا ہے اور فلموں کی کہانیاں لکھنے کے علاوہ فلموں کا ایک ادارہ بھی چلا رہے ہیں۔ کیا آپ اپنی زندگی کی سمت تبدیل کر رہے ہیں؟

☆☆ جی نہیں! میں ایک ناول لکھ رہا ہوں۔ اسے مکمل کر رہا ہوں کہ ایک اور شروع کر سکوں۔ لیکن اس سے پہلے میں نے اتنے بہت سے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے آپ کو کبھی اتنا مکمل محسوس نہیں کیا، زندگی کے اتنے عروج پر نہیں پایا۔ میں لکھ رہا ہوں۔ میری چھ مختلف کہانیاں مکمل ہوتی جارہی ہیں۔ میں سینما فاؤنڈیشن بھی چلا رہا ہوں اور اس سال میرا ڈراما ارجنٹینا اور برازیل میں دکھایا جائے گا۔ بلاشبہ میں طویل عرصے تک کٹھن حالات سے نبرد آزما رہا ہوں۔ میری زندگی کے ابتدائی چالیس سال اسی کشاکش سے عبارت ہیں۔ میں بے روزگاری کا شکار رہا۔ میں مسائل سے دوچار تھا۔ میں ابھی ادیب یا کچھ اور نہیں بن پایا تھا۔ جذباتی اور نفسیاتی طور پر وہ ایک مشکل دور تھا۔ میں اپنے آپ کو محسوس کرتا تھا، میرا کہیں شمار ہی نہیں تھا۔ پھر ''تنہائی کے سو سال'' کے ساتھ ہی حالات بدل گئے، اور اب سارے کام اس طرح چل رہے ہیں کہ مجھے کسی پر تکیہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب بھی مجھے ہر قسم کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ہر صبح مجھے ورزش کے لیے سائیکل چلانی پڑتی ہے۔ میں مستقل طور پر پرہیزی کھانے کھاتا ہوں۔ اپنی نصف زندگی میں جو کچھ کھانا چاہتا تھا غربت کی وجہ سے نہیں کھا سکا اور بقیہ نصف زندگی اس وجہ سے کہ میں پرہیز پر ہوں۔

سائنز: آپ کی تازہ تخلیق ''وبا کے دنوں میں محبت'' میں اسلوب اور موضوع دونوں بہت مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے عشقیہ کہانی لکھی؟

مارکیز: میں سمجھتا ہوں ڈھلتی ہوئی عمر نے مجھے احساس دلایا ہے کہ احساسات اور جذبات ہی۔۔۔ یعنی جو کچھ دل میں ہوتا ہے۔۔ سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

لیکن ایک طرح سے میری ساری کتابیں ہی محبت سے متعلق ہیں۔ ''تنہائی کے سو سال'' میں ایک کے بعد ایک عشقیہ داستان ہے۔ ''ایک پیش گفتہ موت کی روداد'' محبت کا ایک ہولناک ڈراما ہے، میں سمجھتا ہوں کہ محبت ہر کہیں ہے۔ اس بار یہ زیادہ شدید ہے کیونکہ دو محبتیں مل کے آگے بڑھ رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نوعمری میں ''وبا کے دنوں میں محبت'' نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس ناول میں زندگی بھر کا عملی تجربہ ہے۔ بلکہ بہت سے چھوٹے تجربے ہیں۔ اپنے علاوہ دوسروں کے بھی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں ایسے نقطہ ہائے نظر ہیں

جن سے میں پہلے واقف ہی نہیں تھا۔ اس سال میں ساٹھ برس کا ہو جاؤں گا۔ انسان اس عمر کو پہنچ کر ہر معاملے میں زیادہ متین ہو جاتا ہے۔

سائمنز: اور زیادہ فراخ دل بھی، کیونکہ مذکورہ ناول بہت زیادہ عمومی ہے۔

مارکیز: چلّی کے ایک پادری نے مجھے بتایا ہے کہ اس سے زیادہ مسیحی کتاب اس نے کبھی نہیں پڑھی۔

سائمنز: اور اسلوب؟ کیا آپ اسے اپنی ابتدائی تخلیقات سے انحراف سمجھتے ہیں؟

مارکیز: میں ہر کتاب میں ایک مختلف راہ پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ آدمی اسلوب کا انتخاب نہیں کرتا۔ ہاں، غور وفکر سے جاننے کی کوشش کی جا سکتی ہے کہ ایک خاص موضوع کے لیے سب سے بہتر اسلوب کیا ہوگا۔ اسلوب کا تعین موضوع سے ہوتا ہے۔ اپنے عہد کے مزاج سے ہوتا ہے۔ اگر میں ایسا اسلوب اختیار کروں جو موزوں نہ ہو تو بات نہیں بنے گی۔ نقاد اس پر طرح طرح کے نظریے پیش کریں گے اور وہ کچھ دیکھ لیں گے جو میرے وہم وگمان میں بھی نہیں ہے۔ میں صرف اپنے لوگوں کے طرز زندگی یعنی کریبیئن طرز زندگی سے اثر لیتا ہوں۔ آپ میری کوئی کتاب اٹھالیں۔ میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ کس سطر کے پیچھے کون سی حقیقت یا کون سا واقعہ ہے۔

سائمنز: ''تنہائی کے سو سال'' میں بے خوابی کی وبا تھی اور آپ کی ایک دوسری کہانی میں ایک وبا نے سارے پرندوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ آپ نے ''وبا کے دنوں میں محبت'' لکھی ہے۔ آخر بات کیا ہے، آپ وباؤں میں اتنی دلچسپی کیوں لیتے ہیں؟

مارکیز: گزشتہ صدی کے اختتام پر کارٹا گینا میں واقعی ایک بہت بڑی وبا آئی تھی۔ وباؤں میں میری دلچسپی ہمیشہ سے رہی ہے۔ ''آڈی پس ریکس'' سے ابتدا کرتے ہوئے میں نے وباؤں کے بارے میں بہت پڑھا ہے۔ ڈینیل ڈیفو کی کتاب ''اے جرنل آف پلیگ ایر'' میری پسندیدہ کتابوں میں ہے۔ وبائیں غیر مادی خطرات کی طرح ہوتی ہے، لوگوں کو اچانک آ لیتی ہیں۔ وباؤں میں تقدیر کی سی خاصیت ہوتی ہے اور یہ بڑے پیمانے پر موت کی مظہر ہوتی ہیں تاہم جو بات مجھے عجیب لگتی ہے، وہ یہ کہ بڑی وباؤں نے ہمیشہ بڑی بے اعتدالیاں پیدا کی ہیں۔ لوگوں کو اور جینے پر اکسایا ہے۔ وباؤں کی یہی مابعد الطبیعاتی جہت ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ میں نے دوسرے ادبی حوالوں سے بھی استفادہ کیا ہے، جیسے کامیو کی ''دی پلیگ'' ایلیسا نہ رومانزونی کی کتاب ''دی بی ٹروتھڈ'' میں بھی ایک وبا ہی ہے۔ میں ہمیشہ ایسی کتابوں کی تلاش میں رہتا ہوں جو اس موضوع سے بحث کرتی ہوں جس پر میں لکھ رہا ہوں۔ میں ایسا اس لیے کرتا ہوں کہ مشابہت سے بچ سکوں، ان کتابوں سے نقل کرنے کے لیے نہیں بلکہ انہیں کسی نہ کسی طرح کام میں لانے کے لیے میں سمجھتا ہوں سب لکھنے والے ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہر خیال کے پیچھے ادب کی ہزار سالہ تاریخ ہوتی ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ آدمی ادب میں کہاں کھڑا ہے اور اس کا راستہ کیا ہے، اس بات کو جتنا سمجھا جائے کم ہے۔

سائمنز: ''وبا کے دنوں میں محبت کی تخلیق کس طرح ہوئی؟

مارکیز: محبت میں اس کے دو ماخذ ہیں جو ایک دوسرے سے مل گئے ہیں۔ ایک تو میرے ماں باپ کا معاشقہ ہے جو فرمینا ڈازا اور فلورنٹینو ریزا کی جوانی کے معاشقے سے مشابہ ہے۔ میرے باپ اراکاٹاکا (کالمبیا) میں ٹیلی گراف آپریٹر تھے۔ وہ وائلن بجاتے تھے۔ میری ماں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی خوب صورت لڑکی تھی۔ ماں باپ آزاد خیال ہونے کے باوجود اس رشتے کے اس لیے مخالف تھے کہ میرے باپ غریب تھے۔ کہانی کا یہ سارا حصہ میرے ماں باپ سے متعلق ہے۔۔ ان کا اسکول جانا، خطوط، نظمیں، میرے باپ کا راتوں کو وائلن بجانا، تار کے ذریعے اطلاع ملنے پر میری ماں کا اندرون ملک جانا۔ یہ ساری باتیں مستند ہیں۔ ماں کا واپس آنا اور ہر ایک کا یہ سمجھنا کہ وہ میرے باپ کو بھول چکی ہیں، یہ بھی درست ہے۔ یہ ساری باتیں اسی طرح ہیں جس طرح میرے ماں باپ نے بتائی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرے ماں باپ کی شادی ہو گئی تھی اور جونہی ان کی شادی ہوئی وہ ادبی شخصیتوں کے طور پر غیر دلچسپ ہو گئے۔

سائمنز: اور دوسرا ماخذ؟

مارکیز: اس سے پہلے میں نے میکسیکو کے ایک اخبار میں دو معمر امریکیوں کے بارے میں ایک کہانی پڑھی تھی۔ وہ مرد و زن تھے اور ہر سال اکاپلکو میں ملا کرتے تھے۔ وہ ایک ہوٹل میں قیام کرتے۔ گو ان کی عمر اسّی کے قریب تھی لیکن ان کی آمد ورفت جاری تھی۔ ایک دن وہ کشتی میں سیر کرنے گئے تو کشتی بان نے انہیں لوٹنے کی غرض سے پتوار سے قتل کر دیا۔ اس طرح موت نے ان کے خفیہ رومان کی داستان

مشتہر کر دی۔ مجھ پر اس واقعے کا گہرا اثر ہوا۔ میں ہمیشہ اپنے ماں باپ کی کہانی لکھنے کے بارے میں سوچا کرتا تھا لیکن کہانی کا سرا میرے ہاتھ میں نہیں آتا تھا۔ ادبی تخلیق کے دوران کچھ ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو یکسر ناقابل فہم ہوتی ہیں۔ سو ایک دن یہ دونوں کہانیاں میرے ذہن میں آ گئیں۔ نوجوانوں کی محبت مجھے ماں باپ سے ملی تھی۔ بوڑھوں کا پیار میں نے معاشرے سے لیا۔

سائمز: ''تو آپ کی اکثر کہانیوں کی وجہ تخلیق ذہن میں آنے والا محض ایک عکس واحد ہوتا ہے؟''

مارکیز: سچی بات تو یہ ہے کہ میں کہانی کے لمحہ تخلیق کو گرفت میں لانے کا اتنا متمنی ہوں کہ میں نے سینما فاؤنڈیشن میں ''ہاؤ ٹو ٹیل اے اسٹوری'' نامی ایک ورکشاپ قائم کی۔ میں نے لاطینی امریکہ کے مختلف ملکوں سے دس طالب علم اکٹھے کئے ہیں۔ ہم ایک گول میز کے گرد بیٹھ جاتے ہیں اور چھ ہفتے تک روزانہ چار گھنٹے کسی خیال کے بغیر کہانی لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم بار بار بحث سے آغاز کرتے ہیں۔ شروع میں صرف اختلافات ہی سامنے آتے تھے۔۔۔ وینزویلا کا طالب علم کچھ کہتا ہے اور ارجنٹائن کا کچھ۔ پھر اچانک ایک خیال ظاہر ہو کر سب کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور کہانی کی عمارت اٹھائی جا سکتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اب بھی نہیں جانتے کہ خیال کیسے پیدا ہوتا ہے، وہ ہمیشہ ہمیں اچانک آ لیتا ہے۔ میرے ہاں معاملہ کسی خیال یا تصور سے نہیں بلکہ ہمیشہ عکس سے شروع ہوتا ہے۔ ''وبا کے دنوں میں محبت'' کی وجہ تخلیق کشتی کے تختے پر ناچتے ہوئے کا عکس تھا۔

سائمز: جب ایک بار کوئی عکس ذہن میں آ جائے تو پھر کیا ہوتا ہے؟

مارکیز: عکس میرے ذہن میں نشوونما پاتا ہے تاوقتیکہ پوری کہانی اس طرح متشکل ہو جاتی ہے جس طرح حقیقی زندگی میں ہوتی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اپنے آپ سے یہ مشکل ترین سوال پوچھنا پڑتا ہے کہ میں اس سے کیسے اخذ کروں؟ اس کتاب کے لیے موزوں ترین ساخت کیا ہوگی؟ میں ہمیشہ موزوں ساخت کا آرزومند رہا ہوں۔ ادب میں موزوں ترین ساخت کی ایک مثال سوفوکلیز کا ڈراما ''آڈی پس ریکس'' ہے۔ ایک اور مثال انگریز ادیب ولیم جیکبز کی کہانی ''منکیز پا'' ہے۔

جب میں کہانی اور ساخت کے بارے میں مطمئن ہو جاتا ہوں تو لکھنا شروع کرتا ہوں۔ لیکن صرف اس شرط پر کہ مجھے ہر کردار کے لیے موزوں نام مل جائیں۔ کرداروں کو موزوں نام نہ ملیں تو ان میں جان نہیں پڑتی۔ میرا خیال تو یہی ہے۔ میں ایک بار لکھنے بیٹھ جاؤں تو عام طور پر مجھے کوئی تذبذب نہیں ہوتا۔ میں اگلی صبح کام میں لانے کے لیے چند یادداشتیں، ایک آدھ لفظ یا فقرے کو تو کہیں استعمال کر سکتا ہوں لیکن ڈھیر ساری یادداشتوں کے ساتھ کام کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ یہ بات میں نے نوعمری ہی میں دریافت کر لی تھی۔ میں ایسے لکھنے والوں کو بھی جانتا ہوں جن کے پاس یادداشتوں سے بھرے پلندے ہیں جو اپنی یادداشتوں ہی کے بارے میں سوچتے رہ جاتے ہیں اور اپنی کتابیں کبھی نہیں لکھ پاتے۔

سائمز: آپ نے ہمیشہ کہا ہے کہ آپ خود کو صحافی بھی اس قدر سمجھتے ہیں جس قدر فکشن لکھنے والا ادیب۔ بیشتر ادیبوں کا خیال ہے کہ صحافت میں دریافت کی مسرت چھاپنے سے حاصل ہوتی ہے جب کہ فکشن میں یہ چیز محض لکھنے سے میسر آتی ہے۔ آپ اتفاق کرتے ہیں؟

مارکیز: مسرتیں تو یقیناً دونوں میں ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں صحافت کو ایک ادبی صنف سمجھتا ہوں۔ دانشور بھلے اتفاق نہ کریں لیکن مجھے اپنی رائے پر اعتماد ہے۔ صحافت فکشن نہ ہوتے ہوئے بھی ایک صنف ہے، اظہار حقائق کا ایک ذریعہ ہے۔ گو دونوں کے مواقع مختلف ہو سکتے ہیں لیکن جہاں تک تجربے کا سوال ہے وہ صحافت و ادب میں یکساں ہے۔ فکشن میں اگر آپ یہ محسوس کریں کہ کوئی ایسا خیال مل گیا ہے جو آپ کی تحریر میں سما سکتا ہے تو یہ ایسا ہی جذبہ ہے جیسا کوئی صحافی کسی خبر تک پہنچنے کے بعد محسوس کرتا ہے۔ ایسے لمحے بالکل غیر متوقع طور پر آتے ہیں اور ان کے جلو میں غیر معمولی مسرت ہوتی ہے۔ جس طرح صحافی خبر کی بو سونگھ لیتا ہے بالکل اسی طرح ادیب کو بھی الہام ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات کہ ابھی اسے بنانا سنوارنا ہوتا ہے لیکن وہ جان لیتا ہے کہ کہانی اس کی گرفت میں ہے۔ یہ تقریباً ایک طرح کی جبلت ہے۔ صحافی جان لیتا ہے کہ یہ خبر ہے یا نہیں۔ ادیب جان لیتا ہے کہ یہ ادب ہے یا نہیں، شاعری ہے یا نہیں۔ اس کے بعد لکھنے کا عمل تقریباً یکساں ہوتا ہے۔ دونوں ایک جیسی بہت سی تکنیکیں استعمال کرتے ہیں۔

سائمز: لیکن آپ کی صحافت لگے بندھے ضابطوں کی پابندی نہیں کرتی؟

مارکیز: بات یہ ہے کہ میری صحافت معلوماتی نہیں ہوتی، لہٰذا میں اپنی ترجیحات خود متعین کرتا ہوں اور اسی مزاج کو برقرار رکھتا ہوں

جو ادب کا خاصہ ہے۔ اب یہ میری بدقسمتی ہے کہ لوگ میری صحافت میں یقین نہیں رکھتے، اسے من گھڑت سمجھتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں صحافت میں کچھ گھڑتا ہوں نہ فکشن میں۔ فکشن میں حقیقت کو جوڑنا توڑنا پڑتا ہے کہ فکشن کا مقصد ہی یہ ہے۔ صحافت میں میں اپنے مزاج سے ہم آہنگ موضوع کا انتخاب کرسکتا ہوں کیونکہ اب میں پیشے کے تقاضوں سے آزاد ہوں۔

سائمنز: کیا آپ کو اپنی کوئی ایسی صحافتی تحریر یاد ہے جس سے آپ کو خاص لگاؤ محسوس ہوتا ہو؟

مارکیز: ہاں، جب میں ''ایل ایسکپیڈر'' نامی اخبار میں کام کرتا تھا اس وقت کی ایک چھوٹی سی تحریر ہے۔ ''دی مسٹری آف لاسٹ لیٹرز'' میں بگوٹا میں ٹرام میں جارہا تھا، یکا یک میری نظر ایک بورڈ پر پڑی جس پر ''ہاؤس آف لاسٹ لیٹرز'' تحریر تھا۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ مجھے بتایا گیا کہ ایسے تمام خطوط جو غلط پتوں یا کسی اور وجہ سے تقسیم نہ ہو سکتے ہوں اس مکان میں بھیج دیئے جاتے ہیں۔ اس مکان میں ایک بوڑھا آدمی رہتا ہے جس نے اپنی ساری زندگی ان خطوں کی درست ترسیل کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ بعض اوقات اسے کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ اگر درست پتہ تلاش نہیں ہوسکتا تھا تو خط جلا دیا جاتا تھا، لیکن کھولا کبھی نہیں جاتا تھا۔ ایک خط پر یہ پتہ درج تھا۔ ''اس عورت کے لیے جو ہر بدھ کو شام پانچ بجے ڈی لاس ارماس چرچ جاتی ہے''۔ سو وہ مرد ضعیف وہاں گیا۔ اسے سات عورتیں ملیں۔ اس نے باری باری ہر ایک سے استفسار کیا اور جب مطلوبہ عورت مل گئی تو کسی امکانی غلطی سے بچنے کے لیے اس نے عدالت سے حکم لے کر وہ خط کھولا، بہرحال اس کا اندازہ درست نکلا۔ میں یہ تحریر کبھی نہیں بھولوں گا کہ اس میں صحافت اور ادب دونوں کا امتزاج ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں آج تک دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر پاتا ہوں۔

سائمنز: فاؤنڈیشن کے ذریعے آپ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

مارکیز: میں چاہتا ہوں کہ لاطینی امریکہ میں فنکارانہ ذریعہ اظہار کی حیثیت سے فلمسازی کی بھی وہی قدر ہو جو ہمارے ادب کی ہے۔ ہمارا ادب اعلیٰ درجے کا ہے لیکن اسے شناخت حاصل کرنے میں بہت وقت لگا ہے۔ بڑی سخت جدوجہد کرنی پڑی ہے اور بعض اوقات تو یہ مرحلہ اب بھی مشکل ہے۔

سائمنز: بہرحال ادب نے تو اب جڑ پکڑ لی ہے!

مارکیز: آپ کو پتہ ہے اس کا آغاز اس وقت ہوا جب ہم نے مقامی قارئین کو تسخیر کرلیا۔ جب ہماری تحریر لاطینی امریکہ میں پڑھی جانے لگی لیکن ہم نے ہمیشہ اس کے برعکس صورت کو اہم جانا تھا۔ جب ہم کوئی کتاب چھاپتے ہیں تو ہمیں اس کے بکنے کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ ہم تو بس چاہتے تھے کہ اس کا ترجمہ کروالیں۔ گو ہمیں اس کا انجام بھی معلوم ہوتا تھا۔ کتاب کا ترجمہ ہو جاتا تھا اور ماہرین ایک آدھ تنقیدی مضمون لکھ دیتے تھے۔ لیکن کتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یونیورسٹیوں کے ہسپانوی شعبے میں دفن ہو جاتی تھی، بہرحال جب ہم لاطینی امریکہ میں پڑھے جانے لگے تو صورتِ حال یکسر بدل گئی بالکل یہی صورت حال فلموں کے ساتھ ہے۔ اب لاطینی امریکہ میں اچھی فلمیں بن رہی ہیں اور یہ کام بہت بڑے سرمائے سے نہیں ہو رہا ہے۔ یہ کام ہم اپنے وسائل اور اپنے طریقوں سے کر رہے ہیں۔ ہماری فلمیں بین الاقوامی میلوں میں دکھائی جارہی ہیں اور انعامات کے لیے نامزد ہورہی ہیں۔ لیکن انہیں ابھی سے ہی ناظرین کو گرفت میں لینا ہے۔ مشکل بڑے تقسیم کاروں کے ساتھ ہے۔ انہیں غیر معروف فلموں کے لیے بہت سی رقم لگانی پڑتی ہے جس کے بدلے میں انہیں کچھ نہیں ملتا لیکن جس دن ہماری فلموں نے مالی اعتبار سے کامیابی حاصل کرلی سارا منظر بدل جائے گا۔ یہی کچھ ہم نے ادب میں دیکھا ہے اور آنے والے دنوں میں یہی کچھ فلموں میں دیکھیں گے۔

سائمنز: آپ سیاست کو اتنی اہمیت دیتے ہیں لیکن کتابوں کے ذریعے اپنے سیاسی نظریات کا پرچار نہیں کرتے؟

مارکیز: میں نہیں سمجھتا کہ ادب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے۔ لیکن کسی کے نہ چاہنے کے باوجود بھی اس کا نظریاتی موقف اس کی تحریروں سے ناگزیز طور پر منعکس ہو جاتا ہے اور قارئین پر اثر ڈالتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری کتابوں نے لاطینی امریکہ پر اس لحاظ سے سیاسی اثر ڈالا ہے کہ وہ لاطینی امریکہ کا تشخص ابھارتی ہیں اور لاطینی امریکیوں کو اپنی ثقافت سے زیادہ باخبر کرتی ہیں۔ اگلے روز ایک امریکی نے مجھ سے پوچھا کہ سینما فاؤنڈیشن کے پس پشت حقیقی سیاسی مقصد کیا ہے۔ میں نے اسے جواب دیا، مسئلہ یہ نہیں کہ اس کے پیچھے کیا مقاصد ہیں، بلکہ یہ کہ اس کے آگے کیا ہے۔ سینما فاؤنڈیشن کا مقصد لاطینی امریکی سینما کے بارے میں آگہی کا فروغ ہے اور یہ مقصد

بنیادی طور پر سیاسی ہے۔ بلاشبہ ہمارا منصوبہ صرف فلم سازی سے متعلق ہے لیکن اس کے نتائج سیاسی ہوں گے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ سیاست صرف انتخابات کا نام ہے اور سیاست بس وہی کچھ ہے جو حکومتیں کرتی ہیں لیکن لاطینی امریکہ کا تشخص ابھارنے کے لیے ادب، سینما، مصوری اور موسیقی بھی لازمی ہیں۔

سائمنز: آپ کے نزدیک یہ بات فنکارانہ صلاحیت کو سیاست کی تحویل میں دے دینے سے مختلف ہے؟

مارکیز: میں تو کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ ٹھہریئے، میں آپ کو واضح کر دوں۔ فن ہمیشہ سیاست کی خدمت پر مامور ہوتا ہے اور اس نظریئے یا تصور کی ترجمانی کرتا ہے جو ادیب یا فنکار دنیا کے بارے میں رکھتا ہے لیکن فن کو حکومت کی خدمت پر کبھی مامور نہیں ہونا چاہیے۔

سائمنز: لاطینی امریکہ کے بارے میں آپ کا تصور کیا ہے؟

مارکیز: میں چاہتا ہوں کہ لاطینی امریکہ متحد، خود مختار اور جمہوری ہو۔

سائمنز: یورپی مفہوم میں؟

مارکیز: اس مفہوم میں کہ اس کے مفادات اور نقطہ ہائے نظر ایک ہوں۔

سائمنز: آپ اسی وجہ سے سائمن بولیوار کے متعلق لکھ رہے ہیں؟

مارکیز: نہیں، یہ وجہ نہیں۔ سائمن بولیوار کو میں نے اس لیے موضوع بنایا کہ مجھے اس کی شخصیت سے دلچسپی ہے۔ وہ حقیقت میں کیا تھا، یہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ ہیرو کی طرح مقدس ہو گیا ہے۔ میں اسے ایک کریبئین سمجھتا ہوں جسے رومانیت نے متاثر اور متشکل کیا تھا، ذرا سوچو تو، کس قدر دھماکہ خیز بات ہے لیکن سائمن بولیوار کے خیالات آج کے مسائل سے متعلق ہیں۔ لاطینی امریکہ کے بارے میں اس کا تصور ایک خود مختار اور متحدہ وحدت کا تھا جو اس کے نزدیک دنیا بھر میں سب سے بڑی اور طاقتور بن سکتی تھی۔ اس بارے میں اس کا ایک بہت خوب صورت فقرہ ہے: ''ہم اپنی نوعیت کی واحد انسانی نسل ہیں۔ وہ ایک غیر معمولی شخص تھا لیکن اس کے باوجود عبرت ناک شکست سے دوچار ہوا۔ اسے جن طاقتوں نے نیچا دکھایا وہ آج بھی موجود ہیں، یعنی زمیندار اور مقامی روائتی طاقتور گروہ جو اپنے مفادات اور مراعات کو بچانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اس کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا تھا، لیکن اس کا یہ خواب کہ لاطینی امریکہ متحد اور خود مختار ہو، آج بھی زندہ ہے۔ آپ نے غور کیا، میں مختلف الفاظ استعمال کر رہا ہوں۔ حقیقت میں مجھے سیاسی گفتگو سے نفرت ہے۔ بطور مثال ''عوام'' جیسے الفاظ! ہمیں مردہ زبان کے خلاف جدوجہد کرنی ہے۔ صرف مارکسیوں کی صورت ہی میں نہیں جنھوں نے زبان کو سب سے زیادہ حنوط کیا ہے، بلکہ آزاد خیالوں کی طرح بھی۔ ایسا ہی ایک اور لفظ ''جمہوریت'' ہے۔ روسی کہتے ہیں ہم جمہوری ہیں۔ امریکی کہتے ہیں ہم جمہوری ہیں۔ ایلسلواڈور بھی یہی کہتا ہے اور میکسیکو بھی ایک آدھ انتخاب کروالیتا ہے خود کو جمہوری کہنے لگتا ہے۔ ایک اور لفظ ''آزادی'' ہے۔ یہ ایسے الفاظ ہیں جن کے معانی بہت محدود ہو گئے ہیں۔ یہ مردہ ہو گئے ہیں۔ یہ اس حقیقت کا اظہار نہیں کرتے جس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ میں ہمیشہ ایسے الفاظ تلاش کرتا ہوں جو کھوکھلے نہ ہوں۔

آپ کو معلوم ہے میری زندگی میں سب سے بڑی کمی کیا رہی ہے۔ ایسی کمی جس کی تلافی ناممکن ہے یعنی یہ کہ میں ثانوی زبان کی حیثیت سے انگریزی اچھی طرح نہیں بول سکتا۔ کاش میں انگریزی بول سکتا۔۔۔

سائمنز: لکھنے کے بارے میں آپ کا اگلا منصوبہ کیا ہے؟

مارکیز: میں ''سائمن بولیوار'' کو مکمل کروں گا۔ مجھے چند ماہ اور چاہئیں۔ اس کے بعد میں اپنی آپ بیتی لکھوں گا۔ عام طور پر لوگ آپ بیتی اس وقت لکھتے ہیں جب کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ میں آہستہ آہستہ لکھنا شروع کروں گا اور پھر تادیر لکھتا رہوں گا۔ میری آپ بیتی عام آپ بیتی نہیں ہوگی۔ ہر بار جب میں چار سو صفحے لکھوں گا تو ایک جلد چھپوا دوں گا جن کی تعداد چھ تک ہو سکتی ہے۔

(ترجمہ: راشد مفتی۔ بہ شکریہ: ماہِ نو، ستمبر 1988ء)

اپنی نفرت کو برف پر لکھو!

کولمبیا کا شہرۂ آفاق ادیب گیبریل گارشیا مارکیز (Gabrial Garcia Marquiz) فقط ''تنہائی کے سو سال'' جیسی بے مثال کہانی (جس پر اسے نوبل انعام سے نوازا گیا) اور ایسی دیگر بہت سی کہانیوں کا خالق ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی وہ بہت کچھ ہے۔ وہ ایک بہت بڑا انسان ہے اور اس نے یہ بات انٹرنیٹ پر دیئے گئے اپنے الوداعی پیغام میں بدرجہ اولیٰ ثابت کی ہے۔ گارشیا کچھ عرصے سے کینسر جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہے اور شاید اب طبیعت زیادہ بگڑنے پر اس نے موت کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے اپنے ساتھی انسانوں کو وہ پیغام دیا ہے جس میں زندگی کی خوبصورتیوں سے تمام تر انکسار کے ساتھ مستفیض ہونے کا درس ہے۔ پیغام اس قدر خوبصورت ہے کہ مجھے اسے اردو زبان میں منتقل کرتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''اگر خدا مجھے دوبارہ زندگی دے تو میں جو کچھ سوچتا ہوں، اسے کہنے کے بجائے جو کچھ کہتا ہوں، اس کے بارے میں سوچوں گا۔ میں چیزوں کی قدر ان کی قیمت سے نہیں، بلکہ ان کے بامعنی ہونے کی وجہ سے کروں گا۔ میں کم سوؤں گا اور جاگتے میں خواب دیکھوں گا کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ہر اس منٹ کہ جب ہم آنکھیں بند کرتے ہیں، ہم پورے ساٹھ سیکنڈ کے لیے روشنی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

جب دوسرے رک جائیں گے، میں چلتا رہوں گا۔ جب دوسرے سوئیں گے، میں جاگوں گا۔ جب دوسرے بولیں گے تو میں سنوں گا۔ میں اچھی اچھی چاکلیٹ کھاؤں گا۔ اگر خدا مجھے دوبارہ زندگی دے تو میں اچھے اچھے کپڑے پہنوں گا۔ دھوپ تاپوں گا۔۔۔ فقط اپنے جسم کے لیے نہیں بلکہ اپنی روح تک اس کی تپش پہنچاؤں گا۔ اے خدا! اگر میں دل گرفتہ ہوں گا تو اپنی نفرت کو برف پر لکھوں گا اور سورج نکلنے کا انتظار کروں گا تا کہ برف کے ساتھ میری نفرت بھی پگھل کر بہہ جائے۔ میں وین گاگ (Van Gogh) کی طرح ستاروں پر نظمیں لکھوں گا اور چاند کے لیے محبت کے گیت گاؤں گا۔ میں اپنے آنسوؤں سے گلابوں کو سیراب کروں گا اور کانٹوں کا درد اور گلابی پنکھڑیوں کا لمس محسوس کروں گا۔ اے میرے خدا! مجھے دوبارہ زندگی ملے تو میں کوئی دن ایسا نہیں گزاروں گا جب لوگوں کو یہ پیغام نہیں دوں گا کہ مجھے ان سے پیار ہے۔ میں ہر مرد اور ہر عورت کو بتاؤں گا کہ وہ مجھے محبوب ہیں۔ میں پیار سے پیار کروں گا۔ میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ وہ غلط سمجھتے ہیں کہ جب وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو محبت نہیں کر سکتے۔ انہیں نہیں معلوم کہ جب وہ محبت کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میں بچوں کو پر پرواز دوں گا، لیکن انہیں خود اڑنے کی کوشش کرنے دوں گا۔ میں بوڑھوں کو بتاؤں گا کہ موت بڑھاپے سے نہیں آتی بلکہ یہ سب کچھ بھول جانے سے آتی ہے۔ اے انسان! میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

میں نے یہ بھی سیکھا ہے کہ ہر کوئی پہاڑ کی چوٹی پر رہنا چاہتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ اصل خوشی اس بات میں ہے کہ چوٹی پر پہنچا کیسے گیا۔ میں نے یہ بھی جانا ہے کہ جب ایک نومولود بچہ اپنے باپ کی انگلی پکڑتا ہے تو وہ باپ کو ہمیشہ کے لیے اپنی محبت میں قید کر لیتا ہے۔ میں نے یہ بھی جانا ہے کہ انسان کو نیچے کی طرف صرف اس وقت دیکھنا چاہیے جب اسے کسی دوسرے انسان کو اوپر اٹھانا ہو۔ اے انسانو! میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اگر میں اس سب کو اپنے سینے میں لے کر مر جاؤں تو یہ بدقسمتی کی موت ہو گی۔''

اور آخر میں وہ مختصر نظم جو میں نے گارشیا کے اس پیغام سے متاثر ہو کر لکھی۔ یہ نظم میں گارشیا کے نام کرتا ہوں:

اپنی نفرت کو برف پر لکھو
جب بھی الفت کی دھوپ نکلے گی
برف پگھلے گی
اور اس کے ساتھ نفرت بھی!

(لطیف قریشی)

1903ء

اس برس دنیا کے کسی بھی مصنف کو نوبل انعام کا سزاوار نہ سمجھا گیا۔

1914ء

دُنیا کے کسی ادیب کو نوبل انعام نہیں ملا۔

1931ء

ایک ایسا برس جس میں کسی کو نوبل انعام سے نہیں نوازا گیا۔

1935ء

ایک ایسا برس تھا جس میں کسی کو بھی ادب کے نوبل انعام کا حقدار نہ سمجھا گیا۔

1940-1941-1942-1943ء

۱۹۴۰ء میں دوسری جنگ عظیم نے پوری دنیا کو اپنے گھیرے میں لینا شروع کر دیا' انسان اور انسان کی دنیا نے پہلے ایسی ہولناک اور عالمگیر جنگ کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پوری دنیا کی بنیادیں ہل رہی تھیں۔ بہت سے کام ایسے تھے جنہیں ملتوی کر دیا گیا۔ سویڈش نوبل کمیٹی نے ۱۹۴۰۔۱۹۴۱۔۱۹۴۲۔۱۹۴۳ء میں کسی بھی مصنف کو کوئی نوبل انعام نہ دیا۔ ان چاروں برسوں میں نوبل انعام تعطل کا شکار رہا۔

1906ء---الیساندرو کارڈوچی

الیساندرو کارڈوچی اپنے عہد کا عظیم شاعر' ادیب' ادبی محقق اور ترقی پسند سیاست دان تھا۔ وہ اطالوی تھا اور ولادی کاسلو اٹلی میں 27 جون 1835ء کو پیدا ہوا۔ اس کے والدین کیتھولک عقیدے پر ایمان رکھنے والے عیسائی تھے لیکن کارڈوچی نے مذہب کو تیاگ دیا اور اینٹی چرچ عقیدے پر اپنی زندگی کو استوار کیا۔ اس نے پیزا یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ 1859ء میں اس نے شادی کی اور 16 فروری 1907ء کو اس کا انتقال ہوا۔

الیساندرو کارڈوچی کے کئی شعری مجموعوں کے تراجم انگریزی میں ہوئے اور اس کی شاعری کو بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ چند مجموعوں کے نام یہ ہیں: باربیرین اوڈز (مترجم ڈبلیو ایف اسمتھ) پولیٹیکل اینڈ سیٹرک ورس آف کارڈوچی (مترجم ڈبلیو ایف اسمتھ) دی نیولیرکس (مترجم ڈبلیو ایف اسمتھ) کنفیشنز اینڈ بیٹلز (مترجم جارج سانگی)

انگریزی میں جان بیلی کی ایک کتاب بطور خاص قابل ذکر ہے۔ کتاب کا نام ہے: "کارڈوچی"۔ اس کتاب میں الیساندرو کارڈوچی کے فن اور شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ کتاب 1926ء میں شائع ہوئی اور کارڈوچی پر بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کارڈوچی کو اس وقت ادب کا نوبل انعام ملا جب وہ اپنی زندگی کے آخری برس گزار رہا تھا۔ اٹلی میں الیساندرو کارڈوچی کو نوبل انعام ملنے پر بطور خاص مسرت کا اظہار ہوا کیونکہ وہ اس وقت نہ صرف اٹلی کی برگزیدہ شخصیت تسلیم کیا جاتا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ اسے واقعتاً نوبل انعام کا حق دار بھی تصور کیا جاتا تھا۔ اس کا ممتاز ترین تخلیقی کارنامہ شاعری تھی۔ کارڈوچی کا شمار دنیا کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ بے پناہ تخلیقی قوت کا مالک تھا۔ اس کا شعری اسلوب زندہ اور ایسا تھا کہ اس کی انفرادیت کو پوری شعری دنیا نے تسلیم کیا۔ اپنی ان شعری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کارڈوچی نے عظیم شعری فن پارے تخلیق کیے۔ اس نے طنزیہ اور سیاسی شاعری میں بھی نیا انداز اور اسلوب اختیار کر کے منفرد شاعر کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوایا۔

الیساندرو کارڈوچی ایک محب وطن اطالوی اور آزاد خیال ترقی پسند سیاست دان بھی تھا۔ اس کے سیاسی خیالات کے اثرات اس کی شاعری پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے عہد میں وہ اٹلی کی عظیم ترین ادبی شخصیت تھا اور اس کا شمار جدید اطالوی ادب کے عظیم معماروں میں ہوتا ہے۔

1907ء---رڈیارڈ کپلنگ

رڈیارڈ کپلنگ کا شمار برطانیہ اور انگریزی زبان کے چند عظیم لکھنے والوں میں ہوتا ہے بطور خاص ایک فکشن رائٹر، کہانی کار، مقبول عام شاعری اور بچوں کے کلاسیکل مصنف کی حیثیت سے عالمی اور انگریزی ادب میں اسے ممتاز مقام حاصل ہے، تاہم یہ اہم حقیقت بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ رڈیارڈ کپلنگ برطانوی استعمار کا نمائندہ تھا اور برصغیر میں برطانوی اقتدار کے استحکام ودوام کا حامی بھی۔

رڈیارڈ کپلنگ کے حوالے سے دنیا کو وسیع پیمانے پر برصغیر سے تعارف حاصل ہوا اور اس کی بیشتر تخلیقات بھی برصغیر کے حوالے سے ہیں، لیکن اس خطے کے بارے میں اس کا تخلیقی رویہ برصغیر کے عوام اور کلچر کے حوالے سے زیادہ صحت مندانہ اور صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا۔

وہ برصغیر میں ہی پلا بڑھا اور اس نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ اس خطے میں بسر کیا۔ 30 دسمبر 1865ء کو وہ بمبئی میں پیدا ہوا۔ کالج وغیرہ میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ والدین میتھوڈسٹ عقیدے کے مالک تھے۔ 1892ء میں رڈیارڈ کپلنگ نے کیرولین سے شادی کی۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ 1882ء سے 1887ء تک لاہور کے سربرآوردہ انگریزی روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ 1887ء سے 1889ء تک پایونیر (بمبئی) کا ایڈیٹر رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تحریر کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

رڈیارڈ کپلنگ نے اپنی زندگی میں ادب کے نوبل انعام کے علاوہ کئی دوسرے اعزاز اور انعام بھی حاصل کیے جن میں 1916ء، 1921ء، 1924ء میں اسے آرڈر آف میرٹ اور 1926ء میں گولڈ میڈل دیا گیا۔

اپنے ناول "کم" کے حوالے سے رڈیارڈ کپلنگ نے لاہور میں عجائب گھر کے سامنے زمزمہ (بھنگیوں کی توپ) کو عالمی شہرت سے ہمکنار کیا اور آج پوری دنیا میں اسے KimsGun کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کپلنگ ایک ایسا مصنف ہے جس کی تخلیقات کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے البتہ اردو زبان میں اس کی زیادہ تصانیف کو منتقل نہیں کیا گیا۔ اس کی جنگل بک کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے کیا۔ کچھ نظمیں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔ بچوں اور بڑوں کی کچھ کہانیاں بھی جرائد میں شائع ہوئیں لیکن کتابی صورت میں نہیں۔

رڈیارڈ کپلنگ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس کی تخلیقات پر فلمیں بھی بنیں جن میں اس کی نظم "گنگادین"، طویل کہانی "دی مین ہو از اے کنگ" اور "کم" شامل ہیں۔

رڈیارڈ کپلنگ کو جب 1907ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا تو اس کی عمر بیالیس برس تھی۔ اسے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ پہلا برطانوی مصنف تھا جسے ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ وقت بہت سی تخلیقات کو دھندلا دیتا ہے۔ بدلتے ہوئے زمانوں میں بہت سی تخلیقات بے جان ہو جاتی ہیں لیکن بچوں کے کلاسیکل شاعر اور کہانیاں لکھنے والے کی حیثیت سے رڈیارڈ کپلنگ کی تخلیقات یقیناً زندہ رہیں گی۔

1908ء---رڈولف کرسٹوف ایوکین

فلسفی، دانشور اور مفکر ایوکین کو 1908ء میں نوبل انعام کا حق دار قرار دیا گیا۔ وہ جرمنی میں 5 جنوری 1846ء کو پیدا ہوا۔ عقیدے کے اعتبار سے آزاد خیال تھا، تاہم اس کے والدین لوتھر کے پیروکار تھے۔ گوٹنگین یونیورسٹی سے اس نے 1866ء میں فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1882ء میں شادی کی۔

برگساں کا نام آج فلسفے کی دنیا میں بہت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ ایوکین کا موازنہ ایک دور میں برگساں سے کیا جاتا رہا اور اب بھی فلسفیانہ مباحث اور نظریات کے حوالے سے برگساں اور ایوکین کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ اگرچہ ایوکین کو وہ شرف حاصل نہیں رہا جو برگساں کو حاصل ہے۔

ایوکین نے اپنے عہد کے روحانی بحران اور انتشار کو سمجھنے کی کوشش کی اور اپنی تحریروں کے ذریعے مثبت طرز زندگی کی ترویج کی تاکہ عہد جدید کا انسان اپنے روحانی بحران پر قابو پا کر صحت مندانہ مثبت زندگی بسر کر سکے۔ اس کی ایک کتاب نے پوری دنیا کے قارئین کو متاثر کیا۔ یہ کتاب ہے "دی مینگ اینڈ ویلیو آف لائف"۔ یوں ایوکین نے ایک اہم فریضہ اپنی تحریروں سے ادا کیا۔ انسانوں کو زندگی کی حقیقت اور مفہوم سے روشناس کرانے کی سعی کی اور انسان کو روحانی سطح پر اونچا اٹھا کر اپنے عہد کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی راہ دکھائی۔ وہ ایک عظیم زندگی آموز مفکر اور دانشور تھا۔

ایوکین 15 ستمبر 1926ء کو جرمنی میں انتقال کر گیا۔

1909ء---سلیما لیگراف

سلیما لیگراف کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پہلی خاتون جنھیں ادب کا نوبل انعام 1909ء میں دیا گیا۔ وہ 24 نومبر 1858ء کو وارم لینڈ میں پیدا ہوئی۔ سویڈش شہری تھی۔ مذہبا آزاد خیال۔ اس نے رائل ویمنز سپیریئر ٹریننگ کالج سویڈن سے 1885ء میں گریجوایشن کی۔ 1885ء سے 1895ء تک سلیما لیگراف نے گرلز ہائی اسکول لینڈ سکرانا سویڈن میں درس دیا۔ ایک استاد کی حیثیت سے بھی اسے خاصی شہرت ملی۔ اس کی اعلیٰ ترین ادبی خدمات پر اسے سویڈش اکیڈمی نے 1904ء میں گول میڈل ایوارڈ دیا تھا۔

وہ ماہر تعلیم' ناول نگار' کہانی کار' شاعر سوانح نگار' خود نوشت نگار اور ڈرامانگار تھی۔ سویڈش ادب کے احیاء کے ساتھ ساتھ سلیما لیگراف نے اس کے روایتی دھارے کو تبدیل کیا۔ اس کے ہم عصر سویڈش ادب پر رومانویت کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی۔ سلیما لیگراف نے سویڈش اور عالمی ادب کو بلند وارفع آئیڈیلزم' روشن قوت متخیلہ اور روحانی تصورات سے مالا مال کیا۔

نوبل انعام حاصل کرنے والی اس پہلی مصنفہ کا انتقال 16 مارچ 1940ء کو ہوا۔ اس نے ساری عمر شادی نہیں کی تھی۔

1910ء---پال ہیسے

پورا نام جوہان لڈوگ وان پال ہیسے' تاریخ پیدائش 15 مارچ 1830ء' مقام پیدائش برلن' جرمنی۔ قومیت جرمن' مذہب پروٹسٹنٹ اور جیوش' تعلیم بون یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی' شادی شدہ۔ اعزازات درباری شاعر (1854ء سے 1914ء تک) شلر پرائز جرمنی 1884ء' وفات 2 اپریل 1914ء (میونخ)۔ اہم تصانیف لا اربیاٹا اینڈ ادر ٹیلز (ترجمہ میری ولسن) چلڈرن آف دی ورلڈ: ترجمہ جان ہرنز' ان پیراڈائز (3 جلدیں)' سلیکٹڈ سٹوریز۔

پال ہیسے پر اہم ترین کتاب بنیاتی جنیوا کی ہے (لائف اینڈ ورکس آف پال ہیسے 1917ء)۔ پال ہیسے نے اپنی زندگی میں تخلیقی کام کے انبار لگا دیئے۔ وہ ایک شاعر' ڈرامانگار' ناول نویس اور مختصر کہانی کار تھا۔ اس کی مختصر کہانیوں کو پوری دنیا میں سراہا گیا جبکہ ناولٹوں نے جرمن ادب کو نئی جہتوں سے ہمکنار کیا۔ اس کا مکمل کام اڑتیس جلدوں پر مشتمل ہے جو 1871ء سے 1914ء تک مکمل ہوا۔ وہ ایک لبرل ترقی پسند مصنف تھا' تاہم ایک عرصے تک وہ روایتی اسلوب میں لکھتا رہا لیکن بعد میں اس نے اپنے ناولوں اور کہانیوں کے حوالے سے اپنے آپ کو دنیا کا عظیم مصنف تسلیم کرایا۔ اس نے منفرد جدید اور ہم عصر حساسیت سے جڑا ہوا اسلوب تخلیق کیا۔

1911ء---مارئیس میترلنک

اردو میں مارئیس میترلنک کو آل احمد' مجنوں گورکھ پوری اور نیاز فتح پوری جیسے مترجم اور مداح نصیب ہوئے۔ گینٹ (بلجیم) میں 29 اگست 1862ء کو پیدا ہونے والے اس عظیم ڈرامانگار کو 1911ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ وہ مذہبا" تشکیک اور لاادریت میں مبتلا تھا حالانکہ اس نے جیسوئیٹ کالج ڈی سینٹ باربی بلجیم سے اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد میں اس نے گینٹ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری بھی حاصل کی۔ مارئیس نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی ناکام اور مختصر رہی۔ تعلیم کے بعد وہ قانون کے پیشے سے منسلک ہوا اور اٹارنی کی حیثیت سے فرائض انجام دیتا رہا تاہم اسے اصل دلچسپی ڈرامے سے تھی اور ایک ڈرامانگار کی

حیثیت سے اسے کئی اعزاز و انعام ملے۔1891ء میں اسے ڈرامائی ادب میں نمایاں کام کرنے کے سلسلے میں ٹرائی نیشنل پرائز کا حق دار قرار دیا گیا جسے میترلنک نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ 1920ء میں اسے کاؤنٹ کا رتبہ دے دیا گیا۔ 1939ء میں اسے میڈل آف دی آرڈر آف سینٹ جیمز آف دی سورڈ پرتگال کا اعزاز بخشا گیا۔

اس نے شہرت ڈرامانویس کی حیثیت سے حاصل کی اور نوبل انعام بھی اس کے ڈراموں کی وجہ سے ہی دیا گیا۔ اس کے فن کے کئی ادوار ہیں: ڈراموں میں شعریت اور قوت متخیلہ ایک عہد میں نمایاں عنصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ اپنے ڈرامے میں محسوسات پر زیادہ زور دیتے ہوئے ملتا ہے۔ عمل کا حصہ اس کے بعض ڈراموں میں بہت کم ملتا ہے۔

جب میترلنک نے ڈراموں میں علامتوں کو بطور خاص پیش کیا اور سمبلزم کے حوالے سے اس کے ڈراموں کی ایک انفرادیت قائم ہوئی تو اسے بہت شہرت ملی۔ اس کے اس دور کے ڈراموں میں جدت ایک فاتح کی علامت بن کر سامنے آتی ہے لیکن بعد کے ڈراموں میں قنوطیت اور یاسیت کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ 1900ء کے بعد اس نے جو کھیل لکھے' اس میں اس نے سمبلزم کو یکسر نیا رنگ دیا اور زیادہ حقیقت پسندانہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے اخلاقی اور فلسفیانہ مسائل پر ڈرامے لکھے۔

میترلنک اردو میں خاصا جانا پہچانا جاتا ہے' وہ ایک شاعر اور انشاپرداز بھی تھا۔ وزڈم اینڈ ڈسٹینی کے نام سے اس کے مضامین کا مجموعہ 1898ء میں شائع ہوا تھا۔ شہد کی مکھیوں پر بھی اس کی کتاب کو خاص شہرت حاصل ہے۔ میترلنک کا انتقال 6 مئی 1949ء کو ہوا۔

1912ء---گرہارٹ جوہان ہاپٹ مین

ہاپٹ مین باقاعدہ تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ اس نے کسی اسکول اور کالج سے کوئی تعلیمی سند حاصل نہیں کی' اس کے باوجود اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر اسے ادب کا سب سے بڑا انعام ملا اور 1912ء میں نوبل انعام کے بعد بھی اس کے ملک میں اسے بڑے بڑے اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔ وہ 15 نومبر 1862ء کو جرمنی کے ایک قصبے میں پیدا ہوا۔ پیشے کے اعتبار سے مجسمہ ساز اور مصنف تھا۔ اس کا شمار دنیا کے بعض بڑے ڈرامانگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کے اہم ترین ڈرامے یہ ہیں: بِی فور سن رائز (ترجمہ جیمز جوائس)' دی ویورز (ترجمہ میری موریسن)' دی بیوور کوٹ (ایک کامیڈی ترجمہ لڈوگ لیوشن)' دی ریٹس (ترجمہ لڈوگ لیوشن)

ڈرامے کے فن کو ہاپٹ مین نے نئی جہتوں اور معنی سے آشنا کیا۔ اپنے نیچرلسٹ ڈراموں کی وجہ سے اسے پوری دنیا میں شہرت حاصل ہوئی۔ وہ سماجی مسائل اور حقائق کو بہت اہمیت دیتا تھا اور اس نے اپنے عہد کی صداقتوں کے ساتھ انسان کے ازلی اور ابدی مسائل کو سامنے رکھ کر عظیم ڈرامے تخلیق کیے۔ اس نے مذہبی اور فلسفیانہ بنیادوں پر بھی کھیل لکھے۔ اس پر قدیم یونانی المیہ نگاروں کا بہت اثر تھا۔ ہاپٹ مین کے کچھ ڈرامے ان کی تقلید میں بھی ملتے ہیں۔ اس کا انتقال 8 جون 1946ء کو ہوا۔

1913ء---رابندر ناتھ ٹیگور!

پہلا ایشیائی جسے نوبل انعام دیا گیا' وہ رابندر ناتھ ٹیگور تھا۔ بنگالی زبان کا عظیم شاعر' ڈرامانگار' کہانی کار' ناول نگار' مفکر' مصور' موسیقار' سیاست دان اور ماہر تعلیم۔ ایک خاص طرز زیست اختیار کرنے والا انسان۔

رابندر ناتھ ٹیگور کو "گرودیو" کا درجہ حاصل رہا۔ شانتی نکیتن کے حوالے سے اسے خاص شہرت ملی۔ اسے رشی منی تسلیم کیا گیا' ایک روحانی گورو۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنگالی شعر و ادب اور فنون میں ٹیگور کا کنٹری بیوشن بہت شاندار اور بڑا ہے۔ موسیقی' مصوری' شاعری' فکشن اور ڈراما' شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو گا جس میں ٹیگور نے کام نہ کیا ہو۔ وہ بے پناہ صلاحیتوں کا حامل انسان تھا۔

انگریزی کے علاوہ اردو اور دوسری زبانوں میں بھی اس کی تصانیف کے تراجم ہو چکے ہیں' گیتانجلی کا ترجمہ اردو میں کئی بار ہوا ہے۔ مترجموں میں عبدالمجید سالک اور عبدالعزیز خالد قابل ذکر ہیں۔ ٹیگور اپنی زندگی میں ایک ادارہ' ایک لیجنڈ اور ایک بین الاقوامی شخصیت کا درجہ حاصل کر چکا تھا۔

وہ 7 مئی 1861ء کو کلکتہ میں پیدا ہوا۔ ذات کا برہمن اور ایک وسیع المشرب مذہبی فرد تھا۔ اسے خدا نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اس نے اسکول یا کالج سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی۔ وہ سیاسی طور پر مثالی رہنما تھا۔ ایک بڑے جاگیردار کی حیثیت سے اسے اپنی روزی کے لیے کسی پیشے سے منسلک ہونے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ٹیگور نے اپنی زندگی شاعری، ادب اور فنون کی تخلیق کے لیے وقف کر دی تھی۔ 1915ء میں ٹیگور کو سر کا خطاب بھی دیا گیا۔ اس کی اہم ترین تصانیف میں گیتانجلی، باغبان، سادھنا (لیکچروں اور مضامین کا مجموعہ) ڈراموں، افسانوں اور ناولوں اور نظموں کے کئی مجموعے شامل ہیں، تاہم بین الاقوامی سطح پر ٹیگور کی جس کتاب کو سب سے زیادہ شہرت ملی وہ ان کی نظموں کا مجموعہ گیتانجلی ہے جس میں ایک اسراریت، بھرپور نغمگی اور زندگی کا ایک فلسفہ ملتا ہے۔ ٹیگور کے ہاں بے پناہ نغمگی اور حساسیت ملتی ہے۔ اس کی شاعری میں ایک ایسی تازگی اور حسن ہے جو بنگالی شاعری میں ایک نئی چیز تھی۔ اس کا اسلوب اس کا اپنا ہے۔ ایک ناقابل تقلید اسلوب، جس کے اثرات بنگالی شاعری پر بہت نمایاں ہیں لیکن اسے پوری طرح کوئی بھی اپنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ صاحب دانش تھا۔ ایک صوفی، جس کی دانش اور مذہبی بصیرت اس کے تخلیقی کاموں میں ملتی ہے۔

1915ء---رومین رولاں!

رولاں اپنے سیاسی نظریات اور امن کے استحکام کے حوالے سے جدوجہد کی بنا پر جہاں ایک بین الاقوامی شخصیت بن گیا، وہاں اسے یہ نقصان ہوا کہ اس کے عظیم ادبی کارنامے کو نظرانداز کیا جانے لگا۔ کم از کم اردو کی حد تک تو یہ بات خاصے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ جن ترقی پسند نقادوں یا ادیبوں نے ترقی پسند تحریک کے حوالے سے رومین رولاں کو متعارف کرایا، انھوں نے اس کے عظیم ادبی کارنامے اور ناول "ژاں کرستوف" کا ذکر کبھی نہیں کیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں جو چند بڑے ناول لکھے گئے ان میں "ژاں کرستوف" کا شمار ہوتا ہے۔ رومین رولاں 29 جنوری 1866ء کو کلیمسی فرانس میں پیدا ہوا اور اس کا انتقال 30 دسمبر 1944ء کو فرانس ہی میں ہوا۔ رومین رولاں نے فرانس اور اٹلی کی بڑی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ فرانس کی کئی یونیورسٹیوں میں جن میں سوربون بھی شامل ہے، پڑھاتا رہا۔ نوبل انعام کے علاوہ اسے اپنے ملک کی طرف سے کئی اعزاز و انعام دیے گئے جن میں گرینڈ پرکس فرنچ اکادمی 1913ء بھی شامل ہے۔

اسے 1933ء میں جرمن حکومت نے گوئٹے میڈل سے نوازا لیکن چونکہ ہٹلر برسراقتدار آ چکا تھا اور رومین رولاں نازی ازم کا شدید مخالف تھا اس لیے اس نے یہ انعام لینے سے انکار کر دیا۔

رومین رولاں نے ایک بھرپور زندگی بسر کی۔ ایک ادیب اور سیاسی نظریات رکھنے والے فعال کارکن اور رہنما کی حیثیت سے بہت مصروف زندگی گزاری۔ اس کے باوجود وہ بحیثیت ایک خلاق مصنف کے بھی بہت سی تخلیقات کا خالق ہے جن میں دی "ولوز" "دی فور ٹیتھ آف جولائی" "بیتھوون" "دی پیپلز تھیٹر" اور "دانتون" شامل ہیں تاہم اس کا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ اس کا ناول "ژاں کرستوف" ہے جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ رومین رولاں کی تصانیف کا ترجمہ انگریزی، روسی اور عربی تک میں ہوا ہے۔ اردو میں اس کی کوئی بڑی تصنیف منتقل نہیں کی گئی۔

رومین رولاں انسانوں کے تنوع اور ان کی متضاد نفسیات کو سمجھنے والا عظیم مصنف تھا۔ تاریخ اور ادب میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ایک فعال نظریاتی انسان کی حیثیت سے عالمی امن کے لیے اس کی جدوجہد کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ موسیقی پر اسے خاص عبور حاصل تھا۔ اس حوالے سے بھی اس کی شہرت مستحکم ہوئی۔ اس کے ضخیم اور عظیم ناول "ژاں کرستوف" کا مرکزی کردار ایک موسیقار اور موضوع موسیقی ہے۔ اس نے ٹالسٹائی، مائیکل اینجلو، گاندھی، بیتھوون اور ہینڈل پر جو کام کیا اس کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ تھیٹر میں اس کی دلچسپی نے بھی فرانس میں ڈرامے اور تھیٹر کو نئی جہتوں سے ہمکنار کیا۔ ژاں کرستوف کے خالق کی حیثیت سے رومین رولاں کو ہمیشہ دنیا کے ادب میں یاد رکھا جائے گا۔

1916ء---کارل گستاف ورنر' وان ہیڈنسٹام

گھٹن سے نکلو' باہر نکلو' دنیا دیکھو اور ادب کی فضا تبدیل کرو' ہیڈنسٹام کو 1916ء کا نوبل انعام اس بنا پر دیا گیا کہ وہ عالمی ادب میں ایک نئے دور کا ترجمان اور نمائندہ تھا۔ اس نے اپنے عہد کے سویڈش ادب کی منجمد روایات کو توڑا۔ اس دور کی شاعری گھٹن اور حبس کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہ اس محدود دنیا سے باہر نکلا۔ سیر و سیاحت اور بیرونی مناظر کو اپنی تخلیقات میں شامل کر کے اس نے ادبی فضا کو وسعت بخشی۔ اس نے ادب میں حسن فطرت اور زندگی کی مسرتوں کو شامل کیا اور سویڈن کی تاریخ اور دیہات کے مناظر کو ادب کا حصہ بنا کر اسے نئی وسعت دی۔ وہ ایک ایسا شاعر تھا جس نے عالمی شاعری میں نئی روایات قائم کیں۔

ہیڈنسٹام 6 جولائی 1859ء کو سویڈن میں پیدا ہوا۔ اگرچہ اس کے والدین عیسائی تھے لیکن وہ خود ملحد تھا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی اور وہ کسی کالج سے سندیافتہ نہیں تھا۔ اس نے تین شادیاں کیں لیکن اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے ساری عمر لکھنے پڑھنے میں بسر کر دی' کوئی پیشہ اختیار نہیں کیا۔ اسے 1938ء میں ہینرک سٹیفنز پرائز بھی دیا گیا تھا۔ اس کے مجموعوں کا انگریزی' فرانسیسی' جرمنی اور بعض دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔ اس کی اہم تصانیف میں مندرجہ ذیل مجموعے شامل ہیں: دی وانڈر ایرز (1889ء)' پوئمز (1892ء)' دی چارلس مین (1920ء)' سینٹ جارج اینڈ دی ڈریگنز (1902ء)' نیو پوئمز (1915ء)۔

وان ہیڈنسٹام کا انتقال 20 مئی 1940ء کو ہوا۔

1917ء---کارل جیلرپ

1917ء میں ادب کے نوبل انعام کا دو مصنفوں کو حق دار قرار دیا گیا جن میں ایک کارل جیلرپ تھا۔ وہ 2 جون 1857ء کو ڈنمارک کے ایک قصبے میں پیدا ہوا۔ اس نے یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم حاصل کی۔ نظریات و عقائد کے اعتبار سے وہ الحاد پرست تھا۔ اس نے ایک لکھنے والے کی حیثیت سے ساری زندگی بسر کی۔ اسے 1889ء میں پوئیٹس نیشن ڈنمارک کا ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اس کا انتقال 13 اکتوبر 1919ء کو ہوا۔ کارل جیلرپ انیسویں صدی کے ان مصنفوں کی روایت میں پروان ہوا تھا جو عیسائیت سے منہ موڑ کر زندگی کے معنی کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ یقیناً وہ اعلیٰ آدرش رکھتا تھا۔ اپنے نظریات کے دفاع کے لیے بھی اس نے خاصا کچھ لکھا۔ الحاد پرستی کے دفاع میں اس کی تحریریں خاصے کی چیز ہیں لیکن اس کے بعد اس کی فکر میں تبدیلی ہوئی۔ وہ بدھ مت میں گہری دلچسپی لینے لگا اور متصوفانہ عیسائیت تک پہنچ گیا۔ اس کی بہت کم کتابوں کو دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا گیا جن میں ایک "ورلڈ وانڈررز" قابل ذکر ہے۔ کارل جیلرپ کا یہ بھی المیہ رہا کہ ڈنمارک کے باہر اسے بہت کم پڑھا گیا۔ ہم اردو داں اور غیر ملکی ادب سے انگریزی کے ذریعے متعارف ہونے والے قارئین اس کے کام سے تقریباً بے خبر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اسے نوبل انعام ملا لیکن وہ ادب و افکار کی دنیا میں کبھی بڑا حوالہ نہ بن سکا۔ مغرب کے بعض نقادوں نے جیلرپ کو "اپنی صدی کا بور ترین مصنف" قرار دیا تھا۔ آج اسے تقریباً فراموش کیا جا چکا ہے۔

1917ء---ہینرک پونٹوپیڈن!

1917ء میں ادب کا نوبل انعام جن دو مصنفوں کو دیا گیا اس میں ایک ہینرک پونٹوپیڈن تھا۔ وہ بھی ڈنمارک کا ہی ایک شہری تھا جو 24 جولائی 1857ء کو ڈنمارک میں پیدا ہوا اور 21 اگست 1943ء کو وفات پا گیا۔ وہ عقیدتاً آزاد خیال تھا۔ اپنے رفیق انعام یافتہ جیلرپ کی طرح تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ اس نے کسی بھی تعلیمی درس گاہ سے کوئی ڈگری حاصل نہ کی تاہم وہ ایک اسکول میں کچھ برس بطور استاد درس دیتا رہا۔

جیلرپ کے برعکس وہ ناول نگار تھا اور اپنے عہد کی حقیقتوں کو اپنے ناولوں میں سموتا رہا۔ اس کے سہ جلدی ناولوں کے سلسلے

(Trilogy) "دی پرومزڈ لینڈ" کو عالمی ادب میں ایک شہ کار تسلیم کیا جاتا ہے۔ 1896ء میں برطانیہ میں اس کا ترجمہ شائع ہوا تھا اور مترجم ایڈگر لوکاس تھا۔

پونٹوپیڈن نے زندگی کے حقائق اور ڈینش زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ وہ زبردست نثر نگار تھا۔ اس کی نثر نے ڈینش ادب پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اس کا شہ کار "ارض موعودہ" (دی پرومزڈ لینڈ) وہ ناول ہے جس میں ڈنمارک کی دیہی زندگی کو پہلی بار وسیع تناظر میں حقائق کے ساتھ پیش کیا گیا۔ آفاقی سطح پر یہ ناول دنیا کے ہر ملک کی دیہی زندگی کی بعض سچائیوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ پونٹوپیڈن صرف دیہات تک ہی محدود نہیں رہا۔ اصل میں وہ ڈینش زندگی کو پیش کرنے کا خواہاں تھا اور اس میں اسے خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اس کا ناول "لکی پیٹر" کوپن ہیگن کی شہری زندگی کا مرقع ہے۔ "کنگڈم آف دی ڈیڈ" پر قنوطیت اور یاسیت چھائی ہوئی ہے۔ یہ قنوطیت دراصل اس کی اپنی پیداوار نہیں بلکہ بیسویں صدی کے اوائل میں ڈنمارک میں جیسی زندگی تھی، اس کی ترجمانی کرتی ہے۔ یوں اس نے اپنے ان ناولوں کے حوالے سے ڈنمارک کے لوگوں کی زندگی کو اپنی تخلیقی گرفت میں لانے کی کوشش کی اور اس حوالے سے وہ عالمی ادب کا ایک اہم ترین مصنف تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے ناولوں کا خصوصی پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں مستقل اقدار کی تلاش کا تخلیقی اظہار ہوتا ہے۔

1918ء---ایرک ایکسل کر یفیڈٹ!

وہ ایک شاعر تھا اور اصول پرست!

جب 1918ء میں اسے ادب کے نوبل انعام کا حق دار قرار دیا گیا تو کریفیڈٹ نے یہ اعزاز اور انعام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نوبل انعام دینے والی سویڈش اکادمی کا ایک رکن تھا اور 1904ء سے اپنی وفات تک وہ اکادمی کے سیکرٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیتا رہا تھا۔ اس طرح اکادمی کے ساتھ اپنی وابستگی کی بنا پر اس نے یہ انعام وصول اور قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چونکہ وہ واقعی ایک عظیم شاعر تھا اور دنیائے ادب کے سب سے بڑے نوبل انعام کا استحقاق بھی رکھتا تھا اس لیے اس کی موت کے بعد 1931ء میں اسے بعد از مرگ اس انعام اور اعزاز کا حق دار قرار دیا گیا۔ یوں کریفیڈٹ وہ شاعر ہے جسے پہلی بار اپنی زندگی میں انعام داعزاز دیا گیا تو اس نے اسے قبول نہیں کیا لیکن اس کے شعری مرتبے کے پیش نظر بعد از مرگ اس اعزاز و انعام کا حق دار قرار دیا گیا۔

وہ 14 جولائی 1864ء کو سویڈن میں پیدا ہوا اور اس کی وفات 8 اپریل 1931ء میں ہوئی۔ اس نے اپسالا یونیورسٹی سویڈن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ اپنی زندگی میں ایک اسکول میں بھی پڑھاتا رہا اور ایک اخبار کا ایڈیٹر بن گیا۔ بعد میں رائل لائبریری اسٹاک ہوم کا لائبریرین بنا۔ اس کے بعد وہ 1904ء میں سویڈش اکادمی سے منسلک رہا اور اپنی وفات تک اکادمی کے سیکرٹری کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اس نے اپنی شاعری میں انسانوں کی اجتماعی زندگی کو اس طرح پیش کیا کہ انسان اپنے آپ کو اپنی تمام تر اچھائیوں اور خرابیوں کے ساتھ قبول کر سکیں۔ اس کا اسلوب شاندار تھا۔ اس کی شاعری میں نغمگی تھی اور انسانوں کے لیے گہری اور سچی اپنائیت۔

1919ء---کارل سپٹیلر

وہ ایک عظیم روایت سے جڑا ہوا ایک عظیم رزمیہ شاعر تھا۔ اس کا عظیم رزمیہ "اولمپین سپرنگ" اس کا وہ تخلیقی کارنامہ تھا جسے سراہتے ہوئے سپٹیلر کو نوبل انعام کا حق دار قرار دیا گیا۔ اکادمی کی طرف سے یہ رائے دی گئی کہ اس کا یہ عظیم رزمیہ ہومر کی شاعری اور گوئٹے کے فاؤسٹ کا ہم پلہ ہے۔

سپٹیلر 24 اپریل 1845ء کو سوئٹزرلینڈ میں پیدا ہوا۔ مذہباً وہ آزاد مشرب تھا۔ اس نے باسل یونیورسٹی سوئٹزرلینڈ سے دینیات میں ڈگری حاصل کی تھی۔ کچھ عرصہ وہ پرائیویٹ ٹیوٹر کی حیثیت سے سینٹ پیٹر برگ (روس) میں پڑھاتا رہا۔ اس کے بعد سوئٹزرلینڈ کے کئی اسکولوں میں تدریس کے فرائض انجام دیتا رہا۔ دو اخباروں میں اس نے رپورٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ سپٹیلر کا انتقال 28 دسمبر 1924ء کو ہوا۔

1920ء---نٹ ہمسن!

ناروے کے نٹ ہمسن کو اس کی ناول نگاری پر 1920ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ ہمسن اس اعتبار سے اردو پڑھنے والوں میں جانا پہچانا جاتا ہے کہ عزیز احمد نے اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور مخمور جالندھری نے اس کے ناول "دی ہنگر" کا ترجمہ بھوک کے نام سے کیا۔ عشرت رحمانی نے بھی اس ناول کا ترجمہ کیا ہے جو دراصل مخمور جالندھری کے ترجمے کا ہی چربہ لگتا ہے۔

نٹ ہمسن دنیائے ادب کی ایک دلچسپ شخصیت ہے۔ وہ 4 اگست 1859ء کو لوم' ناروے میں پیدا ہوا اور اس کا انتقال 19 فروری 1952ء کو ہوا۔ وہ مذہبی آدمی نہیں تھا۔ اس نے کالج کی سطح پر بھی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔

زندگی کے ابتدائی دور میں وہ آوارہ گرد رہا اور اپنے ملک سے باہر گھومتا رہا جس کا عکس اس کے مشہور ناول "بھوک" میں بھی ملتا ہے۔ بعد ازاں وہ کسان بن گیا۔ اس کے بعد اس نے تحریر و تصنیف کو ہی اپنا مستقل پیشہ بنالیا۔ اسے 1934ء میں گوئٹے میڈل بھی دیا گیا۔ اس نے میڈل تو قبول کر لیا لیکن انعام کے ساتھ جو رقم تھی اسے لینے سے انکار کر دیا۔

اس کی اہم تصانیف میں "بھوک" (1890ء)' وکٹوریہ اے لو سٹوری' ترجمہ اولیور سٹالی براس۔ دی روڈ لیوز اون (1934ء) شامل ہیں تاہم اس کا سب سے اہم ناول "گروتھ آف دی سوئل" ہے۔ بعض نقادوں نے اس کی تصانیف کے حوالے سے اسے "سیکنڈے نیوین روسو" کا لقب بھی دیا ہے۔

نٹ ہمسن فاشزم کا حمایتی تھا' اس لیے اس کی مخالفت بھی ہوئی۔ جب دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کی فوجوں نے ناروے پر قبضہ کر لیا تو ناروے کے عوام نے اس کے خلاف نفرت کا بھرپور اظہار کیا اور اس کی تصانیف کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا تاہم دوسرے ملکوں میں ہمسن کو ایک بڑے ناول نگار کی حیثیت سے پڑھا جاتا رہا اور اس کی تکریم میں بھی کوئی کمی نہ آئی۔ اس کی موت کے بیس برس بعد ناروے کے عوام نے اسے اپنا عظیم مصنف تسلیم کر کے' اس کا چھینا ہوا مقام اسے واپس دے دیا۔

1921ء---اناطول فرانس!

بھبھوتی بھوشن نے ایک ناول ہندی میں لکھا: "چترلیکھا"۔ اردو میں اس کا ترجمہ ہوا اور یہ کتاب ہندی اور اردو دونوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس ناول پر کیدار شرما جیسے عظیم ہدایت کار نے فلم بنائی جسے برصغیر کی فلموں میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ برسوں بعد جب کیدار شرما نے دوبارہ بلیک اینڈ وائٹ کے بجائے پھر رنگین چترلیکھا اپنے دور کے عظیم فنکاروں کے ساتھ بنائی تو فلم فلاپ ہو گئی۔ چترلیکھا---اناطول فرانس کے ناول "تائیس" سے ماخوذ تھی۔

اناطول فرانس کے کام کا ایک زمانے میں پوری دنیا میں ڈنکا بجتا تھا۔ اس کی کتابوں کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ فرانس میں اسے بڑی توقیر حاصل تھی لیکن اچانک اس کی شہرت دھندلانے لگی۔ اس کے کام پر کچھ ادبی لحاظ سے اور کچھ سیاسی وجوہ کی بنا پر تنقید ہونے لگی۔ اس کے نتیجے میں اب تک اسے دوبارہ وہ مقام نہیں مل سکا جس کا وہ اہل تھا بلکہ ادبی اصطلاح میں یہ کہنا چاہیے کہ اسے دوبارہ دریافت نہیں کیا جاسکا۔ ایک فرانسیسی نقاد نے ہی اس کے بارے میں لکھا ہے:

"وہ عظیم شہرت کے بعد یک دم زوال کا ایک دلچسپ معما بن کر رہ گیا"۔

اناطول فرانس 16 اپریل 1844ء کو پیرس میں پیدا ہوا اور اس کا انتقال 12 اکتوبر 1924ء کو ہوا۔ وہ اپنے آپ کو عقیدے کے اعتبار سے "کافر نو" کہتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں لائبریرین کی حیثیت سے ملازمت کی۔ فری لانسر کی حیثیت سے' مدتوں لکھتا رہا۔ 1888ء میں وہ "Le Temps" کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔ اس کی اہم ترین کتابیں مندرجہ ذیل ہیں: کرائم آف سیلوسٹر بونارڈ' تائیس (جس کا ترجمہ اردو میں مولوی عنایت اللہ دہلوی نے کیا) دی مدر آف پرل' دی ریڈ للی' دی وائٹ سٹون' دی ریوولٹ آف دی اینجلز' دی بلوم آف لائف' پینگوئن آئی لینڈ وغیرہ

وہ ایک فعال مصنف تھا۔ اس کا اسلوب بے حد منفرد اور مہذب تھا۔ اس کے دل میں انسانیت کے لیے بے پایاں محبت' خوبصورتی اور انسانی اقدار کی سربلندی کے جذبات تھے۔ اس نے پچاس برس سے زائد عرصے تک تحریر و تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کی پہلی کتاب 1868ء اور آخری کتاب 1922ء میں شائع ہوئی تھی۔

1922ء---جینیٹو بیناونٹی!

1922ء کا ادب کا نوبل انعام جینیٹو بیناونٹی کو دیا گیا جو ایک ہسپانوی مصنف تھا اور ایک ڈرامانگار کی حیثیت سے ممتاز مقام رکھتا ہے۔ وہ 12 اگست 1866ء کو میڈرڈ سپین میں پیدا ہوا۔ اس نے کسی کالج سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی۔ اپنی زندگی میں اس نے تھیٹر کے لیے کام کیا' ڈرامے لکھے اور ایک پرچے کا مدیر بھی رہا۔ 1923ء میں اسے گراں کروز ڈی الفانسو سیز دہم سپین کا اعلیٰ ایوارڈ بھی دیا گیا۔ وہ عظیم صلاحیتوں کا ڈرامانگار تھا۔ اس کے ڈرامے سپین کے علاوہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے اسٹیج پر بھی پیش ہوئے اور دوسری زبانوں میں بھی شائع کیے گئے۔ اس کے ڈراموں میں یہ ڈرامے بہت اہم ہیں: دی انٹروڈور' سیٹر ڈے نائٹ' بونڈز آف انٹرسٹ' دی لیڈی آف دی ہاؤس' بروٹ فورس اور دی پرنس ہو لرینڈ ایوری تھنگ آؤٹ آف بکس۔

1982ء میں سٹارکی والٹر نے اس کے فن پر جو کتاب جینیٹو بیناونٹی کے نام سے شائع کی' اس کے فن کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ بیناونٹی نے ہسپانوی ڈرامے کی روایت میں بیش بہا اضافے کیے تھے۔ ایک انشائیہ نگار اور ادبی نقاد کی حیثیت سے وہ ہسپانوی ادب میں معتبر مقام رکھتا ہے تاہم اسے دنیا میں ایک ڈرامانگار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس کے ڈراموں کا ایک ہی موضوع رہا: محبت۔ ڈراموں میں محبت کو مرکزی حیثیت کے حوالے سے انصاف اور صداقت تک رسائی کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔ وہ 14 جولائی 1954ء کو میڈرڈ میں فوت ہوا۔

1923ء---ولیم بٹلر ژیٹس

بیسویں صدی کے عظیم شاعروں میں سے ایک ولیم بٹلر ژیٹس کو 1923ء کا نوبل انعام دیا گیا۔

وہ آئرش تھا اور ڈبلن میں 13 جون 1865ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس کا انتقال کیپ مارٹن فرانس میں 28 جنوری 1939ء کو ہوا۔ وہ مذہبی آدمی نہیں تھا۔ کئی پرچوں کا مدیر اور اپنے تھیٹر ڈبلن سے بھی بطور ڈائرکٹر منسلک رہا۔ 1899ء میں اسے رائل اکیڈمی پرائز دیا گیا۔ 1915ء میں اسے برطانوی حکومت نے سر کا خطاب دیا لیکن ولیم بٹلر ژیٹس سچا آئرش تھا اس لیے اس نے یہ اعزاز اور خطاب لینے سے انکار کر دیا۔

اس کی کلیات آٹھ جلدوں میں 1908ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد بھی اس کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے۔

ژیٹس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ اردو میں اس پر کچھ کام ہوا ہے۔ مضامین لکھے گئے۔ حوالے موجود ہیں اور کچھ نظموں کا بھی ترجمہ ہوا ہے۔ اس کی شخصیت اور فن پر دنیا کے بڑے بڑے مصنفوں اور شاعروں نے لکھا ہے' تاہم 1966ء میں شائع ہونے والی بارنیز اور نوبل کی مشترکہ تصنیف "ڈبلیو۔ بی ژیٹس۔ مین اینڈ پوئٹ" بطور خاص قابل ذکر ہے۔

ژیٹس کی شاعری کا جوہر یہ ہے کہ شعریت کو سختی سے ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی شاعری کو عوام کی روح سے ہمکنار کرتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ بیسویں صدی کے اہم ترین شاعروں میں سے ایک ہے' ہر طرح کے مبالغے سے خالی دعویٰ ہے۔ اس نے آئرش فوک لور' فلسفے اور علامت کو اپنی شاعری اور ڈرامے میں پیش کیا۔ وہ اپنے عہد اور اپنے وطن کا اہم ترین نمائندہ تھا۔ اپنے وطن آئرلینڈ کے لیے اس نے سیاسی جدوجہد میں حصہ لیا۔ علم و فنون کی ترویج میں بھی اسے گہری دلچسپی رہتی تھی۔ اس کی شاعری انسانی جدوجہد اور زندگی کی خوبصورتی کا موثر ترین اظہار ہے اور اس کی روح آفاقی ہے۔ ژیٹس نے کہا تھا: میں اپنے خیال کو ایسی جگہ لے آیا ہوں جہاں وہ ایک آئینے میں منعکس ہو گئی ہے تاکہ آنے والا ہر دور کہہ سکے' اس کا جسم کتنا حسین تھا!

1924ء---ولادی سلاو ریموں

پولینڈ کا عظیم رزمیہ نگار ولادی سلاو ریموں 7 مئی 1867ء کو پولینڈ کے ایک قصبے میں پیدا ہوا۔ مذہباً وہ کیتھولک عیسائی تھا۔ اس نے کسی کالج سے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس نے شاعری کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ شادی بھی نہیں کی اور کوئی خاص

پیشہ بھی عملی زندگی کے لیے اختیار نہیں کیا۔ اس کی تصانیف میں کامیڈین ‘دی پیزنٹس’ دی پرومزڈ لینڈ وغیرہ اہم ہیں۔
ولادی سلاو ریموں عظیم رزمیہ نگار تھا۔ اس کا شاہکار رزمیہ دی پیزنٹس (The Peasants) ہے جو انگریزی میں چار جلدوں میں شائع ہوا۔
ریموں کو نوبل انعام کا حق دار اس کے عظیم قومی رزمئے "دی پیزنٹس" پر دیا گیا۔ یہ ایک طویل ترین نظم ہے جو پولش قوم کے بارے میں ہے۔ اس میں پولینڈ کا لینڈ اسکیپ اپنی تمام تر بوقلمونیوں اور خوبصورتیوں کے ساتھ ملتا ہے۔ پولینڈ کی دیہی زندگی کو پوری وسعت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ریموں کی ابتدائی دور کی تخلیقات نیچرل ازم سے متاثر تھیں لیکن بتدریج اس کی تخلیقات میں ریئلزم اور سمبولزم نے جگہ لے لی۔

1925ء---جارج برنارڈ شا!

1925ء کا نوبل ادب انعام عظیم ڈرامانگار جارج برنارڈ شا کو دیا گیا۔ شا ہمارے ہاں پوری طرح پڑھا گیا یا نہیں لیکن وہ برصغیر کا جانا پہچانا نام ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جب جی۔ بی شا کی وفات (2 نومبر 1950ء) ہوئی تو خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ان کی فاتحہ خوانی کی اپیل اپنے پیروکاروں اور پڑھنے والوں سے کی۔ اپنی ظرافت اور سیاسی بصیرت کے حوالے سے بھی جی۔ بی شا کو ہمارے ہاں خصوصی مقبولیت حاصل ہوئی۔
شا‘ جسے 1925ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا‘ اس کی پیدائش 26 جولائی 1826ء کو ڈبلن (آئرلینڈ) میں ہوئی۔ اسے اپنی آئرش قومیت پر ہمیشہ ناز رہا اگرچہ اس کا انتقال انگلستان میں ہوا۔ مذہبی عقائد کے اعتبار سے شا قدامت پسندی اور مذہبی بنیاد پرستی کا شدید مخالف تھا۔ وہ خداداد صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے کسی کالج وغیرہ سے اعلیٰ تعلیمی ڈگری حاصل نہیں کی۔
شا نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایڈیسن ٹیلی فون کمپنی لنڈن میں کلرک کی حیثیت سے کیا۔ ایک برس بعد اس نے نوکری چھوڑ دی اور اخبار "اسٹار" کے لیے ڈراموں اور موسیقی پر تنقید لکھنے لگا۔ وہ "اسٹار" کے ساتھ 1890ء تک وابستہ رہا۔ اس کے بعد "ورلڈ" سے منسلک ہو گیا۔ 1894ء میں ورلڈ کو چھوڑ کر وہ "سیٹرڈے ریویو" سے منسلک ہو گیا اور یہ سلسلہ 1898ء تک چلا۔ اس کے بعد شا نے کوئی ملازمت نہیں کی اور ساری عمر ڈرامے اور کتابیں تحریر کرتا رہا۔
اسے برطانوی حکومت نے آرڈر آف میرٹ کا ایوارڈ پیش کیا تھا جسے شا نے مسترد کر دیا۔
شا ایک زبردست طناز تھا۔ اپنے عہد کی بیشتر سربرآوردہ شخصیات سے اس کے تعلقات تھے اور ان سے نوک جھونک بھی رہتی تھی۔ شا کو ایک نیم گرو کی سی حیثیت بھی حاصل رہی ہے۔ اس کا یہ دعویٰ بھی رہا کہ وہ شیکسپئر سے بڑا ڈرامانگار ہے۔
دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کے اہم ڈراموں کا ترجمہ ہوا ہے اور یہ ڈرامے ملکوں ملک کھیلے جاتے رہے ہیں اور اب بھی اسٹیج پر پیش کیے جاتے ہیں جن میں "مسز وارن پروفیشن" پر خاصا ہنگامہ ہوا۔ "دی ڈاکٹرز ڈائیلما" پر انگلستان کے ڈاکٹر اس حد تک مشتعل ہوئے کہ یہ قرارداد تک منظور کر لی کہ شا کا کوئی ڈاکٹر علاج نہیں کرے گا۔
شا کی ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ اپنے ڈراموں کا مقدمہ بہت طویل لکھا کرتا تھا۔ اس کے کچھ ڈرامے ایسے بھی ہیں کہ جن کا مقدمہ ‘اس ڈرامے سے زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ شا کو اس لیے بھی دنیا کے اہم اور بڑے ڈرامانگاروں میں شامل کیا جاتا رہے گا کہ انسان اور انسانی علوم کے بارے میں اس کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ موسیقی ‘ڈرامے کا فن ‘فلسفی اور بیالوجی پر اس کا بہت گہرا مطالعہ تھا۔ ایک ڈرامانگار کی حیثیت سے اس کی شخصیت اور فن کے کئی پہلو قدرے دھندلے ہو گئے ہیں حالانکہ وہ جتنا بڑا ڈرامانگار تھا اتنا ہی بڑا موسیقی اور ڈرامے کا نقاد بھی تھا۔ اس کے مضامین بھی بہت بلند درجہ رکھتے ہیں۔ شا نے ناول بھی لکھے۔ اس فن میں اس کی ذہانت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ سوشلزم پر اس کا پختہ ایقان تھا۔ اس نے سیاسی تحریکوں کے ساتھ گہری اور عملی دلچسپی کا اظہار بھی کیا۔

گریزیا ڈیلیڈا 1871ء میں سارڈینیا (اٹلی) میں پیدا ہوئیں۔ اگرچہ پرائمری ہی میں ان کی تعلیم کا روایتی سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنا پہلا ناول "سانگو سارڈو" لکھنا شروع کیا اور 1895ء میں جب انہوں نے زندگی کی صرف بیس بہاریں دیکھی تھیں‘ ان کی مشہور زمانہ کہانیوں Sardinion Tales کا مجموعہ چھپ کر مارکیٹ میں آچکا تھا (اگلے صفحات پر آپ جو کہانی پڑھیں گے وہ ان کی کہانیوں کے اس اولین مجموعے میں شامل ہیں)۔ گریزیا ڈیلیڈا 1900ء میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں تو اپنے شوہر کے ساتھ

روم میں آبسیں مگران کی روح ہمیشہ سارڈینیا میں مقیم رہی۔ ان کے ناولوں اور کہانیوں سمیت اکثر تحریریں سارڈینیا کے ماحول میں لکھی گئی ہیں۔ ان کی تخلیقات کی زبان سادہ اور لب ولہجہ دیہات میں بسنے والے کسانوں سے مشابہہ ہے اور پڑھنے والوں کو ان میں دیہاتیوں کی سادگی، ان کی حقیقی معاشرت، عمومی اخلاقیات اور رسوم ورواج کی سچی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ گریزیا نے بے شمار کہانیاں اور تیس سے زائد ناول لکھے جن میں سے "ایلیاز پورتولو" کو آفاقی شہرت نصیب ہوئی۔ اسی ناول پر انہیں 1926ء میں ادب کے نوبل انعام کا حق دار گردانا گیا۔ گریزیا ڈیلیڈا 1936ء میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔

1927ء---ہنری لوئی برگساں

برگساں وہ فلسفی ہے جس کے فلسفے نے پوری دنیا کو متاثر کیا اور اس پر غور وفکر کے دریچے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ وہ 18 اکتوبر 1859ء کو پیرس (فرانس) میں پیدا ہوا۔ وہ یہودی تھا۔ اس نے فرانس کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی اور اسے کئی یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریوں سے بھی نوازا۔ 1881ء سے 1918ء تک وہ فرانس کی اعلیٰ یونیورسٹیوں میں پروفیسر کی حیثیت سے پڑھاتا رہا۔ 1940ء میں اسے نکولس مرے بٹلر گولڈ میڈل بھی دیا گیا۔

برگساں نے اندرونی اور وجدانی تجربے کو علم کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ علامہ اقبال کے قارئین جانتے ہیں کہ انہیں برگساں کے نظریات سے گہری دلچسپی تھی اور علامہ اقبال نے برگساں سے پیرس میں ملاقات بھی کی تھی۔

اپنی جوانی کے زمانے میں وہ خاصا مادہ پرست تھا۔ سپنسر کا مداح تھا لیکن بعد میں اس کے ذہن میں سوالوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ اس نے مادی میکانیت کو رد کر دیا اور دنیا کو بتایا کہ اگر ذہن بھی مادہ ہے اور ذہنی عمل بھی ایک میکانکی نتیجہ ہے تو پھر ضمیر کی کیا حیثیت ہے؟ وجدان کیا ہوتا ہے، برگساں تمام الفاظ کو علامتیں تسلیم کرنے سے بھی انکار کرتا ہے۔

برگساں کا سب سے عظیم کام "کریئیٹو ایوولیوشن" ہے۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اسے نوبل انعام اس کتاب کے حوالے سے دیا گیا، حالانکہ اسے یہ انعام اس کے جمالیات، حیاتیات اور فلسفے کے بارے میں نظریات وافکار پر دیا گیا۔

دنیا آج بھی اس کے نظریات پر غور کرتی ہے اور اس کے نظریات میں اتنی جان ہے کہ مدتوں اسے موضوع بنایا جاتا رہے گا۔

برگساں پر ہمارے ہاں کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی گئی لیکن برگساں وہ فلسفی ہے جس کا ہمارے ہاں تنقید وفن کے حوالے سے ہمیشہ ذکر ہوتا رہتا ہے۔ اس پر متعدد مقالے اردو میں لکھے گئے ہیں۔

1928ء---سیگرڈ انڈسیٹ

ڈنمارک میں 20 مئی 1882ء کو پیدا ہونے والی سیگرڈ انڈسیٹ نے بعد میں ناروے کی شہریت اختیار کر لی تھی۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی۔ 1912ء میں اس کی شادی ہوئی۔ کچھ عرصے تک وہ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتی رہی لیکن بعد میں اس نے اپنے آپ کو تخلیق وتصنیف کے لیے وقف کر دیا۔ سیگرڈ انڈسیٹ کا انتقال 10 جون 1949ء کو ناروے میں ہوا۔

وہ ایک عظیم ناول نگار تھی۔ "مادام ڈروتھیا" اور "گنارز ڈاٹر" اس کے دو ایسے ناول ہیں جن کا ترجمہ کئی یورپی اور مشرقی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔

سیگرڈ انڈسیٹ کا طرز احساس رومانوی تھا۔ اس کے بیشتر ناولوں کا زمانہ سکینڈے نیویا کا عہد وسطیٰ ہے۔ اس کے ابتدائی ناولوں کا موضوع ان جوان عورتوں کے مسائل تھے جن سے وہ مردوں کی دنیا میں دوچار ہوتی ہیں اور وہ اپنی زندگی کے معنی اور مقصد کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔ یہ ایک آفاقی موضوع ہے جس سے دنیا کے بیشتر ملکوں کی عورت ہمیشہ سے دوچار رہی ہے۔ ان ناولوں میں اس کا گہرا نفسیاتی مشاہدہ ملتا ہے۔ اس کے بعد اس نے تاریخی ناول لکھنے شروع کر دیئے اور اس کے تاریخی ناولوں کے حوالے سے ہی اسے نوبل انعام کا حق دار قرار دیا گیا، تاہم ایک موضوع ایسا تھا جسے وہ کبھی فراموش نہ کر سکی، جو ہمیں اس کے طویل اور ضخیم تاریخی ناولوں میں بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ وہ موضوع ہے: شہوانی زندگی میں عورت کا کردار!

1929ء---تھامس مان!

یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ 1929ء میں جب تھامس مان کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا تو اس کی زندگی کی بہت سی عظیم تخلیقات کو ابھی بعد میں معرض وجود میں آنا تھا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کا ناول "بڈن بروکس" جو 1901ء میں شائع ہوا' جس کے حوالے سے اسے ادب کا عظیم ترین انعام دیا گیا' اس وقت بھی ایک لافانی شہ کار تسلیم کیا گیا تھا۔ اب برسہا برس گزرنے کے بعد بھی اس کی عظمت کو سراہا جا رہا ہے اور اسے ایک عالمی کلاسیک کا درجہ حاصل ہو گیا ہے تاہم 1929ء میں جب اسے نوبل انعام دیا گیا تو اس کا سارا عظیم تخلیقی کام ابھی دنیا کے سامنے نہیں آیا تھا کیونکہ تھامس مان نے اس کے بعد بھی عظیم ناول تخلیق کیے۔ وہ 6 جون 1875ء کو جرمنی میں پیدا ہوا۔ اس نے کسی کالج سے تعلیمی سند حاصل نہیں کی اور تحریر و تصنیف کو ہی ساری عمر اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ جب 12 اگست 1955ء کو انتقال ہوا تو دنیا میں اسے عظیم خلاق ناول نگار اور انسان تسلیم کیا جا چکا تھا۔

وہ ان مصنفوں میں سے ایک ہے' جنھوں نے انسانی حقوق اور جمہوریت کے لیے جدوجہد کی اور نازی ازم کے خلاف ڈٹ گئے۔ نازی جرمنی سے اسے نکلنا پڑا اور اس کی کتابیں ہٹلر کے جرمنی میں نذر آتش کی گئیں۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اسے جرمنی چھوڑنا پڑا اور وہ امریکی شہری بن گیا۔

تھامس مان دنیا کے عظیم ترین ناول نگاروں میں سے ایک ہے۔ اس کے اہم ناول یہ ہیں: بڈن بروکس (1901ء)' ڈیتھ ان وینس (1912ء)' دی میجک مونٹین (1924ء)' جوزف اینڈ ہز بردرن (1933ء)' ڈاکٹر فاؤسٹس (1948ء)' کنفیشنز آف فلیکس کرل کانفیڈنس مین (1950ء)۔

"بڈن بروکس" عظیم ناولوں میں سے ایک ہے۔ اسے کلاسیک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ یہ ناول ایک جرمن خاندان کی چار نسلوں پر محیط ہے اور ان کے زوال کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس میں نطشے کے فلسفہ کو تخلیقی سطح پر برتا گیا ہے: انسانی صحت اور ارادے کی کشمکش۔

"ڈیتھ ان وینس" میں وہ زندگی اور فن کو اپنا موضوع بناتا ہے اور احساس جمال کی ایک نئی تعبیر پیش کرتا ہے۔ اس موضوع پر یہ ناول یکتا سمجھا جاتا ہے۔

"میجک مونٹین" میں ہمیں وہ بیمار یورپ کی جھلک دکھاتے ہوئے بیمار انسانیت کے ساتھ متعارف کراتا ہے' جسے پراسرار امراض نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ موسیقی' مان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اسے موسیقی سے بے حد شغف تھا۔ "ڈاکٹر فاؤسٹس" جسے عہد جدید کا پیچیدہ اور اہم ترین ناول تسلیم کیا گیا ہے' اس میں تھامس مان نے موسیقی کے ساتھ اپنی محبت اور دلچسپی کا زبردست تخلیقی ثبوت پیش کیا ہے۔ یہ ناول نازی جرمنی کی تصویر کشی کرتا ہے' اپنے عہد کے جبر کو سامنے لاتا ہے جب بنیادی اور دوامی انسانی قدروں کو جھٹلایا جاتا ہے۔

"جوزف اینڈ ہز بردرن" اس کا عظیم ساگا ہے جس میں وہ ہمیں ہزاروں برس پیچھے مصر میں لے جاتا ہے۔ حضرت یوسف اس ناول کا مرکزی کردار ہیں۔ تھامس مان نازی ازم کے خلاف قلم اٹھانے کی پاداش میں جلاوطن ہوا۔ نوبل انعام حاصل کرتے ہوئے اس نے اپنی تقریر میں کہا تھا:

"میں یہ انعام اپنے ملک اور اس کے عوام کے قدموں میں بھینٹ کرتا ہوں جنھوں نے اپنے آپ کو اپنے ملک کی روح کے لیے وقف کر دیا تھا"۔

تھامس مان بیسویں صدی کی برگزیدہ ادبی شخصیت تھا۔ عالمی ادب پر اس کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ اس نے بعض لازوال کہانیاں بھی لکھیں۔

1930ء---سنکلیر لیوس!

سنکلیر لیوس پہلا امریکی مصنف تھا جسے 1930ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ وہ 7 فروری 1885ء کو پیدا ہوا اور اس کا انتقال 10 جنوری 1951ء کو ہوا۔ اس نے ییل یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ عملی زندگی میں وہ کئی اخباروں کے ساتھ بطور رپورٹر

منسلک رہا اور ایک اشاعتی ادارے میں بطور ایڈیٹر بھی کام کیا۔ اسے 1926ء میں پلٹزر پرائز دیا گیا جسے اس نے مسترد کر دیا۔
اس کے ناولوں پر ڈرامے بھی اسٹیج ہوئے اور فلمیں بنائی گئیں۔ "مین سٹریٹ" اس کا اہم ترین ناول ہے جس میں اس نے امریکی سرمایہ داری کو بڑی سفاکی سے پیش کیا۔ اس نے ان سرمایہ دارانہ اقدار پر طنز کیا جو امریکی معاشرت اور زندگی میں جڑیں پکڑ چکی تھیں۔ سنکلیر لیوس جرأت مند مصنف تھا۔ اسے نوبل انعام ملنے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جدید بین الاقوامی ادب کی حیثیت کو تسلیم کیا گیا کیونکہ امریکہ کے حوالے سے وہ نئی سرمایہ دارانہ معاشرتی اقدار کو سامنے لایا تھا۔ سنکلیر لیوس کا ایک ناول سید عابد علی عابد نے "بشر ہے کیا کہئے" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ "مین سٹریٹ" کے بعد اس نے بہت کچھ لکھا لیکن اسے اگر کوئی ناول زندہ رکھ سکتا ہے تو یہی "مین سٹریٹ" ہے۔ اس کے باقی ناول فراموش کیے جا چکے ہیں اور امریکہ میں بھی وہ ایک ایسا مصنف بن چکا ہے جسے کم ہی یاد کیا اور پڑھا جاتا ہے!

1932ء---جان گالزوردی

پیدائش: 14 اگست 1867ء۔ بمقام: کنگسٹن ہل سرے انگلینڈ۔ وفات 31 جنوری 1933ء۔ قومیت: برطانوی۔ تعلیم: آکسفورڈ یونیورسٹی، بیچلر آف لا۔ خطاب: سر کا دیا گیا جسے اس نے لینے سے انکار کر دیا۔
گالزوردی شاعر بھی تھا، افسانہ نویس بھی اور ڈرامانگار بھی۔ اس کا ڈراما "جسٹس" کلاسیکی درجہ حاصل کر چکا ہے اور اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ گالزوردی مدتوں سے ہمارے انگریزی کے نصاب میں شامل ہے تاہم اس کا عظیم تخلیقی کارنامہ اس کا ناول "فور سائٹ ساگا" ہے۔ یہ ایک سہ جلدی (Trilogy) ناول ہے۔ اس سلسلے کا پہلا ناول دی مین آف پراپرٹی 1906ء میں شائع ہوا۔ اس میں اس نے فورسائٹ فیملی کے صاحب جائیداد بننے کی ہوس پر طنز سے آغاز کیا۔ اس سلسلے کا دوسرا ناول "ان چانسری" 1920ء اور تیسرا اختتامی ناول ٹولیٹ (Tolet) 1921ء میں شائع ہوا اور یوں یہ ساگا مکمل ہو گیا۔
اس کے اہم ترین ڈرامے "جسٹس" کے اثرات بہت گہرے، وسیع اور مثبت ہیں۔ انصاف کے برطانوی نظام پر یہ ڈراما ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر اس طرز انصاف کے خلاف ہے جس میں مجبور انسانوں کی مجبوریوں کو نظرانداز کر کے انہیں سزا دی جاتی ہے۔ یہ 1910ء میں اسٹیج ہوا۔ اسے دیکھ کر ونسٹن چرچل (جو اس وقت وزیر داخلہ تھا) اتنا متاثر ہوا کہ اس نے فی الفور جیل کے نظام کی اصلاحات کا کام شروع کر دیا۔ اس اعتبار سے یہ ڈراما اور اس کا مصنف تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

1933ء---آئیوان الیکسی وچ بنین!

بعض افراد اور مصنف ایسے ہیں جن کا ستارہ اور نام غربت میں چمکتا ہے۔ آئیوان بنین بھی ایسے ہی افراد میں سے ایک ہے۔ وہ 22 اکتوبر 1870ء کو روس میں پیدا ہوا۔ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور تحریر و تصنیف کو ہی اپنی مصروفیت بنایا۔ 1903ء میں اسے روس میں انقلاب سے پہلے پشکن پرائز سے نواز کر اس کی ادبی صلاحیتوں اور خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا۔
روسی انقلاب کے بعد بنین کو روس سے نکلنا پڑا اور وہ فرانس چلا آیا۔ یہیں 8 نومبر 1953ء کو اس کا انتقال ہوا اور یہیں اسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی جس کی بنیاد پر وہ ادب کے سب سے بڑے نوبل انعام کا مستحق بھی ٹھہرا۔ بنین کی تخلیقات میں سب سے زیادہ شہرت "دی جنٹل مین فرام سان فرانسسکو" کو حاصل ہوئی ہے۔ یہ ایک عظیم فن پارہ ہے۔ خوش قسمتی کی بات ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے ایک تاریخی قسم کے ناول "باطوفاں" کا بھی اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ وہ کلاسیکی روسی روایات کا امین تھا۔ نثر میں اسے کمال حاصل تھا۔ وہ انسانی تکبر کی بے وقعتی اور انسانی روح کی عظمت کا نقیب تھا۔

1934ء---لیوگی پیر آندیلو!

بعض نقاد اور عالمی ادب کے ان گنت قاری آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ پیر آندیلو بڑا ڈرامانگار تھا یا افسانہ نگار، تاہم اسے

1934ء کا نوبل انعام ایک عظیم ڈراما نگار کی حیثیت سے دیا گیا۔ اردو کے بے مثل افسانہ نگار غلام عباس لیوگی پیر آندیلو کو عظیم ڈراما نگار تو تسلیم کرتے تھے لیکن وہ زیادہ اسے عظیم ترین کہانی کار مانتے تھے۔

پیر آندیلو سسلی میں 28 جون 1867ء میں پیدا ہوا اور وفات 10 نومبر 1936ء کو روم میں ہوئی۔ وہ اطالوی تھا۔ اس نے بون یونیورسٹی سے 1891ء میں فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس نے کچھ سال پروفیسر کی حیثیت سے تدریس کا پیشہ بھی اپنایا۔ اس کی صلاحیتوں کا اظہار ڈرامے، افسانے کے علاوہ تنقید اور شاعری میں بھی ہوا۔

پیر آندیلو کا سب سے مشہور اور رسوا ڈراما "سکس کیریکٹران سرچ آف این آتھر" (چھ کردار ایک مصنف کی تلاش میں) ہے۔ اس ڈرامے پر بہت لے دے ہوئی اور اس پر فحاشی کا بے بنیاد الزام بھی عائد کیا گیا۔ آج یہ عالمی ڈرامے میں ایک کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ ستار طاہر نے اسے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ غلام عباس اور ستار طاہر نے اس کی کچھ کہانیوں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس کے ڈرامے یا افسانوں کے تراجم کو اردو میں کتابی صورت میں ابھی تک شائع ہونا نصیب نہیں ہوا۔

لیوگی پیر آندیلو نے اٹلی میں ڈرامے کو حیات نو بخشی لیکن اس کا اصل مقام یہ ہے کہ وہ ایک جدید عالمی ڈراما نگار ہے جو صرف اٹلی تک ہی مقید نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے ڈرامے میں ایسی تکنیک کاری اور موضوعات کا اضافہ کیا ہے کہ اس کا شمار بیسویں صدی کے ان عظیم ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے جن کے بعض ڈرامے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس نے عالمی ڈرامے میں نفسیاتی اور فلسفیانہ عناصر کو بھرپور انداز میں متعارف کرایا اور بے رحم اور سفاک سماجی حقیقتوں کو اپنے ڈراموں میں جرأت مندی کے ساتھ شامل کیا۔ اس نے عالمی افسانے کو بعض ایسے افسانے دیئے جو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

1936ء --- یوجین اونیل!

1936ء میں جب یوجین اونیل کو نوبل انعام دیا گیا تو وہ ایسے ڈرامے لکھ چکا تھا جنہوں نے اسے ایک عظیم ڈراما نگار کا مقام دلا دیا تھا تاہم اسے ابھی اپنا ایک عظیم ترین کھیل "اے لانگ ڈیز جرنی ان ٹو نائٹ" ابھی لکھنا تھا۔

یوجین اونیل کو نوبل انعام دے کر یہ ثابت کیا گیا کہ امریکی ڈراما اپنی ترقی کی انتہا پر پہنچ گیا ہے اور امریکہ میں ڈرامے نے جدید حساسیت کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ وہ 16 اکتوبر 1888ء کو نیویارک میں پیدا ہوا۔ اس کی وفات 27 نومبر 1953ء کو ہوئی۔ اس نے معمولی تعلیم حاصل کی اور کسی کالج کا منہ نہ دیکھا۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز محنت مشقت اور کلرکی سے کیا۔ پھر کچھ جرائد اور اخباروں کا رپورٹر رہا۔ اسے کئی اعزازات سے زندگی میں نوازا گیا جن میں پلٹزر پرائز 1920ء، پلٹزر پرائز 1922ء، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اور لیٹرز کا گولڈ میڈل 1923ء، پلٹزر پرائز 1928ء اور موت کے بعد 1957ء میں پلٹزر پرائز۔

یوجین اونیل پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تنقید، سوانح اور مضامین! اس نے ایک ایسی زندگی گزاری تھی اور ایک ایسے خاندان میں پرورش پائی تھی جو خود ایک بڑے المیے کا موضوع بنتا ہے۔ اپنی زندگی میں اس نے اپنے ڈراموں سے بے پناہ شہرت اور دولت حاصل کی۔ امریکہ کا سب سے بڑا ادبی اعزاز اور انعام پلٹزر پرائز اپنی زندگی میں تین بار حاصل کیا اور موت کے بعد بھی اسے اس اعزاز و انعام کا مستحق تسلیم کیا گیا۔

یوجین اونیل کی زندگی کو سمجھنے کے لیے خود اس کے ڈرامے کا نام ہی کافی ہے جس پر اسے اس کی موت کے بعد انعام و اعزاز کا خصوصی حق دار سمجھا گیا وہ ہے اس کا ڈراما "ایک طویل دن کا سفر رات میں"۔

یہ کھیل اس نے اپنی زندگی میں مکمل کیا اور وصیت کی کہ اسے اس کی زندگی میں نہ تو شائع کیا جائے اور نہ ہی اسے اسٹیج پر کھیلا جائے۔ یہ کھیل 1955ء میں اس کی وفات کے بعد شائع ہوا اور 57-1956ء میں اسے براڈوے اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ یہ اس عظیم مصنف کی حیات اور اس کے درد و کرب پر مشتمل ہے جو ایک طرح سے اس کی آپ بیتی ہے۔

1937ء --- روجر مارٹن ڈوگارڈ!

1937ء کا نوبل انعام فرانس کے ناول نگار اور ڈرامانویس ڈوگارڈ کو دیا گیا۔ بالزاک نے ایک ناول نگار کی حیثیت سے ایک بہت بڑا منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے کے تحت اس نے ہیومن کامیڈی کے سلسلے کے ناول لکھے۔

روجر مارٹن ڈوگارڈ نے اس تجربے کو اپنے انداز میں برتا۔ اس نے ناولوں کا ایک سلسلہ مکمل کیا جس کا نام Les Thibault ہے۔ یہ آٹھ ناولوں پر مشتمل ہے۔ ان ناولوں میں ڈوگارڈ نے فنکارانہ صلاحیت اور صداقت کے ساتھ انسانی زندگی کے تضادات اور تضادات کو اپنے عہد کی تصویر کشی کے ساتھ پیش کیا۔ ان ناولوں کا اسٹائل وہی ہے جس کی بدولت فرانس کے ناول نگاروں کو عالمی شہرت اور مقبولیت حاصل ہے۔ یہ وہ اسلوب ہے جس میں کردار نگاری پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور مصنف کہانی کی دلچسپی برقرار رکھتا ہوا اسے انجام تک پہنچاتا ہے۔

اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے ایک بڑے اور سچے ناول نگار کی حیثیت سے انسانی فطرت اور اس کی نفسیات کو بھرپور اور تفصیلی مشاہدے کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے ناولوں کو حقیقت پسند اور نفسیاتی مطالعہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے ان ناولوں میں ان مصائب کو پیش کیا گیا ہے جو انسانی ہیں اور انسانی امراض کی علامت، دکھ اور درد اور موت کے حوالے سے جنم لیتے ہیں۔ اس زندگی میں انسان کو جس بدی سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جس طرح وہ شر کا شکار ہو کر اپنے عقیدے کو مسخ کرتا یا توڑتا پھوڑتا ہے، اس کا احوال بھی موجود ہے جو ایک جدید عنصر ہے اور جس نے اس کے ناولوں کو خاص اہمیت عطا کی ہے۔ مارٹن ڈوگارڈ 22 مارچ 1881ء کو فرانس میں پیدا ہوا۔ اس کا انتقال 22 اگست 1958ء کو ہوا تھا۔

1938ء---پرل ایس بک!

پرل ایس بک نے اپنی زندگی کا ایک حصہ چین میں گزارا تھا...اس چین میں جو ابھی عظیم اشتراکی انقلاب سے دوچار نہ ہوا تھا۔ پرل بک نے چین میں اپنے قیام کے مشاہدات سے پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ امریکی شہری تھی، 26 جون 1892ء میں امریکہ میں پیدا ہوئی۔ اس کا انتقال 6 مارچ 1973ء کو ہوا۔ اس نے امریکہ کی بعض اہم درس گاہوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، دو شادیاں کیں اور 1921ء سے 1931ء تک وہ شا کنگ یونیورسٹی چین میں پڑھاتی رہی۔ اسے اپنی زندگی میں کئی انعام اور اعزاز ملے۔

پرل بک پر ایک زمانے میں بہت لکھا گیا، اس کا شہرہ بھی رہا لیکن کچھ عرصے سے اس کے کام اور نام پر دھند چھا رہی ہے۔ پرل کو اس کے جس ناول پر بہت شہرت ملی وہ "گڈ ارتھ" ہے۔ یہ چینی کسان کی زندگی کی سچی تصویر تھی جو چینی انقلاب سے پہلے مصائب و آلام کا نشانہ بنا رہتا تھا۔ اس ناول پر ایک شاہکار فلم بھی بنی جس کی وجہ سے پرل بک اور اس کے ناول کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد پرل بک نے جتنے ناول لکھے اس میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے "گڈ ارتھ" کا ہم پلہ قرار دیا جا سکے۔ ذیل کا افسانہ بھی چینی زندگی کے حوالے سے پرل ایس بک کے گہرے مشاہدے کا ایک سچا عکس ہے۔

1939ء---فرانز سیلانپا!

فن لینڈ کے اس ناول نگار اور کہانی نویس کو 1939ء کا نوبل انعام دیا گیا۔ سیلانپا 16 ستمبر 1888ء کو فن لینڈ کے ایک قصبے میں پیدا ہوا۔ اس نے کسی کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ اسے اس کی زندگی میں کئی ایوارڈز اور اعزاز دیے گئے جن میں فنش سٹیٹ پنشن 1919ء ایلیکسز کیوسی پرائز 1937ء کورڈیلن فاؤنڈیشن پرائز 1938ء اور فرنکل فاؤنڈیشن پرائز 1938ء شامل ہیں۔ اس کے ناولوں میں یہ ناول اہم ہیں جن کے انگریزی میں بھی تراجم ہو چکے ہیں: میک ہیری میج (1930ء)، دی میڈ سلیجا (1931ء)، پیپل ان اے سمر نائٹ (1934ء)۔

سیلانپا نے اپنے وطن کے عوام اور فطرت کو خاص طور پر اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ انسان اور کائنات کے رشتے کو بھی اس نے پیش کیا۔ اس نے عوام اور عوام کی جدوجہد جو وہ زندہ رہنے کے لیے کرتے ہیں، اپنے ناولوں میں پیش کی۔ اس کے ہاں انسانی زندگی کے بارے میں ایک مثبت اور رجائی فلسفہ ملتا ہے۔ اگرچہ اسے دنیا میں کم پڑھا گیا ہے اور اب تو اسے تقریباً بیرونی ملکوں میں فراموش کیا جا چکا ہے، تاہم سویڈن اور فن لینڈ میں وہ اپنی زندگی میں بھی بہت مقبول تھا اور اب بھی اسے ان ممالک میں کلاسیکی مصنف کی حیثیت سے پڑھا جاتا ہے۔ اس کا انتقال 3 جون 1964ء کو ہیل سنکی (فن لینڈ) میں ہوا۔

1944ء---جوہانیز جنیسن!

ڈنمارک کے جوہانیز جنیسن کو 1944ء کا ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ ایک بڑا خلاق شاعر، تاریخی رزمیہ نگار، مترجم اور انشاپرداز ہونے کے علاوہ وہ ڈارون کے نظریات کا موید اور پرچارک بھی تھا۔ وہ 20 جنوری 1873ء کو ڈنمارک میں پیدا ہوا۔ اس نے کوپن ہیگن یونیورسٹی سے 1896ء میں ایم۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کی اہم ترین تصانیف یہ ہیں جن کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے:
ہمر لینڈ سٹوریز (1898۔1910ء)، مادام ڈی اورا (1904ء)، دی وہیل (1905ء)، دی لانگ جرنی (1908ء)۔
وہ بے پناہ شعری قوت متخیلہ کا مالک تھا اور جرأت مند بھی۔ اس نے ایک نیا اور تازہ شعری اور نثری اسلوب تخلیق کیا۔ اپنے رزمیہ تاریخی ناولوں کی وجہ سے بھی اسے بہت شہرت ملی۔ اسے آج بہت کم پڑھا جاتا ہے۔ اس کا انتقال 25 نومبر 1950ء کو ہوا۔

1945ء---گیبریلا مسترال!

1945ء میں چلی کی اس شاعرہ کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ وہ ویکونا چلی میں 17 اپریل 1889ء میں پیدا ہوئی اور اس کا انتقال 10 جنوری 1957ء کو نیویارک میں ہوا۔ اس نے چلی کے اساتذہ کے ٹریننگ کالج سے تعلیم حاصل کی اور 1911ء سے 1920ء تک تعلیمی اداروں میں استاد اور منتظم کی حیثیت سے کام کیا۔ 1922ء سے 1924ء تک وزارت تعلیم میکسیکو میں بطور مشیر اس نے کام کیا۔ اس نے کچھ عرصے تک سفارت کار کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیے۔ اس کی زندگی میں اسے کئی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا جن میں لارل ر۔تھم اینڈ گولڈ کراؤن رائٹرز سوسائٹی سانتیاگو کا 1914ء کا ایوارڈ بھی شامل ہے۔
گیبریلا مسترال عظیم شاعرہ تھی۔ اس نے پورے لاطینی امریکہ کے عوام کی امنگوں اور جذبات کی تخلیقی سطح پر نمائندگی کی۔ اسے لاطینی امریکہ کی آواز سمجھا جاتا تھا۔ اس کے محبوب نے خودکشی کی تو اس کی شاعری میں ایک نئی شدت اور جذباتی کیفیت پیدا ہوئی۔ گیبریلا مسترال کو بچوں سے بے حد محبت تھی۔ بچوں کے لیے اس نے جو نظمیں لکھیں، وہ پوری دنیا میں مقبول ہوئیں۔ اس حوالے سے آج اس کا شعری مرتبہ مستحکم ہے۔ اس نے سفارت کار اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی اہم خدمات انجام دیں۔

1946ء--- ہرمن ہیسے!

ہرمن ہیسے بڑا لکھنے والا تھا، منفرد مصنف تھا تاہم اسے امریکیوں نے چھٹی دہائی میں اس طرح سے دوبارہ دریافت کیا کہ اس کا نام پوری دنیا میں پھیل گیا اور ہیسے ایک کریز بن گیا۔ اس کی سماجی، معاشرتی اور اقتصادی وجوہ تھیں۔ مادہ پرست سرمایہ دارانہ نظام کی پروردہ نئی نسل کے لیے ہرمن ہیسے گویا ایک مداوا بن کر سامنے آیا۔
ہرمن ہیسے 2 جولائی 1877ء کو کلا (جرمنی) میں پیدا ہوا۔ اس کا انتقال 9 اگست 1962ء کو سوئٹزرلینڈ میں ہوا۔ وہ جرمن تھا بعد میں اس نے سوئٹزرلینڈ کی شہریت اختیار کی۔ اس نے کسی کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کی۔ عملی زندگی میں اس نے ایک کلاک فیکٹری میں کام کیا۔ بک سیلر بھی رہا۔
اسے اپنی زندگی میں کئی اعلیٰ ادبی انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا جن میں بائیر نفیلڈ پرائز دی آنا (1904ء) فونٹین پرائز (1920ء) جسے اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ گوئٹے پرائز فرینکفرٹ (1946ء)، راب پرائز برنویک جرمنی (1950ء)، جرمن بک ٹریڈ پیس پرائز (1955ء)، نائٹ آف دی آرڈر پورلا میریٹ جرمنی (1955ء)
اس کی کتابوں کے تراجم انگریزی میں 1960ء کے بعد ہوئے۔ ہرمن ہیسے کے کئی ناولوں بطور خاص "سدھارتا" پر فلمیں بنائی گئیں۔ اردو میں سدھارتا کا ترجمہ آصف فرخی نے کیا۔ ہرمن ہیسے ان مصنفوں میں سے ہے جنھوں نے انسان کی متجسس اور متلاشی روح کو موضوع بنایا ہے اور وہ نئی نئی انوکھی سرزمینوں کو بھی پس منظر کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کا اسلوب بے حد شاندار تھا۔ وہ کلاسیکی انسانیت دوست مصنفوں کی روایت میں ایک عظیم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ آج کی دنیا میں جو انتشار اور

روحانی بحران ہے' اس میں رہنے والے انسان کی ترجمانی کرتا ہے اور اپنے عصر کی روح کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتے ہوئے وہ ابدی صداقتوں کے سراغ کی نشاندہی کرتا ہے۔

1947ء--- آندرے ژید!

1947ء میں فرانسیسی مصنف آندرے ژید کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ آندرے ژید 22 نومبر 1869ء کو فرانس میں پیدا ہوا۔ عقیدے کے اعتبار سے وہ پروٹسٹنٹ تھا۔ اس نے فرانس کے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی۔ 1895ء میں شادی کی۔ 1908ء میں اس نے فرانسیسی زبان میں ایک جریدہ نکالا جس کے بانی اور ایڈیٹر کی حیثیت سے وہ اس کے ساتھ 1941ء تک وابستہ رہا۔ اس کا پہلا ناول "دی امورلسٹ" 1902ء میں شائع ہوا اور ایک متنازعہ ناول کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ اس ناول کے حوالے سے آندرے ژید کی عالمی شہرت کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد اس کے کئی ناول اور تصانیف منظر عام پر آئیں۔

آندرے ژید پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ ان مصنفوں میں سے ایک ہے جو ہمیشہ موضوع بحث رہے ہیں۔ اس کی تصانیف کی تعداد 50 سے زائد ہے جن میں ناول' ڈرامے' نظمیں' ترجمے' تنقید اور سفرنامے شامل ہیں۔ اس کی اہم ترین تصانیف میں اس کے "جرنلز" کو بڑا مقام حاصل ہے۔ اسے نوبل انعام اس کی ایک کتاب پر نہیں بلکہ اس کی مجموعی تخلیقات پر دیا گیا۔ اس کی تحریروں میں ایجاز واختصار اور ایمائیت ہے۔ اس نے انسانی زندگی اور انسان کے مسائل کو بڑی جرأت مندی اور صداقت اور گہری نفسیاتی بصیرت کے ساتھ اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ فرانسیسی ادب اور بیسویں صدی کے ادب پر آندرے ژید کے گہرے اثرات واضح ہیں۔ وہ اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے سماجی اور اخلاقی قدامت پسندی کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہ ذاتی دیانت داری اور فرد کی اہمیت پر بہت اصرار کرتا تھا۔

آندرے ژید کا انتقال 19 فروری 1951ء میں ہوا۔

1948ء---ٹی ایس ایلیٹ

انگریزی شاعر' ڈرامانگار اور نقاد ٹی ایس ایلیٹ کو 1948ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ وہ 26 ستمبر 1885ء کو پیدا ہوا اور اس کا انتقال 4 جنوری 1965ء کو ہوا۔ شہریت کے لحاظ سے وہ امریکی تھا۔ اس نے ہارورڈ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ پھر برطانیہ چلا گیا جہاں اس نے ساری عمر بتادی۔ اسے نوبل انعام کے علاوہ کئی دیگر انعامات واعزازات سے بھی نوازا گیا: آرڈر آف میرٹ 1948ء' فرینچ لیجن آف آنر 1948ء' گوئٹے پرائز 1954ء' ڈانٹے میڈل 1959ء' جرمن آرڈر آف میرٹ 1959ء' یونائیٹڈ سٹیٹس میڈل آف فریڈم 1964ء۔

ٹی ایس ایلیٹ کی تصانیف میں ویسٹ لینڈ' ایش وینز ڈے' مرڈر ان دی کیتھڈرل (ڈراما)' فور کوارٹٹس اور کاک ٹیل پارٹی (ڈراما) وغیرہ شامل ہیں۔

تنقید پر بھی اس کی کئی کتابیں موجود ہیں۔ اس کی شاعری اور تنقید نے بیسویں صدی کے ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ویسٹ لینڈ (WasteLand) کا شمار بیسویں صدی کی عظیم نظم کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ جدید شاعری میں ٹی ایس ایلیٹ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ ساری عمر انفرادیت پسندی کا قائل رہا۔ اس نے شاعری کو نئی جہات سے آشنا کیا۔ اس کی ابتدائی دور کی شاعری میں ایک خاص طرح کی قنوطیت ملتی ہے لیکن بعد کے دور میں اس نے مذہب کو اہمیت دی اور کلچر' سیاست اور مذہب کے حوالے سے انسانی رشتوں کی تفہیم کی۔ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی عالمی ادب پر اس کے اثرات واضح ہیں۔

1949ء---ولیم فاکنر

1949ء میں جب ولیم فاکنر کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا تو اس وقت اس کی بیشتر تصانیف آؤٹ آف پرنٹ تھیں۔ اس کے باوجود وہ سنجیدہ طبقے میں بہت پسند کیا جاتا تھا اور سارتر تک اس کے مداح تھے۔ وہ نیوالبنی (جنوبی امریکہ) میں 25 ستمبر 1897ء کو پیدا

ہوا۔ اس نے کسی کالج سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی۔ اپنی عملی زندگی میں نیشنل بک اسٹور میں کلرکی کرتا رہا۔ رائل فورس میں بھی رہا۔ پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ پاور کمپنی میں بھی ملازمت کی۔ اس نے نوبل انعام کے علاوہ دیگر بے شمار اعزازات و انعامات بھی حاصل کیے۔

فاکنر ایک صاحب طرز اور منفرد ناول نگار تھا۔ اس نے کہانیاں اور ڈرامے بھی لکھے۔ امریکہ میں جنوب اور شمال میں جو اختلافات رہے اور جو حبشیوں اور امریکی خانہ جنگی کے حوالے سے امریکی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں' فاکنر نے ان اختلافات کو مخصوص انداز میں اپنے فکشن میں پیش کیا۔ وہ ایک بے رحم لکھاری تھا۔

امریکہ میں جدید ناول کے بانیوں میں ایک فاکنر ہے۔ اس کے ہاں جو نفسیاتی بصیرت ملتی ہے' اس کی مثال بیسویں صدی کا ناول پیش کرنے سے قاصر ہے۔ گستاف ہیلسٹروم نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ انسانی نفسیات کی گہرائی تک جانے میں' امریکہ اور یورپ کا کوئی ناول نگار فاکنر کے ہم پلہ نہیں۔ وہ سب سے عظیم ہے۔

فاکنر کا انتقال 6 جولائی 1962ء کو ہوا۔ اس کے کئی ناولوں پر فلمیں بھی بنیں۔

1950ء---برٹرینڈ رسل

بیسویں صدی کی ایک اہم مگر متنازعہ شخصیت' لارڈ برٹرینڈ رسل ہے جسے 1950ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ رسل ایک طبیعات دان' فلسفی' افسانہ نگار' سماجی اور سیاسی شخصیت کی حیثیت سے بیسویں صدی پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی بے باکی اور جرات مندی نے اسے قید و بند سے بھی دوچار کیا لیکن اس نے سیاسی امور میں اپنی آواز بلند رکھی اور جدوجہد کو آخری عمر تک جاری رکھا۔ وہ 18 مئی 1872ء میں ویلز (برطانیہ) میں پیدا ہوا۔ وہ انگلستان کے طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ لارڈ تھا' مذہباً لاادریت کا قائل۔ اس نے کیمبرج یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں پڑھاتا بھی رہا۔ اس کے علاوہ نیشنل یونیورسٹی آف پیکنگ چین' یونیورسٹی آف کیلی فورنیا اور کئی دوسرے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے بطور پروفیسر منسلک رہا۔

برٹرینڈ رسل نے عالمی سیاسی صورت حال کے حوالے سے بھی ترقی پسند جدوجہد میں حصہ لیا اور ایک اہم شخصیت کی حیثیت سے سامنے آیا۔ ویت نام کے جنگی جرائم اور امریکی سامراج کے خلاف اس نے موثر آواز اٹھائی۔ پیرانہ سالی کے باوجود وہ اپنی عمر کے آخری ایام تک جدوجہد میں شریک رہا اور نوجوانوں کے محبوب رہنما کی حیثیت سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ رسل نے انسانیت کی سربلندی اور آزادی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔ اس کی تحریریں بھی انہی اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ بطور ریاضی دان بھی پوری دنیا پر اس کے اثرات موجود ہیں۔ فلسفی اور مورخ کی حیثیت سے بھی اس کا مقام بہت بلند ہے۔ سیاست اور تعلیم کے شعبوں میں بھی رسل بے حد نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بہت جری انسان تھا۔ اپنی تحریروں میں بھی اس نے صداقت کو سربلند کیا۔ اس کی آواز توانا تھی اور ساری دنیا میں سنی جاتی تھی۔ رسل کے نزدیک تین اہم مقاصد تھے جس کے لیے ساری عمر جدوجہد کی:

محبت' علم کی تلاش اور مصیبت زدہ انسانیت کے لیے ہمدردی۔

1951ء---پئر فےبیان لیگر کیوسٹ

1951ء کے ادب کا نوبل انعام سویڈن کے ناول نویس اور ڈراما نگار لیگر کیوسٹ کو دیا گیا۔ وہ 23 مئی 1891ء کو واکسجو (سویڈن) میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے والدین پروٹسٹنٹ عقیدے کے عیسائی تھے لیکن لیگر کیوسٹ ملحد تھا۔ اس نے ابتدائی اور معمولی تعلیم حاصل کی' کسی کالج سے کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکا۔ اس نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کیں۔ اپنی ساری زندگی اس نے تصنیف و تخلیق کے سوا کوئی دوسرا کام نہ کیا۔ نوبل انعام و اعزاز کے علاوہ اسے زندگی میں کئی دوسرے انعامات و اعزازات بھی ملے۔ لیگر کیوسٹ کا انتقال 11 جولائی 1974ء کو اسٹاک ہوم سویڈن میں ہوا۔

جب انتقال ہوا تو وہ عالمگیر شہرت حاصل کر چکا تھا۔ ایک بڑے ناول نگار اور مصنف کی حیثیت سے اسے یہ خصوصیت حاصل تھی کہ اس کا ذہن آزاد تھا۔ اس کی تحریروں میں بغاوت ملتی ہے۔ وہ رسمی مذہب و رواج کے خلاف ہے۔ پھر وہ ایسے موضوعات کو

پیش کرنے لگا جن میں قنوطیت تھی۔ وہ انسان کی سفاکی کو بہت اہمیت دینے لگا۔ اس کے علاوہ وہ انسان کو اس کائنات میں یکا و تنہا اور تنہائی کا شکار سمجھتا رہا۔ وہ محبت اور امید کو بھی بے ثمر سمجھتا تھا لیکن بعد میں اس کے ہاں اعتدال پیدا ہوا۔ اس دور میں اس نے ایسے کردار تخلیق کیے جو بے ایقان تھے۔ یوں تو لیگر کیوسٹ نے کئی شاہکار ناول اور ڈرامے لکھے لیکن "دی براباّ" لیگر کیوسٹ کا معرکہ آرا ناول ہے۔ اس پر ایک زبردست فلم بھی بنی تھی جس میں انتھونی کوئین نے لازوال پرفارمنس دی تھی۔

"براباّ" ایک ایسا کردار ہے جو انجیل مقدس اور حضرت عیسیٰ کی زندگی کے حوالے سے ایک علامت بن چکا ہے۔ یہ وہ ڈاکو اور قاتل ہے جس کی رہائی کاہنوں کی وجہ سے ہوتی ہے کہ اس کی جگہ مسیح کو مصلوب کر دیا جائے۔

براباّ.....انسان کی تلاش کی کہانی ہے۔ رہائی پانے کے بعد براباّ اس آدمی کے بارے میں جاننا چاہتا ہے جس کو اس کی جگہ مصلوب کیا گیا۔ یوں وہ دراصل اپنی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم ناول ہے جو لیگر کیوسٹ کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

1952ء---فرانسوا مارئیس

فرانس کے مصنف فرانسوا مارئیس کو 1952ء کا نوبل انعام برائے ادب دیا گیا۔ وہ 11 اکتوبر 1885ء کو پیدا ہوا۔ اس کا انتقال یکم ستمبر 1970ء کو پیرس میں ہوا۔ مارئیس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہ عقیدے کے اعتبار سے کیتھولک تھا۔ اسے 1926ء میں فرانسیسی اکیڈمی کا گرینڈ پرکس رومن ایوارڈ دیا گیا۔ مارئیس نے اپنی زندگی تخلیق و تصنیف کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ ایک ہمہ وقتی مصنف تھا۔

مارئیس پر خاصا لکھا گیا ہے جس میں جینکز سیسل کی کتاب "مارئیس" جو 1965ء میں لندن سے شائع ہوئی ایک اہم کتاب ہے۔ وہ ایک بڑا ناول نگار تھا جو اپنے ناولوں میں زندگی کے ڈرامے کو پوری ڈرامائی شدت اور روحانی بصیرت کے ساتھ پیش کرتا تھا۔ اگرچہ اس کی شہرت کی بڑی وجہ اس کے ناول ہیں، تاہم وہ ایک صحافی، ڈرامانگار اور شاعر بھی تھا۔ اس کے ناولوں میں خیر و شر اور جسم اور روح کی کشمکش پوری ڈرامائی شدت سے ملتی ہے۔ اس کی مذہبی تربیت کے اثرات اس پر ساری عمر موجود رہے اور اس کے ہاں جو روحانی اور مذہبی پہلو ناولوں میں پایا جاتا ہے، اس میں اس کی اپنی زندگی کی روداد اور تجربات بھی شامل ہیں۔ اسے اس حوالے سے بھی شناخت ملی کہ وہ ایک کیتھولک ناول نگار ہے۔ ناولوں کے علاوہ اس نے اپنی شاعری کے چار اور کہانیوں کے دو مجموعے اور چار ڈرامے بھی شائع کیے۔ مارئیس ایک نقاد بھی تھا۔ اس کے تنقیدی مضامین کے مجموعے بھی شائع ہوئے۔ مارئیس کی تحریروں کا اہم پہلو اس کی سوانح نگاری ہے۔ ڈی گال پر اس کی سوانح عمری 1964ء میں شائع ہوئی۔ فرانسیسی المیہ نگار راسین کی سوانح عمری کو بھی خاص شہرت نصیب ہوئی۔

1953ء--- سرونسٹن چرچل

30 نومبر 1874ء کو پیدا ہونے والے چرچل نے ایک بھرپور زندگی بسر کی اور عالمی مدبروں میں ان کا شمار ہوا۔ سیاست، ادب، سوانح، فوجی زندگی، مصوری اور اعلیٰ سرکاری عہدے، وزارت عظمیٰ۔ چرچل کو ان کی زندگی ہی میں ایک لیجنڈ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ 24 جنوری 1965ء کو جب چرچل کا انتقال ہوا تو وہ بقائے دوام کے دربار کا ایک فرد بن چکے تھے۔

چرچل انگلستان کی اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے خاندان کی تاریخ بہت شاندار تھی۔ اس خاندان نے بڑے بڑے لوگوں کو جنم دیا تھا۔ چرچل نے رائل ملٹری کالج سے تعلیم حاصل کی۔ فوج میں ملازمت کی۔ بلوچستان میں ان کی تقرری رہی۔ فوج میں کئی اہم عہدوں پر فائز رہے اور پھر 1898ء سے 1955ء تک کئی اہم عہدوں پر متمکن ہوئے۔ دوبارہ وہ برطانیہ عظمیٰ کے وزیراعظم بھی رہے۔

چرچل کو ادب کا نوبل انعام ان وجوہ کی بنا پر دیا گیا: تاریخ اور سوانح عمری میں کمال، اور انسانی اقدار کی حمایت کرتی ہوئی زبردست نثر۔

چرچل ایک قومی ہیرو، ایک سیاست دان، ایک بین الاقوامی شخصیت تھے۔ اپنی ان حیثیتوں سے بھی انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے

گا۔ دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کے وزیر اعظم کی حیثیت سے ان کی مدبرانہ رہنمائی نے انہیں تاریخ عالم میں ایک مستقل جگہ دلوا دی ہے۔ اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود چرچل نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھی بھرپور اظہار کیا۔ وہ ایک اچھے مصور بھی تھے' لیکن ایک مورخ' ایک سوانح نگار کی حیثیت سے انہوں نے جو کتابیں لکھیں' وہ انسانی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش حصہ بن گئی ہیں۔

1954ء---ارنسٹ ہیمنگوے

1988ء میں ایک امریکی نقاد نے لکھا: ادب میں بھی ہیمنگوے کی کوئی جگہ نہیں لے سکا اور جیسا آدمی تھا' ویسا آدمی تو شاید ہی کوئی سامنے آسکے۔ ارنسٹ ہیمنگوے نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ فوج میں رہا۔ شکاری کی حیثیت سے خطرناک مہموں میں شامل رہا۔ کئی بار جان لیوا حادثوں کا شکار ہوا لیکن اتنا سخت جان تھا کہ بچ نکلا۔ بل فائٹنگ کی۔ خطروں سے کھیلنا اس کا معمول تھا۔ اسپین میں خانہ جنگی میں باقاعدہ حصہ لیا۔

وہ 12 جولائی 1899ء کو امریکہ میں پیدا ہوا۔ اس نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ قدرت نے اسے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا اور ہیمنگوے نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ عملی زندگی میں کنساس سٹی اسٹار کا رپورٹر رہا۔ 1918ء میں وہ امریکن ریڈ کراس ایمبولینس کے ڈرائیور کی حیثیت سے اٹلی میں تھا۔ ٹورانٹو ڈیلی اسٹار سے وابستہ رہا۔ اسپین میں نارتھ امریکن نیوز پیپر الائنس کا اس زمانے میں کارسپانڈنٹ رہا ہے جب خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ 1952ء میں اسے ادب کا پلٹزر پرائز دیا گیا۔

ارنسٹ ہیمنگوے نے 2 جولائی 1961ء کو خود کو گولی مار کر خودکشی کرلی تھی۔ وہ کہانی کار بھی تھا مگر اپنی زندگی میں خطرات سے کھیلنے والے مہم جو اور نڈر انسان کی حیثیت سے شہرت رکھتا تھا۔ اس کی کئی کہانیوں اور ناولوں پر فلمیں بنیں جن میں "سنوز آف کلیمن جارو" "دی سن آلسو رائزز" "فار ہوم دی بیل ٹالز" "اے فیرویل ٹو آرمز" اور "اولڈ مین اینڈ دی سی" بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

ہیمنگوے کا ابتدائی کام خاصا سفاکانہ اور قنوطیت سے بھرپور ہے تاہم وہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا شعور رکھتا ہے۔ اس کے کردار ہیرو کے عناصر رکھتے ہیں' مہم جو اور خطرات سے نبرد آزما ہونے کا مردانہ حوصلہ رکھنے والے۔ اس کے ناول ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ اس انسان کا تصور شاندار انداز میں پیش کرتا ہے جو انفرادی طور پر ایک ایسی دنیا میں اچھائی کے لیے لڑتا ہے' جس پر تشدد اور موت کے سائے ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز لکھنے والا تھا۔ اس کا اسلوب منفرد اور موڈرن ہے۔ بیانیہ میں اس نے جدت پیدا کی: کفایت لفظی اور بھرپور معنی! اس کے اثرات امریکی ادب پر بہت گہرے ہیں۔

1955ء---ہالڈور لیک سنس

ہالڈور لیک سنس کا تعلق آئس لینڈ سے تھا۔ اس چھوٹے سے ملک نے یہ عظیم لکھنے والا پیدا کیا۔ وہ 23 اپریل 1902ء کو ریکجویک میں پیدا ہوا۔ اس نے کسی کالج یا اعلیٰ تعلیمی ادارے سے تعلیم حاصل نہیں کی۔ ہالڈور لیکسنس نے ساری عمر تصنیف و تحریر میں گزاری۔ اسے 1943ء میں سٹالین پرائز 1969ء میں سوننگ پرائز اور 1955ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔

ہالڈور لیکسنس کی تصانیف کو سمجھنے کے لیے اس کی زندگی اور اس کے عقائد کو کسی حد تک جاننا ضروری ہے۔ پیدائشی لحاظ سے وہ عیسائی تھا۔ جوانی میں اس نے کیتھولک عقیدے کو اپنایا۔ اس کے بعد اس کی ساری عمر طبقاتی جدوجہد میں گزری اور اس نے مذہب کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق برقرار نہ رکھا۔

اس کا شمار بیسویں صدی کے اہم ترین مصنفوں میں ہوتا ہے۔ وہ آئس لینڈ کا ترجمان تھا۔ رزمیہ لکھنے میں اسے خاص ملکہ حاصل تھا۔ اس نے آئس لینڈ کے عظیم بیانیہ اسلوب میں اضافہ کیا۔ اس کی تمام اہم تصانیف اس کے اپنے وطن آئس لینڈ کے موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس نے اپنے عہد کے سیاسی سماجی مسائل کو دریافت کیا۔ اس کی تصانیف میں اس کے اپنے قومی اور پرجوش جذبات بھی شامل ہیں۔ اپنے وطن کے ساتھ اس نے اپنی محبت کا بھرپور انداز میں اظہار کیا ہے۔ اپنے وطن کی زبان کو سنوارنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔

1956ء---جو آن ریمون جمینیز

جو آن ریمون جمینیز نے ساری عمر تحریر و تصنیف کو اپنائے رکھا اور کوئی دوسرا کام نہیں کیا حالانکہ سپین کی اعلیٰ درس گاہ سے تعلیم یافتہ تھا۔ اس کی پیدائش 24 دسمبر 1881ء کو موگیور سپین میں ہوئی اور 29 مئی 1958ء کو پورٹو ریکو میں اس کا انتقال ہوا۔

جمینیز ایک عہد ساز عہد آفریں شاعر تھا۔ اس کی شاعری نے اس کے بعد کی نسل کو بے حد متاثر کیا اور ہسپانوی شاعروں البرٹی' سالنیاس لورکا اور منسترال پر اس کے اثرات بہت نمایاں اور گہرے دکھائی دیتے ہیں۔

جمینیز ڈاریو' پیتر او اور دوسرے جدید شعراء سے متاثر تھا۔ وہ فرانسیسی علامت نگاروں سے بھی متاثر دکھائی دیتا ہے لیکن اس نے اپنے لیے نئی راہ نکالی۔ اس نے نیا اسلوب ایجاد کیا جس میں مابعد الطبیعاتی' تجریدی اور خالص لیریکل اور روحانی عناصر کی آمیزش کی۔ اس نے اپنی شاعری کے حوالے سے ہسپانوی زبان کی نئی وسعتوں کی نشاندہی کی۔ اس کی شاعری فنکارانہ اسلوب اور روحانیت کی معراج ہے۔

1957---آلبیر کامیو

جدید عالمی ادب پر کامیو کے اثرات بہت واضح ہیں۔ ہمارے اردو ادب پر بھی اس کے اثرات کی واضح نشاندہی ہوتی ہے۔ کامیو اردو ادب میں ایک جانا پہچانا حوالہ ہے۔ اس کے کئی اہم کام اردو میں منتقل ہو چکے ہیں جس میں اس کے دو ناول اجنبی (بشیر چشتی) زوال (محمد عمر میمن) اور سسی فس (انیس ناگی) بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ آلبیر کامیو پر اردو میں خاصا کچھ لکھا گیا ہے۔

کامیو 7 نومبر 1913ء کو الجزائر میں پیدا ہوا جو اس وقت فرانس کی کالونی تھی۔ عقیدے کے اعتبار سے کامیو اپنے آپ کو "ملحد انسان دوست" کہتا تھا۔ اس نے الجزائر یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جون 1936ء میں پہلی شادی کی جو طلاق پر ختم ہوئی۔ اس کی دوسری شادی 1940ء میں ہوئی۔

4 جنوری 1960ء کو وہ کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ اس کی موت اس کے وجودی نظریات کے عین مطابق تھی۔ اس کی جیب میں ریل گاڑی کا ٹکٹ تھا، لیکن عین وقت پر ریل کا سفر ترک کر کے وہ کار میں روانہ ہوا اور حادثاتی موت مارا گیا۔

کامیو کا زندگی میں تھیٹر سے بھی مختلف حیثیتوں سے رابطہ رہا۔ اداکار، مصنف اور پروڈیوسر کی حیثیت سے وہ 1935ء سے 1938ء تک اسٹیج سے منسلک رہا۔

صحافی کی حیثیت سے الجزائر کے ایک اخبار کے ساتھ 1938ء سے 1940ء تک وابستہ رہا۔ پھر ایک اسکول میں مدرس رہا۔ اس کے بعد فری لانسر کی حیثیت سے کئی برس کام کیا۔ فرانس پر ہٹلر کے قبضے کے زمانے میں اس نے مزاحمتی تحریریں لکھیں اور "کمبات" جریدے کا مدیر رہا۔

فرانس کی آزادی کی تحریک میں اس نے نمایاں حصہ لیا اور 1946ء میں اسے میڈل آف دی لبریشن، فرانسیسی حکومت نے دیا۔ 1947ء میں اسے پرکس ڈی کرٹیکس ایوارڈ ملا۔ 1947ء میں اسے لیجن آف آنر کا اعزاز دیا گیا جسے اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ 1957ء میں اسے ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔

کامیو اور سارتر کی قلمی جنگ بھی ایک اہم ادبی واقعہ ہے۔ ایک زمانے میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے لیکن بعد میں ادبی اختلافات نے جنم لیا جن کی بازگشت پوری ادبی دنیا میں سنی گئی۔ کامیو کی موت پر سب سے اچھا تعزیتی بیان سارتر نے دیا اور اس کی ادبی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا۔

کامیو نے اپنی تصانیف کے ذریعے عہد حاضر کے انسان کے ضمیر کے مسائل کو پیش کیا۔ وہ ایک نظریے کا مالک تھا جس کی ترویج اس نے اپنی تصانیف سے کی۔ اس نے اپنی نسل کے اخلاقی ماحول کو پیش کیا: جنگ سے نبرد آزما نسل کا اخلاقی بحران!

کامیو کے ہاں مایوسی ہے لیکن یہ مایوسی مکمل نفی۔۔۔ (نہلزم) سے ماورا ہے۔ وہ انسانی وجود کا ایک جواز بھی پیش کرتا ہے، علاوہ ازیں اس کے ہاں مسرت کے حصول کے امکانات بھی ملتے ہیں۔

1958ء---بورس پاسٹرناک

1958ء میں جب روسی مصنف بورس پاسٹرناک کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا تو پوری دنیا میں یہ انعام ایک مسئلہ بن کر سامنے آیا۔ اس کے ناول "ڈاکٹر ژواگو" پر جہاں بے حد لے دے ہوئی وہاں اسے بے حد سراہا بھی گیا۔ ایک موثر حلقے کی طرف سے اسے ایک سیاسی انعام قرار دیا گیا۔ دنیا بھر کی زبانوں میں اس ناول کے تراجم ہوئے۔ عالمی تنظیموں اور عالمی ادیبوں نے روس کے رویے کے خلاف احتجاج کیا۔ اس ناول پر ایک زبردست فلم بنی جس میں عمر شریف نے مرکزی کردار ادا کیا۔ رابرٹ بولٹ نے اس کا منظرنامہ لکھ کر شہرت حاصل کی۔ فلم کی تاریخ میں یہ فلم ہمیشہ یادگار رہے گی۔

صورت حال ایسی ہو گئی کہ بورس پاسٹرناک کو اپنا انعام حاصل کرنے کے لیے سوئٹزرلینڈ آنا مشکل ہو گیا۔ اس کی طرف سے بھی کئی متضاد بیانات آئے تاہم وہ اپنا انعام لینے نہ آ سکا۔ اس نے انعام لینے سے انکار کر دیا جس کی وجہ روسی حکومت کا جبر تھا۔ "ڈاکٹر ژواگو" کو ایک بڑے امتحان سے گزرنا پڑا۔ روس اور مشرقی یورپ میں لوگوں نے اسے خفیہ ایڈیشنوں کے ذریعے پڑھا لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے۔ بورس پاسٹرناک کا مقام نہ صرف روس میں بحال کر دیا گیا ہے بلکہ روسی زبان میں بھی 'ڈاکٹر ژواگو شائع ہو چکا ہے۔

بورس پاسٹرناک 10 فروری 1890ء کو ماسکو (روس) میں پیدا ہوا۔ اس نے ماسکو یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے بعد وہ ماسکو میں بطور ٹیوٹر پڑھاتا رہا۔ کچھ عرصہ کلرکی کی۔ پاسٹرناک بہت بڑا روسی شاعر تھا جس کی عظمت کا اعتراف روس میں بہت پہلے کیا جا چکا تھا۔ اس نے عالمی ادب کے بعض فن پاروں کا روسی زبان میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اس کی شاعری کے کئی مجموعے روسی' انگریزی' فرانسیسی اور دوسری زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

ناول "ڈاکٹر ژواگو" میں اس نے انقلاب روس کے بعد ابتری اور انسانی اقدار کی بے حرمتی کو پیش کیا تھا۔ یہ ناول روس میں شائع نہ ہو سکا اور اس کا مسروقہ ایڈیشن بیرون روس پہنچا۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی پاسٹرناک پر روسی حکومت کا دباؤ شروع ہو گیا اور وہ سیاسی معتوب ٹھہرا۔

"ڈاکٹر ژواگو" کی مغرب میں اشاعت ایک ہنگامے کا باعث بنی۔ بورس پاسٹرناک کے حوالے سے انسانی حقوق کے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ بورس پاسٹرناک پر تحریروں کتابوں اور بیانات کے انبار لگ گئے۔

نوبل انعام کمیٹی نے اسے نوبل انعام کا حقدار اس کی عظیم شاعری اور روسی رزمیئے کی روایت کو زندہ رکھنے کی وجہ سے قرار دیا تھا' تاہم نوبل انعام کمیٹی کے مستقل سیکرٹری اینڈرلیس اوسٹرلنگ کے بیان نے 'ڈاکٹر ژواگو کو نمایاں کیا۔ اس نے یہاں تک کہا کہ "ڈاکٹر ژواگو" ٹالسٹائی کے شاہکار "جنگ اور امن" کا ہم پلہ ہے۔ ظاہر ہے کہ وقت نے یہ ثابت کر دیا ہے ڈاکٹر ژواگو بھلے کتنا ہی بڑا ناول کیوں نہ ہو' اسے جنگ اور امن کا ہم پلہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

1959ء---سلواٹور قاسیمڈو

1959ء کا نوبل انعام سلواٹور قاسیمڈو' اٹلی کے شاعر اور مترجم کو دیا گیا۔ قاسیمڈو خداداد صلاحیتوں کا مالک تھا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ کچھ عرصہ تک اٹلی کی وزارت 'پبلک ورکس' میں ملازم رہا۔ 1938ء سے 1940ء تک وہ "ال ٹمپو" کا مدیر رہا۔ 1938ء سے 1940ء تک وہ ویردی کنزرویٹری آف میوزک میلان سے منسلک رہا۔ اس کے بعد اس نے 1941ء سے 1964ء تک پروفیسر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ اسے 1953ء اور 1958ء میں اٹلی کے اعلیٰ شعری اعزازات سے نوازا گیا۔ وہ 20 اگست 1901ء کو سسلی میں پیدا ہوا اور اس کا انتقال 14 جون 1968ء کو نیپلز (اٹلی) میں ہوا۔

سلواٹور قاسیمڈو نے بعض یادگار سمفنیاں بھی لکھیں۔ وہ ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے نوبل انعام کا حق دار ٹھہرا تھا۔ اس کی شاعری میں کلاسیکی روایت کے ساتھ عہد حاضر کی انسانی زندگی کے المیے کا اظہار ذات کے تجربے کے حوالے سے ہوا۔

قاسیمڈو اپنے عہد میں اٹلی میں کئی شعری تحریکوں کا بانی رہا۔ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں اسے ایک شعری تحریک کا بانی قرار دیا گیا جس نے یورپ کی شاعری پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ دوسری جنگ عظیم میں اٹلی جن حوادث سے گزرا اس کے بعد قاسیمڈو کی شاعری کا رنگ اور اسلوب بھی تبدیل ہوا۔ اس نے کلاسیکی امیجری کو اپنی شاعری میں برقرار رکھتے ہوئے شاعری کو سماجی اور سیاسی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ اس کی اس عہد کی شاعری کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ آخری دور کی اسی شاعری کے حوالے سے ہی اسے نوبل انعام کا حق دار قرار دیا گیا۔

1960ء---سینٹ جان پرس

سینٹ جان پرس نے بہت کچھ لکھا لیکن اس کے بہت سے مسودے نازیوں کی تباہ کاریوں کی وجہ سے ضائع ہو گئے' تاہم اس کی جتنی شعری تصانیف بھی شائع ہو کر منظر عام پر آسکیں وہ اس پائے کی ہیں کہ اس کا شمار بیسویں صدی کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔

وہ فرانسیسی تھا اور فرانسیسی ویسٹ انڈیز میں 31 مئی 1887ء کو پیدا ہوا۔ اس نے قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنی زندگی میں کئی اہم سرکاری عہدوں پر ملازمت کی اور سفارت کار کی حیثیت سے بھی اس کا ریکارڈ بہت شاندار رہا۔ 1914ء سے 1941ء تک وہ کئی اہم سفارتی عہدوں پر فائز رہا۔ 1941ء سے 1945ء تک وہ لائبریری آف کانگریس امریکہ کا مشیر بھی رہا۔

سینٹ جان پرس نے اپنی امیجری تخلیق کی۔ اس کی شاعری بلاشبہ مشکل ہے لیکن اس کی تہ داری ہی اس کا ایک ایسا وصف ہے جس نے اس شاعری کو عظیم بنایا ہے۔

سینٹ جان پرس کے تعلقات اپنے عہد کے بڑے شاعروں سے تھے لیکن اس کی شاعری پر کسی کا اثر نہیں' وہ شاعری کے کسی مکتب سے کبھی وابستہ نہ ہوا۔

"ہوائیں" بھی ایک جدید رزمیہ نظم ہے جس کا ترجمہ اردو میں انیس ناگی نے کیا ہے۔ ایک عرصے تک سینٹ جان پرس کی شہرت صرف فرانسیسی بولنے والوں تک محدود رہی' لیکن آہستہ آہستہ اس کا شعری مقام بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کی شاعری آسان نہیں' یہ شاعری کا اعلیٰ ترین ذوق رکھنے والوں کے لیے ہے۔

سینٹ جان پرس کا انتقال 20 ستمبر 1975ء کو ہوا۔

آئیوو آندریک

آئیوو آندریک (1975ء - 1892ء) یوگوسلاوی ادب و معاشرت کی ان عظیم روایات کا نمائندہ ہے جو قریب قریب تین صدیوں کو محیط ہیں۔ وہ یوگوسلاوی ناول اور نئے مختصر افسانے میں ایک اہم اور منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ اپنی چالیس سالہ ادبی زندگی میں اس نے سو سے زیادہ مختصر کہانیاں' مضامین اور ناول لکھے جو موضوع کے تنوع اور طرز تحریر کے باعث ادب کے شاہکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ "درینہ کا پل" سربو کروٹ زبان کا سب سے بڑا ناول ہے جسے 1961ء میں دنیا کے عظیم ادبی انعام "نوبل پرائز" سے نوازا گیا۔ یہ داز ے گراڈ (بوسنیا) کے اس تاریخی پل کے گرد بنی ہوئی ایک شاہکار کہانی ہے جسے 1577ء-1571ء میں محمد پاشا نے تعمیر کیا اور جس کا حسن اور شکوہ چار صدیاں گزرنے کے باوجود قائم و دائم ہے۔

ڈاکٹر آئیوو آندریک کا لڑکپن داز ے گراڈ میں گزرا۔ اس لیے اسے بوسنیا کی تہذیب و معاشرت کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ "درینہ کا پل" میں اس عہد کی جیتی جاگتی زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے جو اس ناول کا موضوع ہے۔ اپنے زندہ' متحرک کرداروں' مقامی رنگ و اثرات' اچھوتے طرز تحریر' گہرے مطالعہ حیات اور سادگی کے باعث یہ ناول نہ صرف یوگوسلاوی ادب بلکہ دنیا کے عظیم ناولوں میں شمار ہوتا ہے' اس میں حقیقت و افسانہ کا خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔ آندریک نے "درینہ کا پل" میں جس طرح اپنے قومی ورثہ اور ماضی کی عکاسی کی ہے اس نے اس ناول کو ایک عظیم ادبی دستاویز بنا دیا ہے۔ دنیا کی تقریباً چالیس زبانوں میں اس کے سو سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

1962ء---جان سٹین بک

1962ء کے ادب کا نوبل انعام جان سٹین بک کو دیا گیا جو امریکی مصنف تھا۔ وہ 27 فروری 1902ء کو سالیناس کیلیفورنیا میں پیدا ہوا۔ وہ بھی ان عالمی مصنفوں میں سے ایک تھا جن کا اصل استاد کوئی درس گاہ نہیں بلکہ زندگی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کئی چھوٹے موٹے کام کیے۔ اس کے بعد جب لکھنا شروع کیا تو پھر صحافت اور ادب کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ اسے نوبل انعام کے علاوہ کئی دوسرے ادبی انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا جن میں گولڈ میڈل کامن ویلتھ کلب آف کیلیفورنیا 1936ء' 1937ء' اور 1940ء شامل ہے اور سرکل سلور پلاق نیویارک ڈراما کرٹیکس 1938ء اور پلٹزر پرائز 1940ء بھی۔

جان سٹین بک کا انتقال 28 دسمبر 1968ء کو نیویارک میں ہوا۔ اس کا شمار عہد حاضر کے مقبول ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کی تصانیف کے تراجم دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ہو چکے ہیں۔ اردو میں بھی وہ ایک جانا پہچانا نام ہے۔ اس کے ناول "ٹورٹیلا فلیٹ" کا ایک ناقص سا ترجمہ اردو میں شائع ہو چکا ہے۔ "دی مون از ڈاؤن" کو کرشن چندر نے اخذ و ترجمہ کیا تھا۔ "دی پرل" کا ترجمہ ممتاز شیریں نے کیا تھا اور حسینہ معین نے اسے ٹیلی پلے کا روپ دیا۔ "دی ریڈ پونی" کا بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

1963ء---یارگوس سیفریز

1963ء کا نوبل انعام یونان کے عظیم شاعر سیفریز کو دیا گیا جو 29 فروری 1900ء کو سمرنا (ترکی) میں پیدا ہوا۔ اس نے 1924ء میں سوربون یونیورسٹی پیرس سے قانون کی ڈگری حاصل کی تھی۔ 1941ء میں اس نے شادی کی۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ یونانی سفارت کار کی حیثیت سے 1931ء سے 1962ء تک فرائض انجام دیتا رہا۔ اس کا انتقال 20 ستمبر 1971ء کو ایتھنز میں ہوا۔

سیفریز ندرت خیال کا شاعر ہے۔ اس کا اسلوب بے حد جاندار ہے۔ یونانی زندگی کے وہ عناصر جو ناقابل شکست اور دوامی ہیں' انہیں سیفریز نے اپنی شاعری میں پیش کیا۔ وہ یونان کی جدید شاعری کی زندہ علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس نے یونانی زبان کو نئی وسعتوں اور امکانات سے ہمکنار کیا۔ اس نے اپنی شاعری میں یونان کی عظمت پارینہ اور جدید عہد کے یونان کے تجربات و مصائب کو بیان کیا ہے۔ اس نے عہد جدید کے عصری موضوعات' جدید کشمکش' جنگ' جلاوطنی اور ناسٹلجیا کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

وہ ایک عملی انسان تھا۔ ایک جدید' اہم اور بڑا شاعر جو نہ صرف اپنی شاعری سے یونان کی علامت بنا بلکہ 31 برس تک یونانی سفارت کار کی حیثیت سے بھی اس نے یونان کے لیے اہم خدمات انجام دیں۔

1964ء---ژاں پال سارتر

1964ء کے نوبل انعام برائے ادب کا حقدار ژاں پال سارتر کو قرار دیا گیا لیکن سارتر نے یہ انعام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ژاں پال سارتر بیسویں صدی کی اہم شخصیات میں سے ایک ہے۔ وہ فرانس کی علامت بن کر زندہ رہا۔ وہ اور فرانس ہم معنی بنے۔ ایک بار جب اس کے خیالات و افکار کے حوالے سے صدر ڈیگال کے مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ سارتر کو گرفتار کر لیا جائے تو صدر ڈیگال نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ سارتر فرانس ہے اور میں فرانس کو کیسے گرفتار کر سکتا ہوں۔

سارتر بین الاقوامی شخصیت تھا۔ ناول نگار' فلسفی' ڈراما نویس' نقاد' صحافی اور سیاسی مدبر اور سیاسی شخصیت۔ وہ 21 جون 1905ء کو پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین لوتھرن عقیدے کے عیسائی تھے لیکن سارتر نے بالغ و باشعور ہو کر مذہب سے قطعی بے گانگی کا اظہار کیا۔ وہ ملحد تھا۔ اس نے فلسفے میں اعلیٰ ڈگری حاصل کی' شادی نہیں کی۔ تاہم اپنی عمر بھر کی ساتھی سیمون ڈی بیودار کی رفاقت میں پچاس برس تک زندگی بسر کی۔ اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی لیکن اس نے اپنی ایڈیٹوریل اسسٹنٹ مس آرلیت کو بطور بیٹی اپنایا تھا۔

سارتر نے اپنی زندگی کا آغاز فرانسیسی فوج میں سارجنٹ کی حیثیت سے کیا یعنی 1929ء سے 1931ء تک۔ 1931ء سے

1939ء تک وہ فرانس کے مختلف اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بطور پروفیسر فلسفہ پڑھاتا رہا۔ 1939ء سے 1941ء تک وہ پھر فرانسیسی فوج میں شامل ہوا اور فاشزم اور ہٹلر کے قبضے کے خلاف مزاحمتی خفیہ جنگ میں حصہ لیا۔ اسے کئی دوسرے اعزازات بھی دیئے گئے جن میں فرنچ پاپولر ناول پرائز 1940ء جبکہ لیجن آف آنر کا اعزاز اسے 1945ء میں دیا گیا لیکن سارتر نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

پس ماندہ اقوام کے لیے سارتر کی جدوجہد بیسویں صدی کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی اس کا رتبہ بلند ہے' تاہم وجودیت کے فلسفے کے فروغ' نشوونما اور اس میں بے پناہ عطا کی وجہ سے اسے بطور خاص شہرت ملی۔ سارتر کی تصانیف نئے خیالات سے لبریز ہیں۔ سچائی کی تلاش اور آزادی کی روح ان تحریروں کا خاصہ ہے۔ اس کے خیالات وافکار کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ سیاسی صحافت اور ادبی تنقید میں سارتر کا رتبہ اتنا ہی بلند ہے جتنا کہ ناول ڈرامے اور فلسفے کے میدان میں۔

سارتر کا انتقال 15 اپریل 1980ء کو پیرس میں ہوا۔ دنیا اسے الجزائر کی آزادی اور ویت نام کے مظالم اور حریت فکر کی تحریکوں کے حوالے سے بھی ہمیشہ یاد رکھے گی۔

1965ء---مائی خل شولوخوف

شولوخوف ویزلنسکایا روشوف (روس) میں 24 مئی 1905ء کو پیدا ہوا۔ اس نے معمولی تعلیم حاصل کی اور کسی کالج سے ڈگری حاصل نہیں کی۔ 1918ء سے 1922ء تک روسی فوج میں رہا۔ 1922ء سے 1926ء تک وہ ماسکو میں محنت مزدوری کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ سیاست دان اور مصنف کی حیثیت سے معروف رہا۔

اسے 1941ء میں سٹالین پرائز' 1960ء میں آرڈر آف دی فادر لینڈ لینن پرائز اور 1967ء میں ہیرو آف سوشلسٹ لیبر کا ایوارڈ ملا۔ اسے آرڈر آف لینن سے آٹھ بار نوازا گیا۔

شولوخوف اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ اردو میں اس کا خاصا کام منتقل ہو چکا ہے۔ "اینڈ کوائٹ فلوز دی ڈان" کا ترجمہ "اور ڈان بہتا رہا" کے نام سے مخمور جالندھری اور سراج نظامی نے کیا۔ "دی سیڈز آف ٹومارو" کا ترجمہ قرۃ العین حیدر نے کیا۔ شولوخوف نے اپنا معرکہ آرا ناول "اور ڈان بہتا رہا' چودہ برسوں میں لکھا تھا۔ یہ ایک رزمیہ ناول ہے جو انیسویں صدی کی حقیقت پسندی کا مظہر ہے۔ اس کا انتقال 21 فروری 1984ء کو ہوا۔

1966ء---شموئیل اگنون

1966ء میں ادب کا نوبل انعام دو مصنفوں میں تقسیم کیا گیا۔ شموئیل اگنون اور نیلی ساشنز۔

شموئیل اگنون یہودی تھا۔ 17 جولائی 1888ء کو وہ آسٹریا میں پیدا ہوا۔ بعد میں وہ اسرائیل چلا گیا اور وہاں کی شہریت اختیار کر لی۔ اس نے معمولی تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ اس نے اسرائیل میں ایک سرکاری ایجنسی میں ملازمت کی۔ باقی عمر اس نے تحریر و تصنیف میں بسر کی۔ اگنون کا انتقال 17 فروری 1970ء کو اسرائیل میں ہوا۔

اگنون زبردست بیانیہ کا مالک تھا۔ اس نے اپنی صلاحیتیں یہودی عوام کی ترجمانی کے لیے وقف کر دیں۔ اس نے نظمیں' کہانیاں اور ناول لکھے۔ ساٹھ برسوں تک وہ مسلسل لکھتا رہا۔ پہلے وقت میں اس کی تصانیف کا موضوع مشرقی یورپ میں رہنے والے یہودی تھے۔ بعد میں اس نے کافکا کے زیر اثر لکھنا شروع کیا۔ اس کی کتاب "دی برائیڈل کینوپی" کو عبرانی زبان میں "ڈان کیخوٹے" کے ہم پلہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے بعض ایسی تحریریں بھی لکھیں جو اسرائیل میں یہودیوں کی حالت پر تنقید کی حیثیت رکھتی تھیں۔

1966ء--- نیلی ساشنز

1966ء کے نوبل انعام برائے ادب کی دوسری حق دار نیلی ساشنز تھی۔ وہ 10 دسمبر 1891ء کو برلن (جرمنی) میں پیدا ہوئی۔ بعد میں اس نے سویڈن کی شہریت اختیار کر لی جہاں اس کا انتقال 12 مئی 1970ء کو ہوا۔ اس نے شادی نہیں کی اور اعلیٰ تعلیم بھی

حاصل نہ کر سکی۔ وہ ایک مترجم کی حیثیت سے معاشی ضرورتوں کو مدتوں پورا کرتی رہی۔
وہ یہودی تھی۔ اسے اتفاق سمجھئے یا خاص منصوبہ بندی کہ 1966ء کے نوبل انعام کے دونوں حق دار یہودی تھے اور یہودیوں کے ترجمان۔
نیلی ساشنز کو اس کی زندگی میں نوبل انعام کے علاوہ دیگر کئی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا جن میں جاہٹرنگ لٹریری پرائز (1959ء) پیس پرائز جرمن بک سیلرز ایسوسی ایشن 1966ء شامل ہیں۔ نیلی ساشنز ایک معمولی درجے کی غنائیہ نظمیں لکھنے والی شاعرہ تھی۔ جب جرمنی میں ہٹلر نے یہودی قوم پر مظالم کا سلسلہ شروع کیا تو وہ بھی نشانہ بنی لیکن وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس ہولناک تجربے نے اسے ایک بڑی مصنفہ بنا دیا اور اس کی زندگی اور تحریروں کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ وہ جو فطرت اور دیومالائی کرداروں پر لکھتی تھی وہ اپنی قوم کے مصائب کی زبردست تخلیقی ترجمان بن کر سامنے آئی۔ بعد میں اس کے فکر و نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور اس کی تخلیقات کو ہمہ گیر مقبولیت ملی۔ یہودی قوم کے مصائب کے دائرے سے نکل کر وہ پوری انسانیت کے دکھوں کی ترجمان بن گئی۔ اس کی تحریریں عفو و درگزر، امن اور محبت کا پیغام دیتی ہیں اور آنے والی نسلوں کو امید کی روشنی بھی عطا کرتی ہیں۔ اس کے ڈراموں میں سے بعض ڈرامے بین الاقوامی سطح پر پیش کیے گئے۔

1967ء---میگوئل آسٹوریاس

گوئٹے مالا میں پیدا ہونے والے مصنف میگوئیل آسٹوریاس کو 1967ء کا نوبل انعام برائے ادب دیا گیا۔ وہ 19 اکتوبر 1899ء کو گٹ مالا سٹی میں پیدا ہوا اور 9 جون 1974 کو میڈرڈ میں اس کا انتقال ہوا۔
عقیدے کے لحاظ سے وہ کیتھولک تھا۔ اس نے سان کارلوس یونیورسٹی گٹ مالا سے قانون کی ڈگری 1923ء میں حاصل کی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کیں۔ 1922ء سے 1933ء تک وہ ایک اخبار کا کارسپانڈنٹ رہا۔ اس کے بعد ایک سفارت کار اور مصنف کی حیثیت سے باقی زندگی بسر کی۔
آسٹوریاس ایک جمہوریت پسند انسان دوست تھا۔ اپنے ملک گٹ مالا میں اس نے عرصے تک آمریت کی مخالفت کی اور اس کی پاداش میں اسے جلاوطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی جس کا تجربہ اس کی اہم تصانیف میں ملتا ہے تاہم وہ بین الاقوامی سطح پر زیادہ پڑھا نہیں گیا۔ اس کی تصانیف انگریزی میں بھی اب نایاب ہیں۔
آسٹوریاس شاعر، ڈرامانگار، ناول نگار اور کہانی کار تھا۔ اپنی تصانیف میں اس نے اپنی قومی انفرادیت اور ہندی روایات کا اظہار کیا۔ مغربی امریکہ میں سرخ ہندی کی روایات دیومالا اور فوک لور کو اس نے اپنے ادب میں رچایا بسایا اور بڑے موثر تخلیقی انداز میں پیش کیا۔ جنوبی امریکہ کی قدیم سرخ ہندی تہذیب کو اجاگر کرنے میں اس نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ ہر طرح کے استبداد کا مخالف تھا۔ ایسے مصنف کی تخلیقات کا عالمی سطح پر اب ناپید ہو جانا یقیناً ایک بڑے المیے سے کم نہیں۔

1968ء---یسوناری کاواباٹا

یسوناری کاواباٹا کے والدین کے بارے میں کسی طرح کی معلومات موجود نہیں۔ وہ اوساکا (جاپان) میں 11 جون 1899ء کو پیدا ہوا اور اس کا انتقال زوشی، جاپان میں 16 اپریل 1972ء کو ہوا۔ وہ مذہبی آدمی نہیں تھا تاہم بدھسٹ لٹریچر سے بے حد متاثر تھا اور اسی پر مبنی عقائد رکھتا تھا۔
وہ جاپان کے کئی جریدوں کا مدیر رہا اور ساری عمر لکھنے پڑھنے میں ہی بسر کی۔ اپنی زندگی میں اسے کئی بین الاقوامی ملکی اعزازات و انعامات سے نوازا گیا جن میں بنگی نوا کی پرائز 1937ء، جوسیٹن شولٹریری پرائز 1952ء، نوما لٹریری پرائز 1954ء، گوئٹے میڈل جرمنی 1959ء، آرڈری آرٹس اینڈ لیٹرز فرانس 1960ء، کلچرل میڈل جاپان 1961ء اور آکتاگاوا پرائز 1961ء شامل ہیں۔
وہ جاپانی ذہن کا زبردست ترجمان تھا۔ اس اعتبار سے بھی اس کی اہمیت ہے کہ وہ پہلا جاپانی مصنف تھا جسے نوبل انعام برائے ادب دیا گیا۔ کاواباٹا نے کئی تجربے کیے تھے، ایک زمانے میں گرٹروڈ سٹین سے متاثر رہا۔ اس کے بعد اس نے جیمز جوائس کی سٹریم

آف کانشی انیس کو بھی برتا لیکن پھر وہ روایتی کلاسیکی جاپانی اسلوب کی طرف لوٹ آیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جاپان کی روایات زندہ، مستحکم، سادہ اور جان دار ہیں۔

1969ء---سموئیل بیکٹ

بیکٹ ڈبلن (آئرلینڈ) میں 13 اپریل 1906ء کو پیدا ہوا۔
اس کی موت پیرس میں 22 دسمبر 1989ء کو ہوئی۔
مذہباً وہ پروٹسٹنٹ تھا۔ 1927ء سے 1932ء تک وہ آئرلینڈ اور پیرس کی درس گاہوں میں بطور استاد پڑھاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے بطور مصنف زندگی بسر کی۔

1948ء میں اس کی شادی ایک دلچسپ واقعہ کے بعد ہوئی۔ بیکٹ کو ایک شخص نے لوٹنے کی غرض سے زخمی کر دیا۔ اس حالت میں اسے ایک خاتون نے ہسپتال پہنچایا۔ اسی خاتون سے بعد میں بیکٹ نے شادی کر لی۔ اس کی بیوی اس کی اپنی موت سے چند ماہ پہلے انتقال کر گئی تھی۔ بیکٹ کو پیرس کے ایک قبرستان میں اسی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ بیکٹ کو اپنی زندگی میں کئی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔

اردو میں وہ جانا پہچانا نام ہے۔ اس کے سب سے مشہور اور اہم کھیل "ویٹنگ فار گوڈو" کا اردو میں ترجمہ کرشن چندر نے کیا جو شب خون الٰہ آباد میں شائع ہوا تھا۔ سموئیل بیکٹ کی زندگی اور فن پر بہت کچھ لکھا گیا اور مستقل اہمیت کی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔
"ویٹنگ فار گوڈو" کو لاہور کے اسٹیج پر بھی کھیلا گیا۔ بیکٹ نے ناول اور بطور خاص ڈراما میں نئی فارم کو متعارف کرایا۔ ابسرڈ تھیٹر میں اس کی کنٹری بیوشن بہت اہم ہے۔ اس کے ڈرامے اور ناول ہمارے آس پاس پھیلی ہوئی بے معنویت اور ابتری کو پیش کرتے ہیں۔ وہ انسانی وجود کو ناکارہ ثابت کرتا ہے۔ انسان جو بے سمت چلا جا رہا ہے 'لامعنیت' میں مبتلا ہے۔ اس کے کردار لمبی لمبی گفتگو کرتے ہیں کہ اس طرح کچھ تسلی ہو سکے۔ وہ روحانی ابتری اور خلا میں گھرے ہوئے ہیں۔ وہ زندگی کو لایعنی قرار دیتا تھا۔

1970ء---الیکساندر سولزے نیتسن

1970ء میں جب ادب کا نوبل انعام روسی مصنف الیکساندر سولزے نیتسن کو دیا گیا تو ایک بار پھر عالمی ادبی دنیا اور سیاست میں ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سولزے نیتسن روس میں معتوب تھا۔ خروشیف کے زمانے میں اس کا کچھ کام شائع ہوا لیکن اس کے بعد وہ معتوب ٹھہرا۔ اس پر کئی پابندیاں لگا دی گئی تھیں اور وہ ایک طویل جدوجہد سے گزرا۔
جب وہ روس سے یورپ آیا تو پھر اس کی سیاسی اور ادبی سطح پر بہت پذیرائی ہوئی۔ بڑی بڑی خبروں نے جنم لیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت پہلے جیسی نہ رہی۔
وہ 11 دسمبر 1918ء کو روس کے ایک قصبے میں پیدا ہوا۔ 1941ء میں اس نے روستوف یونیورسٹی روس سے گریجوایشن کی۔ 1940ء میں اس نے نتالیا سیوٹلووا سے شادی کی تھی۔ 1949ء میں اسے طلاق دی پھر 1956ء میں دوبارہ اسی سے شادی کی۔ 1972ء میں اسے پھر طلاق دی اور 1973ء میں پھر اسی سے شادی کر لی۔ 1941ء سے 1945ء تک روسی فوج میں رہا۔ اس کے بعد اسے قید کر لیا گیا۔ جلا وطن ہوا اور امریکہ میں مقیم رہا۔
کسی بہت بڑے مصنف کی حیثیت سے اس کا مقام اور رتبہ ہمیشہ مشکوک رہے گا۔ وہ خاصا بوجھل اور بور مصنف ہے۔ نوبل انعام کمیٹی نے اسے انعام کا حق دار قرار دیتے ہوئے اس کے کام کے بارے میں جو رائے دی' آج اس پر یقیناً نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے' البتہ اس کی ذاتی جدوجہد شاندار تھی اور اس حوالے سے اس کا ایک مقام بنتا ہے۔ روسی ادب میں بھی اس کا مقام وہ نہیں ہے جو عظیم روسی ناول نگاروں کا ہے۔

1971ء۔۔۔پابلو نرودا

پابلو نرودا، کئی حیثیتوں سے عالم گیر شخصیت تھا۔ ایک عظیم شاعر، ایک سفارت کار، ایک اہم سیاسی شخصیت اور ایک انقلابی!
وہ 12 جولائی 1904ء کو پارل چلی میں پیدا ہوا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ سفارت کار کی حیثیت سے وہ کئی ملکوں میں سفیر رہا جس میں ہندوستان بھی شامل ہے۔
نرودا ان جدید شاعروں میں سے ایک ہے جو مشرق و مغرب میں یکساں مقبول ہوئے۔ دنیا کی شاید ہی کوئی زبان ہو جس میں اس کی نظموں کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ اردو میں بطور خاص انیس ناگی، کشور ناہید، انور زاہدی وغیرہ نے اس کی بہت سے تخلیقات کو اردو میں منتقل کیا۔
ایک انقلابی کی حیثیت سے بھی وہ عالم گیر شہرت رکھتا ہے۔ کمیونزم کے ساتھ اس کی سچی وابستگی نے بھی اسے بلند مرتبے پر فائز کیا۔ اس کی شاعری میں جہاں اس کے وطن چلی کی جدوجہد اور خواب رچے بسے ہوئے ہیں، وہاں اس کی شاعری پوری انسانیت کی امنگوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس نے سیر ریلزم کو بھی اپنی شاعری کے عناصر میں شامل کیا۔ وہ ان شاعروں میں سے ایک ہے جس کی شاعری دلوں کو چھوتی ہے۔ وہ استبداد کے خلاف موثر آواز اٹھاتا ہے اور انسانی تقدیر کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔
چلی میں آلندے کی عوامی اشتراکی حکومت میں وہ صدر آلندے کا نائب تھا۔ جب چلی میں فوجی انقلاب آیا اور چلی کی عوامی حکومت کا تختہ سی آئی اے کے ذریعے الٹا گیا تو پابلو نرودا کو بھی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا انتقال 23 ستمبر 1973ء کو ہوا۔

1972ء۔۔۔ہینرخ بوئل

بوئل کا انتقال 16 جولائی 1985ء کو ہوا۔
وہ 21 دسمبر 1917ء کو کولون جرمنی میں پیدا ہوا تھا۔
اس نے کسی کالج سے کوئی تعلیمی سند حاصل نہیں کی۔
اسے نوبل انعام کے علاوہ اپنی زندگی میں بہت سے بین الاقوامی اور ملکی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔
ہینرخ بوئل نے جرمن ادبی روایت کا احیا کیا۔ یہ اس کا اہم کارنامہ ہے لیکن اس سے بھی بڑا اس کا ادبی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے موجود عہد کو اپنی تحریروں میں پیش کیا۔ علامتی سطح پر اس کے ناول اور کہانیاں پوری انسانیت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں لکھتا رہا جو سماج کا نشانہ بنتے ہیں۔ وہ بہت بڑا انسان دوست تھا۔ اس نے اپنے عہد کی بدصورت انسانی صورت حال کو موضوع بنایا۔

1973ء۔۔۔پیٹرک وائٹ

پیٹرک وائٹ لندن میں پیدا ہوا لیکن بعد میں وہ آسٹریلیا کا شہری بنا اور اسے آسٹریلیا کے مصنف کی حیثیت سے 1973ء کا ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔
وہ 28 مئی 1912ء کو لندن میں پیدا ہوا تھا۔
اس نے 1935ء میں کیمبرج یونیورسٹی لندن سے بی اے کیا تھا۔ اس نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ کچھ عرصہ وہ رائل ایئر فورس میں رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنی زندگی تحریر و تصنیف کے لیے وقف کر دی۔
پیٹرک وائٹ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ آسٹریلیا کا پہلا مصنف ہے جسے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ اردو میں اس کا بہت کم حوالہ ملتا ہے۔ اس کے ناول "دی ٹری آف مین" کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے ہاں رزمیہ اور نفسیات کے امتزاج سے ایک منفرد بیانیے نے جنم لیا ہے۔ بطور ناول نگار بیسویں صدی کا وہ اہم ناول نگار ہے۔ اس کی قوت تخلیق بے پناہ ہے۔ اس کے ہاں انسان

کا اضطراب بھی ایک اہم موضوع بنتا ہے۔ وہ زبان کو برتنے کے خاص قرینے کا اہل ہے۔

1974ء---آئیونڈ جونسن

1974ء کا نوبل انعام دو مصنفوں میں تقسیم ہوا اور اتفاق یہ ہے کہ دونوں کا تعلق سویڈن سے تھا۔
آئیونڈ جونسن 29 جولائی 1900ء کو سویڈن میں پیدا ہوا۔ اس نے کسی کالج سے تعلیم حاصل نہیں کی اور ساری زندگی تحریر و تصنیف میں بسر کی۔ کچھ عرصہ تک وہ یونیسکو میں سویڈن کا نمائندہ رہا۔ جونسن کا انتقال 25 اگست 1976ء کو سٹاک ہوم سویڈن میں ہوا۔
جونسن کو نوبل انعام دینے پر بہت سے حلقوں سے اعتراض ہوا کیونکہ اسے سویڈن کے باہر اس وقت کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔
جونسن کے ناولوں میں موضوعاتی تنوع ہے۔ ایک زمانے میں اس کے ہاں سوشلزم اور اصلاح کا پہلو نمایاں تھا۔ اس کے بعد اس نے سویڈش زندگی کے نفسیاتی مسائل کو موضوع بنایا۔ نازی ازم کے فروغ کے زمانے میں اس نے آمریت کے خلاف آزادی کے لیے آواز اٹھائی۔

1974ء---ہیری مارٹنی سن

1974ء کے نوبل انعام کا دوسرا حق دار ہیری مارٹنی سن تھا جو سویڈن کا شہری تھا۔ 6 مئی 1904ء کو وہ سویڈن میں پیدا ہوا اور 11 فروری 1978ء کو اس کا انتقال ہوا۔ وہ بھی زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز ایک ملاح کی حیثیت سے کیا۔ اس کے بعد لکھنے پڑھنے کو پیشہ بنالیا۔ اسے 1972ء میں پیٹرک سٹیفنز پرائز بھی دیا گیا تھا۔ اس کی اہم تصانیف میں کیپ فیرویل 'فلاورنگ نیٹل' ریئلزم ان ٹوڈ-تھم 'ٹریڈ ونڈ' اور دی روڈ وغیرہ شامل ہیں۔
مارٹنسن شاعر' ناول نگار' انشا پرداز اور ڈراما نگار تھا۔ اس کے نوبل انعام پر وہی اعتراض ہوا جو 1974ء کے دوسرے نوبل انعام یافتہ پر ہوا تھا کہ اس کی شہرت صرف سویڈن تک محدود تھی۔ اس کی ابتدائی کتابوں میں خام کاری ملتی ہے جو اس کی تعلیمی کمی اور عدم تجربے کا اظہار کرتی ہے۔ اس کے بعد کے کام میں بھی بے ترتیبی نمایاں ہے تاہم آخری دور کی تصانیف میں آفاقی رنگ ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مرتبہ زیادہ اہم ہے کہ وہ سائنس فکشن لکھنے والا تھا۔

1975ء---یوجینو مونٹیل

1975ء کا نوبل انعام برائے ادب اٹلی کے شاعر' مترجم اور صحافی یوجینو مونٹیل کو دیا گیا۔ اس کی اہم تصانیف یہ ہیں: کٹ فلیش بونز' دی سٹورم اینڈ ادر تھنگز' دی بٹر فلائی آف ڈینارڈ' زینیا اور رپوئیٹس ان آور ٹائمز وغیرہ۔
یوجینو مونٹیل 12 اکتوبر 1896ء کو جنیوا اٹلی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا انتقال 12 ستمبر 1981ء کو ہوا۔ مذہباً وہ کیتھولک تھا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس نے ساری عمر تحریر و تصنیف میں بسر کی۔ وہ نقاد' مترجم' ایڈیٹر اور صحافی رہا۔
مونٹیل ایک صاحب طرز شاعر تھا۔ اس کی شاعری فنی اعتبار سے پختہ اور شعری حساسیت سے مالامال تھی۔ اس کا نقطہ نگاہ بہت واضح تھا اور انسانی اقدار کے حوالے سے اس کے ہاں کسی قسم کا کوئی واہمہ یا ابہام نہیں ملتا۔ جب اسے انعام ملا تو اس وقت تک اس کے پانچ مختصر شعری مجموعے شائع ہوئے تھے لیکن بقامت کہتر بقیمت بہتر کے مصداق وہ ایک بڑا شاعر تھا جس نے اٹلی اور یورپ کی شاعری کو متاثر کیا۔

1976ء---ساؤل بیلو

ساؤل بیلو امریکہ کا شہری ہے لیکن وہ کینیڈا میں 10 جون 1915ء کو پیدا ہوا۔ وہ مذہباً یہودی ہے اور اس نے یہودی زبان اور قوم کو اپنے ادب میں بطور خاص جگہ دی ہے۔ اس نے نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی کینیڈا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ساؤل بیلو نے اپنی زندگی میں چار شادیاں کی ہیں۔

وہ 1938ء سے 1942ء تک شکاگو میں پڑھاتا رہا۔ 1943ء سے 1946ء تک انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کا ایڈیٹر رہا۔ اس کے بعد وہ امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں بطور پروفیسر پڑھاتا رہا۔

ساؤل بیلو پر امریکہ اور دوسرے ملکوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ متعدد بڑی زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کی کچھ کہانیاں منتقل کی گئی ہیں لیکن کوئی بڑا ناول ترجمہ نہیں ہوا۔ بہرحال اردو میں وہ جانا پہچانا نام ہے۔ اس نے مضامین اور ڈرامے بھی لکھے ہیں تاہم اس کا اصل کام اس کے ناول اور کہانیاں ہیں۔

ساؤل بیلو کے افسانوں اور ناولوں میں عہد حاضر کی عکاسی ملتی ہے اور وہ موجودہ کلچر کی تفہیم کراتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی نسل نے عالمی سطح پر جو سنجیدہ ناول نویس پیدا کیے ہیں' ان میں ساؤل بیلو ایک اہم نام ہے۔ اس نے ناول کو انسانیت کا ترجمان بنایا۔ اس کے ہاں رمز و ایجاز کا حسن ہے۔ جذباتی شدت نے بھی اس کے ناولوں اور کہانیوں کو نیا انداز بخشا ہے۔ اس کے ہاں جدید انسان کا تصور یہ ملتا ہے کہ اس کانپتی لرزتی دنیا میں یہ جدید انسان اپنے قدم جمانے میں کوشاں ہے جو عقیدے اور یقین سے محروم رہتا ہے۔ ساؤل بیلو انسان کی کامیابی کو اس کا جوہر نہیں سمجھتا بلکہ انسان کا وقار اس کی اصل عظمت ہے۔

1977ء---وی نسنٹ الیکسندر

اسپین کے جس شاعر وی نسنٹ الیکسندر کو 1977ء کا نوبل انعام برائے ادب دیا گیا' اس کے بارے میں یہ انکشاف بہت دلچسپ ہو گا کہ 1988ء تک اس کی کوئی کتاب انگریزی میں دستیاب نہیں تھی۔ اس کے کسی شعری مجموعے کا انگریزی میں ترجمہ نہیں ملتا۔ ڈان کارکس نے اس پر جو مضمون لکھا ہے اس کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ 1988ء تک اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود اسے ایک عالمی اور دنیائے ادب کے سب سے بڑے انعام کا حق دار ٹھہرایا گیا۔

وی نسنٹ الیکسندر 26 اپریل 1898ء کو سیوئیل اسپین میں پیدا ہوا۔ اس کے بارے میں جو دیگر معلومات ملتی ہیں' ان کے مطابق وہ مذہباً کیتھولک تھا۔ اس نے یونیورسٹی آف میڈرڈ سے 1919ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی' پھر 1919ء میں ہی اسی یونیورسٹی سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ ساری عمر اس نے شادی نہیں کی۔

وی نسنٹ الیکسندر عصر حاضر کا ترجمان ہے۔ اس نے ہسپانوی شاعری کی عظیم شعری روایات کا احیا کیا ہے۔ اسپین اور لاطینی امریکہ میں اسے ایک عظیم عوامی شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی شاعری فری ورس میں ہے اور اس میں اس نے محبت' موت اور ابدیت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس کی ابتدائی شاعری محبت کی حزنیہ شاعری تھی لیکن بعد میں اس کی شاعری اس قنوطی خالی پن کو ترک کر کے بلند انسانی اقدار اور موضوعات کی شاعری بنی۔

1978ء--- آئزک بشیوز سنگر

سنگر پولینڈ میں 1904ء میں پیدا ہوا' بعد میں وہ امریکی شہری بن گیا۔ مذہباً وہ یہودی ہے۔ اس نے کسی کالج سے کوئی تعلیمی ڈگری حاصل نہیں کی۔ اس نے ساری عمر تخلیق و تصنیف کو ہی اپنا ذریعۂ معاش بنائے رکھا۔

بشیوز سنگر کی کہانیوں کے تراجم بہت سی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کی کہانیاں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اس نے اپنی

کہانیوں میں زبردست تخلیقی مہارت سے پولش یہودیؐ روایات کی جڑوں کو پیش کیا جس کے حوالے سے اس نے عالمی انسانی صورت حال کی اپنی کہانیوں میں عکاسی کی۔ سنگر نے مشرقی یورپ میں بسنے والے یہودیوں کی بطور خاص اپنے افسانوں میں نمائندگی کی ہے۔ اس نے اپنے بچپن' جوانی اور پختہ عمر کے تجربات سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور قدیم اور جدید روایات کے درمیان تصادم کو تخلیقی حسن و معنویت کے ساتھ پیش کیا۔ اس کے ہاں تصوف کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ اس کی کہانیوں میں آزاد فکری' انسانی شکوک اور افکار کی متضاد متصادم آمیزش ملتی ہے۔ وہ بچوں اور بڑوں کا محبوب افسانہ نگار ہے۔

1979ء---اوڈی سیس ایلیٹس

1979ء کا نوبل انعام برائے ادب بھی ایک شاعر کو دیا گیا۔ اس شاعر کا تعلق یونان سے ہے۔

ایلیٹس 2 نومبر 1911ء کو کریٹ یونان میں پیدا ہوا۔ اس نے معمولی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ساری عمر شادی نہیں کی۔ آرٹ کے نقاد کی حیثیت سے بھی اس کا ایک مقام ہے۔

ایلیٹس کی شاعری کا موضوع آج کا انسان ہے۔ اپنی تمام تر ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے ساتھ اس نے عصر حاضر کے انسان کی جدوجہد کو پیش کیا ہے کہ وہ کس طرح آزادی اور تخلیق کے لیے کوشاں ہے۔

ایلیٹس کی شاعری کا ایک اور پہلو بہت اہم ہے کہ یہ شاعری نہ صرف بہت حد تک ذاتی ہے بلکہ یہ یونانی عوام کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔

1980ء---سلاؤ میلوز

سلاؤ میلوز پولینڈ میں 30 جون 1911ء کو پیدا ہوا۔ بعد میں اس نے امریکہ میں شہریت اختیار کر لی۔ اس نے پولینڈ میں اعلیٰ قانونی ڈگری حاصل کی تھی۔ 1935ء سے 1939ء تک وہ پولش ریڈیو سے بطور پروگرامر منسلک رہا۔ 1945ء سے 1950ء تک پولش وزارت خارجہ میں کام کیا اور سفارت کار کی حیثیت سے مختلف ملکوں میں رہا۔ اس کے بعد وہ امریکہ چلا گیا اور وہاں کچھ برسوں تک کیلیفورنیا یونیورسٹی میں پروفیسر رہا۔

نوبل انعام کے علاوہ اسے دوسرے بین الاقوامی اعزازات و انعامات سے بھی نوازا گیا۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں انسان تضادات اور مصائب میں گھرا ہوا ہے' اس دنیا میں شاعر کی آواز گونجتی ہے جس میں بصیرت اور راستی ہے۔ وہ ایک جلاوطن شاعر ہے۔ اس نے اپنے بارے میں کہا تھا: "میری جسمانی جلاوطنی نے میری روحانی جلاوطنی کو تخلیق کیا ہے" اور یہ روحانی جلاوطنی دراصل بنی نوع انسان سے عمومی طور پر تعلق رکھتی ہے۔

وہ ایک شاعر ہونے کے علاوہ ناول نگار' مترجم اور نقاد بھی تھا۔ ایک دانشور کی حیثیت سے تاریخ' عمرانیات اور سیاسی اور روحانی اقتدار کے حوالے سے بھی اس نے اہم کام کیا۔ اس نے نازی ازم کی تباہ کاریاں دیکھیں اور کمیونزم کے تشدد اور گھٹن کا بھی تجربہ کیا جس کی جھلکیاں اس کی شاعری میں ملتی ہیں۔ وہ انسانی دنیا کی ان کمینگیوں اور مظالم کے بارے میں بھی لکھتا ہے لیکن اس کی شاعری ہمیں امید کی روشنی دکھاتی ہے۔

1981ء---الیاس کینیٹی

الیاس کینیٹی جسے 1981ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا' بلغاریہ میں 25 جولائی 1905ء کو پیدا ہوا۔ بعد میں وہ آسٹریا چلا گیا اور وہاں سے برطانیہ۔ مذہباً وہ یہودی ہے۔ اس نے 1929ء میں یونیورسٹی آف وی آنا سے کیمسٹری میں ڈگری حاصل کی۔

کینیٹی کو اقتدار و اختیار کے موضوع سے زندگی بھر دلچسپی رہی۔ وہ اقتدار کے موضوع پر لکھتا رہا اور اس کے مطالعے کا مرکز

بھی یہی موضوع رہا۔ کینیٹی طرفہ تماشا آدمی ہے۔ بلغاریہ میں وہ پیدا ہوا لیکن اس نے اپنی پہلی تصانیف ہسپانوی میں لکھیں۔ تعلیمی اعتبار سے وہ سائنس دان تھا۔ برطانیہ' جرمنی' سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا میں وہ اپنے آپ کو "دی آناکا مصنف" کہتا تھا۔ وہ گوئٹے کا مداح تھا اور بریخت' کافکا اور کراس وغیرہ سے تعلقات بھی رہے اور انھیں وہ پسند بھی کرتا تھا۔

جب تک اسے 1981ء میں نوبل انعام نہیں ملا' وہ انگریزی دان ادبی دنیا کے لیے اجنبی تھا۔ عالمی سطح پر اسے نوبل انعام کے بعد ہی وسیع پیمانے پر پڑھا گیا۔ وہ سادہ بیانیہ کا قائل تھا۔ کہانی میں وہ مزاح اور خوف و دہشت کے روایتی عناصر پیش کرتا تھا۔ اس کا اہم ترین ناول "کراؤڈز اینڈ پاور" تسلیم کیا گیا ہے۔

1982ء---گابرئیل گارشیا مارکیز

مارکیز کولمبیا (لاطینی امریکہ) میں 6 مارچ 1928ء کو پیدا ہوا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ کسی بھی مذہب پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ 1950ء سے وہ لاطینی امریکہ اور کئی دوسرے ملکوں کے جرائد و اخبارات کے ساتھ بطور صحافی منسلک رہا۔ اس نے ایڈیٹر' سکرین رائٹر اور کاپی رائٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

گابرئیل گارشیا مارکیز عہد جدید کا عظیم ناول نگار اور کہانی کار ہے اور ساری دنیا میں مقبول ہے۔ اس کے ہر ناول اور کہانی کا ترجمہ دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اردو میں بھی اس کی کئی کہانیاں اور ناول ترجمہ ہوئے ہیں۔ اس کا ناول "تنہائی کے سو سال" اس دور کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس کے ناولوں اور کہانیوں میں حقیقت اور صداقت کے ساتھ فنکارانہ انداز میں قوت متخیلہ کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ اس نے انسانی زندگی کی کشمکش کو بڑی فنکاری سے بیان کیا ہے۔ اس کے ہاں الیگوری' سرئیلزم اور عہد حاضر کی صداقت یک جان ہو جاتے ہیں۔ وہ نظریاتی اعتبار سے دنیا بھر کے محنت کشوں اور ناداروں کا حامی ہے۔ اس کی سیاسی تحریریں بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ مارکیز بیسویں صدی کی اہم شخصیت بن گیا ہے۔

مارکیز کے اثرات عالمی ادب پر واضح طور پر محسوس کیے جا رہے ہیں۔ وہ بیسویں صدی کا ایک خلاق ترین کہانی کار اور ناول نویس ہے۔

1983ء---ولیم گولڈنگ

1983ء کا نوبل انعام برائے ادب ولیم گولڈنگ کو دیا گیا۔ ولیم گولڈنگ کی اہم تصانیف درج ذیل ہیں: دی لارڈ آف دی فلائیز' دی انہیریٹرز' پنچر مارٹن' فری فال' ڈارک نیس ویزیبل' رائٹس آف پیسج!

ولیم گولڈنگ 19 ستمبر 1911ء کو انگلستان میں پیدا ہوا۔ اس کا کسی بھی چرچ سے کوئی تعلق نہیں' وہ مذہبی آدمی نہیں۔ 1960ء میں اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اسی یونیورسٹی سے بی اے 1935ء میں کیا تھا۔ 40-1939ء میں وہ ایک اسکول میں پڑھاتا رہا۔ 1940ء سے 1945ء دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں وہ بحریہ میں ملازم ہو گیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ ایک اسکول اور پھر ہاکنز کالج میں پڑھاتا رہا۔

نوبل انعام کے علاوہ اسے یہ انعامات و اعزازات بھی مل چکے ہیں: کمانڈر آرڈر آف دی برٹش ایمپائر' بوکر پرائز' بلیک میموریل ایوارڈ' بوکر میکونیل پرائز وغیرہ۔

ولیم گولڈنگ کو جب نوبل انعام ملا تو اس پر خاصی لے دے ہوئی۔ اس کا وہ ناول جو اہم سمجھا جاتا ہے "لارڈ آف فلائیز" ہے۔ اس کے ناولوں کا موضوع وہ بدی ہے جو آج کی انسانی صورت حال میں خود انسان کے اندر کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہے۔ اس کے ہاں انسان کا بدی کی طرف جھکاؤ ایک مستقل موضوع ہے۔

1984ء---یاروسلاف سیفرٹ

سیفرٹ چیکوسلواکیہ کا مصنف تھا جسے 1984ء کا نوبل انعام برائے ادب دیا گیا۔ وہ 23 ستمبر 1901ء کو پراگ میں پیدا ہوا اور پراگ میں ہی اس کا انتقال 10 جنوری 1986ء کو ہوا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھا مگر پراگ چیکوسلواکیہ سے شائع ہونے والے کئی ادبی پرچوں کا مدیر رہا۔ اسے کئی انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔

سیفرٹ ناول نگار اور شاعر تھا۔ بطور شاعر اس کا مقام بہت اونچا ہے۔ اس کے ہاں انسانی روح کی آزادی اور تنوع کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس نے اپنی تحریروں میں ایک بند معاشرے میں رہتے ہوئے اس آزادی کا بھی دفاع کیا جو ظلم و استبداد کی دنیا میں تو دکھائی نہیں دیتی لیکن اپنا وجود رکھتی ہے۔ یہ آزادی اس کے نزدیک ہماری نظروں سے چھپی ہوئی ہے اور پابہ زنجیر ہے لیکن وہ صرف ہمارے خوابوں میں ہی دکھائی نہیں دیتی بلکہ اپنا وجود بھی رکھتی ہے۔ یہ ہماری روح' ہمارے آرٹ اور تخلیقات میں ظہور کرتی ہے۔ اس کی شاعری انسانی نجات کی امید دلاتی ہے۔

1985ء---کلائیڈ سائمن

1985ء کا نوبل انعام حاصل کرنے والے فرانسیسی مصنف کی اہم کتابیں مندرجہ ذیل ہیں: دی چیٹ' دی ٹائٹ روپ' انوئنٹمنٹ آف سپرنگ' دی ونڈ' دی گراس' دی فلینڈرز روڈ' بلائنڈ اوریون' کنڈکٹنگ باڈیز' لسبن ان تھنگز۔

کلائیڈ سائمن 10 اکتوبر 1931ء کو مدغاسکر میں پیدا ہوا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ کسی مذہبی عقیدے سے بھی منسلک نہیں تھا۔ تحریر و تصنیف ہی اس کا پیشہ رہا ہے۔ اسے پرکس ڈی لا اور ایکسپریس 1960ء اور پرکس میڈیچی 1967ء کے اعزازات نوبل انعام سے پہلے مل چکے تھے۔

سائمن ایک بڑا خلاق ناول نگار ہے۔ اس کے ناولوں میں شاعری اور مصوری کا امتزاج ملتا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی صورت حال کے بارے میں اس کا مطالعہ اور مشاہدہ اور بیانیہ بہت عمیق ہے۔

1986ء---وول سوئنکا

وول سوئنکا کا تعلق نائیجیریا سے ہے۔ نوبل انعام کے آغاز کے 85 برس بعد بالآخر سویڈش اکادمی نے ایک افریقی کو ادب کے نوبل انعام کا حقدار قرار دے ہی دیا۔ پیدائش: 1934ء' والد: اسکول انسپکٹر' مقام پیدائش: ابوکیوٹا' مذہب: عیسائی۔ آباؤ اجداد جنگجو قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو روحوں کی عبادت کرتے تھے۔ تعلیم: ایم اے' اباڈان یونیورسٹی۔ ادب میں گریجوایشن: لیڈز یونیورسٹی (1957ء)۔ وول سوئنکا کی تصانیف: مرگیا انسان (سیاسی قید کا تجربہ' ناول)' بچپن کے سال (خودنوشت)' دلدل کے باسی (ڈراما)' شہر اور نگینہ (ڈراما)' جنگلوں کا رقص (ڈراما)' پاگل اور ماہرین (ڈراما)۔

سوئنکا نے ایک بھرپور زندگی گزاری اور اس حوالے سے زندگی میں اس کا رویہ بھی بدلتا رہا۔ وہ تیسری دنیا کے ان معدودے چند لکھنے والوں میں سے ایک ہے جن کے ڈرامے یورپ اور امریکہ کی اسٹیج پر کھیلے جاتے ہیں۔ ڈرامے اور فلم کی دنیا میں وہ ایک معتبر نام ہے۔ ریڈیو کے لیے بھی اس نے بہت کچھ لکھا۔ اس کی سیاسی وابستگی اور عقیدے پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے 26 ماہ تک اپنے نوآزاد ملک میں اپنے خیالات کی وجہ سے قید و بند کی انتہائی صعوبتیں برداشت کیں۔ وہ انتہائی جرأت مند لکھنے والا ہی نہیں بلکہ ذاتی طور پر بھی وہ بہت نڈر واقع ہوا ہے۔ 1965ء میں وہ بندوق تھامے ریڈیو اسٹیشن چلا گیا جہاں اس نے وزیراعظم کی تقریر کی ٹیپ نکال کر' جو نشر ہو رہی تھی' اپنی تقریر شروع کر دی جو حکومت وقت کے خلاف تھی۔ اس کی پاداش میں اسے سخت سزا کا سامنا کرنا پڑا۔

1987ء---جوزف بروڈسکی

1987ء کا نوبل انعام ایک ایسے منحرف روسی شاعر کو دیا گیا جو امریکہ میں آباد ہو چکا تھا۔ بروڈسکی کو نوبل انعام دینے کا اعلان ہوا تو ایک بار پھر ایسے سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا جو 1987ء کے نوبل انعام کے حق دار شاعر کی شعری اور فنی قدر و قیمت کے حوالے سے پیدا ہوئے تھے۔ اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ نوبل انعام کے اعلان سے پہلے جوزف بروڈسکی کو عالمی شاعری کی دنیا میں کوئی خاص شہرت حاصل نہ تھی۔ یورپ اور امریکہ میں بھی اس کے پڑھنے والے بہت کم تھے۔
ایک امریکی یونیورسٹی کے استاد کی حیثیت سے بھی وہ زیادہ جانا پہچانا نہیں تھا۔ جوزف بروڈسکی کو اس وقت محدود حلقے میں جانا پہچانا گیا جب نوبل انعام کے اعلان سے پندرہ برس پہلے وہ روس چھوڑنے پر مجبور ہوا اور اس نے امریکہ کا رخ کیا۔ امریکہ میں اس کی آمد پر کچھ خبریں شائع ہوئیں اور کچھ مضامین اور اس کے بعد قصہ ختم۔ اسے وہ پذیرائی اور شہرت حاصل نہ ہو سکی جو سولژے نیتسن کو حاصل ہوئی تھی۔
جوزف بروڈسکی روسی زبان کا شاعر ہے۔ امریکہ آنے کے بعد اس کی نظموں کا ترجمہ انگریزی میں ہوا۔ اس کے بعد اس نے خود بھی اپنی نظموں کو انگریزی میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور پھر براہ راست انگریزی زبان میں بھی نظمیں لکھنے لگا۔
1987ء کے نوبل انعام کا حق دار قرار دیا گیا تو اسے عالمی شہرت حاصل ہوئی۔

1988ء---نجیب محفوظ

نجیب محفوظ مصر اور عربی زبان کا پہلا مصنف ہے جسے ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ وہ 11 دسمبر 1911ء کو قاہرہ کے ایک قدیم محلے الجمالیہ میں پیدا ہوا۔ قاہرہ کے ان گلی کوچوں کا ذکر نجیب محفوظ کے ناولوں اور کہانیوں میں عام ملتا ہے۔
اس نے 1934ء میں قاہرہ یونیورسٹی سے فلسفے کے ساتھ گریجوایشن کی اور فلسفیانہ موضوعات پر لکھنا شروع کر دیا لیکن بعد میں ادب کی طرف رجوع کرنے کے بعد اس نے فلسفیانہ مضامین لکھنے بند کر دیئے۔
1936ء سے 1939ء تک وہ اپنی مادر علمی میں ملازم رہا' پھر سرکاری ملازمت کی۔ وزارت اوقاف میں کچھ عرصہ رہا۔ 1971ء میں وہ وہاں سے ریٹائر ہوا اور قاہرہ کے مشہور اخبار "الاہرام" سے وابستہ ہوا۔ نوبل ادب انعام سے پہلے مصری حکومت اسے کئی اعزازات و انعامات سے نواز چکی ہے۔ جن میں جائزہ الدولہ التقدیریہ اور جمہوری اعزاز شامل ہیں۔ نوبل انعام ملنے کے بعد مصری حکومت نے اسے مصر کے سب سے بڑے اعزاز "قلادہ النیل" سے مشرف کیا ہے۔ نجیب محفوظ پہلا مصری مصنف ہے جس کی کہانیوں اور ناولوں پر مصر میں متعدد فلمیں بنائی گئیں اور ریڈیو اور ٹی وی کے لیے بھی اس کی تخلیقات کو بنیاد بنایا گیا۔
نجیب محفوظ بہت بڑا کہانی کار ہے لیکن اس کا اصل میدان ناول ہے۔ اس کے درجنوں ناول انگریزی' فرانسیسی' روسی اور جرمن زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ "القصرین" "قصر الشوق" اور "اسکریہ" اس کی Triology ہے جو عربی زبان میں پہلی الثلاثیہ ہے۔ اس کی اشاعت نے اسے دنیا کے عظیم ناول نگاروں کی صف میں پہنچا دیا تھا۔ اس کا ناول "ہمارے محلے کے بچے" ایک ایسا ناول ہے جو اب تک مصر میں شائع نہیں ہوا' یہ ناول "بیروت" سے شائع ہوا۔ اس کی اشاعت پر مصر میں اب تک پابندی عائد ہے۔
نجیب محفوظ کے فن کی اساس عام انسانوں کی زندگی پر ہے۔ اس حوالے سے وہ بڑا اہم ناول نگار اور کہانی کار ہے۔ مابعد الطبیعات روحانیت کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کے عناصر بھی اس کے فن میں گتھے ہوئے ہیں' لیکن نمایاں عنصر عام انسان کی زندگی اور اس کا مطالعہ ہے۔ اس نے اپنے عہد کے سیاسی امور کو بھی اپنے ناولوں کا حصہ بنایا ہے۔ اس اعتبار سے اسے متنازعہ بھی بنایا گیا۔

1989ء---کامیلوجوزسیلا

1989ء کا نوبل انعام ہسپانوی ادیب کامیلو جوزسیلا کو دیا گیا۔ جوزسیلا پانچواں ہسپانوی ادیب ہے جسے ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ وہ 1916ء میں اسپین کے شمال مغربی شہر اوریا خلاویا میں پیدا ہوا۔ اس کے والد ہسپانوی تھے اور والدہ کی رگوں میں برطانوی اور اطالوی خون دوڑ رہا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کامیلو نے ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کر لیا اور طب کی تعلیم حاصل کرنے لگا لیکن 1937ء میں جب اسپین میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا تو وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ خانہ جنگی کے بعد اس نے دوبارہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تاہم وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکا اور ڈاکٹر بھی نہ بن سکا۔

اس کی زندگی گوناگوں تجربات سے بھری ہوئی ہے۔ کچھ عرصے وہ بطور بل فائٹر اکھاڑے میں دکھائی دیا۔ اداکاری سے بھی اسے دلچسپی تھی' اس لیے اداکار بھی بنا۔ مصوری کے حوالے سے بھی اپنی ذات کا اظہار کرتا رہا پھر اس نے سرکاری ملازمت کر لی۔ ادب کی طرف آیا تو اس کی شناخت ہوئی اور 1989ء میں نوبل انعام حاصل کر کے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ اس نے ایک ادبی جریدہ بھی جاری کیا تھا۔ وہ رائل ہسپانوی اکادمی کا رکن بھی ہے۔

ناولوں کے علاوہ کامیلو نے سفرنامے' انشائیے اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ اس کا ایک شاہکار ناول Beehive ہے جس کا ترجمہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس پر فلم بھی بنائی گئی۔

اس کا دوسرا عظیم شاہکار ناول "فیملی آف پاسکل ڈوراۓ" ہے۔ اس ناول کی اشاعت پر اسپین کی حکومت نے اسے ضبط کر کے اشاعت پر پابندی لگادی تھی تاہم بعد میں یہ پابندی ختم کر دی گئی۔ اس ناول کا شمار عہد جدید کے بڑے ناولوں میں ہوتا ہے۔

کامیلو کے ناول ہیئت اور مواد کے اعتبار سے جدت کے نمایاں عناصر رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کی سفاکی کو معروضی انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کے باوجود قنوطیت اس کے ہاں نہیں ملتی' وہ سیاسی گھٹن کو تشدد کا منبع قرار دیتا ہے۔ انسانی اضطراب کی عکاسی کامیلو نے موثر ترین انداز میں کی ہے۔

1990ء---اوکتاویوپاز

اوکتاویو پاز کو بالعموم لاطینی امریکہ کا اہم ترین شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ 1914ء میں میکسیکو سٹی میں تولد ہوا۔ مبدء فیاض سے تخلیق کا ایسا جوہر عطا ہوا تھا کہ نوعمری ہی میں شاعری کا آغاز کر دیا۔ 1937ء میں جب اسپین کو خانہ جنگی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تو حساس اوکتاویو نے اس سے گہرا اثر قبول کیا اور اس کی شاعری پختگی کے ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنے ملک کی سفارتی سروس میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اس ملازمت کے دوران اسے فرانس' ہندوستان اور افغانستان میں طویل قیام کا موقع ملا۔ اس نے ان ممالک کی شعری وادبی روایات کی خوشہ چینی بھی کی اور اپنی تخلیقی مساعی کو کائناتی رنگ دیا۔ ہندوستان کے پس منظر میں اس نے کئی نظمیں لکھیں جن میں ہمایوں کا مقبرہ' برندابن' ہماچل پردیش اور لودھی باغ وغیرہ شامل ہیں۔ کسی بھی دھرتی کی روح سے ہم کلام ہوئے بغیر ایسی کامیاب شاعری کرنا ممکن نہ تھا۔ 1968ء میں میکسیکو کی حکومت نے طلبہ کی شورش کو دبانے کے لیے تشدد کا استعمال کیا جس کے خلاف احتجاج کے طور پر اوکتاویو پاز نے اپنی ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اس کی نثر' نظم اور افسانے کی حد بندیوں کو توڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ 1990ء میں اسے ادب کا نوبل انعام ملا۔

1991ء---ناڈائن گورڈیمر!

جنوبی افریقہ کی عظیم ناول نگار اور افسانہ نویس ہیں۔ آپ 1923ء میں جنوبی افریقہ کے شہر سپرنگز میں ایک متوسط انگریز گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ یونیورسٹی آف وٹواٹرز رینڈ سے گریجوایشن کے بعد انہوں نے درس و تدریس کا شغل اپنایا اور ساتھ ہی ساتھ قلم کاری بھی شروع کر دی۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "سافٹ وائس آف دی سرپنٹ" 1956ء میں منظر عام پر آیا۔ اس

کے بعد یکے بعد دیگرے ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں "سکس فیٹ آف دی کنٹری" مطبوعہ 1956ء اور "فرائیڈے فٹ پرنٹ" مطبوعہ 1960ء بہت مشہور ہوئے اور متعدد ادبی انعامات کے حق دار ٹھہرے۔ ناڈائن کئی ناول بھی لکھ چکی ہیں جن میں سے "اے ورلڈ آف سٹرینجرز" مطبوعہ 1958ء "او کیٹرن فار لوونگ" مطبوعہ 1963ء اور "دی لیٹ بورجیوس ورلڈ" مطبوعہ 1966ء عالمی شہرت کے حامل ہیں۔ ناڈائن کی تحریروں میں جنوبی افریقہ میں گوروں کی طرف سے کالوں کے استحصال' عدم رواداری اور عصبیت کے بارے میں حقیقت نگاری اپنی انتہا پر سانس لیتی نظر آتی ہے۔ ناڈائن کا قلم ایک دردمند ادیبہ کا قلم ہے جسے اپنی سرزمین سے پیار ہے اور جو اعلیٰ انسانی قدروں پر یقین رکھتی ہے۔ جو محبت' ایثار' اخلاق اور قربانی کے سوا کچھ نہیں۔ ناڈائن گورڈیمر کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 1991ء میں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔

1992ء---ڈیرک والکاٹ!

ویسٹ انڈیز کے عالمی شہرت یافتہ ڈرامانگار اور شاعر ہیں۔ آپ 1930ء میں جزیرہ سینٹ لوسیا میں تولد ہوئے۔ آپ نے سینٹ میریز کالج سینٹ لوسیا اور جمیکا یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں 1959ء سے 1976ء تک آپ ٹرنڈاڈ تھیٹر میں بطور ڈائریکٹر کام کرتے رہے۔ اس دوران ان کے تخلیق کردہ کئی ڈرامے اسٹیج کی زینت بنے۔ 1981ء میں آپ امریکہ تشریف لے گئے اور بوسٹن میں سکونت اختیار کرلی۔ آپ بوسٹن اور ہارورڈ یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی رہے۔ آپ نے شاعری کی پندرہ سے زائد کتب تخلیق کی ہیں جبکہ 30 کے قریب معرکتہ الآرا ڈرامے آپ کے کریڈٹ پر ہیں۔ آپ ایک خوبصورت فطرت نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں' جبکہ آپ کی تحریروں میں افریقی' انگریزی اور ڈچ تہذیبوں کی تمام تر خوبیاں اس انداز میں رچی بسی ہیں کہ ان کی علیحدہ شناخت کرنے کے بجائے متنوع خصوصیات کی حامل معاشرت میں محبت کی فضا میں سانس لینے کو جی چاہتا ہے۔ والکاٹ کی شاعری کی کتابوں کے نام یہ ہیں۔ "انیدر لائف (1973ء) سی گریپس (1976ء) دی سٹار ایپل کنگڈم (1979ء) دی فارچونیٹ ٹریولر (1981ء) دی آرکنساس ٹیسٹامنٹ (1987ء) اور اومرساس (1990ء)۔ ڈراموں میں "ڈریم آن منکی ماؤنٹین" مطبوعہ (1970ء) بے حد مشہور ہے۔ آپ کو 1992ء میں نوبل انعام عطا کیا گیا۔

1993ء---ٹونی موریسن!

امریکہ کی عظیم خاتون افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ آپ کا اصل نام کلوا نتھونی ووفورڈ ہے۔ آپ 1931ء میں لورین (اوہیو) میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ آپ بچپن ہی سے بہت ذہین تھیں۔ اپنی ذہانت اور علمی لگن کی بدولت آپ ہاورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوگئیں۔ وہاں آپ کو تھیٹر سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور آپ نے ایک ڈراما گروپ میں شمولیت اختیار کرلی۔ ساتھ ساتھ پڑھنے' اور جز وقتی لیکچرر شپ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ بعد ازاں آپ نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے کارنیل یونی ورسٹی میں داخلہ لیا اور 1955ء میں وہاں سے انگریزی میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ یونی ورسٹی کے دنوں میں آپ کی ملاقات جمیکا کے آرکیٹکٹ ہیرلڈ موریسن سے ہوئی اور باہمی پسند کے نتیجے میں دونوں رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ ہاورڈ یونیورسٹی ہی کے دنوں میں ٹونی موریسن قلم کاری کی طرف مائل ہوگئی تھیں۔ 1964ء میں آپ نے اپنا پہلا ناول شائع کیا جسے خاصی پذیرائی ملی۔ اس کے بعد "دی بلوئسٹ آئی" نامی ناول 1970ء میں منظر عام پر آیا جس نے ان کی شہرت کو چار چاند لگادیئے۔ اس کے یکے بعد دیگرے ان کے کئی ناول شائع ہوئے جن میں سولا (1973ء)' سانگ آف سالمن (1977ء)' ٹار بے بی (1981ء)' بی لووڈ (1987ء)' جاز (1992ء) اور روائٹ نیس اینڈ لٹریری امیجی نیشن (1993ء) کا شمار اعلیٰ ترین ادبی تخلیقات میں ہوتا ہے۔ آپ کو 1993ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ آپ کا تازہ ناول "پیراڈائز" ہے جو 1998ء میں شائع ہوا ہے۔

1994ء---او کنزا برو!

جاپان کے عظیم ادیب ہیں۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد آج تک جاپان میں ان کا مد مقابل ادیب پیدا نہیں ہوا۔ اوکنزا1935ء میں جاپان کے ایک دور دراز پہاڑی علاقے شی کوکو میں تولد ہوئے۔ 1954ء میں آپ نے ٹوکیو یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ آپ زمانہ طالب علمی ہی میں لکھنے لکھانے کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ 1958ء میں آپ نے شی ای کو (گرفت) کے نام سے ایک کہانی لکھی جسے جاپان کے سب سے بڑے ادبی اعزاز "آکوتا گاوا" کا مستحق سمجھا گیا۔ اس کے بعد ان کے تین ناول شائع ہوئے جنھوں نے ان کی ادبی عظمت پر مہر لگا دی۔ ابتداء میں آپ زمانۂ جنگ کے بعد کے جاپانی معاشرے کے مسائل پر ایک ایسے فنکار کے طور پر لکھتے رہے جو بائیں بازو کے افکار کا پرچارک تھا۔ مگر 1963ء میں اپنے ہاں ایک ذہنی معذور بیٹے کی ولادت اور ہیروشیما کے دورے کے بعد ان کے اندر ایک نیا انقلاب آیا۔ انہوں نے ان دنوں اپنی رلا دینے والی کہانی "مابن فوٹوبرو" (خاموش چیخ) تحریر کی۔ اس کے بعد ان کے کئی ناول منظر عام پر آئے جن میں جوہری بموں کی تباہ کاری، انسانی معاشرے پر پڑنے والے اثرات اور مصائب و آلام کو دردمندی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کے مشہور ناول میڈوری نوکی (جلتا ہوا سبز درخت) مطبوعہ 1993ء اور شی زوکانا سیکاٹسو (خاموش زندگی) مطبوعہ 1988ء ہیں۔ مؤخر الذکر پر ان کے نسبتی بھائی اتامی جوزو نے 1995ء میں ایک پر اثر فلم بھی بنائی ہے۔ آپ کو 1994ء میں ادب کا نوبل انعام ملا۔ آپ دوسرے جاپانی ادیب ہیں جنہیں اس اعزاز کا حق دار سمجھا گیا۔

1995ء---ہینے سیمس

آئرلینڈ کے شہرہ آفاق شاعر، مضمون نگار اور نقاد ہیں۔ آپ 1939ء میں شمالی آئرلینڈ کے علاقے لنڈنڈیری میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کسان تھے۔ آپ نے کوئنز کالج، بیلفاسٹ سے گریجوایشن کی اور بعد ازاں وہیں لیکچرار مقرر ہوئے۔ آپ نے 1966ء سے 1972ء تک تدریسی خدمات سرانجام دیں جس کے بعد کلی طور پر قلم کاری کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا۔ آپ نے "فیلڈ ڈے" نامی تھیٹر کمپنی کی بنیاد رکھی اور انگریز شاعر ٹیڈ ہوز کے ساتھ مل کر بہترین اور مقبول شاعری کے مجموعے "دی ریٹل بیگ" کی ادارت بھی کرتے رہے۔ 1984ء میں انہیں ہارورڈ یونیورسٹی کی جانب سے پروفیسری کی پیش کش ہوئی جسے آپ نے قبول کر لیا۔ 1989ء میں آپ آکسفورڈ یونیورسٹی منتقل ہو گئے جہاں 1994ء تک وہ شاعری کے پروفیسر رہے۔ ہینے کی شاعری میں فطرت کی نیرنگی اور آئرلینڈ کی سیاسی جد وجہد کی عکاسی ایک ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔ آپ ایک ایسے انقلاب پسند شاعر ہیں جو فرد کی آزادی، اعلیٰ قدروں کے فروغ اور رواداری کا پرچار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ آپ کے مشہور مجموعہ ہائے فن یہ ہیں۔ ڈیتھ آف اے نیچرلسٹ (1966ء)، ڈور انٹو دی ڈارک (1969ء)، ونٹرنگ آؤٹ (1972ء)، فیلڈ ورک (1979ء)، نارتھ (1975ء)، سٹیشن آئی لینڈ (1984ء)، ہالینٹرن (1987ء)، سی انگ تھنگز (1991ء) اور اسپرٹ لیول (1995ء)۔ آپ کو 1995ء میں ادب کا نوبل انعام عطا کیا گیا۔

1996ء---وسلاوا زمبروسکا!

پولینڈ کی عالمی شہرت یافتہ شاعرہ ہیں۔ آپ 1923ء میں پولینڈ کے علاقے کراکاؤ میں پیدا ہوئیں۔ آپ کی شاعری نے پولینڈ کی نئی نسل کو بے حد متاثر کیا ہے۔ آپ اگرچہ ایک حقیقت پسند شاعر ہیں تاہم آپ نے رومان کی چاشنی سے اپنی شاعری کو خالی نہیں رکھا۔ آپ کی مقبول نظم "پہلی نظر کی محبت" اس کی زندہ مثال ہے۔ آپ کی کتابوں کی تعداد نصف درجن سے زائد ہے۔ آپ کی ادبی خدمات کے باوصف آپ کو 1996ء میں نوبل انعام عطا کیا گیا۔ آپ آج کل کراکاؤ ہی میں مقیم ہیں۔

1997ء---ڈاریوفو!

اٹلی کے معروف ڈرامانگار اور اداکار ہیں جنہیں ان کے سیاسی طور پر متنازعہ ڈراموں کی وجہ سے بے حد شہرت ملی۔ فو 24 مارچ 1926ء کو سان جیانو میں پیدا ہوئے۔ آپ نے میلان اکیڈمی آف فائن آرٹس سے گریجوایشن کی اور 1950ء میں ایک مقامی تھیٹر سے بطور پلے بیک رائٹر منسلک ہو گئے۔ اس دوران ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے بھی کام کیا۔ 1955ء میں آپ روم چلے گئے اور تین سال تک دوسرے اداروں میں کام کیا۔ پھر اپنی بیوی اداکارہ فرانکا ریمے کے ساتھ اپنے تھیٹر گروپ "ڈاریو فو فرانکا کمپیگنا" کی بنیاد ڈالی۔ اس دوران متنازعہ ڈرامے تخلیق کرنے کی وجہ سے جہاں انہیں عوام میں شہرت ملی' وہیں حکام کی نظروں میں معتوب قرار پائے۔ آپ نے بعدازاں 1968ء اور 1970ء میں دو مزید تھیٹر گروپ قائم کیے جو فیکٹریوں' کارخانوں اور مزدوروں کے کلبوں میں جا کر ان کے تخلیق کردہ ڈرامے اسٹیج کرتے تھے۔ آپ کے ڈراموں میں پولیس اور انتظامیہ کے رویے' سیاست دانوں کی مکاریاں' عوام کی زبوں حالی اور معاشرے کی تمام منافقتیں اصل رنگ میں نظر آتی ہیں۔ آپ کی خوبصورت تخلیقات کی بدولت 1997ء میں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔

1998ء۔۔۔جوز سارامیگو!

1998ء کا نوبل ادب انعام پرتگالی ادیب اور دنیا کے ایک منفرد ناول نگار جوز سارامیگو کو دیا گیا۔ وہ 1922ء کو پرتگال کے جنوبی صوبے ریبا تیجو کے ایک گاؤں میں عام سے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالتے ہی غربت وافلاس سے پالا پڑا جس کے سبب اسکول کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ فکر معاش میں مزدوری کی، صحافت اپنائی، کئی اور پیشوں سے رجوع کیا اور آخرکار ایک اشاعتی ادارے سے منسلک ہو گئے۔ 1975ء کے ملکی سیاسی بحران نے یہ ملازمت بھی گنوادی اور چند برس کے اندر اندر جوز سارامیگو نے اپنی ساری توجہ لکھنے پر مرکوز کر دی۔ ان کا پہلا ناول "اے مینوئل آف پینٹنگ اینڈ کیلی گرافی" 1977ء میں شائع ہوا۔ اس کا بنیادی موضوع ایک فنکار کی نشوونما ہے۔ 1982ء میں اپنے دوسرے ناول "بلتزار اینڈ بلیمونڈا" سے وہ ادبی افق پر یکدم چمک اٹھے۔ یہ ایک پہلو دار تاریخی ناول ہے جس کے بنیادی اوصاف میں تخیل کی فراوانی اور بصیرت افروز اسلوب کو اہمیت حاصل ہے۔ 1984ء میں ان کا ناول "رکاردو رائز کی موت کا سال" شائع ہوا۔ ان کا ناول "پتھر کا بیڑا" سیاست دانوں اور صاحبان اقتدار پر گہری نظر ہے۔ "لزبن کے محاصرے کی تاریخ" نامی ناول 1989ء میں شائع ہوا۔ زبان پرشکوہ اور اسلوب پیچیدہ ہے اور سارامیگو تاریخ کو از سرنو لکھنے میں نہایت کامیاب رہے۔ اسی کامیابی نے انہیں یہ راہ دکھائی کہ وہ یسوع مسیح کی زندگی پر قلم اٹھائیں۔ اس ناول پر بہت شور مچا۔ "اندھاپن۔۔۔ایک ناول" 1995ء میں شائع ہوا۔ اس کا تانا بانا ایک مرکزی علامت کے گرد بنا گیا ہے۔ سرخ بتی پر ٹریفک رکا ہوا ہے۔ بتی سبز ہونے پر ٹریفک چل پڑتا ہے سوائے ایک گاری کے جس کے اندر بیٹھا آدمی چیخ رہا ہے: "میں اندھا ہو گیا" ان کی تازہ ترین کتاب "سارے نام" (All The Names) ہے۔ سارامیگو کو زبان کے استعمال پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ انہوں نے زبان و بیان میں نت نئے تجربے کیے اور اپنے اسلوب کی روانی ونغمگی سے بے حد داد پائی۔ ان کے ناولوں کی بنیاد پرتگال کی تاریخ، سیاسی جبر اور غربت پر رکھی گئی ہے۔ اس حوالے سے ان کا موازنہ کولمبیا کے گبریل گارشیا مارکیز سے کیا جاتا ہے۔ خود کو نوبل انعام ملنے پر جوز سارامیگو نے کہا: "پرتگیزی زبان کو اس انعام کے لیے سو برس تک انتظار کرنا پڑا۔"

1999ء۔۔۔گنٹر گراس

''اگر کتابیں دستیاب نہ ہوں گی تب بھی داستان گو موجود ہوں گے!''

یہ الفاظ جرمن شاعر، ناول نگار اور ڈرامانویس گنٹر گراس کے ہیں جس نے اپنے غیر معمولی ناول ''دی ٹن ڈرم'' سے جرمن نسل کی ادبی ترجمانی کا اعزاز حاصل کرلیا۔ وہ نازی دور میں پروان چڑھا۔ 1999ء میں نوبل ادب انعام حاصل کرنے پر اس نے اپنے آپ کو آ گہی کا ایک ایسا پیام برقرار دیا جو بعد از وقت آیا اور جس کا دل دلیل سے بھر چکا تھا۔ اس کے بیشتر ناولوں کا پس منظر اس کی جائے ولادت ڈان زگ ہے جہاں اس کا باپ سبزی بیچتا تھا۔ گراس نے ابتدائی تعلیم کے بعد سولہ برس کی عمر میں فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ دوسری جنگ عظیم میں وہ زخمی ہوا اور چیکوسلواکیہ میں جیل کاٹی۔ 1946ء میں رہائی پانے کے بعد گراس نے مجسمہ سازی سیکھنے کے لیے آرٹ اکیڈمی میں داخلہ لیا۔ 1955ء تک یہی مشغلہ رہا۔ اس دوران اٹلی، فرانس اور اسپین کے سفر بھی کیے اور 1954ء میں اینا مارگریٹ بچوارڈز سے شادی کی۔ 1978ء میں طلاق ہونے کے بعد گراس نے اگلے برس اٹی گرونٹ سے شادی کی۔ اس نے ناول نگاری کے علاوہ بے شمار ڈرامے لکھے اور اپنے مضامین میں حالیہ جرمن تاریخ کے ساتھ ساتھ سیاست اور دیگر مسائل پر قلم اٹھایا۔ گراس کی اہم تخلیقات میں ''The Rat''، ''The Call of the Toad''، ''Dog years'' اور ''Mouse and Cat'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اول الذکر میں ناول کا بیان کنندہ ایک چوہیا کو بطور تحفہ پاتا ہے جو مختلف کہانیوں میں یہ ثابت کرتی ہے کہ چوہے زمین کے وارث بنیں گے۔ موخر الذکر ناول دو بیواؤں کی کہانی ہے جو ان جرمنوں کی واپسی کے متعلق ہے جو بعد از جنگ جلاوطن کیے گئے۔ گراس ''برلن اکادمی فنون'' کا صدر بھی رہا۔ اس نے بے شمار انعامات حاصل کیے جن میں گریپل 47 پرائز (1958ء) کرٹیکس پرائز (1960ء جرمنی) فارن بک پرائز (1968ء) بوینز ہینس پرائز (1949ء) اور مانڈیلو پرائز (1977ء پالرمو) وغیرہ شامل ہیں۔ کئی نامزدگیوں کے بعد اسے ''The Rat'' پر 1999ء میں نوبل انعام ملا۔

2000ء۔۔۔گاؤ زنجیان

گزشتہ صدی کے آخری برس میں ادب کا نوبل انعام پانے والے گاؤ زنجیان 4 فروری 1940ء کو شرقی چین کے صوبے یانگ سی میں ''یان ژوا'' کے مقام پر پیدا ہوئے۔ باپ ایک بینکار اور ماں شوقیہ اداکارہ تھی۔ بنیادی تعلیم عوامی جمہوریہ چین کے مختلف اسکولوں سے حاصل کی اور پھر بیجنگ سے 1962ء میں فرانسیسی زبان میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ 67-1966ء کے ثقافتی انقلاب کے دوران انہیں واپس تعلیم کے کیمپ میں بھیجا گیا جہاں گاؤ نے وہ سارے مسودے نذر آتش کر دیے جو اس وقت تک لکھے ہوئے تھے۔ 1979ء میں انہوں نے فرانس اور اٹلی کے سفر کیے۔ 87-1986ء کے دوران ان کی مختصر کہانیاں، مضامین اور ڈرامے چین کے ادبی رسالے میں شائع ہوئے اور درج ذیل چار کتابیں شائع ہوئیں: (1) جدید افسانوی ادب کے فن پر ابتدائی بحث (2) ''سرخ چونچ نامی کبوتر'' 1985ء (3) ڈراموں کا مجموعہ 1985ء (4) ڈرامائی پیش کش جدید ہیئت کی تلاش میں۔ ان کی انگریزی تصانیف میں ''جنگلی آدمی''، ''بھگوڑے''، ''دوسرا کنارہ''، ''پہاڑ کی روح'' اور ''ایک آدمی کی بائبل'' خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ڈراما نگار کے طور پر گاؤ نے 1982ء میں اپنی پہچان کرائی اور ان کا پہلا ڈراما منظر عام پر آیا تاہم اگلے برس اس پر پابندی عائد کردی گئی۔ ان کے ڈرامے ''بس اسٹاپ'' (1983) کو ذہنی آلودگی کے خلاف مہم کے دوران فضول قرار دیا گیا۔ 1986ء میں ''دوسرا کنارہ'' پر پابندی لگا دی گئی اور تب سے اب تک ان کا کوئی ڈراما چین میں نہیں کھیلا گیا۔ 1987ء میں انہوں نے فرانس میں سیاسی پناہ حاصل کر لی۔ ''بھگوڑے'' 1989ء کے قتل عام پر لکھا گیا جس پر حکومت چین نے انہیں ''ناپسندیدہ شخصیت'' قرار دے دیا۔ ان کی بیشتر تصانیف دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

2001ء۔۔۔وی ایس نائپال (Vidiadhar Surajprasad Naipaul)

نئی صدی کے اولیں برس میں نوبل ادب انعام کے لیے سویڈش اکادمی نے جس ادیب کا انتخاب کیا، وہ ہندی نژاد برطانوی مصنف وی ایس نائپال ہے۔ انعام کا اعلان ہوتے ہی ہندوستان کے ساتھ ساتھ دنیا کے دیگر گوشوں سے بھی اس انتخاب پر تنقید کا آغاز ہو گیا اور اکادمی کا یہ فیصلہ اعتراضات کی لپیٹ میں آ گیا۔ روزنامہ ''دی ٹائمز آف انڈیا'' نے نائپال کی اسلام دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا: ''نائپال کے نظریات ناپختہ اور جذباتیت سے آلودہ ہیں۔ اسلام کے بارے میں اس کا رویہ معاندانہ ہے۔ اسے ایسے حالات میں نوبل انعام دیا گیا جب سارا عالم اسلام مضطرب ہے۔۔۔'' اس کے برعکس نوبل کمیٹی نے نائپال کے استحقاق کے جواز میں لکھا: ''وہ ایسے ادیب ہیں جن کا ہاتھ وقت کی نبض پر ہے۔ انہوں نے ادب کے عصری رجحان اور آدرش سے اتفاقی اختیار کر کے اپنے لیے الگ راہ نکالی ہے۔ یہ وہ راہ ہے جس میں فکشن اور نان فکشن کے مابین روایتی فرق خاصا کم ہو گیا ہے۔'' کمیٹی کے مطابق نائپال نے ایک گمنام، پسماندہ اور کچلے ہوئے طبقے کو دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے جو اب تک اس کی نگاہوں سے روپوش تھا۔ یہ پیا ہوا طبقہ ہندوستان کے غریب لاچار عوام ہیں جن کی بدحالی سے متعلق نائپال کے تین ناول قابل ذکر ہیں: (1) اندھیر نگری۔ 1964ء، (2) ہندوستان۔۔۔ ایک زخمی تہذیب (1977ء)۔ (3) ہندوستان۔۔۔ اب دس لاکھ غدر (1990ء)

وی ایس نائپال کا خاندان بھی اسی کچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ 1880ء میں اس کے دادا ایک جبری مزدور کے طور پر ہندوستان سے ٹرینی داد گئے۔ ان کی زندگی افلاس میں گزری۔ نائپال کے والد شوپرساد نے پڑھ لکھ کر صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ ان کی تحریروں میں جدوجہد اور احتجاج کی واضح جھلک ہے۔ نائپال کے ناول ''اے ہاؤس فار مسٹر بسواس'' کو ایک اہم تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ اس میں کہانی کا ہیرو نائپال کا والد شوپرساد ہے۔ کہانی کے مطابق ایک ہندوستانی برہمن ٹرینی داد میں جا بسا ہے، لیکن اپنی جڑ سے اکھڑ جانے کا غم اسے گھُن کی طرح لگا تار رہتا ہے۔ اس کی بیشتر تخلیقات کا موضوع یہی جڑ کی تلاش ہے جو آفاقی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اپنی جڑ کی تلاش میں نائپال خود بھی کئی بار ہندوستان آیا اور پٹنہ سے لے کر پورے ملک کو ایک ایسا پیشاب خانہ قرار دیا جس میں عفونت، سڑاند اور تعفن ہے۔ نائپال کی دیگر تخلیقات درج ذیل ہیں: (1) امنگ دی بیلیورز۔ 1981ء۔ (2) فائنڈنگ دی سنٹر۔ 1984ء (3) این انگما آف ارائیول۔ 1987ء۔۔۔ اسی پر اسے نوبل انعام دیا گیا۔ (4) اے وے ان دی ورلڈ۔۔۔ 1994ء، (5) بی یانڈ بیلیف۔۔۔ 1998ء، (6) ہاف اے لائف۔۔۔ 2001ء۔

نائپال نے ٹرینی داد کے شہر پورٹ آف اسپین کے علاقے چاگوناز میں جنم لیا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں انگلستان کا سفر کیا اور یونیورسٹی کالج آکسفورڈ سے تعلیم پائی۔ 1953ء میں آرٹس میں بی اے کی ڈگری لی اور انگلستان ہی میں اقامت اختیار کر لی۔ پچاس کی دہائی کے درمیانی چند برسوں میں نائپال نے خود کو مکمل طور پر تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دیا۔ اس کی پہلی تصنیف ''The Mystic Masseur'' 1957ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کی تصانیف ''گوریلے'' (1975ء) اور ''دریا میں ایک موڑ'' (1979ء) شہری دنیا میں نوآبادیاتی نظام اور اس کے نتیجے میں ابھرنے والی قوم پرستی کا احاطہ کرتی ہیں۔ موخرالذکر میں افریقہ کی تصویر کشی اس خوبصورتی سے کی گئی ہے کہ جسے کونرڈ کے A Heart of Darkness کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔ نوبل انعام سے پہلے نائپال نے جو ادبی انعام حاصل کیے، ان میں بکر پرائز 1971ء اور ٹی ایس ایلیٹ ایوارڈ 1986ء شامل ہیں۔ 1990ء میں نائپال کو ملکہ الزبتھ نے نائٹ ہڈ (Knighthood) کا اعزاز عطا کیا۔
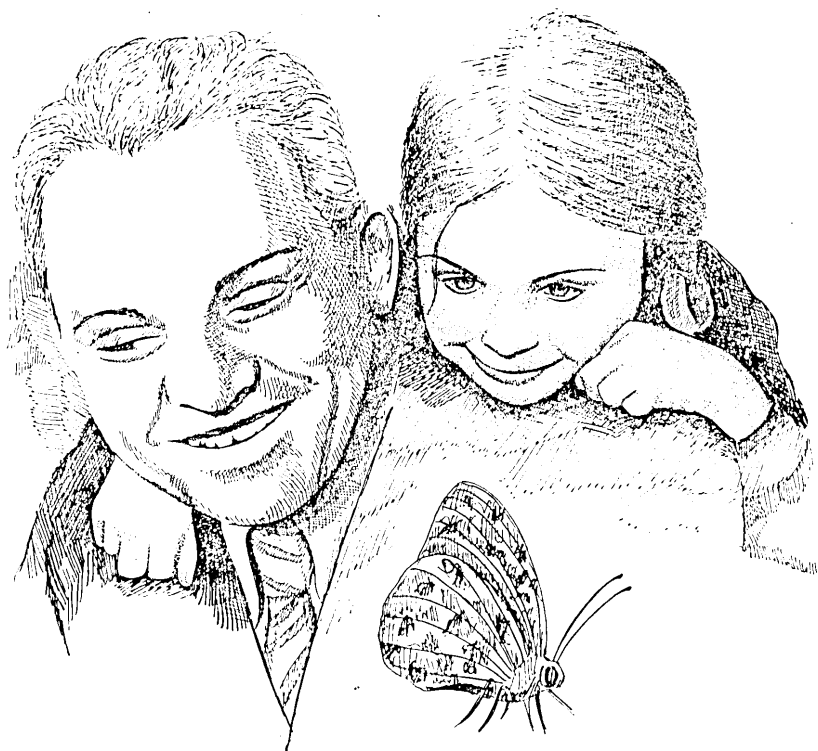
سونار دیش کا جادو

کابلی والا

ایک بابل کا ماجرا، اس کے
آنگن میں چڑیوں کا چنبہ بھی تھا

رابندر ناتھ ٹیگور

میری بٹی، مینی تھی تو صرف پانچ برس کی مگر ایک لمحے کو بھی
خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ دنیا میں قدم رکھنے کے بعد صرف بارہ مہینے
میں اس نے بات کرنا سیکھ لیا پھر تو جب تک وہ جاگتی رہتی، دم بھر کو
اس کی زبان نہ رکتی۔ اس کی ماں کبھی کبھی ڈانٹ ڈپٹ کر اسے چپ
کرا دیتی مگر یہ مجھ سے کیوں کر ہوتا۔ میرے خیال میں مینی کی
خاموشی ایک غیر فطری بات تھی جسے میں زیادہ دیر تک برداشت نہ کر
سکتا تھا۔ یوں میری اور اس کی پہروں دل کھول کر باتیں ہوا

کرتیں۔

صبح کا وقت تھا۔ میں اپنے ناول کا سترہواں باب شروع کرنے بیٹھا ہی تھا کہ منی آموجود ہوئی۔ کہنے لگی: ''بابا دیال، کاگ کو کوا کہتا ہے۔ نرا مورکھ ہے۔ کچھ جانتا نہیں نا!'' اس سے پہلے کہ میں مختلف زبانوں کا فرق اسے سمجھاتا اس نے دوسرا مضمون چھیڑ دیا: ''بابا! بھولا کہتا ہے کہ آسمان پر ایک ہاتھی ہے وہ اپنی سونڈ سے پانی چھڑکتا ہے تو بارش ہوتی ہے۔ بھولا کیسی کیسی باتیں بناتا ہے دن رات بکے جاتا ہے۔'' یہ کہتے کہتے وہ میز کے قریب میرے پاؤں کے پاس آ بیٹھی اور میرے گھٹنوں سے کھیلنے لگی ادھر میرے ناول کے سترہویں باب میں پرتاب سنگھ، کنچن مالا کو لئے اندھیری رات میں قید خانے کے اونچے دریچے سے ندی میں کود رہا تھا۔

میرا مکان سڑک کے کنارے واقع ہے۔ اچانک منی کھیلنا چھوڑ کر کھڑکی کی طرف دوڑی اور زور زور سے چیخ مچانے لگی: ''کابلی والا، او کابلی والا'' ڈھیلا ڈھالا موٹا لباس پہنے، پگڑی باندھے، پیٹھ پر ایک جھولی لٹکائے اور انگوروں کے کچھ ڈبے ہاتھ میں اٹھائے ایک لمبا تڑنگا کابلی افغان ادھر سے گزر رہا تھا۔ نہ جانے اسے دیکھ کر میری بھولی بچی کو کیا سوجھا کہ یوں اسے بے ساختہ پکارنے لگی۔ مجھے خیال ہوا کہ اگر پشت پر جھولی ڈالے یہ بلائے بے درماں ادھر آ دھمکا تو میرے ناول کا سترہواں باب پورا نہ ہو سکے گا۔ خیر جونہی کابلی نے ہنستے ہوئے میرے مکان کا رخ کیا، بچی گھبرا کر گھر میں جا گھسی۔ اسے یہ ان دیکھا یقین تھا کہ اگر تلاشی لی جائے تو کابلی کی جھولی کے اندر انسانوں کے منی جیسے کئی بچے ملیں گے۔ کابلی اندر آیا اور مجھے سلام کر کے کھڑا رہا۔ میں نے سوچا کہ اگرچہ میرے ناول کا ہیرو پرتاب سنگھ اور ہیروئن کنچن مالا، اس وقت خطرناک دور سے گزر رہے ہیں مگر یوں اس کابلی کو گھر بلا کر بغیر کچھ خریدے ٹال دینا مناسب نہیں، سو میں نے کچھ الٹا سیدھا سودا کیا۔ کچھ امیر عبدالرحمن کا ذکر آیا کچھ روس اور انگریزوں کے درمیان سرحد کی حفاظت کے بارے میں جو معاہدہ طے پایا تھا اس کے بارے میں بھی باتیں ہوئیں۔ چلتے وقت کابلی نے مجھ سے پوچھا: ''بابو جی تمہارا لڑکی کدھر گیا؟'' منی کے دل میں کابلی کے بارے میں جو بے بنیاد خوف پیدا ہو گیا تھا اسے دور کرنے کے لیے میں نے بچی کو بلا بھیجا۔ منی آ گئی مگر مجھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور کابلی اور اس کی جھولی کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ کابلی نے اپنی جھولی میں سے کچھ کشمش، کچھ خوبانیاں نکال کر منی کی طرف بڑھائیں مگر اس نے ان چیزوں کو قبول نہ کیا بلکہ اور بھی خوفزدہ ہو کر وہ میرے زانو سے چمٹ گئی۔ یہ تھی منی اور کابلی کی پہلی ملاقات!

کچھ دنوں بعد ایک روز میں کسی ضرورت سے گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ منی دروازے کے پاس بنچ پر بیٹھی ہے اور مسلسل بکے جا رہی ہے۔ کابلی اس کے پاس بیٹھا اس کی باتیں سن رہا ہے، ہنس رہا ہے اور کبھی کبھی ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہے۔ منی کو اپنی پانچ سالہ زندگی میں میرے سوا کوئی ایسا شخص نہیں ملا تھا جو اس کابلی کی طرح پورے انہماک سے اس کی باتیں سنتا۔ میں نے دیکھا کہ منی کا چھوٹا سا آنچل بادام، کشمش، اخروٹ وغیرہ سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے کابلی سے کہا: ''خان تم یہ تکلیف کیوں کرتے ہو۔ اسے چیزیں نہ دیا کرو۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے ایک اٹھنی دی جسے اس نے بغیر کچھ کہے اپنی جھولی میں ڈال لیا۔

جب میں گھر لوٹا تو دیکھا کہ اس اٹھنی نے اچھا خاصا ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ میری بیوی ایک گول سی چمکدار چیز ہاتھ میں لئے منی سے پوچھ رہی ہے: ''بتا تجھے یہ اٹھنی کہاں سے ملی؟'' منی کہہ رہی تھی: ''مجھے کابلی نے دی ہے۔'' اس کی ماں نے کہا: ''تو نے کابلی سے یہ اٹھنی کیوں لی؟'' اس ہنگامے سے گھبرا کر میں منی کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ کابلی اور منی کی یہ دوسری ملاقات نہ تھی۔ کابلی کو جس کا نام رحمت تھا، دیکھتے ہی منی پوچھتی: ''کابلی، تمہاری جھولی میں کیا ہے؟'' رحمت بے ضرورت ایک نون غنہ ڈال کر کہتا: ''ہانتھی۔'' یعنی اس کی جھولی میں ایک ہاتھی ہے۔ کابلی کے خیال میں یہ نہایت ہی لطیف مزاح تھا۔ یہ مذاق اگرچہ چنداں لطیف نہ تھا مگر دونوں اس پر خوب ہنستے۔ ایک ادھیڑ عمر شخص سے ایک ننھی منی لڑکی کی دلچسپ باتیں سن کر میرا بھی دل بہل جاتا۔ کابلی اکثر منی کو پستہ، بادام وغیرہ دے جاتا تھا غالباً انہی تحفوں سے اس نے بچی کا دل موہ لیا تھا۔ دونوں کے درمیان خوب گھل مل کر باتیں ہوا کرتیں۔ رحمت منی سے پوچھتا: ''منی بابا، تم سسرال کب جائے گا؟'' بنگالی لڑکی شاید پیدا ہوتے ہی سسرال کے لفظ سے آشنا ہو جایا کرتی ہے، لیکن ہم لوگ چونکہ نئی روشنی کے زیر اثر آ چکے تھے ہماری بچی کو اس وقت تک اس کا علم نہ تھا، تاہم بات کا جواب نہ دینا اور خاموش رہ جانا منی کی فطرت کے خلاف تھا وہ کابلی کے سوال کے جواب میں ایک سوال جڑ دیتی: ''کابلی تم سسرال نہیں جاؤ گے؟'' رحمت اپنے فرضی سسر کو نشانہ بناتے ہوئے ایک بھاری سا گھونسہ اٹھاتا: ''ام اپنا سسرال کو اس سے ماریں گا۔'' منی یہ تو نہیں جانتی تھی کہ سسر کس بلا کا نام ہے مگر اس بیچارے فرضی سسر کی مشکل کا اندازہ کر کے وہ زور سے ہنس پڑتی۔

ان دنوں پت جھڑ کا موسم تھا۔ ایسے ہی دنوں میں اگلے زمانے کے راجہ مہاراجہ دنیا فتح کرنے نکلا کرتے تھے۔ میں خود کبھی کلکتہ سے

باہر نہیں نکلا اسی لئے میرے خیالات دنیا بھر میں چکر لگاتے پھر رہے تھے۔ میں اپنے مکان میں گوشہ نشین ہو گیا ہوں مگر میرا دل ہر وقت باہر کی دنیا میں لگا رہتا ہے۔ کسی اجنبی ملک کا نام سنتے ہی میری سوچ کو پر لگ جاتے ہیں۔ کسی پردیسی کو دیکھتا ہوں تو تخیل کے پردے پر اس ملک کی ندی، پہاڑ اور جنگل کے دامن میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا نمودار ہو جاتا ہے، ایک ہنستی گاتی زندگی کا خاکہ میرے ذہن میں کھنچ جاتا ہے۔ اگرچہ میرا دل ساری دنیا میں لگا رہتا ہے لیکن میں ایسا درخت بن گیا ہوں جو اپنے پیروں کی مٹی کو مضبوطی سے پکڑے رکھتا ہے۔ جب کبھی گھر سے نکلنے کی ضرورت آن پڑے تو سر پر گویا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ اسی لئے اپنے گھر میں، چھوٹے سے کمرے میں اپنے میز کے پاس بیٹھے بیٹھے اس کابلی کی باتیں سن کر سیر و سیاحت کا شوق پورا کر لیتا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی بنگالی مگر گرجدار آواز میں کابلی میری آنکھوں کے سامنے ایک نقشہ سا کھینچ دیتا: پہاڑی پگڈنڈی ہے جس کے دونوں طرف سرخی مائل پتھریلی زمین ہے۔ بے آب و گیاہ راستے پر پگڑی باندھے تاجروں اور راہ گیروں کا قافلہ چلا جا رہا ہے۔ کوئی اونٹ پر سوار ہے کوئی پیدل چل رہا ہے۔ کسی کے پاس پرانی وضع کی بندوق ہے، کوئی ہاتھ میں برچھا اٹھائے ہے۔

منی کی ماں کی طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ذرا سی بات پر گھبرا جایا کرتی ہے۔ اس کی عمر زیادہ نہیں مگر زندگی کے نشیب و فراز سمجھنے کے لئے کافی ہو چکی تھی پھر بھی اس کے دل میں یہ وہم بیٹھ گیا تھا کہ دنیا کا ہر کونہ چوروں، شرابیوں، سانپوں، شیروں، ملیریا کے کیڑوں اور گوروں سے بھرا پڑا ہے۔ سڑک پر معمولی سا شور ہوتا تو سمجھتی کہ دنیا بھر کے شرابی، اسی کے گھر کی طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ ایسی صورت میں رحمت کابلی اسے کیوں کر پسند آتا۔ اس کی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھنے کے لیے وہ مجھے بار بار تاکید کرتی۔ اس کے شکوک ہنس کر ٹالنے کی کوشش کرتا تو سوال کرنے لگتی: ''کیا کبھی کسی کا بچہ چوری ہوتے نہیں سنا؟ کیا کابل میں بردہ فروشی نہیں ہوتی؟ کیا ایک لمبے تڑنگے کابلی کے لئے ایک چھوٹی سی بچی کا اٹھا لے جانا ناممکن ہے؟'' میں مان لیتا کہ یہ سب امکان سے باہر نہیں تھا مگر پھر بھی رحمت کابلی کے متعلق ایسا گمان رکھنا نامناسب تھا۔ خیر اعتماد کا مادہ ہر شخص میں یکساں نہیں ہوتا۔ میری بیوی بدستور بدگمان رہتی اگرچہ میں رحمت کو اپنے گھر آنے سے روک نہ سکا۔

ہر سال ماگھ کے مہینے میں رحمت کابلی اپنے وطن چلا جاتا۔ ان دنوں اسے گھر گھر جا کر اپنا بقایا وصول کرنے کی مصروفیت ہوتی تھی پھر بھی اب کے برس وہ ہر روز وقت نکال کر منی کو درشن دے جاتا۔ صبح کو نہ آ سکتا تو شام کو آ جاتا۔ اسے میرے گھر پر دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوتی۔ ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے جھولی لٹکائے اس لمبے تڑنگے شخص کو اندھیری کوٹھری کے ایک کونے میں بیٹھا دیکھ کر دل میں کچھ کھٹکا تو ہوتا تھا مگر جوں ہی منی ''کابلی والا، کابلی والا'' پکارتی، کھلکھلاتی ہوئی دوڑتی ہوئی چلی آتی اور دونوں میں مذاق کی جانی بوجھی باتیں شروع ہو جاتیں، تو دیکھنے والوں کو قدرے اطمینان ہو جاتا۔

کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ جاتے جاتے جاڑا اپنا زور دکھا رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹا پروف دیکھ رہا تھا۔ صبح کی دھوپ جو کھڑکی سے ہو کر میرے پیروں پر پڑ رہی تھی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ کوئی آٹھ بجے کا عمل ہوگا۔ صبح کے ٹہلنے والے اپنے سر اور کان گلوبند میں لپیٹے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ اتنے میں گلی میں سے شور وغل بلند ہونے لگا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا کہ رحمت کو دو پولیس والے پکڑے لئے جاتے ہیں۔ تماشائی لڑکوں کا ایک ہجوم بھی ہمراہ ہے۔ رحمت کے کپڑوں پر خون کی چھینٹیں تھیں۔ میں نے باہر نکل کر سپاہیوں سے ماجرا دریافت کیا۔ کچھ ان لوگوں سے کچھ رحمت سے سن کر پتہ چلا کہ ہمارے پڑوس میں ایک شخص نے رحمت سے ایک رام پوری چادر ادھار لی تھی جس کا کچھ روپیہ باقی رہ گیا تھا مگر اب وہ شخص چادر لینے ہی سے مکر گیا۔ اسی تکرار میں بات بڑھ گئی اور رحمت نے اسے چھرا مار دیا۔ رحمت اس شخص کو موٹی موٹی گالیاں دے رہا تھا۔ اتنے میں ''کابلی والا، کابلی والا'' پکارتی ہوئی منی گھر کے باہر آ موجود ہوئی۔

رحمت کا چہرہ خوشی سے پھول کی طرح کھل گیا۔ آج کابلی کے پاس جھولی نہیں تھی چنانچہ ''ہاتھی'' کا ذکر نہ ہوا۔ منی نے اچانک پوچھا: ''کابلی، کیا سسرال جاؤ گے؟'' رحمت نے ہنس کر کہا: ''وہیں جا رہا ہوں۔'' لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے جواب سے منی کو لطف نہیں آیا تو اپنے ہاتھ سے اشارہ کر کے اس نے کہا: ''ان سسروں کو ام مار کے بڑا کر دیتا لیکن کیا کرے ہاتھ بندھا ہے۔'' ایک شخص پر قاتلانہ حملہ کرنے کے جرم میں رحمت کو کئی سال کی سزا ہو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد ہم لوگ اس قصے کو بھول گئے۔ ہمیں کبھی بھولے سے بھی خیال نہ آیا کہ ایک آزاد پہاڑی باشندہ قید خانے کے اندر کیوں کر دن گزار رہا ہے۔ منی کی اس فراموش کاری پر مجھے شرم آتی، اپنے پرانے دوست کو بھول کر اس نے نبی سائیں سے دوستی کر لی تھی پھر جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی دوستوں کو چھوڑ کر سکھی سہیلیوں سے راہ و رسم بڑھانے لگی پھر تو یہ حال ہوا کہ میرے

کمرے میں بھی شاز و نادر ہی آتی جیسے مجھ سے لڑائی ہوگئی ہو۔

کئی برس بیت گئے۔ وہی خزاں کے دن ہیں۔ منی کی شادی طے پا چکی تھی۔ پوجا کی چھٹیوں میں شادی انجام پائے گی۔ درگا مائی جس دن کیلاش سدھاریں گی میرے گھر کی رونق بھی ہمیں اندھیرے میں چھوڑ کر پیا کے آنگن کا رخ کرے گی۔

آج کی سویر بڑی خوشگوار جیسے برسات نے ساری فضا کو دھو ڈالا ہو۔ صبح کی دھوپ سہاگے میں پگھلے ہوئے سونے کی طرح دمک رہی ہے۔ یہاں تک کہ کلکتہ کی گلیوں میں بوسیدہ مکانوں کی شکستہ اینٹیں بھی دھوپ میں نکھری نکھری لگ رہی ہیں۔ ہمارے گھر پر صبح ہی سے شہنائی بجنا شروع ہوگئی ہے۔ شہنائی کا ہر سر میرے دل کو مسل رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنے والی جدائی کا خیال میرے دل کو جو دکھ دے رہا ہے بھیرویں کا رنگ اسے دھوپ کی چادر کی صورت میں ساری دنیا میں پھیلا رہا ہے۔ انگنائی میں شامیانہ تاننے کے لیے بانس کی کھونٹیاں گاڑی جارہی ہیں۔ برآمدے میں فانوس لٹکانے کے لیے ٹھک ٹھک ہورہی ہے۔ لوگوں کے آنے جانے اور ہانک پکار میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا اخراجات کا حساب لکھ رہا ہوں۔ اتنے میں رحمت کابلی داخل ہوا اور سلام کر کے کھڑا ہوگیا۔ میں پہلی نظر میں تو اسے پہچان بھی نہیں سکا کیونکہ نہ اس کے پاس جھولی تھی نہ لمبے لمبے بال، تھے اور نہ ہی بدن میں پہلی سی چستی تھی۔ میں نے پوچھا: "رحمت تو کب آیا؟"

بولا: "بابو جی کل شام جیل سے چھوٹ کر آیا ہوں۔" اس کی بات میرے کانوں کو بھلی نہ لگی۔ میں نے ایک خونی کو پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ میرا دل سہم گیا۔ جی میں آئی کہ وہ چلا جائے تو اچھا ہو۔ میں نے اس سے کہا: "آج ہمارے گھر پر ایک تقریب ہے، مجھے ذرا بھی فرصت نہیں۔ آج جاؤ۔" یہ سن کر وہ فوراً چل پڑا مگر دروازے تک جا کر جھجکتا ہوا بولا: "کیا بچی کو ایک دفعہ دیکھ نہیں سکتا۔" اس کا خیال تھا کہ منی پہلے جیسی ہی ہوگی اور "کابلی والا، کابلی والا" پکارتی ہوئی دوڑی آئے گی۔ منی کے لیے انگوروں کا ڈبہ اور کاغذ میں لپیٹے ہوئے کچھ کشمش بادام وہ اپنے کسی ہم وطن سے لیتا آیا تھا کیونکہ اس کی اپنی جھولی تو تھی نہیں۔ میں نے پھر کہا: "گھر پر ایک تقریب ہے، آج کسی سے بھی ملاقات نہیں ہوسکتی۔" وہ کچھ ملول ہوکر چپکا کھڑا رہا پھر "بابو سلام" کہہ کر باہر نکل گیا۔ میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ سوچا کہ اسے واپس بلا لوں۔ اتنے میں دیکھا کہ وہ خود پلٹ کر آرہا ہے۔ قریب آکر بولا: "یہ انگور اور کچھ کشمش بادام بچی کے لئے لایا تھا اسے دے دیجئے گا۔" میں نے قیمت ادا کرنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا: "بابو جی آپ ام پر برابر مہربانی کیا ہے سو ام کبھی بھول نہیں سکتا۔ ام کو دام مت دو۔ بابو جی تمہارا جیسا لڑکی ویسا دیس میں ہمارا بھی ایک لڑکی ہے۔ ام اس کو یاد کر کے آپ کا لڑکی کے واسطے کچھ میوہ لے آیا کرتا ہے۔ ام آپ کے پاس سودا بیچنے نہیں آتا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے میں ہاتھ ڈال کر ایک تہہ کیا ہوا میلا سا کاغذ نکالا اور دونوں ہاتھوں سے دھیرے دھیرے کھول کر میری میز پر بچھا دیا۔ اس پر ایک ننھے سے ہاتھ کی چھاپ تھی۔ فوٹو تھا نہ رنگین تصویر تھی۔ بچی کے ہاتھ میں کوئی رنگ لگا کر اس نے کاغذ پر چھاپ اتار لی تھی۔ ہر سال رحمت کلکتہ آکر گھر گھر میوہ وغیرہ بیچا کرتا اور اس چھاپے کو سینے سے لگائے رکھتا۔ شاید اس سے بیٹی کی جدائی کا کچھ مداوا ہو جاتا ہو۔

چھاپ کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی فرق نہ رہا۔ میں بھول گیا کہ وہ ایک کابلی میوہ فروش ہے اور میں ایک معزز بنگالی ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ میری ہی طرح وہ بھی ایک بچی کا باپ ہے۔ دور دیس کی بیٹی کے ہاتھ کی چھاپ مجھے اپنی منی کی یاد دلا گئی۔ میں نے فوراً اسے اندر سے بلا بھیجا۔ عورتوں نے اعتراض کرنا چاہا مگر میں نے ایک نہ سنی۔

لال ریشمی ساڑھی پہنے، پیشانی پر چندن کی لکیریں، دلہن کی کے لباس میں شرماتی لجاتی منی میرے نزدیک آ کر کھڑی ہوگئی۔ کابلی اسے دیکھ کر ہچکچا گیا اور پرانی طرز پر باتیں نہ کر سکا۔ ہنستے ہوئے صرف اس نے یہ پوچھا: "منی بابا سسرال جارہی ہو؟" منی پہلے کی طرح رحمت کو جواب نہ دے سکی اور شرما کر منہ پھیر لیا۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا جب کابلی کے ساتھ منی کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میرا دل کروٹیں لینے لگا۔

منی کے واپس جانے کے بعد رحمت ایک ٹھنڈی سانس لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔ غالباً اسے احساس ہوگیا تھا کہ اس کی اپنی لڑکی بھی اتنے دنوں میں منی کی طرح سیانی ہو چکی ہوگی اور اس سے نئی طرح سے بات چیت کرنی پڑے گی۔ نہیں معلوم آٹھ سال کے عرصے میں اس پر کیا گزری ہوگی۔ صبح کی خوشگوار دھوپ میں شہنائی بج رہی تھی اور رحمت خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے اسے ایک نوٹ دیا اور کہا: "رحمت اپنی لڑکی کے پاس جاؤ۔ تم باپ بیٹی کے ملنے سے میری منی کی شادی میں برکت ہوگی۔" اس نوٹ کے دینے سے مجھے شادی کے ساز و سامان میں کسی قدر کمی کرنا پڑی۔ میں نے بجلی کی بتیوں کی تعداد گھٹا دی اور بینڈ باجا بھی نہ منگایا۔ اس سے عورتوں کو بہت ملال ہوا مگر مجھے ایسی خوشی نصیب ہوئی جو شاید دنیا کے سارے ساز و سامان اکٹھا کر کے بھی نہ ہوتی۔
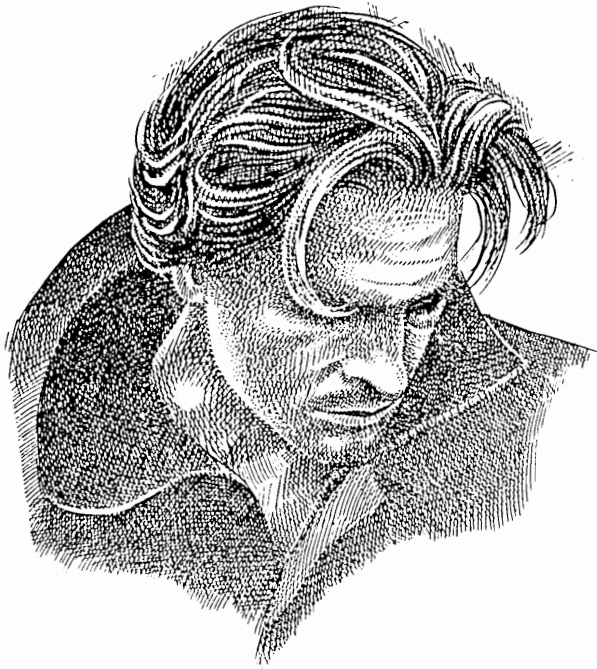
جرمن ادب سے مصری کی ڈلی

مسمی زگلر

ایک نستعلیق شخص کا قصہ، وہ جانوروں کی زبان سمجھنے لگا تھا

ہرمن ہیسے / عبدالوحید

بہت دنوں کی بات ہے، براگاس کے شہر میں زگلر نامی ایک نوجوان رہتا تھا۔ وہ ان بے پرواہ قسم کے لڑکوں میں سے تھا جن کو ہم ہر شام سڑکوں پر بے فکری سے آوارہ خرام دیکھتے ہیں اور جن کے چہرے ہمیں کبھی یاد نہیں رہتے، اس لیے کہ وہ سب ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ اجتماعی چہرے!

زگلر جیسا کہ اس طرح کے اکثر لوگ ہوتے ہیں، ایک خوش فہم انسان تھا اور اپنے بارے میں ان تمام مغالطوں کا شکار تھا جو اس قبیل کے لوگوں کی فطرت ہوتی ہے۔

وہ احمق ہرگز نہیں تھا، لیکن اسے کوئی باصلاحیت انسان بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اسے دولت سے محبت تھی، عیش و آرام کی تمنا تھی اور ہر خوبرو نوجوان کی طرح خوش لباسی کا زعم تھا۔ بہ حیثیت انسان جیسا کہ ہوتا ہے، وہ کسی حد تک بزدل بھی تھا۔

اس کی زندگی کے معمولات خواہشات کی تکمیل کے لیے جدوجہد سے زیادہ سزا اور جزا کے خوف سے زیر سایہ لب ہوتے تھے۔ زنگلر میں عام بشری کمزوریوں کے ساتھ ساتھ بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ وہ ایسا مطمئن نوجوان تھا جس کے لیے اس کی اپنی شخصیت سب سے بڑھ کر اہم ہوتی ہے۔ وہ خود کو معاشرے کا ایک منفرد انسان خیال کرتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس حقیقت سے ہمیشہ لاعلم ہی رہا کہ اس کی حیثیت انسانوں کے اس بپھرے ہوئے ہجوم میں ایک پرکاہ سے بڑھ کر نہیں۔۔۔ بہر حال اپنی نظر میں وہ کائنات کی اہم ترین ہستی تھا اور دنیا کے بیشتر مسائل پر اپنی ایک الگ اور اٹل رائے رکھتا تھا۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے کہ حقائق ہماری خوش فہم دنیا میں آ کر خوبصورت خیالات کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔

زنگلر روشن خیال انسان تھا اس لیے اس کے دل میں دولت کی بے پناہ اہمیت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جدید دنیا کی دوسری بڑی قوت سائنس کا بھی زبردست مداح تھا۔ سائنس کی صحیح تعریف سے تو وہ شاید خود بھی واقف نہ تھا لیکن اسے ریاست کی ترقی کے لیے اس کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ تھا اور وہ جانتا تھا کہ سائنس کی ترویج کے لیے حکومت کس قدر رقم خرچ کر رہی ہے۔

زنگلر کا باپ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر مرا تھا۔ اس وجہ سے اسے ان تمام تحقیقات سے خاص دلچسپی تھی جن کا مقصد کینسر کا علاج دریافت کرنا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ دن دور نہیں جب ایسا ہو سکے گا اور وہ ہمیشہ کے لیے اس خطرناک بیماری کے خوف سے آزاد ہو جائے گا۔

زنگلر خوش لباس تھا اور اکثر یہ خوش لباسی اس کے وسائل سے بڑھ کر اپنا اظہار کرتی۔ وہ سال کے جدید ترین فیشن کے کپڑے زیب تن کرتا۔ وہ فرد کی آزادی کا شدت سے قائل تھا اور کردار اور افعال پر کسی قسم کی بندش گوارا کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار بے باکی سے کرتا، لیکن اس بات کا اہتمام ضرور کرتا کہ اس کے نظریات کا علم حکومت یا اس کے افسران کو نہ ہونے پائے۔

میرے خیال میں زنگلر کے بارے میں کچھ زیادہ ہی تفصیلی باتیں ہو گئی ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک دلکش انسان تھا اور اس کے ساتھ ہونے والے سانحے کا ہم سب سے گہرا تعلق ہے کیونکہ وہ بیچارہ حیران کن اور افسوسناک انجام سے دوچار ہوا۔

اتوار کی ایک خوشگوار صبح وہ خاص تفریح کے ارادے سے ہمارے شہر میں وارد ہوا۔ وہ یہاں بالکل اجنبی تھا۔ اس نے ابھی تک نئی دوستیاں کرنے یا کسی کلب کی ممبر سازی کی بابت کچھ نہیں سوچا تھا۔ ممکن ہے یہ اس کی غلطی ہو۔ انسان کا تنہا ہونا کوئی اچھی بات بھی تو نہیں ہوتی۔ ہم سب کو اس کا علم ہے۔

خاصی سوچ بچار کے بعد اس نے شہر کے عجائب خانے اور چڑیا گھر کی سیر کا پروگرام بنایا۔ عجائب خانے میں صبح کے وقت داخلہ مفت تھا اور چڑیا گھر کے لیے شام کے اوقات میں خاص رعایتی ٹکٹ کا انتظام تھا۔

چنانچہ اپنا بہترین سوٹ زیب تن کیے، جس پر کپڑے کے بہترین بٹن لگے تھے، وہ تاریخی عجائب گھر کو روانہ ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی خوبصورت چھڑی تھی جس نے اس کی شخصیت کو باوقار اور شاندار بنا دیا تھا۔ بدقسمتی سے اسے یہ چھڑی عجائب گھر کے دروازے پر ہی چھوڑنی پڑی۔ خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے!

عمارت کے عظیم الشان ہال میں شیشے کے بڑے بڑے شوکیسوں میں تاریخی نوادرات رکھے تھے اور خوبصورت کتبوں پر سائنس کے ان عظیم شاہکاروں کے بارے میں تفصیلی معلومات درج تھیں۔ وہ بغور شوکیسوں میں رکھی زنگ آلود چابیوں، اور سال خوردہ جواہرات کے بارے میں پڑھتا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا دل سائنس کے کارناموں اور احترام اور تشکر کے جذبات سے لبریز تھا۔ ''واقعی سائنس عظیم ہے، بہت جلد، ہاں، بڑی جلدی، یہ کینسر کا علاج دریافت کرے گی۔ بہت ممکن ہے ہم مستقبل قریب میں موت کی لعنت سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا لیں۔''

دوسرے کمرے میں دیوار گیر شیشہ نصب تھا۔ زنگلر نے چند ثانیے کے لیے رک کر اپنے سراپے کا جائزہ لیا، کوٹ، پتلون، قمیص، ٹائی کی گرہ، سب کچھ شاندار تھا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔

یہاں اس کی دلچسپی کے مرکز لکڑی پر نقاشی کے وہ نمونے تھے جن کی آب و تاب صدیاں گذر جانے کے باوجود قائم تھی۔

''بے شک، افسوسناک حد تک کم علم ہونے کے باوجود ان فنکاروں کا ہنر قابل ستائش ہے۔'' اس نے توصیفی انداز سے شوکیسوں کی طرف دیکھا۔ وہ لمحے بھر کو ہاتھی کے حروف والے گھڑیال کے قریب بھی رکا جس میں رقص کرتے ہوئے ہیرے، ہر گھنٹے کے بعد وقت کا اعلان کرتے تھے۔ ''واقعی یہ ذہانت کا اعلیٰ شاہکار ہے۔''

وہ خاموشی سے انسانی ذہن کی شعبدہ کاریوں کو سراہتا آگے بڑھتا رہا۔ وقت کافی گذر چکا تھا، وہ اب بور ہونے لگا تھا۔ عجائب

کوئی شخص امن و سکون سے ہمیشہ لطف نہیں اٹھا سکتا اور بد قسمتی اور محرومی بھی ابدی نہیں ہوتیں۔ جب سٹیپ (گھاس کے میدان) کی آگ گھاس کو جلا ڈالے گی تو اگلی گرمیوں میں وہ پھر سے اگ آئے گی۔

(منگولیا کی ایک کہاوت)

نوبل انعام

میرے نوبل انعام کے پس پشت ایک طویل تاریخ ہے۔ کئی سال تک میرا نام بہ حیثیت امیدوار کے ہمیشہ لیا گیا تھا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ۱۹۶۳ء میں حالات سنجیدہ ہو گئے۔ ریڈیو نے بار بار دہرایا کہ اسٹاک ہوم (Stockholm) میں میرا نام لیا جا رہا ہے۔ اور اس مرتبہ شاید میں نوبل انعام کا حق دار رہوں گا۔ لہٰذا مٹیلڈی اور میں نے گھر کے دفاع کا پلان نمبر ۳ تیار کر لیا تھا۔ ہم نے خوراک اور سرخ شراب کی بڑی مقدار اکٹھی کر لی تھی اور ازلا نگیرا کے پرانے دروازے پر ایک بہت بڑا تالہ لٹکا دیا تھا۔ کچھ عرصے کے محاصرے کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے کچھ اسرار پھیلا دیا تھا۔ اخباری نمائندے بہت تیزی سے وہاں پہنچے، لیکن انہیں ہم نے نزدیک نہ آنے دیا۔ وہ لوگ مضبوط بڑے دروازے سے جس پر تانبے کا بڑا تالہ لگا ہوا تھا اندر داخل نہ ہو سکے۔ یہ تالہ جتنا مضبوط تھا' اتنا ہی خوبصورت بھی۔

بڑی دیوار کے عقب میں وہ شیروں کی طرح غراتے رہے۔

آخر وہ کیا کرنے کی کوشش میں تھے؟ دنیا میں دوسری طرف سویڈش اکادمی کے ممبران کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ میں کیا کہہ سکتا تھا' اس کے باوجود اخباری نامہ نگاروں نے شلغم سے خون نچوڑنے کی اپنی نیت کو نہ چھپایا۔

بہار بحرالکاہل کے جنوبی ساحل پر دیر سے آئی تھی۔

("یادیں" پابلو نرودا)

گھر کے نوادرات میں بھی کچھ یکسانیت محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے قدرے اکتاہٹ کے عالم میں اپنی خوبصورت گھڑی کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں مغرور روشنی نمودار ہوئی، خالص سونے کی گھڑی، یہ اسے باپ کے ترکے میں ملی تھی۔

ابھی دوپہر کے کھانے میں کافی وقت تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک نسبتاً خاموش کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس کا تجسس پھر سے جاگنے لگا۔ یہاں قرون وسطیٰ کے توہمات سے متعلق اشیاء جمع کی گئی تھیں۔ سامنے جادو، تعویذ، گنڈوں اور چڑیلوں کو تسخیر کرنے کے علم کی کتابیں رکھی تھیں۔ ایک کونے میں کیمیا گری کا مکمل سامان رکھا ہوا تھا، لوہا پگھلانے کی بھٹی، کونڈیاں، چوڑے پیٹوں والی صراحیاں، سور کی خشک کی ہوئی اوجڑی غرض سب کچھ موجود تھا۔ کمرے کے آخری سرے پر مہمانوں کے لیے ہدایت درج تھی کہ یہاں رکھی ہوئی اشیاء کو چھونا خطرناک ہے، لیکن آپ کو تو پتا ہی ہے اس قسم کی تحریروں پر کون دھیان دیتا ہے اور پھر اس وقت زنگلر کے سوا کمرے میں اور کوئی بھی نہ تھا۔

اس نے متجسس نگاہوں سے یہاں موجود پراسرار نوادرات کی طرف دیکھا اور چپکے سے چند ایک کو چھوا بھی۔ اس نے پرانے زمانے کے توہمات کی بابت بہت کچھ سن رکھا تھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ سب نامعقول باتیں ہیں۔ اس زمانے کے لوگوں کو چاہیے تھا کہ جادو وغیرہ جیسی بکواس چیزوں پر پابندی عائد کر دیتے۔ ہاں البتہ کیمیا گری قابل معافی ہو سکتی ہے، کیونکہ اس کے بطن سے جدید کیمیا کی سائنس نے جنم لیا ہے۔

میرے خدایا! یہ سونا بنانے والے احمق اور یہ جادوگر، چکر باز کہیں کے! میرے خیال میں یہ بھی ضروری تھے، ورنہ آج ہمیں گیس بموں کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی، وہ تاسف اور نگرانی کے ملے جلے جذبات سے بڑبڑایا۔

بے دھیانی میں زنگلر کا ہاتھ ایک نرم سی چیز سے جا ٹکرایا۔ یہ روئی کے مانند ملائم کوئی قدیم جڑی بوٹی تھی۔ اس نے خشک اور بے وزن بوٹی کو انگلیوں میں دبا کر اس کی گولی سی بنا ڈالی۔ شاید یہ کوئی

پرانے نسخے سے تیار کردہ مرکب تھا۔ اس بلا ارادہ شغل کے بعد وہ گولی کو واپس اپنی جگہ رکھنے کی بابت سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر قدموں کی چاپ ابھری۔ کوئی آ رہا تھا۔ زنگلر نے مڑ کر دیکھا تو ایک شخص اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھبراہٹ اور سراسیمگی کے عالم میں وہ تیزی سے چل پڑا۔ گولی ابھی تک اس کی مٹھی میں تھی۔ وہ پڑھ چکا تھا کہ نوادرات اور جڑی بوٹیوں کو چھونا سخت منع ہے، اس لیے ایک معزز اور قابل احترام انسان کی حیثیت سے اس کے لیے یہ بڑی توہین کی بات ہوتی کہ کوئی اسے قواعد کی خلاف ورزی کرتے دیکھ لیتا، چنانچہ وہ افراتفری میں عجائب گھر سے باہر نکلا اور تیزی سے قریبی گلی میں داخل ہو گیا۔ دور دور تک خاموشی تھی اور قریب کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ جیب سے نکالا۔ گولی ابھی تک اس کی مٹھی میں تھی۔ وہ اسے نالی میں پھینکنے ہی والا تھا کہ اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے مٹھی کھول کر اس نرم اور قدیم کیمیاوی مرکب کی طرف دیکھا اور ناک کے قریب لا کر اس کی مہک کا اندازہ کرنے کی کوشش کی۔

''ہوں! فرحت بخش۔ بھئی کمال ہے۔'' گولی میں سے عجیب سی مسحور کن خوشبو آ رہی تھی۔ زنگلر نے ہاتھ واپس جیب میں رکھ لیا اور قریبی ریستوران میں داخل ہو گیا۔

چڑیا گھر کا وقت شروع ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے اور بھوک بھی شدید ہو چکی تھی۔ زنگلر نے اپنے پسندیدہ کھانوں کا آرڈر دیا اور دوبارہ گولی جیب سے نکالی اور دھیرے دھیرے خوش ذائقہ مشروب کی چسکیاں لینے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ گولی جیب سے نکالی۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی، لیکن خدا جانے کیوں! زنگلر کو خود بھی اس کا علم نہیں تھا۔ اس نے گولی منہ میں رکھ لی۔ وہ بے ذائقہ تھی۔ وہ چند لمحے اسے چوستا رہا پھر مشروب کے ایک بڑے گھونٹ سے اسے حلق میں اتار لیا۔ یہ ایک معصوم اور قدرے بچگانہ حرکت تھی، بہرحال گولی کا قصہ تمام ہوا، کھانا خوش ذائقہ تھا۔ اس نے پیٹ بھر کر کھایا۔

دو بجے وہ چڑیا گھر کے دروازے پر تھا۔ اس نے اتوار کا خصوصی رعایتی ٹکٹ خریدا اور بڑے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔

مسرور اور مسکراتا ہوا، زنگلر چڑیا گھر کے اس حصے کی جانب بڑھا جہاں چوپائیوں کے پنجرے تھے۔ وہ افریقی لنگوروں کے پنجرے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ لنگور نے خوش مزاجی سے اس کا استقبال کیا پھر آنکھیں مچکاتے ہوئے، دھیمی آواز میں بولا:

''کہو بھیا کیسے مزاج ہیں۔''

زنگلر حیرت کے بے پناہ سمندر میں ڈوبنے لگا۔ پھر خوف کی سرد لہر اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

بندر کی ناراضگی اور نفرت سے بھری ہوئی آواز اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ ''آخر یہ کس بات پر اتراتا پھرتا ہے، احمق ذلیل کہیں کا۔''

اگلے پنجرے میں لمبی دم والے بندر خوشی کے عالم میں رقص کر رہے تھے۔

''ہمارے لیے مٹھائی لاؤ! تم تو اپنے یار ہو۔''

مگر اس کے پاس مٹھائی کہاں تھی۔ بندر غصے سے اس کی نقلیں اتارنے لگے۔ انہوں نے زنگلر کو نکما آوارہ اور نہ جانے کیا کچھ کہا۔ وہ دانت نکال کر اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ یہ سخت ذلت آمیز رویہ تھا۔ ایسی حالت میں کوئی بھی معقول آدمی وہاں کیسے ٹھہر سکتا تھا۔

زنگلر کو یقین تھا کہ ہرن اپنی روایتی شائستگی کا مظاہرہ کرے گا اور اس کا سلوک ان گھٹیا جانوروں سے یقیناً مختلف ہو گا۔

جالیوں کے قریب ایک لمبا سا بارہ سنگھا کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک زنگلر دہشت سے کانپ اٹھا۔ ''اف میرے خدایا''

صورت حال واضح ہوتی جا رہی تھی۔ گولی کھانے کے بعد وہ حیرت انگیز طور پر جانوروں کی زبان سمجھنے لگا تھا۔

بارہ سنگھے نے اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اس کی اداس آنکھوں میں وقار اور حسن تھا، مگر زنگلر کو وہاں حقارت کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ ان پر شکوہ آنکھوں میں نفرت اور غصے کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

زنگلر اپنے شاندار سوٹ، طلائی گھڑی، طنطنے دار شخصیت اور بارعب چہرے کے باوجود پنجرے میں قید اس بے بس جانور کے سامنے کسی حقیر کیڑے کی طرح سہما ہوا تھا۔ قابل نفرت اور مکروہ انسان!

بارہ سنگھے سے وہ باری باری پہاڑی بکرے، نیل گائے، جنگلی سور، ریچھ اور دوسرے جانوروں کے قریب گیا لیکن سب کا رویہ ناقابل فہم تھا، غیر ہمدردانہ اور مایوس کن۔ زنگلر نے ان کی باتیں سننے کی کوشش کی تاکہ ان بظاہر بے زبان چوپاؤں کی انسان کے بارے میں رائے سے آگاہ ہو سکے۔ یہاں اسے اس اذیت ناک حقیقت کا علم ہوا کہ انسان آکلیف وہ حد تک بے توقیر مخلوق ہے۔ پنجروں میں قید چوپائے حیران تھے کہ یہ غلیظ، بے وقار اور متعفن دو پایہ جس کا نام انسان ہے اور جو اپنی کل زندگی میں فقط بہروپیا اور مسخرہ ہے، آزاد کیوں چھوڑ دیا گیا ہے؟

☆☆☆☆☆☆

بورس پیسٹرنک 1890ء میں ماسکو میں پیدا ہوا۔ وہ روس کے ان چند عظیم شاعروں میں سے ہے جنہوں نے روسی ادب کی عظیم روایات کو برقرار رکھا ہے۔ پیسٹرنک کا نام مغربی دنیا کے لیے کوئی اجنبی نام نہیں۔ اس کی شاعری سے وہ سب لوگ واقف ہیں جو ادب کا رچا ہوا ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ غیر ملکی ادبیات کے مطالعہ کا شوق بھی رکھتے ہیں۔ اس کی شعریت، خیالات و احساسات میں دائمی اقدار کا پاس، شعری پیکر اور ارتکاز، موزوں ترین لفظوں کے ذریعہ جامع اظہار اس کی وہ خصوصیات ہیں جو اسے لورسا، رلکے، ایلیٹ اور ملارمے وغیرہ کے برابر لا کھڑا کرتی ہیں۔ اس کی یہ خصوصیات اس درجہ منفرد ہیں کہ اس پر طرح طرح کے الزام لگانے اور اس کی غیر سماجی، شاعری کے خلاف زہر اگلنے کے باوجود اس کا نام روسی شاعری کی تاریخ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسٹالن کے زمانے میں وہ بالکل الگ تھلگ رہا اور مغربی دنیا کے عظیم شعراء کے تراجم میں مصروف رہا۔ 32ء میں اس کا آخری مجموعہ کلام شائع ہوا اور اس کے بعد سے اسٹالن کی موت تک اس نے سوائے ترجمے کے اور کوئی چیز شائع نہیں کی۔ اسٹالن کے بعد جب اس نے یہ محسوس کیا کہ اب فضا نسبتاً زیادہ سازگار ہے اور نئے خداوندان اقتدار اب فرد کی آزادی کا زیادہ احترام کرنے لگے ہیں تو اس نے اپنا ناول مکمل کیا لیکن جو انہی خصوصیات کی وجہ سے روس میں شائع نہ ہو سکا۔ مغربی دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے۔ اور اسے بہت پسند کیا گیا۔ اس ناول میں روس کے موجودہ نظام کی چالیس سالہ تاریخ کو اس ذہنی کشمکش کی روشنی میں دیکھا اور دکھایا گیا ہے جو ایک فرد نے آزادی کے ساتھ محسوس کی اور جیسے بے باکی سے لکھنا اس نے اپنا تخلیقی فرض سمجھا۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جس نے سویڈش اکیڈمی آف لٹریچر کو اس بات پر اکسایا کہ 58 کا نوبل پرائز اس دفعہ بورس پیسٹرنک کو دیا جائے۔ نوبل پرائز کو پہلے اس نے بڑی خوشی سے قبول کر لیا، لیکن جب بعد میں اس پر لے دے ہوئی، اور اس کے اپنے ہم وطنوں نے اسے ملامت کا نشانہ بنایا تو اس نے اپنی مرضی سے، بغیر کسی دباؤ کے، نوبل پرائز واپس کر دیا۔ (سید علی احسن)

یہ مئی 1956ء کی بات ہے۔ میرا سوویت یونین کا دورہ ختم پر آ رہا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے میں شام کو بورس پیسٹرنک سے ملنے اس کے دیہاتی مکان پر گیا جو ماسکو سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ مجھے متنبہ کر دیا گیا تھا کہ پیسٹرنک اکل کھرا اور آدم بیزار انسان ہے، لیکن اس نے بڑے اخلاق اور محبت سے میرا خیر مقدم کیا۔ باغ تک مجھے لینے آیا۔ بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور مجھے اپنے ساتھ مکان میں لے گیا۔ پیسٹرنک میں بوڑھے بچے کا وہ انداز موجود ہے جو شاعروں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کا لمبا چہرہ، بڑی ناک، متفکر منہ، گھنے گھنگریالے بال جو ایک رخ پر علیحدہ ہیں، کپڑے پہننے کا انداز جو روسیوں کے عام ڈھیلے ڈھالے اور بھدے انداز کے مقابلے میں زیادہ نفیس اور پاکیزہ ہے اور اس کے کپڑے یہ سب کے سب ایک حد تک یوروپین بلکہ اینگلو سیکسن نظر آتے ہیں۔ صرف اس کی سیاہ آنکھوں سے جن میں شدید حزینہ انداز موجود ہے اس کے باطن کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسے انسان کی آنکھیں ہیں جو مشکل بلکہ تلخ آزمائشوں سے گزرا ہے اور جس نے اپنے ان تجربات کو اپنی آنکھوں میں سمو لیا ہے۔

ڈاکٹر ژواگو سات سو صفحات کی ایک مبسوط تصنیف ہے، جس میں ایک روسی ہیرو کی داستان صدی کے آغاز سے 1930ء یعنی اس کی موت تک بیان کی گئی ہے۔ تاریخ کا یہ دور تمیں ایسے فیصلہ کن برسوں پر مشتمل ہے جن میں روس نہایت اہم واقعات مثلاً 1905ء کا انقلاب پہلی جنگ عظیم، 1917ء کا انقلاب، خانہ جنگی، قحط، نئی معاشی پالیسی اور اشترا کی ڈکٹیٹر شپ کے استحکام سے دوچار ہوا۔ ڈاکٹر ژواگو اسی انداز کا تاریخی ناول ہے جیسا ٹالسٹائے کا ناول ''جنگ اور امن'' ہے۔ اس میں ہیرو کی زندگی ایک ذاتی معاملے کی طرح جس میں تھوڑی بہت تاریخی رنگ آمیزی بھی ہو بیان نہیں کی گئی، بلکہ یہ کردار اور تشکیل پانے والی تاریخ کے تضاد کا براہ راست اور مسلسل نتیجہ ہے۔ یقیناً ڈاکٹر ژواگو میں اولوالعزمی امیدیں، معاشقے، ذاتی لگاؤ سبھی کچھ موجود ہے لیکن جس انداز سے اس کی ذاتی زندگی ارتقا پذیر ہوئی اور اختتام کو پہنچتی ہے وہ اس کی تاریخی فضا سے براہ راست متاثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی چیزیں جو ڈاکٹر ژواگو کو پیش آئیں وہ وہی عام چیزیں ہیں جو سارے روسیوں کو 1900ء سے 1930ء کے درمیان پیش آئیں۔

(البرٹو موراویا)

نجیب محفوظ / محمود رحیم

مصری ادب سے مختصر مگر پراثر

جنگی وردی کا قیدی

ایک خوانچہ فروش کا المیہ، اسے
مول تول کا بہت چسکا تھا

ذگاذگ کے اسٹیشن پر جب گاڑیوں کی آمد کا وقت قریب ہوتا تو سگریٹ فروش گاہشا وہاں ہمیشہ سب سے پہلے آ پہنچتا۔ وہ ٹھیک سمجھا کہ اسٹیشن اس کی سب سے بڑی منافع مارکیٹ ہے۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی تجربہ کار آنکھوں سے گاہکوں کو تلاش کرتا ہوا نہایت چستی سے پلیٹ فارم پر چلتا۔

گاہشا سے اس کے کام کے متعلق اگر پوچھا جاتا تو اچھی خاصی لعنت بھیجتا کیونکہ بہت سے اور لوگوں کی طرح وہ بھی اپنی زندگی سے بیزار اور اپنے بخت سے ناخوش تھا۔ اگر وہ انتخاب کی آزادی رکھتا تو شاید کسی رئیس کا ڈرائیور ہونے کو ترجیح دیتا تاکہ قیمتی ملبوس پہن سکتا، اعلیٰ طعام کھا سکتا اور گرمی اور سردی کے موسم میں عالیشان مقامات پر اس کا مصاحب ہوتا۔

پیٹ کی خاطر تگ و دو کے مقابلے میں اس نے ایک ایسے کام کو ترجیح دی جو اس کی کایا پلٹ دیتا اور اسے خوش رکھتا، تاہم اس کام کو ترجیح دینے اور اس قدر چاہنے میں اس کی اپنی خاص وجوہ اور اسباب تھے جن کا آغاز اس دن ہوا جب اس نے ایک مقامی معزز آدمی کے ڈرائیور الغور کو معمر کی ملازمہ بناد یہ کے راستے میں کھڑے ہوکر نہایت جرات اور خود اعتمادی کے ساتھ اس سے چھیڑ خانی کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ایک بار جب جوش مسرت میں الغور مضطربانہ اپنے دونوں ہاتھ چلا رہا تھا، تو گاہشا نے ایک دفعہ اس سے یہ بھی سنا کہ اس نے بنادیہ کو کہا ہے کہ وہ جلد ہی اس کے لئے

انگوٹھی لے کر لوٹے گا۔ اس کے بعد گاہشا نے دیکھا کہ وہ لڑکی الغور کی طرف بہ تکلف مسکرائی اور اپنے چہرے سے حجاب کا کونا ہٹایا جیسے کہ اسے درست کر رہی ہو حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس نے تیل میں لپڑے اپنے کالے سیاہ بالوں کی نمائش کی تھی۔ جب گاہشا نے یہ سب کچھ دیکھا تو اس کے دل میں ایک آگ سی لگ گئی۔

اس نے محسوس کیا کہ رشک اسے اندر ہی اندر بیدردی سے کھائے جا رہا ہے۔ اس کی سیاہ آنکھیں اس کے تمام درد و کرب کا باعث بن گئیں۔ وہ اس کے پیچھے چند قدم چلتا۔ کبھی کبھار اسے گلی میں جاتے دیکھ کر اس کے رستے میں ہو لیتا۔ آخر کار جب اس نے ایک تنگ رستے پر اسے جا لیا تو وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو کہ الغور نے اسے انگوٹھی دینے کے بارے میں کہا تھا، مگر وہ منہ بناتے ہوئے ایک طرف کو ہو گئی۔

''اگر تم اپنے پاؤں کے لیے کوئی کھڑاؤں خرید لیتے تو یہ بات زیادہ معقول ہوتی۔'' وہ حقارت سے بولی۔

گاہشا اپنے لمبے لمبے پاؤں غور سے دیکھتا جو ایسے لگتے جیسے بالکل اونٹ کے ہوں۔ اپنی میلی کچیلی عبا اور سر کی گرد آلود ٹوپی کو گھورتا۔ ''تو اسی سبب سے میں اتنا ذلیل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرا مقدر ایسا ہے۔'' وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا۔

اس نے الغور کی ملازمت پر رشک کیا جو اسے بہت پسند تھی، تاہم امیدیں اسے اپنا کام جاری رکھنے سے روک نہ سکیں اور اس نے پکی دھن سے پھر اپنا دھندا شروع کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی تمنائیں خوابوں ہی میں پوری ہو سکتی تھیں۔

اس دوپہر وہ اپنا خوانچہ اٹھائے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا اور گاڑی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے افق کی سمت نگاہ کی اور گاڑی کو دھوئیں کے ایک بادل کی طرح دور سے آتے دیکھا۔ گاڑی قریب سے قریب تر آتی گئی اور اس کے مختلف حصے زیادہ صاف دکھائی دینے لگے۔ شور بلند سے بلند تر ہوتا گیا اور بالآخر گاڑی اسٹیشن پر آ کر مکمل طور پر رک گئی۔ گاہشا جلدی جلدی پر ہجوم ڈبوں کی جانب لپکا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دروازوں پر مسلح گارڈ تھے اور اجنبی سے چہرے بے بسی اور حیرانی کے ساتھ کھڑکیوں میں سے جھانک رہے تھے جب لوگوں نے گاڑی کے متعلق استفسار کیا تو انہیں بتایا گیا کہ یہ اطالوی جنگی قیدی ہیں جو بے شمار تعداد میں دشمن کے ہاتھ لگے ہیں اور اس وقت جنگی کیمپوں میں منتقل کئے جا رہے ہیں۔

گاہشا وہاں حیرت زدہ کھڑا مٹی سے اٹے ہوئے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ وہ دل گرفتہ ہونے لگا۔ جب اسے احساس ہوا کہ یہ لوگ جن کے زرد چہروں سے مایوسی اور مفلسی جھلکتی ہے، سگریٹ نوشی کی اپنی شدید خواہش اس سے پوری نہ کر پائیں گے۔ کھا جانے والی آنکھوں سے خوانچے کو دیکھتے ہوئے اس نے انہیں تاڑ لیا اور پھر غصے اور حقارت آمیز ہنسی سے ان پر نگاہ ڈالی۔ وہ پلٹ کر اپنی راہ لینے ہی والا تھا، جب اس نے یورپی لہجے کی عربی زبان میں کسی کو اپنے اوپر چلاتے ہوئے سنا اس آدمی کو مشکوک نگاہ سے دیکھا اور پھر اپنی شہادت کی انگلی کو انگوٹھے کے ساتھ رگڑتے ہوئے جتایا کہ اسے پیسوں کی بھی ضرورت ہے۔ سپاہی اس کا مطلب سمجھ گیا اور ہاں کے سے انداز میں اپنا سر ہلایا۔ گاہشا احتیاط طریقے سے آگے بڑھا اور سپاہی کی دسترس سے دور خاصے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔

''یہ رہے میرے پیسے!'' سپاہی نے نہایت خاموشی سے اپنی جیکٹ اتاری اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

گاہشا حیران ہوا اور پیلے بٹنوں والی خاکی جیکٹ کو حیرت و تمنا کے ملے جلے جذبات سے دیکھنے لگا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ مگر وہ بھی کوئی بھولا یا بیوقوف نہ تھا۔ اس نے اپنے جذبات کو خاصا چھپایا جو اسے اطالوی کی حرص کا شکار بنا سکتے تھے۔ اطمینان کا اوپر اظہار کرتے ہوئے اس نے سگریٹوں کا ایک ڈبہ نکالا اور جیکٹ لینے کے سے انداز میں اپنا بازو دراز کیا جس پر سپاہی ناخوش ہوا۔

''جیکٹ کے عوض بس ایک ڈبہ؟ مجھے دس ڈبے دو۔'' سپاہی نے ناراض ہوتے ہوئے شور مچایا۔

اس پر گاہشا چونکا اور ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی تمنا قدرے مرجھا گئی۔ وہ دوبارہ پلٹنے ہی والا تھا کہ سپاہی بلند آواز سے کہنے لگا:

''مجھے معقول تعداد میں ڈبے دو، نو یا دس۔''

نوجوان گاہشا نے ڈھٹائی سے سر ہلا دیا۔

''چلو سات سہی۔'' سپاہی کی آواز آئی۔

گاہشا نے دوبارہ اپنا سر ہلایا اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ چلے جانے کا ارادہ کر رہا ہے۔ سپاہی بولا کہ میں چھ میں راضی ہوں، پھر وہ پانچ پر آ گیا۔ گاہشا ہاتھ کے اشارے سے اسے مایوسی کا عندیہ دیتے ہوئے ایک نشست کی طرف آیا اور وہاں بیٹھ گیا۔

''ادھر آؤ، چلو چار ہی منظور ہیں مجھے!'' دیوانہ سپاہی چلایا۔ گاہشا نے کوئی توجہ نہ دی اور صرف دکھانے کے لئے کہ وہ اس صورت حال سے کس قدر غیر متعلق ہے، اس نے ایک سگریٹ سلگایا اور نہایت سکون سے دھواں چھوڑنے لگا۔ سپاہی شدید غصے میں آ گیا اور مکمل طور پر بے قابو ہو گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے سگرٹوں کا حصول اس کے جینے کا واحد مقصد تھا۔ وہ اپنا مطالبہ پہلے تین اور پھر دو ڈبوں تک لے آیا۔

گاہشا اپنی نشست پر جما رہا۔ اس کے جذبے اس کے اندر تپ رہے تھے اور جیکٹ کی تمنا اسے چرکے لگا رہی تھی۔ اس وقت بھی اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ جب سپاہی دو ڈبوں پر آیا تو گاہشا نے غیر ارادی طور پر خفیف سی جنبش کی جسے سپاہی بھی بھانپ گیا۔

''آؤ بھی!'' سپاہی نے اس کی طرف اپنی جیکٹ اچھالتے ہوئے کہا۔ گاہشا نے دیکھا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اٹھے، ٹرین تک جائے، جیکٹ پکڑے اور دو ڈبے سپاہی کو تھما دے۔ اس نے بے پایاں مسرت واطمینان سے جیکٹ پر نگاہ ڈالی۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ اس نے اپنا خوانچہ ایک جگہ پر رکھا، جیکٹ پہنی اور بٹن بند کئے۔ جیکٹ اس کے بدن پر بہت بڑی تھی مگر اس نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنے آپ پر بہت فخر اور خوشی محسوس کر رہا تھا۔

اس نے اپنا خوانچہ اٹھایا اور فاخرانہ مسرت سے پلیٹ فارم کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ وہ چشم تصور سے، حجاب اوڑھے ہوئے بناویہ کی تصویر دیکھ رہا تھا۔

''کاش وہ اس وقت مجھے دیکھ سکتی۔'' وہ زیر لب بولا۔

''ہاں حقیقتاً اب وہ مجھ سے گریز نہیں کرے گی یا حقارت سے منہ نہیں پھیرے گی۔ اب الانور بھی مجھ میں کوئی ایسی کمی نہ پا سکے گا جس کی بناء پر وہ شیخی بگھار سکے۔''

معاً اس کو یاد آیا کہ الانور صرف جیکٹ نہیں بلکہ مکمل سوٹ پہنتا ہے۔ اس نے لمحہ بھر سوچا کہ اب وہ ایک پتلون کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ اور پھر جنگی قیدیوں کے سروں کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا جو کھڑکیوں میں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ تمنا ایک بار پھر اس کے دل میں مچل اٹھی اور پرسکون ہوتے ہوتے اس نے جوشیلا ہونا شروع کر دیا۔ وہ گاڑی کی سمت دوڑ پڑا۔

''سگریٹ، سگریٹ۔۔۔ ایک پتلون کے بدلے میں ایک ڈبہ!'' وہ سرعت سے پکارنے لگا۔ اس نے مکرر اور سہ مکرر کی آواز لگائی۔

اسے خدشہ ہوا کہ سپاہی اس کا مطلب نہیں سمجھ پائے، لہٰذا اس نے پہنی ہوئی جیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سگریٹوں کا ایک ڈبہ دکھایا جس نے مطلوبہ تاثر پیدا کیا۔ ایک سپاہی نے لمحہ بھر بھی تردد نہ کیا اور اپنی جیکٹ اتارنی شروع کر دی۔ گاہشا اس کی جانب تیزی سے لپکا اور اسے رکنے کو کہا۔ اس نے اس کی پتلون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ اس پر سپاہی نے اپنے کندھے مچکائے گویا اسے اپنی پتلون کی کوئی خاص پرواہ نہ تھی۔ سو اس نے اپنی پتلون اتار دی اور لین دین مکمل ہو گیا۔ گاہشا نے اس کے قریب کھڑے نہایت سرخوشی کے عالم میں پتلون پکڑی۔ وہ اپنی سیٹ پر واپس گیا اور پتلون پہننے لگا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں فارغ ہو کر وہ مکمل اطالوی سپاہی بن گیا۔

''کیا اب بھی کوئی کمی ہے؟'' اسے استعجاب ہوا۔

بدقسمتی سے قیدیوں نے اپنے سر ترکی ٹوپیوں سے نہیں ڈھکے ہوئے تھے، مگر ان کے پیروں میں جوتے ضرور تھے۔ اسے جوتے بھی درکار تھے تاکہ وہ الانور کی برابری کر سکے جو اس کی زندگی اجاڑ رہا تھا۔ اس نے اپنا خوانچہ پھر اٹھایا اور جلدی جلدی ٹرین کی طرف چل دیا۔

''سگریٹ۔۔۔ جوتوں کے جوڑے کے عوض ایک ڈبہ!'' وہ زور زور سے چلانے لگا۔ اس نے اپنی بات سمجھانے کے لئے اسی طرح کے اشارے کئے جس طرح کے وہ پہلے کر چکا تھا۔ مگر قبل اس کے کہ اسے نیا خریدار ملتا، گاڑی کی روانگی کی سیٹی بج گئی۔ اس پر ہر گارڈ کے کام میں ایک برق رفتاری سی پیدا ہو گئی۔ اسٹیشن کے کچھ حصے اندھیرے میں ڈوبنے لگے اور رات کے پرندے ہوا میں پھڑپھڑانے لگے۔

گاہشا اپنی آنکھوں میں اداسی اور غصہ لئے دل برداشتہ کھڑا تھا۔ جونہی گاڑی کو حرکت ہوئی، اگلی بوگی میں بیٹھے ایک گارڈ نے اسے دیکھ لیا جو بڑے غضب میں دکھائی دے رہا تھا اور اس سے پہلے انگریزی اور پھر اطالوی میں برس پڑا۔

''او قیدی کے بچے! فوراً گاڑی کے اندر آ!'' وہ گارڈ چلایا۔

گاہشا کچھ نہ سمجھا جو وہ کہہ رہا تھا اور اسے ایسے لگا جیسے وہ شخص اپنی بھڑاس نکال رہا تھا، سو اس نے گارڈ کی نقل اتارنی شروع کر دی اور اس کا منہ چڑانے لگا۔ اسے اطمینان تھا کہ گارڈ اتنی دور ہے کہ اسے پکڑ نہیں سکتا۔ گاڑی جب دور ہونے لگی تو گارڈ اس پر پھر چلایا:

''گاڑی میں سوار ہو جاؤ۔۔۔ میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں کہ فوراً گاڑی میں آ جاؤ!'' گارڈ چیخا۔

گاہشا نے حقارت سے اپنے ہونٹ بھینچے اور گارڈ کی طرف سے رخ موڑ لیا۔ وہ رخصت ہونے والا تھا کہ گارڈ نے دھمکی کے سے انداز میں اپنی مٹھی بند کی اور پھر رائفل کا رخ نوجوان کی طرف کر کے گولی داغ دی۔ بہرا کر دینے والا ایک فائر گونجا اور اس کے پیچھے درد کی ایک چیخ۔ گاہشا جہاں کھڑا تھا، وہیں اس کا وجود مصلوب ہو گیا۔ خوانچہ اس کے ہاتھوں سے گر پڑا، سگریٹوں اور ماچسوں کے ڈبے پلیٹ فارم پر بکھر گئے۔

گاہشا منہ کے بل لڑھک گیا کہ وہ اب ایک بے جان لاشہ تھا۔

روسی ادب کے خزینے سے

آخری ملاقات

جنگل، چاندنی، اوس، زرد اداس چاند!
محبت کے دو متوالوں کی دھواں دھواں داستان

ایوان بیونن / وجاہت مسعود

پت جھڑ کی سرد اور گیلی رات تھی۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ سٹرلیش نیف نے ملازم کو بلا کر کہا کہ گھوڑے پر زین ڈال دے۔

اندھیرے اصطبل کی چھوٹی سی کھڑکی میں سے چھن کر آتی چاندنی کی نیلگوں لکیر میں گھوڑے کی آنکھ ہیرے کی کنی کی طرح چمک رہی تھی۔ سائیس نے گھوڑے پر بھاری بھرکم زین رکھی اور لگام سے پکڑ کر اسے اصطبل سے باہر لے آیا۔ باہر نکل کر اس نے گھوڑے کی دم پکڑی اور اس میں گرہ لگا دی۔ جانور خوب سدھا ہوا تھا مگر جب زین کے بند اس کی پسلیوں میں چبھتے تو وہ اودھی اودھی سانسیں لینے لگتا۔ زین کا ایک بند ٹوٹا ہوا تھا۔ سائیس نے بڑی مشکل سے اسے کنڈے میں سے گزارا اور دانتوں سے کھینچ کر گرہ لگا دی۔

زین کسنے سے فربہ گھوڑا چست نظر آنے لگا۔ سائیس نے احاطے کے سامنے پہنچ کر لگام کو لکڑی کے سال خوردہ کھمبے کے گرد

لپیٹا اور واپس چلا گیا۔ گھوڑا دیر تک چوبی کھمبے پر سم مارتا رہا اور پیلے پیلے دانتوں سے اسے کاٹنے کی کوشش کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پسلیاں پھلا کر ہنہناتا۔ ایسا کرنے میں اس کے پیٹ کے تمام پٹھے لرزنے لگتے۔ قریب ہی گڑھے میں آخری راتوں کے چاند کا سبزی مائل عکس پڑ رہا تھا۔ بے پتوں کے باغ میں دھند آلود کہرا اتر رہا تھا۔

شکاری چابک ہاتھ میں لئے سٹریش نیف ڈیوڑھی میں نمودار ہوا لمبی اور خمیدہ ناک، چھریرا جسم مگر کاٹھی چوڑی۔ اس کا چھوٹا سا سر اوپر اٹھا ہوا تھا۔ قرمزی رنگ کا استراخانی ہیٹ نئے، بھوری جیکٹ اور نقرئی کمر بند باندھے قد آور سٹریش نیف بے حد وجیہہ نظر آتا تھا۔ چاند کی روشنی میں بھی دیکھا جا سکتا تھا کہ اس کا ستا ہوا چہرہ زمانے کے سرد گرم چشیدہ تھا۔ گھنگھریالی مگر گھنی داڑھی میں کہیں کہیں سفیدی کی جھلک تھی اور گردن کے پٹھے کھچے ہوئے تھے۔ اس کے شکاری جوتے پرانے ہو چلے تھے اور جیکٹ کے دامن پر خرگوش کے خون کے خشک دھبے نظر آتے تھے۔

ڈیوڑھی کی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی۔ مدھم سی آواز میں کسی نے پوچھا:

''آندرئی بیٹا کہاں جا رہے ہو؟''

''اماں۔ میں اب بچہ نہیں رہا۔'' سٹریش نیف نے تیوری چڑھا کر لگام تھامتے ہوئے جواب دیا۔ کھڑکی بند ہو گئی مگر اب برآمدے کا دروازہ کھلا۔ پاویل سٹریش نیف چپل گھسیٹتا ہوا ڈیوڑھی تک آیا۔

''کدھر کے ارادے ہیں، آندرائی؟'' اس نے بھاری آواز میں سوال کیا۔ اس کی چندھی آنکھیں پھولے ہوئے گالوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ سفیدی مائل بالوں کو پیچھے کی طرف کنگھی کیا گیا تھا۔ زیر جامہ پہنے پاویل نے اوورکوٹ کندھوں پر ڈال رکھا تھا۔ عام طور پر ذرا سا نشہ بھی اس کی زبان کھول دیا کرتا تھا۔ ''بہر حال ویرا الیکسی ونا کو میری طرف سے آداب کہنا۔ میں نے ہمیشہ اس کا احترام کیا ہے۔''

''تو گویا آپ کسی کا احترام بھی کر سکتے ہیں۔'' سٹریش نیف نے جواب دیا۔ ''ویسے یہ آپ ہر وقت پرائے پھٹے میں ٹانگ کیوں اڑایا کرتے ہیں؟''

''اوہو۔ معاف کرنا بھئی، معاف کرنا!'' پاویل بولا اور گنگناتا ہوا واپس ہو لیا۔ ''گلی اکیلی ہے اور یہ اندھیری راتیں ہیں۔ جو آ ملو تو سجن۔۔۔''

سٹریش نیف دانت پیستا ہوا گھوڑے کی طرف مڑا۔ رکاب سے پاؤں چھوتے ہی گویا گھوڑے میں زندگی لوٹ آئی اور اس نے لڑکھڑاتے ہوئے چلنا شروع کیا۔ سٹریش نیف آہستہ سے سوار ہوا اور چرچراتی ہوئی کاٹھی پر جم کر بیٹھ گیا۔ گھوڑے نے گردن اٹھائی اور گڑھے میں چاند کے عکس کو روندتا ہوا دلکی چال چلنے لگا۔

☆☆☆

چاندنی میں نہائے ہوئے سرد کھیتوں کی چوبی باڑیں جگنوؤں سے سپید ہو رہی تھیں۔ اُلّو آواز پیدا کئے بغیر اچانک باڑوں سے بڑے بڑے پر پھیلائے ہوا میں بلند ہوتے تو گھوڑا بدکنے لگتا۔ سڑک، چاندنی اور اوس میں بھیگتے چھدرے جنگل میں گم ہو رہی تھی۔ گیلا اور روشن چاند درختوں کی ٹنڈ منڈ شاخوں میں سے پل بھر کو جھلک دکھاتا تو یہ ننگی شاخیں گویا اس کی خنک روشنی میں مدغم ہو جاتیں۔ پگڈنڈیوں پر مُردہ پتوں اور بید مجنوں کی چھال کی تلخ بو پھیلی ہوئی تھی۔۔۔ کبھی چراگاہوں کی لامتناہی ڈھلانیں آتیں تو کبھی اوس زدہ جھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے گھوڑے کے نتھنوں سے سفید بھاپ نکلنے لگتی۔ سموں کے نیچے آ کر ٹوٹتی شاخوں کی بازگشت پہاڑی ڈھلان پر اُگے کشیدہ قامت درختوں میں دور تک جاتی تھی۔۔۔ اچانک گھوڑے نے کنوتیاں کھڑی کر لیں۔ چراگاہ کی زرد دھند میں پتلی پتلی ٹانگوں اور گردنوں والے دو موٹے تازے بھیڑیئے کھڑے تھے۔ وہ چپکے کھڑے سٹریش نیف کے گھوڑے کو قریب آتا دیکھتے رہے اور پھر چھلانگ لگا کر کہرے سے چمکتی گھاس میں غائب ہو گئے۔

''اور اگر وہ ایک دن مزید رک جائے تو۔۔۔'' سٹریش نیف نے سر اٹھا کر چاند کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

چاند، برف سے ڈھکی ویران چراگاہوں کے عین اوپر گویا لٹک رہا تھا۔ خزاں کا حسن بہت غم آگیں ہوتا ہے۔

گھوڑا پوری قوت صرف کر کے خشک برساتی ندیوں کے کٹاؤ سے لمبے، گھنے درختوں کی طرف چڑھائی کر رہا تھا۔ زین کا چوبی چوکھٹا چرچرانے لگا۔ یکا یک گھوڑے کے قدم لڑکھڑائے اور وہ ڈھلان سے گرتے گرتے بچا۔ غصے میں سٹریش نیف کے خدوخال بگڑ گئے۔ اس نے چابک گھما کر پورے زور سے گھوڑے کے سر پر مارا ''او بڈھے کتے!'' اس کی غصیلی چنگھاڑ جنگل میں دور تک گونجا کی۔

جنگل سے آگے بے آب و گیاہ کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ پہاڑی کے دامن میں دور دور تک گندم کے سیاہ ٹھنٹھ نظر آ رہے تھے۔ ان کے بیچ ایک مفلوک الحال سا تعلقہ تھا۔ چھٹکی ہوئی چاندنی میں چھپر کا مکان اور چند ملحقہ کمرے اور بھی ویران لگ رہے تھے۔

سٹرلیش نیف رک گیا۔ لگتا تھا اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے صحن میں داخل ہو گیا۔ مکان میں بالکل اندھیرا تھا۔ سٹرلیش نیف اچھل کر گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ گھوڑا سر نہوڑائے کھڑا رہا۔ احاطے میں ایک بوڑھا سا کتا ٹانگوں پر تھوتھنی رکھے پڑا تھا۔ حرکت کئے بغیر اس نے سٹرلیش نیف کی طرف دیکھا اور ابرو اٹھا کر اپنی دم زمین پر مارنے لگا جیسے مہمان کا سواگت کر رہا ہو۔ سٹرلیش نیف ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ سارے میں بیت الخلا سے آتی ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے والے کمرے سے مدھم روشنی چھن رہی تھی جس میں کھڑکیوں کے کہر آلود شیشے سنہرے ہو رہے تھے۔

شب خوابی کا مہین سا لباس پہنے ایک چھوٹی سی عورت بے آواز قدموں سے دوڑتی ہوئی اندھیرے کمرے میں آئی۔ سٹرلیش نیف اس کی طرف جھکا اس نے اپنے عریاں بازو سٹرلیش نیف کی دبلی سی گردن میں حمائل کر دیئے اور اس کے کوٹ سے سر ٹکائے خوشی سے ہولے ہولے سسکتی رہی۔ وہ اس کی بچوں جیسی دھڑکن سن رہا تھا۔ اس کے سینے پر آویزاں چھوٹی سی طلائی صلیب کو محسوس کر سکتا تھا۔ یہ صلیب اس کی دادی کی نشانی تھی اور اس کا بچ رہنے والا واحد اثاثہ تھی۔

"تم کل تک ٹھہرو گے۔ ٹھہرو گے نا؟" وہ سرگوشی میں پوچھ رہی تھی۔ "اف، تمہیں اپنے سامنے پا کر بھی مجھے یقین نہیں آتا۔"

"ویرا، میں جا کر گھوڑے کو باندھ آؤں۔" سٹرلیش نیف نے خود کو علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ "کل تک۔ کل تک۔" اس نے دوہرایا اور سوچنے لگا۔ "خدایا! یہ تو روز بروز دیوانی ہو رہی ہے۔ تمباکو نوشی بھی زیادہ کر رہی ہے اور ہم آغوشیوں میں کیسی بے تابی آ گئی ہے۔"

ویرا کا خوبصورت چہرہ پاؤڈر سے مخملیں ہو رہا تھا اور پھر اپنے نرم ہونٹ بڑی مضبوطی سے اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ صلیب اس کے عریاں سینے پر چمکتی رہی۔ اس کا شب خوابی کا گاؤن بے حد مہین تھا۔ دراصل اس کے پاس یہی ایک گاؤن باقی تھا جسے اس نے خاص خاص موقعوں کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔

"مجھے کیسا یقین تھا!" سٹرلیش نیف نے ویرا کی نوجوانی کے دن یاد کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے کتنا پختہ یقین تھا کہ میں ویرا سے صرف ایک ملاقات کے عوض بغیر ہچکچائے اپنی عمر کے پندرہ سال قربان کر سکتا تھا۔"

☆☆☆

پو پھٹ رہی تھی۔ پلنگ کے قریب ہی فرش پر موم بتی جل رہی تھی۔ سٹرلیش چھت کی طرف منہ کئے چت لیٹا تھا۔ قمیص کا گریبان کھلا تھا، بازو سر سے اوپر پھیلے ہوئے تھے، اس کی خمیدہ ناک دیوار کی طرف مڑی ہوئی تھی۔ پاس ہی ویرا گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے بیٹھی تھی۔ روتے رہنے سے اس کی آنکھیں سرخ اور متورم ہو رہی تھیں۔ سگریٹ پیتے ہوئے وہ بے رنگ نظروں سے فرش کو گھور رہی تھی۔ اس نے ایک ٹانگ دوسری پر رکھنا چاہی تو اس کی نظر اپنے ننھے سے پاؤں پر پڑی جو قیمتی اور خوشنما جوتے میں بڑا بھلا معلوم ہوتا تھا، مگر اس کے دل میں اٹھنے والا درد ہر چیز کو اپنے اندر ڈبوئے دے رہا تھا۔

"میں نے تمہارے لئے سب کچھ گنوا دیا۔" وہ آہستہ سے بولی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی آواز میں بلا کی نرمی اور بچوں جیسا احساسِ زیاں تھا، مگر سٹرلیش نیف نے آنکھیں کھولتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا:

"تم نے کیا گنوایا؟"

"سب کچھ۔ ہر چیز گنوا دی۔ سب سے بڑھ کر اپنی عزت، اپنی جوانی۔"

"تم اور میں ایسے جوان بھی نہیں رہے۔"

"کیسے سنگدل ہو رہے ہو۔ تم مجھے بالکل نہیں سمجھ پائے۔" وہ نرمی سے بولی۔

"دنیا بھر کی عورتیں یہی کہتی ہیں۔ یہ ان کا پسندیدہ لفظ ہے جسے وہ مختلف لہجوں میں ادا کرتی ہیں۔ پہلے ترنگ میں آ کر کہتی ہیں: "تم کتنے ذہین ہو۔ مجھے کتنی اچھی طرح سمجھتے ہو۔" اور پھر" کیسے سنگدل ہو رہے ہو۔ تم مجھے بالکل نہیں سمجھ پائے۔"

ہولے ہولے روتے ہوئے وہ بولتی گئی جیسے کچھ سن نہ رہی ہو: "مانا کہ میں ناکام ہو چکی۔۔۔ مگر میں نے ہمیشہ موسیقی سے محبت کی ہے اور مجھے اب بھی موسیقی سے عشق ہے۔ اگر زیادہ نہیں تو میں نے کچھ نہ کچھ کامیابی تو حاصل کر لی ہوتی۔"

"مگر موسیقی کا اس سے کیا تعلق؟ جس لمحے پیڈرسکی۔۔۔"

"آندری۔ میری جان۔ ایسا مت کہو۔۔۔ اور اب مجھے بورڈنگ سکول میں ڈانس کی کلاسوں کے لیے پیانو بجانا پڑتا ہے اور وہ بھی اس منحوس شہر میں جس سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی۔ پھر بھی مجھے کوئی نہ کوئی مل جاتا جو میرا ہاتھ تھام لیتا۔ مجھے پیار اور احترام دیتا۔ میرا گھر ہوتا۔ بچے ہوتے۔ مگر ہمارے پیار کی یادوں۔۔۔"

سٹرلیش نیف نے سگریٹ سلگایا اور آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا جیسے ایک ایک لفظ تول رہا ہو: "ویرا، ہم خاندانی لوگوں کے لئے محبت کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ ہماری زندگیاں زہر آلود ہو جاتی ہیں۔ اس محبت نے تمہیں نہیں مجھے برباد کیا، پندرہ سولہ برس پہلے

میں ہر روز یہاں آتا تھا۔ تمہاری دہلیز پر رات بسر کرنا میں اپنے لئے اعزاز سمجھتا تھا۔ لڑکا ہی تو تھا۔ جذباتی اور بے وقوف۔''

سگریٹ بجھ چکا تھا۔ اس نے بازو گھما کر اسے دور پھینکا اور بازو چارپائی پر ڈال کر چھت کو گھورنے لگا: ''ہمارے باپ دادا کی محبتوں کے افسانے، سنہری چوکھٹوں میں جڑی ہوئی بیضوی تصویریں، خاندان کے روحانی پیشواؤں کی قلمی تصویریں، سب کچھ ہمارا ورثہ تھا۔ تمہیں یاد ہے ان دنوں میں شاعری بھی کیا کرتا تھا: تمہیں پیار کرتے ہوئے،

میں خواب دیکھتا ہوں، خواب دیکھنے والوں کے
ان کے جنہوں نے سو برس پہلے اس زمین پر محبت کی،
ان تاروں کی چھاؤں میں،
جو کبھی ان کے لیے چمکتے تھے،
میں تمہاری ہی سوچوں میں بھٹکتا پھرتا ہوں

اس نے ویرا پر ایک نظر ڈالی۔ اس کا لہجہ سخت ہوتا گیا:

''آخر تم کیوں چلی گئیں اور گئیں بھی کس کے ساتھ۔ کیا وہ تمہارے قبیلے سے تھا؟ تمہارا اور اس کا کیا میل تھا؟'' وہ اٹھ بیٹھا اور غضب ناک آنکھیں ویرا کے خشک سیاہ بالوں پر گاڑ دیں۔ ''میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی سوچوں میں بھی احترام دیا کہ تم میری ہونے والی بیوی تھیں اور جب قسمت نے ہمیں ایک ہونے کا موقع دیا تو تم میرے لیے کیا بن چکی تھیں؟ میری بیوی؟ تب ہمارے پاس جوانی بھی تھی، صحت بھی اور معصومیت بھی۔ وہ تمہارے چہرے پر آتے گہرے رنگ، تمہاری ململ کی نفیس قمیص۔۔۔ تمہیں معلوم ہے ہر روز تمہیں ملنے آنا میرے لئے کیا معنی رکھتا تھا۔ تمہارے شوخ لباس، دھوپ میں سنولائے ہوئے تمہارے ننگے بازو اور چمکتی ہوئی تاتاری آنکھیں۔۔۔ اور تم میری طرف دیکھنے سے گھبراتی تھیں۔ تمہارے سیاہ بالوں میں اٹکا ہوا زرد گلاب اور تمہاری مسکراہٹ ۔۔۔ کچھ حیران، کچھ احمقانہ سی مسکراہٹ مگر اس پر کیسا پیار آتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ تم کسی اور کے بارے میں سوچتی ہوئی باغ کی روشوں پر۔۔۔ نکل جاتیں۔ کرد کے کھیلتے ہوئے یہ ظاہر کرتیں کہ تم واقعی کھیل میں دلچسپی لے رہی ہو۔ جب تمہاری اماں نے میری بے عزتی کی تو تم دریچے میں کھڑی سب سن رہی تھیں۔ ویرا یہ سب کچھ میرے لئے۔۔۔۔''

''یہ سب اماں کا ہی کیا دھرا ہے۔'' ویرا نے بڑی دقت سے کہا۔

''نہیں۔ تمہیں یاد ہے جب تم پہلی بار ماسکو گئیں۔ سامان باندھتے ہوئے تم میری طرف دیکھے بغیر گنگنا رہی تھیں۔ تم اپنے خوابوں میں ایسی مگن ہو رہی تھیں اور تمہیں آنے والی خوشیوں کا ایسا یقین ہو رہا تھا۔ یخ بستہ شام میں تمہیں خدا حافظ کہنے کے لئے میں نے گھوڑے پر سفر کیا۔ گھاس کے سبز میدان اور ٹھنٹھوں سے بھرے ہوئے کھیت اور پھر تمہاری گاڑی کی کھڑکی کا پردہ۔۔۔۔ اف خدایا''

اس کی آواز کی تلخی میں آنسو گھل رہے تھے۔ اس نے تکئے پر سر رکھ دیا۔ ''تم نے ہاتھوں پر خوشبو لگا رکھی تھی جو میرے ہاتھوں میں بھی چلی آئی۔ واپس آتے ہوئے میں گھوڑے کے پسینے اور زین کے چمڑے کی بو میں بس گیا، مگر وہ خوشبو تھی کہ میرے نتھنوں میں چلی آتی تھی۔ میں جھٹپٹے میں بڑی سڑک پر سفر کرتا رہا اور میرے آنسو گرتے چلے گئے۔۔۔ میں کہتا ہوں اگر کسی نے قربانی دی ہے، اگر کسی نے پوری زندگی تباہ کی ہے تو وہ میں ہوں۔ بوڑھا شرابی!''

گالوں اور مونچھوں سے بہتے آنسوؤں کا نمکین ذائقہ سٹریلش نیف کے ہونٹوں پر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ پلنگ سے اتر آیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

چاند ڈوب رہا تھا۔ برف کے سفید گالے پہاڑی کے دامن میں پھیلے ہوئے کھیتوں میں اٹکے ہوئے تھے۔ افق کے آخری کنارے پر ارغوانی پو پھوٹ رہی تھی۔ بہت دور کجلائے ہوئے سرد جنگل میں مرغ بانگ دے رہا تھا۔

سٹریلش نیف احاطے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ خنکی باریک سی قمیص کو چیرتی ہوئی نکل رہی تھی۔

''اور پھر۔۔۔ ہمارے کردار بدل گئے۔ یہ تو ہونا ہی تھا'' اس نے بڑی آہستگی سے تاسف کیا ''خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے اب تو سب کچھ ختم ہو چکا۔''

☆☆☆

صبح کی چائے یخ بستہ کمرے کی بڑی سی میز پر رکھ دی گئی۔ داندار سماوار کو سبز غلاف سے ڈھانپا گیا تھا۔ سماوار کے نیچے آگ کب کی بجھ چکی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر اٹکے کہرے کے قطرے غائب ہو چکے تھے۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے برفانی صبح کا روشن سورج اور بجھی بجھی پژمردہ گھاس پر کھڑا ایک ٹیڑھا میڑھا پیڑ نظر آتا تھا۔ خواب آلود چہرہ لئے سرخ بالوں والی خادمہ ننگے پاؤں کمرے میں آئی اور متری کے پہنچنے کی اطلاع دی۔

''وہ انتظار کر سکتا ہے۔'' سٹریلش نیف نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔ ویرا بھی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ رات بھر میں اس کا منہ ذرا سا نکل آیا۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔ سیاہ بال گلابی غازے کو حلقہ کئے ہوئے تھے۔ سٹریلش نیف کا دبلا پتلا اور کرخت چہرہ کسی لاش کے مانند پیلا ہو رہا تھا۔ اس کا منہ ہوا میں اٹھا

فلپائن کے لوگوں کو اپنی تہذیب اور کلچر پر بہت ناز ہے۔ یوں بھی یہاں کا کلچر اور آرٹ خاصا قدیم ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ۱۵۲۱ء میں جب ہسپانوی اس ملک میں آئے، اس وقت بھی یہاں تہذیب و تمدن کا دور دورہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہاں کے قدیم باشندے اگرچہ ایشیائی نسل کے تھے لیکن آرٹ اور کلچر کے اعتبار سے فلپائن اپنے ہمسایوں سے مختلف تھا۔
جب ہسپانوی یہاں آئے تو وہ اپنے ساتھ کرسچین تہذیب و تمدن کا تحفہ لے کر آئے جس کی وجہ سے مقامی کلچر میں خاصی تبدیلی پیدا ہوئی۔ ہسپانوی کلچر نے رفتہ رفتہ اس تمام ملک کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ کرسچین اور ہسپانوی تہذیب کا خاصا نمایاں اور قابلِ محسوس اثر آج بھی شدت سے نظر آتا ہے۔ ہسپانوی اپنے ساتھ عرب تمدن کی جھلکیاں بھی لے کر آئے تھے جو آج بھی یہاں موجود ہے۔ خود فلپائنی زبان پر عربی کا خاصا اثر ہے، جو ہسپانویوں کے علاوہ بعد میں آنے والے عرب تاجروں اور سوداگروں کی وجہ سے بھی اس ملک کے لوگوں نے قبول کیا۔ مثال کے طور پر فلپائنی زبان میں ایسے کئی الفاظ استعمال ہوتے ہیں، جو عربی سے ہوتے ہوئے اُردو میں داخل ہوئے اور آج بھی بولے جاتے ہیں۔ مثلاً لوٹا، تولیہ، صابن اور اسی قسم کے بیشتر الفاظ جن سے ہمارے کان خاصے مانوس ہیں۔

دورانِ سفر ـ علی سفیان آفاقی

ہوا تھا اور جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں سے گلے کا ابھرا ہوا کنٹھا نظر آتا تھا۔

سورج ابھی پوری طرح اوپر نہیں آیا تھا، مگر اس کی روشنی آنکھیں چندھیا رہی تھی۔ سامنے کا احاطہ رات کی برف سے سفید ہو رہا تھا جو نمک کی طرح گھاس اور گوبھی کے سبزی مائل نیلے پتوں پر چھڑکی ہوئی تھی۔ سیپے جیسی آنکھوں والا شخص جو بھوسے سے بھرا ہوا چھکڑا لئے احاطے میں آیا تھا، چھکڑے کے گرد چکر لگا کر بھوسے کو ہاتھوں سے دبا رہا تھا۔ اس نے دانتوں میں پائپ دبا رکھا تھا اور دھوئیں کا چھلا سا اس کے کندھوں سے پیچھے اڑتا جا رہا تھا۔ ویرا سمور کا کوٹ پہنے ہوئے احاطے میں آئی۔ پرانی طرز کا یہ کوٹ کبھی قیمتی رہا ہوگا، اب تو بالکل خستہ ہو رہا تھا۔ وہ سر پر سیاہ تنکوں سے بنا ہوا موسم گرما کا ہیٹ رکھے ہوئے تھی جس پر ٹانکے گئے تلے کے پھول جگہ جگہ سے بدرنگ ہو چکے تھے۔

سٹریش نیف انہیں بڑی سڑک تک چھوڑنے گیا۔ اس کا گھوڑا چھکڑے کے پیچھے پیچھے ان راستوں پر چلتا گیا جہاں برف پگھل چکی تھی۔ اچانک گھوڑا منہ پھیر کر ویرا کے تنکوں والے ہیٹ کی طرف ہمکا۔ سٹریش نیف نے چابک گھما کر اس کے ناک پر مارا۔ گھوڑا سر تنتنے اور زور زور سے ہنہنانے لگا۔ وہ خاموشی سے سفر کرتے رہے۔ بوڑھا کتا گھر ہی سے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ صاف اور نیلے آسمان پر چمکتے سورج میں حدت تھی۔ بڑی سڑک کے قریب کوچوان اچانک ویرا سے مخاطب ہوا:

''میں اگلی گرمیوں میں پھر اپنا چھوٹا کتا آپ کے ہاں بھیج دوں گا۔ میرا خیال ہے وہ بھیڑیں چرانے میں آپ کی مدد کر سکے گا۔''

ویرا نے شرما کر سٹریش نیف کی طرف دیکھا۔ سٹریش نیف نے اپنا ہیٹ اتارا اور گھوڑے سے جھک کر ویرا کے ہاتھ پر ایک طویل بوسہ دیا۔ اس کے ہونٹ سٹریش نیف کی سفید ہوتی کنپٹیوں کے پاس کپکپا رہے تھے۔ وہ ہولے سے بولی: ''اپنا خیال رکھنا میری جان اور میرے بارے میں بدگمانی نہ رکھنا۔''

بڑی سڑک پر پہنچ کر کوچوان نے رفتار بدل دی اور کھڑ کھڑاتا ہوا چھکڑا نظروں سے اوجھل ہونے لگا۔ سٹریش نیف نے گھوڑا موڑا اور سمت کا تعین کئے بغیر کھیتوں میں چلتا گیا۔ ایک فاصلے پر کتا بھی پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ سٹریش نیف رک کر کتے پر اچانک چابک لہراتا تو وہ پچھلی ٹانگوں پر بیٹھ جاتا جیسے کہہ رہا ہو: ''آخر میں کہاں جاؤں؟'' سٹریش نیف گھوڑا بڑھاتا تو کتا پھر پیچھا شروع کر دیتا۔ سٹریش نیف کے خیالات بہت دور ریلوے اسٹیشن، اس کی چمکتی ہوئی پٹڑیوں اور دھواں اگلتی، جنوب کی طرف بھاگتی گاڑیوں پر مرکوز تھے۔

وہ ویران کھیتوں اور گرم چٹانوں کے درمیان چلتا رہا۔ نیلے آسمان کے نیچے خزاں کا روشن دن بالکل خاموش تھا۔ ننگے کھیتوں، خشک برساتی نالوں اور تاحدِ نظر پھیلے ہوئے میدانوں میں ایک بھی آواز باقی نہیں تھی۔ جھاڑیوں سے اڑنے والی بڈھیاں ہوا میں تیر رہی تھیں۔ پرندے جھاڑیوں میں بیٹھے تھے۔ انہیں سارا دن یہیں گزارنا تھا۔ بس کبھی اڑتے اور ایک شاخ سے دوسری شاخ پر بیٹھے، خاموش اور خوشیوں بھری زندگی کے تسلسل میں!

گیبریل گارشیا مارکیز کی بیاض سے

آخر کار

ایک دندان ساز کا احوال، ایک روز دشمن اس کی ڈاڑھ تلے آ گیا تھا

ترجمہ: فاروق حسن

سوموار کی گرم صبح بغیر بارش کے طلوع ہوئی۔ علی الصباح بیدار ہونے کے عادی، بغیر ڈگری کے دندان ساز، اوریلیو ایسکو بار نے چھ بجے اپنا دفتر کھولا۔ پلاسٹر کے سانچے میں نصب چند نقلی دانت اس نے شیشے کی الماری میں سے نکالے اور مٹھی بھر اوزاروں کو ان کی قامت کے مطابق ترتیب دے کر میز پر رکھا، یوں جیسے ان کی نمائش کی جانے والی ہو۔ اوریلیو ایسکو بار نے بے کالر کی قمیص پہن رکھی تھی جس کا گلا سونے کی کیل سے بند تھا اور اس کی پتلون کو گارٹرز نے اپنی جگہ پر سنبھالا ہوا تھا۔ جسمانی لحاظ سے وہ سوکھا ہوا آدمی تھا جو ہر وقت عموماً سیدھا کھڑا رہتا تھا اور اس کے چہرے پر ایسا تاثر رہتا تھا جیسا عموماً بہرے لوگوں کے چہروں پر ہوتا ہے، حالانکہ اس تاثر کی اصل صورت حال سے مطابقت کم ہی تھی۔

اوزار میز پر ترتیب دینے کے بعد دانتوں کی صفائی کی مشین کو اپنی طرف کھینچ کر، وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور نقلی دانتوں کو چمکانے کے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کا ذہن اپنی اس مصروفیت کے بارے میں ہر طرح کی سوچ سے عاری لگتا تھا۔ لیکن وہ انہماک اور باقاعدگی سے، ضرورت بے ضرورت، مشین کو پاؤں کے پیڈل سے ہلاتا اور دانتوں کو چمکاتا رہا۔

آٹھ بجے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ کھڑکی سے باہر جہاں تک کہ اس نے آسمان کا جائزہ لیا، اور پڑوس کے گھر کی چھت پر نصب آڑی چوب پر دو مغموم گدھوں کو بیٹھے سورج کی گرمی میں اپنے پروں کو سکھاتے دیکھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ دوپہر کے کھانے کے وقت سے قبل بارش ہونے کا امکان ہے، پھر وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس کے گیارہ سالہ بیٹے کی چیختی ہوئی آواز نے اس کے انہماک کا تسلسل توڑا:

"پاپا۔"

"ہاں؟"

"باہر قصبے کا میئر آیا ہے، وہ پوچھتا ہے آپ اس کا ایک دانت نکال دو گے؟"

"اس سے کہہ دو میں موجود نہیں ہوں۔"

وہ سونے کے ایک دانت کو چمکا رہا تھا۔ ہاتھ بھر کے فاصلے پر رکھ کر اور آنکھیں آدھی بند کر کے اس نے دانت کو غور سے دیکھا۔ اس کے بیٹے نے انتظار کے کمرے سے دوبارہ آواز لگائی:

"پاپا وہ کہتا ہے آپ موجود ہو، کیوں کہ وہ آپ کی آواز سن سکتا ہے۔"

دندان ساز دانت کے معائنے میں مصروف رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے دانت کو دوسرے پالش کئے ہوئے دانتوں کے قریب میز

پر رکھا اور بیٹے کو جواب دیا:

"تب تو اور بھی بہتر ہے۔"

اس نے دوبارہ مشین کو چلانا شروع کیا۔ گتے کے ایک ڈبے میں سے، جس میں سب طرح کی نامکمل چیزیں پڑی رہتی تھیں، اس نے دانتوں کے بل کا ایک حصہ نکالا اور اس کے سونے کو چمکانے لگا۔

"پاپا۔"

"ہاں؟" اس کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"میئر کہتا ہے اگر آپ اس کا دانت نہیں نکالو گے تو وہ آپ کو گولی مار دے گا۔"

کسی قسم کی عجلت دکھائے بغیر اس نے اطمینان سے مشین کے پیڈل کو ہلانا بند کیا اور اسے پرے دھکیلا۔ تب اس نے میز کی ایک دراز کو پورا باہر نکالا، وہاں ایک ریوالور پڑا تھا۔ "ٹھیک ہے" اس نے کہا۔ "اس سے کہو آ کر گولی مار دے مجھے۔"

کرسی کو دھکیل کر اس نے دروازے کے سامنے کر دیا اور اپنا ہاتھ میز کی دراز پر ہی رکھا۔ میئر دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کے چہرے کا بایاں حصہ شیو کیا ہوا تھا، لیکن اس کے سوجے ہوئے اور درد کرتے ہوئے دائیں گال پر پانچ دن کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ دندان ساز نے میئر کی بے حس آنکھوں میں یاس اور بے بسی کی متعدد راتوں کو جھانکتے ہوئے پایا۔ اس نے اپنی انگلیوں کے پوروں سے دراز کو بند کر دیا اور نرمی سے بولا:

"بیٹھ جاؤ۔"

"صبح بخیر" دندان ساز نے کہا۔

دانت نکالنے کے اوزار پانی میں ابل رہے تھے۔ میئر نے اپنا سر کرسی کی پشت کے ساتھ ٹکا دیا، یوں تھوڑا سا آرام محسوس ہوا۔ اس کا سانس یخ تھا۔ اس نے دفتر کا جائزہ لیا، نہایت غریبانہ سا انتظام تھا۔ لکڑی کی ایک پرانی کرسی، پیڈل والی مشین اور شیشے کی ایک الماری، جس میں خالی بوتلیں رکھی تھیں۔ کرسی کے مقابل کھڑکی میں شانوں کی اونچائی پر کپڑے کا پردہ لٹک رہا تھا۔ دندان ساز کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میئر نے ایڑیاں مضبوطی سے جوڑیں اور منہ کھول دیا۔

اوریلیو ایسکوبار نے اس کا چہرہ روشنی کی طرف موڑا اور اس کے متاثرہ دانت کو دیکھا۔ پھر اس نے جبڑا انگلیوں کے محتاط دباؤ سے بند کر دیا اور کہا:

"تمہیں بے ہوش کیے بغیر دانت نکالنا پڑے گا!"

نوبل انعام کی رسم میں سارا مجمع بے حد منظم اور پرسکون تھا جو مناسب موقعوں پر خوشی کا اظہار کرتے۔ بوڑھے بادشاہ نے ہم سے مصافحہ کیا' سند' تمغہ اور رقم کا چیک عطا کیا اور ہم اسٹیج پر اپنی مخصوص نشستوں پر واپس آ بیٹھے' جو مشتوں کے وقت کی طرح گندی نہ تھیں بلکہ اب پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ وہ کہتے ہیں (یا شاید میٹلڈی کو متاثر کرنے کے لیے کہا) کہ بادشاہ نے دوسری انعام پانے والی شخصیتوں کے مقابلے میں مجھے زیادہ وقت دیا تھا اور میرے ہاتھ کو دیر تک اپنے ہاتھ میں دوستی کے جذبے میں تھامے رکھا۔ شاید یہ محل کی جانب سے قدیم مہربانی کی گیارہویں سے تیرھویں صدی کی کوئی یاد تھی۔ بہرطور کسی اور بادشاہ نے میرے ہاتھ سے زیادہ یا تھوڑی دیر کے لیے بھی مصافحہ نہیں کیا تھا۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ تقریب' جو سخت روایتی انداز میں منعقد ہوئی' بے حد شان دار تھی۔ شاید دنیا میں شان و شوکت اہم موقعوں پر ہمیشہ موجود رہے گی۔ انسانوں کو اس کی ضرورت ہے۔
لیکن مجھے اہم شخصیات کا اس تقریب میں انعام لیتے ہوئے مارچ کرتے دیکھنا' چھوٹے قصباتی اسکولوں میں بچوں کی تقریب انعامات سے بے حد مماثل نظر آیا۔ ——————— پابلو نرودا

''کیوں؟''
''اس لئے کہ دانت کے نیچے پیپ بھری ہوئی ہے۔''
میئر نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا، اور مسکرانے کی کوشش کی۔ دندان ساز نے اس کی مسکراہٹ کا جواب نہ دیا۔ ابالے ہوئے اوزاروں والا گرم تسلا اس نے میز پر رکھا اور ایک ٹھنڈی چمٹی سے، کسی عجلت کے بغیر، اوزار باہر نکالے۔ جوتے کی نوک سے اگال دان کو ہلا کر اس نے ٹھیک جگہ رکھا اور ہاتھ دھونے کے لئے نلکے کے آگے جا کر کھڑا ہوا۔ ان سب کاموں کے دوران اس نے ایک بار بھی میئر کی طرف نہ دیکھا لیکن میئر نے ایک لمحے کے لیے بھی ڈاکٹر کو اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔
متاثرہ دانت نچلے جبڑے کی عقل داڑھ تھی۔ دندان ساز نے اپنے پاؤں پھیلائے اور گرم زنبور سے دانت کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میئر نے اپنی تمام قوت سے دونوں ہاتھوں سے کرسی کے بازوؤں کو جکڑا اور پاؤں اکڑا کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنے گردوں میں یخ آلود خلا کی موجودگی کا احساس ہوا، لیکن اس نے آواز نہ نکالی۔ دندان ساز فقط اپنی کلائی کو حرکت دے رہا تھا۔ کسی کینے کے بغیر، بلکہ ایک ترش آمیز ملامت سے اس نے میئر سے کہا:
''ہمارے بیس آدمیوں کے قتل کا حساب تم اب چکاؤ گے۔''
میئر نے اپنے جبڑے میں ہڈی کی کڑکڑاہٹ کو محسوس کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن جب تک دانت منہ سے باہر نہ آ گیا اس نے سانس تک نہ لیا۔ آنسوؤں کے عقب سے اس نے دانت کو دیکھا۔ اسے یہ دانت اپنی ساری تکلیف سے اس قدر غیر متعلق لگا کہ وہ پچھلی پانچ راتوں کی اذیت کو سمجھنے میں ناکام رہا۔

پسینے میں شرابور، کانپتا ہوا، وہ اگال دان کے اوپر جھکا رہا۔ اس نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور پتلون کی جیب میں سے رومال نکالنے کی کوشش کی۔ دندان ساز نے صاف کپڑا اس کی طرف بڑھایا۔
''اپنے آنسو صاف کرو۔'' اس نے کہا۔
میئر نے آنسو پونچھے۔ وہ کانپ رہا تھا۔ جب تک دندان ساز ہاتھ دھوتا رہا، میئر بوسیدہ چھت کو دیکھتا رہا جس پر گرد آلود جالے لگے ہوئے تھے، جن میں مکڑیوں کے انڈے اور مردہ کیڑے مکوڑے لٹکے ہوئے تھے۔ دندان ساز ہاتھ پونچھتا ہوا واپس آیا۔
''گھر جا کر آرام کرو۔'' وہ بولا ''اور نمک کے پانی سے غرارے کرتے رہو۔''
میئر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے تقریباً فوجیوں کے سے سرسری انداز میں دندان ساز کو سلیوٹ کیا اور دروازے کی طرف چلا۔ چلتے ہوئے اس نے اپنی ٹانگوں کو جھٹک کر سیدھا کیا اور کوٹ کے بٹن بند کیے۔
''بل بھجوا دینا'' اس نے کہا۔
''کس کے نام؟ تمہارے یا ٹاؤن کمیٹی کے؟''
میئر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کلینک کا دروازہ بند کیا۔ جالی کے دروازے کے باہر سے اس کی آواز آئی:
''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سالی ایک ہی بات ہے۔''
☆☆☆☆☆

اس رات ہماری ماں بازار گئی تو واپس ہی نہیں آئی۔ پتہ نہیں، اس کے ساتھ کیا ہوا۔ میرا باپ بھی ایک دن اسی طرح چلا گیا تھا پھر کبھی واپس نہیں آیا لیکن وہ تو جنگ لڑ رہا تھا۔ ہم بھی جنگ ہی کی حالت میں تھے لیکن خیر، ہم بچے تھے۔ ہم اپنے دادی اور دادا کی

طرح تھے جن کے پاس ہتھیار بھی نہیں تھے۔ جن لوگوں سے میرا باپ لڑ رہا تھا، حکومت انہیں ڈاکو سمجھتی تھی، وہ ہر جگہ اودھم مچائے ہوئے تھے۔ ہم سب ان سے جان بچانے کے لئے اس طرح ڈر کر بھاگتے تھے جیسے مرغیاں کتوں سے ڈر کر بھاگ رہی ہوں۔ ہماری

سیاہ دیس سے ایک روشن تحریر

ہجرت

بے زمین آدم زادوں کی روداد سفر

گدھ بھی ان کے ہم رکاب تھے

نادین گورڈیمر / نکہت حسن

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائیں۔ ہماری ماں اس لیے بازار گئی تھی کہ اسے کسی نے بتایا تھا، بازار میں کھانے کا تیل مل رہا ہے۔ ہم اس بات سے بہت خوش تھے کیوں کہ ہم نے بہت دن سے تیل چکھا تک نہیں تھا۔ ماں کو شاید تیل مل گیا تھا اسی لیے کسی نے اندھیرے میں اسے قتل کر دیا اور اس سے تیل چھین لیا یا شاید اس کی ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہو گئی ہو گی۔ اگر آپ کا بھی کبھی ڈاکوؤں سے سامنا ہو تو وہ آپ کو بھی مار ڈالیں گے۔

وہ دو بار ہمارے گاؤں میں آئے، ہم بھاگ کر جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ جب وہ چلے گئے تب ہم جھاڑیوں سے نکل کر گھروں میں آئے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ ہر چیز کا صفایا کر چکے ہیں۔

لیکن تیسری دفعہ انہیں گھر میں کوئی چیز نہیں ملی، نہ تیل، نہ کوئی اور کھانے کی چیز۔ انہوں نے گھر کی چھپر اور پرال کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے ہمارے گھر کی چھت زمین پر آ رہی۔ میری ماں ٹین کی چادروں کے کچھ ٹکڑے لے آئی تھی جن سے گھر کا کچھ حصہ ڈھک دیا گیا تھا۔ اس رات ہم اسی چھت کے نیچے بیٹھے اپنی ماں کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔

ہم کام کاج کے سلسلے میں بھی باہر نکلنے سے ڈرتے تھے کیونکہ ڈاکو واقعی پھر آ گئے تھے۔ ہمارے گھر میں تو خیر نہیں آئے، بے چھت کا گھر انہیں سامان اور انسانوں سے خالی نظر آیا مگر پورے گاؤں میں وہ ڈھٹائی سے دندناتے پھرے۔ ہمیں لوگوں کی چیخ پکار اور بھگدڑ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ہم تو اپنی ماں کی ہدایت کے بغیر بھاگنے سے بھی ڈرتے تھے۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں منجھلی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی میرے پیٹ سے ایسا چمٹا ہوا تھا جیسے بندریا کا بچہ اس کے پیٹ سے چمٹا ہوتا ہے۔ اس کے دونوں بازو میری گردن کے گرد تھے اور ٹانگیں میری کمر کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں۔

پوری رات میرا بڑا بھائی گھر کے جلے ہوئے شہتیروں میں سے لکڑی کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھوں میں تھامے رہا تا کہ اگر ڈاکو اسے دیکھ لیں تو وہ خود کو ان سے بچا سکے۔

ہم پورے دن اپنی ماں کا انتظار کرتے رہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے۔ گاؤں میں نہ تو کوئی اسکول باقی بچا تھا نہ کوئی گرجا گھر، اس لیے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کب اتوار ہے، کب سوموار۔

سورج غروب ہوتے وقت دادی اور دادا آ گئے۔ کسی نے انہیں اطلاع دے دی تھی کہ ہم بچے گھر میں اکیلے ہیں، ماں واپس نہیں آئی۔ میں ہمیشہ دادا سے پہلے دادی کا ذکر کرتی ہوں کیوں کہ یہ ترتیب اسی طرح ہے۔ دادی ضخیم شحیم اور قد کاٹھ والی عورت ہے، وہ ابھی زیادہ بوڑھی بھی نہیں ہوئی ہے۔ دادا بے حد چھوٹا ہے، آپ سوچ ہی نہیں سکتے کہ وہ اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون کے کس کونے میں ہے۔ وہ خواہ مخواہ مسکرانے لگتا ہے، یہ سمجھے بغیر کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بال ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے انہیں صابن کے جھاگ سے بھرا ہوا چھوڑ دیا گیا ہو۔ دادی ہمیں اپنے مکان میں لے گئیں، یعنی مجھے، چھوٹے بھائی، بڑے بھائی اور دادا کو۔ ہم بہت ڈرے ہوئے رہے، میرے چھوٹے بھائی کے سوا جو دادی کی پیٹھ پر سوار تھا۔ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں راستے میں ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔

بہت دن تک ہم دادی کے مکان میں ماں کا انتظار کرتے رہے، شاید ایک مہینے تک۔ ہم بھوکے رہتے تھے، ہماری ماں بھی نہیں آئی تھی، ہمیں انتظار تھا کہ وہ آ کر ہمیں یہاں سے لے جائے۔ اس دوران دادی کے پاس ہمارے لیے کھانے کی کوئی چیز نہ تھی، نہ دادا کے لیے، نہ خود اپنے لیے۔ ایک عورت نے جس کی چھاتیوں میں دودھ تھا، اپنا تھوڑا سا دودھ میرے چھوٹے بھائی کو دیا۔ اپنے گھر میں تو وہ ہماری طرح دلیا ہی کھاتا تھا۔ دادی کئی بار ہمیں اپنے ساتھ لے کر جنگلی ساگ کی تلاش میں نکلی لیکن گاؤں کا ہر فرد اسی کی تلاش میں تھا اس لیے ساگ کا ایک پتا بھی کہیں باقی نہ بچا تھا۔

دادا چند نوجوانوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ہماری ماں کی تلاش میں گیا مگر وہ اسے نہ مل سکی۔ دادی مایوسی سے دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر بین کرنے لگی، میں بھی بین میں شامل ہو گئی۔ ایک دفعہ کچھ لوگ تھوڑی سی پھلیاں وغیرہ کھانے کے لئے لے آئے تھے مگر دو دن بعد پھر وہی فاقہ۔ دادا کے پاس پہلے تین بھیڑیں، ایک گائے اور ترکاریوں کا ایک باغیچہ تھا۔ بھیڑیں اور گائے بہت دن ہوئے، ڈاکو لے گئے تھے، وہ بھی تو آخر بھوکے تھے۔ بوائی کا وقت آیا تو دادا کے پاس بیج ہی نہیں تھے۔

آخر ان دونوں نے طے کر لیا، بلکہ دادی نے طے کیا کہ ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ دادا لاکھ چیخا چلایا اور ادھر ادھر پیر پٹختا پھرا لیکن دادی نے ذرا پروا نہ کی۔ ہم بچے بہت خوش تھے۔ ہم ایسی جگہ سے واقعی چلے جانا چاہتے تھے جہاں نہ ماں تھی، نہ کھانا تھا۔ ہم وہاں جانا چاہتے تھے جہاں ڈاکو نہ ہوں، کھانا ہو۔ ہم یہ سوچ کر ہی خوش تھے کہ کہیں بہت دور کوئی ایسی جگہ بھی ہے۔

دادی نے گرجا گھر میں حاضری کے لیے اپنی مخصوص پوشاک کے بدلے مکئی کے خشک دانے لے لیے اور انہیں ابال کر ایک پرانے کپڑے میں باندھ لیا۔ ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو دانے ہمارے

پاس تھے۔ دادی کا خیال تھا کہ راستے میں دریا کا پانی مل جائے گا لیکن کوئی دریا ور یا نہیں ملا۔ ہمیں اتنی سخت پیاس لگی کہ واپس مڑنا پڑا لیکن مڑ کر ہم دادی کے گھر نہیں آئے بلکہ ایک ایسے گاؤں میں رک گئے جہاں پانی کا بمبا تھا۔

دادی نے اپنی ٹوکری کھولی جس میں اس نے کپڑے اور مکئی کے دانے ٹھونس رکھے تھے پھر اس نے اپنے جوتے بیچ کر پانی کے لیے پلاسٹک کا ایک بڑا ڈرم خرید لیا۔ میں نے پوچھا: ''گوگو! تم جوتوں کے بغیر گرجا کیسے جاؤ گی؟''

اس نے جواب میں صرف یہ کہا۔ ''سفر لمبا ہے۔ ہم زیادہ سامان نہیں اٹھا سکتے۔''

اس گاؤں میں ہمیں اور لوگ بھی ملے جو نقل مکانی کر رہے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ وہ ہمارے مقابلے میں منزل سے زیادہ واقف دکھائی دیتے تھے۔

منزل تک پہنچنے کے لیے ہمیں کروگر پارک سے گزرنا تھا۔ ہم کروگر پارک کے بارے میں پہلے سے جانتے تھے۔ وہ ایک طرح، پوری کی پوری حیوانوں کی مملکت تھی۔ ہاتھی، شیر، گیدڑ، لکڑ بگھے، تیندوے، مگرمچھ، غرض ہر قسم کے جانور تھے وہاں۔ ان میں سے کچھ تو ہمارے علاقے میں بھی تھے، خاص طور پر لڑائی سے پہلے۔ دادا کو یاد ہے، ہم بچے تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اب ڈاکوؤں نے سارے ہاتھی مار ڈالے تھے اور ان کے دانت بیچ دیے تھے۔ ڈاکوؤں اور ہمارے سپاہیوں نے سارے ہرن بھی کھا لیے تھے۔ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی دونوں ٹانگوں سے معذور تھا، اس کی ٹانگیں دریا میں رہنے والے ایک مگرمچھ نے کھالی تھیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمارا ملک انسانوں کا ملک ہے، جانوروں کا نہیں۔ ہمیں کروگر پارک کے متعلق بہت کچھ معلوم تھا کیونکہ ہمارے بعض لوگ اپنے گھروں سے نکل کر ایسی جگہوں پر کام کرنے جاتے تھے جہاں گورے لوگ جانور دیکھنے کے لیے آ کر ٹھہرتے تھے۔

ہم نے پھر سفر شروع کیا۔ قافلے میں کچھ عورتیں تھیں اور کچھ میری طرح کے بچے۔ عورتیں تھک کے بیٹھتیں تو چھوٹے بچے ان کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے۔ ایک آدمی ہم سب کو کروگر پارک کی طرف لے کر چلا۔ ''کیا پارک آ گیا؟ کیا پارک آ گیا؟'' میں دادی سے بار بار پوچھ رہی تھی۔ دادی نے جواب نہیں دیا، اس آدمی نے بتایا کہ ابھی نہیں آیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ باڑھ کے گرد سے گھوم کر جانے میں بہت لمبا راستہ طے کرنا پڑے گا۔ باڑھ کے بارے میں اس نے یہ بھی کہا کہ اسے ہاتھ لگاتے ہی تم مر جاؤ گے، اسے چھوتے ہی تمہاری کھال جل بھن کر کباب ہو جائے گی، بالکل اس طرح جیسے شہروں میں بجلی کے کھمبوں کے اوپر تنے ہوئے تار چھونے سے ہوتا ہے۔ میں نے مشن اسپتال میں لوہے کے ایک ڈبے پر سر کا وہ نشان بنا ہوا دیکھا تھا، جس پر نہ آنکھیں تھیں، نہ کھال، نہ بال۔ بعد میں مشن اسپتال بھی دھماکے سے اڑ گیا۔

چلتے چلتے نہ معلوم کتنا وقت گزر گیا۔ جب میں نے راستے میں پھر پوچھا کہ کیا پارک آ گیا؟ پتہ چلا کہ ہاں، پارک آ گیا اور ہم ایک گھنٹے سے کروگر پارک کے اندر ہی چل رہے ہیں۔ مگر یہ تو دیکھنے میں انہی جھاڑیوں کی طرح لگتا تھا جن میں ہم دن بھر چلتے رہے تھے۔ یہاں ہمیں کوئی جانور بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس بندر تھے اور چڑیاں تھیں، جیسی ہمارے گھر کے آس پاس بھی ہوتی تھیں۔ ہمیں ایک کچھوا ملا جو بھاگ کر ہم سے دور نہیں جا سکا۔ میرا بڑا بھائی اور دوسرے لڑکے کچھوا اس آدمی کے پاس لے گئے تاکہ اسے مار کر پکایا اور کھایا جا سکے۔ آدمی نے کچھوا چھوڑ دیا کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ یہاں آگ نہیں جلائی جا سکتی۔ جب تک ہم پارک میں تھے، آگ نہیں جلا سکتے تھے ورنہ دھویں سے ہمارا کھوج لگ جاتا۔ پولیس اور پہرے دار آ کر ہمیں وہیں بھیج دیتے جہاں سے ہم چلے تھے۔ اس آدمی نے کہا کہ ہمیں جانوروں کے درمیان جانوروں کی طرح چلنا ہوگا یعنی سڑک سے اور گورے لوگوں کے خیموں سے دور دور۔

مجھے ایک آواز سنائی دی، مجھے یقین ہے کہ یہ آواز سب سے پہلے میں نے سنی۔ ایسا لگا جیسے ٹہنیاں چیخ رہی ہوں اور کوئی گھاس روندتا ہوا چلا آ رہا ہو۔ قریب قریب میری چیخ نکل گئی کیوں کہ میں نے سوچا، شاید پولیس اور پہرے دار ہیں اور انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے، جن سے وہ آدمی ہمیں چوکنا رہنے کو کہہ رہا تھا۔ مگر وہ تو ہاتھی نکلا۔ اس کے پیچھے دوسرا ہاتھی اور اس کے پیچھے بہت سارے ہاتھی، جیسے پیڑوں کے درمیان بڑے بڑے کالے دھبے ہر طرف چل پھر رہے ہوں۔ وہ اپنی سونڈوں میں موپین درخت کی لال پتیاں لپیٹ کر منہ میں ٹھونس رہے تھے۔ ہاتھیوں کے بچے اپنی ماؤں سے چپٹے ہوئے چل رہے تھے۔ کچھ بڑے بچے آپس میں اس طرح دھینگا مشتی کر رہے تھے جیسے میرا بڑا بھائی اور اس کا دوست کرتے تھے، فرق یہ تھا کہ وہ ہاتھوں کے بجائے سونڈوں سے لڑ رہے تھے۔ مجھے اتنا مزہ آ رہا تھا کہ ڈرنا یاد نہیں رہا۔ اس آدمی نے کہا کہ جب تک ہاتھی گزر نہیں جاتے، ہم خاموش دم سادھے کھڑے رہیں۔ ہاتھی آہستہ آہستہ، مزے مزے سے گزر رہے تھے۔ وہ اتنے ضخیم ہوتے ہیں کہ انہیں کسی سے ڈر کر بھاگنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ہرن ہم سے ڈر کر ادھر ادھر بھاگتے تھے۔ وہ ہوا میں اتنی اونچی

قلانچیں بھرتے، مانو اڑ رہے ہوں۔ جنگلی سور ہماری آہٹ سنتے ہی بالکل ساکت ہو گئے۔ پھر یوں لہرے بناتے ہوئے بھاگے جیسے ہمارے گاؤں میں ایک لڑکا اپنی سائیکل چلاتا تھا جو اس کے باپ نے اسے لا کر دی تھی۔ ہم جانوروں کے پیچھے پیچھے ان کی پانی پینے کی جگہ تک جاتے اور جانور جانے کے بعد قریب جا کر پانی پیتے۔ ہمیں کبھی پیاسا نہیں رہنا پڑا لیکن جانور ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہتے تھے۔ جب دیکھو کبھی گھاس پھوس، کبھی پیڑ پودے، کبھی پیڑوں کی جڑیں اور چھال۔ ادھر ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ مکئی کے دانے بھی ختم ہو چکے تھے۔ اگر ہمارے لئے کھانے کو کچھ تھا تو بس لنگوروں کی غذا یعنی چھوٹے چھوٹے اور چیونٹیوں سے بھرے انجیر جو دریا کے کنارے پیڑوں کی شاخوں پر لٹکے ہوئے تھے۔ سچ مچ جانوروں کی طرح ہونا بہت مشکل ہے۔

دن میں جب بہت زیادہ گرمی ہوتی، شیر سوتے ہوئے ملتے۔ ان کا رنگ گھاس کے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔ پہلے پہل ہمیں وہ دکھائی ہی نہیں دیے لیکن اس آدمی کو نظر آ گئے اور وہ ہمیں اس جگہ سے جہاں شیر سو رہے تھے، بہت دور الٹی طرف واپس لے گیا۔ میرا بھی شیروں کی طرح سونے کو بہت جی چاہتا تھا۔

میرا بھائی برابر دبلا ہو رہا تھا لیکن بھاری ویسا ہی تھا۔ جب دادی اسے میری پیٹھ پر لادنے کے لیے میری طرف دیکھتی تو میں کوشش کرتی کہ اس کی طرف نہ دیکھوں۔ میرے بڑے بھائی نے بھی بولنا بند کر دیا تھا۔ جب ہم پڑاؤ کرتے اور آرام کے لیے لیٹتے تو اسے ہلا ہلا کر جگانا پڑتا جیسے دادا کی طرح اسے بھی کچھ سنائی نہ دیتا ہو۔ ایک بار میں نے دادی کے منہ پر مکھیاں رینگتی دیکھیں جنہیں وہ اڑا نہیں رہی تھی۔ مجھے بہت ڈر لگا، میں نے پام کی ایک شاخ سے انہیں اڑایا۔

ہم دن کو بھی چلتے، رات کو بھی۔ اب ہمیں گوروں کے خیمے دکھائی دینے لگے تھے، وہاں آگ جل رہی تھی اور کھانا بھی پک رہا تھا۔ ہمیں دھویں اور گوشت دونوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ ہم نے لکڑ بگھے جھاڑیوں سے خوشبو کے پیچھے بھاگتے دیکھے۔ ان کی کمریں اس طرح جھکی ہوئی تھیں جیسے وہ کسی بات پر شرمندہ ہوں۔ کوئی لکڑ بگھا اپنی گردن موڑتا تو اس کی آنکھیں ایسی لگتیں جیسی ہماری آنکھیں رات کے اندھیرے میں ایک دوسرے کو دیکھتی ہوئی لگتی ہیں۔ ہوا کے ساتھ ساتھ باڑھ سے گھرے ہوئے احاطوں سے ہماری زبان میں بولنے چالنے کی آوازیں آ رہی تھیں، وہاں کیمپوں میں کام کرنے والے رہتے تھے۔ رات کے وقت ہم میں سے ایک عورت مدد مانگنے ان کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ ہمیں کچرے کے ڈرم سے بھی کھانے کی کوئی چیز دے سکتے ہیں۔ اس نے رونا شروع کر دیا، دادی کو اسے سنبھالنا بھی پڑا اور اس کا منہ اپنے ہاتھ سے بند بھی کرنا پڑا۔ اس آدمی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمیں کروگر پارک میں کام کرنے والے اپنے لوگوں سے دور رہنا ہو گا۔ اگر وہ ہماری کوئی مدد کرتے تو اپنی نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ ان کی نظر ہم پر پڑ جاتی تو وہ اتنا کر سکتے تھے کہ یہ ظاہر کریں، ہم وہاں ہیں ہی نہیں، انہوں نے خالی جانور دیکھے تھے۔

کبھی کبھی رات کو ہم سونے کے لیے تھوڑی دیر رک جاتے۔ ہم ایک دوسرے سے سٹ کر سوتے۔ معلوم نہیں کون سی رات تھی، ہم ہر وقت چلتے چلتے جا رہے تھے۔ اس رات ہم نے کہیں بہت قریب سے شیروں کی آواز سنی۔ ایسی آواز نہیں جیسی شیر دور سے دہاڑ رہے ہوں بلکہ کچھ اس طرح جیسے سانس پھولنے کی آواز ہوتی ہے۔ بالکل ایسی جیسے دوڑنے کے بعد ہمارے منہ سے نکلتی ہے۔ لیکن یہ ہانپنے کی آواز کچھ مختلف تھی کیونکہ وہ دوڑ نہیں رہے تھے، کہیں نزدیک ہی کسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم کھسک کر ایک دوسرے کے اور قریب ہو گئے۔ جو کناروں پر تھے، ان کی کوشش تھی کہ اندر گھس کر درمیان میں پہنچ جائیں۔ میں بالکل ایک عورت سے لگ کر کھڑی تھی جس کے بدن سے بدبو آ رہی تھی، وہ ڈر رہی تھی لیکن میں خوشی سے اس کے ساتھ چمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے خدا سے دعا مانگی کہ شیر کنارے پر کھڑے ہوئے کسی ایک کو لے لیں اور یہاں سے چلے جائیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ درخت نہ دیکھوں جہاں سے کوئی شیر کود کر ہمارے درمیان آ سکتا تھا، بالکل بیچ میں جہاں میں کھڑی تھی۔

وہ آدمی اچھل کر کھڑا ہو گیا اور ایک سوکھی ٹہنی پیڑ پر زور زور سے مارنے لگا۔ ہم سے تو اس نے کوئی آواز نہ نکالنے کو کہا تھا اور خود چیخ رہا تھا۔ وہ شیروں پر ایسے چیخ رہا تھا جیسے ہمارے گاؤں میں ایک نشیارا ہوا میں منہ اٹھا کر چیختا تھا۔ شیر چلے گئے۔ ہم نے دور سے ان کی دھاڑیں سنیں۔

☆☆☆

ہم تھک گئے تھے، بہت زیادہ تھک گئے تھے۔ راستے میں ہم کوئی دریا پار کرتے تو میرا بڑا بھائی اور ایک اور آدمی دادا کو اٹھا کر ایک پتھر سے دوسرے پتھر تک لے جاتے۔ میری دادی بہت طاقت ور ہے لیکن اس کے پیروں سے خون بہہ رہا تھا۔ ہم اتنے تھک گئے تھے کہ سر پر ٹوکری بھی اٹھا کر نہیں چل سکتے تھے، کچھ بھی اٹھانا مشکل تھا، چھوٹے بھائی کے سوا، چنانچہ ہم نے اپنی ساری چیزیں ایک جھاڑی کے نیچے چھوڑ دیں۔'' ہم خود ہی وہاں پہنچ

جائیں تو بہت ہے۔" دادی نے کہا۔
ہم نے بھوک کے مارے کچھ جنگلی پھل کھا لیے جو ہمارے گھر کے آس پاس نہیں ہوتے تھے، نتیجے میں ہم سب کے پیٹ خراب ہو گئے اور دست آنے لگے۔ اس وقت ہم ایسی گھاٹی میں سے گزر رہے تھے جو ہاتھی گھاس کہلاتی تھی اور تھی بھی ہاتھی جتنی اونچی۔ ہمارے پیٹوں میں مروڑ شروع ہوئی، دادا تو میرے چھوٹے بھائی کی طرح سب کے سامنے بیٹھ کر فارغ بھی نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے وہ فارغ ہونے گھاس کے اندر چلا گیا۔ چلتے رہو، چلتے رہو، وہ آدمی ہم سے برابر کہتا رہتا تھا، لیکن ہم نے اس سے دادا کا انتظار کرنے کو کہا۔ ہر شخص دادا کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ اب آیا نہ تب۔ دوپہر کا وقت تھا، ہمارے کانوں میں کیڑے مکوڑے بھن بھنانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ہم گھاس کی سرسراہٹ نہیں سن سکتے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ واپس آ رہا ہے۔ ہم اسے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے کیوں کہ گھاس بہت اونچی تھی اور دادا بہت چھوٹا

ہم اس کی تلاش میں نکلے، لیکن چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تا کہ گھاس میں کہیں ہم بھی ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ گھاس ہماری ناک اور آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ ہم دبی دبی آواز میں دادا کو پکار رہے تھے لیکن اس کے کانوں میں جو جگہ سماعت کے لیے بچی تھی وہ شاید کیڑوں کی بھن بھناہٹ نے پر کر دی تھی۔ ہم اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے لیکن وہ نہ ملا

میری آنکھ کھلی تب بھی اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہم نے پھر اس کی تلاش شروع کی۔ ہم نے گھاس پر چل چل کر راستے بنا دیے تھے، تا کہ اگر ہم اسے نہ ڈھونڈ سکیں تو وہ آسانی سے ہمیں تلاش کر لے۔ پورے دن ہم اس کا انتظار کرتے رہے، سورج سر پر ہو تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے، شعاعیں سر میں گھسی جاتی ہیں، چاہے آدمی، جانوروں کی طرح پیڑ کے نیچے لیٹا ہو۔ میں چت لیٹی مڑی ہوئی چونچوں اور پر نچی گردنوں والے وہ بدصورت پرندے دیکھ رہی تھی جو ہمارے اوپر چاروں طرف اڑ رہے تھے۔ ہم انہیں اس وقت بھی دیکھتے ہوئے گزرے تھے جب وہ مردہ جانوروں کی ہڈیاں کرید رہے تھے، ان ہڈیوں میں ہمارے کھانے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ اوپر گول گول چکر لگا رہے تھے، کبھی نیچے آ کر اڑنے لگتے، کبھی اوپر چلے جاتے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی گردنیں کبھی ایک طرف، کبھی دوسری طرف مڑ جاتیں۔ وہ اڑتے ہوئے مسلسل چکر لگا رہے تھے۔ میں نے دادی کو دیکھا، وہ میرے چھوٹے بھائی کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور پرندے دیکھ رہی تھی۔

شام کے وقت وہ آدمی دادی کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ باقی لوگوں کو اب روانہ ہو جانا چاہیے۔ اس نے کہا کہ اگر ان کے بچوں کو کھانے کو کچھ نہ ملا تو وہ بہت جلد مر جائیں گے۔ دادی کچھ نہ بولی۔

آدمی نے کہا: "میں جانے سے پہلے تمہیں کچھ پانی لا دوں گا۔"

دادی نے میری طرف، میرے بڑے بھائی کی طرف اور اپنی گود میں لیٹے ہوئے میرے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا۔ ہم دوسرے لوگوں کو جانے کے لیے کھڑے ہوتے دیکھ رہے تھے۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ ہمارے ارد گرد کی وہ گھاس خالی ہو جائے گی جہاں سب لوگ تھے اور ہم اس جگہ یعنی کروگر پارک میں اکیلے رہ جائیں گے، پھر پولیس یا درندے ہمارا کھوج نکالیں گے۔ آنسو میری آنکھوں سے بہہ بہہ کر ناک سے گزر کے ہاتھوں پر ٹپکنے لگے لیکن دادی نے کوئی توجہ نہ دی۔ پھر ایک دم وہ اٹھی اور اس نے اپنی ٹانگیں یوں پھیلا لیں جیسے جلانے والی لکڑیاں اٹھاتے وقت پھیلاتی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے میرے بھائی کو پیٹھ پر لادا اور ایک کپڑے سے اسے اپنے اوپر کس کر باندھ لیا۔ اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور اس کی بڑی بڑی چھاتیاں نظر آ رہی تھیں جن میں میرے بھائی کے لیے کچھ بھی نہ تھا، دادی نے کہا: "چلو۔"

ہم اونچی گھاس والی جگہ چھوڑ کر روانہ ہوئے، وہ جگہ پیچھے رہ گئی۔ ہم اس آدمی اور باقی سب لوگوں کے ساتھ دوبارہ چلنے لگے۔

☆☆☆

ایک بڑا سا خیمہ زمین میں گڑا ہے، کسی گرجا یا اسکول سے بھی بڑا۔ ہم بہت زیادہ چلنے کے بعد یہاں پہنچے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ وہ جگہ ہو گی۔ اس قسم کی جگہ ہم نے اس وقت بھی دیکھی تھی جب ہماری ماں ہمیں شہر لے گئی تھی کیوں کہ اس نے سنا تھا کہ ہمارے فوجی وہاں آئے ہوئے ہیں، وہ ان سے ہمارے باپ کا اتا پتہ پوچھنا چاہتی تھی، اس خیمے میں لوگ دعا مانگ رہے تھے اور گا رہے تھے۔ یہ خیمہ بھی اس خیمے کی طرح نیلا اور سفید ہے لیکن یہ دعا مانگنے یا گانے کے لیے نہیں ہے۔

ہم یہاں ان دوسرے لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں جو ہمارے ملک سے آئے ہیں۔ مطب کی نرس کہتی ہے کہ چھوٹے بچے چھوڑ کر ہم کل دو سو افراد ہیں۔ کچھ نئے پیدا ہونے والے بچے بھی ہیں جو اس وقت پیدا ہوئے جب ہم کروگر پارک سے گزر رہے تھے۔ دن کے وقت بھی جب سورج چمک رہا ہوتا ہے، خیمے کے اندر اندھیرا رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پورا گاؤں یہیں آ بسا ہو۔ اندر مکانوں کے بجائے ہر خاندان نے اپنے رہنے کی جگہ بوریاں یا گتے کے بکسوں سے، جو کچھ بھی ہاتھ لگا، گھیر لی تا کہ دوسرے خاندان کو جتا

سکیں کہ یہ ان کی جگہ ہے، یہاں کوئی اور داخل نہ ہو۔ حالانکہ یہاں
نہ دروازہ ہے نہ کھڑکی، نہ چھپر۔ کوئی بڑا کھڑا ہو کر دیکھے تو ہر ایک
کے گھر کے اندر جھانک سکتا ہے۔ کچھ لوگوں نے تو پتھر پیس کر رنگ
بھی گھول لیا اور بوریوں پر تصویریں بنالیں۔

ویسے چھت یہاں ضرور ہے۔ اوپر، بہت دور، خیمے کا
سائبان، بالکل آسمان کی طرح۔ کسی بڑے سے پہاڑ کی طرح جس
میں ہم رہ رہے ہوں۔ خیمے کی دراڑوں سے گرد کے راستے نیچے کی
طرف آتے دکھائی دیتے ہیں، جو اتنے چوڑے ہیں کہ لگتا ہے، ہم
ان پر چڑھ سکتے ہیں۔ خیمے کی چھت اوپر سے بارش کا پانی روک لیتی
ہے لیکن پانی نیچے سے بہہ بہہ کر اندر آ جاتا ہے اور ہمارے اپنے
بنائے ہوئے مکانوں کی گلیوں میں پھیل جاتا ہے۔ یہ گلیاں اتنی
تنگ ہیں کہ ایک وقت میں ایک ہی آدمی چل کر جا سکتا ہے۔

میرا چھوٹا بھائی نہیں ٹہلتا۔ دادی اسے ہر سوموار کو، جب ڈاکٹر
آتا ہے، مطب لے جاتی ہے۔ نرس بتاتی ہے کہ اس کے سر میں کچھ
خرابی ہے، اس کا خیال ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جہاں سے آئے
ہیں، وہاں ہمیں کم خوراک ملتی تھی، جنگ کی وجہ سے یا شاید اس وجہ
سے کہ ہمارا باپ وہاں نہیں تھا یا پھر شاید اس وجہ سے کہ وہ کروگر
پارک سے گزرنے کے دوران بھوکا رہا تھا۔ اسے تو بس دن بھر دادی
کے پیٹ پر یا گود میں پڑے رہنا، یا اس سے ٹیک لگائے بیٹھے رہنا
اچھا لگتا ہے۔ وہ ہمیں تکتا رہتا ہے، کچھ پوچھنا چاہتا ہے مگر اس
سے بولا نہیں جاتا۔ میں اسے گدگدی کرتی ہوں تو وہ صرف مسکرا دیتا
ہے۔ مطب سے اسے کھلانے کے لئے ایک سفوف ملا ہے جسے
گھول کر اس کے لیے دلیا بنایا جاتا ہے۔ شاید ایک دن وہ ٹھیک ہو
جائے۔

جب ہم یہاں پہنچے تب ہماری، میری اور میرے بڑے بھائی
کی حالت بھی بالکل اسی کی طرح تھی۔ مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں۔ خیمے
کے پاس گاؤں میں رہنے والے لوگ ہمیں مطب لے گئے تھے۔
یہاں آنے والوں کو وہیں جا کر اپنا نام لکھوانا پڑتا ہے کہ ہم وہاں
سے نکل آئے ہیں، کروگر پارک کے راستے۔ ہم گھاس پر بیٹھ گئے۔
ہر چیز گڈمڈ لگ رہی تھی۔ ایک نرس اپنے سیدھے بنے ہوئے بالوں
اور اونچی ایڑی کے خوش نما سینڈلوں کی وجہ سے بہت پیاری معلوم ہو
رہی تھی، وہ ہمارے لیے یہی خاص سفوف لے کر آئی اور کہا کہ ہم
اسے پانی میں گھول کر آہستہ آہستہ پئیں۔ ہم نے پلیٹ دانتوں
سے چاٹا اور سفوف منہ میں ڈال لیا، وہ منہ کے اندر چپک گیا۔ میں
نے ہونٹوں اور انگلیوں پر لگا ہوا سفوف چوس لیا۔ کچھ دوسرے بچے
جو ہمارے ساتھ آئے تھے، الٹیاں کرنے لگے۔ مجھے بھی اپنے پیٹ
میں حرکت سی محسوس ہوئی۔ سفوف سانپ کی طرح رینگتا ہوا اندر
جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ہچکیاں آنا شروع ہو گئیں
اور میرا برا حال ہو گیا۔ دوسری نرس نے ہمیں مطب کے برآمدے
میں قطار بنا کر کھڑے ہونے کے لیے کہا مگر ہم کھڑے نہ ہو سکے۔
ہم ادھر ادھر ایک دوسرے پر گرے ہوئے بیٹھے تھے۔ نرسوں نے
ایک ایک کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور بازو میں سوئیاں لگائیں۔
دوسری سوئیوں سے ہمارا خون لے کر چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں
ڈالا۔ یہ سب بیماری کی روک تھام کے لیے کیا جا رہا تھا مگر میری سمجھ
میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جب بھی میری آنکھ لگتی مجھے ایسا معلوم ہوتا
کہ میں لمبی گھاس میں چلی جا رہی ہوں۔ مجھے ہاتھی بھی دکھائی
دیتے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں۔

دادی اب بھی طاقت ور تھی، وہ کھڑی بھی ہو سکتی تھی اور اسے
لکھنا بھی آتا تھا، اس نے ہمارے لیے بھی دستخط کیے۔ دادی نے
خیمے کی ایک دیوار کے بالکل ساتھ یہ جگہ لی، یہ خیمے کی بہترین جگہ
ہے۔ یہاں بارش کا پانی تو بے شک اندر آتا ہے مگر جب موسم اچھا
ہو تو ہم پردہ اٹھا سکتے ہیں، سورج ہمارے سامنے ہوتا ہے اور سیلن کی
بو جلد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ دادی ایک عورت کو جانتی تھی، اس نے
اسے بتایا کہ سونے کی چٹائی بنانے کے لیے عمدہ گھاس کہاں سے لی
جائے۔ دادی نے ہمارے لیے چٹائیاں بنادیں۔

مہینے میں ایک بار کھانے کی چیزوں سے بھرا ہوا ٹرک مطب
میں آتا ہے۔ دادی اپنا دستخط کیا ہوا کارڈ لے کر وہاں جاتی ہے اور
اس کے کارڈ میں تصدیق ہونے کے بعد ہمیں مکئی کے دانوں کی ایک
بوری مل جاتی ہے۔ بوریاں خیمے تک لانے کے لیے ایک پہیے والی
ریڑھیاں ہیں، میرا بڑا بھائی بوری اس پر رکھ کر لے آتا ہے۔ واپسی
میں وہ اور دوسرے لڑکے خالی ریڑھیاں دھکیلتے ہوئے مطب کی
طرف دوڑ لگاتے ہیں۔ کبھی کبھی خوش قسمتی سے اسے کوئی ایسا شخص
مل جاتا ہے جس نے گاؤں سے بیر کی بوتلیں خریدی ہوں، بوتلیں
پہنچانے کے کچھ پیسے مل جاتے ہیں، ویسے اس کی اجازت نہیں
ہے، ریڑھیاں سیدھی نرسوں کے پاس واپس پہنچانی ہوتی ہیں۔ میرا
بھائی ان پیسوں سے شربت خریدتا ہے اور میرے مانگنے پر تھوڑا سا
شربت مجھے بھی دے دیتا ہے۔

مہینے میں ایک اور دن گرجا سے کپڑوں کا ایک گٹھر مطب کے
صحن میں آتا ہے۔ دادی کے پاس ایک اور کارڈ ہے جس میں تصدیق
کروانے کے بعد ہم وہاں سے اپنی پسند کا کوئی لباس لے سکتے
ہیں۔ میرے پاس دو جوڑے، دو پتلون اور ایک جرسی ہو گئی ہے اور
اب میں اسکول جا سکتی ہوں۔

گاؤں والوں نے ہمیں اپنے اسکول میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ہماری ہی زبان بولتے ہیں۔ دادی کہتی ہے، شاید اسی وجہ سے انہوں نے ہمیں اپنے علاقے میں رہنے دیا ہے۔ بہت دن پہلے، ہمارے آباؤ اجداد کے وقتوں میں، ایسی کوئی باڑھ نہیں تھی جسے چھونے سے لوگ مر جاتے ہیں، نہ ان کے اور ہمارے درمیان کوئی کروگر پارک تھا۔ ہم سب ایک تھے، اپنے گاؤں سے لے کر یہاں تک، اور ہمارا ایک ہی بادشاہ تھا۔

☆☆☆

ہمیں خیمے میں رہتے رہتے بہت دن ہو گئے ہیں۔ اب میں گیارہ سال کی ہوں اور میرا چھوٹا بھائی لگ بھگ تین سال کا ہے، حالانکہ وہ بہت چھوٹا سا ہے، صرف اس کا سر بہت بڑا ہے۔ وہ ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ اب کچھ لوگوں نے خیمے کے اردگرد کی خالی زمین کھود کر وہاں مکئی اور کرم کلا بو دیا ہے۔ بوڑھے لوگوں نے شاخیں جوڑ جوڑ کر اپنی کیاریوں کے گرد باڑھیں لگالی ہیں۔ کسی کو شہر میں جا کر کام کرنے کی اجازت نہیں لیکن کچھ عورتوں نے گاؤں ہی میں کام تلاش کرلیا ہے اور اب وہ کچھ خریداری بھی کر سکتی ہیں۔ دادی اب بھی طاقت ور ہے اس لیے وہ بھی کسی ایسی جگہ کام ڈھونڈ لیتی ہے جہاں لوگ مکان بنا رہے ہوں۔ اس گاؤں میں لوگ اینٹوں اور سیمنٹ سے بہت اچھے مکان بناتے ہیں، ہمارے گاؤں کی طرح مٹی اور گارے سے نہیں بناتے۔ دادی لوگوں کے لیے اینٹیں اور پتھروں کی ٹوکریاں سر پر ڈھو کر لے جاتی ہے۔ اب اس کے پاس شکر، چائے، دودھ اور صابن تک خریدنے کے لیے پیسے ہوتے ہیں۔ اسٹور والوں نے اسے ایک کیلنڈر بھی دیا ہے جو اس نے خیمے میں ہمارے پاس کے پردے پر ٹانگ دیا ہے۔

میں اسکول میں بہت تیز ہوں۔ دادی نے لوگوں کے پھینکے ہوئے اشتہاروں کے صفحے جمع کر کے میری کتابوں پر چڑھا دیے ہیں۔ وہ ہر سہ پہر مجھے اور بڑے بھائی کو اسکول کا کام پورا کرنے کے لیے بٹھا دیتی ہے، اس سے پہلے کہ اندھیرا ہو جائے، کیوں کہ خیمے میں صرف سٹ کر لیٹنے بھر کی جگہ ہے، جیسے ہم کروگر پارک سے گزرتے ہوئے لیٹا کرتے تھے اور موم بتیاں بہت مہنگی ہیں۔

دادی ابھی تک اپنے لیے جوتے نہیں خرید سکی جنہیں پہن کر گرجا جا سکے لیکن اس نے میرے اور بڑے بھائی کے لیے اسکول کے کالے جوتے اور ان پر کرنے کے لیے پالش خرید لی ہے۔ ہر صبح جب خیمے میں لوگ بیدار ہو رہے ہوتے ہیں، بچے روتے چلاتے ہیں، لوگ باہر کے نلکے پر ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں اور کچھ بچے پتیلیوں میں سے رات کا بچا ہوا دلیا کھرچ کھرچ کر کھا رہے ہوتے ہیں، میں اور میرا بڑا بھائی اپنے جوتے پالش کرتے ہیں۔ دادی ہمیں ٹانگیں سیدھی کر کے چٹائی پر بٹھا دیتی ہے اور ہمارے جوتوں کا غور سے معائنہ کرتی ہے کہ ہم نے ٹھیک پالش کئے ہیں یا نہیں۔ خیمے میں اور کسی بچے کے پاس اسکول کے سچ مچ کے جوتے نہیں ہیں۔ جب ہم تینوں یہ جوتے دیکھتے ہیں تو لگتا ہے کہ ہم اپنے گھر میں ہیں، کہیں بھی جنگ نہیں ہو رہی ہے اور نہ ہم کہیں اور گئے ہیں۔

کچھ گورے لوگ خیمے میں رہنے والوں کی تصویریں اتارنے آئے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ فلم بنا رہے ہیں۔ میں نے کبھی فلم نہیں دیکھی مگر اس کے بارے میں جانتی ہوں۔ ایک گوری عورت ہماری جگہ میں گھس آئی اور دادی سے سوالات کرنے لگی۔ ایک آدمی اس عورت کی زبان سمجھتا تھا، وہ سوالات ہماری زبان میں دہراتا۔ ”تم یہاں کب سے اس طرح رہ رہی ہو؟“

”کیا مطلب؟ یہاں؟“ دادی نے کہا۔ ”اس خیمے میں؟ دو سال اور ایک ماہ سے۔“

”اور مستقبل کے بارے میں تمہاری کیا امیدیں ہیں؟“

”کچھ بھی نہیں۔ میں بس یہیں ہوں۔“

”لیکن تمہارے بچے؟“

”میں چاہتی ہوں یہ پڑھ لکھ جائیں تاکہ انہیں اچھی نوکری اور اچھے پیسے مل سکیں۔“

”کیا تمہیں امید ہے کہ تم اپنے ملک واپس جا سکو گے؟“

”میں واپس نہیں جاؤں گی۔“

”لیکن آخر جب جنگ ختم ہو جائے گی تو تمہیں یہاں رہنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ کیا تم اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتیں؟“

میرا خیال تھا کہ اب دادی کچھ نہیں بولنا چاہتی اور وہ گوری عورت کے کسی سوال کا جواب نہیں دے گی۔ گوری عورت نے اپنی گردن موڑ کر ہماری طرف دیکھا اور مسکرائی۔ دادی نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور بولی۔ ”اب کچھ نہیں ہے، کوئی گھر نہیں۔“

دادی نے ایسا کیوں کہا؟ آخر کیوں؟ میں تو واپس جاؤں گی۔ میں اسی کروگر پارک سے گزر کر واپس جاؤں گی۔ جنگ کے بعد، اگر سب ڈاکوؤں کا صفایا ہو گیا تو شاید ماں وہاں ہمارا انتظار کر رہی ہو اور شاید دادا نے راستہ ڈھونڈ لیا ہو جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے، شاید وہ آہستہ آہستہ کروگر پارک سے ہوتا ہوا گھر واپس پہنچ گیا ہو۔ وہ سب گھر میں ہوں گے اور میں انہیں یاد رکھوں گی۔

روسی ادب کا ایک شہرہ آفاق ناول

ڈاکٹر ژواگو Dr. Zwago

ایک آدم زاد کی داستان، وہ انقلابِ روس
کے چشم دید گواہوں میں سے تھا

بورس پیسٹرناک

پانچ بجے کی ایکسپریس

''دائمی سکون'' یہ نوحے پڑھتے ہوئے وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ گاتے جا رہے تھے۔ جب وہ نوحہ خوانی بند کر دیتے تب بھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے قدم، ان کے گھوڑے اور ہواؤں کے جھکڑ نوحہ خوانی کر رہے ہیں۔ راہ گیر میت کو راستہ دینے کے لئے ادھر ادھر ہٹ جاتے، کفن پر پڑے ہوئے ہاروں کو گنتے اور ہوا میں صلیب کا نشان بنانے لگتے تھے۔ ان میں سے بعض محض استفسار کی غرض سے جلوس میں شامل ہو جاتے اور پوچھتے: ''کس کی میت ہے؟''

''ژواگو'' ان کو جواب ملتا۔۔۔۔

''اچھا! ٹھیک!! یہ بات ہے۔''

''یہ اس کی نہیں، اس کی بیوی کی میت ہے۔''

آخری لمحے ایک ایک کر کے گذرتے گئے، کبھی واپس نہ آنے والے لمحے۔ پادری نے صلیب کا نشان بناتے ہوئے میریا نکولائی ویِنا کی میت کو مٹی دی۔ انہوں نے ''پاک طینتوں کی روح'' کا نوحہ پڑھا۔ پھر ایک ہیبت ناک سی چرچراہٹ ہوئی۔ چوبی تابوت کو بند کر کے میخیں ٹھونک دی گئیں اور اسے زمین میں اتار دیا گیا۔ قبر میں چار آدمی پھاوڑوں سے تیزی کے ساتھ مٹی ڈالنے لگے اور چوبی تابوت کے ڈھکنے پر مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے برسنے لگے۔ آخر قبر پر مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیر بن گیا۔ ایک دس سال کا لڑکا اس ڈھیر پر چڑھا۔ تدفین کے موقع پر تحیر اور بے حسی کا جو عالم بتدریج لوگوں پر طاری ہو جاتا ہے اس کے باعث ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ لڑکا اپنی ماں کی قبر پر کھڑا ہو کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لڑکے نے اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور سسکیاں لینے لگا۔ تیز ہوا کے ساتھ اس کے ننھے ہاتھوں اور چہرے پر بارش کا سرد پانی تھپیڑے مار رہا تھا۔ ایک شخص جو تنگ آستینوں والا سیاہ لبادہ پہنے ہوئے تھا قبر کے پاس گیا۔ یہ مرحومہ کا بھائی اور اس لڑکے کا ماموں نکولائی تھا جو پہلے پادری تھا مگر بعد میں اسی کے کہنے پر اس کو اس اعزاز سے محروم کر دیا گیا تھا۔ وہ آہستہ سے لڑکے کے پاس پہنچا اور اسے اپنے ساتھ لئے قبرستان سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

دونوں نے رات وہیں عبادت گاہ میں گذاری جہاں ماموں نکولائی کو پرانے تعلقات کی بنا پر ایک کمرہ مل گیا تھا۔ اگلے دن انہیں والگا کے کنارے ایک جنوبی شہر کی جانب روانہ ہونا تھا جہاں ماموں نکولائی ایک مقامی ترقی پسند اخبار کے پبلشر کے ہاں کام کرتا تھا۔ ٹکٹ خریدے جا چکے تھے اور کوٹھری میں ان کا سامان تیار رکھا تھا۔ اسٹیشن اتنا قریب تھا کہ وہ دور شنٹنگ کرنے والے انجنوں کی آواز صاف سن رہے تھے۔

اس شام سردی کافی تیز ہو گئی۔ کمرے کی دونوں کھڑکیاں بہت نیچی تھیں جن میں سے ایک سے ویران سبزیوں کا خانہ باغ، سڑک اور اس پر جمی ہوئی برف کے ٹکڑے اور اس گرجا گھر کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے دن میں میریا نیکولائیونا کو دفن کیا گیا تھا۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ یہ بے برگ و بار پودے رقص کرنے لگتے اور پھر خاموش اور ساکت ہو جاتے۔

رات میں ایکا ایکی کھڑکی کے کھٹکھٹانے کی آواز سے لڑکے یورا کی آنکھ کھل گئی۔ سارا کمرہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی سے عجیب و غریب طور پر چمک اٹھا۔ اس نے اپنا چہرہ کھڑکی کے نیچے شیشے سے لگا دیا۔ باہر سڑک، قبرستان یا سبزیوں کا خانہ باغ کچھ بھی دکھائی نہیں دے

رہا تھا۔ ہرطرف برف اور دھند کا دور دورہ تھا۔ آسمان اور زمین جدھر دیکھئے برف کے طوفان نے ایک سفید چادر تان رکھی تھی۔ آج طوفان پورے زور پر تھا اور دنیا کی ہر طاقت اس کے سامنے ہیچ تھی۔ یورا کو یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اس طوفان میں زمین اندر کی جانب دھنس جائے گی اور اس کی ماں جو ابھی چند گھنٹے قبل دفن کی گئی ہے، زمین میں اور گہری اتر جائے گی۔ یہ سوچتے ہی لڑکے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اتنے میں اس کا ماموں بھی جاگ اٹھا اور اس نے یورا کے ساتھ یسوع مسیح کی باتیں کر کے اسے بہلانے کی کوشش کی۔ پو پھٹ رہی تھی جب ان دونوں نے کپڑے پہننا شروع کر دیئے۔

☆☆☆

جب تک یورا کی ماں زندہ تھی اسے یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا باپ ایک عرصہ سے بیوی بچوں کو چھوڑ کر سائبریا اور دوسرے ملکوں میں گناہ آلود زندگی بسر کرنے پر خاندان کی دولت پانی کی طرح بہا رہا ہے۔ اسے تو ہمیشہ یہی بتایا گیا تھا کہ اس کا باپ پیٹرز برگ میں کاروبار کر رہا ہے۔

اس کی ماں دائم المریض تھی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ تپ دق کے مرض میں مبتلا ہے تو وہ بغرض علاج جنوبی فرانس اور شمالی اٹلی جانے لگی۔ دو مرتبہ یورا بھی اپنی والدہ کے ساتھ گیا، لیکن اکثر اسے اجنبی اور ہر مرتبہ مختلف لوگوں کے ساتھ رہنا پڑتا۔ مگر اب وہ اس قسم کی تبدیلیوں کا عادی ہو چکا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اب اس کا باپ نہیں آئے گا۔

اسے اپنے بچپن کا وہ زمانہ بخوبی یاد تھا جب بہت سی چیزوں کو اس کے اپنے خاندانی ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ اس کے خاندان کے نام ایک ژواگو فیکٹری تھی۔ ایک ژواگو بنک تھا۔۔۔ ایک ژواگو بلڈنگ تھی۔ نکٹائی کے ایک پن کا نام ژواگو تھا اور تو اور

ایک خاص قسم کے کیک کا نام بھی ژواگو تھا۔
ایک زمانہ وہ تھا کہ اگر کوئی شخص گھوڑا گاڑی والے کے سامنے ''ژواگو'' کا نام لے لیتا تو اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ ''مجھے ٹمبکٹو لے چلو'' اور پھر یہ گاڑی والا واقعی ایک الف لیلہ جیسی روایتی سلطنت میں لے جاتا، پھر اچانک سب کچھ غائب ہو گیا۔ اب وہ لوگ غریب ہو گئے تھے۔

☆☆☆

1903ء کے موسم گرما کی ایک صبح کا ذکر ہے کہ یورا اپنے ماموں نکولائی کے ساتھ اپنے کھیتوں سے دو گھوڑوں والی بگھی میں سوار گذر رہا تھا۔ یہ لوگ ایک معلم اور مقبول عام درسی کتابوں کے مصنف ایوان واسکو بوئنی سے ملنے جا رہے تھے۔ یہ استاد ریشم کے مشہور کارخانہ دار اور فنون لطیفہ کے دلدادہ تاجر کرلوگر یووف کی جاگیر دو پلائنزکا میں رہتا تھا۔
یہ عید بطولہ کازان کا دن تھا۔ فصلوں کی کٹائی پورے زوروں پر تھی۔ یہ میلے کی وجہ سے تھا یا دوپہر کے وقفہ کے باعث، تاہم یہ حقیقت تھی کہ اس جگہ ایک بھی متنفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دھوپ میں ادھ کٹے کھیت اس طرح چمک رہے تھے جس طرح سزایافتہ قیدیوں کے ادھ منڈے سر۔ کھیتوں پر ہر طرف پرندے اڑ رہے تھے۔ تمازت کے اس سکوت میں گیہوں کے سیٹے تنے ہوئے سیدھے کھڑے تھے۔
نکولائی نکولائیوچ کے پاس مسئلہ اراضی پر واسکو بوئنی کوف کی کتاب کے پروف تھے۔ پبلشر نے مصنف سے کہا تھا کہ وہ اس کتاب کے مسودہ میں روز بروز بڑھتے ہوئے سخت سنسر کی روشنی میں ذرا ترمیم و تنسیخ کر دے: ''یہاں لوگ بے قابو ہوئے جا رہے ہیں۔ ایک قریبی گاؤں میں ایک تاجر کو قتل کر دیا گیا۔ کھیتی باڑی اور مکان کو آگ لگا دی گئی۔ آخر تم اس کا کیا مطلب سمجھے؟ کیا تمہارے گاؤں میں بھی اس کا کوئی چرچا ہے؟''
یہ دوسرا موقع تھا کہ یورا اپنے ماموں کے ساتھ دو پلائنزکا جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ راستے سے اچھی طرح واقف ہے اور اسے معلوم ہے کہ اب سڑک کہاں جا کر سیدھی جانب مڑے گی اور کہاں سے چھ میل طویل کولوگر یووف کی جاگیر کی پہلی جھلک دکھائی دے گی جس سے ذرا اور ایک طرف دریا ہے اور اس سے آگے ریلوے لائن، لیکن اس کا خیال ہر مرتبہ غلط ثابت ہوا۔ ایک کے بعد دوسرا کھیت آتا اور دور جنگل میں نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ ان وسیع میدانوں کو دیکھ کر معاً اس کے دل میں آزادی اور بلندی کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ انہیں دیکھ کر وہ سوچتے ہوئے مستقبل کے خواب دیکھنے لگا۔
یورا اپنے ماموں کے پاس رہ کر بہت خوش ہوتا۔ ماموں کو دیکھ کر اسے اپنی ماں یاد آ جاتی۔ اس کی ماں کی طرح اس کے ماموں کا دماغ بھی بہت تیز تھا۔ وہ آزادی پسند تھا اور اسرار قدرت سمجھنے کے لئے بے چین رہتا۔ وہ بھی انسانی زندگی میں مساوات کا علمبردار تھا اور اپنے خیالات کا بروقت اور بہترین الفاظ میں اظہار کرنے پر قادر تھا۔ یورا خوش تھا کہ اس کا ماموں اسے اپنے ساتھ دو پلائنزکا لئے جا رہا ہے۔ یہ ایک خوبصورت جگہ تھی اور اسے دیکھ کر بھی اسے ماں یاد آ گئی جو قدرتی مناظر کی بہت شوقین تھی اور اسے اکثر دیہات میں لے جایا کرتی تھی۔ اسے نیکا دروف سے دوبارہ ملنے کا بھی اشتیاق تھا۔ نیکا اسکول میں پڑھتا تھا اور واسکو بوئنی کوف کے ہاں رہتا تھا۔

☆☆☆

ٹرین کے سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں میشا گورڈن بیٹھا ہوا اپنے باپ کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اس کا باپ اورنبرگ کا ایک وکیل تھا۔ میشا گیارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا تھا۔ اپنے چہرے سے وہ سوچ بچار کا عادی معلوم ہوتا تھا اور اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ تھیں۔ وہ ورزش گاہ کے، دوسرے سال میں تھا۔ اس کے باپ گریگوری گورڈن کا تبادلہ ماسکو میں ایک نئے عہدے پر ہوا تھا۔ اس کی ماں اور بہنیں مکان ٹھیک ٹھاک کرنے کے لیے کچھ عرصہ پہلے ہی وہاں جا چکی تھیں۔
باپ اور بیٹے کو سفر کرتے ہوئے تین دن ہو گئے تھے۔ روس کی سرزمین، اس کے کھیت، چراگاہیں دیہات اور قصبے سورج کی روشنی میں ان کی نظروں کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ ہر چیز گرد کے بادلوں میں لپٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ شاہراہوں پر گاڑیوں کی قطاریں چلتی ہوئی نظر آتی تھیں جو کبھی کبھی سڑک سے ہٹ کر ریلوے لائن کو عبور کرتی تھیں۔ انتہائی تیز رفتار ٹرین سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گاڑیاں رکی ہوئی کھڑی ہوں اور ان کے گھوڑے آرام کر رہے ہوں۔
دنیا میں ہر نقل و حرکت اپنی جگہ سوچی سمجھی اور کسی مقصد کے تحت معلوم ہوتی تھی لیکن اگر انہیں ایک ساتھ دیکھا جاتا تو زندگی کے اسی عام دھارے کی ترنگ سے معمور نظر آتے تھے جس نے ان سب کو متحد کر دیا تھا۔ لوگ کام کرتے تھے اور جدوجہد کرتے تھے۔ اگر ان کے اندر ضرورتوں اور تفکرات سے آزادی حاصل کرنے کا اعلیٰ جذبہ موجود نہ ہوتا تو یہ مشینیں صحیح طریقہ پر کام نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ آزادی اسی احساس کا نتیجہ تھی کہ تمام انسانی زندگیاں

ایک رشتے میں منسلک ہیں۔۔۔ اس بات کا یقین کہ وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں، ایک مسرت انگیز احساس کہ تمام واقعات صرف روئے زمین پر ہی پیش نہیں آتے جہاں مُردے گاڑے جاتے ہیں بلکہ کسی دوسری دنیا میں بھی پیش آتے ہیں جسے کچھ لوگ خدائی بادشاہت، کچھ لوگ تاریخ، اور بعض دوسرے لوگ کسی اور ہی نام سے پکارتے ہیں۔ یٹشا اس عام نظریہ سے بالکل الگ تھا۔ وہ ہمیشہ اس بات پر یقین کرتا رہا تھا کہ دوسرے لوگوں جیسے بازو اور ٹانگیں رکھتے ہوئے اور وہی زبان اور طرز زندگی رکھتے ہوئے جیسا کہ تمام دوسرے لوگوں کا تھا، ایک شخص دوسروں سے مختلف کیوں کر ہو سکتا ہے۔ وہ یہ صورت حال نہیں سمجھ سکا تھا جس میں ایک شخص جو دوسرے لوگوں سے بدتر ہو، اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش بھی نہ کر سکتا ہو۔ یہودی ہونے کا کیا مطلب تھا؟ اس کا مقصد کیا تھا؟

اپنے والدین کو چھوڑ کر وہ رفتہ رفتہ تمام بڑی عمر کے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا جو اس خرابی کا باعث تھے اور اسے دور نہیں کر سکتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ بڑا ہو جائے گا تو وہ سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔

اب مثال کے طور پر کوئی بھی یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا کہ جب وہ بھاگ کر باہر پلیٹ فارم پر گیا تھا تو اس کے باپ کو اس پاگل آدمی کے پیچھے دوڑنا نہیں چاہئے تھا اور اس وقت ٹرین کو روکنا نہیں چاہیے تھا جب گریگوری کو ایک طرف دھکیل کر دروازہ کھولتے ہوئے اس پاگل نے اپنے آپ کو سر کے بل ایکسپریس ٹرین کے باہر گرا دیا تھا۔ چونکہ اس کے باپ نے خطرے کی زنجیر کھینچی تھی اس لئے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ٹرین محض ان کی وجہ سے اتنی دیر تک رکی رہی ہو۔

خودکشی کرنے والے شخص کی لاش پشتے کے قریب گھاس پر رکھی ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی سے جو خون کی دھار بہہ رہی تھی، وہ اب خشک ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے چہرے پر کانٹے کا نشان بن گیا ہو۔

حالات جاننے کے شوقین لوگوں اور ہمدردی رکھنے والوں نے لاش کو گھیر رکھا تھا اور ان کی زبانیں برابر چلے جا رہی تھیں جبکہ اس کا دوست اور سفر کا ساتھی، ایک تنومند اور خودسر قسم کا وکیل، ایک اصل نسل کا جانور جس نے پسینے میں بھیگی ہوئی قمیص پہن رکھی تھی اس کے قریب بیزار سا کھڑا تھا۔ تمام سوالوں کے جواب میں وہ اپنے کندھے ہلا دیتا تھا اور بغیر مڑے ہوئے بگڑ کر کہتا تھا: ''وہ ایک شرابی تھا۔ کیا تم سمجھ نہیں سکتے؟ اس نے دورے کی حالت میں ایسا کیا تھا۔''

ایک دو مرتبہ ایک دبلی پتلی عورت جو اونی لباس اور بیل والا رومال اوڑھے ہوئے تھی لاش کے پاس پہنچی۔ وہ تیورزینہ کی بیوہ تھی جس کے دو بیٹے انجینئر تھے۔ یہ عورت اپنی دو بہوؤں کے ساتھ تھرڈ کلاس میں سفر کر رہی تھی۔ تیورزینہ کا شوہر ریلوے کے ایک حادثہ میں زندہ جل گیا تھا۔ وہ لاش سے دور کھڑی تھی مگر لوگوں کے ہجوم میں سے اسے صاف دیکھ سکتی تھی۔ تمام مسافر گاڑی سے باہر آ گئے اور لاش پر ایک نظر ڈال کر اپنے اپنے ڈبوں میں واپس چلے گئے اور وہ بھی صرف اس خوف سے کہ کہیں ان کا سامان چوری نہ ہو جائے۔

اس حادثہ نے یٹشا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مارے غم اور خوف کے وہ خوب رویا۔ اس طویل سفر کے دوران خودکشی کرنے والا آدمی کئی مرتبہ ان کے ڈبہ میں آیا تھا اور اس نے گھنٹوں یٹشا کے والد سے باتیں کی تھیں۔ ہر مرتبہ جب بھی یہ گھبرایا ہوا آدمی ذرا مطمئن ہوتا، اس کا ساتھی ایک فرسٹ کلاس کے ڈبہ سے آتا اور اسے شیمپین پلانے کے لئے گاڑی کے ریستوران میں لے جاتا۔ یہ خوش پوش، مغرور اور ہٹا کٹا آدمی وکیل تھا جو اب لاش کے پاس کھڑا تھا مگر اس کے چہرے پر حیرت واستعجاب یا افسردگی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ ہر شخص اسے دیکھ کر مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچتا کہ اس کے موکل کی اضطراری کیفیت کسی نہ کسی طرح اس کے لئے سود مند تھی۔

یٹشا کے والد نے اسے بتایا کہ وہ مشہور کروڑ پتی ژواگو تھا، جو ایک خوش مزاج، اوباش اور فضول خرچ آدمی تھا اور دراصل اپنے افعال بد کا وہ خود زیادہ ذمہ دار نہیں تھا۔ جب وہ ان کے ڈبہ میں آتا تو یٹشا کی موجودگی کے احساس سے بے خبر وہ اپنے بیٹے کی باتیں کرتا جو یٹشا کا ہی ہم عمر تھا۔ اپنی سابق بیوی کا ذکر کرتا اور پھر اپنے دوسرے خاندان کی بات چھیڑ دیتا جسے اس نے پہلے خاندان ہی کی طرح چھوڑ دیا تھا۔

اچانک ہر طرف ایک ہلچل سی مچ گئی۔ برابر کی لائن پر ایک ہینڈ کار آ کر رکی جس میں سے ایک ڈاکٹر، دو پولیس والے اور ایک مجسٹریٹ اترے۔ خاص دفتری انداز میں چند سوالات پوچھے اور کچھ بیانات قلمبند کئے گئے۔ پولیس والوں اور محافظ دستوں نے بجری میں بری طرح پھسلتے اور لڑھکتے ہوئے لاش کو کھینچ کر لائن کے برابر رکھا۔ ایک دیہاتی عورت نے رونا شروع کر دیا اور مسافروں سے کہا گیا کہ وہ واپس اپنی سیٹوں پر چلے جائیں۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اور گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

نیکا پچھلی رات بالکل نہیں سو سکا تھا۔ اس کا دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔ یہ اس کا چودھواں سال تھا اور وہ بدستور بچہ بنے رہنے کے خیال سے تنگ آ گیا تھا۔ وہ رات بھر جاگتا رہا اور صبح سویرے باہر چلا گیا۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں شبنم سے بھیگے ہوئے درختوں کے طویل سائے پارک کے میدان پر پڑ رہے تھے۔ یہ سائے سیاہ نہیں تھے بلکہ گہرے بھورے رنگ کے تھے۔ صبح کی مست کر دینے والی خوشبو زمین پر پڑتے ہوئے ان پُرنم سایوں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور اس میں سے روشنی کی لکیریں کسی لڑکی کی انگلیوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔

اس کا باپ دمانتی دوروف ایک دہشت پسند تھا جسے پھانسی کی سزا دی گئی تھی لیکن بعد میں اس کی سزا معاف کر دی گئی تھی اور اب وہ جبری مشقت کی سزا کاٹ رہا تھا۔ اس کی ماں جارجیا کے ارستوف خاندان کی ایک شہزادی تھی۔ وہ ایک حسین اور بگڑی ہوئی عورت تھی جو اب تک جوان تھی اور بغاوتوں، باغیوں، تشدد پسندانہ نظریات، مشہور اداکاروں، تکلیف دہ ناکامیوں یا کسی نہ کسی چیز کے بارے میں غلط قسم کے خیالات اس کے ذہن میں سمائے رہتے تھے۔

اس کی ماں بھی خوب تھی۔ جب وہ چلی گئی تو اس نے واسکو بوئی کوف اور خود اس سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ کاکیشیا کے نزدیک تک نہیں گئی تھی بلکہ قریب ترین جنکشن پر راستہ تبدیل کر کے شمال کی طرف پیٹرز برگ چلی گئی تھی اور وہاں طالب علموں کے ساتھ پولیس پر گولیاں چلا کر تفریح میں وقت گذار رہی تھی۔ ادھر وہ خود اس ذلیل جگہ پر پڑا ہوا سڑ رہا تھا، لیکن وہ ان سب سے زیادہ چالاک ثابت ہوگا۔ وہ نادیا کو مار ڈالے گا، اسکول چھوڑ دے گا۔ بھاگ کر اپنے باپ کے پاس سائبیریا چلا جائے گا اور بغاوت شروع کر دے گا۔

انوکھی لڑکی

جاپان کے ساتھ ابھی جنگ ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ یہ سانحہ دوسرے غیر متوقع حادثات سے دب کر رہ گیا۔ روس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک انقلاب کی لہریں رواں دواں تھیں اور ہر انقلابی لہر پہلے سے زیادہ عظیم و شدید تھی۔ اسی زمانہ کی بات ہے کہ بلجیم کے ایک انجینئر کی فرانسیسی نژاد بیوہ امیلیا کارلوونا گیشار جس نے روسی شہریت اختیار کر لی تھی، یورال سے اپنے دو بچوں کو ساتھ لے کر ماسکو پہنچی۔ ان میں ایک بیٹا تھا (رودیا) اور دوسری بیٹی تھی، لاریسا (لارا) اس نے اپنے بیٹے کو ملٹری اکیڈمی میں داخل کرا دیا اور بیٹی کو لڑکیوں کے جسمانی ورزش کے اسکول میں جہاں اتفاق سے نادیا بھی اس کی ہم جماعت تھی۔

مادام گیشار کے شوہر نے اس کے لئے کافی دولت اور حصص چھوڑے تھے جن کی قیمت کچھ عرصہ تک تو بڑھتی رہی مگر اب گرنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے کوئی کام شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ٹرائمفل آرک کے قریب لباس تیار کرنے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ خرید لیا۔ یہ کارخانہ اس نے لیوتسکایا کے ورثا سے خریدا جس کے ساتھ ہی اسے اس فرم کی نیک نامی، خریدار، درزنیں اور کام سیکھنے والی شاگرد لڑکیاں بھی مل گئیں۔

یہ کام مادام گیشار نے کوماردوسکی کے مشورہ پر کیا۔ کوماردوسکی ایک وکیل تھا اور کسی زمانہ میں اس کے شوہر کا دوست تھا۔ اب وہ اسی شخص سے مشوروں اور مدد کے لئے رجوع کرتی تھی۔ وہ ایک ٹھنڈے دل و دماغ کا کاروباری آدمی تھا اور اسے روس کی کاروباری دنیا سے اتنی واقفیت تھی جتنی کسی کو اپنی ہتھیلی سے ہو سکتی ہے۔ اسی سے خط کتابت کر کے مادام گیشار نے یہ فیصلہ کیا تھا اور جب وہ بچوں کو لے کر ماسکو پہنچی تو اس نے ریلوے اسٹیشن پر ان کا استقبال کیا اور انہیں شہر کے دوسرے سرے پر اوروزنی پیریولوک کے علاقہ میں مونٹی نیگرو ہوٹل پہنچایا جہاں اس نے پہلے سے ان کے لئے کمرہ روک رکھا تھا۔ اسی نے رودیا کو ملٹری اکیڈمی اور لارا کو اپنی پسند کے اسکول بھیجنے کا مشورہ دیا تھا۔ کوماردوسکی لڑکے سے یونہی سرسری مذاق کرتا اور لڑکی کو اتنا گھور کے دیکھتا کہ وہ شرما جاتی۔

اس خاندان نے تقریباً ایک ماہ تک مونٹی نیگرو ہوٹل میں قیام کیا اور اس کے بعد وہ اپنے ورکشاپ سے ملحق تین کمروں کے ایک مکان میں منتقل ہو گئے۔ یہ ماسکو کا بہت ہی بدنام علاقہ تھا۔ گلی کوچے تاریک و غلیظ، سستے شراب خانوں کی بھرمار جو ہر وقت مشتبہ چال چلن کے ٹیکسی ڈرائیوروں سے بھرے رہتے تھے۔ پورے کے پورے بازار اور گلی کوچے جرائم کے مراکز اور پیشہ ور عورتوں کے اڈوں سے پٹے پڑے تھے۔

☆☆☆

بچوں نے کمروں میں جو کوڑا کرکٹ، کھٹمل اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر دیکھا تو انہیں اس پر قطعاً کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ والد کی وفات کے بعد سے ہی ان کی ماں مسلسل طور پر مفلسی کے خوف میں زندگی گزار رہی تھی۔ رودیا اور لارا کو یہ سننے کی عادت ہو گئی تھی کہ وہ تباہی کے کنارے پر کھڑے ہیں۔ وہ اچھی طرح محسوس کرتے تھے کہ وہ گلی کے دوسرے بچوں سے مختلف ہیں، لیکن کسی یتیم خانہ میں تربیت یافتہ بچوں کی طرح ان کے دلوں میں بھی امیر آدمیوں کا

خوف بری طرح بیٹھ چکا تھا۔

ان کی والدہ اس خوف کی زندہ مثال تھی۔ مادام گیشار گوری چٹی، موٹی تازی اور سنہرے بالوں والی ایک 35 سالہ خاتون تھی جسے کبھی دل کی گھبراہٹ کے دورے پڑتے اور کبھی حماقت کے۔ وہ بھیانک حد تک بزدل اور مردوں سے بری طرح خوفزدہ رہتی، لہٰذا اسی خوف اور گھبراہٹ کا نتیجہ تھا کہ وہ کبھی کسی ایک سے محبت کرتی اور کبھی دوسرے سے۔

مونٹی نیگرو ہوٹل میں یہ خاندان کمرہ نمبر 23 میں رہتا تھا۔ جب سے ہوٹل قائم ہوا تھا کمرہ نمبر 24 میں ایک سازندہ تاشکیوچ قیام پذیر تھا۔ سر سے گنجا۔ اکثر پسینے میں شرابور۔ بظاہر رحم دل۔ اور سر پر مصنوعی بالوں کی ٹوپی پہنے ہوئے۔ بات چیت کے دوران وہ دوسروں کو قائل کرنے کے لئے اکثر اپنے دونوں ہاتھوں سے سینے پر ایسے نیت باندھتا جیسے عبادت گذار لوگ کرتے ہیں۔ ہمسایوں کی حیثیت سے وہ ایک دوسرے کی کبھی کبھار مدد کرتے رہتے اور اس طرح وہ ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے۔

☆☆☆

جب کبھی کو ماردوسکی وہاں آتا اور بچے گھر پر موجود ہوتے تو مادام گیشار پریشان سی ہو جاتی لہٰذا تاشکیوچ اپنے کمرے کی چابی اسے دے جاتا کہ مادام اس کے کمرے میں اپنے دوست سے مل سکے۔ ورکشاپ تو ورسکایا اسٹریٹ کے کونے کے قریب ایک منزلہ مکان میں تھا۔ قریب ہی بریسٹ ریلوے کے انجن ڈپو، مال گودام اور ملازمین کے مکانات تھے۔ انہی کوارٹروں میں سے ایک میں اولیا وامینا نام کی ایک لڑکی رہتی تھی جو بہت ذہین تھی۔ یہ لڑکی مادام گیشار کے ہاں کام کرتی اور اس کا چچا مال گودام میں۔ اولیا بہت تیزی کے ساتھ کام سیکھ رہی تھی۔ پرانے مالک بھی اس سے بہت خوش تھے اور نئے بھی۔ لارا گیشار کو یہ لڑکی بہت پسند کرتی تھی۔

لیوتر کایا کے زمانہ سے اب تک فیکٹری میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ سلائی کی مشینیں تھکی ماندی درزنوں کے پاؤں یا سبک ہاتھوں کے اشاروں پر برابر شور مچاتی ہوئی مضطرب انداز سے چل رہی تھیں۔

کو ماردوسکی اکثر ان لوگوں سے ملنے جاتا اور جب اُن کے مکان جانے کے لئے ورکشاپ سے گذرتا تو فیشن ایبل عورتوں کو جو نئے سے نئے کپڑے پہنے ہوتیں بری طرح گھورتا اور عورتیں اپنے آپ کو اس کے مشکوک مذاق سے بچانے کے لئے ہڑبڑا کر پردوں کے پیچھے چھپ جاتیں۔ درزنیں اس پر بہت ناراض ہوتیں اور حقارت کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگتیں: ''یہ لاٹ صاحب آ گئے ہیں''۔۔۔''امیلیا کا درد سر''۔۔۔''بوڑھا بکرا''۔۔۔''عورتوں کا قاتل۔''

اس کا کتا جیک اس سے بھی زیادہ نفرت وحقارت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ موسم بہار کا ایک دن تھا کہ جیک نے اپنے تیز دانت لارا کی ٹانگ میں پیوست کر ڈالے اور اس کی جرابیں کاٹ لیں۔ اولیا نے لارا کے کان میں آہستہ سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: ''میں اس شیطان کو مار ڈالوں گی۔''

لارا ہنسنے لگی اور اس نے اولیا کی طرف رشک بھری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ سوچ رہی تھی یہ ایک مزدور لڑکی ہے جو غربت میں دن گذار رہی ہے۔ اس قسم کے بچے وقت سے پہلے نشو ونما پا جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ کتنی اچھی اور معصوم ہے۔

☆☆☆

''امی اس کی۔۔۔کیا لفظ ہے۔۔۔وہ امی کا۔۔۔یہ الفاظ بے ہودہ ہیں۔ میں اپنی زبان سے نہیں کہوں گی۔ تو پھر وہ میری طرف ایسے کیوں دیکھتا ہے؟ آخر میں اس کی بیٹی لگتی ہوں۔''

لارا کی عمر سولہ سال سے کچھ ہی اوپر ہو گی لیکن اس کی اٹھان اچھی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی عمر 18 یا اس سے بھی زائد ہے۔ اس کا دل صاف تھا۔ جو اس سے ملتا خوش ہوتا۔ شکل و صورت سے بھی وہ بہت اچھی تھی۔ اس نے اور رودیا نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ جدو جہد کے بغیر انہیں زندگی میں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہو گی۔ لارا نہایت ہی پاکیزہ اور پاکدامن لڑکی تھی۔

لارا اسکول میں دل لگا کر کام کرتی تھی اس لئے نہیں کہ اسے تعلیم سے بجائے خود محبت تھی بلکہ محض اس لئے کہ صرف انہی طالب علموں کو وظیفے دیئے جاتے تھے جو سب سے زیادہ لائق اور اہل ہوں۔ اسی طرح وہ برتن دھونے، ورکشاپ کے کام میں مدد دینے اور اپنی ماں کے بتائے ہوئے کام انجام دینے میں کافی ہوشیار تھی۔ اس کی چال میں ایک دلربائی تھی اور اس کی تمام وضع قطع، آواز، جسم، اشارے، اس کی بھوری آنکھیں اور اس کے چمکدار اور ملائم بال۔۔۔یہ سب چیزیں مل کر حسن و دلربائی کا ایک مجسمہ معلوم ہوتی تھیں۔

وسط جولائی میں اتوار کا دن تھا۔ چھٹی کے روز بستر پر دیر تک آرام کیا جا سکتا ہے۔ لارا پشت کے بل لیٹی ہوئی تھی اور اس نے اپنے ہاتھوں سے سر کو سہارا دے رکھا تھا۔ ورکشاپ میں خاموشی تھی۔ سڑک کی جانب کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ لارا نے اپنے بائیں کندھے اور اپنے داہنے پیر کے پنجے سے اپنے قد و قامت اور بستر میں اپنی پوزیشن کا اندازہ لگایا۔ اس کے علاوہ اور ہر چیز خود اس سے

مطابقت رکھتی تھی، اس کی روح اس کے جسم سے ہم آہنگ تھی۔
''مجھے ضرور سو جانا چاہیے۔'' لارا نے سوچا اور اپنے ذہن میں گاڑیوں کے احاطہ کا تصور قائم کرلیا اور پھر کچھ اور آگے بڑھ کر لارا نے پٹرووکا اسٹریٹ کا تصور کیا۔
یہ اولگا کے عقیقہ کا دن تھا جو کومار دوسکی کے کسی دوست کی چھوٹی بچی تھی۔ وہ لوگ گاڑیوں کے احاطہ میں رہتے تھے۔ بڑے بوڑھے رقص کر کے اور شمپین پی کر یہ تقریب منا رہے تھے۔ اس نے ماں کو بھی دعوت دی تھی لیکن وہ جا نہیں سکی تھی کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ماں نے کہا۔ ''لارا کو لے جاؤ۔ تم ہمیشہ مجھ سے کہتے رہتے ہو کہ میں لارا کا خیال رکھوں۔ اچھا اب تم ہی اس کی خبر گیری کرو۔'' اور اس نے واقعی اس کی خبر گیری کی۔ یہ بھی کیا مذاق تھا! اس کی شروعات رقص ہی سے ہوئی تھی، موسیقی کی تانوں کے ساتھ ہی ساری کائنات افسانوی زندگی کی طرح گذرتی لیکن موسیقی کے تھمتے ہی ایک قسم کا دھکا سا لگتا ہوا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے ٹھنڈے پانی کی بالٹی آپ پر الٹ دی ہو۔ کسی نے آپ کو ننگا دیکھ لیا ہو۔
وہ کبھی یہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ وہ اتنی اچھی طرح رقص کرتا ہوگا۔ اس کے ہاتھ کتنے پھرتیلے تھے اور اس نے کتنے اعتماد کے ساتھ اس کی کمر میں اپنے ہاتھ حمائل کئے تھے! لیکن اب وہ کبھی ہرگز کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ وہ اس کا اس طرح بوسہ لے سکے۔ اس نے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ کسی شخص کے ہونٹ اتنے گستاخ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اتنی دیر تک اس کے ہونٹوں سے ایک طویل بوسے کی صورت میں پیوست رہیں۔ اسے رقص کا خیال چھوڑ دینا چاہیے۔ وہی تمام برائیوں کی جڑ تھی۔ اسے جرات سے کام لے کر انکار کر دینا چاہئے اور یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ اس نے رقص کرنا نہیں سیکھا یا یہ کہ اس کے پیر میں چوٹ آ گئی ہے۔

☆☆☆☆

اس سال موسم خزاں میں ماسکو کی ریلوے لائن پر کام کرنے والے مزدوروں میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ماسکو۔۔۔ کازان لائن پر کام کرنے والے عملے نے ہڑتال کردی اور خیال تھا کہ ماسکو بریسٹ لائن کا عملہ بھی ہڑتال میں شریک ہو جائے گا۔ اکتوبر کے شروع مہینہ کی ایک سرد صبح تھی، آسمان ابر آلود تھا اور یہ مزدوروں کی اجرتیں ملنے کا دن تھا۔ کافی عرصہ تک محاسب کے دفتر سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اس کے بعد ایک لڑکا تنخواہوں کا حساب اور ان جرمانوں کی فہرست اور تفصیل لے کر دفتر میں آیا جو ان کی تنخواہوں

میں سے کاٹے گئے تھے۔ خزانچی نے تنخواہیں بانٹنی شروع کر دیں۔
شہر میں ہوا کی بو سے ہی ظاہر تھا کہ موسم سرما شروع ہو رہا ہے جو پاؤں تلے روندے ہوئے درختوں کے پتوں، پگھلی ہوئی برف، انجن کے جلے ہوئے کوئلے کی کالک اور تنور سے ابھی ابھی نکلی ہوئی گیہوں کی روٹی کی لپٹ کا عجیب وغریب امتزاج معلوم ہوتی تھی۔ یہ روٹی اسٹیشن کے طعام خانہ کے تہ خانہ میں پکائی جا رہی تھی۔ گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ شنٹنگ ہو رہی تھی۔ ڈبوں کو ایک دوسرے سے جوڑا جا رہا تھا۔ الگ کیا جا رہا تھا۔
فوفلیچن اور پاول انتی پوف ریلوے لائن کے کنارے ٹہل رہے تھے، اول الذکر ڈویژنل منیجر تھا اور دوسرا لائن کا اوورسیر۔ انتی پوف ریلوے لائن کی مرمت میں استعمال ہونے والے فاضل پرزوں کی ساخت کے بارے میں متعلقہ کارخانہ کی شکایت کر رہا تھا۔ انتی پوف کا خیال تھا کہ شدید سردی کے موسم میں پٹڑی ٹوٹ جائے گی۔ منتظمین محض اس کی شکایت کو دبا رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے ان ٹھیکوں میں کوئی خوب دولت سمیٹ رہا ہے۔
فوفلیچن سمور کا ایک قیمتی کوٹ پہنے ہوئے تھا جس پر ریلوے یونیفارم کے نشانات کڑھے ہوئے تھے۔ انتی پوف جو کچھ کہہ رہا تھا اسے وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا رہا تھا۔ فوفلیچن اس وقت کچھ دوسرے ہی خیالوں میں غرق تھا۔ وہ بار بار گھڑی نکالتا اور اسے غور سے دیکھتا، اسے کہیں جانے کی جلدی تھی۔
فوفلیچن نے اپنی گھڑی دیکھی، اس کا ڈھکن بند کیا اور پھر فاصلہ پر گھور کر دیکھنے لگا جہاں ایک سڑک ریلوے لائن کی طرف آتی تھی۔ سڑک کے ایک موڑ پر اسے ایک گاڑی دکھائی دی۔ یہ فوفلیچن کی اپنی گاڑی تھی۔ اس کی بیوی اس کے پاس آئی تھی۔
'' اچھا میرے پیارے دوست، پھر کسی وقت سہی۔'' ڈویژنل منیجر نے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ دونوں میاں بیوی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

تین چار گھنٹے بعد تقریباً مغرب کے وقت ریل کی پٹڑی سے کچھ فاصلہ پر ایک کھیت میں جہاں اس وقت تک کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا دو سائے زمین پر سے اٹھتے ہوئے دکھائی دیئے اور پیچھے گھوم کر دیکھنے کے بعد تیزی سے ایک طرف چلے گئے۔
''ہمیں اور زیادہ تیز چلنا چاہیے۔'' تیورزن نے کہا۔ ''وہ کہتے ہیں کہ آج تنخواہیں مل رہی ہیں۔ میں دفتر تک جاؤں گا۔ اگر آج تنخواہ نہ ملی تو میں تم سب پر لعنت بھیجوں گا۔ خدا کی قسم میں ایسا ہی کروں گا۔ میں یہ سب کچھ خود ختم کر دوں گا اور ایک منٹ بھی

انتظار نہیں کروں گا۔"

"اور کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تم یہ کام کس طرح کرو گے؟"

"کوئی مشکل نہیں۔ میں بوائلر روم میں جاؤں گا اور سیٹی بجا دوں گا۔ بس۔"

انہوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور مختلف سمتوں میں روانہ ہوگئے۔

تیورزن ریل کی پٹڑیوں کو پار کر کے شہر کی طرف چل دیا۔ راستہ میں اسے وہ لوگ آتے ہوئے ملے جو دفتر سے اپنی تنخواہیں لے کر آرہے تھے۔ یہ دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ اسٹیشن کے تقریباً سارے عملے کو تنخواہیں ادا کر دی گئی ہیں۔

اب اندھیرا ہو چلا تھا اور دفتر میں روشنی ہو رہی تھی۔ دفتر کے باہر سڑک پر فوفلیچن کی گاڑی کھڑی تھی جس میں اس کی بیوی بالکل اسی انداز سے بیٹھی ہوئی تھی جیسے اس نے صبح سے حرکت ہی نہ کی ہو۔ وہ اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی جو اپنی تنخواہ لے رہا تھا۔ اچانک برف پڑنی شروع ہوگئی۔ تیورزن سلام کئے بغیر اس کے پاس سے ہو کر گذر گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی تنخواہ بعد میں آ کر لے گا تاکہ دفتر میں اس کے شوہر کا سامنا نہ ہو جائے۔

"تیورزن! کپر ک!" تاریکی میں [illegible] کئی آوازیں سنائی دیں۔ ورکشاپ کے باہر کچھ لوگوں کا مجمع تھا۔ اندر کوئی شخص زور زور سے چلا رہا تھا اور ایک لڑکا رو رہا تھا۔

معمول کے مطابق بوڑھا فورمین پیوترے خورولیف اپنے نوعمر شاگرد یوسپکا کو پیٹ رہا تھا۔ خورولیف ہمیشہ سے ایسا ظالم اور شراب پی کر شور وغل مچانے والا نہیں تھا۔ ایک وہ زمانہ بھی تھا جب ایک نوجوان اور مستعد مزدور کی حیثیت سے وہ ماسکو کے صنعتی علاقہ میں تاجروں اور پادریوں کی لڑکیوں کی توجہ کا مرکز تھا اور وہ اسے قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا کرتی تھیں، لیکن اس لڑکی فارمانے جس سے اسے محبت تھی اور جس نے اسی سال کانونٹ اسکول میں تعلیم ختم کی تھی اسے ٹھکرا دیا اور اس کے ساتھی سویلی سے شادی کر لی تھی جو ایک مکینک اور تیورزن کا باپ تھا۔

سویلی کے ہیبت ناک انجام کے پانچ سال بعد (وہ 1888ء میں ریل کے سنسنی خیز حادثہ میں جل کر مر گیا تھا) خورولیف نے پھر اپنی محبت کا اظہار کیا لیکن مارفا گلوریلوفا نے پھر اسے مسترد کر دیا۔ محبت میں ناکام ہو کر خورولیف نے شراب نوشی اور لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ وہ دنیا سے انتقام لینا چاہتا تھا جو اس کے خیال میں اس کی بدقسمتی کی ذمہ دار تھی۔

یوسپکا جمال الدین کا لڑکا تھا جو اس علاقہ کے مکانوں کا چوکیدار تھا جہاں تیورزن رہتا تھا۔ تیورزن نے لڑکے کو اپنی نگرانی میں لے لیا تھا اور اس سے خورولیف کے غصہ کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی تھی۔

"تم لڑکے پر ظلم کیوں کرتے ہو؟" تیورزن نے مجمع کے درمیان سے گذر کر آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"تم سے کوئی مطلب نہیں ہے۔" خورولیف نے بگڑتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم لڑکے پر ظلم کیوں کرتے ہو؟"

"بھاگ جاؤ، میں تم سے کہتا ہوں کہ صحیح سلامت یہاں سے کھسک جاؤ۔ میں تیری ماں کو جانتا ہوں جو ایک پھوہڑ، ذلیل اور آوارہ عورت ہے۔"

اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا وہ ایک ہی منٹ کے اندر ختم ہو گیا۔ قریب ہی بنچ پر اوزار اور لوہے کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے اور ان دونوں کے جو کچھ بھی ہاتھ پڑا انہوں نے اٹھا لیا۔ اگر مجمع کے آدمیوں نے فوراً بڑھ کر انہیں علیحدہ نہ کر دیا ہوتا تو یقیناً ایک دوسرے کو مار ڈالتے۔

تیورزن نے بلا کی طاقت و جدو جہد کے ساتھ ایک دم ان دونوں آدمیوں کو جھٹکا دے کر الگ کر دیا، جو اس سے چمٹے ہوئے تھے اور دروازے کی طرف دوڑا۔ دروازہ زور سے بند کر کے وہ باہر نکلا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ موسم خزاں کی غم آلود رات تھی اور وہ بڑبڑا رہا تھا۔ "تم ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتے ہو اور وہ تم پر چاقو لے کر دوڑتے ہیں۔" راستہ چلتے ہوئے وہ اس سے بھی بے نیاز تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔

تیورزن کو کافی تاخیر کے ساتھ معلوم ہوا کہ انتی یوف [illegible] ساتھ خفیہ پناہ گاہ سے اس کی روانگی کے بعد ہی ہڑتال کمیٹی نے اس رات ہڑتال شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

عین اس وقت جبکہ انجنوں کی مرمت کے ورکشاپ کی سیٹی بجی تیورزن نے محسوس کیا کہ یہ آواز اس کے دل سے نکل رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ڈپو اور مال گودام سے مزدور نکل کر باہر جمع ہوگئے۔ بعد میں بوائلر روم کے مزدور بھی ان سے آملے۔ انہوں نے تیورزن کے اشارہ پر کام چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

تیورزن کئی سال تک یہی سمجھتا رہا کہ اس رات صرف اس نے لائن پر کام اور ٹریفک کو رکوا دیا تھا، مگر ایک عرصہ بعد جبکہ ہڑتال

میں شرکت کے الزام میں۔۔۔ ہڑتال کرانے کے الزام میں نہیں۔۔۔اس کے خلاف مقدمہ چلا اس وقت اسے صحیح بات معلوم ہوئی۔

تیورزن دو دن کے بعد گھر لوٹا۔اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔سردی سے وہ اکڑا جا رہا تھا۔سال کے اس وقت غیر متوقع طور پر سردی شروع ہو گئی تھی اور تیورزن نے سردی کا لباس نہیں پہن رکھا تھا۔چوکیدار جمال الدین اسے دروازے پر ملا۔

''شکریہ مسٹر تیورزن''۔۔۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی روسی زبان میں کہا۔''آپ نے یوسپکا کو بچا لیا میں ہمیشہ آپ کے لیے دعا کروں گا۔''

''شکریہ جمال الدین!اگر کوئی اور بات رہ گئی ہو تو اسے بھی جلدی بتا دو،میں سردی سے ٹھٹھر رہا ہوں۔''

''میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ رات گھر پر نہ گذارو۔۔۔ پولیس یہاں یہ پوچھتی ہوئی آئی تھی کہ گھر پر کون آیا تھا۔میں نے کہا کوئی نہیں۔پھر مجھے اطمینان ہوا۔میں نے کہا۔ریلوے کے لوگ آئے تھے لیکن کوئی اجنبی نہیں آیا۔''

تیورزن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔وہ اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتا تھا جس کی شادی ہو چکی تھی۔عمارت ہولی ٹرنیٹی کے قریبی چرچ کی تھی۔اس میں کچھ پادری،خوانچہ والوں کی دو انجمنیں،ایک قصائیوں کی انجمن اور دوسری سبزی فروشوں کی انجمن تھی۔۔۔لیکن ان میں زیادہ تر ماسکو بریسٹ ریلوے کے ملازم تھے۔یہ مکان پتھر کا تھا۔صحن کے چاروں طرف لکڑی کے تختے بچھا کر راستہ بنایا گیا تھا اور اس میں سے ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں۔

تیورزن کا بھائی جبری طور پر فوج میں بھرتی کر کے لڑائی پر بھیج دیا گیا تھا۔وہ وفا نکاؤ میں زخمی ہو گیا تھا اور اب کراسنویارسک کے اسپتال میں زیر علاج تھا۔اس کی بیوی اور دو لڑکیاں اسے دیکھنے اور گھر لانے وہاں گئی ہوئی تھیں۔تیورزن کے خاندان کے لوگ شروع ہی سے ریلوے میں ملازم تھے اس لئے وہ پورے روس میں سرکاری پاس پر سفر کرتے تھے۔فلیٹ پر سکون تھا اور اس وقت وہاں صرف تیورزن اور اس کی ماں تھی۔

''ماں تم نے خوب آگ جلا رکھی ہے اندر کتنا گرم اور اچھا ہے۔''

ماں نے گردن اٹھا کر بیٹے کو دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''ابھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔۔۔''ماسکو سے وارسا تک ریلوے لائن پر ہڑتال شروع ہو گئی ہے۔''

''میں جانتی ہوں اسی لئے میں رو رہی ہوں۔وہ اب تیرے پیچھے ہوں گے۔تجھے پکڑنا چاہیں گے۔''

''انتی پوف کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔پولیس رات کو اس کے گھر آئی اس کے فلیٹ کی تلاشی لی تمام چیزیں الٹ پلٹ کر رکھ دیں اور آج صبح اسے گرفتار کر کے لے گئی۔اس کی بیوی دار یا میعادی بخار میں مبتلا اسپتال میں پڑی ہوئی ہے اور ان کا بچہ پاشا جو اسکول میں ہے اپنی گونگی خالہ کے ساتھ گھر میں اکیلا رہ گیا ہے ان سے فلیٹ خالی کرایا جا رہا ہے۔میرا خیال ہے کہ ہم بچے کو اپنے پاس رکھ لیں۔''

☆☆☆

پاشا انتی پوف جس کے باپ کو ہڑتال کے ایک منتظم کی حیثیت سے گرفتار کر لیا گیا تھا،تیورزن خاندان کے ساتھ رہنے کے لئے چلا گیا۔وہ ایک صاف ستھرا لڑکا تھا جس کے نقش و نگار سادہ تھے،اس کے بال سرخ تھے اور وہ عین درمیان سے مانگ نکالتا۔بالوں کو ہمیشہ کنگھے سے ٹھیک کرتا اور اپنے لباس کی شکنیں یا پیٹی پر اسکول کا بیج ٹھیک کرتا رہتا۔اس میں مزاح سے لطف اندوز ہونے اور چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت موجود تھی۔ 17اکتوبر کے منشور کے فوراً بعد ہی مختلف انقلابی جماعتوں نے ایک بڑے مظاہرہ کا اعلان کیا۔اس کا راستہ تائیور گیٹ سے شہر کی دوسری طرف کالوگا گیٹ تک تھا۔

اگرچہ تیورزن نے اسے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے باوجود اس کی ماں مظاہرین میں جا کر شامل ہو گئی اور خوش مذاق ملنسار پاشا بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔

نومبر کا یہ ایک خشک دن تھا۔آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور برف کے گالے ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ فضا میں چکر کھاتے ہوئے نیچے پختہ فرش پر گر کر جم جاتے تھے۔سڑک پر لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ہر طرف ایک زبردست ہجوم تھا۔مرد اور عورتیں،طالب علم،بوڑھے،بچے،ریلوے کے ملازمین،ٹیلیفون ایکسچینج میں کام کرنے والے مزدور،لڑکیاں اور اسکولوں کے لڑکے غرضیکہ ہر طبقہ اور درجہ کے لوگ وہاں موجود تھے۔لیڈروں کو اپنے ہمدردوں کی جانب سے یہ پیغام ملا تھا کہ آگے سڑک پر قازق سپاہی جلوس پر حملہ کے لئے تیار کھڑے ہیں۔یہ اطلاع ٹیلیفون پر نزدیک کے ایک دواخانہ میں دی گئی تھی۔''تو اس

سے کیا ہوتا ہے؟'' منتظمین نے کہا۔ ''ہمیں چاہیے کہ ہم پرسکون رہیں۔'' وہ لوگ بحث کرتے ہوئے ایک اسکول کی عمارت کے نکڑ پر پہنچ گئے جو دوسری متذکرہ عمارتوں کی طرح بالکل محفوظ تھی۔

''بڑے ہال میں، بڑے ہال میں۔'' پیچھے سے کچھ لوگوں نے چلا کر کہا۔ مجمع برابر آگے بڑھتا رہا اور برآمدوں اور کلاسوں میں پھیل گیا۔ آخر کار جب لیڈر انہیں اکٹھا کر کے بڑے ہال میں لے جانے میں کامیاب ہو گئے تو انہوں نے کئی مرتبہ انہیں چھاپہ کے بارے میں خبردار کرنے کی کوشش کی لیکن کسی نے ان کی ایک نہیں سنی۔

جس وقت جلسہ ہو رہا تھا باہر برف گرنی شروع ہو گئی تھی، سڑک سفید ہو رہی تھی اور برفباری برابر شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ جب گھوڑ سوار فوجیوں نے حملہ کیا تو جلوس کے عقب میں چلنے والوں کو پہلے اس کا کوئی علم نہیں ہو سکا۔ ان کے کانوں میں ایک ابھرتی ہوئی آواز آئی جیسے کوئی بہت بڑا مجمع ''ہرا'' کا نعرہ لگا رہا ہو اور ''مدد!'' اور ''قتل!'' کی منفرد آوازیں شور و پکار میں گم ہو کر رہ گئیں۔ نصف پلٹن گھوڑوں کو بھگاتی ہوئی گذری، آگے جا کر مڑی، اور نئے سرے سے منظم ہو کر جلوس کے عقبی حصہ پر حملہ کر دیا۔ قتل و غارت گری شروع ہو گئی۔

چند منٹ بعد سڑک تقریباً سنسان پڑی تھی۔ لوگ آس پاس کی سڑکوں پر منتشر ہو رہے تھے۔ برفباری اب ہلکی پڑ گئی تھی۔ مکانوں کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں اس طرح پڑنے لگیں جیسے وہ سڑک پر پڑی ہوئی ہر سرخ چیز کی طرف انگلی سے اشارہ کر رہا ہو۔۔۔ گھوڑ سوار فوجیوں کی ٹوپیاں جو اوپر سے سرخ تھیں، ایک سرخ جھنڈا جو سڑک پر پڑا ہوا تھا اور برف پر خون کے سرخ چھینٹے۔

گھوڑوں کی ٹاپوں کے بالکل قریب مارفا جس کی شال اس کے سر کے پیچھے جا پڑی تھی ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ''پاشا!'' چلاتی جا رہی تھی۔

پاشا برابر اس کے ساتھ تھا اور جلسہ کے آخری مقرر کی نقلیں اتار کے اسے محظوظ کرتا رہا تھا لیکن گھوڑ سوار دستوں کے حملہ کے بعد جو ہنگامہ ہوا اس میں غائب ہو گیا۔ ایک سوار نے مارفا کی پیٹھ پر بھی چابک مارا۔ آخر کار خوش قسمتی سے اس نے سڑک کے اس پار لڑکے کو دیکھ لیا۔ وہ ایک پنساری کی دکان اور پتھر کے بنے ہوئے ایک مکان کے درمیان کھڑا ہوا تھا جہاں ایک سوار اتفاقیہ آنے جانے والوں کو روکے ہوئے تھا۔

مجمع منتشر ہو چکا تھا۔ پاشا بہت دہشت زدہ تھا اور خوف کی وجہ سے اس کی زبان گنگ تھی، وہ مارفا کی طرف بھاگا۔ گھر پہنچ کر وہ اپنے بیٹے پر برس پڑی: ''۔۔۔ کیا میری اب یہ عمر ہے کہ ایک احمق گھوڑ سوار میری پیٹھ پر چابک مارے؟''

☆☆☆

نکولائی نکولائیوچ نے اپنے دریچہ سے مظاہرین کو دیکھا جو بھاگ گئے تھے۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ کہیں یورا تو ان میں نہیں ہے لیکن بھاگتے ہوئے مظاہرین میں اسے اپنا کوئی دوست نظر نہیں آیا، البتہ اتنا یاد پڑتا ہے کہ درروف کے خاندان کے ایک لڑکے پر اس کی نظر پڑی تھی لیکن اس کا نام اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ نکولائی نکولائیوچ اسی موسم خزاں میں پیٹرز برگ سے آیا تھا۔ ماسکو میں اس کے پاس کوئی مکان نہیں تھا اور ہوٹل میں رہنا بھی اسے پسند نہ تھا، اس لئے وہ اپنے ایک دور کے رشتہ دار سوین ٹیٹسکی کے ہاں قیام پذیر تھا۔ انہوں نے اسے دوسری منزل پر کنارے کا ایک کمرہ دے رکھا تھا۔

چار کھڑکیوں کے باوجود مطالعہ کے کمرہ میں اندھیرا اندھیرا سا رہتا تھا۔ کمرہ کتابوں کاغذوں قالینوں اور تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے آگے نصف دائرہ کی شکل کا ایک چھجہ نکلا ہوا تھا۔ بالکونی کا دروازہ سردی کی وجہ سے بند کر دیا گیا تھا۔ بالکونی کے دروازے اور دو کھڑکیوں سے دور کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ ریلوے لائن دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مکانوں کی بے ترتیب قطاریں تھیں اور تار لگے ہوئے تھے۔ درخت برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان کی شاخیں ایسی ہو رہی تھیں جیسے سفید، موم بتیاں۔

نکولائی نکولائیوچ کھڑا دور نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ وہ پیٹرز برگ میں گذاری ہوئی پچھلی سردیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے مڑا۔ اس کا دل چاہا کہ باہر نکلے، لیکن اسے یاد آیا کہ ٹالسٹائی کا معتقد دیوولوشنوف کسی کام سے اس کے پاس آنے والا ہے۔ وہ کمرے میں ٹہلتا رہا، اسے اپنے بھانجے کا خیال آ گیا۔

جب نکولائی والگا پر اپنی آرام گاہ سے لوٹا تھا تو اس نے یورا کو ماسکو میں چھوڑ دیا تھا جہاں اس کے کئی رشتہ دار تھے۔ یورا کو پہلے آسٹرو مائی سنیسکی کے ہاں ٹھہرایا گیا تھا جو ضرورت سے زیادہ باتیں کرتا تھا اور پوری برادری میں فیدکا کے نام سے مشہور تھا۔ فیدکا گناہ آلود زندگی بسر کر رہا تھا اور خود کو نئے بنائے نظام کو درہم برہم کرنے والا اور ترقی پسند خیالات کا علمبردار سمجھتا تھا۔ اسے یورا کی تعلیم و تربیت کے لیے جو رقم دی گئی تھی وہ اسے بھی کھا گیا جس کی وجہ سے یورا کو گرومیکو کے ہاں منتقل کر دیا گیا۔ یہ بڑا علم دوست

خاندان تھا اور ابھی تک وہیں قیام پذیر تھا۔ ''گرومیکو کے گھر کا ماحول یورا کے لئے بڑا موزوں ہے۔'' نکولائی نے سوچا۔ ''ان کی بیٹی تونیا یورا کی ہم عمر ہی ہے۔ اور میشا گورڈن بھی اس کے ہاں رہتا ہے جو یورا کا دوست اور ہم جماعت ہے۔''

☆☆☆

ٹالسٹائی فیشن کی قمیص، چمڑے کی چوڑی پیٹی، فلیٹ کے جوتے اور ڈھیلی ڈھالی پتلون پہنے جو گھٹنوں پر باہر نکلی ہوئی تھی ایک موٹا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ دیکھنے میں آدمی اچھا تھا مگر کھویا کھویا سا۔ اس نے بغیر کمانی کی عینک لگا رکھی تھی جس کا فیتہ اس کی ناک کے قریب لہرا رہا تھا۔ بڑے کمرہ میں اس نے اوور کوٹ اتار دیا، البتہ ابھی گلوبند نہیں اتارا تھا جو فرش پر لڑھکتا ہوا اس کے ساتھ آ رہا تھا۔ اس کی گول ٹوپی بھی ابھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ ان رکاوٹوں کے باعث وہ نکولائی سے نہ مصافحہ کر سکا اور نہ مزاج پرسی۔ نکولائی نے کہا۔ ''یہ چیزیں جہاں جی میں آئے رکھ دیجئے۔'' یہ سنتے ہی دیودلوشنوف میں پھر قوت گویائی آ گئی اور وہ سنبھل گیا۔

وہ ٹالسٹائی کے ایسے پیروکاروں میں سے تھا جن کے دل و دماغ میں اس غیر معمولی ذہانت کے انسان کے تصورات ہمیشہ کے لئے جاگزیں ہو گئے تھے لیکن دراصل ان تصورات میں کوئی جان نہیں رہی تھی جواب بالکل کھوکھلے دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ نکولائی نکولا ئیوچ کو ایک جلسے میں تقریر کی دعوت دینے آیا تھا جو کسی اسکول میں ان لوگوں کی امداد میں ہو رہا تھا جنہیں سیاسی بنا پر جلاوطن کر دیا گیا تھا۔

''میں پہلے ہی اسکول میں تقریر کر چکا ہوں۔''

''ہاں لیکن اب آپ کو دوبارہ اس سلسلے میں تقریر کرنی پڑے گی۔''

نکولائی نکولا ئیوچ نے تھوڑی دیر تک ہاں۔ نا۔ کی اور آخر کار مان گیا۔

وہ روانگی سے قبل کوئی دلچسپ اور اچھی سی بات کرنا چاہتا تھا۔ اب جو بات چیت ہوئی وہ کشیدہ اور کچھ پریشان کن سی تھی۔ گفتگو خواہ مخواہ طول پکڑتی گئی۔ اس کے باوجود کہ نکولائی نکولا ئیوچ کو معلوم تھا کہ یہ بحث بالکل بیکار ہے، اس نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اثبات نگار مصنفین اسے کیوں پسند ہیں۔ پھر ٹالسٹائی کے اصولوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا:

''ایک حد تک تو میں تمہارے ساتھ ہوں، لیکن ٹالسٹائی کہتا ہے کہ آدمی جس قدر خود کو وقف حسن کرتا ہے اتنا ہی وہ اچھائی سے دور ہٹ جاتا ہے۔۔۔''

''اور تمہارا خیال ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ حسن دنیا کو بچالے گا۔''

''ٹھہرو۔ میں بتاتا ہوں کہ میں کیا سوچتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انسان کے اندر جو درندہ سویا ہوا ہے اسے اگر دھمکیوں سے مرعوب کیا جا سکتا ہے۔۔۔ کسی بھی قسم کی دھمکی۔۔۔ جیل کی یا موت کے بعد سزا و جزا کی۔۔۔ تو انسانیت کا سب سے بڑا نشان سرکس میں اپنے ہنٹر سے شیر کو سدھانے والے رنگ ماسٹر کا ہوتا۔ اس پیغمبر کا نہیں جس نے خود کو قربان کر دیا۔ لیکن تم نہیں سمجھتے۔ یہی تو اصل بات ہے۔ جس چیز نے صدیوں تک انسان کو درندوں کی سطح سے بلند رکھا ہے وہ ڈنڈا نہیں بلکہ ایک اندرونی اور باطنی موسیقی ہے۔ یہ غیر مسلح صداقت کی ناقابل تسخیر طاقت ہے جس کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ اس کے اسوہ حسنہ کی زبردست کشش ہے۔ عام طور پر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ انجیل مقدس میں جو چیزیں سب سے اہم ہیں وہ اخلاقی ضابطے اور احکامات ہیں لیکن میرے لئے سب سے اہم چیز یہ ہے کہ یسوع مسیح جن اخلاقی حکایات یا تمثیلوں کا ذکر کرتے ہیں وہ زندگی سے لی گئی ہیں۔ وہ ہمیں سچ کا سبق، روزمرہ کی زندگی کے حقائق سمجھاتے ہوئے دیتی ہیں۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ فانی مخلوق کا جذبہ خیر سگالی کے ساتھ مل جل کر رہنا اسے غیر فانی بنا دیتا ہے اور اسی معنویت کے اعتبار سے یہ ساری زندگی ایک زبردست اشارہ قدرت ہے۔''

''میری سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آیا۔ تمہیں اس پر کتاب لکھنی چاہیے۔''

دیودلوشنوف کی روانگی کے بعد نکولائی نکولا ئیوچ بہت برہم ہوا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے اپنے بعض دلی خیالات اس بیوقوف کے سامنے اگل دیئے۔ اور اس پر ان کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ اس نے کبھی ڈائری نہیں رکھی، تاہم سال میں ایک دو مرتبہ جب اسے خاص طور پر کوئی بات سوجھتی تو وہ اسے ایک موٹی کاپی میں نوٹ کر لیتا، چنانچہ اس نے نوٹ بک نکالی اور اس میں جلی الفاظ سے لکھنے لگا: ''اس بیوقوف شلینگر عورت نے سارا دن خراب کر دیا۔ وہ صبح آئی اور دوپہر کے کھانے تک رہی۔ پورے دو گھنٹے تک اس نے مجھے اوٹ پٹانگ نظم و نثر، موسیقی اور ستاروں کی الٹی سیدھی منطق اور چار عناصر کی آوازیں وغیرہ سنا کر بور کر دیا۔ میں مظلوم بنا ہوا اس کی خرافات سنتا رہا اور پھر میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ یہ بکواس بند کر دے۔

''اور اچانک میں سب کچھ سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اسی قسم کی

نظمیں اتنی مہلک اور ناقابل برداشت حد تک غلط کیوں ہوتی ہیں یہاں تک کہ ''فاؤسٹ'' میں بھی ایسا ہی ہے۔ پوری نظم مصنوعی معلوم ہوتی ہے، جس میں کوئی شخص دلچسپی نہیں لیتا۔ موجودہ دور کے انسان کو اس کی کوئی ضرورت نہیں، جب وہ کائنات کے رازوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے تو پھر وہ طبیعات کی طرف متوجہ ہوتا ہے، مگر ھلیسیوڈ کی شاعری میں دلچسپی نہیں لیتا۔

''صرف یہ نہیں ہے کہ اس صنف میں تاریخ کی غلطیاں ہوتی ہیں یا تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے یا ان کی روحانیت ان عقدوں کو الجھا کر رکھ دیتی ہے جنہیں سائنس نے حل کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کا فن روح مادے اور موجودہ دور کے فن سے مطابقت نہیں رکھتا۔ تخلیق کے یہ نظریات قدیمی دور میں قدرتی تھے جبکہ دنیا کی آبادی اس قدر کم تھی کہ انسان اس وقت تک فطرت کے رازوں کو نہیں پا سکا تھا۔ دیوقامت مخلوق اس وقت بھی دنیا میں موجود تھی اور اژدہوں اور بڑے بڑے خوفناک سانپوں کی یاد لوگوں کے ذہن میں اس وقت تک تازہ تھی۔ قدرت نے اس قدر صاف طریقہ پر تمہارے منہ پر طمانچہ مارا اور تمہاری اتنی سخت پکڑ کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید اس وقت تک دیوتاؤں کا وجود باقی تھا۔ یہ تاریخ انسانی کے شروع کے صفحات تھے اور محض ابتدا تھی۔

''قدیم دنیا اپنی آبادی کو بڑھا لینے کی وجہ سے روم کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

''روم مانگے ہوئے دیوتاؤں اور مفتوح لوگوں کی منڈی تھا، زمین و آسمان جس کی دو منزلیں تھیں جہاں سودے طے ہوا کرتے تھے، غلاظت کا ایک ڈھیر جیسا کہ انتڑیوں میں جمع ہو جایا کرتا ہے، وہاں مختلف قوموں کے لوگ تھے، بغیر دھڑے کے بھاری پیسے تھے، آنکھوں پر چربی چڑھی ہوئی تھی، لوگ ہم جنسی کے عادی تھے، جاہل شہنشاہ ہوا کرتے تھے اور مچھلیوں کو پڑھے لکھے غلاموں کا گوشت کھلا کر پالا جاتا تھا۔ اس وقت دنیا کی آبادی اتنی زیادہ تھی جتنی اس کے بعد آج تک کبھی نہیں ہوئی، یہ سب لوگ روم کی وسیع تفریح گاہوں میں بھرے پڑے سڑ رہے تھے۔ اور پھر سونے اور سنگ مرمر کی اس دنیا میں یسوع مسیح آئے جو مجسم روشنی اور چمک تھے اور ایک انسان کامل تھے۔۔۔ اور جلیلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے آتے ہی دیوتاؤں اور قوموں کا وجود ختم ہو گیا اور انسان وجود میں آیا۔۔۔ انسان جو بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ انسان جو ہل چلاتا تھا، انسان جو بھیڑیں چرایا کرتا تھا۔ انسان جو قطعی مغرور نہیں تھا، انسان جس کے گن ماؤں کی لوریوں میں گائے گئے اور ساری دنیا میں جس کی تصویریں آویزاں کی گئیں۔''

☆☆☆

موسم غیر معمولی قسم کا تھا۔ پانی کے قطرے دھات سے بنی ہوئی نالیوں اور کارنسوں پر ٹپ ٹپ کی آواز کے ساتھ گر رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہار کا موسم ہو۔ برف پگھل رہی تھی۔

لارا نے سارا راستہ گھبراہٹ کے عالم میں طے کیا اور یہ اس نے گھر پہنچ کر ہی محسوس کیا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ ہر شخص سویا ہوا تھا۔ اس پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی اور اس بےخودی کے عالم میں وہ اپنی ماں کی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت بھی اپنا بیل ٹکا ہوا ارغوانی لباس پہنے ہوئے تھی جو تقریباً سفید معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک لمبی نقاب بھی ڈال رکھی تھی جو اس نے ورکشاپ سے شام کو پہننے کے لئے عاریتاً لی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی جس میں اس کا عکس پڑ رہا تھا لیکن اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے بازو ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر اپنا سر ان پر ٹکا دیا۔

اگر ماں کو اس کا علم ہو گیا تو وہ اسے مار ڈالے گی اور پھر اپنی جان دے دے گی، یہ کس طرح ہو گیا۔ اب وہ کیا تھی؟ ایک آوارہ عورت۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جیسی فرانسیسی ناول میں ہوتی ہے اور کل وہ اسکول جائے گی اور ان دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھے گی جو اس کے مقابلہ میں چھوٹی بچیوں کی طرح تھیں۔ او خدا، او خدا! یہ کس طرح ہو گیا؟

کھڑکی کے باہر پانی کے قطرے ٹپ ٹپ کی آواز کے ساتھ گر رہے تھے اور برف پگھل رہی تھی سڑک پر کوئی شخص کسی پڑوسی کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ لارا نے اپنا سر نہیں اٹھایا۔ اس کے شانے ہل رہے تھے، وہ رو رہی تھی۔

☆☆☆

وہ درازیں کھولتا اور بند کرتا رہا۔ چیزیں الٹ پلٹ کرتا رہا۔ کف اور کالر چاروں طرف قالین اور صوفے پر پھینکتا رہا حالانکہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا چیز تلاش کر رہا تھا۔

اسے اس چیز کی بہت سخت ضرورت تھی اور اس اتوار کو لارا سے ملاقات کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی، وہ ایک ایسے جانور کی طرح جسے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو، بوکھلایا ہوا کمرے میں ادھر سے ادھر چکر لگاتا رہا۔ اس کے غیر مرئی حسن اور خوبصورتی کی تو کوئی نظیر نہیں تھی۔ ہوٹل کے کمرے کی دیوار پر اس کا سایہ اس کی معصومیت کے خاکہ کی مانند تھا۔ اس کی چولی اس کے سینہ پر اتنی مضبوطی کے ساتھ تنی ہوئی تھی جیسے کاڑھنے کے فریم پر کپڑا تانا جاتا

ہے۔

''اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟'' کوماردوسکی نے سوچا۔

''مجھے کیا ہوگیا ہے؟'' کیا یہ اس کے ضمیر کی آواز تھی، رحم کا احساس تھا یا ندامت تھی؟ یا وہ اس کی وجہ سے پریشان تھا؟ نہیں، وہ جانتا تھا کہ وہ گھر پر بخیریت تھی، پھر آخر وہ اس کا خیال اپنے دل سے کیوں نہیں نکال سکتا تھا؟

کوماردوسکی نے بلوط کا جنگلہ اتنی سختی کے ساتھ پکڑ لیا کہ اس کا ہاتھ دکھنے لگا، اس نے ایک لمحہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں اس کے بعد مصمم ارادے کے ساتھ واپس مڑ کر نیچے اتر گیا۔ نیچے اس کا کتا اس کا انتظار کر رہا تھا، اس نے سر اٹھا کر اپنے مالک کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

کتے کو لڑکی سے نفرت تھی۔ اس نے اس کی جرابیں پھاڑ دی تھیں، اس پر بھونکا تھا اور دانت دکھائے تھے، وہ اس سے جلتا تھا جیسے اسے یہ اندیشہ ہو کہ وہ اس کے مالک میں انسانیت کے جراثیم بھر دے گی۔ دن اور ہفتے گذرتے رہے۔

☆☆☆

یہ کیسی ناقابل مفر کشش تھی! اگر کوماردوسکی کے اس کی زندگی میں داخل ہونے سے اسے تنفر پیدا ہو گیا تھا تو لارا بغاوت کر کے اس سے پیچھا چھڑا سکتی تھی، لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔

لڑکی کو اس بات پر فخر تھا کہ ایک خوبصورت آدمی جس کے بال سفید ہو چلے تھے، ایک آدمی جو اس کے باپ کی عمر کا تھا، ایک آدمی جس کی تقریر پر جلسوں میں تالیاں بجتی تھیں اپنا وقت اور دولت اس پر صرف کرے، اسے اپنے ساتھ کنسرٹ اور ڈراموں میں لے جائے اور اس سے کہے کہ وہ اس کی پوجا کرتا ہے اور بقول لوگوں کے: ''اس کے ذہن کو تربیت دے رہا ہے۔''

جو کچھ بھی ہوا، وہ ابھی تک ایک لڑکی ہی تھی، بند بگھی میں کوچوان کی پیٹھ پیچھے یا آپیرا بکس میں تماش بینوں کی نظروں کے سامنے کوماردوسکی کے اظہار محبت نے جو وہ انتہائی جرات کے ساتھ کیا کرتا تھا اس کا دل موہ لیا تھا اور اس کے اندر خوابیدہ شیطان کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا تھا تا کہ وہ بھی اس کا جواب دے۔ لیکن یہ شرارت آمیز بات، لڑکیوں جیسی فریفتگی زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکی۔ اس پر بیزاری اور خوف کا جذبہ مستقل طور پر غالب آتا جا رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ روتی تھی، اسے مستقل دردسر کی شکایت رہتی تھی۔

وہ اس کی زندگی کے لئے ایک لعنت تھا، وہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ روزانہ وہ بار بار یہی سوچا کرتی تھی۔ وہ عمر بھر کے لئے اس کی لونڈی بن گئی ہے، اس نے اسے کس طرح اپنا مطیع بنا لیا؟ وہ اس کی خواہشات کیوں پوری کرتی ہے اور انتہائی بے شرمی کے ساتھ اس کی تفریح کا سامان کیوں مہیا کرتی ہے؟ کیا اس کی عمر کی وجہ سے؟ کیا اس لئے کہ اس کی ماں مالی اعتبار سے اس کی محتاج ہے؟ نہیں۔ نہیں۔ نہیں! یہ سب بکواس ہے۔

یہ خود لارا ہے جس نے اس پر قابو پا رکھا ہے۔ کیا وہ یہ نہیں دیکھتی کہ اسے اس کی کس قدر ضرورت ہے؟ اس کے خوفزدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کا ضمیر مطمئن ہے۔ یہ تو وہی ہے جس کو شرم آنی چاہیے اور اس خیال سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں لارا اسے چھوڑ نہ دے لیکن وہ ایسا کبھی نہیں کرے گی جیسا کہ کوماردوسکی اپنے ماتحتوں اور کمزور انسانوں سے برتاؤ کرتا ہے۔ اور کمزور اور کمینے لوگ طاقتوروں پر تسلط پا لیتے ہیں۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔ وہ غلط دلیلیں دینے کی عادی ہو گئی تھی، لیکن بعض وقت ایک مایوس کن دماغی کرب اس پر غالب آ جاتا تھا۔۔۔ اور وہ اسے برابر باہر لے جاتا رہا، اس کے چہرے پر نقاب پڑی ہوتی تھی۔ وہ اسے اس وحشت ناک ریستوران کے پرائیویٹ کمروں میں رات کا کھانا کھلانے کے لیے لے جاتا تھا جہاں داخل ہونے پر خدمتگاروں اور دوسرے لوگوں کی نگاہیں پڑتے ہی وہ اپنے آپ کو ننگا محسوس کرنے لگتی تھی۔ اور وہ ہمیشہ سوچا کرتی تھی: ''کیا ہم ہمیشہ انہی لوگوں کو ذلیل کرتے ہیں جن سے ہمیں محبت ہوتی ہے؟''

یہ پریسنیا کی بغاوت کا زمانہ تھا۔ گیشار خاندان کا فلیٹ باغیوں کے علاقہ میں تھا۔ ان کے گھر سے چند گز کے فاصلہ پر تیور اسٹریٹ پر قلعہ بندی کے طور پر ایک دیوار بنائی جا رہی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے پانی لا لا کر ڈال رہے تھے تا کہ دیوار زیادہ سے زیادہ پختہ اور مضبوط ہو جائے۔ قریب کا ایک احاطہ مزدوروں کی ملیشیا کی اجتماع گاہ کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ اس مرکز میں جو لڑکے گئے تھے لارا ان میں سے دو کو جانتی تھی۔ ان میں سے ایک نکا دوروف تھا۔

دوسرا لڑکا پاشا انتی پوف تھا جو ورزش گاہ کا طالب علم تھا اور اولیا وینا کی دادی تیورزینہ کے ساتھ رہتا تھا۔ تیورزینہ کے یہاں لارا جب پہلی بار اس سے ملی تھی تو اس نے محسوس کیا تھا کہ پاشا اس سے متاثر ہوا ہے۔ وہ لارا کو دیکھ کر اپنی مسرت پر قابو نہیں پا سکا اور لارا کے حسن و جمال کے بارے میں اپنے تاثرات بالکل اس بے تکلفی کے ساتھ ظاہر کرتا رہا جیسے موسم گرما کے دلکش مناظر، بادل اور جھیلیں اس کا موضوع سخن ہیں۔ لارا کو جب احساس ہوا کہ پاشا

اس سے اس حد تک متاثر ہے تو اس نے غیر شعوری طور پر اپنے اثر کو استعمال کرنا شروع کیا، لیکن پاشا کے بارے میں سنجیدہ رویہ اختیار کرنے میں لارا کو کئی سال لگ گئے۔ اس وقت تک پاشا پوری شدت سے یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ لارا کی محبت میں مبتلا ہے اور یہ محبت تا زندگی رہے گی۔

دونوں لڑکے بڑا خوفناک کھیل کھیل رہے تھے۔۔۔ یعنی جنگ۔۔۔ اور جنگ بھی ایسی کہ اس کی سزا جلاوطنی اور پھانسی سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتی تھی۔۔۔ تاہم جس طرح ان کی اونی ٹوپیاں ان کی پشت سے بندھی ہوئی تھیں اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ابھی بچے ہیں، ان کے ماں باپ زندہ ہیں اور ان کی نگرانی کرتے ہیں۔ لارا ان کے بارے میں اس طرح سوچ رہی تھی جیسے کوئی بڑا بچوں کے بارے میں سوچتا ہے۔

☆☆☆

انہیں پتہ چلا کہ عارضی قلعہ بندیوں پر کسی وقت بھی گولہ باری ہو سکتی ہے اور یہ کہ ان کا مکان خطرے میں ہوگا۔ اب یہ سوچنے کا وقت گذر چکا تھا کہ وہ ماسکو کے کسی دوسرے حصہ میں دوستوں کے ساتھ جا کر رہیں۔ علاقے کا محاصرہ کر لیا گیا تھا۔ اسی محاصرے کے اندر انہیں پڑوس میں کہیں پناہ ڈھونڈنی تھی۔ ان کے ذہن میں ہوٹل مونٹی نیگرو کا خیال آیا۔ پرانے تعلقات کا خیال کرتے ہوئے ہوٹل کے مالک نے انہیں کپڑوں کے اسٹور میں ٹھہرانے کا وعدہ کر لیا۔

ورکشاپ کے ملازمین کے ساتھ چونکہ خاندان کے افراد کا سا سلوک کیا جاتا تھا اس لئے وہ ہڑتال کے باوجود کام کرتے رہے لیکن ایک سرد اور بے جان سہ پہر کو دروازے پر گھنٹی بجی۔ کوئی شخص شکایات لے کر بحث کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس نے مالک کو بلانے کے لئے کہا۔ چند لمحہ بعد سلائی کا کام کرنے والی عورتیں اپنے کمرے میں واپس آ گئیں اور اپنی شالیں اوڑھ کر اوپر سے گرم لبادے پہننے لگیں۔

''کیا ہوا ہے؟'' مادام گیشار نے تیزی سے اندر آ کر پوچھا۔

''وہ لوگ ہمیں باہر بلا رہے ہیں، مادام، ہم نے ہڑتال کر دی ہے۔''

''لیکن۔۔۔ کیا میں نے کبھی تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے؟'' مادام گھبرا کر رونے لگی۔

''پریشان مت ہو، امیلیا کارلوونا۔ ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہم تمہاری بہت شکرگذار ہیں۔ یہ صرف تمہارا اور ہمارا معاملہ نہیں ہے۔ ہر ایک بلکہ ساری دنیا ایسا ہی کر رہی ہے۔ تم ہر شخص کی مخالفت تو نہیں کر سکتیں۔ یا کر سکتی ہو؟'' وہ سب کی سب چلی گئیں۔

رودیا اسکول میں تھا۔ لارا اور اس کی ماں بے مقصد طور پر اکیلے گھر میں ادھر ادھر چکر لگاتی رہیں۔ تاریک سڑک اور مکان کے کمرے ایک دوسرے کو حیرت سے تک رہے تھے۔

''چلو ماں، ہم دونوں اندھیرا ہونے سے پہلے ہوٹل چلی چلیں۔'' لارا نے اس کی خوشامد کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ نا، ماں۔ دیر مت کرو۔ ہمیں ابھی چل دینا چاہیے۔''

جب وہ لوگ باہر نکلے تو انہیں تازہ ہوا، اس قدر غیر مانوس معلوم ہوئی جیسے ہفتوں کی علالت کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ باہر برف سے ڈھکے ہوئے صاف شفاف میدان سے ملی جلی آوازوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ دور فاصلہ پر رائفلیں اور بندوقیں چلنے کی آواز آ رہی تھی جیسے ہر چیز چیتھڑے چیتھڑے ہوئی جا رہی ہو۔

''شاندار!'' لارا نے چلتے ہوئے سوچا۔ وہ اس وقت تک کومارووسکی کی شکل نہیں دیکھے گی جب تک یہ علاقہ شہر کے دوسرے حصوں سے کٹا ہوا ہے۔ اپنی ماں کی وجہ سے وہ اس سے قطع تعلق نہیں کر سکتی تھی۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی: ''ماں، مہربانی کر کے اس سے ملنا بند کر دو۔'' اگر اس نے ایسا کیا تو ساری بات کھل جائے گی۔

☆☆☆

گرومیکو بھائیوں کا مکان، چھوٹی سڑک کے کونے پر واقع تھا۔ الگزینڈر اور نکولائی علم کیمیا کے پروفیسر تھے۔ نکولائی غیر شادی شدہ تھا۔ الگزینڈر کی بیوی کا نام اینا ایوانوونا تھا جو شادی سے پہلے کروگر تھی۔ اس کا باپ لوہے کی کانوں کا مالک تھا۔ یورال میں یوریاتن کے قریب اس کی بہت بڑی جاگیر تھی جس میں کئی بے منفعت کانیں تھیں جو بیکار پڑی تھیں۔ ان دونوں بھائیوں کا مکان دو منزلہ تھا۔ اوپر کی منزل پر خواب گاہیں، اسکول کا کمرہ، مطالعہ کا کمرہ اور کتب خانہ، اینا ایوانوونا کی پرائیویٹ نشست گاہ اور تونیا اور یورا کے کمرے تھے۔ نچلی منزل استقبالیہ دعوتوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ یہ دونوں بھائی مہذب، مہمان نواز، آرٹ کے دلدادہ اور موسیقی کے عاشق تھے۔ وہ اکثر دعوتیں کرتے رہتے تھے اور اکثر شامیں موسیقی کی محفلوں میں گذرتی تھیں۔

موسیقی کی ایسی ہی ایک محفل جنوری 1906ء میں ہونے والی تھی۔ تیاریاں ایک روز قبل شروع ہو چکی تھیں۔ اینا کی خاص اور راز دار سہیلی شورا شلیشنگر صبح سویرے ہی وہاں پہنچ گئی تھی اور وبال جان بن کر رہ گئی تھی۔ وہ ایک طویل قد، دبلی پتلی، سیدھے سادھے

نقش و نگار کی عورت تھی۔ اس کا چہرہ کسی قدر مردوں جیسا تھا جسے دیکھ کر شہنشاہ کا چہرہ یاد آ جاتا تھا، شورا شلینگر کئی مرتبہ شادی کر چکی تھی لیکن وہ اپنے شوہروں کو طلاق دیتے ہی بھول جایا کرتی تھی اور کئی شادیوں کے باوجود اس کے اندر ایک طرح کی غیر شادی شدہ عورتوں کی سی سرد مہری پائی جاتی تھی۔
وہ تھیوسوفی کے عقیدہ پر قائم تھی جس کے مطابق ہر شخص بلا واسطہ روحانی وجدان سے خدا کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ شورا شلینگر علم الحساب جانتی تھی ماسکو کنزرویٹری کے مشہور ترین استادوں کے پتوں سے واقف تھی اور یہ جانتی تھی کہ کون کس کے ساتھ رہ رہا ہے، اور خدا جانے وہ کیا کچھ جانتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ زندگی کے تمام اہم موقعوں پر اسے ثالث یا منتظم کی حیثیت سے بلایا جاتا تھا۔ مقررہ وقت پر مہمان آنے شروع ہو گئے۔
حاضرین بہت جلد روحانی تفریح حاصل کرنے کے لئے بیٹھ گئے تا کہ جسمانی غذا کا لطف حاصل کرنے میں دیر نہ لگے۔ وہ لوگ قطاروں میں بیٹھ گئے۔ موسیقی، خشک اور اکتا دینے والی تھی اور اس میں کافی وقت لگ گیا۔ یورا، تونیا اور میشا گورڈن، جو اپنا آدھا وقت، گرومیکو کے یہاں گذارتا تھا، تیسری قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔
''ایگوردونا تمہیں اشارے کر رہی ہے۔'' یورا نے الگزینڈر سے کہا جو اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ الگزینڈر نے مڑ کر غصے سے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ شرماتے ہوئے وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا کمرے کے دوسری طرف گیا۔
''تم ایسی حرکت کیسے کر سکتی ہو، ایگوردونا! اچھا، اب بتاؤ کہ کیا گڑبڑ ہے؟ اچھا، اب جلدی سے بتاؤ کہ کیا معاملہ ہے؟''
ایگوردونا نے اس کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔
''کیا مونٹی نیگرو؟''
''ہوٹل!''
''اچھا، تو اس کا کیا معاملہ ہے؟''
''انہوں نے کہلوایا ہے کہ وہ فوراً واپس چلا جائے۔ اس کا کوئی عزیز مر رہا ہے۔''
''اچھا، تو اب لوگ مر رہے ہیں! میں سمجھا۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا، ایگوردونا۔ جب یہ کنسرٹ ختم ہو جائے گا تو میں انہیں بتادوں گا اس وقت تک میں ایسا نہیں کر سکتا۔''
''انہوں نے ہوٹل کے ایک خدمتگار کو گاڑی دے کر بھیجا ہے۔ وہ انتظار کر رہے ہیں۔ کوئی شخص مر رہا ہے۔ میں تم سے کہتی ہوں کیا تم نہیں سمجھ سکتے؟ وہ ایک عورت ہے۔''
کنسرٹ ختم ہونے پر تالیوں کی آواز بند ہونے سے پہلے ہی وہ موسیقاروں کے پاس گیا اور تشکیوچ سے کہا کہ اسے گھر بلایا گیا ہے۔ کوئی حادثہ ہو گیا ہے اور اب انہیں موسیقی ختم کرنی پڑے گی۔ پھر وہ حاضرین کی طرف مڑا:
''خواتین و حضرات! مجھے افسوس ہے کہ تین سازندوں میں سے ایک کو جانا پڑ رہا ہے۔ تشکیوچ کو ابھی کوئی بری خبر ملی ہے۔ خواتین و حضرات میں خدا حافظ نہیں کہوں گا۔ میں آپ سب سے رکنے کی درخواست کرتا ہوں۔۔۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔''
برفانی رات میں گاڑی میں بیٹھ کر گھومنے کی خاطر لڑکوں نے بھی اس کے ساتھ چلنے کی اجازت مانگی۔

☆☆☆

اگرچہ دسمبر کے بعد زندگی معمول پر آ گئی تھی لیکن گولیاں چلنے کی آوازیں اب بھی سنائی دیتی تھیں اور وہ مکانات جو آگ لگنے کے معمولی حادثات سے جل گئے تھے وہ بھی انہیں مکانات کی طرح نظر آتے تھے جو بغاوت کے دوران میں تباہ ہو گئے تھے اور اب تک سلگ رہے تھے۔
لڑکے اس سے پہلے کبھی گاڑی میں بیٹھ کر اتنے طویل سفر پر نہیں گئے تھے۔ دراصل سخت برفباری اور کہرے کی وجہ سے راستہ بہت زیادہ طویل ہو گیا تھا۔ الاؤ کا بل کھاتا ہوا دھواں، قدموں کی آواز اور برفانی گاڑیوں کی آوازوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خدا جانے کتنی دیر سفر کرتے رہے ہوں اور کسی خوفناک اور دور دراز مقام پر پہنچ گئے ہوں۔
اس وقت ڈاکٹر اس بے وقوف بڑھیا گیشار کو قے کرانے والی دوا دے رہا تھا اور اس کی انتڑیوں کو دھو کر صاف کر رہا تھا۔ اس کی ملازمہ گلاشا فرش صاف کرتے کرتے اور گندی بالٹیاں باہر لے جا کر صاف بالٹیاں اندر لاتے لاتے تھک گئی تھی۔
میشا اور یورا مادام گیشار کے کمرے کے باہر غلام گردش میں ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ الگزینڈر کا جو خیال تھا معاملہ اس سے بالکل مختلف نکلا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ موسیقار کی زندگی میں ایک صاف اور پر وقار قسم کا حادثہ ہو گا، لیکن یہ حادثہ تو نہایت ذلیل اور بدنام کر دینے والا تھا جس سے بچوں کا علیحدہ رہنا ہی ضروری تھا۔
مادام گیشار نے زہر پی کر نہیں، جیسا کہ برتن دھونے والی عورت کا خیال تھا، بلکہ آیوڈین پی کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ کمرے میں سبز اخروٹوں کی سی ترش اور خشک بو پھیلی ہوئی تھی۔ جالی کے پیچھے خادمہ فرش صاف کر رہی تھی اور بستر پر ایک

عورت نیم برہنہ لیٹی ہوئی تھی۔ وہ پانی، آنسوؤں اور پسینے میں تر بتر تھی۔ اس کے گیلے بال جم گئے تھے اور وہ ایک بالٹی پر جھکی ہوئی زور زور سے رو رہی تھی۔

لڑکے ایک دم واپس پلٹ گئے کیونکہ ان کے خیال میں اس عورت کی طرف نگاہ انتہائی بدتمیزی کی بات تھی۔ لیکن یورا جو کچھ دیکھ چکا تھا اس سے یہ حقیقت اس پر عیاں ہوگئی تھی کہ بعض تکلیف دہ حالات میں، دباؤ اور تکان کے لمحے میں، عورت وہ نہیں رہتی جیسا کہ اسے سنگ تراشی کے مجسموں میں دکھایا جاتا ہے بلکہ ایک ایسے پہلوان کے مانند نظر آتی ہے جس کے پٹھے پھولے ہوئے ہوں اور جو لنگوٹ باندھے ہوئے کشتی لڑنے کے لئے بالکل تیار ہو۔ آخر کار جالی کے پیچھے کسی کو پردے گرا دینے کا خیال آ گیا۔ وہ دونوں سخت گومگو کے عالم میں دروازے میں کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں، اس لئے وہ وہاں کھڑے ہوئے سامنے بڑے کمرے کی تاریکیوں میں گھور رہے تھے جہاں سے لیمپ ہٹا دیا گیا تھا۔ دیواروں پر تصویریں لٹک رہی تھیں۔ کتابوں کی ایک الماری میں موسیقی کی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک (میز پر) اخبار اور البمیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور کھانے کی میز کی دوسری طرف ایک لڑکی آرام کرسی پر ایک کڑھی ہوئی چادر اوڑھے ہوئے سو رہی تھی۔ اس نے کرسی کا سرہانا پکڑ رکھا تھا اور اس کا ایک رخسار اس پر ٹکا ہوا تھا۔ وہ یقیناً بہت زیادہ تھک گئی ہو گی جبھی تو اتنے شور وغل اور ہنگامے کے باوجود اسے نیند آ گئی۔

اسکرین کے پیچھے سے تشکیوچ کے بجائے ایک بھاری بھرکم لحیم شحیم آدمی نکلا جس کے چہرے سے خود اعتمادی ٹپک رہی تھی۔ وہ اپنے سر کے برابر بلندی پر لیمپ اٹھائے ہوئے تھا جسے اس نے میز کے قریب پہنچ کر اس کے بریکٹ میں جما دیا۔ روشنی سے لڑکی جاگ اٹھی۔ وہ اس شخص کو دیکھ کر مسکرائی، آنکھیں جھپکائیں اور انگڑائی لی۔

اجنبی کو دیکھ کر میشا چونک پڑا اور اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اس نے یورا کو آستین سے پکڑ کر اپنی جانب متوجہ کیا اور اس کے کان میں کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن یورا نے اس کی بات نہیں سنی۔ ''لوگوں کے سامنے اس طرح سرگوشی کرنا ٹھیک نہیں۔ آخر وہ کیا سوچیں گے؟''

اسی اثنا میں لڑکی اور اس شخص کے درمیان اشاروں ہی اشاروں میں باتیں ہوگئیں۔ ان کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا، صرف ان کی آنکھیں ہی ملیں۔ لیکن ایک نے دوسرے کو جو پیغام دیا اس میں جادو کا سا دہشت ناک اثر تھا جس نے لڑکی کو اس طرح متاثر کیا گویا وہ کٹ پتلی نچانے والا ہو اور لڑکی محض کٹ پتلی جو اس کے ہر اشارے کی پابند ہو۔

تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھیں چھوٹی پڑ گئیں اور اس کے ہونٹ عجیب طور سے کھلے لیکن اس کی تضحیک آمیز نظر کے جواب میں لڑکی نے سازشی انداز میں آنکھ ماری۔ دونوں کو خوشی ہوئی کہ معاملہ بخیر وخوبی طے ہو گیا۔۔۔ ان کا راز محفوظ رہا اور مادام گیشار نے خودکشی کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکام ہو چکی تھی۔

''کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو؟ وہ کون تھا!'' میشا نے یہ اس وقت کہا جب وہ باہر گلی میں آ گئے۔ یورا نے جو اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا کوئی جواب نہیں دیا۔

''یہ وہی ہے جس نے تمہارے والد کو شراب نوشی کی ترغیب دی اور آخر ان کو موت کے قریب پہنچا دیا۔ تمہیں یاد ہے۔۔۔ ٹرین میں میں نے تمہیں یہ بات بتائی تھی۔''

کرسمس پارٹی

سردیوں کے موسم کی بات ہے کہ الیگزینڈر نے اپنی بیوی اینا ایوانونا کو زمانہ قدیم کی بنی ہوئی کپڑوں کی ایک الماری دی جو اسے کہیں سے مل گئی تھی۔ یہ آبنوس کی بنی ہوئی تھی اور اتنی بڑی تھی کہ پوری کی پوری کسی ایک بھی دروازے سے۔ کان میں نہیں جا سکتی تھی، چنانچہ اسے علیحدہ علیحدہ حصوں میں مکان کے اندر پہنچایا گیا۔

مارکل نامی ایک مزدور اسے جوڑنے کے لئے آیا۔ پہلے تو کام ٹھیک سے ہوتا رہا لیکن جب صرف اوپر کے حصے پر لکڑی جڑنے کا کام باقی رہ گیا تو اس کے دل میں مارکل کی مدد کرنے کا خیال آ گیا۔ وہ الماری کے ایک تختے پر چڑھی ہی تھی کہ پاؤں پھسل گیا اور وہ دھڑام سے کنارے کے تختوں پر آ رہی۔ اس حادثہ کے بعد اینا پھیپھڑوں کی کمزوری کے عارضہ میں مبتلا ہوگئی۔ نومبر 1911ء کا پورا مہینہ اینا ایوانونا نے نمونیہ کے عارضہ میں گزارا۔

یورا، میشا گورڈن اور تونیا آنے والے موسم بہار میں ڈگری لینے والے تھے۔ یورا ڈاکٹری کی، اینا کی بیٹی تونیا قانون کی، اور میشا جو شعبہ فلسفہ کا طالب علم تھا، لسانیات کا گریجوایٹ بننے والا تھا، یورا کے ذہن میں ابھی کوئی شے واضح نہیں تھی، لیکن اس کے نظریات، اس کی عادات اور اس کے رجحانات سب واضح طور پر اس کے اپنے تھے۔

آرٹ اور تاریخ سے گو اسے گہرا لگاؤ تھا، تاہم پیشہ کے

انتخاب میں وہ کبھی نہیں جھجکا۔ اس کا خیال تھا کہ جس طرح پیدائشی زندہ دلی یا افسردگی کوئی پیشہ نہیں ہے، اسی طرح آرٹ بجائے خود بھی اب کوئی پیشہ نہیں رہا ہے۔ اسے طبیعیات اور نیچرل سائنس سے دلچسپی تھی اور اس کا ایمان تھا کہ آدمی کو اپنی عملی زندگی میں معاشرے کے لئے کوئی مفید کام ضرور کرنا چاہیے۔ اپنے چار سالہ کورس کے پہلے سال میں اس نے ایک پوری فصل چیر پھاڑ کے ایک کمرے میں کام کرتے گذاری جو یونیورسٹی کے زمین دوز حصے میں تھا۔

یورا ایک شریف الطبع انسان اور بہترین مصنف تھا۔ اسکول کے زمانہ ہی سے وہ زندگی کے موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا خواب دیکھا کرتا جس میں وہ مدفون دھماکہ خیز مادہ کی طرح ایسی تمام نمایاں اور موثر چیزیں جو اس نے زندگی میں دیکھی یا سوچی تھیں ضابطہ تحریر میں لانا چاہتا تھا، لیکن اس وقت وہ بہت کم عمر تھا اور کتاب تصنیف نہیں کر سکتا تھا لہٰذا اس کی جگہ اس نے شاعری شروع کر دی۔

یورا کو بخوبی اس امر کا علم تھا کہ اس کے کردار کو ڈھالنے میں اس کے ماموں کا کیا حصہ تھا۔ نکولائی آج کل لاسین میں قیام پذیر تھا۔ وہاں اس کی کتابیں روسی زبان میں شائع ہوئیں اور ان کے ترجمے بھی۔ ان کتابوں میں اس نے اپنے اس پرانے نظریہ کو نئے روپ میں پیش کیا کہ تاریخ بجائے خود ایک دوسری دنیا ہے جو کہ موت کے چیلنج کے جواب میں آدمی وقت اور یادداشت کی مدد سے بناتا ہے۔

میشا گورڈن پر ان نظریات کا یورا سے بھی زیادہ اثر تھا۔ ان نظریات ہی کے باعث اس نے یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں داخلہ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دینیات پر لیکچر بھی سنے اور بعد میں تو اس نے شعبہ دینیات میں منتقل ہو جانے پر بھی غور شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

نومبر کے آخر میں ایک رات یورا یونیورسٹی سے بہت دیر گئے گھر آیا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا، اس نے دن بھر کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ اس دن گھر میں سخت گھبراہٹ پھیلی رہی۔ اینا ایوانوونا پر بیماری کا دورہ پڑا۔ اس نے کہا ہے کہ یورا کو واپس آتے ہی اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ یورا فوراً ہی اس کی طرف چل پڑا۔

مریضہ نے پوری کوشش کے ساتھ بولنا شروع کیا: ''وہ مجھے بستر مرگ کی رسم اصطباغ کی ادائیگی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ موت میرے سر پر منڈلا رہی ہے۔ کسی وقت بھی میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گی۔ تم جب دانت نکلوانے جاتے ہو تو ذرا ڈرتے ہو۔ لیکن یہ صرف ایک دانت ہی نہیں۔ تمہاری پوری زندگی ہے جو کھینچ کر باہر نکالی جاتی ہے۔ اور یہ کیا ہے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ میں تو بالکل عاجز آ چکی ہوں۔ مصیبت زدہ ہوں۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لڑی بہہ رہی تھی۔ یورا کچھ نہیں بولا۔ تھوڑے وقفے کے بعد اینا نے پھر بولنا شروع کیا: ''تم ہوشیار ہو۔ اعلیٰ صلاحیتیں رکھتے ہو۔ ذرا مجھے دلاسا دو۔''

یورا نے کہا: ''لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں کیا کہوں۔'' وہ کرسی پر بیٹھا بے چین سا ہو رہا تھا۔ کرسی سے اٹھا۔ کمرے میں چند قدم تک چلا اور پھر آ کر بیٹھ گیا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ تم کل تک ٹھیک ہو جاؤ گی۔ تم مرض کے خطرناک ترین مرحلہ سے گذر چکی ہو۔ اور پھر موت ـــ یہ تو شعور کی بقا اور یوم حشر پر ایمان کا دوسرا نام ہے۔

''قیامت۔ یوم حشر! کمزور انسانوں کی ہمت بندھانے کے لئے ہے۔ اس کی جس طرح تبلیغ کی جاتی ہے میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے زندوں اور مُردوں کے متعلق یسوع مسیح کے الفاظ کو ہمیشہ ایک مختلف پیرائے میں سمجھا ہے۔ ہزار ہا سال میں جینے اور مرنے والے ان اربوں کھربوں انسانوں کے لئے آپ ایک مقام پر جگہ کیسے نکال سکتے ہیں۔ یہ ساری کائنات اتنی وسیع تو نہیں جس میں یہ تمام سما جائے۔ او میرے خدا۔۔۔ اگر ایسا ہوا تو قیامت کا مطلب ہی خبط ہو جائے گا۔ خدا کے نیک اور بزرگ بندے تو وہاں جانوروں کی سی زندگی گذارنے والے بدبختوں کے پاؤں تلے روندے جائیں گے۔''

''لیکن زندگی خواہ اس کی کوئی بھی صورت ہو، خواہ یہ کتنی مختلف شکلیں اختیار کیوں نہ کرے، ہمیشہ کائنات کو لبریز رکھتی ہے اور بار بار جنم لیتی رہتی ہے۔ تمہیں تشویش اس بات پر ہے کہ اس موت کے بعد دوسرا جنم لیا تھا، ہاں البتہ تم نے اسے محسوس نہیں کیا۔

''کیا تمہیں تکلیف ہو گی؟ بالفاظ دیگر تمہارے شعور کا کیا حشر ہو گا؟ لیکن یہ شعور ہے کیا بلا؟ آؤ اس کا جائزہ لیں۔ آپ شعوری طور پر یا ارادتاً اگر سونے کی کوشش کریں گے تو بے خوابی کا شکار ہوں گے۔ اس طرح اگر آپ کو ہر وقت اپنے ہاضمہ کا احساس ہو گا تو آپ کا ہاضمہ یقیناً خراب ہو جائے گا۔ یہ شعور ہمارے جسم و جان اور روح کے لئے زہر ہلاہل کا درجہ رکھتا ہے۔ شعور ایک روشنی ہے جو باہر اور سامنے کا راستہ دکھاتی ہے تاکہ ہم ٹھوکر نہ

کھائیں۔ یہ انجن کی ہیڈ لائٹ کی طرح ہے۔ اسے ذرا اندر کی طرف اپنی طرف موڑ کر تو دیکھئے فوراً حادثہ پیش آ جائے گا۔

''پس تمہارے شعور کا کیا ہوگا؟ اچھا! تم ہو کیا؟ اپنے اندر تمہیں کس چیز کا احساس اور شعور ہے؟ گردوں کا؟ جگر کا؟ خون کی رگوں کا؟ نہیں۔ کتنے ہی پرانے زمانے تک کہ یادداشت سے کام لو۔ نتیجہ یہی ہوگا کہ تمہیں اپنے بارے میں کسی دوسری بیرونی اور واضح علامت کی بنا پر اپنی شناخت کا معیار قائم کرنا ہوگا۔ یہ تمہارے ہاتھ ہو سکتے ہیں۔ تمہارا اپنا خاندان ہو سکتا ہے۔ تمہاری روح۔ یہ ہے تمہاری حقیقت۔ یہ ہے جس پر تمہاری ساری حیات کے دوران تمہارے شعور کی زندگی کا انحصار رہا۔

''اور اب ایک آخری نقطہ رہ گیا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ موت نام کی کوئی چیز نہیں ہے، موت کا ہم سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

''سینٹ جان نے کہا ہے کہ موت کا کوئی وجود نہیں۔ اس کا استدلال بہت سیدھا اور صاف ہے۔ موت اس لئے نہیں آئے گی کہ ماضی بہت اچھا ہے۔ اس کو تقریباً اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ موت نہیں آئے گی کیونکہ وہ پہلے ہی آ چکی ہے۔ ختم ہو چکی ہے۔ یہ پرانی بات ہے اور ہم اس سے تنگ آ چکے ہیں، ہمیں کسی نئی چیز کی ضرورت ہے اور وہ نئی چیز ابدی اور لافانی زندگی ہے۔''

وہ تقریر کرتے ہوئے کمرے میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا تھا۔ اس نے بستر کے قریب جا کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور کہا ''سو جاؤ۔'' اور چند ہی لمحات کے بعد وہ واقعی سونے لگی۔

اگلے دن ایوانو ودنا کی حالت بہتر ہوگئی۔

وہ اکثر یورا اور اپنی بیٹی تونیا کو بلا لیتی۔ اور ہر بار مسلسل گھنٹوں تک ان سے اپنے بچپن کی باتیں کرتی جو اس نے کوہ یورال میں دریائے رینوا کے کنارے اپنے دادا کی واری کینو کی جاگیر پر گذارا تھا۔ یورا یا تونیا میں سے کسی نے بھی وہ جگہ نہیں دیکھی تھی تاہم اینا کی باتیں سن سن کر یورا با آسانی اس دس ہزار ایکڑ کے اس گھنے اور تاریک جنگل کا تصور کر سکتا تھا۔ یورا اور تونیا نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ باقاعدہ شام کا لباس زیب تن کرنے کا فیصلہ کیا۔

27 دسمبر کو وہ یہ ملبوسات سوین ٹیٹسکی کی کرسمس پارٹی میں پہننے والے تھے۔ ابھی انہوں نے یہ کپڑے اپنے جسم سے اتارے بھی نہیں تھے کہ ایگر رودنا وہاں آئی اور کہا کہ وہ اینا ایوانو ونا کے پاس جائیں۔ دونوں نئے کپڑوں میں ہی اس تک چلے گئے۔ ''معلوم ہے میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟ لیکن یورا پہلے میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''اینا ایوانو ونا! مجھے معلوم ہے۔ تمہارا دونوں کا خیال ہے کہ مجھے اس وراثت سے انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ذرا ٹھہرو۔

''ہاں تو پہلی بات تو یہ ہے کہ وکیل تو یہی چاہتے ہیں کہ میرے والد ژواگو نے جو ترکہ چھوڑا ہے اس کی تقسیم کے لئے مقدمہ بازی ضرور ہو، کیونکہ میرے والد اپنی جاگیر کی صورت میں کافی دولت چھوڑ گئے ہیں جس سے وکلا بخوبی فیس وصول کر سکتے ہیں۔ اس کے سوا میرے والد نے اور کوئی ورثہ نہیں چھوڑا۔ قرضوں اور گھپلوں کے سوا اور کچھ نہیں۔''

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی جبکہ میری والدہ زندہ تھیں میرے والد کی ایک سنکی شہزادی۔۔۔ استولیونو دوا ایز یکی پر فریفتہ ہو گئے۔ اس خاتون کے بطن سے میرے والد کا ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام ایوگراف ہے۔ اور اس کی عمر دس سال ہے۔''

''پھر بھی تمہیں اس سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' اینا ایوانو ونا نے کہا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟'' اس نے پھر ایک مرتبہ پوچھا اور فوراً ہی کہنے لگی۔ ''اگر میں مر جاؤں تو تم دونوں ساتھ ساتھ رہنا۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہو، شادی کر لینا۔ لو، بس اب تمہاری منگنی ہو گئی۔'' اتنا کہہ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

☆☆☆

1906ء کا موسم بہار تھا اور لارا کو ماردوسکی کے تعلقات کو چھ مہینے گذرے تھے لیکن اتنی ہی مدت میں وہ تنگ آ چکی تھی۔ کوماردوسکی جب مناسب سمجھتا احتیاط سے اس کی غلطی کی یاد اسے دلا دیا کرتا۔ اس طرح کی باتیں لارا کو ایک ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ اور وہ خود کو نفسانی ہوس کے ایک بھیانک خواب میں ڈوبتا ہوا پاتی تھی۔ شب میں اس پر جو پاگل پن طاری ہوتا، جس طرح وہ خود کو اس کے حوالے کر دیتی تھی وہ اس طرح ناقابل یقین تھا جیسے کہ جادو۔ اس حالت میں کوئی منطق کام نہیں کرتی تھی۔ تیز کنک نقرئی قہقہوں میں بدل جاتی تھی اور چھیڑنے والے کے ہاتھوں کو وہ شکر گذاری کے عالم میں اپنے نازک ہونٹوں سے چوما کرتی تھی۔ ایک دن وہ تاریخ کی کلاس میں بیٹھی موسم گرما کے تصور میں گم تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ گرما میں اسکول یا گھر پر پڑھائی کی مصروفیت بھی اسے کوماردوسکی سے نہ بچا سکے گی تو اس نے اچانک ایک نیا فیصلہ کیا جس نے اس کی ساری زندگی کا رخ ہی موڑ کر رکھ دیا۔ اس دن موسم ذرا گرم تھا اور طوفان آنے والا تھا۔

کلاس میں نپولین کی مصر پر چڑھائی سے متعلق پڑھایا جارہا تھا۔ ایک دم آسمان پر تاریکی پھیل گئی جیسے بجلی کی چمک اور کڑک نے ایک لمحہ کے لئے کاٹ کر رکھ دیا۔ گرد وغبار کا ایک بادل کمرہ میں گھس آیا اور اس کے ساتھ بارش کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی۔ اتنے میں کھڑکیاں بند کر دی گئیں۔ شہر میں گرد آلود غلیظ بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لارا نے کاپی میں سے ایک ورق پھاڑ کر نکالا اور اپنی برابر والی لڑکی نادیا کولوگریوووا کے نام پرچہ لکھا: ''نادیا۔ میں اپنی والدہ سے الگ رہنا چاہتی ہوں۔ بچے پڑھانے کی کوئی ایسی ملازمت دلانے میں میری مدد کریں جس سے میں زیادہ سے زیادہ تنخواہ پاسکوں۔ تم متعدد امیروں کو جانتی ہو۔''

نادیا نے اس کے جواب میں لکھا: ''ہمیں لیپا کے لئے ایک معلمہ کی تلاش ہے۔ تم ہمارے ہاں کام کیوں نہیں کرتیں؟ بہت اچھا رہے گا۔ تم خوب جانتی ہو کہ میرے والدین تمہیں کتنا پسند کرتے ہیں۔''

☆☆☆

لارا نے کولوگریووف کے خاندان میں تین سال ایسے گذارے جیسے وہ سنگین دیواروں میں قلعہ بند ہو کر بیٹھی تھی۔ کسی نے اسے پریشان نہیں کیا۔ اور تو اور اس کی ماں اور بھائی بھی اس سے دور رہے جن سے اس کے تعلقات ذرا کشیدہ ہو گئے تھے۔

اورانتی کولوگریووف ایک بڑا کاروباری آدمی تھا۔ اسے زوال پذیر نظام سے دوہرا بیر تھا۔ ایک رئیس کی حیثیت سے کہ وہ سرکاری خزانہ سے بھی زیادہ دولت جمع کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے اس لئے کہ وہ نچلے طبقہ سے ابھر کر امارت کے انتہائی عروج پر پہنچا تھا۔ وہ اپنے گھر پر ایسے انقلابیوں کو پناہ دیتا پولیس جن کی تلاش میں پھرتی۔ لوگ لطیفے کے طور پر یہ کہا کرتے تھے کہ وہ اس نظام کو بدلنے کی خاطر خود ہی اپنے کارخانوں میں ہڑتالیں کراتا ہے۔ اورانتی بہترین نشانہ باز اور ماہر شکاری تھا۔ 1905ء کی سرما میں اس نے سریبریانی کے گھنے جنگل اور جزیرہ لوسن جا کر مزدوروں کے ملیشیا کو رائفل چلانے کی تربیت دی تھی۔

شوہر بہترین آدمی تھا تو بیوی سرافیما فلی پوونا بھی کسی طرح کم نہ تھی۔ لارا ان دونوں کی مداح تھی اور ان کی بہت عزت کرتی تھی۔ ادھر اس خاندان کے سب افراد لارا سے محبت کرتے تھے۔ ایک دن اس کا بھائی رودیا اس سے ملنے آیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی جماعت کے کیڈٹوں نے اکیڈمی کے سربراہ کو الوداعی تحفہ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور آپس میں چندہ ڈال کر رقم جمع کی اور اس کے حوالے کر دی مگر وہ تحفہ خریدنے کے بجائے یہ ساری رقم دو دن ہوئے جوا کھیل کر ہار آیا۔ اتنا کہہ کر وہ دھڑام سے آرام کرسی پر آ گرا اور رونا شروع کر دیا۔

لارا خاموش بیٹھی بھائی کی رام کہانی سنتی رہی۔ وہ سسکیاں لے کر کہہ رہا تھا۔ ''کل رات میں وکتور ایپولی تووچ سے ملنے گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر تمہاری بہن چاہے تو۔ اس نے کہا کہ گو تم اب ہم میں سے کسی سے محبت نہیں کرتی ہو، تاہم اس پر اب تک تمہارا اثر ہے۔ میرے لئے یہ کتنا اہم ہے۔ بڑی شرم کی بات ہے۔ میری وردی کی عزت خطرے میں ہے۔ تم اس سے ملنے آ جاؤ۔ اتنی سی رقم مانگنا کوئی بری بات نہیں۔''

''تمہاری جان۔۔۔ تمہاری وردی کی لاج۔'' لارا نے اس کے الفاظ غصہ کے ساتھ دہراتے ہوئے کہا ''اور میں چونکہ وردی میں نہیں ہوں اس لئے میری کوئی عزت ہی نہیں۔ کیا تمہیں احساس ہے کہ وہ تمہیں کس مقصد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ میں نے برسوں کی مشقت اور جدوجہد سے اپنے لئے جو کچھ کیا ہے وہ اب تم آ کر ایک لحظہ میں تباہ کرنا چاہتے ہو۔ تم جاؤ جہنم میں۔ جاؤ گولی مار کر خودکشی کر لو۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ آخر تمہیں کتنی رقم چاہیے؟''

''صرف 690 روبل۔ یوں سمجھ لو پورے سات سو۔''

ذرا توقف سے اس نے کہا۔ ''رودیا! تم پاگل ہو گئے ہو۔ معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم نے سات سو روبل جوا کھیل کر ہار دیئے ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ رو پڑی اور پھر سرد مہری کے ساتھ اس سے مخاطب ہوئی جیسے کسی اجنبی سے بات کر رہی ہو۔ ''اچھا۔ میں کوشش کروں گی۔ کل آؤ۔ اور اپنا وہ ریوالور بھی لیتے آنا جس سے گولی چلا کر تم خودکشی کرنے والے تھے۔ یہ ریوالور ہمیشہ کے لئے میرے حوالے کر دینا۔ اور یاد رکھو اس میں کافی گولیاں ہونی چاہئیں۔'' اس نے کولوگریووف سے یہ رقم لے لی۔

☆☆☆

کولوگریووف کے ہاں ملازمت کے ساتھ لارا نے اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور جسمانی ورزش کی تعلیم کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس کے بعد اس نے یونیورسٹی کورس لے لئے۔ یہاں بھی اس کی رفتار بہت اچھی رہی۔ اور اب آئندہ سال 1912ء میں اسے اعلیٰ ڈپلومہ ملنے والا تھا۔

1911ء کے موسم بہار میں اس کی شاگرد لیپا بھی جسمانی ورزش کے اسکول سے گریجوایٹ بن کر نکلی۔ اس دولتمند گھرانے میں لارا خاندان کے ایک فرد کی طرح رہتی تھی۔ اور کسی نے اسے قرضہ کی ادائیگی کے لئے یاد دہانی نہیں کرائی۔ دراصل انہیں یہ

قرضہ یاد ہی نہیں رہا تھا۔ اگر اس کے کچھ خفیہ اخراجات کا چکر نہ ہوتا تو شاید وہ یہ قرض کبھی کی ادا کر چکی ہوتی۔

وہ پاشا کے باپ کو جو سائبیریا میں جلاوطنی کے دن کاٹ رہا تھا ہر مہینے باقاعدگی کے ساتھ ایک رقم بھیجا کرتی۔ مگر لطف یہ کہ پاشا کو اس کی خبر تک نہیں تھی۔ پاشا لارا سے تھوڑا چھوٹا تھا۔ وہ لارا کو جنون کی حد تک چاہتا تھا اور اس کی معمولی معمولی خواہش پر اپنی نظریں بچھانے کے لئے بے چین رہتا تھا۔

1911ء کے موسم گرما میں لارا آخری بار کرلوگر یووف کے ساتھ ڈیلانٹکا گئی۔ اسے اس جگہ سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ اس کے مالکوں سے بھی زیادہ اس کی شیدا تھی۔ لارا پٹڑی کے ساتھ ساتھ ایک پگڈنڈی پر چلتے چلتے کھیتوں میں مڑ گئی اور اپنے گرد پھیلی ہوئی پھولوں کی مہک میں بسی ہوئی فضا میں ایک لمبی سانس لی۔

لارا نے محسوس کیا کہ اس کی پوزیشن بہت غلط اور پریشان کن ہے۔ وہ کولوگر یووف کے خاندان اور خود اپنے آپ سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ مگر اس سے پہلے وہ ان کا قرضہ اتار دینا چاہتی تھی اور فی الحال قرضہ اتارنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک یرغمال کی طرح بند ہے اور یہ سب بیوقوف رودیا کے باعث۔

جب یہ لوگ شہر واپس گئے تو لارا کی الجھنوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ اب پاشا سے بھی اس کی دو دو چونچیں ہونے لگیں۔ ادھر پاشا میں کچھ خود اعتمادی پیدا ہو رہی تھی۔ اسی کیفیت میں اس نے 1911ء کے کرسمس کے دنوں میں ایک مہلک فیصلہ کیا۔ وہ کولو گریووف کے ہاں سے فوراً چلی جائے گی اور آزادانہ زندگی بسر کرے گی اور کومارووسکی سے روپیہ لے گی۔

یہ سوچتے ہی وہ 27 دسمبر کی رات کو پتر ووکا اسٹریٹ کی طرف چل پڑی۔ رودیا کا بھرا ہوا پستول اس کے پاس تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اگر کومارووسکی نے انکار کیا یا اس کی بے عزتی کرنے کی کوشش کی تو وہ اسے گولی مار دے گی۔ سجے سجائے بازاروں میں وہ غضبناک شیرنی کی طرح چل رہی تھی۔

لارا کومارووسکی کے گھر پہنچی تو ایما اس کا اوورکوٹ اتارنے کے لئے بڑھی ہی تھی کہ لارا نے چیخ کر کہا ''اسے ہاتھ نہ لگانا۔'' ایما نے اسے بتایا کہ وکٹور باہر گیا ہوا ہے۔ اور وہ اس کا انتظار کرے۔ لیکن وہاں تاب انتظار کہاں تھی۔ ''میں جلدی میں ہوں۔ وہ کہاں ہے؟'' لارا نے پوچھا۔

''وہ ایک کرسمس پارٹی میں گیا ہوا ہے۔'' کاغذ کا ایک پرزہ ہاتھ میں لئے ہوئے جس پر پتہ لکھا ہوا تھا، لارا اس مانوس اور اداس زینہ سے اتری اور فلور ٹاؤن میں سوین تسکی کے مکان کی طرف چل پڑی۔

اب اس نے اپنے گرد نظر ڈالی تو محسوس کیا کہ شدید سردی پڑ رہی ہے۔ رات کا وقت ہے۔ سرما شباب پر ہے۔ یہ شہر ہے۔ سڑکیں اور بازار پوری طرح برف پوش ہیں۔ اس کے لئے سانس تک لینا مشکل ہو گیا۔ یخ بستہ ہواؤں کے جھونکے اس کی سموری ٹوپی اور چہرے سے آ کر بری طرح ٹکرا رہے تھے۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ سنسان بازاروں اور سستے چائے خانوں کے گرد دروازوں کے سامنے سے گزرتی ہوئی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔

کیمرگر اسٹریٹ میں آ کر اچانک لارا رک گئی۔ ''میں اور نہیں چل سکتی۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اوپر جا کر اسے سب کچھ بتا دوں گی۔'' اور یہ کہتے ہی وہ دروازے میں داخل ہو کر زینہ چڑھنے لگی۔

پاشا پارٹی میں جانے کے لئے جلد از جلد لباس پہن کر تیار ہونے کی فکر میں تھا۔ اس نے فوراً محسوس کر لیا کہ لارا کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔ پاشا گھبرا کے اس کے قریب آیا اور پوچھا۔ ''کیوں خیریت تو ہے۔ کیا بات ہے۔''

''پاشا! سنو!'' لارا بولی: ''میں سخت مشکل میں ہوں۔ تمہیں میری مدد کرنی چاہیے۔ یہ بڑا سنگین معاملہ ہے۔ میں ہر وقت خطرہ میں ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تباہی سے بچی رہوں تو پھر ہمیں اب اپنی شادی میں ذرا دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

''تم جب کہو میں تیار ہوں۔ لیکن اب صاف بتا دو۔ تم پریشان کیوں ہو؟ دیکھو۔۔۔ یہ پہیلیاں بجھوا کر مجھے دکھ مت پہنچاؤ۔'' انہوں نے ادھر ادھر کی اور بہت سی باتیں کیں، جن کا لارا کی مشکلات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

☆☆☆

اس سال موسم سرما میں یورا یونیورسٹی کے گولڈ میڈل کے مقابلہ کے لئے آنکھ کے پردے کے اعصابی عناصر پر ایک سائنسی مقالہ لکھ رہا تھا۔ تونیا اور یورا برف میں چلنے والی کرایہ کی گاڑی پر سوار سوین تسکی کی کرسمس پارٹی میں جا رہے تھے۔ وہ چھ سال تک ایک ہی گھر میں اپنے بچپن اور عنفوان شباب کا زمانہ گذار چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک دوسرے کے متعلق انہیں ہر بات کا علم تھا۔ اس وقت وہ گاڑی میں خاموش بیٹھے تھے۔ مارے سردی کے دانت سے دانت بج رہے تھے۔

ماسکو میں کرسمس کی گہما گہمی شباب پر تھی۔ کرسمس کے درخت

موم بتیوں سے جگمگ جگمگ کر رہے تھے اور رنگ برنگ لباس پہنے مہمان آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔
سوین تسکی کے ہاں عرصہ دراز سے کرسمس پارٹی کا ایک ہی لگا بندھا طریقہ چلا آ رہا تھا۔ دس بجنے کے بعد جبکہ بچے گھروں کو چلے جاتے کرسمس کے روایتی اور آرائشی درخت کو دوسروں کی خاطر دوبارہ روشن کیا جاتا اور پھر اس پارٹی کا ہنگامہ ہاؤ ہو علی الصبح تک جاری رہتا۔ سنجیدہ قسم کے لوگ ایک کمرے میں بیٹھ کر تاش کھیلتے۔
ادھر لارا پارٹی کے آغاز سے اب تک بال روم میں تھی۔ نہ اس نے شام کا لباس پہن رکھا تھا اور نہ وہ کسی کو وہاں جانتی تھی۔ تاہم وہ وہیں رہی۔ کبھی کوکا کورنا کوف کے ساتھ ایسے رقص کر لیتی جیسے سوتے میں چل رہی ہے۔ اور کبھی منہ اٹھا کر کمرہ کے اندر جدھر جی میں آتا گھومنے لگتی۔ ایک آدھ مرتبہ وہ کچھ تذبذب کے عالم میں مہمانوں کی نشست گاہ کے سامنے بھی ذرا دیر کے لئے رکی۔ اس امید میں کہ شاید کومار دوسکی جو دروازے کی جانب منہ کئے بیٹھا تھا اسے دیکھ لے، لیکن اس نے بھی اپنے تاش کے پتوں سے نگاہ نہیں اٹھائی۔ پتے اس کے بائیں ہاتھ میں تھے اور چہرہ پتوں کی اوٹ میں۔ مارے ندامت اور غصہ کے لارا کا دم گھٹنے لگا۔ ایک لڑکی جس سے لارا واقف تھی، بال روم سے دوسرے کمرہ میں گئی۔ کومار دوسکی نے اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جس کا مطلب لارا خوب سمجھتی تھی۔ یہ لڑکی کومار دوسکی کی اس نظر کو بھانپ کر مارے خوشی کے کچھ جھینپ سی گئی، لیکن لارا کا منہ شرم اور غصہ سے سرخ ہو گیا۔ اس کے بعد لارا کی نظروں میں کومار دوسکی سے اپنے تعلقات کی تصویر اس طرح پھرنے لگی جیسے وہ ان واقعات کو آئینہ میں دیکھ رہی ہو۔ اس نے بڑے ضبط سے کام لیا اور بال روم میں چلی گئی۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ یورا کے کان گونجنے لگے۔ چائے کے وقفہ کے بعد پھر رقص شروع ہو گیا۔ کرسمس کے بوٹے پر سے موم بتیاں جل جل کر گر رہی تھیں، مگر موم بتیوں کو بدلنے کی اب کسے فکر تھی۔

اچانک اندر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ہر کوئی مڑ کر اس بھاری پردہ کی طرف دیکھنے لگا جو بال روم اور مہمان خانہ کے درمیان دروازے پر پڑا ہوا تھا۔ ایک لمحہ تک مکمل سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد ہنگامہ شروع ہو گیا۔ ''اس نے کیا کیا ہے؟ اس نے کیا کیا ہے؟'' کومار دوسکی بار بار مایوسی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ ''یوریا، یوریا، مجھ سے کہہ دو کہ تم زندہ ہو۔'' مسز کورنا کوف رو رو کر کہہ رہی تھی۔ اس پر ہسٹریا کی سی کیفیت طاری تھی۔

''وہ رہی ذلیل عورت، وہ رہی، میں تیری آنکھیں نکال لوں گی۔ تم نے کیا کہا کومار دوسکی؟ تم؟ اس نے تم پر گولی چلائی تھی؟''

یورا دم بخود تھا۔ پھر یہی لڑکی! اور پھر ایسے غیر معمولی حالات میں! اور پھر وہی سفید بالوں والا آدمی۔ لیکن اس مرتبہ یورا کو معلوم تھا کہ وہ کون تھا۔۔۔! ایک معزز وکیل کومار دوسکی جس کا اس کے باپ کی جاگیر سے کچھ تعلق تھا۔ تو اس لڑکی ہی نے گولی چلائی تھی؟ بے چاری بری طرح پھنس گئی۔ وہ کس قدر حسین تھی! اور وہ گنوار آدمی جو اس کی بانہیں مروڑ رہے تھے جیسے وہ کوئی عام چور ہو!
لیکن ایک دم وہ سمجھ گیا کہ وہ غلطی پر تھا۔ لارا کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ لوگ اسے پکڑ کر اٹھائے ہوئے نزدیک کی آرام کرسی پر لے جا رہے تھے جہاں وہ بے دم ہو کر گر گئی۔
یورا بھاگ کر اس کے پاس جانے والا تھا لیکن مسز شوتیکا ئیا اور تونیا اس کی طرف آ رہی تھی۔ ان کے چہرے سفید پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر اپنا کوٹ اٹھا لے۔ گھر سے کوئی اطلاع ہے اور فوراً واپس جانا ہے۔
گھر پہنچ کر وہ اپنا ایوانو ونا کو زندہ نہ دیکھ سکے۔ جب وہ سیڑھیوں سے بھاگتے ہوئے اس کے کمرے میں پہنچے تو اسے مرے ہوئے دس منٹ ہو چکے تھے۔ موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی تھی جو پھیپھڑوں کی خرابی کا نتیجہ تھا۔ کئی گھنٹے تک تونیا روتی رہی۔ اگلے روز اس کی حالت پرسکون ہو گئی۔ لیکن جب بھی بولنے کی کوشش کرتی صدمہ اس پر غالب آ جاتا تھا اور وہ پھر چیخنا شروع کر دیتی جیسے اس پر آسیب کا اثر ہو گیا ہو۔
یورا ایک روحانی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ دس سال قبل جب اس کی ماں مری تھی تو اس وقت وہ بچہ ہی تھا۔ اسے اب تک یاد تھا کہ وہ کیسے رو رہا تھا۔ غم اور خوف نے اس پر تسلط پا لیا تھا۔ اب معاملہ بالکل مختلف تھا۔ ورزش کے اسکول اور یونیورسٹی میں بارہ برس گزارنے کے بعد یورا نے اعلیٰ ادب اور آسمانی صحیفوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے پرانی روایات، شاعری، تاریخ اور نیچرل سائنس بھی پڑھی تھی۔ اب اسے کسی چیز کا خوف نہیں تھا۔ نہ وہ زندگی سے خائف تھا اور نہ موت سے۔ اپنی ماں کے جنازہ کی نماز کا اس پر جو کچھ بھی اثر ہوا تھا اینا ایوانو ونا کے جنازے کی نماز کا اثر اس سے بالکل مختلف تھا۔
دن بہت اداس تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنازے کے لیے ہی یہ دن بنا ہے۔ راستے پر جمی ہوئی برف، اور تاریک درخت سب کے سب ماتم کناں دکھائی دے رہے تھے۔ اسی قبرستان میں یورا

کی ماں کو دفنایا گیا تھا لیکن وہ کئی سال سے ادھر نہیں آیا تھا۔ اس نے ماں کی قبر کی جانب منہ کیا اور آہستہ سے اس کے منہ سے ''ماں'' نکل گیا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس نے برسوں پہلے اپنی ماں کی موت کے بعد اسے پکارا تھا۔ تدفین کے بعد یہ لوگ منتشر ہونے لگے۔ تونیا سیاہ ماتمی لباس میں کتنی پیاری دکھائی دے رہی تھی۔

یورا نے محسوس کیا کہ یہ تو وہی میدان ہے جہاں اس کی ماں کے انتقال اور تدفین کے بعد اس رات کو زبردست برفانی طوفان آیا تھا۔ وہ سب سے آگے آگے اکیلا چل رہا تھا۔ اس نے آج پہلے سے بھی زیادہ واضح طور پر محسوس کیا کہ آرٹ کے کبھی ختم نہ ہونے والے اور مسلسل مقاصد ہیں۔ آرٹ ہمیشہ سے عالمانہ انداز میں غور کرنے کا عادی ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں ہمیشہ ایک نئی زندگی کو جنم دیتا ہے۔ دنیا کا عظیم ترین اور سچا آرٹ سینٹ جان کے الہام سے کسی طرح کم نہیں۔

محاذ جنگ

لارا فیلیسیا تا کے بستر پر بخار میں نیم بیہوش پڑی تھی۔ نشست کے ایک چھوٹے کمرے میں کومارد وسکی غصہ کے عالم میں ٹہلتے ہوئے زور زور سے پیر پٹخ رہا تھا جیسے وہ وہاں مہمان نہیں بلکہ اپنے ہی گھر میں ہو۔ وہ انتہائی غصہ میں تھا۔ دل و دماغ متضاد قسم کے جذبات کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ بدنامی! بے عزتی! وہ ذلیل ہو چکا تھا۔ اس کی پوزیشن خطرے میں تھی۔ اس واقعہ سے اس کی عزت پر حرف آئے گا۔ اسے ہر قیمت پر افواہوں کو روکنا چاہیے۔

اس کی گھبراہٹ کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ وہ پھر ایک مرتبہ اس سنکی اور من چلی لڑکی میں کشش محسوس کر رہا تھا۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اسے ہر صورت میں اس کی مدد کرنی چاہیے۔ معاملہ جتنا آگے بڑھے گا اس میں اتنی ہی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ انہیں یہ بات ثابت کرنی پڑے گی کہ لارا کورنا کوف کو نہیں بلکہ اسے گولی مار دینا چاہتی تھی۔ اور پھر اس پر ہی معاملہ ختم نہیں ہو جائے گا۔ پھر بھی اس پر مقدمہ چلائے جانے کا امکان باقی رہے گا۔ اس قدر سوچنے کے بعد اس کی حالت پُرسکون ہونے لگی۔ رات گذر چکی تھی۔ خواب گاہ میں آخری مرتبہ جھانکنے کے بعد کومارد وسکی وہاں سے اپنی ایک دوست روفینا سے ملنے چلا گیا، جو ایک خاتون وکیل اور ایک سیاسی تارک وطن کی بیوی تھی۔ اس کا آٹھ کمروں کا مکان اب اس کی حیثیت سے زیادہ تھا اور وہ اس کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے دو کمرے کرایہ پر دے رکھے تھے۔ ان میں سے ایک کمرہ ابھی حال ہی میں خالی ہوا تھا، اسے کومارد وسکی نے لارا کے لیے کرایہ پر لے لیا۔ چند گھنٹے کے بعد اسے وہاں لے جایا گیا۔ اس کا دماغ ابھی تک متاثر تھا اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی۔

رفینا ترقی پسند خیالات کی عورت تھی۔ اس نے اپنی بیمار کرایہ دار کو دیکھتے ہی یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی۔ اس کے خیال میں لارا بیماری کا بہانہ کر رہی تھی۔ یہ مکان ارباٹ کے علاقہ میں ایک عمارت کی سب سے اوپر کی منزل پر تھا۔ لارا بستر پر لیٹی ہوئی اپنا وقت گزرے ہوئے واقعات کو یاد کر کے گذارتی رہی۔ اسے کئی مرتبہ وہ رات یاد آئی جب وہ سات آٹھ سال قبل یورال سے ماسکو پہنچی تھی۔ وہ اسٹیشن سے ایک گاڑی میں بیٹھ کر بے رونق گلیوں سے گذرتی ہوئی ہوٹل پہنچی تھی جو شہر کے دوسرے سرے پر واقع تھا۔ سڑکوں پر لگے ہوئے لیمپوں کی روشنی میں کوچوان کا کبڑا سایہ بار بار دیواروں پر پڑتا تھا۔

اپنے ہوٹل کے کمرے میں وہ ایک غیر معمولی جسامت کا تربوز دیکھ کر چکرا گئی۔ یہ کومارد وسکی کا تحفہ تھا اور لارا کے نزدیک اس کی طاقت اور دولت کا مظہر تھا۔ جب اس نے اس عجیب و غریب تربوز کو چاقو سے کاٹا اور گہرے سبز رنگ کا چھلکا کٹنے پر اس کے اندر کا سرد اور میٹھا گودا نظر آنے لگا تو وہ خوفزدہ ہو گئی لیکن وہ اس کا قتلہ کھانے سے انکار نہیں کر سکی۔ خوشبودار سرخ گودا اس کے حلق میں پھنس گیا تھا، لیکن اس نے زور لگا کر اسے نگل لیا۔

جس طرح وہ قیمتی کھانوں اور دارالحکومت کی شبانہ زندگی سے مرعوب تھی اسی طرح وہ بعد میں کومارد وسکی سے بھی مرعوب ہو گئی۔ لیکن اب وہ بالکل بدل گیا تھا۔ وہ اس سے کوئی مطالبہ نہیں کرتا تھا۔ اسے ماضی کی یاد کبھی نہیں دلاتا تھا بلکہ کبھی وہاں آیا تک نہیں۔ وہ اس سے دور ہی رہا اور انتہائی شرافت کے ساتھ اسے مدد دینے کی پیش کش کی۔

کولر گریوف کی آمد اس سے قطعی مختلف تھی۔ لارا کو اس کے آنے سے بے انتہا مسرت ہوئی۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا جیسے وہ ایک چھوٹی سی بچی ہو۔ ''اس تماشے کی آخر کیا ضرورت تھی؟'' وہ خاموش ہو گیا۔ پھر ملامت کے طور پر اپنا سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں جا رہا ہوں۔ تم تو جانتی ہو۔۔۔ یہاں کتنی سیل رہتی ہے اور تمہارا کیا خیال ہے۔ آخر تم کب تک رہنے کی کوئی معقول جگہ تلاش کئے بغیر اسی طرح چاروں طرف ٹھوکریں کھاتی پھرو گی؟ اپنے تک ہی بات رکھنا۔ یہ تمہاری مکان

دار عورت جو ہے نا، یہ اچھی نہیں۔ اپنا مکان تبدیل کر دو۔ ایک مصور میرا دوست ہے۔ وہ سال کے لیے ترکستان جا رہا ہے۔ اس کا نگار خانہ کئی حصوں میں تقسیم ہے اور ایک چھوٹے سے فلیٹ کی طرح ہے۔ میرے خیال میں اگر کوئی شخص اس کی دیکھ بھال کا ذمہ لے لے تو وہ اسے مع فرنیچر دے دے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے کیا میں تمہارے لئے کہوں؟ ہاں ایک بات اور ہے۔ یہ ایک معمولی سی رقم ہے، میں تم سے درخواست کرتا ہوں، خدمت کرو۔" اور لارا کے احتجاج، آنسوؤں اور جدوجہد کے باوجود، اس نے وہاں سے جانے سے پہلے اسے دس ہزار روبل کا ایک چیک قبول کرنے پر مجبور کر دیا، جب اس کی حالت ذرا سنبھلی تو لارا اس فلیٹ میں منتقل ہو گئی جو کرلوگریوف نے بتایا تھا۔

☆☆☆

لارا پاشا کی طرف سے بہت زیادہ پریشان رہتی تھی۔ جب تک وہ سخت بیمار تھی پاشا کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اور اس کے سوا وہ سوچ بھی کیا سکتا تھا؟ جب وہ بہتر ہو گئی تو لارا نے اسے بلا بھیجا اور کہنے لگی: "میں ایک بری عورت ہوں۔ تم مجھے نہیں جانتے۔ کسی روز میں تمہیں بتاؤں گی۔ بس اتنا کافی ہے، مجھے بھول جاؤ۔ میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔"

پاشا کو اس پر ہر قسم کے قبیح گناہوں کے ارتکاب کا شبہ تھا۔ اس نے لارا کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا، وہ اسے برا بھلا کہنے اور اس سے نفرت کرنے کو تیار تھا، لیکن وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اور اس کے خیال تک سے حسد کرتا تھا۔ اس گلاس سے بھی جس سے وہ پانی پیتی تھی اور اس تکیہ سے جس پر اس کا سر رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ فوراً شادی کر لیں گے۔ تعلیم ختم کرنے سے پہلے ہی۔ ان کی شادی عید نزول کی سوموار کو ہوئی۔ شادی کے تمام انتظامات لارا کی ہم جماعت توسیا کی ماں لڈملا نے کئے تھے۔ لڈملا ایک حسین عورت تھی۔ اس کا سینہ بھرا ہوا تھا۔ آواز بے حد رسیلی لیکن دماغ توہمات کا پلندہ تھا۔ جس دن لارا کو "شادی کے لئے چرچ جانا تھا،" موسم بہت گرم تھا۔ گرجاؤں کے سنہرے گنبد اور شہر میں باغات کے ریتلے راستے دھوپ میں چمک رہے تھے۔

گرجا سے وہ لوگ سیدھے شادی کی ضیافت کھانے نگار خانہ پہنچے جہاں یہ جوڑا منتقل ہو گیا تھا۔ جب تمام مہمان چلے گئے اور وہ دونوں تنہا رہ گئے تو اس طرح اچانک پیدا ہو جانے والے سکوت میں پاشا بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اس رات جس کی نہ ابتدا تھی نہ انتہا، انتی پوف مسرت کی انتہائی بلندیوں اور مایوسی کی عمیق ترین گہرائیوں تک پہنچا۔ اس کے شکوک وشبہات اور لارا کے اعترافات یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتے رہے۔ اس نے لارا سے پوچھ گچھ کی اور اس کا ہر جواب سن کر اس کا دل ڈوبنے لگتا جیسے وہ ایک لامحدود خلا میں گرتا چلا جا رہا ہو۔ اس کے زخم خوردہ احساسات لارا کے انکشافات کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

وہ دونوں صبح تک باتیں کرتے رہے۔ پاشا کی تمام زندگی میں کبھی فیصلہ کن اور اچانک تبدیلی نہیں ہوئی تھی جتنی کہ اس رات میں ہو گئی۔ صبح کو جب وہ اٹھا تو ایک بالکل بدلا ہوا انسان تھا۔ یہاں تک کہ اسے اس بات پر حیرت ہونے لگی کہ لوگ ابھی تک اسے پاشا انتی پوف کہہ کر پکارتے ہیں۔

نو دن بعد ان کے دوستوں نے اسی کمرے میں انہیں ایک الوداعی دعوت دی۔ پاشا اور لارا دونوں نے امتحانات میں شاندار کامیابی حاصل کی تھی اور دونوں کو یورال کے ایک ہی شہر میں ملازمتوں کی پیشکش کی گئی تھی۔ وہ دونوں اگلے روز وہاں روانہ ہو رہے تھے۔ انہوں نے پھر خوب پی۔ گانے گائے اور غل غپاڑہ مچایا۔ لیکن اس مرتبہ اس میں صرف نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہی شریک تھیں۔

کوماروسکی کو خاص طور پر جوانوں کی اس پارٹی میں شرکت کی اجازت دے دی گئی تھی۔ ضیافت ختم ہونے پر اس نے کہنا شروع کر دیا کہ جب اس کے دونوں نوجوان دوست ماسکو سے چلے جائیں گے تو وہ اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرے گا۔۔۔ اس کے لیے شہر بالکل ایک ریگستان بن جائے گا۔ لیکن وہ اتنا زیادہ جذباتی بن گیا کہ اس نے سسکیاں لینی شروع کر دیں۔

دروازے پر گھنٹی کی آواز ہوئی۔ لارا نے اپنے کان کھڑے کر لئے۔ میز پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ یہ نادیا تھی! لارا بھاگ کر اس سے ملنے کے لئے پہنچ گئی۔ نادیا ٹرین سے اتر کر سیدھی چلی آ رہی تھی۔ اتنی تازہ اور دلفریب کہ اسے معلوم ہونے لگا جیسے وہ ڈپلائنکا کی وادی سے کھلنے والی پھولوں کی مہک بھی اپنے ساتھ لائی ہو۔ دونوں سہیلیاں کچھ دیر تک جذبات کی شدت سے بالکل دم بخود اور خاموش کھڑی رہیں اور پھر ایک دوسری سے لپٹ کر رونے لگیں۔ نادیا اپنے ساتھ پورے خاندان کی مبارکباد اور دعائیں اور اپنے والدین کی طرف سے ایک تحفہ لے کر آئی تھی۔ اس نے زیورات کا ایک بکس اپنے سفری تھیلے میں سے نکال کر کھولا۔ اس میں ایک انتہائی خوبصورت اور قیمتی نیکلس رکھا ہوا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد فلیٹ میں ہر شخص گہری نیند سو رہا تھا۔ ان

میں سے زیادہ لوگ جن کا ارادہ صبح کو لارا اور پاشا کے ساتھ اسٹیشن جانے کا تھا، رات کو وہیں رک گئے۔ انتی پوف میاں بیوی کو ٹرین وقت پر مل گئی۔ ٹرین آہستہ آہستہ روانہ ہوئی اور ان کے دوست انہیں دیکھ کر اپنی ٹوپیاں ہلاتے رہے۔ جب انہوں نے ٹوپیاں ہلانی بند کر دیں اور تین مرتبہ غالباً ''ہرا!'' کا نعرہ لگایا تو ٹرین کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔

☆☆☆

تین روز سے موسم ناخوشگوار تھا۔ جنگ شروع ہونے کے بعد یہ خزاں کا دوسرا موسم تھا۔ پہلے سال، جو کامیابیاں ہوئی تھیں ان کی جگہ اب ناکامیوں نے لے لی تھی۔ فوجیں ہر طرف سے پسپا ہو رہی تھیں۔

ڈاکٹر ژواگو، جو اب تک یورا کے نام سے مشہور تھا، لیکن اب زیادہ تر یوری آندرے وچ کہلاتا تھا، ہسپتال کے نسوانی امراض کے شعبہ کے باہر کھڑا ہوا تھا جہاں وہ ابھی اپنی بیوی تونیا کو لے کر آیا تھا۔ ابھی بہت زیادہ اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ بارش اکتا دینے والے تسلسل کے ساتھ ہو رہی تھی۔ ہوا کی تیزی کے باوجود نہ تو زیادہ تیز تھی اور نہ ہلکی پڑ رہی تھی۔ ماسکو کے ہسپتالوں میں بہت زیادہ بھیڑ تھی جو خاص طور پر گلسک کی لڑائی کے بعد اور بھی بڑھ گئی تھی اور اس عام بھیڑ کا اثر عورتوں کے وارڈ پر بھی پڑنے لگا تھا۔

یوری آندرے وچ تکان کی وجہ سے جماہی لے کر کھڑکی سے دوسری طرف مڑ گیا۔ اچانک اسے ہولی کراس ہسپتال کا ایک واقعہ یاد آ گیا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ چند روز قبل ایک عورت سرجیکل وارڈ میں مر گئی تھی۔ یوری آندرے وچ نے جگر کی بیماری تشخیص کی تھی لیکن ہر شخص کا خیال تھا کہ اس کی تشخیص غلط تھی۔ آج اس کی طبی جانچ ہونے والی تھی۔ اچانک رات ہوگئی۔ نسوانی امراض کے شعبہ کا انچارج تونیا کے وارڈ سے نکل کر باہر آیا۔

اس کے بعد اس کی اسسٹنٹ آئی جو اسی قدر باتونی تھی جتنا اس کا ہم سفر کم سخن تھا۔

''اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو گھر چلی جاتی۔'' اس نے یوری آندرے وچ سے کہا۔ ''میں تمہیں کل ہولی کراس میں اطلاع کر دوں گی۔ اس عرصہ میں کچھ ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ خیال یہی ہے کہ پیدائش قدرتی طور پر ہوگی اور عمل جراحی کی نوبت نہیں آئے گی۔'' اگلے روز جب وہ راہداری سے گذرتا ہوا دروازے پر پہنچا جو غلطی سے آدھا کھلا رہ گیا تھا اس نے تونیا کی دلخراش چیخیں سنیں۔ وہ اس طرح چیخ رہی تھی جیسے کسی حادثہ میں زخمی ہونے والے شخص کو جس کے اعضا کچل کر رہ گئے ہوں ٹرین کے پہیوں کے نیچے سے کھینچ کر نکالا جا رہا ہو۔ اسے تونیا کو دیکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ اس وقت بھی ویسی ہی آڑی ترچھی پھوار پڑ رہی تھی، جیسی گذشتہ دو دن پڑتی رہی تھی۔ ایک نرس وارڈ سے باہر آئی۔

''بیٹا ہوا ہے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا۔ مبارک ہو۔'' نرس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ ابھی اندر نہیں جا سکتے۔'' آندرے وچ بہت خوش تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ بیٹا قدرت کا ایک تحفہ تھا۔ اسے ان تمام باتوں کا مشکل ہی سے اندازہ تھا۔ اصل بات تو یہ تھی کہ تونیا۔۔۔ تونیا جو موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی۔۔۔ اب خوش قسمتی سے بالکل بخیریت ہے۔

یوری آندرے وچ کو ہسپتال میں ہر شخص نے مبارکباد دی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ خبر کتنی تیزی سے پھیلی۔ وہ اسٹاف کے کمرے میں چلا گیا جسے غلاظت گھر کہا جاتا تھا۔ ہسپتال میں جگہ کی کمی کی وجہ سے اسے عام استعمال کا کمرہ بنا دیا گیا تھا۔ وہاں لوگ باہر سے اپنے برفانی جوتے پہنے ہوئے آتے تھے۔ بعض لوگ اپنے بنڈل وہیں بھول جاتے اور کمرے کے فرش پر کاغذ اور سگریٹ کے ٹکڑے پھیلا دیتے۔

اسی وقت میڈیکل ڈائریکٹر اندر آیا، ان دونوں کو سلام کیا اور کہنے لگا: ''اس جگہ کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ یہاں کس قدر گندگی ہے۔ ہاں بھئی ژواگو مرض واقعی وہی تھا۔ ہم لوگ غلطی پر تھے۔ ہم لوگ ان ڈاکٹروں کی فہرستوں پر غور کرتے رہے ہیں جنہیں مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ اس مرتبہ میں انہیں اس سے نہیں روک سکتا۔ ڈاکٹروں کی بہت کمی ہے۔ تمہیں جلد ہی جنگی محاذ پر جانا پڑے گا۔''

☆☆☆

یوریاتن میں انتی پوف میاں بیوی (لارا اور پاشا) کو توقع کے خلاف اچھے حالات پیش آئے۔ لوگ وہاں گیشار کے گھرانے کو نہیں بھولے تھے۔ اس سے لارا کو ایک نئی جگہ پر مکان وغیرہ کا انتظام کرنے میں کافی مدد ملی۔ لارا کے پاس بہت کام تھا۔ اسے بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اس نے مکان کا انتظام اور اپنی تین سالہ لڑکی کا تنکا کی دیکھ بھال اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ان کی سرخ بالوں والی خادمہ مارفتکا اپنی سی ہر ممکن کوشش کرتی تھی، لیکن اس سے گھر کا سارا کام نہیں سنبھلتا تھا۔ لارا خود لڑکیوں کی ورزش گاہ میں پڑھایا کرتی تھی۔

یہی تو وہ زندگی تھی جس کے وہ خواب دیکھا کرتی تھی۔ اسے یوریاتن پسند تھا۔ یہ اس کا آبائی شہر تھا جو دریائے رینوا پر واقع تھا۔ یورال کی ایک ریلوے لائن وہاں سے گزرتی تھی۔ یوریاتن میں ہمیشہ موسم سرما کی آمد کا اعلان کشتیوں کے مالک کیا کرتے تھے

جبکہ وہ اپنی کشتیوں کو دریا سے نکال کر شہروں میں لے آتے۔ صحن
میں الٹی رکھی ہوئی کشتیوں کا یوریا تن میں وہی مطلب لیا جاتا تھا جو
دوسرے مقامات پر سارسوں کے اڑ کر کسی دوسری جگہ چلے جانے یا
پہلی برفباری کا ہوتا تھا۔ انتی پوف میاں بیوی نے جو مکان کرایہ پر
لیا تھا، اس کے صحن میں بھی ایک ایسی ہی کشتی رکھی ہوئی تھی۔ کاتنکا
اس کے سایہ میں اسی طرح کھیلا کرتی تھی جیسے وہ کوئی ہوا گھر ہو۔

اپنی بیوی کے ساتھ پاشا کے تعلقات اچھے تھے، لیکن ان
تعلقات میں سادگی نہیں تھی۔ اس کی مہربانیوں اور اس کی دیکھ
بھال کے سلسلہ میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دینے سے اسے
وحشت سی ہوتی تھی لیکن وہ اس خوف سے اس کی کسی بات پر نکتہ
چینی نہیں کرتا تھا کہ کہیں وہ اس کے کسی معمولی سے لفظ کو بھی طعنہ نہ
سمجھ بیٹھے۔ اس بات کا طعنہ کہ وہ اس سے زیادہ اعلیٰ نسب تھی یا یہ کہ
وہ کبھی کسی دوسرے کی ہو کر رہ چکی تھی۔

ان دونوں کی زندگی میں تصنع کا عنصر پیدا ہو گیا تھا۔ ان
دونوں میں ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ شریف بننے کی
کوشش میں تھا اور اس سے حالات پیچیدہ تھے۔

ایک رات ان کے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں
کے لیے لارا کا لطف آمیز برتاؤ دیکھ کر اسے سخت حیرت تھی۔
مہمانوں کے چلے جانے کے بعد باورچی خانہ میں لارا کو بہت
وقت لگ گیا۔ اس کے بعد اس نے اس بات کا اطمینان کیا کہ کاتنکا
کو ٹھیک سے اڑھا کر لٹا دیا گیا ہے اور یہ کہ پاشا بھی سو چکا ہے۔
اس نے تیزی سے اپنے کپڑے اتارے، روشنی بجھائی اور اپنے
شوہر کے پاس اسی طرح قدرتی انداز میں لیٹ گئی جیسے کوئی بچہ اپنی
ماں کے پاس لیٹ جاتا ہے۔

انتی پوف محض یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ اسے عرصہ
سے بے خوابی کی شکایت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے تین چار گھنٹے
جاگنا پڑے گا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اٹھا، شب خوابی کے لباس کے
اوپر سے اپنا سمور کا کوٹ اور ٹوپی پہنی اور باہر چلا گیا۔ موسم خزاں کی
صاف اور برفانی رات تھی۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے اور
ہلکی نیلی روشنی کی کرنیں جلتی ہوئی شراب کے شعلے کی مانند سیاہ
زمین اور برفانی دلدل پر پڑ رہی تھیں۔ ان کا مکان سڑک پر سب
سے آخر میں تھا۔ اس کے آگے ایک کھیت تھا جس کے درمیان
سے ریلوے لائن گذرتی تھی۔ انتی پوف الٹی ہوئی کشتی پر بیٹھ گیا اور
تاروں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس طرح کام نہیں چل سکتا۔ اس نے
سوچا۔ وہ بچپن ہی میں اسے پسند کرنے لگا تھا اور اس کے اشاروں
پر چلتا تھا۔ اس میں اتنی عقل کیوں نہیں آئی کہ بروقت اسے چھوڑ
دیتا۔ شادی سے قبل موسم سرما میں جبکہ خود اسی نے اس بات پر زور
دیا تھا؟ اس سارے معاملہ کا بدترین پہلو یہ تھا کہ وہ اس سے اب
بھی ہمیشہ کی طرح والہانہ محبت کرتا تھا۔ وہ غضب کی حسین تھی۔ اور
پھر بھی کیا اسے یقین تھا کہ اس کی طرف سے بھی یہ محبت ہی تھی؟ یا
یہ کہ اس کے حسن اور دلربائی کے سامنے اظہار عقیدت تھا؟ ان تمام
باتوں کو کون سمجھ سکتا تھا! شیطان بھی ان کے چکر میں پھنس کر ہوش و
حواس کھو بیٹھتا۔ تو پھر اسے کیا کرنا چاہیے؟

طلاق؟ خود دریا میں ڈوب کر؟ کس قدر لغو اور بیہودہ خیال
ہے! اسے اس خیال ہی سے نفرت ہونے لگی۔ اس نے ستاروں کی
طرف دیکھا جیسے ان سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہو۔ اچانک وہ
ستارے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ایک فوجی ٹرین، دھویں کے
زرد بادل اڑاتی ہوئی اور چنگاریاں چھوڑتی ہوئی مغرب کی سمت
جاتے ہوئے کراسنگ پر سے گذری جیسے لاتعداد دوسرے انجن
گذشتہ سال رات اور دن گزرتے رہے تھے۔ پاول پاولووچ
مسکرایا اور اٹھ کر اندر سونے کے لئے چلا گیا۔ اس کو اپنی الجھن
سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک طریقہ معلوم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

جب لاریسا فیودورونا کو پاشا کے فیصلہ کا علم ہوا تو وہ دم بخود
رہ گئی اور پہلے تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ سکا۔ لیکن بعد میں
اسے معلوم ہوا کہ وہ گذشتہ دو ہفتوں سے تیاریاں کر رہا ہے۔ اس
نے اپنے کاغذات بھرتی کے دفتر کو بھیج دیئے۔ لارا ایک دیہاتی
عورت کی طرح چیخیں مار مار کر روئی اور اس نے پاشا کا ہاتھ پکڑ کر
خود کو اس کے قدموں میں گرا دیا۔ ''پاشا، پاشینکا'' وہ روتی ہوئی
بولی۔ ''ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ۔ ایسا مت کرو، مت کرو، اب بھی
کچھ نہیں بگڑا۔ میں سب کچھ ٹھیک کرا دوں گی۔ تمہارا تو باقاعدہ طبی
معائنہ بھی نہیں ہوا، اور تمہارا دل۔۔۔ کیا تمہیں اپنا ارادہ بدلتے
ہوئے شرم آتی ہے؟ اور کیا تمہیں اپنے گھر والوں کو اپنے کسی
مجنونانہ خیال پر بھینٹ چڑھاتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی؟ تم
بھی ایک افسر کے یونیفارم میں اکڑ اکڑ کر چلنا چاہتے ہو اور قتل و
غارت گری میں حصہ لینا چاہتے ہو۔ پاشا تمہیں ہو کیا گیا ہے؟
تمہیں یسوع مسیح کی محبت کا واسطہ کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر مجھے
دیانت داری کے ساتھ بتا دو کیا روس کو اسی کی ضرورت ہے؟''

اچانک اسے محسوس ہوا کہ اصل قصہ کیا ہے؟ پاشا اپنے
ساتھ اس کے رویہ کو غلط سمجھا۔ اس نے اس مادرانہ جذبہ کے خلاف
بغاوت کر دی جو زندگی بھر اس کی محبت میں شامل رہا تھا اور یہ نہیں
سمجھ سکا کہ ایسی محبت ایک عام جذبہ سے کم نہیں بلکہ ارفع ہوتی ہے

جوایک عورت کے دل میں کسی مرد کے لئے پائی جاتی ہے۔اس نے اپنے ہونٹ کاٹ لئے اوراس طرح بجھ کررہ گئی جیسے اسے پیٹا گیا ہو۔اور پھر اپنے آنسو پیتے ہوئے خاموشی کے ساتھ اس کا سامان باندھنے لگی۔اس کے چلے جانے کے بعداسے ایسا معلوم ہوا جیسے سارا شہر خاموش اور پرسکوت ہو۔اسے آسمان پر اڑتے ہوئے کوؤں کی تعداد بھی کم دکھائی دے رہی تھی۔یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی شکست تھی۔اس کی بہترین اور تابناک ترین امیدیں برباد ہوگئی تھیں۔سائبیریا سے اس کے شوہر کے جو خطوط آتے تھے،ان سے اس کے موڈ کا پتہ چلتا رہتا تھا۔اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔اسے اپنی بیوی اور بچی کی جدائی بہت شاق گذر رہی تھی۔

بروسیلوف کی فوجیں دشمن کے محاذ کو توڑ کر اندر گھس گئی تھیں اور حملہ کر رہی تھیں۔انتی پوف کے خطوط آنے بند ہوگئے۔شروع میں لارا کو فکر نہیں ہوئی۔اس نے اس کی خاموشی کو جنگی کارروائیوں پر محمول کیا۔جب اس کی رجمنٹ نقل وحرکت میں مصروف تھی تو وہ خط نہیں لکھ سکتا تھا۔لیکن موسم خزاں میں پیش قدمی کی رفتار سست پڑ گئی۔فوجیں مورچہ بندی کر رہی تھیں۔اور پھر بھی اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔اس کی بیوی کو اب فکر ہونے لگی۔

دوسری مقامی خواتین کی طرح لاریسا فیودورونا بھی شہر کے ہسپتال سے منسلک فوجی وارڈ میں کام کیا کرتی تھی۔اس نے خود پاشا کا پتہ لگانے کا فیصلہ کرلیا۔یہی سوچ کر اس نے ہسپتال کی ایک ٹرین میں ملازمت کرلی جو ہنگری کی سرحد پر میزولا بورک جارہی تھی۔پاشا نے اپنے آخری خط میں یہی پتہ دیا تھا۔

☆☆☆

ریڈکراس کی ایک ٹرین اس سامان کے ساتھ جو لوگوں نے رضاکارانہ طور پر،زخمیوں کے لیے دیا تھا اور جو ناتیانا کی امدادی کمیٹی نے جمع کیا تھا،ڈویژنل ہیڈکوارٹر پر پہنچ گئی۔اس میں گورڈن بھی تھا۔اسے معلوم تھا کہ اس کا بچپن کا دوست ژواگو ڈویژنل ہسپتال سے متعلق تھا۔یہ معلوم کر کے کہ ہسپتال نزدیک ہی ایک گاؤں میں ہے اس نے ضروری اجازت نامہ اس علاقہ میں جانے کے لیے حاصل کیا اور اس گاؤں کو جانے والی ایک گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔

گورڈن نے زیادہ تر راستہ خاموشی سے طے کیا۔شام کے قریب دور افق پر ان توپوں کے چلنے سے گھڑگھڑاہٹ اور دھاکوں کے ساتھ ہلکی گلابی رنگ کی روشنی چمکتی اور پھر غائب ہوجاتی۔وہ تباہ شدہ گاؤں میں سے ہوکر گذرے۔مکانوں کی جگہ ملبے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔بوڑھی عورتیں راکھ کے ڈھیروں کو جو خود ان کے اپنے مکانوں کے تھے ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں۔اندھیرا ہونے کے بعد گاڑی کو ایک گشتی دستہ نے روک لیا۔صبح سورج نکلنے سے پہلے وہ ایک گاؤں پہنچے جس کا نام وہی تھا جس کی انہیں تلاش تھی،لیکن وہاں کسی کو ہسپتال کے متعلق کوئی علم نہیں تھا۔آخرکار صبح سویرے وہ اس گاؤں پہنچ گئے جہاں انہیں جانا تھا۔

☆☆☆

انہیں دنوں میں ہراول دستوں کی نقل وحرکت شروع ہوگئی۔گاؤں کے جنوب میں جہاں گورڈن اس وقت گیا ہوا تھا،روسی فوجیں دشمن کے مورچوں کو توڑنے میں کامیاب ہوگئیں۔ان کے عقب میں معاون دستے تھے۔لیکن یہ پیچھے رہ گئے۔اور ہراول دستوں کا سلسلہ منقطع ہوجانے پر انہیں پکڑ لیا گیا۔قیدیوں میں لیفٹیننٹ انتی پوف بھی تھا۔اس کے متعلق غلط افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔خیال کیا جاتا تھا کہ وہ توپ کے ایک گولہ سے ہلاک ہوگیا اور دھاکہ کے نتیجہ میں زمین کے ملبہ میں دب گیا۔یہ بات اس کے دوست لیفٹیننٹ جلیلین کی ذمہ داری پر کہی جاتی تھی جو انتی پوف کے حملہ کی کمان کرتے وقت ایک پہرہ کی چوکی سے دوربین کے ذریعہ اس کی نقل وحرکت دیکھ رہا تھا۔

جلیلین اور انتی پوف ایک ہی خندق میں ساتھ رہا کرتے تھے۔جب انتی پوف کے ساتھیوں کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ وہ مرچکا ہے تو جلیلین سے جو اس سے اچھی طرح واقف تھا،کہا گیا کہ وہ اس کی ذاتی چیزیں اپنے پاس رکھ لے اور انہیں اس کی بیوہ کے پاس پہنچانے کی کوشش کرے،جس کے بہت سے فوٹو اس کے سامان میں سے ملے تھے۔

انتی پوف سے جلیلین کی پہلی ملاقات 1905ء میں ہوئی تھی جب پاشا انتی پوف نے چھ مہینے تیورزن کے گھرانے میں گزارے تھے اور یوسپکا اتوار کے روز اس کے ساتھ کھیلنے جایا کرتا تھا۔وہاں بھی ایک آدھ مرتبہ اس کی لارا سے ملاقات ہوئی تھی۔اس کے بعد سے ان دونوں میں سے کسی کی کوئی خبر نہیں ملی۔جب انتی پوف یوریاتن سے آیا اور رجمنٹ میں شامل ہوگیا تو جلیلین کو اپنے پرانے دوست میں اتنی تبدیلی دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔شرمیلا شریر اور لڑکیوں جیسا بچہ اب ایک مغرور اور سمجھدار قسم کا مردم بیزار انسان بن گیا تھا۔بعض وقت اس کی اداس آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک ایسا جذبہ نظر آتا جو پورے طور پر اس پر حاوی ہوگیا تھا۔اپنی بیٹی کو دیکھنے یا اپنی بیوی کے چہرے پر نظر ڈالنے کی خواہش سے انتی پوف بالکل اسی طرح مسحور معلوم ہوتا جیسے پرستان کی کہانیوں سے لوگ

ہوتے ہیں۔ اب انتی پوف جاچکا تھا اور جلیلن کے پاس اس کے کاغذات، اس کی تصویریں اور اس کا نامعلوم راز باقی رہ گیا تھا۔

جیسا کہ جلد یا بدیر ہونا لازمی تھا، لارا نے اپنے شوہر کے متعلق جو معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اس سلسلہ میں اس نے جلیلن کو بھی لکھا۔ وہ اسے ایک طویل اور مفصل خط لکھنے کا ارادہ ملتوی کرتا رہا، یہاں تک کہ اسے معلوم ہوا کہ وہ محاذ پر کسی جگہ نرس کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اور اب وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اسے کس پتہ پر خط لکھے۔

☆☆☆

''کیا آج گھوڑے مل سکیں گے؟'' ڈاکٹر ژواگو جب بھی دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے گھر آتا تو گورڈن اس سے یہی سوال کرتا۔ وہ دونوں گلیشیا کے ایک کسان کے گھر میں رہ رہے تھے۔

''فی الحال کوئی امکان نہیں۔ کافی گڑبڑ ہے۔ شمال کی طرف جرمن فوجوں نے سونیتا کو ایک ایسے مقام پر پار کرلیا ہے جو ناقابل عبور سمجھا جاتا تھا۔ وہ ریلوے لائنوں کو اڑا رہے ہیں، رسد کے ذخیروں کو تباہ کر رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

طبی دستہ سارے گاؤں میں پھیلا ہوا تھا۔ معجزے کی مانند ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ گرم موسم خزاں کا آخری زمانہ ہندوستان کے موسم گرما میں تبدیل ہوگیا تھا۔ ایک پرسکون رات کی بات ہے کہ گورڈن اور ژواگو ایک دوسرے کی طرف منہ کئے ہوئے دو پلنگوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ کمرہ ضرورت سے زیادہ گرم تھا۔ انہوں نے آخری دو جالیاں تازہ ہوا کے لئے کھول دیں اور باتیں کرنے لگے۔ محاذ کی سمت میں افق پر گلابی سی روشنی چمک رہی تھی۔ کبھی کبھی رائفلوں کی متواتر آواز دھماکے کی ایک زوردار آواز سے منقطع ہوجاتی تو اس وقت ژواگو بات چیت کا سلسلہ منقطع کر دیتا جیسے وہ اس دھماکہ کی آواز کا احترام کر رہا ہو، پھر کچھ دیر رک کر کہتا۔ ''یہ برتھا کی آواز ہے، جرمنی کی سولہ انچی دہانے کی توپ جس کا وزن چوبیس پونڈ ہے۔''

''یہ بو کیسی ہے جو سارے گاؤں میں بسی ہوئی ہے؟'' گورڈن نے پوچھا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ یہ بھنگ ہے جو یہاں بہت زیادہ اگتی ہے۔ اس پودے میں مردار گوشت جیسی بدبو ہوتی ہے۔ پھر جنگ کے علاقہ میں مرنے والوں کی لاشیں بھنگ کے کھیتوں میں چھپی عرصہ تک پڑی رہتی ہیں اور پھر سڑنے لگتی ہیں۔ لاشوں کی بو بھی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یہ قدرتی بات ہے۔ تم نے یہ آواز سنی؟ یہ پھر برتھا کی آواز ہے۔''

گذشتہ چند روز میں وہ دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے اور گورڈن کو جنگ کے بارے میں اپنے دوست کے خیالات اور لوگوں کے طریقہ فکر پر اس کے اثرات معلوم ہوگئے تھے۔ وہ سادگی اور دیانت داری کے ساتھ کام کرنے کا قائل تھا۔ یہ چیز کہ زخمیوں کو دیکھ کر بے ہوش بھی ہوا جاسکتا ہے، اس نے خود اپنے ذاتی تجربہ سے سیکھی تھی جب کہ وہ ابتدائی طبی امداد کے ایک مرکز پر گئے تھے جسے ریڈ کراس کا ایک گشتی دستہ محاذ کے پیچھے چلاتا تھا۔

جب گاڑیاں پورچ کے سامنے رکیں، تو اردلی اسٹریچر لے کر باہر آئے اور زخمیوں کو اتارا گیا، ایک نرس نے ایک خیمہ کا پردہ اٹھایا اور کھڑی ہوئی باہر کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ ڈیوٹی پر نہیں تھی۔

جو خوفناک زخمی ابھی مرا تھا وہ جمال الدین تھا اور جو افسر ابھی کچھ دیر پہلے جنگل میں غصہ میں بھر کر چیخ رہا تھا اس کا بیٹا جلیلن تھا۔ نرس لارا تھی۔ گورڈن اور ژواگو بھی دیکھنے والوں میں تھے۔

اس علاقہ میں بعض دیہات اس طرح بچے کہ یہ معجزے سے کم نہیں تھا۔ وہ تباہی اور بربادی کے اس سمندر کے بیچ میں ایک محفوظ جزیرے کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ ایک روز سورج غروب ہوتے وقت گورڈن اور ژواگو گاڑی میں گھر واپس جا رہے تھے کہ ایک گاؤں میں انہوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان قازق کو ایک مجمع نے گھیر رکھا ہے۔ وہ قازق تانبے کا ایک سکہ ہوا میں اچھالتا تھا اور ایک بوڑھے سفید ریش یہودی کو جس نے ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا سکے کو لپکنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس پر سارا مجمع زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔

''یہ بہت خراب بات ہے۔'' اپنے گاؤں کے قریب پہنچتے ہوئے یوری آندرے وچ نے کہا۔ ''تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس جنگ میں غریب یہودیوں کو کن حالات سے گزرنا پڑ رہا ہے۔''

گورڈن نے جواب نہیں دیا۔

☆☆☆

وہ دونوں پھر ایک مرتبہ، اپنے پلنگوں پر کھڑکی کے دونوں طرف لیٹے ہوئے تھے۔ رات کا وقت تھا اور وہ باتیں کر رہے تھے۔ ژواگو گورڈن کو بتا رہا تھا کہ اس نے کس طرح ایک مرتبہ زار کو محاذ پر دیکھا تھا۔ اس نے اپنا قصہ نہایت اچھی طرح سنایا۔ محاذ پر اس کی آمد کے بعد یہ پہلا موسم بہار تھا۔

یہ اپریل کی ایک نم اور تاریک صبح تھی۔ وادی کہر سے ڈھکی ہوئی تھی اور اس کے اندر ہر چیز کھول رہی تھی۔ اس وقت شہنشاہ گلیشیا میں معائنہ کی غرض سے دورہ کر رہے تھے۔ اچانک یہ معلوم

ہوا کہ وہ ژواگو کی یونٹ کا بھی معائنہ کریں گے، جس کے وہ اعزازی کرنل تھے۔ زار نے گارڈ آف آنر کا معائنہ کیا۔ گرانڈ ڈیوک نکولس بھی ان کے ساتھ تھے۔ زار جو مسکرا رہا تھا اور کسی قدر گھبرایا ہوا تھا، اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اس لیے بار بار معذرت خواہ نظروں سے گرانڈ ڈیوک کی طرف دیکھ لیتا۔

پہاڑوں میں اس گرم اور تاریک صبح کو ژواگو نے زار کے لئے افسوس محسوس کیا، اور اسے اپنے اس خیال سے الجھن ہونے لگی کہ ایک ظالم شخص میں بھی ضبط اور ندامت کی خصوصیات پائی جا سکتی ہیں اور ایک کمزور انسان بھی لوگوں کو قید کر سکتا ہے، پھانسی چڑھا سکتا ہے یا معاف کر سکتا ہے۔

''تم نے دکھتی رگ پکڑی ہے۔'' گورڈن نے کہا۔ ''اور اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ آج ہم نے جو واقعہ دیکھا اس کے بارے میں میرا کیا خیال ہے۔ تم کہہ رہے تھے کہ قوم کیا ہوتی ہے؟ اس کا جواب صاف ظاہر ہے۔

''جب انجیل یہ کہتی ہے کہ خدا کی مملکت میں نہ تو یہودی ہیں اور نہ غیر یہودی تو کیا اس کا محض یہ مطلب نکلتا ہے کہ خدا کی نظر میں سب برابر ہیں؟ نہیں ۔۔۔ اس کے لیے انجیل کی ضرورت نہیں تھی۔ یونانی فلسفیوں، رومی معلمین اخلاق اور اسرائیلی پیغمبروں کو یہ بات بہت پہلے سے معلوم ہو چکی تھی لیکن اس نے بتایا کہ زندگی کے اس نئے طریقہ اور سماج کے نئے ڈھانچہ میں جس کی دل میں تخلیق ہوئی ہے اور جسے خدا کی مملکت کہتے ہیں کوئی قوم میں نہیں ہیں۔ وہاں صرف افراد ہیں۔

''جب کسی قوم کا خاص طور پر ایک چھوٹی اور مصیبت زدہ قوم کا برابر تذکرہ کیا جاتا ہے تو اس طرح انہیں اپنی اہلیت اور ہوشیاری دکھانے اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردی جتانے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہودیوں کے قومیت کے تصور نے انہیں صدیوں سے محض ایک قوم رہنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ وہ اس تخیل کے صدیوں سے غلام بنے رہے ہیں جبکہ باقی تمام دنیا کو ایک نئی طاقت کے ذریعہ اس ذہنیت سے آزاد کرایا جا رہا تھا، کیا یہ ایک غیر معمولی بات نہیں ہے؟ تم اس کا کیا جواز پیش کر سکتے ہو؟''

☆☆☆

اگلے روز جب ژواگو رات کے کھانے پر گھر آیا تو اس نے کہا۔ ''تم جانے کے لیے اس قدر بے چین تھے۔ اب تمہاری مراد پوری ہو گئی۔ تمام میڈیکل یونٹوں کو نکل جانے کا حکم مل گیا ہے۔ ہم لوگ کل یا پرسوں چلے جائیں گے، کہاں۔ یہ میں نہیں جانتا۔''

وہ لوگ آہستہ آہستہ سامان باندھتے رہے۔ رات میں چیخوں، توپوں اور بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازوں سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ گاؤں پر ایک نحوست آمیز سی سرخ روشنی چھائی ہوئی تھی۔ یوری آندرے وچ نے اردلی کو یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا کہ اس ہنگامے کی کیا وجہ تھی؟ اسے بتایا گیا کہ جرمنوں نے محاذ توڑ دیا ہے۔ ژواگو تیزی سے ہسپتال کی طرف گیا اور اسے معلوم ہوا کہ یہ بات صحیح ہے۔ گاؤں پر گولہ باری ہو رہی تھی۔ کسی حکم کا انتظار کئے بغیر ہسپتال فوراً منتقل کیا جا رہا تھا۔

''ہم سب لوگ سورج نکلنے سے پہلے ہی روانہ ہو جائیں گے۔'' ژواگو نے گورڈن کو بتایا۔ ''تم پہلی جماعت کے ساتھ جا رہے ہو۔ اچھا خدا حافظ۔''

وہ دونوں دیواروں کو پھلانگتے اور ٹکراتے ہوئے گاؤں کی سڑک پر بھاگنے لگے۔ گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے قریب سے گذر رہی تھیں اور چوراہے سے وہ دھماکے ہوتے ہوئے دیکھ سکتے تھے جیسے کھیتوں میں آگ کی چھتریاں سی کھل رہی ہوں۔ وہ دونوں گاؤں کے نکڑ پر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ مکانوں کی آڑ لیتا ہوا یوری آندرے وچ تیزی سے پلٹا۔ اپنے مکان سے چند گز کے فاصلہ پر ایک دھماکہ ہونے سے اس کے پاؤں اکھڑ گئے اور گولے کا ایک ٹکڑا اس کے آ کر لگا۔ وہ بیچ سڑک پر زخمی اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔

وہ ہسپتال جہاں یوری آندرے وچ افسروں کے وارڈ میں زیر علاج تھا، جنرل ہیڈ کوارٹرز کے قریب ایک چھوٹے سے غیر معروف قصبہ میں منتقل کر دیا گیا تھا جو ریلوے لائن پر واقع تھا۔ یہ فروری کے مہینہ کا آخری زمانہ تھا اور دن گرم تھا۔

بتایا گیا کہ ایک نئی نرس عملے میں شامل ہوئی ہے اور پہلی مرتبہ گشت کرنے والی ہے۔ ژواگو کے پلنگ کے سامنے جلیلین اخبار پڑھ رہا تھا۔ یوری آندرے وچ تونیا کے خطوط پڑھ رہا تھا۔ خط اور اخبار ہوا سے اڑ رہے تھے۔ ہلکے قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور لارا اندر وارڈ میں داخل ہوئی۔

ژواگو اور جلیلین دونوں نے لارا کو پہچان لیا۔ وہ ان دونوں میں سے کسی کو نہیں جانتی تھی۔ جلیلین کے پاس جا کر اس نے حال پوچھا۔ جلیلین نے کہا۔ ''میں تمہارے شوہر کو جانتا تھا۔ ہم ایک ہی رجمنٹ میں تھے۔ میں نے اس کی چیزیں تمہارے لیے رکھ چھوڑی ہیں۔''

''تم اسے جانتے تھے! عجیب اتفاق ہے۔ مہربانی کر کے مجھے بتاؤ کہ یہ کس طرح ہوا؟''

جلیلن کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے اطمینان دلانے کے لئے جھوٹ بولے گا۔ ''انتی پوف کو قیدی بنالیا گیا تھا۔'' اس نے کہا۔ لیکن لارا کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔ اس غیر متوقع ملاقات کے اثر سے وہ کانپنے لگی۔ اس خیال سے کہ کہیں ان اجنبی لوگوں کے سامنے آنسو نہ بہنے لگیں وہ تیزی سے باہر غلام گردش میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گئی اور یوری آندرے وچ کے پاس چلی گئی۔ ''ہلو'' اس نے بے خیالی میں کہا ''تمہیں کیا ہوا؟'' یوری آندرے وچ اس کی گھبراہٹ اور آنسو دیکھ چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ''شکریہ۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور خود اپنی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔''

کئی روز تک موسم متغیر اور غیر یقینی رہا۔ رات کو گرم ہوا کسی قدر شور کے ساتھ چلتی اور اس میں سیلی ہوئی مٹی کی بو آتی۔ جنرل ہیڈ کوارٹرز سے حیرت انگیز اطلاعات آ رہی تھیں، اور اندرونی علاقہ سے تشویشناک افواہیں مل رہی تھیں۔

نرس صبح شام گشت کرتی اور مریضوں سے جن میں جلیلن اور ژواگو بھی شامل تھے، وہ باتیں کرلیا کرتی تھی۔ ''کیسا عجیب شخص ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''جوان اور چڑچڑا۔ اس کی اوپر کو اٹھی ہوئی ناک کی وجہ سے اسے خوبصورت نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن وہ صحیح معنوں میں ذہین، زندہ دل اور سمجھ دار ہے۔''

ہر چیز اچانک بدل گئی تھی۔ لہجہ اور اخلاقی رجحانات! کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ کیا سوچے، کس کی بات سنے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے آپ ساری عمر ایک چھوٹے بچے کی طرح دوسروں کے دست نگر رہے ہوں اور اچانک اکیلے رہ گئے ہوں۔ اور اب آپ کے لئے خود اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا ضروری ہو گیا ہو۔

اب جبکہ پاشا اس کے پاس نہیں تھا، لارا سوائے ایک ماں کے اور کچھ نہیں ہو سکتی تھی اور اس نے اپنی تمام قوت اپنی غریب اور یتیم بچی کے لیے وقف کر دی تھی۔

یوری آندرے وچ کو ماسکو سے اطلاع ملی کہ گورڈن اور دوروف نے اس کی کتاب اس کی اجازت کے بغیر شائع کر دی۔ کتاب کی بہت تعریف کی گئی ہے، اس سے کافی ادبی توقعات وابستہ کی گئی ہیں۔ اسے یہ بھی خبر ملی کی ماسکو ایک ہنگامہ خیز اور ہیجان انگیز دور سے گزر رہا ہے اور وہاں کوئی اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ وہاں عوام میں بے اطمینانی بڑھ رہی ہے اور سنگین سیاسی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ رات زیادہ جا چکی تھی اور یوری آندرے وچ اونگھ رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر نشلی اور خواب آور ہوا چل رہی تھی۔ ''تونیا، ساشا! میں تمہاری جدائی محسوس کر رہا ہوں، میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ میں کام پر واپس جانا چاہتا ہوں۔'' اور ہوا کے جھونکوں نے یوری آندرے وچ کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔

تمام مریض جو چل پھر سکتے تھے شور کے ساتھ بیساکھیوں کے سہارے چلتے ہوئے یا بھاگتے ہوئے دوسرے کمروں سے نکل کر آ گئے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے خیال سے چلا چلا کر کہنے لگے:

''اہم خبر! پیٹرز برگ کی سڑکوں پر لڑائی! پیٹرز برگ میں فوج باغیوں سے مل گئی! انقلاب! انقلاب!!!''

☆☆☆

نیا دور

قصبے کا نام میلوز یودتھا اور وہ زرخیز علاقہ میں واقع تھا جس کی مٹی سیاہ تھی۔ سیاہ خاک ٹڈی دل کی طرح اس کے مکانوں کی چھتوں پر چھائی رہتی تھی۔ یہ گرد قصبہ سے گزرنے والی فوجوں اور قافلوں کی وجہ سے اڑتی تھی جو دونوں سمتوں میں نقل و حرکت کرتے تھے اور کچھ محاذ کی طرف جاتے تھے اور کچھ ادھر سے واپس آتے تھے اور یہ بتانا مشکل تھا کہ جنگ اب بھی ہو رہی تھی یا ختم ہو چکی تھی۔

ژواگو اور انتی پووا کام کے سلسلہ میں اکثر ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ یوری آندرے وچ نے اپنی بیوی کو خط لکھا: ''فوج میں بدنظمی اور افراتفری جاری ہے۔ تنظیم اور اخلاقی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں لکھ چکا ہوں کہ اب میں اپنا زیادہ تر کام انتی پووا نام کی ایک نرس کے ساتھ کرتا ہوں جو ماسکو سے آئی ہے اور یورال میں پیدا ہوئی تھی۔ تمہیں وہ طالبہ تو یاد ہوگی جس نے اس رات جب تمہاری والدہ کا انتقال ہوا تھا سرکاری وکیل پر گولی چلائی تھی؟''

روانہ ہونے سے پہلے اسے اپنی بیوی کا جواب مل گیا۔ اس کے جملے ہچکیوں اور آنسوؤں کے دھبوں کی وجہ سے بے ربط ہو گئے تھے۔ اس نے خط میں اس سے درخواست کی تھی کہ وہ ماسکو واپس نہ آئے بلکہ اس بہترین نرس کے ساتھ سیدھا یورال چلا جائے جس کی زندگی اس قسم کے معجزاتی شگونوں اور اتفاقات سے بھرپور تھی کہ خود تونیا کی سادہ زندگی اس کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی۔

یوری آندرے وچ نے اس کا جواب فوراً لکھا: ''تونیا، ضرور تمہارا دماغ چل گیا ہے! تم ایسی بات کس طرح سوچ سکتی ہو؟ تم نہیں جانتیں، کیا تم اچھی طرح نہیں جانتیں کہ اگر تمہارا تصور، اپنے گھر کا خیال میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں ہرگز جنگ کے دو خوفناک

اور تباہ کن سال نہ گذار سکتا؟ لیکن میں یہ کیوں لکھ رہا ہوں۔۔۔ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے ملیں گے، ہماری زندگی نئے سرے سے شروع ہوگی اور سارا معاملہ صاف ہو جائے گا۔"

☆☆☆

وہ ہسپتال جس میں ژوا گو اپنے علاج کے دوران رہا اس مکان میں واقع تھا جو پہلے کاؤنٹس زیرتسکایا کی رہائش گاہ تھی۔ اس کے عملہ میں سے اب صرف دو عورتیں رہ گئی تھیں۔ اوستینیا جو باورچن تھی اور فلوری جو پہلے کاؤنٹس کی لڑکیوں کی معلمہ تھی۔ فلوری، جس کے بال سفید، گال سرخ اور لباس بے ترتیب ہوتا تھا، سلیپر اور ڈھیلا ڈھالا پرانا لمبا کوٹ پہنے ادھر سے ادھر گھومتی رہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نرس انتی پووا کا ظاہر اور باطن اچھی طرح جانتی ہے اور یہ کہ نرس اور ڈاکٹر لازمی طور پر ایک دوسرے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسے جوڑے ملانے کا شوق تھا جو لاطینی ہونے کی نمایاں خصوصیات تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر اسے بہت زیادہ خوشی ہوتی۔

یوری آندرے وچ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ انقلابی فوجی عدالتیں قائم کر دی گئی تھیں اور سزائے موت جو پچھلے دنوں ختم ہو گئی پھر بحال کر دی گئی تھی۔ روانہ ہونے سے پہلے ڈاکٹر کو مقامی کمانڈنٹ سے ایک کاغذ حاصل کرنا تھا۔

ڈاکٹر کو یاد آیا کہ جلد ہی اسے انتی پووا سے باتیں کرنی ہیں۔ مادموزیل نے اسے بتایا کہ وہ تھکی ہوئی ہے۔ "لیکن اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو اوپر جا کر دروازہ کھٹکھٹا دیتی۔" مادموزیل نے مشورہ دیا۔ "اس کا کمرہ کون سا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ مادموزیل کو اس سوال سے اتنی حیرت ہوئی کہ وہ دم بخود رہ گئی۔ انتی پووا اوپر کی منزل میں راہداری کے آخری کمرے میں رہتی تھی، یہاں ڈاکٹر کبھی نہیں گیا تھا۔ اندھیرا ہوتا جا رہا تھا۔ باہر جھٹپٹے میں مکانوں اور احاطوں کے سائے ایک دوسرے میں خلط ملط ہو رہے تھے۔ کھڑکیوں سے چمکتے ہوئے لیمپوں کی روشنی کے اندر باغ میں درختوں کے سائے بڑھتے جا رہے تھے۔ رات گرم تھی اور کافی حبس تھا۔ ذرا سا کام کرنے سے پسینہ آنے لگتا تھا۔ مٹی کے تیل کے لیمپوں کی ہلکی ہلکی مدھم روشنی باہر احاطہ میں درختوں تک جا رہی تھی۔

ڈاکٹر زینہ کے اوپری سرے تک پہنچ کر رک گیا۔ اسے خیال آیا کہ انتی پووا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانا جبکہ وہ ابھی سفر سے واپس آئی تھی، مناسب نہیں۔ ایک تذبذب کے عالم میں وہ ٹہلتا ہوا راہ داری کے دوسرے سرے تک گیا جہاں ایک کھڑکی پڑوس کے صحن میں کھلتی تھی اور باہر جھانک کر دیکھنے لگا۔ رات پرسکون اور پراسرار آوازوں سے معمور تھی۔

تمام پھول ایک ساتھ مہک رہے تھے۔ پرانے لیموں کے پودوں کی تیز خوشبو آ رہی تھی اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ زندگی کے سحر انگیز خمیر کے ساتھ ہر چیز میں ابال آ رہا تھا۔ ہر چیز بڑھ رہی تھی اور پھسل رہی تھی۔ ہلکی ہلکی غذا کی مانند زندگی گذارنے کی مسرت کا جذبہ سارے میدانوں اور قصبوں، دیواروں اور احاطوں، جنگل اور گوشت پوست میں سے گزرتا ہوا ہر طرف بڑھ رہا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں وہ ان لہروں میں بہہ نہ جائے، یوری آندرے وچ باہر چوک میں تقریریں سننے چلا گیا۔

اس وقت چاند کافی اوپر آ گیا تھا۔ چوک کے گرد نصف دائرے میں بنی ہوئی ستونوں والی سرکاری عمارتوں کے بڑے سائے زمین پر سیاہ قالینوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ جلسہ چوک کے دوسری طرف ہو رہا تھا۔ مکانوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے باغیچوں میں اناج کی سرخ بالیاں کمروں تک پھیلی ہوئی تھیں، ان عورتوں کی طرح جو شب خوابی کے لباس میں ہوں اور مکان کے اندر حبس سے گھبرا کر تازہ ہوا کھانے باہر نکل پڑی ہوں۔

یہ چاندنی رات غیر معمولی قسم کی تھی۔ رحمدل، محبت پاش۔۔۔روشن ضمیری کے تحفہ کی طرح۔ اچانک اس رومانوی اور افسانوی سکوت میں نپی تلی، تال دار اور جانی پہچانی آواز سنائی دی جو اس نے ابھی کچھ عرصہ پہلے سنی تھی۔ یہ ایک دلکش اور پرجوش آواز تھی جس سے قطعیت ظاہر ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے یہ آواز سنی اور فوراً پہچان گیا۔ کومیسار جسٹس چوک میں جلسہ سے خطاب کر رہا تھا۔

وہ انتی پووا سے اگلے روز شام کو ملا۔ وہ اسے اسٹور میں ملی۔ اس کے آگے دھلے ہوئے کپڑوں کا ایک ڈھیر رکھا ہوا تھا جن پر وہ استری کر رہی تھی۔ انتی پووا، دونوں استریاں یکے بعد دیگرے استعمال کر رہی تھی اور ہر ایک کو باری باری چولہے پر رکھ دیتی تاکہ وہ گرم رہیں۔ "تم نے رات کو کنڈی کیوں نہیں کھٹکھٹائی۔ مادموزیل نے مجھے بتایا تھا۔ کیا حال ہے تمہارا؟"

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم سارے ہسپتال کے کپڑے دھوتی رہی ہو۔"

"نہیں۔۔۔ان میں میرے بھی بہت سے کپڑے ہیں۔ میں جا رہی ہوں۔ سامان باندھتے ہی تو میں روانہ ہو جاؤں گی۔ میں یورال میں ہوں گی اور تم ماسکو میں۔ ایک روز کوئی تم سے پوچھے گا کیا تم میلوزیو نام سے کسی چھوٹے سے قصبے سے واقف

ہو؟ اور تم کہو گے مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا، انتی پووا کون ہے؟ میں نے تو یہ نام تک نہیں سنا۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ اوہ، کاش میں کل رات ہی تم سے مل لیا ہوتا۔ میں تمہیں اپنی بیوی کے متعلق بتانا چاہتا تھا۔ اور لڑکے کے متعلق اور خود اپنے متعلق۔ آخر ایک جوان مرد ایک نوجوان عورت سے کسی قسم کے شکوک و شبہات پیدا کئے بغیر کیوں بات نہیں کر سکتا؟ اس پر گندے خیالات کا شبہ کیوں کیا جاتا ہے۔ خیر ان تمام خیالات پر لعنت بھیجو۔ ذرا سوچو تو ہمارے اردگرد کیا ہو رہا ہے اور یہ کہ تم اور میں ایک ایسے دور میں زندگی گزار رہے ہیں۔ سارے روس کے سر سے سایہ اٹھ گیا ہے۔ اور تم اور میں اور سب لوگ کھلے میں بیٹھے ہیں! اور ہماری جاسوسی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ آزادی جو ہماری توقع سے بھی زیادہ ہے، آزادی جو اتفاق سے اور غلط فہمی میں مل گئی ہے۔

''ہر شخص کے اندر ایک نئی روح پیدا ہوگئی۔ نئی زندگی مل گئی۔ ہر شخص بدل گیا۔ کایا پلٹ گئی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر شخص دو انقلابوں سے گذرا ہے۔ اس کا اپنا ذاتی انقلاب اور ایک عام انقلاب۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوشلزم ایک سمندر ہے اور یہ تمام دھارے۔ یہ نجی انفرادی انقلابات بہہ کر اس میں آ گرتے ہیں۔۔۔ زندگی کے سمندر، خودردی کے سمندر میں۔''

اس کی آواز اچانک کانپنے لگی جس سے اس کا بڑھتا ہوا اضطراب ظاہر ہوتا تھا۔ انتی پووا نے استری کرنا بند کر دیا اور سنجیدگی اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں تخلیقی کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس تمام بیداری کا ایک جزو بننا چاہتا ہوں۔ میری کس قدر خواہش ہے کہ تمہارے چہرے سے مجھے یہ پتہ چلے کہ تم اپنی قسمت پر خوش ہو۔ کاش کوئی ایسا شخص جو تم سے واقعی قریب ہو، تمہارا دوست یا تمہارا شوہر۔ بہتر تو یہی ہو گا کہ وہ ایک سپاہی ہو۔ میرا ہاتھ تھام کر کہے کہ میں تمہارے مقدر کے بارے میں فکر کرنا چھوڑ دوں اور تمہیں اپنی توجہات سے پریشان نہ کروں۔ لیکن میں اپنا ہاتھ چھڑا کر گھوم جاؤں گا۔''

ڈاکٹر کی آواز ایک بار پھر اس کی کیفیت قلبی کی غمازی کرنے لگی۔ اس نے تمام جدوجہد ختم کر دی اور پریشانی محسوس کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلا گیا۔

انتی پووا استری کرنے کے تختہ کے گرد چکر کاٹ کر گئی اور کمرے کے بیچ میں اس سے چند قدم پیچھے رک گئی۔ ''مجھے ہمیشہ ہمیشہ سے اسی چیز کا خوف رہا ہے۔ نہیں، یوری آندرے وچ، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اوہ ذرا دیکھو تو تم نے مجھ سے کیا کرا دیا۔'' وہ بھاگ کر تختہ کے پاس گئی جہاں استری کے نیچے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک بلاؤز جل گیا تھا۔ ''یوری آندرے وچ!'' وہ کہنے لگی۔ ''میں نے جیسا تمہیں آج تک پایا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آئندہ بھی ویسے ہی رہو۔ مہربانی کر کے ایسا ہی کرو۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں۔'' ایک ہفتہ بعد لاریسا فیودورونا وہاں سے روانہ ہوگئی۔

کچھ عرصہ بعد ژواگو بھی گھر روانہ ہوگیا۔ جس روز وہ روانہ ہوا اس سے قبل رات کو ایک خوفناک طوفان آیا۔ ہوا کی سنسناہٹ اور مینہ برسنے کی آوازیں ملی جلی آ رہی تھیں۔ بارش کبھی تیزی سے مکانوں کی چھتوں پر ہوتی اور کبھی بدلتی ہوئی ہوا کی وجہ سے اس کا رخ سڑک کی طرف ہو جاتا تھا۔ بادل برابر گرج رہے تھے۔ مسلسل چمکتی ہوئی بجلی کی روشنی میں سڑک دور فاصلہ میں گم ہوتی دکھائی دیتی تھی اور جھکے ہوئے درخت بھی اسی سمت میں بھاگتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

قصبے پر بادل اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے ان کا تعاقب کیا جا رہا ہو، وہ اتنے نیچے تھے کہ بالکل درختوں کی چوٹیوں کو چھوتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ بارش، مکان کی لکڑی کی دیوار پر کوڑے چلا رہی تھی اور اس کا بھورا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک عام روایت تھی کہ بریوچی کا ٹیلیگراف کلرک کولیا اسٹیشن پر ہونے والی گڑبڑ کا ذمہ دار تھا۔ کولیا میلیوزیود کے ایک مشہور گھڑی ساز کا لڑکا تھا۔ مادموزیل فلیوری بھی اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ میلیوزیود میں ہر شخص اسے بغیر کوٹ اور ہیٹ کے اور کینوس کے جوتے پہنے ہوئے ہر موسم میں بائیسکل پر گھومتے ہوئے دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ سڑک پر تیزی سے بائیسکل چلاتا اور ساتھ ہی ساتھ ٹیلیگراف کے کھمبوں اور تاروں کو غور سے دیکھتا جاتا تھا۔ اسٹیشن کے سوئچ بورڈ پر تمام کالیں کولیا ملایا کرتا تھا۔ بلکہ اسٹیشن ماسٹر کچھ دیر کے لیے غیر حاضر ہو جاتا تو ریلوے سگنلوں کی دیکھ بھال اسی کو کرنی پڑتی تھی جن کا انتظام اسی کنٹرول روم سے ہوتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جس روز فسادات ہوئے اس نے اپنے ان اختیارات سے بہت ناجائز فائدہ اٹھایا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ معلومات بہم نہ پہنچا کر اس نے جلیلین کے نیک ارادوں کو ناکام بنا دیا۔ جلیلین نے قصبہ سے ٹیلیفون کر کے کومیسار جنٹس سے بات کرنی چاہی تھی۔ کولیا نے یہ بہانہ کیا کہ وہ ایک آنے والی ٹرین کا سگنل دے رہا ہے اور کومیسار کو بلانے سے انکار کر دیا۔ اس ٹرین میں قازق سپاہی آ رہے تھے جنہیں بریوچی طلب کیا گیا تھا۔ ریل

کا انجن پلیٹ فارم کی تاریک چھت کے نیچے آہستہ آہستہ چلتا ہوا کنٹرول روم کی بڑی کھڑکی کے سامنے آ کر ٹھہر گیا۔ ہنہناتے ہوئے گھوڑے مال کے ڈبوں سے باہر نکالے گئے۔

کمانڈر کا حکم ملتے ہی قازق اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور گھوڑے دوڑاتے ہوئے کھلی جگہ پر پہنچ گئے۔ 212ویں رجمنٹ کے باغیوں کو گھیر لیا گیا۔ پیدل فوج کے سپاہی انہیں دیکھ کر مرعوب ہو گئے۔ قازقوں نے اپنی تلواریں کھینچ لیں۔ گھوڑے ایک دائرے کی شکل میں کھڑے ہوئے تھے۔ جنٹس اس ڈھیر پر چڑھ گیا اور محصور فوجیوں سے خطاب کرنے لگا۔ سینکڑوں آوازوں نے مل کر شور مچایا۔ ''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ خاموش ہو جاؤ۔ بس اتنا کافی ہے۔'' لیکن تنفر اور جذباتی قسم کے لوگ باقی لوگوں پر حاوی آ گئے تھے۔ ''اس کی ہمت تو دیکھو! بالکل پرانے زمانہ کی سی باتیں! اچھا تو ہم باغی ہیں؟ اور یور ایکسلینسی، تم خود کیا ہو؟''

قازقوں کو بھی جنٹس کی بے محل تقریر پسند نہیں آئی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر سپاہیوں نے اپنی تلواریں میانوں میں رکھنی شروع کر دیں۔ ''تم فوراً یہاں سے خاموشی کے ساتھ کھسک جاؤ۔'' قازق افسروں نے پریشانی کے عالم میں جنٹس سے کہا۔ ''تمہاری کار اسٹیشن پر ہے۔ ہم وہ تمہارے لیے بھیج دیں گے۔ جلدی کرو۔'' جنٹس روانہ ہو گیا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس طرح چھپ کر نکل جانا اس کے وقار کے منافی ہو گا۔ اس لیے وہ علانیہ اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

سپاہی رائفلیں لیے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ ''یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے سوچا اور اپنی رفتار تیز کر دی۔ اس کا تعاقب کرنے والوں نے بھی رفتار تیز کر دی۔ ان کا درمیانی فاصلہ بھی اسی قدر رہا۔ جس ٹرین میں قازق آئے تھے اسے اس لائن پر سے ہٹا دیا گیا تھا۔ لائنیں صاف تھیں۔ اس نے بھاگتے ہوئے ان لائنوں کو پار کیا اور پلیٹ فارم پر چڑھ گیا۔

ایک مرتبہ پھر اس کا احساس خودداری، جو اس کا خاندانی اور نسلی ورثہ تھا اور جو شہری زندگی کی ایک خصوصیت تھا، جاگ اٹھا اور اسے ایسی قربانی دینے پر مجبور کرنے لگا جو اس موقع پر بالکل بے محل تھی۔ اس طرح حفاظت کے تمام دروازے اس پر بند ہو گئے۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی آخری کوشش کی۔ اسٹیشن کے دروازے پر گھنٹی کے نیچے پانی کا ایک پیپہ رکھا ہوا تھا کہ آگ لگ جانے کی صورت میں کام آ سکے۔ جنٹس اس پیپے کے اوپر چڑھ گیا اور آنے والے سپاہیوں کو مخ[illegible] تقریر کرنے لگا۔ اس کی مصنوعی آواز سن کر اور اس کے پاگل پن کی حد تک جرات مندانہ اقدام کو دیکھ کر، جب کہ وہ دو قدم آگے بڑھ کر آسانی سے اسٹیشن میں پناہ لے سکتا تھا سپاہی بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ جنٹس جو ڈھکنے کے سرے پر کھڑا ہوا تھا، پھسل گیا۔ اس کی ایک ٹانگ پانی میں اور دوسری پیپے کے کنارے پر لٹک گئی۔ سپاہیوں نے قہقہے لگائے اور ان میں سے ایک نے جو سب سے آگے تھا، جنٹس کی گردن میں گولی مار دی۔

☆☆☆

جس روز یوری آندرے وچ روانہ ہوا، اس دن بہت حبس تھا۔ ویسا ہی طوفان آنے والا تھا جیسا کہ دو روز قبل آیا تھا۔ مٹی کے جھونپڑے اور ٹخنیں آسمان کی سیاہی میں سفید اور خوفزدہ دکھائی دے رہی تھیں۔ اسٹیشن کے سامنے اور دونوں طرف وسیع میدان میں کثیر تعداد میں لوگ جمع تھے جو ہفتوں سے ٹرینوں کا انتظار کر رہے تھے۔

اسٹیشن ماسٹر نے کسی ہمدردی کے بغیر ڈاکٹر سے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ اس ٹرین میں جگہ ملنے کی امید نہیں ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ ہجوم آپ کو کچل کر مار ڈالے گا۔ میں آپ کو ایک لوکل ٹرین سے بھیج دیتا ہوں۔ ٹرین تیار ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے متعلق ایک لفظ بھی اس وقت تک منہ سے مت نکالیے۔ یہ لوگ ٹرین تیار ہونے سے پہلے ہی اسے توڑ کر برابر کر دیں گے۔ آپ کو آج رات سوخی نیچی میں گاڑی بدلنی ہو گی۔''

جب ''خفیہ ٹرین'' ریلوے شیڈ میں سے نکل کر اسٹیشن پر آئی تو سارا مجمع لائنوں پر آ گیا۔ لوگ پہاڑیوں پر سے سنگریزوں کی طرح لڑھکتے ہوئے آئے۔ سوخی نیچی تک تمام راستہ وہ اسی جگہ اپنے سامان پر بیٹھا رہا۔ ہر طرف لوگ چلا رہے تھے گانے گا رہے تھے لڑ رہے تھے اور تاش کھیل رہے تھے۔ جب بھی ٹرین رکتی باہر کے مسافروں کا شور اس میں اور اضافہ کر دیتا۔

اس رات سوخی نیچی کا ایک ریلوے قلی جس کی ہمدردی کی عادت جنگ کے زمانہ میں بھی تبدیل نہیں ہوئی تھی، ڈاکٹر کو اپنے ساتھ لے کر اندھیرے میں ریل کی پٹڑیوں پر سے، ہوتا ہوا، ایک ٹرین کے پاس لے گیا جو اسی وقت آئی تھی، اور اسے سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں بٹھا دیا۔ یہ پراسرار ٹرین ایک ''اسپیشل'' تھی جس کی رفتار کافی تیز تھی اور اسٹیشنوں پر بہت کم ٹھہرتی تھی۔ ٹرین پر ایک مسلح محافظ دستہ بھی سفر کر رہا تھا اور ڈاکٹر کا ڈبہ تقریباً خالی تھا۔ ژواگو کے ڈبہ میں ایک موم بتی روشن تھی جو ایک چھوٹی سی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ اسی کا شعلہ کھلی ہوئی کھڑکی سے آنے والی ہوا میں کانپ رہا تھا۔ یہ موم بتی ڈاکٹر کے دوسرے واحد ہمسفر کی تھی جو ایک سیاہ بالوں والا نوجوان تھا۔ جب ژواگو اندر آیا تو وہ اخلاقاً کھڑا ہو گیا اور پھر سنبھل کر بیٹھ

گیا۔

نوجوان نے اس سے دریافت کیا کہ اگر روشنی کی وجہ سے اسے نیند نہ آتی ہو تو وہ موم بتی بجھا دے۔ ڈاکٹر نے اس کی یہ پیشکش منظور کر لی، اس کا شکریہ ادا کیا، اور ڈبے میں تاریکی چھا گئی۔

ٹرین پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ سامنے سے آنے والی ہوا کھلی ہوئی کھڑکی سے ڈبہ میں داخل ہو رہی تھی۔ ہوا سے یوری آندرے وچ کے بال بکھر گئے۔ اور ان میں مٹی بھر گئی۔ اسٹیشن پر، دن کی طرح رات کے وقت بھی مسافروں کی بھیڑ ٹرین کو گھیر لیتی تھی اور لیموں کے درخت سرسراتے رہتے۔

ڈاکٹر کی آنکھ گیارہ بجے سے پہلے نہیں کھلی۔ ''پرنس پرنس'' اس کا ہم سفر آہستہ آہستہ اپنے کتے کو چمکار رہا تھا جو اس وقت بھونک رہا تھا۔ یوری آندرے وچ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس وقت بھی ڈبہ میں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ کوئی دوسرا مسافر داخل نہیں ہوا تھا۔ اسٹیشنوں کے ناموں سے وہ بچپن ہی سے واقف تھا۔ وہ اب کلوگا کے صوبہ سے نکل کر ماسکو کے صوبہ میں داخل ہو چکے تھے۔ اس باتونی شخص نے ژواگو کو بتایا کہ وہ ہر چیز میں خواہ زندگی ہو، سیاست ہو یا آرٹ ہو، انتہا پسند واقع ہوا ہے۔ اس نے اپنی جیب سے دو کارڈ نکالے اور یوری آندرے وچ کو دے دیئے۔ ایک اس کا ملاقاتی کارڈ تھا۔ اس کے دو نام تھے، وہ میکسیم پوگور یوشک یا صرف پوگور یوشک کہلاتا تھا۔ دوسرے کارڈ میں ایک جدول تھا جس میں چوکور خانے بنے ہوئے تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک میں دو ہاتھ بنے ہوئے تھے جو مختلف طریقوں سے ملے ہوئے تھے۔ اور ان کی انگلیاں مختلف طریقوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ یہ گونگے بہروں کے لیے حروف تہجی تھے۔ اچانک ہر بات بالکل واضح ہو گئی۔ پوگور یوشک ہارٹ مین یا آسترو گریڈوف کے اسکول کا ایک غیر معمولی قسم کا شاگرد تھا جو اپنے استادوں کے گلے کی نسیں دیکھ کر گفتگو کرنا اور سمجھنا سیکھ گیا تھا۔

جنگلات پیچھے رہ گئے تھے۔ ٹرین پتوں سے بنی ہوئی سرنگ سے باہر کھلے میدان میں نکلی۔ ایک ڈھلواں میدانی نشیب سے ابھر کر ایک وسیع پہاڑی کی طرف جاتی دکھائی دیتی۔ اس میدان میں آلوؤں کے کھیت تھے۔ ان سے پرے پہاڑی کی چوٹی پر غیر دلچسپ قسم کے ڈھانچے تھے۔ اچانک بادلوں سے گرم اور تیز بارش ہونے لگی جو سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ بارش تیزی سے ہو رہی تھی اور بارش کے قطروں کی ٹپ ٹپ تیز رفتار ٹرین کی آواز سے مقابلہ کر رہی تھی کہ کہیں وہ گاڑی سے پیچھے نہ رہ جائے۔ اور ایک ہی منٹ بعد شہر کے گنبد، چمنیاں، چھتیں اور مکانات بھی دکھائی دینے لگے۔

''ماسکو!'' اس نے ڈبہ کے اندر واپس آتے ہوئے کہا ''اب تیار ہو جانا چاہیے۔'' ٹرین اسٹیشن پر پہنچ کر رک گئی۔ ڈبہ میں اندھیرا چھا گیا۔ گونگے بہرے نوجوان نے جنگلی مرغابی جو کسی چھپے ہوئے پوسٹر کے پھٹے ہوئے ورق میں لپٹی ہوئی تھی، اس کی طرف بڑھا دی۔

ماسکو کا مورچہ

ٹرین میں ژواگو نے محسوس کیا تھا کہ صرف ٹرین حرکت میں ہے اور وقت ساکت ہے۔ اس کا اندازہ تھا کہ یہ دوپہر کا وقت ہے لیکن جب وہ گاڑی سے اتر کر بگھی میں سوار ہونے کے بعد گنجان آباد علاقہ سے گذر رہا تھا تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ ژواگو کی گاڑی ایک کھلے چوک سے ایک تنگ گلی میں داخل ہوئی۔ ان کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ سڑکوں کے کنارے اور خود سڑکوں پر پرانے اخباروں، دیواروں سے پھاڑے ہوئے پوسٹروں اور مکانوں کے گرد کٹی ہوئی حد بندیوں اور جھاڑیوں کے ڈھیر دیکھ کر ژواگو حیران رہ گیا۔

یوری آندرے وچ جب گاڑی سے اترا تو مارے جوش کے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ مکان کے دروازے پر آیا اور زور سے گھنٹی بجائی اور ابھی وہ گھنٹی بجا ہی رہا تھا کہ اس کی بیوی انتونینا الیگزینڈر انے دروازہ کھولا۔ دروازے کے دونوں پٹ کھولتے ہوئے اس نے اپنے دونوں بازو پوری طرح پھیلا رکھے تھے۔ دونوں کی یہ ملاقات اتنی غیر متوقع تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر چیخے مگر دونوں میں سے کسی نے بھی دوسرے کی آواز نہیں سنی، لیکن جلد ہی دونوں سنبھلے اور بے قراری کے ساتھ بغلگیر ہوئے اور تھوڑی دیر بعد مدت کے بعد ملنے والے میاں بیوی آپس میں محو گفتگو تھے۔

ماسکو میں ژواگو کے لیے اہم ترین چیز اس کا ننھا منا بیٹا تھا۔ ساشنکا کی پیدائش کے تقریباً ساتھ ہی ژواگو کو فوج میں جبری طور پر بھرتی کر لیا گیا تھا لہٰذا بیٹا باپ سے قطعی ناواقف تھا۔ ایک دن جب تونیا ابھی زچہ خانہ ہی میں تھی تو وہ یونیفارم پہنے اپنی بیوی سے ملنے گیا تھا کیونکہ وہ ماسکو سے روانہ ہونے والا تھا۔ جب وہ ہسپتال پہنچا تو بچوں کو دودھ پلانے کا وقت تھا لہٰذا اسے اندر جانے کی اجازت نہ مل سکی۔

اگلے چند روز میں اسے پتہ چلا کہ وہ خاصی اداسی اور تنہائی محسوس کرتا ہے۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس نے جو مانگا تھا

وہی اسے ملا۔ اس کے پرانے دوست بہت روکھے پھیکے اور بے جان سے ہوگئے تھے۔ کسی کا اپنا ذاتی نظریہ نہیں رہا تھا۔ کسی کی اپنی الگ دنیا نہیں رہی تھی۔ یوری آندرے وچ اب جن لوگوں کو اپنے قریب سمجھتا اور جن سے وہ مانوس تھا وہ اس کی بیوی، بیوی کے والد اور ان کے دو تین معمولی کام کاج کرنے والے دوست تھے جو بلند بانگ دعاوی اور تقاریر کے عادی نہیں تھے۔ ژواگو کی واپسی کے چند روز بعد بطخ کے گوشت کی پارٹی حسب فیصلہ دی گئی۔ اس وقت تک وہ اپنے تمام پرانے احباب سے مل چکا تھا۔ ان دنوں جب لوگ کھانے کو ترس رہے تھے ایک بڑی بطخ کے گوشت کی دعوت واقعی ایک نعمت غیر مترقبہ تھی لیکن اس کے ساتھ روٹی نہیں تھی، لہٰذا پارٹی کی ساری شان کرکری ہوکر رہ گئی اور لوگ اس عظیم دعوت میں بھی روٹی کو یاد کرتے رہے۔

اس دعوت کی سب سے زیادہ پرکشش شخصیت ماموں کولیا کی تھی۔ انتونینا الیگزینڈرونا کا یہ خیال غلط تھا کہ وہ شہر سے گاؤں گیا ہوا ہے کیونکہ وہ اپنے بھانجے کی آمد کے روز ہی شہر واپس آ گیا تھا۔

نکولائی نکولائی وچ کو گذشتہ دس سال میں تخلیقی تحریر کے موضوع پر اطمینان و آزادی سے بات چیت کرنے کا آج سے بہتر موقع کبھی نہیں ملا تھا اور نہ ہی اس عرصہ میں یوری آندرے وچ نے اتنی تاثیر انگیز باتیں سنی تھیں۔ ان کی بات چیت حیرت و استعجاب میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اگست کے بعد ستمبر کا مہینہ بھی ختم ہونے والا تھا۔ خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا اور سرما کا بھیانک موسم تقریباً آن ہی پہنچا تھا۔ لوگ سردیوں کی قیامت خیزی کا مقابلہ کرنے کے لیے لکڑیاں اور اناج جمع کر رہے تھے، لیکن مادیت کی فتح کے ان ایام میں کسی موضوع یا کیفیت کی تجسیم یا مادی شکل میں اظہار کا رواج ہی نہ رہا تھا۔ اغذیہ اور ایندھن کی سپلائی نے غذا اور جلانے کی لکڑی کی جگہ لے لی تھی۔ شہروں میں رہنے والے لوگ شیر خوار بچوں کی طرح بیکس و مجبور تھے۔ اس غیر یقینی حالت نے زندگی کے ہر شعبہ کو مفلوج و معطل بنا کر رکھ دیا تھا۔ ہر جانب لوگ خود فریبی کے مرض میں مبتلا تھے۔ لنگڑاتی اور گھسٹتی ہوئی زندگی لیکن ڈاکٹر نے اس زندگی کو اس کے اصلی خدوخال میں دیکھا تھا۔ اس پر واضح ہو چکا تھا کہ سزا کا فیصلہ سنایا جا چکا ہے۔ مستقبل میں زبردست آزمائشوں سے سابقہ پڑنے والا ہے اور شاید موت سے بھی۔ وہ روزمرہ کی زندگی کے معمولات میں مصروف نہ ہوتا تو شاید اب تک پاگل ہو گیا ہوتا۔

ہسپتال کا عملہ پہلے ہی سے کئی گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ اعتدال پسند جن کی کند ذہنی پر ڈاکٹر برہم ہو جاتا تھا اسے خطرناک سمجھتے اور جن لوگوں کی سیاست بہت ''ترقی'' کر چکی تھی وہ کہتے تھے کہ ڈاکٹر ابھی پورا سرخا (کمیونسٹ) نہیں بنا۔ اس طرح اس کا کسی بھی گروہ سے تعلق نہ تھا۔ وہ اول الذکر سے الگ ہو گیا اور آخرالذکر سے پیچھے رہ گیا تھا۔

ژواگو اسٹاف روم کی کھڑکی کے برابر اپنی پرانی میز پر بیٹھتا جو ہر قسم کے نقشوں اور فارموں سے پٹی رہتی تھی۔ بعض اوقات وہ اپنے طبی پیشہ کے بارے میں کچھ لکھنے کے علاوہ اپنی نظموں کے چھوٹے چھوٹے بند بھی لکھتا رہتا۔ ایک عنوان تھا ''بونے اور قدآور'' جو اس زمانے کی ایک حزنیہ یادداشت تھی جس میں نظم ونثر اور سبھی کچھ موجود تھا۔ ڈاکٹر کے روشن کمرہ کی دیواروں میں سفید قلعی بھری ہوئی تھی اور اس میں سنہری خزاں کی دودھیا روشنی بھری ہوئی تھی۔ عید سعید مقدسہ مریم کے بعد موسم اسی قسم کا ہوتا ہے۔ صبح کے وقت کہر ہوتی ہے اور ہر روز زیادہ سے زیادہ پتوں سے محروم ہونے والے جنگلوں میں نیل کنٹھ سنہرے پتوں کو دیکھ کر چہچہاتے رہتے ہیں۔ ایسے ایام میں آسمان ناقابل یقین حد تک بلند کھائی دیتا ہے اور زمین و آسمان کے درمیان ہوا کا جو صاف شفاف ستون ہوتا ہے اس پر شمال کی جانب سے آنے والی برفانی اور گہری نیلی شعاعیں متحرک دکھائی دیتی ہیں۔

اس جگہ ڈاکٹر واقعی نت نئے واقعات سے دوچار ہوتا تھا۔ ایک سرد اور تاریک رات کو اکتوبر کی لڑائی سے کچھ پہلے اس نے ایک آدمی کو فٹ پاتھ پر بیہوش پڑا پایا۔ سر کے پاس ایک بڑا سا پتھر تھا جس سے اسے زخمی کیا گیا تھا۔ سرسری جائزہ سے معلوم ہوا کہ اس کی کھوپڑی صحیح سالم تھی۔ ژواگو اربات کے دواخانے گیا جہاں سے اس نے گاڑی کے لیے ٹیلیفون کیا جو ہنگامی حالت میں مریضوں کو اسپتال لانے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ ڈاکٹر گاڑی میں زخمی کو اسپتال لایا، وہ ایک ممتاز سیاسی لیڈر نکلا۔ ڈاکٹر نے اس کا علاج کیا اور آخر وہ صحت یاب ہو گیا۔ اس کے بعد کئی سال تک یہ آدمی ڈاکٹر کا محافظ بنا رہا۔ اس نے کئی مرتبہ ڈاکٹر کو مصیبتوں سے بچالیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر شخص شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

تین سال لگاتار قیامت خیز سردی پڑی۔ یکے بعد دیگرے تین سال۔ آج جو معلوم ہو رہا ہے کہ 1917ء اور 1918ء میں ہوا تھا وہ واقعی سب کچھ اس زمانہ میں نہیں ہوا۔۔۔۔ بہت سی باتیں غالباً اس کے بعد میں ہوئی ہوں۔ یہ تینوں سال مل کر ایک ہو گئے ہیں اور سب کا الگ الگ تذکرہ کرنا بہت مشکل ہے۔ پرانے اور نئے نظام ابھی ایک دوسرے سے دوچار نہیں ہوئے تھے، وہ ابھی کھل کر ایک دوسرے کے مخالف بھی نہیں تھے کیونکہ جب ایک سال بعد خانہ جنگی

شروع ہوئی تو ان دونوں میں کوئی ربط قائم نہیں ہوا تھا۔ یہ دونوں نظام ایک دوسرے کے سامنے بالکل الگ کھڑے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی پوری ضد۔ ہر جگہ نئے انتخابات ہو رہے تھے۔ عمارتوں، ہر طرح کے اداروں، سرکاری دفتروں اور پبلک سروسوں کے نظم و نسق کے لیے ہر جگہ کو میسار مقرر کئے گئے جن کو آمرانہ اختیارات دیئے گئے تھے۔

ایک کمپنی کے بعد دوسری کمپنی اور ایک صنعتی ادارے کے بعد دوسرا ادارہ بالشویک نظام میں ڈھلنے لگا۔ ہولی کراس کا ہسپتال اب سیکنڈ ریفارمڈ کہلانے لگا۔ ایک عرصہ تک لوگ گھٹیا قسم کی چھوٹی مچھلی کے سر کے شوربے کے ساتھ پانی میں ابلا ہوا باریک باجرہ کھا کھا کر گذارہ کرتے رہے۔ ژواگو اور اس کی بیوی کو انتہائی صبر آزما اور ہمت شکن حالات سے گذرنا پڑا۔ ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا اور نوبت فاقہ کشی تک آ پہنچی۔ ڈاکٹر اس پارٹی ممبر سے ملنے گیا جسے اس نے ایک مرتبہ بچایا تھا، وہی جس کو چور زخمی کر گئے تھے۔ اس شخص نے ڈاکٹر کی مدد کے لیے جو کچھ ممکن تھا کیا۔ لیکن اب خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی اور یہ شخص بمشکل کبھی کبھار ہی ماسکو میں قیام کرتا۔ اس کے علاوہ اس کا خیال تھا کہ اس وقت لوگوں کو جس دور ابتلا سے گذرنا پڑ رہا ہے وہ بالکل قدرتی سی بات ہے۔

ایک دن اسے سرکاری قیمت پر لکڑی کا کچھ کوٹا ملا۔ ایک ٹھیلے میں ان قیمتی لکڑیوں کو لاد کر آ رہا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ وہ کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف جھک کر چل رہا ہے اس کی ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ اسے پتہ چل گیا کہ مصیبت آ گئی ہے۔ اسے ٹائفس ہو گیا تھا۔ ذرا آگے چل کر ڈاکٹر گر پڑا اور ٹھیلے والے نے اٹھا کر اسے لکڑی کے ڈھیر کے اوپر لٹا دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کو کچھ ہوش نہیں رہا کہ وہ گھر کیوں کر پہنچا۔

تقریباً دو ہفتے تک اس پر کچھ وقفوں کے ساتھ ہذیانی کیفیت طاری رہی۔ اس نے خواب دیکھا کہ تونیا نے دو گلیاں اٹھا کر اس کی میز پر رکھ دی ہیں اور ٹیبل لیمپ جلا دیا ہے جس کی نارنگی رنگ کی لو سے ساری گلی روشن ہو گئی اور اب وہ لکھ سکتا ہے، چنانچہ وہ لکھنے لگا۔

اس سال اپریل میں ژواگو اپنے خاندان کو لے کر واری کینو کی سابق جاگیر کی طرف چل کھڑا ہوا جو کہ وہاں سے بہت دور کوہ یورال میں یوریاتن کے شہر کے قریب واقع تھی۔

سفر

مارچ کے مہینہ کے آخر میں موسم گرم ہو گیا۔ موسم بہار کی آمد کے چھوٹے آثار تھے جس کے بعد ہمیشہ کڑاکے کی سردی پڑا کرتی تھی۔ ژواگو اور اس کے گھر والے تیزی سے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

یوری آندرے وچ یروسلاوسکی اسٹیشن پر معلومات حاصل کرنے گیا۔ لکڑی کے جنگلوں کے درمیان بنائے ہوئے راستہ پر مسافروں کی طویل قطاریں دکھائی دے رہی تھیں۔ پتھریلے فرش پر لوگ بڑے بڑے فوجی کوٹ پہنے لیٹے کھانس رہے تھے۔ تھوک رہے تھے۔ ادھر ادھر ہل رہے تھے یا ایسی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے جو محراب دار چھت کے اندر گونج رہی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ ایسے تھے جو پچھلے دنوں ٹائفس بخار میں مبتلا رہ چکے تھے، اور جنہیں حالت ذرا بہتر ہوتے ہی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ہسپتالوں سے خارج کر دیا گیا تھا۔

جس روز یہ لوگ روانہ ہوئے، اس سے ایک روز قبل برف کا طوفان آیا۔ کالے برفانی بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے، برف گر رہی تھی اور اس نے تاریک سڑکوں کو سفید کفن اڑھا دیا تھا۔ تمام سامان بندھ چکا تھا۔ مکان اور اس میں چھوڑی جانے والی چیزیں ایک معمر شخص اور اس کی بیوی کی حفاظت میں دی جا رہی تھیں۔ میزیں اور کرسیاں دیواروں کے ساتھ لگا دی گئی تھیں۔ پردے اتار لیے گئے اور کونے میں بنڈلوں کا ایک ڈھیر رکھا تھا۔ برف کا طوفان جو کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے نظر آ رہا تھا، ان میں سے ہر ایک کو گذری ہوئی تکالیف کی یاد دلا رہا تھا۔

یہ لوگ سورج نکلنے سے پہلے ہی اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ ابھی اندھیرا ہی تھا۔ ہوا کم ہو گئی تھی اور گذشتہ رات سے بھی زیادہ تیز برفباری ہو رہی تھی۔ برف کے بڑے بڑے گالے اوپر سے گر کر زمین پر چپک جاتے تھے۔ لوگوں کی قطاریں، پلیٹ فارم کے پھاٹکوں تک چلی گئی تھیں لیکن مسافروں کو پٹری پر تقریباً آدھ میل آگے جا کر ٹرین پر سوار ہونا تھا۔ صفائی کرنے والوں کی کمی کی وجہ سے اسٹیشن بہت غلیظ ہو رہا تھا۔ پلیٹ فارم پٹریوں پر گرد اور برف کے ڈھیروں کی وجہ سے ناقابل استعمال ہو گیا تھا۔

☆☆☆

یہ لوگ تین دن سے سفر کر رہے تھے لیکن ابھی تک ماسکو سے زیادہ دور نہیں پہنچے تھے۔ سارے علاقہ پر موسم سرما کے اثرات نمایاں تھے۔ ریل کی پٹریاں، کھیت، جنگل اور گاؤں کے مکانوں کی چھتیں غرضیکہ ہر چیز برف پوش تھی۔ ژواگو اور اس کے گھر والوں کی خوش قسمتی سے اوپر کی برتھ پر ایک کونہ خالی مل گیا تھا جو دھندلی سی کھڑکی کے پاس اوپر چھت کے قریب تھی۔ تونیا نے اس سے پہلے کبھی مال گاڑی میں سفر نہیں کیا تھا۔ ڈبہ ایک پہیئے دار سٹور خانہ سے

زیادہ بہتر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ٹرین میں تیس ڈبے تھے (ژواگو اوراس کے گھر والے چودہویں ڈبہ میں تھے) جب ٹرین دیہات کے کسی اسٹیشن پر ٹھہرتی تو سامنے درمیان یا آخر کے صرف چند ڈبے ہی چھوٹے سے پلیٹ فارم کے سامنے رکتے تھے۔ ملاح سامنے کے ڈبوں میں تھے۔ شہری مسافر درمیانی ڈبوں میں اور جبری طور پر بھرتی کیے ہوئے مزدور آخری آٹھ ڈبوں میں تھے۔ یہ لوگ تعداد میں تقریباً پانچ سو تھے اور ان میں ہر عمر، درجہ اور ہر پیشہ کے لوگ شامل تھے۔ یہ بھی ایک غیر معمولی منظر تھا۔ پیٹروگراڈ کے دولت مند اور ذہین وکلاء اور دلال، گاڑی بانوں، فراشوں، حجاموں، مفرور پاگلوں، دوکانداروں اور راہبوں کے ساتھ ایک جگہ بھر دیئے گئے تھے۔

چودہویں ڈبہ میں بھی جبری طور پر بھرتی کیے ہوئے کئی مزدور تھے۔ ان کے ساتھ ان کا محافظ وردنیک بھی تھا۔ ان میں سے تین آدمی باقیوں میں سب سے الگ دکھائی دیتے تھے۔ ایک تو خریتو نووچ پریتویف تھا جو پیٹروگراڈ میں شراب کے ایک سرکاری گودام میں خزانچی رہ چکا تھا۔ دوسرا واسیا بریکن تھا جو ایک سفید بالوں والا انقلاب پرست تھا۔ یہ پچھلی حکومت کے تمام جبری محنت کے کیمپوں میں رہ چکا تھا اور اب نئی حکومت کے جبری محنت کے کیمپوں کا تجربہ حاصل کر رہا تھا۔

جب وہ لوگ وسطی روس کو پیچھے چھوڑ کر مشرق کی طرف بڑھے تو عجیب وغریب باتیں ظہور پذیر ہونے لگیں۔ اب وہ ایک ایسے علاقے سے گذر رہے تھے جہاں ہر طرف بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور جو مسلح فوجی گروہوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ان دیہات کے پاس سے ہو کر گزرے جہاں حال ہی میں بغاوتوں کو کچل دیا گیا تھا ٹرین اکثر راستہ میں کسی بھی جگہ پر کھڑی ہو جاتی اور حفاظتی گشتی دستے مسافروں کے کاغذات اور سامان کی جانچ پڑتال کرنے لگتے۔ ایک مرتبہ تو وہ رات کو ٹھہر گئے لیکن نہ تو کوئی شخص آیا اور نہ کسی کو پریشان کیا گیا۔

اگلے روز ٹرین، آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی چلی کہ کہیں پٹری پر سے نہ اتر جائے کیونکہ پٹری پر برف پڑی ہوئی تھی پھر ایک بے جان اور آتشزدہ عمارت کے ڈھیر کے سامنے رک گئی۔ نزنی کلمز اسٹیشن جل کر تباہ ہو چکا تھا اور یہ اسی عمارت کا ملبہ تھا۔ اس کا نام اب بھی سیاہ پڑی ہوئی عمارت اور ذرا مشکل کے ساتھ پڑھا جا سکتا تھا اس سے آگے ایک گاؤں تھا جس کے مکین اسے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ ساری سڑک پر ٹوٹی ہوئی برفانی گاڑیاں، جنگلے، لوہے کے زنگ آلود ٹکڑے اور ٹوٹا ہوا فرنیچر پڑا تھا۔ وہ مقام دراصل اتنا بے جان نہیں تھا جیسا کہ دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی کچھ لوگ وہاں موجود تھے۔ ملبہ میں سے اسٹیشن ماسٹر نمودار ہوا اور گارڈ ٹرین میں سے کود کر اس کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔ ''یہ ساری عمارت جل گئی؟''

''ہاں، آگ تو ضرور لگی تھی لیکن معاملہ اس سے بھی بدتر تھا۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''بہتر ہے کہ کوشش بھی نہ کرو۔''

''تم مذاق کر رہے ہو! میں متبادل آدمی محاذ پر لیے جا رہا ہوں۔ یہ ایک فوری معاملہ ہے۔''

''میں قطعی مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ یہاں ایک ہفتہ تک برف کا سخت طوفان آتا رہا ہے۔ تمام لائن پر برف کے ڈھیر جمے ہوئے ہیں اور اسے کوئی صاف کرنے والا نہیں ہے۔ گاؤں کے آدھے لوگ بھاگ گئے۔ میں باقی لوگوں کو اس کام پر لگا دوں گا۔ لیکن یہ کافی نہیں ہوگا۔''

ریلوے لائن صاف کرنے میں تین دن لگ گئے اور ژواگو اور اس کے سب گھر والوں نے یہاں تک کہ نیوشا نے بھی اس میں حصہ لیا۔ یہ ان کے سفر کے بہترین تین دن تھے۔ میدان میں ایک پراسراریت تھی جو پگاچیف کی بغاوت کے متعلق پشکن کی کہانی کی یاد دلاتی تھی۔ یہ پراسراریت تباہ شدہ عمارتوں کی وجہ سے اور بڑھ گئی تھی۔ اسی طرح گاؤں کے باقی رہ جانے والے لوگوں کا محتاط پن بھی بڑھ گیا تھا جو مخبروں کے خوف سے مسافروں سے علیحدہ ہی رہتے تھے اور آپس میں بھی ایک دوسرے سے بات چیت نہیں کرتے تھے۔

مزدوروں کو ٹکڑیوں میں بانٹ دیا گیا تھا اور جبری بھرتی والے مزدوروں کو شہریوں سے علیحدہ رکھا گیا تھا۔ مسلح فوجی کام کرنے والی ہر ٹکڑی کی نگرانی کر رہے تھے۔ دن میں مطلع صاف اور کہرآلود ہوتا تھا اور کام زیادہ دیر تک نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ بیلچے کافی نہیں تھے۔ یہ کام انتہائی دلچسپ تھا۔ تازہ ہوا میں گزرے ہوئے یہ تین دن بھی ایک جشن کی طرح معلوم ہوئے اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں تھی! رات کو مزدوروں کو گرم اور تازہ روٹیاں بھی ملتی تھیں جو نہ جانے کس کے حکم سے اور کہاں سے آتی تھیں یہ روٹیاں خوش ذائقہ اور کرکری ہوتی تھیں۔

جب آخرکار صاف کی ہوئی ریلوے لائن کے درمیان برف کی آخری تہوں کو ہموار کر دیا گیا تو پوری پٹری نظر آنے لگی جو دور تک ایک تیر کی مانند چلی گئی تھی۔ لوگوں کی ٹولیاں بیلچے لیے ہوئے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر لائن کے کنارے کھڑی ہوئی تھیں۔ جب لوگوں نے تمام آدمیوں کو پہلی مرتبہ یکجا دیکھا تو وہ اپنی تعداد دیکھ کر

سخت حیرت میں رہ گئے۔
مسافروں کو بتایا گیا کہ رات قریب آ جانے کے باوجود ٹرین جلد ہی روانہ ہونے والی ہے۔

☆☆☆

یوری آندرے وچ جی بھر کر سونے میں مصروف تھا۔ موسم بہار میں گرمی آتی جا رہی تھی اور برف کے وہ ڈھیر پگھلنے شروع ہو گئے تھے جنہوں نے سارے روس کو ڈھانک رکھا تھا، برف پہلے ماسکو میں اسی روز گرنی شروع ہوئی تھی جس دن وہ لوگ روانہ ہوئے تھے اور پھر سارے راستہ گرتی رہی۔
یہ لوگ جوں جوں معدنی کالونی کے علاقہ کے قریب پہنچتے گئے، انہیں زیادہ بستیاں نظر آنے لگیں۔ اسٹیشن بھی جلد جلد آنے لگے اور درمیانی فاصلے بھی مختصر ہوتے گئے۔ اب چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر خاصے مسافر گاڑی میں سوار ہوتے اور اترتے تھے۔
کوئی آدھی رات کے وقت یوری آندرے وچ کی آنکھ کھلی تو وہ ایک مسرت کے انجانے جذبہ سے معمور تھا اور اسی نے اسے بیدار کیا تھا۔ ٹرین خاموش کھڑی تھی۔ اسٹیشن رات کی دودھیا چاندنی میں نہایا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کافی بلندی پر واقع ہو۔
نزدیک ہی ایک آبشار تھا۔ اس سے چاندنی رات میں زیادہ تازگی اور وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ یہی وہ چیز تھی جس نے اسے خواب کے عالم میں بھی مسرت کے جذبہ سے سرشار کر دیا تھا۔ آبشار کا مسلسل شور دوسری تمام آوازوں پر غالب تھا۔ ڈاکٹر کو اس آبشار کے وجود کا کوئی علم نہیں تھا، لیکن پھر بھی اسے اس کی آواز سے سکون سا ملا اور وہ گہری نیند سو گیا۔
اگلے روز صبح تونیا نے کہا: ''واقعی یورا، تم بھی عجیب آدمی ہو، تمہاری عادتیں کس قدر متضاد ہیں کبھی تو تم محض ایک مکھی کی وجہ سے جاگ جاتے ہو اور پھر صبح تک نہیں سو سکتے۔ اور اب تم اس تمام جھگڑے اور شور کے باوجود سوتے رہے۔ اور میرے اٹھانے پر بھی نہیں اٹھے۔''
کھلی ہوئی کھڑکی میں سے دور دور تک موسم بہار کی آمد کے آثار اور پانی ہی پانی دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں کہیں دریا کا پانی کناروں کو توڑ کر پشتوں پر سے بہنے لگا تھا۔ گاڑی سے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے ٹرین پانی میں چل رہی ہو۔ کہیں کہیں پانی کی ہموار سطح پر نیلی دھاریاں دکھائی دیتی تھیں لیکن اس کی باقی تمام سطح پر سورج سے روشنی کے دھبے پڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ رات ختم ہو رہی تھی۔
ٹرین پہاڑ پر چڑھ رہی تھی اور اس کے لکڑی کے ڈبے چرچرا رہے تھے۔ کنارے کے نیچے جھاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا۔ جنگل میں ایک کھلی ہوئی جگہ پر سے ریلوے لائن کا موڑ دکھائی دیتا تھا۔ ٹرین ایک دم کانپ کر پہاڑی کے موڑ پر رک گئی۔ انجن نے کئی بار سیٹیاں دیں لیکن مسافروں کو یہ جاننے کے لئے ان اشاروں کی ضرورت نہیں تھی کہ انجینئر نے ٹرین ایندھن حاصل کرنے کے لئے روکی ہے۔ مال لے جانے والے ڈبوں کے دروازے کھل گئے اور ایک چھوٹے سے قصبہ کی آبادی کے برابر مجمع ان میں سے باہر نکلا۔
ڈبہ کے اندر کافی گرمی اور حبس تھا۔ ڈاکٹر کا تکیہ پسینہ میں ڈوب گیا تھا۔ احتیاط کے ساتھ تاکہ دوسروں کی آنکھ نہ کھل جائے وہ اپنی نشست سے اترا اور ڈبہ کے دروازے کھول دیئے۔ اس نے اپنے چہرے پر گرم ہوا اور چپچپاہٹ سی محسوس کی جیسے وہ کسی تہہ خانے میں چلا گیا ہو۔ ''کہر''۔ اس نے سوچا۔ ''کل بہت سخت گرمی ہوگی جبھی تو اس وقت ہوا بالکل بند ہے اور حبس ہو رہا ہے۔''
یہ ایک بڑا اسٹیشن تھا۔ کہر اور سکوت کے علاوہ ایک طرح کے کھوکھلے پن اور تغافل کا سا احساس ہو رہا تھا جیسے کہ ٹرین گم ہو گئی ہو۔ ٹرین یقیناً اسٹیشن کے سب سے آخری سرے پر کھڑی ہوئی تھی اور اسٹیشن اور ٹرین کے درمیان پٹریوں کا ایک ایسا جال بچھا ہوا تھا کہ اگر یارڈ کے سرے پر زمین پھٹ جاتی اور اسٹیشن اس میں سما جاتا تو ٹرین میں بیٹھے ہوئے کسی شخص کو اس کا علم تک نہ ہوتا۔ مدھم سی آوازیں دور فاصلہ سے آ رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے جو محاذ پر رہ چکا تھا اپنا سر ہلایا اور ڈبہ سے نیچے کود گیا۔ وہ چلتا ہوا چند قدم آگے گیا تو دو ڈبوں کے بعد ٹرین ختم ہو گئی۔ باقی ڈبے ٹرین سے علیحدہ کر دیئے گئے تھے اور انجن کے ساتھ چلے گئے تھے۔ ایک سنتری نے جو رائفل لئے ہوئے تھا، اس کا راستہ روک دیا:
''کہاں جا رہے ہو؟ اجازت نامہ ہے؟''
''یہ اسٹیشن کون سا ہے؟''
''اس کی فکر مت کرو۔ تم کون ہو؟''
''میں ڈاکٹر ہوں۔ ماسکو سے آیا ہوں۔ میرے گھر والے اور میں اس ٹرین میں سفر کر رہے ہیں، یہ رہے میرے کاغذات۔''
''کاغذات پر لعنت بھیجو۔ مجھے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ تم کس قسم کے ڈاکٹر ہو کاغذات دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں تم ہی جیسے ڈاکٹر بارہ انچ دہانہ کی توپیں ہم پر چلا رہے ہیں۔''
''اسے مجھ پر کسی اور کا دھوکا ہوا ہے۔'' ژواگو نے سوچا۔
''ٹرین پر لے چلو۔ دیکھو ہمارا افسر کیا کہتا ہے۔'' پھر وہ سنتری کے ساتھ اسٹیشن کی طرف چل دیا۔
''ژواگو!'' اسٹریلینکوف نے پھر ایک مرتبہ اس کا نام دہرایا۔

وہ دونوں اس کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ''ژواگو۔۔۔ میرے خیال میں تجارت۔ یا اعلیٰ طبقہ کا فرد۔۔۔ اچھا، ٹھیک ہے، ماسکو کا ڈاکٹر۔۔۔ واری کینو جارہے ہو۔ یہ تعجب کی بات ہے۔ تم ماسکو چھوڑ کر ایک چھوٹے سے صوبائی مقام پر کیوں جارہے ہو؟''

''یہی تو بات ہے۔ سکون، تنہائی اور گمنامی کی تلاش میں۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ کس قدر رومانی! واری کینو! میں وہاں کے زیادہ تر مقامات سے واقف ہوں۔ وہ کروگر کی جاگیر ہوا کرتی تھی۔ تم اس کے رشتہ دار تو نہیں ہو؟ کہیں تم اس کے وارث تو نہیں ہو؟''

''یہ طنز کس لئے؟ اس کا وارث ہونے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ میری بیوی۔۔؟''

''اچھا تو یہ بات ہے! لیکن اگر تم سفید فوج کو یاد کررہے ہو تو پھر میں تمہیں مایوس کروں گا۔ تم دیر سے پہنچے ہو۔ ہم نے پورے ضلع کو سفید فوج سے پاک کردیا ہے!''

''تم ابھی تک میرا انداق اڑا رہے ہو؟''

''اور پھر ایک ڈاکٹر۔ ایک فوجی ڈاکٹر۔ اور ہم لوگ جنگ کر رہے ہیں۔ تم فوجی مفرور ہو۔ انارکسٹ کسان (سبز) لوگ بھی جنگلوں میں پناہ لے رہے ہیں۔''

''میں دو مرتبہ زخمی ہوا ہوں اور مجھے معذور سمجھ کر فوج سے علیحدہ کردیا گیا تھا۔'' ژواگو نے کہا۔

''اور اب تم مجھے تعلیم یا صحت کے عوامی کمسریٹ کی طرف سے حوالہ کا خط دوگے تاکہ یہ ثابت کرسکو کہ تم روسی شہری ہو، ہمدرد ہو اور پورے وفادار ہو، یہ ہنگامی دور ہے جناب، یہ آخری فیصلہ ہے۔ اس وقت ایسے فرشتوں کی ضرورت ہے جو چمکتی ہوئی تلواریں اٹھائے ہوئے ہوں اور ایسے اڑنے والے خونخوار درندوں کی ضرورت ہے جو تحت الثریٰ سے نمودار ہوئے ہوں۔ اس وقت ہمدردوں اور وفادار ڈاکٹروں کی ضرورت نہیں ہے۔ بہرحال میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ تم آزاد ہو۔''

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے سے ان کی بات چیت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اسٹریلینکوف نے رسیور اٹھالیا۔

''شکریہ گورمان۔ اب کسی شخص کو یہاں بھیج دو تاکہ وہ کامریڈ ژواگو کو ان کی ٹرین تک پہنچا آئے۔''

جب ژواگو چلا گیا تو اسٹریلینکوف نے ریلوے اسٹیشن کو ٹیلیفون کیا۔ ''یہ لوگ ایک اسکول کے طالب علم کو لے کر آئے ہیں جو اپنی ٹوپی کانوں پر کھینچے رہتا ہے اور اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ یہ بہت شرم کی بات ہے۔''

''وہ کوئی میرا پرانا شاگرد بھی ہوسکتا ہے۔'' اس نے سوچا۔۔۔ ''ہم سے جنگ کررہا ہے، اب وہ بڑا ہوگیا ہے۔'' اس نے کھڑکی میں سے دور افق کی طرف دیکھا اور یوریاتن کے اس حصہ کی تلاش کی جہاں وہ رہا کرتے تھے۔ فرض کرو کہ اس کی بیوی اور لڑکی اب بھی وہاں موجود ہیں! کیا وہ ان کے پاس نہیں جاسکتا؟ لیکن وہ کیسے جاسکتا ہے؟ ان لوگوں کی زندگیاں بالکل مختلف ہیں۔ پہلے وہ یہ زندگی گزار لے پھر وہ اس زندگی میں لوٹ کر جاسکے گا جس میں رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔ کسی روز وہ ایسا کرے گا۔ لیکن کب؟ کب؟

استقبال

انتونینا الیگزینڈرونا تورفیانائیہ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑی اپنے خاندان اور سامان کے نگ بار بار گن رہی تھی کہ کہیں کوئی گاڑی میں تو نہیں رہ گیا۔ پلیٹ فارم کی جمی ہوئی ریت مضبوطی کے ساتھ اس کے پاؤں کی گرفت میں تھی لیکن اس پر ابھی تک یہ اندیشہ مسلط تھا کہ کہیں وہ اسٹیشن پر اترنے سے نہ رہ جائیں۔ گاڑی سامنے خاموش کھڑی تھی۔ یہ اسٹیشن پتھر کا بنا ہوا تھا اور دروازہ کے دونوں طرف بنچیں تھیں۔ تورفیانائیہ پر ژواگو کے خاندان کے علاوہ اور کوئی مسافر نہیں اترا۔ انہوں نے اپنا سامان ایک طرف رکھا اور خود بنچوں پر بیٹھ گئے۔

اسٹیشن کی خاموشی، خالی پن اور صفائی دیکھ کر انہیں بہت حیرت ہوئی۔ اسٹیشن کو کوسنے دینے والے سینکڑوں افراد کے ہجوم میں گھرا ہوا نہ دیکھ کر انہیں عجیب سا محسوس ہورہا تھا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ دور دراز کی اس دیہی زندگی سے ابھی تاریخ بہت پیچھے ہے۔ ابھی یہاں بڑے شہروں والی بربریت نہیں پہنچی تھی۔

یہ اسٹیشن صنوبر کے ایک جنگل کے درمیان واقع تھا۔ گاڑی اسٹیشن میں آئی تو ڈبوں میں اندھیرا چھا گیا۔ درختوں کے اس جھنڈ میں خنکی محسوس ہورہی تھی، اور تو اور پرندوں کا گانا بھی خنک محسوس ہوتا تھا۔ یہ گانا جنگل کی خاموش فضا کو چیرتا ہوا ایک سرے سے دوسرے سرے تک سنائی دے رہا تھا۔

ایک بوڑھا آدمی اسٹیشن ماسٹر کی وردی پہنے ان کے پاس آیا۔

''کہئے کیسے مزاج ہیں۔ میں تو آپ ہی کا انتظار کررہا تھا۔ سمدیویاتوف نے مجھے ٹیلیفون کیا تھا کہ ماسکو سے ڈاکٹر ژواگو اپنے خاندان سمیت یہاں پہنچ رہے ہیں۔ تو آپ ہی ڈاکٹر ژواگو ہیں۔ صحیح ہے نا؟''

''نہیں نہیں، ڈاکٹر ژواگو میرا داماد ہے۔ وہ رہا۔ میں دیہی اقتصادیات کا پروفیسر ہوں۔ میرا نام گرومیکو ہے۔''

''معاف کیجئے۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ آپ لوگوں سے متعارف ہو کر میں بے حد مسرور ہوں۔''

''تو تم بھی سمد یو یا توف کو جانتے ہو؟''

''اسے کون نہیں جانتا۔ عجیب و غریب کارکن ہے۔ اس نے کہا تھا کہ میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں۔ تو کیا آپ کو گھوڑے یا کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟ آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''واری کینو! یہاں سے کافی دور ہے۔''

''واری کینو میں ابھی گھوڑے کا انتظام کرتا ہوں۔ میں اپنے آدمی کو بلا کر پوچھتا ہوں اگر کوئی چھکڑا مل جائے تو بہتر ہے۔''

چھکڑے میں ایک سفید رنگ کی گھوڑی جوتی گئی جس کے ابھی حال ہی میں بچہ ہوا تھا۔ کوچوان ایک بوڑھا آدمی تھا جس کے کان کٹے ہوئے اور بال پریشان تھے۔ وجہ کچھ بھی ہو اس کی ہر چیز سفید تھی۔ چیتڑ کے چھلکے کے بنے ہوئے نئے جوتوں کا رنگ ابھی گہرا نہیں ہوا تھا اور اس کی ململ کی قمیص اور پتلون کا رنگ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بالکل اڑ چکا تھا۔ گھوڑی کا بچہ چھوٹے قد کا تھا۔ اس کی ایالیں گھنگھریالی اور رات کی طرح سیاہ تھیں۔ وہ ایک رنگین کھلونے کی طرح اپنی نرم ٹانگوں سے دولتیاں چلاتا ہوا اپنی ماں کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

جب بھی گھوڑی کا بچہ پیچھے رہ جاتا تو گھوڑی رک جاتی اور اس کا انتظار کرتی۔ بچہ لہروں کی طرح کودتا ہوا خوبصورت انداز میں اس سے آملتا اور اپنی بھدی لمبی ٹانگوں کے ساتھ اس کے بہت قریب آجاتا۔ اپنی لمبی گردن تان کر چھوٹا سا سر گاڑی کے بم کے نیچے سہلانے کے لئے لے آتا۔

واری کینو

جاڑے کے موسم میں جب یوری کو زیادہ وقت ملا تو اس نے ڈائری لکھنا شروع کی: گذشتہ موسم گرما میں بھی میں اکثر ایسے ہی محسوس کیا کرتا تھا۔ محنت میں مصروف ہونے کے بعد کتنے خیالات ذہن میں آتے ہیں۔ یہ تو دراصل ایک نعمت ہے۔ شہر کا بسنے والا مفکر اپنے خیالات کے گھوڑے دوڑانے کے لیے کافی اور سگریٹ کا سہارا لیتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ سب سے زیادہ نشلی چیز اچھی صحت اور حقیقی ضرورت ہے۔

''میں اس سے آگے نہیں بڑھوں گا۔ میں سادہ زندگی اور ''دوبارہ زمین کی طرف لوٹ جاؤ'' کے نعروں کی تلقین نہیں کروں گا جو ٹالسٹائے نے پیش کئے تھے۔ میں خود کسی نظام کی بنیاد نہیں ڈال رہا ہوں۔ یہ نظام بہت پیچیدہ ہے اور ہماری معیشت ملی جلی ہے۔ ہم جو کچھ خود پیدا کرتے ہیں۔۔۔ آلو اور سبزیاں۔۔۔ وہ ہماری ضرورت کا ایک مختصر حصہ ہے۔ باقی سب کچھ ہمیں دوسری جگہ سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ ہم زمین کا ناجائز طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

''میں اپنے ڈاکٹر ہونے کو راز بنائے ہوئے ہوں کیونکہ میں اپنی آزادی پر کسی پابندی کو برداشت نہیں کر سکتا، لیکن کسی طرح کسی نہ کسی کو پتہ چل ہی جاتا ہے کہ واری کینو میں ایک ڈاکٹر موجود ہے اس لئے وہ بیسیوں میل چل کر میری تلاش میں آتے ہیں۔ اور کبھی مرغی، کبھی انڈے یا مکھن فیس کے طور پر لے آتے ہیں۔ میں ان چیزوں کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا، کیونکہ لوگ مفت کی دوا کو غیر موثر سمجھتے ہیں۔ ہمارا سہارا سمد یو یا توف ہے۔ وہ ایک عجیب و غریب شخص ہے۔ میرے لئے اس کو سمجھنا مشکل ہے۔ وہ انقلاب کا حامی ہے۔''

کچھ عرصے بعد یوری نے لکھا:

ہم پرانے مکان کے عقب میں لکڑی کے ایک مکان میں رہتے ہیں جس میں دو کمرے ہیں، اینا ایوانوونا کے بچپن میں کروگر گھرانے کے خاص ملازمین کے لئے اسے استعمال کیا جاتا تھا۔ کچھ ایسے لوگوں کی مدد سے جو کام جانتے ہیں ہم نے چولہے کی مرمت کی جو دونوں کمروں کو گرم بھی رکھتا ہے۔ ہم خوش قسمت رہے کہ خزاں میں گرمی اور خشکی تھی اور ہمیں بارش اور سردی سے پہلے آلو کھود لینے کا وقت مل گیا۔ نمک لگی ہوئی ککڑیوں کے دو پیپے اور تونیا کے بنائے ہوئے اچار کے دو پیپے بھی ہم نے یہاں رکھ دیئے۔ تازہ گوبھی کو باندھ کر لکڑیوں کے ساتھ لٹکا دیا گیا ہے۔ گاجریں خشک ریت میں دبادی گئی ہیں اور مولی، چقندر، شلجم، مٹر اور دوسری پھلیوں کا ذخیرہ کر لیا گیا ہے۔ ہمارے پاس اتنی لکڑی موجود ہے کہ موسم بہار تک جلانے کو کافی ہو سکتی ہے۔

شروع میں بہار اور موسم گرما کے ایام ہم نے نہایت دقت سے گزارے۔ ہم نے اس وقت سخت محنت کی اور اب جاڑے کی شام آرام سے گذارتے ہیں۔ سمد یو یا توف ہمیں تیل لا کر دے گیا ہے ہم چراغ کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ عورتیں بنتی یا سیتی ہیں۔ ہم بار بار ''جنگ اور امن''۔۔۔ ''یوجین اونیگن'' اور پشکن کی دوسری نظمیں پڑھتے ہیں۔ اسٹانڈال کے ''سرخ و سیاہ'' کا روسی ترجمہ۔ ڈکنس کی ''دوشہروں کی کہانی'' کا ترجمہ اور کلیسٹ کے افسانے پڑھے جاتے ہیں۔

موسم بہار قریب پہنچا تو ڈاکٹر نے لکھا: میرے خیال میں تونیا حاملہ ہے۔ اس حالت میں عورت کے چہرے میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ اس کی دلکشی کم ہو جاتی ہے لیکن اپنی شکل وصورت

کے اظہار و نمود پر اس کا کوئی اختیار نہیں رہتا، اس حالت میں اس پر مستقبل کی حکمرانی ہوتی ہے جو وہ اپنے جسم کے اندر چھپائے پھرتی ہے۔ اب وہ کسی وقت تنہا نہیں ہوتی۔ آنکھوں میں ایک نئی طرح کی چمک آ جاتی ہے۔ میرا ہمیشہ یہی خیال رہا ہے کہ ہر حمل بے داغ ہوتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے وقت ہر عورت کو علیحدگی کا یکساں احساس ہوتا ہے جیسے اسے تنہا چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس اہم موقع پر مرد کا کردار اتنا غیر متعلق ہوتا ہے جیسے کہ اس سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو اور جیسے کہ یہ سب کچھ آسمان سے ٹپک پڑا ہو۔

ہم برابر ''یوجین اونیگن'' اور نظمیں پڑھتے رہتے ہیں۔ سمدیو یا توف کل آیا اور کئی تحفے لایا۔ ہم آرٹ پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔

''میرا ہمیشہ یہی خیال رہا ہے کہ آرٹ کوئی صنف نہیں ہے۔ کوئی مملکت نہیں ہے۔ جس میں لاتعداد نظریات اور اخذ کیے ہوئے مظاہرات ہوں۔ اس کے برخلاف یہ ایک طرح کی مجتمع اور نہایت محدود چیز ہے۔ لیکن اس نظریہ کا اظہار یا تشریح نہایت مشکل ہے۔ ایک ادبی تخلیق ہمیں مختلف طریقوں سے متاثر کر سکتی ہے۔ اپنے عنوان سے، موضوع سے، حالات سے اور کرداروں سے، لیکن سب سے بڑھ کر وہ ہمیں اس لئے متاثر کرتی ہے کہ اس میں آرٹ موجود ہوتا ہے۔

''کسی قدر سردی کا اثر، کھانسی اور شدید ہلکا بخار، دن بھر سانس پھولتا رہتا ہے جیسے میرے حلق میں کوئی چیز پھنس رہی ہو۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ آثار و قرائن سے پہلی مرتبہ یہ معلوم ہو رہا ہے کہ مجھے بھی دل کی بیماری اپنی ماں سے ورثہ میں ملی ہے۔ وہ زندگی بھر اسی مرض میں مبتلا رہیں۔ کیا واقعی یہی بات ہے؟ اس قدر جلد؟ اگر ایسا ہے تو پھر میری زندگی کم رہ گئی ہے۔

''میرے سر کا درد برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے نیند اچھی طرح نہیں آتی۔ میں نے ایک الجھا ہوا سا خواب دیکھا تھا۔ ویسا ہی خواب جسے آنکھ کھلتے ہی بھول جاتے ہیں۔ مجھے خواب کا صرف وہی حصہ یاد رہ سکا جس سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ یہ ایک عورت کی آواز تھی جو میں نے اپنے خواب میں ہوا کے ساتھ سنی تھی۔ مجھے وہ آواز یاد رہ گئی اور میرا ذہن برابر اسے سنتا رہا۔ میں ان عورتوں کی آواز پر غور کرتا رہا جو ہماری دوست تھیں۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ کون سی عورت ہو سکتی ہے جو اتنی بھاری، نرم اور کھوکھلی آواز میں بولتی ہے۔ یہ آواز میری دوستوں میں سے کسی کی نہیں تھی۔

''میں ایک ڈاکٹر یا ایک کسان کی حیثیت سے کار آمد بننا چاہتا ہوں۔ اور ساتھ ہی ساتھ کوئی ایسا زندہ رہنے والا کام بھی کرنا چاہتا ہوں جو بنیادی ہو جیسے کوئی سائنسی مقالہ یا کوئی ادبی تصنیف! ہر انسان پیدائشی فاؤسٹ ہوتا ہے جو اس خواہش کے ساتھ دنیا میں آتا ہے کہ وہ دنیا کی ہر چیز کو سمجھ سکے، تجربہ کر سکے اور بیان کر سکے۔ فاؤسٹ اپنے شائقین اور اپنے ہم عصروں کی غلطیوں کی وجہ سے سائنس داں بن گیا۔ سائنس کی ترقی ہزیمت کے قوانین کے تحت ہوتی ہے۔ ہر اگلا قدم موجودہ غلطیوں اور نظریات کی تردید کر کے اٹھایا جاتا ہے۔ فاؤسٹ ایک آرٹسٹ تھا۔ آرٹ میں جو قدم آگے بڑھایا جاتا ہے وہ قانون کشش کے مطابق بڑھایا جاتا ہے۔ اور یہ اقدام آرٹسٹ کے پسندیدہ سابقین کی نقالی یا تعریف کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آخر وہ کون سی چیز ہے جو میرے ڈاکٹر یا مصنف بننے میں حارج ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ ہماری تنگدستی، آوارہ گردی یا ہماری تغیر پذیر زندگیاں نہیں بلکہ بلند بانگ اور مبالغہ آمیز تقریروں اور تحریروں کی موجودہ روش ہے جو ہر جگہ پھیل گئی ہے۔

''ہم لوگ موسم بہار کے شروع میں واری کینو آئے تھے۔ جلد ہی درخت سرسبز ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد ہی بلبلوں نے گیت گانے شروع کر دیئے۔ میں نے بلبل اور دوسرے تمام پرندوں کے گانوں کے فرق پر غور کیا کہ قدرت نے ان کے گانے کو کتنا حسن اور انفرادیت عطا کی ہے۔ کتنا تنوع، طاقت اور گونج! ترگنیف نے کسی جگہ ان کی سیٹیوں کو بانسری کی آواز سے مشابہت دی ہے۔

''موسم بہار۔ ہم موسم بہار کی بوائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ ڈائری لکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ یہ بھی ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ اب مجھے یہ سلسلہ آئندہ موسم سرما تک بند کرنا پڑے گا۔''

''اس روز۔۔۔ موسم بہار کے سیلابوں کے دوران ایک بیمار کسان اپنی گاڑی کیچڑ اور دلدل میں چلاتا ہوا صحن میں آیا، میں نے اسے دیکھنے سے انکار کر دیا۔ میں نے یہ پیشہ ترک کر دیا ہے۔ اس نے اصرار کیا۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔ میں کیا کر سکتا تھا؟ میرا دل پتھر کا نہیں ہے۔ تب میں نے دیکھا کہ صحن میں ایک اور گاڑی کھڑی ہے۔ پہلے میں نے سوچا کہ کوئی دوسرا مریض ہوگا، لیکن وہ میرا بھائی ایوگراف تھا جو بغیر اطلاع کے کہیں سے ٹپک پڑا تھا۔ ہم نے اس پر سوالات کی بھرمار کر دی۔ وہ کہاں سے آیا ہے؟ کس طرح آیا ہے؟ لیکن وہ حسب معمول ٹال مٹول کرتا رہا۔ وہ دو ہفتہ ٹھہرا اور پھر اچانک اس طرح غائب ہو گیا جیسے زمین اسے نگل گئی ہو۔ جب وہ ہمارے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا تو میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے اثرات سمدیو یا توف سے بھی زیادہ تھے اور اس کے تعلقات اور بھی زیادہ پرا سرار تھے۔ وہ کیا ہے؟ وہ کیا کرتا ہے؟ وہ اتنا زیادہ طاقتور کیوں ہے؟ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ہمارے لیے سہولتیں پیدا کر دے گا۔ ہم

نے اس سے پوچھا کہ وہ یہ کس طرح کرے گا لیکن وہ صرف مسکرا دیا، تاہم اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے حالات میں تبدیلی ہونے والی ہے۔ وہ میرا سوتیلا بھائی ہے۔ ہمارے خاندانی نام ایک سے ہیں لیکن پھر بھی میں اس کے متعلق تقریباً کچھ بھی نہیں جانتا۔ شاید ہر زندگی میں دوسرے خاص لوگوں کے علاوہ ایک خفیہ اور نامعلوم طاقت کا موجود ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ غالباً میرے معاملہ میں میرا بھائی ایوگراف اس پوشیدہ محسن کا کردار ادا کرتا ہے؟''

یہاں پہنچ کر یوری آندرے وچ کی ڈائری ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد اس نے پھر کبھی ڈائری نہیں لکھی۔

☆☆☆

یوری آندرے وچ نے وہ کتابیں دیکھیں جو اس نے یوریاتن پبلک لائبریری کے دارالمطالعہ سے نکلوائی تھیں۔ دارالمطالعہ میں کئی کھڑکیاں تھیں اور اس میں سو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ لمبی لمبی میزوں کی قطاریں کھڑکیوں کے پاس جا کر ختم ہوتی تھیں۔ لائبریری غروب آفتاب کے وقت بند ہوتی تھی، موسم بہار میں اس قصبہ میں روشنی نہیں کی جاتی تھی۔ ژواگو ہمیشہ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی واپس آ جایا کرتا تھا اور قصبہ میں رات کے کھانے کے وقت کے بعد نہیں ٹھہرتا تھا۔ صبح کا سارا وقت مطالعہ میں گذارتا اور سہ پہر میں واری کینو واپس آ جاتا۔ جب سے اس نے لائبریری جانا شروع کیا تھا، اس سے پہلے یوری آندرے وچ صرف کبھی کبھار ہی یوریاتن گیا تھا۔ اسے وہاں کوئی خاص کام نہیں تھا اور وہ قصبہ سے بہت کم واقف تھا۔ اب جب کہ دارالمطالعہ رفتہ رفتہ مقامی لوگوں سے بھرتا جا رہا تھا جن میں سے کچھ لوگ اس کے نزدیک اور کچھ دور بیٹھے رہتے تھے، وہ یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ قصبہ کے ایک اہم مرکز پر کھڑے رہ کر اس سے واقف ہوتا جا رہا ہے اور نہ صرف قصبہ کے لوگ بلکہ ان کے مکانات اور سڑکیں بھی کمرے میں نظر آ رہی ہیں۔

مہتمم کتب خانہ اور اس کی دو نائب کھڑکی کے مقابل دیوار کے اندر بنے ہوئے خلا میں ایک ڈائس پر بیٹھتی تھیں۔ ان میں سے ایک نائب غصیلی قسم کی عورت تھی، دوسری عورت سیاہ ریشمی بلاؤز پہنتی تھی، اور اس کا سینہ کمزور معلوم ہوتا تھا کیونکہ سانس لیتے وقت اور بات چیت کرتے وقت بھی اس کا رومال منہ اور ناک پر ہی رکھا رہتا اور وہ اسے کبھی نہیں ہٹاتی تھی۔

یوری آندرے وچ کمرے کے آخری سرے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پگا شیف کی بغاوت کی تاریخ پر بھی دو کتابیں مانگی تھیں لیکن ریشمی بلاؤز والی لائبریرین نے رومال منہ پر رکھے ہوئے اسے سرگوشی کے انداز میں بتایا تھا کہ کسی شخص کو ایک وقت میں اتنی زیادہ کتابیں نہیں دی جا سکتیں اور یہ کہ اپنی دلچسپی کی دوسری کتابیں حاصل کرنے کے لیے اسے ان میں سے کچھ کتابیں واپس کرنی ہوں گی۔ وہ کام میں اتنا محو تھا کہ ادھر ادھر نہیں دیکھ رہا تھا۔

لائبریرین جسے سردی کا اثر تھا ڈائس سے اتر کر کھڑکیوں کے نزدیک گئی۔ ان پر سفید پردے پڑے ہوئے تھے جن کی وجہ سے روشنی ناگوار نہیں گذرتی تھی۔ اس نے آخری کھڑکی کے سوا جو ابھی تک سائے میں تھی باقی تمام کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیئے۔ اس کھڑکی کے پاس پہنچ کر اس نے سرول کھولنے کے لئے ڈوری کھینچی لیکن اسی وقت اسے چھینکیں آنے لگیں۔ دوسرے لوگوں کی طرح ژواگو نے بھی سر اٹھا کر اس عورت کی طرف دیکھا۔ اب اسے کمرے میں ایک تبدیلی نظر آئی۔ اس کے آخری سرے پر ایک نئی عورت بیٹھی تھی۔ یوری آندرے وچ نے انتی پووا کو فوراً پہچان لیا۔ وہ اس کی طرف پشت کئے بیٹھی تھی اور چھینکنے والی لائبریرین سے دھیمی آواز میں گفتگو کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لائبریرین پر گفتگو کا اچھا اثر پڑ رہا تھا۔

یہ واقعہ کمرے کے مختلف حصوں میں کئی لوگوں نے دیکھا۔ وہ بھی مسکرا دیئے اور انہوں نے پسندیدگی کی نظروں سے انتی پووا کو دیکھا۔ ان معمولی سی باتوں سے یوری آندرے وچ نے اندازہ لگایا کہ قصبہ کے لوگ انتی پووا سے واقف تھے اور اسے پسند کرتے تھے۔

ایک دم اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر جائے اور اس سے بات کرے، لیکن ماضی میں انتی پووا کے ساتھ اس کے تعلقات میں ایک طرح کی شرم اور ہچکچاہٹ سی پیدا ہو گئی تھی جو اس کی فطرت کے خلاف تھی اور اس کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے پریشان نہیں کرے گا۔ اسے دیکھنے کی خواہش پر قابو پانے کی غرض سے اس نے اپنی کرسی کا رخ اس طرح تبدیل کر لیا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے ایک مرتبہ واری کینو میں خواب میں جو آواز سنی تھی وہ انتی پووا کی تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ مبہوت سا رہ گیا اور اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی کرسی کا رخ پھر ایک مرتبہ تبدیل کر دیا تا کہ وہ انتی پووا کو دیکھ سکے۔ وہ پیچھے سے اس کا صرف چوتھائی رخ دیکھ سکتا تھا۔ وہ ہلکے خانوں کا بلاؤز پہنے ہوئے تھی جس پر پیٹی کسی ہوئی تھی اور مکمل استغراق کے ساتھ مطالعہ کر رہی تھی۔ یوری آندرے وچ کو وہی چیز اب پھر دکھائی دی جو اس نے عرصہ ہوا میلیو زیود میں دیکھی تھی۔ ''وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ حسین دکھائی دے یا لوگ اسے دیکھ کر خوش

ہوں۔'' اس نے سوچا۔ ''وہ عورت کی فطرت کے اس پہلو سے نفرت کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اپنے آپ کو خوبصورت ہونے کی سزا دے رہی ہے۔ لیکن اس چیز نے اسے اور بھی دس گنا زیادہ حسین بنادیا ہے۔''

مئی کے ابتدائی دنوں کی یہ سہ پہر کافی سرد تھی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ یوری آندرے وچ نے وہ کام ختم کیا جو اسے قصبہ میں کرنا تھا اور کتب خانہ کے اندر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے اچانک اپنا ارادہ بدل دیا اور انتی پووا سے ملنے کے لیے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ہوا کی تیزی اور خاک اور ریت کے بگولوں کی وجہ سے اسے راستے میں رک جانا پڑا۔ اس نے اپنا منہ پھیرلیا، آنکھیں بند کرلیں، اس انتظار میں کھڑا رہا کہ دھول اڑنی بند ہو جائے اور پھر اپنے راستہ پر چل دیا۔

لارا مرچنٹ اسٹریٹ کے نکڑ پر گہرے بھورے رنگ کے مکان کے سامنے رہتی تھی جس پر پتھر کے مجسمے بنے ہوئے تھے۔ اس نے یہ مکان پہلی مرتبہ دیکھا۔ مکان ویسا ہی تھا جیسا کہ اس کا نام تھا اور اس میں کوئی عجیب وغریب اور پریشان کن سی بات محسوس ہوتی تھی۔ اس کی اوپری منزل کے سارے حصہ پر زمانہ قدیم کی عورتوں کی شکلیں بنی ہوئی تھیں جو انسانی قد کے نصف کے برابر تھیں۔ ریت کے دو بگولوں کے درمیان اسے ایسا معلوم ہوا جیسے مکان کی تمام عورتیں باہر بالکونی میں نکل آئی ہوں اور اوپر سے اسے جھانک کر دیکھ رہی ہوں۔ لارا کے مکان میں جانے کے دو دروازے تھے، ایک دروازہ مرچنٹ اسٹریٹ میں تھا اور دوسرا مڑ کر گلی میں تھا۔ آندرے وچ نے صدر دروازہ نہیں دیکھا اور گلی والے دروازہ سے اندر گیا۔ ڈاکٹر نے لارا کو کنوئیں کے پاس کھڑے دیکھا، اس نے دو بالٹیاں بھر کر اپنے بائیں کندھے پر ایک ڈنڈے میں لٹکالی تھیں۔ اس نے اپنے بال بے پرواہی سے ایک رومال سے باندھ رکھے تھے۔ وہ گھر کی طرف روانہ ہوئی لیکن ہوا کے ایک آدھ جھونکے نے اسے روک دیا جس سے اس کا رومال سر سے اتر کر اڑتا ہوا احاطے کے آخری سرے پر جا پڑا۔ ژواگو رومال کے پیچھے بھاگا اور اسے اٹھا کر کنوئیں کے نزدیک اس کے پاس لے گیا۔ لارا نے اپنے منہ سے حیرت کا کوئی جملہ تک ادا نہیں کیا۔ اس نے صرف یہی کہا۔

''ژواگو!''

''لاریسا فیودوروونا!''

''تم یہاں کیا کررہے ہو؟''

''اپنی بالٹیاں رکھ دو۔ یہ میں پہنچادوں گا۔''

''بالٹیوں کو چھوڑو۔ تم سیڑھیوں پر پانی گرادو گے۔ بہتر یہ ہے کہ مجھے یہ بتاؤ تم یہاں کیسے آئے ہو۔ تمہیں آئے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو گیا لیکن اس وقت تک تمہیں یہاں آنے کے لئے وقت نہیں مل سکا۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''بات پھیل ہی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے تمہیں دارالمطالعہ میں بھی دیکھا تھا۔''

''تم نے مجھ سے بات کیوں نہیں کی؟''

''اب مجھ سے یہ تو مت کہو کہ تم نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔''

بالٹیوں کے بوجھ سے کمر لچکائی ہوئی وہ اس کے آگے آگے نیچی سی داخلی محراب سے اندر داخل ہوئی۔ یہاں اس نے جلدی سے دو زانو بیٹھ کر بالٹیاں مٹی کے فرش پر رکھیں، اور اپنے ہاتھ ایک چھوٹے سے رومال سے صاف کئے: ''آؤ میں تمہیں اندر کے راستہ میں سامنے والے ہال کمرے میں لے چلوں۔ وہاں تمہیں ایک منٹ انتظار کرنا ہوگا میں بالٹیاں پچھلے زینہ سے اوپر لے جاؤں گی اور ذرا اپنا حلیہ ٹھیک کروں گی۔ مجھے دیر نہیں لگے گی۔''

''ژواگو!'' انتی پووا نے اوپر سے آواز دی، اور وہ اوپر چلا گیا۔

اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہونے پر وہ دروازے کے سامنے والی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کھڑکی میں سے باہر صحن اور مکانوں کی نیچی چھتیں اور اس سے پرے دریا کے کنارے خالی میدان نظر آرہا تھا۔ وہاں بھیڑیں اور بکریں چر رہی تھیں اور ان کی اونی کھالیں لہنگوں کی طرح زمین پر گھسٹ رہی تھیں۔

اسے وہ دن یاد آ گیا جب وہ ماسکو سے یہاں پہنچا تھا اور ڈاکٹر نے اس کا حال لارا کو بتانا شروع کردیا۔ وہ یہ بالکل بھول گیا کہ یہ افواہ بھی گرم تھی کہ اسٹریلینکوف لارا کا شوہر تھا۔ اس نے لارا کو ٹرین میں کومیسار سے اپنی ملاقات کا حال سنایا۔ اس کی کہانی کے اس حصہ کا اس پر بہت زیادہ اثر ہوا۔۔۔ ''تم نے اسٹریلینکوف کو دیکھا تھا؟'' اس نے بے تابی کے ساتھ پوچھا۔ ''اگر میں غلطی نہیں کر رہی ہوں تو تم نے اس کے بارے میں بری نہیں بلکہ، اچھی رائے قائم کی ہے۔''

''ہاں مجموعی طور پر مجھے اس سے نفرت کرنی چاہیے تھی کیونکہ ہم اس علاقہ میں سے ہو کر گذرے تھے جہاں اس کے ہاتھوں موت اور تباہی نازل ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی سفاک قسم کا سپاہی یا انقلابی ڈاکو ہوگا لیکن وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی شخص تمہاری توقع کے برعکس ہو تو اچھا ہوتا ہے۔''

''لوگ کہتے ہیں کہ وہ پارٹی کا ممبر نہیں ہے۔''

''ہاں، میرے خیال میں یہ صحیح ہے۔ آخر وہ کیا بات ہے کہ

بعض لوگ اس کی طرح بن جاتے ہیں۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ وہ ان تمام گناہوں کا خمیازہ بھگتے گا جو اس نے کئے ہیں۔ وہ انقلابی جو قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں، خطرناک ہوتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ مجرم ہوتے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ ایسی مشینوں کی مانند ہوتے ہیں جن پر قابو نہ پایا جا سکتا ہو، اسٹریلینکوف! وہ اتنا ہی پاگل ہے جتنا کہ دوسرے لوگ ہیں۔ جب تک انہیں اس کی ضرورت ہے وہ اسے برداشت کریں گے۔ جس وقت بھی انہیں اس کی ضرورت باقی نہیں رہے گی وہ کسی قسم کے افسوس کے بغیر اسے علیحدہ کر دیں گے اور کچل دیں گے جیسا کہ انہوں نے دوسرے فوجی ماہروں کے ساتھ کیا ہے۔"

"تمہارا یہی خیال ہے؟"

"مجھے اس کا یقین ہے۔"

"کیا اس کے لئے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے؟ کیا وہ بھاگ نہیں سکتا؟"

"وہ بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے، لاریسا فیودرونا؟ پرانے زمانہ میں ایسا ہو سکتا تھا جبکہ زاروں کی حکومت تھی، لیکن اب ذرا کوشش کر کے تو دیکھو!"

"یہ تو بہت بری بات ہے۔ تمہاری باتیں سن کر مجھے اس پر ترس آ رہا ہے۔ ایک بات بتاؤں! تم بدل گئے ہو۔ تم انقلاب کے متعلق پہلے اتنی سخت باتیں نہیں کہتے تھے۔"

"یہی تو اصل بات ہے، ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس تمام عرصہ میں کوئی ٹھوس کام ہو جانا چاہیے تھا لیکن اب پتہ چلا کہ جن لوگوں نے انقلاب برپا کیا تھا، وہ سوائے تبدیلی اور ہنگامہ کے اور کچھ پسند نہیں کرتے۔ انہیں کسی اور چیز کی تربیت ہی نہیں ملی۔ وہ اس کے علاوہ اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں صحیح صلاحیتیں نہیں ہیں، یہ لوگ نااہل ہیں۔ انسان زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوا ہے زندگی کا سامان اور اس کی تیاریاں کرنے کے لئے نہیں۔ بس بہت ہو چکا۔ اب سوالات کرنے کی میری باری ہے۔ ہم لوگ اسی دن صبح کو یہاں پہنچے ہیں جب یہاں مقامی شورش ہوئی تھی، کیا اس دن تم شہر ہی میں موجود تھیں؟"

"ہاں! ہمارے چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ مکان جلنے سے بچ گیا تاہم یہ بری طرح ہل کر رہ گیا۔ آج تک ایک بغیر پھٹا ہوا گولہ پھاٹک کے اندر صحن میں دبا پڑا ہے۔ لوٹ مار، بمباری، ہر طرح کی دہشت انگیزی۔۔۔ جیسا کہ ہر حکومت کے بدلتے وقت ہوا کرتا ہے۔ سفید روسی فوج نے کیا کچھ نہیں کیا! پرانے حسابات چکانے کے لئے قتل، استحصال بالجبر، بلیک میل۔۔۔ حقیقی خرمستیاں! لیکن میں نے تمہیں سب سے زیادہ حیرت انگیز بات نہیں بتائی۔ ہمارا جلیلین! وہ چیک فوجوں کے ساتھ ایک انتہائی اہم شخصیت کی حیثیت سے آیا۔۔۔ ایک طرح کا گورنر جنرل۔"

"میں جانتا ہوں۔ میں اس کے متعلق سن چکا ہوں۔ کیا تم اس سے ملیں؟"

"ڈاکٹر تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس کی وجہ سے میں نے کتنے لوگوں کو بچا لیا اور کتنوں کو چھپا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا طرز عمل بہت اچھا اور بہادرانہ تھا۔ جلیلین نے میری بہت مدد کی۔ تم تو جانتے ہو کہ ہم پرانے دوست ہیں۔ جب میں چھوٹی سی بچی تھی تو میں اکثر اس مکان میں جایا کرتی تھی جہاں وہ رہتا تھا، زیادہ تر کرایہ دار ریلوے مزدور تھے۔ بچپن میں میں نے بہت افلاس اور غربت دیکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب کے بارے میں میرا نظریہ تمہارے نظریہ سے مختلف ہے۔ میں اس سے زیادہ قریب رہی ہوں۔"

ایک لڑکی اندر آئی جس کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی۔ اس کے بالوں کی مینڈھیاں گندھی ہوئی تھیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شرارت ٹپکتی تھی اور جب وہ ہنستی تھی تو اس کی آنکھیں پھیل جاتی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ کوئی اس کی ماں سے ملنے آیا ہے کیونکہ اس نے آواز دروازہ کے باہر ہی سن لی تھی لیکن پھر بھی اس نے حیرت کا اظہار ضروری سمجھا۔ وہ آداب بجالائی۔ اور ڈاکٹر کو بے خوفی کے ساتھ، پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی، ایک ایسی تنہا بچی کی طرح جس نے شروع زندگی ہی میں غور و فکر شروع کر دیا ہو۔

"میری بیٹی۔ کاتنکا۔ میں امید کرتی ہوں کہ تم دونوں دوست بن جاؤ گے!"

"اور اب، کیونکہ تم نے مجھ سے اس قدر صاف گوئی سے کام لیا ہے اس لیے میں بھی تمہارے ساتھ صاف گوئی سے کام لوں گی اسٹریلینکوف جس سے تم ملے تھے میرا شوہر ہے، پاشا۔۔۔ پاول پاؤلووچ انتی پوف، جسے تلاش کرنے کے لئے میں محاذ پر گئی تھی اور جس کی موت کا یقین کرنے سے میں نے انکار کر دیا تھا۔"

"میں نے اس آدمی کو دیکھا ہے۔ کون یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کا تم سے کوئی تعلق ہوگا؟ تم میں اور اس میں کون سی چیز مشترک ہے؟"

"لیکن یہ پھر بھی صحیح ہے۔ اسٹریلینکوف، میرا شوہر انتی پوف ہے۔ یہ بات کاتنکا بھی جانتی ہے اور اسے اپنے باپ پر فخر ہے۔ اسٹریلینکوف اس کا فرضی نام ہے۔ تمام سرگرم انقلابیوں کی طرح

اس نے بھی ایک نام اختیار کرلیا ہے۔ کسی وجہ سے اسے ایک فرضی نام اختیار کر کے زندگی گزارنا اور کام کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ وہی تھا جس نے یوریاتن پر قبضہ کیا تھا اور ہم پر گولے برسائے تھے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم لوگ یہاں تھے۔ یہ بات کہ وہ واقعی یہاں آیا تھا اور ہم سے ملے بغیر چلا گیا، ناقابل یقین سی ہے! یہ قدیم رومیوں جیسی بات ہے۔ اب وہ سائبیریا میں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اس پر ایسے الزامات لگائے گئے ہیں جن سے میرا خون خشک ہونے لگتا ہے اور وہ وہاں سب سے اگلے محاذ پر ہے اور بیچارے جلیلین سے جنگ کر رہا ہے جو اس کا بچپن کا دوست اور جرمنی کی لڑائی میں اس کا ساتھی رہ چکا ہے۔ جلیلین جانتا ہے کہ وہ کون ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ میں اس کی بیوی ہوں۔ لیکن اس نے معاملہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ استریلنیکاوف کا نام سن کر وہ غصہ سے پاگل ہو جاتا ہے۔ یہاں وہ کافی عرصہ تک رہا۔ وہ اس ریل کے ڈبہ میں رہتا تھا جہاں تم نے اسے دیکھا تھا۔ مجھے برابر یہ امید رہی کہ کبھی اتفاق سے میری اس سے مڈبھیڑ ہو جائے گی۔ کبھی کبھی وہ اسٹاف ہیڈکوارٹر جایا کرتا تھا۔ اتفاق سے داخلہ کا راستہ عمارت کے اسی حصہ میں ہو کر جاتا تھا، جہاں جلیلین مجھ سے ملا کرتا تھا۔ میں ہمیشہ وہاں جاتی رہتی تھی اس سے یہ کہنے کے لیے کہ وہ کسی کی مدد کرے یا کوئی خطرناک قسم کی کارروائی روک دے۔ مثال کے طور پر فوجی اکیڈمی کا ایک معاملہ تھا جس پر اس وقت کافی شور مچا تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں نے یہودیوں کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے اگر تم کسی قسم کا ذہنی کام کرتے ہو اور شہر میں رہتے ہو جیسے ہم رہتے ہیں تو تمہارے آدھے سے زیادہ دوست یقینی طور پر یہودی ہوں گے۔ پھر بھی ایسے موقعوں پر جب منظم جماعتی قتل عام ہوتا ہے اور جب اسی طرح کی خوفناک اور قابل نفرت حرکتیں ہونے لگتی ہیں تو ہم نہ صرف افسوس غصہ اور شرم محسوس کرتے ہیں بلکہ ہم آپس میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

''تعجب کی بات ہے کہ یہ لوگ جنہوں نے ایک مرتبہ بنی نوع انسان کو بت پرستی کی لعنت سے نجات دلائی تھی اور جن میں سے ایک بڑی تعداد اب بنی نوع انسان کو ناانصافی سے آزادی دلانے کے لئے کام کر رہی ہے خود اپنے آپ کو اس وفاداری سے نجات نہ دلاسکیں جس کی تمام اہمیت ختم ہو چکی ہے اور یہ کہ وہ اپنی موجودہ حیثیت سے بلند ہو کر ان تمام باقی لوگوں میں مکمل مل نہ سکیں جن کے مذہب کی بنیاد انہوں نے رکھی ہے۔

''خیر، تو میں وہاں اس امید میں جایا کرتی تھی کہ پاشا سے آتے جاتے ہوئے ملاقات کرسکوں گی۔ دروازے کے باہر سڑک پر ہمیشہ قطار لگی رہتی تھی۔ میں وہاں انتظار کیا کرتی۔ میں نے بھی زبردستی اندر گھسنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ میں اس کی بیوی ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ خود اس کا باپ یہاں سے قریب ہی بڑی شاہراہ کے کنارے ایک بستی میں موجود ہے جہاں وہ ایک جلاوطن کی حیثیت سے رہا کرتا تھا اور اس کا دوست تیورزن بھی وہیں پر ہے، دونوں مقامی انقلابی عدالت کے رکن ہیں۔ کیا تم یقین کر سکتے ہو کہ پاشا اپنے باپ سے ملنے تک نہیں گیا۔ اگر میں یہ ثابت بھی کر دیتی کہ میں اس کی بیوی ہوں تو بھی اس سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوتا! ایسے زمانہ میں بیویوں کی ان کے لئے کیا حقیقت ہوتی ہے؟ یہ عالمی کارکن۔۔۔ کائنات کی تخلیق نو۔۔۔ یہ ہے اصل بات! لیکن بیوی، محض ایک انفرادی دوپایہ۔۔۔ ان کے لئے ایک جوں یا پسو سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی! اس کا ایڈی کانگ باہر آکر لوگوں سے پوچھا کرتا تھا کہ وہ اس سے کس لئے ملنا چاہتے ہیں اور ان میں سے کچھ لوگوں کو اندر جانے کی اجازت بھی دے دیتا تھا۔ میں نے کبھی اسے اپنا نام نہیں بتایا اور جب اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کیا کام تھا تو میں نے ہمیشہ یہی کہہ دیا کہ ذاتی کام ہے۔ ایڈی اپنے کندھے ہلا دیتا اور مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگتا۔ میں نے ایک مرتبہ بھی اس کی شکل نہیں دیکھی۔

''دراصل وہ ہمارے پاس خالی ہاتھ واپس آنا برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ ہمارے پاس ایک فاتح کی حیثیت سے واپس آنا چاہتا ہے۔۔۔ اعزاز واکرام کے ساتھ اور اپنے تمام اعزازات ہمارے قدموں میں ڈال دینا چاہتا ہے۔ ہمیں زندہ جاوید بنانے کے لئے، ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دینے کے لئے! بالکل ایک بچے کی طرح۔''

اتنے میں کاتنکا پھر اندر آئی۔ لاریسا فیودرونا نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور اسے اٹھا کر چاروں طرف گھمانا، گدگدی کرنا اور چمٹانا شروع کر دیا، جس سے بچی بھی حیرت زدہ ہوگئی۔

☆☆☆

یوری آندرےوچ گھوڑے پر واری کینو واپس جا رہا تھا۔ وہ اسی راستہ سے لاتعداد مرتبہ گزرا تھا۔ وہ سڑک سے اتنا واقف تھا کہ نہ وہ راستہ کا خیال کرتا تھا اور نہ آگے دیکھتا تھا۔ وہ اب جلد ہی جنگل کے اندر چوراہے پر پہنچ جائے گا جہاں سے راستہ واری کینو جاتا تھا۔

اس دن کے بعد اب دو مہینے گذر چکے تھے جب یوریاتن سے گھر واپس جانے کی بجائے اس نے رات لاریسا فیودرونا کے یہاں گذاری تھی اور اپنے گھر والوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی کام سے شہر رک گیا تھا اور رات کو سمدیویاتوف کی سرائے میں ٹھہرا تھا۔ وہ کافی عرصہ اسے لارا کہہ کر پکارتا اور تم کی بجائے ''تو'' کہتا تھا حالانکہ وہ

ابھی تک اسے ژواگو ہی کہتی تھی۔ یوری آندرے وچ تونیا کو دھوکا دے رہا تھا۔۔۔اس کا یہ تعلق زیادہ سنگین ہوتا جارہا تھا۔ یہ چیز نفرت انگیز اور غلط تھی کیونکہ وہ تونیا سے محبت کرتا تھا اور اس کی پرستش کرتا تھا۔

کیا اس کی بے وفائی کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک اور عورت کو پسند کرتا تھا؟ نہیں، اس نے کوئی مقابلہ کر کے نہیں دیکھا تھا۔ پسند کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

''اب کیا ہوگا؟'' اس نے اکثر سوچا تھا اور اس نے اس گتھی کو سلجھانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور وہ ایک حل سوچ کر گھر جارہا تھا۔ وہ تونیا سے ہر چیز کا اقبال کرے گا، اس سے معافی مانگے گا اور اب کبھی لارا سے نہیں ملے گا لیکن اس نے لارا سے یہ بات صاف صاف نہیں کہی تھی کہ وہ اس سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر رہا ہے۔ اس روز صبح لارا کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کتنا پریشان تھا اور وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ تکلیف دہ باتیں کر کے اس کی پریشانی میں اضافہ کرے۔ اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ نرم لہجہ میں بار بار یہی کہتی رہی۔ ''وہی کرو جو تم بہتر سمجھتے ہو۔ میری پرواہ مت کرو۔ میں اپنے پر قابو پالوں گی۔'' وہ یہ بات خلوص کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ اسے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ وہ رو رہی ہے اور اس نے اپنے آنسو نہیں پونچھے۔

جب سورج غروب ہوا تو جنگل میں سردی اور تاریکی پھیل گئی۔ ہوا میں سڑی ہوئی پتیوں کی بو بسی ہوئی تھی۔ لاتعداد مچھر ہوا میں بھنبھنا رہے تھے جو آ کر اس کے پسینہ میں شرابور چہرے اور گردن پر بیٹھ جاتے اور وہ انہیں اڑاتا رہتا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز کے ساتھ اس کے تھپڑوں کی آواز بھی آ رہی تھی، اچانک یوری آندرے وچ کو ایک سیدھا سا خیال آیا۔ آخر جلدی بھی کیا ہے؟ وہ اس وعدے سے نہیں پھرے گا جو اس نے اپنے آپ سے کیا ہے۔ اعتراف جرم کیا جائے گا۔ یہ کس نے کہا تھا کہ یہ آج ہی ہونا ضروری ہے؟ وہ لارا سے اپنی بات چیت ختم کرے گا، اسی قدر جوش اور محبت کے ساتھ کہ اس سے ان کی تمام بے چینیوں کی تلافی ہو جائے گی۔ لارا سے پھر ایک مرتبہ ملنے کے خیال سے اس کا دل خوشی میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔

یوری آندرے وچ نے راسیں چھوڑ دیں، رکابوں میں آگے کو جھک کر بیٹھ گیا، اپنے بازو گھوڑے کی گردن میں ڈال دیئے اور اپنا چہرہ اس کی ایالوں میں چھپالیا۔ اس کی اس حرکت کو محبت کا اظہار سمجھ کر گھوڑا جوش میں سرپٹ بھاگنے لگا۔ گھوڑے کے بھاگتے وقت جبکہ اس کے سم مشکل سے زمین سے لگ رہے تھے، یوری آندرے وچ کو ایسا معلوم ہوا جیسے اپنے دل کی مسرت انگیز دھڑکن کے علاوہ وہ کسی کے چلانے کی آوازیں بھی سن رہا ہو۔ لیکن اس نے اسے محض واہمہ قرار دیا۔ اچانک اس کے بالکل نزدیک ہی گولی چلنے کی تیز آواز سنائی دی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، راسیں ہاتھ میں پکڑ لیں اور انہیں کھینچنے لگا۔ تیز رفتاری کے دوران اچانک روکے جانے سے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔

تین مسلح سواروں نے اس کا راستہ روک لیا۔ ان میں سے ایک لڑکا تھا جو اسکول کی ٹوپی پہنے تھا۔ اس نے کارتوسوں کی دو پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ ایک گھوڑسوار فوج کا آدمی تھا جس نے افسروں کا لمبا کوٹ اور سمور کی ٹوپی پہن رکھی تھی اور ایک موٹا آدمی تھا جس کا لباس مضحکہ خیز تھا۔

''جنبش مت کرو کامریڈ ڈاکٹر۔'' گھوڑسوار فوج کے آدمی نے جو سموری ٹوپی پہنے ہوئے تھا اس سے کہا جو ان تینوں میں سے سب سے بڑا تھا۔ ''اگر تم حکم مانو گے تو ہم اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اگر تم حکم نہیں مانو گے تو۔۔۔ برا نہ مانو۔۔۔ تو ہم تمہیں گولی مار دیں گے۔ ہماری یونٹ کا سرجن مارا گیا ہے اور ہم تمہیں طبی کارکن کے طور پر جبریہ بھرتی کر رہے ہیں۔ اپنے گھوڑے سے اتر آؤ اور اس کی راسیں اس نوجوان کو دے دو۔ اور میں پھر ایک مرتبہ تمہیں خبردار کردوں کہ اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو ہم تمہیں فوراً ٹھکانے لگا دیں گے۔''

''کیا تم کامریڈ فورسٹر ہو۔ میکولیتسن کے بیٹے لیبریئس؟''

''نہیں، میں اس کا اعلیٰ افسر رابطہ ہوں۔ میرا نام کامنو دورسکی ہے۔''

شاہراہ

شاہراہ پر قصبے، گاؤں اور قازقوں کی بستیاں واقع تھیں۔ یہ پرانی ڈاک کی سڑک تھی، سائبیریا کی سب سے پرانی شاہراہ۔ یہ قصبوں کے درمیان سے چاقو کی طرح گزرتی تھی اور انہیں اس طرح تقسیم کردیتی تھی جیسے ڈبل روٹی کے توس کاٹے جاتے ہیں۔ اس کے دونوں طرف گاؤں بکھرے ہوئے تھے۔ ماضی قدیم میں جب کہ خود اتسکوئی تک ریل نہیں آئی تھی، اس وقت ڈاک یکوں کے ذریعہ شاہراہ کے رستے بھیجی جایا کرتی تھی۔ ایک طرف چائے، روئی اور کچے لوہے کے کارواں جاتے تھے اور دوسری طرف سے زیر حفاظت قیدی پیدل لائے جاتے تھے۔ وہ لوگ قدم ملا کر بیڑیاں ہلاتے ہوئے چلتے تھے۔۔۔ گمشدہ روحیں، مایوس انسان جنہیں دیکھ کر دل پر ایک دہشت سی طاری ہو جاتی اور ان کے

اردگرد، تاریک اور دشوار گذار جنگل میں درخت سرسراتے رہتے تھے۔ شاہراہ کے کنارے رہنے والے ایک خاندان کی مانند تھے۔ دوستیوں اور شادیوں کے ذریعہ قصبے اور گاؤں آپس میں ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے تھے۔

یوری آندرے وچ کو ہنگامی فوج کے ہاتھوں قید ہوئے ایک سال سے زائد ہو چکا تھا۔ اس کی آزادی کی حدود نہایت غیر واضح تھیں۔ جہاں وہ قید کیا گیا تھا، وہاں چاروں طرف دیواریں نہیں تھیں، محافظ نہیں تھے اور کوئی شخص اس کی نقل و حرکت کی نگرانی نہیں کرتا تھا۔ ہنگامی فوج برابر نقل و حرکت کرتی رہتی تھی۔ اور یوری آندرے وچ اس کے ساتھ جاتا تھا۔ فوج مقامی آبادی سے الگ نہیں رہتی تھی۔ جن کی زمینوں اور بستیوں میں سے وہ ہو کر گزرتی تھی، اس کے سپاہی ان لوگوں سے گھل مل جاتے تھے۔ اس کی یہ قید و بند زندگی کی دوسری مجبوریوں سے مختلف نہیں تھی جو اکثر اسی طرح نہ تو نظر آتی ہیں اور نہ کوئی انہیں سمجھ سکتا ہے اور جو نہ ہونے کے برابر اور محض ایک واہمہ معلوم ہوتی ہیں۔

اس نے تین مرتبہ ہنگامی فوج کی قید سے بھاگنے کی کوشش کی تھی، لیکن ہر مرتبہ پکڑ لیا گیا تھا۔ اسے کسی قسم کی سزا نہیں دی گئی تھی، لیکن وہ آگ سے کھیل رہا تھا۔ ہنگامی فوج کا اعلیٰ افسر لیبریُس اس کی حمایت کرتا تھا۔ وہ اس کا ساتھ پسند کرتا تھا اور اسے اپنے ہی خیمہ میں سلاتا۔ یوری آندرے وچ کو یہ زبردستی کا ساتھ پریشان کن معلوم ہوتا تھا۔

اس زمانہ میں ہنگامی فوج برابر مشرق کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بعض موقعوں پر فوج کی یہ نقل و حرکت کولچک کو مغربی سائبیریا سے مار بھگانے کی عام مہم کا ایک حصہ ہوتی۔ دوسرے موقعوں پر جب سفید فوج عقب سے حملہ کرتی اور ہنگامی فوج کے گھر جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا تو مشرق کی طرف سے فوجی پیش قدمی فرار کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ کافی عرصہ تک ڈاکٹر ان باریکیوں کو نہیں سمجھ سکا۔ ہنگامی فوج شاہراہ کے ساتھ ساتھ چلتی اور کبھی کبھی اسے استعمال بھی کرتی۔ اس کے کنارے بسے ہوئے گاؤں اور چھوٹے چھوٹے قصبے جنگ میں کامیابی یا ناکامی کے مطابق سرخ فوج یا سفید فوج کی حمایت کرتے تھے۔ ان پر سرسری نظر ڈالنے پر یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ اس وقت وہ کس کے قبضہ اختیار میں ہیں۔

ڈاکٹر بہت مصروف تھا۔ موسم سرما میں میعادی بخار اور گرمی کے موسم میں پیچش پھیل گئی تھی۔ اور پھر اس کے علاوہ زخمی بھی تھے جن کی تعداد جنگ دوبارہ شروع ہو جانے سے بہت بڑھ گئی تھی۔ ناکامیوں اور پسپائیوں کے باوجود ان بستیوں میں سے جہاں سے کسان فوج گزرتی تھی لوگ برابر آ کر ہنگامی فوج میں شامل ہوتے تھے اور اس کے علاوہ مفرور فوجی بھی اس میں آ کر شامل ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر نے جو اٹھارہ مہینہ کا عرصہ ہنگامی فوج کے ساتھ گزارا تھا، اس میں اس کی تعداد دس گنا بڑھ گئی تھی۔

یوری آندرے وچ کے ساتھ کئی نئے بھرتی کئے ہوئے ڈاکٹر اور دو چیف اسسٹنٹ بھی تھے۔ وہ دونوں سابق جنگی قیدی تھے۔ ان میں سے ایک کا نام کرینی لیجوس اور دوسرے کا انگلر تھا جو کروشیا کا رہنے والا تھا۔

ریڈ کراس کے بین الاقوامی کنونشن کے مطابق فوج کے طبی عملے کو فوجی کارروائیوں میں حصہ نہیں لینا چاہیے، لیکن ایک موقع پر ڈاکٹر کو اس قاعدے کی خلاف ورزی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ محاذ پر تھا کہ لڑائی شروع ہو گئی اور اسے لڑنے والوں کے ساتھ جنگ میں حصہ لیتے ہوئے ذاتی دفاع میں گولی چلانی پڑی۔ محاذ جہاں وہ دشمن کی گولہ باری میں گھر گیا تھا ایک جنگل کے سرے پر تھا۔ وہ یونٹ کے ٹیلیفون افسر کے پاس زمین پر لیٹ گیا۔ جنگل ان کی پشت پر تھا۔ ان کے سامنے ایک میدان تھا۔ اس کھلے ہوئے میدان کے پار سفید فوجیں حملہ کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر ان کی شکلیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ لوگ لڑکے ہی سے تھے جو دارالخلافہ کی شہری آبادی سے حال ہی میں رضا کارانہ طور پر شامل ہوئے تھے۔

یوری آندرے وچ کے پاس کوئی رائفل نہیں تھی۔ وہ گھاس پر لیٹا ہوا لڑائی کا رخ دیکھ رہا تھا۔ اس کی تمام تر ہمدردیاں ان بچوں کے ساتھ تھیں جو بہادروں کی طرح مر رہے تھے۔ ان حالات میں جبکہ چاروں طرف موت اور زندگی کی کشمکش ہو رہی تھی اس طرح ناکارہ لیٹے ہوئے دیکھتے رہنا ناممکن اور انسانی شعور کے خلاف تھا۔ سوال ان لوگوں کے ساتھ وفاداری کا جنہوں نے اسے قید کر رکھا تھا یا اپنی حفاظت کا نہیں تھا بلکہ حالات کے مطابق عمل کرنے کا تھا۔ ایک بے تعلق شخص کی طرح رہنا قاعدے کے خلاف تھا۔ اس کے لئے بھی وہی کرنا ضروری تھا جو ہر شخص کر رہا تھا۔ جنگ ہو رہی تھی۔ اس پر اور اس کے ساتھیوں پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ اس کے لئے جواب میں گولی چلانا ضروری تھا، اس لئے جب اس کے قریب ہی ٹیلیفون افسر تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا تو وہ رینگتا ہوا اس کے قریب گیا۔ اس کا کارتوسوں کا تھیلا اور رائفل اٹھائی اور اپنی جگہ پر واپس جا کر لگاتار گولیاں چلانے لگا۔

یوری آندرے وچ ٹیلیفون افسر کو چھوڑ کر باہر میدان میں سفید فوج کے اس کم عمر سپاہی کے پاس گیا جسے اس نے ہلاک کر دیا تھا۔ لڑکے کے چہرے پر معصومیت کے آثار نظر آ رہے تھے۔" میں

نے اسے کیوں مار ڈالا؟'' ڈاکٹر نے سوچا۔ اس نے لڑکے کا کوٹ کھول کر دیکھا۔ کسی مشاق ہاتھ نے ۔۔۔ جو غالباً اس کی ماں کا تھا۔۔۔ اس کا نام سیریوزا رنز یووچ اندراستر پر خوبصورت الفاظ میں کاڑھ رکھا تھا۔ سیریوزا کی کھلی ہوئی قمیص کے اندر سے ایک صلیب، ایک لاکٹ اور ایک سونے کا چپٹا سا کیس جو نسوار کی ڈبیہ جیسا تھا باہر نکل پڑا۔ اسی وقت سیریوزا نے کراہ کر جنبش کی۔ وہ زندہ تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اسے ایک معمولی قسم کے اندرونی زخم کی وجہ سے سکتہ ہو گیا تھا۔ گولی اس کی ماں کے تعویذ نے روک لی تھی اور اس طرح وہ بچ گیا۔ لیکن اب اس بیہوش آدمی کا کیا بنے گا؟

یہ وہ وقت تھا جب کہ دہشت و بربریت پورے شباب پر تھی۔ قیدی زندہ یا سلامت ہیڈ کوارٹر تک نہیں پہنچتے تھے اور دشمن کے زخمی ہونے والے سپاہیوں کو میدان جنگ ہی میں چاقو مار کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔

یوری آندرے وچ نے مردہ ٹیلیفون افسر کا بھاری لباس اتار لیا۔ اینگلر کی مدد سے جسے اس نے سب معاملہ بتا دیا تھا اسے اس لڑکے کے لباس سے تبدیل کر دیا۔ وہ اور اینگلر لڑکے کی دیکھ بھال کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ صحت یاب ہو گیا۔ جب وہ ٹھیک ہو گیا تو انہوں نے اسے چھوڑ دیا حالانکہ اس نے ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھی تھی کہ وہ کولچک کی فوج میں واپس جا کر سرخ فوج سے جنگ جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

موسم خزاں میں ہنگامی فوج نے ایک ایسی جگہ ڈیرا جما لیا جو ایک ڈھلوان پہاڑی کے اوپر ایک چھوٹا سا جنگل تھا جس کے تین طرف ایک تیز رفتار نالہ زمین کو کاٹتا ہوا بہتا تھا۔ سفید فوج نے گذشتہ سال موسم سرما کا زمانہ اس میں گزارا تھا۔ اور وہاں آس پاس کے گاؤں والوں کی مدد سے خندقیں کھود لی تھیں لیکن وہ لوگ موسم بہار میں اپنی قلعہ بندیوں کو تباہ کئے بغیر وہاں سے چلے گئے تھے۔ اب ان کی کھودی ہوئی خندقیں ہنگامی فوج کے کام آ رہی تھیں۔ ڈاکٹر ایک خندق میں لیبرئیس کے ساتھ رہتا تھا جس نے دو راتوں سے برابر باتیں کر کے اسے سونے نہیں دیا تھا۔

یوری آندرے وچ اپنے پلنگ پر اوندھا لیٹ گیا۔ اس نے اپنا منہ تکیہ میں چھپا لیا اور اس بات کی پوری کوشش کرنے لگا کہ وہ لیبرئیس کی باتیں نہ سن سکے جو اپنی صفائی پیش کر رہا تھا اور پھر ایک مرتبہ اسے یہ اطمینان دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ موسم بہار تک انہیں سفید فوج کے مقابلہ میں ضرور فتح حاصل ہو جائے گی۔ خانہ جنگی ختم ہو جائے گی۔ امن، آزادی اور خوشحالی کا دور دورہ ہو گا اور پھر کسی شخص کو اتنی جرات نہیں ہو گی کہ وہ ڈاکٹر کو ایک منٹ بھی روک سکے لیکن ایسا ہونے تک اسے صبر کرنا چاہیے۔

یوری آندرے وچ نے خاموشی کے ساتھ غصے کے عالم میں سوچا۔ ''وہ اپنی بکواس بند نہیں کر سکتا؟ آخر اسے سالہا سال سے برابر یہی بکواس کرتے ہوئے شرم کیوں نہیں آتی؟ کسی دن اس کی باتیں ناقابل برداشت ہو جائیں گی اور میں اسے جان سے مار ڈالوں گا، ہلاک کر دوں گا۔''

موسم خزاں کا صاف اور سنہرا دن تھا۔ جنگل کے مغربی سرے پر سفید فوج کی بنائی ہوئی لکڑی کی عمارت کی برجی دکھائی دے رہی تھی۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ پورے ہفتہ موسم پرسکون اور خشک رہا تھا۔ وسیع کیمپ میں حسب معمول شور ہو رہا تھا جیسے دور سے سمندر کی لہروں کا شور سنائی دے رہا ہو۔ لوگوں کے چلنے پھرنے، کلہاڑیوں سے لکڑی کاٹنے، فولادی سندان کوٹنے، گھوڑوں کے ہنہنانے، کتوں کے بھونکنے، مرغوں کے بانگ دینے کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ سانولی رنگت کے آدمی مسکراتے ہوئے جنگل میں پھر رہے تھے۔ جو لوگ ڈاکٹر کو جانتے تھے وہ اسے دیکھ کر سلام کے لئے سر ہلاتے تھے اور دوسرے بغیر کسی سلام دعا کے گزر جاتے۔

اپنے بچپن ہی سے یوری آندرے وچ کو شام کے وقت غروب آفتاب کے ساتھ جنگل کا منظر بہت پسند تھا۔ ایسے لمحات میں وہ محسوس کرتا تھا جیسے روشنی کی نوکیلی کرنیں اس کے جسم سے بھی پار ہو رہی ہوں جیسے زندگی اس کے سینے میں ابل رہی ہو اور اس کے جسم کو پھاڑتی ہوئی پروں کی طرح اس کے شانوں پر نمودار ہو رہی ہو۔ اسے قدرتی منظر، جنگل، شفق، غرضیکہ ہر چیز ایک لڑکی کی ایسی ہی بنیادی اور جاذب نظر شبیہہ میں تبدیل ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ ''لارا'' اس نے آنکھیں بند کر کے زیر لب کہا اور اپنے تمام تر وجود کے ساتھ اس کا تصور کرنے لگا۔ تمام روئے زمین اور سورج کی روشنی میں جگمگاتی ہوئی فضائے بسیط اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئی، لیکن روزمرہ کی زندہ حقیقت پھر بھی اس کے سامنے تھی۔ روس اکتوبر کے انقلاب سے گذر رہا تھا اور وہ ہنگامی فوج کی قید میں تھا۔ ایسی ہی کھوئی ہوئی حالت میں وہ میکنڈ روسکی کے سلگائے ہوئے الاؤ تک گیا۔

مکینڈ روسکی نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر ڈاکٹر کو دے دیا: ''یہ تمہاری میڈیکل یونٹ کی روانگی کے احکامات ہیں۔ ہنگامی فوج کے خاندانوں کو لے کر قافلہ قریب پہنچ چکا ہے، اور کیمپ کے اندر کے اختلافات کا آج شام تک تصفیہ ہو جائے گا، لہٰذا اب ہم کسی روز بھی روانہ ہو سکتے ہیں۔''

"تو پھر میں جا کر پمفل کو دیکھتا ہوں۔"

پمفل کے پاس جاتے ہوئے ڈاکٹر پر تکان غالب آ گئی۔ یہ کئی روز راتوں کو متواتر جاگتے رہنے کا نتیجہ تھا۔ وہ اسے اپنے خیمہ کے دروازے پر مل گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی تھی۔ اس کے سامنے صنوبر کے کٹے ہوئے تنوں کا ایک اونچا سا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ پمفل ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ اس کے لمبے سیاہ بال اور داڑھی تھی اور ابھری ہوئی پیشانی تھی جو دوہری معلوم ہوتی تھی۔ سامنے کی ہڈی چوڑی تھی جیسے کوئی فولادی گول سی لکڑی اس کی کنپٹیوں پر دبا دی گئی ہو۔ جب انقلاب کے شروع میں یہ اندیشہ تھا کہ 1905ء کی طرح یہ جدوجہد صرف تعلیم یافتہ اعلیٰ طبقوں کی تاریخ میں مختصر ہی رہے گی اور سوسائٹی کی جڑوں تک نہیں پہنچے گی تو عوام میں انقلابی پروپیگنڈا پھیلانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی تھی تاکہ انہیں بیدار کیا جا سکے۔ ان ابتدائی دنوں میں پمفل پالخ جیسے لوگوں کو جنہیں ذہین لوگوں، افسروں اور اعلیٰ طبقہ کے افراد کے خلاف نفرت دلانے کے لئے کسی کوشش کی ضرورت نہیں تھی، بائیں بازو کے پرجوش اور ذہین لوگ ایک نادر اور قابل قدر شخصیت سمجھتے تھے۔

"خیمہ کے اندر آ جاؤ۔" پمفل نے کہا۔

"نہیں یہ کیوں؟ باہر فضا زیادہ خوشگوار ہے۔ میں اندر نہیں آ سکوں گا۔"

وہ دونوں صنوبر کے کٹے ہوئے درختوں پر بیٹھ گئے اور پمفل نے ڈاکٹر کو اپنی داستان حیات سنائی: "لوگ کہتے ہیں کہ کہانی جلد ختم ہو جاتی ہے، لیکن میری کہانی طویل ہے۔ میری بیوی اور میں جوان تھے۔ وہ گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ میں کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ ہماری زندگی بری نہیں گزر رہی تھی۔ ہمارے بچے بھی تھے۔ انہوں نے مجھے فوج میں بھرتی کر لیا اور پھر جنگ پر بھیج دیا۔ جہاں تک جنگ کا سوال ہے میں تمہیں جنگ کے متعلق کیا بتاؤں؟ تم دیکھ ہی چکے ہو کامریڈ ڈاکٹر۔ پھر انقلاب آیا۔ مجھے روشنی کی کرن دکھائی دی۔ سپاہیوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ جرمن ہمارے دشمن نہیں تھے بلکہ ہمیں میں سے کچھ لوگ ہمارے دشمن تھے۔ عالمی انقلاب کے سپاہیو! اپنی رائفلیں رکھ دو گھر جاؤ۔ بورژواؤں کو پکڑو! اور ایسی ہی باتیں! تم یہ سب کچھ خود جانتے ہو۔ کامریڈ فوجی ڈاکٹر۔ بہر حال پھر خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ میں ہنگامی فوج میں شامل ہو گیا۔ اب میں اس وقت کیا دیکھ رہا ہوں؟ وہ ڈاکو، لٹیرا، وہ روسی محاذ سے دوستاو روپوسکی رجمنٹیں لایا ہے میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں؟ کیا میں سمجھتا نہیں ہوں؟ کیا میں فوج میں نہیں رہ چکا ہوں؟ ڈاکٹر، ہم لوگ مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ہم ختم ہو چکے ہیں۔

"لیکن میری بیوی اور بچے ہیں۔ اگر فتح اس کی ہوتی ہے تو پھر وہ لوگ کس طرح بھاگ سکیں گے؟ وہ لوگ بے قصور ہیں۔ وہ یہ کچھ نہیں سوچے گا۔ وہ میری بیوی کو رسی سے باندھ دے گا اور میری بجائے اسے ایذائیں پہنچا کر ہلاک کر دے گا۔ وہ میرے بچوں کی ہڈیاں پسلیاں ایک کر دے گا۔ ان کا ایک ایک عضو جسم سے علیحدہ کر دے گا۔ اور تم پوچھتے ہو کہ میں سوتا کیوں نہیں؟ آدمی فولاد کا بنا بھی ہو سکتا ہے لیکن ایسی چیزوں سے تمہارا دماغ بھی خراب ہو سکتا ہے"۔

"تم بھی کیسے عجیب آدمی ہو، پمفل۔ اب تم دو ایک روز میں ان سے ملنے والے ہو اور اس پر خوش ہونے کے بجائے تم اس قسم کا مظاہرہ کر رہے ہو جیسے ان کے جنازہ میں شریک ہو۔"

"یہ پہلے کی باتیں ہیں۔ اب معاملہ مختلف ہے۔ میں جلد ہی مر جاؤں گا، لیکن میں اپنے بچوں کو تو دوسری دنیا میں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا یا لے جا سکتا ہوں؟ وہ یہیں رہیں گے اور وہ اس کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔ وہ ان کے جسموں کا سارا خون قطرہ قطرہ کر کے نچوڑ لے گا۔"

"کیا تمہیں اسی لئے منحوس شکلیں دکھائی دیتی ہیں؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ تمہیں ایسی شکلیں نظر آتی ہیں۔"

"ڈاکٹر، میں نے تمہیں سب کچھ بتایا ہے۔ میں نے سب سے اہم بات پوشیدہ رکھی ہے۔ میں نے تم جیسے بہتوں کو ختم کر دیا ہے۔ میرے ہاتھ بہت سے افسروں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔۔۔ بہت سے سرمایہ داروں کے خون سے اور میں اس کی وجہ سے کبھی پریشان نہیں ہوا۔ میں خون پانی کی طرح بہاتا رہا، لیکن ایک ایسا بھی شخص ہے جسے میں اپنے ذہن سے نہیں بھلا سکتا۔ میں نے اس نوعمر شخص کو ہلاک کر دیا تھا اور میں یہ بات نہیں بھول سکتا۔ یہ واقعہ فروری کے انقلاب کا ہے جو کرینسکی کے تحت ہوا تھا۔ ہم نے بغاوت کر دی تھی۔ ہم ایک ریلوے اسٹیشن کے قریب تھے۔ ہم محاذ سے آ گئے تھے۔ انہوں نے ایک نوجوان، ایک انتشار پسند کو ہم سے بات چیت کر کے واپس جانے پر آمادہ کرنے کے لئے بھیجا تاکہ ہم آخر دم تک لڑ سکیں۔ تو وہ نوجوان کیڈٹ ہم سے یہ کہنے کے لئے آیا کہ ہم معقولیت کا ثبوت دیں۔ وہ بالکل بھولا بھالا سا تھا۔ "آخر دم تک لڑتے رہو۔" یہی اس کا نعرہ تھا۔ وہ پانی کے ایک پیپے پر یہ نعرہ لگاتا ہوا چڑھ گیا، پانی کا پیپا ریلوے پلیٹ فارم پر تھا۔ اچانک ڈھکنا الٹ گیا اور وہ اندر جا پڑا۔ وہ مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا۔ میرے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔ میں ایک رائفل تھامے ہوئے تھا اور ہنستے ہنستے میرا سر چکر کھانے لگا۔ پھر میں نے نشانہ باندھ کر اسے

وہیں ہلاک کر دیا۔ اور یہی ہے میرا وہ بھیانک خواب جو مجھے دکھائی دیتا رہتا ہے۔ مجھے وہ اسٹیشن راتوں کو دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت یہ سب مذاق تھا لیکن اب مجھے افسوس ہے۔"

"کیا یہ واقعہ میلوزیود کے شہر کے قریب بروچی اسٹیشن پر پیش آیا تھا؟"

"یاد نہیں۔"

"کیا تم زیوشینو کی بغاوت میں شریک تھے؟"

"یاد نہیں۔"

فرار

ہنگامی فوج کے سپاہیوں کے گھر والوں کا قافلہ جس کے ساتھ بچے اور سامان بھی تھا کافی عرصہ سے ہنگامی فوج کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ قافلہ کے ساتھ گاڑیوں کے پیچھے مویشیوں کا ریوڑ تھا جس میں زیادہ تر گائیں تھیں۔ ان کی تعداد کئی ہزار تھی۔ ہنگامی فوج نے اب اپنا کیمپ ایک نئی جگہ منتقل کر لیا تھا۔ خیال تھا کہ وہ اس وقت تک وہاں ٹھہریں گے جب تک کہ آس پاس کے علاقہ کا جائزہ لیا جائے اور موسم سرما کے لئے رہنے کے واسطے موزوں جگہ تلاش نہ کر لی جائے، لیکن غیر متوقع حالات کی بنا پر اب انہیں سردیوں کا موسم اسی جگہ گزارنا تھا۔ نیا کیمپ کسی طرح پرانے کیمپ جیسا نہیں تھا۔ اس کے چاروں طرف گھنا جنگل تھا اور ناقابل عبور جھاڑیاں تھیں۔

شروع زمانہ میں جب خیمے گاڑے جا رہے تھے اور یوری آندرے وچ کے پاس آرام کرنے کے لئے زیادہ وقت تھا وہ مختلف سمتوں میں جنگل کے اندر گھومتا پھرا تھا اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی شخص بھی اس کے اندر غائب ہو سکتا ہے۔

سردی کے موسم میں مشرق کی سمت منتقل ہونے کے خیال کو آسانی سے ترک نہیں کیا گیا۔ گشتی دستے جائزہ لینے کے لئے شاہراہ کے دوسری طرف بھیجے گئے۔ لبریس اکثر غائب رہتا اور ڈاکٹر اکیلا رہ جاتا، لیکن اب ہنگامی فوج کے منتقل ہونے کا وقت نہیں رہا تھا اور پھر کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں وہ جا سکتے۔ یہ ان کی ہزیمت کا بدترین وقت تھا۔ سفید فوج نے انہیں مکمل طور پر تباہ کرنے سے پہلے ان کے جنگل کے دستوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے انہیں گھیرے میں لے لیا تھا اور ہر طرف سے دبا رہے تھے۔

سپاہیوں کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ چھوٹے افسر ہمت ہار چکے تھے۔ روزانہ رات کو اعلیٰ کمانڈروں کا جلسہ ہوتا اور مختلف قسم کے حل پیش کئے جاتے۔ آخر میں کیمپ کو منتقل کرنے کا خیال ترک کر دیا گیا۔ طے کیا گیا کہ جھاڑیوں کے بیچ میں دفاعی مورچوں کو مضبوط بنایا جائے۔ فوری ضرورت اس بات کی تھی کہ خندقیں کھود کر مورچہ بندی کر لی جائے اور زیادہ سامان اکٹھا کر لیا جائے۔ کیمپ کے کھانے کے انچارج افسر بسورین نے رپورٹ پیش کی کہ آٹے اور آلوؤں کی شدید قلت پیدا ہو گئی ہے تاہم مویشی بہت کافی تعداد میں موجود تھے اور اس کا خیال تھا کہ موسم سرما میں اصل خوراک دودھ اور گوشت ہو گی۔ گرم کپڑوں کی بھی کمی تھی۔ بہت سے سپاہیوں کے پاس پورا لباس تک نہیں تھا۔ کیمپ میں تمام کتوں کو مار ڈالا گیا۔ اور جن لوگوں کو سمور کے ملبوسات بنانے کا تجربہ تھا انہیں کتوں کی کھال کی جیکٹیں بنانے کے کام پر لگا دیا گیا جو بالوں والا حصہ اوپر رکھ کر پہنی جا سکتی ہوں۔ ڈاکٹر کو گاڑیاں استعمال کرنے سے روک دیا گیا۔ آخری مرتبہ جب ہنگامی فوج کا کیمپ منتقل ہوا تھا تو زخمیوں کو تیس میل تک اسٹریچروں پر لے جایا گیا تھا۔ اس کے پاس جو دوائیں باقی بچی تھیں ان میں صرف کونین، کچھ نمک اور آیوڈین تھی۔

ڈاکٹری ضرورتوں کے لئے شراب کی کشید پھر شروع کر دی گئی۔ جب کیمپ میں یہ بات مشہور ہوئی تو لوگوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھ کر سر ہلائے۔ لوگ پھر شراب کے نشہ میں بدمست نظر آنے لگے اور اخلاقی معیار پھر گر گیا۔ اس مرتبہ جو شراب تیار کی گئی تھی وہ آیوڈین کو حل کرنے اور کونین کا ٹنکچر تیار کرنے کے لئے موزوں تھی۔ موسم سرما کی آمد پر جب ٹائیفس بخار پھر پھیلا تو کونین کا ٹنکچر ہی اس کے علاج کے لئے کام میں لایا گیا۔

سردی کے شباب پر پہنچنے سے قبل کیمپ کے لوگوں کو ہنگامہ کے ایک دور سے گزرنا پڑا جو پریشانیوں، غیر یقینی کیفیتوں، الجھنوں اور خطرناک حالات سے بھرپور تھا اور اس دوران متعدد حادثات بھی پیش آئے۔ سفید فوج نے منصوبہ کے مطابق محاصرہ مکمل کر لیا تھا۔ دوسری طرف ان کے لئے یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ بے کار بیٹھے رہیں۔ ان کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ایک نہ ایک حملہ ضرور کریں خواہ وہ حملہ فوجی مظاہرے کے طور پر ہی کیوں نہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے فوج کا ایک مضبوط حصہ علیحدہ کر دیا گیا اور اسے دائرے کے مغربی قطر پر لگا دیا گیا۔ کئی روز کی شدید جنگ کے بعد ہنگامی فوج نے سفید فوج کو شکست دے دی اور گھیرا توڑ کر ان کے عقب میں پہنچ گئی۔ یہ راستہ کھل جانے سے جھاڑیوں کے اندر کیمپ تک پہنچنے کا راستہ نکل آیا۔

جنگل کے مغربی سرے پر لڑائی ہو رہی تھی، لیکن جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ یہ لڑائیاں ایسی ہی معلوم ہوتی تھیں جیسے کہ کسی بڑی

مملکت کی سرحدوں پر ہو رہی ہوں اور جنگل کے وسط میں چھپے ہوئے کیمپ میں اتنے زیادہ لوگ تھے کہ خواہ ان میں سے کتنے ہی لڑنے کے لئے چلے جاتے پھر بھی وہاں ہمیشہ زیادہ ہی لوگ دکھائی دیتے تھے۔

سردی کا سخت موسم آ گیا اور شدید برف گرنے لگی۔ برفانی کہر میں سے غیر متعلق آوازیں اور شکلیں ابھرنے لگیں جو ساکت رہتی تھیں، پھر نقل و حرکت کرتی تھیں اور غائب ہو جاتی تھیں۔ سورج اب وہ سورج نہیں رہا تھا جس کی زمین عادی تھی۔ وہ اس کی تبدیل شدہ شکل معلوم ہوتی تھی۔ اس کا سرخ گولا جنگل کے اوپر لٹکا رہتا تھا اور اس کے اندر سے آہستہ آہستہ دبی دبی کرنیں خواب آلود کیفیت یا پریوں کی داستان کی طرح درختوں پر پھیلتی رہتی تھیں۔

فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ڈاکٹر کی ملاقات لیبریئس سے ہو گئی۔ ''ہیلو، اجنبی! آج شام کو میری خندق میں آؤ۔ رات وہیں گذارنا۔ ہم باتیں کریں گے۔ کچھ خبریں بھی ملی ہیں۔''

''کیا ہرکارہ واپس آ گیا؟ واری کینو سے کوئی خبر آئی؟''

''تمہارے یا میرے گھر والوں کے متعلق کوئی خبر نہیں ملی۔ اسی سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ یقیناً وقت پر بچ کر نکل گئے ہوں گے۔''

اسی روز شام کو لیبریئس کی خندق میں جا کر ڈاکٹر نے اپنا سوال دہرایا۔ ''تم نے ہمارے گھر والوں کے متعلق کیا سنا ہے؟ بس مجھے اتنا بتا دو۔''

''تم اپنی ناک سے آگے کچھ نہیں دیکھنا چاہتے ہو۔ تکلیف کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ سارے محاذ پر کولچک کی فوجیں پسپا ہو رہی ہیں۔ انہیں بالکل تباہ کر دیا گیا ہے۔ سمجھے تم! میں ہمیشہ سے کیا کہا کرتا تھا؟ کیا تمہیں یاد ہے کہ تم کس طرح بسورا کرتے تھے؟''

''میں کب بسورتا تھا؟''

''ہمیشہ۔ خاص طور پر جب ولسن کی فوجیں ہمیں دبا رہی تھیں۔''

ڈاکٹر کو خزاں کا وہ موسم یاد آ گیا جب غداروں کو گولی ماردی گئی تھی۔ پمفل نے اپنی بیوی اور بچوں کو ہلاک کر دیا تھا، قتل و غارت گری کا سلسلہ جس کا کوئی خاتمہ ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ سفید اور سرخ فوجیں مظالم کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتی تھیں۔ ایک ظلم سے دوسرا ظلم پیدا ہوتا تھا۔ خون کی بو اس کی ناک اور گلے میں بھر گئی تھی، اس سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا، متلی ہونے لگی تھی، وہ اس کے دماغ کو چڑھ گئی تھی اور اس کا سر چکرانے لگا تھا۔

''خدا کے لیے مجھے پریشان مت کرو۔ تم ہمارے گھر والوں کے متعلق کیا جانتے ہو؟''

''واری کینو میں نہیں ہیں اور یہ خوش قسمتی کی بات ہے۔''

''میں ابھی واپس آتا ہوں۔ یہاں بہت دھواں ہے اور میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں ذرا باہر ہوا میں سانس لینے جا رہا ہوں۔'' باہر نکل کر ڈاکٹر نے لکڑی کے اس کندے پر سے برف جھاڑی جو خندق کے دروازے پر رکھا ہوا تھا اور اس پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ جنگلی جھاڑیاں کیمپ اور اٹھارہ مہینے کا وہ زمانہ جو اس نے ہنگامی فوج کے ساتھ گزارا تھا، یہ سب اس کے ذہن سے نکل گئے۔ وہ ان کے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔ اس کا ذہن محض اپنے پیاروں کی یاد سے معمور تھا اور تمام دوسرے خیالات اس کے دماغ سے نکل گئے تھے۔

اس نے تونیا کو برف کے شدید طوفان میں ایک کھیت میں چلتے ہوئے دیکھا۔ وہ ساشا کو گود میں لئے ہوئے تھی۔ وہ کیسا باپ ہے؟ کیا ایک حقیقی باپ کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ہمیشہ علیحدہ رہے۔ بہتر ہے کہ اس کے متعلق سوچا ہی نہ جائے۔ ڈاکٹر اٹھ کھڑا ہوا اور خندق میں واپس جانے کے لیے مڑا۔ اچانک اس کے خیالات نے دوسرا رخ اختیار کیا اور اس نے لیبریئس کے پاس واپس جانے کا ارادہ بدل دیا۔

کافی عرصہ قبل اس نے برف پر پھسلنے کے تختے، بسکٹوں کا ایک تھیلا اور دوسری چیزیں چھپا کر رکھی تھیں جن کی اسے چھپ کر فرار ہونے کی صورت میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس نے یہ سب چیزیں کیمپ کے باہر درخت کی جڑ میں برف میں گاڑ دی تھیں۔ اس نے وہاں ایک نشان بھی بنا دیا تھا تا کہ انہیں آسانی سے تلاش کر سکے۔ اب وہ مڑ کر پگڈنڈی پر ہوتا ہوا اس طرف گیا جہاں اس نے اپنا یہ خزانہ دفن کیا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا اور چاند نکلا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سنتری کس جگہ تعینات تھے۔ جب وہ اس کھلی ہوئی جگہ پر پہنچا تو ایک سنتری نے کچھ فاصلہ سے اسے للکارا:

''ٹھہر جاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔ تم کون ہو؟ شناخت کا لفظ؟''

''تمہیں کیا ہو گیا ہے بھئی؟ کیا تم مجھے نہیں جانتے؟ میں کیمپ کا ڈاکٹر ہوں، ژواگو۔''

''تم اتنی رات گئے کس فکر میں ہو؟''

''میں پیاسا تھا اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پھر میں نے یہ برفانی درخت اور اس کی برف میں دبی ہوئی بیریاں دیکھیں۔ میں جا کر تھوڑی بیریاں توڑنا چاہتا ہوں۔''

"کبھی کسی کو سردیوں کے موسم میں بیریاں توڑتے ہوئے نہیں سنا! ہم لوگ تین سال تم سب لوگوں کی عقلوں کا فتور دور کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن تم لوگ اب بھی ویسے ہی ہو۔ اچھا ٹھیک ہے۔ جاؤ اور جا کر اپنی بیریاں توڑو، پاگل آدمی، میں اس کی کیا پروا کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر پگڈنڈی پر چلتا ہوا برفانی درخت تک پہنچا، آدھا درخت برف میں دبا ہوا تھا اور آدھا برف میں جمی ہوئی پتیوں اور بیریوں سے لدا ہوا تھا اور اس کی دو سفید شاخیں اس کی طرف پھیلی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کر اسے لارا کی توانا اور سفید بانہیں یاد آ گئیں اور اس نے وہ ٹہنیاں پکڑ کر اپنی طرف کھینچیں۔ اس کے جواب میں درخت نے برف کو اس کے اوپر جھاڑ دیا۔ بغیر یہ محسوس کئے کہ وہ کیا کہہ رہا تھا، وہ بڑبڑایا: "میں تمہیں ڈھونڈ لوں گا، میری حسینہ، میری محبوبہ، میری برفانی دیوی میری زندگی۔" آسمان بالکل صاف تھا، اور چودہویں کا چاند چمک رہا تھا۔ وہ جھاڑیوں کے گھنے جنگل میں دور تک چلا گیا۔ وہ نشان لگے ہوئے درخت تک گیا، اپنی چیزیں کھود کر نکالیں اور کیمپ سے فرار ہو گیا۔

اس گھر کے سامنے

مرچنٹ اسٹریٹ یوریاتن کے بالائی حصہ میں مکانوں اور گرجا گھروں کے قریب سے ہوتی ہوئی سانپ کی طرح بل کھاتی گذرتی تھی۔ ایک کونے میں وہ سیاہی مائل عمارت تھی جس پر عورتوں کے مجسمے بنے ہوئے تھے۔ اس عمارت کے نچلے حصے کے چوکور پتھروں پر حکومت کے تازہ اعلانات اور اخبارات کے صفحات چسپاں تھے۔ قریب ہی کچھ لوگ خاموش کھڑے ان اعلانات کو بغور پڑھنے میں مصروف تھے۔ برف پگھلنے کے بعد اب موسم خشک اور کہر آلود تھا۔ اب دن کے اس حصہ میں بھی روشنی ہوتی تھی جبکہ چند ہفتے قبل اس وقت سخت اندھیرا ہوا کرتا تھا۔

سفید روسی حال ہی میں شہر کا قبضہ چھوڑ کر گئے تھے اور اب شہر سرخ فوج کے قبضہ میں تھا۔ بمباری، خون خرابہ اور زمانہ جنگ کے تفکرات ختم ہو چکے تھے، لیکن لوگ موجودہ صورت حال سے بھی پریشان تھے بالکل اسی طرح جیسے موسم سرما کے خاتمہ پر دن طویل ہو جانے کے بعد لوگوں کو ایک نئی فکر دامنگیر ہوتی ہے۔

اس عمارت کے سامنے جو لوگ جمع تھے ان میں ایک ایسا آدمی بھی آ کر شامل ہو گیا جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی جنگل سے آیا ہے۔ سوکھ کر کانٹا۔ مارے غلاظت کے اس کا رنگ سیاہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے کندھے پر ایک تھیلا ڈال رکھا تھا اور ہاتھ میں ایک چھڑی لئے ہوئے تھا۔ اس کے سر کے گندے اور گھنے بالوں میں ابھی کوئی سفید بال نمودار نہیں ہوا تھا تاہم اس کی داڑھی کے سرخی مائل نوکیلے اور سخت بال کہیں کہیں سے رنگ بدل رہے تھے۔ یہ تھا یوری آندرے وچ، اس کی پوستین یا تو کسی نے راستے میں چھین لی تھی یا پھر اس نے کھانے پینے کی اشیاء حاصل کرنے کے لیے خود ہی اس کا سودا کر ڈالا تھا۔

وہ کوئی ایک گھنٹہ قبل یوریاتن کے مضافات میں پہنچ گیا تھا مگر وہاں سے یہاں تک پہنچنے میں اسے اتنا وقت لگ گیا۔ گذشتہ چند روز کی تھکاوٹ کے بعد اب نقاہت کا یہ عالم تھا کہ اس کے لئے ایک ایک قدم سوسو من کا ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ گھٹنوں کے بل جھک کر اس شہر کے پتھروں کو بوسہ دے جسے دوبارہ دیکھنے سے وہ تقریباً مایوس ہو چکا تھا۔ اس شہر کو دیکھ کر وہ مارے خوشی کے پھولا نہیں سمایا۔ اپنے طویل پیدل سفر میں آدھا راستہ اس نے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل کر طے کیا۔ لائن زیر استعمال نہیں تھی اور برف میں دبی پڑی تھی۔ جگہ جگہ اسے ریل گاڑیاں ملیں جو سفید روسی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ یہ گاڑیاں بیکار کھڑی تھیں۔ ان میں سے بعض لٹیروں کی کمین گاہ بنی ہوئی تھیں یا بھاگے ہوئے مجرموں یا سیاسی مفرورین کی پناہ گاہ۔ لیکن بیشتر برف پوش گاڑیاں اس علاقہ میں سردی اور ٹائفس سے مرنے والوں کا قبرستان بنی ہوئی تھیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جس نے اس قدیمی محاورہ کی واقعی تصدیق کر دی تھی کہ "انسان۔ انسان کے لئے بھیڑیئے کی حیثیت رکھتا ہے۔" مسافر دوسرے مسافر کو دیکھ کر فوراً سڑک سے ہٹ جاتا۔ اجنبی دوسرے اجنبی کو دیکھتے ہی ہلاک کر دیتا تا کہ کہیں دوسرا اسے قتل نہ کر ڈالے۔ کہیں کہیں مردم خوری کے واقعات بھی پیش آئے تھے۔ انسانی تہذیب کے قوانین معطل ہو چکے تھے، ہر طرف جنگل کے قانون کا دور دورہ تھا۔ آج انسان قبل از تاریخ کے دھات اور پتھر کے زمانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ کہیں کہیں یوری آندرے وچ کو بھی خندق پار کرتے یا سڑک سے گذرتے ہوئے کوئی تاریک انسانی سایہ دکھائی دے جاتا۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ ان سے بچ کر نکلنے کی کوشش کرتا۔

ژواگو فوراً سڑک پار کر کے لارا کے مکان تک پہنچنے کے لئے تیزی کے ساتھ زینہ چڑھنے لگا جو اسے بے حد عزیز تھا۔ اس نے جنگل کے کیمپ میں بارہا اس فولادی قدمچوں والے زینہ کو یاد کیا تھا۔ وہ کنڈی کھٹکھٹانے ہی والا تھا کہ اس نے دیکھا کہ دروازے پر ایک تالا پڑا ہوا ہے جو خستہ حال دروازہ کے نقشین تختوں میں زنجیروں

سے جکڑا ہوا ہے۔ پرانے زمانہ میں اس قدر مکمل تباہی کا کوئی تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ تالے ہوتے تو دروازے میں باقاعدہ لگے ہوتے اور خرابی ہوتی تو لوہار سے مرمت کرالی جاتی، لیکن یہاں تالا زنجیروں میں لٹک رہا تھا۔

ڈاکٹر کو یقین تھا کہ لارا اور کاتنکا گھر پر نہیں ہیں۔ ممکن ہے وہ یوریاتن ہی میں نہ ہوں اور کیا خبر زندہ بھی ہیں یا نہیں؟ وہ بدترین خبر سننے کو تیار تھا، تاہم اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے دیوار کے شگاف میں چابی تلاش کرنا شروع کر دی جہاں کسی زمانہ میں کاتنکا ایک بڑے چوہے کی موجودگی سے بری طرح خوفزدہ ہو گئی تھی۔

دیوار کے شگاف میں ایک اینٹ رکھی تھی جسے اس نے ہٹا دیا اور اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ اوہ! معجزہ۔۔۔ واقعی معجزہ۔۔۔ شگاف سے چابی نکل آئی اور اس کے ساتھ ایک رقعہ بھی۔ یہ رقعہ بہت طویل تھا۔ زینہ کے قریب کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اس نے رقعہ پر نظر ڈالی تو ایک اور معجزہ دکھائی دیا۔ یہ خط اس کے اپنے نام تھا۔ اس نے تیزی سے پڑھنا شروع کیا: ''اوہ میرے خدا کس قدر مقام مسرت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم زندہ ہو۔ واپس آ گئے ہو۔ ایک آدمی نے تمھیں شہر کے قریب دیکھا اور فوراً بھاگا ہوا میرے پاس بتانے آیا۔ میرا خیال ہے تم سیدھے واری کینو جاؤ گے، لہٰذا میں بھی کاتنکا کو ساتھ لے کر واری کینو جا رہی ہوں، لیکن اگر ضرورت پڑی تو چابی میں اس جگہ رکھے جا رہی ہوں جہاں یہ ہوتی ہے۔ میرا انتظار کرنا۔ ادھر ادھر نہ ہو جانا۔ میں خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی ہوں۔'' اس نے یہ خط صفحہ کے آخر تک پڑھا مگر الٹ کر دوسری طرف نہیں دیکھا حالانکہ دوسری طرف بھی کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس نے رقعہ کو بوسہ دے کر لپیٹا اور چابی کے ساتھ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس خوشی کے عالم میں اس نے شدید درد و کرب بھی محسوس کیا کیونکہ لارا واری کینو تو جا رہی ہے مگر اس نے رقعہ میں تو بتایا ہی نہیں کہ وہاں کیوں جا رہی ہے۔ غالباً اس کا خاندان وہاں نہیں تھا۔ یہ سوچتے ہی کہ اس کے بیوی بچے وہاں نہیں ہیں ژواگو کچھ اداس سا ہو گیا اور اسے ایک قسم کی تشویش دامنگیر ہو گئی۔ اس نے سوچا آخر لارا نے ان لوگوں کے بارے میں کیوں نہیں لکھا؟

ژواگو نے لارا کے مکان کا تالا کھول لیا۔ زینہ میں ابھی تک معمولی روشنی تھی۔ ڈاکٹر خوش ہوا کہ سورج غروب کے معاملہ میں جلد بازی سے کام نہیں لے رہا۔ دروازہ کھولنے کی چرچراہٹ کے ساتھ ہی مکان میں زبردست ہنگامہ شروع ہو گیا۔ چوہوں نے برتنوں کی الماریوں سے فرش پر چھلانگیں لگاتے ہوئے ایک افراتفری مچا دی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ چوہے یہاں ہزاروں کی تعداد میں پروان چڑھ رہے ہیں۔

موسم بہار کی شام ہر طرف بکھری ہوئی آوازوں سے معمور تھی۔ دور نزدیک ہر طرف سے کھیلتے ہوئے بچوں کی صدائیں آتی رہی تھیں جو اس امر کا ثبوت تھیں کہ ابھی اس خطہ میں زندگی کے آثار باقی ہیں اور یہ وسیع خطہ مادر روس ہے۔ فقید المثال! جس کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہے، روس ۔۔۔ شہیدوں کا گہوارہ۔۔۔ سخت جان ۔۔۔ سخاوت کی انتہا۔۔۔ پاگل پن اور غیر ذمہ داری اور محبت کا گہوارہ۔ وہ روس جو ابدی طور پر شان و شکوہ، تباہی و بربادی اور غیر متوقع حادثات و کارگذاریوں کا مرکز بنا رہا ہے۔۔۔ اوہ! زندہ رہنا بھی، کتنی پیاری چیز ہے۔ زندہ رہنے اور زندگی سے محبت کرنے میں بھی کتنا لطف ہے؟ اور یہی وہ چیز تھی جس کا نام تھا لارا!

ژواگو کی آنکھوں میں محبت اور پچھتاوے کے آنسو بھر آئے۔ اس نے آتشدان کا در کھول کر آگ کو ہلایا۔ جو لکڑیاں پوری طرح جل کر کوئلہ بن رہی تھیں انہیں اس نے کھینچ کر پیچھے ہٹایا اور کم آنچ دینے والی لکڑیوں کو آگے کی طرف کھینچ کر۔ آتشدان کا در کھلا چھوڑ کر وہ شعلوں کے سامنے آگ تاپنے بیٹھ گیا۔ وہ اس روشنی کے کھیل اور اپنے چہرہ اور ہاتھوں کی تمازت سے خوب محظوظ ہو رہا تھا۔

اسے لارا ناقابل برداشت حد تک یاد آنے لگی اور لارا سے اپنی فوری ملاقات کے خیال سے وہ بری طرح بیتاب ہو کر رہ گیا۔ اس نے لارا کا لکھا ہوا رقعہ جو اب چرمر ہو چکا تھا اپنی جیب سے نکالا۔ مڑا ہوا رقعہ اس طرح تھا کہ اس کا پچھلا حصہ باہر اور دوسرا حصہ جو وہ پڑھ چکا تھا اندر کی طرف تھا۔ اب اس نے دیکھا کہ رقعہ کی دوسری طرف بھی کچھ لکھا ہوا ہے۔ رقعہ کو سیدھا کر کے اس نے لکڑیوں کی پھڑ پھڑاتی روشنی میں اسے پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا: ''یقیناً تمھیں معلوم ہو گا کہ تمہارے خاندان پر کیا گذری۔ یہ سب لوگ ماسکو میں ہیں۔ تونیا کے منی سی بیٹی پیدا ہوئی تھی۔'' اس کے بعد کئی سطریں لکھ کر کاٹ دی گئی تھیں اور پھر لکھا تھا: ''میں نے جان کر یہ سطریں کاٹی ہیں کیونکہ اس قسم کی باتیں لکھنا بے وقوفی ہو گی۔ ملاقات ہونے پر ہم پوری طرح بات کریں گے۔ میں جلدی میں ہوں۔ باہر جا رہی ہوں۔ مجھے گھوڑے کی سخت تلاش ہے۔ اگر گھوڑا نہ ملا تو کیا ہو گا؟ کاتنکا کا مسئلہ بھی تو ہے۔۔۔'' باقی کا فقرہ پڑھا نہیں جا سکا۔ یوری آندرے وچ نے اطمینان سے سوچا۔۔ ''سمدیویاتوف سے اس کو گھوڑا مل گیا ہو گا۔ اگر وہ کچھ چھپانا چاہتی تو

وہ اس کا تذکرہ ہرگز نہ کرتی۔''

جب آتشدان گرم ہوگیا تو اس نے ہوادان بند کر دیا اور کچھ کھانے کی فکر کی۔ اس کے بعد اسے اتنی زور کی نیند آئی کہ وہ کپڑے بدلے بغیر ہی صوفے پر لیٹا اور فوراً ہی سو گیا۔ دیوار اور دروازے کے پار اسے چوہوں کا پریشان کن شور وغل قطعاً سنائی نہیں دیا اور اس عرصے میں اسے یکے بعد دیگرے دو بھیانک خواب آئے۔ اس نے دیکھا وہ ماسکو میں ایک ایسے کمرہ میں ہے جس کا دروازہ شیشے کا ہے۔ دوسری طرف اس کا ننھا سا بیٹا ساشدکا ایک ملاح کی وردی اور ٹوپی پہنے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے اندر آنے کے لئے منت و ساجت کر رہا تھا۔ بچے کے پیچھے ایک آبشار تھا جس کا پانی اڑ کر بچے اور دروازے کو تر بتر کر رہا تھا۔

بلندی سے گرتے ہوئے پانی کے شور سے لڑکا بہت سہا ہوا تھا اور اس شور میں لڑکے کی چیخیں گم ہو کر رہ گئیں۔ یوری آندرے وچ اندازہ سے دیکھ رہا تھا کہ وہ بار بار کچھ اس طرح منہ بنا رہا ہے کہ اسے ''ڈیڈی۔ ڈیڈی۔'' کہہ کر پکار رہا ہے۔ دل شکستہ آندرے وچ پوری شدت کے ساتھ چاہتا تھا کہ وہ لڑکے کو اپنے بازوؤں میں لے کر اسے بھینچ کر سینے سے لگائے لیکن اس نے باہر کھڑے ہوئے بچے کو عزت و غیرت کے جھوٹے تصور پر، اور ایک دوسری عورت کی طرف سے اپنے آپ پر عائد ہونے والی مبینہ ذمہ داری پر قربان کر دیا۔

اپنا پہلا خواب دیکھ کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے اور آنسوؤں میں تر بتر تھا۔ اس نے سوچا۔ ''مجھے بخار ہو گیا ہے۔ میں بیمار ہوں۔۔۔ یہ ٹائفس نہیں ہے۔۔ یہ تو ایک قسم کی انتہائی نقاہت ہے جو کسی خطرناک بیماری کی صورت اختیار کر رہی ہے۔'' اور وہ پھر سو گیا۔ اس نے پھر خواب دیکھا۔ ماسکو کے ایک مصروف بازار میں موسم سرما کی تاریک صبح کا وقت تھا۔ لیمپ کی زردی مائل روشنی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ انقلاب سے پہلے کا زمانہ تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا مکان ہے جس کی بے شمار کھڑکیاں ہیں۔ مکان کے اندر لوگ بالکل مسافروں کی طرح پورے کپڑے پہنے سو رہے تھے۔

میزبان لارا جس نے جلدی میں اپنی کمر کے گرد گاؤن باندھ لیا تھا ایک سے دوسرے کمرے میں تیزی اور خاموشی کے ساتھ آ جا رہی تھی۔ اور وہ (ڈاکٹر) اس کے پیچھے پیچھے واہیات اور بے تکی باتیں بڑبڑاتا ہوا پھر رہا تھا اور بالکل مسخرہ دکھائی دیتا تھا لیکن لارا کو اس بات کی ذرا بھی فرصت نہ تھی کہ اس کی غیر متعلق بڑبڑاہٹ کو سنتی یا اہمیت دیتی۔ اور یہ عورت۔ اف۔ خدا کی پناہ۔ اس سے کتنی دور تھی۔ کتنی سرد مہر تھی۔ کتنی خوبصورت اور پرکشش تھی۔ اس نے اس عورت پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔

اس کے اندر جو چیز رو رہی تھی، سسکیاں بھر رہی تھی وہ خود اس کی ذلت نہیں تھی بلکہ اس کی ذات سے بھی کوئی عظیم تر چیز تھی جو تاریکی میں فاسفورس کے سے روشن الفاظ میں چمک رہی تھی۔ اس گریہ کناں روح کے ساتھ اس نے بھی رونا شروع کر دیا۔ نیند، ہذیان اور بے ہوشی کے درمیان جب اسے ذرا دیر کے لئے ہوش آتا تو وہ محسوس کرنے لگتا۔ ''میں بیمار ہوں۔ مجھے کسی خاص قسم کا ٹائفس ہو گیا ہے۔''

اس کے بعد وہ بے ہوش ہو جاتا یا اسے پھر نیند آ جاتی اور جب دوبارہ آنکھ کھولی تو دیکھا کہ برف سے ڈھکی ہوئی کھڑکی سے گلابی روشنی چھن چھن کر آ رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیشے کے گلاس میں سرخ شراب چھلک رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا یہ صبح سویرے کا وقت ہے یا شام کا جھٹپٹا۔

معاً اس نے محسوس کیا کہ اس کا منہ ہاتھ دھلایا گیا ہے۔ اس کو نئی قمیص پہنائی گئی ہے۔ وہ صوفہ پر نہیں بلکہ ایک نئی مسہری پر لیٹا ہوا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے قریب، اس پر جھکے ہوئے، اس کے بالوں سے اپنی دراز زلفوں کو ٹکراتے ہوئے اور اپنی آنکھوں سے آنسو ڈھلکاتے ہوئے لارا وہاں بیٹھی تھی۔ مارے خوشی کے وہ غش کھا گیا۔

☆☆☆

ژواگو تیزی کے ساتھ صحت مند ہو گیا۔ لارا اسے کھانا کھلاتی۔ اس کے آرام و آسائش کا انتظام کرتی۔ لارا چوبیس گھنٹے اس کی تیمارداری میں گذارتی۔ وہ ہر وقت چکا چوند کر دینے والے حسن کے جلوے لئے کبھی سوال کرتی۔ کبھی جواب دیتی۔ یا پھر کبھی اپنی ملائم اور گرم سانسوں کی آواز میں سرگوشیاں کرتے ہر وقت اس کے اردگرد منڈلاتی رہتی۔ ان کی دبی دبی باتیں جو کبھی کبھار ہوتی تھیں اتنی ہی معنی خیز تھیں جتنے کہ افلاطون کے مکالمات۔ باقی دنیا سے وہ جتنے مختلف تھے اتنے ہی وہ آپس میں مشترک تھے۔ انہیں آج کے روایتی جدید انسان سے نفرت تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے گہری محبت تھی۔ بیشتر افراد اس جذبہ کی خصوصیات سے باخبر ہوئے بغیر ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں، لیکن ژواگو اور لارا عام لوگوں سے بہت مختلف تھے۔ ان پر جب جوش محبت غالب آتا اور ابدیت کے ایک سانس کی طرح ان کے انسانی وجود پر چھا جاتا تو ان کے لئے یہ ایک الہامی دور ثابت ہوتا۔ وہ اس مختصر وقفہ میں مسلسل اپنے آپ اور زندگی کے متعلق نئی نئی باتیں دریافت کرتے۔ ''ہاں ہاں۔ ضرور۔ تمہیں اپنے خاندان کے پاس واپس

جانا چاہیے۔ میں ضرورت سے زیادہ تمہیں ایک دن بھی یہاں نہیں روکوں گی۔ لیکن ذرا یہ تو غور کرو کہ ہو کیا رہا ہے؟ تمہاری بیماری کے دوران ہی یوریاتن کا شہر کتنا بدل گیا ہے۔ ڈاک غائب۔ مسافروں کی آمد و رفت کا سلسلہ بند۔ لیکن تم سفر کیسے کر سکتے ہو۔ تم ہڈیوں کا پنجر بنے ہوئے ہو۔ ذرا جان آ جائے تو پھر چلے جانا۔ تم ڈاکٹری کرو۔ یہاں یہ لوگ بھی اسے پسند کریں گے۔ ممکن ہے تمہیں علاقائی محکمہ صحت میں کوئی کام مل جائے۔ تمہارا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔ تم انقلابی فوج سے بھاگ کر آئے ہو۔ تم مفرور فوجی ہو۔ تمہیں تو کسی بھی صورت میں بے کار نہیں پھرنا چاہیے۔ مجھے بھی کوئی کام ضرور کرنا ہوگا۔ یوں سمجھو کہ میں تو ایک آتش فشاں کے دہانہ پر بیٹھی ہوں۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے اس سے؟ اسٹریلینکوف کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''اسی کے باعث تو یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ اس کے بہت سے دشمن ہیں۔ سپاہی اور افسر جو کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تھے مگر فوجی لیاقت اور فتوحات کے باعث چوٹی تک پہنچ گئے تھے اور جنہیں سب کچھ معلوم تھا اب ان کی مصیبت آ گئی ہے۔ ان کی تو یہی خوش قسمتی ہوگی کہ انہیں صرف برطرف کر دیا جائے۔ مجھے رونے سے سخت نفرت ہے، لیکن اگر میں نے اب اس کے بارے میں ایک بھی بات اور کی تو میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگوں گی۔''

''تمہیں اس سے بے حد محبت تھی۔ اب بھی ہے نا؟''

''میں نے اس سے شادی کی یوروچکا! وہ میرا شوہر ہے۔ وہ ایک صاف گو آدمی اور تابناک شخصیت کا حامل ہے۔ وہ بہت مضبوط کردار کا آدمی ہے، لیکن میں بہت بری ہوں۔ اس کے مقابلہ میں میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں یہی دراصل میرا قصور ہے۔''

''تم واری کینو میں اتنی دیر کیوں رہیں۔ یہ جگہ سنسان پڑی ہے، آخر تمہیں وہاں اتنی دیر کیوں لگی؟''

''میں کاتنکا کے ساتھ مل کر وہاں تمہارا مکان صاف کر رہی تھی۔ میرا خیال تھا سب سے پہلے تم وہاں جاؤ گے اور نہیں چاہتی تھی کہ تم اسے ناگفتہ بہ حالت میں دیکھو۔''

''تم اس اختصار سے کام لیتے ہوئے مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ مجھے تونیا کے بارے میں تو بتاؤ۔ ننھی منی بیٹی کا انہوں نے کیا نام رکھا ہے؟''

''ماشا۔ تمہاری والدہ کی یاد میں۔''

''یہ سمدیویاتوف، جس نے تمہیں گھوڑا دیا تھا، بہت ہی دلچسپ آدمی ہے۔ کیا رائے ہے تمہاری؟''

''ہاں۔ بہت دلچسپ۔''

''تم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریبی دوست ہو گئے۔ کیا وہ تمہاری بھی مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟''

''ہر وقت۔ قدرتی بات ہے۔''

''اور تم بھی اسے پسند کرتی ہو۔ معاف کرنا۔ مجھے تم سے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔''

''ارے نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میرا خیال ہے تم دراصل یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ ہمارے تعلقات کس نوعیت کے ہیں؟ کیا ہمارے درمیان محض دوستی سے زیادہ بھی کوئی بات ہو سکتی ہے؟ یقین کرو اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اگر وہ میرے وزن کے برابر تول کر سونا بھی دے، اگر وہ اپنی جان بھی دے دے تو بھی میں اس سے زیادہ ایک قدم اس کے اور قریب نہیں ہوں گی۔''

''تمہارے دل میں ہے کیا؟ مجھے بتاؤ تم تو دنیا کی بہترین شخصیت ہو۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ یوروچکا! میں سنجیدگی سے بات کر رہی ہوں۔ میرے اندر احساس شکست انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ میری ساری زندگی ٹوٹ کر رہ گئی ہے۔ میں نے زندگی کی اصلیت کو وقت سے پہلے ہی پا لیا۔ مجھے زندگی کو اس کے بدترین پہلو سے دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اور وہ بھی ایک خود اعتماد، معمر مفت خورے کی آنکھوں سے۔ جس نے ہر چیز سے پورا فائدہ اٹھایا اور جو اس کے جی میں آیا اس کے ساتھ کیا۔''

''میرا خیال ہے میں سمجھ گیا۔ میں تمہارے بچپن کے آلام کا تصور کر سکتا ہوں۔ ایک ایسا ابتلا جو اس وقت تمہاری عمر سے کہیں زیادہ تھا۔ میں اب صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب تمہیں ان پرانی باتوں کو سوچ کر اداس نہیں ہونا چاہیے۔ خود کو رنج و غم میں مبتلا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ کام تو ان لوگوں کا ہے جو تم سے محبت کرتے ہیں۔ اور یہ بات تو قدرتی طور پر واضح ہے کہ میں اس عورت کی محبت میں جسے میں چاہتا ہوں دوسرا حصہ دار یا شریک برداشت نہیں کروں گا۔ میں ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جنہوں نے کبھی کوئی غلطی نہ کی ہو۔ جو کبھی ٹھوکر کھا کر نہ گرے ہوں۔ ایسے لوگوں کی خوبیاں بے جان ہیں۔ ان کی کوئی قیمت نہیں۔ زندگی نے ان پر اپنے جمال و رعنائی کو آشکار نہیں کیا۔''

''اسی حسن و رعنائی کے بارے میں تو میں سوچ رہی تھی۔ اسی چیز سے مجھے محروم کر دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ بعد میں جب میں نے ایک ایسے آدمی سے شادی کی جو واقعی ایک بڑا آدمی تھا اور خوبیوں کا

مالک تھا اور جو مجھ سے محبت کرتا تھا اور جس سے میں محبت کرتی تھی تو ہماری شادی پھر بھی ناکام ہو کر رہ گئی۔''

''اس سے پہلے کہ تم اپنے شوہر کی مجھ سے بات کرو۔ ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں صرف ان لوگوں سے جلتا ہوں جو مجھ سے گھٹیا ہیں۔ اپنے برابر والوں سے میں کبھی نہیں جلتا۔ ہاں تو ذرا مجھے اس آدمی کے متعلق بتاؤ۔''

''کون سے آدمی کے متعلق؟''

''وہ خبیث جس نے تمہاری زندگی کو تباہ کیا۔ کون تھا؟''

''ماسکو کا ایک خاص مشہور وکیل۔ میرے باپ کا ایک دوست۔ جب ہمارے والد کا انتقال ہو گیا اور ہماری حالت بہت خراب ہو گئی تو اس نے میری والدہ کو مالی امداد پہنچائی۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس کا نام بھی بتا دوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ میں نے اسے ایک مرتبہ دیکھا تھا۔''

''واقعی؟''

''ہوٹل کے ایک کمرہ میں جب تمہاری ماں نے زہر کھایا تھا۔ بہت رات گئے کا واقعہ ہے۔ تم اور میں دونوں ان دنوں اسکول میں پڑھتے تھے۔''

''اوہ۔ مجھے یاد آیا۔ تم کسی دوسرے شخص کے ساتھ وہاں آئے تھے۔''

''کومارووسکی تھا وہاں پر۔''

''کیا واقعی؟ ہم اکثر ایک دوسرے سے ملتے رہا کرتے تھے۔''

''لیکن تم شرما کیوں رہی ہو؟''

''کومارووسکی کا نام تمہاری زبان سے سن کر۔ میں اب یہ نام سننے کی عادی نہیں ہوں۔ میں تو حیرت میں رہ گئی۔''

''ہاں یہی وہ آدمی ہے جس سے میں ہمیشہ ہمیشہ جلتا رہوں گا۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ میں پاگل پن کی حد تک اس سے نفرت کرتا رہوں گا۔''

''تم ایسی باتیں نہیں کہہ سکتے۔ صرف یہی نہیں کہ میں اس سے محبت نہیں کرتی بلکہ میں تو اس سے نفرت کرتی ہوں۔''

''کیا تم اپنے آپ سے اتنی ہی واقف ہو؟ انسانی فطرت اور خاص طور پر عورت کی فطرت تو بے حد پراسرار ہے۔ غالباً تمہاری اس نفرت میں کوئی ایسی بات بھی پوشیدہ ہے جو تمہیں اس سے مرعوب کئے رکھتی ہے۔ اس شخص سے بھی زیادہ تم اس کی غلام ہو جس سے تم بغیر کسی دباؤ کے اپنی مرضی سے محبت کرتی ہو۔''

''کیسی خوفناک باتیں کر رہے ہو تم۔''

''گھبراؤ نہیں۔ میری باتوں پر نہ جاؤ۔ میرا مطلب یہ تھا کہ میں کسی اتھاہ چیز سے جلتا ہوں۔ میں تمہارے سامان آرائش کا رقیب ہوں۔ تمہاری جلد پر پسینے کے قطروں کو دیکھ کر جلتا ہوں۔ میں ان جراثیم سے جلتا ہوں جو تمہاری سانسوں کے ساتھ تمہارے جسم میں جا کر تمہارے خون میں گھل مل جاتے ہیں اور زہریلا مادہ پیدا کرتے ہیں اور میں کومارووسکی سے حسد کرتا ہوں ایسے سمجھ کر جیسے وہ متعدی مرض ہو۔ ایک نہ ایک دن وہ تمہیں مجھ سے چھین کر لے جائے گا۔ اس وقت یہ امکان بہت دھندلا اور الجھا ہوا دکھائی دے رہا ہو گا لیکن میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اسے بیان نہیں کر سکتا۔ میں جنون کی حد تک تم سے محبت کرتا ہوں۔ میرا یہ عشق عقل و منطق کے خلاف ہے۔ بے پایاں اور بے حد و حساب ہے۔ مجھے اپنے شوہر کے متعلق کچھ اور بتاؤ۔۔۔''

''وہ جو میری بدقسمتی کا نوشتہ بن گیا ہے!۔۔۔ جیسا کہ شیکسپیئر نے کہا ہے۔''

''اس نے یہ کہاں کہا ہے؟''

''رومیو جولٹ میں۔''

''مجھے یہ بتاؤ کہ انقلاب سے پہلے تم نے اس کے ساتھ اپنی زندگی کس طرح گذار دی؟''

''شروع شروع میں جب کہ میں بالکل ہی بچہ تھی پاکدامنی اور نیکی میرا نصب العین اور میرا نظریہ تھا اور وہ ان خوبیوں کا مظہر تھا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں ہم تقریباً ایک ہی گھر میں پروان چڑھے، وہ۔ جلیلین۔۔۔ اور میں۔ وہ ابھی بہت کمسن لڑکا تھا کہ مجھ پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ میں نے اس کو اسی وقت اپنے دل میں جگہ دے دی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ذرا سیانی ہوتے ہی میں اس سے شادی کر لوں گی۔ اس کا باپ ریلوے میں سگنل مین یا کراسنگ گارڈ تھا۔ اس نے محض اپنی محنت اور خداداد قابلیت کی بدولت اتنی کامیابی حاصل کی کہ تحصیل علم کے میدان میں وہ انتہا کو پہنچ گیا اور کلاسیکس اور ریاضیات میں نام پیدا کر لیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔''

''لیکن پھر تمہاری شادی کا یہ حشر کیوں ہوا جبکہ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے؟''

''آہ! اس کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ آہ! یہ افراد کا سوال نہیں ہے کہ وہ مزاج میں ایک جیسے ہیں یا مختلف، محبت کے قابل ہیں یا نہیں۔ اس معاشرہ کی اس تنظیم نو اور ہنگامہ آرائی میں ہر چیز خاک میں مل گئی ہے۔ پوری انسانی زندگی کا ڈھانچہ تباہ و برباد ہو گیا

ہے۔ اب جو کچھ باقی رہ گیا ہے، وہ محض ایک برہنہ روح انسانی ہے جس کے جسم سے تار تار اتار لیا گیا ہے۔

''ہم دونوں تو آدم وحوا کی طرح ہیں۔۔۔اس کرۂ ارضی کے قیام کے بعد پہلے دو انسان جن کے پاس تن ڈھانپنے تک کو کچھ موجود نہ تھا۔ اور آج جب کہ دنیا کا خاتمہ قریب ہے اس وقت بھی ہم اتنے ہی برہنہ اور بے گھر ہیں۔ آدم وحوا سے لے کر ہمارے اس دور تک کے ہزاروں برسوں کے درمیان دنیا میں جو بھی بے پناہ عظمت پیدا ہوئی ہے ہم اور تم اس کی آخری یادگار آخری نشانی ہیں اور ان تمام غائب ہو جانے والے عجائبات کی یاد میں ہم زندہ ہیں، محبت کرتے ہیں، روتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔''

اتنا کہنے کے بعد اس نے سسکیاں لیتے ہوئے خود کو اس کے بازوؤں کے درمیان گرا دیا۔

''مجھے بتا دو میری جان تم کتنی ذہین اور عقلمند ہو۔''

''جنگ سے دو سال پہلے ہماری شادی ہوئی۔ ہم نے ابھی اپنی زندگی کا آغاز ہی کیا تھا۔ ہم نے ابھی اپنا گھر آباد ہی کیا تھا کہ جنگ چھڑ گئی۔ اب میرا یہ ایمان ہے کہ یہ سب تباہی اس جنگ کی وجہ سے ہم پر نازل ہوئی۔ اچانک ہر شعبۂ زندگی مفلوج ہو کر رہ گیا۔ ریلوے کی ٹرینیں، شہروں میں اشیائے خور ونوش۔ خاندانوں کی اساسیں اور بنیادیں اور معیار اخلاق بھی کچھ تباہی کی نذر ہونے لگا۔

''چنانچہ یہ تھا وہ وقت جبکہ ہماری اس سرزمین روس پر جھوٹی باتوں نے قدم جمائے۔ ان سب برائیوں کی جڑ یہ تھی کہ لوگوں کی انفرادی رائے اور اس کے وزن سے اعتماد اٹھ گیا۔ لوگ یہ سوچنے لگے کہ ان کی اپنی اخلاقی قدروں پر عمل کرنا اب فرسودہ بات ہو گئی کہ ان سب کو کورس کی شکل میں مل کر گانا چاہیے اور دوسرے لوگوں کے نظریہ کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے اور نظریات بھی ایسے جو مار مار کر لوگوں کے حلق سے نیچے اتارے جا رہے تھے۔ یہ سماجی برائی ایک وبا کی صورت اختیار کر گئی۔ ہمارے اپنے گھر میں بھی یہ وبا پھیل گئی۔ ہمارے گھرانے میں اچانک کچھ گڑبڑ ہونے لگی۔ ہم قدرتی حالات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے عادی تھے مگر اب ہم نے احمقانہ طور پر ایک دوسرے کے ساتھ برخود غلط قسم کا رویہ اختیار کر لیا۔ ہماری زندگیوں میں یہ جو بناوٹ اور فریب واقعی پیدا ہو گیا تھا، آخر پاشا جیسا آدمی انہیں محسوس کئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا؟''

لارا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''اور اسی مرحلہ پر اس نے ایک مہلک ایک بھیانک غلطی کی۔ اس نے زمانہ کی اسپرٹ، معاشرہ اور عالمی برائی کو ایک پرائیویٹ اور خانگی معاملہ سمجھ لیا۔ وہ ہماری ادبی خرافات کو سنتا رہا اور اس نے سمجھا کہ چونکہ وہ اعلیٰ پایہ کا آدمی نہیں، وہ کوئی بڑی شخصیت نہیں لہٰذا اسی لئے ہم اس سے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ وہ محض اس لئے لڑائی پر گیا کیونکہ وہ اپنے آپ کو ہم پر ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ اس سارے پاگل پن کی ابتدا یہی تھی۔ وہ حالات و واقعات کی رفتار سے بہت آزردہ اور پریشان تھا۔ اس نے تاریخ سے جھگڑا مول لیا۔ وہ آج تک تاریخ سے اپنا حساب چکانے کی کوشش کر رہا ہے۔ او خدا! کاش میں اسے بچا سکتی۔''

''اس کے لئے تمہاری محبت کتنی قوی اور کتنی پاکیزہ ہے۔ محبت کرتی رہو۔ اس سے محبت کرتی رہو۔ میں خود کو اس کا رقیب نہیں سمجھتا۔ کبھی نہیں سمجھوں گا۔ میں تمہاری راہ میں کبھی حائل نہیں ہوں گا۔''

موسم گرما آیا اور آنکھ جھپکتے ہی گذر بھی گیا۔ ڈاکٹر صحت یاب ہو گیا۔ ماسکو جانے کا منصوبہ تیار کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے نہ صرف ایک بلکہ تین جگہ بیک وقت ملازمت اختیار کر لی۔ سکہ کی قیمت روز بروز گرنے کی وجہ سے گذارہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہفتہ میں تین یا چار مرتبہ یوری آندرے وچ میاسکی اسٹریٹ میں یوریاتن ہیلتھ سروس کے بورڈ کے اجلاس میں شریک ہوتا۔ شہر کے دوسرے کنارے عورتوں کی بیماریوں کی سابق انسٹی ٹیوٹ کی عمارت تھی جو سمدیویاتوف کے والد نے اپنی بیوی کی یاد میں قائم کی تھی۔

جب وہ گھر پہنچتا تو لارا کو گھریلو کاموں میں مصروف پاتا۔ وہ پکائی یا دھلائی میں مصروف ہوتی۔ ہر روز گھر کے کام کرتے ہوئے جب وہ اسے بے کیف اور غیر شاعرانہ حالت میں دیکھتا، یعنی اس کے بال الجھے اور پھیلے ہوئے ہوتے، وہ اپنی آستینیں چڑھا لیتی، اپنا سایہ ذرا اوپر کو اڑس لیتی تو ڈاکٹر اس کے اس شاہانہ جلال سے سہم کر رہ جاتا۔ اگر وہ رقص کی کسی محفل میں جانے کے لیے اونچی ایڑی کا جوتا اور تنگ طویل اور کھڑکھڑاتا ہوا سایہ پہن کر اس کے سامنے آتی تب بھی وہ اتنی حسین وجمیل دکھائی نہ دیتی جتنی کہ اس گھریلو حلیہ میں دکھائی دیتی تھی۔ بالکل قاتل! دھلائی اور صفائی کے کام ختم ہو جاتے تو وہ کاتنکا کو پڑھانے بیٹھ جاتی۔

اسی طرح دو تین مہینے گزر گئے۔ اکتوبر کا مہینہ تھا کہ ایک دن یوری آندرے وچ نے لاریسا فیودُونا سے کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے اپنی اس جگہ سے استعفیٰ دینا پڑے گا۔ میں تنگ آ چکا ہوں۔ میں ہسپتال میں البتہ اس وقت تک کام کرتا رہوں گا جب تک کہ وہ مجھے خود نہیں نکال دیتے۔ لیکن انسٹی ٹیوٹ اور ہیلتھ سروس

سے میں استعفیٰ دے دوں گا۔ کبھی میرے دل میں خیال ضرور آتا ہے کہ ممکن ہے کسی نہ کسی دن وہ مجھے گرفتار کر لیں۔''

''خدا نہ کرے۔ یوروچکا! خوش قسمتی سے ابھی حالات اتنے نہیں بگڑے۔ مگر تمہارا خیال صحیح ہے۔ زیادہ محتاط رہنے میں کوئی حرج نہیں۔'' اس بات چیت کے عواقب بھی جلد ہی دیکھنے میں آ گئے۔ تلاشیوں اور گرفتاریوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ افواہیں بھی سننے میں آئیں کہ بعض مشتبہ افراد بچ کر دریا پار بھاگ گئے ہیں۔

لارا نے کہا: ''سارا ماحول دھمکیوں سے پر ہے۔ اب ہماری خیر نہیں۔ یہ لوگ تمہیں۔۔۔ مجھے اور تمہیں دونوں کو گرفتار کر لیں گے۔ لیکن کا تنکا کا کیا ہو گا۔ میں ماں ہوں۔ مجھے سوچ سمجھ کر کوئی حل تلاش کرنا ہو گا۔ اوہ۔ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔''

''ہاں ہاں۔ آؤ اس پر ذرا سوچیں۔''

''ہم لازمی طور پر بچ کر نہیں نکل سکتے، تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ذرا سایہ میں، ذرا پس منظر میں ذرا ایک طرف ہو کر بیٹھ جائیں۔ مثال کے طور پر واری کینو چلیں۔ مجھے موسم سرما وہاں گذارنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ سردیوں کا موسم سر پر آن پہنچا۔ اتنی دیر میں کہ وہ ہم تک پہنچیں، ہم اس زندگی کا تقریباً ایک سال اور گذار چکے ہوں گے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ سمدیویاتوف ہمارے اور شہر کے درمیان رابطہ کا کام انجام دے گا۔ ممکن ہے وہ ہمیں روپوش کرنے میں بھی کچھ مدد پہنچائے۔ کہتے ہیں وہاں بھیڑیئے ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تیورزن اور انتی پوف جیسے آدمی تو بھیڑیوں سے بھی زیادہ، خوف ناک ہیں۔''

''مجھے نہیں خبر میں کیا کہوں۔ واری کینو کے بارے میں تم جو کہہ رہی ہو اسے کیا کروں؟ تم خود بھی ایسی الگ تھلگ جگہ جانا پسند نہیں کرو گی۔''

''ظاہر ہے۔ نہیں۔۔۔ تمہارے بغیر میرا اکیلے وہاں جانا تو بالکل ناممکن ہے۔''

''اور پھر بھی تم مجھ سے کہہ رہی ہو کہ میں ماسکو چلا جاؤں؟''

''میں اس کے متعلق سیما سے بات کر رہی تھی۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میں نے اسے کئی بار دیکھا ہے۔''

''ارے! مجھے تو تم پر حیرت ہے۔ واقعی! تمہاری جگہ میں ہوتی تو فوراً اس پر عاشق ہو جاتی۔ مجھے نہیں خبر تم مرد اپنی آنکھیں کہاں رکھتے ہو۔ ارے جانتے ہو کتنی بلا کی حسین، دلربا، شاندار، ذہین، تعلیم یافتہ، رحمدل اور واضح دل و دماغ کی مالک ہے وہ۔''

☆☆☆

وہ ایک بار پھر ریلوے اسٹیشن گیا اور خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ اسے اور لارا کو کچھ خبر نہ تھی کہ آگے چل کر کیا پیش آنے والا ہے۔ پہلی برفباری سے قبل جیسا موسم یہ ہوتا ہے ویسے ہی اس وقت سخت سردی اور تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

یوری آندرے وچ جب گھر آیا تو دیکھا کہ سیما لارا سے باتیں کر رہی ہے۔ یوری آندرے وچ دونوں کے انہماک میں مخل ہونا نہیں چاہتا تھا اور پھر وہ خود بھی ذرا اکیلے میں خاموش بیٹھنا چاہتا تھا۔ عورتیں بیٹھی اگلے کمرے میں باتیں کر رہی تھیں اور دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ کھلا تھا۔ اس میں پردہ لٹکا ہوا تھا اور ژواگو دونوں عورتیں کی باتیں صاف سن سکتا تھا۔

یوری اسٹیشن سے تھک کر گھر واپس لوٹا تھا۔ وہ صوفے پر لیٹا ہوا سیما کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ''یہ باتیں اس نے ماموں کولیا کی کتاب سے لی ہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''پھر بھی یہ لڑکی کتنی ذہین اور کتنی قابل ہے۔'' وہ اٹھ کر کھڑکی کی طرف چلا جو دوسرے کمرے کی طرح مکان کے احاطہ کی طرف کھلتی تھی۔ اب تاریکی پھیلنے لگی اور برفباری شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کی گھنٹی بجائی۔ لارا پردے کے پیچھے سے نکل کر بڑے کمرہ سے گذرتی ہوئی دروازہ کھولنے کے لئے گئی اور یوری نے اسے سیما کی بہن گلافیرا سے باتیں کرتے ہوئے سنا۔

''تم اپنی بہن کی تلاش میں آئی ہو؟ ہاں وہ یہاں موجود ہے۔''

''نہیں میں اس کے لئے نہیں آئی۔ میں تمہارے دوست کے لئے خط لے کر آئی ہوں۔ یہ خط ماسکو سے آیا ہے اور وہاں سے چلے اس خط کو پورے پانچ مہینے ہو گئے۔ یہ خط بہت طویل اور کئی صفحات پر پھیلا ہوا تھا جو خستہ حال لفافے میں بری طرح چرمر ہو گئے تھے۔ یہ خط جوڈاک خانہ میں کھولا بھی جا چکا تھا اس کی بیوی تونیا نے بھیجا تھا۔ جب اس نے خط پڑھنا شروع کیا تو اس وقت تک اسے یوریاتن میں اپنی موجودگی کا احساس تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ لارا کے مکان میں ہے لیکن جوں جوں وہ خط پڑھتا گیا اس کا یہ احساس بھی ختم ہوتا چلا گیا۔

تونیا نے لکھا تھا: ''یورا۔۔۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہماری ایک بیٹی بھی ہے۔ ہم نے تمہاری والدہ کی یاد میں اس کا نام ماشا رکھا ہے۔ اب ایک اور بات ہے۔۔۔ کئی سرکردہ آدمی جن میں کیڈٹ پارٹی اور دائیں بازو کی سوشلسٹ پارٹی کے لوگ شامل ہیں اور کئی دوسرے جن میں تمہارے ماموں کولیا میرے والد اور ہم سب شامل ہیں روس سے ملک بدر کئے جا رہے ہیں۔ بڑی بدقسمتی کی بات ہے

یہ خاص طور پر تمہاری عدم موجودگی میں۔ لیکن ہمیں ہر حال پر صابر و شاکر رہنا چاہیے۔ اور خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس سخت ترین دور میں ہماری جلاوطنی بہت ہلکی اور نرم معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم یہاں ہوتے تو تم بھی ہمارے ساتھ چلتے۔ لیکن تم ہو کہاں؟ میں یہ خط انتی پووا کے پتہ پر بھیج رہی ہوں۔ اگر تم اسے مل گئے تو وہ یہ خط ضرور تم تک پہنچا دے گی۔

''خدا نے چاہا تو ایک نہ ایک دن تمہارا بھی کچھ پتہ چل ہی جائے گا۔ میں نے ابھی تک یہ خیال کرنا نہیں چھوڑا کہ تم زندہ ہو اور تمہارا کھوج ضرور مل جائے گا۔ شاید تم اپنے لئے الگ ویزا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ اور ہم سب ایک بار پھر ایک جگہ مل بیٹھیں گے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ہمیں واقعی اتنی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں گی۔ میری اصل مصیبت یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ اپنے آپ پر ناقدانہ نظر ڈالتی ہوں۔ لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ آخر میں نے کیا قصور کیا تھا جس کی یہ سزا مجھے ملی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم نے میرے بارے میں غلط رائے قائم کی ہے۔ تم میرے بارے میں غیر ہمدردانہ رویہ رکھتے ہو۔ تم مجھ پر ایسی نظر ڈالتے ہو جیسے کوئی آدمی اس آئینے میں جھانکے جس میں خدوخال اور بگڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

''جہاں تک میرا تعلق ہے۔ تو میرے پیارے! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ ہم یہاں سے غالباً پیرس جا رہے ہیں۔ اب میں اس دور دیس جا رہی ہوں جہاں کبھی تم نے اپنے بچپن کے دن گذارے تھے۔ جہاں تمہارے والد اور میرے چچا پروان چڑھے تھے۔ والد تمہیں یاد کرتے ہیں۔ ساشا خاصا بڑا ہو گیا ہے۔ زیادہ خوبصورت تو نہیں لیکن بہت قد آور اور طاقتور لڑکا ہے۔ جب بھی ہم تمہارا ذکر کرتے ہیں، بری طرح رونے لگتا ہے اور کسی بات سے نہیں بہلتا۔ بس اب ضبط کا یارا نہیں۔ رونا ہے کہ چلا آتا ہے۔ میں اسے نہیں روک سکتی۔ میں اب اور نہیں لکھ سکتی۔ اچھا خدا حافظ! ذرا میں تمہیں اپنے تصور میں لا کر تم پر صلیب کا نشان بنا دوں۔ تمہارے لئے دعائیں مانگ لوں۔ یہ مفارقت نہ جانے کتنی طویل ہو گی۔

''میری جان تمہاری راہ بہت کٹھن اور تاریک ہے، جاؤ تمہیں خدا کو سونپا۔ میں تمہیں کسی بات پر دوش نہیں دیتی۔ میں تمہیں برا نہیں کہتی۔ اپنی زندگی سنوارنے کے لئے جو چاہو کرو۔ اگر تم خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں'' تیری خوشی میں خوش ہوں میں مجھ کو ملال کچھ نہیں۔''

''ہاں جب ہم یورال سے روانہ ہوئے۔۔۔ تو میری لارا سے اچھی خاصی واقفیت ہو گئی تھی۔ وہ میرے ایام زچگی میں ہر وقت میرے پاس رہی۔ اس نے جس طرح آڑے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے، اس کے لئے میں اس کی بے حد شکر گزار ہوں۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ اچھی عورت ہے، مگر میں فریب سے کام نہیں لوں گی۔ یوں سمجھو کہ وہ مجھ سے بالکل برعکس ہے۔ میں اپنی پیدائش سے لے کر اب تک زندگی کو سادہ اور پرسکون بنانے اور مسائل کو ہوشمندی سے سلجھانے کی قائل رہی ہوں، لیکن لارا زندگی کو الجھانے اور پیچیدگیاں پیدا کرنے کی عادی ہے۔ اوہ یورا۔ میرے پیارے۔ میری جان یورا۔ میرے عزیز شوہر۔ میرے بچوں کے ابا۔ یہ ہمارا کیا حال ہو رہا ہے؟ کیا تمہیں اس امر کا احساس ہے کہ اب ہم شاید کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکیں گے؟ اوہ یورا۔ میرے یورا۔۔۔''

یوری آندرے وچ ژواگو نے کھوئی کھوئی، بے نم، صدمہ سے خشک اور غم واندوہ سے پامال، نظریں خط سے ہٹا کر اوپر کی طرف خلا میں دیکھا۔ اسے اپنے گرد کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے کسی چیز کا احساس نہیں تھا۔ باہر برفباری ہو رہی تھی۔ تیز و تند ہوائیں برف کو اڑا رہی تھیں۔ برف تیز سے تیز تر اور پہلے سے زیادہ دبیز ہوتی جا رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کے گلے سے کراہنے کی آواز نکلی اور اس نے صدمہ سے نڈھال ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ تھام لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ غش کھانے والا ہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چند قدم چل کر صوفے تک پہنچا اور غش کھا کر گر پڑا۔

گوشہ تنہائی

موسم سرما شباب پر تھا۔ جس وقت یوری آندرے وچ ہسپتال سے واپس روانہ ہوا تو برف تیزی سے گر رہی تھی۔ لارا اسے ہال میں ملی۔ ''کوماردوسکی یہیں ہے'' اس نے دھیمی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا وہ اس طرح گھبرائے ہوئے عالم میں کھڑی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی جیسے وہ مبہوت ہو گئی ہو۔

''کہاں؟ یہاں؟''

''نہیں، یہاں نہیں۔ وہ آج صبح آیا تھا اور اس نے کہا ہے کہ آج رات پھر آئے گا۔''

''وہ کیوں آیا ہے؟''

''اس نے جو کچھ کہا تھا وہ میں نہیں سمجھ سکی۔ اس نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ہماری جانیں خطرے میں ہیں۔ ہم تینوں کی۔ تمہاری، پاشا کی اور میری۔ اور یہ کہ صرف وہی ہمیں بچا سکتا ہے بشرطیکہ ہم اس کے کہنے پر عمل کریں۔''

''میں باہر جا رہا ہوں۔ میں اس سے ملنا نہیں چاہتا۔''

لارا رونے لگی اور اس نے اپنے آپ کو اس کے قدموں میں گرا دینے کی کوشش کی اور اس کے گھٹنے پکڑ لئے لیکن اس نے اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ ''مہربانی کر کے مت جاؤ، میری خاطر۔'' اس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا۔''

''تمہیں کیا ہو گیا ہے جان من! میرے پیر مت پکڑو۔ اب کھڑی ہو جاؤ اور مسکرا دو۔ تم جانتی ہو کہ میں تمہارے پاس ہوں۔ اگر ضرورت پڑی تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔ صرف تمہارے اشارے کی دیر ہے۔''

کوئی آدھ گھنٹہ بعد رات ہو گئی۔ اب مکمل تاریکی تھی۔ کومار دوسکی کا انتظار کرتے ہوئے لارا نے راشن کی سیاہ روٹی کے توس کاٹے اور کچھ ابلے ہوئے آلوؤں کی ایک پلیٹ میز پر رکھ دی۔ انہوں نے اس سے پرانے کھانے کے کمرے میں ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا تھا جہاں وہ اب بھی کھانا کھایا کرتے تھے۔ کومار دوسکی دسمبر کی تاریک رات میں برف میں لت پت پیدل چل کر آیا۔ برف کے گالے اس کے ہیٹ، کوٹ اور ربڑ کے بڑے بڑے جوتوں پر سے گر رہے تھے اور فرش پر گر کر پگھل جاتے تھے۔ اس کی داڑھی اور مونچھوں پر بھی برف جمی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس کی شکل مسخروں جیسی بن گئی تھی۔ اس نے ایک اچھا سا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا پتلون دھاریدار اور استری شدہ تھا۔ اپنے میزبانوں سے سلام دعا کرنے سے پہلے اس نے دیر تک اپنے چمکدار بالوں میں کنگھا کیا اور اپنی مونچھیں اور بھنویں ایک رومال سے خشک کیں۔ پھر خاموشی کے ساتھ پروقار طریقہ پر اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ بایاں ہاتھ لارا کی طرف اور دایاں یوری آندرے وچ کی طرف۔

''میرا خیال ہے ہم پرانے ملاقاتی ہیں۔'' اس نے یوری آندرے وچ سے کہا۔ ''تمہارے والد سے میری کافی دوستی تھی، انہوں نے میرے بازوؤں میں جان دی تھی۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ تم میں ان کی مشابہت ہے۔ تم یقیناً اپنی ماں سے زیادہ ملتے ہو۔ وہ ایک شریف خاتون تھیں جو اپنے خیالات میں گم رہا کرتی تھیں۔''

''لاریسا فیودوروونا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تم سے مل لوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں، تو پھر کیا ہم معاملہ کی بات کریں؟ تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟''

''میرے پیارو، تم سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ میری اس جرات کو معاف کرنا، لیکن تم دونوں ایک دوسرے کے لئے موزوں ہو، ایک بہترین جوڑا۔''

''مجھے قطع کلام کرنا پڑے گا۔ مہربانی کر کے تم ان معاملوں میں دخل مت دو جن کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''نوجوان، اتنے زیادہ حساس مت بنو۔ بدقسمتی سے تم لوگ ابھی تک بچے ہو۔۔۔ ایسے بچے جو ہر چیز سے ناواقف ہوں اور کچھ نہ سوچ سکتے ہوں۔ بغیر جانے بوجھے تم لوگ ایک خطرناک غار کے اوپر چٹان کے کنارے چل رہے ہو یوری آندرے وچ! کمیونسٹوں کا ایک خاص اسٹائل ہے۔ بہت کم لوگ اس پر پورے اترتے ہیں۔ لیکن کوئی شخص اس طریقہ حیات کی اس طرح تحقیر نہیں کرتا جس طرح کھلم کھلا طریقہ پر تم کرتے ہو! میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم خطرات سے کیوں کھیلتے ہو۔ تم اس سارے نظام کا تمسخر اڑاتے ہو اور اس کی توہین کرتے ہو۔ اگر تمہارا ماضی تمہارے لئے راز ہو تو ہو۔۔۔ لیکن ماسکو کے بہت سے لوگ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ مقامی کمیونسٹ حکام تم دونوں کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ کامریڈ انتی پوف اور تیورزن اپنے پنجے تیز کر رہے ہیں اور کسی وقت بھی تم پر اور لاریسا فیودوروونا پر جھپٹ سکتے ہیں۔ لیکن، یوری آندرے وچ تم ایک مرد ہو۔ تم اپنی مرضی کے مالک ہو لیکن لاریسا فیودوروونا اپنی مرضی کی مالک نہیں ہے؛ وہ ایک ماں ہے، اس کے ہاتھوں میں ایک بچے کی زندگی ہے اور وہ اس طرح خوابوں کی دنیا میں نہیں رہ سکتی۔ اسے اپنی بیٹی کی زندگی سے کھیلنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسے میری اس دلیل کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔''

یوری نے اس کے جواب میں کہا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو اپنے خیالات ماننے پر مجبور نہیں کیا۔ لاریسا فیودوروونا کو اس بات کی پوری آزادی ہے کہ اگر وہ چاہے تو تمہارے کہنے پر عمل کر سکتی ہے۔''

''واقعی، لیکن یہ کافی پیچیدہ معاملہ ہے۔ تباہی تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے، یوری آندرے وچ۔ تمہارا نام فہرست میں موجود ہے۔ میں یہ بات تمہیں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ بتا رہا ہوں۔ میں نے وہ فہرست خود دیکھی ہے۔ انقلاب سے قبل ایک زمانہ میں، میں بینکوں اور تجارتی اداروں کے معاملات کی ولاڈی واسٹک میں دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ وہاں لوگ مجھ سے واقف ہیں اور اب میں وہاں جا رہا ہوں۔

''میں تمہیں اور لاریسا فیودوروونا کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ وہاں سے تم آسانی سے جہاز میں بیٹھ کر سمندر پار اپنے گھر والوں کے پاس جا سکتے ہو۔ یہ بات تو تمہیں یقیناً معلوم ہو گی کہ انہیں ملک بدر کر دیا گیا ہے۔ اس معاملہ کی کافی شہرت ہوئی تھی اور سارے ماسکو میں ابھی تک اس کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ میں نے لاریسا

فیودرو وناسے وعدہ کرلیا ہے کہ میں اسٹریلینکوف کو بچالوں گا۔ اگر وہ بچ نکلنے میں کامیاب نہ ہوا تو پھر میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ اس کا تبادلہ کسی ایسے شخص سے کرلیا جائے جو اتحادیوں کے قبضہ میں ہو، اور جسے ماسکو کی حکومت اہم سمجھتی ہو۔"

لاریسا فیودرو ونا کومارد وسکی کی باتیں مشکل ہی سے سمجھ سکی تھی لیکن جب اس نے ڈاکٹر اور اسٹریلینکوف کے بچاؤ کے انتظامات کا ذکر کیا تو اس نے اپنے کان کھڑے کر لئے۔ کسی قدر شرماتے ہوئے اس نے کہا: "تم دیکھتے ہو، یوروچکا، یہ سب تمہارے اور پاشا کے لئے کس قدر اہم ہے۔"

"پیاری تم بہت جلد ہر کسی پر اعتبار کر لیتی ہو۔"

اس نے کومارد وسکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس تمام دلچسپی کے لئے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں جو تم میرے معاملات میں لے رہے ہو۔ لیکن واقعی تم یہ تو نہیں سمجھ رہے ہو کہ میں تمہیں اپنے معاملات چلانے کی اجازت دے دوں گا؟ اور جہاں تک اسٹریلینکوف کا تعلق ہے، لارا کو اس کے متعلق سوچنا پڑے گا۔"

"ان تمام باتوں کا مطلب یہ نکلتا ہے۔" لارا نے کہا "آیا ہم اس کے ساتھ جائیں گے یا نہیں۔ یہ بات تو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہارے بغیر ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

کومارد وسکی نے وہ پانی میں ملی ہوئی شراب پی جو یوری آندرے وچ ہسپتال سے لایا تھا، ابلے ہوئے آلو کھائے اور زیادہ بہکنے لگا۔

رات زیادہ ہوتی جارہی تھی۔ ہر مرتبہ جب بتی ٹھیک کی جاتی تو وہ بھڑک کر تیزی سے جلنے لگتی جس سے کمرہ روشن ہو جاتا تھا۔ پھر لو دھیمی پڑ جاتی تھی اور سائے دکھائی دینے لگتے تھے۔ میزبانوں کو نیند آ رہی تھی، وہ آپس میں کچھ باتیں کرنا اور پھر سو جانا چاہتے تھے، لیکن کومارد وسکی رکا رہا۔ اس کی موجودگی اس قدر پریشان کن ہوتی جارہی تھی جتنی وحشت ناک کھڑکیوں کے باہر دسمبر کی رات کی تاریکی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی بہکی ہوئی زبان سے برابر بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔ اس کی تمام طویل گفتگو اکتاہٹ کا باعث بن گئی تھی۔

اس کی لفاظی کا اثر لاریسا فیودرو ونا کے اعصاب پر ہونے لگا۔ آخر کار اکتاہٹ کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بہت زیادہ تھک گئی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف اٹھا کر انتہائی تلخ لہجہ میں کہا۔ "اب رات زیادہ ہو گئی ہے اور تمہارے جانے کا وقت ہو چکا ہے۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"مجھے امید ہے تم اس قدر بد اخلاقی سے کام نہیں لوگی کہ مجھے اتنی رات گئے اپنے مکان سے نکال دو! میں شہر سے واقف نہیں ہوں اور تاریکی بھی بہت زیادہ ہے۔"

"تمہیں یہ بات پہلے ہی سے سوچنی چاہیے تھی اور تم سے کسی نے بھی اتنی دیر تک ٹھہرنے کو نہیں کہا تھا۔"

"تم مجھ سے اتنی ناراض کیوں ہو؟ تم نے تو مجھ سے یہ تک نہیں پوچھا کہ میرے ٹھہرنے کا کوئی انتظام کہیں ہوا بھی ہے یا نہیں؟"

"مجھے اس سے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر تم اس کوشش میں ہو کہ تمہیں رات یہاں گزارنے کی دعوت دی جائے تو میں تمہیں یقیناً اس کمرے میں نہیں ٹھہراؤں گی جہاں ہم لوگ اور کاتنکا سوتے ہیں اور دوسرے کمروں میں چوہے بہت ہیں۔"

"میں چوہوں سے نہیں ڈرتا۔"

"اچھا، ٹھیک ہے، تو جیسا تم چاہو کرو۔"

☆☆☆

"کیا بات ہے پیاری؟ تم راتوں کو بالکل نہیں سوتی ہو۔ کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگاتی اور پاگلوں کی سی شکل بنائے پھرتی ہو۔ تم ہر وقت کچھ سوچتی رہتی ہو۔ تمہیں کیا پریشانی ہے؟ تمہیں اپنی پریشانیوں پر قابو پانے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

"وہ تمہارے ہسپتال کا چوکیدار۔۔۔عزت۔۔۔پھر آیا تھا۔ وہ نیچے والی دھوبن سے عشق لڑا رہا ہے۔ یہاں بھی چلا آیا اور مجھے ایک اچھی سی خبر سنائی! یہ بہت راز کی بات ہے، اس نے کہا تمہارے دوست کو جیل ہونے والی ہے۔ کسی روز بھی۔ اور پھر تمہاری باری ہے۔"

"وہ بالکل ٹھیک کہتا ہے۔" یوری آندرے وچ نے کہا۔ "خطرہ بالکل قریب آ گیا ہے اب ہمیں فوراً غائب ہو جانا چاہیے۔ تم جانتی ہو، میری جان، ہم وہی کریں گے جیسا کہ پہلے تم نے سوچا تھا۔ ہم لوگ واری کینو جا کر غائب ہو جائیں گے۔ چلو، ایک دو ہفتہ یا مہینہ بھر کے لئے وہیں چلیں۔"

"شکریہ، پیارے، بہت بہت شکریہ، اوہ، میں کتنی خوش ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم اسے ناپسند کرتے ہو۔ لیکن ہم لوگ تمہارے مکان میں نہیں رہیں گے۔ میں اس مکان کے متعلق سوچ رہی تھی جہاں میکولیتسن اور اس کے گھر والے رہتے تھے۔"

"ہاں یہ بالکل صحیح ہے لیکن ایک منٹ ٹھہرو۔ کومارد وسکی کا کیا ہوا؟"

"مجھے بھی کچھ معلوم نہیں۔ ہمیں اس کی کیا پرواہ ہے؟"

"میں اب یہ سوچتا ہوں کہ ہمیں اس کی تجویز فوراً مسترد نہیں

کر دینی چاہیے تھی۔ میرا مطلب ہم دونوں سے ہے۔ ہم دونوں کی پوزیشن یکساں نہیں ہے۔ تمہیں اپنی لڑکی کے بارے میں سوچنا ہے، لیکن جہاں تک واری کینو کا سوال ہے، یہ بات یقینی ہے کہ جاڑوں میں بغیر کھانے پینے کے سامان، طاقت، یا امید کے اس سنسان مقام پر چلا جانا واقعی حماقت ہو گا۔ لیکن کیوں نہیں جان من! اگر ہمارے لئے پاگل پن کے سوا کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا ہے تو ہم ایک بار پاگل ہی کیوں نہ ہو جائیں۔''

''چلو، ہم دونوں کچھ عرصہ تنہا رہیں۔ جان من! چلو چلیں اور ہم ایک ہفتہ میں اس سے زیادہ لکڑیاں کاٹ کر استعمال کریں گے جتنی کہ ایک سمجھدار گھریلو عورت پرامن زمانہ میں ایک مہینہ میں کر سکتی ہے۔ آؤ ہم ان مختصر ایام کو زندگی سے رخصت ہونے کے لئے استعمال کریں۔ اور جدا ہونے سے پہلے آخری مرتبہ اپنا تمام وقت ایک دوسرے کے ساتھ گذاریں۔ ہم ہر اس چیز کو الوداع کہہ دیں گے جو ہمیں عزیز ہے۔ ہم پھر ایک مرتبہ آپس میں وہی رازدارانہ سرگوشیاں کریں گے جو ہم راتوں کو کرتے ہیں۔ عظیم اور وسیع باتیں۔ بحرالکاہل کے مانند وسیع و بے پایاں۔ تم بلاوجہ ہی تو میری زندگی کے آخری دور میں میرے پاس نہیں آ گئی ہو، میری حسین حور، ایسے وقت جبکہ آسمان پر جنگ اور مصیبتوں کے بادل چھائے ہوئے ہیں، تم پھر میرے پاس آ گئی ہو، جو بچپن کے پرامن زمانہ میں میری زندگی کے ابتدائی دور میں داخل ہوئی تھیں۔ اس رات کو جب تم ایک نوخیز لڑکی تھیں اور اپنا اسکول کا خاکی یونیفارم پہنے ہوئے تھیں۔ ہوٹل کے نیم روشن کمرے میں تم بالکل ایسی ہی معلوم ہو رہی تھی جیسی کہ اب ہو، کتنی حسین اور دلکش۔ اس کے بعد سے اب تک میں برابر اس سحر انگیز کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں جو اس رات تمہیں دیکھنے کے بعد مجھ پر طاری ہوئی تھی، جو بعد میں میرے تمام وجود پر چھا گئی اور جو میرے لئے دنیا کی ہر چیز کو سمجھنے کا ذریعہ بن گئی۔ میں جو ایک لڑکا تھا میں سمجھ گیا کہ یہ سوکھی اور دبلی چھوٹی سی لڑکی اپنے اندر برقی کشش رکھتی ہے اور اس میں نسوانی حسن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اگر میں نے تمہیں اپنی انگلی کے ایک پور سے بھی چھو لیا ہوتا تو کمرے میں ایک ایسا شعلہ بھڑکتا جس سے یا تو میں وہیں ختم ہو جاتا یا پھر عمر بھر میرے اندر رنج اور خواہش کی مقناطیسی لہریں دوڑتی رہتیں۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور میرا دل رونے لگا۔ میرا تمام وجود حیرت زدہ تھا اور پوچھ رہا تھا۔ ''اگر محبت کرنا اور اس برقی رو کو برداشت کرنا اتنا ہی تکلیف دہ ہے تو پھر ایک عورت ہونا ایک برقی رو ہونا اور محبت کے جذبات ابھارنا اس سے بھی کس قدر زیادہ تکلیف دہ ہو گا۔''

لاریسا فیودورونا باقاعدہ لباس پہنے ہوئے اپنے پلنگ کے سرے پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور اس نے سکڑ کر اپنے آپ کو ایک شال سے ڈھانک رکھا تھا۔ یوری آندرے وچ اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بستر پر سے جھک کر اپنے بازو اس کے گرد حمائل کر دیئے اور پرمسرت لہجہ میں بول اٹھی: ''یوروچکا! یوروچکا! تم کتنے عقلمند ہو! تم ہر بات جانتے ہو، یوروچکا تم میری طاقت اور میرا سہارا ہو۔ خدا میرا یہ کفر معاف کرے۔ میرے پیارے، چلو چلیں، وہاں پہنچ کر میں تمہیں ایک بات بتاؤں گی جو میرے ذہن پر بوجھ بنی ہوئی ہے۔''

وہ سمجھ گیا کہ وہ یقیناً اپنے حمل کے متعلق کہہ رہی ہے، جو غالباً جھوٹا حمل ہے اور اس نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں۔''

وہ دونوں موسم سرما کی ایک تاریک صبح کو شہر سے روانہ ہو گئے۔ اس دن چھٹی کا دن نہیں تھا۔ لوگ اپنے دھندوں کے سلسلے میں سڑکوں پر چل پھر رہے تھے، ان میں سے بہتوں کے چہرے جانے پہچانے تھے۔ پوری رفتار سے گھوڑا بھگاتے ہوئے وہ لوگ سمدیویاتوف کے پاس پہنچ گئے جو سڑک پر پیدل جا رہا تھا اور اس کے قریب سے تیزی کے ساتھ گزر گئے۔ کچھ اور آگے چل کر وہ کومار دوسکی کے قریب سے گذرے اور اسے سلام کئے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے۔

جس وقت یہ لوگ واری کینو پہنچے تو دن ختم نہیں ہوا تھا اور کیونکہ پہلے ژواگو کا مکان پڑا اس لئے وہ اس کے سامنے رک گئے۔ وہ لوگ چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے، انہیں جلدی اس لئے تھی کہ پھر جلد ہی اندھیرا ہونے والا تھا۔ واری کینو بالکل اجاڑ تھا اور وہاں لوگ اس تباہی کو مکمل کرنے کے لئے موجود نہیں رہ گئے تھے۔

''ہمیں جلدی کرنی چاہیے۔ ابھی ایک منٹ میں اندھیرا ہو جائے گا۔ گھوڑے کو کھلیان میں بھیج دینا چاہیے۔ کھانے کا سامان کوٹھری میں رکھ دینا چاہیے۔ پہلا کام تو انگیٹھی سلگانا ہے۔ ہمیں اس کو چوبیس گھنٹہ جلانا پڑے گا، لیکن میرے پیارے، کیا بات ہے؟ تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔''

''ایک منٹ میں۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔ نہیں، غالباً ہمیں میکولیتسن کا مکان دیکھنا ہو گا۔ وہ زیادہ بہتر رہے گا۔'' اور وہ لوگ گاڑی میں بیٹھ کر چل دیئے۔

میکولیتسن کے مکان کے دروازے کو تالا لگا کر کیل ٹھونک دی گئی تھی۔ یوری آندرے وچ نے تالا معہ قبضوں اور لکڑی کے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اور یہاں بھی وہ لوگ تیزی سے اندر داخل ہوئے اور سیدھے اندر کے کمروں میں گئے۔ انہوں نے اپنے کوٹ،

ٹوپیاں اور فلیٹ کے جوتے بھی نہیں اتارے۔ انہوں نے یہ بات فوراً محسوس کر لی کہ اندر کا کچھ حصہ بہت صاف ستھرا تھا، خاص طور پر میکولیٹسن کے مطالعہ کا کمرہ۔

پہلے کی طرح پھر ایک مرتبہ یوری آندرے وچ تحیّر زدہ کیفیت میں مطالعہ کے کمرے کے دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔ یہ کمرہ بہت بڑا اور آرام دہ تھا۔ اور کھڑکی کے پاس ایک بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی اور پھر ایک مرتبہ اس نے سوچا کہ ایسا پرسکون ماحول اطمینان سے لکھنے پڑھنے کا کام کرنے کے لئے بہت اچھا رہے گا۔

اس نے گھوڑے کی زین اتاری اور جب وہ ستا لیا تو اسے پینے کے لئے پانی دیا جو اسے کنویں سے مل گیا تھا۔ خوش قسمتی سے کھلیان کے اندر بھی کافی گھاس موجود تھی۔ یہ لوگ کپڑے تبدیل کئے بغیر ہی لیٹ گئے۔ انہوں نے اپنے سموری کوٹ کمبلوں کی بجائے اوپر ڈال لئے اور بچوں کی مانند فوراً ہی سو گئے جو دن بھر کھیلنے کے بعد تھک کر سو جاتے ہیں۔

لارا نے کھانے پینے کا وہ سامان استعمال کرنا شروع کر دیا تھا جو وہ لوگ اپنے ساتھ لائے تھے۔ رات کے کھانے پر اس نے آلوؤں کا شوربہ، بھنا ہوا گوشت اور آلو تیار کئے تھے۔ کاتنکا نے اتنا زیادہ کھایا کہ اس کے پیٹ میں گنجائش باقی نہیں رہی۔ وہ کھلکھلائے جا رہی تھی۔ آخر میں جب اس کا پیٹ بھر گیا اور اسے گرمی پہنچی تو وہ صوفے کے اوپر اپنی ماں کی شال میں سکڑ کر لیٹ گئی اور فوراً سو گئی۔ لاریسا فیودرونا اپنا کھانا پکانے کی کامیابی پر بھی خوش تھی۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ کاتنکا سو چکی ہے، اس نے میز پر آگے کو جھک کر اپنی ٹھوڑی اپنے ہاتھ پر ٹکا دی اور کہنے لگے: ''میں تمہاری لونڈی بن کر بھی خوش ہوں گی اگر صرف مجھے اتنا معلوم ہو جائے کہ اس کا کوئی نتیجہ نکلے گا اور یہ سب کچھ بیکار نہیں ہو گا۔ تمہیں بار بار مجھے یہ یاد دلانا ہو گا کہ ہم لوگ یہاں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے لئے آئے ہیں۔ اگر تم دیانت داری کے ساتھ اس پر غور کرو تو سوچو گے کہ ہم لوگ کیا کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ کیا ہے؟ ہم کسی دوسرے کے مکان میں گھس آئے ہیں اور یہاں آ کر اس طرح رہنے لگے ہیں جیسے یہ ہمارا اپنا مکان ہو اور ہم اب چاروں طرف پاگلوں کی طرح پھر رہے ہیں تا کہ ہم یہ نہ محسوس کر سکیں کہ یہ اصل زندگی نہیں ہے۔''

''لیکن پیاری، کیا خود تم نے ہمارے آنے پر اصرار نہیں کیا تھا؟''

''یقیناً میں نے ایسا کیا تھا۔ میں اس سے انکار نہیں کرتی۔ تو اب غلطی میری ہے! تم اندر آئے، تم نے اپنے لڑکے کا پالنا دیکھا اور تم پر بیہوشی طاری ہونے لگی۔ تمہیں یہ حق حاصل ہے، لیکن مجھے یہ بھی حق حاصل نہیں ہے کہ کسی بات کی فکر کروں۔ کاتنکا کا خیال کروں۔''

''لارا ہوش میں آؤ۔ سوچو ابھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ تم اپنا فیصلہ تبدیل کر سکتی ہو۔ ہمارے پاس گھوڑا موجود ہے اگر تم چاہو تو ہم لوگ کل ہی سیدھے یوریاتن جا سکتے ہیں۔ کومارووسکی ابھی تک وہیں ہے۔''

''میں نے تو ایک لفظ بھی نہیں کہا اور تم ناراض دکھائی دے رہے ہو۔ ذرا سوچو تو! ہم لوگ ایک وسیع اور ہموار میدان میں تنہا ٹھہرے ہوئے ہیں! اگر رات کو برفباری میں ہم لوگ مکان کے اندر دب جائیں تو صبح کو اپنے آپ باہر بھی نہیں نکل سکیں گے!''

''لیکن تم کیا چاہتی ہو؟ تم اب مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

''میں خود نہیں جانتی کہ کیا کہوں۔ مجھے ہر وقت اپنے اثر میں رکھو۔ مجھے بار بار یاد دلاتے رہو کہ میں تمہاری محبت کرنے والی لونڈی ہوں۔ تمہاری تونیا اور میرا پاشا ہم دونوں سے ہزار گنا بہتر ہیں، لیکن اصل بات یہ نہیں ہے اصل بات تو یہ ہے کہ محبت کا تحفہ بھی دوسرے تحفوں کی طرح ہے۔ وہ خواہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو لیکن وہ دعاؤں کے بغیر پرورش نہیں پا سکتا۔ جہاں تک میرا اور تمہارا تعلق ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہمیں جنت میں پیار کرنا سکھایا گیا ہو اور پھر یہ دیکھنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ زمین پر بھیج دیا گیا ہو کہ ہمیں جو کچھ سکھایا گیا تھا وہ ہمیں یاد بھی ہے یا نہیں۔ یہ ایک ایسی ہم آہنگی ہے جس کی کوئی حدود نہیں ہیں۔''

اس نے اپنی باہیں ژواگو کے گلے میں ڈال دیں اور آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی: ''کیا تم دیکھ سکتے ہو کہ میری وہی حیثیت نہیں ہے۔ تمہیں پر دیئے گئے تھے تا کہ بادلوں کے اوپر پرواز کر سکو، لیکن میں ایک عورت ہوں، مجھے یہ پر اس لئے دیئے گئے ہیں تا کہ میں زمین پر بھی رہوں اور اپنے بچوں کی حفاظت کروں۔''

لارا کے الفاظ سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوا لیکن اس نے یہ چیز ظاہر نہیں ہونے دی کہ کہیں وہ جذبات کی رو میں بہک نہ جائے۔

دن ختم ہوتے ہوئے ان دونوں نے گرم پانی سے خوب اچھی طرح غسل کیا اور لارا نے کاتنکا کو نہلایا۔ یوری آندرے وچ اپنے آپ کو نہایت صاف اور پاکیزہ محسوس کر رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے سامنے میز کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی پشت کمرے کی طرف تھی جہاں لارا کاتنکا کو بستر پر لٹا رہی تھی۔ اس کے جسم سے صابن کی مہک آ رہی تھی۔

اس وقت رات کا ایک بجا تھا جب کہ لارا، جو پہلے بناوٹی نیند

ظاہر کر رہی تھی، واقعی سوگئی۔ اس کا اور کاتزکا کا شب خوابی کا لباس بستر کی سفید اور شفاف چادروں کی مانند صاف اور چمکدار دکھائی دے رہا تھا۔ ان دنوں میں بھی لارا کسی نہ کسی طرح کلف کا بندوبست کر ہی لیتی تھی۔ لیمپ کی زرد اور مدھم روشنی کاغذ کے سفید ورقوں پر پڑ رہی تھی اور دوات کے اندر روشنائی کی سطح اس روشنی میں چمک رہی تھی۔ باہر موسم سرما کی رات ہلکی نیلی دکھائی دے رہی تھی۔ برفانی رات کا حسن ناقابل بیان تھا۔ اس کا دل مکمل سکون محسوس کر رہا تھا وہ اندر کے گرم اور روشن کمرے میں واپس چلا گیا اور لکھنا شروع کر دیا۔ دو تین بند لکھنے اور خیال آرائیاں کرنے کے بعد جن سے وہ خود بھی متاثر تھا، اس پر خیالات کا غلبہ ہونے لگا اور آمد ہونے لگی۔

وہ اب اپنے آپ کو مسرور، توانا اور پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اچانک باہر کے کھلے ہوئے میدان کا سکوت جو کھڑکی سے دور تک پھیلا ہوا تھا ایک دردانگیز آواز سے ٹوٹ گیا۔ وہ قریب کے تاریک کمرہ میں گیا تا کہ کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھ سکے۔ اس وقت کھڑکی کے شیشوں پر برف جم گئی تھی۔ اس نے قالین کا وہ بنڈل کھینچ کر ہٹایا جو دروازے کے پاس برفانی ہواؤں کو روکنے کے لئے لگا دیا گیا تھا، اپنا کوٹ کندھوں پر ڈالا اور باہر چلا گیا۔ سفید برف پر چاند کی تیز روشنی سے اس کی آنکھوں میں چکاچوند ہونے لگی اور پہلے تو اسے کچھ بھی نظر نہیں آ سکا۔ پھر طویل اور تند غراہٹ ایک مرتبہ سنائی دی جو فاصلہ کی وجہ سے مدھم پڑ گئی تھی اور اس نے چار طویل سائے دیکھے جو میدان کے دوسرے سرے پر محض پنسل کے خفیف نشانات کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چاند کی طرف یا کھڑکی پر اس کی روپہلی کرنوں کو دیکھ کر غرا رہے تھے۔ لیکن ابھی یوری آندرے وچ کو مشکل ہی سے اس کا احساس ہوا تھا کہ وہ بھیڑیئے ہیں کہ وہ واپس مڑ کر کتوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"بس اب تو انتہا ہو گئی۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا۔" اس نے سوچا۔ "کیا ان بھیڑیوں کے بھٹ قریب ہی ہیں؟ کس قدر خوفناک! اور سمدیویاتوف کا گھوڑا کھلیان میں بندھا ہوا ہے۔" اس نے طے کر لیا کہ وہ فی الحال لارا کو یہ نہیں بتائے گا ورنہ وہ کہیں پریشان نہ ہو جائے۔ واپس آ کر اس نے سرد کمروں اور مکان کے گرم حصوں کے درمیان کے تمام دروازے بند کر دیئے اور اپنی میز پر واپس چلا گیا۔ لیمپ کی روشنی پہلے کی طرح تیز تھی اور اسے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

لارا جاگ گئی: "میری روشن شمع! کیا ابھی تک جل رہی ہو؟" اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی ہلکی آواز میں کہا۔ "یہاں آ کر ایک منٹ کے لئے میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں اپنا خواب سناؤں گی۔"

یوری آندرے وچ نے روشنی گل کر دی۔

☆☆☆

ایک اور دن خواب کی طرح گذر گیا۔ انہیں مکان میں بچوں کی ایک گاڑی مل گئی۔ کاتزکا خوشی سے گلنار ہو رہی تھی۔ اس نے لارا کے بھی بہت سے کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ کوئی کام کرتے ہوئے ان کے ہاتھ ایک دوسرے سے مل جاتے تھے اور پھر وہ دونوں وہ چیزیں رکھ دیتے تھے جو وہ اٹھائے ہوئے ہوتے اور ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیٹھ جاتے۔ یوری آندرے وچ بے چینی سے رات کا منتظر تھا تا کہ وہ اپنے لکھنے پڑھنے کا کام پھر شروع کر سکے جس میں رکاوٹ پڑ گئی تھی۔

وہ بھیڑیئے جن کا خیال اسے دن بھر آتا رہا تھا، اب چاند کی روشنی میں میدان میں کھڑے ہوئے بھیڑیئے نہیں رہے تھے، وہ ایک تصور بن گئے تھے، ایک موضوع۔ وہ ایک ایسی تباہ کن طاقت کی علامت بن کر ظاہر ہوئے تھے جو اسے اور لارا کو تباہ کر دینے اور واری کینو سے بھگا دینے پر آمادہ معلوم ہوتی تھی۔ آخر رات آ گئی اور ڈاکٹر نے میز پر رکھا ہوا لیمپ پھر جلا دیا۔ لارا اور کاتزکا پچھلی رات کے مقابلہ میں آج جلد ہی سو گئیں۔ اس نے نہایت تیزی کے ساتھ لکھنا شروع کر دیا یہاں تک کہ وہ اپنے ذہن میں آنے والے الفاظ کے دھارے کا ساتھ بھی نہیں دے سکا۔

اس نے لارا کو بستر سے اٹھ کر میز کے نزدیک آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے لمبے شب خوابی کے لباس میں وہ بہت دبلی اور اپنے اصل قد سے لمبی دکھائی دے رہی تھی۔ جب وہ اس کے قریب آئی تو اس نے بہت حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ وہ زرد اور خوفزدہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر سرگوشی کے لہجہ میں کہا: "کیا تم سن رہے ہو؟ باہر کتا بھونک رہا ہے۔ میرے خیال میں شاید دو ہوں۔ ہم لوگ چلے جائیں گے! اب میں ہرگز یہاں نہیں ٹھہروں گی۔"

ایک گھنٹہ بعد، کافی سمجھانے بجھانے پر وہ پرسکون ہو گئی اور سو گئی۔ یوری آندرے وچ باہر گیا۔ بھیڑیئے پچھلی رات کے مقابلہ میں اب زیادہ نزدیک آ گئے تھے۔ اس مرتبہ وہ اور بھی زیادہ تیزی سے غائب ہو گئے۔

واری کینو میں ان کے قیام کا تیرہواں دن تھا۔ آج کوئی نئی یا خاص بات نہیں تھی۔ بھیڑیئے چند روز غائب رہنے کے بعد پچھلی

رات کو پھر شور مچاتے رہے۔ لارا نے واپسی کے سفر کے لئے سامان باندھنا شروع کیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں ان کے قیام کا تیرہواں دن آیا ہی نہ ہو۔ لارا بہت زیادہ پریشان اور فکر مند تھی۔ وہ اپنے ہاتھ برابر مسل رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بیٹھ جائے۔ وہ خود ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور لڑکھڑاتی آواز میں رک رک کر کہنے لگی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟ میں جانے کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ جیسے کوئی مجھ سے کہہ رہا ہو کہ میں نہ جاؤں۔ کچھ بولتے کیوں نہیں؟''

''اپنی حالت ٹھیک کرو۔ پریشان مت ہو۔ اس طرح اچانک اور بغیر کسی تیاری کے چل دینا ٹھیک نہیں۔ رونا بھی ٹھیک نہیں۔ میں ابھی ایک منٹ میں انگیٹھی سلگائے دیتا ہوں لیکن ایسا کرنے سے پہلے میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ میں گاڑی لے کر جاؤں اور اپنے لکڑی کے گودام میں سے بچی ہوئی لکڑیاں لے آؤں۔ لکڑیاں بالکل ختم ہو چکی ہیں۔ اب روؤ مت میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔''

ژواگو کے مکان میں لکڑی کے گودام تک گاڑی کے کئی راستے تھے۔ گودام کے آگے برف کی اونچی سی تہہ جمی ہوئی تھی اور اس کے اوپر ہی نیا چاند نظر آ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی ڈاکٹر کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ وہ رات گئے اپنی زندگی کے تاریک جنگل میں کھڑا ہو۔ اس کی روح کی تاریکی اور مایوسی اتنی ہی بڑھ چکی تھی۔ اس نے سائبان میں سے تھوڑے تھوڑے سے لکڑی کے گٹھے اٹھا اٹھا کر گاڑی میں ڈالے۔ گھوڑا اپنا سر میکولیتسن کے مکان کی طرف موڑ کر ہنہنایا۔ پہلے آہستہ آہستہ اور پھر زور زور سے۔

''یہ کیوں ہنہنا رہا ہے؟'' یوری آندرے وچ نے سوچا۔ ''خوف کی وجہ سے تو نہیں ہو سکتا۔ وہ یقیناً گھر جانے کے انتظار میں ہوگا۔ اچھا، ایک منٹ ٹھہرو۔ ہم ابھی چلتے ہیں۔''

جس وقت وہ مکان کی طرف جا رہا تھا تو وہ ایک طرح کی بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ پورچ کے سامنے کسانوں کی ایک بڑی سی گاڑی کھڑی تھی جس میں ایک مشکی گھوڑا جتا ہوا تھا اور ایک موٹا تازہ اجنبی شخص گھوڑے کے پاس ٹہل رہا تھا۔ مکان کے اندر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے کومارووسکی کی آواز پہچان لی جو لارا اور کاتزکا سے باتیں کر رہا تھا۔ لارا کی آواز سن کر یہ اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ پریشان ہو اور رو رہی ہو۔ یوری آندرے وچ اندر چلا گیا۔ کومارووسکی نے سمور کا ایک لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ یوری آندرے وچ کے اندر داخل ہوتے ہی لارا اور کومارووسکی اس کی طرف لپکے اور وہ دونوں ایک ساتھ بولنے لگے۔

''تم اتنی دیر کہاں رہے ہو؟ ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے!''

''تم کہاں چلے گئے تھے؟'' لارا نے پھر پوچھا۔ ''اچھا سنو یہ کیا کہہ رہے ہیں اور فوراً ہم دونوں کی طرف سے فیصلہ کرو۔''

☆☆☆

''اسٹریلینکوف پکڑ لیا گیا، اسے موت کی سزا سنا کر گولی مار دی گئی۔''

''کس قدر خوفناک؟ کیا تمہیں واقعی یقین ہے؟''

''مجھے یہی بتایا گیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ صحیح ہے۔''

''لارا کو مت بتانا۔ وہ پریشان ہو جائے گی۔''

''نہیں، میں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ اسی لئے تو میں نے تم سے علیحدہ بات چیت کرنے کو کہا تھا۔ اب جبکہ یہ واقعہ پیش آ چکا ہے اور اس کی لڑکی کو فوری خطرہ درپیش ہے، انہیں بچانے میں تمہیں میری مدد کرنی چاہیے۔ کیا تم واقعی ہم لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤ گے؟''

''قطعی نہیں۔ میں پہلے ہی تم سے کہہ چکا ہوں۔''

''لیکن وہ تمہارے بغیر نہیں جائے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ تمہیں دوسرے طریقہ سے میری مدد کرنی ہوگی۔ تمہیں تصنع سے کام لینا ہوگا۔ اس پر یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ جیسے تم اپنا ارادہ بدلنے کو تیار ہو، ایسا ظاہر کرنا ہوگا جیسے تم زیادہ اصرار کرنے پر چلنے کے لئے تیار ہو گئے ہو۔ تمہیں اس کو یہ یقین دلانا ہوگا کہ تم چلو گے ضرور، ابھی نہیں تو بعد میں، جب مجھے جانے کا انتظام کرنے کے لئے دوسرا موقع مل جائے گا۔ میں تم سے اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہاری طرف سے پہلا اشارہ ملتے ہی میں تمہیں یہاں سے مشرق میں بلوا لوں گا اور وہاں سے تم جس جگہ بھی جانا چاہو گے تمہیں بھجوانے کا انتظام کروں گا۔''

''اسٹریلینکوف کے متعلق خبر سن کر میرے اعصاب پر اتنا زیادہ اثر پڑا ہے کہ میں اپنے حواس مجتمع نہیں کر سکتا۔ حالات کے پیش نظر لاریسا فیودروونا کاتزکا کی زندگیاں بھی خطرے میں ہیں۔ وہ یا میں یقینی طور پر گرفتار کر لئے جائیں گے اور اس طرح ہماری جدائی بہر حال یقینی ہے۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ تم ہی ہم لوگوں کو جدا کر دو اور انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اچھا تو پھر اس کی خاطر، اب میں باہر جا کر اس سے کہتا ہوں کہ میں گاڑی تیار کروں گا اور تم لوگوں کو راستہ میں پکڑ لوں گا، لیکن حقیقت میں میں پیچھے ہی رہ جاؤں گا۔ ہاں، ایک بات ضرور ہے۔ تم اب کس طرح جا سکتے ہو جبکہ جلد ہی اندھیرا ہو جائے گا۔ سڑک جنگل میں سے ہو کر گذرتی ہے اور اس میں بھیڑیے ہیں۔ ان کا خیال رکھنا۔''

''میں جانتا ہوں۔ فکر مت کرو۔ میرے پاس ایک بندوق اور

ریوالور ہے۔ ہاں میں تھوڑی سی شراب بھی ساتھ لایا ہوں تا کہ سردی سے بچا جا سکے۔ کیا تم تھوڑی سی لو گے؟ میرے پاس بہت کافی شراب ہے۔"

☆☆☆

"میں نے کیا کر دیا؟ میں نے کیا کر دیا؟ میں نے اسے چھوڑ دیا، اپنے سے علیحدہ کر دیا، مجھے ان لوگوں کے پیچھے بھاگنا چاہیے لارا! لارا! وہ میری آواز نہیں سن سکتے۔ ہوا مخالف ہے اور وہ لوگ غالباً ایک دوسرے سے چلا چلا کر باتیں کر رہے ہیں۔ اسے خوش ہونا بھی چاہیے، اسے اس بات کا شبہ تک نہیں ہے کہ میں نے اسے دھوکا دیا ہے۔"

وہ برآمدے میں کھڑا تھا۔ اس کا کوٹ اس کے ایک کندھے پر پڑا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ لکڑی کا نازک ستون تھامے ہوئے تھا۔ اس کی تمام توجہ دور فاصلہ پر ایک نقطہ پر مرکوز تھی۔

"الوداع۔ الوداع۔" اس نے ایک لمحہ کے انتظار میں کئی بار کہا۔ "الوداع میری محبوبہ۔ میری ہمیشہ کے لئے جدا ہونے والی محبوبہ۔"

اب اندھیرا ہوتا جا رہا تھا۔ دھوپ کی سرخی برف پر پھیل کر بالکل ختم ہو گئی۔ غروب آفتاب کی تاریکی سارے میدان میں چھا گئی۔ سڑک کے کنارے درختوں پر ایک تاریک کہر سا چھا گیا اور آسمان پر شفق کی سرخی پھیل گئی۔ صدمہ کی وجہ سے یوری آندرے وچ کی حس تیز ہو گئی اور اس کا ادراک بڑھ گیا تھا۔ سرما کی شام میں زندگی اور ہمدردی کے آثار پائے جاتے تھے جیسے اس نے بھی ایک دوست کی طرح یہ تمام منظر دیکھا ہو۔

وہ ابھی تک برآمدے ہی میں کھڑا تھا اور اب بند دروازے کی طرف مڑا جیسے اس نے دنیا سے منہ موڑ لیا ہو۔ "میرا روشن سورج غروب ہو گیا۔" وہ دل ہی دل میں بار بار کہتا رہا۔

"اب میں ماسکو چلا جاؤں گا۔" اس نے سوچا "پہلا کام تو یہ ہے کہ زندہ رہا جائے۔ مجھے زبردستی سونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے بجائے مجھے رات بھر کام کرنا چاہیے۔"

وہ اندر گیا، جاتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر دیا، اور پھر اپنا کوٹ اتارا۔ جب وہ خوابگاہ میں گیا جسے لارا نے اسی روز صبح کو اتنے سلیقہ کے ساتھ صاف اور آراستہ کیا تھا اور وہ ایک چھوٹے سے بچے کی طرح دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اپنا سینہ مسہری کی پٹی پر ٹکا دیا، منہ بستر کی چادروں میں چھپا لیا اور بچوں کی طرح زور زور سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆

یوری آندرے وچ کو نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ اس کا ذہن آہستہ آہستہ ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اس کی یہ حالت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مکان پر توجہ دینی چھوڑ دی، اسے خود اپنی کوئی پروا نہیں رہی۔ اس نے رات کو بھی دن میں تبدیل کر دیا اور لارا کے جانے کے بعد اسے اس وقت کا احساس ہی بالکل نہیں رہا تھا۔ ووڈ کا پی کر وہ لارا کے متعلق لکھنے لگا۔

لارا کی یاد میں نوحہ لکھنے کے ساتھ ہی ساتھ وہ ان یادداشتوں کو بھی مکمل کر رہا تھا جو اس نے گذشتہ برسوں میں فطرت، انسان اور دوسری چیزوں کے بارے میں اکٹھی کی تھیں، جیسا کہ لکھتے وقت ہمیشہ اس کے ساتھ ہوا کرتا تھا، اس وقت بھی ایک فرد کی زندگی اور سوسائٹی کے متعلق متعدد خیالات اس کے ذہن میں مجتمع ہو گئے۔

لارا کی یاد میں آنسو بہاتے ہوئے اس نے اس موسم گرما کی یاد میں بھی، آنسو بہائے جو اس نے میلوزیود میں گزارا تھا جبکہ انقلاب کو ایک آسمانی اوتار سمجھا گیا تھا جو آسمان سے زمین پر نازل ہوا تھا۔

جس وقت وہ منطقی طریقہ پر یہ یادداشتیں سپرد قلم کر رہا تھا اس نے ایک یادداشت میں اپنے اس عقیدہ کا بھی اظہار کر دیا کہ آرٹ ہمیشہ حسن کی خدمت کرتا ہے اور حسن وجودی اعتبار سے ایک مسرت ہے اور وجود فطری کلید زندگی ہے۔

سمدیویا توف اس سے ملنے کے لئے آیا۔ وہ اس کے لئے ووڈ کا لایا اور اسے بتایا کہ انتی پووا اور اس کی لڑکی کوماردوسکی کے ساتھ کس طرح گئی تھیں۔ اس نے کہا کہ وہ اپنا گھوڑا اپنے ساتھ واپس لے جا رہا ہے۔ اس نے اسی ہفتہ کے اندر پھر آنے کا وعدہ کر لیا اور کہا کہ وہ اسے خودواری کینو سے ہمیشہ کے لئے لے جائے گا۔

کبھی کبھی اپنے کام میں غرق ہو جانے کے بعد یوری آندرے وچ کو اچانک لارا یاد آ جاتی۔ اس طرح جیسے وہ اس کے سامنے موجود ہو اور وہ اس کی جدائی پر رنج اور محبت کے جذبات کی شدت سے نڈھال ہو جاتا۔

ہفتہ کے آخر میں رات کو وہ ایک مضحکہ خیز قسم کا خواب دیکھ کر جاگ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ گھاٹی میں ایک روشنی چمکی اور اس نے رائفل چلنے کی آواز سنی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس قدر غیر معمولی واقعہ پیش آنے کے چند ہی لمحہ بعد وہ پھر سو گیا۔

یہ وہ واقعہ ہے جو ایک یا دو روز بعد پیش آیا۔ اس نے باہر برف پر بھاری قدموں کی آوازیں سنیں۔ کوئی شخص مضبوطی اور آہستگی کے ساتھ اطمینان سے چلتا ہوا مکان کی طرف آ رہا تھا۔

یوری آندرے وچ میز کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی پشت

دروازے کی طرف تھی۔ جب وہ اٹھ کر دروازہ کی طرف مڑا تو اجنبی پہلے ہی دروازہ پر موجود تھا جہاں وہ بالکل ساکت کھڑا ہوا تھا۔

''تم کس سے ملنا چاہتے ہو؟'' ڈاکٹر نے یہ رسمی الفاظ کچھ سوچے بغیر قدرتی طور پر کہے اور جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو اس پر اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

اجنبی ایک طاقت ور اور تندرست قسم کا شخص تھا جس کا چہرہ کافی دلکش تھا۔ اس نے سمور کی جیکٹ، پتلون اور بکری کی کھال کے گرم جوتے پہن رکھے تھے اور اس کے کندھے پر ایک رائفل لٹک رہی تھی۔

''وہ کون ہے؟ وہ کون ہے؟'' ڈاکٹر نے اپنے دماغ پر زور دیا۔ ''میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ رازولی کے اسٹیشن پر، کومیلر کا گاڑی کا ڈبہ۔ واضح اور خشک نظریات، خیالات کی ایک ہی رو، سختی اور دیانت داری۔۔۔اسٹریلینکوف!''

☆☆☆

وہ دونوں گھنٹوں سے باتیں کر رہے تھے اسی طرح جیسے روسی باشندے روس میں باتیں کیا کرتے ہیں۔ خاص طور پر جس طرح اس زمانہ میں کیا کرتے تھے جبکہ خوف اور پریشانی کے ان دنوں میں وہ بالکل مایوس اور گھبرائے ہوئے تھے۔ رات آ رہی تھی اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔

''میں اس سے اور اپنی بچی سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ مجھے یہ پیغام کہ وہ دونوں یہاں تھیں بہت دیر سے ملا۔ اسی لئے میں ان سے نہیں مل سکا۔ جب اس سے تمہارے قریبی تعلقات کی اطلاعات اور افواہیں مجھ تک پہنچیں اور مجھے ڈاکٹر ژواگو کا نام بتایا گیا تو کسی ناقابل بیان وجہ سے ان ہزاروں شکلوں میں سے جو میں گذشتہ برسوں میں دیکھ چکا ہوں مجھے اس نام کا ایک ڈاکٹر یاد آ گیا جسے ایک مرتبہ پوچھ گچھ کے لئے میرے پاس لایا گیا تھا۔''

''اور کیا تمہیں افسوس ہوا کہ تم نے مجھے گولی کیوں نہیں مار دی تھی؟''

اسٹریلینکوف نے یہ سوال ٹال دیا۔ وہ اپنے خیالات میں گم برابر اسی طرح بولتا رہا: ''قدرتی بات ہے۔ میں بہت جلا۔۔۔ اور اگر سچ پوچھو تو یہ حسد اب بھی موجود ہے۔۔۔ اور تم توقع بھی کیا کر سکتے تھے؟ میں اس ضلع میں صرف چند مہینے قبل آیا تھا جبکہ مشرق بعید میں میری تمام پناہ گاہوں کا پتہ چل گیا تھا۔ ایک غلط الزام لگا کر مجھ پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جانے والا تھا۔ اس کا نتیجہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں تھا۔ میں مجرم نہیں تھا۔ میں نے سوچا ممکن ہے آئندہ کسی بہتر موقع پر مجھے اپنا دفاع کرنے اور باعزت طور پر بری ہونے کی امید ہو سکے لہٰذا میں نے طے کر لیا کہ جب تک بھی چھپ سکتا ہوں چھپا رہوں قبل اس کے کہ یہ لوگ مجھے گرفتار کر لیں۔ اس لئے میں اس وقت چھپتا پھرتا ہوں اور راہبوں کی سی زندگی گزارتا ہوں۔

''وہ لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ سنو۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔ اور میں اسے پسند نہیں کرتا کیونکہ میں عرصہ دراز سے سو نہیں سکا ہوں۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ کتنی اذیت ہوتی ہے۔ اگرچہ میری موم بتیوں میں سے ایک آدھ باقی رہ گئی ہے۔ ٹھیک ہے، اچھی ہے نا۔ خالص چربی کی! تو پھر آؤ کچھ دیر اور باتیں کریں۔ اس وقت تک جب تک کہ برداشت کر سکو۔ ساری رات۔ آرام سے۔ موم بتیوں کی روشنی میں۔''

''موم بتیاں سب کی سب موجود ہیں۔''

''کیا تمہارے پاس روٹی ہے؟''

''نہیں۔''

''تو پھر کیا کھا کر زندہ رہے ہو؟ لیکن یہ بھی کیسا حماقت کا سوال ہے! ظاہر ہے آلو!''

''ہاں۔ آلو بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ تمام آلو گودام میں بحفاظت موجود ہیں۔ نہ تو گلے سڑے ہیں اور نہ جمے ہیں۔''

اچانک گفتگو کا رخ بدل کر اسٹریلینکوف انقلاب کی باتیں کرنے لگا۔

☆☆☆

''تمہارے لیے یہ تمام باتیں بے معنی ہوں گی۔ تم نہیں سمجھ سکو گے۔ تمہاری پرورش مختلف طریقہ پر ہوئی تھی۔ مضافاتی علاقوں، ریلوں، غلیظ اور گندی آبادیوں اور کچے مکانوں کی بھی ایک دنیا تھی۔۔۔ گرد و غبار، بھوک، بھیڑ بھاڑ، انسان کی حیثیت سے مزدور کی تذلیل اور عورتوں کی بے حرمتی کی دنیا! اور دوسری دنیا ماؤں کے لاڈلوں، چاق چوبند طالب علموں اور دولت مند تاجروں کے لڑکوں کی تھی۔ ہر الزام سے بریت، بے شرمی، گستاخی اور گناہ کی دنیا۔ ان دولت مندوں کی دنیا جو غریبوں کے آنسوؤں کا تمسخر اڑاتے تھے اور ان لوگوں کا بھی جنہیں لوٹا جاتا تھا، جن کی بے عزتی کی جاتی تھی اور عصمتیں لوٹی جاتی تھیں۔ لٹیروں اور غاصبوں کی حکومت جن کی وجہ خصوصیت صرف یہ تھی کہ وہ کبھی کسی چیز کی پروا نہیں کرتے تھے، لیکن ہمارے لئے زندگی ایک مہم تھی۔ ان لوگوں کی خاطر جن سے ہم محبت کرتے تھے ہم پہاڑوں تک کو ہلا دیتے تھے اور ہم اگر سوائے رنج کے انہیں اور کچھ نہیں دے سکتے تھے تو اس پر وہ ہمیں مورد الزام نہیں ٹھہراتے تھے کیونکہ آخر میں ہم ان سے بھی زیادہ تکلیفیں اٹھاتے

تھے۔ لیکن اپنی بات جاری رکھنے سے پہلے میں تمہیں ایک بات بتا دینا چاہتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے تمہیں داری کینو چھوڑ دینا ہوگا۔ وہ لوگ مجھے گھیرنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ دوسری چیزوں کے علاوہ یہاں آس پاس لاتعداد بھیڑیئے ہیں۔ اس روز رات کو شتما میں سے ہوکر نکلنے کے لئے مجھے گولی چلانی پڑی تھی۔"

"تو اس روز گولی تم نے چلائی تھی؟"

"ہاں، تم نے تو آواز سنی ہوگی۔ میں صرف رات یہاں گزاروں گا۔ اور صبح کو چلا جاؤں گا۔" اس کے بعد استریلینکوف نے پھر تقریر شروع کردی: "تو دراصل ایسا صرف ماسکو یا روس ہی میں نہیں تھا اور صرف یہیں یہ شاندار قسم کی سڑکیں نہیں تھیں جن پر بھڑکدار لباسوں میں ملبوس عیاش نوجوان گاڑیوں میں اپنی محبوباؤں کے ساتھ تفریح کرتے پھرا کرتے تھے۔ ایسی سڑکیں، سڑکوں کے رات کے ہنگامے، گذشتہ صدی کی شبینہ زندگی اور ریس کے گھوڑے اور تماش بین دنیا کے ہر شہر میں موجود تھے۔ لیکن انیسویں صدی کو کیا خصوصیت حاصل تھی اور ایک تاریخی دور کی حیثیت سے وہ منفرد کیوں ہے؟ سوشلسٹ نظریہ کی پیدائش کے باعث "انقلاب" مورچوں پر جانیں دیتے ہوئے نوجوان۔۔۔ مصنف جو دولت کے زور کو گھٹانے کے لئے اور غریبوں کے انسانی وقار کو بچانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ مارکس کا عقیدہ سامنے آیا۔ اس نے برائیوں کی جڑ کو بے نقاب کر دیا۔ اور ان کا علاج بتایا۔ وہ صدی کی سب سے بڑی طاقت بن گیا۔ اور شاندار سڑکیں وہی سب کچھ تھیں اور خاک دھول اور بہادری، گناہ اور غلیظ اور گندے علاقے اور اعلانات اور مورچے۔"

"تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ بچپن میں کس قدر حسین تھی، اس لڑکی کی خاطر میں نے تعلیم حاصل کی [illegible] بن گیا اور یوریاتن چلا گیا جس سے میں اس وقت واقف نہیں تھا۔ اس کی خاطر میں نے ڈھیروں کتابیں پڑھ ڈالیں اور بہت زیادہ علم حاصل کیا تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی مدد کرسکوں۔ شادی کے تین سال بعد اس لڑکی کو واپس جیتنے کے لئے میں لڑائی پر چلا گیا۔ اور جنگ ختم ہونے پر میں قید سے واپس آیا۔ مجھے مُردوں کی فہرست میں شامل کر دیا گیا تھا۔ اس سے میں نے فائدہ اٹھایا اور ایک نیا فرضی نام اختیار کرکے انقلاب میں شریک ہوگیا تاکہ ان تمام مصیبتوں کی تلافی کرسکوں جو اسے برداشت کرنی پڑی تھیں۔ اس تمام عرصہ میں مجھے ان سے آکر ملنے اور انہیں دیکھنے کی خواہش کو دبانے کے لئے کس قدر صبر سے کام لینا پڑا! لیکن پہلے میں اپنا زندگی کا کام ختم کرلینا چاہتا تھا۔ اوہ، اب انہیں صرف ایک نظر دیکھنے کی میں بڑی سے بڑی قیمت دینے کو تیار ہوں۔! جب وہ گھر میں آتی تھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے در بچہ کھل گیا ہو اور کمرہ ہوا اور روشنی سے معمور ہوگیا ہو۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم اس سے کس قدر محبت کرتے تھے۔ لیکن مجھے معاف کرنا۔ کیا تمہیں اس کا بھی کوئی اندازہ ہے کہ اسے تم سے کتنی محبت تھی؟"

"معاف کرنا۔ تم نے کیا کہا؟"

"میں نے تم سے پوچھا ہے۔ کیا تمہیں اس کا بھی کوئی اندازہ ہے کہ اسے تم سے کتنی محبت تھی۔ دنیا میں ہر شخص سے زیادہ!"

"تم یہ کیوں کہہ رہے ہو؟"

"کیوں کہ اس نے یہ بات خود مجھ سے کہی تھی۔"

"اس نے یہ بات کہی تھی؟ تم سے؟"

"ہاں"

"معاف کرنا، کیا تم وہی الفاظ میرے سامنے دہراؤ گے جو اس نے تم سے کہے تھے؟"

"اس نے کہا تھا کہ تم ان چیزوں کا مظہر ہو جو کہ انسان کو ہونا چاہیے۔ ایک ایسا انسان جس کی برابری کر سکنے والا کوئی دوسرا شخص اسے کبھی نہیں ملا۔ اور یہ کہ اگر وہ اس مکان تک واپس جاسکتی جہاں وہ تمہارے ساتھ رہا کرتی تھی تو وہ دنیا کے دوسرے سرے سے گھٹنوں کے بل گھسٹتی ہوئی وہاں جانے کو تیار تھی۔"

کچھ دیر بعد استریلینکوف یوری آندرے وچ کے پاس آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور انہیں اپنے سینہ سے لگا لیا اور پھر اسی طرح جلد جلد کہنے لگا: "مجھے معاف کردو۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ایسی باتوں کا ذکر کررہا ہوں جنہیں تم عزیز اور مقدس سمجھتے ہو۔ لیکن اگر تم مجھے اجازت دو تو میں تم سے کچھ اور سوالات کروں گا۔ مہربانی کرکے جاؤ مت۔ مجھے اکیلا مت چھوڑو۔ میں خود بھی جلد ہی چلا جاؤں گا۔ میرے تمام اندازے غلط نکلے۔ وہ لوگ کل مجھے گرفتار کرلیں گے۔ تم اس کے قریب ہو اور اسے عزیز بھی ہو۔ شاید تم کبھی نہ کبھی اسے ملو اور۔۔۔ لیکن میں یہ کیا کہہ رہا ہوں! میں پاگل ہوگیا ہوں۔ وہ مجھے گرفتار کرلیں گے اور مجھے اپنے دفاع میں ایک لفظ بھی نہیں کہنے دیں گے۔ وہ بکتے چیختے ہوئے مجھے پکڑنے کو آئیں گے اور مجھے بے دست و پا کردیں گے۔ کیا میں یہ نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ کس طرح ہوا کرتا ہے؟"

☆☆☆

آخر کار، یوری آندرے وچ بہت اطمینان سے سو گیا۔ کئی راتوں کے بعد پہلی مرتبہ وہ لیٹتے ہی فوراً سو گیا۔ استریلینکوف نے بھی رات وہیں گذاری۔ ڈاکٹر نے اسے دوسرے کمرے میں ٹھہرا

دیا۔ وہ دیر سے سو کر اٹھا۔ زیادہ دیر تک سونے سے اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ کون تھا یا کہاں تھا؟

پھر اسے یاد آ گیا۔ ''اسٹریلینکوف یہاں موجود ہے۔ دیر ہو گئی۔ مجھے کپڑے تبدیل کر لینے چاہئیں، وہ اب تک یقیناً اٹھ گیا ہو گا۔ اگر نہیں اٹھا تو میں اسے اٹھا دوں گا، اور تھوڑی سی کافی بناؤں گا اور ہم دونوں ساتھ بیٹھ کر پئیں گے۔''

''پاول پاولووچ!'' اس نے آواز دی۔

کوئی جواب نہیں ملا۔ ''وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ بہت غافل سوتا ہے'' اس نے کسی عجلت کے بغیر کپڑے تبدیل کئے اور دوسرے کمرے میں گیا۔ اسٹریلینکوف کا سموری کوٹ میز پر رکھا ہوا تھا، لیکن اس کا مکان میں کہیں پتہ نہیں تھا۔ اس نے باورچی خانہ کی انگیٹھی سلگائی، ایک بالٹی اٹھائی اور کنویں کی طرف چل دیا۔ دروازے سے چند گز کے فاصلہ پر اسٹریلینکوف راستے میں پڑا ہوا تھا۔ اس کا سر برف میں دبا ہوا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو گولی مار لی تھی۔ اس کی بائیں کنپٹی کے قریب جہاں سے خون بہا تھا برف سرخ ہو گئی تھی۔ ابلتے ہوئے خون کے جو قطرے برف میں مل گئے تھے، وہ سرخ موتیوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے جو برفانی درخت کی بیریوں کی مانند تھے۔

دمِ واپسیں

اب صرف ژواگو کی زندگی کے آخری آٹھ دس سال کے واقعات بتانے رہ گئے ہیں۔ اس عرصہ میں اس نے زیادہ تر مزدوری کی اور ڈاکٹر اور مصنف کی حیثیت سے اس عرصہ میں وہ برابر پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ اس کے لئے زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اسی دور میں اس کا عارضہ قلب جس کی اس نے خود ہی ایک عرصہ قبل تشخیص کی تھی، سنگین صورت اختیار کر چکا تھا۔ ماسکو کے سفر کے دوران اس نے روٹی کھانے کے لئے اپنے تھوڑے بہت قیمتی کپڑے بیچ دیئے تھے اور ان کی بجائے اب وہ پھٹے پرانے اور خستہ کپڑے پہنے ہوئے پھر رہا تھا۔

شہر کے بازاروں، سڑکوں اور اسٹیشن پر سرخ فوج کے جو ہزاروں سپاہی پھر رہے تھے ان میں ژواگو اپنے اس لباس کی خصوصیت کی بنا پر سب سے الگ اور فوراً پہچانا جا سکتا تھا۔

یوری نے اپنے سفر کا آخری حصہ ٹرین میں طے کیا مگر اس سے پہلے اس نے زیادہ تر مسافت پیدل ہی طے کی تھی۔ راستے میں جو دیہات پڑے وہ یورال اور سائبیریا کے دیہات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ آدھے گاؤں بالکل خالی پڑے تھے۔ دشمن کے حملہ کے بعد لوگ ہرے بھرے کھیت چھوڑ کر فصلیں کاٹے بغیر وہاں سے جان بچا کر بھاگ گئے تھے۔ یہ تھا اثر جنگ کا۔۔۔ خانہ جنگی کا۔

لوگ جن کھیتوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے وہاں اناج ہر طرف پھیلا ہوا پڑا تھا۔ یوری کو جب کھانے کے لئے کچھ اور نہ ملتا تو وہ اس میں سے مٹھی بھر اناج اٹھا لیتا اور اگر ابالنے کا کوئی انتظام نہ ہوتا تو وہ اس کچے اناج کو ہی منہ میں ٹھونس لیتا اور دانتوں سے چکی کا کام لے کر اپنا پیٹ بھر لیتا۔ اس سے پہلے چوہوں کی وبا کبھی اتنے وسیع پیمانہ پر نہیں پھیلی تھی۔ چوہوں کی پیداوار ناقابل یقین حد تک پہنچ گئی تھی۔ جب کبھی اندھیری رات میں یوری کو مجبوراً کہیں کھلے میں ہی سونا پڑتا تو یہ چوہے یوری کے چہرے پر پھرتے۔ اس کی جیبوں اس کی پتلون غرضیکہ پورے جسم پر گھومتے پھرتے۔ دن کے وقت چوہے آزادانہ سڑک پر دوڑ کے مقابلے کرتے اور ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کے پاؤں تلے آ کر کچلے جاتے۔

ان دنوں گھنے جنگل اور کھیت ایک دوسرے کا بالکل الٹ بنے ہوئے تھے۔ کھیت اجاڑ پڑے تھے جیسے انسان کی غیر موجودگی ان کے لئے بد دعا ثابت ہوئی ہو۔ اس کے برعکس جنگل انسان سے نجات حاصل کر کے خوب پھل پھول رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں انسانی چنگل سے آزادی مل گئی ہو۔

☆☆☆

اپنے سفر کے اس مرحلہ پر یوری ایک اجاڑ اور جلے ہوئے گاؤں میں پہنچا۔ دریا کے سامنے سڑک کی جانب تمام مکانات ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف جلے ہوئے مکانوں کا سیاہ ڈھانچہ کھڑا تھا مگر یہ بھی خالی تھے۔ مکانوں کی قطار کے آخری گھر کے سامنے تین بڑے پتھر رکھے تھے۔ دوسروں کی طرح یہ مکان بھی خالی پڑا تھا۔ یوری اندر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ عام دیہات کی طرح یہاں بھی چوہوں کا زور تھا جنہوں نے یوری کے پہنچتے ہی ہر طرف بھاگنا شروع کر دیا اور اچھا خاصا اودھم مچا دیا۔ وہ باہر آ گیا۔ یوری سڑک پار کر کے چکی کے ایک پاٹ پر بیٹھ گیا جو وہاں گھاس پر رکھا ہوا تھا۔ اچانک ندی کے کنارے کی طرف سے ایک کھردرے بالوں والا سر ابھرتا ہوا دکھائی دیا۔ یوری کو دیکھتے ہی وہ رک گیا۔

''کیا تم پانی پیو گے۔ اور ہاں اگر تم نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی تو میں بھی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

''شکریہ۔ ہاں پانی پیوں گا میں۔ لیکن ذرا ادھر تو آؤ۔ ڈرو نہیں۔ میں تمہیں کیوں کچھ کہنے لگا؟''

پانی لانے والا ایک نوعمر لڑکا تھا۔ بیس سال سے بھی کم عمر کا۔

ننگے سر۔ بال بکھرے ہوئے اور کپڑے پھٹے ہوئے۔ وہ یوری کو ٹکٹکی باندھ کر شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا رہا۔

''معاف کرنا کامریڈ۔ کیا تم وہ ڈاکٹر نہیں ہو؟''

''اور تم کون ہو؟''

''ارے۔ کیا تم مجھ سے واقف نہیں ہو؟''

''نہیں۔''

''ماسکو سے آتے ہوئے ہم ایک ہی گاڑی میں تھے۔ ایک ہی ڈبہ میں۔ مجھے زبردستی مزدوری کے لئے بھرتی کرلیا گیا تھا۔ یاد ہے نا؟''

یہ لڑکا واسیا بریکین تھا۔ وہ یوری کے سامنے زمین پر لیٹ گیا، اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ڈاکٹر اور واسیا 1922ء کے موسم بہار میں ماسکو پہنچے جبکہ روسی انقلاب کا بدترین اور انتہائی غیر یقینی دور شروع ہوا تھا۔ موسم بہت اچھا اور خاصا گرم تھا۔ سورج کی شعاعیں ''نجات دہندہ کے چرچ'' کے سنہری گنبد سے ٹکراتی ہوئی نیچے چوک پر بکھری ہوئی تھیں جہاں راستہ چلنے کی پٹریوں پر پتھروں کے درمیان دراڑوں میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ نجی کاروبار سے پابندی اٹھالی گئی تھی اور بعض تنگ حدود میں اس کی بھی اجازت تھی۔ اس بے حیثیت مارکیٹ میں چیتھڑوں اور ہڈیوں کے سوداگر اپنی ہمت وحیثیت کے مطابق معمولی معمولی سودے کیا کرتے تھے۔ اور ان لوگوں کی کم مائگی اور بے بضاعتی کے باعث اس کاروبار میں بھی سٹہ اور دوسری برائیاں شروع ہوگئیں۔

ماسکو پہنچ کر یوری نے واسیا سے کہا۔ ''تمہیں یہاں کچھ نہ کچھ کام ضرور کرنا پڑے گا۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تعلیم حاصل کروں۔''

یوری آندرے وچ نے اپنے دوستوں کی مدد سے واسیا کو استروگانوف انسٹی ٹیوٹ میں داخل کرادیا جہاں اس نے پہلے تو عام مضامین کا کورس لیا اور پھر چھپائی، جلد اور کتابوں کے ڈیزائن تیار کرنے کی تربیت حاصل کی۔ اب ڈاکٹر اور واسیا مل کر کام کرنے لگے۔ ڈاکٹر مختلف موضوعات پر پمفلٹ اور کتابچے لکھتا اور واسیا انہیں ترتیب دے کر انسٹی ٹیوٹ میں اپنی ٹریننگ کے طور پر ان کے چھوٹے چھوٹے ایڈیشن چھاپ دیتا۔

ایک عرصہ تک واسیا اور اس کے تعلقات دوستانہ تھے اور ایک ہی جگہ رہے۔ اس عرصہ میں وہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان سے دوسرے خستہ حال مکان میں اپنی سکونت منتقل کرتے رہے۔ ان میں سے ہر جگہ کسی نہ کسی وجہ سے بیحد تکلیف دہ اور ناقابل رہائش ثابت ہوئی۔ ماسکو پہنچتے ہی ژدا گو اپنا قدیمی مکان دیکھنے گیا۔ اسے بتایا گیا کہ اس کا خاندان ماسکو واپس آ کر اس مکان میں نہیں ٹھہرا۔ ان کی جلاوطنی کے بعد وہ کمرے جو ان کے نام سے رجسٹرڈ تھے، نئے کرایہ داروں کو دے دیئے گئے لیکن ژدا گو کے خاندان کا سامان کہیں دکھائی نہیں دیا۔ یوری آندرے وچ کا ایک پرانا ہمسایہ خود اس کو دیکھ کر کنی کترا گیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ژدا گو کا واقف ہونا بھی خطرہ مول لینے سے کم نہیں ہے۔

مارکل بھی اس مکان میں نہیں تھا۔ وہ اس نئے دور میں ترقی کر گیا تھا اور فلور ٹاؤن کا منیجر بنا ہوا تھا۔

☆☆☆

موسم سرما کے ایک ابر آلود اتوار کے دن ہر مکان کی چھت سے دھواں اور کھڑکیوں سے سیاہ بھاپ نکل رہی تھی اور یہ اس سرکاری حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ تھا کہ چولہوں کا دھواں پائپ کے ذریعہ کھڑکیوں کے راستے نہ نکالا جائے۔ شہری زندگی کی سہولتیں اور آسائشیں ابھی تک بحال نہیں ہوئی تھیں۔ فلور ٹاؤن کے مکانوں میں رہنے والے کرایہ دار نہائے دھوئے بغیر دن گذار رہے تھے۔ کوئی پھوڑے پھنسیوں میں مبتلا رہتا کوئی سردی اور نزلہ و زکام میں۔ ہر اتوار کے معمولات کے مطابق مارکل اور اس کے تمام اہل خانہ آج گھر پر موجود تھے اور اس وقت بڑی ڈنر ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

کمرہ میں داخل ہوتے ہی ایک طرف پانی کا نل دیوار میں لگا ہوا تھا اور اس میں باقاعدگی کے ساتھ پانی آتا تھا۔ مارکل کا یہ کمرہ بہت گرم رہتا تھا۔ یوری آندرے وچ دو بالٹیاں اٹھائے وہاں آیا اور آتے ہی کہنے لگا۔ ''بھوک خوب لگتی ہے۔''

''تکلف مت کرو۔ آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔''

''بہت بہت شکریہ۔ میں کھانا کھا چکا۔''

جب یوری تیسری یا چوتھی مرتبہ پانی کی بالٹی بھرنے آیا تو بات کا انداز بدل چکا تھا: ''میرے داماد بارہا مجھ سے پوچھ چکے ہیں کہ تم کون ہو۔ میں نے انہیں بتادیا لیکن انہیں، اب تک یقین نہیں آیا۔ ارے تم پانی بھرتے رہو۔ میری باتوں کی پرواہ مت کرو۔ بس ذرا دھیان رہے کہ پانی فرش پر نہ گرے۔''

جب یوری آندرے کوئی پانچویں یا چھٹی مرتبہ اندر آیا تو مارکل نے غصہ میں آ کر کہا: ''بس ایک اور۔ اس کے بعد ختم کرو یہ سلسلہ۔ عقلمند آدمی۔ ہر بات کی حد ہوا کرتی ہے۔ اگر ہماری بیٹی میرینا تمہارا خیال نہ کرتی تو میں کبھی کا دروازہ مقفل کر چکا ہوتا۔''

''میرینا سنٹرل پوسٹ آفس میں ٹیلیگراف سٹ ہے۔ غیر ملکی زبانیں جانتی ہے تمہارے بارے میں کہتی ہے۔'' یہ بہت بدقسمت

انسان ہے۔''
اس پر پھر سارے گھر والے ہنس پڑے۔ صرف میرینا نہیں ہنسی۔ وہ غصے میں بپھری ہوئی اپنے سارے گھر والوں پر بری طرح برس پڑی۔ یوری اس کی آواز سن کر متحیر سا ہو گیا، گو وہ یہ پتہ نہیں چلا سکا کہ آخر اس کی آواز میں ایسی بات کیا تھی جس سے وہ اتنا متاثر ہوا تھا۔
میرینا کو ذرا سی تربیت دے کر بہترین مغنیہ بنایا جا سکتا تھا۔ اس کی آواز بہت دلکش، بلند اور کھنک دار تھی۔
اتوار کے دنوں میں یہ پانی بھرنے کا ہی سلسلہ تھا جس کے باعث یوری اور میرینا کے درمیان دوستی کی ابتدا ہوئی۔ وہ اکثر آتی اور اس کے گھریلو سامان میں اس کا ہاتھ بٹاتی اور پھر ایک دن تو وہ اسی کے ہاں رہ گئی، پلٹ کر اپنے گھر نہیں گئی۔ اس طرح وہ یوری کی تیسری بیوی بن گئی، حالانکہ اس نے پہلی بیوی سے طلاق نہیں لی تھی اور اپنی شادی کا بھی اندراج نہیں کرایا۔ ان کے بچے پیدا ہوئے، مارکل اور اگاتھا اپنی بیٹی کا فخریہ ذکر کرتے کہ وہ ایک ڈاکٹر کی بیوی ہے۔ اس کے باپ کو یہ مستقل شکایت تھی کہ چرچ یا شادی کے دفتر میں کہیں بھی انہوں نے باقاعدہ شادی کی رسم ادا نہیں کی تھی، لیکن اس کی بیوی اگاتھا کہتی۔ ''تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا؟ تونیا ابھی زندہ ہے۔ اس کی زندگی میں یوری کی دوسری شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ جرم ہوگا۔''
یوری بعض اوقات مذاق میں کہتا کہ ان کا یہ رومان پانی کی صرف 20 بالٹیوں میں چلا ہے بالکل اسی طرح جس طرح ناول بیس باب کا ہو۔ یوری گھر میں جو گند پھیلاتا اور جس طرح گھر کے سامان کو منتشر کرتا اس پر اس کی بیوی میرینا اسے معاف کر دیتی۔
یوری اور میرینا اب سپرینی دونو کا اسٹریٹ پر رہتے تھے اور قریب ہی برونی اسٹریٹ پر گورڈن کا مکان تھا۔ یوری اور میرینا کی دو بیٹیاں تھیں، کاپکا اور کلازکا۔ پہلی کی عمر چھ سال اور دوسری کی چھ ماہ تھی۔
1929ء کے موسم گرما کا ابتدائی حصہ بے حد گرم تھا۔ ایک دوسرے کے قریب چند گلیوں کے فاصلہ پر رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے ملنے ٹوپی پہنے بغیر اور محض آستینوں والی قمیص میں چلے جاتے۔ گورڈن کے کمرہ کی ساخت بھی عجیب و غریب تھی کیونکہ کسی زمانہ میں وہاں ایک فیشن ایبل درزی رہتا تھا۔ اس وقت اس کمرہ میں گورڈن کے ساتھ ژواگو، دوروف، میرینا اور اس کے بچے موجود تھے جو بڑوں کے برعکس شیشے میں سے پورے کے پورے دکھائی دے رہے تھے۔ جلد ہی میرینا اپنی ننھی بیٹیوں کو لے کر وہاں سے چلی گئی اور اب تینوں مرد وہاں رہ گئے۔ وہ تینوں موسم گرما میں بڑے اطمینان سے بالکل اس انداز سے باتیں کر رہے تھے جیسے وہ لوگ کر سکتے ہیں جو برسوں سے قریبی دوست ہوں۔
گورڈن اور دوروف دونوں بڑے مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں سے تعلقات رکھتے تھے۔ ان کا وقت اچھی کتابیں پڑھنے میں اور اچھے مفکروں اور شاعروں سے بات چیت میں اور اچھے گانے سننے میں گذرتا تھا۔
دوروف حال ہی میں اپنی پہلی جلاوطنی کاٹ کر واپس آیا تھا۔ اس کے شہری حقوق بحال ہو گئے تھے اور اسے یونیورسٹی میں دوبارہ اپنا کام باقاعدہ شروع کرنے کی اجازت مل گئی تھی اب وہ دوستوں کو اپنے ایام جلاوطنی کی داستان سنا رہا تھا۔
''مجھے جانا چاہیے۔'' یوری آندرے وچ نے کہا۔ ''میشا مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ یہاں بہت گرمی ہے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے تازہ ہوا چاہیے۔''
''ایک منٹ ٹھہرو۔ تم محض بہانے تلاش کر رہے ہو۔ ہم تمہیں اس وقت تک نہیں جانے دیں گے جب تک تم ہمیں دیانت داری کے ساتھ صاف جواب نہیں دے دو گے۔ کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہو یا نہیں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنے طریقے بدل دو اور اپنی اصلاح کر لو؟ تم اس بارے میں کیا کرو گے؟ اول تو تمہیں تونیا اور میرینا کے بارے میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنی چاہیے، یہ لوگ بھی انسان ہیں۔''
''اچھا ٹھیک ہے۔ میں تمہیں اپنا جواب دے دوں گا۔''
اگلی صبح میرینا بھاگتی ہوئی گورڈن کے پاس آئی۔ وہ بہت پریشان تھی۔
''میشا۔ کیا یورا یہاں ہے؟'' اس نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔
''کیا وہ رات گھر نہیں پہنچا؟''
''نہیں۔'' میرینا نے کلازکا کو صوفہ پر بٹھا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
دو روز تک گورڈن اور دوروف میرینا کو تنہا چھوڑنے کی ہمت نہیں کر سکے اور دونوں باری باری اس کی دیکھ بھال اور ڈاکٹر کی تلاش کرتے رہے۔ وہ ایسی جگہوں پر گئے جہاں اس کے جانے کا امکان ہو سکتا تھا۔
تیسرے روز ان تینوں گورڈن، دوروف اور میرینا کے نام مختلف اوقات میں یوری آندرے وچ کے خطوط آئے۔ اس نے اس بات پر بہت معذرت کی تھی کہ اس کی وجہ سے ان لوگوں کو فکر اور

پریشانی ہوئی اوران سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کے بارے میں فکرمند نہ ہوں۔

اس نے گورڈن کولکھا تھا کہ وہ اسے میرینا کے لئے منی آرڈر سے روپیہ بھیج رہا ہے اوراس سے کہا تھا کہ وہ بچوں کے لئے ایک نرس رکھ دے تا کہ میرینادوبارہ کام پر جا سکے۔

رقم جلد ہی وصول ہوگئی اور وہ یوری اوراس کے دوستوں کے معیار سے بہت زیادہ تھی۔ نرس ملازم رکھ لی گئی اور میرینا دوبارہ ڈاکخانہ میں کام پر جانے لگی۔ وہ تینوں اسے ڈھونڈتے رہے لیکن رفتہ رفتہ اسی نتیجہ پر پہنچے کہ اسے تلاش کرناواقعی اتنا ہی فضول تھا جیسا کہ خوداس نے لکھا تھا، انہیں اس کا کوئی پتہ نہیں لگ سکا۔

لیکن اس تمام عرصہ میں وہ ان کے قریب ہی رہ رہا تھا۔ جس روز وہ غائب ہوا تھا اس دن اس کی ملاقات اپنے سوتیلے بھائی ایوگراف سے ہوگئی جوسڑک پر چلتا ہوااسی کی طرف آرہا تھا۔ پتہ یہ چلا کہ ایوگراف حال ہی میں ماسکو آیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ بالکل غیرمتوقع طور پر وہاں پہنچا اوراس نے تمام سوالات مسکرا کر یا مذاق میں ٹال دیئے۔ اسی کی تجویز تھی کہ یوری آندرے وچ کچھ عرصہ کے لئے غائب ہوجائے اور چھپارہے۔

اس نے کیمرگرا سٹریٹ پر آرٹس تھیٹر کے قریب اس کے لئے ایک کمرہ لے لیا، اسے رقم دی اور ایک ہسپتال میں اسے اچھی جگہ دلوانے کی کوشش کی، اس نے اس سے وعدہ کیا کہ پیرس میں اس کے گھر والوں کی مشکوک پوزیشن بھی صاف کر دی جائے گی۔ یا تو یوری آندرے وچ ان کے پاس چلا جائے گا۔ یا وہ لوگ اس کے پاس آجائیں گے۔ ہمیشہ کی طرح اس کے بھائی کی مدد سے یوری آندرے وچ کا دل بڑھ گیا۔

☆☆☆

یہ یادداشتیں بعد میں اس کے کاغذات میں پائی گئیں:

''جب میں 1922ء میں ماسکو واپس آیا تو میں نے اسے آدھا اجاڑ اور تباہ پایا۔ انقلاب کے بعد پہلے چند سال کی آزمائشوں سے اس کا یہ نقشہ ہوگیا تھا اور آج تک یہی نقشہ ہے۔ اس کی آبادی گھٹ گئی ہے، کوئی نئے مکانات نہیں بن رہے اور پرانے مکانات بغیر مرمت کے پڑے ہیں، لیکن ان حالات میں بھی یہ ابھی تک ایک بڑا اور جدید شہر ہے اور نئے اور حقیقی طور پر جدید آرٹ کی تخلیق کا واحد ذریعہ شہری ہوتے ہیں۔

''میں ایک مشہور اور بارونق شہر ماسکو میں رہتا ہوں جو سورج کی روشنی اور تارکول سے بنی ہوئی سڑکوں کی گرمی سے چکا چوندی پیدا کرتا ہے، جہاں سورج کی روشنی کا عکس عمارتوں کی اونچی کھڑکیوں سے زمین پر پڑتا ہے، جہاں آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں اور سڑکوں کا ہنگامہ ہروقت جاری رہتا ہے ماسکو نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے اور میرا سر پھرا جارہا ہے۔ ماسکو نے ایک فن کار کی حیثیت سے میری پرورش کی ہے اور مجھے ایک فن کار بنادیا ہے۔ ہماری چار دیواری کے باہر سڑکوں پر رات دن کے مسلسل ہنگامہ کو دورجدید کی روح سے جدا نہیں کیا جا سکتا جس طرح کسی ڈرامہ کے ابتدائی نغمے اسٹیج کے پردوں سے جدا نہیں ہوسکتے۔''

اگست کے آخر میں ایک روز صبح کو یوری آندرے وچ نے گزیتی اسٹریٹ کے موڑ پر ٹرالی پکڑی جونکتیا اسٹریٹ سے ہوتی ہوئی کلرتسکائیہ کے آخری اسٹاپ تک جاتی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ بوٹکن ہسپتال میں اپنی ملازمت پر جارہا تھا۔ ٹرالی میں کافی بھیڑ تھی۔ نیچے سڑک پر مجمع ایک سے دوسری ٹرالی میں منتقل ہو رہا تھا اور ادھر آسمان پر گہرے بادل جمع ہو رہے تھے۔ طوفان آنے والا تھا۔ یوری آندرے وچ بائیں طرف کی اکیلی نشست پر کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ اسے نکیتا اسٹریٹ کا بایاں حصہ دکھائی دے رہا تھا۔

ایک بوڑھی سفید بالوں والی عورت جس نے ہلکی تنکوں والی ٹوپی اور ایک پرانے فیشن کا چست لباس پہن رکھا تھا فٹ پاتھ پر جارہی تھی۔

بجلی چمکی اور بادلوں کی گرج سنائی دی تھی۔ اس بوڑھی عورت کا چہرہ کھڑکی کے چوکھٹے میں سے پھر دکھائی دیا اور آگے بڑھ گیا۔ بارش کی پہلی بوندیں سڑک پر فٹ پاتھ پر اوراس عورت پر پڑیں۔ ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی درختوں میں سے گذر رہی تھی۔ پتے زور زور سے ہل رہے تھے، اس سے عورت کی ٹوپی اڑنے لگی اور ہوا اس کے لباس میں بھی بھرگئی جس سے وہ غبارہ کی طرح پھول گیا۔ پھر ہوا اچانک رک گئی۔ ڈاکٹر کو متلی سی ہونے لگی۔ اپنی کمزوری پر قابو پاتے ہوئے وہ اپنی نشست پر سے اٹھا اور کھڑکی کھولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ اسے کھول نہیں سکا۔

اچانک اس نے شدید درد محسوس کیا۔ اتنا شدید درد اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے اوراس نے کوئی ناقابل تلافی اور مہلک کام کیا ہے۔ یہ آخری وقت ہے۔ اسی وقت ٹرالی رک گئی۔

کھڑی ہوئی ٹرالی میں سے نیچے سڑک پر اترا، ایک اور قدم بڑھایا اور تیسرا قدم بڑھاتے ہی پتھر یلے فٹ پاتھ پر ڈھیر ہوگیا اور پھر نہیں اٹھ سکا۔

مجمع میں ایک شور مچ گیا۔ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ انہیں فوراً ہی معلوم ہوگیا کہ وہ سانس نہیں لے رہا۔ اس کے قلب کی

حرکت بند ہو چکی ہے۔ وہی بوڑھی عورت بھی چلتی ہوئی آئی۔ ایک منٹ رکی لاش کو دیکھا، لوگوں کی باتیں سنیں اور آگے بڑھ گئی۔ یہ عورت سوئٹزر لینڈ کی رہنے والی مادموزیل فلیوری تھی اور میلیوزیود سے آئی تھی۔ وہ بارہ سال سے ماسکو میں حکام کو درخواستیں دیتی رہی تھی کہ اسے اس کے ملک جانے کی اجازت دی جائے اور ابھی حال ہی میں اس کی درخواست منظور ہوئی تھی۔ وہ اپنا ویزا لینے کے لئے ماسکو آئی تھی۔ وہ اسی طرح چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اسے یہ احساس کبھی نہیں ہو سکا کہ اس نے ژواگو کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ تھی۔

☆☆☆

راہداری کے کھلے دروازے سے کمرے کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا جہاں کونے میں ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ میز پر تابوت رکھا ہوا تھا جو ایک تراشی ہوئی کشتی کے مانند تھا اور اس کا پتلا نچلا حصہ دروازے کے رخ پر تھا۔ یہ وہ حصہ تھا جس میں مردے کی ٹانگیں تھیں۔ یہ وہی میز تھی جس پر بیٹھ کر یوری آندرے وچ لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتا تھا۔ اس کے چاروں طرف پھول ہی پھول تھے۔ سفید بکائن کی جھاڑیاں رکھی ہوئی تھیں جو اس موسم میں مشکل ہی سے ملتی ہیں۔ پھولوں کے ڈھیر کی وجہ سے کھڑکیوں سے آنے والی روشنی چھپ گئی اور سورج کی ننھی ننھی شعاعیں پھولوں کے ڈھیر میں سے چھن چھن کر لاش کے مومی چہرے اور ہاتھوں پر اور تابوت پر پڑ رہی تھیں۔

مردے کو جلانے کا طریقہ اس وقت تک عام ہو چکا تھا۔ بچوں کو پنشن ملنے اور ان کی تعلیم کا بندوبست ہونے اور ڈاک خانہ میں میرینا کی ملازمت قائم رکھنے کے خیال سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ گرجا میں مذہبی رسومات ادا نہ کی جائیں بلکہ صرف شہری طریقہ پر لاش کو جلایا جائے۔ متعلقہ حکام کو اطلاع کر دی گئی اور ان کے نمائندے وہاں پہنچنے والے تھے۔

جب یوری آندرے وچ کی لاش کیمرگر اسٹریٹ کے قلب میں لے جائی گئی تو اس کے دوست جنہیں اس کی موت کی اطلاع دے دی گئی تھی اور جو اس سے بہت زیادہ متاثر تھے، کھلے ہوئے دروازہ سے داخل ہوئے اور میرینا کو بھی ساتھ لائے، جو صدمہ اور رنج سے نیم پاگل ہو رہی تھی، وہ فرش پر گر پڑی اور اپنا سر ہال کمرے میں رکھے ہوئے لکڑی کے بڑے صندوق پر مارنے لگی۔

اس کے دوست گورڈن اور دوروف بھی اس کے ساتھ تھے اور صدمہ کی وجہ سے انہیں بھی چپ لگ گئی تھی۔

لیکن مجمع میں دو افراد، ایک مرد اور ایک عورت، ایسے بھی تھے جو سب سے نمایاں تھے۔ یہ مسلمہ بات تھی کہ انہیں مردہ شخص پر خصوصی حقوق حاصل تھے اور کسی شخص نے ان کے اس اختیار کو چیلنج نہیں کیا۔ جب کبھی یہ آدمی اس حسین عورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتا تھا تو وہ سب کے سب اٹھ کر باہر چلے جاتے تھے۔

اب بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ دونوں تنہا رہ گئے تھے۔ دونوں دیوار کے قریب دو کرسیوں پر بیٹھ گئے اور فوراً باتیں کرنے لگے: ''تم نے کیا معلوم کیا۔ ایوگراف آندرے وچ؟''

''لاش آج رات پھونکی جائے گی۔''

''لاریسا مہربانی کر کے لاش کو ٹھکانے لگانے کے بعد غائب نہ ہو جانا۔ غالباً سب سے زیادہ تم نے کہا تھا کہ تم ارکسک سے دو روز قبل ہی آئی ہو اور تمہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ گذشتہ مہینوں میں میرا بھائی یہاں رہا کرتا تھا یا یہ کہ وہ کہاں تھا۔ تم نے جو کچھ کہا وہ سب میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

''اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟ میں ماسکو پہنچی۔ اسٹیشن پر اپنا سامان چھوڑا اور ماسکو کی چند پرانی سڑکوں پر ٹہلنے نکل گئی۔ شہر کے آدھے حصہ کو میں نہیں پہچان سکی کیونکہ میں اتنا زیادہ عرصہ باہر رہی ہوں۔ خیر میں ٹہلتی رہی، ٹہلتی رہی۔ کزنسکی موسٹ اور کزنسکی پریولوک پر اور اچانک میں نے ایک انتہائی مانوس جگہ دیکھی۔ کیمرگر اسٹریٹ۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں میرا شوہر انتی پوف، جسے گولی ماری گئی ہے، ایک طالب علم کی حیثیت سے رہا کرتا تھا۔ میں نے سوچا، اندر جا کر دیکھوں۔ میں حیرت زدہ رہ گئی۔ کھلا ہوا دروازہ، ہر طرف لوگ بھرے ہوئے۔ کمرے میں ایک تابوت۔ ایک مردہ آدمی۔ یہ کون ہے؟ میں اندر آئی۔ میں اوپر چڑھی اور دیکھا۔ میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔''

''ایک منٹ ٹھہرو۔ انتی پوف اسٹریلینکوف کے متعلق تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے خود اپنے آپ کو گولی ماری تھی؟''

''ہاں، میں نے یہ روایت بھی سنی ہے، لیکن پاول پاولووچ ایسا آدمی نہیں تھا جو خودکشی کر لیتا۔''

''لیکن یہ بالکل صحیح ہے۔ اس کی لاش میرے بھائی کو ملی تھی۔ اس نے اسے دفن کیا تھا۔ تمہیں یہ سب کچھ کیوں نہیں بتایا گیا؟''

''یہ تفصیل میرے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ میرے خیال میں تم نہیں جانتے کہ آیا کبھی اس کی اور ژواگو کی ملاقات بھی ہوئی تھی یا نہیں۔ آیا وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی تھے یا نہیں؟''

''یوری نے جو کچھ مجھے بتایا تھا، اس سے تو یہی ظاہر ہونا ہے کہ ان دونوں کی طویل گفتگو ہوئی تھی۔''

"کیا یہ ممکن ہے! خیر خدا کا شکر ہے، خدا کا شکر ہے یہ بہتر ہی ہوا۔" انتی پودا نے اپنے سینہ پر صلیب کا نشان بنایا۔

"ارے، ہاں۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ لاش جلائے جانے کے بعد میں چلی نہ جاؤں۔ اچھا ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ میں غائب نہیں ہوں گی۔"

"اب میں تعزیت کے لئے آنے والوں کو اندر بلاتا ہوں۔"

لیکن انتی پودا اب کچھ نہیں سن رہی تھی۔ اس نے نہ تو لوگوں کو چلتے پھرتے سنا اور نہ میرینا کی سسکیاں اسے سنائی دیں۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا، اور سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور یادوں اور خیالات میں گم ہو گئی۔ اپنے ان خیالات میں اس کی پریشانی انتہا کو پہنچ گئی تھی: "کوئی باقی نہیں رہا۔ ایک مر گیا۔ دوسرے نے خودکشی کر لی۔ اور زندہ صرف وہی رہ گیا ہے جسے مر جانا چاہیے تھا۔ جسے میں نے ہلاک کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہی۔ وہ اجنبی جس کی کوئی بات مجھ سے مشترک نہیں ہے۔ وہ ناکارہ شخص جس نے میری زندگی کو میرے علم کے بغیر گناہوں کا مجموعہ بنا دیا اور وہ جنگلی جانور ایشیا کے پراسرار علاقوں میں گھوم رہا ہے جن سے عام لوگ واقف نہیں ہیں۔ جو لوگ مجھے عزیز تھے اور جن کی مجھے ضرورت تھی ان میں سے ایک بھی باقی نہیں بچا۔ آہ۔"

سسکیوں کو روکنے کی کوشش نے اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جب تک ہو سکا وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتی رہی لیکن کبھی کبھی آنسوؤں کو روکنا اس کی طاقت سے باہر ہو جاتا اور آنسوؤں کا ریلا بری طرح بہنے لگتا جو اس کے رخساروں اور لباس، ہاتھوں اور تابوت پر بہنے لگتے تھے جس سے وہ لپٹی ہوئی تھی۔

وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ حالات نے انہیں محبت کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ ان کی اس محبت میں جذبات کے شعلوں کی بھڑک نہیں تھی، جیسا کہ محبت کے بارے میں غلط طریقہ پر باور کیا جاتا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے کیونکہ ان کے چاروں طرف ہر چیز یہی چاہتی تھی۔ درخت اور بادل، سروں کے اوپر آسمان اور پیروں کے نیچے زمین، ان کے چاروں طرف کا ماحول، وہ اجنبی لوگ جو انہیں سڑکوں پر ملتے تھے، وہ وسیع میدان جو وہ چہل قدمی کرتے وقت دیکھتے تھے، وہ کمرے جن میں وہ رہتے تھے یا ملا کرتے تھے خود ان دونوں سے بھی زیادہ ان کی محبت سے مسرت حاصل کرتے تھے۔

آہ۔ یہی تو وہ چیز تھی جس نے انہیں متحد کر دیا تھا۔ یہ جذبہ کہ وہ خود اس کل کا ایک جز اور کائنات کے حسن کا ایک عنصر تھے۔ کل کے ساتھ یہ ہم آہنگی ان کے لئے زندگی کے سانس کی طرح اہم تھی۔

اور اب اس نے اس سے رخصت چاہی اور اسے روزمرہ کی زبان میں براہ راست مخاطب کیا۔ اس کے سادہ اور غیر سنجیدہ الفاظ آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہی آنسوؤں نے اس کے الفاظ کو محبت آمیز اور تیز سرگوشی میں تبدیل کر دیا تھا جیسے گرمیوں کے موسم میں جب کہ تیز ہوا چل رہی ہو بارش سے درختوں کے پتے ریشمی کپڑے کی مانند سرسرانے لگتے ہیں۔

"یورو چکا! آخرکار ہم دونوں پھر مل گئے اور خدا کو یہی منظور تھا کہ ہم دوبارہ اتنے دردناک حالات میں ایک دوسرے سے ملیں۔ او خدا، میں اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکتی۔ ذرا سوچو تو! تمہارا اس طرح چلا جانا۔۔۔ میرا خاتمہ۔۔۔ پھر کوئی بڑی اور ناقابل تلافی بات۔

"الوداع، میرے عظیم ساتھی۔ میرے عزیز، رخصت۔ میری قابل فخر ہستی الوداع۔ میرے تیز رفتار اور عمیق دھارے، میں تجھے دن بھر تیز آواز کے ساتھ بہتے دیکھ کر کتنا خوش ہوتی تھی۔ میں اپنے آپ کو تیری سرد لہروں کے سپرد کرنے میں کس قدر مسرت محسوس کرتی تھی۔

"یاد کرو اس دن کو۔ وہاں برف پر ہم نے کس طرح ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا تھا؟ تم نے مجھے کیا دھوکا دیا؟ کیا میں کبھی تمہارے بغیر جا سکتی تھی؟ اوہ۔ میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں، تم نے اپنے اوپر جبر کر کے یہ حرکت کی تھی۔ اور اس کے بعد ہر چیز تباہ ہو گئی۔ او خدا۔ میں نے وہاں کتنی تکلیفیں اٹھائیں۔ میں تین مہینے تک ہسپتال میں رہی۔ پورے ایک مہینہ میں بیہوش رہی، اور اس وقت سے میری زندگی کرب و اذیت کے سوا اور کچھ نہیں۔ یورا میری روح کو کوئی سکون حاصل نہیں ہے۔ درد اور ندامت سے میرے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جا رہے ہیں۔"

وہ بولتی رہی اور کرب و اذیت کے عالم میں سسکیاں بھرتی رہی۔ اچانک اس نے حیرت کے ساتھ اوپر نظر اٹھائی اور اپنے چاروں طرف دیکھا۔ لوگ کمرے کے اندر آ گئے تھے۔ وہ اسٹول سے نیچے اتری اور لڑکھڑاتی ہوئی اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو ملتی ہوئی جیسے وہ اپنے آخری آنسو خشک کر رہی ہو، تابوت کے پاس سے ہٹ گئی۔

لوگ تابوت کے قریب آئے اور اسے تین کپڑوں پر اٹھا لیا۔ جنازے کا جلوس روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

لاریسا فیودورونا کئی روز تک کیمر گر اسٹریٹ میں ٹھہری۔ ژواگو کے کاغذات کو چھانٹنے کا کام اس کی مدد سے شروع ہوا، لیکن

ڈاکٹر ژواگو ہے کون؟ میں سمجھتا ہوں کہ وہ خودنوشت سوانح کا ایک ایسا کردار ہے جسے پیسٹرنک نے اپنا سب کچھ عطا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر، شاعر، مفکر۔ وہ ایک عام انسان نہیں۔ عوام سے تعلق رکھنے والا معمولی فرد نہیں بلکہ ہر لحاظ سے غیر معمولی انسان ہے۔ وہ بے حد ذہین ہے اور اخلاقی خوبیوں کا حامل ہے۔ اس طرح انجام کار یہ ناول ایسے رشتے کی داستان ہے جو ایک ذہین آدمی اور انقلاب میں قائم ہو سکتا ہے یا پھر ایک انسان۔۔ اس لفظ کے بہترین اور وسیع تریں معنوں میں۔ اور ان عام واقعات کا تذکرہ ہے جو اسے اپنے ساتھ بہا لے جاتے ہیں اور اسے سربسجود کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ژواگو جیسا کہ اس کے مصنف نے صریح طور پر تسلیم کیا ہے مخصوص واقعات کے تشدد اور اہمال کے باوجود محض عقلی بنیادوں پر قائم ہے۔ یہ ہیرو اپنی روشنی طبع، ذہانت اور تاریخ کی بے رحمانہ عقلیت، نا قابل استحصال (اور ایک طرح سے مثبت) انسانی احساس کی غیر عقلیت کے تضاد کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ پورا ناول تاریخ اور فطرت، تاریخ اور انسان کے اسی تضاد پر قائم ہے۔ خاص اور فیصلہ کن واقعہ ژواگو اور لارا کا وہ دلآویز معاشقہ ہے جسے انقلاب منقطع کر کے ختم کر ڈالتا ہے۔ (البرٹو موراویا)

ہیمنگو ے کے ناول ''بوڑھا اور سمندر'' کو بہر حال، وسیع ترین نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس ناول میں زندگی کو کبھی مغلوب نہ ہونے والی فطری قوتوں کے خلاف ایک ایسی جدوجہد دکھایا ہے جس میں ایک طرح کی فتح پانا ممکن ہے۔ یہ زندگی کا ایک رزمیہ استعارہ ہے، ایک مقابلہ جس میں اس جدوجہد جیسی عظیم شے کے روبرو حق و باطل کا مسئلہ تک بے حقیقت نظر آتا ہے۔ یہ کچھ کچھ یونانی ٹریجڈی سے بھی اس اعتبار سے مشابہ ہے کہ جب ہیرو پر زوال آتا ہے اور وہ ناکام ہوتا ہے تو اس وقت ناظرین کو شاید ایک ناقابل فراموش جھلک میں یہ دکھائی دے جائے کہ انسان کتنا قدرآور ہو سکتا ہے۔ اور خصوصاً اگر ان متعدد نمایاں اشاروں کو جو مسیحی اشاریت (سمبلزم) کی طرف، خاص طور پر حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کی طرف کیے گئے ہیں، ملحوظ خاطر رکھا جائے تو یہ مسیحی ٹریجڈی بھی ہے۔

(فلپ ینگ/محمد سلیم الرحمٰن)

ہیمنگو ے نے بڑی گوناگوں زندگی گزاری۔ اس کی زندگی کی کہانی، جہاں جہاں کوئی بحرانی موڑ آتا ہے، وہاں اپنے ہیرو کی زندگی سے مختلف نہیں۔ وہ 21 جولائی 1899، کوشکاگو کی ایک نواحی بستی میں پیدا ہوا، جو اوک پارک، الی نوئے کے نام سے مشہور تھی، اور درمیانے طبقے کا خاص الخاص مسکن تھی۔ اس کا پورا نام ارنسٹ ملر ہیمنگو ے تھا۔ باپ ڈاکٹر تھا، شکار کھیلنے اور مچھلیاں پکڑنے کا شوقین! ماں مذہبی خیال کی اور موسیقی شناس عورت تھی، اور اس جدوجہد میں کہ لڑکے کو کس کی پیروی کرنی چاہیے بظاہر کامیابی اول الذکر کو ہوئی۔ بچپن کے وہ دور جن کی یاد سب سے گہری اور دیرپا ثابت ہوتی ہے، چھٹیوں کے دنوں میں مشی گن میں گزارے گئے تھے۔

لڑکپن میں ہیمنگو ے نے مکے بازی سیکھی (اور سیکھنے سیکھنے میں ایک آنکھ ہمیشہ کے لیے خراب کر لی) اور ہائی اسکول میں اس نے فٹ بال کھیلا۔ وہ بہر حال، اس ثانی الذکر مشغلے سے خوش نہیں تھا، جس کی کچھ وجہ یہ تھی کہ وہ ابھی سے لکھنے لکھانے میں زیادہ دلچسپی محسوس کرنے لگا تھا۔ اسکول کے اخبار اور انگریزی کی کلاسوں کے لیے کام کرتے ہوئے اس نے ہلکی پھلکی نظمیں کہیں، رنگ لارڈنر کی نقل میں بہت کالم لکھے (لارڈنر کی نقل اتارنے میں وہ بڑا ماہر ہو گیا تھا) اور کچھ افسانے لکھنے کی بھی کوشش کی۔ اگر چہ کئی برس تک یہی نظر آتا رہا کہ اس کی طبیعت مزاح نگاری کے لیے بے حد موزوں ہے، لیکن اس نے زیادہ سنجیدہ فکشن لکھنے پر توجہ دی، اور درحقیقت اس کے لڑکپن کی ادبی پیداوار کا یہی پہلو سب سے زیادہ اثر دار ہے۔ (فلپ ینگ/محمد سلیم الرحمٰن)

اس کے بغیر ختم ہوا۔ اس نے ایوگراف آندرے وچ سے بھی بات چیت کی اور اسے ایک اہم بات بتائی۔

ایک روز لاریسا فیودوروونا باہر گئی اور پھر واپس نہیں پلٹی۔ اسے یقیناً اس وقت سڑک پر گرفتار کر لیا گیا ہوگا۔ وہ کوئی نشان چھوڑے بغیر غائب ہوگئی اور غالباً کسی جگہ اس کی موت واقع ہوگئی۔ اور لوگ اسے بھی اس فہرست کے گمنام افراد کی طرح بھول گئے جو بعد میں کہیں گم ہوگئی، شمالی علاقہ کے ان لاتعداد مشترکہ یا عورتوں کے نظر بندی کے کیمپوں میں سے کسی ایک کیمپ میں! (ختم شد)

دُنیا کے عظیم ناولوں میں سے

سوہنی دھرتی (Good Earth)

چین کے ایک کسان کی سرگزشت، وہ یہ بھولا نہیں تھا کہ اُسے مٹی سے اٹھایا گیا ہے

پرل ایس بک/انور کمال پاشا

''پرل ایس بک'' کا تعلق قدیم نسل سے تھا، مگر ان کے ناول مغرب کی نئی نسل میں EROTIC ERA ہونے کے باوجود بے حد مقبول تھے۔ ان کے یہاں حقیقت نگاری کے نام پر تحریر میں عریانی وفحاشی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ پرل ایس کی تاریخ پیدائش 26 جون 1892ء ہے اور وفات 6 مارچ 1973ء کو امریکہ میں ہوئی۔ چین کی تہذیبی ومعاشرتی زندگی کے بارے میں ان کے ناولوں اور کتابوں کو ایک عالمگیر شہرت حاصل ہے، بلکہ ان کے ناولوں کو چین کی مجلسی زندگی پر ایک اتھارٹی سمجھا جاتا ہے اور دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

انہیں 1938ء میں نوبل پرائز ملا۔ انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی اور جوانی کا بیشتر حصہ چین میں گزارا۔ یہاں ان کے والدین مشنری بن کر گئے اور وہیں مقیم ہو گئے تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم چین کے مشہور شہر شنگھائی میں پائی تھی جبکہ 1914ء میں رنڈ ولف میکون وومن کالج لانچ برگ سے گریجوایشن کی تھی اور اسی سال وہ اپنے والدین کے ساتھ دوبارہ چین چلی گئیں اور کچھ عرصہ بعد چین ہی کے ایک مشہور شہر نکیانگ کی یونیورسٹی میں لیکچرار بھی رہیں۔ وہ چینی زبان پر بھی عبور رکھتی تھیں۔

چین کی تہذیبی ومجلسی زندگی کے بارے میں ان کے مقالات ومضامین سب سے پہلے امریکہ کے جرائد واخبارات میں 1923ء میں شائع ہوئے تھے۔ مگر ان دنوں امریکہ میں چین کے بارے میں کچھ جاننے کا کوئی جذبہ نہ تھا، کیونکہ خود امریکی ایک نازک صنعتی دور سے گزر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مضامین ومقالات اور افسانوں کا علمی حلقوں میں بھی کوئی خاص نوٹس نہ لیا گیا اور نہ ہی عام قارئین نے اس پر کوئی توجہ کرنا ضروری سمجھا، مگر 1931ء میں جب انہوں نے ایک ناول ''گڈ ارتھ'' کے نام سے لکھا تو وہ ایک دم آسمانِ علم وادب پر ستارہ بن کر جگمگانے لگیں۔ ''گڈ ارتھ'' میں انہوں نے جو کہانی بیان کی ہے وہ چین کے متعلق ہے اور چین ہی کے ایک کسان کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ چینی کسان اپنی اور اپنی ''غلام بیوی'' کا پیٹ پالنے کے لئے کس طرح چین کے ظالم زمینداروں سے دھرتی اور اناج حاصل کرتا ہے اور اپنا مجلسی تشخص بحال رکھتا ہے۔

بہرحال اس ناول میں ان کا رویہ چینی لوگوں کے ساتھ بے حد ہمدردانہ ہے۔ اسی ناول پر انہیں امریکہ کا ایک مشہور ادبی ایوارڈ ''پلٹزر پرائز'' 1932ء میں ملا تھا۔ اس ناول کا دنیا کی شاید ہی کوئی بڑی زبان ہو، جس میں ترجمہ نہ کیا گیا ہو مغربی زبانوں کے علاوہ اس کا مشرقی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔ اس کے بعد نیک دل ناول نگار خاتون پرل ایس بک نے یکے بعد دیگرے کئی ناول لکھے جن میں سنز (SONS) اور اے ہاؤس ڈیوائڈڈ ہیں۔

آخرالذکر ناول اس قدر مقبول ہوا تھا کہ قارئین کے پیہم اصرار پر پرل نے اس ناول کا دوسرا حصہ بھی لکھا، جس کا نام ہاؤس آف ارتھ (HOUSE OF EARTH) رکھا۔

اسی دوران 1934ء میں پرل ایس بک کو ان کے شوہر جان ایل بک نے طلاق دے دی۔ وہ خود بھی ایک مشنری رہ چکے تھے۔ انہوں نے 1917ء میں شادی کی تھی۔ اس کے بعد 1935ء میں پرل نے نیویارک کے ایک بڑے ناشر رچرڈ جے ویلش سے شادی کر لی۔ اس طرح انہیں امریکہ میں رہائش اختیار کرنا پڑی۔ دوسری عالمگیر جنگ 45-1938ء میں جنگ سے متاثرہ بچوں اور افواج کے ناجائز بچوں کو اولاد بنانے کی تحریک نے زور پکڑا۔ یہ وہ معصوم بچے تھے جو امریکی فوجیوں کی حرامی اولاد میں سے تھے اور جنگ کے دوران ایشیائی و افریقی ممالک میں پیدا ہوئے تھے۔ ان امریکی فوجیوں نے ایشیائی ممالک میں مقامی عورتوں سے غیر قانونی شادی کی تھی بعد میں انہوں نے ان بچوں کی پرورش اور نگرانی سے انکار کر دیا تھا۔ پرل ایس بک نے ان بے گناہ بچوں کے لیے اپنے دل کو بڑا رقیق پایا، چنانچہ انہوں نے چودہ لاوارث بچوں کو اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا اور انہیں اپنے ساتھ رکھا اور انہیں بیٹے بیٹیوں کی طرح پالا پوسا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک

امدادی ادارہ بھی قائم کیا جس کا نام پرل ایس بک فونڈیشن رکھا۔ اس ادارے کی تمام آمدنی دنیا بھر میں پائے جانے والے لاوارث بچوں اور ناجائز بچوں کی بہبودی و بہتری پر صرف کی جاتی رہی ہے۔ 1967ء میں پرل نے اس ادارے کے نام اپنی بیشتر آمدنی جو انہیں کتابوں کی رائلٹی سے حاصل ہوتی تھی، وقف کر دی جو 1967ء میں ستر لاکھ ڈالر تھی۔

انہوں نے جو چودہ بچے اپنی زیر کفالت لیے تھے وہ ان بچوں کے ساتھ ایک ماں کے طور پر پیش آتی رہیں اور یہ بچے بھی انہیں اپنی اصلی ماں ہی سمجھتے رہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ پرل بک کے کوئی اولاد نہ تھی۔ انہوں نے جان ایل بک سے طلاق کے باوجود ان کے نام کا سابقہ اپنے نام کے ساتھ لکھنا بولنا جاری رکھا تھا۔ انہوں نے عام یورپی امریکی عورتوں کی طرح پے در پے شادیاں نہیں کی تھیں۔ وہ بہت وفادار اور نیک دل خاتون تھیں۔ انہوں نے 1936ء میں ایک کتاب FIGHTING ANGEL کے عنوان سے لکھی تھی اصل میں یہ ان کے والد اپسلم سائیڈن کی سوانحی کتاب ہے۔ پھر اسی سال انہوں نے اپنی والدہ کیرولین کا سوانحی خاکہ بھی لکھا جس کا کتابی نام THE EXILE ہے۔

جن دنوں ان کے والدین چین میں مشنری تھے، وہاں شہنشاہیت تھی مگر 1919ء میں ڈاکٹر سن یات سن، چیئر مین ماؤزے تنگ اور جناب چواین لائی کے برپا کردہ انقلاب کے بعد چین سے تمام غیر ملکیوں کو نکال دیا گیا تھا جن میں پرل کے والدین بھی شامل تھے۔

1936ء سے لے کر 1954ء تک انہوں نے بے شمار ناول لکھے۔ ان کے ناولوں کا پلاٹ فرضی نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مضبوط تاریخی اور جغرافیائی پس منظر ہوتا ہے انہوں نے مختصر افسانے بھی لکھے اور ان کے کئی مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ 1950ء میں انہوں نے دُنیا کے غریب بچوں اور غریب والدین کے بارے میں ایک نہایت درد انگیز ناول لکھا تھا جس کا نام THE CHILD WHO NEVER GREW تھا۔ اس ناول کو جو کوئی پڑھتا ہے آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انسانی رواداری اور ہمدردی کا ایسا بھرپور تاثر جو پرل کے یہاں موجود ہے، شاید ہی اور کسی کے یہاں ہو۔ اس ناول کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اصل میں اس کا پس منظر ان کی اس بچی کے متعلق ہے، جو جان ایل بک کی پہلی بیوی سے تھی۔ پرل اس سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔

MY SEVERAL WORLDS کہنے کو ناول ہے، مگر اصل میں پرل ایس بک کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ وہ ایک غیر معمولی صلاحیتوں کی خاتون تھیں۔ طبعاً رحمدل اور انسان دوست تھیں۔ جوانی میں بہت حسین تھیں مگر انہوں نے عہد جوانی کو نہایت پاکبازی سے بسر کیا تھا۔ مغربی عورت ہوتے ہوئے ان کی عادات مشرقی عورتوں جیسی تھیں۔ ان کی مادری زبان انگریزی تھی، مگر انہوں نے انگریزی سے پہلے چینی زبان سیکھ لی تھی اور چینی زبان میں میٹرک پاس کیا تھا وہ اچھی طرح چینی لکھ پڑھ اور بول سکتی تھیں۔

1971ء میں جب امریکہ کے ایک سابق صدر نکسن کے دور میں امریکہ اور چین کے تعلقات (پاکستان کی کوششوں اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کی ذاتی مساعی سے) قائم ہوئے تو امریکہ کی طرف سے چین میں مختلف مکتب فکر کے لوگوں تاجروں، صنعتکاروں، ماہرین، سیاست دانوں، ادباء، شعراء اور صحافیوں کو خیر سگالی کے اظہار کے لیے پیکنگ بھیجا گیا۔ ایک ایسے ہی وفد میں پرل ایس بک کو بھی شامل کیا گیا، مگر کسی وجہ سے چین کی حکومت نے انہیں ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ پرل ایس بک کو جب اس صورت حال کا علم ہوا تو انہیں گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ مطلب یہ نہیں کہ چین کی حکومت کو پرل ایس بک سے کوئی پرخاش تھی، کیونکہ وہ تو چین کی محسنہ تھیں، کیونکہ ان کے بیشتر ناولوں میں چین کا تہذیبی پس منظر لیا گیا ہے۔ دراصل یہ چین کی اس پالیسی کا حصہ تھا جس کے مطابق وہ دور شہنشاہیت سے تعلق رکھنے والے امور سے قطع تعلقی کا اعلان کرنا چاہتا تھا۔

بہر حال پرل ایس بک کو چین نہ جانے پر گہرا صدمہ ہوا۔ اب وہ بڑھاپے کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھیں۔ بعض امریکی اخباروں میں ان کے ''آخری لمحات'' کے بارے میں چھپا ہے۔ پرل کو چین جانے کی اجازت نہ ملنے ہی کی وجہ سے بیماری لاحق ہوئی تھی اور اسی کے سبب ان کا انتقال ہوا تھا۔ (قیوم اعتصامی)

آج وینگ لینگ کی شادی کا دن تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو کوٹھڑی میں کچھ اندھیرا سا تھا۔ گھر خاموش تھا۔ تیسری کوٹھڑی سے، جو دوسری کوٹھڑی کے عقب میں تھی، اس کے باپ کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ آواز اس گھر میں سب سے پہلے ابھرتی۔۔۔ گھٹی گھٹی خشک کھانسی کی آواز۔ وینگ لینگ اس وقت تک اپنے بستر پر کسمساتا رہتا، جب تک وہ آواز دروازے کی چرچراہٹ کے بعد، جو باپ کا دروازہ کھولنے کے وقت پیدا ہوتی، اس کے بالکل قریب نہ آ جاتی۔

لیکن آج اس نے اس آواز کا انتظار نہ کیا۔ وہ آنکھ کھلتے ہی بستر سے نکل آیا۔ کھڑکی کے سوراخ میں سے روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ صحن میں آ گیا اور صحن کا دروازہ کھول کر اس نے اپنے کھیت پر ایک مطمئن نظر ڈالی۔ مشرق سے آنے والی ہوا میں نمی تھی۔ بارش کے آثار تھے۔ کھیتوں کو بارش کی ضرورت تھی۔ وہ اس عمر میں ہی ایک اچھا کاشتکار بن گیا تھا اور ہوا میں نمی محسوس کر کے اسے یقین ہو چلا تھا کہ برکھا ضرور ہو گی۔ اس کی ہونے والی بیوی یقیناً بڑی خوش نصیب تھی۔ وہ بارش کو اپنے ساتھ لا رہی تھی۔

وہ بہت جلد اپنے صحن میں آ گیا اور اس نے چھپر کے نیچے کھڑے ہوئے بیل کی پشت تھپکی اور اسے چمکارا، اور نہانے کے بعد کوٹھڑی میں آ کر کپڑے بدلے۔ اس کا گھر مٹی کا بنا ہوا تھا، جو اس کے باپ دادا نے اپنی زمین کھود کر اس بھوسے سے جو ان کی اپنی ہی گندم سے نکلا تھا، یہ گھر بنایا تھا۔ کپڑے پہننے کے بعد اس نے پتھر رگڑ کر آگ جلائی اور جب آگ سے شعلے نکلنے لگے تو وہ اپنے بوڑھے کھانسنے والے باپ کے لیے چائے تیار کرنے لگا۔ گزرے ہوئے چھ سال سے اس کا یہی معمول تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد وہ صبح اٹھ کر آگ روشن کرتا اور اپنے باپ کے لیے چائے تیار کرتا۔ گرم چائے سے جس میں برائے نام پتی ہوتی، اس کے باپ کی کھانسی میں کمی آ جاتی، لیکن اب شاید کچھ آرام میسر آ جائے۔

ایک عورت اس گھر میں آ رہی تھی۔ شاید جس کے آنے کے بعد اسے گرمیوں اور سردیوں میں آگ نہ جلانی پڑے۔ جب وہ اور اس کا باپ بستر پر لیٹے چائے کا انتظار کر سکیں۔ بیوی کا خیال آتے ہی وینگ لینگ کے دماغ میں بچوں کا تصور ابھرا آیا۔ بچے جو اس صحن میں بھاگا دوڑا کریں گے اور پھر یہ صحن اور کوٹھڑیاں بھری بھری لگیں گی۔

آج تک یہ تین کوٹھڑیوں والا گھر اسے بہت بڑا لگتا تھا۔ تقریباً خالی! اس وقت سے جب اس کی ماں اچانک مر گئی۔ جب تک ماں جیتی رہی، اس گھر میں مہمان بھی آتے رہے۔ خاص طور پر اس کا چچا، اپنی فربہ بیوی اور کئی بچوں کے ساتھ۔

وہ سوچنے لگا مستقبل قریب میں ہی اس گھر میں بستر ہی بستر ہوں گے۔ وہ ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا باپ کھانستا اور تھوکتا ہوا کوٹھڑی سے صحن میں نکل آیا اس کی آواز نے وینگ لینگ کو چونکا دیا: ''ابھی تک چائے کا پانی گرم نہیں ہوا۔''

وینگ لینگ نے جو خوش آئند خیالوں میں کھویا ہوا تھا آہستگی سے جواب دیا: ''لکڑیاں کچھ گیلی تھیں ہوا میں نمی جو آ گئی ہے۔''

چائے کے دو چار گھونٹ بھرنے کے بعد بوڑھے کی آنکھوں میں چمک آ گئی، لیکن اس نے شکایت کے لہجے میں دوبارہ کہا: ''تم چائے میں بہت پتی ڈالنے لگے ہو، چائے تو چاندی کے بھاؤ بکتی ہے۔''

''میں نے کچھ زیادہ پتی ڈال دی ہے آج۔''

''ہاں آج تمہاری شادی کا دن ہے۔ جاؤ میری کوٹھڑی میں تمہاری ماں کا صندوق پڑا ہے۔ اس میں شاید تمہاری ہونے والی بیوی کے لیے کوئی جوڑا ہو۔'' وینگ لینگ کوٹھڑی کی طرف چلا گیا۔

وہ آج تک سوچا کرتا تھا اس غربت میں اسے کوئی عورت میسر نہیں آئے گی۔ عورت جب تک چاندی اور سونا کسی شخص کے پاس نہ ہو، اسے کیسے مل سکتی ہے۔

اس کے باپ نے یہی سوچ کر بڑی حویلی کی بڑی جاگیردارنی سے دست بستہ عرض کی تھی کہ وہ کوئی اپنی زرخرید لونڈی اس کے محنتی بیٹے کو بخش دے وہ خواہ خوبصورت نہ ہو۔

وہ بڑی حویلی کے آہنی دروازے پر کئی برس تک چوکیدار رہ چکا تھا اور اس کی اس درخواست پر بڑی حویلی کی جاگیردارنی نے کہا تھا کہ وہ اپنی ایک لونڈی اپنے پرانے چوکیدار کے بیٹے کو بخش دے گی۔

آج وینگ لینگ اس بڑی حویلی میں ایک ایسی نوجوان تندرست، لیکن بدشکل عورت کو بیاہنے جا رہا تھا جس کا رشتہ اس کے باپ نے طے کیا تھا۔ بوڑھا باپ آہستگی سے بولا: ''تمہیں ایک بیوی چاہیے، ایک عورت، خواہ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ ہوں یا اس کا ہونٹ کٹا ہوا ہو۔ لیکن سنو تمہاری بیوی کے چہرے پر

چیچک کا کوئی داغ نہیں اور نہ اس کا ہونٹ کٹا ہوا ہے۔ تم بڑی حویلی کے آہنی دروازے تک پہنچ جاؤ اور اپنے آنے کی اطلاع دو۔ دروازے پر تمہیں بڑی حویلی کا چوکیدار ملے گا۔"

"اس کے بائیں گال پر ایک مسہ ہے، تم اسے پہچان لو گے۔ اسے کہنا تم دروازے کے پرانے چوکیدار کے بیٹے ہو۔ تمہارے لیے وہ دروازہ کھول دے گا۔"

"لیکن بابا میں اکیلا جاؤں گا؟"

"ہاں تمہیں اکیلے ہی جانا ہوگا۔ تمہارا چچا شاید اس لیے نہیں آیا کہ اسے کچھ دینا پڑے اور ہمارا ہمسایہ چن وہ اچھا آدمی ہے، لیکن ہماری طرح فاقہ مست!"

"تو کیا میں اکیلا جاؤں گا!"

"لو پیتل کے کچھ سکے! تمہیں شاید ان کی ضرورت ہو۔" اور پھر وہ آہستگی سے کہنے لگا۔ "یہ لو چاندی کا ایک سکہ، بازار سے کچھ مٹھائی لے لینا۔ تمہاری بیوی کے لیے تمہاری ماں نے جوڑا بنوایا تھا اسے ساتھ لے جاؤ۔"

وینگ لینگ باپ کی ہدایت سن کر کوٹھڑی سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر ہولیا۔ اکیلا دلہا اپنی دلہن کو لینے کے لیے جا رہا تھا۔ پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا ایک چھوٹی سی صندوقچی اٹھائے، جس میں اس کی ماں کا تیار کیا ہوا جوڑا تھا، جو اس نے اپنی بہو کے لیے بنایا تھا اور تھوڑی سی مٹھائی، جو اس نے راستے میں ایک دکان سے خریدی تھی۔

آہنی دروازے کے قریب پہنچ کر وینگ لینگ نے چوکیدار کو مخاطب کیا:

"میں وینگ لینگ ہوں، اس بڑی حویلی کے پرانے چوکیدار کا بیٹا!" وینگ لینگ نے دیکھا چوکیدار کے دائیں گال پر مسہ تھا۔ اس مسے میں تین خاردار بال اگے ہوئے تھے۔

"اکیلے ہو۔" چوکیدار نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"جیب میں کچھ ہے؟ چاندی کی کنجی ہر دروازہ کھول سکتی ہے!"

"میں ایک غریب آدمی ہوں۔"

"شادی کے لیے کوئی غریب بھی خالی جیب نہیں آتا۔"

"تلاشی لے لو!!"

وینگ لینگ نے یہ فقرہ اس لیے کہا تھا کہ اس کی تلاشی نہیں لی جائے گی، لیکن چوکیدار اس کی جیب ٹٹولنے لگا۔

ایک چاندی کا سکہ اور کچھ دھات کے سکے نکلے۔

"میں صرف چاندی کا سکہ لوں گا۔" اس نے کہہ کر آہنی دروازہ کھول دیا۔

"آؤ تمہیں اندر پہنچا آؤں۔"

وینگ لینگ کو چوکیدار کی اس حرکت پر غصہ آیا، لیکن دروازہ کھلتا دیکھ کر وہ صندوق اور مٹھائی کی ٹوکری سنبھالتا اندر داخل ہوا۔

وہ سہما ہوا تھا۔ بڑی حویلی میں داخلہ کوئی معمولی بات نہ تھی! چوکیدار اسے مہمان خانے میں پہنچا کر اندرونی کمروں میں غائب ہوگیا۔ وینگ لینگ عجیب وغریب حالات میں گھرا پسینے میں نہا رہا تھا کہ چوکیدار کمرے میں داخل ہوا۔

"بڑی سرکار تمہیں بلا رہی ہیں۔"

وینگ لینگ مسکراتا آہستہ آہستہ راہداری سے ہوتا ایک بڑے ایوان میں پہنچا، جاگیردارنی ایک مسند پر سوار تھی۔

وہ ایک سن رسیدہ باوقار عورت تھی۔ اس نے بیش قیمت ساٹن کا لباس، جس پر زردوزی کا کام ہوا تھا اور کشمیرے کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ کنیزیں مورچھل ہلا رہی تھیں اور دبیز تکیوں میں دھنسی ہوئی مالکن گھلی ہوئی افیون کی چسکیاں لے رہی تھی۔

وینگ لینگ اس کے باوقار چہرے کی تاب نہ لا سکا، اس کے پاؤں جیسے قالین میں دھنسنے لگے۔ وہ ایک معمولی کاشتکار تھا۔ اس نے خواب میں بھی یہ تصور نہ کیا تھا کہ وہ بڑی حویلی کے ایوان خاص میں پہنچ جائے گا۔ وہ غیر اضطراری طور پر جھک گیا، جاگیردارنی کی آواز آئی۔

"سر اونچا کرلو۔" وینگ لینگ سیدھا کھڑا ہوگیا وہ نہیں جانتا تھا کیا کرے، کیا نہ کرے، جاگیردارنی کی آواز ابھری۔ "یہ کیوں آیا ہے؟" اس نے چوکیدار سے سوال کیا۔

"امیروں کا حافظہ اکثر کمزور ہوتا ہے، اس نے سوچا۔

"یہ شاید اولین (او۔لین) آپ کی کنیز کا ہونے والا شوہر ہے۔" جاگیردارنی کا حافظہ جیسے جاگ اٹھا۔

"وینگ لینگ ہماری کنیز ہے۔" بوڑھی عورت نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولی: "میں بھول گئی تھی۔ مجھے بھول جانا چاہیے تھا۔ یہ شادی گڈے گڑیوں کا کھیل ہے۔" پھر اس نے وینگ لینگ کو مخاطب کیا: تم ہماری کنیز کے لئے آئے ہو۔ تمہارا باپ ہمارا پرانا چوکیدار تھا۔ ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی کنیز اس کے بیٹے سے بیاہ دیں گے۔ ہاں کہو کیا کرتے ہو۔

"کاشتکار ہوں! تھوڑی سی زمین ہے۔"

جاگیردارنی نے افیون کی چسکی لی اور اپنی ایک ملازمہ کو مخاطب کیا: اولین کو بلاؤ، وہ چاہتی تھی کہ شادی کا یہ معاملہ ابھی ختم

کر دے۔ کچھ لمحوں کے بعد ایک تندرست کنیز آراستہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بیس بائیس سالہ تندرست لڑکی تھی۔ اسے لڑکی بھی کہا جا سکتا تھا اور عورت بھی۔ وینگ لینگ نے کنکھیوں سے اسے دیکھا۔ بوڑھی مالکن کی آواز آئی۔ "ہم نے تمہیں بیاہنے کا فیصلہ کر لیا ہے دیکھ لوا سے۔"

نو آمدہ کنیز نے سر جھکا لیا۔

"مطلب یہ ہے کہ تم اسے پسند کرتی ہو۔ جاؤ اپنے جہیز کا بکس اٹھا لاؤ۔" کنیز نے سر جھکا لیا اور لٹکے ہوئے پردوں میں غائب ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد امیر مالکن نے افیون کی چسکی لی اور اس کی آواز آنے لگی:

یہ بچی تھی، عمر چھ سات سال کی ہو گی جب اس کے علاقے میں قحط پڑا۔ میں نے اسے خرید لیا۔ سستی جنس کون نہیں خریدتا۔ اب یہ بائیس برس کی ہے۔ میں نے اسے جنوبی شہر کی ایک منڈی سے خریدا تھا۔ اس کے ماں باپ اس وقت فاقہ کر رہے تھے۔ میں نے چاندی کے کچھ سکے ان کی طرف بڑھائے اور وہ اسے مجھے دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ میں اس غریب گھرانے پر رحم کرنا چاہتی تھی۔

بھوک نے مجھے رحم بھی نہ کرنے دیا۔ اس بچی کے پھولے ہوئے گالوں پر تھپڑوں کے نشان تھے اور وہ چیتھڑوں میں ٹھٹھر رہی تھی۔ میں نے اسے خرید لیا۔

یہ خوبصورت نہیں اور تمہیں خوبصورت عورت کی ضرورت بھی نہیں۔ صرف عیش پسند مردوں کو ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ابھی تک اس کی عصمت محفوظ ہے (ابھی تک کنواری ہے)

یہ کنواری ہے۔ یہ تمہارا ہر حکم مانے گی۔ یہ تمہارے لیے بچے جنے گی، بچے! یہ میری خدمت میں رہی ہے اور میں نے آج تک اس کی کوئی شکایت نہیں سنی۔ اس کے پستانوں کو آج تک کسی نے ہاتھ نہیں لگایا اور نہ اس کی تندرست ٹانگیں کسی کے سامنے اٹھی ہیں۔

او۔ لین اس گفتگو کے دوران میں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے سر پر ایک چوبی بکسا تھا۔ بوڑھی مالکن نے اسے آتے ہوئے دیکھا اور اس کی نظریں اولین پر مرکوز ہو گئیں۔ "اس کا ہر حکم ماننا، بچے پیدا کرنا۔۔۔ لڑکے اور۔۔۔ جب پہلا لڑکا پیدا ہو تو اسے لے کر ہمارے حضور آنا۔"

"ایسا ہی ہو گا۔"

"تو جاؤ اس بکس میں اس کا جہیز ہے۔ تمہیں جہیز کی ضرورت بھی نہیں، غریب آدمی ہو۔ غریبوں کو لمبے چوڑے جہیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" یہ الفاظ غیر ارادی طور پر وینگ لینگ کے منہ سے نکلے۔ وہ خوش تھا اور اس نے سر جھکا کر بوڑھی جاگیردارنی کا شکریہ ادا کیا اور بکسا اٹھا کر پاس پڑی ہوئی ٹوکری نو بیاہتا بیوی کے ہاتھ میں تھما کر رخصت ہونے کی اجازت مانگی۔

دونوں آہستہ آہستہ باہر کے دروازے کی طرف چلے۔ آہنی دروازے کے قریب پہنچ کر اس احساس سے کہ وہ ایک عورت کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے، ایک ایسے لذیذ گوشت کو جسے آج تک کسی نے نہیں چکھا تھا۔ اس کے نتھنوں سے سانس کی جگہ شرارے پھوٹنے لگے۔

جب وینگ لینگ اپنی بیوی کے ساتھ حویلی کے آہنی دروازے پر پہنچا تو چوکیدار جو بڑی حویلی میں بدکاری سے واقف تھا آہستگی سے کہنے لگا: "بیوی مبارک ہو۔ جاؤ شام ہونے والی ہے اور تمہیں لمبا فاصلہ طے کرنا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے آہنی دروازہ بند کر لیا۔

وینگ لینگ اپنی بیوی کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ سیاہ بادل جھوم جھوم کر آ رہے تھے۔ لدے پھندے بادل، وہ بارش کو اپنے کندھوں پر سوار کر کے لا رہے تھے۔ مختلف پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے شوہر اور بیوی گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔

گھر کے دروازے پر وینگ لینگ کا بوڑھا باپ دور افق پر سورج غروب ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے اور بہو کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ شاید وہ انہیں دیکھنا کسر شان سمجھتا تھا۔ انہیں دیکھنے کے بجائے وہ دوران بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا، جو قطروں سے بھرے ہوئے تھے۔

"بادلوں کا سیاہ ٹکڑا بارش کی خبر دیتا ہے۔"

میرا تجربہ کہتا ہے کل شام تک برکھا ضرور ہو گی! اور یہ کہتے ہوئے بوڑھے باپ نے ٹوکری کی طرف دیکھا: "کیا لائے ہو؟"

کچھ کھانے پینے کا سامان! آج مہمانوں کو جو بلایا ہے، کیا وہ یہاں آ کر بھوکے رہیں گے!

اور یہ کہہ کر وینگ لینگ نے ٹوکری اٹھائی اور صحن میں اپنے باورچی خانے کی طرف چلا۔ نئی نویلی دلہن بھی آہستگی سے اس کے پیچھے پیچھے چلی۔

باورچی خانہ میں پہنچ کر اس نے ٹوکری ایک تھال میں خالی کر دی۔

"یہ گوشت ہے اور مچھلی۔ ہم کھانے والے کل سات آٹھ ہوں گے۔ کیا تم گوشت پکا لو گی۔"

"میں بچپن ہی سے بڑی حویلی کے باورچی خانے میں رہی

ہوں، گوشت کے بغیر امیروں کا دسترخوان مکمل نہیں ہوتا۔''

وینگ لینگ نے یہ سن کر سر ہلایا اور باہر نکلا۔ وقت مقررہ سے کچھ دیر پہلے مہمان آ گئے۔ چچا کو ہمیشہ کی طرح بھوک ستا رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا پندرہ سالہ بیٹا بھی تھا۔ باقی مہمان ساتھ کے گاؤں کے تھے، جن سے وینگ لینگ فصل کے دنوں میں بیجوں اور اپنی محنت کا تبادلہ کیا کرتا تھا اور تیسرا ان کا نزدیکی ہمسایہ چنگ تھا۔ ایک خاموش طبع مختصر سا آدمی، جو ضرورت کی بات کہنے سے بھی گریز کیا کرتا تھا۔

ابھی مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھنے کے وقت وضع داری کے قرینوں میں الجھے ہوئے تھے کہ وینگ لینگ اپنے مختصر سے باورچی خانے میں جا پہنچا اور او۔لین سے کہا کہ وہ کھانا لے آئے۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، جب اس کی بیوی نے آہستگی سے کہا: ''میں تمہیں برتن اور پیالے پکڑاتی ہوں تم میز پر چن دو۔ میں غیر مردوں کے سامنے کیسے باہر آؤں۔''

وینگ لینگ اس حساس سے بہت خوش ہوا۔ نازاں کہ وہ عورت صرف اس کی تھی اور اس کے علاوہ بلا دھڑک وہ کسی کے سامنے جانا نہ چاہتی تھی!

اس نے برتن پکڑے اور نشست گاہ میں آ کر بوسیدہ میز پر رکھنے لگا۔ اس نے مہمان نواز بنتے ہوئے ذرا بلند آواز سے کہا:

''چچا کھانا شروع کرو، اور بھائیو تم بھی!''

چچا نے از راہ تمسخر کہا:

''بہو کہاں ہے، دلہن۔''

''ابھی ہم ایک نہیں ہوئے۔ بیوی اور شوہر کا رشتہ ابھی قائم نہیں ہوا۔'' اس پر سب ہنسنے لگے اور خاموشی سے کھانے پر پل پڑے۔ وینگ لینگ کبھی کبھار انکساری کا اظہار کرتے ہوئے کہتا: ''معمولی کھانا ہے، پتہ نہیں میری بیوی کو ٹھیک طور پر پکانا بھی آتا ہے یا نہیں۔''

لیکن یہ کہتے ہوئے وہ دل ہی دل میں خوش تھا۔ ایسا لذیذ کھانا، شاید اس کے غریب مہمانوں نے کبھی نہ چکھا تھا۔

کھانے کے بعد چائے آ گئی۔ آخر میں جب سب مہمان ایک ایک کر کے چلے گئے، تو وینگ لینگ اپنے سونے کے کمرے کی طرف بڑھا اور کمرے میں آ کر اس نے آہستگی سے اپنی بیوی کا ہاتھ تھاما۔ یکایک اسے شرم سی آئی۔ اس نے میز پر سرخ رنگ کی موم بتی روشن کر دی۔ اس کی کمزور روشنی ہلکی کوٹھڑی میں پھیل گئی۔

اس نے سوچا: ''کیا یہ عورت میری ہے!''

''اسے اب کیا کرنا چاہیے۔''

یہ سوچ کر وہ جسم سے کپڑے اتارنے لگا۔ اس کی بیوی بستر پر ایک طرف سمٹ گئی تھی۔ اس نے بوسیدہ کمبل اپنے شانوں پر ڈال لیا تھا۔

وینگ لینگ کے جسم میں ایک انجانی کپکپاہٹ، ایک جھرجھری، ایک سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے موم بتی بجھا دی اور اندھیرے میں تندرست بیوی کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

☆☆☆

کتنی عیش کی زندگی ہوتی ہے جس میں ایک عورت ہو، ایک ایسی عورت جو سرتا پا اس کی تھی۔ وہ سویرے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کپڑے اپنے تندرست و توانا جسم پر کس کر باندھ لیے۔ کوٹھڑی کی کھڑکی سے ہلکی ہلکی روشنی اندر داخل ہو رہی تھی۔ وینگ لینگ کو اس کا چہرہ اور جسم مدہم روشنی میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے بوڑھے باپ کی کھانسی کی آواز آ رہی تھی۔

''پہلے بابا کو گرم گرم پانی دو۔ اس کے پھیپھڑوں میں جمی ہوئی بلغم کو ابلتا ہوا پانی ہی دھو سکتا ہے۔''

''کیا گرم پانی میں چائے کی پتی نہیں پڑے گی۔'' او۔لین نے پوچھا۔ اس سیدھے سے سوال نے وینگ لینگ کو الجھن میں ڈال دیا، وہ کہنا چاہتا تھا: ''کیوں نہیں، کیا تم سمجھتی ہو ہم منگتے ہیں۔''

لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ جانتا تھا کہ ہیونگ کی بڑی حویلی میں ہر وقت سبز چائے کی پتی پیالیوں میں تیرتی نظر آتی ہو گی۔ وہاں شاید کوئی معمولی ملازمہ یا خادم بھی صرف گرم پانی نہیں پیتا ہو گا لیکن وہ اپنے باپ کی فطرت سے خوب واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کی بیوی نے پہلی ہی صبح اس کے باپ کو سبز چائے مہیا کر دی، تو وہ ناراض ہو جائے گا ان کی فضول خرچی پر۔ اس نے سوچا وہ اپنی غربت کو اپنی بیوی سے کب تک چھپائے گا، اس لیے اس نے جیسے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: ''نہیں نہیں، چائے پینے سے ان کی کھانسی کا دورہ تیز ہو جاتا ہے۔'' اور یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پر آرام سے لیٹا رہا اور آج اتنے برس کے بعد نہ اس نے آگ روشن کی اور نہ پانی گرم کیا۔

وینگ لینگ بستر پر لیٹے لیٹے عجیب و غریب باتیں سوچ رہا تھا۔ اسے مدت کے بعد فرصت نصیب ہوئی تھی۔ کبھی وہ اپنے کھیت کے متعلق سوچتا، جو متوقع بارش کے بعد لہلہانے لگے گا۔ بادلوں کے متعلق، جو آج کل میں برسنے والے تھے۔ کبھی اپنی بیوی کے متعلق، جس نے اس کے ساتھ رات گزاری تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، کیا اس کی بیوی نے اسے پسند کر لیا ہے؟ ''پسند۔'' شاید وہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا کہ اس کی بیوی کو جنسی آسودگی ملی ہے یا نہیں۔

اس کی بیوی کا چہرہ بالکل سپاٹ سا تھا۔ اس کے ہاتھ اور اس کے تلوے کھردرے تھے، لیکن باقی جسم مضبوط و توانا اور ملائم تھا۔ شاید اسے آج تک کسی نے چھوا نہ تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ جس بڑی حویلی میں کام کرتی تھی، اس کے مالک کے جوان بیٹوں نے اسے اس لیے اپنے بستر کی زینت نہ بنایا تھا یا اس کے جسم سے اس لیے حرارت حاصل نہ کی تھی کہ وہ خوبصورت نہ تھی۔ اس کے کولہے دراز، لیکن سڈول تھے جن پر عالمِ بے اختیاری میں وہ رات بھر ہاتھ پھیرتا رہا تھا۔

وہ انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ او۔لین کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیالہ تھا، جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ایک بھینی بھینی خوشبو نے اسے خیالوں سے چونکا دیا۔ بیوی نے پیالہ ونگ لنگ کی طرف بڑھایا اور آہستگی سے بولی: ''چائے پی لو۔'' ونگ لنگ نے بھاپ اگلتے ہوئے پیالے پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ چائے کی سبز پتیاں گرم پانی کی سطح پر تیر رہی تھیں۔ اس نے پیالہ جب ہاتھ میں لیا تو بیوی مجرمانہ انداز تخاطب سے کہنے لگی:

''میں نے بابا کو چائے نہیں دی، صرف گرم پانی دیا ہے۔ جو کچھ تم نے کہا تھا وہی کیا ہے لیکن۔۔۔ تمہارے لیے۔''

ونگ لنگ نے محسوس کیا کہ اس کی لم ڈھنگ چوڑی چکلی بیوی اس سے ڈرتی ہے۔ اس احساس نے اسے چونکا دیا اور وہ چائے کے لمبے گھونٹ بھرنے لگا۔

آئندہ چند مہینے اس نے بیوی پر کڑی نگرانی رکھنے میں گزارے۔ وہ لاشعوری طور پر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی کیسی ہے۔ وہ صبح سویرے اپنے کھیتوں کی طرف چلا جاتا۔ ہل اٹھاتے ہوئے اپنے بوڑھے بیل کو ساتھ لیے ہوئے۔ اس نے کھیتی میں گیہوں کا بیج ڈالا تھا۔ ایک طرف پیاز اور لہسن بویا تھا اور زمین کے کچھ حصے پر سبزیاں بھی اس لیے اگائی تھیں کہ اب وہ ایک بیوی کا شوہر تھا اور شاید کوئی بچہ بھی ہو۔ آج تک جب وہ کام سے تھکا ہارا واپس آتا تو اسے اپنا اور اپنے بوڑھے باپ کا کھانا خود تیار کرنا پڑتا تھا۔ وہ ٹیڑھی میڑھی چپاتیاں بناتا اور سبزی جس میں وہ کبھی کبھی گوشت بھی ڈالا کرتا تھا۔ آگ کی زیادتی سے چپاتی کبھی کبھی کچی رہ جاتی اور کبھی ملیدہ بن جاتی اور یہ کھانا وہ اور اس کا باپ مدتوں سے کھاتے چلے آئے تھے۔ اور اب یہ احساس بھی ختم ہو چکا تھا کہ اچھا اور برا کھانا کیا ہوتا ہے۔

لیکن، اب جب وہ محنت و مشقت کرنے کے بعد واپس آتا تو اس کے لیے کھانا تیار ہوتا۔ مٹی کے چولہے نئے لیپ کے بعد کچھ نئے نئے لگتے۔ فرش دھلا ہوا ہوتا۔ صحن میں جھاڑو صفائی سے کیا ہوتا کہ تنکا بھی نظر نہ آتا۔ اس کے اور اس کے بوڑھے باپ کے کپڑے الگنی پر لٹکے ہوئے ہوتے۔ اب ونگ لنگ کو چولہا سلگانے کے لیے سوکھی لکڑیاں بھی لانی نہ پڑتی۔ او۔لین ساتھ کے جنگل سے انہیں خود تلاش کر کے لے آتی یا وہ کچی سڑک پر کھڑی ہو کر بیلوں اور گھوڑوں کی لید کا انتظار کرتی جو راہ چلتے جانور سڑک پر گرا دیتے۔ وہ انہیں اکٹھا کرتی اپلے تھاپتی اور جو بچ جاتا اسے کھیت کی کھاد کے لیے جمع کر لیتی۔ وہ ہر کام اپنی مرضی سے کرتی۔ کسی نے اسے یہ سب کچھ کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ کسی حکم کے تحت یہ سب کچھ نہیں کرتی تھی۔ پھر جب اس کا تھکا ہارا شوہر آرام کرنے کے لئے صحن میں ہل چھوڑ کر اپنی کوٹھڑی میں چلا جاتا تو وہ بیل کے آگے چارہ جو لکڑیاں چننے کے وقت آس پاس کے کھیتوں سے جڑی بوٹیوں کی صورت میں روزانہ اکٹھا کرتی، اس کے سامنے ڈالتی۔

ہر دن دوسرے دن کی نقل ہوتا۔ وہ ہر روز وہی کام کرتی جو اس نے گزرے ہوئے دن میں کیا ہوتا۔ بوڑھے کی کھانسی کچھ کم ہو چکی تھی۔ وہ اسے سہارا دے کر صحن میں پڑے ہوئے تخت پوش پر بٹھا دیتی جہاں وہ سارا دن دھوپ ڈھلنے تک اونگھتا رہتا۔ یہ سب کرنے کے باوجود وہ ہمیشہ خاموش رہتی۔ ونگ لنگ اسے یہ سب کام کرتے ہوئے دیکھتا اور اس کے محنتی اور متناسب جسم کو، سپاٹ چہرے کو اور اس کی سہمی سہمی آنکھوں کو۔ رات کے وقت وہ اس کا تندرست جسم ٹٹولتا تو اپنی ساری تھکن بھول جاتا۔ وہ بستر پر بھی اتنی ہی مستعد کام کرنے والی ملازمہ دکھائی دیتی۔ رات کو سوتے وقت اس نے کبھی۔۔۔ اس سے نہ پوچھا تھا۔

''تم بولتے کیوں نہیں؟''

ونگ لنگ کئی مرتبہ اپنے کھیتوں میں ہل چلاتے وقت سوچتا میری بیوی کیسی مخلوق ہے۔ نہ روتی ہے نہ ہنستی ہے، کبھی درد کی شدت سے نہیں تڑپتی۔ یہ سوچتے وقت وہ ایک الجھن میں گرفتار ہو جاتا۔ اس نے کبھی اسے ہنسنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ گھر میں ہنسنے والی کوئی بات ہی نہ تھی۔ وہ صبح سے لے کر شام تک کام کرتی اور رات کے وقت ایک نئی مزدوری کے لئے جس کی تھکن فرحت بخش ہوتی ہے۔

ایک دن ونگ لنگ جب تھکا ہارا گھر واپس آیا تو اس کے ذہن پر۔۔۔ ایک بوجھ تھا۔ ان بالیوں کی طرح جو گندم کے بوجھ سے لد جاتی ہیں۔ کٹائی کے دن قریب آ رہے تھے۔ اس کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ ونگ لنگ نے محسوس کیا کہ اس کے شانوں کے قریب کوئی کھڑا ہے۔

''بہت تھک گئے ہو؟''

"نہیں۔"
"تو کیا سوچ رہے ہو؟"
"کچھ نہیں، فصل تیار ہے۔ اچھی فصل ہے۔ سوچتا ہوں بابا بیمار ہے۔ اکیلا فصل کیسے کاٹوں گا۔"
"تم اب اکیلے کب ہو۔"
"کیا کہہ رہی ہو۔"
"ٹھیک کہہ رہی ہوں، میں تمہارے ساتھ فصل کاٹوں گی۔"
وینگ لینگ نے یہ سن کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو بالکل سپاٹ تھا۔ دوسرے دن سے اس نے شوہر کے ساتھ کھیتوں میں کام شروع کر دیا۔ گھر واپس آ کر چولہا سلگاتی۔ اپنے شوہر کے بوڑھے باپ کے لیے شوربا تیار کرتی۔ سورج کی تمازت میں کام کرتے ہوئے اس کا چہرہ سنولا گیا تھا، کٹنے والی گندم کی طرح۔
ایک دن شام کے قریب جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ کام کر رہی تھی تو اس نے اچانک کدال ہاتھ سے رکھ دی اور دھیمے لہجے میں بولی: "میں گھر چلی ہوں۔"
"کیوں؟"
"شاید بچہ!" اور یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ جیسے کچھ سنبھالتی ہوئی گھر کی طرف بڑھی۔ وینگ لینگ یہ سن کر خاموش کھڑا رہا۔ وہ بہت دیر تک مبہوت کھڑا رہا۔ اس کی بیوی نے اتنی بڑی خبر اس طرح کہی تھی جیسے وہ روز کہا کرتی تھی: "چائے لاؤں"
"کھانا تیار ہے!"
"تم تھکے ہوئے کیوں ہو؟"
وینگ لینگ نے باپ کی کوٹھڑی میں پہنچ کر سرگوشی کے انداز میں اپنے باپ سے کہا:
"شاید بچہ ہونے والا ہے۔"
بوڑھے باپ نے خشک ہنسی ہنستے ہوئے کہا:
"اچھی خبر لے کر آئے ہو۔"
شام کو او۔لین حسب معمول باورچی خانے میں گئی اور جا کر کھانا پکانے لگی۔ بوڑھا باپ جس کی کمر جھک گئی تھی، ہاتھ سے کمر کو سہارا دے کر باورچی خانے میں پہنچا۔
"بیٹی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" یہ فقرہ رسمی طور پر بوڑھے باپ نے اچھالا تھا۔ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ دیگچی چولہے پر تھی جس میں سے ہلکی ہلکی بھاپ نکل رہی تھی۔ بوڑھا قریب پڑی ہوئی پیڑھی پر بچوں کی طرح سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنتیں بھوک کی شدت سے کلبلا رہی تھیں۔ وہ بھول گیا کہ اس کی بہو کے گھر بچہ ہونے والا ہے۔ بھوک نے اس سے تمام احساسات چھین لیے تھے۔

☆☆☆

جب پیدائش کا وقت قریب آیا، تو وینگ لینگ نے اپنی بیوی سے کہا:
"اس وقت کسی عورت کو تمہارے قریب ہونا چاہیے۔"
او۔لین نے جو دردِ زہ میں مبتلا تھی، نفی میں اپنے سر کو ہلایا۔ وینگ لینگ کا بوڑھا باپ سو چکا تھا۔ اس کوٹھڑی میں صرف وہ دو تھے۔ پاس رکھی ہوئی بوسیدہ تپائی پر کم تیل پڑا چراغ سسکیاں لے رہا تھا۔ او۔لین کے چوڑے دہانوں سے، جو موٹے لبوں میں گڈمڈ ہو گئے تھے، کوئی سسکی نہ ابھری، اس نے درد کو بھی اپنے سینے میں سمیٹ لیا تھا۔ وینگ لینگ شرمندگی کے احساس سے بولا:
"اس گاؤں میں تو کوئی بھی دائی نہیں۔"
"اس کی ضرورت بھی نہیں۔"
"پھر کیا ہوگا۔ میں نے کبھی کسی گائے کو بچھڑا دیتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔"
"تم فکر مت کرو۔" یہ کہتے کہتے رکی اور پھر اس کی آواز آنے لگی، جیسے وہ عالم خیال میں بول رہی ہو:
"اگر لڑکا پیدا ہوا تو میں اسے اپنی گود میں لے کر بڑی حویلی میں جاؤں گی اپنی پرانی مالکن کے پاس اور اس سے کہوں گی:
"میں بیٹا اپنی گود میں اٹھا کر لائی ہوں، مجھے انعام دو۔"
وینگ لینگ نے اتنے بہت سے الفاظ اپنی بیوی کے منہ سے کبھی نہ سنے تھے۔ وہ ہمیشہ خاموش رہی تھی لیکن یہ تمام جملے وہ بولتی چلی گئی۔ تیز تیز جیسے اس نے پہلے سے ازبر کر رکھے ہوں۔
اور جب بچہ پیدا ہوا تو او۔لین کی کوٹھڑی میں کوئی موجود نہ تھا۔ اس نے اپنے شوہر کو بھی کوٹھڑی سے چلے جانے کو کہا اور جب وہ باہر جانے لگا تو وہ آہستگی سے بولی:
"مجھے ایک سرکنڈا لا دو تیز سا، سرکنڈا۔ تاکہ میں بچے کو اپنے آپ سے جدا کر سکوں۔" وینگ لینگ نے حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اس کی بیوی دوسری عورتوں سے کتنی مختلف تھی جیسے وہ اس زمین کی مخلوق نہ تھی اور آسیبی طاقت رکھتی تھی۔
وہ گھر کے قریب جوہڑ کے کنارے پہنچا اور ایسا سرکنڈا تلاش کرنے لگا جس کی فرمائش اس کی بیوی نے کی تھی۔ جب وہ گھر لوٹا تو اس کی بیوی کے ماتھے پر ایک نئی قسم کا پسینہ تھا۔ اس نے اکثر بیوی کے ماتھے پر پسینہ دیکھا تھا، لیکن اس پسینے کے قطروں میں ایک نئی چمک تھی۔ سرکنڈا بیوی کو دے کر وہ باہر نکل گیا۔ جب وہ اپنے باپ کی کوٹھڑی میں پہنچا بوڑھا کھاٹ پر کہنی ٹیکے خلاؤں میں گھور رہا تھا۔

ونگ لینگ کو دیکھ کر ناصحانہ انداز میں بولا:
''فکر کی کوئی بات نہیں ابھی بہت دیر لگے گی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب تم پیدا ہوئے تو تمہاری ماں شام کو بستر پر لیٹی تھی۔ اور صبح کا سورج جب آنکھیں کھول رہا تھا تو میں نے تمہارے رونے کی آواز سنی۔ پہلا بچہ آسانی سے ماں کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔''

اور پھر اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا: ''کل شاید صبح تک میں دادا بن جاؤں اور تم باپ۔''

ونگ لینگ بوڑھے باپ کی یہ گفتگو توجہ سے نہیں سن رہا تھا اس کا ذہن دوسری کوٹھڑی کی طرف مبذول تھا۔ اس نے بے چینی سے کچھ عرصہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ گزارا اور پھر اس کے قدم کشاں کشاں اسے دوسری کوٹھڑی کی طرف لے چلے۔ دروازے کے قریب آ کر وہ رک گیا، تازہ خون کی ایک بھبک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ کوٹھڑی کے اندر اسے درد و کرب کی سسکیوں کی آواز سنائی دی جو تیز تر ہو گئی تھی۔ اس نے کوئی بلند چیخ نہ سنی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کوٹھڑی کے اندر ضرور جائے گا۔ وہ قدم اٹھانے کو تھا کہ نحیف کمزور اور ننھے رونے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔
(کیا یہ کسی مرد کی آواز ہے یا عورت کی) وہ بے چین ہو گیا اور بولا:
''میں اندر نہیں آتا، لیکن یہ تو بتاؤ، لڑکا ہوا ہے یا لڑکی۔''
او-لین کی کمزور آواز آئی۔ ''لڑکا''

یہ سن کر ونگ لینگ کے زرد چہرے پر سرخی سی آ گئی۔ (یہ سب کچھ کیسے اتنی جلدی ہو گیا، بابا تو کہتا تھا بہت دیر لگے گی) وہ تیزی سے پلٹا اور باپ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے فرط جوش سے بولا: ''بیٹا ہوا ہے بابا۔ میں باپ بن گیا ہوں اور تم دادا۔''
''دادا۔ واوا، وہ تو مجھے بننا ہی تھا۔'' دوسرے کمرے سے نوزائیدہ بچے کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔ وہ اس دنیا سے مانوس ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اسے پتہ چل گیا تھا کہ جس نئی جگہ میں وہ آیا ہے وہاں دکھ اور درد کے سوا کچھ نہیں اور اسے رونے کی عادت ڈال لینی چاہیے۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے کندھوں سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ وہ اطمینان سے فاتحانہ انداز میں جیسے اس نے کوئی مہم سر کر لی ہو، بیوی کے کمرے کی طرف چلا۔
کمرے کی فضا میں تازہ خون کی بدبو پھیلی ہوئی تھی، لیکن خون کا ایک دھبہ بھی اسے نظر نہ آیا۔ اس کی بیوی نے غالباً پانی سے اسے دھو دیا تھا۔ سرخ موم بتی کمرے کی مٹیالی فضا میں مدھم روشنی بکھیر رہی تھی اور اس کی بیوی کے پہلو میں ایک ننھی سی جان تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا، آہستہ سے جھکا اور بچے کے سلوٹ زدہ چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس کے چھوٹے سے سر پر سیاہ بال تھے۔ اس نے رونا چھوڑ دیا تھا اور آنکھیں میچے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور بیوی نے شوہر کی طرف۔ اس کی بیوی کے بال پسینے میں تر تھے اور آنکھوں کے نیچے بڑے بڑے حلقے موجود تھے۔ وہ تھک گئی تھی۔

نہ جانے کس جذبے کے تحت اس کے ہونٹوں سے الفاظ پھسلے: ''کل میں قصبے میں جاؤں گا، سرخ رنگ کی شکر لاؤں گا اور اسے پی کر تم تگڑی ہو جاؤ گی۔''
اور یہ کہہ کر اس نے پھر بچے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

☆☆☆

دوسرے دن او-لین حسب معمول بستر سے اٹھ کر گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ ونگ لینگ نے آج کئی دنوں کے بعد نئے کپڑے پہنے اور قصبے میں پہنچا۔ اس نے شکر، تین درجن انڈے اور کچھ سرخ رنگ خریدا۔ وہ رسم کے مطابق بیٹے کی پیدائش پر انڈوں کو سرخ رنگ دے کر ہمسایوں میں تقسیم کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ بساطی سے شکر اور انڈے خرید رہا تھا، تو بساطی نے مسکرا کر کہا:
''کہو بیٹا ہوا ہے''
''ہاں''

ونگ لینگ نے یہ کہتے ہوئے بڑا فخر محسوس کیا۔ بساطی دوسرے تیسرے دن یہ فقرہ کسی نہ کسی سے کہنے کا عادی تھا، لیکن ونگ لینگ کے لیے یہ نئی بات تھی۔ اس نے بساطی کو بڑا بھلا آدمی سمجھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ واقعی اچھا آدمی تھا محض اس لئے کہ اس نے مبارک باد دی تھی۔ گلی میں چلتے ہوئے وہ یہ محسوس کرتا تھا، جیسے وہ تمام لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی سمجھتا تھا۔ اس احساس سے وہ خوف محسوس کرنے لگا۔ اس دنیا میں زیادہ خوش قسمت ہونا بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ ایک دکان کے سامنے رک گیا اور اس نے موم بتیوں کا بڑا بنڈل خریدا۔

چند دنوں کے بعد او-لین پھر سے اپنے شوہر کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے لگی۔ اسی محنت و جانفشانی سے جس طرح اس کا شوہر کام کرتا تھا، بڑے بڑے چھاجوں میں گندم کے دانے تیز چلنے والی ہوا میں اچھالتی۔ بھس علیحدہ ہو جاتا اور گندم کے دانے سونے کے رنگ کی طرح چمکتے ہوئے زمین پر اکٹھے ہونے لگتے۔ کٹائی سے فارغ ہو کر دونوں نے غلہ اپنی کوٹھڑی میں جمع کرنا شروع کیا اور پھر اگلی فصل کے بونے کا وقت آ گیا۔ او-لین کھیتوں میں جاتے وقت اپنے ننھے بچے کو ساتھ لے جاتی۔ اس نے اپنی پشت پر ایک چادر باندھ کر ایک ننھا پنگھوڑا بنا لیا تھا۔ وہ تمام دن کام کرتی اور

بچہ اس کی پشت پر پڑے ہوئے پنگھوڑے میں ہلکورے لیتا رہتا۔

او۔لین کی بھورے رنگ کی چھاتیوں میں سے دودھ چشموں کی طرح پھوٹتا اور اس کا ننھا بچہ جب ایک پستان کے دودھ سے سیر ہو جاتا اور دوسرے پستان کی باری نہ آتی تو وہ سفید رنگ کا دودھ اپنے پستان سے زمین پر بہنے دیتی۔ دودھ کی اتنی بہتات تھی کہ اولین ایک فضول خرچ کی طرح جسے اپنی دولت کی زیادتی کا احساس ہوتا ہے، قیمتی دودھ کو ضائع ہوتے ہوئے دیکھ کر کوئی نقصان محسوس نہ کرتی۔

موسم سرما آ پہنچا تھا۔لیکن وہ بالکل فکرمند نہ تھے۔فصل نہایت اچھی ہوئی تھی اور کوٹھڑیاں دانوں سے بھری پڑی تھیں۔او۔لین نے چھت کے ساتھ لمبی لمبی رسیوں میں پیاز اور لہسن لٹکا رکھا تھا۔ بڑے بڑے مٹی کے کٹھلے، جنہیں او۔لین نے اپنی زمین کی مٹی سے گوندھ کر بنایا تھا، اناج سے بھرے ہوئے تھے۔

وینگ لینگ نے اپنے کھیت کی پیداوار کو ابھی اس لیے فروخت نہیں کیا تھا کہ فصل کی کٹائی کے دنوں میں قیمت کم ملتی ہے۔ وہ ایک سیانا کاشتکار تھا۔اسے فضول خرچی سے نفرت تھی۔اس نے اپنے گھرانے کے کھانے کا معیار بھی نہ بدلا تھا اور گھرانہ بھی تین افراد پر مشتمل تھا۔ وینگ لینگ اس کی بیوی، ایک بوڑھا باپ اور بچہ جس کے لیے اس کی ماں کی چھاتیاں ہی ضرورت سے زیادہ خوراک مہیا کر دیتی تھیں۔ وینگ لینگ کو سخت سردی پڑنے کا انتظار تھا جب اس کے دانوں اور اناج کی قیمت دو چند بلکہ سہ چند ہونے والی تھی۔

اس کا چچا ہمیشہ اپنی فصل کی کٹائی سے پہلے ہی آڑھتی کے پاس فروخت کر دیا کرتا تھا۔ وہ ہر وقت ضرورت مند رہتا تھا۔ اور اکثر وہ جلد رقم حاصل کرنے کے لیے کھڑی فصل ہی بیچ دیتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کی بیوی نکمی، پھوہڑ اور بہت موٹی تھی، کسی کام کاج کے نااہل۔ وہ چٹوری بھی تھی اور اس کے چچا کی تمام کمائی کچھ اس کے منہ کے ذائقے کی نظر ہو جاتی۔ اور کچھ وہ خود گاؤں کے جوئے خانے کی میز پر ہار دیتا۔اس کا چچا اس کی بیوی کچھ پس انداز کرنے کے عادی بھی نہ تھے۔ اس کے مقابلے میں او۔لین سبزیاں بھی خشک کر کے جمع کر لیتی اور تمام دن کی محنت و مشقت کے بعد ہر وقت کسی نہ کسی کام میں جتی رہتی۔اسے جیسے کام کرنے کا خبط تھا۔

موسم سرما نے شدت اختیار کر لی۔ وینگ لینگ آرام سے اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا جب برفانی ہوائیں شمال مشرق کی طرف چلنے لگیں، تیز کاٹنے والی ہوائیں۔اس دوران میں اس نے اپنے بچے کی ششماہی گزر جانے پر ضیافت کا انتظام کیا اور صرف ان لوگوں کو مدعو کیا جنہیں وہ مخلص اور اپنا ہمدرد سمجھتا تھا اور جو اس کی شادی کی ضیافت پر بھی آئے تھے۔ سب نے بچے کو دیکھ کر مبارکباد دی (گول مٹول چاند کا چہرہ رکھنے والا بچہ ہے۔خوش قسمت بچہ) یک زبان ہو کر سب نے کہا اور وینگ لینگ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔

اس کے صحن میں لگے ہوئے چھوٹے سے کھجور کے درخت نے بھی اپنے پتے جھاڑ دیئے اور ٹنڈ منڈ ہو گیا۔سردی کی شدت میں اور اضافہ ہو گیا۔اب اناج بیچنے کا وقت تھا۔ وینگ لینگ نے قصبہ کے آڑھتی سے اچھے داموں پر سودا کر لیا اور اناج کے عوض اسے اتنے چاندی کے سکے ملے جن کا ایک غریب کاشتکار ہونے کی حیثیت سے وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔اب اسے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ وہ اپنی پونجی کہاں محفوظ کرے۔ اس نے چاندی کے ان سکوں کا ذکر اپنی بیوی کے سوا کسی سے نہ کیا۔ آخر میاں بیوی سر جوڑ کر بیٹھے، مشورہ کیا اور او۔لین نے اپنی اندرونی کوٹھڑی جہاں وہ سویا کرتے تھے، کے فرش کو کھرپے سے کھودا اور چاندی کے سکے وہاں محفوظ کر کے زمین کو ہموار کر دیا۔ یہ کام کرنے کے بعد جوان کے لیے کوئی ایسا مشکل کام نہ تھا وہ اپنی عقل مندی اور دانائی سے محفوظ ہوئے اور مطمئن جیسے وہ کسی بہت بڑے خطرے سے نکل کر عافیت کی جگہ پر آ گئے ہوں۔

☆☆☆

نئے سال کی تقریبات میں وینگ لینگ اور اس کی بیوی نے فراخ دلی سے حصہ نہ لیا اور نہ مہمان ہی مدعو کئے۔خوشحالی نے وینگ لینگ کو محتاط کر دیا تھا۔وہ ڈرتا تھا کہ ہمسائے اور رشتہ دار اسے خوشحال دیکھ کر کہیں اس سے ادھار نہ مانگ لیں۔

او۔لین نے اس نئے سال کی تقریب پر ایک بات یاد رکھی۔ اس نے بڑی محنت اور چابکدستی سے ایک کیک تیار کیا۔مختلف قسم کی مٹھائیاں بنائیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے بچے کو لے کر اپنی باوقار مالکن کے پاس جائے۔ وہ جانتی تھی کہ مالکن بچے کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرے گی اور اسے انعام بھی ملے گا۔ وینگ لینگ بھی خوش تھا اور مسرور۔اس کی بیوی اس بڑی حویلی میں، جہاں ایک خدمت گار لونڈی کی طرح اس نے زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ گزارا تھا وہاں ایک ایسے کاشتکار کی بیوی کی حیثیت سے مہمان بن کر جائے گی جو کسی کا کارندہ یا مزارعہ نہیں۔اس نے اپنے لیے ایک لمبا سیاہ رنگ کا کوٹ سلوایا اور بیوی کے لئے بھی ایک نیا ساٹن کا جوڑا۔

نئے سال کے دوسرے دن جب انہیں مہمانوں سے فرصت ملی، وہ بہت سویرے جاگ پڑا۔او۔لین پہلے ہی بیدار ہو چکی تھی اور

منّے کو نہلا دھلا کر سرخ رنگ کے کپڑے جو خوش قسمتی کی علامت سمجھے جاتے ہیں پہنا چکی تھی۔ وینگ لینگ بھی بہت جلد تیار ہو گیا۔ او۔لین اپنے لمبے بالوں کو سکھا چکی تھی۔

بچہ اس کی گود میں اور کیک اور مٹھائی کی ٹوکری او۔لین نے اٹھا رکھی تھی۔ وہ آج ایک برس اور کچھ مہینوں کے بعد پھر بڑی حویلی کی طرف جا رہا تھا۔ اس وقت وہ اکیلا تھا اور آج وہ تین تھے۔

وینگ لینگ جب حویلی کے چوکیدار کے صدر دروازہ پر اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ پہنچا تو چوکیدار نے اپنے مسے پر لگے ہوئے خاردار بالوں کو مروڑا جیسے کوئی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہے۔

''آؤ وینگ لینگ! بیوی کو بھی ساتھ لائے ہو۔'' اور اس کی گود میں سوئے ہوئے بچے کو دیکھ کر بولا: ''شاید لڑکا ہے؟''

''ہاں''

''خوش قسمت ہو۔ گزرا ہوا برس معلوم ہوتا ہے تم پر کافی مہربان رہا ہے۔'' وہ حسد کی آگ میں بھنکنے لگا تھا۔ مصنوعی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر کہنے لگا:

''آؤ تم میری بدنصیب کوٹھڑی میں بیٹھو جو تمہارے لائق تو نہیں، میں تمہاری بیوی اور بچے کے آنے کی اطلاع بڑی جاگیردارنی کو پہنچاتا ہوں۔''

وینگ لینگ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش کھڑا اپنی بیوی کو جس نے ایک بغل میں بچہ اور دوسرے میں مٹھائی کی ٹوکری اٹھائی تھی، بڑی حویلی کی راہداری کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب چوکیدار کے ساتھ اس کی بیوی اور بچہ حویلی کے اندر چلے گئے تو وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چوکیدار کی کوٹھڑی کی طرف بڑھا جو آہنی دروازے کے قریب اس کی رہائش کے لیے بنی ہوئی تھی۔ اس کی چیچک زدہ بیوی نے اس کا مناسب الفاظ میں خیر مقدم کیا اور کچھ عرصہ کے بعد چائے کا پیالہ اس کے سامنے بوسیدہ میز پر رکھ دیا۔ اس نے بہت دیر تک چائے کو ہاتھ نہ لگایا۔ شاید اسے پتی کی خوشبو نہ آئی تھی۔ چائے اس وقت تک میز پر پڑی رہی جب تک چوکیدار واپس نہ پلٹا۔ اس کی بیوی اور بچہ بھی اس کے ساتھ تھے۔ بیوی کے اس قدر جلد واپس آ جانے پر وینگ لینگ کو کچھ حیرانی بھی ہوئی اور پشیمانی بھی۔ وہ اس کے چہرے کے خدوخال کو بغور پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی بیوی کے سپاٹ چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ اس لیے وہ اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ حویلی میں کیسا سلوک کیا گیا ہے۔ بچے کو گود میں لیتے ہوئے اس نے سرد مہری سے چوکیدار اور اس کی بیوی سے رخصت لی اور او۔لین کو لے کر کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔ آہنی دروازہ سے کچھ قدم نکل آنے کے بعد اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا: ''معلوم ہوتا ہے تمہاری پرانی مالکن نے تم سے اچھا سلوک نہیں کیا۔''

او۔لین خاموشی سے چلتی رہی اور کچھ دور چلنے کے بعد اس نے مہر سکوت توڑی:

''حویلی والوں کے حالات کچھ اچھے نہیں۔ جاگیردارنی نے وہی شال لے رکھی تھی، جو وہ پچھلے سال اوڑھا کرتی تھی۔ اس حویلی میں تو لونڈیاں اور باندیاں بھی پچھلے سال کے پرانے کپڑے پہنتی تھیں۔ میرے کپڑے تمام خادماؤں سے اچھے تھے۔'' اور یہ کہتے وقت او۔لین کی گردن تمکنت سے تن گئی اور بیوی کی گفتگو سن کر وینگ لینگ نے ایک گونہ اطمینان و فخر محسوس کیا۔

''کچھ معلوم ہوا کہ وہ غریب کیوں ہو گئے؟''

''میں پل بھر کے لیے باورچی خانہ میں گئی تھی، اس باورچی کو سلام کرنے کے لئے جس کے ماتحت مدتوں میں نے باورچی خانے میں کام کیا ہے۔'' وہ کہنے لگا:

''اس حویلی کا یہی حشر ہونا تھا، جس میں جاگیردارنی اور جاگیردار کے بیٹے ہر رات نئی داشتہ لاتے ہیں اور۔۔۔ ان سے تھک کر دوسری داشتاؤں کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ بڑی جاگیردارنی ہر روز اتنی افیون چکھتی ہے اور کھاتی ہے، جس سے میرے دونوں جوتے طلائی سکوں سے بھی بن سکتے ہیں۔''

''کیا وہ سچ کہہ رہا تھا؟''

''ہاں۔۔۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ جاگیردارنی نے اپنی تیسری بیٹی کی شادی ایک بڑے ہی رئیس کے بیٹے سے طے کی ہے، جس کے جہیز کی تیاری کے لئے ایک ریاست بھی بک سکتی ہے اور پھر باورچی کی بات چھوڑ دو۔ بڑی جاگیردارنی نے مجھے خود کہا ہے کہ وہ کچھ زمین فروخت کرنا چاہتی ہے۔ قصبے کے مضافات والی زمین۔ وہ زمین جہاں عمدہ قسم کے چاول ہوتے ہیں۔''

''کیا کیا۔۔۔؟ زمین بیچنا چاہتے ہیں۔ وہ زمین تو بہت زرخیز ہے۔ اگر ایسا ہی ہے، تو وہ واقعی غریب ہو گئے ہیں۔ زمین کون بیچتا ہے۔ زمین تو انسان کا گوشت بھی ہوتی ہے اور خون بھی۔'' کہتے ہوئے وہ کچھ رکا اور پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''میں وہ زمین خریدوں گا۔۔۔ ہم وہ زمین خریدیں گے۔''

''کیا کیا۔۔۔؟۔۔۔ زمین۔۔۔ اتنی قیمتی زمین۔ بڑی حویلی والوں سے۔''

''لیکن وہ زمین تو ہمارے گھر سے بہت دور ہے۔''

''تم نہیں جانتی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔'' وینگ لینگ نے

غصہ سے کہا۔ ''سکوں کو زمین میں دبائے رکھنے سے کیا بہتر نہیں کہ زمین خریدیں۔''

''لیکن چچا کی زمین کیوں نہیں خرید لیتے۔ وہ بیچنا بھی چاہتے ہیں اور وہ زمین ہمارے گھر کے قریب بھی ہے۔''

''نہیں۔۔۔۔ میں وہ زمین نہیں خریدوں گا۔ وہ ہر برس اس زمین کو کاشت کرتا ہے اس نے اس زمین سے ایک ایک دانہ کھینچ لیا ہے۔ بالکل اس گائے کی طرح جس کے تھنوں سے دودھ کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا جاتا ہے۔ اس زمین میں شور کے سوا اور کیا ہوگا جس میں کبھی کھاد نہ ڈالی گئی ہو۔ میں بڑی حویلی کی زمین ہی خریدوں گا۔ میں اپنی تمام جمع کی ہوئی پونجی بڑی جاگیردار کے منشی کے سامنے ڈھیر کر دوں گا۔''

او۔لین جو اس بڑے خاندان میں مدتوں تک ایک خادمہ کی حیثیت سے کام کرتی رہی تھی سوچنے لگی۔ ''وہ ایک ایسے شوہر کی بیوی ہے، جو اتنے بڑے گھرانے کی زمین خرید سکتا ہے۔'' اور یہ سوچتے وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''پچھلے برس تک میں بڑی حویلی میں نوکر رہی ہوں۔ ہم ان کی زمین کے مالک کیسے بن سکیں گے۔''

''ایسا ضرور ہوگا۔ ایسا ہو کر رہے گا۔''

☆☆☆

دوسرے دن وینگ لینگ نے مٹی کا فرش کھودا اور تمام جمع کی ہوئی نقدی احتیاط سے جیب میں رکھی۔ جب اس نے اس گڑھے کی طرف دیکھا، جو نقدی نکال لیے جانے کے بعد خالی ہو کر منہ پھاڑے، جیسے اس کی طرف دیکھ رہا تھا تو وقتی طور پر وہ کانپ سا گیا۔ ایک ہول سا اٹھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ نقدی پھر گڑھے کے خالی پیٹ میں جھونک دے، لیکن دل کڑا کر کے وہ بڑی حویلی کی طرف چلا۔

آہنی دروازے پر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ بڑا جاگیردار ابھی تک سو رہا ہے۔ ''ابھی تک۔''

''ہاں۔ وہ تین دن اور تین راتوں سے اپنی خوابگاہ میں ہیں ایک نئی داشتہ کے ساتھ جسے انہوں نے بھاری رقم دے کر خریدا ہے، لیکن یہ بتاؤ تم انہیں کیوں ملنے آئے ہو۔''

''میں نقدی لے کر آیا ہوں۔ چاندی اور سونے کے سکے۔''

یہ سن کر وینگ لینگ کو پھر اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا۔ وہ خریدار بن کر آیا تھا، لیکن اس سے بھکاریوں جیسا سلوک کیا جا رہا تھا۔

چوکیدار نے آہستگی سے کہا:

''زمین خریدنے آئے ہو تو منشی سے ملو۔ زمین خریدتے وقت رشوت دینی پڑے گی۔ وہ رقم لے کر کچھ زیادہ ہی رقبہ تمہارے نام کر دے گا۔ بڑے جاگیردار نے تو کبھی زمین کی شکل بھی نہیں دیکھی۔''

''ٹھیک ہے۔ مگر میں منشی سے کہاں مل سکوں گا؟''

''میری ہتھیلی پر چاندی کا سکہ رکھ دو۔ دولتمند ہو گئے ہو، تو بخشش دینے کی عادت بھی ڈالو۔''

وینگ لینگ نے چاندی کا ایک سکہ لالچی چوکیدار کی ہتھیلی پر جما دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ منشی سے زمین کا سودا مکمل کر چکا تھا۔

موسم سرما نرم و نازک ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آ پہنچا۔ وینگ لینگ کے وہ دن جو موسم سرما میں سورج کی تسلی بخش تمازت میں گزرا کرتے تھے اب سخت محنت و مشقت میں گزرنے لگے۔ اس کا بوڑھا باپ وینگ لینگ کے بچے کی نگہداشت کرتا اور اس کی بیوی او۔لین اپنے خاوند کے ساتھ کھیتوں میں ایک تندرست بیل کی طرح جتی رہتی۔ صبح کا سورج طلوع ہوتے وقت ان دونوں کو کھیتوں میں دیکھتا اور شام کو غروب ہونے والا سورج بھی۔

ایک دن وینگ لینگ نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی اس کے کھیت کی طرح ایک نئی فصل لانے والی ہے۔ یہ محسوس کرنے کے بعد اس کے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی اور اس کے اعصاب سکڑنے لگے۔ کیا اس کی بیوی پھر بچہ جنے گی؟ اس مہینے میں جب کھیت کو اس کی محنت کی ضرورت تھی۔ اس نے تھکے ہوئے خلجانی لہجے میں سوال کیا: ''تو تم پھر اس وقت بچہ جن رہی ہو، جب پکی ہوئی فصل کو تمہاری درانتی کی ضرورت ہے؟''

''میں ایک دو دن میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ پہلے بچے کے وقت مشکل ہوتی ہے۔ اب اتنی نہیں ہوگی۔''

یہ مختصر گفتگو، یہیں ختم ہو گئی۔ آنے والے دوسرے بچے کے متعلق اس سے زیادہ نہ کچھ کہا گیا اور نہ کچھ سنا گیا اور چلچلاتی دوپہر میں او۔لین کھرپا چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے پیٹ پر اپنا کھردرا ہاتھ جما دیا۔ وینگ لینگ اس سے ذرا ہٹ کر کھیت میں کام کر رہا تھا۔ اس نے ایک تھکی ہوئی بھرپور نظر اس پر ڈالی اور وہ کچھ کہے سنے بغیر اپنے آپ کو سنبھالا دیتی ہوئی اپنے مٹیالے گھر کی طرف چلی۔ وینگ لینگ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اسے ابھی کھیت میں بہت دیر تک کام کرنا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی محنت کش بیوی کیوں سورج ڈوبنے سے پہلے اسے کچھ کہے بغیر گھر کی طرف لوٹ رہی ہے۔

شام گئے وہ گھر کی طرف پلٹا اور جب وہ اپنے مٹیالے مٹی کی

اینٹوں کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کی بیوی اپنے بستر پر نڈھال لیٹی ہوئی تھی، وہ کھیتوں سے سارے دن کی محنت و مشقت کرنے کے بعد تھکا ہارا واپس آیا تھا۔ اس کی بیوی اس سے زیادہ محنت و مشقت کے بعد بستر پر نڈھال سی پڑی تھی۔ وینگ لینگ نے مدھم سے لہجے میں پوچھا: ''بیٹا ہے یا بیٹی؟''

او۔ لین نے آہستگی سے جواب دیا۔ ''بیٹا ہوا ہے۔''

اس کے بعد ان دونوں نے ایک دوسرے سے گفتگو نہ کی، لیکن وہ خوش تھا۔ ایک نئے محنتی مزدور نے جنم لیا تھا۔ وہ بڑا ہو کر اس کے دوش بدوش فصل کاٹا کرے گا۔ لیکن وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ اس نے دوسرے نوزائیدہ بیٹے کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس کی بیوی گول مٹول بچے کے ساتھ لیٹی رہی۔ یہ بچہ جسم میں پہلے بچے سے چھوٹا تھا۔ ایک دوسرا بیٹا۔ پھر ایک نیا بیٹا ہر برس۔

جھوٹی ظاہر داری، چونکا دینے والی خبر کی تشہیر اب کچھ ایسی ضروری نہ تھی۔ اس چھوٹے سے گھر میں جیسے خوشیاں ہر طرف سے داخل ہونے پر مجبور تھیں۔ ہر برس ایک نیا بیٹا۔ ایک نیا مزدور جو زمانے کی کروٹ بدلنے کے ساتھ باپ کے شانہ بشانہ کھیت میں کام کرے گا۔ بیل خریدنے کے لئے روپوں کی ضرورت ہوتی ہے، اسے محنت کش بیل اس کی بیوی مفت جن کر دے رہی تھی۔

وینگ لینگ نے اپنے سوختہ جسم کو ٹھنڈک پہنچانے کے بعد اپنے بوڑھے باپ کے کمرے کا رخ کیا۔

''بابا۔۔۔ تمہاری بہو نے تمہارے لیے ایک اور پوتے کو جنم دیا ہے۔ گھر چھوٹا ہے۔ اب تمہارا بڑا پوتا تمہارے ساتھ تمہاری کھاٹ پر سویا کرے گا۔''

وینگ لینگ کے بوڑھے باپ کے جھریاں پڑے چہرے پر خوشی کی لکیریں نمودار ہوئیں، لیکن وہ لکیریں جھریوں میں چھپ گئیں۔ بوڑھے کی تو ہمیشہ خواہش رہی تھی کہ اس کا پوتا اپنے گٹھیلے توانا گوشت سے اس کی برفیلی ہڈیاں گرمایا کرے۔

اس برس بھی بہت زیادہ اچھی فصل ہوئی، مہنگے داموں بکی اور وینگ لینگ نے خاص رقم سے جو زمین خریدی تھی اس نے ہن برسایا۔ وینگ لینگ کی وہ تجوری طلائی اور نقرئی سکوں سے بھرنے لگی، جو اس کی چارپائی کے نیچے دفن تھی۔ بڑی حویلی سے اس نے جو زمین خریدی تھی گیلی اور زرخیز تھی اور اس میں فصل جنگلی گھاس کی طرح اگتی تھی۔ گاؤں والوں سے یہ بات اب ڈھکی چھپی نہ تھی کہ وینگ لینگ اب خاصا بڑا زمیندار ہو گیا ہے۔ وہ اسے گاؤں کا نمبردار بنانے کے متعلق سوچنے لگے۔

☆☆☆

وینگ لینگ کا بوڑھا چچا سر درد بننے لگا، جس کی اسے توقع تھی۔ اس کا چچا اس کے باپ کا چھوٹا بھائی تھا اور معذوری، مجبوری اور بیکاری کی حالت میں۔ بہرحال وینگ لینگ کو ہی اس کی کفالت کرنی تھی۔ جب تک وینگ لینگ اور اس کا باپ غریب تھے، نان شبینہ کے محتاج، تو ان کا بوڑھا چچا اپنی نیم بنجر زمین پر کبھی کبھی مانگے تانگے کا بیل لے کر ہل چلایا کرتا۔ بالکل اسی طرح وہ اپنی سخت اور بنجر زمین کو کھجاتا جیسے ایک گنجا اپنی چندیا کھجاتا ہے۔ اس معمولی محنت کے بعد بیوی اور سات نکمے بچوں کے پیٹ کی آگ بجھاتا، لیکن اس کا پورا گھرانا اس بات کا عادی تھا کہ جیسے ہی تھوڑا بہت اناج زمین ان کے لیے اگاتی وہ سب کے سب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے۔ یہاں تک کہ کاہل اور سست بچے منہ کے دہانوں پر جمی ہوئی رال کے نشان بھی صاف نہ کرتے۔

یہ شرمناک بات تھی کہ چچا کی لڑکیاں جوانی کی دہلیز پر کھڑی تھیں اور دو ایک بیاہے جانے کے قابل ہو گئی تھیں، لیکن وہ گاؤں کی گلیوں میں ننگے سر لنڈوروں کی طرح گھومتی اور کبھی مردوں سے بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتیں۔ ایک دن جب وینگ لینگ نے اپنی چچازاد بہن کو ایک پرائے غیر شخص سے گلی میں بات کرتے دیکھا، تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے کھیتوں پر جانے کی بجائے چچا کے گھر کا رخ کیا اور صحن میں پہنچتے ہی چچی کو مخاطب کیا:

''اب کون کرے گا ایسی لڑکی سے شادی جسے ہر شخص آسانی سے مل سکتا ہے۔ آج اس کی شادی کو تین چار برس ہو جانے چاہئیں تھے۔ آج میں نے ایک لفنگے کو اس کا بازو پکڑتے ہوئے دیکھا، اس کے منہ پر چانٹا مارنے کی بجائے یہ بیباکی سے ہنسنے لگی۔''

اس کی چچی کے سارے جسم میں سے صرف ایک ہی عضو جلد حرکت میں آ سکتا تھا اور وہ اس کی زبان تھی۔ چچی کرختگی سے بولی:

''ہاں۔۔۔ کون سا منہ لے کر یہاں آئے ہو تمہیں پتہ نہیں کہ گھر میں فاقہ ہے، کون اس کے جہیز کے لئے روپے دے گا۔ کون اس کی بارات رخصت کرے گا۔ تم سب کچھ اس لیے بک رہے ہو کہ تمہارے پاس بہت سی زمین ہے اور ہر نئی فصل کے بعد نئی زمین خریدتے جا رہے ہو۔ کاش میں تمہارے بدنصیب چچا کی دکھیا بیوی نہ ہوتی۔ تمہارے چچا کی قسمت میں بدنصیبی اور بدبختی کے سوا کچھ نہیں لکھا جیسے وہ آسمان کا مجرم ہو۔ دوسرے کاشتکار اپنی زمین سے غلہ اگاتے ہیں اور اس کی زمین میں بیج دم توڑ دیتا ہے اور صرف سرکنڈے نکلتے ہیں۔''

یہ کہنے کے بعد بڑھیا کی آواز تیز ہو گئی اور آنسوؤں کی رفتار

تیز تر۔ وہ اپنے بال بے تحاشا نوچنے لگی اور ہتھیلیوں سے اپنا منہ پیٹنے لگی۔

"کاش تم جانتے کہ لوگوں کے مٹی کے گھر برسوں سے زمین پر کھڑے ہیں۔ نہ چنائی کرتے ہیں نہ لپائی اور ہمارے اس منحوس گھر کے دروازے، درو دیوار ہر بارش اور آنے والے طوفان کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے زمین پر آ گرتے ہیں۔"

(پھر یہ کہتے ہوئے) وینگ لینگ کی چچی اپنی تھل تھل کرتی چھاتیاں پیٹنے لگی۔ وینگ لینگ ساکت و جامد کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور پھر اس نے وہ کچھ کہنے کی کوشش کی جسے کہے بغیر چارہ نہ تھا:

"میں تم پر پھبتی کسنے یا نصیحت کرنے یہاں نہیں آیا، صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ لڑکیوں کو اس وقت گھر سے رخصت کرنا اچھا ہوتا ہے جب تک وہ کنواری ہوں۔" اور یہ کہہ کر وہ مزید کچھ کہے بغیر صحن چھوڑ گیا۔ صحن سے باہر آنے کے بعد اس نے سوچا کہ اس نے خود یہ مصیبت مول لی۔ وہ اس فصل کے بعد بڑی حویلی والوں سے کچھ اور زمین خریدنا چاہتا تھا اور اپنے گھر کے صحن میں ایک کوٹھڑی کا اضافہ کرنا چاہتا تھا، لیکن اس نے خود وہاں جا کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی، لیکن وہ مجبور ہو گیا تھا۔ یہ برداشت نہیں کر سکتا ۔۔۔ کہ اس کے خاندان کی کوئی لڑکی کھلے بندوں گاؤں کی ایک گلی میں پرائے آدمی سے بات کرے۔ وہ اسے بازو سے پکڑے۔ وہ کھلکھلا کر ہنسے۔

دوسرے دن وینگ لینگ کا چچا تڑکے ہی اس کھیت میں، جہاں وینگ لینگ کام میں مصروف تھا آ پہنچا۔ او۔ لین اس وقت وہاں نہ تھی۔ دوسرے بچے کو پیدا ہوئے دس مہینے گزر چکے تھے اور اب تیسرا بچہ آنے والا تھا۔ اس مرتبہ او۔ لین کی صحت بھی کچھ ٹھیک نہ رہی تھی، وہ اپنے دو بچوں کی پیدائش سے پہلے ہٹی کٹی، چاق چوبند شوہر کے شانہ بشانہ کام کرتی، لیکن اس مرتبہ وہ ہر برس کاشت کی جانے والی زمین کی طرح کمزور اور ناتواں تھی۔

وینگ لینگ کے چچا کے جسم پر برائے نام لباس تھا۔ تیز ہوا میں اس کے جسم سے لٹکے ہوئے چیتھڑے کٹے ہوئے جھنڈے کی طرح لہرا رہے تھے۔ وہ وینگ لینگ کے بالکل قریب پہنچ گیا اور کچھ دیر پگڈنڈی پر کھڑا رہا۔ وینگ لینگ کام میں مصروف رہا۔ چچا نے آہستگی سے کہنا شروع کیا:

"میں بد قسمت ہوں، میں کئی بیج دھرتی پر بکھیرتا ہوں، کوئی بیج پھوٹتا ہے اور وہ بھی جب پودا بنتا ہے تو کملا ہوا۔ اس برس شاید فصل کے بعد ہمیں اپنے کھیت کا اناج بھی میسر نہ آئے اور ہمیں مانگ تانگ کر گزارہ کرنا پڑے۔ اپنے پرایوں سے ادھار لینا پڑے۔"

وینگ لینگ نے اپنے سینے پر پتھر کی سل رکھ لی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا چچا اس سے مانگنے کے لیے آیا ہے جسے کہ وہ اپنا حق سمجھتا ہے۔ اس نے کھرپا زمین میں گاڑ دیا۔ (چچا کی آواز آئی)

"میری بیوی نے مجھے بہت کچھ کہا ہے لیکن تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے۔ جھوٹ بولنے کے لئے مشق، مہارت اور تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سچ، مشق، مہارت، تجربے کا محتاج نہیں ہوتا۔ تم اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ سیانے ہو، میری بیٹی ۔۔۔۔ تمہاری بہن کی شادی ہو جانی چاہیے تھی۔ اس کی عمر اب سترہ برس ہے۔ اسے اس عمر تک ماں بن جانا چاہیے تھا۔ میں ڈرتا ہوں وہ کوئی ایسا بچہ نہ جن دے جو ۔۔۔۔ جو ۔۔۔۔ حرامی کہلائے۔ تمہارے باپ کے بھائی کی بیٹی کا حرامی بچہ جو پیدا ہو کر خاندان کے لئے ایک بہت بڑی گالی بن جائے۔"

وینگ لینگ نے یہ سنا، وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا: "گھر کے تمام کھلنے والے دروازے بند کر دو۔ تم اسے ایک گھریلو لڑکی بناؤ، جو صحن میں جھاڑو دے۔ چولہے چوکے کا انتظام سنبھالے۔" لیکن وہ یہ سب کچھ نہ کہہ سکا۔ بوڑھے چچا نے اسے خاموش دیکھا تو اس کی آواز آئی:

"اگر قسمت مجھ سے منہ نہ پھیرتی اور میں ایک ایسی بیوی کا شوہر نہ ہوتا جو لڑکی کے بعد لڑکی بستر پر دے پھینکتی ہے اور ایک بیٹا پیدا کرتی ہے، تو وہ بھی زنخہ۔ تو میں بھی آج تمہاری طرح امیر ہوتا۔ اگر قسمت مہربان ہوتی تو میں تمہارے پاس مانگنے کے لیے نہ آتا۔ تم مجھ سے کچھ لینے کے لیے دروازے پر کھڑے ہوتے۔ اگر تمہاری بیٹیاں ہوتیں، تو ان کے لئے اچھے شوہر تلاش کرتا۔ تمہارا مکان گر جاتا تو اسے بنواتا۔ تمہارے گھر والوں کو نیند نہ آتی تو میں جاگ رہا ہوتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہمارا خون ایک ہے، ہم ایک دوسرے کے دکھ درد نہیں دیکھ سکتے۔"

وینگ لینگ تمام بات سمجھ گیا اور موضوع سمیٹنے کے لئے موزوں الفاظ تلاش کرنے لگا:

"چچا، تم جانتے ہو، میں امیر آدمی نہیں، یہ بھی جانتے ہو ایک بیوی دو بچے ہیں۔ تیسرا منہ کھولے چلا آ رہا ہے۔ ایک بوڑھا باپ ہے تمہارا بھائی جو کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس کے پوپلے منہ میں کوئی دانت نہیں، لیکن اس کے پیٹ کو دانتوں کی مدد کی ضرورت نہیں۔"

اس پر بوڑھے چچا نے جھنجھلا کر کہا: "تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم امیر ہو، تم نے بڑی حویلی والوں سے منہ مانگی قیمت دے کر زمین خریدی ہے۔ قیمتی زمین جو کوئی دوسرا نہیں خرید سکا۔"

وینگ لینگ نے غصے سے جواب دیا: "میں امیر نہیں، لیکن

میرے پاس کچھ چاندی کے سکے ضرور موجود ہیں اس لیے کہ میں کام کرتا ہوں، میری بیوی کام کرتی ہے اور میں تمہاری طرح جوئے کی میز پر بیٹھ کر افیون کے نشے میں اپنا اناج اونے پونے نہیں بیچتا۔"

خون کے شرارے بوڑھے چچا کے زرد گالوں سے پھوٹنے لگے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے اپنے کرخت سوکھے ہوئے ہاتھوں سے وینگ لینگ کے منہ پر کئی تھپڑ مارے۔

"تم اپنے چچا سے یہ سب کچھ کہہ رہے ہو، کیا خاندان کے بڑوں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے؟ کیا ہمارا اخلاق یہ نہیں کہ کوئی چھوٹا اپنے بڑے کو اس کے کئے ہوئے جرم اور گناہ بھی یاد نہیں دلا سکتا؟"

وینگ لینگ خاموش کھڑا رہا، جیسے اسے اپنی غلطی پر ندامت ہو، لیکن اس کے دل میں اپنے حریص اور نکمے چچا کے لئے نفرت کے سوا کچھ نہ تھا۔

"میں تمام گاؤں والوں کو اکٹھا کروں گا۔ کل تم نے گھر میں آ کر برا بھلا کہا کہ میری کوئی بیٹی کنواری نہیں۔ وہ بدکار ہے۔ آج تم نے میرے بڑھاپے کی پروا نہ کرتے ہوئے میری بے عزتی کی۔ میری کوئی بھی بیٹی کنواری نہیں۔ وینگ لینگ کی کوئی بھی چچازاد بہن کنواری نہیں۔"

"آخر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" وینگ لینگ نے زچ ہو کر پوچھا۔ وہ اس جنونی بڈھے سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بڈھا ہذیانی کیفیت میں کیا کچھ بک سکتا ہے۔ آخر اس کی جوان بیٹیاں وینگ لینگ کی چچازاد بہنیں تھیں۔ ان کے خاندان کا خون ان کی رگوں میں گردش کر رہا تھا۔

یہ سن کر بڈھے کا لہجہ بدل گیا۔ اس کے چہرے پر ایک مٹی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی:

"میں جانتا ہوں تم نیک بچے ہو۔ سنو میری ہتھیلی پر کچھ چاندی کے سکے رکھ دو، یہی دس پندرہ! پھر دیکھو میں تمہاری بہن کے ہاتھ کتنی جلدی پیلے کر دیتا ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ پھل کو پکنے کے بعد بہت جلد درخت سے اتار لینا چاہیے ورنہ وہ گل سڑ کر نہ جانے کس راہی کی جھولی میں آ گرے۔"

"آؤ میرے ساتھ! میں چاندی کے سکے امیر زادوں کی طرح اپنی جیب میں تو نہیں لیے پھرتا۔"

یہ کہہ کر وہ آہستگی سے گھر کی طرف چلنے لگا۔ اس کا چچا سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ فصل کے بعد وہ کچھ اور زمین کا سودا کر لے گا، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ چاندی کے سکے کچھ دیر کے بعد کسی دیہاتی جوا خانے کی بوسیدہ میز پر داؤ پر لگے ہوں گے۔

وینگ لینگ سر جھکائے صحن میں داخل ہوا۔ اس کے دونوں بچے ننگے جسم میں کھیل رہے تھے۔ اس کے چچا نے بچوں کو دیکھ کر انہیں چمکارا۔ جب وہ قریب آئے تو اس نے اپنی بوسیدہ جیب سے ٹٹول کر دھات کے دو چھوٹے سکے نکالے۔ اس نے گول مٹول بچوں کو سینے سے لگایا اور اپنے ناک کی چونچ پیار سے ان کے نرم و نازک جسم سے رگڑنے لگا۔

"اوہ تم کتنے پیارے بچے ہو۔ مقدس دیوتا تمہیں سلامت رکھے۔"

وینگ لینگ رکے بغیر کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ کوٹھڑی تاریک تھی۔ شاید اس کی بیوی نے دروازوں پر ٹاٹ کھینچ دیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹی تھی۔ وینگ لینگ کو تازہ گرم خون کی بھبکی سی محسوس ہوئی۔ وہ تیزی سے بولا: "کیا وقت آ گیا ہے؟"

بستر کے وسط سے بیوی کی کمزور آواز آئی:

"آنے والا وقت گذر بھی گیا۔ لڑکی ہوئی ہے۔"

"لڑکی۔۔۔۔" وہ سوچنے لگا۔

"یہ منحوس لڑکیاں جن میں سے ایک نے میرے چچا کے گھر میں قیامت بپا کر دی ہے۔ کیا ایک ایسی ہی لڑکی نے اس کے گھر میں بھی جنم لیا ہے؟" کچھ کہے بغیر وہ کوٹھڑی کی دیوار کے قریب پہنچا اور چارپائی کے نیچے کچھ دیر ہاتھ سے کچھ ٹٹولنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر اس نے زمین میں گڑے ہوئے آبخورے میں سے کچھ سکے انگلیوں سے گن کر نکالے۔

"تم یہ روپے کیوں نکال رہے ہو؟ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"تمہارے لیے نہیں، میں یہ رقم اپنے چچا کو ادھار دینے پر مجبور ہوں۔"

"میرا خیال ہے اسے ادھار نہ کہو۔ اس گھر میں ادھار نام کی کوئی چیز نہیں، صرف دینا کہو" (بیوی کی نقاہت آمیز آواز آئی)

"ہاں میں جانتا ہوں۔" (وینگ لینگ نے تلخی سے کہا)۔

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اپنا گوشت کاٹ کر اسے دے رہا ہوں اس لیے کہ ہمارا خون ایک ہے۔"

اور یہ کہہ کر وینگ لینگ غصے اور تیزی سے گھر سے باہر نکلا۔ چاندی کے سکے اس نے بڈھے کی ہتھیلی پر جما دیئے اور کچھ کہے بغیر واپس اپنے کھیتوں کی طرف لوٹ گیا۔ کھیت میں آ کر اس نے پھاوڑا اٹھایا اور اسی شدت کے ساتھ زمین پر برسانے لگا، جیسے اس

کی بنیادیں ہلا دے گا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک خیال گردش کر رہا تھا۔ ابھی اس کا بچا چاندی کے وہ سکے بے پروائی سے کسی جوئے کی میز پر ہار دے گا۔ وہ قیمتی سکے، جو اس نے زمین دھرتی ماں کے سینے سے دفینے کی شکل میں نہیں فصل کی شکل میں حاصل کئے تھے۔

اب شام ہو چکی تھی۔ وینگ لینگ تھک چکا تھا۔ غصہ مدہم ہو چکا تھا۔ اسے کمر سیدھی کرنے کا خیال آیا، بھوک بھی ستا رہی تھی۔ وہ اپنی نوزائیدہ بچی کے متعلق سوچنے لگا۔ بیٹی کے متعلق جس کی ابتدا اس کے گھر میں بھی ہو گئی تھی۔ بیٹیاں جو اس لیے پالی پوسی جاتی ہیں کہ دوسروں کے حوالے کر دی جائیں۔ بدنامی ہو تو ماں باپ کی۔ آرام پائیں تو بیگانے۔ غصے میں اس نے بچی کا منہ بھی نہ دیکھا تھا۔ غم کے بادل چھا چکے تھے۔ کوؤں کی لمبی ڈار اس کے سر پر سے گزری اور دور خلاؤں میں چھوٹے چھوٹے سیاہ دھبوں کی طرح غائب ہو گئی۔ وہ توہم پرست تھا۔ کوؤں کا سر سے گزرنا اچھی علامت نہ تھی۔

☆☆☆

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خدا جب انسانوں پر ناراض ہو جاتا ہے، تو پھر اپنے قہر پر نظر ثانی نہیں کرتا۔ سوکھی ہوئی پیاسی زمین اپنی پیاس بجھا کر سوندھی خوشبو فضا میں بکھیرنے لگتی تھی، لیکن اس مرتبہ کوئی بادل نہ آیا اور رات کے وقت نیلے آسمان پر کوئی تارا بادل کی اوٹ میں نہ چھپ سکا۔ وہ چمکتے ہوئے تارے کتنے ظالم اور بے رحم تھے۔ وہ سوکھی اور پیاسی زمین کو اپنی بے رحم آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ زمین بانجھ عورت کی طرح ان کا منہ تکتی رہی۔

وینگ لینگ نے دھرتی پر سخت محنت و مشقت کی تھی۔ گیہوں کے کچھ پودے بھی زمین سے سر نکالنے لگے تھے کہ مرجھانے لگے۔ آسمان سے ایک بوند بھی نہ ٹپکی، زمین کی جھولی خالی رہ کر جگہ جگہ سے پھٹنے لگی۔ اس پر بڑی بڑی دراڑیں پڑ گئیں۔ دھرتی ماں کا سینہ کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ وہ ایک ایسی ماں کی طرح تھی جس کے تھنوں میں دودھ کی آخری بوند بھی سوکھ جائے اور بچے کے منہ میں ڈالنے کے لئے اس کے پاس دودھ کا آخری قطرہ بھی نہ رہے۔ آسمان سے ناامید ہو کر وینگ لینگ نے قریبی جوہڑ سے پانی لانے کی ٹھانی۔ بڑے بڑے چوبی ڈول اس نے ایک بانس کے دونوں سروں پر باندھ لیے اور سوکھی ہوئی فصل تک پانی پہنچانے لگا۔ اس کے کندھوں پر بوجھ اٹھانے کے سبب بڑے سخت گٹے پڑ گئے۔ اس نے سوچا کہ جب تک بارش نہیں ہوتی وہ عارضی طور پر اپنی اس بے زبان اولاد کو محنت اور مشقت کے بل بوتے پر تازہ دم رکھ سکے گا، لیکن ایک ستم رسیدہ کاشت کار کی خام خیالی تھی۔ آخر جوہڑ میں بھی پانی سوکھنے لگا اور جوہڑ پانی اور مٹی سے مل کر ملیدہ سا بن گیا۔ ان کی زمینوں کے قریب ایک کنواں تھا، جس کا پانی بھی پاتال میں چلا گیا۔ شاید زمین کے نیچے رہنے والی مخلوق کو اس کی ضرورت تھی۔

ایک دن او۔لین نے اپنے شوہر سے کہا: ''پانی ختم ہو رہا ہے۔ کیا تم بچوں اور بوڑھے باپ کی پیاس چھین کر فصل اگانا چاہتے ہو؟''

یہ سن کر وینگ لینگ کے ماتھے پر غصے کی لکیریں ابھریں، اس کی آنکھوں میں مجبوری کے آنسو ابل پڑے۔ اس کی آواز وفور جذبات سے رندھ گئی۔ فصل نہ ہوئی تو ہم سب مر جائیں گے۔ زمین بھوکی رہی، تو ہم بھوکے رہیں گے، وہ سچ کہہ رہا تھا۔ ماں بھوکی ہو۔ اس کے تھن سوکھے ہوئے ہوں، تو وہ بچے کو دودھ کیسے دے سکتی ہے۔ او۔لین خاموش ہو گئی اور آنے والے دو ہفتوں تک وینگ لینگ اس تھوڑی سی زمین کے حصے کی طرف متوجہ ہو گیا، جہاں اسے کچھ دانے ملنے کی امید تھی بالکل اسی طرح جس طرح ماں باپ نکمی اولاد کا خیال چھوڑ کر کماؤ پوت کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس پریشانی اور بدحالی کے باوجود وینگ لینگ کے ذہن میں ایک خیال زہریلے بچھو کی طرح اپنی زہریلی ٹانگیں گاڑے ہوئے تھا۔ اس بدحالی کے زمانے میں زمین سستے داموں مل سکتی تھی۔ اس نے اپنی تھوڑی سی فصل جو اس کی محنت سے بار آور ہوئی تھی مہنگے داموں آڑھتی کے پاس فروخت کر دی۔ رقم کو اس نے شلوکے میں ڈالا اور بڑی حویلی والے، جو بھوک سے پچھاڑ کھا چکے تھے، روپے کی کیابی نے ان کے عیش کو درہم برہم کر دیا تھا، وہ روپے کے حصول کے لیے زمین تو کیا اپنی روح بھی بیچنے کے لیے تیار تھے۔ بڑی حویلی کا بوڑھا مالک اپنی عادت نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے نشہ چاہیے اور ایک جوان گوشت جسے وہ نوچ سکے۔ اس کے بوڑھے ناخن جوان لڑکی کا خون جذب کر کے اس کی کمی ہوئی رگوں میں حرارت پیدا کر سکیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جاگیردار کی بوڑھی بیوی افیون کی رسیا ہے اور کئی روز تک نشہ کرنے کی وجہ سے وہ ایک زور آور بوڑھی آدم خور شیرنی بن چکی ہے۔

اب معلوم ہو چکا تھا کہ اس بڑے گھرانے کو زمین کی نہیں تعیش کی ضرورت ہے، جس کی وہ چسکی لے سکے۔ حویلی کے بوڑھے جاگیردار کو ایک نوخیز کلی کی ضرورت ہے، جس کا رس وہ ایک بھنورے کی طرح چوس سکے۔ اسے اب تندرست پکی عمر کی عورتوں کی ضرورت اس لیے نہیں کہ وہ اس کی کمزوری پر نہ ہنسیں اور اپنی شہوانی خواہشات کو نامکمل پا کر بھی اسے بستر پر سے نہ دھکیلیں۔

جاگیردار کو ایسی نوخیز جوانیوں کی ضرورت تھی جو دبلی پتلی، گرم اور تشنہ ہوں، انہیں تھوڑی سی برانگیختگی مطمئن کر دے اور بستر کے باہر اس کی نااہلیت کا ڈھنڈورا نہ پیٹیں۔
جاگیردار کی بیوی بوڑھی تھی، افیون کھاتی تھی اور اس کے جسم پر گوشت کم اور رگیں زیادہ تھیں۔ وہ جاگیردار کے ساتھ بستر پر عشق پیچاں کی بیل کی طرح لپٹ جاتی اور جاگیردار کو اس کا منہ بند کرنے کے لیے اس کی ہر خواہش پوری کرنا پڑتی تھی۔
بارش زمین کے کسی حصے پر بھی نہ ہوئی تھی۔ آسمان کے اس حصے کے نیچے بڑی حویلی والے بھی موجود تھے۔ فاقہ مست اور بدحال، حیوانی خواہشات اور جبلی عادات سے مجبور۔ اس بدحالی کے زمانے میں وینگ لینگ بڑی حویلی میں پہنچا اور اس نے ایک مرتبہ پھر حویلی کے مختارِ خاص سے کہا: "میرے پاس چاندی ہے۔"
یہ بالکل ایسے ہی تھا، جیسے کوئی جاں بلب بھوکے سے کہا: "میرے پاس روٹی ہے۔"
مختارِ خاص نے وینگ لینگ کی بات سمجھ لی اور بہت جلد وہ دونوں ایک دوسرے کے کان میں کچھ کہنے لگے۔ سرگوشی کا یہ عالم زیادہ دیر قائم نہ رہا اور اس نے بڑی حویلی والوں سے زمین کا ایک بڑا حصہ اپنی ساری پس انداز پونجی دے کر خرید لیا۔ پہلی مرتبہ اس نے نئی زمین خریدنے کے بعد خرید و فروخت کا یہ راز اپنی بیوی او۔ لین سے بھی پوشیدہ رکھا۔
کئی ہفتے بیت گئے۔ بارش نہ ہوئی۔ کبھی کبھار بادل آتے۔ گاؤں کے کاشت کاروں کی نظریں ان پر جم جاتیں اور شاید بادل ایک دوسرے سے مشورہ کر کے کسی اور جگہ برسنے کا فیصلہ کر کے رینگ جاتے۔ کبھی بادل جمع ہو کر گھٹا بننے لگتے تو تیز ہوا ان ہلکے ہلکے بادلوں کو اپنے پروں پر اٹھا کر کہیں دور اڑ جاتی۔
آسمان خالی، بنجر اور ویران رہا اور چاند بادلوں کے نہ ہونے کی وجہ سے کھلی زمین پر جو بے برگ و گیاہ تھی، سورج کی طرح چمکتا رہا۔
وینگ لینگ جیسے محنتی کسان کو اس مرتبہ زمین نے کچھ اگل کر نہ دیا۔ کھیتی خشک رہی۔ ایک دانہ بھی نہ اگ سکا۔ آسمان نامہربان تھا، زمین کرخت اور بنجر۔ کھیتوں پر ویرانی چھانے لگی۔ درخت پانی نہ ملنے کی وجہ سے اپنے پتے جھاڑنے لگے۔ "ان لکڑیوں کو نہ جلاؤ نہ چھال کو۔ شاید ہمیں درختوں کی چھال کھانی پڑے۔ گھر کے سب لوگ "فاقہ" کو جان چکے تھے۔ سوائے نوزائیدہ ننھی سی جان کے، جسے بھوک کا کوئی احساس نہ تھا۔ وہ اپنی ماں کے لٹکے ہوئے تندرست پستان چوس سکتی تھی۔ ایک ایسے پستان جس کے آخری حصہ میں سیاہ سرخ ابھار ہوئے تھے، جیسے سیاہ سرخ پتھروں سے پانی نچڑ نچڑ کر رس رہا ہو۔
انہی بدقسمتی کے ایام میں او۔ لین پھر حاملہ ہو چکی تھی۔ اس کا دودھ سوکھ گیا اور اب ننھی سی بچی کے مسلسل رونے کی آواز ہر وقت کوٹھڑی میں سنائی دینے لگی۔
تمام بستی والے بھوکوں مر رہے تھے۔ انہیں صرف اپنی اپنی بھوک کا خیال تھا، کسی دوسرے کا نہیں۔
وینگ لینگ کو اپنے بیل سے بڑی محبت تھی۔ وہ اس محنتی جانور کی نگہداشت میں کبھی کوتاہی نہ کرتا۔ اس قحط کے دوران میں بھی وہ اسے درختوں کی سوکھی ٹہنیوں پر اکا دکا جھڑنے والے پتے کھلاتا رہا اور اب جب کہ موسم خزاں پر تھا، ان سوکھے ہوئے پتوں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔
سوکھی ہوئی زمین، جس میں دراڑیں پڑ چکی تھیں کھیتی باڑی کے قابل نہ رہی تھی (کھیتی باڑی نہ کرنی ہو تو بیج کس کام کے) اس لیے چھوٹے سے خاندان نے بیج بھی چند ہی دنوں میں پیٹ کے دوزخ میں جھونک دیئے اور پھر ایک دن مضمحل و مجبور وینگ لینگ نے بے چین اور بے بس ہو کر بیل کی رسی کھول دی تاکہ وہ اپنی خوراک خود تلاش کر لے۔ لیکن جب قحط پڑے مہینے گزر گئے تو اس نے اپنے کمزور بیل کو پھر کھونٹے سے باندھ دیا۔ اسے ڈر تھا کہ خوراک کی تلاش میں جانے والا بیل خود کہیں کسی بھوکے خاندان کی خوراک نہ بن جائے۔ بیل اب صرف نام کا بیل تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ، جس کی کھال خشک ہونے کے باوجود لٹکنے لگی تھی۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ گھر میں اناج چاول یا بھوسے کا نشان بھی نہ رہا۔ اس کے بوڑھے باپ نے جو نقاہت کی وجہ سے ہر وقت سویا سا رہتا تھا آہستگی سے کہا: "ہمیں اس بیل کو کھا جانا چاہیے۔"
وینگ لینگ نے اپنے محنتی ساتھی کے متعلق یہ سنا تو غصہ سے کانپنے لگا اور چیخا: "اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کو کھا جائیں گے۔"
کھیتوں میں بیل اس کا ساتھی رہا تھا۔ مونس و غمخوار، وہ چھوٹا سا بچھڑا تھا جب اس کے باپ نے خریدا تھا۔ اسے پیٹ میں اتارنے کے متعلق وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔
"بارش کب تک نہیں ہوگی۔ قحط کب تک رہے گا۔ اگر ہم بیل کھا گئے، تو ہل میں کیا جوتیں گے۔"
"کیا بیل کی زندگی ہم سب کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے۔ مجھ سے، تمہارے بچوں کی زندگی سے۔ انسان بیل خرید سکتا ہے۔۔۔ زندگی کے سانس نہیں۔"
لیکن وینگ لینگ یہ منطق سننے کے بعد اپنے بوڑھے باپ

سے متفق نہ ہوا۔ ایک پہاڑ جیسا دن گذرا، ایک قیامت کی رات۔۔۔ بچے بھوک سے بلبلانے لگے۔ او۔لین پھٹی پھٹی ویران نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھتی رہی اور آخر وینگ لینگ کو وہی فیصلہ کرنا پڑا، جو وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بیل کو پیٹ کا ایندھن بنانا پڑے گا، لیکن وہ گرسنہ ہونے کے باوجود ظالم نہیں تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے تھکے ہوئے لہجے میں کہا:

''اسے ہلاک کردو، لیکن میں ایسے نہیں کرسکوں گا۔''

یہ کہہ کر وینگ لینگ اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا اور اس نے کوشش کی کہ وہ سو جائے۔ اس نے پھٹا ہوا بوسیدہ کمبل اپنے سر اور کانوں کے گرد لپیٹ لیا۔ وہ بیل کا واویلا سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ او۔لین آہستگی سے باہر نکلی۔ اس نے بڑی چھری نکالی اور پھر آنکھیں بند کر کے چھری کا کاری وار بیل کی گردن پر کیا اور بہت دیر تک بے رحمی سے بڑی لاش کا گوشت کاٹتی رہی۔

وینگ لینگ اپنی کوٹھڑی سے اس وقت تک باہر نہ نکلا، جب تک اس کی بیوی قتل کی واردات سے فارغ نہ ہوئی۔ او۔لین نے تھوڑا سا گوشت لے کر ہنڈیا چڑھادی اور باقی کا گوشت اس طرح سنبھالنے لگی، جیسے کوئی کنجوس اپنی پونجی کو لوگوں کی نظر سے چھپا کر رکھتا ہے۔ جب کھانا میز پر آیا، تو وینگ لینگ گوشت کو نگل نہ سکا۔ وہ اپنے آپ کو محسن کش سمجھنے لگا تھا۔ اس نے شوربا پینے کی کوشش کی لیکن وہ بھی اس کے حلق سے نیچے نہ اتر سکا۔ اس کا بوڑھا باپ بڑی رغبت سے کئی دنوں کی بھوک مٹا رہا تھا۔ اس نے بیٹے کو ہاتھ روکے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا:

''بیل انسان نہیں ہوتا اور پھر وہ ایک بوڑھا بیل تمہارے پیٹ کی آگ نہ بجھاتا تو زمین میں دفن ہو جاتا۔ ہمارے پیٹ میں نہ اترتا تو زمین میں اتر جاتا۔''

یہ سن کر وینگ لینگ کی کچھ تسلی ہوئی اور پھر اس نے ڈرتے ڈرتے احساس ندامت سے ایک لقمہ اٹھایا پھر تیسرا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اس کی جھجک اتر گئی اور وہ رغبت سے کھانے لگا۔ کچھ دنوں میں بیل ختم ہو گیا۔ اس کی ہڈیاں تک چبائی گئیں اور یہ سب کچھ بہت جلد ہو گیا۔ اب اس کی کھال کے سوا کچھ نہ تھا، جو خشک اور سخت ہو چکی تھی اور جسے صحن میں گڑے ہوئے بانس کے ساتھ لٹکا دیا گیا تھا۔

پہلے گاؤں والے وینگ لینگ سے نفرت کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس نے بہت سی چاندی اور غلہ جمع کر رکھا تھا۔ اس کا چچا اپنی بیوی اور سات بچوں کے ساتھ ان کے گھر اس امید پر آیا کہ کچھ کھانے کے لیے ملے گا، لیکن اسے کھانے کے لیے کچھ نہ ملا۔ اس نے تھوڑے سے سوکھے ''جو'' سکوں کی طرح بوڑھے چچا کی ہتھیلی پر رکھ دیئے اور کہنے لگا یقین کرو اب ہمارے گھر میں مٹھی بھر ''جو'' کے سوا کچھ نہیں۔ نہ باپ کے لیے نہ بچوں کے لئے۔ اس کا چچا ناراض ہو کر واپس لوٹ گیا۔ اسے وینگ لینگ کی باتوں پر یقین نہ آیا تھا اور اسی روز سے وہ ایک ایسے کتے کی طرح اس کے خلاف ہو گیا، جسے زور سے ٹھوکر ماری گئی ہو۔ اس واقعے کے بعد وہ اس کے خلاف گاؤں کے ہر گھر میں زہر اگلنے لگا:

''میرے بھتیجے کے پاس چاندی اور اناج سے مٹکے بھرے ہوئے ہیں، لیکن وہ ہم سب کو کچھ نہیں دے گا۔ نہ مجھے نہ میرے بچوں کو جو اس کا اپنا خون ہیں۔''

ہر گزرا ہوا دن گاؤں کے ہر گھر سے جیسے غلہ چاٹ رہا تھا۔ کسی کے گھر میں اب کوئی سکہ بھی نہ تھا اور موسم سرما کی تیز ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ خشک تیز اور بھوک سے نڈھال لوگ بے حال ہو رہے تھے۔ مشقت کرنے والے مرد اپنے آپ سے بیزار ہو چکے تھے۔ اپنی بیویوں اور بچوں کا مسلسل واویلا اور تڑپنا ان سے نہ دیکھا جاتا تھا اور جب اس کا چچا ایک کمزور اور دبلے کتے کی طرح گاؤں میں کپکپاتا یہ فریاد کرتا:

''صرف ایک شخص کے پاس اس گاؤں میں اناج ہے۔۔۔ صرف ایک شخص اس گاؤں میں ایسا ہے جس کے بچے ابھی تک موٹے تازے ہیں۔'' تو اس کی باتوں سے لوگوں میں اس قدر اشتعال پیدا ہوا کہ وہ بڑے بڑے ڈنڈے اور ہتھیار سنبھال کر وینگ لینگ کے گھر آ دھمکے۔ دروازہ بند تھا۔ وہ غصے سے دروازہ پیٹنے لگے اور جب ہمسایوں کی آواز سن کر وینگ لینگ نے دروازہ کھولا تو سب اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے دھکیلتے ہوئے صحن عبور کر کے کوٹھڑی میں جا پہنچے۔ اس کے سہمے ہوئے بچوں کو ادھر ادھر اچھال دیا اور گھر کے کونے کونے کی تلاشی لینے لگے اور جب مٹھی بھر دانوں کے سوا اس کے گھر سے کچھ دستیاب نہ ہوا، تو اس کی بوسیدہ میز بینچ اور بستر اٹھانے لگے۔ او۔لین نے یہ آواز سنی تو دہلیز پر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ''میرے جیتے جی یہ نہیں ہو گا۔ تم جاؤ پہلے اپنا سامان بیچو، پھر ہماری بھی باری آ جائے گی۔ ہم ایک جیسے غریب اور لاچار ہیں۔ ہم سب بھوکے ہیں۔ شاید تم نہیں جانتے کہ ہم بھی درخت کے اکا دکا پتوں پر گزارہ کر رہے ہیں۔'' اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پیٹ زور سے بھینچا، سب لوگوں کی نگاہیں ندامت سے زمین میں گڑ گئیں۔ وہ سب بھوکے تھے، برے آدمی نہیں تھے۔ آہستہ آہستہ سب ایک ایک کر کے چلے گئے۔ صرف ایک آدمی وہاں رکا رہا، ایک دبلا پتلا، چھوٹے قد کا خاموش طبع آدمی، اس کا نام چین تھا

اور اپنے اچھے وقت میں اس کا چہرہ ایک بندر کی طرح ہوگا، لیکن اب بھوک نے اسے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا تھا۔ وہ شرمندہ سا ہو کر کھڑا رہا۔ وہ ایک نیک دل آدمی تھا صرف اس کی ننھی بچی کے مسلسل رونے نے اسے اس جرم یا گناہ کے لیے اکسایا تھا۔ وہ معذرت کے لیے اس واسطے رکا تھا کہ کچھ کہے، لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا اور پھر آہستگی سے باہر نکل گیا۔

وینگ لینگ صحن میں اداس اور مضمحل کھڑا رہا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے صحن میں چاروں طرف دیکھتا رہا۔ اس صحن میں او۔لین ہمیشہ فصل کی چھٹائی کیا کرتی تھی اور چاروں اور اناج کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ لیکن اب صحن خالی تھا۔ اس کے پیٹ کی طرح! اب اس گھر میں بوڑھے باپ کو دینے کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ بچے بھی ہر قسم کے دلاسے جھوٹ سمجھتے تھے۔ اس کی بیوی روز بروز نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اپنے علاوہ ایک اور ننھی جان کو بھی رزق پہنچانا پڑتا تھا۔ ان سوچوں کے بعد ایک انجانی سوچ نے وینگ لینگ کو تسلی دی اور وہ کچھ مطمئن ہو گیا۔ اگر آج اس کے پاس سونا چاندی ہوتا تو وہ سب چھین کر لے جاتے۔ اگر اس چاندی سے اس نے غلہ یا اناج خرید کر اکٹھا کیا ہوتا تو وہ اس کا دانہ دانہ لوٹ کر لے جاتے، لیکن اس نے اندوختہ سے زمین خریدی تھی۔ زمین جو اس کی تھی، صرف اس کی، جسے کوئی نہیں چرا سکتا تھا۔

☆☆☆

وینگ لینگ اپنے صحن میں کھلنے والے دروازے سے پیٹھ لگائے سوچ رہا تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ خالی ہاتھ موت کے انتظار میں، مکان میں بیٹھے رہنا اسے منظور نہ تھا۔ وہ لاغر اور کمزور ہو چکا تھا، لیکن اس کے دل میں اب تک جینے کی خواہش تھی۔ زندہ دل رہنے کا عزم تھا۔ وہ بے رحم قسمت کے آگے ہتھیار ڈالنے کو تیار نہ تھا۔ وہ خشمگیں نگاہوں سے نیلے ظالم آسمان کی طرف دیکھتا، جس پر دور دور تک کوئی بادل نہ تھا۔

نقاہت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تو چلنا بھی اس کے لیے محال ہو گیا تھا۔ غلہ ختم ہو چکا تھا۔ دور دور تک کوئی جانور بھی نظر نہیں آتا تھا۔ نہ پرندہ۔ نہ درندہ۔

خالی پیٹ رہنے کی وجہ سے بچوں کے پیٹ میں ہوا بھر گئی تھی، جیسے سوجن ہو گئی ہو۔ اب کوئی بچہ نہ گاؤں کی گلی میں کھیلتا ہوا نظر آتا تھا نہ صحن میں۔ وینگ لینگ کے دونوں بچے بہ مشکل کوٹھڑی سے صحن میں۔ وینگ لینگ کے دونوں بچے بہ مشکل کوٹھڑی سے صحن میں نکلتے۔ گھسٹتے ہوئے، ان کے گول مٹول توانا جسم لبوترے ہو گئے تھے۔ ہڈیاں نکل آئی تھیں سوائے پیٹ کے، جس میں ہوا بھری ہوئی تھی وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے تھے۔

وینگ لینگ کی نوزائیدہ بچی، ہر وقت بستر پر ادھر ادھر لڑھکتی رہتی۔ اس میں بیٹھنے کی سکت بھی نہ تھی۔ پہلے وہ بھوک کی شدت سے ہر وقت بلکتی اور روتی رہتی، لیکن اس میں شاید رونے کی طاقت بھی نہ رہی تھی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے اور اس کے پھول سے گالوں میں گڑھے۔ اس کا منہ ایک بڑھیا کا پوپلا منہ نظر آتا تھا۔ ایک عجیب جرم کا احساس وینگ لینگ کے حواس کو ڈس رہا تھا۔ وہ ایک کمزور بے زبان بچی کے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ کبھی وہ اسے گود میں اٹھا لیتا۔ وہ بہت ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ وہ اسے سینے سے لپٹا کر کہتا:

''چھوٹی سی گڑیا''

اور جب اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں سے مجبور باپ کی طرف نقاہت سے تکتی، تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور وہ اسے لیے ہوئے صحن سے باہر آ جاتا اور دور تک پھیلے ہوئے اپنے کھیت دیکھتا، جو بے گیاہ تھے، بنجر اور ویران۔ خشک سالی نے زمین کی چھاتی میں لمبی لمبی بے ربط دراڑیں بنا دی تھیں۔

جہاں تک اس کے بوڑھے باپ کا تعلق تھا، وہ ہر وقت کھاٹ پر پڑا رہتا اور آج تک جو دانہ دنکا کسی بھی طریقے سے یا کوئی پتا وینگ لینگ کو دستیاب ہوتا، وہ اپنے بوڑھے باپ کے حوالے کر دیتا اور وہ ایک مریل بیل کی طرح جگالی کرتا رہتا۔ اسے یہ احساس ضرور تھا کہ مرتے وقت اس کے باپ کو یہ اطمینان ضرور ہوگا کہ اس کے بیٹے نے اس کی خبر گیری یا نگہداشت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وہ اپنے جسم کا گوشت تک بھی اپنے باپ کو کھلا سکتا تھا۔ صحن میں جب دھوپ پھیلی جاتی، تو وہ اپنے باپ کو سہارا دے کر چارپائی پر ڈال دیتا اور ایک دن بوڑھے کی آواز آئی بالکل اسی طرح جیسے ہلکی سی آندھی سوکھے ہوئے کھیتوں سے گزرے:

''میں نے اس سے برا وقت بھی دیکھا ہے، اس سے برا وقت بھی، جب میں نے عورتوں اور مردوں کو اپنے بچے بھون کر کھاتے ہوئے دیکھا۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' اس خیال سے ہی وینگ لینگ پر جیسے لرزہ طاری ہو گیا۔

ایک دن وینگ لینگ کا ہمسایہ چنگ جو اپنے جسم کا سایہ معلوم ہوتا تھا، اس کے پاس آیا اور اس کے خشک ہونٹوں سے جن پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں، یہ الفاظ نکلے:

''قصبے میں بھی لوگ کتے کھانے لگے ہیں۔ گھوڑے اور دوسرے سب مویشی ختم ہوتے جا رہے ہیں، یہاں ہم نے وہ بیل

بھی کھا ڈالے، جو کھیتوں میں ہمارے ساتھ کام کرتے تھے۔ وہ گھاس بھی چبا ڈالی، جو مویشی کو ڈالا کرتے تھے اور درختوں کی چھال تک نگل گئے۔ اب کھانے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟"

وینگ لینگ نے سر کے اشارے سے اس حقیقت کی تائید کی۔

چنگ قریب آ گیا۔ بالکل قریب اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا: "سنا ہے اب گاؤں والے آدم خور ہو گئے ہیں، وہ انسانی گوشت کھا رہے ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ تمہارے چچا بھی یہی کچھ کھا رہے ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو وہ کیسے جی رہے ہیں چل پھر رہے ہیں اور ان کی ہڈیوں پر ابھی گوشت موجود ہے۔ ان کے گھر میں اناج کا ذخیرہ تو موجود نہیں تھا۔"

وینگ لینگ کسی انجانے خوف سے چونک کر ایک دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسے اپنے ہمسایے سے ڈر آنے لگا تھا۔

"ہم یہاں سے چلے جائیں گے، ہم جنوب کی طرف جائیں گے۔"

چنگ کی کمزور آواز آئی: "تم ابھی جوان ہو، لیکن میں اور میری بیوی دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ہم کیسے چل کر وہاں تک پہنچیں گے اس لیے ہمیں یہیں بھوکے پیاسے مرنا ہوگا۔ ہاں ایک ننھی بچی ہے اس کا خیال ہے۔ اسے اس ننھی عمر میں نہیں مرنا چاہیے۔"

"تم مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہو۔" وینگ لینگ نے کہا۔ "میرے ساتھ ایک باپ ہے، تم سے بھی زیادہ بوڑھا، کمزور اور لاچار اور پھر تین چھوٹے چھوٹے بچے۔ ایک اور منہ پھاڑے چلا آ رہا ہے۔ ہمیں ہر حالت میں یہاں سے چلے جانا چاہیے مبادا ہم درندوں کی طرح ایک دوسرے کو چیر پھاڑ کر کھا جائیں۔ پاگل کتوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹیں اور طاقت ور کمزور کو کھا جائے۔"

یہ کہہ کر اس نے او۔لین کو آواز دی۔ او۔لین گھر میں کوئی کام نہ ہونے کی وجہ سے بستر پر پڑی تھی۔ ہنڈیا کے لیے کوئی خوراک نہ تھی۔ چولہے کے لیے کوئی ایندھن نہ تھا۔

"او۔لین، ہمیں یہاں سے جلد چلے جانا چاہیے۔" او۔لین بستر سے اٹھی، دروازے تک پہنچی اور چوکھٹ کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔

"ٹھیک سوچا ہے، تم نے"۔ بیوی کی آواز آئی۔ "چلتے ہوئے مر جانا یہاں محبوس ہو کر مرنے سے بہتر ہے لیکن ایک دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔ اس وقت تک شاید میں فارغ ہو جاؤں، مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پیٹ پکڑ کر زور سے دبایا۔

"کل سہی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر کاہی جمی ہوئی تھی۔ "لیکن اس حالت میں تم کیسے چل سکو گے" اور اس نے اپنے ہمسائے چنگ کو مخاطب کیا:

"کیا تمہارے پاس کوئی بچا کھچا اناج۔۔۔۔ اناج کے کچھ دانے موجود ہیں۔ اگر ہیں، تو خدا کے لیے میرے بچوں کی ماں کی زندگی کو بچالو۔"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں میرے گھر میں مٹھی بھر سوکھے دانوں کے سوا کچھ نہیں ہے، جنہیں میں نے اپنے صحن کے کونے میں دفن کر رکھا ہے۔ دانے ہم نے اپنے آخری وقت کے لیے سنبھال رکھے ہیں۔ وہ اس لیے کہ مرتے وقت اس احساس کے ساتھ نہ مریں کہ ہم خالی پیٹ مر رہے ہیں، میرا کوئی بیٹا بھی نہیں اور اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں زندہ ہوں یا مردہ سا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا۔ اس نے ایک بوسیدہ رومال میں کچھ چنے باندھ رکھے تھے جن سے مٹی کی بساند آ رہی تھی۔ بچوں کو جیسے دانوں کی خوشبو آ گئی وہ اس کے قریب سرکنے لگے، لیکن وینگ لینگ نے انہیں سختی سے پرے دھکیل دیا اور مٹھی بھر چنے لے کر بیوی کی کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔ پیدائش کا وقت قریب تھا اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر یہ چند سوکھے چنے بھی اس کی بیوی نے نہ چبائے تو وہ موت کے منہ میں اتر جائے گی۔ چند دانے اپنے پاس رکھ کر بقیہ چنے اس نے اپنی بیوی کی کھردری ہتھیلی پر رکھ دیئے اور پھر وہ دانے جو اس نے بچائے تھے اپنے منہ میں ڈالے اور انہیں چبانے لگا۔ دانت چبانے کی عادت بھول چکے تھے، اس لیے اسے خاصی زحمت محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جب ان کا ملیدہ بن گیا، تو وینگ لینگ شفقت سے ننھی بچی کے بستر کے قریب آیا اور پھر اس نے اپنا منہ بچی کے منہ کے ساتھ ملا دیا اور زبان سے وہ ملیدہ ننھی بچی کے منہ میں دھکیل دیا اس کے ننھے جبڑے ہلے اور پھر اس نے محسوس کیا جیسے اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا ہے۔

وہ رات اس نے دوسری کوٹھڑی میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے دونوں بیٹے بوڑھے دادا کی کھاٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں اوندھے لیٹے رہے۔ او۔لین اکیلی زچگی کا دکھ جھیلتی رہی۔ وہ کوٹھڑی کے باہر دہلیز پر اکڑوں بیٹھا رہا۔ ایک کمزور اور ننھی سی آواز کو سننے کے انتظار میں۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے ایک نحیف اور مدھم آواز سنی (بیٹا یا بیٹی) اس کے لیے یہ خبر کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ اسے تو صرف یہ فکر دامن گیر تھی کہ ایک اور جان جسے پالنے کی فکر اسے کرنی تھی، گھر میں آفت بن کر آ رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ یہ ہلکی سی چیخ پھر نہ اٹھے اور ایسا ہی ہوا۔ کاش اس کی کوئی اور

خواہش ہوتی۔ وہ کچھ دیر دم سادھے دروازے کی طرف دہلیز پر کھڑا رہا۔ وہ بیوی کی کوٹھڑی میں داخل ہونے سے نہ جانے کیوں خائف تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' باہر سے اس نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ اندرونی کوٹھڑی سے کوئی آواز نہ آئی۔ کہیں اس کی بیوی بھی دکھ درد کی تاب نہ لاکر ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ تو نہیں گئی، لیکن کچھ لمحوں کے بعد کوٹھڑی سے سرسراہٹ سنائی دی: ''آجاؤ۔''

وہ اندر چلا گیا۔ اس کی بیوی بستر پر نیم مردہ سی لیٹی رہی۔

''بچہ کہاں ہے؟''

اس کے ہاتھوں میں خفیف سی جنبش ہوئی اور اس نے فرش پر ایک ننھی سی لاش دیکھی:

ایک لوتھڑا سا۔

''مر گیا''

''ہاں''

وہ جھکا اور اس نے کچھ ٹٹولا۔ ایک لوتھڑا سا۔ شاید اس لوتھڑے میں کوئی چرمرائی ہڈی ہو۔ وہ لڑکی تھی۔

''میں نے اس کی آواز سنی تھی!''

یہ کہہ کر اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ خاموش تھی۔ اس نے کچھ نہ کہا اور نوزائیدہ بچے کی لاش کو لے کر صحن میں آگیا۔ صحن کے کونے میں ایک گلے ہوئے ٹاٹ کا ٹکڑا پڑا تھا۔ اس نے بچی کو اس میں لپیٹنا چاہا، تو اس کی ڈھلکی ہوئی گردن پر اس نے دو چھوٹے چھوٹے نشان دیکھے۔ ایک لمبی آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر اس ٹاٹ کو اٹھایا اور بے سکت قدم اٹھاتا ہوا قریب کے قبرستان کی طرف چل پڑا۔ قبروں کے مٹے مٹے نشان قریب ہی سے شروع ہو گئے، لیکن اسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ ایک لمبا فاصلہ طے کر کے آیا ہے۔ یکا یک اس نے اپنے سے کچھ دور ایک لومڑی نما بھوکے کتے کو دیکھا، جس کے جبڑوں پر بھی کوئی گوشت موجود نہ تھا۔ اس نے نقاہت کے باوجود مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا کر اسے دے مارا، لیکن کتا اپنی جگہ سے ایک بالشت بھی نہ ہٹا۔ وہ اس بستی کے انسانوں کی طرح بھوکا تھا اور خون کی خوشبو سونگھ کر اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے قریب کھڑا اغرار ہا تھا۔ وینگ لینگ نے ٹاٹ زمین پر رکھ دیا، جس میں اس کی ننھی سی بچی کی لاش لپٹی ہوئی تھی، دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور بے چارگی کا بوجھ اٹھائے ہوئے واپس پلٹا۔ اسے اپنے آپ پر جتنا ترس آرہا تھا اتنا کبھی نہ آیا تھا۔

دوسرے دن سورج پھر حسب معمول طلوع ہوا، وہ ایک مرتبہ پھر سوچنے لگا کہ کیا وہ ایک جاں بلب بوڑھے باپ اور بے بس معصوم بچوں کے ساتھ اپنا گھر چھوڑ کر جنوب کی طرف ایک لمبا فاصلہ طے کر سکے گا۔ کیا وہ سو میل تک اس ننھے سے قافلے کے ساتھ گھسٹ سکے گا اور پھر کیا پتہ کہ جس منزل پر وہ پہنچنا چاہتا ہے، کیا وہاں بھی کچھ کھانے کے لیے ہے؟ کیا ایسا ہی ایک ظالم آسمان وہاں نہیں ملے گا جسے زمین اور اس پر بسنے والی مخلوق پر ترس نہیں آتا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے سوچا کہ اسے یہیں اپنے گاؤں اپنے گھر میں، اپنے صحن کی دہلیز پر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مر جانا چاہیے۔ اس کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ پیتل کا آخری سکہ تک ختم ہو چکا تھا اور پھر اگر اس کے پاس چاندی اور سونے کے سکے بھی ہوتے تو وہ اناج نہیں خرید سکتا تھا، کیونکہ اناج سرے سے ملتا ہی نہیں تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ شہر میں بڑے بڑے امیر بڑے بڑے دولت مند رہتے ہیں، جو دوسرے بڑے امیروں کو غلہ مہنگے داموں فراہم کرنے کے لیے اور اپنی ضرورت کے لیے ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ شہر میں ضرور کھانے پینے کے لیے کچھ ہو گا، لیکن وہاں تک پہنچنے کے لیے ان میں نہ طاقت تھی نہ ہمت۔ کئی دنوں سے وہ جوہڑ کی گیلی مٹی کھاتے رہے تھے۔ اس مٹی سے انہیں گیہوں کی خوشبو آتی تھی، جسے وہ چکھنا تو درکنار سونگھنا بھی بھول گئے تھے۔ چنے کے چند دانے جو اس کا بوڑھا ہمسایہ، چن اپنا پیٹ کاٹ کر از راہ ہمدردی اس کی بیوی کے لیے دے گیا تھا، ابھی تک اس کی بیوی کی ہتھیلی پر موجود تھے، جنہیں وہ ایک ایک کر کے بڑی کفایت سے چبا رہی تھی۔ انہیں پریشان کن خیالات میں وہ ڈوبا ہوا تھا کہ اسے دور سے سوکھے ہوئے کھیتوں کے پرے کچھ سائے اپنی طرف حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔ وہ گم سم وہیں بیٹھا رہا۔ سائے قریب آ گئے۔ چند آدمیوں کے ساتھ اس کا چچا بھی تھا۔ قریب آ کر وہ بلند آواز سے بولا: ''کہو کیسے گزر رہی ہے۔ میرے بڑے بھائی کا کیا حال ہے؟''

وینگ لینگ نے چچا کی طرف دیکھا، وہ پہلے سے دبلا ضرور ہو گیا تھا، لیکن قحط زدہ نہ تھا۔ اس نے اپنے قوا کی طاقت مشت میں کرتے ہوئے کہا:

''تو تم بھوکے نہیں مرے، تمہیں اناج کہاں سے ملتا رہا؟''

وینگ لینگ نے چچا کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر پوچھا۔

چچا نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے:

''قسم ہے مجھے آسمان پر رہنے والے کی میرے گھر اناج کا ایک بھورا (دانہ) بھی نہیں۔ تمہاری چچی سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ یوں سمجھو جیسے کسی کپڑے کو سوکھنے کے لیے بانس پر لٹکا دیا جائے۔ اب

تو صرف اس کی ہڈیاں چٹختی ہیں۔ گوشت اس کی ہڈیوں پر سے غائب ہو گیا ہے۔ رہے بچے تو سات میں سے چار رہ گئے ہیں۔ تینوں چھوٹی بچیاں چلی گئیں۔ انہیں مرنا ہی تھا سو مر گئیں۔"

"انہیں کھا تو نہیں گئے؟"

"میں جھوٹ تو نہیں کہتا، چھوڑو ان باتوں کو مجھے ہر دم تمہارا خیال رہا۔ تمہارے باپ کا، جو میرا بھائی ہے۔ میرے ساتھ دیکھو کون ہے۔ انہوں نے مجھے اناج اس وعدے پر دینا منظور کیا ہے کہ میں انہیں کچھ زمین خرید دوں۔ یہ زرخیز زمین خریدنا چاہتے ہیں۔ اس کے عوض یہ تمہیں چاندی کے روپے دیں گے۔ اناج نئی زندگی۔"

وینگ لینگ خاموش کھڑا رہا اس نے نظر اٹھا کر بھی بیوپاریوں کی طرف نہ دیکھا۔ کچھ عرصہ خاموشی رہی۔ پھر وینگ لینگ نے سوچا کہ اسے کچھ کہنا چاہیے۔ "میں اپنی زمین نہیں بیچوں گا۔" اسی لمحے وینگ لینگ کی نظر صحن میں بچوں پر پڑی، جو بھوک سے نڈھال اور بے سدھ ہو کر لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہے تھے۔

"یہ تمہارے بچے ہیں وہی گول مٹول موٹے تازے بچے، جنہیں میں نے آخری ملاقات پر پیتل کا ایک ایک سکہ دیا تھا۔"

یہ سن کر فرط جوش سے وینگ لینگ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کچھ اس کے حلق میں اتر گئے اور کچھ سوکھے ہوئے گالوں پر بہہ نکلے۔

"کیا دو گے؟"

اسے معاً اپنے بوڑھے باپ بچوں اور بیمار بیوی کا خیال آ گیا۔ ایک بیوپاری شہری لہجے میں بولا:

"ہم تمہیں فی ایکڑ چاندی کے پانچ سکے دیں گے۔"

وینگ لینگ تن گیا:

"میں نے تو اس زمین کے لیے بیس گنا زیادہ رقم دی تھی۔"

"آج کی بات کرو۔ کیا تم اپنے خاندان کے ساتھ خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

وینگ لینگ ان کی طرف لپکا:

"بھاگ جاؤ۔ میں اپنی زمین نہیں بیچوں گا۔ اس زمین کو جس نے ہمیں جنم دیا۔ ہم اس زمین میں سو جائیں گے۔"

بیوپاریوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسے ایک ایسا بھوکا انسان سمجھ رہے تھے، جسے فاقوں نے پاگل کر دیا ہو۔ وینگ لینگ کا چچا بھی خاموش تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا بھتیجا زمین کو کسی بھی قیمت پر بیچ دے گا۔ زمین جان سے زیادہ پیاری نہیں ہوتی، لیکن اس کے منہ سے انکار سن کر وہ سخت نادم اور پشیمان تھا۔

یکا یک او۔لین دروازے میں نمودار ہوئی۔ نجانے اس نقاہت کے عالم میں اس نے بستر سے دروازے تک کا فاصلہ کیسے عبور کیا تھا۔ وہ کہنے لگی:

"زمین ہم کسی قیمت پر نہیں بیچیں گے۔ اس لیے کہ جب ہم واپس آئیں گے، تو زمین کے بغیر کیسے جئیں گے۔ خریدنا چاہتے ہو تو ہمارے گھر کا سب سامان خرید لو۔ میز، بنچ، چارپائیاں، بستر برتن، جو کچھ اس گھر میں ہے، سب کچھ خرید لو۔ صرف ہم زمین اور ہل نہیں بیچیں گے۔"

اس کی آواز میں وہ ٹھہراؤ اور مضبوطی تھی، جو وینگ لینگ کی غصیلی آواز میں موجود نہ تھی۔

ایک بیوپاری بولا: "ایسی چیزیں تو صرف چولہے میں جلانے کے کام آتی ہیں۔" اور پھر جب اس نے سب سامان دیکھ لیا، تو نفرت بھری آواز میں بولا: "چاندی کے دو سکے لے لو۔"

"ٹھیک ہے نکالو" اور یہ کہہ کر اس نے اپنی ہتھیلی آگے بڑھا دی۔ وہ سب اندر داخل ہوئے اور سامان پر قبضہ کرنے لگے۔ چولہے پر جو دیگچا چڑھا تھا وہ بھی انہوں نے اٹھا لیا اور بوڑھے باپ کی کوٹھڑی میں پہنچ کر اس کا بستر اس کے نحیف و نزار جسم کے نیچے سے کھینچ لیا۔ مکار چچا جان بوجھ کر کوٹھڑی میں داخل نہ ہوا مبادا اس کا بھائی اسے دیکھ لے، جسے چارپائی لینے کے لئے فرش پر پھینک دیا گیا تھا۔ بہت جلد گھر کا صفایا کرنے اور چاندی کے دو سکے دینے کے بعد وہ سب چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد وینگ لینگ نے ایک بھرپور اداس نظر اپنے خالی مکان پر ڈالی۔ صحن کے ایک کونے میں ہل کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کی ہتھیلی پر چاندی کے دو سکے چمک رہے تھے۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور مطمئن لہجے میں بڑبڑایا:

"میں نے زمین تو نہیں بیچی۔ زمین تو میری ہے۔ میں نے اپنی ماں کا سودا تو نہیں کیا۔"

☆☆☆

اب کیا رہ گیا تھا۔ دروازے کے قریب آ کر کنڈی چڑھانا اور نئی منزل کی طرف روانہ ہو جانا، ان کے پاس کوئی زاد راہ نہ تھا۔ کانسی کے کٹوروں کے سوا، جو وینگ لینگ نے سامان فروخت میں شامل نہیں کئے تھے۔ یہ چھوٹا سا قافلہ افتاں و خیزاں چل پڑا۔ آہستہ آہستہ جیسے مریل جانور مذبح کی طرف چلتے ہیں۔

ننھی بچی کو وینگ لینگ نے اپنی گود میں اٹھا رکھا تھا۔ یکا یک اس کی نظر اپنے بوڑھے باپ پر پڑی۔ وہ ایڑیاں اٹھا کر نہیں، خشک زمین پر گھسٹ گھسٹ کر رینگ رہا تھا۔ اس نے بچی او۔لین کے سپرد کر دی اور جھک کر اپنے بوڑھے باپ کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔

اسے اٹھاتے وقت اس کے گھٹنے چٹخے۔ بوڑھا وزنی نہ تھا، لیکن اسے بڑا وزنی محسوس ہو رہا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے وہ چلتے رہے، تیز ہوا مخالف سمت سے آ رہی تھی، جیسے ان کا رستہ روک رہی ہو۔ وینگ لینگ نے اپنے بچوں کا حوصلہ بڑھایا:

"تیز تیز چلو، وہاں پہنچتے ہی تمہیں کچھ کھانے کے لیے ملے گا۔ ابلے ہوئے سفید چاول اور بھنے ہوئے دانے۔"

باپ کے نحیف بوجھ تلے وینگ لینگ کی پیشانی پر پسینے کے وہ قطرے، جو مسافت کرنے کے وقت ٹپک رہے تھے بہہ کر اس کے چیتھڑوں میں جذب ہو رہے تھے۔ وینگ لینگ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ کبھی اپنی منزل تک پہنچ سکیں گے؟ شمالی ہوا سرد ہو چلی تھی اور ان سب کے اعصاب ٹھٹھرنے لگے تھے۔ او۔لین بچی کو اٹھائے جیسے رینگ رہی تھی۔ وینگ لینگ اپنے بوڑھے باپ کو ناکارہ ایندھن کی طرح اٹھائے ہوئے تھا۔ کبھی کبھی بچے پیچھے رہ جاتے تو وہ باپ کو پیٹھ سے اتار کر انہیں اٹھا کر اپنے قریب لاتا۔ پسینہ بارش کی طرح بہنے لگا۔ بارش ہو جاتی تو یہ پسینہ نہ بہتا۔

یہ وہی رستہ تھا، جہاں ایک دن وینگ لینگ اپنی بیوی او۔لین کو بیاہنے کے لئے بڑی حویلی کے مضبوط لوہے کے بنے ہوئے دروازے پر پہنچا تھا۔ وہ جب وہاں پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ وہ آہستگی اور خاموشی سے دروازے کے سامنے سے گزر گئے۔ رات پڑنے والی تھی۔

ناگہاں وینگ لینگ نے دیکھا بہت سے آدمیوں کا گروہ، ان کی پشت سے نمودار ہوا۔ غالباً وہ گروہ بھی جنوب کی طرف جا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ جم غفیر کہاں جا رہا ہے؟

اس نے ایک راہی سے ڈرتے ڈرتے پوچھا: "کہاں جا رہے ہو؟"

"ہم بھوک سے تنگ آ کر جنوب کی طرف جا رہے ہیں۔ یہاں قریب ہی سے ایک "آگ گاڑی" جس کے منہ سے شعلے نکلتے ہیں چلنے والی ہے! وہ ہمیں شہر تک لے جائے گی۔"

"آگ گاڑی" وینگ لینگ نے سوچا اور اپنے دماغ پر زور دیا۔ اس نے گاؤں کے بنئے سے سنا تھا دھواں اڑانے والی ایک آگ گاڑی کے متعلق جو بیک وقت آگ اور پانی کی خوراک حاصل کر کے دھواں اگلتی ہے، انسانوں اور حیوانوں سے تیز بھاگتی ہے۔

"کیا ہم اس گاڑی میں سوار ہو سکتے ہیں۔"

"کیوں نہیں، اگر تمہارے پاس چاندی کے سکے ہیں۔"

یہ سن کر وینگ لینگ کا چہرہ دمک اٹھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دیو پیکر گاڑی جو دھواں اگل رہی تھی، اندھیرے کو چیرتے ہوئے لوہے کی پٹڑی پر منہ کھولے آتی نظر آئی۔ سب اس کی طرف بھاگے۔ وینگ لینگ اپنے باپ کو اٹھائے ہوئے۔ او۔لین اپنی ننھی بچی کو سنبھالتے ہوئے اور ننھے بچے گرتے پڑتے۔

☆☆☆

چاندی کے دو سکے وینگ لینگ کے پاس تھے، اس نے "آگ گاڑی" کے افسر کے حوالے کر دیئے۔ اس نے دھات کے کچھ سکے اسے واپس کیے۔ یہ وینگ لینگ کے لیے انمول پونجی تھی۔

آگ گاڑی ایک قصبے کے قریب کھڑی ہوئی تو ان لٹے پٹے مسافروں کو دیکھ کر سوکھے چنے اور باسی روٹیاں بیچنے والے ان چھوٹے چھوٹے گھروں کے قریب جو لوہے کی پٹڑی پر ایک دوسرے سے بندھے ہوئے تھے۔

وینگ لینگ نے للچائی ہوئی نظروں سے سوکھے چنوں اور باسی روٹیوں کو دیکھا۔ اسے اپنے بوڑھے باپ، بیمار بیوی اور کمسن بچوں کا بھی خیال نہ آیا وہ ایک نئی منزل پر پہنچنے والا تھا۔ اس آگ گاڑی میں چند ایسے لوگ گڈ مڈ ہو کر بیٹھے ہوئے تھے، جو پہلے بھی جنوب کا سفر کر چکے تھے۔ آگ گاڑی کے آگے جو تنے والا بیل لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اس کے نتھنوں سے آگ نکل رہی تھی۔ وہ بیک وقت پانی پیتا تھا، آگ اگلتا تھا اور اپنی پیاس بجھانے کے بعد آگ اگلتا تھا۔

اس گاڑی میں بیٹھا ہوا ایک بوڑھا شخص ناصحانہ انداز میں دوسرے شخص سے، جو کئی مرتبہ یہاں کا سفر کر چکا تھا کہنے لگا:

"وہاں پہنچتے ہی تمہیں چھوٹی چھوٹی چٹائیاں خریدنی پڑیں گی۔ بھس کی چٹائیاں جو پیتل کے ایک سکے میں مل جائیں گی اور پھر تم انہیں بانسوں سے باندھ کر سائبان بنا لینا۔ سائبان کو پختہ کرنا چاہو تو تھوڑا سا بھس ملا کر چھت مضبوط کر لینا۔ سر ڈھانپنے کو جگہ مل گئی تو اس شہر میں بھیک مانگنا مشکل نہ ہوگا۔ تمہارے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر ضرور کچھ نہ کچھ تھما دیا جائے گا اور پھر پیٹ کی آگ بھی بجھ جائے گی۔"

وینگ لینگ نے آج تک بھیک نہیں مانگی تھی۔ وہ غیر اضطراری طور پر بولا: "کیا بھیک مانگنا ضروری ہے؟"

"ہاں! بہت ضروری، لیکن تم بھیک بھی اس حالت میں نہیں مانگ سکتے ہو، جب تک تمہارا پیٹ خالی ہو۔ بھیک مانگنے کے لیے محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ گلا پھاڑنا پڑتا ہے پھیپھڑوں پر زور دینا پڑتا ہے تم تن آسانی سے اس وقت مانگ سکتے ہو، جب تمہارا پیٹ بھرا ہوا ہو۔"

راز کی یہ باتیں سن کر وینگ لینگ خاموشی سے ایک طرف سرک گیا اور اس نے اپنی پھٹی ہوئی جیب میں دھات کے سکے گنے۔ اس تھوڑی سی رقم سے وہ چٹائیاں اور بانس خرید سکے گا اور بھکاری کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کر سکے گا، لیکن بھیک کیسے مانگے گا۔ وہ ایک جفاکش محنتی انسان رہ چکا تھا۔ بھیک مانگنے کا فن نہ آتا تھا۔ اس کا بوڑھا باپ اور ننھے منے بچے شاید بھیک مانگ لیں لیکن وہ یہ اذیت ناک مشقت نہ کر سکے گا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ کیا یہ ہاتھ بھیک مانگنے کے لیے ہیں؟ اس نے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی سے سوال کیا:

''کیا شہر میں ہاتھوں کو صرف بھیک ہی مانگنی پڑتی ہے کوئی کام ان کے لیے نہیں ہوتا؟''

''کیوں نہیں! وہاں رکشا چلا سکتے ہو جسے چلاتے وقت تمہارا خون پسینہ بن جاتا ہے۔ پسینہ سر کے بالوں سے ہوتا ہوا ایڑی تک جا پہنچتا ہے۔ رکشا آہستہ چلاؤ تو گالیاں سننی پڑتی ہیں۔ تیز چلاؤ پھر بھی گالیاں۔''

یہ سن کر اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ اس آگ گاڑی پر سوار جہاں جا رہا تھا، وہاں لوگ محنت کا مطلب سمجھتے ہیں۔

گاڑی منزل مقصود پر پہنچ کر رک گئی۔ دھکم پیل کے ساتھ، سب باہر نکلے۔ اس نے انہیں اس لوہے کے گھر سے باہر نکالا اور بولا: ''بابا تم ان کے ساتھ یہیں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔''

اور یہ کہہ کر وہ کھلے آسمان کے نیچے ایک چھوٹا گھر بنانے کے لیے کچھ چٹائیاں اور بانس خریدنے کے لیے چل پڑا۔ شہر میں دکانوں پر چہل پہل تھی جیسے قحط زدہ علاقے سے کوئی ہوا چل کر بھی ان کے پاس نہ پہنچی تھی۔ دکانوں پر ہر طرح کا گوشت لٹکا ہوا تھا۔ سبزیاں دھڑا دھڑ بک رہی تھیں۔ وینگ لینگ کو چٹائیوں کی دکان پر پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ اس نے ضرورت کی چیزیں خریدیں۔ اس کی ضرورت چٹائیوں اور بانسوں کے سوا کیا تھی۔ اس کی بیوی او۔ لین اس کی منتظر تھی۔ جب اس کا شوہر اس کے قریب پہنچا اور اس نے بتایا کہ سائبان بنانا نہیں آتا تو اس کی بیوی او۔ لین نے بچی کو زمین پر لٹا دیا۔

''میں ابھی سائبان بنا لوں گی۔ ابھی ہمارے سر پر سایہ ہو جائے گا۔''

وینگ لینگ کچھ مطمئن سا ہو گیا۔ وہ شہر میں آ پہنچے تھے یہاں پر ہر چیز کی بہتات تھی۔ یہاں بازار کے ہر کونے میں خیراتی کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ وینگ لینگ اور اس کا چھوٹا کنبہ ان ہزاروں میں ایک تھا، جو عارضی طور پر سائبان کے نیچے زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ یہاں ہر شخص کو کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ مل سکتا تھا۔ بھیک بھی تو وہاں ملتی ہے جہاں لوگوں کے پاس کھانے کے بعد کچھ بچ رہے۔ خیراتی تندوروں پر بہت بھیڑ تھی۔ وینگ لینگ بھی اپنے بوڑھے باپ بیمار بیوی اور بچوں کے ساتھ خیراتی کیمپ میں جا پہنچا۔ بچوں نے کانسی کے پیالے چاولوں سے بھر لیے۔ وینگ لینگ اور اس کی بیوی نے چاول اپنے ہاتھوں میں سنبھالے اور بھوکے کتوں کی طرح انہیں چاٹنے لگے۔ اس کے بچے جب چاولوں کا کشکول لے کر مڑنے لگے، تو ایک شخص نے جو سرکاری وردی پہنے ہوئے تھا، ان کا رستہ روک لیا۔

''تم یہاں سے کچھ بھی نہیں لے کر جا سکتے۔ لنگر اس لیے کھولا گیا ہے کہ صرف اپنے پیٹ کی آگ بجھاؤ۔''

وینگ لینگ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی:

''ہم یہ چاول اس لیے بچا کر رکھ رہے ہیں کہ صبح سویرے ہمارے کام آئیں۔''

اس پر سرکاری چوکیدار نے چاولوں سے بھرا ہوا کشکول چھین کر پرے پھینک دیا۔ وینگ لینگ اور اس کی بیوی بوڑھے باپ کو سنبھالا دیتے ہوئے اور بچوں کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے واپس بسیرے کی طرف چلے جو بانسوں اور کم قیمت چٹائیوں سے انہوں نے عارضی طور پر بنایا تھا۔ دوسری صبح انہیں پیٹ کی تپش بجھانے کے لیے پھر سکوں کی ضرورت تھی۔ آخری دھات کا سکہ تک خرچ ہو چکا تھا۔

وینگ لینگ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ انہی نظروں سے جیسے اپنے بنجر اور خالی کھیت کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ وہ اپنے گاؤں میں اپنی زمین پر جو اس کی طرح بھوکی اور پیاسی تھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے سکتے تھے، لیکن یہاں اس شہر میں کیسے بھوکے مریں۔

''میں اور بچے بوڑھے بابا کو لے کر بھیک مانگنے کے لیے نکلتے ہیں۔ شاید کسی کو میرے پھٹے ہوئے کپڑوں، بچوں کے آنسوؤں اور بوڑھے باپ کے سفید بالوں پر ترس آ جائے۔''

اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دونوں لڑکوں کو اپنے قریب بلایا۔ وہ گم سم اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ انہیں بھیک مانگنے کے طریقے سمجھانے لگی:

''پیالے کو آگے بڑھاؤ اور کہو اللہ کے نام پر۔ خدا کے نام پر۔ روتے ہوئے کہو، کچھ دے دو اللہ والو۔ ہم بھوکے ہیں۔ ایک سکہ۔ ہم بھوکے ہیں۔''

اور یہ سب کچھ سکھاتے ہوئے او۔ لین کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ آیا۔ وینگ لینگ رونے لگا۔ اس نے کبھی بھیک نہ مانگی تھی۔

''تمہیں بھیک مانگنے کا یہ طریقہ کس نے سکھایا ہے؟''
زہر خند کی ہنسی او۔لین کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی:
''زمانے نے، جب میں چھوٹی تھی۔اسی طرح ایک قحط پڑا تھا اور میرے ماں باپ نے مجھے بیچ دیا۔ یہ طریقہ بکنے سے پہلے میرے ماں باپ نے مجھے سکھایا تھا۔''
''پیالے کو ہر گزرنے والے کی طرف بڑھاؤ۔ رونے کی کوشش کرو۔''
اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بچوں کے منہ پر چانٹے برسانے شروع کر دیئے۔ آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر پلکوں پر پہنچے اور گالوں پر بہنے لگے۔
''جاؤ! اب جاؤ۔ تمہارے یہ آنسو دیکھ کر شاید رحم جاگ اٹھے۔ جاؤ تم اب بھیک مانگنے کے قابل ہو چکے ہو۔''
وینگ لینگ یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکا اور وہ اس جگہ پہنچا، جہاں رکشے کرائے پر دیئے جاتے تھے۔ رکشے کے مالک سے معاملہ طے کرتے دیر نہ لگی۔ وہ ایک فربہ جسم کا بیوقوف کاروباری تھا۔ اس کے رکشے اکثر بیکار پڑے رہتے تھے۔ شہر میں مزدور بیل کی طرح جوتنا بھول گئے تھے۔ وینگ لینگ نے جب مزدوری کے لیے رکشا مانگا، تو اڈے کے مالک نے تسلی تشفی کے بغیر رکشا اس کے حوالے کر دیا۔ تجربہ کار اڈے کے مالک نے پہلی ہی نظر میں وینگ لینگ کے چہرے اور حلیے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ فاقہ مست اسے دھوکا نہیں دے گا۔ گدھا محنت کر سکتا ہے لیکن دھوکا نہیں دے سکتا۔ لیکن اس نے رکشے کا کرایہ اتنا بڑھا دیا تھا، جو کوئی بھی محنت و مشقت کرنے والا شہری مزدور ادا نہیں کر سکتا تھا۔
وینگ لینگ نے رکشا تو لے لیا، لیکن اسے چلانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ آج تک وہ بیل ہانکتا رہا تھا۔ آج اسے خود بیل بن کر جتنا تھا۔ رکشے کے وزنی بم اس کے نحیف شانوں پر تھے اور اسے آج محسوس ہو رہا تھا کہ ہنکنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اسے اپنے اس بیل کا خیال آیا جو سر نیچے کئے ہوئے مدتوں تک اس کا کھیت وزنی ہل اٹھائے چپ چاپ گاہتا رہا۔ وینگ لینگ وزن اٹھانے کا عادی تھا، وزن کھینچنے کا نہیں۔
وہ تمام دن رکشا چلاتا رہا۔ اسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ سواری سے کتنا کرایہ لے اور شام پڑنے کے بعد جب وہ اڈے پر پہنچا، تو رکشے کے مالک نے کہا: ''کتنی مزدوری کی ہے؟''
''چھبیس دھات کے سکے۔''
''کتنا پینڈا کاٹا ہے۔''
''پتہ نہیں۔ منڈی سے چار مینار تک اور چار مینار سے منڈی کئی مرتبہ۔''
''تم بڑے بدھو ہو۔ اتنی مشقت کی اتنی تھوڑی مزدوری۔ کیا تم نے سواری بٹھاتے وقت کرایہ طے نہیں کیا تھا؟''
''نہیں جی۔ کسی نے آواز دی۔ میں قریب چلا گیا۔ وہ رکشے پر بیٹھ گئے، منزل پر پہنچ کر جو سکہ کسی نے اچھالا، میں نے دبوچ لیا۔''
''تم ابھی نئے ہو، کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کیا؟ کسی سے یہ نہیں کہا کہ میں غریب مزدور ہوں، تمہارا گریبان نوچ لوں گا۔ میرے بچے بھوکے مر رہے ہیں۔''
''میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔''
''تو تم کر چکے مزدوری۔ مزدور کا ہاتھ جب تک امیر کے گریبان تک نہ پہنچے، وہ جیب کی طرف اپنا ہاتھ نہیں بڑھاتا۔''
یہ نیا سبق سیکھ کر اور دھات کے دو چھوٹے سکے لے کر جو اس کے سارے دن کی کمائی تھی، وینگ لینگ اپنے عارضی چھپر تک پہنچا۔ او۔لین اس کا انتظار کر رہی تھی۔ چالیس سکے اس کے پاس تھے۔ چھوٹا بچہ پچیس سکے لایا تھا۔ بڑا آٹھ اور خود سات۔ بوڑھے کا کشکول خالی تھا۔ وہ شرمندہ ہو کر کہنے لگا:
''مجھے بھیک مانگنا نہیں آتا۔ چوراہے پر بیٹھے بیٹھے مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا اور جب اٹھا تو کشکول خالی تھا۔ رحم فریاد کئے بغیر نہیں جاگتا۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ ''میں تمام عمر زمین میں بیج بکھیرتا رہا ہوں۔ فصل کاٹتا رہا ہوں۔ مجھے بھیک مانگنا نہیں آتا۔''
وینگ لینگ نے جب یہ سنا تو آنسو نجانے اس کی آنکھوں میں کہاں سے نمودار ہوئے۔ اس نے آہستگی سے کہا:
''تم کل سے بھیک مانگنے کے لیے نہیں جاؤ گے بابا۔''
☆☆☆
وینگ لینگ اور اس کے چھوٹے سے کنبے کی بھوک کی شدت کم ہونے لگی۔ ان سب کو پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کچھ نہ کچھ میسر آ جاتا تھا۔ وینگ لینگ دن بھر مشقت کرتا۔ او۔لین اور بچے سارا دن گلی کوچوں میں بھیک مانگتے۔ محنت اور بھیک کی کمائی سے ان کے دن جوں توں گزر رہے تھے۔
وینگ لینگ کو اب شہر کے اہم مقامات اور گلی کوچوں کی شناخت بھی ہو گئی۔ تمام دن وہ شہر میں رکشا کھینچتا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ صبح کے وقت اگر کوئی عورت رکشے میں بیٹھے، تو خرید و فروخت کے لیے نکلتی ہے اور عورتیں اکثر کنجوس ہوتی ہیں۔ مرد رکشے میں بیٹھے تو وہ کاروباری مراکز کا رخ کرتے ہیں اور وہ بھی اکثر کنجوس ہوتے ہیں۔ رات کے وقت مرد رکشے میں تفریح گاہوں کی طرف

نکلتے ہیں ایسی تفریح گاہوں کی طرف جہاں سے موسیقی ابھر رہی ہوتی ہے اور لوگ بڑی بڑی چوبی میزوں پر آمنے سامنے بیٹھ کر ہاتھی کے دانتوں کے چمکتے ہوئے سکے لگاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے گھروں میں بھی جاتے ہیں، جن کے اسرار کا اسے پتہ نہ چل سکا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ صرف دروازے تک پہنچ سکتا تھا۔ دروازے تک اس کی منزل ختم ہو جاتی۔ وہ اس رنگ برنگے شہر میں ایک اجنبی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک چوہا امیر آدمی کے گھر کے کونوں میں ادھر ادھر چھپ کر اور بچی کھچی یا پھینکی ہوئی غذا کھا کر زندگی کے دن گزارتا ہے اور کبھی امیر آدمی کے گھر کا جز نہیں بنتا۔

وہ اپنے آبائی گاؤں سے تقریباً سو میل کے فاصلے پر تھے، لیکن اس جنوبی شہر میں رہتے ہوئے انہیں احساس ہوتا تھا، جیسے وہ اپنے گاؤں سے ہزاروں میل دور ہوں۔ اس کے اور اس کے کنبے والوں کے بال اور آنکھیں اس شہر میں بسنے والے لوگوں کی طرح تھیں۔ بول چال میں فرق ضرور تھا، لیکن اتنا نہیں کہ وہ ایک دوسرے کو اپنا مدعا نہ سمجھا سکیں۔ گاؤں میں سب لوگ ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ بولتے تھے لیکن یہاں شہر میں شاید تالو کے نیچے کوئی مشین لگی ہوئی تھی، جس کی مدد سے وہ بلا تکان تیز تیز بولنے میں کوئی دقت محسوس نہ کرتے تھے۔ گاؤں میں اگر کسی شخص کو گیہوں کی دو روٹیاں پیاز کا ایک ٹکڑا یا تھوڑی سی چٹنی مل جاتی تو وہ اسے اچھا کھانا سمجھتا تھا، لیکن یہاں شہر میں سیخ کباب، تکے اور طرح طرح کی سبزیاں، جن میں سالم مرغ دیکھا جا سکتا تھا کھاتے اور اگر کسی شخص کے منہ سے پیاز کی بو آتی تو وہ دوسری طرف منہ پھیر لیتا یا ناک پر رومال رکھ لیتا۔

وینگ لینگ نے شہر کی بیرونی فصیل کے سامنے کھلے میدان میں اپنا عارضی جھونپڑا بنایا تھا۔ اس کے جھونپڑے کے دائیں بائیں دور تک سینکڑوں ایسے جھونپڑے تھے، جس میں بے شمار لوگ رہتے تھے۔ ان لوگوں کا شہر کے لوگوں سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ وہ لاتعلق سے تھے۔ انہی جھونپڑوں میں رہنے والے ایک دن سب لوگ اکٹھے ہو گئے اور ایک شخص نے اونچی جگہ کھڑے ہو کر زور زور سے بولنا شروع کیا:

''چین میں انقلاب کی ضرورت ہے۔ ہمیں ان غیر ملکیوں کو اپنی سرزمین سے نکال دینا چاہیے۔''

وینگ لینگ یہ سن کر اس مجمع سے کھسک گیا۔ وہ سمجھا کہ وہ بھی ایک غیر ملکی ہے اور کہیں اس پر کوئی عتاب نازل نہ ہو اور پھر چند دنوں کے بعد ایک اور شخص نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''ہم سب کو اکٹھا ہو جانا چاہیے۔ ان سفید فام غیر ملکیوں کے خلاف۔''

یہ سن کر وینگ لینگ کی تسلی ہو گئی۔ اونچا اونچا بولنے والوں کا اشارہ اس کی طرف نہ تھا۔

ایک دن وہ ریشمی کپڑوں کی منڈی میں رکشا لیے سواری کا انتظار کر رہا تھا، تو ایک ایسی سفید رنگ کی عورت دکان سے نکلی جس کا ذکر اونچا بولنے والے اکثر کیا کرتے تھے۔ وہ عورت رکشے میں بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں دو بڑے بڑے بنڈل تھے اور جب وہ منزل پر پہنچی تو اس نے اسے پوچھے بغیر دگنا کرایہ ادا کر دیا۔

اور پھر اس دن شام کو ایک اور سواری اس کے رکشے میں بیٹھی۔ وہ اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ اس کا قد خاصا لمبا تھا۔ اس نے ایک لمبا کوٹ پہن اور کسی مردہ لومڑی کی دم گردن میں لٹکا رکھی تھی۔ وہ رکشا کھینچتا رہا۔ سواری نے ایک عجیب لہجے میں کہا: ''بڑے پل کی دوسری طرف۔'' یہ سنتے ہی وہ تیزی سے بھاگنے لگا ایک رکشا اس کے ساتھ جا رہا تھا۔ وینگ لینگ نے ساتھی رکشے والے سے پوچھا:

''دیکھو میرے رکشے میں کون ہے؟ میں کسے کھینچ رہا ہوں۔''

دوسرے نے رکشا کھینچتے ہوئے جواب دیا:

''یہ امریکن عورت ہے، تم آج امیر ہو جاؤ گے۔''

وینگ لینگ یہ سن کر اور تیزی سے بھاگنے لگا۔ وہ پسینے میں نہا گیا اور جب ہانپتے ہوئے اس نے اس عجیب و غریب مخلوق کو بڑے پل کی دوسری طرف ایک شاندار نو ساختہ بنگلے کے سامنے اتارا تو اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا:

''اوتم پسینے میں نہا گیا۔''

اور یہ کہہ کر اس نے اپنے بٹوے سے دو چاندی کے سکے وینگ لینگ کی ہتھیلی پر جما دیئے۔ سکوں کو دیکھ کر وینگ لینگ کی آنکھیں چمکنے لگیں:

''اتنا بہت سا کرایہ۔''

اور آج اسے یقین ہو گیا کہ سفید چمڑی والے امریکن بہت اچھے اور بہت امیر ہوتے ہیں۔ وینگ لینگ کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والے بھورے بالوں اور ہلکے رنگ کی آنکھوں کو پسند نہیں کرتے اور جب وہ اپنے جھونپڑے میں داخل ہوا اور اس نے اپنی بیوی او۔لین کو اس امریکن عورت کے متعلق بتایا جس نے اسے چاندی کے دو سکے دیئے تھے وہ سر ہلا کر بولی:

''میں نے ایسی کئی عورتوں اور مردوں کو دیکھا ہے۔ میں ان سے ''ضرور'' بھیک مانگتی ہوں۔ وہ کبھی میرے پیالے میں پیتل کے سکے نہیں پھینکتے بلکہ چاندی کا سکہ دے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔''

وینگ لینگ اور اس کی بیوی دونوں کو اس بات کا یقین تھا کہ یہ غیر ملکی فیاضانہ یہ سکے عطا نہیں کرتے، بلکہ اس لیے دے ڈالتے ہیں کہ انہیں اس بات کا پتہ نہیں کہ غریبوں کے کشکول میں چاندی کی جگہ پیتل کے سکے ڈالنے چاہئیں۔

وینگ لینگ اور اس کا چھوٹا سا کنبہ ایک ایسے گاؤں سے شہر میں آیا تھا، جہاں سوائے اناج یا اکا دکا سبزیوں کے کچھ نہیں خریدا جا سکتا، اس لیے چاندی کے بہت سے سکوں کی بھی گاؤں میں کوئی اہمیت نہ تھی، لیکن یہاں شہر میں بیشمار قابل خرید چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک بہت بڑی مچھلی منڈی تھی، جس میں سینکڑوں قسم کی مچھلیاں، نیلی، پیلی، سرخ، سنہری، ہر وقت بڑے بڑے ٹوکروں میں انبار لگی ہوتیں۔

ایک اناج کی منڈی تھی، جس میں ہر قسم کا اناج، کئی قسم کا چاول اور ہر قسم کی دال ڈھیروں کے حساب سے پڑی رہتی۔ ایک گوشت منڈی تھی، جہاں بڑے بڑے تندرست بکرے دنبے اور کئی دکانوں پر جو نسبتاً بڑی تھیں گائے اپنے پورے جسم کے ساتھ لٹکی نظر آتی تھی، جس سے قصاب اپنی تیز چھری سے گوشت کے بڑے بڑے پارچے کاٹ کر خریداروں کو دیتا۔

سبزی منڈی میں ہر طرح کی سبزی خواہ وہ زمین کے اندر اگتی ہو یا باہر ہر وقت بکنے کے لیے موجود ہوتی۔ غرض کہ اس شہر میں دنیا کی ہر وہ چیز بکتی تھی، جس کی انسان کی بھوک کو ضرورت یا خواہش ہوتی تھی۔

وینگ لینگ سارا دن اور رات گئے تک رکشا کھینچتا۔ او۔لین اور اس کے بچے سارا دن بھیک مانگتے اور اس کے باوجود وہ بوڑھے باپ کو روزانہ ہاتھ میں کانسی کا پیالہ دے کر خیراتی لنگر خانے کی طرف بھیج دیتے، جہاں سستے قسم کے چاول حاجت مندوں کو صرف دھات کا ایک سکہ دینے کے عوض ملتے تھے۔ کبھی کبھی دونوں بچے بھی بھیک مانگنے سے قبل اپنے بوڑھے دادا کے ساتھ چاول لینے کے لیے چلے جاتے۔ او۔لین نے اپنے جھونپڑے میں دو اینٹیں رکھ کر ایک عارضی سا چولہا بنا لیا تھا۔ دونوں بچے بھیک مانگنے کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی بیل گاڑیوں سے جن پر لکڑیاں لدی ہوتیں ایک آدھ چھوٹی سی لکڑی اچک لیتے، یا سوکھی ٹہنیاں ادھر ادھر سے اکٹھی کر لاتے۔ کبھی کبھی بچے چوری کرتے پکڑے جاتے اور پٹ کر واپس آتے۔ ایک مرتبہ بڑا بیٹا، جب واپس آیا تو اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی اور گال پر نیلے رنگ کا نشان تھا، جسے دیکھ کر او۔لین نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔

چھوٹا لڑکا ہوشیار اور چالاک تھا۔ بھیک مانگنے کے ساتھ ساتھ وہ چھوٹی موٹی چوری بھی کر لیتا۔ او۔لین انہیں کچھ نہ کہتی۔ اس لیے کہ پیٹ بھرنے کے لیے اگر بھکاری کو بھیک نہ ملے، تو چوری چکاری کرنے میں کیا حرج ہے۔ لیکن وینگ لینگ چوری کے سخت خلاف تھا۔ ایک رات وہ بہت دیر سے اپنے جھونپڑے میں واپس آیا۔ مٹی کی دیگچی میں گوشت کی ران پک رہی تھی۔ گوشت کی خوشبو آج بہت دنوں کے بعد وینگ لینگ کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی شاید اس دن کے بعد جب انہوں نے اپنے بوڑھے مریل بیل کو ہلاک کیا تھا۔

وینگ لینگ نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا:

"معلوم ہوتا ہے کہ آج پھر تمہارے پیالے میں کسی غیر ملکی نے چاندی کے سکے ڈالے ہیں۔" لیکن او۔لین خاموش رہی اور بھولا بھالا بیٹا فخریہ لہجے میں کہنے لگا:

"میں لایا ہوں، یہ گوشت جب قصاب ایک بوڑھی عورت کو گوشت کاٹ کر دینے لگا، تو میں نے آنکھ بچا کر یہ ران اڑا لی اور بھاگ کر ساتھ کی گلی میں چھپ گیا۔"

یہ سنتے ہی وینگ لینگ کی بھویں تن گئیں۔ وہ غصہ بھری آواز میں بولا: "یہ گوشت نہیں پکے گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے دیگچی میں کھولتے ہوئے پانی کی پرواہ کیے بغیر ران اٹھائی اور فرش پر پھینک دی۔ اس نے بچوں کے واویلے کی ذرہ برابر بھی پروانہ کی۔

"ہم صرف وہی گوشت کھائیں گے، جو ہم بھیک میں مانگیں یا خریدیں، ہم بھکاری ضرور ہیں، لیکن چور نہیں۔"

او۔لین نے شوہر کی باتوں کی پروانہ کی، آہستہ سے اٹھی۔ اس نے ران کو زمین سے اٹھایا، دھویا اور پھر دیگچی میں ڈال دیا۔

"گوشت آخر گوشت ہوتا ہے۔"

وینگ لینگ خاموش ہو رہا اور غصے کو چباتے ہوئے ایک کونے میں جا بیٹھا۔

او۔لین نے ہنڈیا پک جانے کے بعد گوشت کے کئی ٹکڑے کیے۔ سب سے نرم اور بڑا ٹکڑا اس نے وینگ لینگ کے بوڑھے باپ کے سامنے رکھ دیا، جو اسے "ندیدوں" کی طرح کھانے لگا۔ اور باقی گوشت او۔لین اور اس کے بچوں نے بڑی رغبت سے کھایا۔ وینگ لینگ بھوکا رہا۔ جب سب کھا چکے تو وینگ لینگ نے چھوٹے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اسے اتنے فاصلے پر لے گیا جہاں سے اس کی چیخیں ماں کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں۔ وہاں پہنچ کر اس نے کئی طمانچے بچے کے گالوں پر جڑ دیئے اور ہر چپت کے ساتھ زور زور سے چیختا رہا: "پھر کرو گے چوری، بتاؤ چوری کرو گے؟"

اور بچے کو سزا دینے کے بعد وہ اپنے جھونپڑے کی طرف چلا۔ سہما سہما بچہ ہچکیاں لیتا ہوا اس کے پیچھے قدم اٹھانے لگا۔ وینگ لینگ کے دماغ میں بار بار یہی خیال آ رہا تھا:

''ہمیں واپس اپنے گاؤں چلا جانا چاہیے۔ اپنی زمین پر۔''

☆☆☆

وینگ لینگ کو شہر میں کام کرتے کئی مہینے گزر گئے۔ وہ بدستور رکشا کھینچتا رہا۔ او۔لین اور اس کے دونوں بچے بھیک مانگتے رہے۔ گاؤں سے اپنے ساتھ وہ ایک چھوٹی سی بچی بھی لائے تھے۔ ایک ننھی منی سہمی سی بچی، جو بھوک کا شکار رہی تھی۔ کمزوری کے باعث وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہی تھی۔ وہ پھونس کے جھونپڑے میں سارا دن اپنے اونگھتے ہوئے دادا کے پاس زمین پر ادھر ادھر گھسٹتی رہتی۔ او۔لین کی جن چھاتیوں میں طغیانی پر آئی ہوئی ندی کی طرح دودھ بہتا تھا، سوکھنا شروع کر دیا۔ کچھ اس لیے بھی کہ وہ پھر ''امید'' سے تھی۔ کفایت شعار بن کر آنے والے بچے کے لیے دودھ جمع کر رہی تھی۔

وینگ لینگ اکثر اس بچی کو دیکھ کر گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ اسے اب تک چلنا پھرنا چاہیے تھا۔ کچھ بولنا چاہیے تھا، لیکن بچی نہ چل پھر سکتی تھی نہ بول سکتی تھی۔

ایک دن وینگ لینگ جب سارے دن کی محنت و مشقت کے بعد جھونپڑے میں واپس آیا، تو اس کا باپ جھونپڑے کے دروازے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ہوا میں کچھ نمی آ گئی تھی۔ یہ نمی اکثر آنے والی بارش کا پتہ دیتی تھی۔ وینگ لینگ نے سوتے سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اپنی زمین پر واپس جانے کے خواب دیکھے تھے۔ اس نے اپنے باپ کو جھنجھوڑا۔ ''بابا! ہمیں اب گاؤں واپس چلا جانا چاہیے۔ بیجائی کے دن آ گئے ہیں شاید بارش ہو۔''

بوڑھے نے آنکھیں کھول کر وینگ لینگ کی طرف دیکھا:

''ٹھیک کہتے ہو، میرا تجربہ بھی کہتا ہے کہ اس مرتبہ بہت بارش ہوگی، لیکن ہمارے پاس زمین کے سوا کیا بچا ہے۔ نہ کوئی ہل ہے نہ کوئی بیل، اور نہ زمین پر بکھیرنے کے بیج۔۔۔''

وینگ لینگ نے یہ سنا۔ ایک آہ بھری۔ بوڑھے کی باتوں میں کتنا سچ تھا۔ وہ آہستگی سے جھونپڑے کے اندر چلا گیا۔ اس کی ننھی بچی شاید سو رہی تھی اور اس کی بیوی برتن مانجھ رہی تھی۔ وینگ لینگ نے بیوی کی طرف دیکھا اور حسرت بھری آواز میں کہا:

''سوچتا ہوں، جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے بیچ کر گاؤں واپس چلے جائیں۔''

''ہمارے پاس بیچنے کے لئے کیا رہ گیا ہے، صرف یہ بچی! اسے بیچ دو۔''

وینگ لینگ کا گلا خشک ہو گیا، سانس رک گئی وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا: ''نہیں نہیں، میں بچے نہیں بیچوں گا، میں اپنی بچی نہیں بیچوں گا۔''

''میں بھی ایک دن بکی تھی۔ ایک دولت مند گھرانے کے لوگ مجھے اس لیے خرید کر لے گئے کہ میرے قحط زدہ ماں باپ اپنے گاؤں واپس جانا چاہتے تھے۔ اپنی زمین پر۔ تم بھی اس بچی کو بیچ دو، زمین ماں ہوتی ہے۔ ماں کے لیے بیٹی کو قربان کر دو۔''

''نہیں نہیں میں یہ سودا نہیں کروں گا۔ یہ گم سم ننھی سی کمزور بچی میں کسی قیمت پر نہیں بیچوں گا۔''

کہنے کو تو وینگ لینگ نے یہ سب کہہ دیا، لیکن شاید یہ سب اس کی مرضی کے خلاف تھا، زمین کے مقابلے میں اس بچی کی کیا اہمیت تھی، جو کمزور تھی، گونگی اور ہر وقت میلے فرش پر گھسٹتی رہتی تھی۔

یہ سوچتے ہوئے اس نے بچی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک بجھی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ اس کا ضمیر بچی اور زمین کو سوچ کے ترازو میں تولنے لگا تھا اور وہ جب فیصلے کے امتحان میں پورا نہ اترا، تو جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔

رات ہو چکی تھی، وہ جھونپڑے سے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے گھر سے دور تک کئی جھونپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ دوسرے جھونپڑے سے ایک تنومند ادھیڑ عمر شخص نکلا۔ وینگ لینگ اسے کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ وہ کوئی محنت و مشقت نہیں کرتا تھا، لیکن اس کے جھونپڑے میں ہر روز گوشت پکتا تھا۔

کیسے؟

یہ راز وینگ لینگ آج تک معلوم نہ کر سکا تھا۔ وہ چرٹ جس میں سے تمباکو اور افیون کی بدبو آ رہی تھی، منہ میں دبائے ہوئے اس کے قریب آیا۔ اس نے دو تین لمبے کش بھرے۔

''یہاں کیوں کھڑے ہو!''

''بس یونہی''

''شاید غربت سے گھبرا گئے ہو''

''نہیں تو''

''تو پھر چپ کیوں کھڑے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں اپنے گاؤں واپس چلا جاؤں۔ اپنی زمین پر۔''

''تو کچھ جمع پونجی ہے؟''

''نہیں تو''

"تو پھر تم واپس گاؤں کیسے جا سکتے ہو؟"

یہ کہہ کر اس نے دو تین لمبے کش بھرے اور زمین پر تھوکتے ہوئے بولا: "سنو یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، ہمیشہ نہیں ہو گا۔ جب امیر بہت زیادہ امیر ہو جاتے ہیں۔ غریب بہت زیادہ غریب ہو جاتے ہیں، تو کچھ ضرور ہو کر رہتا ہے۔ پچھلی سردیوں میں میں نے اپنی دو کم سن بیٹیاں بیچیں۔ اس لیے کہ سردی کے دن آرام سے گزار سکوں۔ میری بیوی پھر حاملہ ہے۔ پورے دنوں پر ہے، اگر پھر بچی پیدا ہوئی، تو بیچ دوں گا۔ بچوں کو ہلاک کر دینے سے بیچ دینا اچھا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے شانے اچکائے۔ "اس میں شک نہیں کہ چند والدین ایسے ہوتے ہیں، جو ننھے منھے بچے بیچتے ہیں ان کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ یہ ایک رستہ ہے۔ جب غریب بہت زیادہ غریب ہو جاتا ہے۔ دیکھو دور اس بازار کے دوسری طرف تمہیں روشنیاں نظر آئیں گی۔ جھلمل کرتی ہوئی روشنیاں! میں اپنی بیٹی کو ان روشنیوں کی طرف لے گیا تھا۔ بیچنے کے لیے۔ تم نہیں جانتے وہاں کیا ہوتا ہے۔ ہر وقت دولت چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اس روشنیوں کے محلے میں ملازم پیشہ لوگ بھی ہاتھی دانت کے دستوں والے چمچوں اور چھریوں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ معمولی سے معمولی خادمائیں بھی سونے کے زیور پہنتی ہیں۔ ایسے جوتے پہنتی ہیں، جن پر مٹی کا ذرا بھر نشان بھی نظر آ جائے تو اسے اچھال کر گلی میں پھینک دیتی ہیں۔"

وینگ لینگ حیرت سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"یہ بھی ایک رستہ ہے، جس پر چل کر لوگ بہت جلد امیر ہو جاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وینگ لینگ کا ہمسایہ چرٹ کے لمبے لمبے کش بھرتا ہوا ساتھ کی گلی میں غائب ہو گیا۔ اس رات وینگ لینگ سو نہ سکا۔ اس کے ذہن پر ہمسائے کی باتیں ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ اس کا ضمیر مردہ ہونے لگا۔ ایک نئی خواہش نے اس کے ذہن میں جنم لیا۔

کیوں نہ اپنی بچی بیچ دے۔ ایک ایسے گھر میں، جہاں وہ من بھاتے کھانے کھائے، جو جی چاہے پہنے۔ عیش کی زندگی گزارے۔ بچی بیچنے کے بعد وہ اپنے گاؤں جا سکتا ہے۔ بیج خرید سکتا ہے۔ نیا ہل اور بیل۔ لیکن ان خیالات کے ساتھ ساتھ ہی اس کے ذہن میں ہمسائے کے یہ الفاظ گونج رہے تھے:

"یہی رستہ ہے، جب غریب بہت غریب ہو جاتے ہیں۔"

☆☆☆

موسم بہار آ پہنچا۔ سردی کی شدت ختم ہوتے ہی، جب رات ہو جاتی تو جھونپڑوں میں رہنے والے باہر کھلے میدان میں نکل آتے ہیں۔ سردی کے زمانے میں سب اپنے اپنے جھونپڑوں میں دبکے رہتے اور کسی کو ایک دوسرے سے کھل کر باتیں کرنے اور مراسم بڑھانے کا موقع نہ ملتا، لیکن کھلی بہار میں تمام لوگ اپنے اپنے جھونپڑوں سے باہر نکل آتے تھے۔ یہ آبادی تقریباً ان لوگوں پر مشتمل تھی، جو سارا دن بھیک مانگتے تھے یا اس قسم کی محنت و مشقت کرتے تھے، جو شہری مزدوروں کے بس کا روگ نہ تھی۔ جھونپڑوں سے باہر نکل کر وہ زمین پر چٹائیاں یا دریاں بچھا کر سو جاتے۔ وہ ایک قبرستان کا منظر پیش کرتے، جس میں سانس لیتی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ سونے سے پہلے وہ تمام دن کی بپتا کی داستاں ایک دوسرے سے بیان کرتے اور جو کٹھن دن ان پر سے گزرا ہوتا اس کی کہانی وہ درد بھرے لہجے میں مزے لے لے کر ایک دوسرے کو سناتے۔

لیکن وینگ لینگ نے اپنے آپ کو ایک مزدور ہوتے ہوئے بھی، جس کی بیوی اور بچے سارا دن بھیک مانگتے تھے کبھی ان میں شمار نہیں کیا تھا۔ وہ زمین کا مالک تھا۔ ایک کسان جسے نامساعد حالات نے شہر میں ضرور لا پھینکا تھا لیکن وہ بنیادی طور پر ایک کاشتکار تھا۔ ایک خود مختار حیثیت کا مالک۔ وہ ان لوگوں کو جو رات کے وقت اپنے اپنے جھونپڑوں سے نکل آتے تھے، باتیں کرتا ہوا سنتا۔ ہر شخص پیسوں اور روپوں کی بات کر رہا تھا۔ اپنی اپنی غربت کی، کوئی مہنگائی کا رونا رو رہا تھا اور کوئی اپنی ناداری کا۔ وہ سب امیروں اور پیسے والوں کے لیے شدید نفرت رکھتے تھے۔ فطری طور پر ان کے دشمن تھے۔ تمام لوگ پیسے والوں کی ایک ایک برائی گن گن کر سناتے۔ کیسے وہ جوا کھیلتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں اور افیون کی چسکیاں لیتے ہیں اور کس طرح اپنی نفسانی خواہشات بجھانے کے لیے ابھرے ہوئے پستانوں اور گدرائی ہوئی رانوں والی جوانیاں بھاری رقم دے کر خریدتے ہیں۔ سب غریبوں کا خیال تھا کہ دولت لٹانے اور عیش و عشرت کے علاوہ امیر بالکل نکمے ہوتے ہیں اور کوئی کام نہیں کرتے۔

وینگ لینگ ان کی گفتگو میں حصہ نہ لیتا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔ بالکل اس عاشق کی طرح جس کا محبوب اس سے روٹھ گیا ہو۔ وینگ لینگ ایک سیدھا سادا محنتی آدمی تھا، وہ مشکل باتیں سوچنے کا عادی نہ تھا، لیکن اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ شہر کی فضا کچھ بدلی سی ہے اور جو بارش نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

وہ سارا دن رکشا کھینچتا اور ایک نئی چیز جو اس نے دیکھی وہ یہ

تھی کہ لوگ کچھ کاغذ، جن پر کچھ لکھا ہوتا بانٹتے ہوئے نظر آتے۔ کچھ بڑے بڑے کاغذ دیواروں پر چپکے ہوتے ہیں۔ ایک دو مرتبہ ایسے ہی ایک دو کاغذ اسے بھی دیئے گئے۔ یہ کاغذ ایک دبلے پتلے لمبے شخص نے اسے دیئے تھے جو ایک بغیر پتوں والے لمبے درخت کی طرح تھا جس کا ایک ایک پتا تیز چلتی ہوئی ہوا نے چھین لیا ہو۔ اس شخص کی آنکھیں برف کی طرح سفید ہلکی سی نیلاہٹ لیے ہوئے تھیں۔ اس کی ناک اس کے گالوں سے، جس پر کوئی گوشت نہ تھا باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس نے جب وینگ لینگ کی طرف کاغذ بڑھایا تو وہ اسے لینے سے انکار نہ کرسکا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں ایک ایسی وحشت اور درندگی دیکھی، جس کی وہ تاب نہ لاسکا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے کاغذ پر نظر ڈالی۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ کاغذ پر ایک تصویر بنی ہوئی تھی ایک ایسے شخص کی جو ننگا تھا۔ تنکے کی طرح سوکھا ہوا تھا، ہڈیوں کا پنجر تھا، جس کی آنکھیں گالوں کی ہڈیوں کے درمیان دھنسی ہوئی تھیں۔ وینگ لینگ نے حیرت سے اس تصویر کی طرف دیکھا۔ تصویر دیکھنے کے بعد اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ وہ اس تصویر کو لے کر اپنے جھونپڑے میں آ گیا اور اس نے یہ تصویر اپنے بوڑھے باپ کو، جس کی کھانسی میں زیادتی ہو گئی تھی، دکھائی۔ اس نے چندھیائی ہوئی نظروں سے دیکھا وہ بھی پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ وینگ لینگ نے تصویر کو پھر غور سے دیکھا، جس شخص کی تصویر کاغذ پر بنی ہوئی تھی اس کی ایک پسلی سے خون رس رہا تھا۔ باپ اور بیٹے نے اس تصویر کے مختلف معانی تلاش کرنے شروع کیے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچے۔

تیسری مرتبہ ایک اور کاغذ وینگ لینگ کے ہاتھوں میں تھما دیا گیا۔ کاغذ بانٹنے والا چھپ کر چوری سے یہ کاغذ تقسیم نہیں کر رہا تھا بلکہ اونچا اونچا بول کر، بیشمار لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے اور وہ آزادانہ طور پر یہ کاغذ بانٹ رہا تھا، جس پر خون میں نہائی ہوئی لاش کی تصویر تھی۔ اس لاش کی شکل وینگ لینگ سے مشابہ تھی اور اس نے بالکل اس کی طرح پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس لاش پر ایک بے تحاشا موٹا آدمی، جس کے ہاتھوں میں برچھی تھی، کھڑا تھا۔ وینگ لینگ نے اس مرتبہ ڈرے بغیر تصویر کو اچھی طرح دیکھا اور آج زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اس بات کا شدید دکھ ہوا کہ اس کاغذ پر لکھے ہوئے حروف وہ کیوں نہیں پڑھ سکتا۔ ان پڑھ ہونے کی ندامت کے احساس سے وہ ایک دوسرے شخص کے قریب پہنچا، جو غور سے اس کاغذ کو دیکھ رہا تھا۔

''اس پر کیا لکھا ہے؟''

''لکھا ہے کہ لاش ایک جفاکش غریب کی ہے، جو مر چکا ہے اور جس نے اسے ہلاک کیا ہے، ایک دولت مند ہے۔ سرمایہ دار جو مرنے کے بعد بھی لاش پر برچھیاں برساتا ہے۔''

کاغذ بانٹنے والا اب زور زور سے بول رہا تھا:

''بارش نہیں ہوئی۔ نہ ہو! اس میں غریبوں کا قصور نہیں! کوئی غریب بھوکا نہ مرتا اگر امیر اور پیسے والے گندم کا ذخیرہ نہ کرتے۔ امیر غریبوں میں گندم تقسیم کر دیتے، تو قحط نام کی کوئی چیز نہ تھی! غریب لوگ اس لیے بھوکے مرے اور مریں گے کہ دولت مند سانپ بن کر اپنی تجوریوں پر بیٹھے ہیں۔ غریبوں کے کھلیان ان کے زمیں دوز تہہ خانوں میں جمع ہیں۔ ان دولت مندوں کو ہلاک کر دو۔ ہمیشہ کے لیے ختم کر دو، جو تمہیں موت کی نیند سلا چکے ہیں۔ انہیں جینے کا کوئی حق نہیں، جو دوسروں کو موت دینا چاہتے ہیں۔۔۔''

یہ سنتے ہی وینگ لینگ کی خوابیدہ حسرتیں مچلنے لگیں۔ دولت مندوں کے خلاف ایک ایسا جذبہ اس کے ذہن میں پیدا ہوا، جس کا وہ مطلب بھی نہیں جانتا تھا۔ تمام لوگوں نے جو کاغذ بانٹنے والے کے قریب جمع ہو گئے تھے ایک نعرہ لگایا۔ اس نعرے میں وینگ لینگ کی آواز شامل نہ تھی۔ وہ اس وقت بھی اپنی زمین کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس نے کاغذ زمین پر پھینک دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کاغذ اسے کیوں دیا گیا ہے۔ ایک ایسے شخص کو، جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا، لیکن اسے غیر شعوری طور پر اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے اور امیر آدمی اچھے نہیں ہوتے۔

وینگ لینگ پکی سڑک پر رکشا کھینچتا رہا۔ کچی زمین اس کے خیالوں میں رچی تھی۔ اس شہر میں اب ہر طرف نعرے لگنے لگے تھے۔ سپاہی جنہوں نے موٹے موٹے بوٹ پہنے ہوتے سنگین ہاتھ میں لیے ہوئے اسے ہر گلی میں چلتے پھرتے نظر آتے۔ ان کا شغل اور پیشہ مارنا پیٹنا تھا۔ وہ راہ چلتے لوگوں کو سنگینوں کی زد میں لے لیتے، ٹھوکروں سے ان کی تواضع کرتے۔ کوئی مقابلے کے لیے کھڑا ہو جاتا، تو مار مار کر اس کا کچومر نکال دیتے۔ وینگ لینگ کو آج تک کسی سپاہی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے بھاری بوٹوں سمیت کھٹ کھٹ کرتے قریب سے گزر جاتے، لیکن اسے ایک ڈر محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ انہیں ظالم اور جابر سمجھنے لگا تھا اور اپنے آپ کو مجبور و مظلوم! جابر اور ظالم، مجبور و مظلوم ایک برادری سے تعلق نہیں رکھتے۔

اس نے ایک دن اپنے ہمسائے سے پوچھا، جو کاغذ پر لکھے ہوئے حروف پڑھ سکتا تھا۔ ''یہ سپاہی بےگناہ لوگوں کو کیوں پکڑتے ہیں؟ کیوں مارتے ہیں؟''

ہمسائے نے جواب دیا: ''سپاہیوں کا یہی کام ہوتا ہے۔ یہ

سمجھتے ہیں کہ ہم سب باغی ہیں اور ہم نے اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں میں پھٹنے والے بم چھپا رکھے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے پڑھے لکھے بوڑھے ہمسائے نے کہا: "اب کچھ ہوکر رہے گا۔ ایسا ہوکر رہتا ہے۔ جب امیر بہت امیر ہو جاتے ہیں اور غریب بہت غریب۔"

وینگ لینگ نے ہمسائے کی بات کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی اپنے جھونپڑے میں پہنچ کر اس نے اپنی بیوی اور بوڑھے باپ کو بتایا کہ شہر میں کچھ ہونے والا ہے۔ اس شہر میں ظلم کے سوا کچھ نہیں اور کسی وقت بھی کچھ ہوسکتا ہے۔

او۔لین نے سادگی سے کہا: "ہمارے ساتھ اور کیا ہوسکتا ہے۔"

"سپاہی مجھے پکڑ سکتے ہیں۔"

"کس جرم میں؟"

"بغاوت کے جرم میں۔"

"مجھے پتہ نہیں، لیکن یہ لفظ میں روز سنتا ہوں۔"

"تو کیوں نہ ہم واپس اپنے گاؤں چلے جائیں۔ مجھے یہ شہر پسند نہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو، لیکن گاؤں جانا اتنا آسان نہیں۔ لمبا سفر، بوڑھے بابا اور بچوں کا ساتھ۔ اور تم بھی ایک نئے بوجھ کے ساتھ ہو۔ کچھ بھی مشکل نہ ہوتا اگر ہمارے پاس چاندی کے سکے ہوتے۔"

"میں کئی بار کہہ چکی ہوں، بچی بیچ دو۔"

وینگ لینگ نے یہ سن کر بچی کی طرف دیکھا۔ اس کے معصوم چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ ہونے والی گفتگو کا مطلب نہیں سمجھی تھی۔ وینگ لینگ دیر تک بچی کا چہرہ دیکھتا رہا۔

ابھی اس نے یہ فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ باہر سے نعروں کی آواز گونجنے لگی۔ یہ آواز جیسے پوری بستی کی آواز تھی۔ یہ آواز زیر و بم کے بغیر آرہی تھی، جیسے شہر پھٹ پڑا تھا۔ رات اور بستی جاگ اٹھی تھی۔ جھونپڑی میں رہنے والے شور مچاتے اس آواز کی طرف لپک رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں، جن سے کئی زبانوں والے شعلے نکل رہے تھے اور اس کی لاش پر کھڑے ہوکر نعرے لگا رہے تھے۔

وینگ لینگ اپنی جھونپڑی میں چھپا رہا۔ اسے باہر نکلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دوسرے دن اس نے ایک نیا منظر دیکھا۔ غیر ملکی، جو دولت مند تھے اور امیر تھے اپنے قیمتی سامان اور اپنی خوبصورت بیویوں کے ساتھ شہر چھوڑنے لگے۔ وہ دریا کے کنارے تک منہ مانگا کرایہ دیتے اور چھوٹے چھوٹے جہازوں میں بیٹھ کر کہیں چلے جاتے۔ دوسری سمت پر آگ گاڑیاں آتی جاتی رہتیں، غیر ملکیوں اور ان کے قیمتی ساز و سامان کو ساتھ لے کر کسی انجانی منزل کی طرف روانہ ہو جاتیں۔ کچھ دنوں کے بعد لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ غریب لوگوں کا جم غفیر دولت مندوں کے مقفل دروازے توڑنے لگا۔ جونہی رات ہوتی انجانے آدمیوں کے گروہ کہیں سے نمودار ہوتے ان کے ہاتھ میں وزنی ہتھوڑے ہوتے۔ پھر ایک رات وینگ لینگ نے بہت سے سپاہی دیکھے، جن کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی سنگینیں تھیں اور وہ سڑکوں پر گشت کرنے لگے۔ وینگ لینگ سیدھی سادی کھوپڑی کا آدمی تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ فوجی دستوں کے آنے کے بعد تمام شہر کی مخلوق سہم سی گئی ہے اور عام آدمی ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے۔ اس کے جھونپڑے کے باہر بھی لوگوں نے اکٹھا ہونا چھوڑ دیا تھا دکانوں پر بکری کم ہوگئی تھی اور اکثر بڑی دکانیں، جن کے مالک غیر ملکی تھے بند پڑی تھیں۔ یہ خبر عام تھی کہ دشمن کی فوجوں نے حملہ کر دیا ہے۔ تمام بچے کھچے دولت منداور پیسے والے ہراساں اور خوف زدہ تھے، لیکن غریبوں کی اس بستی میں، جہاں وینگ لینگ کا جھونپڑا تھا کوئی ہراساں نہ تھا اور نہ خوف زدہ۔ ان کے قبضہ میں کوئی ایسی چیز نہ تھی، جس کے چھن جانے کا ڈر ہو۔ ان کی زندگی موت سے بدتر تھی۔ اس لیے انہیں مرنے کا خوف بھی نہ تھا۔ وہ سب سوچتے دشمن آتا ہے، تو آنے دو۔

وینگ لینگ بھی بالکل بیکار ہوگیا۔ رکشے میں بیٹھنے والی کوئی سواری نہ تھی، چند سکے جو اس نے سخت محنت و مشقت اور اس کے کنبے والوں نے بھیک مانگ کر اکٹھے کیے تھے، برف کی ڈلی کی طرح پگھل گئے، اب کوئی خیراتی لنگر خانہ بھی نہ تھا، جہاں سے وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکتے۔

وینگ لینگ اس دوران میں اپنی بچی کی طرف جسے وہ کئی مرتبہ بیچنے کا ارادہ کر چکا تھا عجیب و غریب نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے سوچا کہ وہ بیچ دے ایک ایسے گھر والوں کے حوالے کر دے جہاں اسے تن ڈھانپنے کا کپڑا اور کھانے کے لیے دو وقت کی روٹی مل سکے۔ یہ سوچ کر وینگ لینگ اپنی بیوی او۔لین کے قریب سرک گیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا:

"یہ بتاؤ، جب تمہیں بیچا گیا تو کیا بڑی حویلی والے تمہیں مارتے پیٹتے تھے؟"

"ہر روز"

"کیا وہ تمہارے منہ پر طمانچے مارتے تھے؟"

"نہیں، چمڑے کے کوڑے، وہ ہر وقت باورچی خانے میں

باورچی کے ہاتھ میں بھی ہوتا تھا۔ برتن ٹوٹ جاتا تو بڑی سزا ملتی۔"
"کیا وہ ان بچوں کو بھی پیٹتے تھے، جن کی شکل منی جیسی تھی۔ میرے کہنے کا مطلب ہے، جو خوبصورت تھے؟"
"نہیں انہیں اچھی خوراک دی جاتی تھی، تا کہ وہ جلد جوان ہو جائیں اور انہیں دولت مند رئیس زادوں کی خلوت گاہ میں بھیجا جا سکے۔ ہر رات ایک نئے بستر پر۔"
"ہاں! اور جب رئیس زادوں کا دل بھر جائے تو پھر گھر کے دیرینہ ملازموں کے پاس۔"
یہ سنتے ہی وینگ لینگ کے منہ سے جیسے چیخ نکلی۔ مجبوری کے آنسو آنکھوں میں تیرنے لگے۔ اس نے ننھی بچی کو سینے سے لگا لیا۔ یکا یک ایک بہت بڑا دھما کا ہوا، جیسے آسمان میں شگاف پڑ جائے۔ وینگ لینگ کے بوڑھے باپ کی آواز آئی:
"ایسی آواز میں نے آج تک نہیں سنی۔ ایسا گرج دار دھما کہ بچے چیخ چیخ کر رونے لگے۔ او۔لین اپنی عادت کے مطابق خاموش رہی اور کچھ لمحوں کے بعد بولی:
"یہ توپ کی آواز ہے، دشمن شہر کے قریب پہنچ گیا ہے۔" پھر بیشمار آوازیں بلند ہوئیں، جیسے تمام شہر بولنے لگا ہو۔ یہ واویلا بلند ہوتا جا رہا تھا۔ پھر شہر کے بیرونی دروازے کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ جھونپڑوں میں سے چھپروں میں لیٹے بھیک منگوں نے بھی نعرہ بلند کیا۔ بیشمار لوگ او۔لین کے سامنے سے چلاتے ہوئے گزرے۔ اس کا موٹا ہمسایہ چیخ رہا تھا:
"جس وقت کا انتظار تھا وہ وقت آ گیا ہے۔ دولت مندوں کے دروازے ٹوٹ گئے ہیں۔"
وینگ لینگ اور او۔لین بھی ایک انجانے جذبے کے تحت اس گروہ میں شامل ہو گئے، جو سیلاب کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہے تھے ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ انسانوں کے کئی گروہ نجانے کہاں سے ابل کر ان سب کے ساتھ آ ملے تھے۔ دولت مندوں کے گھروں پر یلغار شروع ہو گئی۔
آہنی دروازے ٹوٹنے لگے، بھوکوں کے اس ہجوم نے آہنی دروازوں کو زمین سے اکھاڑ پھینکا۔ سب اندھا دھند مکانوں کو تاخت و تاراج کرنے لگے، جس کا جی چاہتا مکانوں میں داخل ہو جاتا۔ وینگ لینگ بھی ایک گروہ کے ساتھ جو چنگھاڑ رہا تھا ایک بڑی حویلی میں داخل ہوا تھا۔ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے ہجوم میں کسی ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ گھر اور حویلیاں خالی ہو چکی تھیں۔ جس دولت مند کے بڑے مکان میں وینگ لینگ داخل ہوا اس میں کوئی تنفس نہ تھا۔ سجے سجائے کمرے دیکھ کر اور کئی آتش دانوں میں آگ جلتی

دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس حویلی کے مکین ابھی ابھی فرار ہوئے ہیں۔ وینگ لینگ کے ساتھ بلوائی لوٹ کھسوٹ میں لگ گئے اور مال غنیمت پر بری طرح حملہ آور ہوئے کہ چھینا جھپٹی کرتے ہوئے ایک دوسرے پر بھوکے چیتوں اور کتوں کی طرح حملہ آور ہوئے۔ وینگ لینگ ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس نے آج تک اس چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا جو اس کی اپنی نہ ہو۔ وہ پرائی چیز کو چھونا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ ابھی لوٹ کھسوٹ کا یہ منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ جم غفیر کے ایک دھکے سے وہ لڑھکتا ہوا ایوان کی راہ داری میں آ گرا۔ بچتا بچاتا وہ ایوان کے اندرونی کمرے میں جا پہنچا۔ کمرہ آراستہ و پیراستہ تھا اور بالکل خالی تھا۔ بلوائیوں نے جن کے چیخنے اور شور مچانے کی آواز مسلسل آ رہی تھی اس طرف رخ نہ کیا۔ کمرے میں ایک مدھم سا فانوس جل رہا تھا اور ایک دبیز بستر پر جس پر بڑے بڑے گدے پڑے تھے ایک بہت موٹا لحیم شحیم شخص بالکل ننگا لیٹا ہوا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک خوبصورت عریاں عورت لیٹی ہوئی تھی۔ اس موٹے شخص کے سینے پر گوشت جیسے تہہ بہ تہہ لپٹا ہوا تھا۔ اس کے گلے چڑھے ہوئے تھے۔ اور آنکھیں سور کی آنکھوں کی طرح چھوٹی اور اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ وینگ لینگ کو دیکھ کر وہ کانپنے لگا اور کسی انجانے خوف سے گڑگڑانے اور آہ و بکا کرنے لگا۔ وینگ لینگ کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہ تھا۔ وینگ لینگ کو اس کی بیچارگی پر ترس آیا۔ موٹا اسی حالت میں وینگ لینگ کے قدموں میں آ گرا اور اپنا سر اس کے قدموں پر رگڑنے لگا۔
"بچاؤ مجھے خدا کے لیے بچا لو، مجھے قتل نہ کرو، تمہیں بہت نقدی دوں گا، جتنے مانگو گے اتنے ہی چاندی اور سونے کے سکے۔"
"روپے" وینگ لینگ سکوں اور نقدی کا نام سن کر چونک پڑا۔ اسے اس کی سخت ضرورت تھی، جیسے کوئی زور زور سے اس کے کانوں میں کہہ رہا تھا، تمہیں بچی نہیں بیچنی پڑے گی۔ تم اپنی زمینوں پر واپس چلے جاؤ گے۔ اس نے گرج دار آواز میں کہا: "تو لاؤ کہاں ہے نقدی؟"
یہ سنتے ہی موٹا آدمی تیزی سے اٹھا۔ اس نے اپنی سرخ رنگ کی مخملیں قبا کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مٹھی بھر سونے کے سکے باہر نکالے۔ وینگ لینگ ایک مرتبہ پھر چیخا "اور نکالو۔" موٹے آدمی نے دوسری جیب ٹٹولی اور باقی طلائی سکے وینگ لینگ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:
"اب کچھ نہیں رہا، قسم ہے مجھے اپنی جان کی، جو تمہارے قبضے میں ہے۔"
اور یہ کہہ کر وہ ٹھٹھرے ہوئے بچے کی طرح کانپنے لگا۔

"بخش دو، میری جان بخش دو۔"
وینگ لینگ کو اس پر ترس آ گیا، لیکن مصنوعی غصے سے بولا:
"میری نظروں سے دور ہو جاؤ، ورنہ میں ایک موٹا لٹیرا سمجھ کر مسل دوں گا۔"
وینگ لینگ نرم دل کا آدمی تھا فطرتاً رحم دل جس نے کبھی بیل بھی ہلاک نہیں کیا تھا۔ موٹے نے یہ سن کر ایک چھلانگ لگائی اور زخمی کتے کی طرح اچھل کر اندرونی کمرے کی طرف بھاگ نکلا۔
وینگ لینگ اب کمرے میں اکیلا تھا۔ سونے کے سکے اس کے ہاتھوں میں تھے۔ انہیں گنے بغیر اس نے اپنے پھٹے ہوئے شلوکے کی اندرونی جیب میں ڈال لیا، سکے ابھی گرم تھے شاید وہ موٹے آدمی کی جیب کی گرمی زائل نہ کر سکتے تھے۔ وہ چپکے سے باہر نکلا۔ اس کے ذہن میں صرف یہی ایک خیال تھا کہ ہم اپنی زمینوں پر واپس چلے جائیں گے۔ کل۔ ہاں۔ کل۔

☆☆☆

اپنی زمینوں پر واپس آئے ابھی وینگ لینگ کو چند دن ہی ہوئے تھے کہ اس نے محسوس کیا کہ وہ کبھی اپنی زمینوں سے جدا نہیں ہوا۔ مصیبت اور کلفت کے تمام ایام گزر چکے تھے اور ان کی یادیں باقی تھیں، جنہیں وہ آہستہ آہستہ ختم کر رہا تھا۔ سونے کے کچھ سکوں سے اس نے جنوبی منڈی سے چاول اور گندم کے بہت عمدہ بیج خرید لیے تھے۔ وہ اپنی زمین پر ایسے خوشبودار چاول اگانا چاہتا تھا، جو گردونواح کا کوئی کاشت کار بونے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔
وہ اپنی زمین پر کاشت کرنے کے لیے ہر قسم کی سبزیوں کے علاوہ بیج بھی لایا تھا۔ سونے کے پانچ سکوں کے عوض اس نے ایک قوی الجثہ تندرست بیل بھی خرید لیا تھا۔ جب وہ شہر سے گاؤں واپس آ رہا تھا تو اس نے ایک کاشتکار کو اپنے کھیت میں ہل چلاتے ہوئے دیکھا، اس کی نظر ہل چلانے والے بیل پر مرکوز ہو گئی۔ وینگ لینگ کو اس کی مضبوط گردن اور ابھرا ہوا کوہان بہت بھایا۔ وہ اپنے کنبے کو کچی سڑک کے کنارے روک کر کاشت کار کے قریب پہنچا اور ایک چالاک بیوپاری کی طرح بولا:
"بیل بیچو گے؟ میرا بیل مر گیا ہے اور مجھے اس قسم کے ایک سستے بیل کی ضرورت ہے۔"
"میں اپنی بیوی بیچ سکتا ہوں، لیکن بیل نہیں بیچوں گا۔ دیکھتے نہیں یہ تین سالہ بیل میرے سر سے نکلنے لگا ہے۔"
یہ کہہ کر وہ بیل ہانکنے لگا۔ وینگ لینگ جس کے پاس نقرئی اور طلائی سکوں کی کمی نہ تھی ہزیمت خوردہ ہو کر کچی سڑک پر اپنے باپ کے قریب آ گیا۔
"بابا تم کہو بیل کیسا ہے؟"
"اچھا جانور ہے، کیا قیمت مانگتا ہے۔"
"بیچنا نہیں چاہتا۔"
"کون سی چیز بکاؤ نہیں، کچھ زیادہ لالچ دو ایسا جانور روز ہاتھ نہیں آتا۔ دیکھتے نہیں پرانے ہل کو کھلونے کی طرح کھینچ رہا ہے اور پھر یہ گیہوں پیسنے کے لیے چکی کے آگے بھی باندھا جا سکتا ہے۔"
باپ کی تحریک پا کر وینگ لینگ پھر کاشت کار کے قریب پہنچا۔ سودا ہونے میں کافی دیر لگی۔۔۔ لمبی جھک جھک کے بعد غریب کاشت کار نے طلائی سکے دیکھے تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے بیل کی گردن سے ہل اتار لیا۔ سکے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو گئے اور بیل کی رسی وینگ لینگ نے اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔
جب وہ واپس اپنے گاؤں گھر پہنچے، تو گھر میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ دروازہ۔ چھت کی کڑیاں بھی غائب تھیں، صرف مٹی کی دیواریں کھڑی تھیں، جو کس مپرسی کی حالت میں جیسے اپنے مکینوں کا منہ چڑا رہی ہوں۔ یہ حیرت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ گھر والوں کو بغیر چھت کے چار دیواری میں چھوڑ کر وینگ لینگ قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ قصبے میں اب وہی چہل پہل تھی۔ قحط کے آثار آہستہ آہستہ معدوم ہو رہے تھے۔
وینگ لینگ نے مضبوط لکڑی کا بنا ہوا، جس میں پیتل کی کیلیں گڑی ہوئی تھیں، ایک نیا ہل خریدا اور چھت کے لیے کچھ کڑیاں۔ شام پڑنے سے پہلے وہ واپس آ گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ لیکن اس نے تھکن کی پرواہ نہ کی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسے تروتازگی بخش رہے تھے۔ موسم بہار جوبن پر تھا اور ساتھ کے جوہڑ میں سے مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز آ رہی تھی جیسے وہ نیند میں بول رہے ہوں۔ چاند آہستہ آہستہ نمودار ہو رہا تھا اور ٹنڈ منڈ درختوں پر نئے پتے پھوٹ رہے تھے۔ ان کے سرسرانے کی آواز بہت مدت کے بعد وینگ لینگ نے سنی تھی۔ وہ اس نظارے سے لطف اندوز ہونے کے لیے اپنے کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ وہ ایک فراق زدہ عاشق کی طرح اپنے محبوب کو تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔ اس کا محبوب زمین کے سوا کون تھا!
صبح سویرے اکا دکا ہمسائے آنے لگے۔ قحط نے ان کی تعداد بہت کم کر دی تھی۔ وہ مصنوعی گرم جوشی کے ساتھ ان سے ملا اور زہرخند سے ایک دو سے پوچھا:
"کیا بتا سکتے ہو میری چھت کی کڑیاں دروازے اور میرا ہل کس نے سردی کی شدت سے بچنے کے لیے اپنے چولہے میں

جھونک دیا ہے۔''
سب ہمسایوں نے نفی میں سر ہلایا ایک معمر ہمسایہ بولا: ''کون جانے، بھوک ہر شخص کو چور بنا دیتی ہے۔''
ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ان کا نزدیکی اور اس کا سب سے عزیز ہمسایہ چنگ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے اس کے قریب آیا۔ وینگ لینگ اس سے بغل گیر ہوا اور اس سے بھی یہی سوال کیا۔
''تمہارے گھر میں ڈاکو اور لٹیروں نے بسیرا کر رکھا تھا۔ تمہارا چچا بھی ان کے ساتھ تھا۔'' چنگ نے آہستہ سے کہا۔
چنگ اب پنجر کے سوا کچھ نہ تھا۔ وینگ لینگ نے اس کی طرف دیکھا، اس کی حالت ناقابل دید تھی۔ وینگ لینگ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
''تم کہو کیا اتنا عرصہ کچھ کھایا پیا نہیں؟''
''کیا کچھ نہیں کھایا۔ مرے ہوئے کتے۔ میری بیوی مرنے سے پہلے اپنے آخری بچے کو بھی بھون کر کھا گئی۔ میں نے اپنی بچی ایک سپاہی کے حوالے کر دی، بیچ دی۔ اس نے اسے نفسانی خواہشات کے لیے خرید لیا۔''
یہ کہہ کر چنگ رونے لگا۔ وینگ لینگ نے اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ بوڑھا کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے موسم بہار میں بھی ٹھٹھر رہا تھا۔ وینگ لینگ اسے سنبھالا دیتے ہوئے اپنے صحن میں لے آیا۔
''اب تم بھوکے نہیں رہو گے۔ جی بھر کے کھاؤ۔ چاول، گندم، میں بہت سے بیج اپنے ساتھ لایا ہوں۔''
ہمدردی کے یہ الفاظ سن کر چنگ بے تحاشا رونے لگا۔ وینگ لینگ کی آواز آئی:
''کیا تم سمجھتے ہو، میں تمہارا احسان بھول گیا ہوں۔ تم آ کر مجھے مٹھی بھر چنے نہ دیتے تو شاید میری بیوی نہ ہوتی نہ میری بچی۔''
وینگ لینگ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اس کا چچا گاؤں چھوڑ گیا ہے، وہ کہاں ہے؟ کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ کوئی کہتا تھا شہر میں ہے کوئی کہتا تھا وہ لٹیروں کے ساتھ روپوش ہو گیا ہے۔ اس نے بھی اپنی بچیاں یکے بعد دیگرے بیچ ڈالی تھیں۔ شاید ان بھوکے سپاہیوں کے ہاتھ جو قحط زدہ علاقے میں حفاظتی دستوں کی صورت میں لوٹ کھسوٹ کے تدارک کے لیے مقرر تھے۔ اس کی وہ بچی بھی بک گئی تھی، جس کے چہرے پر چیچک کے داغ آٹا چھاننے والی چھلنی کی طرح تھے۔
وینگ لینگ اپنے نئے خریدے ہوئے بیل اور ہل کے ساتھ دن رات کھیتوں میں کام کرتا۔ وہیں وہ پیاز کے ساتھ چنے کی روٹی زہر مار کرتا۔ تھک جاتا، تو ننگی زمین پر بازو پھیلا کر سو جاتا، اس بچے کی طرح، جسے ماں کی آغوش میں آسودگی اور آرام ملتا ہے۔ زمین سے بڑی ماں کون ہوتی ہے!
او۔لین گھر میں رہنے لگی۔ اس لیے نہیں کہ وہ شوہر کے ساتھ ہاتھ بٹانا نہ چاہتی تھی بلکہ اس لیے کہ اسے گھر میں کام کرنا تھا۔ وہ مٹی کی گرتی ہوئی دیوار پر گوبر بھس اور مٹی کو گوندھ کر نیا لیپ کر رہی تھی۔ چھت پر نئی کڑیاں جو اس کا شوہر خرید لایا تھا، چن کر ایک نئی چھت بنا رہی تھی۔ ایک دن زور کی بارش ہوئی۔ وینگ لینگ کے لیے یہ فرصت کا دن تھا۔ وہ او۔لین کو لے کر قصبے کی منڈی میں پہنچا اور ایک نئی کڑاہی، ایک بڑا دیگچا اور کانسی کے کئی برتن خریدے۔ او۔لین پھر حاملہ ہو چکی تھی اور پیٹ میں بچہ ہونے کی وجہ سے کچھ بڑی بڑی اور موٹی نظر آتی تھی۔ نئے ہونے والے بچے کا تصور اب وینگ لینگ کو نہیں ڈراتا تھا۔ گھر میں دانے تھے، اس کی تجوری میں چاندی اور سونے کے سکے تھے۔ وہ ہمسایوں کی مدد کر سکتا تھا، گھر میں آبادی بڑھ جانے کا کوئی خوف نہ تھا۔ یہ خوف صرف غریبوں کو ہوتا ہے۔

☆☆☆

ایک رات جب وینگ لینگ اپنی بیوی کے ساتھ سو رہا تھا تو اس نے جب بھی اس کے پستانوں کو چھونے کی کوشش کی تو پستانوں کے درمیان اسے ایک سخت سی پوٹلی جو بند مٹھی کے حجم جتنی تھی محسوس ہوئی۔
''یہ تم نے کیا چھپا رکھا ہے۔''
اس نے سخت ہاتھوں سے وہ پوٹلی اچک لی۔ او۔لین نے معمولی مزاحمت کی اور پھر جب اپنے شوہر کو غلبہ پاتے ہوئے دیکھا، تو بولی:
''اس پوٹلی کو نہ کھولنا۔''
''کیوں نہ کھولوں؟''
''تو کیا ضرور کھولو گے؟''
''ہاں''
وہ پوٹلی ایک کرم زدہ کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ وینگ لینگ نے تجسس سے اسے کھولا۔ قیمتی زر و جواہر موتی اور لعل اس کی آنکھوں کو چندھیانے لگے۔ اس نے دو ایسے سرخ پتھر بھی دیکھے، جیسے وہ تربوز کا گودا ہوں۔ وینگ لینگ نے زندگی بھر ایسے موتی اور جواہر نہ دیکھے تھے نہ ان کے متعلق کچھ سنا تھا۔ وہ اس کی ہتھیلی پر چمک رہے تھے۔ اس کی کھردری ہتھیلی پر۔ وہ جیسے ساکت ہو گیا۔

گونگا۔ جواہر کی چمک نے اس سے قوت گویائی چھین لی تھی۔

''کہاں سے۔ کہاں سے تمہیں یہ ملے ہیں؟''

او۔لین نے ڈرتے ہوئے کہا: ''جہاں ہم بلوائیوں کے ساتھ داخل ہوئے تھے۔''

''جانتی ہو یہ کیا ہے؟''

''ہاں میں ایک بہت بڑے گھرانے میں ملازمہ رہی ہوں۔ میں ان کی قیمت کا اندازہ تو نہیں کر سکتی، لیکن جانتی ہوں یہ بہت قیمتی ہیں۔ چاندی اور سونے سے بھی زیادہ قیمتی۔''

وینگ لینگ کی سانس جیسے رک گئی۔

''تم شاید نہیں جانتی، انہیں گھر میں نہیں رکھا جا سکتا، ہم انہیں بیچ کر زمین کیوں نہ خرید لیں۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ یہ قیمتی پتھر ہمارے پاس ہیں، تو وہ ڈاکہ ڈالنے پر مجبور ہو جائے گا۔ تم نے کیسی مصیبت میرے گلے ڈال دی ہے۔ میں تمام رات سو نہ سکوں گا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے قیمتی جواہرات کو، جس میں دو لعل بھی موجود تھے اپنی دونوں مٹھیوں میں بھینچ لیا اور کچھ لمحوں کے بعد وہ پھر انہیں کپڑے میں باندھنے لگا۔

او۔لین اپنے شوہر کو یہ سب کچھ کرتے دیکھتی رہی پھر آہستگی سے ڈرتے ڈرتے بولی: ''تو تم یہ سب بیچ دو گے؟''

''ہاں کیوں نہیں، اس مٹی کے گھر میں جس میں کوئی تجوری نہیں، ہم یہ قیمتی پتھر کب تک رکھ سکیں گے۔''

اس پر او۔لین نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ساکت و جامد تھیں۔

اس کی پلکیں جیسے جھپکنا بھی بھول گئیں، وہ ایک بچے کی ضدی آواز میں بولی: ''کیا میں یہ دو موتی اپنے پاس رکھ سکتی ہوں۔'' اس نے ایک ایسی آواز میں کہا، جیسے کوئی بچہ کھلونے کے لئے توتلی زبان میں گڑگڑاتا ہے۔ ''مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ یہ چھوٹے چھوٹے دو موتی۔ میں انہیں اپنے پاس رکھوں گی نہ بیچوں گی نہ پہنوں گی۔''

وینگ لینگ اپنی بیوی کی اس ننھی سی خواہش کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ وہ اس کی ایک ایسی غم گسار بیوی تھی، جو دن رات مشقتی بیل کی طرح سارا دن اس کے کھیتوں میں جتی رہتی۔ گھر کا سارا کام کاج کرتی۔ گوبر اٹھاتی۔ گوبر اٹھانے والے ہاتھ رکھنے والی بیوی کو ان قیمتی جواہرات سے کیا واسطہ! اس نے تلخی سے کہا:

''تم ان قیمتی پتھروں کو اپنے پاس رکھ کر کیا کرو گی؟''

''کچھ نہیں، کبھی کبھی انہیں چھوا کروں گی! دیکھا کروں گی!''

یہ سن کر اس کا دل پسیج گیا، اس نے دو موتی، جو اس کی بیوی کی پلکوں پر آئے ہوئے آنسوؤں کی طرح چمک رہے تھے اس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ سفید سفید چمکتے ہوئے موتی۔ او۔لین نے وہ موتی اپنے پستانوں کے درمیان چھپا لیے۔ اتنے بہت سے قیمتی جواہرات حاصل کرنے کے بعد وینگ لینگ کو ایک ہی فکر ستانے لگی۔ کیوں نہ بڑی حویلی والوں سے اور زمین خرید لے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ ایک مرتبہ پھر بڑی حویلی کے آہنی دروازے کی طرف چلا۔

آہنی دروازے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ وہ بند ہے، دروازے پر اب کوئی چوکیدار نہ تھا۔ وینگ لینگ نے دروازے کے کنڈے کو زور سے ہلایا۔ اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ واپس مڑنے کو تھا کہ ایک حسین مترنم آواز آئی: ''کون ہے؟''

وینگ لینگ گھبرا گیا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا:

''کوئی نہیں میں ہوں وینگ لینگ۔''

''کون کم بخت وینگ لینگ؟''

''آرام میں مخل ہونے کی معافی چاہتا ہوں۔ میں تو صرف منشی سے ملنے آیا ہوں۔ دروازے پر کوئی چوکیدار نہ تھا۔ اس لیے دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔''

''وہ پاپا تو بھاگ گیا! سور کی اولاد۔''

وینگ لینگ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا جواب دے، لیکن قیمتی پتھر جو دہکتی ہوئی آگ کی طرح اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں محفوظ تھے اسے یہ کہنے پر مجبور کر رہے تھے کہ وہ زمین کے سودے کی بات کرے۔

''میں کچھ روپے!''

''یہاں کچھ نہیں! تمہیں بھیک نہیں مل سکتی۔ منشی! وہ سور کا بچہ بھی بھاگ گیا ہے۔''

''نہیں نہیں، میں بھیک مانگنے نہیں کچھ دینے کے لیے آیا ہوں۔''

''ہاں اب تم نے کام کی بات کہی۔''

اور اسی لمحے ایک نہایت خوبصورت ابھرے ہوئے پستانوں والی جوان عورت نے آہنی دروازہ کھولا۔ ''اندر آ جاؤ۔''

وینگ لینگ ڈرتے ڈرتے سہمے ہوئے قدموں سے دروازے کے اندر داخل ہوا۔ خوبصورت عورت آہستہ آہستہ اس کی رہنمائی کرنے لگی۔

بڑا جاگیردار ایوان خاص میں پتھر کے بڑے مجسمے کی طرح کھڑا تھا۔ وہ ضرور ایک مجسمہ ہوتا اگر وینگ لینگ اس کی کھانسی کی آواز نہ سنتا۔ وہ ایک قیمتی، لیکن فرسودہ عبا پہنے ہوئے تھا، جس پر جابجا دھبے پڑے ہوئے تھے وہ شاید اس عبا کو شب خوابی کے طور پر

استعمال کرتا تھا۔ وینگ لینگ اس کے حضور پہنچ کر ایک انجانے خوف سے لرزنے لگا۔ بڑی حویلی کے مکینوں کا خوف اس نے ورثے میں پایا تھا۔ جاگیردار کبھی بہت موٹا ہوگا۔ اب دبلا پتلا سا نظر آنے لگا تھا۔ اس کی کھال گوشت کے کم ہو جانے کی وجہ سے لٹکی ہوئی تھی۔ شاید ہڈیوں نے گوشت کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ جو خوبصورت عورت اسے اپنی رہبری میں لائی تھی نکھری نکھری صاف ستھری دکھائی دیتی تھی۔ اس کے گال سرخ و سفید تھے۔ اس کے لب و لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑے خاندان سے تعلق نہیں رکھتی۔ جوان سال عورت کی آواز آئی: ''زمین خریدنے آئے ہو! روپے کہاں ہیں؟''

وینگ لینگ نے یہ سن کر خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ وہ بڑے جاگیردار کے سامنے کوئی فالتو بات کہنا نہ چاہتا تھا۔ نوجوان عورت نے تحکمانہ بوڑھے جاگیردار سے کہا: ''اندر کے کمرے میں جاؤ۔''

یہ سن کر بوڑھا جاگیردار ایک کل دار کھلونے کی طرح بھد کنے کے انداز میں قدم اٹھاتا ہوا اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ اب وینگ لینگ اور جواں سال عورت تنہائی میں ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ جاگیردار کے جانے کے بعد نوجوان عورت بولی:

''بھس بھرا ہے تمہارے دماغ میں، اگر سکے لے کر آئے ہو تو دکھاؤ! نکالو اپنی جیب سے۔''

''میں روپے لے کر تو نہیں آیا۔''

''تو پھر کیوں آئے ہو؟''

''میں بڑی جاگیردارنی سے ملنے آیا ہوں۔''

وینگ لینگ نے بہانہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں جانتے وہ مر چکی ہے۔ لٹیروں نے اس گھر کو لوٹ لیا اور اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اس حویلی میں سب بھاگ گئے لیکن میں یہاں رہی۔''

''اس حویلی کے خادم، خادمائیں اور باندیاں اور چوکیدار۔''

''کہہ چکی ہوں سب بھاگ گئے، جس کا سینگ جس طرف سمایا بھاگ نکلا۔ تمہیں شاید پتہ نہیں کہ اس حویلی کے ملازموں نے چوروں اور رہزنوں کا ساتھ دیا۔ ان میں آہنی دروازے کا چوکیدار بھی تھا۔ اس نے مجھ سے منہ چھپانے کی کوشش کی، لیکن میں اس کے گال پر ابھرے ہوئے مسے اور خاردار بالوں کو خوب اچھی طرح پہچانتی تھی۔''

یہ کہہ کر عورت خاموش ہوگئی۔ حویلی کا زوال شروع ہو چکا تھا۔

''جب میں داشتہ بن کر اس گھر میں آئی، اس گھر کو عیاش دوستوں کی دوستی، دشمنوں کی دشمنی، ملازموں اور خادماؤں کے بہی خواہوں سب نے مل کر لوٹا۔ زمین نیلام کر دی۔ اگر اس بوڑھے جاگیردار کے پاس آسمان کا کوئی ٹکڑا بھی ہوتا تو یہ اس کو بھی بولی پر اٹھا دیتے۔''

''جاگیردار کے بیٹے کہاں گئے؟'' اسے کسی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ادھر ادھر خزاں زدہ پتوں کی طرح اڑ گئے۔ ان سے خاندان کی بدحالی نہ دیکھی گئی۔'' یہ کہہ کر عورت زہر خند سے ہنسی۔

''میں تو ایک معمولی داشتہ ہوں۔ میرے پاس شاید کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس لیے یہاں رہی۔''

''ٹھیک ہے، لیکن میں زمین کا سودا تم سے کیسے کر سکتا ہوں۔''

''مجھ سے، کیوں نہیں! میں جو چاہوں گی، اسے کرنا ہوگا۔''

''کتنی زمین باقی بچی ہے؟'' وینگ لینگ نے کچھ مطمئن ہو کر کہا۔

''اتنی جس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے، جس کی پیمائش نہیں ہو سکتی۔ جنوب، شمال، مشرق اور مغرب ہر طرف پھیلی ہوئی زمین جاگیردار کی ہے۔''

''اگر میں یہ زمین خرید لوں اور کل جاگیردار کے بیٹے اعتراض کریں! اس سودے کو ماننے سے انکار کر دیں؟''

''انہیں اعتراض نہیں ہوگا اور وہ بزدل پھر یہاں واپس نہیں آئیں گے۔ قحط اور لٹیروں نے انہیں ہراساں کر دیا ہے۔''

''میں رقم کسے ادا کروں گا۔''

''بوڑھے جاگیردار کو۔''

وینگ لینگ نے گفتگو کو طوالت دینی نہ چاہی۔

''میں کل آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، لیکن کل یا پھر کبھی نہیں۔''

وینگ لینگ اس گفتگو کے بعد غلطاں و پیچاں حویلی سے باہر نکلا۔ اس کا دماغ عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس کی جیب میں بیش قیمت زر و جواہرات موجود تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک غریب کاشت کار تھا اور دولت مند بننے کے بعد ایک ڈر، ایک خوف ہر وقت اس پر مسلط رہتا۔ وہ یہ سمجھ کر کہ ہر شخص کی نگاہ اس پر ہے، وہ جلد سے جلد ان بچھو اور سانپوں کو، جو قیمتی پتھروں کی شکل میں اس کی جیب میں پڑے اس کی جان کے لاگو ہو رہے تھے پرے اچھال دینا چاہتا تھا لیکن ایسے سنہرے روپہلی اور چمکدار موتی بلا معاوضہ وہ کیسے اپنے آپ سے جدا کر لیتا۔ گھر جانے کی بجائے اس نے قصبے کے قہوہ خانے کا رخ کیا۔ وہ بڑی حویلی کے متعلق لوگوں کو اختراع سازی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور افواہیں جن کی روزمرہ

کی خوراک ہیں، باتیں کرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چپکے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور دھواں اگلتے ہوئے پیالے کی بھاپ سے ذہنی خلجان کو مٹانے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

وینگ لینگ کے پاس اتنی زمین ہو گئی تھی کہ جس پر ہل چلانے کے لیے ایک بیل کافی نہ تھا۔ اتنی فصل بھی ہونے لگی تھی کہ جسے وہ اپنے چھوٹے سے گھر میں ذخیرہ نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے اسے اپنے صحن میں ایک کوٹھڑی بنانی پڑی۔ اس نے دوسرا بیل بھی خریدا اور ایک گدھا بھی! ایک دن وہ اپنے غریب بوڑھے ہمسائے چنگ کے پاس گیا۔

''تم اپنی تھوڑی سی زمین میرے پاس بیچ دو، مناسب قیمت دوں گا۔ میرے گھر اٹھ آؤ اور میرے ساتھ دوسرے کھیتوں میں کام کرو۔ تم میرے بڑے بھائی ہو، میں تمہارے ساتھ ملازموں جیسا سلوک نہیں کروں گا۔'' چنگ نے ایسا ہی کیا اور وہ وینگ لینگ کے گھر آ گیا۔

اس برس خوب بارش ہوئی۔ فصلیں اتنی اچھی ہوئیں کہ وینگ لینگ اور چنگ دونوں کے لیے فصل کاٹنا مشکل تھا۔ اس لیے وینگ لینگ نے دو مزدوروں کو روزانہ اجرت پر ملازم رکھ لیا۔ وہ اپنے دونوں بیٹوں کو جو ابھی کم عمر تھے اپنے ساتھ کھیتوں پر لے جاتا اور ان کے ذمے وہ کام لگاتا، جو وہ آسانی اور شوق سے کر سکتے تھے۔ وہ گدھے پر اناج لاد دیتے، ہل ہانکتے۔ کیاریوں سے جنگلی گھاس چنتے۔ وینگ لینگ انہیں بھی محنتی کاشت کار بنانا چاہتا تھا۔ وہ زیادہ کارآمد کام تو نہ کر سکے، لیکن وہ چاہتا تھا کہ کم از کم ان کے جسم سورج سے آشنا ہو جائیں۔ محنت کا مطلب سمجھ لیں اور محنت کی عادت ڈال لیں۔ وہ ان پڑھ تھا لیکن یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ حویلی والوں نے یہ زمین اس لیے بیچی ہے کہ اس دولت مند گھرانے میں کسی کو محنت مشقت یا زمین کی نگہداشت کرنے کی فرصت بھی نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ زمین مالک کی محنت اور توجہ کے بغیر کسی کام کی نہیں ہوتی۔ کھیتی وہ جس کا مالک سر پر ہو۔

اپنی بیوی او۔لین کو اس نے اب کھیتوں میں کام کرنے سے روک دیا تھا۔ وہ اب غریب نہ تھا۔ اس نے اب مزدور اور مزارعے ملازم رکھ لیے تھے۔ چنگ کی مدد سے اس نے ایک بہت بڑی کوٹھڑی غلہ کو ذخیرہ کرنے کے لیے بنالی تھی۔ فصل اس بہتات سے ہوئی تھی کہ اسے چھوٹی چھوٹی دو کوٹھڑیوں میں نہ سمایا جا سکتا تھا۔ چنگ اور بوڑھے باپ کے مشورے سے اس نے اس سال دس بھیڑیں، بطخیں اور دو مرغیاں بھی خریدیں۔

او۔لین گھر کا کام کرتی۔ بستروں کے لیے نئی چادریں کاڑھتی اور بچوں کے لیے نئے کپڑے سیتی۔ اس نے گھر کا نقشہ پلٹ کر رکھ دیا۔ اب یہ گھر ایک معمولی کاشت کار کا گھر نہیں نظر آتا تھا اور ایک دن وہ پھر اندرونی کوٹھڑی میں چلی گئی، وہ ایک چھوڑ کئی دائیاں زچگی کے وقت منگوا سکتی تھی، لیکن اسے تنہائی میں بچہ پیدا کرنے کی عادت ہو چکی تھی، اس لیے اس نے اکیلا ہی رہنا پسند کیا۔ اس مرتبہ زچگی کے دوران اسے بہت تکلیف ہوئی اور فارغ ہوتے ہوتے بہت وقت لگا۔ وینگ لینگ جب رات پڑے کھیتوں سے واپس آیا، تو اس کا باپ گھر کی دہلیز پر کھڑا تھا اس نے اپنے پوپلے منہ کو مسرت کے انداز میں کھولا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا:

''انڈا! دو زردیوں والا انڈا۔''

یہ سن کر وینگ لینگ جب کوٹھڑی میں پہنچا، تو او۔لین بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے جڑواں بچے جنے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ جیسے چاول کے دو دانے ہوں۔ وہ اپنی بیوی کے اس کارنامے پر بہت خوش ہوا اور ہنستے ہوئے بولا:

''تو وہ یہ وجہ تھی تم دو قیمتی موتی ہر وقت اپنے سینے سے لگائے رکھتی تھیں۔''

او۔لین نے اپنے شوہر کو خوش دیکھا، تو اس کے چہرے پر بھی ایک مدھم تھکن سے بھرپور مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

وینگ لینگ کو اب غم تھا، تو صرف ایک، اس کی بڑی بچی نے ابھی تک بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ اب چلنے پھرنے لگی تھی۔ باپ کو دیکھ کر وہ مسکراتی، لیکن منہ سے کچھ نہ بولتی۔ کیا وہ گونگی ہے؟ یہ خیال ہر وقت وینگ لینگ کو ستائے رکھتا۔ اس کی مسکراہٹ فرشتوں جیسی تھی اور چہرہ چاند کی طرح دمکتا تھا۔ اس کے خاموش رہنے کی شاید وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنی زندگی کا پہلا برس بھوکے مر کر اور ہر طرح کے دکھ اور مصائب جھیل کر گزارا تھا۔ وینگ لینگ کئی مہینوں سے اس کے منہ سے ایک لفظ ''ابو'' سننے کا انتظار کر رہا تھا، لیکن بچی کے منہ سے کوئی آواز نہ آئی۔ صرف ایک پوپلی مسکراہٹ تھی جو باپ کو دیکھ کر اس کے لبوں پہ آ جاتی ہے۔

''چھوٹی سی پگلی۔ میری پیاری پگلی۔''

وہ سوچتا اگر میں نے اس ننھی چوہیا کو بیچ دیا ہوتا اور خریدنے کے بعد یہ گونگی نکلتی، جیسی کہ ہے تو وہ اس کا گلا گھونٹ دیتے۔

یہ خیال آتے ہی وہ اس ننھی گلہری کو اپنے کندھوں پر بٹھا لیتا۔

جس زمین پر وینگ لینگ اور اس کے آباؤ اجداد نے زندگی گزاری تھی، ہر پانچ سال کے بعد قحط ضرور پڑتا تھا۔ کبھی بارش نہ ہونے کے سبب اور کبھی زیادہ بارش ہونے کی وجہ سے۔

وینگ لینگ اسی لیے بہت محتاط ہو گیا تھا کہ اس کا کنبہ قحط کا سامنا کر چکا تھا۔ اور شاید موت کا بھی!

وہ غلے کی بہت بڑی مقدار ہر وقت گودام میں جمع رکھتا۔ اب اس نے مزارعوں کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اپنے پرانے مکان کی پشت پر ایک اور مکان بنالیا تھا۔ بڑے بڑے کمروں والا مکان جس کا صحن بھی وسیع تھا۔ پکی چھت تھی۔ دیواریں مٹی کی ضرور تھیں لیکن انہیں اچھی طرح کھرچ کر سفیدی اس مقدار سے استعمال کی گئی تھی کہ کمروں کا مٹیالا پن خراب ہو گیا تھا۔ نیا مکان بننے کے بعد وینگ لینگ اپنے بیوی بچوں اور بوڑھے باپ کے ساتھ اس میں اٹھ آیا اور چنگ مزارعوں کے ساتھ پرانے مکان میں رہنے لگا۔ تمام مزارعے چنگ کے ماتحت کام کرتے اور وہ ان کے کام کی نگرانی بڑی فرض شناسی سے کر رہا تھا۔ وہ چنگ کی تمام ضروریات کا خیال رکھتا تھا اور اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیتا۔ چنگ بھی نہایت دیانتدار آدمی تھا۔ وہ سارا بندوبست اور سارا کام اپنا سمجھ کر کرتا۔ وینگ لینگ کے اصرار کے باوجود چنگ زیادہ خوراک سے پرہیز رکھتا اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی ہڈیاں گوشت سے خالی تھیں۔ چنگ صبح سویرے جاگ اٹھتا اور شام پڑے کھیتوں سے واپس آتا۔ اس کی نظریں ہر وقت کھیت میں کام کرتے ہوئے مزدوروں اور مزارعوں پر جمی رہتیں۔ اور وہ کسی کو غیر ضروری ستانے کا موقع نہ دیتا اور جب کٹائی کا وقت آتا، تو کسی مزارعے کی بیوی یا بچے کو کھیت کے قریب نہ آنے دیتا مبادا چوری چھپے دانے چرا کر لے جائیں خواہ وہ مٹھی بھر ہی کیوں نہ ہوں۔

وینگ لینگ اور چنگ کا برتاؤ اور سلوک ایک دوسرے سے بھائیوں کی طرح تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عمر میں بڑا ہونے کے باوجود چنگ ہمیشہ اپنے آپ کو چھوٹا بھائی سمجھتا۔ اس لیے کہ اسے احساس تھا کہ وہ اس کا ملازم ہے اور اس کے گھر کی چھت کے نیچے سوتا ہے۔

چار پانچ مہینے گزر گئے۔ اب وینگ لینگ خود کھیتوں میں گاہے گاہے کام کرتا تھا۔ اس کی زمینوں میں اس قدر اضافہ ہو گیا تھا اور فصل اتنی بہتات سے ہونے لگی تھی کہ اسے اناج کی خرید و فروخت کے لیے زیادہ عرصہ منڈی میں آڑھتیوں کے پاس گزارنا پڑتا تھا، بھاؤ معلوم کرنے اور سودا طے کرنے کے لئے۔

منڈی میں پہنچ کر سودا اور نرخ طے ہو جانے کے بعد وینگ لینگ سخت احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا۔ کیا وہ اس حد تک ان پڑھ اور گاؤدی ہے کہ اسے کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ کی پہچان تو کیا یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ تحریر نیچے سے اوپر کی طرف ہے یا اوپر سے نیچے کی طرف۔ یعنی بائیں سے دائیں طرف لکھا گیا ہے یا دائیں سے بائیں جانب۔ اسے ہر سودے کے خاتمے پر ہمیشہ شدید شرمساری کا احساس ہوتا جب اسے مجبوراً کہنا پڑتا:

''لکھنا پڑھنا نہیں جانتا ان پڑھ ہوں۔''

اور جب اسے معاہدہ کا کاغذ کسی دوسرے سے پڑھوانا پڑتا، تو وینگ لینگ شرم سے ڈوب جاتا۔ وہ دستخط بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جب آڑھتی کا معمولی سا منشی جس کی تنخواہ یا محنتانہ وینگ لینگ کے کسی بھی مزارعے سے زیادہ نہ تھا، اسے تحقیر کی نظر سے دیکھتا اور اس کا انگوٹھا لگوانے کے لیے سیاہی اس کے انگوٹھے پر لگاتا تو وینگ لینگ شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔

ایک ایسے ہی دن جب کٹائی زوروں پر تھی، وہ منڈی میں گیا اور جب نرخ طے کرتے وقت اس نے اپنے ان پڑھ ہونے کا اعتراف کیا تو کئی لوگ منشی اور چھوٹے چھوٹے لوگ جو دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے اس کی باتیں سن کر اور اس کے قیمتی لباس کو دیکھ کر جو وہ اب پہنا کرتا تھا چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے اور ایک دو نے تو پھبتی بھی کس دی۔ یہ وینگ لینگ کے صبر کی انتہا تھی۔ دولت مند ہونے کے بعد وہ کچھ چڑچڑا بھی ہو گیا تھا۔ دکان پر تو اس نے کسی سے الجھنا مناسب نہ سمجھا لیکن رستہ بھر وہ اپنے آپ سے الجھتا رہا اور اپنے آپ کو لعن طعن کرتا رہا۔ مجھ پر پھبتیاں کسنے والے کسی کے پاس ایک دھیلہ یا بالشت بھر زمین نہیں۔ یہ دو ٹکے کے منشی مجھ پر اس لیے ہنستے ہیں کہ میں کاغذ پر بنے ہوئے ٹیڑھے میڑھے نشان نہیں سمجھ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ان پڑھ اور جاہل ہونا بہت بڑی بدقسمتی اور بدنصیبی اور شرمناک ہے۔

میں کل ہی اپنے بڑے بیٹے کو کھیت سے اٹھالوں گا اور اسے کسی مدرسے میں داخل کرا دوں گا۔ وہ قصبے میں جایا کرے گا اور جب پڑھ لکھ جائے گا، تو جب میں منڈی میں جایا کروں گا میرے ساتھ ہو گا۔ میری تمام لکھت پڑھت وہ کرے گا۔ پھر کسی کو مجھ پر ہنسنے یا پھبتی کسنے کا موقع نہیں ملے گا۔ مجھ پر جو اس علاقے کا سب سے بڑا زمیندار ہوں، جس کے گودام اناج سے بھرے رہتے ہیں اور جس کے کئی ملازم اور کئی مزارعے ہیں۔ وینگ لینگ فیصلہ کرنے کے بعد بدلنے کا عادی نہ تھا، گھر پہنچتے ہی اس نے اپنے بڑے لڑکے کو آواز دی۔

اس کی عمر اب بارہ برس کے قریب تھی اور عمر کے لحاظ سے اس نے کچھ زیادہ قد نکال لیا تھا۔ وہ ماں کی طرح دوہرے قد کاٹھ کا تھا۔

''کل سے تمہارا کھیتوں پر جانا بند۔ کل سے تم مدرسے جاؤ گے، تعلیم حاصل کرو گے، ہمارے خاندان اور کاروبار کو اب ایک

پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت ہے۔"
یہ سن کر بڑے لڑکے کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔
"میری تو مدت سے یہی خواہش تھی، لیکن میں کچھ کہنے کے لیے جرات نہ کر سکتا تھا۔"
جب چھوٹے لڑکے نے سنا تو وہ بھی رویا اور شکایت کرتا ہوا بھاگا آیا۔ وہ سخت غصیلا شور مچانے والا ضدی بچہ تھا۔ وہ ان بچوں میں سے تھا، جن کا حصہ کھانے کے دسترخوان پر بھی نہیں چھینا جا سکتا تھا۔ وہ روتے ہوئے بولا:
"میں بھی کھیتوں پر کام نہیں کروں گا۔ میں بھی پڑھوں گا۔ میں کیوں کر بیل گدھے کی طرح کام کروں اور یہ دری پر بیٹھ کر آرام سے پڑھے۔"
وینگ لینگ اس کا شور و غوغا برداشت نہ کر سکا اور حقیقت میں دل ہی دل میں بہت خوش کہ اسے بھی پڑھنے لکھنے کا شوق ہے۔
"بہت اچھا! تم دونوں مدرسے جاؤ گے۔"
وینگ لینگ یہ فیصلہ اتنی جلدی نہ کرتا، لیکن اب اپنے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے اسے ان بچوں کی ایسی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس کے مزارعوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا اور چنگ نگرانی کے کام میں کوئی غفلت نہیں برتتا تھا۔
دوسرے دن اس نے بچوں کی ماں او۔لین کو چنگ کے ساتھ قصبہ بھیجا کہ ان کے مدرسے جانے کے لیے چوغوں کا کپڑا لائے اور سیئے۔ اور خود ایک کاغذ دوات کی دوکان پر پہنچا۔
اس نے ان کے لیے تختیاں دواتیں قلم اور کاغذ خریدے۔ ان کی خرید کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا۔ دوکاندار جو اسے دیتا رہا اور جو قیمت بتاتا رہا وہ اپنی جہالت کو چھپانے کے لیے سر اثبات میں ہلاتا رہا۔
اس تیاری کے بعد وینگ لینگ اپنے بچوں کو لے کر قصبہ کے بہت قریب ایک مدرسے میں گیا۔ اس مدرسے کا معلم ایک ایسا بوڑھا تھا، جسے زندگی بھر کوئی ٹھکانے کی نوکری نہ مل سکی تھی۔ اس نے اپنے صحن کے وسط میں ایک ٹاٹ پر دریاں بچھا رکھی تھیں۔ ایک مونڈھا تھا اور ایک بوسیدہ میز جو اس کے سامنے دھری رہتی تھی۔ وہ ہر ششماہی پر تہوار کے دن بچوں کے والدین سے معمولی رقم لے کر شاگردوں کو پڑھاتا تھا۔ انہیں وزنی پنکھے سے پیٹتا اور سبق یاد نہ کرنے اور چھوٹی سی غلطی کرنے پر سخت سزا دیتا۔ وہ کسی کو اپنے سوا کاہل نہ دیکھ سکتا تھا۔ خود اونگھتا رہتا، لیکن بچوں کو آنکھ جھپکنے یا لمحہ بھر آرام نہ کرنے دیتا۔ بوڑھا استاد کبھی کبھی اونگھتے ہوئے خراٹے بھی لینے لگتا اور اس کا پوپلا منہ کھل جاتا جس کے اردگرد مکھیاں منڈلانے لگتیں اور بچے تختیوں اور کتابوں سے نظریں ہٹا کر یہ دیکھتے اور شرط لگاتے کہ مکھی منہ کی سرائے میں داخل ہو گی یا نہیں۔
پھر یکا یک اس کی آنکھ کھل جاتی وہ بچوں پر قہر بھری نظر ڈالتا اور فروگذاشت کا بدلہ بغیر قصور انہیں پیٹ کر لیتا۔
بہر حال استاد کی اس سخت مزاجی نے اسے قابل احترام بنا دیا تھا اور عام تاثر یہ تھا کہ اس کے شاگرد بہت جلد اس کے ڈنڈے اور پنکھے کے دستے کی چوٹیں سہنے کے بعد لکھنے پڑھنے لگتے ہیں۔ وینگ لینگ نے اس مدرسہ کا انتخاب اس کی مشہوری سن کر کیا تھا۔
وینگ لینگ اپنے دونوں بچوں کو لے کر جب مدرسے پہنچا تو اس کے ہاتھ میں ایک ریشمی رومال تھا۔ اس میں دو درجن تازہ انڈے تھے۔ بوڑھے استاد نے پیتل کی کمانیوں کی عینک پہن رکھی تھی، جسے دیکھ کر وینگ لینگ بہت متاثر ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک وزنی پنکھا تھا، جسے وہ انتہائی سردی کے زمانہ میں بھی اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ وینگ لینگ نے مئودبانہ جھک کر کہا:
"جناب یہ اس ناچیز کے دو ناکارہ بچے ہیں۔ مجھے امید ہے آپ کی مار کھا کر یہ کچھ لکھنے پڑھنے لگیں گے۔ آپ بے شک ان کی کھوپڑی توڑ دیں۔ پیٹ پیٹ کر ہلاک کر دیں۔ مجھے کوئی ملال نہیں ہوگا۔ یہ آج سے آپ کی خدمت میں رہا کریں گے اور جو حکم ہوگا بجا لائیں گے۔ میں بھی ہر قسم کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔"
یہ کہتے ہوئے اس نے ریشمی پوٹلی استاد کے سامنے پڑی ہوئی میز پر رکھ دی۔ استاد نے پیش کش قبول کر لی اور وینگ لینگ کو یقین دلایا کہ وہ اس کے دونوں بچوں کو بہت جلد عالم فاضل بنا دے گا۔
واپسی پر بچوں کو مدرسے داخل کرانے کے بعد وینگ لینگ کا سینہ دفور مسرت اور جوش سے پھٹا پڑتا تھا۔ خوشی سے اس کے قدم زمین سے نہ لگتے تھے۔ راستے میں اس کے ایک ہمسائے سے ملاقات ہوئی، جو شہر سے آ رہا تھا۔
"آج میں نے اپنے دونوں بیٹوں کو مدرسے داخل کرا دیا ہے۔ مجھے انہیں کاشتکار نہیں بنانا۔ پڑھانا ہے، دل کھول کر پڑھیں۔" اور اس دن کے بعد بچوں کو "بڑے چھوٹے" کے نام سے پکارنا بند کر دیا گیا۔ بوڑھے استاد نے ان کے نام تجویز کر دیئے تھے۔
یہ باپ کے پیشے کو ذہن میں رکھ کر اس نے گھڑے تھے۔ بڑے کا نام تھا "نیوان" اور چھوٹے کا نام تھا "نیو دن" اور دونوں کے ناموں کے پہلے لفظ کا مطلب تھا:
"ایک ایسا آدمی، جس کی دولت زمین ہو۔"
☆☆☆

سات برس گزر گئے۔ سیلاب آ گیا۔ اپنی طوفان سامانیوں کے ساتھ شمالی سرحد کے قریب سے گزرنے والا دریا، بپھر کر کناروں سے اچھل پڑا اور پانی آس پاس کی آبادیوں کو اپنی زد میں لینے لگا۔ ان آبادیوں کے مکین ہمیشہ کی طرح ادھر ادھر بھاگنے کی تیاری کرنے لگے۔ وینگ لینگ مطمئن تھا۔ اس کی زمین کا بنجر حصہ زیر آب آ چکا تھا اور کئی جگہ تو پانی جھیل کی شکل اختیار کر چکا تھا اور گھٹنوں سے بڑھ کر کندھوں تک آ پہنچا تھا۔

بہار کے آخری اور موسم گرما کے آغاز کے دنوں میں پانی کی سطح اور زیادہ بلند ہو گئی، ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور اس پانی میں چاند، بید اور بانس کے درختوں کا عکس، بادلوں کے اس منظر کے ساتھ جو پانی میں منعکس ہو رہے تھے بہت بھلا لگتا تھا۔ کہیں پانی میں مٹی کا بنا ہوا کوئی مکان، جس کے مکین بہت پہلے اسے چھوڑ چکے تھے گھل کر ماں کی آغوش مٹی میں چلا جاتا، لیکن وینگ لینگ نے نیا مکان ایک ٹیلے پر بنایا تھا، جہاں پانی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کا مکان اور اس کے سامنے تھوڑا سا میدان ایک جزیرے کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ اس گاؤں کی آبادی کے لوگ تختوں سے بنی ہوئی عارضی کشتیوں پر ہی رہنے لگے تھے۔ وینگ لینگ کے پاس اناج کا کافی ذخیرہ تھا۔ وہ کفایت شعار تھا، لیکن مناسب داموں پر ان کو اناج مہیا کر دیتا۔ اس سیلاب اور متوقع قحط سے وینگ لینگ قطعاً ہراساں یا متفکر نہ تھا، لیکن مسلسل بیکار رہنے، عمدہ غذا کھانے اور وقت بے وقت سونے نے وینگ لینگ کو کاہل بنا دیا تھا، چنگ بھی اس کے پاس تھا اور اس کے مزارعے بھی، جو مفت ہاتھ پر ہاتھ رکھے سارا دن بیٹھے گپیں مارتے رہتے۔ وینگ لینگ اس لیے کبھی کبھی چڑچڑا ہو جاتا اور وہ کوئی نہ کوئی کام ان کے لیے ڈھونڈ نکالتا۔ کبھی کبھی اپنے مکان کی چھتوں کی لپائی اور کبھی دیواروں کی بے جا مرمت، جو کسی جگہ سے بھی ٹوٹی پھوٹی نہ ہوتیں۔ کبھی کبھی وہ ان سے سن کے رسے بنواتا۔ ایسے تمام کام جو وہ کچھ سال پہلے اپنے بیکاری کے دنوں میں خود کیا کرتا تھا، آج دوسروں سے کرواتا تھا۔ اس کے اپنے کرنے کے لیے کوئی کام نہ تھا اور یہ الجھن اسے کھائے جاتی تھی۔ ایک انسان آخر تمام دن بیٹھا دور تک پھیلے ہوئے پانی کو تو نہیں دیکھ سکتا۔ نہ ہر وقت بیوی سے باتیں اور بچوں سے پیار کر سکتا ہے۔ اس کی سیمابی طبیعت میں آرام نہیں تھا۔ وہ اس لیے اپنے آپ کو بہت بڑا مجرم سمجھتا تھا۔

وینگ لینگ کا باپ بہت بوڑھا اور تقریباً بہرہ ہو گیا تھا۔ ویسے اب اس سے باتیں کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ اپنے بستر میں گرم رہے۔

وینگ لینگ کو اس بات کا شدید صدمہ تھا کہ اس کا باپ جو مخبوط الحواس ہے۔ اس کے دولت مند ہونے کی آسائشوں سے لطف اندوز تو ہو سکتا ہے آگاہ نہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا باپ اس کی امارت، آسائش اور فارغ البالی دیکھے۔ کبھی اس کا باپ گرم پانی جس میں چائے کی پتی نہ ہوتی، پیتا تھا۔ بوڑھے نے اپنی ایک دنیا بسائی تھی اور اس میں رہ کر وہ خواب دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ وینگ لینگ کا بوڑھا باپ اور اس کی بڑی لڑکی، جس نے ابھی تک منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا تھا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنستے رہتے۔ ان دونوں کے پاس ایک خوشحال اور خوش بخت انسان کے لیے، جو ایک کا بیٹا اور دوسری کا باپ تھا کوئی الفاظ نہ تھے۔ بوڑھا کبھی کبھی اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر بچی کے گالوں پر پھیرتا۔ وہ معصومانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف تکنے جاتی۔ اس کے سوا ان دونوں کے پاس کچھ نہ تھا جس کا تبادلہ کر سکتے۔ وینگ لینگ ان دونوں کو اس حالت میں دیکھتا تو ایک آہ بھر کر رہ جاتا۔ اتنی بہت سی خوشیوں کے بعد تھوڑا سا غم نہ ہو، تو انسان پاگل ہو جائے، خدا بن جائے۔

او۔لین نے جو جڑواں بچے پیدا کیے تھے، وہ اب چھوٹے چھوٹے چوہوں کی طرح فرش پر رینگنے لگے تھے۔ وینگ لینگ بچوں کی معیت میں کچھ وقت کاٹتا، کچھ باپ کی تیمارداری میں، اور کچھ وقت اپنی بیوی کے ساتھ۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک لمبا عرصہ گزار چکا تھا اور اس کی بیوی کے پاس کوئی چیز ایسی نہ رہ گئی تھی، جسے معلوم یا حاصل کرنے کی خواہش اسے ہوتی۔ وہ ایک ایسی بیوی تھی، جو اسے سب کچھ دے چکی تھی۔ محبت، پیار، خدمت اور جسم کی آسودگی اور اب وینگ لینگ یہ محسوس کر رہا تھا، جیسے اس نے اپنی بیوی او۔لین کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ یہ عورت! ایک گم سم مجسمہ، ایک خاموش عورت! اسے آج پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس کے بال رنگی ہوئی بھیڑ کی پرانی اون کی طرح ہیں۔ اس کا چہرہ بہت بڑا، سپاٹ اور اس کی کھال کھردری ہے۔ اس کی بھنویں بکھری ہوئی تھیں، جن پر بالوں کا نشان تک نہیں۔ اس کے کولہے پھیلے ہوئے، اس کے ہونٹ موٹے اور ہاتھ پاؤں مردوں جیسے ہیں، جن میں نام تک کی نسوانیت نہیں۔ یہ سوچ کر اسے غصہ آ گیا اور چلایا:

''تمہیں دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ تم ایک بڑے زمیندار کی بیوی ہو۔ ایک ایسے بڑے کاشتکار کی، جس کی زمین حد نظر تک پھیلی ہوئی ہے اور جس کے ملازموں کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ تمہیں دیکھ کر صرف یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تم ایک غریب فاقہ مست، نان شبینہ کے محتاج مزارعے کی بیوی ہو جس کا اپنا کوئی ہل ہوتا ہے نہ بیل۔''

وہ بیوی پر گرجتا اور برستا رہا۔ بیوی چپ چاپ سب کچھ سنتی رہی درد بھری نظروں سے، وہ اس وقت کپڑے سی رہی تھی۔ اس نے کپڑے سینے والی سوئی منہ میں داب لی: ''یہ تم نہیں، کوئی اور بول رہا ہے۔'' اور پھر آہستہ سے بولی: ''نام لوں کون بول رہا ہے؟''

وینگ لینگ نے اپنی بیوی کی خشمگیں نظریں کبھی نہ دیکھی تھیں اور نہ اس کا زہریلا تخاطب سنا تھا۔ وہ لہجے میں نرمی پیدا کرنے پر مجبور ہو گیا: ''میرا مطلب ہے کہ تم اپنے بالوں کے لیے تیل نہیں خرید سکتیں۔ اچھے کپڑے اور اچھے جوتے نہیں پہن سکتیں۔ تم ایک امیر زمیندار کی بیوی ہو!''

او۔لین نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، وہ اسے تکتی رہی اور اس نے اپنے پیروں کو کھردرے کپڑے میں ڈھانپ لیا۔ اس کے شوہر کو اس کے کھردرے پاؤں اب تکلیف پہنچانے لگے تھے۔

اور وینگ لینگ شرمندہ ہو گیا۔ اس نے یہ الفاظ ایسی عورت سے کہے تھے، جس نے آج تک اسے کسی شکایت کا موقع نہ دیا تھا اور ایک زر خرید لونڈی کی طرح جس نے اس کا ہر حکم مانا تھا۔ انتھک بیل کی طرح جس نے کسی بوجھ کو بھی گراں نہیں سمجھا تھا۔ وفادار کتے کی طرح، جس نے کبھی اس کی چوکھٹ نہیں چھوڑی تھی۔

اسے وہ زمانہ یاد آیا، جب وہ غریب تھا، مفلس اور کھیتوں میں اسے کرائے کے مزارعوں سے بہت زیادہ کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کی بیوی بچہ جننے کے تیسرے روز کٹائی میں اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے کھیتوں میں آ پہنچی تھی۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا، لیکن یہ پھانس ابھی تک اس کے سینے میں چبھی ہوئی تھی وہ سخت محنت، عرق ریزی اور جانفشانی سے ایک بڑا زمیندار، ایک دولت مند کسان بنا تھا۔ اسے حق تھا کہ وہ اپنی بیوی کو خوبصورت اور اچھے کپڑوں میں ملبوس دیکھے۔

وہ غصیلی آواز میں بولا: ''اور تمہارے یہ پیر، جنہیں تم ایک پھٹے اور ادھڑے ہوئے چپل میں ڈال کر ہر وقت گھسٹتی رہتی ہو، کتنے بدصورت ہیں۔ مجھے تمہارے چہرے سے نفرت ہے، جسم سے اس سے زیادہ اور تمہارے ان پاؤں سے سب سے زیادہ۔''

یہ سن کر او۔لین آہستگی سے معصومانہ انداز میں بولی:

''میں بچپن میں ننگے پاؤں پھرتی رہی ہوں۔ اس لیے یہ بے تحاشا لمبے اور موٹے ہو گئے ہیں، میں نے اس لیے بچی کو کبھی ننگے پاؤں نہیں پھرنے دیا۔''

یہ سن کر وینگ لینگ وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ شرم سے پسینوں نہا گیا۔ وہ اپنی بیوی پر برس رہا تھا غضبناک ہو کر اسے طعنے دے رہا تھا، اس کی برائیاں گنوا رہا تھا اور اس کی بیوی دھیمے لہجے میں جواب دے رہی تھی۔ صرف وہ کچھ ڈری ہوئی تھی۔ کمرے سے باہر جاتے ہوئے وینگ لینگ کچھ دور رکا اور دھمکی دینے کے انداز میں بولا:

''میں قہوہ خانے چلا ہوں! اس گھر میں ایک بدشکل بیوی، کھانستے ہوئے بوڑھے اور ننگے بچوں کے سوا کیا ہے۔''

قصبے تک اسے ایک لمبا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اپنی زمینوں کو دیکھ کر جو دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں، وہ رستہ بھر یہ سوچتا رہا، وہ کبھی اتنی بڑی املاک کا مالک نہ بن پاتا اگر او۔لین اتنے قیمتی زر و جواہر، لعل اور موتی اس کے حوالے نہ کرتی۔ اس نے کتنی سادگی اور معصومی سے ایک معصوم بچے کی طرح وہ قیمتی خزانہ اسے تھما دیا تھا اور صرف دو چھوٹے چھوٹے موتی لے کر مطمئن اور خوش ہو گئی تھی۔ موتیوں کا خیال آتے ہی وینگ لینگ کے ذہن میں او۔لین کے پستانوں کا خیال آ گیا جن کے درمیان اس نے موتی رکھ لیے تھے۔ پستانوں کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں اس کے بھلے پن کا خیال آیا، جو ڈھیلے ہو کر لٹکنے لگے تھے۔

شاید وینگ لینگ کو اس کی ان خصوصیات کا خیال کبھی نہ آیا تھا۔ وہ اب غریب نہ تھا۔ اس کے گھر کی چار دیواری میں اناج تھا۔ سرخ رنگ کے گیہوں اور سفید چاول چاندی اور سونے کے سکے دفن تھے۔ دولت کے ساتھ اس کے زاویہ نظر میں تبدیلی آ گئی تھی، جیسے اس کی فطرت بدل گئی ہو۔ وہ جب غریب تھا، تو ایک انسان تھا۔ اب امیر ہو کر وہ ایک بن مانس بن گیا تھا۔ اپنے اصل کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اس کی شہوانی اور نفسانی حسیات بیدار ہو چکی تھیں۔ اب اسے اپنے سوا کوئی چیز پسند نہ تھی۔

جس چائے خانے میں وہ چوری چھپے توجہ کا مرکز بنے بغیر داخل ہوا کرتا تھا اب وہاں وہ چونکا دینے والی شخصیت بن کر داخل ہوا۔ کچھ عرصہ پہلے اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ بھیگی بلی کی طرح چائے خانے میں داخل ہوتا اور کسی کونے میں دبک جاتا۔ چائے خانے میں چھوٹی عمر کے نادان بچے، جو بیرے کا کام کرتے تھے، اس کی طرف توجہ نہ دیتے۔ اب جب کبھی وہ چائے خانے میں داخل ہوتا، تو سرگوشی میں کہی جانے والی کوئی نہ کوئی آواز اس کے کانوں میں ضرور پڑتی:

''یہ وینگ لینگ ہے، وہی جس نے بڑی حویلی والوں کی زمین خریدی تھی۔ کل کا فاقہ مست آج دیکھو کیسے چل رہا ہے۔''

یہ باتیں اکثر اس کے خلاف کہی جا رہی تھیں، لیکن وہ پھولا نہ سماتا اور چائے خانے میں اپنی نشست سنبھالنے کے بعد محتاط ہو کر ادھر ادھر دیکھتا۔

آج بیوی کو برا بھلا کہنے کے بعد جب وہ چائے خانے

میں داخل ہوا، تو اسے یہ ماحول جس میں داخل ہوکر وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جایا کرتا تھا، اپنے مرتبے کے مطابق بہت گھٹیا اور پس ماندہ محسوس ہوا۔

''مجھے اس قسم کے گھٹیا چائے خانے میں نہیں آنا چاہیے۔ جس کا مالک بھینگا ہے اور جس کی آمدنی میرے مزارعوں کی آمدنی سے زیادہ نہیں۔''

یہ خیال آتے ہی اس نے فرغل کی جیب سے چند سکے نکالے اور بل کی رقم پوچھے بغیر دے کر باہر نکل گیا۔ وہ بہت دیر تک گلیوں میں گھومتا رہا۔ بلا مقصد۔ اس چھوٹے سے قصبے میں اس کی دلچسپی کا شاید کوئی سامان نہ تھا۔ اس نے سوچا اسے شہر چلے جانا چاہیے۔ وہ سکوں سے بھری جیب خالی کرنا چاہتا تھا۔

مدت سے سیلاب کی وجہ سے وہ اپنے گھر میں مقید تھا۔ وہ بیکار بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تھا۔ بیوی کو لعن طعن کرنے کے بعد اس کی طبیعت مکدر سی ہوگئی تھی۔ وہ تفریح چاہتا تھا۔ اس نے شہر جانے کا فیصلہ کیا۔

شہر پہنچ کر اس کی نظریں بڑے بڑے شیشوں والی ایک آرائش گاہ پر گڑ گئیں۔ یہ شہر کا سب سے بڑا قہوہ خانہ تھا جسے رنگا رنگ قمقموں سے روشن کیا گیا تھا۔ قہوہ خانے میں صاف شفاف میزیں پڑی تھیں اور ان پر سکے اچھالے جا رہے تھے۔ وہ چپکے سے قہوہ خانے میں داخل ہو گیا۔ آج سے کچھ برس پہلے وہ کتنا غریب تھا۔ فاقہ مست، جس کی جیب میں چاندی کا ایک سکہ تک بھی نہ تھا۔ ایک ایسا شخص جو جانوروں کی طرح وزنی رکشا کھینچا کرتا تھا۔ وہ احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ قہوہ خانے میں داخل ہو کر وہ چپکے سے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ قہوہ خانے کی چھت منقش تھی اور اس پر مختلف رنگوں سے پیتل اور دھات کی آمیزش سے کئی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ عورتوں کی تصویریں! ننگی عورتوں کی تصویریں۔

وینگ لینگ نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چوری چھپے ان کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے زمین پر ایسی تصویریں نہیں دیکھی تھیں۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہر سکا اور بل ادا کرنے کے بعد چائے خانے سے باہر آ گیا۔

جب تک وینگ لینگ کی زمین پانی میں ڈوبی رہی وہ ہر شام شہر کے اس قہوہ خانے میں پہنچ جاتا۔ وہ عمدہ قسم کی چائے لانے کا حکم دیتا اور خود چھت پر بنی ہوئی منقش ننگی خوبصورت عورتوں کی تصویریں دیکھتا۔ اس کے وہاں بیٹھنے کا وقت دراز ہونے لگا۔ اس کے گھر میں کیا تھا؟ یہاں کتنا دلچسپ ماحول تھا۔ اس نے اپنے لباس میں بھی بہت سی تبدیلی پیدا کر لی تھی۔ وہ قیمتی ریشم کا لبادہ پہن کر آتا اور اپنے لمبے بالوں پر ضرورت سے زیادہ تیل لگاتا۔

ایک شام وہ قہوہ خانے میں بیٹھا قہوے کی گرم چسکیاں لے رہا تھا کہ اس نے ایک شناسا شکل دیکھی، جو بڑے ہال سے ملحقہ اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل کی راہداری میں غائب ہوگئی۔

شہر کے اس حصہ میں شاید یہی عمارت دومنزلہ تھی۔

وینگ لینگ آج معمول سے زیادہ دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ باہر رات کے سائے گھنے ہو رہے تھے، لیکن قہوہ خانہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ یکا یک بالائی منزل سے سازوں کی آواز بلند ہوئی اور ہلکی ہلکی تالیوں کا ارتعاش! وہ اس آواز کی طرف غیر اضطراری طور پر متوجہ ہوا اور پھر اس نے قہوہ خانے کے ماحول پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ میزوں پر سکے اچھل کود رہے تھے۔ وہ یہ نظارہ دیکھنے میں محو تھا کہ اچانک کسی نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ وینگ لینگ نے گردن گھما کر دیکھا تو اس کے سامنے ایک نہایت ہی حسین و جمیل مناسب جسم کی عورت کھڑی تھی۔ اس عورت کو اس نے کہیں دیکھا تھا، کہاں؟ ہاں یہ وہی عورت تھی، جسے اس نے جاگیردار کی بڑی حویلی میں دیکھا تھا، جس نے کہا تھا: ''میں تو ایک معمولی داشتہ ہوں! میرے پاس شاید کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس لیے یہاں رہی۔''

اس نے عورت کو پہچان لیا تھا۔ جاگیردار کی زمین کا آخری سودا اسی عورت نے چکایا تھا۔ عورت نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسی: ''وینگ لینگ کون جانتا تھا کہ ہم کبھی ملیں گے۔''

وینگ لینگ پر لازم ہو چکا تھا کہ وہ اپنی موجودہ حیثیت کا مظاہرہ کچھ بڑھ چڑھ کر کرے۔

''آؤ بیٹھو! چائے پیو! ہاں میں تمہارا نام بھول گیا ہوں۔''

''کوکو''

عورت یہ کہہ کر ساتھ کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی تنگ آنکھوں میں سانپ کی چمک تھی اور اس کی آواز ایسی تھی جیسے ایک بڑے کنستر سے چکنے تیل کی دھار بہہ رہی ہو!

''میں نے تمہیں آج یہاں پہلی بار دیکھا ہے۔''

''میں تو کئی دنوں سے آتا ہوں تقریباً ہر شام۔''

''اور رات ہونے سے پہلے چلے جاتے ہو۔'' کوکو نے رات کے لفظ پر زور دے کر کہا۔

''ہاں شاید آج پہلا موقع ہے کہ میں رات گئے تک یہاں بیٹھا رہا۔'' وینگ لینگ نے لہجے سے دیہاتی اکھڑ پن دور کرنے کی کوشش کی۔

''کیا کبھی شراب پی ہے؟ یہاں ہر قسم کی شراب ملتی ہے،

میٹھی، کڑوی، تند اور تیز۔''
''نہیں''
''اور جہاں تک میرا خیال ہے تم نے کسی اور ''چیز'' کو بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھوں کو۔۔۔ چمکتے دمکتے غنچوں جیسے گالوں کو۔''

وینگ لینگ نے سر جھکا لیا۔ سرخ خون اس کے چہرے پر جیسے ابل آیا۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ تمام لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ ہر کوئی صرف اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور ان کی باتیں سن رہا ہے۔

اس نے ہمت کر کے سر اوپر اٹھایا، اردگرد دیکھا، کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ وہ اپنے اپنے کام میں منہمک تھے۔

''نہیں نہیں کچھ بھی نہیں، صرف چائے یا قہوہ۔''

پھر کوکو نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور چھت پر نظریں گاڑ کر بولی: ''وہ دیکھو چھت پر تصویریں، پسند کرلو، کون سی تصویر پسند ہے۔ کسے دیکھنا چاہتے ہو کسے چھونا چاہتے ہو؟ چاندی کے سکے میری ہتھیلی پر اور لڑکی تمہاری آغوش میں۔''

ان لڑکیوں میں سے کوئی بھی!

وینگ لینگ نے چھت پر منقش تصویروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''میں نے سمجھا تھا یہ آسمانی حوریں ہیں۔ خواب کی دیویاں۔''

''ہاں، ہاں یہ آسمانی حوریں ہیں، خواب کی ایسی دیویاں جو سکوں کی آنچ میں پگھل کر انسانی جسم اختیار کر لیتی ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے پاس کھڑے ہوئے وردی پوش ملازم کو آنکھ کا اشارہ کیا: ''انہیں اوپر کی منزل پر لے جاؤ۔''

اور پھر وینگ لینگ سے مخاطب ہوئی: ''ان تصویروں میں سے پسند کرلو۔ بیس تصویریں ہیں۔''

وینگ لینگ نے ان تصویروں کی طرف دیکھا، پہلی تصویر دوسری، تیسری۔ اسے ساتویں تصویر پسند آئی۔ وہ اس کی بیوی کی صورت جسم اور ساخت کے ہر زاویے سے مختلف تھی۔ دبلی پتلی، ہلکی پھلکی بانس کی طرح۔ اس نے ایک ہاتھ دوسری ہتھیلی پر جما رکھا تھا۔ اس کا چہرہ ایسے کنول کی طرح تھا، جو ابھی غنچہ ہو۔ اس نے کوکو کی طرف دیکھا۔ اس کے کانوں میں ضمیر کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ ایک بیوی کا شوہر ہے۔ بچوں کا باپ ہے۔

اس نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا، جیب سے چاندی کے چند سکے نکالے، میز پر رکھ دیئے اور یہ کہہ کر: ''میں پھر آؤں گا، میں پھر آؤں گا۔'' تیزی سے قہوہ خانہ چھوڑ گیا۔

جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا، تو چاند پانی میں منعکس ہو رہا تھا اور اس کی رگوں میں نیا خون، نئے جوش اور نئے ولولے کے ساتھ گردش کر رہا تھا۔

☆☆☆

اگر پانی وینگ لینگ کی زمینوں سے اتر گیا ہوتا اور زمین پر ہل چلانے نیا بیج بکھیرنے اور مزارعوں کی نگہداشت کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی، تو شاید وہ پھر قہوہ خانے کا رخ نہ کرتا۔ یا پھر اس کا بوڑھا جان بلب باپ، بچے بیمار پڑ جاتے یا چھت سے گر پڑتے، تو شاید وینگ لینگ ان عورتوں کے تصور سے باز رہتا، جو قہوہ خانہ کی چھت پر پرچھائیاں بن کر اسے مبہوت کئے ہوئے تھیں، لیکن معمولی جھگڑ، جو سورج کے نکلنے سے پہلے چلتے تھے، ٹھہرے ہوئے پانی کو خشک نہ کر سکے۔

وینگ لینگ کا بوڑھا باپ ہر وقت اونگھتا رہتا اور دونوں بچے، جن کے مدرسے جانے کا رستہ منقطع ہوگیا تھا اپنی تختیوں پر الٹے سیدھے حروف بناتے رہتے۔

وینگ لینگ ذہنی انقلاب کا شکار ہو چکا تھا اور نہ جانے کیوں اپنی بیوی او۔لین سے نظریں چرانے لگا تھا۔ بیوی کی نظریں ہر وقت اس کا تعاقب کرتیں اور وہ اس تعاقب سے گھبرا کر کسی مجرم کی طرح گوشہ عافیت کی تلاش میں رہتا۔ وہ اتفاقاً اس کی بنی ہوئی چائے نہ پیتا اور نہ چرٹ جس میں وہ تمبا کو بھر کر لاتی۔ دن اسی اضطراب میں گزرنے لگے۔

ایک دن سہ پہر کے قریب نجانے وینگ لینگ کے دل میں کیا آئی کہ وہ اندرونی کمرے میں پہنچا۔ اس نے ریشم کا سب سے قیمتی لبادہ، جس پر زردوزی کا کام کیا ہوا تھا، پہنا، کامدار جوتا اور جیبوں میں چاندی سونے کے سکے رکھ کر وہ گھر سے باہر نکلا۔ اس کے قدم شہر کے قہوہ خانے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ وہاں روشنی ہی روشنی تھی۔ تیل کے لیمپ جگمگا رہے تھے۔ قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ سکے اچھل رہے تھے۔ وینگ لینگ قہوہ خانے کے صدر دروازے کے قریب آ کر رک گیا۔ نجانے یہاں پہنچ کر وہ کیوں سہم جاتا تھا۔ اچانک اسے کوکو کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے اسے دیکھ لیا تھا اور وہ اسے بلا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھنے میں جھجک محسوس کر رہا تھا۔ کوکو قریب آ گئی۔ ''آؤ رک کیوں گئے ہو، نہیں آنا چاہتے تو نہ آؤ، میں کسی اور کو بلا لوں گی۔ یہاں آنے کے لیے چاندی کے سکوں کی ضرورت ہوتی ہے اور تمہاری جیب کے علاوہ دوسری بے شمار جیبوں میں بھی سکے ہوتے ہیں۔''

وینگ لینگ نے یہ سن کر خفت محسوس کی۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ

اس کی جیب بہت وزنی ہے اور اس کا اظہار ضروری تھا۔ اس نے اپنا جفاکش محنتی ہاتھ جیب میں ڈالا اور جب وہ ہاتھ پھر نمودار ہوا سکے چمک رہے تھے۔

''کیا یہ کم ہیں! کم ہیں تو۔۔۔؟''

کوکو نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آؤ اپنی پسند کی مورت چن لو۔''

''میری پسند کوئی نہیں۔'' اور پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ ''پھول کی پنکھڑی، وہ نازک سی مورت، جس کے پاؤں بہت خوبصورت ہیں، جس کا چھوٹا سا چہرہ ہے۔ کنول کی طرح شاداب۔''

آج ویٹگ لینگ کوکو کے ساتھ بالائی منزل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ کوکو اسے ایک تاریک راہداری سے ایک روشن آراستہ کمرے میں لے آئی۔

''دروازہ کھولو اور باہر نکلو! آج کی رات کا خریدار آ گیا ہے۔''

کمرے میں کئی دروازے تھے۔ سب یکبارگی کھل گئے اور کئی چہرے کمرے میں جھانکنے لگے۔

''پسند کرو۔'' اس نے ویٹگ لینگ کو مخاطب کیا اور اس کی پسند معلوم کرنے کے لیے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم نہیں، تم بھی نہیں، ہاں تم، کنول تم، تم جو موسم بہار کے انار کی طرح سرخ اور تر و تازہ ہو۔ آنے والے خریدار نے تمھیں پسند کیا ہے۔ اس کی طرف دیکھو کنول! یہ کسان ہے اور گیہوں اور پیاز اگانے والی زمین سے آیا ہے۔''

یہ الفاظ تیر کی طرح ویٹگ لینگ کے سینے میں اتر گئے۔ ان الفاظ میں کتنی نفرت کتنی طنز، کتنا زہر پوشیدہ تھا۔ وہ اپنا سب سے قیمتی لباس پہن کر آیا تھا۔ اس کی جیبوں میں چاندی اور سونے کے بے شمار سکے تھے، لیکن پھر یہ تحقیر آمیز جملے اس پر کیوں اچھالے گئے۔ وہ ابھی کچھ سوچ رہا تھا کہ کوکو کی سفید ہتھیلی اس کے سامنے پھیل گئی۔ اس نے اس پر آدھی جیب انڈیل دی۔

''تم اندر جا سکتے ہو۔''

ویٹگ لینگ ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوا۔ ایک سرخ ریشمی چادر پہنے جس پر پھول کڑھے ہوئے تھے، ایک نوخیز لڑکی سامنے بیٹھی تھی۔

اگر اسے کوئی کہتا کہ کسی لڑکی کے ہاتھ اتنے نازک چھوٹے اور ملائم ہو سکتے ہیں۔ انگلیاں گاؤدم، ناخن اتنے سرخ جیسے گل لالہ ہو اور اگر کوئی اسے کہتا کہ پاؤں اتنے چھوٹے اتنے نازک ہو سکتے ہیں، سرو کی منجھلی انگلی سے بھی کم لمبے، تو وہ یقین نہ کرتا، لیکن ویٹگ لینگ کے سامنے ایک ایسی ہی لڑکی بیٹھی تھی، جس کے ہاتھ اور پاؤں ناقابل یقین خواب یا بعید از قیاس تصور کی طرح تھے۔

وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے محویت کے انداز میں اسے تک رہی تھی۔ اس کی عبا تنگ تھی۔ آنکھیں شفتالو کی قاشوں کی طرح تھیں۔ اسے وہ لڑکی گوشت پوست سے زیادہ مرقع معلوم ہوتی تھی۔

''قریب آؤ۔'' گڑیا بولی۔

وہ قریب چلا گیا۔ لڑکی نے اپنا مخروطی انگلیوں والا نازک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ وہ اتنا ہلکا، سبک اور بے وزن تھا جیسے کسی نے ہوا کے جھونکے کو منجمد کر کے اس کے شانوں پر رکھ دیا ہو، لیکن اس ہوا کے منجمد جھونکے میں کون سی آگ چھپی ہوئی تھی، کون سا لاوا پوشیدہ تھا، وہ ہاتھ آہستہ آہستہ شانوں سے حرکت کرتا اس کی عبا کے بٹن کھولنے لگا۔ ویٹگ لینگ پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ پھر اس نے ایک قہقہہ کی آواز سنی، جیسے چاندی کی کئی گھنٹیاں بیک وقت بجنے لگیں۔ ''تم کتنے سیدھے سادے ہو، کیا ساری رات صرف مجھے تکتے ہی رہو گے؟''

اور یہ سن کر ویٹگ لینگ نے آہستہ سے اس کے نرم ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا، جیسے اس نے ایک کونپل ہاتھوں میں لے لی ہو۔

لڑکی نے شرماتے ہوئے لہجے میں کہا: ''مجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔ کچھ بتاؤ؟'' لڑکی اسے کچھ سکھانا چاہتی تھی۔

ویٹگ لینگ نے کھیتوں میں ہل چلائے تھے۔ خشک اور برفیلی ہواؤں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس نے جنوبی شہر میں قحط کے دوران رکشا چلایا تھا۔ اس نے غربت سہی تھی۔ مسلسل فاقے کئے تھے، لیکن اس نرم و نازک لڑکی کے ہاتھوں کو ہاتھ میں لے کر وہ نہتا ہو گیا تھا۔

اب ہر رات وہ وہاں جانے لگا۔ ہر رات وہ اس کی خواب گاہ تک پہنچ جاتا، لیکن اس کے ہاتھوں کے لمس سے زیادہ جسم کے کسی حصے سے حظ حاصل نہ کر سکا۔

وہ پھول کو سونگھنا، پھل کو چکھنا چاہتا تھا، لیکن کوکو کی تربیت میں پلی ہوئی گلہری اسے ہاتھ نہیں ڈالنے دیتی تھی۔ ویٹگ لینگ اسی لیے روز بروز تشنہ اور بھوکا ہوتا جا رہا تھا۔

جب وہ او۔لین کو بیاہ کر لایا تھا، تو اس کے گوشت کے ہر حصے میں خون تیزی سے گردش کرتا تھا اور وہ والہانہ طور پر اس سے لپٹ جاتا، جیسے ایک درندہ اپنی مادہ کو اس کی مرضی یا محبت پوچھے بغیر اپنی آغوش میں سمیٹ لیتا ہے۔

اب نہ تو اس میں وہ جرات رہی تھی اور نہ اس لڑکی میں تمازت، گرمی اور مقناطیسیت، کئی بار وہ لطف اندوز ہوئے بغیر چاندی

کے سکے اس کے ننھے ہاتھوں میں تھما کر بھوکا پیاسا گھر کی طرف، ایک ایسے پیاسے کی طرح لوٹ آتا، جو نمکین چشمے کے کنارے بیٹھا رہا ہو۔ اس نے کئی مرتبہ اس چشمے سے پیاس بجھانے کی کوشش کی تھی اور وہ ہمیشہ تشنہ کام رہا تھا۔

گرمی کے اس تمام موسم میں وینگ لینگ کنول سے محبت کرتا رہا۔ وہ اس لڑکی کے ماضی سے واقف نہ تھا۔ اسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے اور ایک عورت کے سوا وہ کیا ہے! وہ جب کبھی تنہائی میں ملتے، تو وینگ لینگ خاموش رہتا۔ وہ مسلسل باتیں کرتی رہتی اور وہ سنتا رہتا۔ وہ بہت تیزی سے بولنے کی عادی تھی، کبھی کبھی وہ ایک قہقہہ لگانے کے لیے رکتی اور باتیں کرنے لگتی۔ وینگ لینگ اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہتا۔ اس کے نرم و نازک ہاتھوں اور مخروطی انگلیوں کی طرف، اس کے متناسب جسم کی طرف اور اس کی آنکھوں کی طرف، جس میں مٹھاس تھی جیسے بنفشی رنگ کے شربت سے بھرے ہوئے کٹورے ہوں۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود گھنٹوں اس کے قریب رہنے کے بعد بھی وینگ لینگ ہمیشہ پیاسا ہی گھر لوٹتا۔

راتوں کی نینداس پر حرام ہو گئی تھی۔ وہ گرمی کی شدت کا بہانہ تراش کر کمرے سے صحن میں نکل آتا اور بانسوں کے بنائے ہوئے چھپر کے نیچے، جس پر عشق پیچاں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں، بیٹھ کر ان گنت تاروں والے آسمان کی طرف دیکھتا۔ اس کے سینے میں ایک میٹھی میٹھی تھکی ہوئی سی درد ہوتی۔ وہ اب کسی سے بات بھی نہ کرتا تھا۔ نہ اپنی بیوی سے نہ بچوں سے اور نہ اپنے بوڑھے باپ سے۔

ایک روز چنگ اس کے قریب آیا، وہ چٹائی پر لیٹا آسمان کی طرف تک رہا تھا۔

''پانی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا ہے۔ دو چار روز میں فصل بونی ہوگی۔ کتنی زمین پر چاول اور۔۔۔۔۔۔''

وینگ لینگ غصے سے بولا: ''پانی اتر جائے گا، تو سوچوں گا۔''

آج اس نے چنگ سے مالکوں کے لہجے میں بات کی۔ وہ اس وقت کنول کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ اب اپنی بیوی او۔لین اور بچوں سے بھی نظریں چرانے لگا تھا۔

ایک دن اس کے جہاندیدہ بوڑھے باپ نے پوچھا:

''کیا بات ہے، تم بہت چڑ چڑے ہو گئے ہو؟''

وینگ لینگ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور رات کے انتظار میں رہا جب کنول اور اس کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہے گا۔ کوکو کی ہدایات پر ابھی تک کنول نے وینگ لینگ کو جنسی آسودگی نہ بخشی تھی۔ کنول نے آج اسے کہا کہ اسے جنگلیوں کی طرح کے بال اور مونچھیں پسند نہیں ہیں اور وینگ لینگ نے دوسرے روز ہی کنول کا قرب اور اس کی آغوش کی گرمی حاصل کرنے کے لیے بال ترشوا لیے۔ جب وہ مونچھیں اور بال منڈوا کر گھر واپس آیا تو او۔لین اپنا غصہ ضبط نہ کر سکی۔ وہ عادت کے خلاف بلند آواز سے بولی:

''یہ تم نے کیا کیا۔ مونچھیں تو مردوں کا زیور ہوتی ہیں۔''

''کیا میں تمام عمر ایک جگہ بے سلیقہ دیہاتی رہتا۔ شہر کے تمام نوجوان مونچھیں منڈواتے اور بال ترشواتے ہیں۔''

اس نے کہنے کو تو یہ سب کچھ کہہ دیا، لیکن اسے اپنے اس فوری فیصلے پر ندامت اور خفت محسوس ہو رہی تھی، لیکن بالوں کی کیا حیثیت تھی، اگر کنول اسے گردن کٹوانے کے لیے بھی کہتی تو وہ لمحہ بھر کے لیے بھی نہ سوچتا۔ وہ اس کی زندگی تھی۔

آج وہ بہت دیر تک نہاتا رہا۔ خوشبودار صابن سے، اور اپنے جسم کو اس طرح دیکھتا رہا جیسے وہ کسی دوسرے کا جسم ہو۔ اس نے پیاز بھی کھانا چھوڑ دیا تھا مبادا کنول بدبو کی بھبکی محسوس کر لے اور اس سے نفرت کرنے لگے۔ اس کے بدلے ہوئے تیور اور رویے کو گھر کے تمام چھوٹے بڑے محسوس کرنے لگے تھے، لیکن ان کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔

اس مرتبہ اس نے اپنے کپڑے بھی او۔لین کو سینے کے لیے نہ دیئے حالانکہ وہ بہت اچھے کپڑے سیتی تھی۔ عمدہ ریشم کے کپڑے اس نے شہر کے ایک درزی سے سلوائے، نئے جوتے پہنے، چمکیلے اور نرم کھال کے، لیکن نجانے وہ بھڑکیلے کپڑے او۔لین اپنی بیوی، اور بچوں کے سامنے پہننے سے کیوں گھبراتا اور شرم محسوس کرتا تھا۔ اس نے کپڑوں کا بقچہ چائے خانے کے بوڑھے مالک کے پاس رکھ دیا۔

ایک دن دوپہر کے وقت وہ اپنے گھر میں بیوی کے ساتھ چاول زہر مار کر رہا تھا، تو اس کی بیوی بہت دیر تک اس کے چہرے کی طرف تکتی رہی اور بولی: ''تم وہی کچھ بنتے جا رہے ہو، جو بڑی حویلی کے آقا ہوتے تھے۔ تم بڑی حویلی کے مالکوں کی طرح ہوتے جا رہے ہو۔''

وینگ لینگ نے اس کا جواب نہ دیا۔ لیکن ایک انجانی سی خوشی محسوس کی۔ اب چاندی کے سکے تیزی سے اس کے ہاتھ سے پھسلنے لگے۔ یہ صرف ان لمحات کی قیمت نہ تھی جو وینگ لینگ کنول کے ساتھ اس کے بستر پر بسر کرتا تھا، بلکہ اس کی فرمائش پر جن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اگر وینگ لینگ اس کی کسی خواہش کی تکمیل میں لیت و لعل کرتا، تو کنول اس کے سینے کے ساتھ لگ کر کہتی:

''میں! میں! آخر کیا لگتی ہوں آپ کی۔''

اور یہ سن کر وینگ لینگ اس کی ہر خواہش پر دم دینے کے لیے تیار ہو جاتا۔ اس نے وہ تمام الفاظ اور آداب یاد کر لیے تھے، جو عاشقوں کی لغت میں اپنے محبوب کے لیے ہوتے ہیں:

''جانی''

''زندگی''

''دھڑکن''

وہ اتنے الفاظ یاد کر چکا تھا جتنے الفاظ اس نے اپنی فصل کے بونے اور کاٹنے کے لیے بھی یاد نہ کئے تھے۔ وہ تجوری سے ہر دوسرے تیسرے روز چاندی کے سکے نکالتا اور اس کی بیوی او۔لین خاموش تماشائی کی طرح اس کی ہر حرکت دیکھتی رہتی۔ وہ اس سے الجھنا چاہتی تھی۔ وہ خوبصورت نہ تھی، اس کے بال کھردرے بے رنگ تھے، اس کے پاؤں لمبے اور بے ڈھنگے تھے۔

ایک دن جب او۔لین گھر کے صحن میں کپڑے دھو رہی تھی وہ اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے قدموں میں مجرم کا احتیاط اور اسرار تھا۔

''وہ موتی کہاں ہیں؟''

''کیوں۔''

''تمہارے کس کام کے۔''

''میں نے سوچا تھا کبھی بندے بنواؤں گی اور لڑکی کی شادی ہو گی، تو جہیز میں اسے دے دوں گی۔''

''وہ تم مجھے دے دو! مجھے ان کی ضرورت ہے۔''

اس نے یہ سن کر اپنا گیلا ہاتھ انگیا میں ڈالا اور ننھی سی پوٹلی نکال کر، جس میں موتی بندھے ہوئے تھے، وینگ لینگ کے حوالے کی اور کپڑوں کو پتھر کی سل پر پٹخنے لگی۔ آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں سے نکلے۔ اس نے انہیں پونچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ ان گرتے ہوئے آنسوؤں کی پروا نہ کرتے ہوئے کپڑوں پر چوبی دستہ برساتی رہی۔

☆☆☆

وینگ لینگ بے دریغ دولت نچھاور کر رہا تھا۔ گھر کے تمام افراد اور پینگ محض تماشائی تھے کہ ایک دن وینگ لینگ کا چچا واپس گاؤں آ دھمکا۔ وہ اچانک گھر میں آ ٹپکا۔ اس کے کپڑے بوسیدہ اور میلے تھے۔ قمیص کے بٹن بھی ٹوٹے ہوئے تھے اور اس کے چہرے سے خشونت اور وحشت ٹپک رہی تھی۔

وینگ لینگ اپنے چچا کو دیکھ کر ہراساں اور کچھ پریشان ہوا۔ وہ اسے مردہ تصور کرنے لگا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے محسوس کیا، جیسے مردہ قبر پھاڑ کر آ گیا ہو۔

وینگ لینگ نے بادل نخواستہ اسے گھر کے اندر آنے کو کہا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو وینگ لینگ کا باپ اسے نہ پہچان سکا۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ بصارت سے محروم۔ چچا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا: بڑے بھائی سلام!

یہ کہتے ہوئے وہ تکلف کے بغیر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''کچھ کھانے کے لیے لاؤ۔ سنا ہے بلکہ دیکھ بھی لیا ہے کہ غربت یہاں سے بھاگ گئی ہے۔''

کچھ عرصہ کے بعد جب مچھلی، گوشت اور چاول کے کئی طشت خالی کر چکا تو غنودگی کے انداز میں بولا:

''اب میں کچھ سو لوں، تھک گیا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور چند لمحوں کے بعد خراٹے لینے لگا۔ وینگ لینگ چچا کی غیر متوقع آمد اور بے تکلفی پر جل بھن رہا تھا۔

نیند پوری کرنے کے بعد، جب اس کا چچا بستر سے اٹھا تو اس نے اطمینان کی جمائی لیتے ہوئے وینگ لینگ کو مخاطب کیا:

''میں نے سنا تھا کہ تم دولت مند ہو گئے ہو۔ لیکن تم اتنے امیر ہو گئے ہو، میں نہیں جانتا تھا، میں کل ہی اپنی بیوی اور لڑکے کو بھی یہاں لے آؤں گا۔ وہ قصبے کی سرائے میں سڑ رہے ہیں۔ تین انسانوں کا بوجھ تم آسانی سے برداشت کر سکتے ہو۔ اتنے بڑے گھر میں کوئی ٹھکانے کی جگہ میں دے دو۔ رہا کھانا پینا، تو تمہارے بیسیوں مزارعے ہیں وہاں ہم بھی کھا پی لیا کریں گے۔''

''ایسا نہ کہو چچا، میں تمہیں باپ سمجھتا ہوں۔ تم میرے بڑے ہو۔'' وینگ لینگ نے رسمی طور پر یہ فقرہ کہا۔

اس کا چچا کچھ زیادہ بے تکلف ہو چلا تھا اور وینگ لینگ سمجھنے لگا تھا کہ بہت جلد وہ اپنی فربہ بیوی اور بدتمیز بچے کو لے کر اس کے گھر آ ٹپکے گا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس کا چچا اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ گھر میں آ گھسا، تو وہ گھر کا کوئی دروازہ بھی اس پر بند نہ کر سکے گا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

پریشان کن مستقبل اسے ڈرانے لگا۔ اس نے سوچا امیر ہونا کتنی بڑی لعنت ہے۔ اگر وہ امیر نہ ہوتا تو اس کا کوئی غریب رشتہ دار اس کے گھر کے دروازے پر دستک نہ دیتا۔

اور وہی ہوا، جس کا ڈر تھا۔ اس کا چچا اپنی چرب زبان بیوی اور بیٹے کے ساتھ اس کے گھر آ گیا۔ وینگ لینگ لب کشائی نہ کر سکا۔

وہ اپنے گاؤں قصبے، شہر میں بہت معزز آدمی بن چکا تھا اگر وہ اپنے غریب رشتہ داروں کو دھتکار دیتا تو سب کی انگلیاں اس پر اٹھنے لگتیں۔ اس نے پرانے مکان کا ایک حصہ اپنے چچا کے کنبے کے لیے خالی کرالیا۔ فیاضی، رحمدلی یا فرض شناسی کا اس کے اس فیصلے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ غم و غصہ کا اظہار بھی نہ کرسکا۔ اس کی چٹوری چچی، بہت سی باتیں کہنے والی لمبی زبان لے کر اس کے گھر میں آ پہنچی تھی۔ اس کا چچیرا بھائی بدخصلتی کی علامت بن کر آ پہنچا تھا۔

وینگ لینگ اس صورتحال سے بہت پریشان اور نالاں تھا۔ وہ اپنے چچا چچی اور ان کے لڑکے سے نفرت کرتا تھا، لیکن اسے ہنس کر ان کے سلام کا جواب دینا پڑتا اور پھر کچھ دن کی غیر حاضری نے کنول کی یاد میں بھی شدت سے اضافہ کر دیا تھا اور وہ سخت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کوئی انسان بھی جب ضرورت مند نہیں رہتا، تو اپنے آپ کو کسی بھی پابندی کا محتاج نہیں سمجھتا۔

جب کسی کے گھر میں ہر وقت کتے بھونکنے لگیں، صرف شور ہی شور ہو تو اسے وہاں نہیں رہنا چاہیے۔

عشق کی بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے وینگ لینگ کے سینے میں فروزاں تھے۔ او۔لین اپنی سادگی، بوڑھا باپ بینائی کے فقدان اور چینگ اپنے تجربے اور دوستی کے باوجود نہ دیکھ سکے، لیکن چچا کی فربہ اور جہاندیدہ بیوی کی نظروں سے یہ شعلے پوشیدہ نہ رہ سکے اور ایک دن اس نے ہنستے ہوئے اولین سے کہا:

"تمہارا شوہر کسی نئے پھول کو توڑنے کی فکر میں ہے شاید۔"

او۔لین یہ سن کر خاموش رہی تو چچی کی آواز پھر آئی:

"تربوز کو جب تک دو ٹکڑے نہ کرو، اس کے بیج نظر نہیں آتے۔ نہیں سمجھی! سمجھو، تمہارا مرد کسی اور عورت کے چکر میں ہے۔"

یہ باتیں وینگ لینگ کمرے میں کھلنے والی کھڑکی کے دوسری طرف کھڑا سن رہا تھا۔ چچی کی زہر بھری آواز پھر سنائی دی:

"میں نے کئی مرد دیکھے ہیں، جب کوئی مرد اپنے بالوں کو سنوارنا، نئے کپڑے پہننا اور اس پر عطر چھڑکنا شروع کر دیتا ہے تو وہ ایک نئی عورت کو اپنے گھر میں لانے کی فکر میں ہوتا ہے۔"

اس کے بعد اس کی بیوی او۔لین نے کچھ کہا جسے وہ نہ سن سکا! لیکن چچی کی مکارانہ آواز آئی: "بے وقوف مرد نہیں جانتا کہ ایک عورت ایک مرد کے لیے کافی ہوتی ہے۔ لیکن تم نے کبھی اپنے شوہر کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ تم ہمیشہ ایک بیل کی طرح کھیتوں میں جتی رہی ہو۔ ایک بھینس کی طرح اس کے بچوں کو دودھ پلاتی رہی ہو۔ تم نے کبھی ایسی عورت بننے کی کوشش نہیں کی، جو مرد کو شیشے میں اتار لیتی ہے۔ ان کو بیل بنا لیتی ہے۔ جب تک تمہارا شوہر غریب تھا، تمہیں کوئی ڈر نہیں تھا۔ اب دولت کے ساتھ کسی دروازے سے کوئی بھی عورت داخل ہو سکتی ہے۔

امیر کا بچہ ہو تو ایک کھلونا اس کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ جب تک تمہارے شوہر کی جیب خالی تھی، گودام میں دانے نہیں تھے، اس کی تجوری خالی تھی، کوئی عورت نہ اس کے ضمیر میں تھی اور نہ اس کے گھر میں آ سکتی تھی۔ بھوکا مرنے کے لیے کون عورت آتی ہے اور امیر بننے کے لیے زرق برق کپڑے قیمتی زیورات پہننے کے لیے کون عورت نہیں آتی؟"

گول گپا چچی بہت کچھ کہتی رہی۔ وینگ لینگ سنتا رہا۔ جہاندیدہ چچی اس کی کمزوری سے واقف ہو چکی تھی اس لیے وینگ لینگ نے مناسب سمجھا کہ وہ اسے خاموش رکھنے کے لیے اس سے خفیہ طور پر ملے۔ اس کا منہ بند کرنے کے لئے اگر اسے کچھ چاندی کے سکے بھی دینے پڑیں تو گریز نہ کرے۔ اور اسی شام وہ اپنی چچی سے وسیع صحن میں اگے ہوئے چنار کے درخت تلے ملا:

"تم جو کچھ میری بیوی سے کہہ رہی تھیں، میں نے سن لیا ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ مجھے ایک دوسری عورت کی ضرورت ہے اور کیوں نہ ہو میرے پاس زمین ہے۔"

"کیوں نہیں، جو مرد خوشحال اور دولت مند ہو جائے اسے حق پہنچتا ہے کہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھے۔ یہ تو صرف غریب ہی ہوتا ہے، جو ایک پیالی سے چائے پیئے۔"

وہ رمز شناس عورت تھی اور وہی باتیں کر رہی تھی جنہیں وینگ لینگ سننے کا آرزومند تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ معاملے کو آگے بڑھانے کے لیے اسے ایک دلال کی ضرورت ہے۔

"میں ایک عورت کو گھر لانا چاہتا ہوں، لیکن ایسا کرنے سے پہلے کچھ شرائط طے کرنی ہوں گی۔ اس کے مطالبات معلوم کرنے ہوں گے۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو، مجھے صرف لڑکی کا نام اور پتہ بتاؤ۔ میں سب ٹھیک کرالوں گی۔"

"اس کا نام کنول ہے۔"

اس نے یہ نام اس طرح لیا، جیسے دنیا کا ہر شخص اس نام سے واقف ہے۔

"رہتی کہاں ہے۔" چچی نے آہستگی سے پوچھا۔

"بڑے قہوہ خانے کی بالائی چھت پر۔ اسی قہوہ خانے میں جو بڑے بازار کے کونے پر ہے۔" وینگ لینگ نے شرما کر کہا۔

"وہی، جسے 'جنسی پھول گھر' کہا جاتا ہے۔"

"ہاں وہی۔"

یہ سن کر مکار چچی نے دانتوں سے نچلا ہونٹ کاٹا اور سوچتے ہوئے بولی: ''اس ''پھول گھر'' کی دلالہ کون ہے؟''

''اس کا نام ''کوکو'' ہے۔''

کوکو کا نام سن کر حرافہ چچی چونکی اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولی:

''وہ تو نہیں، جو بڑی حویلی کے جاگیردار کی داشتہ تھی۔ شاید، وہی ہوگی۔ سیدھی بات ہے وہ ہمیشہ دولت مند بننے کی آرزومند رہتی تھی۔ نرم و نازک کھالوں کے کاروبار سے زیادہ کسی دوسرے کاروبار میں منافع نہیں۔''

یہ سن کر وینگ لینگ کا منہ جیسے خشک ہوگیا۔ اس کی آواز بھی سوکھ گئی۔ ''تو چاندی اور سونے پر بات ختم ہوگئی۔ چلو اس مرتبہ زمین نہ سہی ایک عورت سہی۔''

حرافہ چچی یہ سن کر مطمئن ہوگئی اور منصوبے کو عملی جامہ پہنانے لگی۔ وہ مقصد کی تکمیل سے پہلے بہت سی رقم اینٹھ لینا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وینگ لینگ کے پاس سونے چاندی کی کمی نہیں اور تکمیل ہوس کے لیے وہ جان کی بازی بھی لگا سکتا تھا۔ ایک دن اس نے وینگ لینگ سے کہا: ''ان کے مطالبات بڑھتے جا رہے ہیں، جس کے متحمل تم شاید نہ ہو سکے۔'' یہ فقرہ تجربہ کار چچی نے آتش اشتیاق بھڑکانے کے لیے کہا تھا۔

وینگ لینگ غصے سے بولا: ''کیا تم نے کوکو سے نہیں کہا کہ میرے پاس سونے چاندی کی کمی نہیں، میں بہت بڑا زمیندار ہوں۔ وہ میرے گھر میں آ کر راج کرے گی۔ اسے یہاں کوئی محنت و مشقت نہیں کرنی پڑے گی۔ وہ قیمتی ریشم اور اپنی پسند کے زیور پہنے گی۔''

''ٹھیک ہے اب انہیں انکار نہیں ہوگا۔ تم مجھے بیوقوف نہ سمجھو۔ مرد اور عورت کا ناتا میں پہلی بار نہیں جوڑ رہی۔''

اب بوڑھی چچی کبھی معاملہ نبٹانے شہر جاتی اور واپس آ کر اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے او۔لین کو کمرے صاف کرنے فرش دھونے اور گھر کو صاف ستھرا رکھنے کے گر سمجھاتی۔ او۔لین بیچاری یہ سب کچھ جان چکی تھی۔ وہ روز بروز خوف زدہ ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

اب وینگ لینگ کی نیندیں بھی حرام ہو چکی تھیں۔ معاملہ یا سودا مکمل ہو چکا تھا اور مستقبل قریب میں ایک دوسری عورت اس گھر آ رہی تھی۔ وہ سوچتا دوسری عورت کے آنے پر اسے زیادہ کمروں کی ضرورت ہوگی۔ دو ایک ایسے کمروں کی، جو الگ تھلگ ہوں۔ جہاں وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ تنہائی میں عشق و محبت، راز و نیاز کی باتیں کر سکے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے کھیتوں پر سے آدھے مزدوروں کو واپس بلا لیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ دن رات کر کے صحن کے دوسری طرف دو نئے کمرے بنانا شروع کر دیں۔ مزدوروں نے اپنا کام شروع کر دیا اور اس نے خود ان کے کام کی نگرانی سنبھال لی۔ اس نے چنگ سے اس موضوع پر گفتگو مناسب نہ سمجھی۔ شاید اس لیے کہ وہ انتہائی ندامت محسوس کر رہا تھا۔ دیواریں بلند ہونا شروع ہوگئیں اور وینگ لینگ چھت کے لیے تراشے ہوئے پتھر کی سلیں لینے کے لیے خود شہر گیا۔ یہ دونوں کمرے اس نے پختہ اینٹوں سے تعمیر کرائے۔ اور پختہ فرش پر ایک منقش چھت جب بن کر تیار ہوگئی، تو وینگ لینگ نے دروازوں کے لیے سرخ ریشم کے پردے خریدے اور کمرے کو سجانے کے لیے نیا ساز و سامان بھی۔ ایک مخملیں صوفہ اور دو آبنوس کی خوبصورت کرسیاں۔ قیمتی چینی کے برتن اور ایک نہایت ہی خوبصورت پلنگ۔ اس تمام خرید و فروخت کے دوران میں اس نے او۔لین سے کوئی مشورہ نہ لیا۔ وہ خاموشی سے یہ کایا پلٹ دیکھتی رہتی۔ شوہر اور بیوی کی آنکھیں ایک دوسرے سے چار ہوتیں دونوں نظریں جھکا لیتے۔ وینگ لینگ شرمندہ ہو جاتا اور او۔لین نہیں چاہتی تھی کہ اس کا شوہر شرمندہ ہو۔ اس لیے۔۔۔۔۔

ایک شام چچی مسکراتی ہوئی وینگ لینگ کے کمرے میں آئی اور اسے خوشخبری سنائی کہ رخصتی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ چاند کی ''پانچویں۔''

وینگ لینگ نے اس کی ہتھیلی پر پانچ طلائی سکے رکھ دیئے۔ جو ہچکچاتے ہوئے اس نے وصول کر لیے۔ دوسرے دن وینگ شہر میں پہنچا اور اس نے شیشے کے ایک مرتبان میں پانچ سنہرے رنگ کی زندہ مچھلیاں خرید کر چھوڑ دیں۔ یہ وہ اپنے اس تالاب کے لیے لایا تھا، جو خاص طور پر اس نے کنول کے لیے صحن کے وسط میں بنوایا تھا۔ وینگ لینگ کی تیاری بھی مکمل ہو چکی تھی۔ دوسری عورت کے آنے میں کچھ دن رہ گئے تھے اب اس کا تمام وقت بچوں کو ڈانٹتے ڈپٹتے گزرتا۔

''اپنا ناک صاف کرو۔ تمہارے کپڑے میلے کیوں ہیں۔'' او۔لین پر وہ گرجتا ''تم نے تین روز سے اپنے بالوں میں کنگھی نہیں کی۔ کیا جھاڑو لٹکائے پھر رہی ہو۔'' اور ایک صبح جب اس نے اپنی بیوی کو ڈانٹا، تو او۔لین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ آج تک نہیں روئی تھی۔ وہ اس وقت بھی نہیں روئی تھی، جب مہینوں تک انہوں نے فاقے کاٹے تھے، بھیک مانگی تھی، پیڑوں کی چھال اور سوکھے پتے چبائے تھے۔ گھر کے چولہے کے لیے گاؤں میں ہمسایوں کے جانوروں کا گوبر اکٹھا کیا تھا۔ او۔لین کو آنسو بہاتے

دیکھ کر وینگ لینگ شرمندہ ہو گیا اور ندامت کے احساس کو زائل کرنے کے لیے بولا: "کیا میں تمہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ بالوں میں کنگھی کر لیا کرو؟"

آج پہلی مرتبہ او۔لین اپنے شوہر سے اس انداز میں مخاطب ہوئی: "میں تمہارے بچوں کی ماں ہوں۔ میں نے تمہارے لیے بچے جنے۔" اس سے زیادہ اس نے کچھ نہ کہا۔ اس میں کیا شک تھا کہ او۔لین اس کی نہایت وفا شعار بیوی تھی۔ محنتی اور شکایت نہ کرنے والی بیوی، خدمت گزار۔ اس میں کوئی عیب نہ تھا۔ صرف اس کی ہوس کو دوسری عورت کی ضرورت تھی۔

وہ دن آ پہنچا جب دوسری عورت نے اس گھر میں آنا تھا۔ وہ بانسوں کی بنی ہوئی ایک خوبصورت پالکی میں، جس پر قیمتی ریشم کی چادر پڑی ہوئی تھی اور جسے چار کہاروں نے اٹھا رکھا تھا اس کے گھر کے قریب آتی دکھائی دی۔ کوکو پالکی کے ساتھ ساتھ تھی۔ پالکی کو گھر کے قریب آتا دیکھ کر پہلی مرتبہ وینگ لینگ نے خوف سا محسوس کیا۔ اس کے ضمیر سے آواز اٹھی: "تم اپنے گھر کے اندر کیا لیے جا رہے ہو؟"

اس احساس کے ساتھ ہی اس نے وہ دروازے بند کر دیئے جو او۔لین کے کمروں کی طرف کھلتے تھے۔ اس نے ان دروازوں کو بند کر دیا تھا جن کے اندر وہ اپنی پہلی بیوی کے ساتھ برسوں سوتا رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیوی صحن میں جھانک سکے، جہاں سے ایک دوسری عورت دلہن بن کر صحن میں داخل ہو رہی ہو۔ کوکو اور اس کی چچی کی آوازیں بلند ہوئیں:

"اپنی دلہن کا ہاتھ پکڑو!" اور وینگ لینگ شرمندگی کے بوجھل قدموں کے ساتھ آگے بڑھا۔ آگے بڑھتے وقت وہ چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتا رہا تھا۔ کوکو کہنے لگی:

"ہمیں پتہ نہیں تھا کہ اس طرح چوری چھپے تم اپنی دلہن کا ہاتھ پکڑو گے۔"

وینگ لینگ نے پالکی کا پردہ اٹھایا اور نئی دلہن کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس نے کتنے مہنگے داموں یہ عورت خریدی تھی۔ کنول ایک ٹھنڈے گلاب کے پھول کی طرح سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ شرم اور خوف کے تمام احساسات بھلا بیٹھا۔ کنول "پھول گھر" سے نکل کر ہمیشہ کے لیے اس کے گھر آ گئی تھی۔ صرف اس کی ہو کر! کنول آہستگی سے پالکی سے نکلی۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ کوکو اور چچی کا سہارا لیے ہوئے اپنے ننھے ننھے پیروں سے شرمیلے قدم اٹھا رہی تھی۔

"یہ کمرہ تمہارا ہے۔ ساتھ والا بھی اور اس کے ساتھ والا بھی۔ یہ صحن اور یہ حوض دیکھو اور اس میں سنہری مچھلیاں بھی تمہارے لیے لا کر چھوڑی گئی ہیں۔"

وینگ لینگ کے کمرے کے اس حصے میں کوئی انہیں دیکھنے والا نہ تھا۔ وینگ لینگ نے چنگ کو تمام مزارعوں کے ساتھ اس زمین والا کام کرنے کے لیے بھیج دیا تھا، جو اس کے گھر سے دو کوس کے فاصلے پر تھی۔ او۔لین ۔۔۔۔ اپنے جڑواں بچے لے کر صبح سویرے ہی کہیں چلی گئی تھی۔ وینگ لینگ کا بوڑھا باپ جواب سننے سے یکسر عاری تھا اپنے کمرے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی کھاٹ پر سو رہا تھا۔ صرف پگلی سی لڑکی گھر میں موجود تھی، جو اپنی ماں اور باپ کے چہروں کے سوا کسی کو نہیں پہچانتی تھی، جب کنول کمرے میں چلی گئی تو کوکو نے پردے کھینچ دیئے اور کچھ عرصہ کے بعد چچی ہنستی ہوئی باہر نکلی۔ باہر نکل کر اس نے ہاتھ جھاڑے جیسے کام پورا ہو گیا ہو۔ یا وہ کوئی گندگی اپنے ہاتھوں سے صاف کرنا چاہتی ہو۔

"کتنی خوشبو لگا رکھی ہے اتنا ابٹنا، سینٹ اور پوڈر، لیکن بدبو نہیں چھپا سکی۔" اور پھر نتھنے سکیڑتے ہوئے بولی:

"وہ اتنی جوان بھی نہیں، وینگ لینگ جتنی نظر آتی ہے۔ میرے خیال میں عمر کے اس کنارے پر آ پہنچی ہے، جہاں مرد عورتوں کی طرف دیکھنا چھوڑ دیتے ہیں۔"

اور پھر اس نے وینگ لینگ کے چہرے پر ناراضگی کے اثرات جو اس کی صاف گوئی نے پیدا کر دیئے تھے دیکھ کر باتوں کا رخ پلٹا "لیکن ہے خوبصورت۔ تمہاری دہری ہڈی کی بیوی سے بہت زیادہ خوبصورت اور نازک، لاکھوں میں ایک۔"

وینگ لینگ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور توقف کے بعد پردہ اٹھا کر اس کمرے میں داخل ہوا جہاں کنول موجود تھی۔

او۔لین ابھی تک گھر واپس نہیں لوٹی تھی۔ اس نے صبح سویرے ہی ایک کدال اٹھائی اور اپنے بچوں کو لیے ہوئے کھیتوں کی طرف چلی گئی۔ رات کے سائے پھیلنے لگے تھے، جب واپس پلٹی تو وہ خاموش بھی تھی تھکی ہوئی سی۔ وہ آہستگی سے باورچی خانے میں پہنچی کھانا تیار کیا اور ہمیشہ کی طرح اسے میز پر چن دیا۔ بوڑھے باپ کے کمرے میں پہنچی۔ اسے سہارا دے کر کھانے کی میز تک لائی اور اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں چمچ تھما دیا پھر وہ اپنی بہری اور گونگی بچی کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلانے لگی۔ کھانے سے فراغت پا کر اس نے بچوں کو ان کے بستر پر سلا دیا اور خود تنہا اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

دن گزرنے لگے۔۔۔ وینگ لینگ کنول کے کمرے سے بہت کم باہر نکلتا۔ کنول موسم سرما کے آغاز کی دھوپ سے لطف اندوز

ہونے کے لیے بھی صحن سے باہر نہ آتی۔ کوکو جو کنول کے ساتھ تھی، اس گھر میں رہنے لگی۔ وہ نیم گرم پانی سے غسل دیتی، اس کے بال بناتی اور ہر وقت اس کے جسم پر مختلف قسم کے عطر چھڑکتی رہتی۔ کنول کے کہنے پر وینگ لینگ نے ایک بڑی معقول تنخواہ پر کوکو، کو اس کے ساتھی خدمت گار کی حیثیت سے رکھ لیا تھا۔

تمام دن کنول کمرے کی سرد مدھم روشنی میں تکیے پر کہنی جمائے پھل اور مٹھائیاں، چوستی اور چباتی رہتی۔ رات پڑنے پر وینگ لینگ سیر ہو کر اس کے جوبن سے اپنے دل کی پیاس بجھاتا۔ اسے اب اپنی نئی دلہن کے سوا گھر کے کسی دوسرے فرد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

☆☆☆☆

کنول اور اس کی خدمت گار کوکو کا ہلچل کے بغیر اس گھر میں آنا ممکن نہ تھا۔ ایک گھر کی چھت کے نیچے، خواہ وہ کتنا ہی وسیع واور کشادہ کیوں نہ ہو دو عورتوں کا رہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ گھر کے امن اور سکون کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ وینگ لینگ کو اس کی توقع نہ تھی۔ او۔لین کی اداس اور خاموش نظریں چال ڈھال میں تھکن، کوکو کی تیزی اور طراری اس بات کی غمازی کرتی تھی کہ اس گھر سے سکون غائب ہو رہا ہے۔ خوشی اور قہقہوں کی جگہ اداسی اور غم کے سائے لمبے اور گہرے ہو رہے ہیں!!

دن راتوں میں اور راتیں صبح کے اجالے میں تبدیل ہوتی رہیں۔ صبح کا سورج جب طلوع ہوتا تو وینگ لینگ اپنی چہیتی نو بیاہتا بیوی کو دیکھتا اور جب چاند نکلتا تو اس وقت بھی کنول اس کے قریب یا اس کے پہلو میں ہوتی۔ آہستہ آہستہ اس کی پیاس بجھ رہی تھی اور اب اسے یہ حقیقت نظر آ رہی تھی کہ جس سے وہ یکسر ناآشنا تھا۔

وینگ لینگ نے محسوس کیا کہ پہلے ہی دن سے او۔لین اور کوکو کے درمیان ٹھن گئی ہے۔ او۔لین کی ناراضگی اور رنجیدگی فطری اور قدرتی تھی۔ اس نے سن رکھا تھا اور اس کے مشاہدے میں بھی آیا تھا کہ دوسری بیوی کے اوپر پہلی بیوی زہر کھا لیتی ہے، کنوئیں میں کود پڑتی ہے یا چھت سے لٹک کر خودکشی کر لیتی ہے، لیکن شرمندہ ہونے کے باوجود وہ خوش تھا کہ او۔لین نے خاموش رہنے کے سوا کسی نفرت و حقارت کا اظہار نہیں کیا اور کنول کے متعلق اس نے کبھی زبان نہیں کھولی۔ وہ صرف کوکو سے نفرت کرتی تھی۔ شاید کنول سے نفرت کے اظہار کا بالواسطہ ایک طریقہ تھا۔

وینگ لینگ اس گھر میں کوکو جیسی چالاک حرافہ کو کبھی نہ رکھتا، لیکن جب کنول نے اپنی خوبصورت آنکھوں میں آنسو بھر لاتے ہوئے التجا کی: ''آپ کوکو، کو میری خدمت کے لیے رکھ لیں۔ میں اس دنیا میں بالکل اکیلی تھی، جب میرے ماں باپ مرے تو اس وقت میں بولنا چالنا بھی نہیں سیکھی تھی۔ میرے چچا نے مجھے بیچ دیا اور اگر کوکو میری پرورش اور نگہداشت نہ کرتی، تو میں آج زندہ آپ کے سامنے موجود نہ ہوتی اور پھر میں یہاں بالکل اکیلی ہوتی ہوں۔''

وینگ لینگ انکار نہ کر سکا اور یہ ایک حقیقت تھی کہ نو بیاہتا کی خدمت کے لیے کم از کم ایک خادمہ کی ضرورت تھی، جو اس کی غیر موجودگی میں اس کے پاس رہے اور خدمت کے علاوہ دلجوئی کرے۔ یہ کسی طور بھی ممکن نہ تھا کہ او۔لین دوسری بیوی کی خدمت کرے، دلجوئی درکنار اس سے بات کرنے کی زحمت بھی برداشت کرے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کوکو کو مناسب سے کچھ زیادہ تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ او۔لین جب بھی کوکو کو دیکھتی، تو نجانے غصے کی آگ اتنی جلدی کیسے بھڑک اٹھتی۔ اسے دیکھتے ہی او۔لین کا چہرہ غصے سے بھڑ کنے لگتا۔ کوکو نے ایک دو مرتبہ اپنی باتوں سے اسے رام کرنے کی کوشش کی، لیکن اسے شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس دشمنی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ جاگیردارنی کے جس بڑے گھر میں او۔لین ایک زرخرید غلام کی طرح باورچی خانے میں جھوٹے برتن صاف کرتی تھی اور باورچیوں کی مدد کے لیے مقرر تھی، وہاں کوکو اور جاگیردارنی کی خلوت گاہ میں ان کی معتمد اور معزز سمجھی جانے والی خاص خادمہ تھی۔ ایک دن کوکو نے آہستگی سے کہا:

''آپ مجھ سے ناراض کیوں ہیں۔ ہم تو ایک دوسرے کو بہت دیر سے جانتی ہیں۔ قدرت کو یہی منظور تھا کہ ہمارا پھر سے ملاپ ہو جائے۔ یہ اتفاق ہے کہ آپ مالکن ہیں مالک کی پہلی معزز بیوی اور میں محض ایک خادمہ۔''

او۔لین نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور تیزی سے چلتی ہوئی وینگ لینگ کی نشست گاہ میں پہنچی۔ وہ وہاں اکیلا تھا۔

''بیوی تو آپ لے آئے، لیکن یہ حرافہ کٹنی یہاں کیوں رہتی ہے؟''

وینگ لینگ نے ادھر ادھر اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا: ''یہ میرا گھر ہے اور میں جسے چاہوں یہاں رکھوں تم پوچھنے والی کون ہو؟'' لیکن وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکا۔ او۔لین اس کے سامنے کھڑی تھی۔ شرمندگی کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ ندامت سے بچنے کے لیے اس نے پائپ سلگایا۔

''میں نے پوچھا ہے، یہ عورت یہاں کیا کرتی ہے؟''

اب وینگ لینگ کے لیے جواب دینا ناگزیر ہو گیا۔

''تمہارا اس سے کیا واسطہ؟''

''آپ شاید نہیں جانتے یہ حرافہ جاگیردارنی کے گھر میں ہر

وقت باورچی خانے میں آ کر مجھ پر رعب ڈالتی تھی، حکم چلاتی تھی۔ کبھی کہتی تھی۔ ''سرکار چائے مانگ رہے ہیں۔ تیار کیوں نہیں ہوئی۔'' کبھی کہتی تھی ''جاگیردارنی صاحبہ فرماتی ہیں کہ کھانا ٹھنڈا کیوں ہے، ٹھیک سے کیوں نہیں پکایا گیا۔'' کبھی کہتی تھی ''تم بدصورت ہو، نکمی کچھوے کی چال چلتی ہو۔''

یہ کہتے ہوئے او۔لین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، جسے اس نے پلو سے صاف کیا۔

''یہ گھر میرے لیے جہنم بن گیا ہے۔ میرے ماں باپ بھی زندہ نہیں۔ کوئی بھی تو ٹھکانہ نہیں، جہاں میں چلی جاؤں۔''

وینگ لینگ جیسے گونگا ہو گیا۔ کوشش کے باوجود بھی نہ بول سکا۔ او۔لین یہ کہہ کر آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئی۔ وینگ لینگ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا وہ ندامت اور شرمندگی کے وزنی بوجھ تلے دب گیا تھا، لیکن او۔لین کے جانے کے بعد اس نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے ذہن کی ناآسودگی کو یہ سوچ کر دلاسہ دینے کی کوشش کی:

''میں نے دوسری شادی کر کے اچھا نہیں کیا، لیکن مجھ سے بھی برے آدمی اس دنیا میں ہیں، جو دوسری شادی کرنے کے بعد پہلی بیوی کو گھر سے نکال دیتے ہیں، اولین کو یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں۔ اسے یہ سب کچھ برداشت کرنا چاہیے۔''

او۔لین معمول کے مطابق صبح اٹھتی پانی گرم کرتی۔ چائے بناتی اور وینگ لینگ کے بوڑھے باپ کو سہارا دے کر اٹھاتی چائے پلاتی اور اگر وینگ لینگ بیدار ہو کر نشست گاہ میں آ چکا ہوتا، تو اس کے سامنے بھی چائے لا رکھتی۔ جب کوکو پانی گرم کرنے کے لیے آتی تو آگ بجھ چکی ہوتی۔ تانبے کے بڑے مٹکے میں پانی کی ایک بوند بھی نہ ہوتی اور لکڑیاں ندارد۔ اب کوکو کو عجب مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک مرتبہ اس نے تنگ آ کر کہا:

''اب میں اپنی بچاری مالکن کے لیے چائے کیسے بناؤں۔''

او۔لین بچوں کے لیے ناشتہ تیار کرتی۔ ایک دن کوکو نے کنول کے سامنے وینگ لینگ سے شکایت کی اور یہاں تک کہہ دیا کہ اس کی پہلی بیوی نے ان کا جینا دوبھر اور زندگی حرام کر دی ہے۔ کنول نے بھی جب اپنی ملازمہ کی ہاں میں ہاں ملائی اور اپنی تکالیف کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا، تو وینگ لینگ کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا، او۔لین کے قریب پہنچا اور غصے سے بولا:

''تم کیوں اسے تنگ کرنے پر تلی ہوئی ہو، نہ مٹکے میں پانی کی ایک بوند چھوڑتی ہو اور نہ پانی گرم کرنے کے لیے لکڑیاں۔''

اس پر او۔لین نے آہستگی سے جواب دیا: ''میں کسی خادمہ کی خادمہ نہیں بن سکتی۔''

''کیا تمہیں پتہ نہیں کہ اسے یہ سب کنول کے لیے چاہیے، اپنے لیے نہیں۔''

''تم اس عورت کا ذکر میرے سامنے نہ کرو، جسے تم نے میری آخری پونجی دو موتی بھی مجھ سے چھین کر دے ڈالے۔''

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یہ سنتے ہی وینگ لینگ کا غصہ سرد ہو گیا۔ شرمندگی سے قدم اٹھاتا ہوا واپس چلا گیا اور کنول کے کمرے میں پہنچ کر اس نے کوکو سے کہا: ''میں تمہارے لیے ایک نیا باورچی خانہ بنواؤں گا اور نئے برتن خرید دوں گا۔ تم اپنی مرضی سے جو چاہو وہاں پکوانا۔ میں اس جاہل گنوار عورت کو کچھ سمجھانا نہیں چاہتا۔''

اور دوسرے ہی دن اس نے کھیت سے کئی مزدور بلوا لیے اور انہیں ایک باورچی خانہ جلد از جلد بنانے کا حکم دیا اور چنگ کو نئے برتن خریدنے کے لیے قصبے کی طرف روانہ کر دیا۔

باورچی خانہ تیار ہو گیا۔ چمکتے ہوئے نئے برتن بھی آ گئے۔ اب کوکو کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ صبح سویرے ایک بڑی ٹوکری ہاتھ میں لیتی اور بے شمار مزدوروں میں سے کسی ایک کو ساتھ لیتی اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں خریدنے کے لیے قصبے کے بازار کی طرف چلی جاتی۔ وہ سب سے مہنگی نایاب سبزیاں خریدتی۔ پھلوں سے ٹوکرا بھرتی۔ بادام، پستے، شہد میں خشک کی ہوئیں کھجوریں، طرح طرح کے مربے اور اچار مچھلی اور گوشت!

وینگ لینگ کے روزمرہ خرچ میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ بنیادی طور پر ایک غریب کاشت کار رہ چکا تھا جسے دولت مند بننے کے لیے کچھ نہیں کرنا پڑا تھا۔ بڑھتے ہوئے اخراجات اور شکایات کے لیے لب نہ کھولنے کی بے ہمتی نے اس کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ والہانہ محبت جو اس کو کنول کے ساتھ تھی، سرد خانے میں اترنے لگی، لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس کی پیٹو چچی کنول کے ساتھ صبح سے شام تک چٹخارے لے کر کچھ نہ کچھ کھاتی یا نگلتی نظر آتی۔ اس نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کی فربہ چچی ایک مہینے میں اور زیادہ موٹی ہو گئی ہے۔ قیمتی اور عمدہ غذا نے اس کی چربی میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے کہ اس کے ماتھے اور گالوں پر بار بار پونچھنے کے باوجود چکناہٹ موجود رہتی تھی۔

ایک رات وینگ لینگ نے دھیمے لہجے میں بیوی کو رازدارانہ انداز میں کہا کہ ''تم جو چاہو خرچ کرو، کھاؤ پیو، لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میری چچی اور کوکو ہر وقت تمہارے سرہانے سے لگی رہیں اور بھوکی بھینسوں کی طرح دن بھر چرتی رہیں۔'' اس پر وینگ لینگ کی حیرت

کی انتہا نہ رہی، جب اس نے دیکھا کہ پھول جیسا جسم اور دمکنے والی نازک اندام کنول بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غرائی:

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس گھر میں تمہارے سوا سب میرے دشمن ہیں۔ تمہاری بیوی جو مجھے زندہ دیکھنا نہیں چاہتی اور تمہارے منحوس بچے، جو میرے سائے سے بھی نفرت کرتے ہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں چچی اور اپنی ملازمہ سے بھی باتیں نہ کروں۔ کیا میں دیواروں کے ساتھ سر ٹکرا ٹکرا کے مر جاؤں۔''

اور یہ کہتے ہوئے وہ بے تحاشا رونے لگی اور سر کے بال نوچنے لگی: ''نکل جاؤ، میرے کمرے سے چلے جاؤ۔ اگر تمہارا دل مجھ سے بھر گیا ہے، تو میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ میں چلی جاؤں گی، وہیں جہاں سے میں آئی تھی۔ اچھا ہوا کہ میں نے کوکو سے ناتا نہیں توڑا۔''

یہ سنتے ہی وینگ لینگ کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے پیار سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ہزار منت اور خوشامد سے اسے منانے کی کوشش کرنے لگا۔ بمشکل کنول اسے معاف کرنے پر رضامند ہوئی۔

گھریلو مشکلات اور الجھنوں کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ایک دن ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ وینگ لینگ کا باپ جو بڑھاپے کی وجہ سے بہت کمزور اور لاغر ہو چکا تھا اور جس میں اٹھنے کی سکت بھی نہ رہی تھی اور ہر وقت اپنے کمرے میں کھاٹ پر پڑا اونگھتا رہتا تھا، دھوپ سینکنے کے لیے اس چھڑی کی مدد سے جو وینگ لینگ نے اس کی اٹھہترویں سالگرہ پر اسے تحفے کے طور پر دی تھی دروازے کی دہلیز عبور کر کے صحن میں نکل آیا، جہاں کنول کے لیے نئے کمرے تعمیر کیے گئے تھے اور حوض بنایا تھا۔ بوڑھے کو جو تمام بدلے ہوئے حالات سے قطعی طور پر بے خبر تھا اس بات کا علم بھی نہ تھا کہ گھر میں نئی تعمیر کے علاوہ کسی نئے فرد کا اضافہ بھی ہو چکا ہے۔ وینگ لینگ نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ایک دوسری عورت کو گھر لے آیا ہے۔ وینگ لینگ نے اس کی ضرورت اس لیے محسوس نہ سمجھی تھی کہ وہ جانتا تھا کہ اس کا بوڑھا باپ بصارت اور سماعت سے تقریباً محروم ہو چکا ہے۔ اس وقت وینگ لینگ اپنی نازک اندام بیوی کنول کے ساتھ حوض کے کنارے کھڑا سنہری مچھلیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو ابھرتے ہوئے سورج کی روپہلی کرنوں میں پگھلتا ہوا سونا معلوم ہو رہی تھیں۔ چندھیائی ہوئی نظروں سے بوڑھے نے جس کی بصارت مکمل طور پر زائل نہیں ہوئی تھی، اپنے بیٹے کے ساتھ ایک نئی عورت کو دیکھا۔ نجانے بوڑھے کے ذہن میں کیا آیا، شعوری یا لاشعوری طور پر وہ چیخا: ''تو کیا اس گھر میں ایک بازاری عورت ہے۔ بازاری عورت، بازاری عورت۔''

وینگ لینگ گھبرا گیا اسے ڈر تھا کہ کہیں کنول ناراض ہو کر رونا پیٹنا اور سینہ کوبی شروع نہ کر دے۔ وہ تیزی سے اپنے باپ کے قریب آیا اور ملائمت سے اس کا بازو تھام کر کہنے لگا:

''آؤ بابا آؤ، دوسرے صحن میں چلیں وہاں بہت اچھی دھوپ ہے۔ یہ بازاری عورت نہیں میری دوسری بیوی ہے۔''

لیکن بوڑھا مجنونانہ آواز میں چیختا رہا:

''نہیں یہ بازاری عورت ہے طوائف، میری ایک بیوی تھی۔ میرے باپ کی بھی ایک بیوی تھی۔ ہم ایک ہی زمین پر ہل چلاتے رہے ہیں۔'' اور پھر اس سے بھی بلند آواز میں چیخا:

''یہ بازاری عورت ہے۔''

وینگ لینگ بمشکل اسے دوسرے صحن میں لے آیا جہاں او۔لین اپنے باورچی خانے میں بیٹھی گرم گرم روٹیاں پکا رہی تھی۔

اب بوڑھے کا یہ معمول سا ہو گیا کہ وہ بستر سے لڑکھڑاتا ہوا اٹھتا، دوسرے صحن میں کھلنے والی کھڑکی کے قریب آ جاتا اور زور زور سے چلانے لگتا: ''بازاری عورت، طوائف''

بوڑھا عمر کے اس حصے میں پہنچ کر اس شرارتی بچے کی طرح ہو گیا تھا، جو کسی کو ستانے یا چھیڑنے کے لیے منع کرنے کے باوجود وہی حرکت بار بار کرتا ہے۔

وینگ لینگ کے گھر میں یہ ایک نئی مصیبت کا آغاز تھا۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کو سختی سے نہیں سمجھا سکتا تھا اور اسے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کنول کو کوئی ایسا بہانہ میسر نہ آ جائے کہ وہ اسے چھوڑ کر اپنے ماضی کی طرف پلٹ جائے۔ اس مسلسل سوچ اور فکر نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر دی!

اس دن وہ اپنی نشست گاہ میں بیٹھا چنگ سے بیجوں اور غلے کی خرید و فروخت کے متعلق گفتگو کر رہا تھا کہ اسے کنول کے کمرے سے ایک لمبی چیخ کی آواز آئی۔ یہ جانی پہچانی چیخ تھی۔ وینگ لینگ کمرے کی طرف بھاگا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں چھوٹے بچے لڑکا اور لڑکی جو جڑواں پیدا ہوئے تھے، اس کی بڑی بیٹی جو پگلی تھی اور چوتھا ننھا لڑکا کنول کے کمرے میں موجود تھے۔ یہ چاروں کبھی اس صحن کی طرف نہیں آئے تھے۔ او۔لین نے انہیں سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اس صحن میں جھانکنے کی کوشش بھی نہ کریں۔ تینوں بچے کبھی کبھی اپنے اندرونی کمرے کی کھڑکی سے صحن میں جھانکتے اور کنول کو تالاب کے قریب ٹہلتے ہوئے دیکھتے اور جب ان کے نتھنوں میں کنول پر بے تحاشا چھڑکے ہوئے قیمتی عطر کی خوشبو پہنچتی تو وہ بے تحاشا چھینکنے لگتے اور جب وہ کنول کو زرق

برق قیمتی لباس میں ملبوس دیکھتے تو پھٹی پھٹی نظروں سے اس عجیب و غریب مخلوق کو عجوبہ روزگار سمجھ کر اس وقت تک اسے دیکھتے رہتے جب تک وہ اپنے کمرے میں قیمتی پردوں کے پیچھے غائب نہ ہو جاتی۔

کنول نے کئی مرتبہ کبھی دبے اور کبھی کھلے الفاظ میں وینگ لینگ پر یہ بات واضح کردی تھی کہ اسے اس کے غلیظ بچوں سے سخت نفرت ہے اور یہ کہہ چکی تھی کہ وہ اس کھڑکی کو بند کروا دے، جو اس کے حوض والے صحن میں کھلتی تھی۔ وینگ لینگ نے کبھی سنجیدگی سے اس کی درخواست یا حکم پر غور نہیں کیا تھا۔ آج نجانے تینوں بچے اپنی پگلی بہن کو لے کر کیسے صحن عبور کر کے کنول کے کمرے میں جا پہنچے تھے۔ وینگ لینگ کی یہ گم سم پگلی سی لڑکی گڑیا، جو نہ کچھ کہتی تھی اور نہ سنتی تھی صرف دیکھ سکتی تھی، کمرے میں کنول کے سامنے بت بن کر کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر اور متواتر اپنی طرف دیکھتے رہنے کی وجہ سے کسی انجانے خوف سے ڈر گئی اور چیخی۔ یہی وہ چیخ تھی جسے سن کر وینگ لینگ بھاگتا ہوا کمرے میں آ پہنچا تھا۔

"اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔ کاش مجھے پتہ ہوتا کہ میں ایک ایسے منحوس گھر میں جا رہی ہوں، جس میں ایسے حرامی پلے رہتے ہیں، بدشکل اور غلیظ بچے، میں تو اس دہلیز کے اندر قدم نہ رکھتی۔"

اور یہ کہتے ہوئے اس نے ایک تھپڑ پگلی کے منہ پر جڑ دیا۔

وینگ لینگ آج زندگی میں پہلی مرتبہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ غصے سے اس کا جسم کپکپانے لگا: "تو نے میرے بچوں کو حرامی کہا ہے حرافہ، ایک ایسی عورت جس کی کوکھ بانجھ ہے۔" اور پھر بچوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگا: "چلے جاؤ یہاں سے اور پھر کبھی اس ذلیل عورت کے کمرے میں نہ آنا۔ یہ تمہیں پسند نہیں کرتی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مجھے بھی پسند نہیں کرتی۔"

اور پھر اس پگلی گڑیا کی انگلی تھام لی۔ باپ کی انگلی پکڑ کر گم سم ویران سی آنکھوں والی لڑکی مسکرائی۔ وینگ لینگ تمام بچوں کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے غصے کی انتہا نہ تھی۔ اس کے بچوں کو ایک فاحشہ عورت نے حرامی کہا تھا۔ وہ دو دن تک کنول کے کمرے میں نہ گیا، بلکہ اپنے پرانے گھر میں بچوں سے کھیلتا رہا اور اپنی پگلی گڑیا سے دل بہلاتا رہا۔ شہر جا کر وہ بچوں کے لیے کھلونے اور مٹھائی بھی لایا۔ اس کے اس بدلے ہوئے رویے کو دیکھ کر او۔لین کے چہرے پر ایک نئی تر و تازگی نمودار ہونے لگی۔ تیسرے دن جب کنول کے کمرے میں پہنچا تو وہ چچی اور کوکو کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ وینگ لینگ کو دیکھ کر خلاف توقع کھڑی ہو گئی اور اس نے دونوں عورتوں کو باہر جانے کے لیے کہا۔ وہ اپنے شوہر کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی۔ متواتر دو دنوں تک سوچتی رہی تھی کہ وہ وینگ لینگ کی نظروں سے گر گئی تو اسے ایسی آرام دہ اور پرآسائش زندگی کیسے میسر آئے گی۔ اس نے ناز و ادا، گفتگو کی مٹھاس اور اپنے جسم کے لمس سے وینگ لینگ کو ایک مرتبہ پھر شیشے میں اتار لینے کی کوشش کی۔ دو تین دن کی جدائی نے آتش شوق کو بھڑکا دیا تھا۔ وینگ لینگ نے بے اختیار ہو کر اسے سینے سے لگا لیا، لیکن ناراضگی کے بادل چھٹ جانے کے باوجود وینگ لینگ اب کنول سے دیوانگی کی حد تک پیار نہیں کرتا تھا۔

موسم گرما ختم ہو رہا تھا اور صبح کی ہوا میں خنکی آ چکی تھی۔ آسمان نیلے سمندر کے پانی کی طرح تھا۔ کسی اضطراری جذبے سے مخمور ہو کر صبح سویرے وینگ لینگ اپنے گھر سے باہر نکلا۔ خشک ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس کے سینے سے ایک آواز اٹھی، جو کہہ رہی تھی اپنی زمین سے زیادہ کوئی محبوبہ پیاری نہیں ہوتی۔ اس نے اپنی ریشمی عبا اور مخملی جوتے اتار دیئے اور گاڑھے کھدر کا شلوکا اور تہمد کس کر وہ پھر سے کاشت کار نظر آنے لگا۔ ہل کندھے پر رکھ کر کدال ہاتھ میں لے کر وہ چنگ کی کوٹھڑی کے باہر پہنچا اور آواز دی: "چنگ! چنگ باہر نکلو میرے یار، آؤ ہمارے کھیت ہمیں بلا رہے ہیں۔"

☆☆☆

دوسری صبح وینگ لینگ اپنے بوڑھے دیرینہ دوست چنگ کے ساتھ، جو اب اس کے مزارعوں اور مزدوروں کے کام کی نگرانی کرتا تھا، کھیتوں کے قریب پہنچا۔ زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ چڑیوں کے چہچہانے کی آواز آ رہی تھی۔ وینگ لینگ نے محسوس کیا، جیسے اسے ایک نئی زندگی ملی ہے۔ مزارعے روزمرہ کے معمول کے مطابق کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ وہ اپنے مالک کو دیکھ کر جانفشانی کا ثبوت دینے کے لئے برق رفتاری سے کام کرنے لگے۔ وینگ لینگ نے ایک مزارعے سے ہل لے کر خود چلانا شروع کر دیا اور بیلوں پر ایک زوردار چابک رسید کی۔ اسے مدت کے بعد مشقت کرنے میں کیف اور مستی محسوس ہونے لگی۔

ایک زمانہ وہ تھا، جب ضرورت سے مجبور ہو کر وہ طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک ایک لمحہ آرام کئے بغیر بیلوں کی طرح ہل میں جتا رہتا لیکن آج جب اسے خود کام کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، وہ بیلوں کو ہانکتے ہوئے ایک لافانی سرور محسوس کر رہا تھا۔

شام پڑنے پر جب وہ گھر کی طرف لوٹا، تو اس کا جسم تھکن

سے چور تھا، لیکن تھکن میں ایک بشاشت تھی۔ وہ اسی طرح مٹی بھرے ہاتھوں اور پسینے سے شرابور کپڑوں کے ساتھ کنول کے کمرے میں آ پہنچا۔ کنول نے کبھی اسے اس حلیے اور اس لباس میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہکابکا سی رہ گئی۔

وینگ لینگ نے اسے سراسیمہ دیکھ کر قہقہہ لگایا اور اس کے چھوٹے چھوٹے نرم و نازک ہاتھوں کو زور سے دباتے ہوئے کہا: ''دیکھا تم نے اپنے کاشت کار شوہر کو۔ تم ایک کاشت کار کی بیوی ہو۔''

''خدا نہ کرے ایسا ہو۔'' یہ سنتے ہی وینگ لینگ نے ایک قہقہہ بلند کیا اور پرانی حویلی کی طرف چلا گیا۔ آج اسے نہانے میں وہی لطف آیا، جو کئی برس پہلے آیا کرتا تھا۔ اس نے آج کھانا بھی معمول سے زیادہ کھایا۔ کئی برس کے بعد اس کی بھوک پھر چمک اٹھی تھی۔

کئی روز کی محنت و مشقت کے بعد وینگ لینگ کے ہاتھوں میں وہی سختی اور کرختگی آ گئی۔ تمازت آفتاب سے اس کی جلد سانولی پڑ گئی اور چہرے کی زردی کی جگہ سانولے پن کے باوجود سرخی جھلکنے لگی۔

او۔لین کو اچھی طرح پتہ تھا کہ ایک محنتی کاشتکار کو کس قسم کی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ عمدہ قسم کے چاول شوربا اور پیاز سامنے لا رکھتی جسے وہ سیر ہو کر کھاتا۔ اسے اب اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ کنول پیاز کی بدبو سے نفرت کرتی ہے۔

اب اس گھر میں جس کے دو حصے تھے، دونوں عورتوں کی الگ الگ حیثیت تھی۔ ایک کھلونے کی طرح تھی، جس سے وہ خوشی کے لمحات میں جذبات کی تسکین کے لیے کھیل کھیلتا۔ اور او۔لین ایک ایسی عورت تھی، جو اس کے لیے من بھاتا کھانا تیار کرتی۔ اس کی، اس کے بچوں اور اس کے باپ کی خدمت کرتی۔

اس کا چچا اور چچی اس گھر میں بغیر کسی کام کاج کے آرام و آرائش کی زندگی بسر کر رہے تھے، چچا جو فطری طور پر بری ذہنیت رکھنے والا نکما جابر اور ظالم آدمی تھا، اپنے بھتیجے کی وقت بے وقت خوشامد کرنے پر اتر آیا تھا اور گاؤں والوں کے سامنے اپنے بھتیجے کی امارت اور ذہانت کی ڈینگیں مارتا۔ گاؤں میں تمام لوگ وینگ لینگ کی عزت کرنے لگے تھے کیونکہ شادی بیاہ بیجوں کی خرید یا کسی بھی ضرورت پڑنے پر وہ اس سے معمولی سود پر قرض لے سکتے تھے۔ اس لیے سب گاؤں والوں نے متفقہ طور پر اسے اپنا چودھری بنا لیا تھا۔ لڑائی جھگڑوں اور تنازعات کا فیصلہ اسی سے کراتے تھے۔ اس مرتبہ وقت پر بارش ہوئی اور بہت عمدہ فصل پیدا ہوئی۔ اناج سے وینگ لینگ کے گودام بھر گئے۔ اس مرتبہ جب وینگ لینگ اناج کی فروخت کے سلسلے میں قصبے کی منڈی میں پہنچا، تو اس کا بڑا بیٹا بھی اس کے ہمراہ تھا، جسے لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب کرنا آ گیا تھا۔

وینگ لینگ ایک ان پڑھ دیہاتی کاشتکار تھا اور انگلیوں پر بھی ٹھیک سے نہیں گن سکتا تھا۔ معمولی سی خرید و فروخت کے وقت اسے گھنٹے لگ جاتے اور وہ شک مٹانے کے لئے کہ وہ درست قیمت لے رہا ہے یا کم، کئی لوگوں کی خوشامد کرتا، لیکن آج اس کے ساتھ اس کا بیٹا تھا، جو کاغذ پر لکھ کر حساب کر سکتا تھا۔ منڈی میں پہنچ کر جب اس کے بیٹے نے کاغذ پر حساب کیا تو وینگ لینگ خوشی سے پھولا نہ سمایا اور اجناس کی فروخت کے بعد جب باپ بیٹا گاؤں واپس پلٹے تو خوشی کے مارے وینگ لینگ کے قدم زمین پر نہ پڑتے تھے۔ اس نے راستے میں یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اپنے بیٹے کی شادی کر دے، کسی بڑے گھرانے میں جس کی اپنی زمین اور جائیداد ہو۔

اسی رات اپنی نشست گاہ میں اس نے قہوہ پیتے ہوئے چنگ سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتا ہے اور کیونکہ چنگ اس کا پرانا دوست اور رفیق ہونے کے علاوہ تجربہ کار ہے، اس کے بیٹے کے لیے اونچے گھرانے کی کوئی لڑکی تلاش کرے، چنگ نے جو کسی زمانے میں اس کا ہم پلہ کاشت کار رہ چکا تھا، لیکن بدلے ہوئے حالات اور بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ایک ملازم سمجھنے لگا تھا اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور لڑکے کی ذہانت اور قابلیت کی تعریف کی اور اٹھتے ہوئے کہنے لگا:

''رشتوں کی کیا کمی ہے، ہم کسی سے کم ہیں۔''

وینگ لینگ کے گھر میں سب کچھ تھا۔ اناج سے بھرا ہوا گودام۔ دولت، عزت، بچے اور ایک جوڑ دو بیویاں۔

موسم گرما بھی گزر گیا اور موسم سرما بھی۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ ایک دن نجانے اس کے بڑے بیٹے کو کیا ہوا کہ وہ عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگا۔ اس نے اپنی کتابیں پھاڑ دیں۔ دروازوں سے سر ٹکرانے لگا اور جب وینگ لینگ نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی، تو اس کے لہجے میں گستاخی اور درشتی موجود تھی۔ وینگ لینگ اس یکایک تبدیلی سے سخت برہم اور پریشان ہوا اور چنگ سے مشورہ کیا، چنگ نے دبے ہوئے الفاظ میں وینگ لینگ سے کہا:

''عمدہ اور مرغن غذا اور وزنی جیب نے تمہارے بیٹے کو وقت سے پہلے جوان کر دیا ہے۔ جب میں قصبے میں گیا تو اس کا بوڑھا استاد کہہ رہا تھا کہ وہ پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتا اور کئی دن سے

مدر سے بھی نہیں گیا۔"
یہ سن کر وینگ لینگ کے غصے کی انتہا نہ رہی اور جب اس نے اس سے باز پرس کی تو تسلی بخش جواب دینے کے بجائے بڑے بیٹے نے صاف کہہ دیا کہ وہ اب تعلیم جاری رکھنا نہیں چاہتا اور کاروبار کرنے کے لیے شہر جانا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ اس گاؤں میں اس کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں۔
وینگ لینگ نے اپنی وزنی چھڑی اٹھائی اور اسے بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔
او۔لین تیزی سے کمرے سے نکل کر آئی۔ بیٹے اور باپ کے درمیان کھڑی ہوگئی، لیکن وینگ لینگ جس نے تمام عمر اپنے باپ تو کیا کسی بڑے بوڑھے کے سامنے زبان کشائی نہ کی تھی بیٹے کے اس سخت لہجے اور گستاخانہ گفتگو کو سن کر اپنے آپے میں نہ رہا تھا۔ وہ چھڑی برساتا رہا، جس کی ضربیں او۔لین کے جسم پر بھی پڑیں۔ لیکن اس نے سسکی تک نہ بھری۔ بڑا بیٹا جو باپ کی ایک چپت کھا کر رونے لگتا تھا، آج اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا اور اس طرح پٹتا رہا جیسے اس کا جسم پتھر کا بنا ہوا ہو۔ او۔لین پٹتی پٹاتی آگے بڑھی اور شوہر کے بازو تھام کر منت سماجت کرتی ہوئی اسے اپنے کمرے کی طرف لے گئی۔ کمرے میں پہنچ کر او۔لین نے دروازہ بند کر دیا اور رقت بھری آواز میں بولی: "میں جانتی ہوں آپ بڑے غصے میں ہیں۔ اس بدنصیب نے بدتمیزی کی ہے، لیکن خدا کے لیے میری ایک بات سنئے۔"
وینگ لینگ جس کی سانس پھولی ہوئی تھی کمرے میں پڑے ہوئے سٹول پر بیٹھ گیا۔
"یہ مار پیٹ فضول ہے، یہ سب کچھ میں کئی مرتبہ دیکھ چکی ہوں۔ اس وقت میں جاگیر دار کی بڑی حویلی میں ایک خادمہ کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ اس بڑے گھرانے میں بچے جب جوانی کی سیڑھی پر قدم رکھتے تھے تو اس قسم کی حرکتیں کرتے تھے۔ بڑے جاگیردار کے سامنے تن کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور جو کنیزیں بڑے جاگیردار کے بستر سے الگ کر دی جاتی تھیں ان پر ہاتھ ڈالتے تھے۔ آپ کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کی یہ سرکشی اس بات کی علامت ہے کہ کھانے پینے اور خرچ کرنے کے علاوہ اسے اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔ شاید عورت کی۔"
"لیکن نوجوانی کے وقت اور جوان ہونے کے بعد بھی میں نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔ میرے ذہن میں تو عورت کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔" وینگ لینگ نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
"مت بھولیے کہ آپ ایک محنتی کاشت کار تھے۔ دن بھر ہل چلاتے تھے اور رات کو تھک کر سو جاتے تھے۔ آپ کے پاس کسی ایسی چیز کی سوچ کے لیے وقت نہ تھا۔ میں نوابزادوں کی بات کر رہی تھی، جن کے پاس کچھ نہ کرنے کی وجہ سے سوچنے کے لیے بہت وقت ہوتا ہے۔"
وینگ لینگ او۔لین کے منہ سے عقل مندی کی باتیں سن کر حیران رہ گیا۔ اس کی باتوں میں کتنی صداقت تھی۔ اسے بیل کو چارہ ڈالنے کے لیے تاروں کی چھاؤں میں اٹھنا پڑتا تھا۔ کھیتوں میں پہنچ کر اس وقت تک محنت کرنی پڑتی تھی جب تک اس کی ریڑھ کی ہڈی میں درد نہ اٹھنے لگتا۔ اسے اس لیے محنت ومشقت کرنی پڑتی کہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس نے کام نہ کیا تو واپسی پر گھر میں اس کے لیے اناج کا ایک دانہ بھی نہیں ہوگا۔ میرا باپ غریب تھا۔ میں محنتی باپ کا محنتی بیٹا تھا۔ وہ ایک امیر باپ کا بیٹا ہے۔ اسے پڑھنا لکھنا بھی آتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا:
"تم ٹھیک کہتی ہو او۔لین! چنگ بھی یہی کہتا ہے، میں اب اس کی شادی میں دیر نہیں کروں گا۔"
یہ کہہ کر وینگ لینگ صحن عبور کرتا ہوا کنول کے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

آج وینگ لینگ کئی دنوں کے بعد کنول کے کمرے میں آیا۔ کنول نے جو یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ وہ شوہر کے لیے پرکشش رہی ہے، قریب آ کر اس کے ہاتھ تھام لیے اور بولی:
"اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تم ایک برس میں ہی مجھ سے نفرت کرنے لگو گے، بھول کر بھی مجھے ملنے نہیں آؤ گے اور تمہاری محبت کا بخار اتر جائے گا تو میں اس بڑی دنیا سے اس چھوٹی دنیا میں نہ آتی۔"
یہ کہتے ہوئے اس نے انکھیوں سے وینگ لینگ کے دلی اثرات پڑھنے کی کوشش کی اور اس کے ہاتھ اٹھا کر اپنے گالوں پر لے گئی جو کھردرے، سخت اور سرد تھے۔
"قیمتی ہیرا انگوٹھی میں جڑا ہو اور ہاتھ کی انگلی میں ہو تو اس کی قدر نہیں ہوتی، لیکن اگر کھو جائے تو آدمی "باؤلا" ہو جاتا ہے۔" کنول نے آہستگی سے کہا۔
"نہیں ایسی کوئی بات نہیں کنول۔ آج کل میں صرف اپنے بڑے بیٹے کے متعلق سوچ رہا ہوں کہ جوان ہو گیا ہے اور اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔ لیکن سوچتا ہوں کہ اسے کہاں بیاہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی معمولی کاشت کار کی بیٹی میری بہو بن کر آئے۔ میں شادی کرانے والے پیشہ ور لوگوں کی مدد نہیں لینا چاہتا۔ وہ

جھوٹ بول کر الٹے سیدھے ناتے جوڑ دیتے ہیں۔"
"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ میں کوکو کو بلاتی ہوں، قصبے کا کون امیر گھرانہ ہے، جو اس کی نظروں سے چھپا ہوا ہے۔"
یہ کہہ کر اس نے کوکو کو آواز دی۔ چند لمحے کے بعد کوکو کمرے میں نمودار ہوئی، جسے دیکھ کر کنول نے کہا:
"تمہارا مالک اپنے بڑے بیٹے کو بیاہنا چاہتا ہے کسی بڑے گھرانے میں، کیا تمہاری نظر میں کوئی رشتہ ہے؟"
"لیئو کی بیٹیاں بھی جوان ہو رہی ہیں۔ قصبے کی منڈی میں وہ اناج کا سب سے بڑا بیوپاری ہے، شریف آدمی ہے اور دولت کی بھی اس کے پاس کمی نہیں۔"
"کون لیئو؟ کیا وہ تو نہیں، جس کے پتھروں والے دروازے کے قریب تھوک کی دکان ہے اور آڑھت کا کام بھی کرتا ہے۔"
"ہاں بالکل وہی۔"
"میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، میری اجناس کا سب سے بڑا خریدار وہی ہے۔ اگر وہاں رشتہ طے ہو جائے تو ہماری خوش قسمتی ہو گی۔"
"میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ مجھے امید ہے وہ انکار نہیں کرے گا۔"
"تمہیں یقین ہے کہ وہ رضامند ہو جائے گا؟" وینگ لینگ نے مشکوک لہجے میں کہا۔
"آپ کو کوکو کی چکنی چپڑی باتوں اور فراست پر یقین نہیں، اگر یہ مجھے شیشے میں نہ اتارتی، تو کیا میں تمہاری بیوی بن سکتی تھی؟ اس کے لیے انعام کی رقم مقرر کر دو۔"
"کیوں نہیں، لیکن آج کی رات میں سوچ لوں۔ اپنے دوست چنگ سے مشورہ کر لوں۔ وہ لیئو کو اچھی طرح جانتا ہے۔" یہ کہہ کر وینگ لینگ کمرے سے باہر چلا گیا۔
چنگ سے مشورہ کرنے کے بعد وینگ لینگ نے کئی دن اس سوچ میں گزار دیے۔
علی الصبح ایک دن جب خوشگوار موسم میں خوشبودار گرم چائے پینے کے بعد وینگ لینگ اپنے دوست کے ساتھ کھیتوں پر جانے کے لیے نکلا، تو اس نے اپنے بڑے بیٹے کو لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گھر کے صحن میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور قدم استوار نہ تھا۔ صحن میں داخل ہوتے وقت دہلیز سے ٹھوکر کھا کر وہ گر پڑا اور ۔۔۔۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کو ابکائی آئی اور اس نے قے کر دی۔ وہ قے کرنے کے بعد اس کتے کی طرح زمین پر لوٹنے لگا، جسے زہر دے دیا گیا ہو۔ او۔لین بھی بھاگی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔ وینگ لینگ، چنگ اور او۔لین نے اسے اٹھا کر صحن میں رکھے ہوئے تخت پوش پر لٹا دیا۔ او۔لین تولیے سے اس کا منہ صاف کرنے لگی اور چنگ اس کے جوتے اتارنے لگا، لیکن وینگ لینگ ایک لمحہ کے توقف کے بغیر اندرونی کمرے کی طرف چلا، جو بچوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس کا منجھلا بیٹا مدرسے جانے کے لیے اپنی کتابیں جزدان میں رکھ رہا تھا اور سب سے چھوٹا بستر پر لیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔
"بتاؤ تمہارا بڑا بھائی رات کہاں تھا؟"
"مجھے پتہ نہیں" منجھلے بیٹے نے آہستگی سے کہا۔
"کھال ادھیڑ دوں گا۔ سچ سچ کہو، کیا وہ رات یہاں تھا۔"
"نہیں" منجھلے بیٹے نے ڈرتے ہوئے کہا۔
"تو کہاں تھا؟"
"مجھے پتہ نہیں۔"
"کتیا کے پلے" یہ کہتے ہوئے وینگ لینگ نے اس کی گردن دبوچ لی، ڈرتے اور ہکلاتے ہوئے لڑکے نے کہا:
"بڑے بھائی نے کہا تھا اگر میں نے زبان سے ایک لفظ بھی نکالا، تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔"
"سچ سچ بتا دو!" اور یہ کہتے ہوئے وینگ لینگ نے پاس پڑی ہوئی درانتی اٹھا لی، ڈر سے لڑکے کی ہچکی بندھ گئی اور اس نے رک رک کر کہا: "وہ کئی راتوں سے کمرے میں نہیں ہوتا۔ وہ چچا کے بیٹے کے ساتھ کہیں چلا جاتا ہے۔"
وینگ لینگ کا پارہ چڑھ گیا اور وہ درانتی ہاتھ میں لیے ہوئے گھر کے اس حصے کی طرف بھاگا، جہاں اس کے چچا کا خاندان رہتا تھا۔
اس کے چچا کا بیٹا بھی مدہوشی کے عالم میں تھا، لیکن اس کی زبان میں لکنت تھی نہ قدموں میں لڑکھڑاہٹ۔ عمر میں اس کے بیٹے سے بڑا ہونے اور عادی شرابی ہونے کی وجہ سے اس کی حالت غیر نہ تھی۔
"کہاں لے گئے تھے تم میرے بیٹے کو" وینگ لینگ چیخا۔
"میں کہاں لے جاتا اسے، وہ اکیلا ہر جگہ جا سکتا ہے۔"
وینگ لینگ نے درانتی لہراتے ہوئے کہا: "بتاؤ میرا بیٹا رات بھر کہاں رہا؟"
اس کے چچا کا بیٹا یہ صورت حال دیکھ کر کانپ گیا۔
"اس بڑی حویلی میں، جو قحبہ خانہ بن گئی ہے کسی عورت کے

پاس۔"

"اس عورت کا نام کیا ہے؟"

"شعلہ"

یہ سنتے ہی وینگ لینگ مڑا۔ کمرے میں چیخ کر اس نے لوہے کی سلاخ اپنے ہاتھوں میں پکڑی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس حویلی کی طرف روانہ ہوا جہاں کسی زمانے میں بڑا جاگیردار اپنے معزز خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔

بڑی حویلی کا آہنی زنگ آلود دروازہ جو ہمیشہ بند رہا کرتا تھا آج کھلا تھا۔ وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ حویلی تک پہنچنے کے لئے اسے کئی سو گز کا فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔ عالیشان حویلی کے باہر خوبصورت باغات اور روشوں پر جہاں دو رویہ پھولدار درخت اگے تھے، مضافات کے غریب لوگوں نے چھوٹے چھوٹے کچی اینٹوں یا پھونس کی کوٹھڑیاں یا جھونپڑے بنا لیے تھے۔ فضا متعفن تھی اور جا بجا گندگی اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے۔

وینگ لینگ پہلے بھی ایک مرتبہ اس گذرگاہ اور راہداری سے گزرا تھا۔ زمانے نے کایا پلٹ کر رکھ دی۔ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا حویلی کے اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ سنگ سفید کا برآمدہ عبور کر کے اس نے ان محرابوں اور ستونوں پر نظر ڈالی، جو زمانے کی بے وفائی کا ماتم کر رہے تھے۔ اندرونی دروازے کے قریب آ کر وہ رکا:

"کہاں ہے وہ بدکار فاحشہ، جس کا نام شعلہ ہے۔" قریب ہی ایک ٹوٹے ہوئے سٹول پر ایک بوڑھی عورت، جس کے منہ میں کوئی دانت نہیں تھا گھٹی ہوئی آواز میں ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولی:

"اندر چلے جاؤ اور آخری کمرے پر دستک دو۔"

وینگ لینگ کچھ کہے بغیر راہداری سے ہوتا ہوا آخری کمرے تک جا پہنچا اور اس نے شیشم کے مضبوط دروازے پر اپنے وزنی ہاتھوں سے دستک دی۔ کوئی آواز نہ آئی۔ اس نے پھر دستک دی۔

"چلے جاؤ، میں آج رات کے لیے بستر پر لیٹ چکی ہوں۔ ساری رات تم لوگوں کا دل بہلا کر تھک گئی ہوں اور اب سونا چاہتی ہوں۔" کمرے میں نشے سے ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

لیکن وینگ لینگ واپس جانے کے لیے تیار نہ تھا اس نے پھر دروازے پر زور سے دستک دی۔ کچھ عرصے کے بعد ایک عورت نے دروازہ کھولا، وہ جوان نہ تھی، اس کے چہرے پر خمار کی شکستگی ------ سرخ اور لال رنگ کے دھبے اور نشان تھے جو متواتر بوس و کنار کے بعد اس کے ہونٹوں سے پھسل کر اس کے چہرے پر پھیل گئے تھے۔

"رات کے وقت آنا، اس وقت میں تمہیں کوئی مزہ نہ دے سکوں گی۔" عورت نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں کوئی لطف یا مزہ حاصل کرنے کے لیے نہیں آیا۔ میں اپنے بیٹے کے متعلق کچھ پوچھنے آیا ہوں۔"

"ہاں کیا ہوا، تمہارے بیٹے کو؟"

"کیا وہ رات یہاں تھا۔" وینگ لینگ نے پژمردگی سے کہا۔

"یہاں پر کئی لوگوں کے نوجوان بیٹے آتے ہیں۔ میں کیا جانوں تمہارا بیٹا کون تھا؟"

"وہ دبلا پتلا لمبے قد کا نوجوان ہے۔ ابھی اسے نوجوان بھی نہیں کہنا چاہیے۔ وہ بچہ ہے۔" وینگ لینگ نے شرمندگی سے کہا۔

"کیا وہ دو تھے، ایک جس کی ناک پچکی ہوئی تھی اور بھینگا تھا اور دوسرا ایک لمبا پتلا نوجوان سا لڑکا، جسے مرد بننے کا شوق ہے؟" عورت نے ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہی، وہی میرا بیٹا ہے۔"

"وہ چلا گیا ہے۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ اگر وہ پھر یہاں آئے تو اسے بھگا دو، اس پر اپنے کمرے کے دروازے بند کر دو۔" یہ کہتے ہوئے وینگ لینگ نے اپنے فرغل کی جیب سے چاندی کے سکے نکال کر اس کی ہتھیلی پر جما دیئے۔ "یہ پیشگی، اگر تم نے اسے یہاں آنے سے روک دیا، تو میں ہمیشہ تمہیں کچھ نہ کچھ دیتا رہوں گا۔" وینگ لینگ نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے منظور ہے، اب مجھے بھی اس عمر میں مرد چاہیے چھوکرے میرے کس کام کے۔"

بوڑھی فاحشہ کو رشوت دینے کے بعد وینگ لینگ واپس مڑا۔ اسی شام اس نے کنول کے کمرے میں کوکو سے کہا:

"تم کل ہی لینو کے گھر جاؤ اور شادی کی بات چیت مکمل کرو۔ وہ لالچی آدمی ہے۔ اسے کہہ دو کہ ہمیں قیمتی جہیز کی بھی ضرورت نہیں۔"

اور یہ کہہ کر اس نے چاندی کے کچھ سکے لالچی کوکو کی کپکپاتی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ اس کام سے فراغت پا کر وینگ لینگ او۔لین کے صحن سے گزرتا ہوا اس کے کمرے میں جا پہنچا جہاں اس کا بڑا بیٹا ابھی تک مکمل ہوش میں نہیں آیا تھا۔ او۔لین اس کے بستر کے قریب بیٹھی تھی اور گرم پانی میں سرکا ڈال کر اس کے ماتھے کا پسینہ صاف کر رہی تھی۔ وینگ لینگ آج کئی معاملات یکسر طور پر طے کرنا چاہتا تھا۔ وہ صحن عبور کرتا ہوا اس کمرے میں پہنچا، جہاں اس کا چچا،

چچی اپنے آوارہ بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ وینگ لینگ کمرے میں داخل ہوا، تو اس کا چچا پائپ میں تمباکو بھر رہا تھا۔

"آؤ، وینگ لینگ آج اس کمرے میں کیسے بھول کر آ گھسے۔" چچا نے ایسے لہجے میں کہا جس میں طنز تھی۔

وینگ لینگ نے تمہید کے بغیر جواب دیا۔ "میں پوچھنے آیا ہوں کہ کیا میں نے اپنے گھر کی چھت کے نیچے بچھو اور سانپ پال رکھے ہیں؟"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

وینگ لینگ نے مختصر الفاظ میں تمام واقعات رقت آمیز آواز میں بیان کئے۔ یہ سن کر وینگ لینگ کا بوڑھا گرگ چچا ہنسا:

"کیا کوئی کسی کو جوان ہونے سے روک سکتا ہے اور کیا تم ایک جوان کتے کو آوارہ کتیا سے دور رکھ سکتے ہو۔"

"چچا مجھے تم سے اس گفتگو کی امید نہ تھی، میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر تمہارے پاس میرے لیے ہمدردی کے الفاظ بھی نہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔ اب میرے پاس تمہارے لیے کچھ بھی نہیں۔ نہ تمہارے رہنے کے لیے جگہ ہے اور نہ کھانے کے لیے کسی قسم خوراک۔"

"تمہاری یہ جرات، تم مجھے گھر سے نکل جانے کے لیے کہہ رہے ہو۔ کیا تمہیں پتہ نہیں کہ تم ڈاکوؤں اور رہزنوں سے کیوں محفوظ ہو۔ سب سے دولت مند شخص کے گھر میں ڈاکہ کیوں نہیں پڑا۔ اس کی دولت چھین کیوں نہیں لی گئی اور اس کے اجناس کیوں محفوظ ہیں؟" اور یہ کہتے ہوئے بوڑھے چچا نے اپنے لمبے چوغے کے بٹن کھولے ایک لمبی سرخ داڑھی اور ایک سیاہ کپڑے کی پٹی اس کے سینے کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔

"غور سے دیکھو ان نشانیوں کو! کیا تم جانتے ہو یہ رہزنوں اور اس بڑے گروہ کے سردار کی نشانی ہے جس سے قرب وجوار کا کوئی گھر بھی محفوظ نہیں۔ جو گھروں کو آگ لگا دیتے ہیں۔ اجناس اور دولت لوٹ کر لے جاتے ہیں اور گھر کے مکینوں کو زندہ چھت کی کڑیوں سے لٹکا کر مرنے کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ تمہارے گھر میں اس لیے ڈاکہ نہیں پڑا۔ رہزنی کی کوئی واردات نہیں ہوتی اور تمہارے گھر والے اس لیے زندہ ہیں کہ رہزنوں کا سردار تمہارے گھر میں ایک بھیک مانگنے والے کی طرح پڑا ہے۔"

وینگ لینگ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اس میں شک نہ تھا کہ اس کا گھر ہر آفت سے محفوظ رہا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ "سرخوں" کے گروہ کا سردار اس کا چچا تھا جبکہ مضافاتی گاؤں مسلسل لوٹے اور جلائے جا رہے تھے۔ وہ اور اس کا کنبہ سکھ کی نیند سوتا تھا۔ وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ دیوتا اس کی اور اس کی املاک کی حفاظت کر رہے ہیں۔ آج اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ اس کا گھر اور اس کی دیگر املاک کیوں محفوظ ہیں۔ اس نے کچھ بھی کہنا مناسب نہ سمجھا اور چپکے سے اپنے چچا کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسی رات اس نے اپنی چچی کو نئے کپڑے بنوانے اور چچا کے لیے تمباکو خریدنے کے لیے چاندی کے کچھ سکے دیئے۔

کوکو آڑھتی لییو سے مل کر واپس آ گئی۔

لییو کو شادی پر کوئی اعتراض نہ تھا، لیکن اس کی بیٹی کی عمر صرف چودہ برس تھی۔ وہ منگنی کے لیے تیار ہو گیا تھا لیکن رخصتی کے لیے تین برس سے پہلے رضامند نہ تھا۔ وینگ لینگ کو یہ سن کر بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ جلد از جلد اپنے بیٹے کو شادی کے بندھن میں جکڑ دینا چاہتا تھا، تاکہ آوارگی کی کہانی دہرائی نہ جا سکے۔ وینگ لینگ کے پاس ذہنی اضطراب اور دماغی ہیجان سے راہ فرار حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ تمام تفکرات کو نظر انداز کر کے پھر سے اپنے شب و روز اپنی زمین کے لیے وقف کر دے۔ وہ صبح سویرے ایک معمولی کاشتکار کی طرح بیلوں کو ہانکتا ہوا ہل کندھے پر رکھے اپنے دیرینہ ساتھی چنگ کے ساتھ کھیتوں کی طرف چلا جاتا۔

ایک دن جب وہ صبح کے ٹھنڈے جھونکوں سے لطف اندوز ہوتا ہوا کھیتوں کی طرف جا رہا تھا تو جھونکے یکایک تیز ہوئے اور کچھ دیر کے بعد آندھی بن گئے۔ اس نے دیکھا کہ اس سے کچھ دور دو چار موٹی ٹڈیاں زمین پر پڑی سسک رہی ہیں اور شاید آندھی کے تھپیڑے انہیں ان کے غول سے اڑا کر کچھ پہلے لے آئے تھے۔ چنگ نے بھی جب ٹڈیاں دیکھیں تو اس کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔

وینگ لینگ سب کچھ بھول گیا۔ بیوی، بچے، چچا اور اس کا آوارہ بیٹا، فصلیں لہرا رہی تھیں۔ اس نے یاس بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھا، ابھی یہ کھیت ویران ہونے کو تھے۔ ٹڈیاں دیوتاؤں کے قہر کی صورت میں نباتات کو نگلنے اور چاٹنے کے لیے ایک مہیب اور خونخوار لشکر کی طرح ان پر حملہ کرنے کو تھیں۔ وینگ لینگ نے اپنی آواز کی پوری طاقت سے اپنے مزارعوں اور مزدوروں کو آواز دی جو اس ناگہانی آفت سے بے خبر تھے۔ وہ اس آسمانی دشمن سے بچنے کے لیے کھیتوں میں نقارے، ٹین کے کنستر، پھٹے پرانے ڈھول تاشے لے کر کھڑے ہو گئے۔

وینگ لینگ نے دور سے حد نظر تک ٹڈیوں کا لشکر، جو کئی میل تک پھیلا ہوا تھا، اپنے کھیتوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا جس سے نجات ناممکن تھی۔ ٹڈیاں فصلوں کا صفایا کر رہی تھیں۔ درختوں

کے پتے چاٹ رہی تھیں۔ دیہاتی مزارعے اور مزدور مجبور اور بے بس تھکے ہارے اپنی محنت اور مشقت کو چند لمحوں میں برباد ہوتے دیکھ رہے تھے۔ آگ کے قریب بیٹھے ہوئے دیہاتی ان ٹڈیوں کو، جو آگ کی لپیٹ میں آکر گر رہی تھیں بھون بھون کر کھانے لگے۔ بھوک مٹانے سے زیادہ انتقام لینے کے لیے۔ متواتر سات دن تک وینگ لینگ اس شدید نقصان پر تلملاتا اور کڑھتا رہا۔ لیکن پھر اس نے اپنے دل کو یہ تسلی دی کہ اس کے پاس سب کچھ ہے: سونا، چاندی، زر و جواہر، اناج سے بھرے ہوئے گودام۔ اسے اور اس کے خاندان کے لیے قحط کا کوئی خطرہ نہیں، وہ ان سب سے بہتر حالت میں ہے، جنہیں بھوکا مرنے کا خطرہ تھا۔

☆☆☆

ایک دن وینگ لینگ، چنگ کے ساتھ اپنے کھیتوں کی طرف جانے کے لیے کمر کس رہا تھا کہ اس کا بڑا بیٹا اس کے قریب آیا۔ وہ مکمل طور پر تندرست ہو چکا تھا۔ وینگ لینگ نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور کہا: ''کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''ہاں! اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں پڑھائی جاری رکھوں تو مجھے قصبے کے مدرسے سے نکال کر شہر بھیج دیں۔ یہاں جو میں نے پڑھنا لکھنا تھا پڑھ چکا۔ آپ کے کاروبار کے لیے اتنا پڑھنا لکھنا ہی ضروری ہے۔ ہمارا قصبہ صرف ایک بڑا گاؤں ہے۔''

وینگ لینگ نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا، اس کی ٹھوڑی اور گالوں پر چمکتے ہوئے سنہرے بال اگ آئے تھے۔ وہ دراز قد اور ہلکے پھلکے جسم کا نوجوان تھا۔

''میں تمہیں شہر نہیں بھیجوں گا۔ میرے ساتھ کھیتوں پر چلو ہل چلاؤ، محنت مشقت کرو۔ چال ڈھال اور چہرے کی بشاشت سے تم ایک مرد سے زیادہ عورت معلوم ہوتے ہو۔''

''میں آپ کے فیصلے کا انتظار کروں گا۔ آپ بہت جلد فیصلہ کرنے کے عادی ہیں۔'' بیٹے نے خلاف توقع آہستگی سے جواب دیا۔

وینگ لینگ چنگ کے ساتھ صحن کی دہلیز عبور کر گیا۔

اسی رات محنت و مشقت سے چور ہو کر جب وینگ لینگ گھر واپس آیا تو اس نے تھکن دور کرنے کے لیے غسل کیا۔ نئے ریشمی کپڑے پہنے اور کنول کے کمرے کا رخ کیا۔ کنول شاید اس کے انتظار میں تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا۔

''آپ رات یہاں گزاریں یا چلے جائیں، لیکن کھانا آپ یہیں کھائیں گے، کوکو نے آپ کے لیے مرغابی بھونی ہے۔ وہ چنگ کے ہاتھوں سے دو مرغابیاں چھین کر لے آئی۔ وہ چھ مرغابیاں تمہاری پہلی بیوی کو دینے کے لیے جا رہا تھا۔ اسے ڈانٹو، وہ غلط بانٹ کرتا ہے۔''

''ٹھیک ہے کوکو، او۔لین سے اچھا کھانا پکاتی ہے، لیکن نجانے مجھے بھوک وہاں زیادہ کیوں لگتی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے وینگ لینگ کنول کے ریشمی بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ کنول کچھ دیر خاموش رہی اور پھر جھجکتے ہوئے بولی: ''سنا ہے تمہارا بڑا بیٹا آج کل تمہاری نہیں سنتا اور شہر جانا چاہتا ہے۔''

''ہاں ہاں! تم نے ٹھیک سنا ہے، لیکن تمہیں اس سے کیا! وہ یہیں رہے گا میرے سامنے ان کمروں میں۔''

وینگ لینگ نے انگلی سے ان کمروں کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ اسے شہر کیوں نہیں بھیج دیتے۔ وہ یہاں تنہائی محسوس کرنے لگا ہے۔''

''تم اس کی وکالت کیوں کر رہی ہو، تمہیں اس کی تنہائی کا احساس کیوں ہوا!''

''کچھ کوکو نے مجھے بتایا ہے، وہ کہہ رہی تھی کہ وہ اب اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتا اور شہر جانا چاہتا ہے۔ تم اسے شہر کیوں نہیں بھیج دیتے۔'' کنول نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''یہ میرے سوچنے کی بات ہے، تمہارے سوچنے کی نہیں۔''

سورج ابھی نکل رہا تھا کہ وینگ لینگ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے کھیتوں کی طرف جانے کے لیے تیاری کرنے لگا۔ کنول ریشمی بستر پر خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔ اسے یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ شوہر کو محنت و مشقت کے لیے بھیجنا بیوی کے فرائض میں شامل ہے۔ وہ صرف شوہر کے ساتھ سونا اور اسے آسائش پہنچا کر سلانا جانتی تھی۔

فصلیں کمر تک آ پہنچی تھیں۔ پچھلے برس کی فصل ٹڈی چاٹ گئی تھی اور اس مرتبہ پکی ہوئی فصل کو وینگ لینگ اپنے ساتھی چنگ، اپنے مزارعوں اور مزدوروں کی مدد سے جلد کاٹ لینا چاہتا تھا۔ وہ بادل کی طرح اس آسمانی آفت سے ہراساں اور ڈرا ہوا تھا۔ وہ اپنے گودام کو اناج سے ایک مرتبہ پھر بھر لینا چاہتا تھا۔ اسے نہ اولاد کی فکر تھی نہ بیویوں کی اور نہ اپنے بوڑھے باپ کی، وہ صرف اپنی فصلوں کے متعلق سوچ رہا تھا، جو سیلاب کے اتر جانے کے بعد زرخیز ہو گئی تھیں۔

کنول پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔ اس کا جسم بھر گیا تھا اور اس کا چہرہ مرغن غذائیں کھا کر گول مٹول ہو گیا تھا۔ اس کا وزن بھی بڑھ گیا تھا اور اب وہ چلتی پھرتی قیامت نظر آتی تھی۔ کنول اب وہ نہیں رہی تھی، جس کا گوشت ہڈیوں سے چپکا ہوا تھا، وہ ایک

ایسا کھلا ہوا گلاب تھی، جس کے وزن سے ٹہنی جھک جاتی ہے۔ وہ نہ بوڑھی تھی نہ جوان، عمر وقت کے ترازو میں اسے برابر تول رہی تھی۔

کوکو اسے انواع و اقسام کے کھانے کھلاتی۔ وہ سارا دن بستر پر بے فکر سوتی۔ اس کاہلی اور بے فکری نے اس کے جسم میں گوشت کا اضافہ کر دیا۔

وینگ لینگ کا بڑا بیٹا اب کچھ خاموش اور تنہائی پسند ہو گیا تھا۔ باپ جب کھیتوں کا رخ کرتا، تو وہ اپنے کمرے میں موجود ہوتا، کتابوں میں غرق لکھنے پڑھنے میں مصروف اور وینگ لینگ یہ سمجھنے لگا کہ ٹڈیوں کا سیلاب پانی کی طغیانی ہر موسم میں اس کے کھیتوں کا رخ نہیں کرتی۔ اسی طرح اس کا بیٹا اپنے کیے کی غلطی نہیں دہرائے گا۔

فصلیں کٹ گئیں اور وینگ لینگ کے گھر میں دھن برسنے لگا۔ اسے اب اس بات کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ کوئی کیا کھاتا اور پہنتا ہے۔ جہاں تک کنول کا تعلق تھا وہ کوکو کے تیار لذیذ کھانے کھاتی اور کاہلی اور بستر پر ہمہ وقت لیٹنے کی وجہ سے اس کے گوشت میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ جیسا کہ اس کی چچی نے کہا تھا، وہ جوانی کے کئی سال کھا چکی تھی اور اب عمر کے اس حصے میں تھی، جہاں خوراک دونی ہو کر لگتی ہے۔

وینگ لینگ کو اس بات کی خوشی تھی کہ اب اس کا بیٹا آوارگی کے لیے باہر نہیں جاتا اور دن رات کتابوں کا کیڑا بنا رہتا ہے۔

ایک رات او۔لین دبے پاؤں اس کے کمرے میں آ پہنچی۔ وہ چنگ کو رخصت کرنے کے بعد صوفے پر غنودگی کی حالت میں پڑا تھا۔ او۔لین کھانسی، اسے جگانے کے لیے، وینگ لینگ نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے سامنے اس کی دراز تر بدھو بیوی کھڑی تھی۔ او۔لین نے آہستگی سے کہا: ''میں نے آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

''منحوس عورت کیا کہنا چاہتی ہو، تم نے مجھے گہری نیند سے جگا دیا۔''

''میں کچھ بھی تو کہنا نہیں چاہتی، صرف یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ تمہارا بڑا بیٹا دہلیز عبور کر کے دوسرے صحن میں قدم رکھنے لگا ہے۔''

''تم ہمیشہ شکستہ خواب دیکھتی ہو۔''

''کسی دن جب سب سمجھیں کہ آپ کھیتوں پر چلے گئے ہیں، واپس آ کر یہ تماشہ دیکھیے۔''

یہ کہہ کر او۔لین واپس پلٹ گئی۔ اس کے جانے کے بعد وینگ لینگ ایک گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

''جلاپے کی آگ ہر وقت اس کے سینے میں سلگتی رہتی ہے۔ سوکن جو ٹھہری۔'' لیکن اسی رات جب وینگ لینگ کنول کے کمرے میں پہنچا اور بستر پر لیٹ کر اس نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لینا چاہا تو وہ نفرت بھرے لہجے میں بولی:

''میرے پاس نہا کر آیا کرو۔ اس سخت گرمی میں تمہارے جسم سے بدبو اٹھ رہی ہے، میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔''

یہ کہتے ہوئے وہ بستر سے اٹھ کر سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

آج کئی راتوں کے بعد وینگ لینگ جنسی تسکین حاصل کرنے کے لیے اس کے قریب پہنچا تھا۔ اس کا یہ تلخ رویہ دیکھ کر وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے غصے بھری آواز میں کہا:

''اب تم ہمیشہ اکیلی سویا کرو گی۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا اور اپنی پرانی حویلی کا رخ بھی نہ کیا اور صحن عبور کرتا ہوا کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ اس کے ذہن میں نئے خدشات کا ہجوم تھا۔ وہ سوچنے لگا کنول نے اسے کیوں دھتکار دیا ہے؟ کیا او۔لین کی باتوں میں کوئی سچائی ہے اور اس کا جواں سال بیٹا اب بغاوت پر کیوں نہیں اترتا۔ وہ کیوں ہمہ وقت گھر میں موجود رہتا ہے؟

کیا کنول ایک جوان جسم سے حدت حاصل کر کے اس سے متنفر ہو گئی۔ یہ سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے اصل حقیقت معلوم کرنے کے لیے خود حالات پر گہری نظر رکھنی ہو گی۔

دوسری صبح اس نے گھر سے نکلتے ہوئے بلند آواز سے چیخ کر کہا: ''میں بیج خریدنے کے لیے قصبے جا رہا ہوں۔ دیر سے واپس آؤں گا۔ میرا کھانا کھیت پر نہ بھیجنا۔''

وہ شاید اس لیے چیخا تھا کہ گھر کے تمام مکین یہ سن کر غفلت کا شکار ہو جائیں۔ گھر سے نکل کر وہ آہستہ آہستہ قصبے کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک اجاڑ کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اس کے ضمیر پر بوجھ اور دماغ میں فاسد خیالوں کا ہجوم تھا۔ اس کی فاحشہ کنول نے اس سے ہم بستری کرنا نہ چاہی تھی۔ کیا اس نے اس کے جواں سال بیٹے کو اپنے گداز بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ وہ منڈیر پر بیٹھا وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ سورج جب سر پر آ پہنچا، تو اس نے واپس گھر جانے کا تہیہ کیا۔ تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ جب وہ اپنے گھر کے قریب آیا، تو محتاط ہو کر اس نے اپنے قدموں کی چاپ نرم کر دی۔ وہ ایک چالاک بلی کی طرح قدم اٹھاتا ہوا کنول کے کمرے کے قریب پہنچا۔ کمرے سے اس کے بیٹے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ واپس مڑا اور اپنے کمرے میں آ کر اس نے شیشم کی وہ چھڑی اٹھائی، جو کسی کا بھیجا

نکالنے کے لئے کافی تھی۔ چھڑی ہاتھ میں لینے کے بعد وہ تالاب
کے قریب سے ہوتا ہوا کنول کے کمرے میں پہنچا۔

کنول عنابی رنگ کا لباس پہنے ہوئے بستر پر دراز تھی۔ اور اس
کا بیٹا اس کے قریب بیٹھا تھا۔ وینگ لینگ نے ایک چیتے کی طرح
جست لگائی اور بیٹے پر ایک درندے کی طرح حملہ آور ہوا۔ مضروب
ہو کر اس کا بیٹا زمین پر گر پڑا۔ کنول نے جب مداخلت کرنے کی
کوشش کی تو اس نے بے تحاشا اسے بھی پیٹنا شروع کر دیا۔ کنول چیخ
مار کر ایک طرف لڑھک گئی۔ وینگ لینگ بے تحاشہ بیٹے کو پیٹتا رہا
اور اس کو ادھ موا کر کے گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔ وینگ
لینگ کا بیٹا سانس تک نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے سر اور نتھنوں سے
خون جاری تھا، لیکن وینگ لینگ پر جیسے بھوت سوار تھا اس کو نیم بے
ہوش چھوڑ کر وہ واپس کنول کے کمرے میں آیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی
اس کے قدموں سے لپٹ گئی اور چیختے ہوئے بولی:

"آپ کیوں اپنے بیٹے کو اور مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہیں، ماں
اور بیٹے کا رشتہ ایسا نہیں ہوتا، جسے کوئی شک کی نظر سے دیکھے! یقین
کرو وہ کوکو کے ساتھ اس لیے آیا تھا کہ اس کے رشتے کی بات جلد
طے ہو جائے۔"

وینگ لینگ کا غصہ سرد نہ ہوا اور دوسرے دن اس نے اپنے
بیٹے کو شہر بھیج دیا یہ کہتے ہوئے:

"اب تمہارا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں، کماؤ اور کھاؤ اب یہ
سمجھو کہ تم یتیم ہو۔"

وینگ لینگ کے بیٹے نے باپ کی کسی بات کا جواب نہ دیا اور
جب گھر سے رخصت ہوتے وقت وہ اپنی ماں کے کمرے میں پہنچا
تو اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

☆☆☆

بڑے بیٹے کے چلے جانے کے بعد وینگ لینگ نے سکون کا
سانس لیا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے
موجود تھے۔ بڑے بیٹے کی بے راہ روی نے اسے سخت مایوس کیا
تھا۔ اس نے اپنی توجہ باقی بچوں کی طرف مبذول کر دی۔ اس کا بڑا
بیٹا، جسے اس نے چاندی کے چند سکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا
لمبے قد کا سرخ و سفید نوجوان تھا، لیکن اس کا دوسرا بیٹا چھوٹا قد اور پیلی
رنگت رکھتا تھا۔ اس نے سوچا کہ جسم کی ایسی ساخت رکھنے والا محنتی
کاشت کار نہیں بن سکتا۔ اس لیے اسے کسی قسم کے کاروبار میں لگا
دینا چاہیے۔ "تم بڑے بیٹے کے سسر کے پاس جاؤ اور اس سے کہو
کہ میں ایک ضروری معاملے میں اس سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ
ہمارے گھر آئے یا میں اس کے گھر چلا جاؤں۔ اس سے کوئی فرق
نہیں پڑتا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے چاندی کے چند سکے کوکو کی ہتھیلی
پر جما دیئے۔ کوکو اسی وقت قصبے کی طرف روانہ ہو گئی اور رات پڑنے
کو تھی کہ واپس لوٹ آئی اور کہنے لگی:

"انہوں نے آپ کو گھر آنے کی دعوت دی ہے۔ وہ کل شام
آپ کا انتظار کریں گے۔" اور پھر چمکتے ہوئے بولی: "وہ اتنا بڑا آدمی
نہیں، جتنے بڑے آپ ہیں، اپنے مرتبے اور حیثیت کا شاید آپ کو
اندازہ نہیں۔ لہجے میں اپنی برتری کا خیال رکھیے۔"

"میں کل وقت پر وہاں پہنچ جاؤں گا۔ وقت بے وقت نصیحت
کرنے کا شکریہ۔"

دوسرے دن ریشمی کپڑوں میں ملبوس وینگ لینگ، لیو کے
دروازے پر دستک دینے کے لیے آ پہنچا۔ ایک بوڑھی عورت نے
دروازہ کھولا اور جب اسے معلوم ہوا کہ گھر میں بڑی بیٹی کا سسر آیا
ہے تو اس نے جھک کر اسے خوش آمدید کہا اور اندرونی نشست گاہ کی
طرف لے گئی۔ وینگ لینگ نے تعظیموں کی آرائش اور ریشمی
پردوں کو بغور دیکھا۔ وہ اپنے ہونے والے سمدھی کی حیثیت کو تولنا
اور پرکھنا چاہتا تھا۔ کمرے کا فرنیچر اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ
اگر اس کی ہونے والی بہو دولت مند گھرانے سے تعلق نہیں رکھتی، تو
غربت بھی ان کو چھو کر نہیں گزری ا

ابھی وینگ لینگ ان خیالوں میں گم تھا کہ بھاری بھرکم جسم
رکھنے والا ایک ادھیڑ عمر آدمی کمرے میں داخل ہوا دونوں نے رسمی
علیک سلیک کی، وینگ لینگ توقف کے بغیر حرف مدعا زبان پر لایا:

"میں اس لیے آیا ہوں لیو! کہ تم بہت اچھے کاروباری ہو، میرا
منجھلا بیٹا اتنا تنومند اور مشقتی نہیں کہ زمین کے سینے میں بیج بو کر فصل
اگا سکے۔۔۔۔ میں چاہتا ہوں تم اسے کسی حیثیت میں اپنی دکان پر
کاروباری دھندا کرنے کے اصول اور طریقے سمجھاؤ، وہ تنخواہ نہیں
لے گا۔ بلکہ میں کچھ رقم دینے کے لیے آیا ہوں، تمہاری آڑھت
میں اضافہ ہو گا۔ میں کوئی رعایت بھی نہیں چاہتا۔ تم اس سے
ملازموں جیسا سلوک کرو اور اسے بتاؤ کہ زندگی سنہرا خواب نہیں
ہوتی۔"

"کیا وہ کچھ لکھنا پڑھنا جانتا ہے۔" بوڑھے تاجر نے کہا۔

"ہاں وہ حساب کتاب کر سکتا ہے۔ وہ ہندسوں میں تمیز بھی
جانتا ہے۔"

اور یہ کہتے ہوئے وینگ لینگ نے اپنی فرغل کی جیب سے
پانچ سو چاندی کے سکے میز پر رکھ دیئے۔

"اسے یہ پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ وہ کسی معاوضے کے بغیر
یہاں کام کر رہا ہے۔ تم اس کے لیے ایک چھوٹی سی تنخواہ مقرر کر دو۔

اسے محنت کرنا سکھا دو۔''

''اس رقم کی کیا ضرورت تھی۔'' بوڑھے تاجر نے کہا۔ یہ فقرہ محض رسمی تھا۔

''تم جانتے ہو کہ میری زمین سونا اگلتی ہے اور میں چاندی دے رہا ہوں، تم اگر میرے دوست ہو تو اسے فولاد بنا دو۔ اور اسے یہ پتہ نہ چلے کہ یہ تنخواہ وہ مجھ سے لے رہا ہے۔''

''تمہارا بیٹا میرا بیٹا ہے، میں اسے بہت جلد ایک اچھا کاروباری بنا دوں گا، لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''کیسی شرط۔'' وینگ لینگ نے آہستگی سے کہا۔

''میری دوسری بیٹی بھی جوان ہو رہی ہے۔ تمہیں اپنے دوسرے بیٹے کو میرا داماد بنانا پڑے گا۔'' ٹلیو نے شرم محسوس کئے بغیر کہا:

''تم تھوک کے بیوپاری ہو، مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔''

وینگ لینگ سب کچھ طے کرنے کے بعد جب گھر واپس آیا تو وہ کنول کے کمرے میں نہ گیا، بلکہ او۔لین کے کمرے میں آ گیا اور آج کئی مہینوں کے بعد اس نے اپنی پہلی بیوی پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ وہ زرد زو تھی اور اس کے گالوں کی ہڈیاں جیسے ابل کر باہر نکلنا چاہتی تھیں، آنکھوں کی چمک غائب تھی۔ وہ شاید غم کی دلدل میں دھنس گئی تھی۔ اس نے جب یہ خوشخبری سنائی تو وہ نہ ہنسی نہ مسکرائی۔

''تم کچھ مرجھائی ہوئی ہو، تم میں چلنے پھرنے کی وہ سکت نہیں رہی۔ کیا تم بیمار ہو؟''

''ہاں! میں صبح اٹھتی ہوں، تو تھکن مجھے اٹھنے نہیں دیتی۔ بابا کو اٹھانے لگتی ہوں تو میری سانس پھول جاتی ہے۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں کچھ درد ہے اور میں ٹھیک سے جھاڑو بھی نہیں دے سکتی۔'' یہ کہتے ہوئے او۔لین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تو تم بستر پر آرام کرو، تم نے کچھ کم کام نہیں کیا۔ میں کل ہی ایک خادمہ لے آؤں گا اور قصبے میں جا کر ایک حکیم لاؤں گا، تمہارا علاج ہو گا!''

''میرے روگ کا کوئی علاج نہیں، میں بیماری سے لڑتی رہی ہوں وہ جیت گئی ہے۔''

وینگ لینگ نے اپنی پہلی بیوی کو سہارا دیا اور بستر تک لے آیا!

دوسری صبح وہ قصبے میں پہنچا اور ایک تجربہ کار طبیب کو ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ چاندی کے چند سکے لے کر طبیب وینگ لینگ کے ساتھ گھر آیا۔ اس نے او۔لین کی نبض ٹٹولی اور آہستگی سے باہر نکلتے ہوئے کہا: ''بچنا محال ہے، چاندی کے سو سکے شاید اس کی جان بچا سکیں۔ دوا مہنگی ہے۔ جگر اور گردے جواب دے چکے اور دل کبوتر کے پروں کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہے۔'' طبیب نے حریصانہ لہجے میں کہا۔

''تمہیں سب کچھ ملے گا، میری بیوی کو ہر حالت میں زندہ رہنا چاہیے۔ وہ میرے بچوں کی ماں ہے۔''

''اس خرچ پر وہ صرف دس ہفتے زندہ رہ سکے گی، اگر ایک ہزار چاندی کے سکے خرچ کر سکو تو شاید اس کی زندگی لمبی ہو سکے۔'' حکیم نے بلیک میلنگ کرنے کی کوشش کی۔

''تم روپے پیسے کی فکر نہ کرو، اسے ہر حالت میں زندہ رہنا چاہیے، خواہ مجھے اسے زندہ رکھنے کے لیے اپنی زمین ہی کیوں نہ بیچنی پڑے۔''

چاندی کے سکے طبیب کو دینے کے بعد جب وہ او۔لین کے کمرے میں آیا تو وہ درد کی شدت سے تلملا رہی تھی۔ اس نے وینگ لینگ کو دیکھ کر ایک لمبی آہ بھری اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہا: ''مجھے مر جانے دو، میں اتنی قیمتی نہیں کہ آپ میرے لیے زمین بیچیں۔''

☆☆☆

او۔لین دکھ درد سہہ کر سخت جان ہو گئی تھی شاید موت بھی اس کے قریب آنے سے ڈرتی تھی۔ ابھی اس نے اپنی عمر کے چالیس برس بھی پورے نہیں کئے تھے، لیکن کئی بیماریاں اکٹھی ہو کر اس سے لپٹ گئی تھیں۔ وہ دائم المریض ہو گئی تھی۔ موسم سرما میں وہ ہمہ وقت بستر سے لگ گئی تھی اور اب وینگ لینگ اور اس کے بچوں کو پتہ چلا کہ وہ گھر کے لیے کتنی کارآمد چیز تھی۔ چولہا سلگانا کتنا مشکل ہے اور چپاتیاں پکانا اتنا آسان نہیں جتنا وہ سمجھتے تھے۔ کھانے میں کتنا نمک اور کتنا گھی ڈالنا چاہیے۔ یہ بھی بچوں کو پتہ نہ تھا، گھر کی صفائی بھی کچھ اتنی آسان نہ تھی۔ صرف وینگ لینگ کے بوڑھے باپ کو اٹھا کر چائے پلانا۔ اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو مضبوطی کے ساتھ سہارا دینا آسان نہ تھا۔ وینگ لینگ کا بوڑھا باپ، جو ہوش و حواس جسمانی توانائی، سماعت و بصارت سے تقریباً عاری ہو چکا تھا یہ نہ جانتا تھا کہ او۔لین اب صبح سویرے چائے کیوں نہیں لاتی۔ اور رات کو اس کے سکڑے اور ٹھٹھرے ہوئے پاؤں میں گرم پانی کی بوتل نہیں رکھتی۔

ایک دن وینگ لینگ اپنے بوڑھے، ضعیف اور لاغر باپ کو سہارا دے کر او۔لین کے کمرے میں لے گیا، جہاں وہ زندگی کے آخری سانس لے رہی تھی۔ وینگ کے بوڑھے باپ کی آنکھوں

کے سامنے کہرا جما ہوا تھا۔ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے او۔لین کی طرف دیکھا۔ اس بہو کی طرف جس کے بیس برس اس کی خدمت کرتے ہوئے گزرے تھے۔ وہ بے اختیار رونے لگا اور اس کی ہچکی بندھ گئی، سب چیزیں ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔ رونا ساتھ نہیں چھوڑتا۔

وینگ لینگ کی پگلی بچی حالات سے بے خبر ماں کی شدید بیماری سے بے پرواہ گھر میں ادھر ادھر گھومتی پھرتی رہی۔ اس کی ہمہ وقت نگہداشت کرنے والا کوئی نہ تھا۔

تمام موسم سرما میں جب او۔لین بستر مرگ پر تھی وینگ لینگ نے اپنی زمینوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی، وہ شب و روز او۔لین کے بستر کے قریب موجود رہتا تھا یا قریبی نشست گاہ میں بیٹھا ہوا اس کی سسکیوں کی آواز سنتا رہتا، چنگ اس کا ہمدرد، رفیق بھی اپنے کمرے سے اٹھ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ جاتا اور اس کی دل جوئی کرتا۔ کالی سرد راتوں میں وینگ لینگ کا معمول سا بن گیا کہ کمرے کو گرم رکھے اور دو چار گھنٹوں کے وقفے کے بعد آگ سلگاتا رہے۔ ایک اندھیری رات کو جب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور وینگ لینگ اپنی بیوی کے سرہانے بیٹھا تھا، او۔لین نے مدھم سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر اپنے شوہر سے کہا:

''میں نے تو مرنا ہی ہے، آپ راتوں کو نہ جاگا کریں، کل قصبے جایئے اور میرے لیے کفن لے آیئے اور سنیے مجھے قبرستان میں دفن نہ کیجئے، بلکہ اس زمین پر جہاں ہم اکٹھے ہل چلاتے رہے ہیں، میری قبر بننے سے کچھ زمین کم ہو جائے گی، کم غلہ اگا کرے گا لیکن جب آپ ہل چلاتے وہاں تک پہنچا کریں گے تو مجھے یاد کر لیا کریں گے۔''

وینگ لینگ نے یہ سن کر شدت سے اپنے سینے میں درد محسوس کیا اور بولا: ''تم ٹھیک ہو جاؤ گی، موت کا فکر نہ کرو۔''

دوسرے دن وینگ لینگ قصبے پہنچا اور اس نے ایک کفن فروش سے بہترین ریشمی کفن کا سودا کیا، کفن فروش چالاک کاروباری تھا اور وینگ لینگ کے گھرانے سے پوری طرح متعارف تھا۔

''دو کفن خریدو، سستے مل جائیں گے، تمہارے باپ کو بھی تو اچھے کفن میں قبر میں اترنا چاہیے، وہ بھی اب مٹی کی تلاش میں ہے۔''

وینگ لینگ نے دو کفن خرید لیے اور وزنی قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف لوٹا۔ ایک دن وہ بیوی کا مختصر جہیز اٹھا کر لایا، آج اس کا کفن خرید کر لا رہا تھا۔

رات کے وقت اس نے چنگ سے کہا کہ وہ اس ٹیلے پر جو اس کی زمین میں موجود تھا قبروں کے لیے کچھ جگہ ہموار کر دے، سب نے باری باری مرنا تھا، چنگ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا: ''تم منحوس باتیں کرنے لگے ہو وینگ لینگ۔''

''نہیں چنگ، ہم سب نے مٹی چاٹنی ہے۔''

او۔لین کی بیماری کے دوران میں وینگ لینگ ایک دن بھی کنول کے کمرے میں نہ گیا اور ایک دن نجانے او۔لین جب اکھڑے ہوئے سانس لے رہی تھی اس نے وینگ لینگ سے کہا:

''ذرا کوکو کو بلا دو۔''

''تم اسے بلا کر کیا کرو گی؟'' وینگ لینگ نے شدت احساس سے کہا۔

''میں اسے کہنا چاہتی ہوں کہ تمہارے کھانے پینے کا خیال رکھے میں تمہاری پسند اور ناپسند کے کھانے کی چیزیں اسے بتانا چاہتی ہوں۔''

''خدا کی مار ہو اس پر، تم زندہ رہو گی اور میں صرف تمہارے ہاتھ کا کھانا کھاؤں گا۔''

اب او۔لین پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔

''صرف ایک بات کہنا چاہتی ہوں، اس کمرے میں کوئی نہ آئے، میری کسی چیز کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو میں خوابوں میں آ کر اسے ڈرایا کروں گی اور ہاں آپ میری ایک بات مانیں گے، میری بہو کو، جس کی منگنی آپ نے میرے بیٹے سے کی ہے، یہاں بلا لیں۔ میں نے اسے آج تک نہیں دیکھا اور مرنے سے پہلے اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''میں کل ہی کوشش کروں گا کہ وہ یہاں آ جائے، لیکن وعدہ نہیں کرتا۔''

دوسرے دن وینگ لینگ نے کوکو، کو چاندی کے چند سکے رشوت کے طور پر دے کر لیو کے گھر بھیجا اور دوسری شام لیو کی بیوی اپنی بیٹی کو لے کر او۔لین کے کمرے میں پہنچ گئی۔ بہو کو دیکھ کر او۔لین کے ہونٹوں پر ڈوبتی ہوئی شفق کی سرخی آ گئی۔ لیو کی بیٹی اس کی ہونے والی بہو خوبصورت نہیں تو قبول صورت ضرور تھی۔ اس کا گدرایا ہوا بدن ساٹن کے لباس میں سے ٹپک ٹپک پڑتا تھا۔ وہ ایک محتاط طریقے سے پالی ہوئی ایک گھریلو لڑکی تھی۔ اپنی ساس کو بستر مرگ پر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، تھکی ہوئی نحیف باہوں سے اس نے اپنی بہو کو سینے سے لگا لیا اور اس کا ماتھا چوما۔ بہو نے آہستہ آہستہ سے او۔لین کے پاؤں دابنے شروع کر دیئے۔ اسے شوہر کا گھر بسانا بتایا گیا تھا، او۔لین بہو کی ماں سے مخاطب ہو کر آہستگی سے بولی: ''اسے یہیں رہنے دو، وہ یہاں نہیں ہے اور

اس بستر سے قبر کا فاصلہ زیادہ دور نہیں ہے!''
سمدھن نے روائتی انداز میں کہا: ''یہ آپ کی خدمت کرے گی، یہ آپ کی بہو نہیں، بیٹی ہے۔'' اور پھر اس نے بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''ان کی خدمت کرو، پاؤں دابو، تمہیں چھبیس قسم کا شوربہ بنانا آتا ہے، چولہے کے ساتھ چولہے کی راکھ بن جاؤ۔'' اور یہ کہتے ہوئے سمدھن اٹھی اور اس نے اپنے شلوکے سے چاندی کے بیشمار سکے نکال کر بیٹی کی طرف بڑھائے ''ان پر بوجھ نہ بننا۔''
''اتنی بڑی دولت یہاں چھوڑ کر جا رہی ہو بہن۔ سونا چاندی تو اس کے پاؤں کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔''
یہ سنتے ہی کاروباری خاوند کی عورت نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور وینگ لینگ اسے چھوڑنے کے لیے باہر کی طرف مڑا۔ اور جب اسے رخصت کرنے کے بعد واپس آیا تو او۔لین نے اپنے جسم میں ایک نئی طاقت محسوس کرتے ہوئے کہا: ''بہو آ گئی ہے، بیٹے کو بھی بلا لو۔ روشنی بڑھ جائے گی ان کمروں کی۔''
وینگ لینگ نے یہ سنا تو مسکراتا ہوا باہر نکلا، چنگ برآمدے میں بیٹھا اپنا چرٹ سلگا رہا تھا۔
''چنگ تمہیں ابھی جانا ہوگا۔ ایک اچھے سفر پر! اسے ڈھونڈ کر لانا ہوگا، اس آوارہ کتے کو۔''
چنگ مسکرایا۔ ''میں اسے کل ہی لے آؤں گا، مجھے پتہ ہے وہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔''
''اسے کہنا کہ اس کی ماں آخری سانس لے رہی ہے اور مرنے سے پہلے بہو گھر لانا چاہتی ہے۔ اگر اسے اپنی ماں اور گھر سے تھوڑا سا بھی لگاؤ ہے تو واپس پلٹ آئے۔'' وینگ لینگ نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔
دوسری رات وینگ لینگ کا بڑا بیٹا گھر پہنچ گیا اور اگلی صبح وینگ لینگ چنگ کے ساتھ قیمتی ریشمی فرغل پہن کر دوستوں کو مدعو کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ اس نے اپنے چچا کو بھی ساتھ لے جانا چاہا، لیکن وہ گنٹھیے کے درد کا بہانہ بنا کر بستر پر لیٹا رہا۔ وینگ لینگ شادی کی تقریبات دھوم دھام سے کرنا چاہتا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ لوگوں کو اس کی حیثیت کا پتہ چل جائے اور دوسرے اس لیے کہ اس کی بیمار بیوی یہ نہ سمجھے کہ اس نے اس کے بیٹے کی شادی کرنے میں کنجوسی کا ثبوت دیا ہے۔
وینگ لینگ کا بڑا بیٹا ایک خوبرو جوان تھا۔ سرخ و سفید، وینگ لینگ نے جب پہلی نظر اسے دیکھا تو اسے اپنا قد کچھ نیچا نظر آنے لگا۔ اس نے پیار سے اس کے شانوں پر تھپکی دی اور بیمار ماں کے کمرے کی طرف لے گیا۔
بیمار ماں نے جب اپنی پہلی تخلیق کو دیکھا، تو اس کے گالوں پر سرخی کی لکیریں پھیل گئیں۔
''اچھا ہوا تم آ گئے، میں چاہتی تھی کہ تمہیں بیاہ دوں۔''
بیٹے نے ماں کی حوصلہ افزائی کے لیے کہا: ''تم تو ماں پہلے سے بہت تندرست نظر آتی ہو، میں جب گیا تھا تو تمہاری صحت گری ہوئی تھی۔'' اور یہ کہہ کر بیٹے نے ماں کے ماتھے پر بوسہ دیا۔
دوسری رات گھر میں پھل جھڑیوں کی رات تھی۔ براتیوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے اس کا چچا اپنی بڑی توند کے ساتھ گھر کے دروازے پر موجود تھا۔ چنگ بھی آج بہت خوش تھا اور وینگ لینگ کے مزارعوں اور مزدوروں نے صاف اور اجلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ او۔لین نے شدید بیماری کے باوجود سرخ رنگ کا جوڑا پہن لیا تھا۔ نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے وہ چل پھر تو نہیں سکتی تھی، لیکن پلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑکی سے آتشبازی کا تماشا دیکھ سکتی تھی۔ مہمانوں کی آمد، شور وغل مبارک، علیک سلیک سن رہی تھی۔ وینگ لینگ کا ضعیف و نزار باپ جو کسی خوشی غمی میں حصہ نہیں لے سکتا تھا بمشکل چھوٹے بھائی کے سمجھانے سے صرف یہ سمجھا تھا کہ اس گھر میں دلہن آ رہی ہے، جو بچے پیدا کرے گی پوتے تو ہیں اب شاید پڑپوتے۔
شادی کی رسومات ادا ہو گئیں اور دولہا دلہن کمرہ عروسی میں چلے گئے، لیکن باہر عظیم الشان دعوت، جس کا اہتمام کوکو، چنگ چچا اور چچی اور دوسرے شہر کے باورچیوں کے سپرد تھا، جاری تھی۔ سب باراتی مزارعے اور مزدور من بھاتے کھانے کھانے میں مشغول تھے۔ وینگ لینگ نے وہ تمام کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے تھے، جہاں او۔لین بیمار پڑی تھی۔ او۔لین کھانوں کی بھانت بھانت کی خوشبو سونگھ رہی تھی اس نے ایسا محسوس کیا کہ کھانا اس کے سوکھے ہوئے حلق سے اس کے پیٹ میں اتر رہا ہے۔
آخر سب مہمان گھر چھوڑ کر جانے لگے اور بستر پر پڑی ہوئی او۔لین نے تھکن کے ساتھ ایک تسکین محسوس کی اور غنودگی محسوس کرتے ہوئے سو گئی۔
دوسری صبح اس نے اپنی بہو کو دیکھنے کی آرزو کا اظہار کیا اور جب نئی نویلی دلہن خوشبو میں لپٹی ہوئی مہندی بھرے ہاتھوں کے ساتھ اس کے قریب آئی، تو او۔لین نے حسرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا، وہ بہت کم بولنے والی عورت تھی، لیکن آج وہ بولتی چلی گئی جیسے لفظوں کا خزانہ اس کے پاس کسی نے محفوظ کر رکھا تھا۔ ''سنو بیٹی میں تمہیں شاید کل پرسوں نظر نہ آؤں، اپنے خاوند، اس کے باپ اور اس کے باپ کا خیال رکھنا اور میری اس پگلی سی بیٹی

کا جو نہ بولتی ہے نہ سنتی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ عین اس وقت وینگ لینگ کمرے میں داخل ہوا۔ بیوی کو حالت نزع میں دیکھ کر جب اس کے ہونٹ دانتوں کا ساتھ چھوڑ رہے تھے اس نے سب کو کمرے سے چلے جانے کے لیے کہا۔ جب سب چلے گئے، تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے اور انہی نظروں سے دیکھتی دیکھتی اس کی گردن ایک طرف لڑھک گئی۔ او۔لین نے اپنے شوہر کا دائمی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

وینگ لینگ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ابھی وہ اپنے آنسو ضبط کرنے نہ پایا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ چنگ دروازہ کھنکھنا رہا تھا۔ وینگ لینگ دروازے کے قریب پہنچا تو چنگ ڈبڈبائی آنکھوں سے دہلیز کے دوسری طرف کھڑا تھا۔

"چنگ وہ چلی گئی ہے۔ ہم سے بہت دور!"

"اس گھر سے جنازے اکٹھے اٹھیں گے، تمہارا باپ بھی ہمیں چھوڑ گیا ہے۔"

چنگ نے کھیتوں کے قریب ایک اونچی جگہ قبریں کھدوائیں اس کٹھن کام کی نگرانی اس نے خود کی۔ دو جنازے اکٹھے آ رہے تھے۔ قرب و جوار کے تمام لوگ جنازوں کے ساتھ شریک تھے۔ بوڑھے باپ کو لحد میں پہلے اتارا گیا۔ پھر او۔لین کو۔ کنول بھی گریہ کناں تھی اور شاید جنازے میں شریک سب مردوں اور عورتوں سے زیادہ رو رہی تھی۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے غم میں برابر کی شریک ہے اور پہلی بیوی کے مرنے سے اسے شدید صدمہ پہنچا ہے۔ وینگ لینگ خاموش اور مبہوت قبروں کے قریب کھڑا تھا۔ وہ نہ رویا نہ چیخا، لیکن جب کھودی ہوئی قبروں کی مٹی برابر ہو گئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا اور انتہائی کوشش کے باوجود اس کی آواز رندھ گئی۔

آج وہ اپنے دو رفیقوں کو زمین میں اتار کر واپس جا رہا تھا۔ جب سوگواروں کا ہجوم واپس پلٹا تو وہ دھیمے دھیمے قدم اٹھاتا ہوا ان کے ساتھ ہولیا۔ کچھ قدم اٹھانے کے بعد اس نے مڑ کر قبروں کی طرف دیکھا۔ وہاں اس کی آدھی عمر سو رہی تھی۔ اب اسے اپنے گھر میں ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا، آنسو اس کی آنکھوں میں امڈ آئے تھے۔

ایک بچے کی طرح اس نے اپنے ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے۔

☆☆☆

شادی کی شہنائیاں اور موت کی سوگواری جب مدھم اور خاموش ہو گئی تو ایک دن چنگ وینگ لینگ کی نشست گاہ میں آیا۔ اس وقت وہ بیٹھا خلاؤں میں گھور رہا تھا۔

"جو ہونا تھا ہو چکا ہے، اب ہمیں اپنی زمینوں کے متعلق کچھ سوچنا چاہیے۔" چنگ نے آہستگی سے کہا۔

"میں تو یہ بھی بھول چکا ہوں کہ میری کوئی زمین بھی تھی، اپنوں کو دفن کرنا آسان نہیں ہوتا۔" وینگ لینگ نے فرط کرب سے کہا۔ چنگ کچھ عرصہ خاموش رہا اور پھر آہستگی سے بولا:

"میرا تجربہ اگر جھوٹ نہیں بولتا تو اس برس بہت بڑا سیلاب آئے گا۔ شاید اتنا بڑا سیلاب جو اس زمین نے پہلے نہیں دیکھا۔ میں یہ بری خبر نہ سناتا، لیکن مجھے ڈر ہے کہ ندیاں دریا بن جائیں گی۔ میں نے بادلوں کو کبھی اتنی مہیب شکل میں نہیں دیکھا۔" وینگ لینگ یہ سنتے ہی کھڑا ہو گیا اور حویلی سے باہر نکل آیا۔ چنگ سائے کی طرح تھوڑے فاصلے پر اس کے پیچھے تھا۔ وینگ لینگ نے بھی بادلوں کو دیکھا وہ آفت برسانے والے تھے، لہلہاتی ہوئی فصلیں حد نظر تک پھیلی ہوئی تھیں جو مستقبل قریب میں تباہ ہونے والی تھیں۔

تمام گاؤں آہستہ آہستہ پانی کی لپیٹ میں آ گئے اور مجبوری کے احساس نے کسی بھی شکایت کار کو کچھ بھی نہ کرنے دیا۔ موسلا دھار بارش رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔

وینگ لینگ گھر کے چبوترے پر کھڑا ہو کر اپنے کھیتوں کی طرف دیکھتا۔ مٹی کے مکان سطح ہموار کر رہے تھے۔

اس موسم میں کوئی فصل نہ ہوئی۔ وہاں رہنے والے بھوکوں مرنے لگے۔ کچھ جنوب کی طرف بھاگ گئے اور کچھ شمال کی طرف جہاں سیلاب کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے وینگ لینگ ایک دن سیلاب کے ڈر سے اپنا گھر چھوڑ کر بھاگا تھا۔ اس وقت اس کا بوڑھا بیمار باپ زندہ تھا اور اس کی ہٹی کٹی بیوی او۔لین زندہ تھی۔ سیلاب کے طوفانوں کے سامنے سینہ سپر ہو جانے والی عورت!

اس وقت وینگ لینگ غریب تھا۔ اس کے پاس دوسرے دن کے لیے اناج نہ تھا، لیکن آج اسے مستقبل کی کوئی فکر نہ تھی۔ اس کے گودام اناج سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کا گھر اونچی جگہ تھا، جہاں سیلاب کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ پرانی حویلی میں جہاں چنگ رہتا تھا، وینگ لینگ نے اپنے تمام مزدوروں اور مزارعوں کو بلا لیا تھا۔ وہ من بھاتا کھاتے اور ان کی موجودگی میں گھر رہزنوں سے محفوظ رہتا۔

وینگ لینگ نے خلاف توقع کفایت شعاری کو اپنا لیا تھا وہ ان قحط کے دنوں میں کسی فضول خرچی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے گھر میں سب کچھ موجود تھا۔ اناج، تیل، گھی اور ہر قسم کی دالیں۔ وہ فاقہ

زدہ مجبور کسان نہ تھا۔

چنگ اور اس کے مزدور سیلابی مچھلیاں پکڑ کر لاتے، جو وہ اپنی بہو اور کوکو کے حوالے کر دیتا۔ وہ ان کا شوربا بناتی اور بھون بھون کر کھاتیں۔ اس گھر میں بھوک نہیں اتری تھی حالانکہ گرد و نواح کے لوگ قحط زدہ ہو کر فریاد کر رہے تھے۔ وینگ لینگ کو اپنے بیتے دن یاد آئے جب وہ بھوک اور تنگ دستی سے مجبور ہو کر بھیک مانگنے کے لیے شمالی شہر کی طرف چلا گیا تھا۔ جہاں اس نے رکشہ چلایا تھا جو چھ سواریاں ڈھوئی تھیں۔ اس کے بچوں نے کشکول ہاتھ میں پکڑ کر بھیک مانگی تھی۔ اس کا محتاج باپ گھٹنے رگڑ رگڑ کر امیر سوداگروں کے پیچھے تانبے کا ایک سکہ لینے گھسٹتا تھا۔

اب وہ بھوک نہ تھی، گودام بھرے ہوئے تھے۔ چاندی اور سونے کے سکے موجود تھے اور اسے بھوک کا کوئی ڈر نہ تھا کیونکہ اس کا خطرناک چچا اور رہزنوں کا سردار اس کے گھر کے ملحقہ کمروں میں اپنی موٹی بیوی اور اپنے آوارہ لڑکے کے ساتھ موجود تھا۔ وینگ لینگ سمجھ چکا تھا کہ مطمئن اور اچھی زندگی گزارنے کے لیے اسے اپنے بدمعاش چچا اور اس کے بیٹے کو رشوت دینی پڑے گی۔ اس کا چچا پیشہ ور بدمعاش تھا۔

وینگ لینگ نے اب یہ سمجھ لیا تھا کہ رشوت ضروری ہے۔ رشوت کئی طریقے سے دی جا سکتی تھی۔ کبھی نقدی کی صورت میں، اور کبھی نشہ کی حالت میں۔ خوشامد کی صورت میں۔ خریدار نشے کا رسیا تھا۔ وہ کم قیمت پر بکنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے چچا کو خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے دوسرے دن چچا کے کمرے میں آ کر کہا:

''چچا کیا بیمار ہو، ہر وقت بستر پر لیٹے رہتے ہو؟''

''کچھ ایسا بیمار بھی نہیں، میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں اور تم ہو کہ خبر لینے بھی نہیں آئے۔'' چچا نے روکھے پن سے جواب دیا۔

''باہر نکل کر دیکھو کس شدت کا سیلاب آیا ہے اگر میں اونچی جگہ پر یہ گھر نہ بنواتا، جہاں ہم بیٹھے ہیں، تو گھاس اور تنکوں کی طرح بہہ گئے ہوتے۔'' وینگ لینگ نے رک رک کر کہا۔

''دولت کے ساتھ عقل آتی ہے۔ کوئی بھی ہوتا ایسا ہی کرتا، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارا غریب دوست چنگ اور تمام مزارعے اور مزدور اس سیلاب سے خوفزدہ نہیں اس لیے کہ تم نے انہیں ہر قسم کی خوراک اور سہولت مہیا کر رکھی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس گھر میں فاقہ نہیں اترے گا۔'' بوڑھے چچا نے تنک (طنز) مزاجی سے کہا۔

''میں آپ سے بھی غافل نہیں، لیکن ان کا خیال اس لیے رکھنا پڑتا ہے کہ وہ پانی اترنے کے بعد میرے کھیتوں پر پھر غلہ اگائیں گے۔ میرے پاس نہ ختم ہونے والا خزانہ تو نہیں۔ اسی طرح کا ایک سیلاب اور آیا اور قحط پڑ گیا تو میں ان جیسا ہو جاؤں گا۔'' وینگ نے آہستگی سے کہا۔

''یہ سب کچھ ٹھیک ہے، لیکن تمہیں پتہ ہے میں تمہارا چچا ہوں اور بدقسمتی سے نشے کا عادی۔ تمہیں میری ضرورت کا خیال رکھنا چاہیے۔ سیلاب کا پانی ان راہزنوں کو یہاں آنے سے نہیں روک سکتا، جن کے پاس کشتیاں موجود ہیں۔ تمہارے معمولی کارندے تمہاری حفاظت کے لیے کافی نہیں۔ وہ اس طرف کا رخ اس لیے نہیں کرتے کہ تمہارا چچا اس گھر میں موجود ہے۔'' چچا نے سفید خونی کا ثبوت دیا۔

لیکن اس کے چچا کی باتوں میں زہر بھری صداقت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی امارت اناج کے بھرے ہوئے گودام فاقہ زدہ راہزنوں سے اس لیے محفوظ ہیں کہ ان کا سردار اس کا چچا اس کے گھر میں موجود ہے۔ اس نے لہجے میں انتہائی ملائمت لاتے ہوئے کہا۔

''میرا سب کچھ آپ کا ہے، یہ لیجئے کچھ رقم۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے فرغل سے سونے اور چاندی کے کئی سکے چچا کی ہتھیلی پر جما دیئے۔ یہ رقم اس نے خوش ہو کر نہ دی تھی۔

ہر دو تین دنوں کے بعد یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔ یا چچا اس کے کمرے میں آتا یا اس کا آوارہ بیٹا، اور روپوں کا مطالبہ ہوتا۔ وینگ لینگ ان کی ہر خواہش پوری کرتا تھا اور جب یہ سلسلہ دراز ہو گیا تو ایک دن وینگ لینگ غصے سے بپھرا ہوا چچا کے کمرے میں پہنچا۔

''کیا تم چاہتے ہو چچا ہم وقت سے پہلے بھوکے مر جائیں سیلاب کا پانی ہماری مرضی سے نہیں اترے گا۔'' کہنے کو تو وینگ لینگ نے یہ بات کہہ دی، لیکن چچا ٹس سے مس نہ ہوا۔

''تم جھوٹ کہتے ہو، تمہارے پاس اتنی کم دولت نہیں کہ ایک سیلاب کم کر سکے اور تم جانتے ہو کہ راہزن گھروں کے دریچوں اور چھت کی کڑیاں بھی اکھاڑ کر لے جاتے ہیں۔ چاندی اور سونے کے سکے اب میں تم سے مانگ کر لیتا ہوں۔ میں انہیں چھین بھی سکتا ہوں۔''

یہ سن کر وینگ لینگ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اس نے چچا کے ماتھے کو چومتے ہوئے آہستگی سے کہا: ''چچا یہ گھر آپ کا ہے، ہم سب کو مل کر اخراجات میں کمی کرنی چاہیے۔ سیلاب کا خطرہ ٹل گیا تو آپ عیش کریں۔'' اس پر چچا نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

''اب تم نے ٹھیک بات کہی، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

وینگ لینگ کا بڑا بیٹا مسلسل اپنے چچا کے آوارہ بیٹے پر نظر رکھے ہوئے تھا، جو اس کی بیوی کو دریچوں سے جھانکتا رہتا تھا۔ اس

نے اپنی بیوی پر سختی سے یہ پابندی لگادی تھی کہ وہ صحن میں نہ نکلے۔ اور ایک دن بڑے بیٹے نے اپنے باپ سے بھی کہا:

''چچا کا بیٹا ہر وقت صحن میں تاک تکار رہتا ہے۔ کہیں میرے ہاتھ سے قتل نہ ہو جائے، آپ چچا اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دیں اور اگر ایسا نہیں کر سکتے، تو میں اپنی بیوی کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''تم جانتے ہو تمہارا چچا کون ہے، وہ صرف میرے باپ کا بھائی ہی نہیں، رہزنوں کا سردار بھی ہے۔ میں اس سے تم سے زیادہ نفرت کرتا ہوں، تمہیں اور اپنے آپ کو عافیت میں رکھنے کے لیے ان کتوں کے آگے دولت کے چیتھڑے (چھیچھڑے) پھینکتا رہتا ہوں۔ اگر ہم نے ان بھوکوں کو ناراض کیا تو ہم دوسرا سورج نہیں دیکھ سکیں گے۔''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم تینوں چچا، چچی اور اس کے آوارہ بیٹے کو چنگ اور اپنے مزدوروں کی مدد سے ہلاک کر دیں اور ان کی لاشیں سیلاب کے پانی میں بہادیں۔''

''ایسا میں نے بھی کئی مرتبہ سوچا ہے، لیکن اس کی موجودگی ہمارے لیے ضروری ہے۔ اس کی عافیت ہماری عافیت ہے۔ اس کو زندہ رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ ہم زندہ رہیں۔'' وینگ لینگ نے پژمردگی سے کہا۔

یہ سن کر وینگ لینگ کے بڑے بیٹے کی آنکھیں آسمان کی طرف ٹک گئیں۔ وینگ لینگ اپنے چچا کو فصلیں تباہ کرنے والے سور سے زیادہ بے رحمی اور بیدردی سے ہلاک کرنا چاہتا تھا لیکن وہ پوری طرح جانتا تھا کہ اس کی ہلاکت یا موت راہزنوں اور ڈاکوؤں پر اس کے گھر کے دروازے کھلے چھوڑ دے گی۔

اسی سوچ نے باپ اور بیٹے کو کوئی نیا قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اسی رات وینگ لینگ نے اپنے دیرینہ دوست چنگ سے اس معاملے پر گفتگو کی اور دیر تک چرٹ کا دھواں نکلتے اور ہوا میں بکھیرتے ہوئے مصروف گفتگو رہے۔ چنگ نے آخر میں آہستگی سے کہا:

''تم پوچھتے ہو، ہمیں کیا کرنا چاہیے، تو سنو اپنے خطرناک چچا کو جو ہر وقت نشے سے ٹوٹا رہتا ہے اتنا نشہ پلاؤ کہ اسے گرد و پیش کی، کسی آنے جانے والے کی پہچان نہ رہے۔''

''لیکن اس سیلاب کے زمانے میں تو افیون سونے کے بھاؤ بکتی ہے۔'' وینگ لینگ نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''یہ تو پھر کرنا ہوگا۔ اپنی زندگی کو آسان اور مطمئن بنانے کے لیے کچھ نہ کچھ دولت خرچ تو کرنی پڑتی ہے۔''

وینگ لینگ نے یہ سن کر پیار بھری نظروں سے چنگ کی طرف دیکھا اور کہا: ''میں ایسا ہی کروں گا۔''

کچھ دنوں سے وینگ لینگ کا آوارہ بھتیجا وینگ لینگ کی دوسری لڑکی پر نظر رکھے ہوئے تھا، جو رشتے میں اس کی بہن تھی۔ وہ نہایت حسین و جمیل لڑکی تھی۔ دبلی پتلی سرخ و سفید۔

ایک شام جب رات پڑنے کو تھی، جب وہ اپنے وسیع صحن سے باورچی خانے کی طرف جانے لگی، تو وینگ لینگ کے بھتیجے نے دست درازی کرنے کی کوشش کی اور اپنے ہاتھ اس کے نوخیز پستانوں کی طرف لے گیا۔ لڑکی چیخی اور وینگ لینگ بھاگتا ہوا آیا اور لڑکی کو اس کے مضبوط شکنجے سے چھڑانے۔۔۔ کی کوشش کی، لیکن اس کے بدمعاش بھتیجے نے لڑکی کو ایسے دبوچ رکھا تھا، جیسے بھوکے کتے نے چرایا ہوا گوشت دانتوں میں دبوچ رکھا ہو۔

وینگ لینگ کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس نے لاٹھی اٹھا کر اس کے سر پر کاری ضربیں لگائیں۔ بھتیجا زمین پر گر پڑا اور ڈھٹائی سے کہنے لگا:

''یہ تو مذاق تھا چچا، ورنہ کوئی اپنی بہن پر بھی ہاتھ اٹھاتا ہے۔''

لیکن اب حد ہو چکی تھی۔ لڑکی کو اپنے ساتھ لیے ہوئے غصے میں بھرا ہوا وینگ لینگ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اور اس رات وینگ لینگ نے اپنے بیٹے سے اس واقعہ کا ذکر کیا اور دونوں بہت دیر تک سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ بیٹی کو جس کی منگنی ہو چکی تھی، شادی جلد سے جلد کرنے کے بعد گھر سے رخصت کر دینا چاہیے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد دوسرے دن وینگ لینگ لیو کے گھر پہنچا اور شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے کہا۔ لیو نے معذرت کے انداز میں کہا کہ اس سال اسے سیلاب کی وجہ سے کاروبار میں نقصان پہنچا ہے اور وہ بیٹے کی شادی شان و شوکت سے نہیں کر سکے گا۔

وینگ لینگ نے زور دیتے ہوئے کہا: ''تم اس کی فکر نہ کرو لیو۔ شادی کے تمام اخراجات میں برداشت کروں گا۔''

''یہ مجھے کسی حالت میں بھی منظور نہیں، خدا کا دیا ہوا میرے پاس سب کچھ ہے۔ صرف ایک برس انتظار کرلو۔ میں اپنے بیٹے کی شادی اپنی حیثیت کے مطابق کروں گا۔''

وینگ لینگ زیادہ اصرار نہ کر سکا۔ لڑکی کا باپ تھا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس کے گھر میں اس کا بھتیجا شکاری کتے کی طرح اس کی لڑکی کی تاک میں ہے۔

وینگ لینگ مایوسانہ قدم اٹھاتا ہوا باہر نکلا۔ چنگ کشتی میں اس کا انتظار کر رہا تھا، کیونکہ سیلاب کا زور ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا۔ اس

لیے انہیں کشتی میں یہاں آنا پڑا تھا۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے وینگ لینگ نے چنگ سے کہا: ''کشتی کو ذرا اور آگے لے جاؤ۔''
''کیا کچھ خریدنا ہے۔'' چنگ نے پوچھا۔
''ہاں، تمہاری نصیحت پر عمل کرنا ہے۔ اپنے لیے کچھ تمباکو اور اپنے موذی چچا کے لیے افیون، تاکہ وہ ہر وقت نشے میں غرق رہے اور میری زندگی اجیرن نہ بنائے۔
افیون کی دکان پر پہنچ کر وینگ لینگ نے بیس تولے افیون خریدی اور اس کے لیے اسے چاندی کے کئی سکے ادا کرنے پڑے۔
☆☆☆
دوسرے دن وینگ لینگ چچا کے کمرے میں پہنچا اور اس نے اپنے فرغل سے ایک ڈبیا نکال کر چچا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:
''میں شہر گیا تھا اور آپ کے لیے افیون لایا ہوں۔''
''افیون میرے لیے، افیون تو سونے کے بھاؤ بک رہی ہے۔'' چچا نے خوش ہو کر کہا۔
''پھر کیا ہوا، باپ کے مرنے کے بعد تم ہی تو اس گھر میں بزرگ ہو، میرا بابا افیون کا رسیا تھا، لیکن افسوس اس گھر میں غربت تھی، افیون تو کہاں اناج بھی نہیں ملتا تھا۔''
یہ کہتے ہوئے وینگ لینگ نے افیون کی ڈبیا چچا کے ہاتھ میں تھمادی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد چچا نے حریصانہ افیون کی طرف دیکھا۔ اکٹھی بیس تولے افیون۔
اس نے چار رتی کی ایک گولی بنائی اور نگل گیا۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ ایک بہت امیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، جو قحط کے زمانے میں بھی اتنا قیمتی نشہ خرید سکتا ہے۔
اتنی بڑی رقم خرچ کرنے کے بعد وینگ لینگ کو یہ تسلی ہوگئی کہ اس کا چچا، جو نشے کا رسیا ہے اب اس کے رستے میں کوئی نئے کانٹے نہیں بکھیرے گا اور نشے میں مست اسے کوئی نئی دھمکی نہیں دے گا۔
سیلاب کا پانی کم ہونے لگا اور اب نئی فصل کے لیے بیج بونے کا وقت قریب آ گیا۔ چنگ جو مزدوروں اور مزارعوں سے کام لینے کا عادی ہو چکا تھا، ایک دن وینگ لینگ کے پاس آیا اور کہنے لگا:
''سیلاب کا پانی اتر رہا ہے۔ اپنی ان زمینوں پر نظر ڈالو، جو نئی فصل اگانے کی منتظر ہیں۔ غربت کاہلی کا دوسرا نام ہے لیکن دوست تم مشقت کرنے والے اچھے کاشتکار ہو۔''
''تم نے مجھے ان دنوں کی یاد دلا دی ہے چنگ، جب میں محنت کش کسان تھا، بلکہ یوں کہو کہ انسان تھا۔''
یہ کہنے کے بعد جب وینگ لینگ اپنے دوست چنگ کے ساتھ باہر نکلنے کو تھا تو اس کا بڑا بیٹا ساتھ کے کمرے سے صحن عبور کرتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس نے فرط جذبات سے نیم ہکلاتے ہوئے کہا:
''ابو، اناج کھانے کے لیے ایک نیا منہ اس گھر میں آ رہا ہے۔'' وینگ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، وہ دادا بننے کو تھا۔ وہ مسکرایا۔
''دھرتی ماں ہوتی ہے۔ وہ اس بار زیادہ دودھ اگل دے گی۔ تم فکر نہ کرو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چنگ کے ساتھ کھیتوں کی طرف چلا گیا۔
کچھ فاصلہ اور منڈیریں طے کرنے کے بعد وہ ایک جگہ پر رکا اور اس نے چنگ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:
''میری بہو پہلا بچہ جن رہی ہے۔ تم اس کی خوراک کا خیال رکھنا۔ میری دوسری بیوی شاید اس کا خیال نہ رکھے۔ گوشت مچھلی شوربا، اسے ہر چیز ملنی چاہیے۔ مجھے اچھے گوشت پوست کا پوتا ملنا چاہیے۔''
چنگ نے کہا: ''آپ فکر نہ کریں، مجھے دادا بننا آتا ہے۔''
اسے اب پوتے کا انتظار تھا اور ایک دن اس کا بڑا بیٹا اسے ملا اور اس نے یہ خوشخبری سنائی کہ وہ دادا بن گیا ہے۔ وینگ لینگ کو یہ احساس اور خوشی دوسری مرتبہ ہوئی۔ ایک اس وقت جب وہ باپ بنا تھا اور آج دوسری مرتبہ جب وہ دادا بنا تھا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ کتنا عجیب زمانہ تھا جب اس کی بیوی اسے کچھ بتائے بغیر خاموشی سے تاریک چھوٹی سی کوٹھڑی میں چلی گئی تھی اور آہ یا سسکی بھرے بغیر اس نے بچہ جن دیا۔ نہ اس کے ہونٹوں پر کوئی چیخ ابھری تھی اور نہ خطرے یا درد کی کوئی علامت آواز کی شکل میں اس تک پہنچی تھی اور تیسرے دن ہی اس کی بیوی کھیتوں میں اس کے ہم دوش کام کرنے کے لیے چلی گئی تھی۔
اور یہ اس کے بیٹے کی بیوی تھی جو ایک ننھے بچے یا بیمار خرگوش کی طرح چیختی چلاتی رہی تھی۔ چار چار خادمائیں اس کے بستر سے لگی ہوئی تھیں دو دائیاں رات بھر جاگتی رہی تھیں اور اس کا شوہر وینگ لینگ کا بڑا بیٹا چوکھٹ سے لگا ہوا نو آمدہ روح کے انتظار میں تھا۔ دولت اور امارت کیسے کیسے نئے اسلوب سمجھاتی اور نئی عادتیں ڈال دیتی ہے۔
وہ یہ سوچ کر خوش تھا کہ اس کے گھر میں پوتا پیدا ہوا ہے کہ اس کا بیٹا مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کچھ کہنے کو تھا کہ وینگ لینگ نے اٹھتے ہوئے کہا: ''مجھے خوشخبری مل چکی ہے، چنگ کو بلاؤ۔ وہ ایک ایسی تندرست عورت کو ڈھونڈ کر لائے، جس کی چھاتیاں

دودھ سے بھری ہوئی ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بہو اور تمہاری بیوی جوانی میں اپنے حسن کو کھو دے۔"

موسم سرما میں وینگ ایک خوبصورت پوتے کا دادا بن چکا تھا اور سیلاب کا پانی بھی آہستہ آہستہ زمینوں میں دھنس گیا۔ وینگ لینگ کے مکان کے سوا جو اونچی سطح پر تھا گردونواح کے تمام گاؤں مٹی میں مل چکے تھے۔ غربت چاروں طرف سے جھانک رہی تھی۔ ملبے میں لپٹے ہوئے مٹی کے مکان اس غربت کا احساس اور شدید کر رہے تھے، غربت کی شدت سے ابلتی ہوئی آنکھوں سے وہ سب اس اونچے مکان کی طرف دیکھ رہے تھے، جو سیلاب سے محفوظ رہا تھا اور جس کے بند کمروں میں اناج محفوظ تھا۔ گردونواح کے لوگ اس کے گھر پر اس لیے حملہ آور نہیں ہو سکتے تھے کہ وہاں وینگ لینگ کا چچا رہزنوں کا سردار اپنے آوارہ بیٹے کے ساتھ وینگ لینگ کے گھر میں موجود تھا۔

سیلاب ٹھنڈا پڑ گیا اور زمینوں کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اجڑے ہوئے لوگ واپس آ گئے تھے، لیکن اب وہاں کیا تھا، گیلی مٹی جو خشک ہو کر ان کے ماتھے کی منحوس لکیریں بن کر خشک ہو رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کاشتکار ہل کندھوں پر رکھے ہوئے فاقہ زدہ بیلوں کے ساتھ اپنی زمین کی طرف لوٹ رہے تھے۔

یہاں صرف ان کی مدد کرنے والا وینگ لینگ تھا، جس سے وہ روپیہ قرض لے سکتے تھے۔ زمین پر ہل چلانے کے لیے بیل، بیج خریدنے اور اپنی بھوک مٹانے کے لیے۔ انہیں کاشتکاری کے لیے بیلوں کی اور بیجوں کی ضرورت تھی۔

وینگ لینگ نے ان کی کسمپرسی سے پورا فائدہ اٹھایا اور ایک کے دس بنائے۔ اس طرح ایک شخص جو پہلے معمولی دولت مند تھا، امیر کبیر بن گیا۔

اس دوران میں اس نے اپنی دوسری بیوی کنول کے کمرے کا رخ نہ کیا۔ وہ مسلسل مرغن غذائیں کھا کر ہر قسم کے فکر سے بے نیاز فربہ اندام ہو گئی۔

وینگ لینگ کا چچا افیون کے نشے میں مست رہنے لگا اور وینگ لینگ اپنے پرانے دوست چنگ کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد یہ محسوس کرنے لگا کہ اب وہ غربت تنگ دستی عسرت یا اسی قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھے گا۔

وہ لوگوں کی فاقہ مستی سے فائدہ حاصل کرنے لگا اور اس نے قرض دی ہوئی رقم پر شرح سود بڑھا دی اور اس کی پہلی کوشش ہوتی کہ ضرورت مند اور احتیاج والے اپنی زمین اس کے پاس فروخت کر دیں اور اگر ایسا نہ کرنا چاہیں تو سود کا بوجھ ان کی کمر توڑ کر رکھ دے اور آخر کار وہ زمین بیچنے پر مجبور ہو جائیں۔

اب وینگ لینگ کو گھریلو ذہنی سکون ملنے کی امید ہو چلی تھی۔

اس مرتبہ وہ یہ فیصلہ کیے ہوئے تھا کہ اپنی زمین پر خاصی توجہ دے گا۔ کاشت کاری کی خود نگرانی کرے گا۔ اس لیے اپنے دوست چنگ کے ساتھ اپنے کھیتوں کی طرف نکل پڑا، جو حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو بھی اپنے ہمراہ لے لیا۔ وہ اسے ایک اچھا کاشت کار بنانا چاہتا تھا، جو اس کے بعد کھیتی باڑی اور کاشت کاری کے طور طریقے اور اصول جانتا ہو۔ وہ جگہ جگہ رک کر چنگ سے مشورہ کرتا کہ کون سی فصل ادل بدل کر کے کس زمین پر اگائی جائے تا کہ فصل میں اضافہ ہو اور زمین اپنی طاقت بھی نہ کھوئے۔ وینگ لینگ کا چھوٹا لڑکا گردن جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوتا۔ کئی دن کی مسلسل سوچ کے بعد جب وینگ لینگ اپنے دوست چنگ کے ساتھ گھر واپس لوٹا تو وہ مطمئن تھا۔ اپنی آرام دہ کرسی سے ٹیک لگا کر وہ سوچنے لگا:

"میں اب جوان نہیں رہا اور اب میرے لیے یہ ضروری بھی نہیں کہ میں خود اپنے ہاتھوں سے کام کروں۔ محنت و مشقت کروں۔ میرے بیٹے جوان ہیں۔ میرے بے شمار ملازم اور مزارعے ہیں۔"

یہ سوچ کر اس نے اطمینان بخش سانس لی۔ لیکن چند ہی لمحات کے بعد اس کے خیالات کے دھارے نے رخ بدل لیا۔ گھر کا ماحول ابھی تک مکدر تھا۔ اس ماحول میں بے چینی اور اضطراب تھا۔ گھر میں ملازموں کی ریل پیل تھی۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ لیکن اس کے بڑے بیٹے اور بدمعاش چچا کے اوباش بیٹے کے درمیان ٹھنی ہوئی تھی۔ وہ بظاہر ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور باتیں کرتے تھے، لیکن کدورت کے شعلے اپنی زبان لمبی کیے جا رہے تھے۔

وینگ لینگ کا بڑا بیٹا کسی ذہنی یا عقلی سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ اپنے باپ کے چچازاد بھائی کو شک و شبے کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ تمام دن گھر میں اس لیے موجود رہتا کہ کہیں وہ اس کی بیوی پر زور دستی سے ہاتھ نہ ڈال دے۔

ابھی وہ یہ تمام باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ وینگ لینگ کا سب سے بڑا بیٹا کمرے میں داخل ہوا اور تلخی کے لہجے میں باپ سے مخاطب ہوا: "اب یہ سب کچھ برداشت سے باہر ہو چکا ہے۔ وہ شرابی حالت میں گریبان کھولے ہوئے تاک جھانک کرتا رہتا ہے۔ کبھی میرے کمرے کے اندرونی حصے میں جھانکتا ہے اور کبھی کبھی یہ لمبا صحن عبور کر کے ماں کے کمرے میں بھی چلا جاتا ہے۔"

اس کا اشارہ کنول کی طرف تھا اور اسے یہ کہتے ہوئے اسی

بات کا احساس تھا کہ ایک مرتبہ اسے بھی اس کمرے میں جانے کی سخت سزا مل چکی تھی۔ وہ بے تحاشہ پیٹا گیا تھا اور اسے گاؤں چھوڑ کر شہر بھاگنا پڑا تھا۔

وینگ لینگ آج خوشی اور مسرت میں لپٹا ہوا واپس آیا تھا، لیکن بڑے بیٹے کی اس گفتگو نے ان تمام خوش آئند خوابوں اور خیالوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس نے تلخی سے اپنے بیٹے کو جواب دیا:

''تم ایک نہایت بے وقوف نوجوان ہو۔ ہر وقت بہو کے متعلق سوچتے رہتے ہو۔ تم شاید نہیں جانتے کہ بیوی کو بہت زیادہ محبت دینا بے وقوفی اور حماقت ہے۔ بیوی معشوق یا داشتہ نہیں ہوتی، جس کی ہر وقت خوشامد کی جائے۔''

باپ کے یہ تمہیدی فقرے سن کر نوجوان بیٹے نے ندامت محسوس کی اور کہا: ''میں صرف اپنی بیوی کے لیے نہیں کہتا، اس گھر میں جو غلاظت وہ بکھیر رہا ہے وہ مناسب نہیں۔''

لیکن وینگ لینگ یہ سب کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ غصے بھری آواز میں بولا: ''کیا تم ہر وقت مرد اور عورت کے جنسی ملاپ کی باتیں کرنے سے باز نہیں آؤ گے، کہو تم کیا چاہتے ہو۔ میں وہ کروں گا۔''

یہ سن کر نوجوان بیٹا خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ وینگ لینگ کی آواز اور تلخ ہو گئی:

''بولتے کیوں نہیں کہ میں کیا کروں؟''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم شہر چلے جائیں۔ اس دیہاتی زندگی میں کیا رکھا ہے۔ یہ بڑی حویلی ہم چچا اور اس کی بیوی اور اس کے بدکار بیٹے کے حوالے کر جائیں۔''

''بکتے ہو، زندگی فرار کا نام نہیں۔ میں اپنے باپ کی اور دادا کی زمین چھوڑ دوں، یہاں ان کی قبریں ہیں۔ اس جگہ سے چلا جاؤں، جہاں میرے باپ دادا کی سانسیں مہک رہی ہیں۔ گھر میرا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے پائپ سلگایا۔

''یہ زمین بھی میری ہے اور یہ گھر بھی۔ اس جگہ نے ہمیں اناج بھی دیا ہے۔ اس زمین نے ماں بن کر تمہیں پالا ہے۔ اگر ہل چلانے کے لیے یہ زمین اور تمہیں پناہ دینے کے لیے یہ چھت نہ ہوتی تو تم اس وقت میرے سامنے نہ کھڑے ہوتے۔''

بڑا بیٹا ڈانٹ ڈپٹ کھا کر دلائل پر اتر آیا تھا۔

''ہاں ابو! جاگیردار کی بڑی حویلی، جس کا آہنی دروازہ ہے، جہاں سے آپ میری ماں کو بیاہ کر لائے تھے۔ اس کے بیرونی حصے اور باغ چھوٹے چھوٹے لوگوں نے چھوٹے چھوٹے حصوں میں کرائے پر لے رکھے ہیں اور اندرونی حویلی کے بڑے بڑے ایوانوں پر تالے پڑے ہیں۔ ہم کیوں نہ اسے کرائے پر لے لیں۔ مجھے اس کتے سے نجات مل جائے گی۔'' اس کا اشارہ اپنے باپ کے چچیرے بھائی کی طرف تھا۔

یہ کہتے ہوئے آنسو ڈھلک کر اس کے گالوں پر آ گئے۔ اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا: ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک اچھا بیٹا بن کر رہوں گا، نہ جوا کھیلوں گا اور نہ افیون کھاؤں گا اور جس عورت سے تم نے میرا نکاح اپنی رضامندی سے کیا ہے اس کے سوا کسی عورت کو نہیں دیکھوں گا۔''

بیٹے کے آنسوؤں سے وینگ لینگ متاثر و مسحور ہو گیا یا اس حویلی کے خریدنے کا تصور تھا جس کے آہنی دروازے پر اس کا باپ چوکیدار رہا تھا اور جس کے اندرونی حصے کے باورچی خانے میں اس کی بیوی ملازمہ رہ چکی تھی۔

کیا وہ یہ املاک خرید کر انتقام نہیں لینا چاہتا تھا۔

وینگ لینگ ابھی تک نہیں بھولا تھا کہ وہ کن حالات میں ٹوکری اٹھائے چوکیدار کی منت و سماجت کر چکا تھا۔ وہ کیسے اس بڑے ایوان میں پہنچا تھا، جس کے برآمدوں اور راہداریوں کو عبور کرتے وقت وہ اپنے بدن میں کئی مرتبہ کانپا تھا۔ کیا وہ اتنی بڑی حویلی کا مالک بن جائے گا۔ یہ تصور کتنا خواب ناک تھا۔

☆☆☆

وینگ لینگ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا تھا جہاں وہ اپنی ہر نئی سوچ کو کم سے کم عرصے میں مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا اب یہ معمول تھا کہ وہ صبح سویرے اپنے وسیع کھیتوں کی طرف نکل جاتا اور واپس آ کر صحن میں ایک آرام دہ کرسی پر امیر تر بننے کے خواب دیکھتا۔ یہ خواب اس کی جیب میں تھے۔

بڑی حویلی کو خریدنے کے بعد اب نقل مکانی کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے کو اپنے قریب بلایا اور کہا کہ وہ جلد سے جلد بڑی حویلی میں منتقل ہو جائے۔ سب سے پہلے کنول اور کوکو اپنے زرخرید اور بیش قیمت سامان اور اشیاء کو لے کر بڑی حویلی کے کمروں میں آباد ہو جائیں پھر بڑا بیٹا اپنی بیوی اور ملازموں کے ساتھ حویلی میں اپنی جگہ ٹھیک ٹھاک کر لے۔

''آپ وہاں کب چلیں گے بابا؟''

''میرے سوچنے کی بات ہے۔ میں اتنی آسانی کے ساتھ اس گھر کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بچپن سے لے کر اس عمر تک میری تمام یادداشت یہاں دفن ہے۔''

بیٹے نے مزید اصرار کیا تو وینگ لینگ نے درشتی کے لہجے میں کہا: ''تم بے وقوف بھی ہو اور نا سمجھ بھی۔ کیسے چھوڑ سکتا ہوں یہ گھر

اتنی جلدی۔ یہاں میری مفلوج لنگڑی بچی بھی تو ہے اور میں نے محسوس کر لیا ہے کہ تمہاری بیوی میری بہو اسے پسند نہیں کرتی۔ سوتیلی ماں اس کے سائے سے بھی بھاگتی ہے۔ میں اسے کسی کے حوالے نہیں کر سکتا۔''

''میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا، آخر وہ بھی تو میری بہن ہے۔''

''ٹھیک ہے، لیکن بیوی کے آنے کے بعد بہنوں کے رشتے اکثر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور پھر وہ تو ایک لنگڑی سی لڑکی ہے۔''

اس پر وینگ لینگ کا بڑا لڑکا خاموش ہو گیا۔ اب اس گھر میں کیا رہ گیا تھا۔ صرف وینگ لینگ کا چچا اور اس کی فربہ اندام بیوی اور ان کا آوارہ بیٹا۔ چنگ اور محنتی مزارعے، جو بیرونی کمروں میں اٹھ آئے تھے، وینگ لینگ کا چچا اس کی بیوی اور بیٹا اندرونی کمروں میں آ گئے، جہاں پر کبھی کنول رہتی تھی۔ بیرونی کمروں میں جو وینگ لینگ نے پختہ اور مضبوط بنائے تھے وینگ لینگ خود رہنے لگا۔ اس نے ایک مضبوط جسم کی بوڑھی عورت ملازمہ کے طور پر رکھ لی جو اس کی لنگڑی لڑکی کی حفاظت اور نگہداشت کرتی۔

اب وینگ لینگ کا معمول یہ تھا کہ وہ سورج نکلتے ہی آرام دہ کرسی پر سورج کی شعاعوں سے اپنے جسم کو تمازت پہنچاتا۔ اب اس کے دماغ اور اعصاب کو سکون ملنے لگا تھا۔ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا ایک اچھا دہقان بن چکا تھا۔

ایک دن وینگ لینگ نے سوچا کہ وہ اپنے دوسرے بیٹے کی شادی بھی کر دے۔ اس نے اپنے پرانے دوست چنگ کو بلایا اور اسے مناسب رشتہ ڈھونڈنے کے لیے کہا۔ چنگ نے جو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا، لیکن اس میں اب بھی ایک وفادار کتے کی طاقت تھی اثبات میں سر ہلایا اور دوسری صبح منقش اونی فرغل پہن کر رشتے کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے ادھر ادھر کئی گاؤں چھان مارے اور ایک دن یہ خوشخبری لے کر واپس آیا کہ اس نے اپنے دوست کے بیٹے کے لیے ایک اچھا گھرانہ تلاش کر لیا ہے۔ لڑکی تندرست اور توانا ہے، خانہ داری سے پوری طرح واقف۔ مناسب جہیز لائے گی، جس میں زمین بھی شامل ہوگی۔ زمین وینگ لینگ کی کمزوری تھی وہ مان گیا۔

اسے اور کیا چاہیے تھا۔ اس نے تھکن دور کرنے والی انگڑائی لے کر آہستگی سے کہا: ''بوڑھا ہو جانا کتنا آرام دہ ہوتا ہے۔ نہ فکر معاش اور سونا جاگنا اپنے بس میں۔''

چنگ اس کا دوست دبلا ہو چکا تھا اور وہ فربہ اور توانا۔ اسے اب خراٹے بھرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ ایک لمبی آرام دہ کرسی پر لیٹا سوتا رہتا اور غریب کاشت کاروں کو قرضے دیتا اور غریب کاشت کاروں کو جو سود کی رقم بھی نہ دے سکتے تھے اپنی زمینیں بیچنے پر آمادہ کرتا۔

کبھی کبھی وینگ لینگ اپنی اس حویلی میں بھی پہنچ جاتا جو اس نے خریدی تھی۔ یہاں آ کر وہ اپنی دوسری بیوی کنول کے کمرے میں چلا جاتا جو فربہ اندام اور ہوس پرست ہو چکی تھی۔ یہاں آ کر اسے محسوس ہوتا کہ وہ بالکل نامردی کے قریب ہے۔ کچھ دن یہاں گزار کر وہ واپس اپنی زمینوں کی طرف لوٹ جاتا۔

اپنی آبائی زمین پر وہ آ کر مزدوروں سے ملتا جلتا۔ چنگ سے بغل گیر ہوتا اور اندرونی کمرے میں سونے کے لیے چلا جاتا۔ اندرونی کمروں کے قریب اس کا چچا اپنے بدمعاش بیٹے کے ساتھ غل غپاڑے میں مصروف ہوتا۔

وینگ لینگ ان کی ضرورت کو سونے چاندی کے سکوں سے پورا کرتا رہا۔ وہ ہر حالت میں انہیں خاموش اور مطمئن رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے بدمعاش چچا، اس کے بدفعل بیٹے اور پیٹو بیوی کو رشوت دے کر ہمیشہ کے لیے خاموش رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس گھر کے لیے خاموشی خریدنا چاہتا تھا۔

اپنے کنبے کو بھیجنے کے بعد بھی وہ مطمئن خاموشی حاصل نہیں کر سکا تھا جس کی اس کو تمنا تھی۔

وینگ لینگ جو کسی زمانے میں ایک سوکھی روٹی ادرک اور لہسن کا چھلکا جو ہمسایوں سے مانگ کر لاتا تھا، کھا کر اپنے جسم کی آگ بجھا کر سو جایا کرتا تھا، اب شمالی ہواؤں سے اڑنے والے کبوتروں بٹیروں اور تیتروں کی یخنی پی کر بھی سونے سے بیزار تھا۔ وہ امیر ہونے کے بعد اپنی خوراک کا ذائقہ بھی بھول گیا تھا۔ وہ ایک ایسی امیرانہ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا جہاں دکھ کا شائبہ تک نہ ہو۔

ایک دن اسے خبر ملی کہ شمالی حصوں میں جنگ ہونے والی ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ خوش اس لیے ہوا کہ اس کے چچا کا بدمعاش بیٹا میدان جنگ میں جائے گا اور یہ گھر عفریت سے خالی ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اگر یہ چلا جائے تو عزت سے خطرہ ٹل جائے گا اور انہی سوچوں میں گم وہ چچا کے کمرے کی طرف چلا اور وہاں پہنچ کر اس نے اپنے اونی فرغل کی جیب سے ایک ڈبیہ نکالی۔

''چچا میں تمہارے لیے اصلی افیون لایا ہوں اور یہ ہیں چاندی کے کچھ سکے۔ میں نے سنا ہے میرا بھائی میدان جنگ میں جا رہا ہے۔ وہ بہادر لڑکا ہے۔'' زہرخند سے وینگ لینگ نے فقرہ مکمل کیا۔ ''وہ میدان جیت کر آئے گا۔ چاندی کے یہ کچھ سکے اس کی

جیب خرچ کے لیے ہیں۔"
وینگ لینگ کے چچا نے اپنی کھردری مرجھائی ہوئی ہتھیلی پر جب یہ سکے دیکھے تو اس کی آنکھیں جگنو بن گئیں۔
"جنگ میں فتح بھی ہوتی ہے اور شکست بھی۔ جیت کر واپس آیا، تو تمام گاؤں والوں کو بڑی دعوت دوں گا اور مر گیا تو تمام گاؤں والے اس کے جنازے میں شرکت کریں گے۔ کیا یہ ہمارے خاندان کے لیے عزت کا نشان نہیں ابھرے گا۔"
اس پر اس کا بوڑھا تجربہ کار پیشہ ور چچا مسکرایا۔ "میں اس کی جگہ ہوتا، تو بھاگ جاتا۔ زندگی داؤ پر لگانے کی چیز نہیں۔"
"یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے چچا۔ میرا دیا ہوا انعام تمہاری ہتھیلی پر ہے اسے جیب میں رکھ لو یا اسے دے دو۔"
یہ کہتے ہوئے وینگ لینگ کمرے سے باہر نکل گیا اور اس رات وینگ لینگ نے اپنی چچی کے رونے کی آواز سنی۔ اس کا بیٹا میدان جنگ کی طرف جا رہا تھا۔
اب اس گھر میں سکون اور اطمینان تھا۔ اس کے چچا کا لفنگا بیٹا اس کے گھر سے جا چکا تھا اور بیرونی کمروں میں اس کا بوڑھا چچا اور اس کی بیوی افیون میں دھت اس کے لیے کسی خطرے کا نشان نہیں بن سکتے تھے۔
وینگ لینگ اب بڑھاپے کی کمزوری کو عمدہ خوراک سے مٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چنگ کو بلا کر کہتا:
"مچھلی لاؤ، میں اس کا شوربا پیوں گا۔ جنگلی کبوتر لاؤ، میں ان کی یخنی پینا چاہتا ہوں۔"
خوراک عمر کا علاج نہیں بنتی۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا۔ سب اہل خانہ گھر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ وہ بڑی حویلی میں جلد سے جلد منتقل ہونا چاہتے تھے۔ کنول اپنی محافظ کوکو کے ساتھ بڑی حویلی میں چلی گئی تھی۔
ان کے جانے کے بعد وینگ لینگ جو بڑھاپے کی سرحد کے قریب آ چکا تھا، آرام ہی آرام محسوس کرنا چاہتا تھا۔
لہسن میں بھنے ہوئے شوربے اور تازہ سبزیوں اور گوشت سے جو اس کے ملازم شکار کر کے لاتے۔ تیتر، بٹیر اور مرغیاں۔ وہ کبھی بھنی ہوئی اس کے سامنے آتیں۔ کبھی شوربے کی شکل میں۔ وہ یہ عمدہ اور قیمتی خوراک کھا کر موٹا ہو گیا تھا۔
کبھی وہ دن تھے کہ وہ مرچ پیاز اور لہسن کو وزنی پتھر کے نیچے کوٹتا اور چٹو میں گھونٹتا اور پھر اپنے کھیتوں کی طرف چلا جاتا۔
اب وینگ لینگ کے شب و روز عمدہ غذا کھانے کے بعد آرام سے زندگی گزارنے میں بسر ہو رہے تھے۔ وہ سورج نکلنے کے بہت بعد میں اٹھتا۔ اب اسے اپنے ہاتھوں سے محنت و مشقت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے ملازم کارندے مزارعے ہر وقت تندرست بیلوں کی طرح اس کے کھیتوں میں کام کرتے اور وہ فکر معاش سے بے پرواہ تن آسان زندگی گزارتا۔ وہ کالے رنگ کے جنگلی کبوتروں کا شوربا پیتا۔ عمدہ قسم کی مچھلی کھاتا۔
دوپہر کے وقت سورج کی گرم شعاعوں سے تمازت اور رات گرم اونی بستر پر لیٹ کر گہری نیند کے خراٹے بھرتا۔ اب وہ اپنی مرضی سے جاگتا اور اپنی مرضی سے اٹھتا۔
ایک مہینے کے بعد وینگ لینگ نے اپنے پوتے کی پیدائش کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ شہر اور گاؤں کے سینکڑوں لوگ شامل ہوئے۔ ایک مہینے میں ہی وینگ لینگ کا پوتا چھوٹا موٹا اور گول مٹول ہو گیا تھا۔ ضیافت میں تمام مہمانوں نے جی بھر کے کھایا پیا۔ ابھی ضیافت کی تقریب ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک دیہاتی کانپتا کانپتا داخل ہوا اور اس نے اکھڑی ہوئی سانس سے کہا:
"چنگ پر چھت گر پڑی ہے۔ ہم نے مشکل سے اسے ملبے سے نکالا ہے، وہ مرنے سے پہلے آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"
"میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ چنگ کیوں نہیں آیا اس حادثے نے اسے یہاں پہنچنے کی مہلت نہیں دی ہوگی۔"
اور مزید سوچے بغیر وہ تمام مہمانوں کو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رفیق اس کا ساتھ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی۔ مہمان کمرے میں گرم شوربے، تلی ہوئی مچھلی اور جلتی ہوئی آگ جو آتش دانوں میں روشن تھی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ انہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد گھرانے کے لوگ باتیں کرنے لگے۔
"اس عمر میں اور اس بارش میں انہیں جانا چاہیے تھا۔" ایک بوڑھی عورت نے کہا:
"عمر بھر کا ساتھ ہے۔" ایک بوڑھے دیہاتی نے کہا۔
جب وینگ لینگ بارش میں بھیگتا ٹھٹھرتا ہوا اپنی اس آبائی حویلی میں پہنچا اور اس نے اس کمرے کی طرف قدم بڑھائے، جہاں وہ کبھی غربت کی زندگی گزار چکا تھا وہاں اس نے اپنے ہڈیوں کے ڈھانچے مرتے ہوئے دوست چنگ کو دیکھا۔ فاصلے سمٹ گئے اور اس نے تھرتھرائی ہوئی زبان میں کہا:
"میں ایک اچھے مزدور اور دوست کی حیثیت سے مر رہا ہوں۔ کیا تم مجھے اچھا کفن پہناؤ گے؟"
"میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔"
"تم خدا نہیں ہو، تم موت کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھ سکتے۔ وہ

میرے بالکل قریب کھڑی ہے۔ وہ مجھے اپنے ٹھنڈے اور لمبے ہاتھوں میں اٹھا کر قبر تک لے جائے گی۔ تم اس کا راستہ نہیں روک سکتے۔''

''اتنے بیمار تھے تو تم نے مجھے پہلے خبر کیوں نہ دی؟''

''پہلے خبر دے دیتا تو کیا موت نہ آتی۔ اچھا ہوا تم سرہانے کھڑے ہو۔''

یہ کہتے ہوئے چنگ نے گوشت سے گم گشتہ ہڈیوں بھرا ہاتھ وینگ لینگ کی طرف بڑھا دیا اور جب اس کا سوکھا نیم مردہ ہاتھ وینگ لینگ کے ہاتھ میں آیا، تو سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی۔

برسوں کے رشتے موت نے توڑ دیئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا موت کتنی گھناؤنی چیز ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو کتنی جلد علیحدہ کر دیتی ہے۔

اور جب چنگ مر گیا، تو وینگ لینگ اس کی لاش پر جھک گیا اور ایک ننھے بچے کی طرح بلک بلک کر روتا رہا اور اس نے اپنے سب سے معتمد ملازم کو سب سے قیمتی کفن خریدنے کی ہدایت کی اور کہا: ''یہ میرا ملازم نہیں تھا دوست اور رفیق تھا۔''

اسے دفنانے کے بعد وینگ لینگ متواتر تین دن تک اضطرابی مریض رہا۔ اس نے چنگ کو اسی قبرستان میں دفنایا جہاں اس کا باپ اور اس کی بیوی سو رہے تھے۔

چوتھے دن وینگ لینگ کے بڑے بیٹے نے گستاخی کے انداز میں کہا: ''آپ نے ایک ملازم کو میرے دادا اور ماں کی قبر کے نزدیک سلا دیا ہے۔''

اس پر وینگ نے کہا: ''وہ مجھے ان سب سے زیادہ عزیز تھا۔''

اب وینگ لینگ نے چنگ کے مرنے کے بعد، جو مزارعوں کی نگرانی کرتا تھا، وہاں یکسر جانا چھوڑ دیا۔ درد کی شدت سے اس کے روئیں روئیں میں بے سکتی کی وجہ سے چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔ اسے اپنے آبائی گھر سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ چنگ کے مرنے کے بعد اسے اس زمین سے بھی نفرت ہو گئی تھی، جو کبھی اس کی تھی۔ اب اسے فکر تھا اپنے چھوٹے بیٹے کا اور اس پگلی مفلوج بچی کا، جو نہ سوچ سکتی تھی نہ کچھ سمجھ سکتی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی نئی خرید شدہ حویلی میں چلا جائے۔ ان زمینوں اور پرانی حویلی کو چھوڑ کر جو اس نے تنگدستی سے فارغ البالی تک بنائی تھی۔

☆☆☆

وینگ لینگ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ اس کے منجھلے بیٹے نے یہ خبر اس تک پہنچائی کہ ملک کے جنوبی حصوں میں جنگ ہونے والی ہے اور اناج کے بھاؤ بڑھنے والے ہیں۔ اس کا منجھلا بیٹا دوپہر کے کھانے کے وقت روز گھر آیا کرتا تھا۔ وینگ لینگ نے جب یہ خوشخبری سنی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

''جنوبی حصوں میں جنگ۔''

''آدمی مر رہے ہیں بابا، اور جو بچ گئے ہیں فاقوں سے مر رہے ہیں!!''

''جنگ نہ ہوتی تو اناج کی قیمت کیسے بڑھتی۔''

یہ گفتگو جاری تھی کہ باہر سے اسے سخت نوکیلے جوتوں کی آواز آئی۔ وینگ کا ننھا پوتا چھوٹے چھوٹے ننگے پاؤں زمین پر رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ وینگ لینگ اس کے پیچھے بڑھاپے کے محتاط قدم رکھتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ باہر خاکی وردیاں پہنے ہوئے بڑے بڑے بوٹوں پر تسمے چڑھائے فوجی ٹڈیوں کی رفتار سے آ رہے تھے۔

وینگ لینگ اس منظر کو پوری طرح دیکھنے نہ پایا تھا کہ فوجیوں میں سے ایک تنومند، کریہہ المنظر نوجوان چلایا:

''رک جاؤ یہیں پر یہ میرے بھائی کا گھر ہے۔ ہم کچھ دیر یہاں آرام کریں گے۔''

وینگ لینگ نے جب اپنے آوارہ صفت چچیرے بھائی کی آواز سنی تو اپنے پوتے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

ایک ''عفریت'' اس کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔

تھکے ہارے مسافت کے مارے فوجی اس کے گھر میں داخل ہونے لگے۔ اس کے وسیع صحن اور باغات میں داخل ہو کر فوجی اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگے۔

وینگ لینگ کا چچیرا بھائی اپنے کپڑوں سے گرد جھاڑ رہا تھا۔ اس کی پہاڑی کوے کی سی آواز صحن میں گونجی:

''ہم سب پیاسے ہیں، ہمیں پانی پلاؤ۔''

اور یہ سن کر وینگ لینگ چپکے سے صحن سے غائب ہو گیا۔

وہ کسی کو بھی پانی پلانا نہ چاہتا تھا، تھکے ہارے فوجیوں نے چلوؤں سے تالاب سے پانی پینا شروع کر دیا۔

اس حویلی پر خاکی رنگ کی وردیوں نے بسیرا کر لیا۔

وینگ کسی فوجی کا میزبان بننا نہ چاہتا تھا، لیکن ہر فوجی کے ہاتھ میں بندوق اور سنگین تھی۔

وینگ لینگ کو ہمدردی کے تحت نہیں بلکہ مجبوری سے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ ایک مہربان، میزبان بن جائے۔ اس نے حالات کا جائزہ لے کر منافقانہ کہا: ''اس گھر کے دروازے تم سب پر اس وقت تک کھلے ہیں جب تک، تم اگلی منزل کی طرف کوچ نہیں کرتے۔''

''بھائی مت بھولو کہ ہمیں شاید کئی دن تک یہاں رہنا پڑے۔ کیا تم ہر روز ہماری ضیافت کا انتظام کر سکو گے۔ خوش قسمتی ہے

ہماری۔"

وینگ لینگ کو جھوٹ بولنا پڑا۔ ڈر کیسے کیسے جھوٹ بلواتا ہے۔ اتنے بن بلائے مہمانوں کو دیکھ کر وینگ لینگ بوکھلا گیا تھا۔ مزاحمت قطعی طور پر نا قابل عمل تھی۔ فوجی صرف گولی کی زبان سمجھتے ہیں۔ ہر گھر پر ان کا قبضہ ہے۔ یہ جنگلی ہوتے ہیں، شہوت پرست۔

وینگ لینگ نے بیٹوں سے مشورہ کر کے اپنی بہوؤں کو حویلی کے پچھلے کمروں میں دھکیل دیا یا مقید کر دیا۔

وینگ لینگ کا چچیرا بھائی ہر وقت حویلی میں دندناتا پھرتا تھا۔ وہ کبھی اس کے بڑے بیٹے کی بیوی کی طرف حریصانہ نظر ڈالتا اور نشے میں دھت کہتا:

"کیسی نازک اندام اور غنچے کی طرح شگفتہ ہے، تمہاری بیوی! کیسے خوبصورت پاؤں ہیں اس کے۔ جیسے کنول کی کلیاں ہوں۔"

دوسرے بیٹے کی بیوی کو دیکھ کر آواز کستا:

"کیسا اناری رنگ ہے، تمہاری بیوی کا! بڑا لذیذ گوشت ہوگا اس کا۔"

وینگ لینگ کو پتہ چل گیا کہ اس کا آوارہ فوجی چچیرا بھائی اس کی بیٹیوں پر کیسے بے شرم فقرے اچھالتا ہے، لیکن وہ اور اس کے بیٹے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ کئی بار اس نے کنول سے بھی مذاق کیا وہ کہتا:

"امیر آدمی کی بیوی ہو نا! اچھی خوراک اور دن رات کے آرام نے تمہیں گوشت کا پہاڑ بنا دیا ہے۔"

وہ کوکو، جو ہر وقت افیون کے نشے میں ڈوبی ہوئی کنول کی خدمت کے لیے موجود رہتی تھی کو دیکھ کر کہتا:

"یہ بوڑھی کتیا ابھی تک زندہ ہے۔"

باہر وسیع صحن اور باغات میں، خاکی کپڑوں میں ملبوس بڑے بڑے بوٹوں والے فوجیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ انہوں نے طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا تھا۔ آگ جلانے کے لیے وہ قیمتی درختوں کی ٹہنیاں توڑ لیتے۔ خوشبودار نازک پھولوں کو بے مقصد اپنی ہتھیلیوں پر مسلتے، ہر وقت غل غپاڑے میں مشغول رہتے اور سنگ مرمر کے تالاب میں ہر وقت نہاتے۔ وہ اپنے غلیظ لباس اور مٹی سے اٹے ہوئے بوٹوں سمیت تالاب میں کود جاتے اور چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو ہوا میں اچھال کر ان کے تڑپنے کا مزہ دیکھتے۔

وینگ لینگ اور اس کے بیٹوں نے مشورہ کیا کہ وہ چچا کے آوارہ بیٹے کے لیے کوئی خادمہ اس کی شہوانی خواہشات کی تکمیل کے لیے مہیا کر دیں ورنہ وہ کسی بہو پر ہاتھ ڈال کر گھرانے کی عزت پر ڈاکہ ڈال دے گا۔

اپنے اس منصوبے کو مکمل کرنے کے لیے وینگ لینگ نے تجربہ کار بوڑھی مرغی کوکو کو بلایا اور اسے اپنے چچیرے بدمست بھائی کے کمرے میں اس لیے بھیجا کہ وہ یہ معلوم کرے کہ اسے اپنی شہوانی خواہشات کی تسلی کے لیے کون سی خادمہ کی جوانی پسند ہے۔

کوکو تیز قدم بڑھاتی ہوئی بدمست فوجی کے کمرے میں چلی گئی اور چند لمحوں کے بعد اس نے وینگ لینگ کو یہ بتانے میں کوئی شرم محسوس نہ کی کہ اس کا چچیرا بھائی اس جواں سال لڑکی کی حرارت سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے جو اس کی بیوی کنول کی تھل تھل کرتی رانوں پر ہر وقت زیتون کے تیل کی مالش کرتی ہے۔

☆☆☆

نوخیز آڑو کا بوٹا پیر بلاسم اس کنیز کا نام تھا جسے اس کا عیاش، تنومند بدتمیز چچیرا اپنے بستر کے لیے مانگ رہا تھا۔ کیکر کا درخت گلاب کی ٹہنی سے ہم آغوش ہونا چاہتا تھا۔

یہ سنتے ہی پیر بلاسم پر کپکپی طاری ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"ایسا نہ ہونے دینا، مالکن! وہ مجھے مار ڈالے گا۔"

"مت ڈرو! کوئی مرد، بستر پر عورت سے بڑا نہیں ہوتا، وہ تھک جائے گا، تمہیں تھکانے سے پہلے۔ تمہیں اس سے بہت کم محنت کرنی پڑے گی۔"

لیکن پیر بلاسم ہچکیوں میں رو رہی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "مالکن آپ مجھے اس کمرے میں جانے سے روک لیں۔" اس وقت وینگ لینگ فرغل پہنے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی پیر بلاسم کی آواز سنی۔ اس کو پتہ چل گیا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ اس نے کوکو سے پوچھا:

"تو تم نے اسے سب کچھ بتا دیا؟"

"ہاں مجھے سب کچھ بتانا پڑا۔" کوکو نے جواب دیا۔

نوخیز لڑکی، جس نے مرد جیسی کوئی چیز نہ دیکھی تھی وینگ لینگ کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اس کا چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ وہ کپکپاتی ہوئی رو رہی تھی۔

وینگ لینگ نے اسے اپنے بوڑھے لیکن مضبوط بازوؤں کی مدد سے اٹھایا۔ اس نے اس کو اٹھاتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کے بازو کتنے نازک، کمزور، لیکن کتنے سڈول ہیں۔ وینگ لینگ نے کنیز کی تر و تازگی محسوس کرتے ہوئے کہا:

"یہ اس بھیڑیے کے پاس نہیں جائے گی۔ میں تندرست کنیزوں میں سے کوئی کنیز اس کے پاس بھیجوں گا، جو اس کی ہوس کی آگ بجھا دے۔"

شام رات بننے نہ پائی تھی کہ کوکو ایک توانا اور تندرست کنیز کو

لے کر اس کے چچیرے بھائی کے کمرے میں پہنچ گئی۔

اس جواں سال ابلتے ہوئے خون کو دیکھ کر وینگ لینگ کے چچیرے بھائی نے ''کوکو'' کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ کوکو کے جاتے ہی اس نے کنیز کو اپنی طرف کھینچ لیا اور پھر اسے میدان کارزار میں بندوقوں کے چلنے والی آواز نہ آئی اور نہ سسکیوں کی۔ اس نے تلذذ کے چند فقرے سنے اور بستر بھیگ گیا۔ ساری رات اسی طرح گزر گئی اور جب دوسری صبح ہوئی تو وینگ لینگ کا چچیرا انہائے بغیر اپنے دوسرے فوجیوں کے ساتھ لڑائی کے میدان کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

جب فوجی وینگ لینگ کے چچازاد بھائی کے ساتھ چلے گئے تو وینگ لینگ اور اس کے بیٹوں نے سوچا کہ وہ اپنی حویلی کے باغ میں نئے پھول اگائیں اور سنگ مرمر کے تالاب کی مرمت کرنے کے بعد اس میں نئی سنہری مچھلیاں چھوڑ دیں یا جن دروازوں اور محرابوں کو فوجی توڑ پھوڑ گئے۔۔۔ اور حویلی کی ظاہری آرائش اور تزئین کا انتظام ہونے لگا۔

وینگ لینگ کی عمر اب ستر کے قریب تھی اور اس کے نواسے اور پوتے قد کاٹھ میں اسے اس احساس میں مبتلا کرنے لگے تھے کہ وہ اونچے اور وہ کوتاہ قد ہو گیا ہے۔ وینگ لینگ کو امیر ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ گھر میں مکمل سکون دیکھے، لیکن اب اس کے دونوں بیٹوں کی بیویوں نے شدت سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ بڑے لڑکے کی بیوی پڑھی لکھی، شہری امارت زدہ عورت تھی۔ دوسرے بیٹے کی بیوی ایک ان پڑھ دیہاتی لڑکی اور وہ دونوں روزمرہ کی زندگی میں بار بار ایک دوسرے سے الجھ پڑتی تھیں۔

اس کی بڑی بہو، حسب نسب پر مغرور اور اپنی دیورانی کو قریب سے دیکھنا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس کے بچے جب معصومیت سے کھیلنے کے لیے ان کے صحن کا رخ کرتے تو وہ چلا کر کہتی:

''ان بلوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے مت جاؤ۔''

دوسری بہو دوسرے صحن سے چلا کر اپنے بچوں سے کہتی:

''ان سنپولیوں کے پاس مت جاؤ، نہیں تو تمہیں ڈس لیں گے۔'' ان دو عورتوں کا جذبہ حقارت بڑھ گیا تھا اور اس جذبے کے ساتھ وہ نفرت کی دیوار بھی اونچی ہو گئی اور ان دو بھائیوں کے درمیان کھنچ آئی تھی۔

دولت سکھ سے زیادہ دکھ لاتی ہے۔ دو عورتوں کی نفرت حویلی میں ہر طرف پھیل گئی۔ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا تھا اور ان کی اولاد ایک دوسرے کی دشمن۔

وینگ لینگ کو ہمیشہ سکھ کی تلاش رہی تھی، لیکن سکھ نے جیسے اس سے روٹھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وینگ لینگ بڑھاپے کی اس سرحد کے قریب آ پہنچا تھا جہاں نامردی بوڑھوں کو شرافت کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ اس نے ہمیشہ امیر بننے کے بعد سکون کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن سکھ جیسے اس کی غربت کے ساتھ ہی کہیں دور بھاگ گیا تھا۔

ایک رات وہ مولسری اور رات کی رانی کے درختوں کے نیچے اپنے بڑھاپے کی نیند کو بہلا رہا تھا کہ اس نے پیر بلاسم کو چپکے سے صحن عبور کرتے ہوئے دوسرے صحن کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کی عمر سولہ یا سترہ برس ہو گی اور وہ نانا، دادا ستر سال کا ایک بوڑھا آدمی تھا، لیکن نجانے اس کے دل کی دھڑکنوں نے تیز ہو کر اس کے دل اور جسم میں چنگاریاں بھر دیں کہ وہ اضطراری طور پر بستر سے اٹھ بیٹھا اور اس نے دھیمے سے لہجے میں سرگوشی میں کہا: ''پیر بلاسم''

بوجھل فضا میں یہ آواز ڈوب گئی۔

''میرے قریب آؤ''

دوشیزہ نے اپنے قدم روک لیے۔ ستر سال کا بوڑھا ایک سولہ سالہ لڑکی کو اپنے قریب بلا رہا تھا۔ وہ بلا خطر اس کے قریب آ گئی۔

''لڑکی''

وہ یہ لفظ کہہ کر کچھ جھجکا۔ وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گئی تھی اور وہ غیر اضطراری طور پر ڈر رہا تھا کہ وہ اپنی پوتی یا نواسی کی عمر کی لڑکی کو کیا کہے کیا نہ کہے۔ آج نجانے خون اس کی رگوں میں کیوں ابلنے لگا تھا۔

''بیٹھو میرے پاس بیٹھو، میں بوڑھا ہو گیا ہوں، شاید بہت بوڑھا۔'' اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب مخالف سمت سے آواز آئی: ''مجھے بوڑھے آدمی پسند ہیں، وہ مہربان بھی ہوتے ہیں۔ اچھے بھی اور ظالم نہیں ہوتے۔''

''تمہیں جوانوں سے کیوں نفرت ہے۔''

''وہ ظالم ہوتے ہیں، خونخوار اور ان میں ہمدردی کا جذبہ نہیں ہوتا۔''

اس کی کپکپاتی آواز سن کر وینگ لینگ نے اسے شگفتگی سے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اپنے بڑے صحن سے لے کر اس کمرے کی طرف چلا گیا، جو اس نے ہزاروں چاندی کے سکے خرچ کر کے آرائش و زیبائش کے لیے بنایا تھا۔

معاملے کو آج ختم کرنے کے لیے کچھ دیر نہ لگی اور اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ نوخیز کلیاں کانٹوں سے بہت دیر کے بعد خبردار ہوتی ہیں۔ اس نے آہستگی سے کہا:

''میں تمہارے لیے بہت بوڑھا ہوں۔ شعلے خاکستر بن چکے ہیں۔''

وہ بولی'' آپ نے مجھ پر مہربانی کی ہے، مجھے کسی دوسرے شعلے کی ضرورت نہیں۔''

''پوچھ سکتا ہوں تم نے اس چھوٹی عمر میں ان جوان مردوں سے ڈرنا کیوں شروع کر دیا؟''

''آپ کیوں پوچھنا چاہتے ہیں۔''

''یونہی سکون کی تلاش میں۔''

اور یہ سکون کی تلاش وینگ کو تھی بھی۔ دادا اور نانا بننے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں جاتا، تو بے شمار مہمان اس کی ملاقات کے منتظر ہوتے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے احترام میں سب کھڑے ہو جاتے۔

آج ایک بوڑھے نے پوچھا: '' کتنے پوتے ہیں تمہارے۔''

اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا: ''بیٹیوں اور پوتوں سمیت گیارہ اور آٹھ بچیاں۔''

اس نے جرات کا سانس لیتے ہوئے کہا: ''ہر سال دو کا اضافہ کر لو۔''

وینگ لینگ کو ہمیشہ سکھ کی تلاش رہی تھی، جو ہمیشہ اس سے سائے کے فاصلے تک رہا تھا۔ وہ دولت مند بننے کے بعد غریب ہو گیا تھا۔

اب زندگی کے اس حصے میں پہنچ جانے کے بعد اس کا زیادہ وقت صحن میں پیڑوں کی چھاؤں میں گزرتا۔ اب زندگی میں اس کے دو رفیق تھے۔ ایک اس کی پگلی مفلوج بیٹی جو ہوش خرد سے بیگانہ، بغیر سوچے سمجھے ادھر ادھر گھومتی پھرتی اور دوسری پیر بلاسم جو بمشکل عمر کا ستر ہواں سال عبور نہ کر پائی تھی۔ عمر کے اس تفاوت نے وینگ لینگ کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک ابھرتی ہوئی معصوم جوانی کو دیکھ کر وہ پسینے میں نہا جاتا اور کبھی کبھی ندامت محسوس کرتے ہوئے کہتا: ''میں عمر میں تم سے بہت بڑا ہوں اور تم بھی غالباً یہی سوچتی ہو گی کہ میں نے دولت کا سہارا لے کر تمہاری جوانی کا مذاق اڑایا ہے۔''

اس پر پیر بلاسم سر جھکا کر دھیمے لہجے میں کہتی:

''آپ بہت اچھے ہیں اور مجھے آپ کے سوا کسی دوسرے مرد کی ضرورت نہیں۔''

اس کا تمام دن تو بیزاری میں گزر جاتا لیکن رات کے وقت جب وہ اپنے آرام دہ بستر پر لیٹتا تو ایک چنگاریاں بھرا جسم اسے اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے اس کے بالکل قریب ہوتا۔ اسے اب کسی عورت کی شہوانی خواہش کو تکمیل تک پہنچانے کی خواہش نہیں رہی تھی۔

اس مرتبہ جب موسم بہار آیا، تو غیر شعوری طور پر اس کے نتھنوں نے سوندھی ہوئی مٹی کی خوشبو سونگھی۔ وہ اپنا آبائی گاؤں چھوڑ کر قصبے کی بڑی حویلی میں آ گیا تھا۔ وہاں وہ امیر ترین شخص سمجھا جاتا تھا۔ طول وعرض میں اس کی تجارت تھی۔ ساٹھ کمروں پر مشتمل حویلی جس کے عقب، دائیں بائیں اور سامنے وسیع باغات تھے۔ ملازموں اور خادماؤں کا جھرمٹ تھا اور حویلی کے باغات میں سنگ مرمر کے تالاب موجود تھے، جن میں رنگ برنگی مچھلیاں تیرتی رہتی تھیں۔ وہ ماہی بے آب کی طرح بستر پر تڑپتا رہتا، لیکن اسے یہاں سکون میسر نہ تھا۔ خوابوں اور خیالوں میں سوندھی اور مہکتی ہوئی مٹی کی خوشبو اس کی تسکین کا باعث بنتی۔

ایک دن نجانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے ایک پرانے ملازم کو ساتھ لیا اور اپنے اس دیہاتی گھر میں پہنچا، جہاں سے اس نے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ مٹی کی چار دیواری کے درمیان وہ اس صحن میں سویا جہاں غربت کے ایام گزارے تھے۔ سورج ابھی طلوع نہ ہوا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کھیتوں کی طرف نکل گیا، جہاں کبھی وہ ہل چلایا کرتا تھا اور او۔لین اس کی ہمدوش بیل کی طرح جتی رہتی تھی۔ ایک غیر اضطراری جذبے سے مجبور ہو کر وہ اپنے اس خاندانی قبرستان کی طرف جا نکلا، جہاں اس کے باپ اس کے دوست چنگ اور او۔لین کی قبر تھی۔ خودرو پھولوں کی ٹہنیاں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ اس نے وہ پھول مٹی کے ان نشانوں پر رکھ دیئے، جہاں اس کی یادیں سوئی ہوئی تھیں۔ بیتا ہوا وقت اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب اسے ہر طرح کی آسائش میسر تھی، لیکن بیتے ہوئے لمحات کے دکھ میں ایک نیا سکھ مل رہا تھا۔ اس نے وہ جگہ دیکھی، جہاں اس نے ایک دن آ کر سونا تھا۔

☆☆☆

باپ اور او۔لین کی قبر کے درمیان آ کر اس نے ٹھنڈی مٹی کو چھوا، جو اس کی قبر بننے والی تھی۔ مٹی کو چھوتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ مضبوط ہاتھ جو وزنی کدال اٹھاتے وقت کبھی نہ کانپے تھے۔ انسان قبر میں اترنے سے کتنا گھبراتا ہے۔

قبرستان سے واپس آ کر اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلایا۔ وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا تھا، جہاں پہنچ کر یادداشت دم توڑ دیتی ہے۔

بڑے بیٹے نے پوچھا: ''تم نے بلایا تھا بابا کیا بات ہے؟''

لیکن وینگ لینگ نے انہیں کیوں بلایا تھا، وہ یہ بھی بھول

گیا۔

پیر بالا سم اس کے قریب کھڑی تھی۔

"یہ آج کہاں گئے تھے؟"

"کہہ رہے تھے اپنی زمین پر اپنے خاندانی قبرستان میں۔"

پھر وینگ لینگ کو جیسے سب کچھ یاد آ گیا۔

"ہاں! میں نے تمہیں بلایا تھا بیٹے کہ میرے لیے ایک کفن خرید لو اور مجھے اپنے دادا اپنی ماں کی قبر کے درمیان سلا دینا۔"

"ایسا نہ کہو، بابا۔" دونوں بیٹوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ "تم تو ابھی ہم سے بھی زیادہ جوان ہو۔"

"نہیں، میرے حکم کی تعمیل کرو۔"

اور دوسرے دن بیٹے اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے کفن خرید لائے، جسے وینگ لینگ نے اپنے کمرے میں سجا لیا۔ اسے دیکھ کر وہ آسودگی اور اطمینان محسوس کرنے لگا۔ وینگ لینگ اپنی پگلی لڑکی اور پیر بالاہم کے ساتھ کنول اور سب کو خیر باد کہے بغیر اس گھر میں لوٹ آیا تھا جس میں رہ کر وہ لہسن اور پیاز کے ساتھ سوکھی روٹی چبایا کرتا تھا۔

وہ ایک مرتبہ اپنے باپ کی دیمک زدہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کی بینائی اور قوت سماعت کم ہو گئی تھی لیکن سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے، سورج کی ہر شعاع کے ساتھ اسے ہر وقت اپنی زمین کا خیال رہتا تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرح ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا رہتا اور اس کے بیٹے دن میں کئی مرتبہ اس کی عمر، اور ہاضمے کا خیال رکھتے ہوئے اسے زود ہضم اور من بھاتے کھانے بھیجتے۔ ایک درجن سے زیادہ ملازم اس کی خدمت کے لیے موجود تھے۔ ایک دن کنول کوکو کے ساتھ اسے ملنے کے لیے آئی وہ اتنی فربہ اندام ہو گئی تھی کہ اسے صحن عبور کر کے وینگ لینگ تک پہنچنے کے لیے دو تین مرتبہ رک کر سانس لینا پڑا۔ شوہر اور بیوی کے درمیان تمہید کے بغیر بات چیت ہوئی: "میرے بیٹوں کی بیویاں ایک دوسرے سے خوش ہیں نا۔"

کنول نے جوافیون کے نشے میں مست تھی، بہکی ہوئی آواز میں کہا:

"میں تو پچھلے کمرے میں رہتی ہوں کوکو مجھے بتاتی رہتی ہے کہ وہ بھوکی بلیوں کی طرح ایک دوسرے کو گھورتی رہتی ہیں، تمہارے بڑے بیٹے نے دوسری شادی کر لی ہے اور دوسرے بیٹے نے قصبے میں اپنی دکان بنالی ہے، جو کچھ بھی کیا ہے ٹھیک کیا ہے انہوں نے۔ دولت نئے نئے راستے کھولتی ہے ہر ایک کے لیے۔"

"انہیں کہنا میرے آرام و آسائش کا خیال رکھتے ہوئے مجھے آ کر ملا کریں۔ میں مرنے سے پہلے انہیں ان کا جائز حق دے دینا چاہتا ہوں۔"

اور دوسرے دن وینگ لینگ کے بیٹے آ گئے۔ انہیں باپ کی موت کا کتنا انتظار تھا۔ وینگ لینگ صحن میں آرام دہ کرسی پر لیٹا خراٹے بھر رہا تھا کہ ان کے آنے کی چاپ سن کر غنودگی کے عالم سے نکل کر اپنی آنکھیں کھولیں۔

"میں مرنے سے پہلے، تمام زمین اور املاک تقسیم کر دینا چاہتا ہوں اس لیے کہ میرے مرنے کے بعد کوئی جھگڑا نہ ہو۔"

بڑے بیٹے نے کہا: "ہم یہ زمین بیچ کر رقم آپس میں تقسیم کر لیں گے۔"

اس پر وینگ لینگ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ہم اس مٹی سے اٹھائے گئے ہیں اور اس مٹی میں دفن ہوں گے۔ کیا زمین بیچنے والی چیز ہے؟"

یہ کہتے وقت اسے سکتہ ہو گیا۔ اس نے آرام دہ کرسی سے اٹھنے کی ناکام کوشش کی، دونوں بیٹوں نے اسے سہارا دے کر پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ آئی ہوئی موت جیسے پھر ٹل گئی تھی۔

"نہیں بابا، ہم یہ زمین کبھی نہیں بیچیں گے۔"

وینگ لینگ کو جیسے سکون آ گیا اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے دور اپنی زمین دیکھنے لگا۔ وینگ لینگ اب سکون کے ساتھ، جو شاید اسے کبھی میسر نہ آیا تھا مر سکتا تھا۔ (ختم شد)

ہیمنگوے کہتا ہے کہ تشدد سے واسطہ پڑنے سے انسان کی جینے کی اہلیت میں فرق آ جاتا ہے۔ تشدد کا جو نشان پڑ جائے وہ مٹائے نہیں مٹتا، خواہ وہ جسم پر ہو یا روح پر۔ اب صورت حال یہ ہے کہ بیسویں صدی میں وسیع پیمانے پر جنگ و جدل کی بدولت تشدد زندگی کا جز و لاینفک سا بن گیا ہے۔ ہیمنگوے ان تشدد کے مارے ہوئے لوگوں ("ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے") کی کرب آلود زندگیوں کی تصویریں کھینچتا ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ اس مسلسل موت کے درد کے ساتھ جینا کیونکر ممکن ہے، اور وہ کیسا ہوتا ہے۔ (محمد سلیم الرحمٰن)

آتش و آہن کی سرزمین کولمبیا سے
ایک یادگار، ناقابلِ فراموش ناول

ایک پیش گفتہ موت کی رُوداد

عہدِ حاضر کے عظیم ادیب کے قلم سے

ایک المناک سانحے کا بیان، سارا قصبہ
اُس کا عینی شاہد تھا۔

گبریل گارشیا مارکیز/افضال احمد سید (مترجم)

مارکیز کے ناول Chronicle of a Death Foretold کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ یہ ناول بلاشبہ قدرت بیان کا ایک بے مثل معجزہ اور کئی اعتبار سے مارکیز کی منفرد ترین تحریر ہے۔ اس کا موضوع سماجی عزت کی اقدار کے نام پر ایک بے گناہ شخص کا قتل ہے' اور اس کے مجرم صرف وہ نہیں جن کے ہاتھوں سے یہ جرم سرزد ہوا' بلکہ ان مصنوعی اقدار پر یقین رکھنے والا ایک پورا قصبہ ہے جس نے اپنی بے عملی اور خاموشی کے ذریعے اس جرم کو تکمیل تک پہنچنے دیا۔ جرم اور بے گناہی کی یہ کہانی دراصل ایک عام واقعے پر مبنی ہے جس کی خبر مارکیز کو اپنی صحافیانہ زندگی کے ابتدائی برسوں میں ملی تھی' لیکن اس واقعے نے فکشن کے ایک شاہکار کی صورت کو پہنچنے تک مارکیز کے ذہن میں تیس برس انتظار کیا۔ اسے ناول کی ہیئت میں منتقل کرتے ہوئے مارکیز نے ایک نہایت پر تخیل اسلوب وضع کیا ہے۔ اسی قصبے کا ایک شخص' جرم کے ستائیس برس بعد' قصبے کے لوگوں کے غیر حتمی اور ایک دوسرے کی تردید کرتے ہوئے بیانات اور دھندلی یادوں کی مدد سے واقعے کی تفصیلیں اکٹھی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ہیئت نہ صرف المیے کو واضح کرنے میں مددگار رہوئی ہے بلکہ اس نے جرم کی سفاکی کو بھی پوری طرح نمایاں کر دیا ہے۔

جس دن اسے قتل کیا جانے والا تھا' سانتیاگو نصر ساڑھے پانچ بجے اس کشتی کا انتظار کرنے کے لیے بیدار ہوا جس پر بشپ آ رہا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ عمارتی لکڑی والے درختوں کے جھنڈ سے گزر رہا ہے جہاں ہلکی بوندیں پڑ رہی ہیں' اور ایک لمحے کے لیے وہ اپنے خواب میں خوش تھا' مگر جب وہ جاگا' اس نے خود کو چڑیوں کی بیٹ سے مکمل طور پر لتھڑا ہوا پایا۔ وہ ہمیشہ درختوں کے بارے میں خواب دیکھتا تھا' "پلاسید الینیرو' اس کی ماں' نے ستائیس سال بعد اس ناخوش آئند سوموار کی تفصیل یاد کرتے ہوئے مجھے بتایا:

"ایک ہفتے پہلے اس نے خواب دیکھا تھا کہ وہ ٹین کے ورق سے بنے ہوائی جہاز میں تنہا ہے اور بادام کے باغوں میں کسی درخت سے ٹکرائے بغیر اڑ رہا ہے"۔ پلاسید الینیرو کو دوسروں کے خوابوں کی اگر وہ نہار منہ سنائے جاتے' درست تعبیر بتانے میں بجا طور پر ایک نیک نامی حاصل تھی' مگر وہ اپنے بیٹے کے ان دو خوابوں میں' یا درختوں کے دوسرے خوابوں میں' جو اس نے اپنے قتل سے پہلے والی صبحوں میں اسے سنائے تھے' کسی بدشگونی کو محسوس نہیں کر سکی تھی۔

نہ سانتیاگو نصر ہی پیش گوئی کو جان سکا۔ وہ کپڑوں سمیت' کم اور بے حال سویا' اور سرور داور الوداعی جرعے کی تلچھٹ اپنی زبان پر لیے نیند سے جاگا' اور اس نے انہیں شادی کی رنگ رلیوں کے' جو آدھی رات کے بعد تک مچتی رہی تھیں' قدرتی اثر سے وابستہ کیا۔ اس کے علاوہ' ان بہت سے لوگوں کو' جن سے وہ چھ بج کر پانچ منٹ پر اپنا گھر چھوڑنے سے لے کر ایک گھنٹے بعد تک' جب وہ سور کی طرح کاٹ کر رکھ دیا گیا' راستے میں ملا' یاد تھا کہ وہ ذرا خواب آلود مگر خوش مزاجی میں تھا' اور اس نے ان سب سے ایک بے پروایانہ انداز میں کہا تھا کہ یہ ایک بہت خوب صورت دن ہے۔ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا اشارہ موسم کی کیفیت کی طرف تھا۔ دوبارہ یاد کرتے ہوئے بہت سے افراد نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ ایک روشن صبح تھی' کیلوں کے باغ سے سمندری ہوا آ رہی تھی' جیسا کہ اس وقت کی ایک پر کیف فروری میں توقع کی جا سکتی تھی مگر زیادہ تر لوگ متفق تھے کہ ابر آلود نشیبی آسمان اور رکے ہوئے پانی کی درشت بو کی وجہ سے موسم ماتم انگیز تھا' اور بدقسمتی کے اس لمحے میں ایک نم نم پھوار' جیسی سانتیاگو نصر نے اپنے خواب کے باغوں میں دیکھی تھی' پڑ رہی تھی۔ میں' ماریا' الیساندر ریناسروانتس کی جواریانہ آغوش میں' شادی کے ہنگامے سے بحال ہونے میں مشغول تھا' اور اطلاعی گھنٹیوں کی فریاد سے یہ سوچتے ہوئے بیدار ہوا کہ انہیں بشپ کے اعزاز میں بے قرار کر دیا گیا ہے۔

سانتیاگو نصر بغیر کلف لگی سفید لنن کی قمیص اور پتلون میں' جیسی کہ اس نے گذشتہ دن شادی میں پہنی تھیں' ملبوس تھا۔ اگر بشپ نہ آ رہا ہوتا تو وہ اپنا خاص خاکی لباس اور ٹخنے سے اونچے گھڑ سواری کے جوتے پہنتا' جو وہ ہر سوموار کو ڈیوائن فیس میں مویشیوں کی اس پرورش گاہ کو جانے کے لیے پہنتا تھا جو اس نے اپنے باپ سے ارث کی تھی اور جس کا

اس نے ہوشیاری سے' مگر زیادہ خوش طالعی کے بغیر' نظم و نسق چلایا تھا۔ قصبے سے باہر وہ اپنی بیلٹ پر میگنم ۳۵۷ء باندھتا تھا' اور اس کی خود چڑھی گولیاں' اس کے کہنے کے بموجب' کسی گھوڑے کو درمیان سے کاٹ کر رکھ سکتی تھیں۔ تیتروں کے موسم میں وہ اپنا شکرے سے شکار کرنے کا ساز و سامان بھی ساتھ لے جاتا۔ صندوق خانے میں ایک مالنچر شوناور ۶ء۳۰۶ رائفل' ایک ہالینڈ میگنم ۳۰۰ رائفل' دہری طاقت کے دوربینی دید پیش والی ہارنیٹ ۲۲ء اور ونچسٹر ریپٹر موجود تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ کی طرح اسلحہ تکیے کے غلاف میں چھپا کر سوتا تھا' مگر اس دن گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے گولیاں نکال کر نائٹ ٹیبل کی دراز میں ڈال دی تھیں۔ "وہ کبھی اسے بھرا ہوا نہیں چھوڑتا تھا" اس کی ماں نے مجھے بتایا۔ میں یہ جانتا تھا' اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ بندوقیں ایک جگہ رکھتا تھا اور گولیاں دوسری جگہ کافی فاصلے پر' تاکہ کوئی بے مقصد بھی انہیں گھر کے اندر بھرنے کی ترغیب کا شکار نہ ہو سکے۔

یہ ایک ہوش مندانہ روش تھی' جو اس کے باپ نے اسے صبح سے ہمیشہ کے لیے قائم کی۔ جب ایک خدمت گار لڑکی نے تکیہ نکالنے کے لیے غلاف کو جھٹکا اور پستول فرش سے ٹکرا کر چل گیا' اور گولی کمرے کی الماری کو تباہ کرتی ہوئی' نشست کے کمرے کی دیوار میں سے ہو کر پڑوس کے مکان کے کھانے کے کمرے سے گھن گرج کے ساتھ گزری' اور ایک قد آدم ولی کو' چوک کے بالمقابل مرکزی محراب پر' پلاسٹر کے غبار میں تبدیل کر دیا۔ سانتیاگو نے' جو اس وقت خرد سال تھا' کبھی اس حادثے کو فراموش نہیں کیا۔ اس کی ماں کے پاس اس کا آخری عکس اس کا شب خوابی کے کمرے سے تیزی کے ساتھ گزرنا تھا۔ اس نے غسل خانے میں دواؤں کی چھوٹی الماری میں آہستگی سے اسپرین تلاش کرتے ہوئے اپنی ماں کو جگا دیا تھا۔ اس کی ماں نے بتی جلائی اور اس کو' پانی کا ایک گلاس اپنے ہاتھ میں لیے' جائے در سے نمودار ہوتے ہوئے دیکھا' جیسا کہ وہ اسے تا ابد یاد رکھے گی۔ سانتیاگو نصر نے اسے خواب کے متعلق بتایا' مگر اس نے درختوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

"پرندوں کا خواب میں نظر آنا اچھی صحت کی علامت ہے" وہ بولی۔

اس کی ماں نے' اسی جھولے میں اسی کروٹ سے لیٹے اسے دیکھا تھا' جس میں میں نے اسے بڑھاپے کی آخری

فاکنر کا فن امریکی ادب کی ٹیڑھی کھیر ہے۔ فاکنر کو پڑھنا اور سمجھنا دونوں محنت طلب کام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 1946ء میں فاکنر کی ایک بھی کتاب ناشروں سے دستیاب نہ ہوسکتی تھی۔ اگر فرانسیسی اول اول اس کا جوہر نہ پہچانتے اور بعدازاں اسے نوبل انعام نہ ملتا تو شاید آج بھی اس کی تصنیفات عام طور پر دستیاب نہ ہوتیں۔ اور ہیرمین میلول کی طرح وہ بھی گمنامی کی زندگی بسر کرتا، حالانکہ فاکنر ہیمنگوے سے کہیں زیادہ امریکی ہے اور اس کی اچھی تحریروں سے ریاست ہائے متحدہ کے جنوبی علاقے کی مٹی کی مہک صاف آتی ہے، لیکن اس کی مشکل پسندی اور اضطراب نے اسے مقبول نہ ہونے دیا۔

فاکنر کا تعلق ایک جنوبی ریاست سے تھا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شمال اور جنوب میں مزاج کا بہت فرق ہے۔ یہ فرق اتنا گہرا ہے کہ امریکی روح میں رخنہ بن گیا ہے۔ مشہور امریکی خانہ جنگی بھی شمال اور جنوب ہی کے درمیان ہوئی تھی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جنوب کے سفید فام لوگ حبشیوں کو اپنا غلام بنائے رکھنے پر بضد تھے اور شمال کے سفید فام لوگ انہیں آزاد کردینے کے حق میں تھے۔ خانہ جنگی میں بالآخر جنوب کو شکست ہوئی، لیکن میدان جنگ میں فتح یا شکست کسی ایسے معاشرتی مسئلے کا حل ثابت نہیں ہوا کرتی جس کی جڑیں باطن میں دور تک پھیلی ہوئی ہوں۔ جنوب میں حبشیوں کو بدستور تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا رہا اور اب بھی دیکھا جاتا ہے۔ فاکنر نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں دراصل یہ دکھایا ہے کہ خانہ جنگی ابھی ختم نہیں ہوئی، اسی شدومد سے جاری ہے، صرف پیکار کی سطحیں بدل گئی ہیں اور یہ کہ امریکی زمین پر حبشیوں کا وجود اور ان کے ساتھ بدسلوکیاں، جو مسیحی تعلیمات کے صریحاً منافی ہیں، پھانسوں کی طرح ہیں جو سفید فام باشندوں کے ضمیر میں کھٹکتی رہتی ہیں۔ اور شاید ضمیر تو نام ہی ایسی چیز کا ہے جس میں کچھ نہ کچھ پھانس کی طرح کھٹکتا رہے۔ (محمد سلیم الرحمٰن)

ولیم فاکنر 1897 میں نیو ایلبنی، مسی سپی، میں پیدا ہوا۔ 1902ء میں اس کے گھر والے آکسفورڈ آ گئے جہاں مسی سپی کی یونیورسٹی واقع تھی، اور فاکنر کے باپ، مرے سی، فاکنر (Falkner) نے لوہے تانبے کے برتنوں کی دوکان کھول رکھی تھی اور گھوڑے کرائے پر دیا کرتا تھا۔ بعدازاں وہ یونیورسٹی کا کاروباری منیجر بن گیا۔ (خاندانی نام (فاکنر) میں حرف ''U'' نہ تھا۔ یہ اضافہ فاکنر کی پہلی کتاب (THE MARBLE FAUN) کے طابع نے کیا) فاکنر کی ماں کا نام ماڈ بٹلر تھا۔ بچے کل چار تھے: ولیم، مرے، جون اور ڈین۔

ولیم فاکنر کا پردادا، ولیم سی فاکنر، 1825ء میں پیدا ہوا تھا۔ وہ شمالی مسی سپی میں کسی افسانوی ہستی کی طرح مشہور رہا۔ اس کی زندگی کی تفصیلات، جن میں سے متعدد اس کے پڑپوتے کی کتابوں میں نظر آتی ہیں، کچھ ایسی ہیں جیسے کسی ''پکار سک'' (PICARESQUE) ناول (ناول جس کا ہیرو کوئی عیار اور آوارہ شخص ہو۔ مترجم) کے واردات پڑھ رہے ہوں۔ دومرتبہ وہ قتل کے مقدموں میں ماخوذ ہوکر بری ہوا۔ خانہ جنگی کے دوران میں جب اس نے کرنل بن کر دھاوا ماروں کی ایک ٹولی کی قیادت کی تو بڑا جی دار سپاہی اور نظم وضبط کا سختی سے قائل ثابت ہوا۔ لڑکپن کے زمانے میں وہ غربت کا مارا، پیسے کمانے کے لیے کوشاں رہا کرتا تھا تاکہ بیوہ ماں کی مدد کرسکے لیکن مرنے سے پہلے ایک ریلوے لائن کا مالک اور ریاستی آئین ساز مجلس کا رکن بن چکا تھا۔ آئین ساز مجلس کے انتخاب میں اس نے جس آدمی کو شکست دی تھی وہ پہلے ریلوے لائن میں اس کا ساجھی تھا۔ انتخاب کے تھوڑے ہی عرصے بعد اسی ساجھی نے اسے ہلاک کر دیا۔ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا ریلوے لائن کے بالمقابل ولیم سی۔ فاکنر کا مجسمہ موجود ہے۔

ولیم سی۔ فاکنر کا بیٹا، اور ناولسٹ (فاکنر) کا دادا، جے ڈبلیو، ٹی فاکنر وکیل، بینکر اور سرکاری نائب اٹارنی تھا۔ اس نے ''(REDNECKS) کی شورش'' میں سرگرمی سے حصہ لیا (یہ ایک سیاسی تحریک تھی جس نے مزارعوں کو ووٹ ڈالنے کا پہلے سے زیادہ حق دلایا تھا) آکسفورڈ کے وہ رہنے والے، جو ابھی اسے بھولے نہیں، بتاتے ہیں کہ وہ چڑچڑے مزاج کا آگ بگولہ ہوجانے والا آدمی تھا۔ وہ بہرا تھا، اور اس کی آن بان میں تصنع تھا۔ (ولیم وان اکونر / محمد سلیم الرحمٰن)

روشنیوں میں اُفتادہ پایا' جب میں نے حافظے کے شکستہ آئینے کے اتنے منتشر ٹکڑوں کو باہم پیوست کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس فراموش قصبے کو مراجعت کی۔ پوری روشنی میں وہ بہ زحمت شکلوں کا اندازہ کرپاتی تھی' اور اپنی کنپٹیوں پر چند شفا بخش پتیاں اس دائمی سردرد کی وجہ سے رکھے ہوئے تھی جو اس کا بیٹا شب خوابی کے کمرے سے آخری بار گزرتے ہوئے اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اٹھنے کی کوشش میں جھولے کے سرے کی رسیاں اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے' وہ اپنی کروٹ پر تھی' اور آدھے سایوں میں بسے کے حوض کی وہی بو تھی جس نے جرم کی صبح مجھے چونکا دیا تھا۔

ابھی میں چوکھٹ پر نمودار بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے مجھے سانتیاگو نصر کی یاد سے خلط ملط کردیا۔ "وہ وہیں کھڑا تھا"' پلاسید الینیرو نے مجھے بتایا' "وہ سفید لنن کا لباس پہنے تھا جسے اس نے سادہ پانی میں دھویا تھا' کیوں کہ اس کی جلد اتنی حساس تھی کہ کلف کے شور کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی"۔ وہ جھولے میں دیر تک بیٹھی کاہو کے بیج چباتی رہی' یہاں تک کہ اس کا یہ اشتباہ کہ اس کا بیٹا لوٹ آیا ہے' رفع ہو گیا۔ پھر اس نے آہ بھری: "وہی میری زندگی کا سہارا تھا"۔

میں نے سانتیاگو نصر کو اس کی ماں کے حافظے میں دیکھا۔ گزشتہ جنوری کے آخری ہفتے میں وہ اکیس سال کا ہو گیا تھا' وہ چھریرا اور پریدہ رنگ تھا' اور اس کے عرب پپوٹے اور گھنگریالے بال اپنے باپ پر تھے۔ وہ ایک غرض مندی کی شادی کی' جس میں مسرت کا کوئی موقع نہیں آیا' اکلوتی اولاد تھا۔ مگر تین سال پہلے اپنے باپ کی اچانک موت تک' وہ اس کے ساتھ خوش نظر آتا تھا' اور اپنی تن تنہا ماں کے ساتھ ویسا ہی خوش نظر آنا جاری رکھے ہوئے تھا' یہاں تک کہ اس کی موت کا سوموار آ گیا۔ اس نے اپنی جبلت اپنی ماں سے پائی تھی۔ اپنے باپ سے اس نے بہت ابتدائی عمر میں آتشیں اسلحہ کا چابک دستی سے استعمال' گھوڑوں سے عشق' اور اونچے اڑنے والے شکاری پرندوں پر پوری مہارت حاصل کی تھی' مگر اس نے اپنے باپ سے دلیری اور تدبر کا ارفع ہنر بھی سیکھا تھا۔ وہ آپس میں عربی بولتے تھے' مگر پلاسید الینیرو کے سامنے نہیں' تاکہ وہ اپنے آپ کو جدا محسوس نہ کرے۔ دونوں باپ بیٹے قصبے میں کبھی ہتھیار بند نہیں نظر آئے' اور صرف ایک بار وہ اپنے تربیت کردہ پرندے ایک خصوصی بازار میں شکار کے مظاہرے کے لیے لائے تھے۔ اس کے باپ کی موت نے اسے اپنی تعلیم کو ثانوی اسکول کے خاتمے پر ترک کرنے پر مجبور کردیا تھا' تاکہ وہ موروثی پرورش گاہ کی ذمے داری اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر سنبھال سکے۔ اپنے اوصاف میں سانتیاگو نصر خوش و خرم' صلح جو اور کشادہ دل تھا۔

جس دن اسے قتل کیا جانے والا تھا' اس کی ماں نے اسے سفید کپڑوں میں دیکھ کر سوچا کہ وہ اپنے دنوں کے اندازے میں غلطی کر گیا ہے۔ "میں نے اسے یاد دلایا کہ آج سوموار ہے"' پلاسید الینیرو نے مجھے بتایا۔ مگر اس نے اپنی ماں سے وضاحت کی کہ وہ کلیسائی وضع میں اس لیے ملبوس ہے کہ شاید اسے بشپ کی انگشتری کا بوسہ لینے کا موقع مل جائے۔ اس کی ماں نے دلچسپی کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ "وہ تو کشتی سے اترے گا بھی نہیں"' اس نے کہا۔ "وہ لوگوں کو حسب دستور فرض برکتیں دے گا' اور جس راستے سے آیا ہے اس پر لوٹ جائے گا۔ اسے اس قصبے سے نفرت ہے"۔

سانتیاگو نصر جانتا تھا کہ یہ حقیقت ہے' مگر کلیسا کا جاہ و جلال اس کے لیے ایک ناقابل مزاحمت سحر تھا۔ "یہ فلموں کی طرح ہے"' اس نے مجھ سے ایک بار کہا تھا۔ بشپ کی آمد سے متعلق واحد شے جس سے اس کی ماں غرض رکھتی تھی' سانتیاگو نصر کا بارش میں بھیگنے سے بچنا تھا' کیوں کہ اس نے اسے سوتے میں چھینکتے ہوئے سنا تھا۔ اس نے اسے اپنے ساتھ ایک چھتری لے جانے کا مشورہ دیا' مگر وہ الوداع کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ یہ آخری موقع تھا جب اس کی ماں نے اسے دیکھا۔

وکتوریا گزمان' باورچن' غیر متذبذب تھی کہ اس دن' بلکہ فروری کے پورے مہینے میں بارش نہیں ہوئی تھی۔ "اس کے برخلاف' اس نے مجھے بتایا' جب میں اس کی موت سے تھوڑے عرصے پہلے اس سے ملنے گیا' "دھوپ سے ہر چیز اگست سے پہلے ہی تپنے لگی تھی"۔ وہ' ہانپتے ہوئے کتوں کے درمیان' دوپہر کے کھانے کے لیے خرگوشوں کے ٹکڑے کر رہی تھی جب سانتیاگو نصر باورچی خانے میں داخل ہوا۔ "وہ ہمیشہ ایک فاسد رات کے چہرے کے ساتھ اٹھتا تھا"' وکتوریا گزمان نے کسی تاثر کے بغیر یاد کیا۔ دیوینا فلور' اس کی لڑکی نے' جو بلوغت کو پہنچ رہی تھی' سانتیاگو نصر کو گنے کی شراب ملی کوہستانی کافی کا ایک مگ پیش کیا تاکہ وہ پچھلی رات کا بوجھ برداشت کر سکے۔ وسیع و عریض باورچی خانہ' آگ کی سرگوشیوں اور اپنے رین بسیروں میں سوئی ہوئی مرغیوں کے ساتھ' ایک پراسرار فضا رکھتا تھا۔ سانتیاگو نصر نے ایک اور

اسپرین نکلی اور خاموشی سے سوچتے ہوئے' اپنی نظریں ان دو عورتوں سے ہٹائے بغیر جو اسٹوو پر خرگوشوں کے شکم چاک کر رہی تھیں' چھوٹے چھوٹے گھونٹوں کے ساتھ کافی پینے بیٹھ گیا۔ اپنی عمر کے باوجود' وکٹوریا گزمان ابھی تک اچھی ساخت میں تھی۔ لڑکی ابھی ذرا شوریدہ سر' اپنے غدود کی سرگرمی سے مست نظر آتی تھی۔ سانتیاگو نصر نے اسے کلائی سے پکڑا جب وہ خالی مگ اس سے لینے آئی۔

"تمہارے بل نکلنے کا وقت آ رہا ہے" اس نے دیوینا فلور سے کہا۔ وکٹوریا گزمان نے اسے خون آلود چھری دکھائی۔

"اسے چھوڑ دو" اس نے سانتیاگو نصر کو سختی سے حکم دیا۔ "جب تک میں زندہ ہوں تم اس چشمے کی ایک بوند بھی نہیں چکھ سکو گے"۔

وہ ابراہیم نصر کے ہاتھوں اپنے عنفوان شباب میں گمراہ ہوئی تھی۔ اس نے اس کے ساتھ پرورش گاہ کے اصطبلوں میں کئی سال تک درپردہ اختلاط جاری رکھا تھا۔ جب مہرد محبت ختم ہوئی تو وہ وکٹوریا گزمان کو ایک گھریلو خادمہ بنانے کے لیے لے آیا۔ دیوینا فلور' جو کسی بعد کے مرد سے تھی' جانتی تھی کہ وہ سانتیاگو نصر کے دزدانہ بستر کے لیے مقدر ہے' اور یہ خیال اسے ایک پیش از وقت اذیت میں ڈال دیتا تھا۔ "اس جیسا آدمی پھر کبھی پیدا نہیں ہوا"۔ فربہ اور پژمردہ' دوسری یاریوں کے نتیجے میں پیدا ہوئے بچوں میں گھری ہوئی دیوینا فلور نے مجھے بتایا۔ "وہ بالکل اپنے باپ پر پڑا تھا" وکٹوریا گزمان نے اسے جواب دیا' "لعنتی"۔ مگر وہ سانتیاگو نصر کی اس وقت کی دہشت زدگی یاد کرتے ہوئے' جب اس نے خرگوش کی انتڑیوں کو جڑ سے نکال باہر کیا تھا اور ابلتی ہوئی اوجھڑی کتوں کے آگے پھینک دی تھی' خوف کی لہر سے نہیں بچ سکی۔

"جنگلی مت بنو" اس نے کہا تھا' "سمجھ لو کہ یہ ایک انسانی وجود تھا"۔ وکٹوریا گزمان کو تقریباً بیس سال یہ سمجھنے میں لگے کہ بے مدافعت جانوروں کو شکار کرنے کا عادی شخص بھی اچانک ایسی دہشت کا اظہار کر سکتا تھا۔ "میرے خدا" اس نے حیرت سے کہا' "یہ سب کچھ کیسا انکشاف تھا"۔ مگر اس کے باوجود' جرم کی صبح اس کے پاس اتنے ملتوی شدہ غصے جمع تھے کہ وہ سانتیاگو نصر کے ناشتے کو تلخ کرنے کے لیے کتوں کو دوسرے خرگوشوں کی انتڑیاں کھلاتی چلی گئی۔ وہ اسی عمل میں تھے جب تمام قصبہ اس دخانی کشتی کے' جس پر بشپ آ رہا تھا' زمین کو کپکپا دینے والے شور سے جاگ اٹھا۔

ان کا گھر ایک سابقہ گودام تھا جس میں دو منزلیں' تختوں کی دیواریں اور ٹین کی نوک دار چھت تھی جس پر گدھ بیٹھے گودی کے آخور کی نگہبانی کیا کرتے تھے۔ یہ ان دنوں میں تعمیر ہوا تھا جب دریا اتنا قابل استعمال تھا کہ بہت سے بجرے' بلکہ چند بڑے جہاز بھی دہانے کی دلدلوں سے سمندر تک اسی راستے سے جاتے تھے۔ ابراہیم نصر جس زمانے میں' خانہ جنگیوں کے خاتمے پر' آخری عربوں کے ساتھ آیا' دریا کی گزرگاہ بدل جانے کی وجہ سے جہاز آنے بند ہو گئے تھے اور گودام متروک ہو چکا تھا۔ ابراہیم نصر نے اسے ارزاں قیمت پر درآمدی اشیا ذخیرہ کرنے کے خیال سے خریدا تھا' مگر اس نے اس جگہ کا یہ استعمال کبھی نہیں کیا' جب وہ شادی کرنے جا رہا تھا' اس نے اسے رہنے کے لیے ایک مکان میں تبدیل کر دیا۔ زمینی منزل پر اس نے ایک بڑا کمرہ بنایا جو ہر طرح کے کام کے لیے تھا اور عقب میں چاروں جانوروں کا اصطبل' نوکروں کی کوٹھریاں اور ایک دہقانی باورچی خانہ بنایا جس کی گودی کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں سے پانی کی سڑاند ہر وقت آتی رہتی تھی۔ واحد شے جو اس نے کمرے میں صحیح و سالم چھوڑی تھی' کسی تباہ شدہ جہاز سے بازیاب ہوا چکردار سیڑھیوں کا زینہ تھا۔ اوپر کی منزل پر' جہاں پہلے کسٹم کے دفاتر تھے' اس نے شب خوابی کے دو بڑے کمرے' اور ایک چوبی بالکنی بنائی جو چوک میں بادام کے درختوں پر کھلتی تھی' اور جہاں پلاسید الینیرو مارچ کی سہ پہروں میں اپنے آپ کو تنہائیوں پر دلاسا دینے کے لیے بیٹھے رہنے والی تھی۔ صدر دروازہ اس نے سامنے کی طرف رکھا تھا اور خراد کی ہوئی سلاخوں والی دو آدم قد کھڑکیاں بنائی تھیں۔ اس نے گھوڑے کے نکلنے کے قابل' ذرا اونچائی کے ساتھ' ایک عقبی دروازہ بھی بنایا تھا' اور گودی کے پرانے پل کا ایک حصہ بھی زیر استعمال رکھا تھا۔ عقبی دروازہ شروع ہی سے زیادہ مستعمل تھا' نہ صرف اس بنا پر کہ یہ جانوروں کی ناندوں اور باورچی خانے کے لیے قدرتی داخلہ تھا' بلکہ اس لیے بھی کہ یہ چوک کا چکر لگائے بغیر گودی کو جانے والی سڑک پر کھلتا تھا۔ سامنے کا دروازہ' تقریبات کے سوا' بند اور آنکل چڑھا رہتا تھا تاہم کسی اور دروازے کے بجائے' جو لوگ اسے قتل کرنے جا رہے تھے' اسی پر سانتیاگو نصر کا انتظار کر رہے تھے' اور وہیں سے سانتیاگو نصر بشپ کا خیر مقدم کرنے باہر نکلا' حالانکہ اس طرح اسے گودی تک پہنچنے کے لیے گھر کے گرد پورا چکر لگانا

پڑا تھا۔

کوئی بھی اس مہلک اتفاق کو نہیں سمجھ سکا۔ تفتیشی جج نے، جو ریوہاچا سے آیا تھا، تسلیم کرنے کی جرات کیے بغیر اسے ضرور محسوس کیا ہوگا، کیوں کہ اس کی معقول وضاحت پیش کرنے میں اس کی دلچسپی رپورٹ سے عیاں تھی۔ چوک کی طرف کھلنے والے دروازے کا، چونی والے ناولوں کے سے "خونی دروازے" کے نام سے، کئی بار تذکرہ آیا۔ اصل میں صرف پلاسید الینیرو کی تشریح قابل قبول معلوم ہوتی تھی، جس نے اس سوال کا مادرانہ حکمت سے جواب دیا تھا "میرا بیٹا جب اچھا لباس پہنے ہوتا، کبھی عقبی دروازہ استعمال نہیں کرتا تھا" یہ ایک ایسی سامنے کی بات محسوس ہوئی کہ تفتیش کرنے والے نے اسے حاشیے کے طور پر درج کیا اور رپورٹ میں شامل نہیں کیا۔

وکتوریا گزمان، اپنے طور پر، جواب میں قطعی تھی کہ نہ وہ اور نہ اس کی بیٹی یہ جانتی تھی کہ وہ سانتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں، مگر اپنی عمر کے ایک دور میں اس نے اعتراف کیا کہ جس وقت سانتیاگو نصر باورچی خانے میں کافی پینے آیا تھا، وہ دونوں اس بات سے واقف ہو چکی تھیں۔ یہ اطلاع انھیں ایک عورت سے ملی تھی جو پانچ بجے تھوڑا سا دودھ مانگنے آئی، اس نے اس کے ساتھ ساتھ قتل کا سبب، اور وہ جگہ بھی، جہاں وہ انتظار کر رہے تھے، بتادی تھی۔ "میں نے اسے خبردار نہیں کیا، کیوں کہ میں سمجھی کہ یہ بدمستوں کی باتیں ہیں" اس نے مجھے بتایا۔ تاہم دیوینا فلور نے ایک بعد کی ملاقات میں، جب اس کی ماں کو گزرے ہوئے مدت ہو چکی تھی، مجھ سے اعتراف کیا کہ وکتوریا گزمان نے سانتیاگو نصر کو اس لیے کچھ نہیں بتایا تھا کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ چاہتی تھی کہ وہ قتل کر دیا جائے۔ اور خود اس نے سانتیاگو نصر کو اس لیے متنبہ نہیں کیا کہ اس وقت، وہ خود مختارانہ فیصلہ کرنے کی اہلیت سے عاری، ایک سہمی ہوئی بچی سے زیادہ نہیں تھی، اور سب سے بڑھ کر، اس پر خوف غالب آگیا جب سانتیاگو نصر نے اس کی کلائی ایک ایسے یخ اور سنگلاخ ہاتھ سے پکڑی جو اسے کسی مرے ہوئے آدمی کا ہاتھ محسوس ہوا تھا۔

سانتیاگو نصر سایہ دار گھر سے، بشپ کی کشتی سے اٹھتے ہوئے شادمانی کے شور میں تیز قدم نکلا۔ دیوینا فلور، اس کوشش میں کہ کہیں وہ کھانے کے کمرے میں خوابیدہ پرندوں کے پنجروں کے درمیان، یا نشست کرنے کے کمرے میں بید کے فرنیچر اور فرن کے آویزاں گملوں تک، اس سے پہلے نہ پہنچ جائے، اس سے آگے بھاگی، مگر آنگل اتارتے ہوئے اس بار وہ سفاک شکرے کے پنجے سے نہیں بچ سکی۔ "اس نے میری سموچی فرج دبوچ لی تھی" دیوینا فلور نے مجھے بتایا۔ "جب وہ مجھے گھر کے کسی کونے میں پکڑ لیتا، ہمیشہ یہی کیا کرتا تھا، مگر اس دن میں نے غیر معمولی حیرت نہیں بلکہ رو پڑنے کی ایک شدید طلب محسوس کی"۔ وہ ہٹ گئی تاکہ سانتیاگو نصر باہر نکل جائے، نیم وا دروازے سے اس نے صبح کی برف سی روشنی میں چوک کے بادام کے درختوں کو دیکھا، مگر اس میں کسی اور چیز کو دیکھنے کی جرات نہیں تھی۔ "پھر کشتی نے ترم ترم کرنا بند کر دیا اور مرغوں نے بانگیں دینی شروع کیں" دیوینا فلور نے مجھے بتایا۔ "ہنگامہ اتنا تھا کہ مجھے یقین کرنا مشکل تھا کہ قصبے میں اتنے مرغے ہو سکتے ہیں، اور میں نے سمجھا کہ وہ بشپ کی کشتی پر آ رہے ہیں"۔ اس آدمی کے لیے جو کبھی اس کا نہیں تھا، وہ صرف اتنا کر سکتی تھی کہ دروازہ پلاسید الینیرو کے احکام کے خلاف، اس کی ہنگامی واپسی کے لیے آنگل چڑھائے بغیر رہنے دیتی۔ کسی نے، جس کی کبھی شناخت نہیں ہو سکی، ایک لفافہ دروازے کے اندر ڈال دیا تھا، جس میں کاغذ کے ایک پرزے پر سانتیاگو نصر کو خبردار کیا گیا تھا کہ وہ اسے قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں، اور اس تحریر میں مقام، محرک اور منصوبے کی دیگر تفصیلوں کا بے کم و کاست انکشاف تھا۔ پیغام فرش پر تھا جب سانتیاگو نصر اپنے گھر سے نکلا، مگر اس پر اس کی نظر نہیں پڑی۔ دیوینا فلور، یا اور کسی نے بھی، اسے بہت بعد میں دیکھا، جب جرم پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

چھ بجے تھے اور سڑک پر بتیاں ابھی تک جل رہی تھیں۔ بادام کے درختوں کی شاخوں اور چند بالکونیوں میں عروسی آرائشیں ہنوز آویزاں تھیں اور یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ وہ بشپ کے اعزاز میں لگائی گئی ہیں، اور بیرونی زینوں تک، جہاں بینڈ اسٹینڈ تھا، سنگ فرش کیا ہوا چوک خالی بوتلوں اور عوامی جشن کے ہر نوع کے ملبے کی وجہ سے بے ترتیبی کا انبار نظر آ رہا تھا۔ جب سانتیاگو نصر گھر سے نکلا، کئی آدمی کشتی کے شور سے سرعت پذیر ہو کر گودی کی طرف بھاگ رہے تھے۔

صرف اس مقام پر، جہاں چوک میں کلیسا کی ایک طرف دودھ کی دکان تھی، دو آدمی تھے جو سانتیاگو نصر کا اسے قتل کرنے کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ کلوتیلدے آرمنتا، دکان

کی مالکہ، طلوع آفتاب کی تمتماہٹ میں اسے دیکھنے والی پہلی ہستی تھی، اور اس کو یہ خیال سا آیا کہ سانتیاگو نصر المونیم کے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ "وہ قتل ہونے سے پہلے ہی کسی روح کی طرح نظر آ رہا تھا" کلوتیلدے آرمنتا نے مجھے بتایا۔ وہ لوگ جو اسے قتل کرنے جا رہے تھے، اخبار میں لپٹے ہوئے چھروں کو اپنے سینے سے جکڑے، بنچوں پر سوئے ہوئے تھے اور کلوتیلدے آرمنتا ان کی نیند ٹوٹ جانے کے خوف سے اپنی سانس روکے ہوئی تھی۔

وہ دونوں جڑواں تھے، پیدرو اور پابلو ویکاریو۔ وہ چوبیس سال کے تھے، اور اس حد تک مماثل کہ انہیں الگ الگ شناخت کرنا دشوار تھا۔ "ان کے چہرے کے نقوش تیکھے مگر خوشگوار تھے" رپورٹ میں لکھا تھا۔ میں نے بھی، جو انہیں گرامر اسکول سے جانتا تھا، یہی لکھا ہوتا۔ وہ اس وقت بھی رات کی عروسی تقریب کے سیاہ سوٹوں میں تھے جو کریبیئن کے لیے بہت بوجھل اور پر تکلف تھے، اور وہ عیش و عشرت کی اتنی ساعتوں کے بعد، فرض سمجھ کر شیو بنا لینے پر بھی، تباہ حال لگ رہے تھے۔ اگرچہ انہوں نے شادی کی شام سے شراب نوشی جاری رکھی تھی، تیسرے دن کے اختتام پر وہ نشے میں نہیں تھے، بلکہ کسی حد تک اجڑی ہوئی نیند کے ساتھ خواب میں چلتے نظر آ رہے تھے۔ کلوتیلدے آرمنتا کی دکان پر تین گھنٹے کے انتظار کے بعد، وہ صبح کی باد اولیں کے ساتھ سو گئے، اور یہ پہلی نیند تھی جو جمعے کے دن سے انہیں نصیب ہوئی۔ کشتی کی پہلی آواز پر وہ بہ مشکل جاگے تھے، مگر جب سانتیاگو نصر اپنے گھر سے نکلا، وجدان نے انہیں مکمل بیدار کر دیا۔ اس وقت ان دونوں نے مڑے ہوئے اخبار کو سنبھالا، اور پیدرو ویکاریو کھڑا ہونے لگا۔

"خدا کے لیے" کلوتیلدے آرمنتا نے بہت آہستہ سے کہا "اسے کسی اور وقت پر چھوڑ دو، حضور بشپ کے احترام ہی میں سہی"۔

"یہ روح القدس کا ایک نفس تھا" وہ اکثر دہرایا کرتی۔ بے شک یہ ایک امر ربانی تھا، مگر اس کی تاثیر صرف لمحاتی تھی۔

اس کی آہٹ سنتے ہی ویکاریو بھائیوں نے رد عمل کیا، اور وہ جو کھڑا ہو چکا تھا، پھر سے بیٹھ گیا۔ دونوں نے سانتیاگو نصر کا، جب وہ چوک کو طے کر رہا تھا، اپنی نگاہوں سے تعاقب کیا۔ "انہوں نے اسے تاسف سے زیادہ دیکھا" کلوتیلدے آرمنتا نے کہا۔ راہباؤں کے اسکول کی لڑکیوں نے اپنی

تیموں کی وردی میں چوک کو اسی لمحے بے نظمی سے آہستہ دوڑ کر پار کیا۔

پلاسیدا الینیرو کی بات درست تھی، بشپ کشتی سے نہیں اترا۔ گودی پر حکام اور اسکول کے بچوں کے علاوہ بہت سے لوگ اور تھے، ہر طرف خوب پھولے ہوئے مرغوں کے ٹوکرے نظر آ رہے تھے جو بشپ کے لیے تحفے کے طور پر لائے گئے تھے، کیوں کہ مرغ کی کلغیوں کا سوپ اس کی مرغوب خوراک تھی۔ بار کرنے کے پل پر اتنی سوختنی لکڑیاں جمع تھیں کہ کشتی میں انہیں بھرنے کے لیے کم از کم دو گھنٹے درکار ہوتے۔ مگر وہ رکی نہیں۔ وہ دریا کے موڑ پر ایک اژدہے کی طرح نتھنے پھلاتی نمودار ہوئی، موسیقاروں کے بینڈ نے بشپ کا ترانہ شروع کیا اور مرغوں نے اپنی ٹوکریوں میں بانگیں دے دے کر قصبے کے دوسرے سارے مرغوں کو برانگیختہ کر دیا۔

ان دنوں افسانہ آمیز پیڈل وہیلر، جو لکڑیوں کے جلنے سے چلتی تھیں، معدوم ہونے کے قریب تھیں، اور جو خدمت میں باقی رہ گئی تھیں، ان میں خود نواز پیانو یا عروسی خاص کمرے نہیں تھے اور وہ بہ مشکل بہاؤ کے خلاف سفر کی اہل تھیں۔ مگر یہ کشتی نئی تھی اور اس میں ایک کے بجائے دو چمنیاں تھیں جن پر آرم بینڈوں کی طرح پرچم رنگے گئے تھے، اور پشت پر تختوں سے بنے ہوئے پہیے نے اسے ایک بحری جہاز کی سی کارکردگی عطا کر دی تھی۔ بالائی عرشے پر، کپتان کے کیبن سے متصل، بشپ اپنی سفید عبا اور اپنے اسپانوی خدم و حشم کے ساتھ موجود تھا۔ "یہ کرسمس کا زمانہ تھا" میری بہن مارگوت نے کہا۔ اس کے بقول ہوا یہ کہ گودی سے گزرتے ہوئے، کشتی کی سیٹی نے دبی ہوئی بھاپ کی ایک بوچھاڑ ماری اور جو لوگ کنارے کے قریب تھے، انہیں شرابور کر دیا۔ یہ ایک بے ثبات فریب نظر تھا۔ بشپ نے گودی کے پل پر جمع ہجوم کے مقابل، ہوا میں صلیب کا نشان بنانا شروع کیا اور اس کے بعد کسی خیر و شر کے بغیر کٹھ پتلی کی طرح ایسا کرتا چلا گیا، یہاں تک کہ کشتی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، اور جو کچھ بچ رہا، وہ مرغوں کا شور تھا۔

سانتیاگو نصر کے لیے خود کو فریب خوردہ محسوس کرنے کی معقول وجہ تھی۔ اس نے فادر کارمین آمادور کی صلائے عام پر لکڑیوں کے کئی گٹھڑ نذر کیے تھے، اور اس کے علاوہ اس نے خود نہایت اشتہا انگیز کلغیوں والے فربہ آختہ مرغوں کا انتخاب کیا تھا۔ میری بہن مارگوت کو، جو گودی کے پل پر

سانتیاگو نصر کے ساتھ تھی' وہ جشن کو جاری رکھنے کی خواہش کے ساتھ خوش نظر آیا تھا' ہرچند کہ دراصل اسپرین نے اسے تسکین نہیں دی تھی۔ "وہ پژمردہ نہیں نظر آرہا تھا' اور صرف یہ سوچ رہا تھا کہ شادی کی تقریب پر کیا خرچ ہوا ہوگا" اس نے مجھے بتایا۔ کرستو بیدیا نے' جو ان کے ساتھ تھا' ایسی رقموں کا انکشاف کیا جن سے اس کی حیرت اور بڑھ گئی۔ وہ میرے اور سانتیاگو نصر کے ساتھ چار بجے سے ذرا پہلے تک کھل کر شراب پیتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ شب بسری کے لیے اپنے والدین کے پاس نہیں گیا' بلکہ اس نے اپنے دادا کے ہاں محفل جمائی۔ وہاں اسے ان اعداد کا سراغ ملا جو تقریب کے اخراجات کا اندازہ لگانے کے لیے درکار تھے۔ اس نے شمار کیا کہ مہمانوں کے لیے چالیس ترکی مرغیاں اور گیارہ خصی سور ذبح کیے گئے تھے' اور چار بچھڑے بھی' جو نوشے نے عوامی چوک پر لوگوں کی تواضع میں بھونے جانے کے لیے مخصوص کیے تھے۔ اس نے شمار کیا کہ غیر قانونی طور پر درآمد کردہ الکوحل کے ۲۰۵ صندوق خالی ہوئے تھے اور گنے کی شراب کی تقریباً دو ہزار بوتلیں ہجوم میں بانٹی گئی تھیں۔ امیر و غریب' ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس نے کسی نہ کسی طرح اس بے نظیر پررونق ضیافت میں شرکت نہ کی ہو۔ سانتیاگو نصر بہ آواز بلند خواب دیکھنے لگا۔

"میری بھی شادی اسی طرح ہوگی" اس نے کہا۔ "لوگوں کی زندگیاں اسے بیان کرنے میں ناکافی پڑ جائیں گی"۔

میری بہن نے فرشتے کو پاس سے گزرتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے ایک بار پھر فلورا میگل کی خوش نصیبی کے بارے میں سوچا' جسے زندگی میں اتنا کچھ حاصل تھا اور جو سانتیاگو نصر کو بھی اس سال کرسمس میں حاصل کرنے جارہی تھی۔ "مجھے اچانک خیال آیا کہ اس سے بہتر شکار نہیں مل سکتا تھا" اس نے مجھے بتایا۔ "ذرا سوچو' خوش شکل' وعدہ وفا اور اکیس سال کی عمر میں ذاتی جائیداد کا مالک"۔ جب ہمارے یہاں کساوا کے کلوچے بنے ہوتے' وہ اسے ہمارے گھر پر ناشتے کے لیے بلایا کرتی تھی' اور اس صبح میری ماں وہی تیار کر رہی تھی۔ سانتیاگو نصر نے اشتیاق کے ساتھ اس کی دعوت قبول کی۔

"میں کپڑے بدل کر تمہارے ہاں آتا ہوں" اس نے کہا' اور پھر اسے خیال آیا کہ وہ اپنی گھڑی نائٹ ٹیبل پر چھوڑ آیا ہے۔ "کیا وقت ہوا ہوگا؟"

اس وقت چھ بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔ سانتیاگو نصر نے کرستو بیدیا کو بازو سے پکڑا اور چوک کی طرف لے جانے لگا۔

"میں پندرہ منٹ کے اندر تمہارے گھر پر ہوں گا" اس نے میری بہن سے کہا۔

میری بہن نے ضد کی کہ وہ اسی وقت ساتھ چلے' کیوں کہ ناشتا تیار ہوچکا تھا۔ "یہ عجیب اصرار تھا" کرستو بیدیا نے مجھے بتایا۔ "یہاں تک کہ بعد میں کئی بار مجھے گمان ہوا کہ مارگوت جانتی تھی کہ وہ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں' اور وہ اسے تمہارے گھر میں چھپالینا چاہتی تھی"۔ سانتیاگو نصر نے بہرحال اسے رضامند کرلیا۔ وہ اتنی دیر میں ڈیوائن فیس پر بچھڑوں کو خصی کرنے کے لیے جانے کو گھڑسواری کا لباس پہننا چاہتا تھا۔ اس نے میری بہن سے اسی موج میں اجازت لی جس میں اس نے اپنی ماں کو الوداع کہا تھا' اور کرستو بیدیا کے ہم دوش چوک کی طرف بڑھ گیا۔ یہ آخری موقع تھا کہ میری بہن نے اس کو دیکھا۔

گودی میں کئی لوگ جانتے تھے کہ سانتیاگو نصر کو قتل کیا جانے والا ہے۔ دون لزارو آپونتے نے' جو اکادمی کرنل کی حیثیت سے سبک دوشی کا لطف اٹھانے کے ساتھ ساتھ گیارہ سال سے قصبے کا میئر بھی تھا' اسے ہاتھ لہرا کر خوش آمدید کہا۔ "میں نے واقعی یقین کرلیا تھا کہ اب وہ کسی خطرے کی زد میں نہیں ہے" اس نے مجھے بتایا۔ فادر کارمین امادور بھی پریشان نہیں تھا۔ "جب میں نے اسے بہ حفاظت دیکھا' میں نے سمجھا کہ سب کچھ ایک بے ضرر افواہ تھی" اس نے مجھے بتایا۔ کسی نے بھی یہ نہیں پوچھا کہ کیا سانتیاگو نصر کو متنبہ کردیا گیا ہے' کیوں کہ یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ اسے خبر نہ پہنچائی گئی ہو۔

میری بہن مارگوت' سچ مچ ان چند لوگوں میں سے تھی جو اس وقت تک نہیں جانتے تھے کہ وہ اسے قتل کرنے جارہے ہیں۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا' میں اسے گھر لے جاتی' چاہے مجھے اس کو سور کی طرح باندھ کر لے جانا پڑتا" اس نے تفتیشی افسر کو بیان دیا۔ یہ حیرت کی بات تھی کہ اسے معلوم نہیں تھا' مگر اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر تھا کہ میری ماں بھی نہیں جانتی تھی جو ہر بات کو گھر کے کسی اور فرد سے پہلے جان جاتی تھی' اس کے باوجود کہ اسے کلیسا کے اجتماع کے لیے بھی گھر سے باہر نکلے برسوں گزر چکے تھے۔ میں اس کی اس صلاحیت سے اس وقت آگاہ ہوا تھا جب میں نے اسکول

جانے کے لیے جلد اٹھنا شروع کیا۔ صبح کی خاکستری روشنی میں' زرد اور پر اسرار' جیسی کہ وہ ان دنوں ہوا کرتی تھی' صحن کو ایک خانہ ساز جھاڑو سے صاف کرتے ہوئے' اور کافی کے گھونٹوں کے درمیان وہ ہمیں بتانا شروع کرتی کہ دنیا میں کیا ہوا جب ہم سو رہے تھے۔ وہ قصبے کے اندر لوگوں' خاص طور پر اپنے ہم عمروں سے خبر رسانی کے خفیہ سلسلے بنائے ہوئے معلوم ہوتی تھی' اور کبھی کبھی وہ ہمیں ان واقعوں کی اطلاع سے حیرت زدہ کر دیتی جو اس وقت تک پیش نہیں آئے تھے اور جنہیں وہ صرف اپنی غیب دانی کی استطاعت ہی سے جان سکتی تھی۔ اس صبح مگر اس نے اس سانحے کی دھڑکن نہیں سنی جو رات کو تین بجے سے پرورش پا رہا تھا۔ اس نے صحن میں جھاڑو دینا ختم کیا تھا' اور جب میری بہن مارگوت بشپ کا استقبال کرنے باہر نکلی' اس نے اسے کساوا پیستے ہوئے دیکھا۔ "مرغوں کی بانگیں سنی جا سکتی تھیں" میری ماں اس دن کو یاد کرتے ہوئے کہنے کی عادی ہے۔ اس نے کبھی دور سے آتی ہوئی ان آوازوں کو بشپ کی آمد سے منسوب نہیں کیا' وہ انہیں شادی کے جشن کی باقیات سمجھتی رہی۔

ہمارا گھر خاص چوک سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے آموں کے باغ میں تھا۔ میری بہن مارگوت گودی تک دریا کے کنارے کنارے چلتی ہوئی گئی تھی' اور لوگ بشپ کی آمد پر اتنے پرجوش تھے کہ وہ کسی اور بات پر توجہ نہیں دے سکے۔ انہوں نے بیماروں کو خدا سے شفا حاصل کرنے کے لیے محرابی دروازوں میں کھڑا کیا تھا' اور عورتیں اپنے آنگنوں سے ترکی مرغ اور شیر خوار سور اور ہر طرح کی خوردنی اشیا لیے دوڑی چلی آ رہی تھیں' اور دوسرے کنارے سے پھولوں سے سجے ڈونگے پہنچ رہے تھے۔ مگر جب بشپ زمین پر قدم رکھے بغیر چلا گیا' دوسری دبی ہوئی خبر سنسنی خیزی کے درجہ کمال کو پہنچ گئی۔ تب میری بہن مارگوت نے اس کے بارے میں مفصل اور سفاک انداز میں جانا۔ انجلا ویکاریو' وہ خوش شکل لڑکی جو ایک دن پہلے بیاہی گئی تھی' اپنے والدین کے گھر لوٹا دی گئی تھی' کیوں کہ اس کے شوہر نے دریافت کیا تھا کہ وہ کنواری نہیں ہے۔ "مجھے ایسا لگا کہ میں مرنے والی ہوں" میری بہن نے کہا۔ مگر جو بھی ہو' انہوں نے اس داستان کو جتنا الٹا پلٹا' کوئی مجھے یہ نہیں بتا سکا کہ غریب سانتیاگو نصر کس طرح اس بکھیڑے میں پڑ کر اپنی جان سے گیا۔ صرف ایک بات جو سب قطعی طور پر جانتے تھے' یہ تھی کہ انجلا ویکاریو کے بھائی اسے قتل کرنے کے لیے انتظار کر رہے ہیں۔

میری بہن اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتی ہوئی گھر واپس آئی۔ اس نے میری ماں کو اتوار کے نیلے پھولوں والے کرتے میں' کہ کہیں بشپ ہم سے ملنے آ ہی جائے' ملبوس دیکھا' وہ میز لگاتے ہوئے غیر مرئی محبت کے بارے میں ایک فادو گا رہی تھی۔ میری بہن نے غور کیا کہ معمول سے ایک پلیٹ زیادہ ہے۔

"یہ سانتیاگو نصر کے لیے ہے" میری ماں نے کہا۔ "انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم نے اسے ناشتے پر بلایا ہے"۔

"اسے ہٹالیں" میری بہن نے کہا۔

پھر اس نے میری ماں کو بتایا۔ "مگر ایسا لگتا تھا کہ اسے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے" اس نے مجھے بتایا۔ "یہ ہمیشہ کی طرح تھا۔ آپ اسے کچھ بتانا شروع کریں اور اس سے پہلے کہ کہانی آدھی بھی ہو' وہ جان جائے گی کہ آخر میں کیا ہوا؟"

وہ بری خبر میری ماں کے لیے ایک مسئلہ بن گئی۔ بپتسمہ دیتے وقت سانتیاگو نصر کا نام اس کے نام پر رکھا گیا تھا اور وہ اس کی دینی ماں تھی' مگر وہ پیورا ویکاریو' واپس کی گئی دلہن کی ماں' کی بھی قرابت دار تھی۔ اس کے باوجود' خبر سنتے ہی میری ماں نے اونچی ایڑی کے جوتے پہنے اور کلیسائی شال اوڑھی جو وہ صرف عزاداری کے لیے نکلتے وقت اوڑھتی تھی۔ میرا باپ' جس نے بستر سے ہر بات سن لی تھی' شب خوابی کے لباس میں نمودار ہوا اور متوحش ہو کر پوچھنے لگا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔

"اپنی عزیز دوست پلاسیدا کو اطلاع دینے" اس نے جواب دیا۔ "یہ نامناسب ہے کہ ہر آدمی جان لے کہ وہ اس کے بیٹے کو قتل کرنے جا رہے ہیں' اور ماں ہو کہ اسے معلوم ہی نہ ہو"۔

"ہمارے ویکاریو سے بھی برابر کے تعلقات ہیں" میرے باپ نے کہا۔

"آدمی کو ہمیشہ مرنے والوں کا ساتھ دینا چاہیے" اس نے کہا۔

میرے چھوٹے بھائی شب خوابی کے دوسرے کمروں سے نکل کر آنے لگے۔ سب سے چھوٹے نے المیے کی فضا سے متاثر ہو کر رونا شروع کر دیا۔ میری ماں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ زندگی میں ایک بار اس نے اپنے شوہر کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی۔

"ایک منٹ رکو' میں کپڑے بدل لوں" میرے باپ

نے کہا۔

وہ سڑک پر نکل آئی، صرف میرا بھائی جیمے، جو اس وقت سات برس سے زیادہ کا نہیں ہوگا، اسکول جانے کے لیے کپڑے بدل چکا تھا۔

"تم اس کے ساتھ جاؤ" میرے باپ نے حکم دیا۔

جیمے اس کے پیچھے بھاگا، یہ جانے بغیر کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور وہ کہاں جا رہی ہے، اور ماں کا ہاتھ تھام لیا۔ "وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی جا رہی تھی" جیمے نے مجھے بتایا۔ "بدمعاش"۔ وہ زیرلب کہہ رہی تھی، "یہ گندے جانور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس میں کچھ نہ کچھ شرارت نہ ہو"۔ اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ بچے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے۔ "انہوں نے ضرور سوچا ہوگا کہ میں پاگل ہو گئی ہوں"۔ اس نے مجھے بتایا۔ "ایک ہی بات یاد ہے کہ دور سے بہت سے لوگوں کی آوازیں آرہی تھیں، جیسے شادی کی تقریب پھر سے شروع ہو گئی ہو، اور ہر کوئی چوک کی طرف دوڑا جا رہا تھا"۔ اس نے اپنے قدم تیز کر دیئے، ایک عزم کے ساتھ جس کی، جب کسی کی زندگی خطرے میں ہو، وہ اہل تھی، یہاں تک مخالف سمت سے آتے ہوئے کسی آدمی نے اس کی دیوانگی پر ترس کھایا۔

"زحمت مت کرو، لوئیزا سانتیاگا" وہ گزرتے ہوئے چلایا۔ "انہوں نے اسے قتل کر دیا ہے"۔

☆☆☆

بیاردو سان رومان، وہ آدمی جس نے دلہن لوٹائی، پہلی بار گذشتہ اگست میں، شادی سے چھ مہینے پہلے یہاں آیا تھا۔ وہ ہفتہ وار کشتی پر چاندی سے جڑی چند خورجینیں لیے ہوئے اترا جو اس کی بیلٹ کے بکسوؤں اور اس کے جوتے کے چھلوں سے میل کھا رہی تھیں۔ وہ تقریباً تیس برس کا تھا، مگر اس کی نوآموز بل فائٹر کی سی کمر، سنہری آنکھوں، اور قلمی شورے سے رفتہ رفتہ جلی ہوئی جلد نے اس کی عمر کو خوش اسلوبی سے چھپا رکھا تھا۔ وہ ایک چھوٹی جیکٹ اور بہت تنگ پتلون پہنے ہوئے آیا، دونوں بچھڑے کی کھال کے نرم چمڑے سے بنے تھے اور اس نے اسی رنگ کی مینمے کی کھال کا دستانہ پہن رکھا تھا۔ ماگدالینا اولیوز، جو کشتی میں اس کے ساتھ تھی، سارے سفر میں اس پر سے نگاہیں نہیں ہٹا سکی۔ "وہ ایک پری زاد کی طرح نظر آرہا تھا" اس نے مجھے بتایا "اور اس پر افسوس کیا جانا چاہیے، کیوں کہ میں مکھن لگا سے چٹ کر سکتی تھی"۔ اکیلی وہ ایسا سوچنے والی نہیں تھی، نہ یہ محسوس کرنے میں سب سے پیچھے کہ بیاردو سان رومان پہلی نظر پر کھل جانے والا آدمی نہیں ہے۔

میری ماں نے مجھے اسکول میں اگست کے اختتام کے قریب ایک خط بھیجا اور بلامقصد انداز میں لکھا: "ایک بہت عجیب آدمی یہاں آیا ہوا ہے"۔ اس کے بعد کے خط میں اس نے مجھے لکھا: "اس عجیب آدمی کا نام بیاردو سان رومان ہے اور ہر شخص کہتا ہے کہ وہ پرکشش ہے مگر میں نے اسے خود ابھی نہیں دیکھا ہے"۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔ کچھ لوگوں کو، جو پوچھنے کی ترغیب سے خود کو نہیں روک سکے تھے، جواب ملا: "میں کسی کی تلاش میں، جس سے شادی کر سکوں، شہر در شہر گھوم رہا ہوں"۔ یہ درست بھی ہو سکتا تھا، مگر وہ کسی اور سوال کا جواب بھی اسی انداز میں دے سکتا تھا، کیوں کہ اس کا طرز گفتگو انکشاف کی نسبت اخفا میں زیادہ معاون تھا۔

جس رات وہ آیا، اس نے لوگوں کو یہ باور کرایا کہ وہ ریل کی پٹڑیوں کا انجینئر ہے۔ اس نے اندرونی علاقوں میں ریل کی پٹڑی بچھانے کی سخت اہمیت کے بارے میں بتایا جس کے بعد ہم لوگ دریا کے آئے دن متغیر ہونے والے راستوں سے بے نیاز ہو جاتے۔ اس کے بعد والے دن اسے ایک ٹیلی گرام بھیجنا تھا، اور اس نے اسے بیرم پر خود روانہ کیا، اور اس کے ساتھ ہی اس نے ٹیلی گراف کے کارندے کو اپنا نسخہ بتایا، جس کی مدد سے وہ خستہ بیڑیوں کا استعمال جاری رکھ سکتا تھا۔ اسی دن اس نے کسی سرحدی بیماری کا ملٹری ڈاکٹر سے ذکر کیا جو جبری بھرتی کے تحت ان مہینوں میں وہاں آیا ہوا تھا۔ اسے پرشور اور دیر تک جاری رکھنے والی خوش وقتیاں پسند تھیں، مگر وہ بہترین بلانوش، تنازعوں کا ثالث اور بےتے بازوں کا دشمن تھا۔ ایک اتوار، عبادت کے بعد اس نے سب مشاق پیراکوں کو، جو بہت سے تھے، مقابلے کی دعوت دی، اور اول ترین کو دریا کے پار جانے اور لوٹنے میں بیس ہاتھ پیچھے چھوڑ دیا۔ میری ماں نے اس کے متعلق مجھے ایک خط میں بتایا، اور آخر میں اس نے ایک تبصرہ کیا جو اسی کا حق تھا: "یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سونے میں تیر رہا ہے"۔ یہ اس قبل از وقت روایت کے جواب میں تھا کہ بیاردو سان رومان نہ صرف ہر کام باکمال طریقے سے کرنے کا اہل ہے، بلکہ اس کی رسائی کبھی نہ ختم ہونے والے خزانوں تک ہے۔

میری ماں کی طرف سے اس کے حق میں آخری حرف خیر اکتوبر کے ایک خط میں تھا۔ "لوگ اسے بہت زیادہ چاہتے

ہیں"۔ اس نے مجھے لکھا۔ "کیوں کہ وہ دیانت دار اور دل کا اچھا ہے' اور گزشتہ اتوار اس نے عشائے ربانی دوزانو ہو کر وصول کیا اور دعا پڑھنے والوں کی لاطینی میں مدد کی"۔ اس زمانے میں عشائے ربانی کو کھڑے ہو کر وصول کرنے کی اجازت نہیں تھی' اور ہر دعا لاطینی میں ہوتی تھی مگر میری ماں اس طرح کی تفصیلوں کو' جب وہ معاملے کی تہہ کو پہنچنا چاہتی ہو' یاد رکھنے کی عادی ہے۔ پھر بھی' اس مقدس فتوے کے بعد' اس نے مجھے دو خط بھیجے جن میں بیاردو سان رومان کا تذکرہ نہیں تھا' اس وقت بھی نہیں جب یہ اچھی طرح آشکار ہو گیا تھا کہ وہ انجلا ویکاریو کا خواستگار ہے۔ صرف اس سیاہ بخت شادی کے بہت عرصے بعد اس نے مجھ سے اعتراف کیا کہ وہ بیاردو سان رومان کو سمجھ گئی تھی' مگر اس وقت تک اکتوبر کے خط کو درست کرنا بے معنی تھا' اور یہ کہ اس کی سنہری آنکھیں میری ماں کو ہراساں کر دیتی تھیں۔

"وہ مجھے ابلیس کی طرح لگتا تھا" اس نے مجھے بتایا۔ "مگر تم نے خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ اس نمونے کی باتیں تحریر میں نہیں آنی چاہئیں"۔

میں بیاردو سان رومان سے' اپنی ماں کی اس سے ملاقات کے تھوڑے دنوں بعد' کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آنے پر ملا' اور میں نے اسے اتنا ہی عجیب پایا جتنا کہ کہا جاتا تھا۔ بے شک وہ پرکشش نظر آتا تھا' مگر ماگدالینا اولیور کے سادہ و دلکش تصور سے بہت دور۔ مجھے اس میں اس سے زیادہ سنجیدگی نظر آئی جتنی کہ اس کی بے پروایانہ وضع نشاندہی کر سکتی تھی' اس میں ایک پوشیدہ کشمکش تھی جو اس کے حد سے زیادہ شائستہ اطوار میں بہ زحمت ہی چھپ سکتی تھی۔ مگر ان سب کے باوجود' وہ مجھے ایک بہت غم زدہ آدمی لگا۔ اس وقت وہ انجلا ویکاریو سے اپنی محبت کے پیمان کا پابند ہو چکا تھا۔

یہ کبھی اچھی طرح ثابت نہیں ہو سکا کہ وہ دونوں کس طرح ملے تھے۔ غیر شادی شدہ افراد کی جس اقامت گاہ میں بیاردو سان رومان فروکش تھا' اس کی مالکہ نے بتایا کہ ستمبر کے آخری دنوں میں کس طرح وہ پارلر میں ایک جھولنے والی کرسی میں جھپکی لے رہا تھا کہ انجلا ویکاریو اور اس کی ماں چوک سے مصنوعی پھولوں کی دو ٹوکریاں لیے ہوئے گزریں۔ بیاردو سان رومان نے نیم بیداری کے عالم میں دونوں خواتین کو' جو دو بجے دوپہر کی اس دلدلی ساعت میں تنہا زندہ مخلوق تھیں' بے رحم سیاہ رنگ میں ملبوس دیکھا' اور سوال کیا کہ نوجوان لڑکی کون ہے۔ اقامت گاہ کی مالکہ نے جواب دیا کہ وہ اپنی ہم راہ عورت کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے' اور اس کا نام انجلا ویکاریو ہے۔ بیاردو سان رومان نے اپنی نگاہوں سے ان کا چوک کے دوسرے سرے تک تعاقب کیا۔

"وہ خوش نام ہے"۔ اس نے کہا۔

پھر اس نے اپنا سر کرسی پر رکھا اور دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

"جب میں اٹھوں" اس نے کہا۔ "مجھے یاد دلانا کہ میں اس سے شادی کرنے والا ہوں"۔

انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا کہ اقامت گاہ کی مالکہ نے اسے اس ضمنی واقعے کے متعلق اس سے پہلے بتا دیا تھا' جب بیاردو سان رومان نے اس سے خواستگاری شروع کی۔ اقامت گاہ میں تین افراد نے تصدیق کی کہ یہ واقعہ پیش آیا تھا' مگر دوسرے چار متذبذب تھے۔ ساتھ ہی تمام روایتیں اس امر میں موافقت کرتی تھیں کہ انجلا ویکاریو اور بیاردو سان رومان پہلی بار قومی تعطیل کے دن ایک مینا بازار میں ملے تھے' جہاں وہ گیت گا کر ایک لاٹری فروخت کرنے کی ذمے دار تھی۔ بیاردو سان رومان مینا بازار میں آیا اور سیدھا اس بوتھ پر گیا جسے جامہ سوگواری میں آخری حد تک ملبوس' بے حال بخت آزما چلا رہی تھی۔ اور اس نے اس سے صدف کے ایک منقش میوزک بکس کی قیمت دریافت کی' جو میلے کی ایک اہم کشش رہا ہو گا۔ انجلا ویکاریو نے اسے جواب دیا کہ وہ فروخت کے لیے نہیں بلکہ لاٹری کے انعام میں دیے جانے کے لیے ہے۔

"خوب" اس نے کہا۔ "اس سے تو اس کا ملنا سہل ہو گیا' اور ارزاں بھی"۔

انجلا ویکاریو نے مجھ سے اعتراف کیا کہ وہ اسے متاثر کرنے میں کارگزاری دکھا گیا تھا' مگر اس کے نتائج محبت کے برخلاف تھے۔ "میں خود پسند مردوں سے متنفر تھی' اور میں نے کبھی اتنا مغرور آدمی نہیں دیکھا تھا"۔ اس نے مجھ سے اس دن کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ میں نے سوچا کہ وہ ایک اجڈ کوہستانی ہے"۔ میوزک بکس کی لاٹری کے لیے گانا گاتے ہوئے اس کی برافروختگی عروج پر تھی' اور تمام لوگوں کو حیرت ہوئی جب اسے سچ مچ بیاردو سان رومان نے جیت لیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس نے صرف اسے متاثر کرنے کے لیے لاٹری کے تمام ٹکٹ خرید لیے تھے۔

اس رات' جب وہ گھر لوٹی' انجلا ویکاریو نے اس

میوزک بکس کو تحفے کے طور پر عمدگی سے ملفوف اور ایک نازک آرگنڈی بو سے بندھا ہوا پایا۔ "میں کبھی نہیں معلوم کر سکی کہ اس نے کس طرح جانا کہ وہ میری سالگرہ کا دن ہے"۔ اس نے مجھے بتایا۔ اس کے لیے اپنے والدین کو یقین دلانا دشوار ہو گیا کہ اس نے بیاردو سان رومان کو اس طرح کا تحفہ، اور اس سے بدتر، اتنے واشگاف انداز میں کہ وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر نہ رہ سکے بھیجنے کے لیے کوئی وجہ فراہم نہیں کی تھی۔ اس لیے اس کے بڑے بھائی، پیدرو اور پابلو، میوزک بکس کو اس کے مالک کو واپس کرنے ہوٹل لے گئے، اور انہوں نے یہ کام اتنی عجلت سے کیا کہ کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس نے انہیں گھر میں آتے دیکھا ہو اور باہر نکلتے نہ دیکھ پایا ہو۔ چونکہ جس بات کا اس خاندان نے خیال نہیں رکھا تھا وہ بیاردو سان رومان کا ناقابل مزاحمت طلسم تھا، جڑواں بھائی دوسرے دن صبح سے پہلے نمودار نہیں ہوئے۔ وہ نشے میں دھت، میوزک بکس کو دوبارہ اٹھائے اور بیاردو سان رومان کو ساتھ لیے گھر پر ہنگامہ جاری رکھنے کے لیے لوٹ آئے تھے۔

انجلا ویکاریو ایک محدود آمدنی والے گھر کی سب سے چھوٹی لڑکی تھی۔ اس کا باپ پونسیو ویکاریو، غریبوں کا سنار تھا، اور اس نے گھر کی نیک نامی قائم رکھنے کے لیے سونے کا ازحد باریک کام کرتے ہوئے اپنی بینائی گنوا دی تھی۔ پیورا سیما دیل کارمین، اس کی ماں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شادی شدہ ہو جانے سے پہلے، ایک اسکول میں معلمہ تھی۔ اس کے بردبار اور کسی حد تک زخم خوردہ نظر آنے نے اس کے کردار کے استحکام کو اچھی طرح چھپا لیا تھا۔ "وہ کوئی راہبہ معلوم ہوتی تھی" مرسیدس یاد کرتی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو قربانی کے اتنے شدید جذبے کے ساتھ اپنے شوہر کی اطاعت اور بچوں کی پرورش کے لیے وقف کر دیا تھا کہ کبھی کبھی یہ بھی فراموش ہو جاتا کہ اس کا اپنا بھی کوئی وجود ہے۔ بڑی دو لڑکیاں بہت دیر سے بیاہی گئی تھیں۔ جڑواں بھائیوں کے علاوہ ایک منجھلی بھی تھی جو شبینہ بخار میں مر گئی تھی، اور وہ لوگ دو سال بعد بھی اس کے سوگ کو برقرار رکھے ہوئے تھے، جو گھر میں سکون کے ساتھ، اور باہر شدت سے منایا جاتا تھا۔ بھائیوں کو مرد بننے کے لیے پالا گیا تھا۔ لڑکیوں کی پرورش بیاہے جانے کے لیے کی گئی تھی۔ انہیں جالی دار کشیدہ کاری، مشین سے سینا، جھالر بننا، کپڑے دھونا اور استری کرنا، مصنوعی پھول اور رنگ برنگی مٹھائیاں بنانا آتا تھا، اور وہ تقریبات کے دعوت نامے لکھ لیتی تھیں۔ اس وقت کی لڑکیوں سے بالکل مختلف، جو موت کی رسموں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں، وہ چاروں، بیماروں کے سرہانے بیٹھنے کے قدیم علم، مرتے ہوؤں کی دلجوئی، اور مرے ہوؤں کو کفن دینے میں تصور سے بڑھ کر ماہر تھیں۔ صرف ایک بات جس پر میری ماں انہیں ٹوکتی تھی، ان کا سونے سے پہلے بالوں میں کنگھی کرنا تھا۔ "لڑکیو" وہ انہیں کہتی "رات کو بالوں میں کنگھی نہ کرو، تم سمندر میں جانے والوں کا سفر طویل کر دو گی"۔ اس کے سوا، اس کا خیال تھا کہ ان سے بڑھ کر اچھی پرورش پانے والی لڑکیاں اور کوئی نہیں۔ "وہ بے عیب ہیں" اکثر اسے کہتے سنا گیا "اور کوئی بھی شخص ان کے ساتھ خوش رہ سکے گا، کیوں کہ انہیں دکھ جھیلنے کے لیے پالا گیا ہے"۔ اس کے باوجود، جنہوں نے بڑی دو سے شادیاں کی تھیں، ان کے لیے ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا تھا، کیونکہ وہ ہمیشہ ہر جگہ ان کے ساتھ جاتیں، اور صرف خواتین کے لیے رقص کا اہتمام کرتیں، اور مردوں کے منصوبوں میں چھپی ہوئی غرض کو بھانپ لینے میں بہت تیز تھیں۔

انجلا ویکاریو چاروں میں سب سے خوش شکل تھی، اور، میری ماں کہتی تھی، وہ تاریخ کی ایک عظیم ملکہ کی طرح، گردن کے گرد لپٹی ہوئی نال کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔ مگر وہ بے چارگی اور روح کی کسمپرسی کا شکار تھی، جو اس کے غیر یقینی مستقبل کا شگون معلوم ہوتی تھی۔ میں ہر سال اپنی کرسمس کی تعطیل میں اسے دیکھا کرتا، اور وہ، دوپہر میں اپنے گھر کی کھڑکی میں بیٹھی کپڑوں کے پھول بناتی اور تنہا عورتوں کے والز اپنی پڑوسنوں کے ساتھ گاتی ہوئی، ہر بار اور زیادہ بے حوصلہ نظر آیا کرتی۔ "یہ تمہاری احمق عم زاد" سانتیاگو نصر مجھ سے کہا کرتا "کانا نگلنے کے لیے مچل رہی ہے"۔ ایک روز جب اس کی بہن کے سوگ سے ذرا پہلے، میں سڑک پر اس کے پاس سے گزرا، وہ پہلی بار ایک جوان عورت کی طرح ملبوس تھی اور اس کے بال تاب دیے ہوئے تھے، اور میں بہ مشکل یقین کر سکا کہ یہ وہی ہے۔ مگر یہ ایک ناپائیدار عکس تھا۔ اس کی روح کی ناداری عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ جب یہ انکشاف ہوا کہ بیاردو سان رومان اس سے شادی کا خواستگار ہے، بہت سے لوگوں نے سوچا کہ یہ ضرور اس بیگانے شخص کی کوئی چال ہے۔

خاندان والوں نے اس کی درخواست پر نہ صرف سنجیدگی سے، بلکہ پرجوش انداز میں ردعمل کیا، سوائے پیورا

ویکاریو کے، جس نے یہ شرط رکھی کہ بیاردو سان رومان اپنے آپ کو بطور مناسب شناخت کرائے۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ در حقیقت کون ہے۔ اس کا ماضی اس دوپہر تک محدود تھا جب وہ ایک اداکار کے سوانگ میں کشتی سے اترا تھا، اور اپنے آغذ کے بارے میں وہ اتنا کم گو تھا کہ آخری حد تک بعید از عقل اختراع بھی درست ہو سکتی تھی۔ یہ سننے میں آیا تھا کہ اس نے کاسا نارے میں 'ٹروپ کمانڈر' کی حیثیت سے دہشت گردی مچائی تھی اور دیہاتوں کو نیست و نابود کیا تھا۔ وہ ڈیولز آئی لینڈ سے فرار ہوا تھا۔ اسے پرنامبو کو میں ریچھوں کے ایک جوڑے کو نچا کر روزی کماتے دیکھا گیا تھا اور اس نے رودبار ونڈوارڈ میں سونے سے لدی ہوئی ایک اسپانوی جنگی کشتی کے باقیات کو سمندر سے نکالا تھا۔ بیاردو سان رومان نے ان تمام قیاس آرائیوں کا خاتمہ ایک سیدھے سادے عمل سے کیا۔ وہ اپنے پورے کنبے کو لے آیا۔

وہ چار تھے: باپ، ماں اور دو ہوشیار بہنیں۔ وہ سرکاری نمبر پلیٹ کی ٹی ماڈل فورڈ میں آئے، جس کے بطخ کی آوازوں والے ہارن نے گیارہ بجے سڑک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کی ماں، البیرتا سمونڈس، کیوراساؤ کی ایک طویل قامت ملاتو خاتون جو اسپانوی کو پاپیامنتو کی آمیزش کے ساتھ بولتی تھی، انٹیلس کی دو سو حسین ترین عورتوں میں سب سے زیادہ خوبصورت مانی گئی تھی۔ نوشگفتہ بہنیں، دو بے قرار بچھیریوں کی طرح تھیں مگر توجہ کا اصل مرکز ان کا باپ جنرل پیترونیو سان رومان تھا، گزشتہ صدی کی خانہ جنگیوں کا مرد میداں، اور کنزرویٹو عہد کی اہم نعمتوں میں سے ایک، جس نے کرنل اورلیانو بوئندیا کو تیو کورینکا کی تباہ کن جنگ میں پسپائی پر مجبور کر دیا تھا۔ صرف میری ماں اسے خوش آمدید کہنے نہیں گئی، جب اسے معلوم ہوا کہ وہ کون ہے۔ ''یہ مجھے ٹھیک لگتا ہے کہ وہ شادی کر لیں''۔ اس نے مجھے بتایا ''مگر یہ اور بات ہے کہ اس آدمی سے ہاتھ ملایا جائے جس نے جیری نیلڈو مارکیز کی پشت میں گولی مارنے کا حکم دیا تھا''۔ جیسے ہی وہ اپنی آٹوموبیل کی کھڑکی سے اپنا سفید ہیٹ لہراتا ہوا نمودار ہوا، ہر شخص نے اس کو اس کی مشہور تصویروں کی وجہ سے پہچان لیا۔ وہ سفید لنن کے کوٹ اور گلابتوں والے اونچے قرطبائی جوتوں میں تھا، اور سونے کی رم کی عینک، جس کی زنجیر اس کی واسکٹ کے کاج سے بندھی تھی، اس کی ناک کے بانسے پر ایک قبضے کی مدد سے ٹکی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کوٹ کے کالر پر شجاعت کا تمغہ سجائے اور ایک چھڑی لیے ہوئے تھا جس کے دستے پر قومی شیلڈ کھدی تھی۔ ہمارے خستہ راستوں کی تپتی دھول میں پوری طرح اَٹا ہوا، آٹوموبیل سے اترنے والا وہ پہلا شخص تھا، اور اسے صرف یہ کرنا تھا کہ وہ رننگ بورڈ پر کھڑا ہو جائے، کہ سب جان لیں کہ بیاردو سان رومان جس کا خواستگار ہے اس سے شادی کرنے جارہا ہے۔

یہ انجلا ویکاریو تھی جو اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ''وہ مجھ سے بہت فزوں تھا'' اس نے مجھے بتایا۔ اس کے علاوہ بیاردو سان رومان نے کبھی اسے شادی کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی، بلکہ اس کے گھر والوں کو اپنے جادو سے مسخر کر لیا تھا۔ انجلا ویکاریو اس رات کی سراسیمگی کبھی فراموش نہ کر سکی جب اس کے والدین اور بڑی بہنوں نے اپنے خاوندوں سمیت، بڑے کمرے میں جمع ہو کر، اس پر اس کا یہ فرض عائد کیا کہ وہ ایک ایسے آدمی سے شادی کے لیے رضامند ہو جائے جسے اس نے ٹھیک سے دیکھا تک نہیں تھا۔ جڑواں بھائی اس معاملے میں نہیں پڑے۔ ''یہ ہمیں عورتوں کا بکھیڑا لگا'' پابلو ویکاریو نے مجھے بتایا۔ والدین کی حتمی دلیل یہ تھی کہ نسبتاً کم ذرائع سے اپنا بھرم قائم رکھے ہوئے ایک خاندان کو اس خوش قسمتی کی اہانت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ انجلا ویکاریو نے ہمت کر کے عدم محبت کی ناسازگاری کی طرف اشارہ کیا، مگر اس کی ماں نے اسے ایک فقرہ سے ڈھا دیا:

''محبت بھی سیکھی جا سکتی ہے''۔

اس وقت کی منگنیوں کے برخلاف، جو سرپرستوں کی زیر نگرانی مدتوں چلتی تھیں، یہ منگنی بیاردو سان رومان کے پرزور اصرار پر صرف چار مہینے جاری رہی۔ یہ مدت اور کم نہیں ہو سکی کیونکہ پیورا ویکاریو نے مطالبہ کیا تھا کہ وہ خاندانی سوگ کے اختتام تک انتظار کریں۔ مگر یہ عرصہ، اس ناقابل مزاحمت وضع کی بدولت جس میں بیاردو سان رومان نے معاملات کو طے کیا، کسی دشواری کے بغیر گزر گیا۔ ''ایک شام اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کون سا مکان سب سے زیادہ پسند ہے'' انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا۔ ''اور میں نے، بغیر یہ جانے کہ کیوں، جواب دیا کہ قصبے کا سب سے خوبصورت مکان رنڈوے ہیوس کا فارم ہاؤس ہے''۔ میں نے بھی یہی جواب دیا ہوتا۔ وہ ایک پہاڑی پر، ہوا کے رخ پر واقع تھا اور اس کی ٹیرس سے کوئی شخص قرمزی شقائق نعمان سے ڈھکی ہوئی دلدلوں کی لامتناہی بہشت، اور گرمیوں کے صاف دنوں میں کریبیئن کا شفاف افق اور کارتاجیناڈے آندیاز سے آتے

ہوئے سیاحوں کے جہاز دیکھ سکتا تھا۔ اس شام بیاردو سان رومان سوشل کلب گیااور ہیوس کی میز پر دومینو کی ایک بازی کھیلنے بیٹھا۔

"ہیوس!" اس نے کہا' "میں تمہارا مکان خریدنے والا ہوں"۔

"وہ بکنے کے لیے نہیں ہے" ہیوس نے جواب دیا۔

"میں اسے اس میں موجود تمام چیزوں کے ساتھ خرید لوں گا"۔

ہیوس نے اسے پرانے زمانے کی صحیح النسبی کے ساتھ سمجھایا کہ مکان کی چیزیں اس کی بیوی نے تمام عمر کی قربانیوں کے بعد جوڑی تھیں' اور وہ اب تک اس کے لیے اس کی بیوی کے وجود کا حصہ ہیں۔ "وہ اپنا دل اپنے ہاتھ میں لے کر بات کر رہا تھا" مجھے ڈاکٹر دیونیسیو اگواران نے بتایا' جو ان کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ "مجھے یقین تھا کہ وہ اس مکان کو' جس میں تیس سال سے زیادہ عرصے تک خوش و خرم رہا تھا' بیچنے سے پہلے مرجائے گا"۔ مگر بیاردو سان رومان بھی اس کی دلیل کو سمجھتا تھا۔

"منظور!" اس نے کہا۔ "بس مجھے خالی مکان بیچ دو"۔

مگر ہیوس کھیل ختم ہونے تک اپنی مدافعت کرتا رہا۔

تین شاموں کے بعد' بیاردو سان رومان بہتر پیش بندیوں کے ساتھ دومینو کی میز پر واپس آیا۔

"ہیوس!" اس نے پھر شروع کیا' "مکان کی قیمت کیا ہے؟"

"اس کی کوئی قیمت نہیں"۔

"کوئی بھی قیمت' جو تم چاہو لگالو"۔

"بیاردو! مجھے افسوس ہے" ہیوس نے کہا "مگر تم نوجوان لوگ' دل کے محرکات کو نہیں سمجھتے"۔

بیاردو سان رومان سوچنے کے لیے تھما نہیں۔

"اگر ہم پانچ ہزار پیسو کہیں؟" اس نے کہا۔

"اپنا وقت ضائع مت کرو" ہیوس نے جواب دیا اس کی خودداری عروج پر تھی' "مکان اس سے کہیں زیادہ کا ہے"۔

"دس ہزار" بیاردو سان رومان نے کہا' "اسی وقت' نقد"۔

ہیوس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ "وہ غصے سے رو رہا تھا"۔ مجھے ڈاکٹر دیونیسیو اگواران نے بتایا' جو معالج ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب بھی تھا۔ "تصور تو کرو! اتنی بڑی رقم سامنے ہو اور صرف روح کی ایک کمزوری کی بنا پر انکار کرتا"۔ ہیوس کی آواز نہیں نکل پائی' مگر بغیر تردد کے' اس نے سر کی جنبش سے "نہیں" کہا۔

"پھر اتنی مہربانی کرو" بیاردو سان رومان نے کہا "یہاں پانچ منٹ کے لیے میرا انتظار کرو"۔

پانچ منٹ بعد وہ سوشل کلب میں اپنی چاندی جڑی خور جینیں لیے واپس آیا اور اس نے اسٹیٹ بینک کے چھپے ہوئے فیتوں سے بندھی ہوئی ہزار ہزار پیسوؤں کی دس گڈیاں میز پر رکھ دیں۔ رنڈوا ہیوس دو ماہ بعد مرگیا۔ "وہ اسی وجہ سے مرا" ڈاکٹر دیونیسیو اگواران نے کہا۔ "وہ ہم سب سے زیادہ تندرست تھا' مگر جب تم اسٹیتھوسکوپ سے سننے کی کوشش کرتے' اس کے دل کے اندر آنسوؤں کو غلغل کرتے سن سکتے تھے"۔ مگر نہ صرف یہ کہ اس نے مکان اندر کی تمام اشیاء کے ساتھ فروخت کیا' بلکہ اس نے بیاردو سان رومان سے درخواست کی کہ وہ اسے قسطوں میں ادائیگی کرے' کیونکہ اس کے پاس ایک صندوق بھی نہیں بچا تھا جس میں وہ نعم البدل کی اتنی زیادہ رقم رکھ سکتا۔

کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ انجلا ویکاریو دوشیزہ نہیں ہے۔ اس کا کوئی پچھلا منگیتر بھی نہیں تھا' اور وہ اپنی بہنوں کے ساتھ اپنی ماں کی سخت گیریوں میں جوان ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ جب اس کی شادی میں صرف دو مہینے رہ گئے تھے' پورا ویکاریو نے اسے بیاردو سان رومان کے ساتھ' اس مکان کو دیکھنے کے لیے' جہاں وہ رہنے جا رہے تھے' جانے کی اجازت دی۔ مگر وہ خود' اور نابینا باپ' اس کی عفت کی نگہبانی کے لیے ہمراہ گئے۔ "میں خدا سے صرف یہ دعا کرتی تھی کہ وہ مجھے اپنے آپ کو ختم کرنے کی جرات عطا کرے"۔ انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا۔ "مگر اس نے مجھے یہ جرات عطا نہیں کی"۔ وہ اتنی پریشان تھی کہ اس نے اپنی ماں کو سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کیا' تاکہ اپنے آپ کو اس شہادت سے بچا سکے' مگر اس کی دونوں رازداروں نے' جو کپڑوں سے پھول بنانے میں اس کی معاون تھیں' اسے اس کے نیک ارادوں سے باز رکھا۔ "میں نے آنکھ بند کرکے ان کا کہا مانا" اس نے مجھے بتایا "کیوں کہ انھوں نے مجھے یہ تاثر دیا تھا کہ وہ مردوں کو فریب دینے میں ماہر ہیں"۔ انھوں نے اسے یقین دلایا کہ تقریباً تمام لڑکیاں اپنی دوشیزگی بچپن کے حادثات میں کھو بیٹھتی ہیں۔ انھوں نے بصد اصرار اسے آگاہ کیا کہ سخت سے سخت شوہر بھی خود کو ہر بات برداشت کرنے پر آمادہ کرلیتا

ہے' تاوقتیکہ کوئی اور اس کے بارے میں نہ جان جائے۔ انہوں نے آخرکار اسے قائل کر لیا کہ زیادہ تر مرد اپنے حجلہ عروسی میں اتنے سہمے ہوئے آتے ہیں کہ وہ عورت کے تعاون کے بغیر کسی عمل کے اہل نہیں رہ جاتے' اور لمحہ صدق میں اپنی حرکات انہیں یاد نہیں رہتیں۔ "وہ صرف اس پر یقین کرتے ہیں جو وہ بعد میں چادر پر دیکھتے ہیں"۔ انہوں نے اس سے کہا اور انہوں نے اسے دوشیزگی کا تصنع کرنے میں تجربہ کار بیویوں کی چال بازیاں سکھائیں تاکہ وہ نوعروسی حیثیت میں اپنی پہلی صبح کو مکان کے صحن میں اپنی لنن کی چادر' دوشیزگی کی خون آلود علامت سمیت' عام نمائش کے لیے رکھ سکے۔

وہ اسی بہلاوے کے ساتھ بیاہی گئی۔ بیاردو سان رومان نے' اپنے طور پر' ضرور اس التباس کے ساتھ شادی کی ہوگی کہ وہ اپنی طاقت اور دولت کے بل پر خوشیاں خرید رہا ہے' کیوں کہ اس تقریب کا منصوبہ جتنا پھیلتا گیا اس کو اتنے ہی بے خود کر دینے والے خیالات اسے اور زیادہ طول دینے کے لیے آتے رہے۔ جب بشپ کی آمد کا اعلان ہوا' اس نے تقریب کو ایک دن کے لیے روکنا چاہا کہ وہ ان کی شادی کی رسم ادا کر سکے' مگر انجلا ویکاریو اس کے خلاف تھی۔ "درحقیقت" اس نے مجھے بتایا' "میں ایسے شخص کی معرفت خدا کی بخشش نہیں چاہتی تھی جو سوپ کے لیے کلغی کاٹ کر باقی مرغ کو کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیتا ہے"۔ مگر بشپ کی مقدس تمناؤں کے بغیر بھی جشن نے اتنا زور پکڑ لیا کہ اسے قابو میں رکھنا دشوار ہو گیا' اور وہ' بیاردو سان رومان کے اپنے ہاتھوں سے نکل کر' ایک عوامی ہنگامے پر ختم ہوا۔

جنرل پیترونیو سان رومان اور اس کا خاندان اس بار قومی کانگریس کی پرتکلف کشتی پر آیا' جو تقریب کے اختتام تک گودی پر لنگرانداز رہی۔ اور ان کے ساتھ بہت سے نامور لوگ آئے' جو اپنی ناموری کے باوصف' نئے چہروں کے ہنگامے میں بے ملاحظہ گزر گئے۔ اتنے تحفے لائے گئے تھے کہ یہ ضروری ہو گیا کہ ان میں سے زیادہ لائق تحسین تحفوں کی نمائش کے لیے برقی توانائی کے اولیں کارخانے کی فراموش شدہ عمارت کو بحال کیا جائے' بقیہ فوراً رنڈوے ہیوس کے سابقہ مکان پر پہنچا دیے گئے' جو نوعروسوں کے لیے پیشتر ہی آراستہ کیا جا چکا تھا۔ نوشے کو ایک کنورٹیبل ملی جس پر اس کا نام کمپنی کے مونوگرام کے نیچے کندہ تھا۔ دلہن کو چوبیس مہمانوں کی تواضع کے لیے خالص طلائی ظروف سے بھری ایک الماری ملی۔ وہ بیلے کا ایک طائفہ اور والٹز کے دو آرکسٹرا بھی لائے تھے' جو شادمانیوں کے شور سے برانگیختہ مقامی بینڈ اور دوسرے آئے ہوئے سازوں اور اکارڈین کا ساتھ دیتے دیتے بے سرے ہو گئے۔

ویکاریو خاندان ایک تجل سے مکان میں رہتا تھا جس کی دیواریں اینٹوں کی اور چھت تاپول کی تھی' مع دو عدد دو چھتیوں کے جہاں ابابیلیں جنوری میں افزائش نسل کرتیں۔ بیرونی رخ پر اس میں پھولوں کے گملوں سے تقریباً پورا بھرا ہوا ایک چبوترہ تھا' اور ایک طویل صحن جس میں آزاد دوڑتی ہوئی مرغیاں اور پھل دار درخت تھے۔ صحن کے پچھواڑے' قربانی کی سل اور انتڑیاں صاف کرنے کی میز سمیت' جڑواں بھائیوں کا سوروں کا باڑا تھا' جو پونسیو ویکاریو کی بینائی کے جاتے رہنے کے بعد خاندانی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ تھا۔ پیدرو ویکاریو نے یہ کاروبار شروع کیا تھا' اور جب وہ فوجی خدمت کے لیے چلا گیا' اس کے جڑواں بھائی نے بھی ذبح کرنے کا کسب اختیار کر لیا۔

مکان کے اندر رہنے کے لیے حسب ضرورت کمرے بہ مشکل ہی تھے' اس لیے بڑی بہنوں نے جب جشن کے پھیلاؤ کا اندازہ لگایا تو کرائے پر ایک مکان لینا چاہا۔ "دیکھو تو" انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا۔ "انہوں نے پلاسیدا لینیرو کے مکان کے بارے میں سوچا مگر خوش قسمتی سے ہمارے والدین اپنی پرانی ضد پر اڑے رہے کہ ہماری لڑکیاں ہمارے اسی خنزیر خانے میں بیاہی جائیں گی' یا کبھی نہیں بیاہی جائیں گی"۔ اس لیے انہوں نے مکان کو اصلی زرد رنگ میں رنگا' دروازے ٹھیک کیے' فرش ٹھکوا دیا' اور جہاں تک بن پڑا' اسے ایسی پرشور شادی کا اہل کر کے چھوڑا۔ جڑواں بھائی سوروں کو کہیں اور لے گئے' اور باڑے کی ان بجھے چونے سے صحت افزائی کی گئی' مگر اس کے باوجود یہ واضح تھا کہ مکان میں زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ آخرکار' بیاردو سان رومان کی کوششوں سے انہوں نے صحن کی باڑھیں گرائیں' پڑوس کے گھر کو رقص کے لیے مستعار لیا' اور ثمرہند کے درختوں کی شاخوں کے نیچے' بیٹھنے اور کھانے کے لیے ترکھانی بنچیں نصب کیں۔

صرف ایک غیر متوقع سراسیمگی نوشے نے شادی کی صبح پھیلائی' جب اس نے انجلا ویکاریو کے ہاں آنے میں دو گھنٹے کی تاخیر کی' اور اس نے عروسی جوڑا پہننے سے انکار کر دیا جب تک کہ اسے گھر میں آتے دیکھ نہیں لیا۔ "سوچو تو"۔ اس نے مجھے بتایا "میں خوش ہوتی اگر وہ بالکل نہ آتا' مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے دلہن کی طرح سجنے کے بعد ترک کر

دے"۔ اس کی احتیاط بجا طور نظر آتی تھی کیوں کہ کوئی بھی عام ابتلا کسی عورت کے لیے اس سے زیادہ رسوا کن نہیں ہو سکتی تھی جتنی یہ کہ کوئی اس کے عروسی جوڑا پہننے کے بعد شادی کے اقرار سے پھر جائے۔ دوسری طرف' یہ امر کہ انجلا ویکاریو نے دوشیزہ نہ ہوتے ہوئے بھی نقاب اور اورنج بلاسم پہننے کی جسارت کی' بعد ازاں' پاک دامنی کی علامت کی بے حرمتی سے تعبیر کیا گیا۔ میری ماں وہ واحد ہستی تھی جس نے اس حقیقت کو کہ اس نے اپنے نشان زدہ پتے آخری بازی تک کھیلے' ایک جرات مندانہ قدم کی طرح قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ "ان دنوں" اس نے مجھے بتایا' "خدا اس طرح کی باتیں سمجھتا تھا"۔ ادھر' کوئی نہیں جانتا تھا کہ بیاردوسان رومان کن پتوں سے کھیل رہا ہے۔ اس لمحے سے لے کر جب وہ آخر کار فراک کوٹ اور اونچے ریشمی ہیٹ میں ملبوس حاضر ہوا' اپنے آزار کی تخلیق کو رقص گاہ سے لے اڑنے تک وہ ایک خوش نصیب دولہے کی مکمل تصویر بنا رہا۔

نہ یہ معلوم تھا کہ سانتیاگو نصر کن پتوں سے کھیل رہا ہے۔ کلیسا اور جشن میں تمام وقت' میں' کرستو بیدویا اور اپنے بھائی ایزیک کے ہمراہ' اس کے ساتھ ہی رہا تھا' اور ہم میں سے کسی نے اس کے رویے میں کسی تبدیلی کی جھلک نہیں دیکھی۔ مجھے یہ بات کئی بار دہرانی پڑی' کیوں کہ ہم چاروں اسکول تک ایک ساتھ پڑھے تھے اور بعد میں تعطیل کے دوران ایک ہی ٹولی میں ہوتے تھے' اور کوئی بھی یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ ہم کوئی راز' اور خصوصاً اتنا بڑا راز' ایک دوسرے سے چھپا سکتے ہیں۔

سانتیاگو نصر تقریبات کا آدمی تھا' اور اس نے اپنا بہترین وقت' اپنی موت سے پیشتر کی شام' شادی کے اخراجات کا تخمینہ لگاتے ہوئے گزارا۔ کلیسا میں اس نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے پھولوں کی اتنی آرائشیں کھڑی کی ہیں کہ ان پر چودہ اول درجے کے جنازوں کے برابر خرچ آیا ہوگا۔ یہ تشبیہ مجھے برسوں تک تنگ کرتی رہنے والی تھی' کیونکہ سانتیاگو نصر نے مجھ سے اکثر کہا تھا کہ بند عمارتوں میں پھولوں کی خوشبو اس کے لیے موت سے ایک قریبی ربط رکھتی ہے' اور اس دن جب وہ کلیسا کے اندر گیا' اس نے مجھ سے اس بات کو دہرایا۔ "میں اپنے جنازے پر کوئی پھول نہیں چاہتا" اس نے مجھ سے کہا' یہ جانے بغیر کہ اگلے دن' میں نے اس کا اہتمام کیا کہ اس کے تابوت پر پھول نہ رکھے جائیں۔ کلیسا سے ویکاریو کے گھر تک اس نے رنگین پھولوں کے دستوں کی قیمت کا تعین کیا جو سڑک کو سجا رہے تھے' اس نے موسیقی اور ہوائیوں' یہاں تک کہ کچے چاولوں کی نچھاور کی لاگت کا بھی اندازہ لگایا جس سے انہوں نے ہمارا خیر مقدم کیا تھا۔ دوپہر کی خواب آلودگی میں نوعروس صحن میں آ جا رہے تھے۔ بیاردوسان رومان ہمارا بہت اچھا دوست بن گیا' "چند جام کا دوست" جیسا کہ ان دنوں کا محاورہ تھا۔ اسے ہماری میز پر بہت زیادہ مزہ آیا۔ انجلا ویکاریو نے' نقاب اور عروسی گلدستے اور پسینے سے داغ دار ساٹن کے لباس میں' اچانک ایک شادی شدہ عورت کی شبیہ اختیار کر لی تھی۔ سانتیاگو نصر نے حساب لگایا' اور بیاردوسان رومان سے کہا کہ اس وقت تک شادی پر لگ بھگ نو ہزار پیسے خرچ ہو چکے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ انجلا ویکاریو نے اس بات کو گستاخی سمجھا تھا۔ "میری ماں نے مجھے تربیت دی تھی کہ دوسروں کے سامنے کبھی پیسوں کا ذکر نہیں کرتے" اس نے مجھے بتایا۔ بیاردوسان رومان نے' اپنے طور پر' اس بات کو بڑی تمکنت سے' بلکہ ایک خاص خود نمائی کے ساتھ سنا۔

"تقریباً" اس نے کہا۔ "مگر یہ تو صرف شروعات ہیں' خاتمے تک' اس سے دگنا خرچ ہو چکا ہوگا"۔

سانتیاگو نصر نے اسے آخری پائی تک ثابت کرنے کو کہا' اور اس کی زندگی نے وہیں تک وفا کی۔ آخری اعداد سے' جو کرستو بیدویا نے اسے دوسرے دن گودی پر' اس کے مرنے سے پینتالیس منٹ پہلے' فراہم کیے' اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بیاردوسان رومان کا اندازہ درست تھا۔

اس سے پہلے' جب میں نے دوسروں کی یادداشتوں سے اسے بحال کرنا شروع کیا' میرے پاس تقریب کا ایک دھندلا سا خیال باقی رہ گیا تھا۔ برسوں تک ہمارے گھر میں اسی کا ذکر ہوتا رہا' مثلاً میرے باپ نے' نوعروسوں کے اعزاز میں' اپنے ایام طفلی کا وائلن دوبارہ اٹھا لیا تھا' میری راہبہ بہن دربان کے سوانگ میں ایک میرنگو ناچی تھی' اور یہ کہ ڈاکٹر دیونیسیو اگواران نے' جو میری ماں کا عم زاد تھا' صرف ان کی خاطر باضابطہ سرکاری کشتی سے آنے کا بندوبست کیا تھا' تا کہ وہ یہاں دوسرے دن' جب بشپ کو آنا تھا' نہ پہنچے۔ ان وقائع کی تفتیش کے دوران' میں کئی ضمنی تجربوں سے دوبارہ گزرا' جن میں بیاردوسان رومان کی بہنوں کا بے اختیار تصور بھی تھا جن کے مخمل کے لباس نے' جس میں ایک بڑی تتلی کے پر پشت کی جانب ایک طلائی سنجاق سے اٹکے ہوئے تھے' ان کے باپ کے پروں والے ہیٹ اور جنگی تمغوں کی قطار سے زیادہ

پذیرائی حاصل کی تھی۔ کئی لوگ جانتے تھے کہ شادی کے اس ہنگامے کے دوران' میں نے مرسیدس باچاکو' جیسے ہی وہ پرائمری اسکول ختم کرتی' شادی کرنے کی تجویز پیش کردی تھی' جیساکہ اس نے خود چودہ سال بعد' جب ہم نے شادی کی' مجھے یاد دلایا۔ فی الواقع' اس ناخوش آئند اتوار کی سب سے تکلیف دہ تصویر' جسے میں کبھی نہیں بھول سکا' صحن کے بیچ ایک اسٹول پر تنہا بیٹھے بوڑھے پونسیو ویکاریو کی تھی۔ انہوں نے اسے یہ سوچ کر وہاں بٹھا دیا تھا کہ احترام کی نشست یہی ہے' اور مہمان اس سے ٹھوکر کھاتے ہوئے آجا رہے تھے' اس پر کسی اور کا گمان کررہے تھے' اسے ہٹارہے تھے تاکہ وہ ان کی رکاوٹ نہ بنے اور وہ کلف سے گتے کی طرح اکڑی قمیص میں' اپنی وزنی چھڑی کے سہارے جو اس کے لیے خاص اس تقریب کے واسطے لائی گئی تھی' ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے جو اس سے نہیں پوچھے گئے' اور ہاتھ کے ان گریز آمیز اشاروں پر ردعمل کرتے ہوئے جو اسے نہیں کیے جارہے تھے' کسی ایسے شخص کے نادرست تاثر کے ساتھ جس کی بینائی ضائع ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو' اپنے برف جیسے سفید سر کو ہر سمت میں ہلاتے ہوئے' اپنی خودفراموشی کے دائرے میں خوش تھا۔

چھ بجے شام کو جب مہمان رخصت ہوئے' رسم کی سرگرمیاں اپنے اختتام کو پہنچیں۔ کشتی' اپنی تمام بتیاں روشن کیے' پیانو پر بجتے والز کے آہنگ کے ساتھ چلی اور کچھ دیر تک ایک موہوم گرداب میں بھٹکنے کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو از سرنو دریافت کیا اور تقریب کے دائرے میں واپس آگئے۔ نوعروس تھوڑی دیر بعد کھلی ہوئی کار میں' تقریب کے ہنگاموں کے درمیان سے اپنا راستہ بہ دشواری بناتے ہوئے نمودار ہوئے۔ بیاردوسان رومان نے ہوائیاں چھوڑدیں' ہجوم کی پیش کردہ بوتلوں سے گنے کی شراب پی' اور کمیامبا رقص کے دور میں شریک ہونے کے لیے انجلا ویکاریو کے ساتھ باہر نکلا۔ آخر میں' اس نے ہمیں اپنی طرف سے' جہاں تک ہماری زندگیاں پہنچ سکیں' رقص جاری رکھنے کو کہا' اور اپنی وحشت زدہ دلہن کو اپنے خوابوں کے گھر لے گیا' جہاں کبھی ہیوس خوش و خرم رہا کرتا تھا۔

آدھی رات کے قریب عام رنگ رلیاں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر اختتام پذیر ہوئیں' اور باقی رہ جانے والی صرف چوک کے پاس کلوتیلدے آرمنتا کی دکان تھی۔ میں اور سانتیاگو نصر' میرے بھائی لوئس ایزیک اور کرستو بیدویا کے ساتھ ماریا الیہاندرینا سروانتس کے دارالامان پہنچے۔ دوسرے بہت سے لوگوں کے علاوہ ویکاریو برادران بھی وہاں موجود تھے' اور وہ ہماری ہم نشینی میں شراب پیتے رہے' اور اس کو قتل کرنے سے پانچ گھنٹے پہلے تک' سانتیاگو نصر کے ساتھ مل کر نغمہ سرائی کرتے رہے۔ اصل تقریب سے چند منتشر چنگاریاں ضرور باقی رہ گئی ہوں گی کیوں کہ بشپ کی کشتی کے نعرہ زن ہونے سے پہلے تک ہر طرف سے موسیقی کی لہریں اور رزم آرائیوں کی غمگین تر ہوتی ہوئی آوازیں ہم تک پہنچتی رہی تھیں۔

پیورا ویکاریو نے میری ماں کو بتایا کہ وہ اپنی بڑی لڑکیوں کی مدد سے تقریب کی تباہ کاریوں کو ایک ذرا سمیٹنے کے بعد' گیارہ بجے رات کو بستر پر گئی۔ دس بجے کے آس پاس' جب چوک میں چند بدمست اپنی نغمہ سرائی جاری رکھے ہوئے تھے' انجلا ویکاریو نے اپنے شب خوابی کے کمرے کی الماری سے اپنی ذاتی اشیاء منگانے کے لیے ایک چھوٹا سوٹ کیس بھیجا' اور اس نے اس کے علاوہ اپنے روزمرہ کے کپڑوں کا ایک سوٹ کیس بھی بھیجنے کو کہا تھا' مگر قاصد جلدی میں تھا۔ پیورا ویکاریو پر گہری نیند کا غلبہ تھا' جب دروازے پر دستک ہوئی۔ "وہ تین بہت آہستہ دستکیں تھیں"' اس نے میری ماں سے کہا "مگر ان میں بدفالی کا ایک نامعلوم عنصر تھا"۔ پیورا ویکاریو نے میری ماں کو بتایا کہ اس نے روشنی کیے بغیر' تاکہ کوئی اور نہ جاگ اٹھے' دروازہ کھولا' اور سڑک سے آتی ہوئی روشنی میں بیاردوسان رومان کو دیکھا' اس کی ریشمی قمیص کے بٹن کھلے تھے اور اس کی زرق برق پتلون الاسٹک کی گیلس سے رکی ہوئی تھی۔ "اس کا رنگ خوابوں کی طرح سبز ہو رہا تھا"۔ پیورا ویکاریو نے میری ماں سے کہا۔ انجلا ویکاریو تاریکی میں تھی' اس لیے اس کی ماں نے اسے صرف اس وقت دیکھا جب بیاردوسان رومان اسے بازو سے پکڑ کر روشنی میں کھینچ لایا۔ اس کا ساٹن کا لباس چیتھڑے ہو چکا تھا اور وہ کمر تک ایک تولیے میں لپٹی تھی۔ پیورا ویکاریو نے سوچا کہ وہ سڑک پر گاڑی میں دھماکے سے ختم ہو چکے' اور اب ایک گہری کھائی میں مردہ پڑے ہیں۔

"مقدس مریم" اس نے لرز کر کہا' "تم لوگ اب تک اسی دنیا میں ہو؟"

بیاردوسان رومان اندر نہیں آیا' مگر اس نے' ایک لفظ کہے بغیر' اپنی بیوی کو گھر میں آہستگی سے داخل کردیا۔ پھر اس نے پیورا ویکاریو کے رخسار پر بوسہ دیا اور بہت گہری غم زدہ

آواز میں کمال ملائمت کے ساتھ اس سے مخاطب ہوا۔ "امی' آپ کی بہت نوازش"۔ اس نے کہا "آپ نہایت مقدس ہیں"۔

صرف پیورا ویکاریو ہی جانتی تھی کہ اس نے بعد کے دو گھنٹوں میں کیا کیا' اور وہ یہ راز اپنی قبر میں لے گئی۔ "مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ ایک ہاتھ سے میرے بال پکڑ کر دوسرے سے اتنے غصے میں مجھے پیٹ رہی تھی کہ میں سمجھی کہ وہ مجھے جان سے مار ڈالے گی"۔ انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا۔ مگر یہ عمل بھی اس نے اتنی رازداری سے کیا کہ اس کا شوہر اور بڑی لڑکیاں جو دوسرے کمروں میں محوِ خواب تھیں' صبح تک' جب سانحہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا' کسی بات کو نہیں جان سکیں۔

جڑواں بھائی تین بجے سے کچھ پہلے' اپنی ماں کے ہنگامی طور پر طلب کرنے پر واپس آئے۔ انہوں نے انجلا ویکاریو کو کھانے کے کمرے کی کوچ پر اوندھے منہ پڑے دیکھا۔ اس کے چہرے پر خراشیں پڑ گئی تھیں' مگر وہ رونا موقوف کر چکی تھی۔ "اس وقت میں بالکل خوف زدہ نہیں تھی"۔ اس نے مجھے بتایا۔ "اس کے برعکس' مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ موت کی غنودگی آخر کار مجھ پر سے زائل ہو گئی ہے' اور میں صرف یہ چاہ رہی تھی کہ یہ سب کچھ جلدی سے ختم ہو تاکہ میں گر پڑوں اور سو جاؤں"۔

بھائیوں میں زیادہ زور آور' پیدرو ویکاریو نے اسے کمر سے پکڑ کر ہوا میں بلند کیا اور کھانے کی میز پر بٹھا دیا۔

"کون تھا وہ؟" اس نے غصے میں لرزتے ہوئے پوچھا۔

اس نے نام بتانے میں ضروری وقت لگایا۔ بہت سے عکس اس کے سامنے آئے' اور اس نے پہلی نظر میں' اس دنیا' اور دوسری کے بہ آسانی خلط ملط ہو جانے والے بہت سے ناموں میں اسے تلاش کر لیا' اور اپنے خوش ہدف تیر سے ایک بے مدافعت تتلی کی طرح جس کی تقدیر ہمیشہ دوسروں نے لکھی' اسے دیوار پر پیوست کر دیا۔

"سانتیاگو نصر!" اس نے کہا۔

☆☆☆

وکیل عزت کے جائز دفاع کے تحت قتل کے موقف میں قائم رہا' جو عدالت نے نیک نیتی سے تسلیم کر لیا' اور جڑواں بھائیوں نے اپنے مقدمے کے خاتمے پر اعلان کیا کہ وہ ہزار بار' اس طرح کی صورت حال میں' ایسا ہی کریں گے۔ جرم کے چند منٹوں کے بعد اپنے آپ کو کلیسا کے حوالے کرتے ہوئے انہوں نے خود اس نکتے کی طرف اشارہ کیا تھا جو بعد میں وکیل صفائی نے اٹھایا۔ مشتعل عربوں کے ایک گروہ کے خطرناک تعاقب سے بچ کر وہ ہانپتے ہوئے' کلیسا کے احاطے میں گھس آئے اور انہوں نے بے داغ چھرے فادر امادور کی رحل پر رکھ دیئے۔ دونوں قتل کے سفاکانہ عمل کے بعد تھکے ہوئے تھے' اور ان کے کپڑے اور بازو تربتر' اور ان کے چہرے پسینے اور ہنوز زندہ خون سے آلودہ تھے' مگر کلیسا نے ان کی سپر اندا ختگی کو نہایت باوقار عمل کے طور پر یاد رکھا۔

"ہم نے اسے علانیہ قتل کیا ہے"۔ پیدرو ویکاریو نے کہا۔ "مگر ہم بے گناہ ہیں"۔

"شاید خدا کی نظروں میں" فادر امادور نے کہا۔

"خدا اور اس کے بندوں کی نظروں میں"۔ پابلو ویکاریو نے کہا۔ "یہ عزت کا معاملہ تھا"۔

مزید برآں' واقعات کو نئے سرے سے بیان کرتے ہوئے انہوں نے' جتنی کہ فی الواقع زیبا تھی' اس سے کہیں زیادہ سخت خون آشامی کا تصنع کیا' اس انتہا تک کہ یہ ضروری ہو گیا کہ پلاسیدا الینیرو کے گھر کے صدر دروازے کی مرمت میں' جو چھروں کی ضربوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا' سرکاری وسائل استعمال کیے جائیں۔

ریوہاچا کی مدور جیل میں' جہاں انہوں نے مقدمے کی ساعت کے انتظار میں تین سال گزارے' کیوں کہ وہ ضمانت کرانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے' پرانے قیدیوں نے انہیں ان کے اچھے کردار اور ان کی خوش خلقی کی وجہ سے یاد رکھا' اور انہوں نے ان میں کبھی پچھتاوے کا کوئی شوق نہیں دیکھا۔ اس کے باوجود' حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ویکاریو برادران نے سانتیاگو نصر کو فی الفور' اور تماشا بنائے بغیر' قتل کرنے کے لیے کچھ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا' بلکہ انہوں نے اس سے کہیں زیادہ جتنی تصور میں آ سکتی ہے' کاوش کی کہ کوئی انہیں اس کو قتل کرنے سے باز رکھ سکے' اور وہ اس میں ناکام رہے۔

اس کے مطابق جو انہوں نے مجھے کئی برسوں کے بعد بتایا' انہوں نے اس کی تلاش ماریا الیھاندرینا سروانتس کے ہاں سے شروع کی' جہاں وہ اس کے ساتھ دو بجے تک رہے تھے۔ یہ واقعہ' بہت سے اور واقعوں کی طرح مسل میں درج نہیں ہوا۔ اصل میں' سانتیاگو نصر اس وقت وہاں نہیں تھا جب وہ دونوں اپنے کہنے کے مطابق اسے تلاش کرنے آئے تھے' کیوں کہ ہم سیرینادوں کا گشت کرنے نکل پڑے تھے' مگر

کسی بھی صورت میں یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ واقعی وہاں گئے تھے۔ "وہ یہاں آنے کے بعد جا نہیں سکتے تھے"۔ ماریا الیہاندرینا سروانتس نے مجھے بتایا' اور اسے بخوبی جانتے ہوئے' میں نے کبھی اس کی بات پر شک نہیں کیا۔ اس کے برخلاف' وہ اس کا انتظار کرنے کلوتیلدے آرمنتا کی دکان پر گئے' جہاں وہ جانتے تھے کہ سانتیاگو نصر کے سوا تقریباً ہر شخص تھوڑی دیر کے لیے رکے گا۔ "صرف وہی دکان کھلی ہوئی تھی"۔ انہوں نے تفتیش کرنے والے سے کہا۔ "جلد یا بدیر اسے گھر سے نکلنا تھا"۔ انہوں نے' بری ہو جانے کے بعد' مجھے بتایا۔ پھر بھی ہر شخص جانتا تھا کہ پلاسید الینیرو کا صدر دروازہ ہمیشہ' حتیٰ کہ دن کے وقت بھی' اندر سے آگل چڑھا رہتا ہے' اور یہ بھی کہ سانتیاگو نصر ہمیشہ عقبی دروازے کی چابیاں اپنے پاس رکھتا ہے۔ درحقیقت' جب ویکاریو برادران کو دوسری طرف اس کا انتظار کرتے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا' وہ اپنے گھر میں اسی دروازے سے داخل ہوا' اور اگر وہ بعد میں بشپ کا استقبال کرنے کے لیے چوک کی طرف کے دروازے سے نکلا تو یہ کسی ایسے ناگہانی امر کی وجہ سے تھا جسے تفتیش کرنے والا' جس نے مسل کو مرتب کیا تھا' کبھی دریافت نہ کرسکا۔

کوئی موت اس سے زیادہ پیش گفتہ نہیں تھی۔ جب ان کی بہن نے ان پر نام منکشف کر دیا' ویکاریو برادران سوروں کے باڑے میں اس صندوق تک گئے جس میں وہ ذبح کرنے کے اوزار رکھتے تھے' اور انہوں نے دو عمدہ ترین چھرے منتخب کیے۔ ایک چہار قاش' دس انچ لمبا اور ڈھائی انچ چوڑا' اور دوسرا پارچے بنانے والا' سات انچ لمبا اور ڈیڑھ انچ چوڑا۔ انہوں نے ان کو چیتھڑوں میں لپیٹا اور گوشت بازار لے گئے۔ اتنی صبح کو وہاں زیادہ گاہک نہیں تھے' مگر بائیس آدمیوں نے بتایا کہ انہوں نے ہر بات سنی تھی' اور ان تمام نے اس تاثر پر اتفاق کیا کہ انہوں نے وہ باتیں سنانے ہی کے لیے کی تھیں۔ تین بیس پر' جب فاؤستینو سانتوس' ان کے ایک قسائی دوست نے اپنی دراز کھولی ہی تھی' انہیں آتے دیکھا' اور سمجھ نہیں پایا کہ وہ سوموار کو اتنی جلدی کیوں آ رہے ہیں' اور اس وقت تک شادی کے لیے پہنے گئے سیاہ سوٹوں میں کیوں ہیں۔ وہ انہیں جمعے کو آتے دیکھنے کا عادی تھا' مگر ذرا دیر سے' اور چمڑے کے ایپرن میں' جو وہ ذبح کرتے وقت باندھتے تھے۔ "میں سمجھا کہ وہ اتنے نشے میں ہیں"۔ فاؤستینو سانتوس نے مجھے بتایا "کہ وہ نہ صرف یہ بھول گئے ہیں کہ کیا بجا ہے' بلکہ یہ بھی کہ کون سا دن ہے"۔ اس نے انہیں یاد دلایا کہ آج سوموار ہے۔

"یہ سب کو معلوم ہے' بے وقوف"۔ پابلو ویکاریو نے اسے خوش طبعی سے جواب دیا۔ "ہم صرف اپنے چھرے تیز کرنے آئے ہیں"۔

انہوں نے چھروں کو سان پر چڑھایا۔ ہمیشہ کی طرح پیدرو چھروں کو پکڑے ہوئے تھا اور انہیں پتھر پر تیز کر رہا تھا' اور پابلو پہیے کو گھما رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دوسرے قسائیوں سے شادی کی شان و شوکت کے متعلق باتیں کرتے جا رہے تھے۔ چند ایک نے' ان کے کام کے ساتھی ہونے کے باوجود اپنے حصے کا کیک نہ ملنے کی شکایت کی' اور انہوں نے بھجوانے کا وعدہ کیا۔ آخر کار' انہوں نے چھروں کو پتھر پر نغمہ زن کر دیا' اور پابلو نے اپنا چھرا لیمپ کے مقابل رکھا تاکہ اسٹیل جگمگا سکے۔

"ہم سانتیاگو نصر کو قتل کرنے جا رہے ہیں"۔ اس نے کہا۔

نیک آدمیوں کی حیثیت سے ان کی شہرت اتنی مستحکم تھی کہ کسی نے ان کی بات پر توجہ نہیں دی۔ "ہم نے سمجھا یہ شرابیوں کی بکواس ہے"۔ کئی قسائیوں نے بیان دیا۔ یہی وکتوریا گزمان اور کئی اور لوگوں کا بیان تھا' جنہوں نے انہیں بعد میں دیکھا۔ کچھ دنوں کے بعد میں قسائیوں سے پوچھنے والا تھا کہ آیا ذبح کرنے کا کسب ایسی روح کی نشان دہی نہیں کرتا جو کسی انسان کے قتل پر پہلے سے مائل ہو۔ انہوں نے احتجاج کیا: "کسی بچھڑے کو ذبح کرنے والا اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی ہمت نہیں کرتا"۔ ان میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے ذبح کیے ہوئے جانور کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ ایک اور نے بتایا کہ وہ جس گائے کو پہلے سے جانتا ہو' اسے ذبح کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا' اور اگر اس نے اس کا دودھ بھی پیا ہو تو ذبح کرنے کا امکان اور بھی کم ہو گیا۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ ویکاریو برادران اپنے پالے ہوئے سوروں کو ذبح کرتے تھے' جن سے وہ اتنے مانوس تھے کہ انہیں ان کے ناموں سے پکارتے تھے۔ "یہ سچ ہے" ان میں سے ایک نے کہا "مگر یہ بھی یاد رہے کہ انہوں نے سوروں کو آدمیوں کے نہیں بلکہ پھولوں کے نام دیے تھے"۔ بس ایک فاؤستینو سانتوس تھا جس نے پابلو ویکاریو کی دھمکی میں سچائی کی جھلک محسوس کی تھی' اور اس نے ان سے مذاق میں پوچھا تھا کہ انہیں سانتیاگو نصر کو کیوں قتل کرنا پڑ رہا ہے' جب کہ کئی اور

دولت مند موجود ہیں، جو پہلے مارے جانے کے مستحق ہیں۔
"سانتیاگو نصر جانتا ہے کیوں"۔ پیدرو نے جواب دیا۔
فاؤستینو سانتوس نے مجھے بتایا کہ اس وقت اسے شک پڑ گیا تھا، اور اس نے ایک پولیس والے کو، جو میئر کے ناشتے کے لیے ایک پونڈ کلیجی لینے آیا تھا، یہ اطلاع دے دی تھی۔ مسل کے مطابق اس پولیس والے کا نام لیاندرو پورنوئے تھا، اور وہ اس کے ایک سال بعد، قومی تعطیل کے دوران گردن کی رگ میں بیل کا سینگ لگ جانے سے ہلاک ہو گیا تھا، اس لیے میں کبھی اس سے بات کرنے کا موقع نہیں حاصل کر سکا، مگر کلوتیلدے آرمنتا نے تصدیق کی کہ وہ اس کی دکان پر، جہاں ویکاریو برادران انتظار کر رہے تھے، آنے والا پہلا آدمی تھا۔

کلوتیلدے آرمنتا نے اسی وقت کاؤنٹر کے پیچھے اپنے شوہر کی جگہ سنبھالی تھی۔ یہ ان کا طریق کار تھا۔ دکان صبح کو دودھ اور دن کو سودا سلف بیچتی، اور شام کے چھ بجے کے بعد شراب خانہ ہو جاتی۔ کلوتیلدے آرمنتا صبح ساڑھے تین بجے اسے کھولتی تھی۔ اس کا نیک شوہر، دون رحیلیو دے لا فلور، بند ہونے کے وقت تک شراب خانے کی ذمے داری سنبھالتا۔ مگر اس رات شادی کی وجہ سے اتنے زیادہ غیر متوقع خریدار آتے گئے کہ وہ اسے بند کیے بغیر تین بجے سونے چلا گیا، اور کلوتیلدے آرمنتا معمول سے پیشتر آ گئی تھی، کیوں کہ وہ بشپ کے آنے سے پہلے کام ختم کرنا چاہتی تھی۔
ویکاریو برادران چار دس پر آئے۔ اس وقت کھانے کی آخری چیز بھی بک چکی تھی، مگر کلوتیلدے آرمنتا نے انہیں گنے کی شراب کی ایک بوتل پیش کی، نہ صرف یوں کہ وہ ان کے لیے زیادہ احترام رکھتی تھی، بلکہ اس لیے بھی کہ وہ شادی کے کیک کے اس حصے کے لیے جو انہوں نے اسے بھجوایا تھا، بہت ممنون تھی۔ وہ پوری بوتل دو طویل گھونٹوں میں پی گئے، مگر ان پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ "وہ حواس باختہ تھے" کلوتیلدے آرمنتا نے مجھے بتایا۔ "وہ لیمپ آئل پی کر بھی اپنے آپ میں ولولہ پیدا نہ کر پاتے"۔ انہوں نے اپنی سوتی جیکٹیں اتاریں، انہیں احتیاط سے کرسی کی پشت پر لٹکایا، اور اس سے ایک اور بوتل طلب کی۔ ان کی قمیص منجمد پسینے سے داغ دار تھی اور ایک دن کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی نے ان کو جنگل نشیں کی سی شان عطا کر دی تھی۔ انہوں نے دوسری بوتل، سڑک کے پار پلاسید الینیرو کے مکان کی طرف، جہاں کھڑکیوں میں تاریکی تھی، غور سے دیکھتے ہوئے، زیادہ سکون سی بیٹھ کر پی۔ بالکنی پر سب سے بڑی کھڑکی سانتیاگو نصر کی خواب گاہ کی تھی۔ پیدرو ویکاریو نے کلوتیلدے آرمنتا سے پوچھا کہ کیا اس نے اس کھڑکی میں کوئی روشنی دیکھی ہے اور اس نے نفی میں جواب دیا، مگر یہ سوال اسے غیر مانوس معلوم ہوا۔
"کیا اسے کچھ ہو گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں" پیدرو ویکاریو نے جواب دیا۔ "بس ہم لوگ اسے قتل کرنے کے لیے ڈھونڈ رہے ہیں"۔
یہ اتنا بے ساختہ جواب تھا کہ اسے یقین نہیں آیا کہ اس نے صحیح سنا ہے، مگر اس نے دیکھا کہ وہ دونوں باورچی خانے کی صافی میں لپٹے دو قصابی چھرے لیے ہوئے ہیں۔
"اور کیا کوئی جان سکتا ہے کہ تم لوگ کیوں اسے صبح سویرے قتل کرنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔
"اسے معلوم ہے کیوں!" پیدرو ویکاریو نے جواب دیا۔
کلوتیلدے آرمنتا نے سنجیدگی سے ان کا جائزہ لیا۔ وہ انہیں اچھی طرح جانتی تھی کہ الگ الگ پہچان سکتی تھی، خاص طور پر جب سے پیدرو ویکاریو فوج سے لوٹا تھا۔ "وہ دو بچوں کی طرح لگ رہے تھے"۔ اس نے مجھے بتایا۔ اور یہ بات اسے لرزا گئی، کیوں کہ ہمیشہ سے اس کا خیال تھا بچے ہی سب کچھ کر گزرنے کے اہل ہیں۔ اس لیے اس نے دودھ کے جگ تیار کرنے ختم کیے اور اپنے شوہر کو جگانے چلی گئی تاکہ اسے بتا سکے کہ دکان پر کیا ہو رہا ہے۔ دون رحیلیو دے لا فلور نے نیم بیداری کی حالت میں اس کی بات سنی۔
"بے وقوف مت بنو"۔ اس نے کلوتیلدے آرمنتا سے کہا۔ "وہ دونوں کسی کو بھی قتل نہیں کرنے والے ہیں، اور کسی دولت مند کو تو بالکل بھی نہیں"۔
جب کلوتیلدے آرمنتا دکان پر لوٹی، وہ دونوں سپاہی لیاندرو پورنوئے سے، جو میئر کے لیے دودھ لینے آیا تھا، بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ یہ نہیں سن سکی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، مگر جس طرح سے لیاندرو پورنوئے نے جاتے ہوئے چھروں پر نظر ڈالی، اس کا خیال تھا کہ انہوں نے اسے اپنے ارادے سے کچھ نہ کچھ آگاہ کر دیا تھا۔
کرنل لزارو آپونتے چار سے ذرا پہلے اٹھا تھا۔ وہ ڈاڑھی بنانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ سپاہی لیاندرو پورنوئے نے اس پر ویکاریو برادران کے عزائم کا انکشاف کیا۔ کرنل لزارو آپونتے نے گزشتہ رات دوستوں کے درمیان اتنے

جھگڑوں کا تصفیہ کرایا تھا کہ وہ ایک اور کے تصفیے کے لیے عجلت میں نہیں تھا۔ اس نے آرام سے لباس تبدیل کیا اور اپنی بو کئی بار باندھی یہاں تک کہ وہ بالکل درست بندھ گئی' اور بشپ کی پذیرائی کے لیے اپنی گردن مئی کے اجتماع کی ڈھیلی ڈھالی آستینوں والی عبا لٹکائی۔ جب وہ تلی ہوئی پیاز کے حلقوں کے ساتھ بھنی ہوئی کلیجی کا ناشتا کر رہا تھا' اس کی بیوی نے اس کو بہت ہیجان کے ساتھ بتایا کہ بیار دوسان رومان انجلا ویکاریو کو اس کے گھر واپس کر آیا ہے' مگر اس نے اس بات کو ڈرامائی انداز میں نہیں دیکھا۔

"خداوندا!" اس نے مسخرے پن سے کہا۔ "بشپ کیا سوچے گا"۔

مگر اس کے باوجود' ناشتا ختم کرنے سے پہلے اسے یاد آ گیا کہ سپاہی نے اسے کیا بتایا تھا' اس نے خبر کے دونوں اجزا کو ساتھ ساتھ رکھا اور فوراً دیکھ لیا کہ وہ چیستاں کے دو ٹکڑوں کی طرح جڑ جاتے ہیں۔ پھر وہ نئی گودی کے ساتھ کی شاہراہ پر چلتا ہوا چوک پر پہنچا جہاں مکانات بشپ کی آمد کے لیے روشن ہونے شروع ہو گئے تھے۔ "میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت تقریباً پانچ بجے تھے اور بارش شروع ہو گئی تھی"۔ کرنل لزارو آپونتے نے مجھے بتایا۔ راستے میں تین آدمیوں نے اسے رازدارانہ یہ بتانے کے لیے روکا کہ ویکاریو برادران سانتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں' مگر صرف ایک شخص نے اسے بتایا کہ وہ کس جگہ ہیں۔

اس نے انہیں کلوتیلدے آرمنتا کی دکان پر پایا۔ "جب میں نے انہیں دیکھا تو میں نے سوچا کہ وہ شیخی خوروں کے جوڑے کے سوا کچھ نہیں"۔ اس نے مجھ سے اپنی ذاتی منطق کے تحت کہا "کیوں کہ وہ اتنے مدہوش نہیں تھے جتنا میرا خیال تھا"۔ نہ ہی اس نے ان سے ان کے ارادوں کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اس نے انہیں اسی خود اعتمادی سے برتا جس سے اس نے اپنی بیوی کے اشتباہ کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔

"ذرا سوچو"۔ اس نے ان سے کہا۔ "بشپ نے اگر تمہیں اس حالت میں دیکھا تو کیا کہے گا"۔

وہ چلے گئے۔ کلوتیلدے آرمنتا نے میئر کے سرسری رویے کی وجہ سے ایک اور دل شکستگی سہی' کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ حقیقت کے واضح ہونے تک اسے ضرور ان کو حراست میں لے لینا چاہیے تھا۔ کرنل آپونتے نے آخری دلیل کے طور پر چھرے اس کے سامنے رکھ دیئے۔

"اب ان کے پاس کسی کو قتل کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے"۔ اس نے کہا۔

"یہ وجہ نہیں"۔ کلوتیلدے آرمنتا نے کہا۔ "یہ ان غریب لڑکوں کو اس مہیب فرض سے آزاد کرنے کے لیے ضروری ہے جو ان پر عائد ہو گیا ہے"۔

اس نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ویکاریو برادران حکم کو بجا لانے میں اتنے پرجوش نہیں ہیں جتنا کہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرنے میں جو انہیں روک دینے کی ان پر نوازش کر سکے۔ مگر کرنل آپونتے کی روح بے سکون نہیں تھی۔

"کوئی بھی صرف شبے میں گرفتار نہیں کیا جاتا"۔ اس نے کہا۔ "مگر اب سانتیاگو نصر کو آگاہ کرنے کا معاملہ ہے۔ اور نیا سال مبارک"۔

کلوتیلدے آرمنتا ہمیشہ یاد رکھنے والی تھی کہ کرنل آپونتے کی گول مٹول وضع دیکھ کر وہ ایک عجیب سے تاسف میں مبتلا ہو جاتی تھی' مگر اس کے برعکس مجھے یاد ہے کہ وہ ایک خوش طبع آدمی تھا۔ ہاں تنہائی میں روحانی مشقیں' جو اس نے ڈاک کے ذریعے سیکھی تھیں' جاری رکھنے کی وجہ سے ذرا کھسکا ہوا تھا۔ اس سوموار کو اس کا طرز عمل اس کی حماقت کا آخری ثبوت تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے سانتیاگو نصر کے بارے میں' جب تک اسے گودی پر نہیں دیکھا' دوبارہ سوچا تک نہیں' اور تب اس نے اپنے آپ کو صحیح فیصلہ کرنے پر مبارکباد دی۔

ویکاریو برادران نے دودھ خریدنے کے لیے آنے والے ایک درجن سے زیادہ لوگوں کو اپنا منصوبہ بتایا' اور انہوں نے اسے سب میں چھ بجے سے پہلے پھیلا دیا۔ کلوتیلدے آرمنتا کو ناممکن لگتا تھا کہ سڑک کے پار مکان میں یہ خبر نہ پہنچی ہو۔ اس کا خیال تھا کہ سانتیاگو نصر وہاں نہیں ہے کیوں کہ اس نے شب خوابی کے کمرے میں روشنی ہوتے نہیں دیکھی تھی' اور اس نے جس سے بھی ممکن ہوا' درخواست کی کہ وہ اسے دیکھتے ہی خبردار کر دیں۔ اس نے فادر امادور تک کو سرخدمت نوآموز کے ذریعے' جو راہباؤں کے لیے دودھ لینے آئی تھی' اطلاع بھجوائی۔ چار بجے کے بعد جب اس نے پلاسید الینیرو کے باورچی خانے میں روشنی دیکھی' آخری ہنگامی پیغام وکتوریا گزمان کو گداگر عورت کے ذریعے بھیجا جو ہر روز اس سے خدا کے نام پر تھوڑا سا دودھ مانگنے آتی تھی۔ جب بشپ کی کشتی نعرہ زن ہوئی' تقریباً ہر آدمی

اس کا استقبال کرنے کے لیے بیدار تھا اور ہم میں سے بہت کم ایسے تھے جو نہ جانتے ہوں کہ ویکاریو برادران سانتیاگو نصر کا اس کو قتل کرنے کے لیے انتظار کر رہے ہیں' اور اس کے علاوہ ان کے ایسا کرنے کی وجہ بھی آخری جزئیات کے ساتھ مشہور ہو چکی تھی۔

کلوتیلدے آرمنتا نے دودھ تقسیم کرنا ابھی ختم نہیں کیا تھا کہ ویکاریو برادران اخباروں میں لپٹے ہوئے دوسرے چھروں کے ساتھ لوٹ آئے۔ ایک زنگ آلود لمبے پھل والا چہار قاش' بارہ انچ لمبا اور تین انچ چوڑا' جو پیدرو ویکاریو نے اس زمانے میں جب جرمن چھرے جنگ کی وجہ سے دستیاب نہیں ہو رہے تھے' منبت کاری کے آرے کی دھات سے بنایا تھا۔ دوسرا چھوٹا تھا مگر چوڑا اور خم دار۔ تفتیش کرنے والے نے اپنی مسل میں ان کے خاکے بنائے تھے' شاید اسے ان کو لفظوں میں بیان کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ اس نے بس اتنا لکھنے کی جسارت کی تھی کہ یہ چھوٹی سی تلوار کی طرح نظر آ رہا تھا۔ یہی وہ چھرا تھا' جس سے جرم پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ دونوں چھرے بھدے اور کثرت سے استعمال شدہ تھے۔

فاؤستینو سانتوس سمجھ نہیں پایا کہ انہیں کیا ہو گیا ہے۔ "وہ اپنے چھرے دوسری بار تیز کرنے آئے تھے"۔ اس نے مجھے بتایا۔ "اور ایک بار پھر لوگوں کو سنانے کے لیے چیخ رہے تھے کہ وہ سانتیاگو نصر کی انتڑیاں باہر نکالنے جا رہے ہیں' اس لیے میں نے سمجھا کہ وہ چھیڑ چھاڑ کر رہے ہیں' خاص طور پر یوں بھی کہ میں نے چھروں پر توجہ نہیں دی تھی اور فرض کر لیا تھا کہ وہ پہلے والے ہی ہیں"۔ اس بار بہرحال کلوتیلدے آرمنتا نے انہیں آتے دیکھ کر محسوس کر لیا کہ ان میں پہلے جیسا عزم نہیں ہے۔

دراصل ان میں پہلا اختلاف ہو چکا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنی ظاہری مشابہت کے باوجود باطن میں کہیں زیادہ مختلف تھے' بلکہ ہنگامی صورت حال میں وہ متضاد رد عمل کا اظہار کرتے تھے۔ ہم' ان کے دوست' یہ بات گرامر اسکول کے زمانے سے محسوس کر چکے تھے۔ پابلو ویکاریو اپنے بھائی سے چند منٹ بڑا تھا اور عنفوان شباب تک وہ زیادہ پر تخیل اور راسخ ارادوں والا تھا۔ پیدرو ویکاریو مجھے ہمیشہ زیادہ جذباتی اور اسی حوالے سے زیادہ پر تحکم لگتا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ بیس سال کی عمر میں خود کو فوجی خدمت کے لیے پیش کیا تھا۔ پابلو ویکاریو کو مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا تا کہ وہ گھر پر رہ کر خاندان کی پرورش کر سکے۔ پیدرو ویکاریو نے گیارہ ماہ گشتی پولیس میں خدمت انجام دی تھی۔ فوجی ضابطگی نے' موت کے خوف سے اور زیادہ شدید ہو کر' اس کی حکم دینے' اور اپنے بھائی کے لیے بھی خود فیصلہ کرنے کی عادت کو پختہ کر دیا تھا۔ وہ سارجنٹس بلنوراجیا کے مرض کے ساتھ لوٹا جو فوجی معالجے کے انتہائی بہیمانہ طریقوں اور ڈاکٹر دیونیسیو اگوار ان کے آرسینک کے انجکشنوں اور تطہیری پرمینگنیٹ کی خوراکوں کے باوجود باقی تھا۔ صرف جیل میں اس کا علاج کرنے میں کامیابی ہو سکی۔ ہم' ان کے دوستوں' نے اتفاق کیا کہ پابلو ویکاریو نے اچانک ایک چھوٹے بھائی کی سی تابعداری پیدا کر لی' جب پیدرو ویکاریو عسکری ترنگ' اور ہر اس شخص کے لیے جسے اس کے بائیں پہلو میں گولی کا زخم اور اس کے نیچے بندھے فلیتے کو دیکھنے کی خواہش ہو' اپنی قمیص اٹھانے کی نئی شعبدہ بازی کے ساتھ واپس آیا۔ پابلو ویکاریو نے اس عظیم شخص کے بلنوراجیا تک کے لیے' جسے وہ جنگی تمغے کی طرح سجائے پھر رہا تھا' ایک تحسین کا جذبہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

پیدرو ویکاریو کے اعتراف کے مطابق سانتیاگو نصر کے قتل کا فیصلہ اس نے کیا تھا اور شروع میں اس کے بھائی نے صرف اس کی تقلید کی تھی' مگر یہ سوچنے والا بھی وہی تھا کہ میئر کے ان کو غیر مسلح کر دینے کے بعد ان کا فرض پورا ہو گیا ہے' اور اس کے بعد پابلو ویکاریو نے کمان سنبھال لی تھی۔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی اس اختلاف کا تفتیش کرنے والے سے' اپنے جدا جدا بیانات میں' ذکر نہیں کیا۔ مگر پابلو ویکاریو نے مجھ سے کئی بار تصدیق کی کہ اپنے بھائی کو آخری اقدام پر آمادہ کرنا اس کے لیے آسان کام نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اصل میں یہ دہشت زدگی کی ایک لہر سے زیادہ نہ رہا ہو' مگر حقیقت یہ ہے کہ پابلو ویکاریو باڑے میں دوسرے دو چھروں کو لانے اکیلا گیا جب کہ اس کا بھائی ثمرہند کے درختوں کے نیچے پیشاب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے' قطرہ بہ قطرہ' بڑی اذیت میں تھا۔ "میرا بھائی کبھی نہ جان سکا کہ وہ کیسا عذاب تھا"۔ پیدرو ویکاریو نے مجھ سے اپنی واحد ملاقات میں کہا۔ "ایسا لگتا تھا جیسے پیشاب کی جگہ شیشے کی کرچیاں نکل رہی ہوں"۔ پابلو ویکاریو نے' جب وہ چھروں کو لیے واپس ہوا' اسے درخت سے لپٹا ہوا پایا۔ "اسے تکلیف سے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے"۔ اس نے مجھے بتایا "اور اس نے مجھے تنہا جانے کو کہنا چاہا' کیوں کہ وہ کسی کو قتل کرنے کی

صورت حال میں نہیں تھا"۔ وہ ان درختوں کے نیچے ان ترکھانی بنچوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا جو انہوں نے شادی کی دعوت کے لیے رکھی تھیں' اور اس کی پتلون گھٹنوں تک گری ہوئی تھی۔ "اس نے تقریباً آدھا گھنٹا اس پٹی کو تبدیل کرنے میں لگایا جس میں اس نے اپنا رکن لپیٹا ہوا تھا"۔ پابلو ویکاریو نے مجھے بتایا۔ اصل میں اس نے دس منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی' مگر پابلو ویکاریو کے لیے حرکت اتنی دشوار اور تعجب خیز تھی کہ اس نے اسے اپنے بھائی کی' وقت کو صبح ہونے تک ضائع کرنے کے لیے' کسی نئی شعبدہ بازی سے تعبیر کیا' اس لیے اس نے چھرا ہاتھ میں پکڑا' اور تقریباً بہ زور اسے اپنی بہن کی کھوئی ہوئی عزت کی تلاش میں کھینچ لے گیا۔

"اس کے سوا کوئی راستہ نہیں"۔ اس نے کہا۔ "یہ تو اب طے ہو چکا ہے"۔

وہ سوروں کے باڑے کے دروازے سے ننگے چھرے لیے' صحن میں تعاقب کرتے ہوئے کتوں کے شور کے ساتھ نکلے۔ روشنی ہونے لگی تھی۔ "بارش نہیں ہو رہی تھی"۔ پابلو ویکاریو کو یاد تھا۔ "ہو رہی تھی"۔ پیدرو نے یاد کیا۔ "سمندری ہوا چل رہی تھی اور کوئی ستاروں کو اس وقت بھی اپنی انگلیوں سے گن سکتا تھا"۔ خبر اس وقت تک اتنی اچھی طرح پھیل چکی تھی کہ اور تسا باؤ نے اپنا دروازہ عین اس وقت کھولا جب وہ اس کے مکان کے سامنے سے گزر رہے تھے' اور وہ سانتیاگو نصر کے لیے رونے والوں میں پہلی تھی۔ "میں سمجھی کہ انہوں نے اسے قتل کر دیا ہے"۔ اس نے مجھے بتایا۔ "کیوں کہ میں نے چھروں کو اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں دیکھا اور مجھے یوں لگا کہ ان سے خون ٹپک رہا ہے"۔ اس بے محل شاہراہ پر کھلنے والے چند مکانوں میں سے ایک پابلو ویکاریو کی منگیتر پرودنسیا کوتیس کا تھا۔ جب بھی وہ دونوں وہاں سے گزرتے' خاص طور پر جمعے کے دن بازار جاتے ہوئے' وہ اندر آ کر دن کا پہلا کافی کا پیالا پیتے تھے۔ وہ دروازے کو دھکا دے کر صحن میں داخل ہوئے اور کتوں کے محاصرے میں' جنہوں نے صبح کی مدھم روشنی میں انہیں پہچان لیا تھا' پرودنسیا کوتیس کی ماں کو باورچی خانے میں سلام کیا۔ کافی ابھی تیار نہیں ہوئی تھی۔

"بعد میں سہی"۔ پابلو ویکاریو نے کہا۔ "ابھی ہم جلدی میں ہیں"۔

"میں سمجھ سکتی ہوں میرے بچو"۔ وہ بولی۔ "عزت انتظار نہیں کرتی"۔

بہرصورت' انہوں نے انتظار کیا' اور اس بار یہ پیدرو ویکاریو تھا جس نے سوچا کہ اس کا بھائی عمداً وقت ضائع کر رہا ہے۔ جب وہ کافی پی رہے تھے' پرودنسیا کوتیس' عنفوان شباب کی پوری رعنائی میں' پرانے اخباروں کا ایک ڈھیر اسٹوو کی آگ کو تازہ کرنے کے لیے ساتھ لے کر باورچی خانے میں آئی۔ "مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں"۔ اس نے مجھے بتایا۔ "اور میں نے نہ صرف اتفاق کیا' بلکہ میں کبھی اس سے شادی نہ کرتی اگر اس نے وہ نہ کیا ہوتا جو ایک مرد پر لازم تھا"۔ باورچی خانے سے جاتے ہوئے پابلو ویکاریو نے اس سے اخباروں کے دو ورق لیے' اور ان میں سے ایک اپنے بھائی کو چھرے لپیٹنے کے لیے دیا۔ پرودنسیا کوتیس باورچی خانے کے دروازے کے پاس کھڑی' صحن کے دروازے سے باہر چلے جانے تک انہیں دیکھتی رہی اور اس نے تین سال تک' حوصلہ شکنی کے ایک لمحے کے بغیر' انتظار کیا' یہاں تک کہ پابلو ویکاریو جیل سے باہر آیا اور زندگی بھر کے لیے اس کا شوہر بن گیا۔

"اپنا ٹھیک طرح سے خیال رکھنا"۔ اس نے ان سے کہا۔

اس طرح کلوتیلدے آرمنتا کے پاس یہ محسوس کرنے کی معقول وجہ تھی کہ وہ دونوں پہلے جیسے پرعزم نہیں رہ گئے ہیں' اور اس نے انہیں رانگٹ رم کی ایک بوتل اس امید میں پیش کی کہ وہ ان کو مکمل مدہوش کر دے گی۔ "اس دن"۔ اس نے مجھے بتایا۔ "مجھے اندازہ ہوا کہ ہم عورتیں دنیا میں کتنی تنہا ہیں"۔ پیدرو ویکاریو نے اس سے کہا کہ وہ اپنے شوہر سے ڈاڑھی بنانے کا سامان مانگ لائے' اور وہ اس کے لیے برش' صابن' آویزاں آئینہ اور نئے بلیڈ والا سیفٹی ریزر لے آئی' مگر اس نے اپنے قصابی چھرے سے ڈاڑھی بنائی۔ کلوتیلدے آرمنتا نے سوچا کہ یہ جارح مردانگی کی انتہا ہے۔ "وہ کسی فلم کے قاتل کی طرح لگ رہا تھا"۔ اس نے مجھے بتایا۔ مگر جیسا کہ پیدرو ویکاریو نے مجھے بعد میں بتایا' اور یہ درست بھی تھا' فوج میں اس نے سیدھے استرے سے ڈاڑھی بنانا سیکھ لیا تھا اور اس کے بعد وہ کسی اور طرح سے ڈاڑھی نہیں بنا سکتا تھا۔ اس کے بھائی نے' اس کے برعکس' زیادہ انکسار کے ساتھ' دون روحیلیو دے لافلور سے مستعار لیے ہوئے سیفٹی ریزر سے ڈاڑھی بنائی۔ آخر میں انہوں نے خاموشی سے' سحر خیزوں کی سی سادہ لوحی کے ساتھ' سڑک

کے پار مکان کی تاریک کھڑکی کو تکتے ہوئے' بہت دھیرے دھیرے رم کی بوتل ختم کی' جس کے دوران فرضی گاہک' اس دودھ کو خریدنے جو انہیں درکار نہیں تھا' اور ان خوردنی اشیاء کو طلب کرتے ہوئے جو وہاں موجود نہیں تھیں' دکان میں یہ دیکھنے کی غرض سے آتے رہے کہ آیا یہ درست ہے کہ وہ سانتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

ویکاریو برادران کبھی اس کھڑکی کو روشن نہیں دیکھنے والے تھے۔ سانتیاگو نصر چار بیس پر گھر آیا' مگر اسے شب خوابی کے کمرے تک پہنچنے کے لیے کسی بتی کو جلانے کی ضرورت نہیں پڑی کیوں کہ جائے در کا بلب تمام رات جلتا رہا تھا۔ اس نے خود کو تاریکی میں' کپڑوں سمیت' بستر پر گرا دیا کیوں کہ اس کے پاس سونے کے لیے صرف ایک گھنٹا بچا تھا' اور وکتوریا گزمان نے اسے اسی حالت میں پایا جب وہ اسے بشپ کے استقبال کو جانے کے لیے نیند سے جگانے آئی۔ ہم ماریا الیھاندرینا سروانتس کے ہاں تین بجے کے بعد تک ساتھ رہے تھے' جب اس نے خود موسیقاروں کو رخصت کیا اور رقص کے صحن کی بتیاں بجھائیں تا کہ اس کی عیش آفریں ملاتو لڑکیاں تنہا بستر پر جا سکیں اور تھوڑا سا آرام کر لیں۔ وہ تین دن سے' رکے بغیر' پہلے مہمانان تکریمی کی دربردہ دلگیری' اور پھر ہم میں سے ان کی جو اس وقت تک شادی کی ہنگامہ خیزیوں کے باوجود ناآسودہ تھے' واشگاف دل بستگی میں مصروف تھیں۔ ماریا الیھاندرینا سروانتس' جس کے بارے میں ہم کہا کرتے تھے کہ وہ صرف ایک بار سونے جائے گی اور یہ مرنے کے لیے ہو گا' ان تمام عورتوں میں جن سے میں اپنی زندگی میں واقف ہوا' سب سے زیادہ خوش ادا اور سب سے زیادہ نرم و نازک عورت تھی' اور بستر میں سب سے زیادہ قابل استفادہ' مگر وہ سب سے زیادہ سخت گیر بھی تھی۔ وہ یہیں پلی بڑھی اور یہیں کھلے دروازوں والے ایک مکان میں رہتی تھی جس میں کئی عاریتی کمرے اور پاراماریبو کے چینی بازار سے لائی ہوئی تونبی لالٹینوں سے آراستہ' رقص کا ایک وسیع صحن بھی تھا۔ یہ وہی تھی جس نے میرے ہم عصروں کو کنوارپن سے آزاد کیا۔ اس نے ہمیں اس سے کہیں زیادہ سکھایا جتنا ہمیں سیکھنا چاہیے تھا' مگر اس نے ہمیں سب سے بڑھ کر یہ سکھایا کہ زندگی میں خالی بستر سے زیادہ اداس کوئی جگہ نہیں۔ سانتیاگو نصر اسے پہلی بار دیکھتے ہی حواس کھو بیٹھا تھا۔ میں نے اسے خبردار کیا: "وہ شاہین جو کسی مبارز طلب کونج کا تعاقب کرے' اسے صرف ایک اندوہناک زندگی کی امید رکھنی چاہیے"۔ مگر' ماریا الیھاندرینا سروانتس کی پرفریب پیش رفت سے مسحور ہو کر' اس نے میری نہیں سنی تھی۔ وہ اس کا جنون تھی' پندرہ سال کی عمر میں اس کے آنسوؤں کی معشوق تھی' یہاں تک کہ ابراہیم نصر نے اپنے بیٹے کو ایک چابک کی مدد سے بستر سے باہر نکالا اور ایک سال سے زیادہ کے لیے ڈیوائن فیس میں بند کر دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ان میں' محبت کے اختلال کے بغیر' ایک مضبوط ربط قائم تھا' اور وہ اس کا اتنا پاس رکھتی تھی کہ اس کی موجودگی میں کسی اور کے ساتھ کبھی بستر پر نہیں گئی۔ ان آخری تعطیلات میں وہ تھکن کا بہانہ کر کے ہمیں جلدی بھگا دیا کرتی' مگر دالان کو روشن' اور دروازے کو آنگل چڑھائے بغیر چھوڑ دیتی تا کہ میں چھپ کر آ سکوں۔

سانتیاگو نصر میں بھیس بدلنے کا ایک سحر آمیز جوہر تھا' اور اس کا دل پسند مشغلہ ملاتو لڑکیوں کی شناخت تبدیل کر دینا تھا۔ وہ ایک کی کپڑوں کی الماری کو اجاڑ کر دوسری کا بھیس بدل دیتا' اور وہ تمام خود کو اپنے آپ سے مختلف' اور ان کی طرح جو وہ نہیں تھیں' محسوس کرنے لگتیں۔ ایک خاص موقعے پر ان میں سے ایک لڑکی نے خود کو ایک اور میں اتنے مکمل طور پر دہرایا ہوا پایا کہ اس پر رونے کا دورہ پڑ گیا۔ "مجھے لگا کہ میں آئینے سے نکل کر آ گئی ہوں"۔ اس نے کہا۔ مگر اس رات ماریا الیھاندرینا سروانتس نے سانتیاگو نصر کو آخری بار بھیس تبدیل کرنے والے کی حیثیت سے شعبدہ بازی میں مشغول ہونے نہیں دیا' اور یہ اس نے اتنے فاش بہانے سے کیا کہ اس کی یاد کی چھوڑی ہوئی تلخی نے اس کی زندگی بدل دی۔ اس لیے ہم نے سیرینادوں کا گشت کرنے کے لیے موسیقاروں کو اپنے ساتھ لیا' اور تقریب کو اپنے طور پر جاری رکھا' جب کہ ویکاریو برادران سانتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ خیال اسی کو آیا تھا کہ ہیوس کے مکان کی پہاڑی پر جا کر نوعروسوں کے لیے گیت گایا جائے۔

نہ صرف ہم نے کھڑکی کے نیچے گیت گایا بلکہ باغوں میں آتش بازیاں بھی چھوڑیں۔ اس کے باوجود ہمیں فارم ہاؤس میں زندگی کی کوئی علامت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ ہمارے تصور میں بھی نہیں آیا کہ وہاں کوئی نہیں ہو گا' خاص طور پر اس لیے بھی کہ کھلی ہوئی چھت والی' اور جشن کے لیے ساٹن کے ربن اور مومی اورنج بلاسم کے گلدستوں سے آراستہ' نئی کار اس وقت دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ میرے بھائی

لوئس ایزیک نے' جو اس وقت ایک پیشہ ور کی طرح گٹار بجاتا تھا' نوعروسوں کے اعزاز میں فی البدیہہ ایک ذومعنی نغمہ بنایا۔ اس وقت تک بارش نہیں ہوئی تھی۔ اس کے برعکس' چاند آسمان پر بلند تھا' اور ہوا شفاف تھی' اور پہاڑی کے قدموں میں قبرستان سے آتی ہوئی ایلمو کی آگ کی جھلملاہٹ دیکھی جاسکتی تھی۔ دوسری جانب چاندنی میں کیلے کے نیلگوں باغات' حزن آلود دلدلوں اور کریبین کے ضیاپاش افق کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ سانتیاگو نصر نے سمندر میں ایک جلتی بجھتی روشنی کی طرف اشارہ کیا اور ہمیں بتایا کہ وہ ایک غلام بردار جہاز کی' اذیت میں گرفتار روح ہے جو سینیگال سے سیاہ فاموں کے بار کے ساتھ کارتاجینا دے آندیاز کی مرکزی بندرگاہ کے داہنے کے بالمقابل غرق ہوا تھا۔ یہ سوچنا ناممکن تھا کہ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا ہوگا' ہرچند کہ اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ انجلا ویکاریو کی ایک روزہ عروسانہ زندگی دو گھنٹے پہلے اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ بیاردو سان رومان اسے اس کے والدین کے ہاں پیدل لے گیا تھا تاکہ موٹر کی آواز اس کی بدقسمتی کو قبل از وقت افشا نہ کردے' اور وہ وہاں سے ہیوس کے پرمسرت فارم ہاؤس کی تاریکی تک تنہا واپس آیا تھا۔

جب ہم پہاڑی سے اترے تو میرے بھائی نے ہمیں بازار میں ایک دکان پر بھنی ہوئی مچھلیوں کا ناشتا کرنے کی دعوت دی' مگر سانتیاگو نصر نے اس کی مخالفت کی کیوں کہ وہ بشپ کے آنے سے پہلے ایک گھنٹے کی نیند لینا چاہتا تھا۔ وہ کرستو بیدویا کے ساتھ دریا کے کنارے کنارے پرانی بندرگاہ کے پاس ناداروں کی طعام گاہوں سے گزرتا ہوا گیا جو اب روشن ہونے لگی تھیں' اور کونے پر مڑنے سے پہلے اس نے ہاتھ ہلا کر ہمیں الوداع کہا۔ یہ آخری موقع تھا کہ ہم نے اسے دیکھا۔

کرستو بیدویا نے' جس سے اس نے بعد میں گودی پر ملنے کا وعدہ کیا تھا' اس سے اس کے گھر کے عقبی دروازے پر اجازت لی۔ کتے حسب معمول اسے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اس پر بھونکے مگر اس نے انہیں نیم روشنی میں اپنی چابیوں کی جھنکار سے چپ کرا دیا۔ وکتوریا گزمان کافی کی کیتلی پر نظر رکھے ہوئے تھی جب وہ باورچی خانے کے پاس سے گزرا۔ "سانتیاگو نصر"۔ اس نے پکارا۔ "کافی تیار ہونے والی ہے"۔

سانتیاگو نصر نے اس سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر بعد کافی پیئے گا اور اسے ہدایت کی کہ وہ دیوینا فلور کو اسے پانچ تیس پر اٹھانے کے لیے کہہ دے اور اس کے لیے صاف لباس بھجوا دے' بالکل ویسا ہی جیسا وہ پہنے ہوئے تھا۔ ایک لمحے بعد' جب وہ بستر پر جا چکا تھا' وکتوریا گزمان نے کلوتیلدے آرمنتا کا بھیجا ہوا پیغام دودھ مانگنے والی عورت کے ذریعے وصول کیا۔ پانچ تیس پر اس نے اسے اٹھا دینے کے حکم پر عمل کیا' مگر اس نے دیوینا فلور کو نہیں بھیجا اور شب خوابی کے کمرے میں اصلی لنن کے کپڑے لے کر خود گئی کیوں کہ وہ اپنی لڑکی کو اس محترم کے چنگل سے دور رکھنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتی تھی۔

ماریا الیخاندرینا سروانتس نے اپنے گھر کا دروازہ آگل چڑھائے بغیر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اپنے بھائی سے رخصت لی' برآمدے کو لانگھا' جس میں ملاتو لڑکیاں گل لالہ کے درمیاں سمٹ سمٹا کر سو رہی تھیں' اور شب خوابی کے کمرے کا دروازہ دستک دیئے بغیر کھولا۔ بتیاں بجھ چکی تھیں مگر جیسے ہی میں داخل ہوا مجھے ایک گرم عورت کی خوشبو محسوس ہوئی اور تاریکی میں ایک بے خواب چیتے کی آنکھیں نظر آئیں' اور پھر میں نے اپنے بارے میں گھنٹیوں کا شور شروع ہونے سے پہلے کچھ نہیں جانا۔

گھر جاتے ہوئے میرا بھائی کلوتیلدے آرمنتا کی دکان پر سگریٹ لینے رکا۔ وہ اتنی پی چکا تھا کہ اس کی یادداشت اس ملاقات کے بارے میں ہمیشہ بہت پراگندہ رہی' مگر وہ اس قاتل شراب کو فراموش نہیں کر سکا جو پیدرو ویکاریو نے اسے پیش کی۔ "وہ پگھلی ہوئی آگ تھی"۔ اس نے مجھے بتایا۔ پابلو ویکاریو' جو سو چکا تھا' اس کے آنے کی آواز سن کر جاگ اٹھا' اور اسے چھرا دکھایا۔

"ہم سانتیاگو نصر کو قتل کرنے جا رہے ہیں"۔ اس نے اسے بتایا۔

میرے بھائی کو یہ بات یاد نہیں۔ "اگر مجھے یاد بھی ہوتا' میں کبھی اس پر اعتبار نہ کرتا"۔ اس نے مجھ سے کئی بار کہا۔ "کون حرام زادہ کبھی سوچ سکتا تھا کہ وہ دونوں کسی کو قتل کر دیں گے' اور وہ بھی سوروں کے چھرے سے"۔ پھر انہوں نے اس سے پوچھا کہ سانتیاگو نصر کہاں ہے' کیوں کہ انہوں نے ان دونوں کو ساتھ دیکھا تھا' اور میرے بھائی کو اپنا جواب بھی یاد نہیں۔ مگر کلوتیلدے آرمنتا اور ویکاریو برادران اسے سن کر اتنے بدحواس ہوئے تھے کہ مسل میں اسے دو الگ

الگ بیانوں میں برقرار رکھا گیا۔ بقول ان کے میرے بھائی نے کہا تھا "سانتیاگو نصر مرچکا ہے"۔ پھر اس نے انہیں ایک کلیسائی دعا دی، چوکھٹ سے ٹکرایا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ چوک کے درمیان اس نے فادر امادور کو دیکھ کر صلیب کا نشان بنایا۔ وہ اپنی عبا میں ملبوس، گھنٹیاں بجاتے ہوئے ماتحت اور بشپ کے میدانی وعظ کے لیے محراب اٹھائے ہوئے کئی مددگاروں کے آگے آگے، گودی کی طرف جارہا تھا۔ ویکاریو برادران نے بھی انہیں گزرتا دیکھ کر صلیب کے نشانات بنائے۔

کلوتیلدے آرمنتا نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اپنی آخری امیدیں ہار دیں جب فادر امادور اس کی دکان کے پاس سے گزرا۔ "میں نے سمجھا کہ اسے میرا پیغام نہیں ملا"۔ اس نے کہا۔ اس کے باوجود فادر امادور نے برسوں بعد، کالا فل کے اداس آرام گھر میں دنیا سے کنارہ کشی کے زمانے میں، مجھ سے اعتراف کیا کہ درحقیقت اسے کلوتیلدے آرمنتا کا پیغام، اور دوسروں کے زیادہ قطعی پیغامات، جب وہ گودی پر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا، مل گئے تھے۔ "سچ بات یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرنا چاہیے"۔ اس نے مجھے بتایا۔ "میرا پہلا خیال یہ تھا کہ یہ میرا نہیں بلکہ شہری حکام کا مسئلہ ہے، مگر پھر میں نے ارادہ کیا کہ گزرتے ہوئے پلاسید الینیرو کو بتاتا جاؤں"۔ اس کے باوجود جب اس نے چوک کو پار کیا، وہ بالکل بھول چکا تھا۔ "تمہیں سمجھنا پڑے گا"۔ اس نے مجھے بتایا کہ "اس بدقسمت دن کو بشپ آرہا تھا"۔ جرم کے لمحے میں اسے اتنی ناامیدی محسوس ہوئی، اور وہ اپنے آپ سے اتنا متنفر ہوا، کہ واحد چیز جو وہ سوچ سکا، آگ لگنے کی اطلاع دینے والی گھنٹی کا بجانا تھا۔

میرا بھائی لوئس ایزیک باورچی خانے کے دروازے سے گھر میں داخل ہوا، جو میری ماں نے کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ میرا باپ ہمارے اندر آنے کی آواز نہ سن سکے۔ وہ بستر پر جانے سے پہلے غسل خانے میں گیا مگر ٹوائلٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گیا، اور جب میرا بھائی جیمے اسکول جانے کے لیے اٹھا، اس نے اسے فرش پر منہ کے بل پڑے، نیند میں گانا گاتے ہوئے پایا۔ میری راہبہ بہن، جو بشپ کا انتظار نہیں کر رہی تھی، کیوں کہ وہ اپنے جذب کے لیے اس کی محتاج نہیں تھی، اسے جاگنے پر آمادہ نہیں کر سکی۔ "پانچ بج رہے تھے جب میں غسل خانے میں گئی"۔ اس نے مجھے بتایا۔ بعد میں جب میری بہن مارگوت، گودی پر جانے سے پہلے، نہانے کے لیے غسل خانے میں گئی، بڑی جدوجہد کے بعد اسے شب خوابی کے کمرے میں گھسیٹ لانے میں کامیاب ہو سکی۔ نیند کی دوسری جانب سے اس نے بشپ کی کشتی کے اولین شور کو جاگے بغیر سنا۔ مے گساری سے چور وہ پھر گہری نیند میں چلا گیا، یہاں تک کہ میری راہبہ بہن شب خوابی کے کمرے میں آئی اور بھاگتے ہوئے اپنا کلیسائی لباس پہننے کی کوششوں کے دوران اسے اپنی پاگل چیخ سے جگا دیا:

"انہوں نے سانتیاگو نصر کو قتل کر دیا ہے"۔

لاش کو چاقوؤں سے مجروح کرنا اس بے رحم معائنے کی محض ابتدا تھی جسے انجام دینے پر فادر امادور نے ڈاکٹر دیونیسیو اگواران کی عدم موجودگی میں خود کو مجبور پایا۔ "یہ ایسا تھا کہ گویا ہم نے اس کے مرجانے کے بعد اسے از سرنو قتل کیا"۔ عمر رسیدہ فادر امادور نے مجھے کالا فل میں اپنی کنارہ کشی کے زمانے میں بتایا "مگر یہ حکم میئر کے پاس سے آیا تھا، اور اس وحشی کے احکام چاہے کتنے ہی جاہلانہ کیوں نہ ہوں، بجالانے پڑتے تھے"۔ یہ پورے طور پر درست نہیں تھا۔ اس بے سروپا سوموار کو کرنل آپونتے نے صوبے کے گورنر سے ٹیلی گراف پر ایک ہنگامی گفتگو کی تھی، اور موخرالذکر نے اسے تفتیشی مجسٹریٹ کی آمد تک ابتدائی اقدامات کی اجازت دے دی تھی۔ میئر قانونی اُمور سے بے بہرہ، ایک سابق فوجی کمانڈر تھا جس کے غرور نے اسے اجازت نہیں دی کہ وہ کسی سے پوچھ لیتا کہ اسے کہاں سے آغاز کرنا چاہیے۔

پہلا خیال جو اسے آیا وہ پس مرگ معائنے کا تھا۔ کرستو بیدویا نے، جو میڈیسن کا طالب علم تھا، سانتیاگو نصر سے اپنی قریبی دوستی کی وجہ سے، کسی نہ کسی طرح، اس میں ملوث نہ ہونے کا بندوبست کر لیا۔ میئر کا خیال تھا کہ ڈاکٹر دیونیسیو اگواران کے واپس آنے تک لاش کو ریفریجریشن میں رکھا جائے، مگر اسے قد آدم فریزر نہیں مل سکا، اور بازار میں واحد فریزر جس سے کام چل سکتا، خراب پڑا تھا۔ لاش لوہے کی ایک تنگ چارپائی پر، عوامی دیدار کے لیے، رہنے کے کمرے کے وسط میں بے کفن، رکھی گئی تھی۔ اسی دوران، اس کے لیے ایک رئیسانہ تابوت بنایا جارہا تھا۔ وہ شب خوابی کے کمروں اور چند پڑوسیوں کے گھروں سے پنکھے لے آئے تھے، مگر اتنے لوگ اسے دیکھنے کو بے تاب تھے کہ انہیں فرنیچر کو پیچھے کھسکانا، اور چڑیوں کے پنجروں اور فرن کے گملوں کو نیچے لے جانا پڑا، مگر اس کے بعد بھی وہاں گرمی ناقابل برداشت تھی۔ اس کے علاوہ، موت کی بو سے بھڑک اٹھے ہوئے کتوں

نے وحشت کو اور بڑھا دیا تھا۔ انہوں نے اس وقت سے واویلا کرنا بند نہیں کیا تھا جب میں اس گھر میں داخل ہوا تھا' اس لمحے تک سانتیاگو نصر باورچی خانے میں جاں کنی کی حالت میں پڑا تھا' اور میں نے دیوینا فلور کو اونچی چیخوں کے ساتھ روتے اور انہیں ایک ڈنڈے سے پرے ہٹاتے دیکھا۔

"میری مدد کرو"۔ اس نے چلا کر مجھ سے کہا۔ "یہ اس کی انتڑیاں کھانا چاہتے ہیں"۔

ہم نے انہیں اصطبل میں بند کر دیا۔ پلاسید الینیرو نے بعد میں حکم دیا کہ تدفین ہو جانے تک انہیں کسی بہت دور جگہ لے جایا جائے۔ مگر دوپہر کے قریب' کوئی نہیں جانتا کہ کس طرح' وہ وہاں سے نکل آئے اور پاگل ہوتے ہوئے' گھر میں گھس آئے۔ پلاسید الینیرو' صرف ایک بار اپنی گرفت کھو بیٹھی۔

"یہ غلیظ کتے!" وہ چیخی۔ "انہیں جان سے مار دو"۔

حکم پر فوری عمل در آمد کیا گیا' اور گھر پھر خاموش ہو گیا۔ اس وقت تک کسی کو لاش کی حالت کے بارے میں کوئی تشویش نہیں تھی۔ چہرہ صحیح سالم تھا' انہی تاثرات کے ساتھ جو اس پر گانا گاتے وقت تھے' اور کرستو بیدویا نے انتڑیوں کو واپس اندر ڈال دیا تھا اور لاش کو لنن کی چادر سے لپیٹ دیا تھا۔ اس کے باوجود' سہ پہر میں زخموں سے شیرے کے رنگ کا سیال بہنا شروع ہو گیا' جس پر مکھیاں جمع ہو رہی تھیں' اور ایک اودا دھبا اوپری ہونٹ پر ابھر آیا اور بہت آہستہ سے' پانی پر بادل کے سائے کی طرح' اس کی پیشانی تک پھیل گیا۔ اس کے چہرے نے' جو ہمیشہ سے دوستانہ تھا' ایک معاندانہ تاثر اختیار کر لیا' اور اس کی ماں نے اسے ایک رومال سے ڈھانک دیا۔ کرنل آپونتے نے سمجھ لیا کہ مزید تاخیر نہیں کی جا سکتی' اور اس نے فادر امادور کو معائنہ کرنے کا حکم دیا۔ "ایک ہفتے بعد قبر کھود کر اسے نکالنا اور بھی بدتر ہو گا"۔ اس نے کہا۔ فادر امادور نے سالامانکا میں میڈیسن اور سرجری پڑھی تھی' مگر فارغ التحصیل ہونے سے پہلے وہ پادریوں کی درس گاہ میں داخل ہو گیا تھا۔ میئر کو علم تھا کہ اس کے کیے ہوئے معائنے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں' اس کے باوجود اس نے اپنے حکم پر عمل کروایا۔

یہ پبلک اسکول میں' ایک دواساز' جس نے تفصیلات درج کیں' اور تعطیلات پر آئے ہوئے میڈیسن کے ایک طالب علم کی مدد سے انجام دی گئی ایک خوں ریزی تھی۔ جراحی کے صرف چند معمولی آلات دستیاب تھے' بقیہ اوزار بڑھئی کے ہاں سے آئے۔ مگر لاش پر برپا کی ہوئی تباہی سے قطع نظر' فادر امادور کی رپورٹ درست معلوم ہوتی تھی اور تفتیش کرنے والے نے اسے مسل میں ایک کار آمد دستاویز کے طور پر شامل کیا۔

متعدد زخموں میں سے سات مہلک تھے۔ سامنے کے دو شگافوں کی وجہ سے جگر' تقریباً ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اس کا پیٹ چار جگہوں پر چاک ہوا تھا' اور ان میں سے ایک وار اتنا گہرا تھا کہ اس نے معدے کے پار نکل کر لبلبے کو تباہ کر دیا تھا۔ چھ کم تر شگاف بڑی آنت کے زیریں حصے کے چوڑے رخ پر' اور کئی چھوٹی آنت پر تھے۔ صرف ایک وار نے' جو پشت کے تیسرے مہرے کی سطح پر تھا' اس کے دائیں گردے کو چھید دیا تھا۔ شکمی جوف خون کے بڑے لختوں سے بھر گیا تھا' اور معدے کے ملغوبے کے درمیان مریم کارمیل کا ایک تمغا نکلا جو سانتیاگو نصر نے چار سال کی عمر میں نگل لیا تھا۔ صدری جوف میں دو شگاف ظاہر ہوئے: ایک دائیں پہلو کے درمیانی حصے میں' جس نے پھیپھڑوں کو زخمی کیا' اور دوسرا بائیں بغل کے بالکل ساتھ۔ اس کے بازوؤں اور ہاتھوں پر بھی چھ کم تر زخم تھے اور دو افقی شگاف تھے۔ ایک دائیں ران پر اور دوسرا معدے کے عضلات میں۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک گہرا زخم تھا۔ رپورٹ میں درج ہے: "لاش مسیح مصلوب کے زخموں کا ایک نقش نظر آ رہی تھی"۔ مغز کا وزن ایک اوسط انگریز کے مغز سے ساٹھ گرام زیادہ نکلا' اور فادر امادور نے رپورٹ میں درج کیا کہ وہ اعلیٰ ذہانت اور شاندار مستقبل رکھتا تھا۔ پھر بھی' اپنے حتمی نوٹ میں اس نے جگر کے معمول سے زیادہ بڑے ہونے کی طرف اشارہ کیا جس کا اس نے یرقان کے ناقص علاج کو مورد ٹھہرایا۔ "کہنا یہ چاہیے"۔ اس نے مجھے بتایا کہ "اس کے پاس' ہر حال میں' زندگی کے چند ہی سال رہ گئے تھے"۔ ڈاکٹر دیونیسیو اگواران نے' جس نے درحقیقت سانتیاگو نصر کے یرقان کا بارہ سال کی عمر میں علاج کیا تھا' اس معائنے کو برہمی سے یاد کیا۔ "صرف کوئی راہب ہی اتنا احمق ہو سکتا ہے"۔ اس نے مجھے بتایا۔ "ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اسے سمجھایا جا سکے کہ ہم منطقہ حارہ کے باشندے ان خام گالیشیائی اسپانویوں سے بڑے جگر رکھتے ہیں"۔ رپورٹ اس نتیجے پر پہنچی کہ موت کا سبب خون کا کثیر اخراج تھا جو سات بڑے زخموں میں سے کسی ایک کی وجہ سے عمل میں آیا۔

انہوں نے ہمیں ایک بالکل مختلف لاش لوٹائی۔ کاسہ

سر کا آدھا حصہ سوراخ کرنے سے ضائع ہو چکا تھا' اور عورتوں کو یہ آسانی اپنا شیفتہ بنالینے والا چہرہ' جسے موت تک نے محفوظ رکھا تھا' اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا۔ مزید یہ کہ فادر امادورنے کٹی ہوئی انتڑیوں کو جڑ سے کھینچ لیا تھا' مگر آخر میں اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ ان کا کیا کرے' سو اس نے ان کے لیے مغفرت کی دعا کی اور انہیں کوڑے کی بالٹی میں ڈال دیا۔ پبلک اسکول کی کھڑکیوں سے لگے آخری تماشائیوں نے اپنی دلچسپی کھو دی' مددگار بے ہوش ہو گیا' اور کرنل آپونتے' جس نے بہت سے ظالمانہ قتل عام دیکھے اور کیے تھے' ایک نبات خور اور ارواح پرست ثابت ہوا۔ چیتھڑوں اور ان بجھے چونے سے بھرا' اور بے دردی کے ساتھ موٹی ڈوری اور سوے سے سیا ہوا خالی پوست بکھر جانے کی نوبت پر تھا جب ہم نے اسے ریشمی لحاف کی تہوں والے نئے تابوت میں لٹایا۔ ''میرا خیال تھا کہ وہ اس طرح زیادہ دیر تک محفوظ رہے گا''۔ فادر امادور نے مجھے بتایا: ''اس کے بالکل برخلاف ہوا' اور ہمیں صبح کو اسے عجلت میں دفن کرنا پڑا کیوں کہ لاش اتنی بری حالت میں تھی کہ گھر میں اسے رکھنا ناقابل برداشت ہو گیا تھا''۔

منگل کا ابر آلود دن شروع ہو رہا تھا۔ میں اس افسردہ ساعت کے خاتمے پر سونے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا اور میں نے جا کر ماریا الیھاندرینا سروانتس کے دروازے کو دھکا دیا' کہ شاید اس نے آنکل نہ چڑھائی ہو۔ روشن تونبی لالٹینیں درختوں سے آویزاں تھیں اور رقص کے صحن میں کئی الاؤ جل رہے تھے جن پر رکھے بھاپ اگلتے برتنوں کے پاس ملاتو لڑکیاں اپنے تقریبات کے لباسوں پر سوگ کے رنگ لگا رہی تھیں۔ میں نے ماریا الیھاندرینا سروانتس کو علی الصبح بیدار پایا' اور مکمل برہنہ' جیسی کہ وہ ہمیشہ' جب کوئی اجنبی موجود نہ ہوتا' رہا کرتی تھی۔ وہ ترکی حور کی طرح اپنے پرشکوہ بستر پر ایک بابلی خوان کے سامنے اکڑوں بیٹھی تھی' جس میں بچھڑے کے گوشت کے کباب' ابلی ہوئی مرغی' سؤر کے پٹھ' اور کیلوں اور سبزیوں کا ایک ڈھیر تھا جو پانچ افراد کے لیے کافی ہوتا۔ غیر متناسب خوراک ہمیشہ سے اس کے ماتم کرنے کا واحد طریقہ تھا' اور میں نے کبھی اس کو یہ فعل اتنے سخت رنج کے ساتھ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میں خاموشی سے' اور خود اپنے طور پر ماتم کرتے ہوئے' اس کے پہلو میں' کپڑے اتارے بغیر لیٹ گیا۔ میں سانتیاگو نصر کی تقدیر کی سفاکی پر غور کر رہا تھا' جس نے خوشیوں کے بیس سال کے عوض نہ

صرف اس کی زندگی بلکہ اس کے اعضا کا جدا ہونا' بکھر جانا اور مکمل تباہ ہونا بھی طلب کیا۔ میں نے خواب میں ایک عورت کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا جو اپنے بازوؤں میں ایک بچی کو لیے ہوئے تھی اور وہ بچی' سانس لینے کو رکے بغیر' منہ چلا رہی تھی' اور مکئی کے ادھ چبے دانے عورت کی بریزیئر میں گر رہے تھے۔ عورت بچی کے منہ چلانے کے انداز کو کسی پرندے سے مماثلت کے بارے میں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اچانک میں نے ان بے قرار انگلیوں کو محسوس کیا جو میری قمیص کے بٹن کھول رہی تھیں' اور میں نے محبت کے درندے کی خطرناک بو اپنے پہلو میں محسوس کی اور خود کو اس کی لطف کے گرداب کی لذت میں ڈوبتا پایا۔ مگر فوراً' وہ رک گئی۔ پھر اس کے سانسوں کی آواز دور سے آئی اور وہ میری زندگی سے نکل گئی۔

''مجھ سے نہیں ہو گا''۔ اس نے کہا۔ ''تم میں سے اس کی سی بو آتی ہے''۔

صرف میں ہی نہیں' اس دن ہر شے سانتیاگو نصر کی طرح مہکتی رہی۔ ویکاریو برادران نے اس کو جیل کی کوٹھڑی میں محسوس کیا' جہاں میئر نے انہیں' اس وقت تک کے لیے جب وہ ان کی بابت کوئی فیصلہ کر سکے' مقفل رکھا تھا۔ ''جتنا بھی میں نے صابن اور تولیے سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا' اس بو سے نجات نہیں پا سکا''۔ پیدرو ویکاریو نے مجھے بتایا۔ وہ تین راتیں سوئے بغیر گزار چکے تھے' مگر انہیں نیند نہیں آ رہی تھی کیوں کہ وہ سوتے ہی اپنے خواب میں جرم کا پھر سے ارتکاب کرنا شروع کر دیتے۔ اب' جب کہ وہ اپنے بڑھاپے میں ہے' اپنی ذہنی حالت کی وضاحت کرتے ہوئے پابلو ویکاریو نے مجھے کسی کوشش کے بغیر بتایا: ''یہ دہری بیداری کی طرح تھا''۔ اس فقرے نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا کہ جیل میں جو چیز ان کے لیے سب سے زیادہ ناقابل برداشت رہی ہو گی وہ ان کے ہوش مندی کے لمحات تھے۔

کمرہ دس فیٹ مربع تھا' اور اس میں لوہے کی سلاخوں والا ایک بہت اونچا روشن دان' پیشاب کا ایک برتن' ایک سلفچی مع اپنے کوزے اور آب گیر کے' اور پوال کے گدوں کے دو عارضی بستر تھے۔ کرنل آپونتے کا' جس کے احکامات کے تحت یہ کمرہ تعمیر کیا گیا تھا' کہنا تھا کہ کوئی ہوٹل اس سے زیادہ متواضع نہیں تھا۔ میرے بھائی لوئس ایزیک نے اتفاق کیا' کیوں کہ ایک رات انہوں نے موسیقاروں کے درمیان جھگڑے کے بعد اسے وہاں بند کیا تھا اور میئر نے انسانی

ہمدردی کے تحت اسے ملا تو لڑکیوں میں سے ایک کو اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت دی تھی۔ ویکاریو برادران بھی صبح آٹھ بجے شاید یہی سوچ سکتے تھے' جب انہوں نے خود کو عربوں کی زد سے محفوظ محسوس کیا۔ اس لمحے وہ اپنے فرض کو بجالانے کے اعزاز سے آسودہ خاطر تھے' اور ایک ہی چیز جو انہیں تنگ کر رہی تھی وہ بو کا ختم نہ ہونا تھا۔ انہوں نے ڈھیر سارا پانی' کپڑے دھونے کا صابن اور تولیے طلب کیے' اور اپنے بازوؤں اور چہرے سے خون کو دھویا' انہوں نے اپنی قمیصیں بھی دھوئیں' مگر وہ سکون نہ پا سکے۔

پیدرو ویکاریو نے اپنی قبض کشا اور پیشاب آور دوائیں منگوائیں' اور جراثیم سے پاک پٹیاں بھی طلب کیں تاکہ وہ انہیں تبدیل کر سکے' اور وہ صبح کے عرصے میں دو مرتبہ پیشاب خارج کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے باوجود دن چڑھتے چڑھتے' زندگی اس کے لیے اتنی دشوار ہو گئی کہ بو کی اہمیت ثانوی رہ گئی۔ دوپہر کے دو بجے' جب گرمی کی شدت انہیں پگھلا چکی ہوتی' پیدرو ویکاریو سے بستر پر پڑا رہنا ناممکن ہو گیا' مگر اس کی تھکن اسے کھڑا ہونے سے روکے رہی۔ اس کے پیڑو کا درد اس کے حلق تک پہنچ گیا' اس کا پیشاب رک گیا تھا' اور وہ اس دہشت انگیز یقین کے ساتھ عذاب کھینچ رہا تھا کہ وہ اب زندگی بھر نہیں سو سکے گا۔ "میں گیارہ مہینوں تک جاگتا رہا"۔ اس نے مجھے بتایا' اور میں' اس سے اچھی طرح مانوس ہونے کے سبب' جانتا تھا کہ یہ سچ ہے۔ وہ دن کا کھانا نہیں کھا سکا۔ جہاں تک پابلو ویکاریو کا تعلق ہے' اس نے ہر چیز کو جو وہ اس کے لیے لائے تھے' تھوڑا بہت چکھا' اور پندرہ منٹ کے بعد ایک طاغوتی اسہال میں مبتلا ہو گیا۔ شام کو چھ بجے' جب سانتیاگو نصر کی لاش کا معائنہ کیا جا رہا تھا' میئر کو ہنگامی طور پر طلب کیا گیا' کیوں کہ پیدرو ویکاریو کو یقین تھا کہ اس کے بھائی کو زہر دیا گیا ہے۔ "وہ میرے سامنے پانی میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا"۔ پیدرو ویکاریو نے مجھے بتایا۔ "اور ہم اس خیال سے پیچھا نہیں چھڑا سکے تھے کہ یہ ترکوں کی کوئی شیطنت ہے"۔ اس وقت تک وہ برتن کو دو مرتبہ لبالب بھر چکا تھا اور نگرانی پر موجود پہرے دار اس کو ٹاؤن ہال کے پاخانے میں چھ مرتبہ لے جا چکا تھا۔ وہاں بغیر دروازے کے سنڈاس پر کرنل آپونتے نے اسے پہرے داروں میں گھرے' اور اتنی تیزی سے سیال خارج کرتے دیکھا کہ زہر کے متعلق سوچنا بالکل بے معنی بھی نہیں رہ گیا۔ مگر اس خیال کو فوراً ہی ترک کر دیا گیا' جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ انہوں نے صرف پانی پیا تھا اور وہی کچھ کھایا تھا جو پورا ویکاریو نے انہیں بھجوایا۔ اس کے باوجود' میئر اتنا فکرمند ہوا کہ وہ قیدی کو خصوصی پہرے دار کی نگرانی میں اپنے گھر لے گیا' اور وہ تفتیشی جج کے آنے اور اپنے ریو ہاچا کی مدور جیل میں منتقل کیے جانے تک وہیں رہا۔

جڑواں بھائیوں کا خوف باہر کی صورت حال کے پیش نظر تھا۔ عربوں کے انتقام کا خطرہ دور نہیں ہوا تھا' مگر کسی نے بھی' سوائے ویکاریو برادران کے' زہر کے بارے میں نہیں سوچا۔ بلکہ خیال یہ تھا کہ وہ روشن دان سے پٹرول چھڑکنے کے لیے رات ہونے کا انتظار کریں گے' اور قیدیوں کو ان کی کوٹھڑی میں زندہ جلا دیں گے۔ مگر یہ بھی آسان مفروضہ تھا۔ عرب ایک پرامن جماعت تھے جو صدی کے آغاز میں کریبیئن کے شہروں اور قصبوں' یہاں تک کہ انتہائی غریب اور دور افتادہ مقامات تک پہنچے' اور وہیں آباد ہو گئے اور رنگین کپڑے اور سستے زیور بیچنے لگے۔ وہ قبائلی' سخت کوش اور کیتھولک تھے۔ وہ آپس میں شادیاں کرتے' اپنی گندم درآمد کرتے' اپنے صحنوں میں بھیڑیں پالتے' اور ریگانو اور بینگن اگاتے' اور تاش کھیلنا ہی ان کا سرگرم مشغلہ تھا۔ متقدمین نے دہقانی عربی بولنا جاری رکھا تھا جو وہ اپنے وطن سے ساتھ لائے تھے اور اسے دوسری نسل تک تغیر سے محفوظ رکھے ہوئے تھے' مگر تیسری نسل' سانتیاگو نصر کے استثنا کے ساتھ' اپنے والدین کی بات عربی میں سنتی اور اسپانوی میں جواب دیتی تھی۔ اس لیے یہ ناقابل یقین تھا کہ ایک ایسی موت کے انتقام کے لیے جس کا الزام ہم سب پر عائد کیا جا سکتا تھا' وہ اپنی راعیانہ خو تبدیل کر دیتے۔ دوسری طرف' کسی نے بھی پلاسید الینیرو کے خاندان کی جانب سے انتقامی کارروائی کے متعلق نہیں سوچا' جو اپنی دولت مندی کے خاتمے تک طاقتور اور جنگجو لوگ رہے تھے' اور ان میں دو سے زیادہ' مے خانے کے قاتل پیدا ہوئے تھے' جنہیں' ان کے نام کے نمک سے' محفوظ رکھا گیا تھا۔

کرنل آپونتے نے' افواہوں سے پریشان ہو کر' عربوں کی آبادی کا دورہ کیا اور اس وقت اس نے' آخرکار' صحیح نتیجہ اخذ کیا۔ اس نے انہیں اپنی محرابوں پر ماتمی نشانات کے درمیان حیران اور سوگوار پایا' اور ان میں سے چند زمین پر بیٹھے بین کر رہے تھے' مگر کسی نے بھی انتقام کے خیال کو دل میں جگہ نہیں دی۔ اس صبح ان کا ردعمل جرم کی شدت سے پیدا ہوا تھا' اور ان کے سرکردہ لوگوں نے اعتراف کیا کہ کسی

بھی صورت میں وہ زد و کوب سے تجاوز نہ کرتے۔ مزید برآں' یہ قبیلے کی صد سالہ سردار' سوزانہ ابدالہ ہی تھی' جس نے گل ساعت کا حیرت انگیز خیساندہ اور عرق افسنطین تجویز کیا' جس سے پابلو ویکاریو کا اسہال بند' اور اس کے بھائی کا گلگوں پیشاب جاری ہو گیا۔ پیدرو ویکاریو اس کے بعد ایک بے خواب غنودگی میں چلا گیا' اور اس کے شفایافتہ بھائی کو پہلی بار کسی پشیمانی کے بغیر نیند آئی۔ اسی حالت میں پیورسیما ویکاریو نے انہیں منگل کی صبح کو تین بجے دیکھا' جب میئر انہیں الوداع کہنے کے لیے اس کو وہاں لایا۔

کرنل آپونتے کی ایما پر' تمام خاندان' یہاں تک کہ بڑی بہنیں بھی اپنے شوہروں سمیت واپس چلی گئیں۔ وہ لوگوں کی تھکن کے زیرِ حفاظت' نظر میں آئے بغیر وہاں سے رخصت ہوئے' اس وقت جب ہم میں سے اس ناقابلِ تلافی دن کے جو پسماندگان بیدار تھے' سانتیاگو نصر کو دفن کر رہے تھے۔

میئر کے فیصلے کے مطابق' وہ اس وقت تک کے لیے رخصت ہو رہے تھے جب تک کہ معاملہ ٹھنڈا نہ پڑ جائے' مگر وہ پھر کبھی نہیں لوٹے۔ پیورا ویکاریو نے رد کردہ بیٹی کا چہرہ ایک کپڑے سے چھپا دیا تھا کہ کوئی خراشوں کو نہ دیکھ سکے اور اسے شوخ سرخ رنگ میں ملبوس کیا تھا تا کہ کوئی یہ نہ سوچ سکے کہ وہ اپنے عاشق کے ماتم میں ہے۔ واپسی سے پہلے اس نے فادر امادور سے درخواست کی کہ وہ اس کے بیٹوں سے جیل میں گناہوں کا اعتراف سنے' مگر پابلو ویکاریو نے انکار کر دیا اور اپنے بھائی کو قائل کر لیا کہ ان کے پاس منفعل ہونے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ انہیں تنہا رکھا گیا' اور اپنی ریوہاچا منتقلی کے دن تک وہ اتنے بحال ہو چکے تھے' اور اپنے حق پر ہونے میں اتنے پراعتماد تھے' کہ انہوں نے رات کو لے جایا جانا پسند نہیں کیا' جیسا کہ خاندان والوں کے ساتھ کیا گیا تھا' بلکہ وہ دن کی پوری روشنی میں' اور اپنے چہروں کی باقاعدہ نمائش کرتے ہوئے گئے۔ پونسیو ویکاریو' ان کا باپ' تھوڑے عرصے کے بعد مر گیا۔ "اس کا صدمہ اسے لے گیا"۔ انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا۔ جب ویکاریو برادران بری ہوئے' وہ مانورے سے' جہاں خاندان رہ رہا تھا' ایک دن کی مسافت پر' ریوہاچا میں ٹھہرے۔ پرودنسیا کوتیس نے وہیں جا کر پابلو ویکاریو سے شادی کی' جس نے اپنے باپ کی دکان پر قیمتی دھاتوں کا کام سیکھ رہا تھا اور ایک ہنرمند سنار ثابت ہوا۔ محبت اور روزگار سے محروم' پیدرو ویکاریو نے تین سال بعد دوبارہ فوج میں شمولیت اختیار کر لی' فرسٹ سارجنٹ کا عہدہ حاصل کیا' اور ایک خوشگوار صبح اس کا گشتی دستہ قحبہ خانوں کے ترانے گاتا ہوا گوریلا علاقے میں پہنچ کر مفقودالخبر ہو گیا۔

لوگوں کی بڑی اکثریت کے نزدیک ستم رسیدہ صرف ایک تھا۔ بیاردو سان رومان۔ یہ بات مصدقہ طور پر تسلیم کر لی گئی تھی کہ المیے کے دوسرے اہم کردار اپنا حصہ باوقار طور پر' بلکہ ایک عظمت کے ساتھ ادا کر رہے تھے۔ سانتیاگو نصر تہمت کی حدود سے نکل چکا تھا' ویکاریو برادران مرد کی حیثیت سے اپنا مرتبہ منوا چکے تھے' اور گمراہ بہن کی عزت بحال ہو چکی تھی۔ صرف بیاردو سان رومان ایک تھا جس نے سب کچھ گنوا دیا: "غریب بیاردو" جیسا کہ وہ ان برسوں میں یاد کیا جاتا تھا۔ پھر بھی' کسی کو اس کا خیال دوسرے سنیچر کو چاند گہن کے بعد تک نہیں آیا' جب رنڈوے ہیوس نے میئر کو بتایا کہ اس نے ایک روشن پرندے کو اپنے سابقہ مکان کے اوپر پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھا ہے' اور اس کے خیال میں وہ اس کی بیوی کی روح ہے جو اپنی ملکیت کی واپسی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ میئر نے اپنا ماتھا پیٹا' مگر اس کا ہیوس کے واہمے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

"لعنت ہو"۔ وہ زور سے بولا۔ "میں اس غریب کو بھول ہی گیا تھا"۔

وہ ایک گشتی دستے کے ساتھ پہاڑی پر گیا اور گاڑی کو کھلی چھت کے ساتھ فارم ہاؤس کے سامنے پایا' اور اس نے شب خوابی کے کمرے میں ایک روشنی دیکھی' مگر کسی نے اس کی دستکوں کا جواب نہیں دیا' اس لیے وہ ایک بغلی دروازے کو توڑ کر اندر داخل ہوا اور کمروں کی تلاشی لی' جو چاند گہن میں نیم روشن تھے۔ "چیزیں پانی میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھیں" میئر نے مجھے بتایا۔ بیاردو سان رومان بستر پر بے ہوش پڑا تھا' اسی طرح جیسا کہ پیورا ویکاریو نے اسے سوموار کی صبح کو دیکھا تھا' پر تکلف پتلون اور ریشمی قمیص میں ملبوس' مگر اس نے اپنے جوتے اتار رکھے تھے۔ فرش پر خالی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں اور بہت سی سربمہر بوتلیں بستر کے قریب تھیں مگر وہاں کھانے کی کسی چیز کا کوئی نشان نہیں تھا۔

"وہ اتھلک نشے کی آخری منزلوں میں تھا"۔ مجھے ڈاکٹر دیونیسیو اگواران سے معلوم ہوا جس نے اسے ہنگامی امداد دی تھی۔ مگر وہ چند گھنٹوں میں ٹھیک ہو گیا' اور جیسے ہی اس کا ذہن صاف ہوا' اس نے' جتنی شائستگی اس سے ممکن ہوئی' استعمال کرتے ہوئے' انہیں گھر سے نکال باہر کیا۔

"کوئی میری فکر نہ کرے"۔ اس نے کہا۔ "میرے

باپ تک کو آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ اس نے اس کی شان میں ایک فحش فقرہ کہا۔

میسٹر نے جنرل پیترونیو سان رومان کو واقعے کی اطلاع' آخری فقرے سمیت' ایک پر آشوب ٹیلی گرام کے ذریعے پہنچائی۔ جنرل سان رومان نے ضرور اپنے بیٹے کی خواہش پر حرف بہ حرف عمل کیا ہوگا' کیوں کہ وہ اس کے پاس نہیں آیا' بلکہ اس نے اپنی بیوی کو لڑکیوں اور دو عمر رسیدہ خواتین کے ساتھ روانہ کیا جو اس کی بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔ وہ بیار دو سان رومان کی بد قسمتی پر گردنوں تک ماتمی لباس میں مقفل' اور غم میں اپنے بال بکھرائے ہوئے' ایک مال بردار کشتی میں آئیں۔ زمین پر قدم رکھنے سے پہلے انہوں نے اپنے جوتے اتارے اور سڑک پر دوپہر کی جلتی ہوئی دھول میں ننگے پاؤں اپنے بالوں کی لٹیں کھینچتی اور اتنی بلند چیخوں کے ساتھ بین کرتی پہاڑی کے آخری سرے تک گئیں کہ وہ خوشی کے عالم میں سرزد ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے ماگدالینااولیور کی بالکنی سے انہیں گزرتے ہوئے دیکھا اور مجھے یاد ہے کہ میں نے سوچا تھا کہ اس طرح کا ماتم صرف دوسری زیادہ اہم شرمساریوں کو چھپانے ہی کے لیے کیا جا سکتا ہے۔

کرنل لزارد آپونتے ان کے ساتھ فارم ہاؤس تک گیا' اور پھر سورج ڈوبنے سے پہلے' ڈاکٹر دیونیسیو اگواران اپنے خچر پر' جو اس نے ہنگامی حالات کے لیے رکھا ہوا تھا' وہاں پہنچا۔ حکومت کے دونوں نمائندے' گردن تک ایک کمبل میں لپٹے ہوئے بیار دو سان رومان کو' آہ و زاری کرتی خواتین کے جلو میں' ایک ڈنڈے سے لٹکے ہوئے جھولے پر نیچے لائے۔ ماگدالینااولیور سمجھی کہ وہ مرچکا ہے۔

"خدا کی پناہ!" وہ بول اٹھی' "کیسی مصیبت ہے!"

اس نے الکوحل سے خود کو دوبارہ جاں بہ لب کر لیا تھا' مگر یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ کسی زندہ آدمی کو لے جا رہے ہیں' کیوں کہ اس کا داہنا بازو زمین پر گھسٹ رہا تھا' اور جب اس کی ماں اسے جھولے میں ڈال دیتی' وہ پھر باہر نکل آتا' اس لیے اس کے ہاتھ سے پہاڑی کے دامن سے لے کر کشتی کے عرشے تک زمین پر ایک لکیر بنتی چلی گئی۔ ہمارے لیے اس کی طرف سے یہی نشانی بچی۔ ایک ستم رسیدہ کی یاد۔

انہوں نے فارم ہاؤس کو اسی حالت میں چھوڑ دیا۔ میرا بھائی اور میں جب تعطیلات میں گھر آتے' آوارہ گردی کی راتوں میں اسے دریافت کرنے جایا کرتے' اور ہر بار ہم نے متروک کمروں میں قیمتی اشیا کی تعداد پچھلی بار سے کم پائی۔

ایک موقعے پر ہمیں وہ چھوٹا سوٹ کیس نظر آیا جو انجلا ویکاریو نے اپنی ماں کے ہاں سے شادی کی رات کو منگوایا تھا' مگر ہم نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ہم نے اس کے اندر جو کچھ پایا وہ ایک عورت کے حفظ حسن و صحت کی ذاتی اشیا معلوم ہوئیں' اور مجھ پر ان کا اصل استعمال صرف اس وقت کھلا جب انجلا ویکاریو نے بہت برسوں کے بعد مجھے بتایا کہ کون سی زنانہ شعبدہ بازیاں اسے اپنے شوہر کو فریب دینے کے لیے سکھائی گئی تھیں۔ یہ واحد یادگار تھی جو اس نے اس جگہ چھوڑی جو پانچ گھنٹوں تک شادی شدہ عورت کی حیثیت سے اس کا گھر تھا۔

برسوں بعد' جب میں ان وقائع کے لیے شہادتوں کی آخری جزئیات تلاش کرنے آیا' یولانداہیوس کی مسرتوں کی خاک تک باقی نہیں بچی تھی۔ کرنل لزارد آپونتے کے مقرر کردہ پہرے کے باوجود چیزیں تھوڑی تھوڑی کر کے غائب ہو رہی تھیں' حتیٰ کہ چھ آئینوں والی تمام قد الماری بھی' جو مومپوکس کے ماہر دستکار کو مکان کے اندر کھڑی کرنی پڑی تھی کیوں کہ وہ دروازے سے نہیں گزر سکتی تھی۔ شروع شروع میں رنڈواہیوس یہ سوچتے ہوئے بہت خوش تھا کہ اس کی بیوی' پس از مرگ' اپنی چیزوں کو لے جانے کے لیے واپس آیا کرتی ہے۔ کرنل آپونتے نے اس کا مذاق اڑایا۔ مگر ایک رات اسے اس راز کو معلوم کرنے کے لیے ارواح کی محفل کا خیال آیا' اور یولانداہیوس کی روح نے اپنی تحریر میں تصدیق کی کہ وہی اپنی مسرتوں کی معمولی اشیا کو اپنے خانہ مرگ سے لے جا رہی ہے۔ مکان ڈھینا شروع ہو گیا۔ شادی کی گاڑی دروازے پر پڑے پڑے گلنے لگی' اور آخر میں صرف اس کا بوسیدہ ڈھانچہ باقی رہ گیا۔ کئی برسوں تک اس کے مالک کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی۔ مسل میں اس کا ایک بیان ہے مگر وہ اتنا مختصر اور سرسری ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آخری لمحے میں کسی ناگزیر ضرورت کے تحت درج کیا تھا۔ ایک ہی بار جب میں نے اس سے ۲۳ سال بعد' بات کرنے کی کوشش کی' وہ مجھ سے ایک خاص جارحانہ انداز میں پیش آیا' اور انتہائی غیر اہم حقائق کو بیان کرنے سے بھی انکار کیا جو ڈرامے میں اس کی شرکت کی تھوڑی سی بھی وضاحت کر سکتے۔ بہر صورت' اس کا خاندان بھی اس کے بارے میں' جو ہمیں علم تھا اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا' اور ان کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے کے سوا جسے اس نے کبھی دیکھا تک نہیں تھا' وہ ایک

غلط افتادہ قصبے میں کیوں پہنچا تھا۔

انجلا ویکاریو کے متعلق، اس کے برعکس، مجھے وقفے وقفے سے خبریں ملتی رہی تھیں، جن سے میرے ذہن میں اس کی ایک مثالی تصویر بن گئی تھی۔ میری راہبہ بہن بالائی گواہیرا میں آخری بت پرستوں کو مشرف بہ کلیسا کرنے کی کوشش میں مصروف تھی اور اس کی عادت تھی کہ وہ کریبیئن نمک سے پختہ قریبے میں، جہاں انجلا ویکاریو کی ماں اسے زندہ دفن کرنے کو لے گئی تھی، اس کے پاس رکتی اور اس سے باتیں کرتی۔ "تمہاری عم زاد تمہیں سلام کہتی ہے"۔ وہ مجھے ہمیشہ لکھا کرتی۔ میری بہن مارگوت نے بھی، جو ابتدائی برسوں میں اس سے ملنے جاتی رہی تھی، مجھے بتایا کہ اس نے ایک ہوادار صحن والا مضبوط مکان خرید لیا تھا، جس میں صرف ایک نقص تھا کہ مہ کامل کی راتوں کو غسل خانہ ابل پڑتا اور مچھلیاں صبح کو شب خوابی کے کمروں میں شلپ شلپ کرتی نظر آتیں۔ جس کسی نے بھی اسے ان دنوں دیکھا تھا، متفق تھا کہ وہ اپنی کشیدہ کاری کی مشین پر ہروقت مشاقانہ جھکی رہتی تھی، اور اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس نے واقعات کو فراموش کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔

بہت بعد کے ایک غیر یقینی زمانے میں، جب میں اپنے آپ کو تھوڑا بہت سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے گواہیرا کے قصبوں میں انسائیکلوپیڈیا اور طب کی کتابیں بیچتا پھر رہا تھا، اتفاقاً بت پرستوں کے اس قریہ مرگ میں جا نکلا۔ اس مکان کی کھڑکی پر جس کا رخ سمندر کی طرف تھا، دن کی سب سے زیادہ تپتی ہوئی ساعت میں، اسٹیل رم کی عینک اور زردی آمیز سفید بالوں والی ایک عورت نصف ماتمی لباس میں، کشیدہ کاری کی مشین پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سر کے اوپر ایک زرد بلبل کا پنجرا تھا جو مسلسل چہکتی رہتی۔ جب میں نے اسے کھڑکی کے سادہ چوکھٹے میں سے اس طرح دیکھا تو یقین کرنے سے انکار کردیا کہ یہ وہی عورت ہے جس کا تصور میرے پاس تھا، کیوں کہ میں خود کو اس اعتراف پر آمادہ نہیں کرسکا کہ زندگی خراب ادب کے اتنی مماثل ہو کر رہ جائے گی، مگر ڈرامے کے ۲۳ سال بعد، یہ وہی تھی: انجلا ویکاریو۔

اس نے مجھ سے ہمیشہ کی طرح ایک دور کی عم زاد کا سلوک کیا، اور میرے سوالوں کے جواب عقل سلیم اور ایک حس مزاح کے ساتھ دیے۔ وہ اتنی بالغ نظر اور بذلہ سنج ہوگئی تھی کہ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہی ہستی ہے۔ جس بات پر مجھے سب سے زیادہ حیرت ہوئی، اس کا وہ انداز تھا جس میں وہ اپنی زندگی کے مفہوم تک پہنچی تھی۔ چند منٹوں کے بعد وہ مجھے اتنی عمر رسیدہ نہیں لگی جتنی کہ پہلی نظر میں معلوم ہوئی تھی، بلکہ وہ تقریباً اتنی ہی جوان نظر آئی جتنی وہ میری یادداشت میں تھی، اور وہ اس شخص سے جو اس سے بیس سال کی عمر میں محبت کے بغیر شادی کرنے پر مجبور ہوا تھا، کوئی قدر مشترک نہیں رکھتی تھی۔ اس کی ماں نے، اپنے پرشکایت بڑھاپے میں، مجھے ایک مشکل بد روح سمجھا۔ اس نے ماضی کے متعلق بات کرنے سے انکار کردیا اور ان وقائع کے لیے مجھے اپنی ماں کے ساتھ اس کی گفتگو اور اپنی یادداشت سے کھنگالے ہوئے اس کے چند غیر مربوط فقروں پر اکتفا کرنا پڑا۔ وہ اس سے آگے جا چکی تھی جو انجلا ویکاریو کو جیتے جی مار ڈالنے کے لیے ممکن تھا، مگر اس نے خود اپنی ماں کی منصوبہ بندیوں کو صفر پر پہنچا دیا تھا کیوں کہ اس نے کبھی اپنی بدقسمتی سے کوئی پراسراریت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس، اس نے اسے، تمام تفصیلات سمیت، ہر اس شخص سے بیان کیا جو اسے سننے کا طالب ہوا، سوائے ایک رمز کے، جو کبھی نہیں کھل سکا، کہ اس کی تباہی کا اصل باعث کون، کیسے اور کیوں تھا۔ اس لیے کہ کسی نے بھی یقین نہیں کیا تھا کہ وہ سچ مچ سانتیاگو نصر ہی رہا ہوگا۔ وہ دونوں بالکل مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی نے کبھی انہیں ایک ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ پر غرور سانتیاگو نصر اس پر کبھی توجہ نہ دیتا۔ "تمہاری بے وقوف عم زاد" وہ مجھ سے کہا کرتا جب اسے اس کا تذکرہ کرنا ہوتا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم اس وقت کہا کرتے تھے، وہ چڑیوں کو اچک لینے والا شکرا تھا۔ وہ، اپنے باپ کی طرح، کسی خود سر دوشیزہ کو زیر کرنے کی کوشش میں اکیلا پھرا کرتا، جو ان جنگلوں میں نظر آنا شروع کررہی ہوتی مگر قصبے میں اس کا اور کوئی تعلق علم میں نہیں آیا، سوائے فلورا میگل سے رسمی ملاقاتوں اور ماریا الیہاندرینا سروانتس سے ہنگامہ خیز عشق کے، جس نے اسے چودہ مہینوں تک پاگل کیے رکھا تھا۔ زیادہ مشہور روایت، شاید اس لیے کہ اسی میں زیادہ کج روی تھی، یہ تھی کہ انجلا ویکاریو نے کسی اور کو جو واقعتاً اس سے محبت کرتا تھا، بچانا چاہا تھا اور اس نے سانتیاگو نصر کے نام کا اس لیے انتخاب کیا کہ اس کا خیال تھا کہ اس کے بھائی اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کریں گے۔ میں نے یہ حقیقت اس سے خود معلوم کرنے کی کوشش کی، جب میں اپنے تمام دلائل سے مسلح، اس کے پاس دوسری بار گیا، مگر اس نے ان کو شکست دینے کے لیے اپنی نظریں کشیدہ کاری

سے بہ مشکل ہی ہٹائی ہوں گی۔ "اتنا تردد مت کرو"۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "وہ وہی تھا"۔

اس کے علاوہ ہر بات کو، حتیٰ کہ اپنی شادی کی رات کی ابتلا کو بھی، اس نے بغیر کسی احتیاط کے بیان کر دیا۔ اس نے یاد کیا کہ کس طرح اس کی دوستوں نے اسے ہدایات دی تھیں کہ وہ اپنے شوہر کو بستر میں اتنی شراب پلائے کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھے، اس سے زیادہ شرم کا مظاہرہ کرے جتنی در حقیقت اس کو آ رہی ہو تاکہ وہ کمرے کی روشنی بجھا دے، دوشیزگی کا تاثر پیدا کرنے کے لیے پھٹکڑی کے پانی کی ایک کارگر دوش لے اور چادر پر مرکیورو کروم سے دھبے ڈال دے تاکہ اسے دوسرے دن عروسی صحن میں نمائش کے لیے رکھ سکے۔ اس کی مشیروں نے دو باتوں پر انحصار نہیں کیا تھا: بیاردو سان رومان کی شراب کے اثر کی غیر معمولی مدافعت اور انجلا ویکاریو کی اعلیٰ شائستگی، جو وہ اپنی ماں کی عائد کردہ غیر جذباتیت میں مستور رکھتی تھی۔ "میں نے وہ سب نہیں کیا جو انہوں نے بتایا تھا"۔ اس نے کہا۔ "کیوں کہ میں نے جس قدر سوچا، مجھے محسوس ہوا کہ یہ ایک پست حرکت ہے جو کسی کے ساتھ نہیں کی جانی چاہیے، اور وہ بھی اس بدبخت آدمی کے ساتھ جو مجھ سے شادی کر رہا تھا"۔ اس لیے اس نے خود کو شب خوابی کے روشن کمرے میں بطور آشکار کپڑوں سے آزاد ہونے دیا، ان تمام اکتسابی خطروں سے بالاتر ہو کر جنہوں نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔ "یہ بہت آسان تھا"۔ اس نے مجھ سے کہا "کیوں کہ میں نے مرنے کا ارادہ کر لیا تھا"۔

سچ یہ ہے کہ اس نے اپنی بدقسمتی کا تذکرہ کسی شرم کے غیر کیا، تاکہ وہ دوسری، اصل بدقسمتی کی پردہ پوشی کر سکے، جو سے ختم کیے دے رہی تھی۔ کسی کو اس کا شبہ تک نہ ہوتا، مگر اس نے مجھے یہ بتانے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا کہ بیاردو سان رومان اس کی زندگی میں اس لمحے سے ہمیشہ کے لیے داخل ہو لیا تھا جب وہ اسے گھر واپس چھوڑ گیا۔ یہ فیصلہ کن وار تھا۔ جب ماما نے مجھے مارنا شروع کیا، وہ مجھے اچانک یاد آتا چلا لیا"۔ اس نے مجھے بتایا۔ اسے مار سے کم تکلیف ہوئی کیوں لہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس کے نام پر تھی۔ اس نے اس کے علق اس وقت ایک خاص حیرت کے ساتھ سوچنا شروع کیا ب وہ سسکیاں بھرتی ہوئی کھانے کے کمرے میں کوچ پر پڑی ی۔ "میں مار یا کسی اور وجہ سے نہیں رو رہی تھی"۔ اس نے اس کے متعلق سوچنا جاری رکھا جب اس کی ماں آرنیکا کی ٹھنڈی پٹیاں اس کے چہرے پر رکھ رہی تھی، اور اس سے بھی زیادہ اس وقت جب اس نے سڑک پر شور سنا اور آگ لگنے کی اطلاع دینے والی گھنٹیاں بجنے لگیں، اور اس کی ماں اس کو یہ بتانے آئی کہ اب وہ سو سکتی ہے کیوں کہ بدترین بات پیش آ چکی ہے۔

وہ اس کے بارے میں بہت طویل عرصے تک، بغیر کسی خود فریبی کے، سوچتی رہی تھی، جب اس کو اپنی ماں کے ساتھ اس کی آنکھوں کے معائنے کے لیے ریوہاچا کے اسپتال میں جانا پڑا۔ وہ راستے میں ہوٹل دل پوئرتو پر رکیں، جس کا مالک انہیں جانتا تھا، اور پیورا ویکاریو نے بار پر جا کر پانی کا ایک گلاس طلب کیا۔ وہ اپنی بیٹی کی طرف پشت کیے پانی پی رہی تھی، جب انجلا ویکاریو نے اپنے تصور کو ان آئینوں میں منعکس پایا جو کمرے میں خود کو دہرا رہے تھے۔ انجلا ویکاریو نے اپنا سر ایک آہ کے ساتھ پھیرا اور اسے ہوٹل سے باہر جاتے دیکھا۔ پھر اس نے اپنے دل ریزہ ریزہ کے ساتھ اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ پیورا ویکاریو نے پانی پینا ختم کیا، اپنے ہونٹوں کو اپنی آستین پر صاف کیا اور بار کی جانب سے، اپنی نئی عینک سے اسے دیکھ کر مسکرائی۔ انجلا ویکاریو نے، اپنی پیدائش کے بعد سے پہلی مرتبہ، اس مسکراہٹ میں اپنی ماں کو اس طرح دیکھا جیسی وہ در حقیقت تھی: اپنے عیوب کی پرستش میں گرفتار ایک غریب عورت۔ "لعنت ہو"۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ اتنی پریشان تھی کہ اس نے گھر کو واپسی کا سارا سفر بلند آواز میں گاتے ہوئے طے کیا، اور پھر خود کو بستر پر تین دن تک روتے رہنے کے لیے گرا دیا۔

وہ پھر سے زندہ ہو گئی۔ "میں اس کے لیے دیوانی ہو رہی تھی"۔ اس نے مجھے بتایا، "بالکل پاگل"۔ اسے اس کو دیکھنے کے لیے صرف اپنی آنکھیں بند کرنی پڑتی تھیں: وہ اس کو سمندر میں سانس لیتا سنتی، بستر میں اس کے بدن کا شعلہ اسے آدھی رات کو جگا دیتا۔ ہفتے کے ختم ہونے تک، ایک لمحہ آرام پائے بغیر، اس نے اسے پہلا خط لکھا۔ یہ ایک رسمی مراسلہ تھا، جس میں اس نے بتایا کہ اس نے اسے ہوٹل سے باہر آتے دیکھا تھا اور یہ کہ وہ خوش ہوتی اگر وہ بھی اسے دیکھ پاتا۔ اس نے جواب کا ناکام انتظار کیا۔ دو مہینوں کے بعد، انتظار سے تھک کر، اس نے پہلے کی طرح ایک اور خط اسی مبہم اسلوب میں بھیجا، جس کا واحد مقصد اسے شائستگی کے فقدان پر سرزنش کرنا تھا۔ چھ مہینوں میں وہ جواب پائے بغیر چھ خطوط لکھ چکی تھی، مگر اس نے اس امر سے اپنے آپ کو

تسلی دی کہ وہ انہیں وصول کر رہا ہے۔

پہلی بار اپنی قسمت کی خود مالکہ انجلا ویکاریو نے تب جانا کہ محبت اور نفرت متبادل جذبے ہیں۔ جتنے زیادہ خطوط اس نے بھیجے اتنا ہی اس کے اضطراب میں اضافہ ہوا، مگر اس میں اپنی ماں کے خلاف مسرت آمیز کینے کی آگ بھی اتنی ہی تیز ہوتی گئی۔ "مجھے اس کو دیکھتے ہی اُبکائی آجاتی" اس نے مجھے بتایا۔ "لیکن میں اپنی ماں کو دیکھ کر اس شخص کو یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی"۔ اس کی زندگی ایک رد کردہ بیوی کی حیثیت سے جاری تھی، جیسے ایک بوڑھی خادمہ کی سیدھی سادی زندگی ہوتی ہے۔ وہ مشین پر اپنی دوستوں کے ساتھ کشیدہ کاری میں مصروف رہتی، بالکل پہلے کی طرح جب وہ کپڑوں کے گلدستے اور کاغذی پرندے بنایا کرتی تھی، مگر جب اس کی ماں سونے چلی جاتی، وہ صبح تک کے لیے اپنے کمرے میں بند ہو جاتی، ان خطوں کو لکھنے کے لیے جن کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ وہ دوبارہ باہوش ہو گئی، اپنے ذاتی ارادے کی مالکہ، اور صرف اس کے لیے پھر سے ایک دوشیزہ بن گئی، اور اس نے اپنے سوا کسی اور کی حاکمیت، اور نہ کوئی محکومی بجز اپنے جنون کی اطاعت کے قبول کی۔

اس نے ہفتہ وار خط لکھنا آدھی زندگی تک جاری رکھا۔ "کبھی کبھی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا لکھا جائے"۔ ہنسی سے مرے جاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔ "مگر میرے لیے یہی بہت تھا کہ وہ انہیں پا رہا ہے"۔ شروع میں وہ ایک منگیتر کے رقعے تھے، پھر وہ ایک خفیہ معشوقہ کے مختصر پیغامات، شوخ محبوبہ کے خوشبودار کارڈ، کاروباری کاغذات، عشقیہ دستاویزات ہوتے گئے، اور آخر میں ایک ترک کردہ بیوی کے تلخ خطوط ہو گئے، جن میں وہ اسے واپس آنے پر آمادہ کرنے کے لیے سفاک بیماریاں ایجاد کیا کرتی۔ ایک رات ایک اچھی کیفیت میں اس نے لکھے ہوئے خط پر دوات گرا دی اور اسے پھاڑنے کے بجائے اس نے ایک پس نوشت کا اضافہ کیا: "اپنی محبت کے ثبوت میں، میں تمہیں اپنے آنسو بھیج رہی ہوں"۔ کسی کسی موقع پر رونے سے تنگ آکر وہ اپنی دیوانگی کا مذاق اڑاتی۔ چھ مرتبہ ڈاک خانے کی نگراں عورتیں تبدیل ہوئیں اور چھ مرتبہ وہ ان کی اعانت حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ صرف ایک بات جو اسے نہیں سوجھی، وہ خطوط نگاری کا ترک کرنا تھا۔ اس کے باوجود اس کے جنون کا اس شخص پر کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان خطوں کا مخاطب کوئی تھا ہی نہیں۔

دسویں سال، ایک طوفان خیز صبح، وہ جلد اٹھ گئی، اس یقین کے ساتھ کہ وہ اس کے بستر میں برہنہ موجود ہے۔ پھر اس نے ایک بے قرار خط لکھا، بیس صفحات پر مشتمل، جس میں اس نے وہ تلخ حقائق جو وہ اپنے دل میں اس زبوں بخت رات سے لیے پھر رہی تھی، بے حجابانہ بیان کر ڈالے۔ اس نے اس کو ان ابدی نشانات، جو اس نے اس کے بدن پر چھوڑے تھے، اس کی زبان کے نمک، اس کے افریقی عضو کی آتشیں یاد کے بارے میں لکھا۔ جمعے کو اس نے یہ خط ڈاک خانے کی نگراں کو دیا جو سہ پہر کو اس کے ساتھ کشیدہ کاری کرنے اور خط لینے آئی، اور وہ پر یقین تھی کہ یہ آخری مداوا اس کے عذاب کا خاتمہ ہوگا، مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کے بعد اسے ہوش نہیں تھا کہ اس نے کیا لکھا، اور نہ یہ کہ وہ درحقیقت کسے لکھ رہی تھی، مگر اس نے تعطل کیے بغیر سترہ سال تک خط لکھنا جاری رکھا۔

اگست کی ایک سہ پہر، جب وہ اپنی دوستوں کے ساتھ کشیدہ کاری میں مشغول تھی، اس نے دروازے پر کسی کی آہٹ سنی۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہاں کون ہے، اسے نظر اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ "وہ فربہ اندام ہو چکا تھا، اس کے بال گرنے شروع ہو گئے تھے اور اسے چیزوں کو قریب سے دیکھنے کے لیے عینک کی ضرورت پڑ چکی تھی"۔ اس نے مجھے بتایا "مگر یہ وہی تھا"۔ وہ خوف زدہ تھی، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ وہ بھی اسے اتنا ہی مختلف پا رہا ہوگا جتنا کہ وہ اسے نظر آیا تھا، اور اس کے خیال میں اسے اس سے اتنی محبت نہیں رہی ہوگی کہ وہ اس تغیر کی تاب لا سکے۔ اس کی قمیص پسینے سے بھیگی ہوئی تھی اور وہ وہی بیلٹ باندھے تھا اور وہی چاندی جڑی، بغیر بخیوں کی چمڑے کی خورجینیں لیے ہوئے تھا۔ دوسری متحیر کشیدہ کاروں سے بے نیاز، بیار دو سان روماں نے قدم آگے بڑھایا اور اپنی خورجینیں سلائی کی مشین پر رکھ دیں۔

"یہ میں ہوں"۔ اس نے کہا۔

وہ رہنے کے لیے کپڑوں کا ایک سوٹ کیس ساتھ لایا تھا اور دوسرا، بالکل پہلے والے کی طرح، دو ہزار خطوط سے بھرا جو اسے لکھے گئے تھے۔ وہ دنوں کی ترتیب سے رنگین ربر سے بندھے ہوئے تھے، اور انہیں کبھی نہیں کھولا گیا تھا۔

☆☆☆

برسوں تک ہم کسی اور واقعے کے بارے میں بات نہ کر سکے۔ ہمارے روز و شب نے، جو بہت سی یک ر

عادتوں سے مغلوب تھے' اچانک ایک مشترکہ خلش کے محور پر گھومنا شروع کر دیا تھا۔ طلوع سحر ہمیں بہت سے اتفاقیہ واقعات کی زنجیر کو' جنھوں نے ایک امر محال کو ممکن بنایا تھا' ایک ترتیب دینے کی کوشش کرتے دیکھا کرتی۔ یہ واضح تھا کہ ہم ایسا ان اسرار کو دریافت کرنے کی طلب میں نہیں کر رہے تھے' بلکہ اس لیے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس مقام اور ماموریت کے درست علم کے بغیر' جس کی جستجو تقدیر کی طرف سے ہمارے حوالے ہوئی تھی' اپنی زندگی جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔

کچھ لوگ کبھی نہیں جان سکے۔ کرستو بیدویا' جو ایک مشہور سرجن بنا' کبھی خود کو یہ سمجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکا کہ کیوں وہ اس ترغیب کا شکار ہو گیا کہ بشپ کے آنے تک دو گھنٹے اپنے دادا کے ہاں گزارے' بجائے اس کے کہ آرام کرنے اپنے والدین کے گھر جاتا جو صبح ہی سے اطلاع دینے کے لیے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر ان میں سے بہت سوں نے' جو جرم کو روکنے کے لیے کچھ کر سکتے تھے اور اس کے باوجود انھوں نے کچھ نہیں کیا' اپنے آپ کو اس عذر سے تسلی دی کہ عزت کے معاملات اجارۂ خداوندی ہیں اور ان میں صرف ان کا دخل ممکن ہے جو ڈرامے کا حصہ ہوں۔ "عزت ہی محبت ہے"۔ میں نے اپنی ماں کو کہتے سنا۔ اور تسیاباؤتے' جس کی شمولیت صرف دو خون آلود چھروں کو دیکھنے کی حد تک تھی' جو اس وقت تک درحقیقت خون آلود بھی نہیں تھے' اپنے واہمے سے اس حد تک متاثر ہوئی کہ وہ ایک ندامت آمیز ہیجان میں مبتلا ہو گئی' اور ایک دن' مزید برداشت کرنے کی اہل نہ رہ جانے پر' سڑک پر ننگی نکل آئی۔ فلورا میگل' سانتیاگو نصر کی منگیتر' عداوت کے مارے سرحدی گشت کے ایک لیفٹیننٹ کے ساتھ بھاگ گئی جس نے اس سے وچہادا کے ربر مزدوروں کے درمیان جسم فروشی کروائی۔ اورا دیئرس' وہ دایہ جس کی مدد سے تین نسلیں اس دنیا میں آئیں' اس خبر کو سنتے ہی مثانے کے درد میں مبتلا ہو گئی' اور اپنی موت کے دن تک اسے پیشاب کرنے کے لیے قناطیر کا استعمال کرنا پڑا۔ دون رحیلودے لانکور' کلو تیلدے آرمنتا کا نیک شوہر' جو چھیاسی سال کی عمر میں قوت مردی کا ایک شاہکار تھا' آخری بار یہ دیکھنے کو اٹھا کہ کس طرح انھوں نے سانتیاگو نصر کے اعضاء' اس کے اپنے گھر کے بند دروازے کے سامنے جدا کر دیئے اور اس صدمے کے بعد زندہ نہیں رہ سکا۔ پلاسید الینیرو نے آخری لمحے میں اس دروازے کو مقفل کروا دیا تھا' مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے خود کو الزام سے بری کر دیا۔ "میں نے اسے اس لیے بند کروایا تھا کہ دیویناقلور نے مجھ سے قسم کھا کر کہا تھا کہ اس نے میرے بیٹے کو اندر آتے دیکھا ہے"۔ اس نے مجھے بتایا۔ "مگر یہ سچ نہیں تھا"۔ دوسری طرف اس نے خود کو درختوں کے سعد شگون اور پرندوں کے نحس شگون میں تمیز نہ کرنے پر کبھی معاف نہیں کیا' اور کاہو کے بیج چبانے کی قبیح عادت کا شکار ہو گئی' جو اس کے زمانے میں عام تھی۔

جرم کے بارہ دنوں کے بعد تفتیشی مجسٹریٹ' اس قصبے میں جو ایک کھلے ہوئے زخم کی طرح تھا' وارد ہوا۔ ٹاؤن ہال کے خستہ حال چوبی دفتر میں' شدید گرمی میں گنے کی شراب سے دو آتشہ گرم کافی پیتے ہوئے' ہجوم کو قابو میں رکھنے کے لیے جو طلب کیے بغیر ڈرامے میں اپنے اہم کردار کی نشاندہی کرنے کے لیے امڈ آیا تھا' اسے فوجی دستے کی کمک طلب کرنی پڑی۔ وہ نیا نیا فارغ التحصیل ہوا تھا اور ابھی تک قانون کی درس گاہ والا سیاہ لنن کا سوٹ اور سونے کی انگوٹھی پہنتا تھا' جس پر اس کی سند کا نشان کندہ تھا۔ اس میں ایک نئے نئے باپ بننے والے مسرور شخص کی سی سرمستی اور غنائیت تھی۔ مگر میں کبھی اس کا نام نہیں جان سکا۔ جو کچھ بھی ہمیں اس کے کردار کے بارے میں معلوم ہوا' مسل سے اخذ کیا گیا تھا' جسے چند لوگوں نے بیس سال بعد ریوہاچا کے ایوان انصاف میں تلاش کرنے میں میری اعانت کی۔ مسلوں کی کسی طرح کی کوئی درجہ بندی نہیں کی گئی تھی' اور ایک سو سے زیادہ مقدمات اس نوآبادیاتی عمارت کے بوسیدہ فرش پر انبار تھے' جو سر فرانسس ڈریک کا دو دن کے لیے مستقر رہ چکی تھی۔ زمینی منزل مد کامل میں پانی سے بھر جایا کرتی' اور غیر مجلد مسلیں ویران دفتر میں تیرتی پھرتیں۔ میں نے خود کئی بار اپنی تلاش ٹخنوں تک پانی میں گمشدہ قضیوں کے اس دریا میں جاری رکھی' اور صرف حسن اتفاق سے' پانچ سال کی جستجو کے بعد' میں ۵۰۰ سے زیادہ صفحات پر مشتمل مسل کے ۳۲۲ صفحات بازیاب کرنے میں کامیاب ہوا۔

جج کا نام ان میں سے کسی پر نہیں آتا' مگر یہ واضح ہے کہ وہ ادب کے جنون میں مبتلا ایک شخص تھا۔ اس نے بلاشبہ اسپانوی اور کچھ لاطینی ادبیات عالیہ پڑھ رکھی تھیں' اور وہ نیٹشے سے بخوبی واقف تھا جو ان دنوں کے مجسٹریٹوں میں رائج

مصنف تھا۔ حاشیاتی شذرے، روشنائی کے رنگ سے قطع نظر بھی، خون سے تحریر شدہ معلوم ہوتے تھے۔ وہ اس چیستاں پر، جس کی زد میں وہ اتفاقاً آگیا تھا، اتنا حیران تھا کہ کئی مرتبہ ایک غنائی انتشارِ خیال میں مبتلا ہو گیا، جو اس کے پیشے کے سخت گیر تقاضوں کے خلاف تھا۔ سب سے بڑھ کر، اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہ جائز ہو سکتا ہے کہ زندگی اتنے زیادہ اتفاقات کا استعمال کرے، جو ادب میں بھی ممنوع ہیں، اور اتنی صاف طور پر پیش گفتہ موت کو آزادانہ پایۂ تکمیل تک پہنچنے دے۔

اس کے باوجود، اپنی جاں فشاں تفتیش کے اختتام پر، جس بات نے اس کو سب سے زیادہ حیران کیا، وہ یہ تھی کہ کوئی سراغ، یہاں تک کہ کوئی ناممکن ترین اشارہ بھی موجود نہ تھا جو سانتیاگو نصر کو خطا کا مرتکب قرار دیتا۔ انجلا ویکاریو کی دوستوں نے، جو فریب دہی میں اس کی مشیر تھیں، عرصے تک یہی کہا کہ وہ شادی سے پہلے ہی اس کے راز میں شریک ہو گئی تھیں، مگر اس نے ان پر کسی نام کا انکشاف نہیں کیا تھا۔ مسل میں ان کا بیان تھا: "اس نے معجزے کے متعلق بتایا مگر ولی کا نام نہیں لیا"۔ لیکن انجلا ویکاریو اپنے بیان پر قائم رہی۔ جب تفتیشی مجسٹریٹ نے اس سے اپنے بالواسطہ انداز میں پوچھا کہ آیا وہ جانتی ہے کہ متوفی سانتیاگو نصر کون تھا، تو اس نے جذبات سے عاری جواب دیا:

"وہ میرے ساتھ مرتکب ہوا تھا"۔

مسل میں اس کا بیان یہیں تک ہے، کیسے اور کہاں کی کسی تفصیل کے بغیر۔ سماعت کے دوران جو صرف تین دن جاری رہی، وکیل سرکار نے اپنی تمام تر کوشش الزام کی کمزوری پر صرف کی۔ تفتیشی مجسٹریٹ کی پریشانی سانتیاگو نصر کے خلاف عدم ثبوت کی بنا پر اتنی زیادہ تھی کہ بعض مقامات پر یہ کارِ خیر مایوسیوں کی وجہ سے تباہ ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ صفحہ ۴۱۶ پر اپنی تحریر اور دواساز کی سرخ روشنائی میں، اس نے ایک حاشیے پر لکھا: "مجھے ایک مفروضہ دے دو اور میں دنیا کو ہلا دوں گا"۔ حوصلہ شکنی کی شرح کرتے ہوئے، اس نے ایک شوخ خاکے میں، اسی خوں رنگ روشنائی میں، تیر سے چھدا ہوا ایک دل بنایا۔ اس کے نزدیک، سانتیاگو نصر کے قریب ترین دوستوں کی طرح، زندگی کی آخری چند ساعتوں میں ستم رسیدہ کا طرزِ عمل اس کی بے گناہی کا کافی سے زیادہ ثبوت تھا۔

اپنی موت کی صبح، در حقیقت، سانتیاگو نصر کے پاس شک کا ایک لمحہ بھی نہیں تھا، اس امر کے باوجود کہ وہ بخوبی آگاہ تھا کہ اس پر لگائی گئی تہمت کی اسے کیا قیمت ادا کرنی پڑ سکتی ہے۔ وہ اس دنیا کی ظاہرداری کی روش سے واقف تھا اور ضرور جانتا رہا ہو گا کہ ویکاریو برادران کی سادہ مزاجی کسی بدنامی کو برداشت کر جانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کوئی بھی بیاردو سان رومان کو بہت اچھی طرح نہیں جانتا تھا، مگر سانتیاگو نصر اس سے اتنا ضرور آشنا تھا کہ سمجھ سکے کہ اپنے دنیادارانہ مزاج کی گہرائیوں میں وہ اپنے فطری تعصبات کا اتنا ہی اسیر ہے جتنا کہ کوئی اور ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس کا فکرمند نہ ہونا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ اس کے علاوہ، آخری لحات میں، جب اسے علم ہو گیا کہ ویکاریو برادران اسے قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں، اس کا ردِ عمل سراسیمگی کا نہیں تھا، جیسا کہ متعدد موقعوں پر بیان کیا گیا، بلکہ بے گناہوں کی پریشانی کی طرح کا تھا۔

میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ وہ اپنی موت کو سمجھے بغیر مر گیا۔ میری بہن مارگوت سے وعدہ کرنے کے بعد، کہ وہ ہمارے گھر آکر ناشتا کرے گا، کرستو بیدویا اس کو بازو سے تھام کر گودی کی طرف لے گیا اور وہ دونوں اتنے بے فکر نظر آ رہے تھے کہ انھوں نے ایک غلط تاثر کو راہ دی۔ "وہ دونوں اتنے مطمئن چلے جا رہے تھے"۔ میمے لوئیزا نے مجھے بتایا کہ "میں نے خدا کا شکر ادا کیا، کیوں کہ میں سمجھی کہ معاملہ صاف ہو گیا ہے"۔ بلاشبہ ہر کوئی سانتیاگو نصر سے بے پناہ محبت نہیں رکھتا تھا۔ پولو کاریو، برقی کارخانے کے مالک کا خیال تھا کہ اس کا پرسکون ہونا اس کی بے گناہی کا نہیں بلکہ کلبیت کا مظہر تھا۔ "وہ سوچتا تھا کہ اپنی دولت کی وجہ سے وہ ناقابلِ گرفت ہے"۔ اس نے مجھے بتایا۔ فاؤستالوپیز، اس کی بیوی نے تبصرہ کیا: "بالکل ترکوں کی طرح"۔ اندالیسیو پاردو، کلوتیلدے آرمنتا کی دکان کے پاس سے یوں ہی گزر رہا تھا کہ ویکاریو برادران نے اسے بتایا کہ جیسے ہی بشپ چلا جائے گا وہ سانتیاگو نصر کو قتل کر دیں گے۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح، اس نے سمجھا کہ یہ صبح خیزوں کی خواب آرائی ہے، مگر کلوتیلدے آرمنتا نے اس سے سانتیاگو نصر کے پاس جانے اور اسے خبردار کرنے کی درخواست کی۔

"تکلیف مت کرو"۔ پیدرو ویکاریو نے اس سے کہا۔ "جو بھی ہو، اب اسے مردہ ہی سمجھو"۔

یہ بہت زیادہ واضح چیلنج تھا: وہ اندالیسیو پاردو اور سانتیاگو نصر کے درمیان تعلق کو جانتے تھے' اور انہوں نے ضرور سوچا ہوگا کہ وہ جرم کو روکنے اور انہیں شرمندگی سے بچانے کے لیے نہایت موزوں شخص ہے۔ مگر اندالیسیو نے سانتیاگو نصر کو کرستو بیدویا کے ساتھ ان گروہوں میں پایا جو گودی سے لوٹ رہے تھے' اور اسے اس کو متنبہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ "میرے اعصاب جواب دے گئے"۔ اس نے مجھے بتایا۔ اس نے دونوں کی پیٹھ تھپتھپائی اور انہیں ان کی راہ پر جانے دیا۔ انہوں نے شاید ہی اسے محسوس کیا ہو' کیوں کہ وہ ابھی تک شادی کے اخراجات کا تخمینہ لگانے میں منہمک تھے۔

اب لوگ منتشر ہو کر' ان دونوں کی طرح' چوک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ ایک کثیف ہجوم تھا مگر اسکولیستکا سیروس کا خیال تھا کہ اس نے دونوں کو ہجوم کے وسط کے ایک خالی دائرے میں بہ آسانی چلتے ہوئے دیکھا تھا' کیوں کہ لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ سانتیاگو نصر مرنے جا رہا ہے' اور ان میں اس سے مس ہونے کی جرأت نہیں تھی۔ کرستو بیدویا نے بھی اس غیر معمولی طرز عمل کی وجہ سے اس ہجوم کو یاد رکھا۔ "وہ ہماری طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ہم نے اپنے چہرے پر رنگ مل رکھا ہو"۔ اس نے مجھے بتایا۔ "سارا فوریگا بھی اسی وقت اپنی جوتوں کی دکان کھول رہی تھی' اور جب وہ وہاں سے گزرے وہ سانتیاگو نصر کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی۔ مگر اس نے اسے مطمئن کر دیا"۔

"تم سمجھ سکتی ہو' سارا"۔ اس نے اس سے رکے بغیر کہا۔ "رات بھر اتنے غل غپاڑے کے بعد تو ایسا ہی لگوں گا"۔

سیلی ستے دانگوندا اپنے گھر کے دروازے پر شب خوابی کے لباس میں بیٹھا ان لوگوں کا مضحکہ اڑا رہا تھا جو بشپ کے استقبال کو گئے تھے۔ اس نے سانتیاگو نصر کو کافی پینے کی دعوت دی۔ "مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا"۔ اس نے مجھے بتایا۔ مگر سانتیاگو نصر نے اسے جواب دیا کہ وہ میری بہن کے ساتھ ناشتا کرنے کے لیے لباس تبدیل کرنے کی عجلت میں ہے۔ "میں بالکل گڑبڑا گیا"۔ سیلی ستے دانگوند نے مجھے بتایا۔ "کیوں کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر وہ اتنا پر یقین ہے کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے تو پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اسے قتل کرنے والے ہوں"۔ جمیل شعیوم واحد شخص تھا جس نے وہی کیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ جیسے ہی اس نے افواہ سنی' وہ اپنی بزازی کی دکان کے دروازے پر گیا' اور سانتیاگو نصر کا انتظار کرنے لگا تاکہ اسے خبردار کر سکے۔ وہ ان آخری عربوں میں سے ایک تھا جو ابراہیم نصر کے ساتھ آئے تھے اور اس کے دم واپسیں تک تاش کی بازی میں اس کا ساتھی رہا تھا' اور ابھی تک خاندان کا موروثی مشیر تھا۔ اس سے زیادہ کسی کو بھی سانتیاگو نصر سے بات کرنے کا اختیار نہیں تھا' مگر اس کے باوجود' اس نے سوچا کہ اگر افواہ بے بنیاد ہے تو وہ اس کو خوامخواہ پریشان کر دے گی' اور اس نے پہلے کرستو بیدویا سے مشورہ کرنے کو ترجیح دی' کہ شاید اسے کچھ خبر ہو۔ جب وہ پاس سے گزرا' اس نے اسے آواز دی۔ کرستو بیدویا نے سانتیاگو نصر کو تھپکی دی' جو چوک کے موڑ تک پہنچ چکا تھا اور جمیل شعیوم کے بلانے کا جواب دیا۔ "ہفتے کو ملیں گے"۔ اس نے کہا۔

سانتیاگو نصر نے اسے جواب نہیں دیا' مگر عربی میں جمیل شعیوم سے کچھ کہا جس نے عربی ہی میں' ہنسی سے بل کھاتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم میں ذو معنی گفتگو چلتی تھی"۔ جمیل شعیوم نے مجھے بتایا۔ رکے بغیر' سانتیاگو نصر نے دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے الوداع کہا' اور چوک کے موڑ کی طرف چلا گیا۔ یہ آخری موقع تھا کہ انہوں نے اسے دیکھا۔

کرستو بیدویا نے سانتیاگو نصر کو پکڑنے کے لیے دوڑنے سے پہلے صرف جمیل شعیوم کی اطلاع سننے کا وقت لیا۔ اس نے اس کو موڑ سے جاتے ہوئے دیکھا تھا مگر وہ اسے ان گروہوں میں نظر نہیں آیا جو چوک تک پہنچ کر منتشر ہونے لگے تھے۔ اس نے جس سے بھی پوچھا' اس کو ایک ہی جواب ملا:

"میں نے اسے ابھی تمہارے ساتھ دیکھا تھا"۔

یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ اتنے کم وقت میں گھر پہنچ گیا ہو' مگر بہرصورت وہ اس کے بارے میں معلوم کرنے اندر چلا گیا' کیوں کہ اس نے بیرونی دروازہ آنکل چڑھے بغیر اور آدھ کھلا پایا۔ وہ فرش پر پڑے کاغذ کو دیکھے بغیر اندر گیا۔ وہ رہنے کے تاریک کمرے سے شور پیدا نہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گزرا' کیوں کہ مہمانوں کے آنے کے لیے یہ وقت نامناسب تھا۔ مگر گھر کے عقبی حصے میں کتے ہوشیار ہو گئے تھے اور اس سے ملنے کو آ گئے۔ اس نے انہیں چابیوں کی

جھنکار سے چپ کرایا' جیسا کہ اس نے ان کے مالک سے سیکھا تھا' اور ان کے آگے آگے باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ برآمدے میں وہ دیوینا فلور سے ٹکرایا' جو پانی کی ایک بالٹی لیے رہنے کے کمرے کا فرش صاف کرنے آ رہی تھی۔ اس نے اسے یقین دلایا کہ سانتیاگو نصر واپس نہیں آیا۔ وکتوریا گزمان نے خرگوشوں کا اسٹو چولہے پر رکھا ہی تھا' جب وہ باورچی خانے میں داخل ہوا۔ وہ فوراً جان گئی۔ "اس کا دل اس کی زبان پر تھا"۔ اس نے مجھے بتایا۔ کرستو بیدویا نے اس سے پوچھا کہ کیا سانتیاگو نصر گھر آ گیا ہے' اور اس نے بناوٹی معصومیت سے جواب دیا کہ وہ ابھی تک سونے کے لیے نہیں لوٹا۔

"دیکھو' بہت سنگین بات ہے"۔ کرستو بیدویا نے اس سے کہا۔ "وہ قتل کرنے کے لیے اس کو تلاش کر رہے ہیں"۔

وکتوریا گزمان اپنی معصومیت بھول گئی۔

"وہ غریب لڑکے کسی کو قتل نہیں کریں گے"۔ اس نے کہا۔

"وہ ہفتے کے دن سے پیے چلے جا رہے ہیں"۔ کرستو بیدویا نے کہا۔

"اسی لیے تو"۔ اس نے جواب دیا۔ "دنیا میں کوئی شرابی اپنی بکواس پر عمل نہیں کرتا"۔

کرستو بیدویا دوبارہ رہنے کے کمرے میں چلا گیا جہاں دیوینا فلور نے کھڑکیوں کو کھولا ہی تھا۔ "بلاشبہ بارش نہیں ہو رہی تھی"۔ کرستو بیدویا نے مجھے بتایا۔ "اس وقت سات بجنے ہی والے تھے اور سنہری دھوپ کھڑکیوں سے آ رہی تھی"۔ اس نے دیوینا فلور سے پوچھا کہ کیا وہ یقین سے کہہ رہی ہے کہ سانتیاگو نصر رہنے کے کمرے کے دروازے سے اندر نہیں آیا۔ اب کی بار وہ پہلے کی طرح پر یقین نہیں تھی۔ اس نے پلاسید الینیرو کے بارے میں پوچھا' اور اس نے جواب دیا کہ صرف ایک لمحے پہلے وہ اس کی کافی نائٹ ٹیبل پر رکھ کر آئی ہے' مگر اسے جگایا نہیں۔ ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا۔ وہ سات بجے اٹھتی' کافی پیتی اور دن کے کھانے کے لیے ہدایات دینے نیچے اترتی۔ کرستو بیدویا نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ چھ پچپن ہوئے تھے۔ وہ دوسری منزل پر اس بات کی تصدیق کرنے گیا کہ سانتیاگو نصر گھر نہیں آیا۔

شب خوابی کا کمرہ اندر سے بند تھا کیوں کہ سانتیاگو نصر اپنی ماں کے شب خوابی کے کمرے کی طرف سے باہر گیا تھا۔ کرستو بیدویا نہ صرف اس گھر کو اپنے گھر کی طرح بخوبی جانتا تھا' بلکہ وہ اس خاندان سے اتنا مانوس تھا کہ اس نے پلاسید الینیرو کے شب خوابی کے کمرے کا دروازہ کھولا اور وہاں سے متصل کمرے میں چلا گیا۔ روشن دان سے ایک گرد آلود روشنی کی لکیر آ رہی تھی' اور خوبصورت عورت اپنی کروٹ پر جھولے میں سوئی ہوئی اپنا عروسی ہاتھ اپنے رخسار پر رکھے غیر حقیقی لگ رہی تھی۔ "وہ ایک خوبصورت روح کی طرح تھی"۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا' اس کے حسن سے مسحور ہوا' اور پھر خاموشی کے ساتھ غسل خانے سے ہوتا ہوا سانتیاگو نصر کے کمرے میں چلا گیا۔ بستر ابھی تک بچھا ہوا تھا' اچھی طرح استری کیے ہوئے گھڑسواری کے کپڑے کرسی پر رکھے تھے' اور کپڑوں کے اوپر اس کا ہیٹ اور فرش پر مہمیز والے جوتے تھے۔ نائٹ ٹیبل پر سانتیاگو نصر کی کلائی کی گھڑی چھ اٹھاون بتا رہی تھی۔ "اچانک میں نے سوچا کہ وہ واپس آ چکا ہے تاکہ مسلح ہو کر باہر جا سکے"۔ کرستو بیدویا نے مجھے بتایا۔ مگر اس نے میگنم نائٹ ٹیبل کی دراز میں پائی۔ "میں نے کبھی گولی نہیں چلائی"۔ کرستو بیدویا نے مجھے بتایا۔ "مگر میں نے فیصلہ کیا کہ ریوالور رکھ لوں اور سانتیاگو نصر تک پہنچا دوں"۔ اس نے اسے اپنی قمیص کے نیچے اپنی بیلٹ میں پھنسا لیا' اور جرم کے بعد ہی اس کو احساس ہوا کہ وہ بھرا ہوا نہیں ہے۔ پلاسید الینیرو کافی کا مگ اپنے ہاتھ میں لیے جائے در میں نمودار ہوئی' عین اس وقت جب وہ دروازہ بند کر رہا تھا۔

"خداوندا"۔ وہ چیخی۔ "تم نے مجھے ڈرا دیا"۔

کرستو بیدویا بھی گھبرا گیا تھا۔ اس نے اس کو پوری روشنی میں سنہری پرندوں والا ڈریسنگ گاؤن پہنے اور بال بکھرائے دیکھا۔ اس کا سحر ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے بڑی حد تک بدحواسی میں اسے بتایا کہ وہ سانتیاگو نصر کی تلاش میں ہے۔

"وہ بشپ کا استقبال کرنے گیا ہے"۔ پلاسید الینیرو نے کہا۔

"وہ ابھی ابھی گیا ہے؟" اس نے کہا۔

"ہاں' میرا خیال ہے"۔ اس نے کہا۔ "وہ سب سے خراب قسم کی ماں کا بیٹا ہے"۔

وہ وہاں سے گئی نہیں' کیوں کہ اس وقت تک اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کرستو بیدویا کو اپنی حرکات و سکنات پر اختیار

نہیں رہا ہے۔ "میرا خیال ہے خدا نے مجھے معاف کر دیا ہو گا"۔ پلا سید الینیرو نے مجھے بتایا۔ "مگر مجھے وہ اتنا الجھا ہوا نظر آ رہا تھا کہ اچانک مجھے لگا کہ وہ لوٹنے آیا ہے"۔ اس نے پوچھا کہ وہ اتنا بدحواس کیوں ہے۔ کرستو بیدویا کو معلوم تھا کہ وہ مشتبہ حالت میں ہے، مگر اس میں سچ بتانے کی ہمت نہیں تھی۔

"بس میں ایک منٹ بھی سو نہیں سکا ہوں"۔ اس نے کہا۔

وہ مزید توضیحات کے بغیر چلا گیا۔ "ویسے بھی"۔ اس نے مجھے بتایا۔ "وہ ہمیشہ اس وہم میں مبتلا رہا کرتی تھی کہ اسے لوٹا جا رہا ہے"۔ چوک پر وہ فادر امادور سے ملا، جو نہ ہونے والے اجتماع کی عبا میں کلیسا کو واپس جا رہا تھا، مگر اس کا خیال تھا کہ وہ سانتیاگو نصر کے لیے سوائے اس کی روح کو بچانے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ دوبارہ گودی کی طرف بڑھ رہا تھا، جب اس نے انہیں کلوتیلدے آرمنتا کی دکان سے پکارتے سنا۔ پیدرو ویکاریو دروازے پر تھا، زرد اور وحشت زدہ! اس کا گریبان کھلا ہوا تھا اور آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں، اور اس کے ہاتھ میں ننگا چھرا تھا۔ اس کا انداز اتنا نامناسب تھا کہ فطری نہیں لگ سکتا تھا، مگر یہ صرف ان حربوں میں سے ایک تھا جو اس نے اختیار کیا تھا تاکہ وہ اسے جرم کے ارتکاب سے روک سکے۔

"کرستوبال"۔ وہ چیخا۔ "سانتیاگو نصر سے کہہ دو، ہم اسے قتل کرنے کے لیے یہاں اس کا انتظار کر رہے ہیں"۔

کرستوبیدویا اسے باز رکھنے کی نوازش کر سکتا تھا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ریوالور کس طرح چلایا جاتا ہے، تو سانتیاگو نصر آج زندہ ہوتا"۔ اس نے مجھے بتایا۔ مگر اس خیال نے اسے متاثر کیا، کیوں کہ وہ خود چڑھی گولی کی تباہ کارانہ صلاحیت کے بارے میں سن چکا تھا۔

"میں تمہیں خبردار کرتا ہوں۔ وہ میگنم سے مسلح ہے جس کی گولی انجن بلاک سے گزر سکتی ہے"۔ اس نے چیخ کر کہا۔

پیدرو ویکاریو جانتا تھا کہ یہ درست نہیں ہے۔ "وہ کبھی مسلح ہو کر نہیں نکلتا تھا، سوائے اس وقت کے جب اس نے گھڑسواری کا لباس پہن رکھا ہو"۔ اس نے مجھے بتایا۔ مگر بہرحال اس نے اپنی بہن کی عزت کا داغ مٹانے کا فیصلہ کرتے وقت اس امکان کو مدنظر رکھا تھا کہ وہ مسلح بھی ہو سکتا ہے۔

"مرا ہوا آدمی گولیاں نہیں چلاتا"۔ اس نے چیخ کر کہا۔

پھر پابلو ویکاریو جائے در میں نمودار ہوا۔ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح زرد ہو رہا تھا، اور شادی کی جیکٹ پہنے اور اخبار میں لپٹا چھرا لیے ہوئے تھا۔ "اگر ایسا نہ ہوتا"۔ کرستوبیدویا نے مجھے بتایا۔ "میں کبھی نہ جان سکتا کہ دونوں میں کون سا بھائی کون ہے"۔ پھر کلوتیلدے آرمنتا پابلو ویکاریو کے پیچھے نمودار ہوئی اور اس نے چیخ کر کرستوبیدویا سے جلدی کرنے کو کہا، کیوں کہ اس نامرد قصبے میں صرف اس جیسا شخص ہی المیے کو روک سکتا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ سب کے علم میں ہے۔ جو لوگ گودی سے واپس آ رہے تھے، چیخوں سے ہوشیار ہو کر جرم کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے چوک پر اپنی اپنی جگہ سنبھالنے لگے۔ کرستوبیدویا نے کئی لوگوں سے، جنہیں وہ جانتا تھا، پوچھا کہ کیا انہوں نے سانتیاگو نصر کو دیکھا ہے، مگر کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ سوشل کلب کے دروازے پر وہ کرنل لزارو آپونتے سے ملا، اور اس نے اسے بتایا کہ کلوتیلدے آرمنتا کی دکان کے سامنے کیا ہو رہا ہے۔

"یہ ناممکن ہے"۔ کرنل آپونتے نے کہا۔ "کیوں کہ میں نے انہیں گھر جا کر سو رہنے کا حکم دیا ہے"۔

"میں نے انہیں ابھی ابھی سؤروں کو ذبح کرنے کے چھروں کے ساتھ دیکھا ہے"۔ کرستوبیدویا نے کہا۔

"یہ ناممکن ہے، کیوں کہ وہ میں نے گھر جا کر سونے کا حکم دینے سے پہلے ان سے لے لیے تھے"۔ میئر نے کہا۔ "ضرور تم نے انہیں اس سے پہلے دیکھا ہو گا"۔

"میں نے انہیں دو منٹ پہلے دیکھا ہے، اور دونوں کے پاس سؤروں کو ذبح کرنے کے چھرے تھے"۔ کرستوبیدویا نے کہا۔

"لعنت ہو"۔ میئر نے کہا۔ "وہ ضرور نئے چھروں کے ساتھ لوٹ آئے ہیں"۔

اس نے اس مسئلے پر فوری توجہ دینے کا وعدہ کیا، مگر وہ رات کے دومینو کی تاریخ کی تصدیق کرنے سوشل کلب کے اندر چلا گیا، اور جب باہر نکلا تو جرم کا ارتکاب ہو چکا تھا۔

کرستوبیدویا نے اس وقت اپنی واحد مہلک غلطی کی۔ اس نے سوچا کہ سانتیاگو نصر نے آخری لمحے میں فیصلہ کرلیا ہوگا کہ وہ لباس تبدیل کرنے سے پہلے ہی ہمارے گھر ناشتا کرے گا' اور وہ اسے تلاش کرنے کے لیے وہاں پہنچا۔ وہ دریا کے کنارے تیزی سے پلٹا' ہر ایک سے یہ پوچھتے ہوئے کہ کیا کسی نے اسے گزرتے ہوئے دیکھا ہے' مگر کسی نے نہیں کہا کہ اس نے دیکھا ہے۔ اسے تشویش نہیں ہوئی' کیوں کہ ہمارے گھر پہنچنے کے کئی اور راستے بھی تھے۔ پروسپیرا آرانگو' پہاڑی لڑکی نے اس سے اپنے باپ کی طبی امداد کرنے کو کہا' جو بشپ کی گریزپا دعاؤں کے اثر سے باہر اپنے گھر کے چبوترے پر جاں کنی کے عالم میں پڑا تھا۔ "میں نے اسے گزرتے ہوئے دیکھا تھا"۔ میری بہن مارگوت نے مجھے بتایا۔ "اور اس کا چہرہ اس وقت ہی مردوں جیسا ہو چکا تھا"۔ کرستوبیدویا نے بیمار شخص کی حالت کا اندازہ کرنے میں چار منٹ لگائے' اور وعدہ کیا کہ وہ بعد میں آکر ہنگامی امداد دے گا' مگر اس نے مزید تین منٹ شب خوابی کے کمرے تک جانے میں پروسپیرا آرانگو کی مدد کرتے ہوئے ضائع کیے۔ جب وہ باہر آیا' اس نے دور سے شور کی آواز سنی' اور اسے معلوم ہوا کہ چوک کی جانب ہوائیاں چھوڑی جارہی ہیں۔ اس نے دوڑنا چاہا' مگر ریوالور' جو اس کی بیلٹ میں بے ڈھنگے پن سے اڑسا ہوا تھا' اس کی رفتار میں مزاحم ہوا۔ جیسے ہی وہ آخری موڑ سے آگے بڑھا' اس نے میری ماں کو عقب سے پہچان لیا' جب وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو اپنے ساتھ عملاً گھسیٹتی ہوئی جا رہی تھی۔

"لوئیزا سانتیاگا"۔ اس نے اسے زور سے پکارا۔ "سانتیاگو نصر کہاں ہے؟" میری ماں مشکل سے مڑ سکی' اس کا چہرہ آنسوؤں میں نہایا ہوا تھا۔

"میرے بچے"۔ اس نے جواب دیا۔ "وہ کہہ رہے ہیں کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے"۔

ایسا ہی ہوا تھا۔ جب کرستوبیدویا اسے تلاش کر رہا تھا' سانتیاگو نصر اپنی منگیتر فلورا میگل کے گھر گیا تھا' جو اس موڑ کے بالکل قریب تھا جہاں اس نے آخری بار دیکھا تھا۔ "میرے تصور میں بھی نہیں آسکا تھا کہ وہ وہاں ہوگا"۔ اس نے مجھے بتایا۔ "کیوں کہ وہ لوگ کبھی دوپہر سے پہلے سو کر نہیں اٹھتے تھے"۔ مروجہ روایت یہ تھی کہ پورا خاندان قبیلے کے بزرگ نحیر میگل کی ہدایت پر بارہ بجے تک سوتا رہتا تھا۔ اسی لیے فلورا میگل' جو اتنی نوخیز نہیں رہ گئی تھی' اس وقت تک گلاب کی طرح شاداب تھی۔ مرسیدس کہتی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ' دوسرے بہت سے گھروں کی طرح' اپنے گھر کو بہت دیر تک بند رکھتے تھے' مگر وہ صبح خیز اور جفاکش تھے۔ یہ رشتہ سانتیاگو نصر اور فلورا میگل کے والدین نے طے کیا تھا۔ سانتیاگو نصر نے اسے اپنے عنفوان شباب میں قبول کیا تھا اور وہ اسے قائم کرنے کا مصمم ارادہ رکھتا تھا' شاید وہ بھی اپنے باپ کی طرح شادی کے افادی پہلو کا زیادہ قائل تھا۔ فلورا میگل ایک خاص گل اندامی کی حامل تھی' مگر اس میں ذہانت اور قوت فیصلہ کی کمی تھی' اور وہ اپنی تمام ہم عصروں کے لیے دلہن کی خاص سہیلی کی حیثیت سے خدمت انجام دے چکی تھی' اس لیے یہ رشتہ اس کے لیے ایک عطیۂ خداوندی تھا۔ ان کی منگنی' پر تکلف ملاقاتوں اور دلوں کی بے قراریوں کے بغیر' آسانی سے عمل میں آئی تھی۔ شادی کی تاریخ کئی بار ملتوی ہونے کے بعد آخر کار کرسمس کے بعد مقرر ہوئی تھی۔

فلورا میگل اس سوموار کو بشپ کی کشتی کے پہلے شور پر بیدار ہوئی تھی' اور اٹھنے کے تھوڑی ہی دیر کے بعد اسے علم ہو گیا تھا کہ ویکاریو برادران سانتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس نے میری راہبہ بہن کو' جو واحد ہستی تھی جس سے اس نے بدبختی کے بعد گفتگو کی' بتایا کہ اسے یہ بھی یاد نہیں کہ اسے کس نے یہ اطلاع دی تھی۔ "مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ چھ بجے صبح ہر کوئی جانتا تھا"۔ اس نے میری بہن سے کہا۔ اس کے باوجود اسے یہ ناقابل یقین نظر آتا تھا کہ وہ سانتیاگو نصر کو قتل کرنے جارہے ہیں۔ اس کے برعکس' اس کو یہ خیال آیا کہ وہ اسے انجلا ویکاریو سے شادی کرنے پر مجبور کریں گے تاکہ اس کی عزت اسے واپس مل سکے۔ وہ تذلیل کے ایک شدید بحران سے گزری۔ جب آدھا قصبہ بشپ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا' وہ غصے میں روتی ہوئی اپنے شب خوابی کے کمرے میں تھی' اور ان صندوقچہ بھر خطوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی جو سانتیاگو نصر نے اسے اسکول سے لکھے تھے۔

جب بھی وہ فلورا میگل کے گھر کے پاس سے گزرتا' حتیٰ کہ جب وہاں کوئی نہ ہوتا' سانتیاگو نصر اپنی چابیاں کھڑکی کی جالی سے رگڑتا تھا۔ اس سوموار کو وہ خطوں کا صندوقچہ اپنی گود میں لیے انتظار کر رہی تھی۔ سانتیاگو نصر سڑک پر سے اسے نہیں دیکھ سکا۔ مگر اس نے بہرحال اسے چابی رگڑنے

سے پہلے جالی کے اندر سے دیکھ لیا۔

"اندر آجاؤ"۔ اس نے کہا۔

اس گھر میں کوئی بھی، حتیٰ کہ کوئی معالج بھی، صبح کے چھ بج کر پینتالیس منٹ پر داخل نہیں ہوا تھا۔ سانتیاگو نصر نے اسی وقت کرستوبیدیا کو جمیل شعیوم کی دکان پر چھوڑا تھا، اور اس وقت چوک پر اتنے افراد اس کی حرکات پر نظر رکھے ہوئے تھے کہ یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ کسی نے اس کو اپنی منگیتر کے گھر جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔ تفتیشی مجسٹریٹ نے کسی ایک آدمی کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس نے اسے فلورا میگل کے گھر میں جاتے ہوئے دیکھا ہو، اور اس نے بھی میری طرح اتنی ہی سخت کوشش کی تھی، مگر ایک گواہ کو بھی تلاش کرنا ناممکن ثابت ہوا۔ مسل کے صفحہ ۳۸۲ پر ایک اور حاشیاتی فیصلے میں، اس نے سرخ روشنائی سے لکھا: "بدبختی ہمیں نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے"۔ حقیقت یہ تھی کہ سانتیاگو نصر سب کی نظروں کے سامنے، اور خود کو چھپانے کی کوئی کوشش کیے بغیر، صدر دروازے سے اندر گیا تھا۔ فلورا میگل ان لباسوں میں سے ایک بدنصیب چنٹ دار جھالروں والا لباس پہنے، جو وہ یادگار مواقع پر پہننے کی عادی تھی، غصے سے پاگل ہوتی ہوئی، پارلر میں اس کا انتظار کر رہی تھی، اور اس نے صندوقچہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"تو یہ تم ہو؟"۔ اس نے اسے بتایا۔ "مجھے امید ہے کہ وہ تمہیں قتل کر دیں گے"۔ سانتیاگو نصر اتنا بدحواس ہوا کہ اس نے صندوقچہ گرا دیا، اور اس کے نامحبوب خط فرش پر بکھر گئے۔ اس نے فلورا میگل کو شب خوابی کے کمرے میں جا لینا چاہا مگر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس نے کئی بار دستک دی اور اس کو صبح کے وقت کا لحاظ نہ کرتے ہوئے، بہت اصرار آمیز آواز میں پکارا، لہٰذا تمام خاندان جمع ہو گیا، اور وہ سب متوحش تھے۔ نسبی اور ازدواجی رشتے داروں کو شمار کرتے ہوئے، بڑے اور چھوٹے ملا کر وہ چودہ افراد تھے۔ نحیر، میگل، فلورا میگل کا باپ، اپنی سرخ ڈاڑھی کے ساتھ اور بدوی کفتان میں ملبوس، جو وہ اپنے وطن سے لایا تھا اور گھر میں تمام وقت زیب تن کیے رہتا تھا، سب سے آخر میں نمودار ہوا۔ میں نے اسے کئی بار دیکھا تھا اور وہ بہت بوڑھا اور نحیف تھا، مگر جو چیز مجھے متاثر کرتی تھی وہ اس کی مقتدرانہ تاب و تب تھی۔

"فلورا"۔ اس نے اپنی زبان میں پکارا۔ "دروازہ کھولو"۔

وہ اپنی بیٹی کے شب خوابی کے کمرے میں گیا، جب کہ سارا خاندان کھڑا سانتیاگو نصر کو گھورتا رہا۔ وہ پارلر میں جھکا، خط اٹھا اٹھا کر صندوقچے میں رکھ رہا تھا۔ "یہ عمل توبہ کی ایک ریاضت معلوم ہوتا تھا"۔ انہوں نے مجھے بتایا۔ نحیر میگل چند منٹوں میں شب خوابی کے کمرے سے باہر آیا، اپنے ہاتھ سے ایک اشارہ کیا، اور تمام خاندان منتشر ہو گیا۔

اس نے سانتیاگو نصر سے عربی میں گفتگو جاری رکھی۔ "پہلے ہی لمحے میں سمجھ گیا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اسے اس کا خفیف سا گمان بھی نہیں ہے"۔ اس نے مجھے بتایا۔ "اس نے اس سے بے درنگ پوچھا کہ کیا وہ جانتا ہے کہ ویکاریو برادران قتل کرنے کے لیے اس کو تلاش کر رہے ہیں"۔ وہ زرد پڑ گیا اور اپنا توازن اس طرح کھو بیٹھا کہ یہ سوچنا ناممکن تھا کہ وہ دکھاوے کے لیے ایسا کر رہا ہے"۔ اس نے اتفاق کیا کہ اس کا رویہ خوف سے زیادہ ایک پریشانی کا غماز تھا۔

"صرف تم جان سکتے ہو کہ ان کا الزام درست ہے یا نہیں"۔ اس نے اس سے کہا۔ "مگر بہرصورت، اب تمہارے پاس دو راستے ہیں: یا تو تم یہیں چھپ جاؤ، اس گھر میں جو تمہارا ہے، یا تم میری رائفل لے کر باہر نکلو"۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے"۔ سانتیاگو نصر نے کہا۔ وہ صرف اتنا ہی کہنے کے قابل ہو سکا، اور اس نے یہ اسپانوی میں کہا۔ "وہ ایک بھیگے ہوئے پرندے کی طرح لگ رہا تھا"۔ نحیر میگل نے مجھے بتایا۔ اس کو صندوقچہ اس کے ہاتھ سے لینا پڑا، کیوں کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دروازہ کھولنے کے لیے اسے کہاں رکھے۔

"یہ دو کا ایک سے مقابلہ ہوگا"۔ اس نے اسے بتایا۔

سانتیاگو نصر چلا گیا۔ لوگوں نے خود کو چوک پر اسی انداز میں مقرر کر لیا تھا جیسا کہ وہ پریڈ کے دنوں میں کیا کرتے تھے۔ ان سب نے اسے باہر آتے دیکھا، اور وہ سب سمجھ گئے کہ اب وہ جانتا ہے کہ وہ اسے قتل کرنے جا رہے ہیں، اور وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اسے اپنے گھر جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک بالکنی سے کسی نے چیخ کر کہا "اے ترک، اس راستے سے نہیں، پرانی گودی کی طرف سے"۔ سانتیاگو نصر نے آواز دینے والے کو ڈھونڈنا چاہا۔ جمیل شعیوم نے اسے آواز دی کہ وہ اس کی دکان کے اندر آ جائے، اور اپنی

شکاری بندوق لانے چلا گیا۔ مگر اسے یاد نہیں آیا کہ اس نے کارتوس کہاں رکھے تھے۔ انہوں نے اسے ہر طرف سے آوازیں دینی شروع کر دیں' اور سانتیاگو نصر اتنی آوازوں سے بوکھلا کر کئی بار آگے بڑھا' اور پھر پیچھے لوٹا۔ یہ واضح تھا کہ اس کا رخ اپنے گھر کے باورچی خانے کے دروازے کی طرف تھا' مگر یک دم اسے احساس ہوا ہو گا' کہ صدر دروازہ کھلا ہے۔

"وہ آرہا ہے"۔ پابلو ویکاریو نے کہا۔

دونوں نے اسے بیک وقت دیکھا۔ پابلو ویکاریو نے اپنی جیکٹ اتاری' اسے بنچ پر رکھا' اور اپنا چھرا اخبار سے نکال کر اسے ایک تلوار کی طرح تھام لیا۔ دکان سے نکلنے سے پہلے' بغیر کسی مطابقت کے' دونوں نے اپنے سینوں پر صلیب کا نشان بنایا۔ پھر کلوتیلدے آرمنتا نے پابلو ویکاریو کی قمیص تھام لی اور سانتیاگو نصر سے چیخ کر کہا کہ وہ بھاگ جائے کیوں کہ وہ اسے قتل کرنے جا رہے ہیں۔ یہ اتنی ہنگامی چیخ تھی کہ اس نے دوسروں کو چپ کرا دیا۔ "پہلے تو وہ حیرت زدہ رہ گیا"۔ کلوتیلدے آرمنتا نے مجھے بتایا "کیوں کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کون آواز دے رہا ہے اور کہاں سے"۔ مگر جب اس نے دیکھا' اس نے پیدرو ویکاریو کو بھی دیکھ لیا' جس نے کلوتیلدے آرمنتا کو دھکا دے کر زمین پر گرا دیا اور اپنے بھائی سے جاملا۔ سانتیاگو نصر اپنے گھر سے پچاس گز سے کم فاصلے پر تھا' اور وہ صدر دروازے کی طرف دوڑا۔

پانچ منٹ پہلے وکٹوریا گزمان نے پلاسید الینیرو کو وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو لوگ پہلے سے جانتے تھے۔ پلاسید الینیرو مضبوط اعصاب کی عورت تھی' اور اس نے فکرمندی کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس نے وکتوریا گزمان سے پوچھا کہ کیا اس نے اس کے بیٹے کو کچھ بتایا ہے' اور اس نے ایمانداری سے جھوٹ بولا' کیوں کہ اس نے اسے جواب دیا کہ جب وہ کافی کے لیے نیچے آیا تھا' اس وقت تک وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ رہنے کے کمرے میں جہاں وہ ابھی تک فرش صاف کر رہی تھی' دیوینا فلور نے اسی وقت سانتیاگو نصر کو چوک کی طرف والے دروازے سے اندر آتے' اور کھلی سیڑھیوں سے شب خوابی کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ "یہ ایک بہت واضح فریب نظر تھا"۔ دیوینا فلور نے مجھے بتایا۔ "وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھا' اور اپنے ہاتھ میں کچھ لیے تھا' جس کا میں ٹھیک سے اندازہ نہیں کر سکی' مگر وہ گلابوں کے ایک دستے کی طرح لگ رہا تھا"۔ اس لیے جب پلاسید الینیرو نے اس کے بارے میں پوچھا' دیوینا فلور نے اسے مطمئن کر دیا۔

تب پلاسید الینیرو نے کاغذ کو فرش پر دیکھا' مگر اس کو اسے اٹھانے کا خیال نہیں آیا' اور اسے صرف اس وقت معلوم ہوا کہ اس میں کیا لکھا تھا جب کسی نے بعد میں المیے کی افراتفری کے دوران اسے وہ خط دکھایا۔ دروازے سے اس نے دیکھا کہ ویکاریو برادران اپنے چھرے بلند کیے اس کے گھر کی طرف دوڑتے آرہے ہیں۔ اس جگہ سے جہاں وہ تھی' وہ انہیں دیکھ سکتی تھی' مگر اپنے بیٹے کو جو ایک دوسری سمت سے دروازے کی طرف دوڑ رہا تھا' نہیں دیکھ سکتی تھی۔ "میں سمجھی کہ وہ اسے قتل کرنے کے لیے مکان کے اندر داخل ہونا چاہتے ہیں"۔ اس نے مجھے بتایا۔ پھر وہ بھاگی اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ آگل چڑھا رہی تھی جب اس نے سانتیاگو نصر کی چیخیں سنیں اور دروازے پر کسی کے سخت خوفزدگی کے عالم میں زور زور سے ہاتھ مارنے کی آواز آئی' مگر اس نے سوچا کہ وہ اوپر اپنے کمرے کی بالکنی سے ویکاریو برادران پر چلا رہا ہے۔ وہ اس کی مدد کرنے اوپر گئی۔

سانتیاگو نصر کو اندر آنے میں چند ثانیے رہ گئے تھے جب دروازہ بند ہوا۔ اس نے اپنی مٹھیوں سے کئی مرتبہ دروازہ پیٹا' اور پھر فوراً اپنے دشمنوں کا اپنے خالی ہاتھوں سے مقابلہ کرنے کو مڑا۔ "میں اسے رو بہ رو دیکھ کر ڈر گیا"۔ پابلو ویکاریو نے مجھے بتایا۔ "کیوں کہ وہ اپنے قد سے دگنا لگ رہا تھا"۔ سانتیاگو نصر نے پیدرو ویکاریو کا پہلا وار روکنے کے لیے' جس نے اس پر سیدھے تھامے ہوئے چھرے سے دائیں جانب سے حملہ کیا تھا' اپنا ہاتھ بلند کیا۔

"سؤر کے بچو!" وہ چیخا۔

چھرا اس کی دائیں ہتھیلی سے گزر کر اس کے پہلو میں دستے تک اتر گیا۔ ہر شخص نے اس کی دردناک چیخ سنی۔

"اوہ' میری ماں"۔

پیدرو ویکاریو نے چھرا اپنی قسائیوں والی فولادی کلائی سے باہر کھینچا' اور دوسرا وار تقریباً اسی مقام پر کیا۔ "تعجب یہ ہے کہ چھرا ہر بار بے داغ باہر آتا رہا"۔ پیدرو ویکاریو نے تفتیش کرنے والے کو بیان دیا۔ "میں نے اسے کم از کم تین بار اس کے جسم میں اتارا' مگر اس پر خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا"۔ سانتیاگو نصر تیسرے وار کے بعد خم کھا گیا' اس کے

بازو اس کے پیٹ پر تھے۔ اس نے ایک ذبح ہوتے ہوئے بچھڑے کی کراہ نکالی' اور اپنی پشت ان کی طرف کرنے کی کوشش کی۔ پابلو ویکاریو نے' جو اس کے بائیں طرف تھا' پھر اسے پشت کا واحد زخم لگایا' اور خون کی ایک دھار بہت زیادہ فشار سے اس کی قمیص تر کر گئی۔ "اس میں اُس کی مہک تھی"۔ اس نے مجھے بتایا۔ تین بار مہلک طور پر زخمی ہو کر' سانتیاگو نصر پھر سامنے کی طرف مڑا' اور مزاحمت کیے بغیر اپنی پشت اپنی ماں کے دروازے سے ٹیکی' جیسے انہیں قتل کرنے میں برابر کی شرکت کا موقع دے رہا ہو۔ "وہ پھر نہیں چیخا"۔ پیدرو ویکاریو نے تفتیش کرنے والے کو بتایا۔ "اس کے برعکس' مجھے ایسا لگا کہ وہ قہقہہ لگا رہا ہے"۔ پھر ان دونوں نے' دہشت کے اس پار کی خیرگی میں' دروازے سے لگے ہوئے سانتیاگو نصر پر باری باری' بہ آسانی وار کرتے ہوئے' اپنی خنجر زنی جاری رکھی۔ انہوں نے پورے قصبے کی آوازیں نہیں سنیں' جو اپنے جرم سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوا جیسا گھوڑے کی پیٹھ پر پیٹھ کر اسے سرپٹ دوڑاتے ہوئے محسوس ہوتا ہے"۔ پابلو ویکاریو نے بیان کیا مگر وہ دونوں فوراً ہی حقیقت کی دنیا میں آ گئے' کیوں کہ وہ تھک چکے تھے' اس کے باوجود انہوں نے سوچا کہ سانتیاگو نصر کبھی نہیں گرے گا۔ "لعنت ہو"۔ پابلو ویکاریو نے مجھے بتایا۔ "تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی انسان کو قتل کرنا کتنا دشوار ہے"۔ اسے ایک وار میں ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے' پیدرو ویکاریو نے اس کے دل کا نشانہ لینا چاہا' مگر اس نے اسے بغل کے قریب تلاش کیا' جہاں سؤروں کا دل ہوتا ہے۔ درحقیقت سانتیاگو نصر کے نہ گرنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے وار اسے دروازے کے ساتھ کھڑا کیے ہوئے تھے۔ مایوس ہو کر پیدرو ویکاریو نے اس کے پیٹ پر ایک افقی چاک لگایا' اور اس کی تمام انتڑیاں باہر نکل آئیں۔ پیدرو ویکاریو پھر یہی عمل دہرانے جا رہا تھا' مگر خوف سے اس کی کلائی مڑ گئی اور اس کا تیز وار ران پر پڑا۔ سانتیاگو نصر دروازے کی ٹیک لگائے ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا' پھر اس نے اپنی صاف اور نیلگوں انتڑیوں کو سورج کی روشنی میں دیکھا اور اپنے گھٹنوں پر گر گیا۔

پلاسید الینیرو' شب خوابی کے کمرے میں تلاش کرنے اور آواز دینے کے بعد' دوسری چیخوں کو سن کر جو اس کی اپنی نہیں تھیں' اور یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ کہاں سے آ رہی ہیں' چوک کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر گئی اور ویکاریو برادران کو کلیسا کی طرف بھاگتے دیکھا۔ جمیل شعیوم اپنی جگوار بندوق لیے ہوئے' اور چند دوسرے غیر مسلح عرب' ان کے تعاقب میں تھے' اور پلاسید الینیرو نے سوچا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ پھر وہ شب خوابی کے کمرے کی بالکنی پر آئی اور اس نے سانتیاگو نصر کو دروازے کے سامنے' خاک پر منہ کے بل پڑے اور اپنے ہی خون میں تر' اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔

وہ گھر کے گرد دائرہ مکمل کرتے ہوئے سو گز سے زیادہ دور تک چلا' اور باورچی خانے کے دروازے سے اندر پہنچا۔ اس کو اس وقت بھی سڑک سے ہو کر لمبے راستے سے نہ جانے کا ہوش تھا' اور وہ پڑوس کے مکان کے راستے اندر گیا۔ پونچو لاناؤ' اس کی بیوی' اور ان کے پانچ بچے نہیں جانتے تھے کہ ان کے دروازے سے بیس قدم کے فاصلے پر کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ "ہم نے چیخیں سنی تھیں"۔ اس کی بیوی نے مجھے بتایا۔ "مگر ہم سمجھے یہ بشپ کے جشن کا ایک حصہ ہیں"۔ وہ ناشتا کرنے بیٹھے ہی تھے جب انہوں نے سانتیاگو نصر کو' خون میں تر اور اپنی انتڑیاں ہاتھوں میں لیے' اندر آتے دیکھا۔ پونچو لاناؤ نے مجھے بتایا "میں فضلے کی اس ہولناک بدبو کو کبھی نہیں بھولوں گا"۔ مگر آرخینیدا لاناؤ' سب سے بڑی لڑکی' نے کہا کہ سانتیاگو نصر حسب عادت اپنے قدموں کو بخوبی ناپتے ہوئے' اپنی اعلیٰ بردباری کے ساتھ چل رہا تھا' اور یہ کہ اپنے سرکش کاکلوں کے ساتھ اس کا عرب چہرہ ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ میز کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا' اور شب خوابی کے کمروں سے ہوتا ہوا گھر کے عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ "ہم خوف سے مفلوج ہو گئے تھے"۔ آرخینیدا لاناؤ نے مجھے بتایا۔ میری خالہ وینے فریدا مارکیز' دریا کی دوسری طرف اپنے صحن میں ایک چشم سیاہ مچھلی کے فلس اتار رہی تھی کہ اس نے اسے پرانی گودی کی سیڑھیوں سے اترتے' اور اُستوار قدموں کے ساتھ اپنے گھر کا راستہ تلاش کرتے دیکھا۔

"سانتیاگو نصر' میرے بچے"۔ اس نے اس سے چیخ کر کہا۔ "تمہیں کیا ہوا؟"

"انہوں نے مجھے قتل کر دیا ہے"۔ اس نے کہا۔

آخری سیڑھی پر وہ لڑکھڑا کر گرا' مگر فوراً ہی اٹھ گیا۔ "اس نے اس خاک کو بھی صاف کرنے کا خیال کیا جو اس کی انتڑیوں پر لگ گئی"۔ میری خالہ نے مجھے بتایا۔ پھر وہ اپنے گھر میں عقبی دروازے سے داخل ہوا' جو چھ بجے سے کھلا ہوا تھا' اور باورچی خانے میں منہ کے بل گر گیا۔ □

سابق یوگوسلاویہ سے ایک سدا بہار ناول
ایک قوم کا فسانہ، صدیوں کے عروج و زوال کا شاخسانہ

دریناکا پُل

ایک شاہکار تعمیر کی کہانی، اسکی !
بنیادوں میں انسانیت کا خون رچا تھا

آیوو آندریک
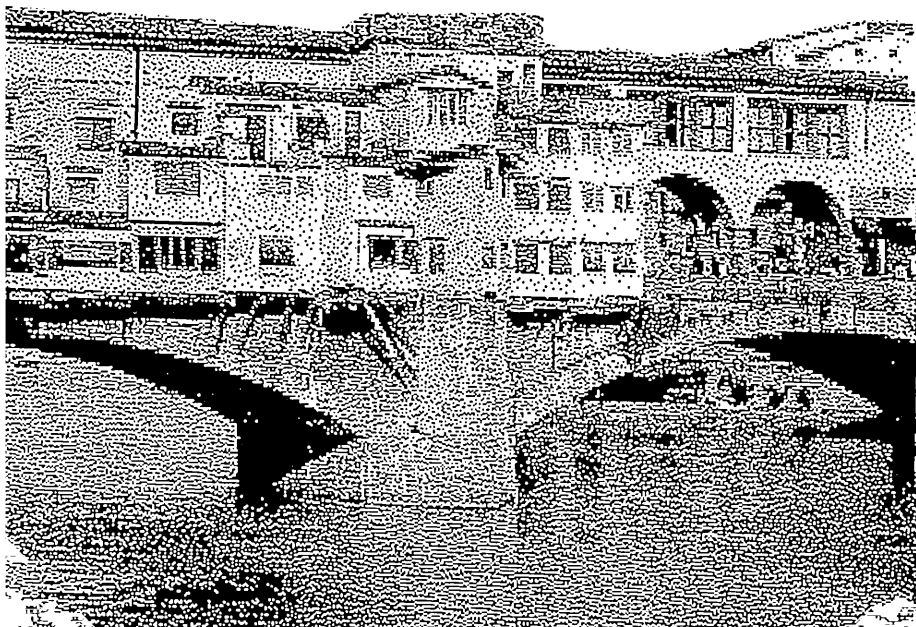
1961ء---آئیو آندریک

1961ء کا نوبل انعام، یوگوسلاویہ کے مصنف آئیو آندریک کو دیا گیا۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے والدین کون ہیں۔ اس نے اس کمی اور محرومی کے باوجود زندگی کو گزارا اور ایک ایسا مصنف بنا جسے دنیا کے سب سے بڑے ادبی انعام سے نوازا گیا۔

وہ 10 اکتوبر 1892ء کو یوگوسلاویہ کے ایک قصبے میں پیدا ہوا۔ اس نے گراز یونیورسٹی آسٹریا سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس نے شادی کی لیکن وہ کسی بچے کا باپ نہ بن سکا۔ اس کی معنوی اولاد اس کی تصانیف ہی ہیں۔

اس نے 1923ء سے 1941ء تک یوگوسلاویہ کے سفارت کار کی حیثیت سے مختلف عہدوں پر کام کیا اور 1946ء سے 1952ء تک یوگوسلاویہ کی سیاست میں بھی حصہ لیا۔

آندریک ایک عظیم ناول نگار تھا۔ اس کے ہاں زندگی کا رزمیہ بڑی شدت اور قوت کے ساتھ اظہار پاتا ہے۔ اس کی کتاب "بوسنین کرانیکل" ایک سہ جلدی (ٹریولوجی) ناول ہے۔ یہ اس کا عظیم تخلیقی کارنامہ ہے۔ اس ناول میں اس نے سربیا اور اس کے باشندوں کو سولہویں صدی کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ وہ اعلیٰ انسانی اقدار کو ذہنی عوامل اور نفسیاتی کشمکش کے حوالے سے پیش کرتے ہوئے ایسی پیچویشنز فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے کہ یہ صورت حال مقامی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی ترجمانی کرتی ہے۔

آئیو آندریک کا انتقال 13 مارچ 1975ء کو بلغراد میں ہوا۔

دریائے درینہ اپنا راستہ زیادہ تر اونچے پہاڑوں اور سیدھی ڈھلان والی تنگ اور گہری گھاٹیوں میں سے بناتا ہوا بہتا ہے۔ چند مقامات پر صرف دریا کے کناروں نے دو طرف پھیل کر ہموار' زرخیز اور کشادہ وادیاں سی بنا دی ہیں جو آبادی اور کاشت کے لیے موزوں ہیں۔ ایسا ہی ایک مقام وشی گراڈ نامی ہے جہاں یہ دریا بٹ کو دو اور اوزادنیک نامی پہاڑوں سے بنی ہوئی ایک تنگ اور گہری گھاٹی میں سے سر باہر نکالتے ہی ایک موڑ بنالیتا ہے جو بہت اچانک ہے۔ اس کے دونوں کناروں پر پہاڑوں کے سلسلے اتنے بلند اور ایک دوسرے سے قریب واقع ہوئے ہیں جن سے یوں دکھائی دیتا ہے گویا دریا کسی ٹھوس مادے کی ایک سیاہ دیوار سے نکل رہا ہو' اس کے بعد پہاڑ اچانک ایک بے قاعدہ دائرے میں پھیل جاتا ہے جو ناک کی سیدھ میں زیادہ سے زیادہ دس میل کے لگ بھگ چوڑا ہوگا۔

عین اس جگہ جہاں درینہ سیاہ رنگ کے دیو قامت پہاڑوں سے براہ راست نکلتا دکھائی دیتا اور پوری قوت سے جھاگ اڑاتا ہوا چلتا ہے' ایک بہت بڑا پُل بنا ہوا ہے۔ یہ پُل صاف تراشیدہ پتھروں سے تعمیر ہوا ہے جس کی گیارہ وسیع محرابیں ایک سے دوسرے کنارے تک چلی گئی ہیں۔

اس پُل کے چاروں طرف تمام وادی پھیلتی چلی گئی ہے جس میں مشرقی طرز کا ایک چھوٹا سا قصبہ وشی گراڈ نامی اور اس کے آس پاس کا علاقہ ہے۔ اس علاقے کی پہاڑیوں کے دامن میں گاؤں آباد ہیں' جو آڑی ترچھی دیواروں' باڑوں' چراگاہوں' سبزہ زاروں' آلوچے کے باغیچوں' جنگلات اور درختوں کے جھنڈوں سے ڈھکے پڑے ہیں۔ پُل سے اگر فاصلے پر کھڑے ہو کر پُل کی وسیع محرابوں میں سے دیکھا جائے تو نہ صرف درینہ کا خوبصورت نیلا پانی نظر آتا ہے' بلکہ سارے دیہاتی علاقے کے زرخیز اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے ساتھ اوپر جنوبی آسمان بھی دکھائی دیتا ہے۔

پتھروں کے اس پُل کے لیے جو کہ صناعی کا ایک خوبصورت اور نادر نمونہ تھا اور جس کے وجود سے بہتیرے مصروف اور باحیثیت قصبے محروم تھے' جیسا کہ ایک پرانا مقولہ ہے "ساری قلمرو میں اس جیسے دو اور ہیں"۔ درینہ کے سارے درمیانے اور اوپر والے راستے پر فقط ایک حقیقی اور مستقل چوراہا تھا۔ یہ بوسنیا اور سربیا کو ملانے والی سڑک کے علاوہ سربیا کے آگے ترک سلطنت کے دیگر حصوں کو بھی استنبول سے ملانے کے لیے ایک اہم اور ناگزیر رابطہ تھا۔

اس قصبے کا صحیح نقشہ کھینچنے اور پُل سے اس کے تعلق کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کے لیے یہ بتلانا ضروری ہے کہ اس کے اندر ایک اور پُل اور ایک دریا تھا۔ یہ دریا رژاف تھا جس پر لکڑی کا پُل بنا ہوا تھا۔ قصبے کے آخری سرے پر رژاف دریائے درینہ سے جاملتا ہے اور اس طرح مرکز اور قصبے کا بڑا حصہ ان دونوں دریاؤں کی درمیانی ریتلی زمین پر آباد تھا۔ جہاں یہ بڑا اور چھوٹا دریا ملتے تھے' وہیں سے اضافی بستیاں دونوں پہلوؤں سے شروع ہو کر درینہ کے بائیں اور رژاف کے دائیں کناروں کے ساتھ ساتھ پھیل گئی تھیں۔

درینہ کا پُل قریباً دو سو پچاس فٹ لمبا تھا اور مرکزی حصے کو چھوڑ کر قریب قریب دس قدم چوڑا تھا۔ اس کا مرکزی حصہ جو عام چوڑائی سے دوگنا تھا' دو چبوتروں پر مشتمل تھا۔ یہ چبوترے جو بالکل ایک ہی قسم کے تھے' مکمل ہم آہنگی کے ساتھ گزرگاہ کی دونوں جانب بنائے گئے تھے۔ پُل کے اس حصے کو کپیا کہا جاتا تھا۔ پُل کے مرکزی ستون کے دونوں جانب دو پشتے تعمیر کیے گئے تھے جو اوپر کی سمت مڑے ہوئے تھے اور اس طرح گویا گزرگاہ کی دائیں بائیں طرف دو چبوترے بن گئے تھے۔ یہ دونوں چبوترے کوئی پانچ پانچ قدم لمبے اور اتنے ہی چوڑے تھے۔ پُل کی کل لمبائی کی طرح ان کے گرد بھی پتھر کی منڈیر تھی ورنہ یہ بالکل کھلے تھے۔

قصبے سے جب پُل کی طرف آئیں تو دائیں طرف والے چبوترے کو صوفہ کہتے تھے۔ یہ دو سیڑھیاں اونچا تھا اور اس کے آس پاس بنچ پڑے تھے' جن کی منڈیر پشتیبانی کا کام دیتی تھی۔ سیڑھیاں' منڈیر اور بنچ سب ایک ہی قسم کے چمکدار پتھر سے بنے ہوئے تھے۔ صوفے کے بالمقابل بھی یہی نقشہ تھا' مگر یہاں بنچ مفقود تھے۔ منڈیر کے مرکز میں ایک قد آدم اونچا پتھر تھا جس کے آخری سرے سے قدرے نیچے کی طرف سفید سنگ مرمر کی ایک تختی نصب تھی جس پر ترکی زبان میں ۱۳ اشعار پر مشتمل ایک نظم کندہ ہے۔ اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے کس نے تعمیر کیا تھا اور کس سن میں تعمیر کیا تھا۔ اس پتھر کے پائے کے پاس سانپ کے منہ والا ایک فوارہ تھا جس سے پانی کی پتلی سی دھار پھوٹا کرتی تھی۔ چبوترے کے اس حصے پر ایک آدمی نے قہوہ خانہ کھول رکھا تھا جہاں تانبے کے برتن' ترکی پیالیاں اور کوئلوں کی ایک انگیٹھی ہوا کرتی تھی۔ ایک نوکر تیار شدہ قہوہ صوفہ پر لے جا کر مہمانوں کو پلایا کرتا تھا۔ پس اس کپیا کا نقشہ کچھ ایسا ہی تھا۔

دریینہ کے بائیں کنارے پر پیدا ہونے والے عیسائی بچے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں جتنا جلدی ممکن ہوتا تھا' دریینہ کے پُل کو عبور کرتے تھے' کیونکہ پیدائش کے پہلے ہفتے میں انھیں ہمیشہ پُل کے اس پار جا کر بپتسمہ لینا ہوتا تھا' لیکن باقی تمام بچے جو دائیں کنارے پر پیدا ہوتے تھے' یا مسلمان بچے جنھیں بپتسمہ بالکل لینا نہیں ہوتا تھا' اسے اسی طرح عبور کرتے تھے جس طرح ان کے باپ دادا نے اپنے بچپن کا زمانہ پُل پر یا اس کے ارد گرد گزارا ہوتا تھا' وہ اس پُل کے آس پاس یا تو مچھلی کا شکار کرتے تھے یا پھر اس کی محرابوں کے نیچے فاختائیں شکار کرتے تھے۔ اپنے ابتدائی برسوں سے ہی ان کی آنکھیں پتھروں کی اس عالی شان تعمیر کے پیارے خطوط سے واقف ہو جاتی تھیں جس میں مسام دار چمکیلے پتھروں کو بے عیب طور پر کاٹ کر استعمال کیا گیا تھا' انھیں مستریوں کے تمام ابھرواں اور مجوف سطحوں کا بھی علم تھا۔ انھیں ان قصوں اور کہانیوں کا بھی علم تھا جو اس پُل کی تعمیر اور وجود سے منسوب تھیں جن میں حقیقت خیالی باتوں اور واقعات اور خوابوں کو ایسے عمدہ طریقے پر گڈمڈ کر دیا گیا تھا کہ وہ کسی حالت میں بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے تھے۔ وہ ان چیزوں کو ہمیشہ اس طرح جانتے تھے جیسے وہ دنیا میں ان کے ساتھ آئے تھے' بلکہ ان کی دعاؤں کو بھی جانتے تھے' مگر انھیں یہ یاد نہ تھا کہ انھوں نے کس سے یا سب سے پہلے کب سنی تھیں۔

انھیں معلوم تھا کہ یہ پُل وزیر اعظم محمد پاشا نے بنوایا تھا جو نزدیک ہی کے ایک گاؤں سوکولووٹی میں پیدا ہوا تھا۔ یہ گاؤں ان پہاڑوں سے ورے آباد ہے جو اس پُل اور قصبے کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ یہ ایک وزیر ہی کے بس کی بات تھی کہ پتھروں کی اس عجوبہ روزگار تعمیر کی تمام ضروریات اور اخراجات کا متحمل ہوتا (دراصل بچوں کے ذہن میں وزیر کا تصور یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی عظیم افسانوی اور خوفناک ہستی ہوتی ہے جو وضاحت کے دائرے سے باہر ہوتی ہے)

یہ عجوبہ ریڈ مستری نے تعمیر کیا تھا جو ضرور سینکڑوں برس تک زندہ رہا ہو گا تا کہ سربیا کی سرزمین کی ساری پیاری اور دیرپا چیزیں تعمیر کر سکے۔ یہ واحد افسانوی اور حقیقت میں بے نام ماہر تعمیرات تمام لوگوں کی خواہشوں اور خوابوں کی دنیا کا ہیرو ہے' کیونکہ لوگ نہیں چاہتے کہ بہت سوں کو یاد رکھیں اور اپنی یادداشت میں بھی ان کے ممنون احسان رہیں۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ ملاحوں کی دیوی نے اس پُل کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالی تھی (جیسا کہ ہمیشہ اور ہر جگہ کوئی نہ کوئی ہوتا ہے جو تعمیری کام میں رکاوٹ ڈال دیتا ہے) اور دن کے وقت جتنا تعمیراتی کام کیا جاتا تھا' رات کے وقت تباہ کر دیا جاتا تھا' چنانچہ تخریب کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب پانی میں سے کسی چیز نے سرگوشی کے انداز میں ریڈ مستری کو مشورہ دیا کہ ستویا اور ستویانا کے جڑواں شیر خوار بہن اور بھائی کو پُل کے مرکزی ستون میں چن دیا جائے' چنانچہ ایسے بچوں کو تلاش کر کے لانے کے لیے انعام کا اعلان کر دیا گیا۔

آخر کار سنتریوں نے یہ جڑواں دودھ پیتے بچے دور دراز کے ایک گاؤں سے ڈھونڈ نکالے اور وزیر کے سپاہی انھیں زبردستی اٹھا لائے۔ جب یہ بچے لائے جا رہے تھے تو ان کی ماں ان سے جدا ہونے کو تیار نہ ہوئی۔ وہ مار کٹائی اور گالی گلوچ سے بے نیاز روتی دھوتی اور ٹھوکریں کھاتی ہوئی وشی گراڈ تک آ پہنچی اور لڑتی بھڑتی ریڈ مستری سے جا ملی۔

بچوں کو تو دیوار میں چن دیا گیا' کیونکہ اس کے بغیر اور کوئی صورت ہی نہ تھی' مگر کہا جاتا ہے کہ ریڈ نے ان پر ترس کھاتے ہوئے ستون میں سوراخ چھوڑ دیے تا کہ ان میں سے ماں اپنے بھینٹ چڑھے ہوئے بچوں کو دودھ پلا سکے۔ یہ عمدہ نقش و نگار والے بند طاقچے ہیں جو تنگ کمانچہ دار سوراخوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں آج کل جنگلی کبوتر اپنے گھونسلے بناتے ہیں۔ اس واقعے کی یاد میں سو برس تک ان دیواروں سے ماں کا دودھ ٹپکتا رہا۔ سال کے کسی عرصے میں اس بے عیب تعمیر کے پتھروں سے ایک سفید پتلی سی دھار کی صورت میں دودھ بہتا رہتا ہے جو پتھروں پر اپنے انمٹ نشان چھوڑ دیتا ہے (عورت کے دودھ کی بات گو بچوں کے ذہن میں فوری طور پر نہایت قریبی احساس پیدا کر دیتی ہے' تاہم وزیروں اور مستریوں کی طرح مبہم اور پراسرار شخصیتوں سے وہ پریشان اور متنفر ہو جاتے ہیں) لوگ دودھ کے ان دھبوں کو ستونوں سے کھرچ کر دوا کے طور پر ایسی خواتین کو بیچ دیتے ہیں جن کی چھاتیوں میں بچے کی پیدائش کے بعد دودھ خشک ہو جاتا ہے۔

پُل کے مرکزی ستون میں کیپیا کے نیچے ایک لمبی اور تنگ گزرگاہ ہے جس میں دروازے نہیں ہیں۔ اس کی شکل ایک عظیم کمانچے کی طرح ہے۔ کہتے ہیں اس ستون میں ایک بڑا تاریک کمرہ ہے' جس میں ایک عرب رہتا ہے۔ یہ بات تمام بچے جانتے ہیں۔ ان کی خیالی دنیا کے مطابق یہ عرب ایک بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اگر کسی کو دکھائی دے تو وہ آدمی

ضرور مرجاتا ہے۔ اب تک کسی ایک بچے نے بھی اسے نہیں دیکھا' کیونکہ بچے مرتے نہیں' لیکن دمہ کے مریض حمید نامی قلی نے جس کی آنکھیں کثرت شراب نوشی سے اکثر سرخ رہتی تھیں' اسے ایک رات دیکھ لیا اور وہ اسی رات وہاں دیوار کے پاس مرگیا۔ یہ سچ ہے کہ وہ اس وقت نشے میں دھت تھا اور اس نے وہ رات پُل پر کھلے آسمان کے نیچے ۱۵ درجہ سنٹی گریڈ کے موسم میں گزاری تھی۔

اس دریا کی اوپر کی سمت اس کے خاکستری چاک کے اونچے کناروں میں گول گول گڑھے سے ہیں جو تھوڑے تھوڑے نپے تلے فاصلے پر جوڑے جوڑے کی شکل میں ملتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پتھر میں کسی مافوق الفطرت قسم کے گھوڑے کے سموں کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ یہ نشان پرانے قلعے سے نیچے کی جانب شروع ہوتے ہیں اور ڈھلان پر سے اتر کر دریا کی سمت رخ اختیار کرلیتے ہیں اور اس کے بعد دوبارہ دریا کے اس پار ظاہر ہو کر سیاہ مٹی اور جھاڑیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔

جو بچے گرمی کے موسم میں سارا سارا دن ان پتھریلے کناروں پر کیکڑے پکڑا کرتے تھے' وہ یہ بات جانتے تھے کہ یہ سم نما نشان پرانے زمانے کے ایسے مجاہدوں کے گھوڑوں کے سموں کے نقوش تھے جنھیں مرے ہوئے صدیاں بیت گئی ہیں۔ اس دور میں زمین پر بڑے بڑے بہادر اور جانباز رہتے تھے جن کے گھوڑے بھی اپنے سواروں کی طرح غیر معمولی قد کاٹھ کے ہوا کرتے تھے اور اس دور میں پتھر مٹی کی طرح نرم تھا اور ابھی سخت نہیں ہوا تھا۔ صرف سربیا کے بچوں کے لیے یہ نشان کرال ژے وٹ مارکو کے سراک نامی گھوڑے کے سموں کے تھے اور یہ اس وقت سے چلے آرہے ہیں' جب خود کرال ژے مارکو ادھر قلعے میں قید تھا۔ قید سے فرار ہوتے وقت اس نے قلعے کی ڈھلان کو اڑان کے ذریعے اور درینہ کو پھلانگ کر عبور کیا تھا۔ اس وقت درینہ پر پُل موجود نہ تھا' لیکن ترک بچوں کو معلوم ہے کہ یہ کرال ژے وٹ مارکو نہیں' بلکہ یرزلز عالیجاہ تھا (کسی حرامی عیسائی کتے کے پاس بھلا اتنی طاقت اور ایسا گھوڑا کہاں ہو سکتا تھا) جسے گھاٹوں اور گھاٹوں کے ملاحوں سے نفرت تھی۔ وہ اپنے اڑن گھوڑے پر دریاؤں کو اس طرح پھلانگا کرتا تھا جیسے وہ پانی کی نالیاں ہوں۔ وہ اس موضوع کو کبھی زیر بحث بھی نہیں لاتے تھے' کیونکہ دونوں کو اپنے اپنے اعتقاد پر یقین کامل تھا۔ ایسا موقع کبھی نہیں آیا تھا کہ ایک فریق نے دوسرے کو قائل کرلیا ہو یا کسی ایک نے اپنا عقیدہ بدل دیا ہو۔

جب پہلے محمد پاشا وزیر نے درینہ پر پُل باندھنے کا منصوبہ بنایا اور اپنے آدمی یہاں بھیجے' ہر آدمی نے فرمانبرداری کا ثبوت دیا اور انھیں بیگار کے لیے طلب کیا گیا۔ صرف ریڈی ساف ہی وہ فرد واحد تھا جس نے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا اور وزیر سے کہہ دیا کہ وہ یہ کام بند کردے' ورنہ درینہ پر پُل باندھنے میں اسے بہت مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا' چنانچہ وزیر نے ریڈی ساف کو گرفت میں لینے تک کافی تکلیفیں اٹھائیں' کیونکہ وہ دیگر آدمیوں سے عظیم تھا۔ اسے نہ تو کوئی بندوق یا تلوار نقصان پہنچا سکتی تھی اور نہ ہی کوئی زنجیر یا رسی اسے باندھ سکتی تھی۔ اس کے پاس جو تعویذ تھا' اس کی طاقت اتنی زیادہ تھی کہ وہ ان سے زنجیروں کو کچے دھاگوں کی طرح توڑ دیتا تھا۔

اگر وزیر کے دانا اور آزمودہ کار آدمی ریڈی ساف کے نوکر کو رشوت دے کر راز معلوم نہ کرلیتے تو خدا جانے صورت حال کیا ہوتی اور وزیر اپنا پُل بنوانے میں کامیاب ہو سکتا یا نہ۔ یہ راز معلوم ہو جانے پر وزیر کے آدمیوں نے ریڈی ساف کو اچانک سوتے میں جالیا اور ریشمی رسیوں سے جکڑ کر ڈبو دیا۔ ریشمی رسیاں اس لیے استعمال میں لائی گئی تھیں کہ ان پر تعویذ کسی بھی صورت میں اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ سربیا کی عورتوں کا اعتقاد ہے کہ اس کی قبر پر سال میں ایک بار رات کے وقت آسمان سے براہ راست تیز روشنی پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ نظارہ موسم خزاں میں کسی وقت کنواری مریم کے بڑے اور چھوٹے تہواروں کے درمیانی عرصے میں دکھائی دیتا ہے' لیکن بچے جو یقین اور بے یقینی کی فضا میں پروان چڑھتے ہیں' اپنے گھروں کی کھڑکیوں میں خاموشی سے مسلسل شب بیداری کرنے کے باوجود اس آسمانی نور کو کبھی بھی نہ دیکھ پائے' کیونکہ آدھی رات سے پہلے ان سب پر نیند کا غلبہ ہو جاتا تھا' ہاں البتہ ایسے راہ گیر تھے جنھیں اس بات کا علم نہ ہونے کے باوجود رات کو گھر لوٹتے وقت پُل سے اوپر کی طرف اس قبر پر سفید روشنی پڑتی دکھائی دی۔

دوسری طرف اس قصبے کے ترکوں کا کہنا ہے کہ اس مقام پر شیخ تورہانیہ نامی ایک درویش دین کے لیے لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ ترکوں کا یہ بطل جلیل اس مقام پر کفار کی فوج کے مقابلے میں اس وقت ڈٹ گیا تھا جب وہ دریائے درینہ عبور کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس

پیسٹرنک نے اپنے ناول کے ہیرو ڈاکٹر ژواگو کا تقابل ترگنیف کے ہیرو ''رودین'' سے کیا ہے، لیکن یہ تقابل بذات خود صرف ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جہاں تک مزاج کا تعلق ہے ڈاکٹر ژواگو ''رودین'' سے مشابہت ضرور رکھتا ہے۔ اپنے تلون اور غیر مستقل مزاجی کی وجہ سے وہ ایسے حالات سے دوچار ہوتا ہے جو اس کے پیدا کردہ نہیں ہیں یا پھر وہ ان میں معمولی مزاحمت کرنے کے باوجود پھنس کر رہ جاتا ہے۔ مستقل مزاجی کی چند کوششیں رودین کی معمولی اور بے معنی حرکات سے ملتی جلتی ضرور ہیں لیکن ان میں اتنی جرات بھی نہیں ہے جتنی رودین کے ہاں نظر آتی ہے۔

اس کے باوجود، افتادِ طبع کا یہ ہلکا سا تعلق جو رودین سے مشابہہ ہے، اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ژواگو قبل از انقلاب روس کے بے ضرورت انسان کا دوسرا نام ہے۔ سوویٹ دور کا یہ ناکام ذی ہوش انسان مختلف اسباب کا شکار ہوا۔ اس کے لیے لفظ ''از گوئی'' کا استعمال بالکل مناسب ہے۔ اس لفظ کو ایلیا اہرن برگ نے 1920ء میں اپنے ناول دوسرا دن (SECOND DAY) میں پہلے پہل استعمال کیا۔ ''از گوئی'' پرانا روسی لفظ ہے جس کے معنی ''سماج کا ٹھکرایا ہوا'' (SOCIAL OUT CAST) ہیں۔ یہ ایسے شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو سوسائٹی میں اپنا مقام کھو چکا ہو۔ اس لیے کہ یا تو وہ اس کے لوازم کھو چکا ہو یا وہ اس سے چھین لیے گئے ہوں جس کی بناء پر اسے سوسائٹی میں وہ خاص مقام حاصل تھا۔ اس کی مثال ویسی ہی ہے جیسے بغیر تخت کا بادشاہ، یا دیوالیہ سوداگر یا ایک جاہل پادری کا لڑکا۔ (میکس ہیورڈ/سید علی احسن)

سوویٹ ادب میں پہلی مرتبہ پیسٹرنک نے رومانوی انقلاب کو بے نقاب کیا ہے۔ قحط، وبائیں، قتل و خون، روسی اور غیر روسی مظالم، آدرش لے کر بڑھنے والوں کی قوت کی حرص، غلاموں کے زندان، یہ ساری چیزیں نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کی گئی ہیں، مگر ہیرو کے دکھوں اور قوم کے المیے کے باوجود ڈاکٹر ژواگو مثبت اور امید افزا ناول ہے کیونکہ یہ زندگی کی حیرانیوں اور طلسموں کو پیش کرتا ہے۔ یہ آدمی کی تلاشِ آزادی کو غیر فانی دکھاتا ہے اور محبت کی پاکی اور اچھائی پر یقین دلاتا ہے۔ یہ اتفاق نہیں ہے کہ ژواگو کے نام کا مشتق روسی لفظ زوائے (زندہ) ہے۔ پیسٹرنک کا فلسفہ سوویٹ نظام کی بنیاد پر ضرب ہے۔ وہ آدمی کو ریاست سے بلند مرتبہ دیتا ہے۔ زندگی کو شریعت سے برتر گردانتا ہے اور ضمیر کو استدلال سے اعلیٰ سمجھتا ہے۔ جھوٹ اور ظلم کی حکومت میں وہ سچائی کی بے تیغ قوت کا اعلان کرتا ہے۔ وہ مادیت کے خلاف عیسائیت کا محاذ بناتا ہے۔ مشہور نقاد ایڈمنڈ ولسن کے قول کے مطابق: ''ڈاکٹر ژواگو انسانی ادب اور اخلاقی تاریخ میں ایک عظیم واقعہ ہے۔ کوئی شخص جس میں جینئس کا حوصلہ نہ ہو جابر حکومت کے زیر اثر ایسی کتاب نہیں لکھ سکتا۔ یہ کتاب اس بات پر مبینہ دلیل ہے کہ وہ فن کی حرمت اور انسانی روح پر یقین رکھتا ہے۔'' (یوجین لائنس/سید علی احسن)

پیسٹرنک کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ایک احساس مجھے یہ بھی ہوا تھا کہ وہ چیزوں کے بجائے ان کے رشتوں اور تاثرات کا بیان کرتا ہے اور اسی وجہ سے اس کی شعری تصاویر اسے اس کے معنی کو وسیع تر کر دیتی ہیں اور پیسٹرنک کی ذات اور اس کا اندازِ نظر ہر ہر مصرعے میں نظر آتا ہے۔ ''نیچر'' کے بیان میں وہ منظر کشی نہیں کرتا بلکہ وہ اس میں بھی اپنی ذات اور اپنے احساس کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اور اس طرح منظر، منظر نہیں رہتا بلکہ اس کے احساس یا تجربہ کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ یہی اندازِ نظر اس کی عشقیہ شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں میر اور مومن ایسے شاعر ہیں جو عشق میں معاملے کے ساتھ پوری کائنات کو سمیٹ لیتے ہیں۔ دشنام یار طبع حزیں پہ اس لیے گراں نہیں گزرتی کہ شاعر کی توجہ دشنام سے ہٹ کر نزاکتِ آواز پر چلی جاتی ہے یا پھر اس میں اسے شعلہ سا لپکتا محسوس ہونے لگتا ہے۔ پیسٹرنک جب محبوب کا بوسہ لیتا ہے (اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے) تو اسے اس بوسے میں بنفشہ کے ذائقہ کا احساس ہوتا ہے۔
(جمیل جالبی)

مقام پر نہ تو کوئی یادگار بنی ہوئی ہے اور نہ ہی مقبرہ کیونکہ درویش مرحوم کی اپنی وصیت تھی کہ انھیں گمنام طور پر دفن کیا جائے تاکہ کسی کو پتا نہ چلے کہ وہ کون تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر دوبارہ کافروں کی کوئی فوج اس راستے سے حملہ آور ہوئی تو یہ درویش پہلے کی طرح دوبارہ اٹھ کھڑا ہوگا اور اسے وشی گراڈ کے پُل سے آگے بڑھنے نہیں دے گا اور یہی وجہ ہے کہ آسمان اس کی قبر پر گاہے بگاہے روشنی پھینکتا رہتا ہے۔

مختصر یہ کہ قصبے کے بچوں کی زندگی یوں اس پُل کے نیچے یا اس کے اردگرد معصومانہ کھیلوں اور بچگانہ تخیل میں بسر ہوتی تھی۔ جب یہ بچے بلوغت کو پہنچتے اور زندگی کی پریشانیاں جدوجہد اور ذمہ داریاں شروع ہو جاتیں تو دوسرا دور اسی پُل کے کپیا والے حصے میں شروع ہو جاتا جہاں نوجوان تخیل کو اور زیادہ خوراک اور نئے میدان میسر آجاتے۔

محبت کی پہلی تحریک، نظروں کا پہلی بار آپس میں ٹکراؤ، عشوہ طرازی اور سرگوشیاں کپیا کے اوپر یا اس کے گردوپیش سے ہی شروع ہوتی تھیں اور یہی حال ابتدائی خرید و فروخت اور نفع بازی، لڑائی جھگڑوں اور صلح و صفائی، جلسوں اور انتظار کا تھا۔ پُل کی پتھروں کی منڈیر پر جہاں گیلاس اور تربوز کی پہلی فصل فروخت کرنے کے لیے رکھی جاتی تھی، وہاں علی الصبح ثعلب مصری اور گرم سموسے بھی بکنے کے لیے پہنچ جاتے تھے۔ گداگر، اپاہج، کوڑھی اور وہ نوجوان اور صحت مند آدمی جو کچھ دیکھنا چاہتے تھے یا خود نمائی کرنا چاہتے تھے، یہاں اکٹھے ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ ایسے تمام لوگ جن کے پاس نمائش کے لیے کوئی غیر معمولی جنس، کپڑے یا ہتھیار ہوتے تھے، وہ بھی یہیں آتے تھے۔ ایک طرف قصبے کے بزرگ اگر یہاں بیٹھ کر سماجی معاملوں اور عام شکایات پر تذکرے کرتے، تو دوسری طرف نوجوان یہاں گانے اور ہنسنے ہنسانے کی محفلیں سجاتے تھے۔ بڑی بڑی تقریبات اور اہم تبدیلیوں کے موقع پر اس جگہ سرکاری اعلانات اور نوٹس چسپاں کئے جاتے تھے۔ یہ اعلانات وغیرہ فوارے سے اوپر اور سنگ مرمر کی ترکی زبان والی تحریر کی تختی کے نیچے اٹھی ہوئی دیوار پر چسپاں کیے جاتے تھے، مگر یہاں ۱۸۷۸ء تک ایسے لوگوں کے سر بھی نمائش کے لیے لٹکے رہتے تھے جنھیں کسی نہ کسی پاداش میں موت کی سزا ملتی تھی۔ اس سرحدی قصبے میں موت کی سزا بالخصوص بے چینی کے برسوں میں بہت عام تھی اور بعض برسوں میں جیسا کہ ہم دیکھیں گے، قریب قریب روز کا معمول تھی۔

تمام باراتیں اور جنازے پُل عبور کرتے وقت کپیا پر ضرور رکتے تھے۔ باراتی یہاں عام طور پر اپنے آپ کو بناتے سنوارتے اور مارکیٹ میں داخل ہونے سے پیشتر اپنی اپنی درجہ بندیاں کر لیتے تھے۔ اگر امن کا زمانہ ہوتا اور پریشانی کا عالم نہ ہوتا تو یہاں آلوچے کی شراب کے دور چلتے، کولو نامی رقص اور موسیقی کے مظاہرے ہوتے اور باراتیں یہاں اپنے وقت سے بہت زیادہ دیر تک ٹھہرتیں۔ جنازے کے سلسلے میں تابوت اٹھانے والے تابوت کو کپیا پر اتار کر قدرے ستاتے، کیونکہ اس مقام پر مرنے والے کی زندگی کا اچھا خاصا حصہ گزارا ہوتا تھا۔

جس طرح پُل قصبے کا بہت اہم حصہ تھا، اسی طرح کپیا بھی پُل کا بہت اہم حصہ تھا۔ ایک ترک سیاح جس کی وشی گراڈ والوں نے بہت خاطر و مدارات کی تھی، اپنے سیاحت نامے میں لکھتا ہے: "ان کا کپیا پُل کا دل ہے اور پُل قصبے کا دل ہے جو ہر آدمی کے دل میں رہتا ہے"۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرانے مستریوں کو جنھوں نے پرانے قصوں کے مطابق پانی کی دیویوں اور دیگر کئی قسم کی عجیب و غریب مخلوق کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے مجبوراً بچوں کو دیوار میں چنا، انھیں نہ صرف اپنی تخلیق کی پائیداری اور خوبصورتی کا احساس تھا، بلکہ ان کے پیش نظر یہ بات بھی رہتی تھی کہ ان کی تخلیق سے آنے والی نسلوں کی نسلیں بھی فائدہ حاصل کرتی رہیں۔ جب بھی کوئی آدمی اس قصبے کی روزمرہ کی زندگی سے واقف ہو جاتا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہمارے بوسنیا میں بہت کم لوگ اس طرح خوش خوش رہتے اور زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں جس طرح اس قصبے کا ہر باشندہ کپیا پر خوش رہتا اور لطف اٹھاتا ہے۔

البتہ قدرتی طور پر موسم سرما کو اس سلسلے کے عوامل میں شمار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ سردیوں میں اگر کسی نے یہ پُل مجبوراً عبور کرنا ہوتا تھا تو وہ بے چارہ دریا پر چلنے والی سرد ہوا سے بچنے کے لیے سر نیہوڑھا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا گزر جایا کرتا تھا۔ ایسے موسم میں کپیا کے چبوتروں پر چہل قدمی نہیں ہوتی تھی، لیکن سال کے باقی ہر موسم میں کپیا ہر چھوٹے بڑے کے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ ان موسموں میں قصبے کا ہر باشندہ رات ہو یا دن کسی بھی وقت کپیا پر جا سکتا تھا جہاں وہ جا کر صوفے پر بیٹھ جایا کرتا یا اس کے اردگرد گپ شپ لگاتا رہتا یا کاروباری بات چیت میں مشغول رہتا۔ پتھر کا

یہ صوفہ تند نیلے پانی سے کوئی پندرہ میٹر اوپر ہوا میں معلق تھا۔ اس کے تین طرف گہرے نیلے رنگ کی پہاڑیاں تھیں۔ اوپر بادلوں اور ستاروں سے بھرا ہوا آسمان اور نیچے اور سامنے تنگ قوس بناتا ہوا دریا جس کے پیچھے گہرے نیلے رنگ کے پہاڑ تھے۔

کسی غیر ملکی نے بہت مدت پہلے مزاحیہ طور پر یہ بات کہی تھی کہ کپیانہ صرف اس قصبے کی تقدیر پر بلکہ اس کے باشندوں کے کردار پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔ اس غیر ملکی نے آگے چل کر کہا کہ ان نہ ختم ہونے والی ٹولیوں میں یہ بات ضرور دریافت کرنا چاہیے کہ ہمارے قصبے کے اکثر باشندوں کا رجحان غور و فکر اور خواب کی دنیا کی طرف کیوں ہے اور کیوں اس قصبے کے باشندے ملول کی متانت کے لیے مشہور ہیں۔ بہرحال اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وشی گراڈ کے باشندے دیگر قصبوں کے باشندوں کے مقابلے میں قدیم زمانے سے تن آسان' عیش پرست اور خراج سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا قصبہ ایک ایسے مقام پر ہے اور اس کے ارد گرد کے دیہات امیر اور زرخیز ہیں جہاں سے روپیہ وشی گراڈ پہنچتا رہتا ہے' اگرچہ یہ اس قصبے میں ٹھہرتا زیادہ دیر نہیں۔ اگر اس قصبے میں کوئی کفایت شعار اور پیسہ بچانے والا باشندہ ہے جس میں کوئی بری عادت نہ ہو تو وہ یقیناً کوئی نیا آدمی ہو گا' مگر وشی گراڈ کی آب و ہوا ایسی ہے کہ اس کے بچے کھلے ہاتھ اور پھیلی ہوئی انگلیاں لے کر بڑے ہوں گے اور اس قصبے کی عام بیماری یعنی فضول خرچی اور بے غمی کا ضرور شکار ہو جائیں گے' کیونکہ اس کا اصول ہے' نیا دن اور نئی کمائی' قصہ کرتے ہیں کہ جب شاریناتوواک (StarinaNovak) اپنی طاقت کھو بیٹھا اور مجبور ہو کر رومانوی پہاڑوں میں راہزنی کرنی چھوڑ دی' تو اس نے اپنے نوجوان جانشین گرویٹ (Grujic) کو یہ سبق دیا تھا:

جب تم گھات میں بیٹھو' تو آنے والے راہ گیر کو اچھی طرح دیکھو۔ اگر وہ اکڑ کر سواری کر رہا ہو' سرخ زرہ بکتر پہن رکھی ہو جس میں چاندی کی گول میخیں اور سفید گیٹس پہنے ہوں تو وہ یقیناً فوچا (Foca) کا رہنے والا ہے۔ اس پر فوراً حملہ کر دو' کیونکہ اس کی جیبوں میں اور اس کی زین میں دولت ہو گی۔ اگر کوئی ایسا راہ گیر ملے جس کے کپڑے معمولی ہوں' سر جھکا ہوا ہو اور گھوڑے پر یوں سکڑ کر بیٹھا ہو جیسے وہ مانگ رہا ہو تو بلا سوچے سمجھے اس پر بھی حملہ کر دو' کیونکہ یہ روگاٹیکا (Rogatica) کا رہنے والا ہے جو سب کے سب ایک جیسے کنجوس اور بند مٹھیوں والے ہوتے ہیں' مگر اناری کی طرح دولت سے پر ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی پاگل سا آدمی نظر آئے جو زین کے ڈھانچے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا ڈھول بجاتا ہو اور پوری قوت سے گا رہا ہو تو اس پر حملہ کر کے بے کار اپنے ہاتھ خراب نہ کرنا۔ اس بد معاش کا راستہ نہ روکنا' کیونکہ یہ وشی گراڈ کا رہنے والا ہے جو خالی ہے' کیونکہ دولت ایسے آدمیوں کے پاس نہیں رہ سکتی۔

آئیں اب ہم اس دور میں چلیں جب اس مقام پر معمولی پل کا بھی تصور نہ تھا' چہ جائیکہ ایسا پل جیسا یہ ہے۔ شاید ان قدیم ایام میں بھی کسی تھکے ماندے اور بھیگے ہوئے راہ گیر نے خواہش کی ہو کہ اس طوفانی دریا پر معجزانہ طریقے سے کوئی پل بن جائے کہ وہ اپنی منزل مقصود پر آسانی سے اور جلدی پہنچ جائے۔

اس میں شک نہیں کہ جب سے انسان نے پہلے پہل اس جگہ سفر کیا اور راستے کی مشکلات کا مقابلہ کیا تو اسے اکثر یہ خیال آیا کہ کسی طرح یہاں ایک چوراہا بنایا جائے۔ بالکل اس طرح جس طرح تمام مسافر ہر دور میں ایک اچھی سڑک' قابل اعتماد مسافر ساتھیوں اور گرم سرائے کا خواب دیکھتے تھے' مگر تقدیر کی بات ہے کہ نہ تو ہر انسانی خواہش پوری ہوتی ہے اور نہ ہی ہر آدمی میں اتنی قوت ارادی اور طاقت ہوتی ہے کہ وہ اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدل دے۔

چونکہ پل کے مقدر میں تعمیر ہونا تھا' اس لیے سب سے پہلے اس کا خیال جو ابتدا میں قدرتی طور پر گڈمڈ اور دھندلا تھا' سوکولو ویٹی (Sokolovici) نامی گاؤں کے ایک دس سالہ بچے کے ذہن میں ۱۵۱۶ء کی ایک صبح کو اس وقت کوندا' جب اسے اپنے گاؤں سے سڑک کے ساتھ ساتھ استنبول کے دور' پر کشش اور خوفناک شہر لے جایا جا رہا تھا۔ اس وقت یہی نیلا اور ہیبت ناک پہاڑی دریا درینہ جو اکثر غصے میں آجاتا تھا' بنجر' بے آب و گیاہ' پتھریلے اور ریتلے کناروں کے درمیان دندناتا ہوا بہتا تھا۔

یہ قصبہ اس وقت بھی موجود تھا' لیکن اس کی شکل اور سائز مختلف تھا۔ دریا کے دائیں کنارے ایک سیدھی ڈھلان والی پہاڑی کے سرے پر جہاں آج کل کھنڈرات ہیں' محفوظ حالت میں ایک قدیم قلعہ کھڑا تھا جس کی وسیع قلعہ بندیاں تھیں۔ یہ بوسنین سلطنت کے عروج کے وقت کی عمارت تھی جو دریچوں اور پشتوں سے مزین تھی۔ اسے پے ولوویٹ (Pavlovic) کے ایک طاقت ور رئیس نے بنوایا تھا۔ اس

قلعے سے نیچے ڈھلانوں پر اس کی زیر حفاظت مے یدان (Mejdan) اور بیکوواک (Bikavac) کی عیسائی بستیاں اور حال ہی میں تبدیل کیا گیا ترکی گاؤں ڈوشے (Dusce) تھا۔ اس سے نیچے درینہ اور رژاف دریاؤں کے درمیان میدانی علاقے میں جہاں اصلی قصبہ بعد میں پھیلا ہوا تھا، قصبے کی چراگاہیں تھیں، جن کے بیچوں بیچ ایک سڑک تھی جس کے کنارے پرانی وضع کی سرائے اور چند جھگیوں کے علاوہ پن چکیاں تھیں۔

اس سڑک کو جہاں درینہ کاٹتا تھا، وہاں وشی گراڈ کا مشہور گھاٹ تھا۔ اس گھاٹ پر قدیم وضع کی سیاہ کشتی چلا کرتی تھی جسے کھینے والا جماک نامی ایک اکھڑ اور بدمزاج ملاح تھا۔ جماک کو جاگتے میں بلانا کسی دوسرے کو گہری نیند سے جگانے کے مقابلے میں بہت مشکل کام تھا۔ وہ دیو قامت ملاح غیر معمولی طاقت کا مالک تھا، لیکن اسے ان متعدد جنگوں میں نقصان پہنچا تھا جنہیں جیتنے کے لیے وہ مشہور تھا۔ اس کی صرف ایک آنکھ، ایک کان اور ایک ٹانگ تھی (دوسری ٹانگ لکڑی کی تھی) بغیر مسکرائے اور بغیر دعا سلام کے بجھے بجھے انداز میں وہ سامان اور سواریاں طویل وقت صرف کر کے ایمانداری اور حفاظت سے دریا کے پار پہنچایا کرتا تھا تاکہ اس کی ایمانداری اور اعتماد کی داستانیں اسی طرح اکثر سنائی جائیں جس طرح اس کی سست رفتاری اور ضدی پن کی داستانیں سننے میں آتی تھیں۔ جن مسافروں کو وہ کشتی سوار کرتا نہ تو ان سے بات چیت کرتا اور نہ انھیں چھوتا۔ لوگ کشتی کا کرایہ تانبے کے سکے سیاہ کشتی کے پیندے میں پھینک دیا کرتے تھے جہاں وہ سارا دن ریت اور پانی میں پڑے رہتے اور صرف شام کے وقت ملاح بے پروائی سے انھیں لکڑی کے کفچے میں اکٹھے کرتا اور دریا کے کنارے اپنے جھونپڑے میں لے جاتا۔

گھاٹ کی کشتی کے چلنے کا دارومدار دریا کی عام حالت یا اس سے قدرے زیادہ پر منحصر تھا۔ جونہی دریا کا پانی میلا ہوتا یا ایک خاص حد تک اونچا ہوتا، جماک اپنی بھاری بھرکم کشتی کو لے جا کر کھاڑی میں مضبوطی سے باندھ دیتا اور درینہ کسی بڑے سمندر کی طرح ناقابل عبور ہو جاتا۔ ایسی حالت میں جماک اپنے دوسرے کان سے بھی بہرہ ہو جاتا یا قلعے کی طرف چل دیا کرتا اور کھیت میں کام کرتا رہتا۔ اس دوران تمام دن بوسنیا سے بھیگے ہوئے اور سردی سے اکڑے ہوئے بے چارے مسافر آتے رہتے اور پریشانی کے عالم میں کشتی بان کی راہ تکنے کی بیکار تکلیف کرتے رہتے۔ وقتاً فوقتاً یہ بے چارے کسمپرسی کے عالم میں زور زور سے پکارتے:

او۔ او۔ و۔ و۔ و۔ جما آ۔ آ۔ آ۔ ک ٹکراں کی پکار، صدا بصحرا ثابت ہوتی تاوقتیکہ پانی اتر جاتا اور اس لمحے کے متعلق فیصلہ کرنا جماک کے اختیار میں تھا جو اکثر تاریک اور بے رحم ہوتا اور اس میں کوئی بات چیت نہ ہوتی۔

یہ قصبہ جو اس وقت ایک چھوٹے سے گاؤں سے کچھ ہی بڑا ہوگا، درینہ کے دائیں کنارے پر اپنے دور کے اس قلعے کے کھنڈرات کے نیچے پہاڑی ڈھلان پر تھا، کیونکہ اس وقت اس کی وہ شکل و صورت تھی نہ ہی اس کا وہ سائز تھا جو درینہ پر پُل کے بننے اور مواصلاتی اور تجارتی ترقی کے بعد اس نے اختیار کیا۔

اس نومبر کے دن مال بردار گھوڑوں کا ایک لمبا قافلہ دریا کے بائیں کنارے پر رات بسر کرنے کے لیے اترا۔ ترک سپاہیوں کے دستے کا آغا (کمانڈر) مشرقی بوسنیا کے دیہات سے عیسائی بچوں کی مقرر کردہ تعداد کا خونی خراج اکٹھا کر کے بدرقے سمیت واپس استنبول جا رہا تھا۔

چونکہ بچوں کا یہ خونی خراج کوئی چھ سال بعد وصول کیا گیا تھا، اس لیے یہ خراج اس مرتبہ آسان اور بہترین رہا، اگرچہ بہت سے والدین نے اپنے بچوں کو جنگلوں میں چھپا دیا تھا اور انھیں چیتھڑوں اور غلیظ حالت میں چھوڑ کر ہدایت کر دی کہ وہ پاگلوں کا سا حلیہ بنائے رکھیں تاکہ آغا انھیں انتخاب کرنے میں ناکام رہے، پھر بھی دس پندرہ برس کے درمیان عمر کے خوبصورت، ذہین اور صحت مند بچوں کی مقررہ تعداد حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ بعض ماں باپ نے تو یہاں تک کر دیا تھا کہ کلہاڑی سے بچوں کی انگلیاں کاٹ کر انھیں ناکارہ بنا دیا تھا۔

منتخب بچوں کو بوسنیا کے ٹٹوؤں پر لاد کر ایک طویل قافلہ تیار کر لیا تھا۔ ہر ٹٹو پر پھل لادنے کے ٹوکروں کی طرح وہ جڑے ہوئے ٹوکرے تھے۔ ایک ٹٹو کی ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف اور ہر ٹوکرے میں ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا جن کے پاس ان کے والدین کے گھر سے آخری تحفے میں ملا ہوا ایک ایک گول کیک اور ایک ایک پارسل تھا۔ ان متوازن ٹوکروں میں جو سارے کے سارے ایک تال پر چرمراتے جاتے تھے، اغوا شدہ بچوں کے خوف سے کملائے ہوئے پھول جیسے چہرے جھانک رہے تھے۔ ان میں سے بعض چپ چاپ ٹٹو کی دُمچی کو دیکھتے اور حد نگاہ تک اپنے وطن کی سرزمین پر

بھی نظر ڈالتے جا رہے تھے اور کچھ کھا بھی رہے تھے اور کچھ رو رہے تھا اور کچھ زین پر سر رکھ کر سو گئے تھے۔

اس عجیب و غریب قافلے کے آخری جانوروں کے عقب میں ان بچوں کے تھکے ماندے اور پریشان حال والدین اور رشتہ داروں کی بڑی تعداد پاؤں گھسیٹتی آ رہی تھی کیونکہ ان کے جگر گوشوں کو ان سے چھین کر ایک غیر دنیا میں لے جایا جا رہا تھا' جہاں انھیں ختنہ کر کے ترک بنا لیا جائے گا اور پھر یکسر اپنا مذہب' وطن اور نسل بھلا کر ساری زندگی سپاہیوں کی یا سلطنت کے کسی اونچے عہدیدار کی حیثیت سے گزار دیں گے۔ ان کے لواحقین میں زیادہ تر عورتیں' مائیں' دادیاں اور ان چرائے ہوئے بچوں کی بہنیں تھیں۔

جب یہ لواحقین بہت قریب پہنچ جاتے' تو آغا کے گھڑ سوار انھیں چابکوں سے بھگا دیتے اور گھوڑے ان پر چڑھا دیتے اور وہ مختلف سمتوں میں بھاگ کھڑے ہوتے اور سڑک کے کنارے جنگلوں میں چھپ جاتے۔ کچھ دیر بعد یہ قافلے کے پیچھے دوبارہ روتے ہوئے جمع ہو جاتے تاکہ ٹوکروں سے باہر نکلے ہوئے بچوں کے سر دیکھ سکیں۔ مائیں خاص طور پر زیادہ اصرار کرتی تھیں اور انھیں روکنا مشکل کام تھا۔

بعض نڈھال مائیں اپنے آپ سے بے خبر کھلے بال اور ننگی چھاتیاں لیے روتی اور بین کرتی ہوئی آگے بڑھتی جاتیں اور بعض بالکل پاگلوں کی طرح کراہتیں' جیسے دردِ زہ سے ان کی بچہ دانیاں پھٹی جا رہی ہوں۔ رو رو کر ہلکان ہوتی ہوئی یہ مائیں گھڑسواروں کے چابکوں کے آگے سینے تان لیتیں اور بغیر کوئی جواب ملے پوچھتی جاتیں: "اسے کہاں لے جا رہے ہو؟ مجھ سے میرے بچے کو کس لیے چھین رہے ہو؟" ان میں سے بعض اپنے بچوں سے صاف طور پر مختصر الفاظ میں آخری بات کر لیتیں جو راستے کے لیے سفارش یا کوئی نصیحت ہوتی تھی:

"ریڈ! میرے بچے اپنی ماں کو نہ بھلانا"۔

ایک اور عورت سخت مایوسی کے عالم میں اس جانے پہچانے پیارے سر کی تلاش میں نگاہیں ادھر ادھر دوڑاتی ہوئی چیخ چیخ کر گلا تار لیا' "الیا" کا نام پکارتی جا رہی تھی جس سے شاید وہ بچے کی یادداشت میں یہ نام بٹھانا چاہتی ہو جس سے کہ وہ ایک دو دنوں کے اندر ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا جائے گا۔

لیکن چونکہ راستہ طویل تھا' زمین سخت' جسم ناتواں اور ترک حاکم طاقت ور اور بے رحم تھے' لہٰذا تھکن سفر اور ضربات سے نڈھال ہو کر عورتیں تھوڑی تھوڑی کر کے گھٹتی چلی گئیں۔ یہاں دشی گراڈ گھاٹ پر زیادہ سے زیادہ بردبار عورتوں کو بھی رکنا پڑتا تھا' کیونکہ گھاٹ پر ان کو اجازت نہ تھی اور دریا دہ پار نہ کر سکتی تھیں۔ اب وہ دریا کے کنارے آرام سے بیٹھ کر روتیں' کیونکہ اب انھیں کوئی مزید اذیت نہ دیتا تھا۔ یہاں وہ بھوک' پیاس اور سردی سے بے حس پتھر بنی انتظار کرتی رہتیں' حتیٰ کہ دریا کے دوسرے کنارے گھوڑوں اور سواروں کا یہ لمبا قافلہ دوبارہ آگے ڈبرینا (Dubrina) کی طرف مڑتا نظر آ جاتا اور یہ ایک مرتبہ پھر اپنے بچوں کا آخری دیدار کرنے کی سعی کرتیں جو ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو رہے تھے۔

نومبر کے اس روز سوکولو ویٹی کے پہاڑی گاؤں کا سانولے رنگ کا ایک دس سالہ بچہ ان لاتعداد ٹوکروں میں سے ایک میں خاموشی سے بیٹھا اپنے گرد و پیش کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سردی سے سرخ ہوتے ہوئے ایک ہاتھ میں چھوٹا خم دار چاقو پکڑا ہوا تھا جس سے وہ بے خیالی میں اپنے ٹوکرے کے کناروں کو آہستہ آہستہ چھیل رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنا گرد و پیش بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ اسے وہ پتھریلا کنارہ یاد تھا جس پر چھدرے' پھیکے خاکستری رنگ کے بے برگ بید مجنوں کھڑے تھے' ساتھ ہی اسے وہ اکھڑ کشتی ران اور خشک پن چکی بھی یاد تھی جو ہوا کی درزوں اور مکڑی کے جالوں سے بھری ہوئی تھی' کیونکہ یہاں پر ان سب کو دریائے درینہ کے بپھرے ہوئے پانی سے جس کے اوپر پہاڑی کوے بولتے تھے' پار کرانے سے پہلے رات بسر کرنا پڑی تھی۔ وقتاً فوقتاً اسے اپنے اندر کسی جگہ اچانک درد کی تیز ٹیس اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی اور اسے یوں لگتا گویا اس کا سینہ فگار ہو کر خطرناک طور پر زخمی ہو گیا ہے۔ اس پہاڑی اور افلاس زدہ ضلع کا یہی وہ خاص مقام تھا' جہاں بدبختی کھلے طور پر عیاں تھی۔ یعنی آدمی کو وہ طاقتیں روک لیتی تھیں' جو اس سے زیادہ مضبوط تھیں اور اس بے بسی پر وہ شرمندہ ہو کر مجبور تھا کہ اپنی اور اوروں کی نکبت اور پسماندگی کو صاف طور پر تسلیم کرے۔

یہ سب کچھ لڑکے کی اس جسمانی بے کلی اور تکلیف میں سمو گیا تھا جو اس نے اس نومبر کے روز محسوس کی تھی اور جو باوجود اس کی طرزِ زندگی' مذہب' نام اور وطن کی تبدیلی کے اس کے ذہن سے مکمل طور پر کبھی بھی نہ نکلتی تھی۔

ٹوکرے میں اس لڑکے نے جو کچھ آگے چل کر بننا تھا' وہ تمام زبانوں کی تمام تاریخوں میں لکھا جا چکا ہے اور باہر کی دنیا اسے ہم سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہے۔ وقت کے ساتھ

ساتھ وہ سلطان کے دربار کا ایک بہار دنوجوان افسر بن گیا اور پھر شاہی بیڑے کا بڑا امیرالبحر اور سلطان کا داماد ہو گیا۔ یہ عالمی شہرت کا جرنیل سیاست دان محمد پاشا سوکولی تھا جس نے تینوں براعظموں پر زیادہ فتح مندی سے جنگیں لڑیں اور سلطنت عثمانیہ کی سرحدوں کو وسیع کر کے بیرونی طور پر اسے محفوظ بنا دیا اور اندرونی طور پر بھی اسے اپنے حسن انتظام سے مستحکم بنا دیا۔ اس ساٹھ سال سے قدرے اوپر کے زمانہ میں اس نے تین سلطانوں کی ملازمت کی۔ اچھائی اور برائی دونوں کا تجربہ نادر الوجود اور منتخب اشخاص کی طرح کیا اور اپنے آپ کو طاقت اور اختیارات کی ان بلندیوں تک پہنچایا جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور جن تک چند آدمی پہنچ جاتے ہیں اور معدودے چند انھیں برقرار رکھ سکتے ہیں۔

جیسا کہ ظاہر ہے کہ نیا آدمی ایسی اجنبی دنیا میں پہنچ کر جہاں ہم تصور میں بھی نہیں پہنچ سکتے' اپنے وطن کی' وہ تمام چیزیں جو پیچھے چھوڑ آیا تھا' ضرور بھول گیا ہو گا' وہ یقیناً وشی گراڈ' دریائے درینہ کو عبور کرنا' بنجر کنارے جن پر مسافر سردی اور ناامیدی سے ٹھٹھرتے تھے' ست رفتار گلی سڑی کشتی جس کا عجیب قسم کا کشتی ران تھا اور موجیں مارتے پانی کے اوپر بھوکے پہاڑی کوؤں کو بھی بھول گیا ہو گا' لیکن تکلیف کا وہ احساس جو اسے تھا' وہ اس کے ذہن سے مکمل طور پر کبھی نہ مٹ سکا۔

دوسری طرف وہ درد اور ٹیس جو بچپن میں اس کے سینے سے اٹھا کرتی تھی اور جو بعد کی زندگی میں تمام دردوں اور تکلیفوں سے ممتاز رہی' وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ اکثر و بیشتر سر ابھارتی رہی۔ وزیر اپنی آنکھیں موند کر انتظار کرتا رہتا کہ کب یہ سیاہ چھری کی نوک جیسی ٹیس تھمے' اور اس کے درد میں کمی واقع ہو۔ ایسے ہی کسی لمحے اسے خیال آیا کہ وہ درد کی اس بے چینی سے نجات حاصل کر سکتا ہے: اگر وہ اس دور دراز درینہ پر سے کشتی کے اس منحوس مواصلاتی سلسلے کو ختم کر دے' جس کے گرد بدبختیوں اور تکلیفوں کا ایک حلقہ ہے جو مسلسل بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اس کے گہرے کناروں کے درمیان بداندیش پانی پر پُل باندھ کر سڑک کے ان دونوں کناروں کو دوبارہ جوڑ دے جنھیں درینہ نے توڑ دیا تھا اور اس طرح بوسنیا اور مشرقی حصے کو محفوظ طریقے پر ہمیشہ کے لیے ملا دے جو اس کی جائے پیدائش اور زندگی کی جگہیں تھیں' چنانچہ یہ وہ تھا جس نے سب سے پہلے اپنی بند آنکھوں کے پیچھے ایک ہی لمحے میں پتھروں کے اس عظیم اور خوبصورت پُل کا دھندلا سا خاکہ دیکھا تھا جس نے وہاں تعمیر ہونا تھا۔

پھر اسی برس وزیر کے حکم سے اور وزیر کے خرچ پر درینہ پر عظیم پُل کی تعمیر شروع ہو گئی جسے پانچ سال کا عرصہ لگا۔ سچ پوچھیے تو یہ وقت نہ صرف قصبے کے لیے بلکہ سارے ضلع کے لیے پر لطف اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہو گا جس میں لاتعداد تبدیلیاں اور چھوٹے بڑے واقعات رونما ہوئے ہوں گے۔ اس قصبے میں ہر واقعہ جس کا تعلق کسی اور چیز سے تھا یا براہ راست پُل سے' صدیوں تک یاد رکھا جاتا تھا اور اس پر وقتاً فوقتاً گرما گرم بحثیں چلتی تھیں' لیکن حیرانی کی بات ہے کہ جہاں اس قصبے نے اور واقعات یاد رکھے' وہاں یہ پُل کی تعمیر سے متعلق بہتیرے واقعات کی تفصیلات محفوظ نہیں رکھ سکا۔

عام لوگ یاد رکھتے ہیں اور وہ بات بتاتے ہیں جو وہ سمجھ سکتے ہیں اور جسے وہ افسانے میں تبدیل کر سکتے ہیں' باقی سب چیزیں بے نام فطری عجیب وقوعوں کی طرح بے اعتنائی سے ان کے سامنے سے گزر جاتی ہیں اور ان پر کوئی گہرا نقش نہیں چھوڑتیں۔ ایسے واقعات نہ تو تخیل کو چھوتے ہیں اور نہ یادداشت میں ٹھہرتے ہیں۔ یہ طویل اور محنت طلب تعمیری کام ان کے نزدیک ایک غیر ملکی منصوبہ تھا جو اوروں کے خرچ پر بن رہا تھا' لیکن جوں ہی اس محنت کا ثمر ایک عظیم پُل کی صورت میں ان کے سامنے آیا' تو انھوں نے اس کی تفصیلات یاد رکھنی شروع کر دیں اور اس حقیقی اور پائیدار فن تعمیر کے نمونے پر افسانوی قصے کہانیوں کی کشیدہ کاری شروع کر دی' جس کا کاڑھنا اور پھر یاد رکھنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

جس سال وزیر نے تعمیر کا فیصلہ کیا اسی کے موسم بہار میں وہ اس کے قصبے میں پہنچے تاکہ پُل کی تعمیر کے سلسلے میں تمام ضروری اقدامات کیے جا سکیں۔ ان میں بہت سے آدمیوں کے پاس گھوڑے' گاڑیاں' خیمے اور مختلف قسم کے اوزار تھے۔ یہ دیکھ کر اس چھوٹے قصبے اور اس کے اردگرد کے دیہات کے لوگوں بالخصوص عیسائیوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔

اس جتھے کا سردار عابد آغا (Abid Aga) جسے وزیر نے اس پُل کی تعمیر کا کام سونپا تھا' اس کے ہمراہ ایک مستری کا نام توسن آفندی عابد آغا کے متعلق پہلے ہی سے یہ بات مشہور تھی کہ وہ نہایت سفاک اور بے رحم تھا اور ظلم و تعدی میں

اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ جونہی یہ لوگ میدان (Mejdan) سے نیچے خیمہ زن ہو گئے' عابد آغا نے مقامی لیڈروں اور چندہ چیدہ ترکوں کو بات چیت کے لیے بلا بھیجا' لیکن یہ بات چیت کچھ زیادہ نہ ہوئی' کیونکہ دونوں طرف ایک ہی شخص بولا اور وہ تھا عابد آغا۔ جن لوگوں کو طلب کیا گیا تھا انھوں نے دیکھا کہ عابد آغا ایک مضبوط جسم کا مالک ہے' اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور چہرہ بیمار سرخی مائل تھا۔ وہ استنبول کا زرق برق لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کی ڈاڑھی سرخی مائل تھی اور اس کی منگول طرز کی مونچھیں تھیں جو عجیب طریقے سے اوپر کی سمت مڑی ہوئی تھیں۔ اس سخت گیر آدمی نے ممتاز شخصیتوں کے سامنے جو تقریر جھاڑی' اس نے انھیں اس کی شخصیت سے بھی زیادہ مرعوب اور ششدر کیا۔

"اس بات کا غالب امکان ہے کہ آپ لوگوں نے میرے آنے سے قبل میرے متعلق داستانیں سنی ہوں گی اور میں بغیر پوچھے یہ جانتا ہوں کہ یہ داستانیں خوش کن اور موافق نہ پائی گئی ہوں گی۔ غالباً آپ نے سن لیا ہو گا کہ میں ہر آدمی سے کام اور اطاعت کی توقع رکھتا ہوں۔ جو آدمی اپنے کام میں کوتاہی کرے گا اور خاموش اطاعت نہیں کرے گا' میں اس کی پٹائی کروں گا اور اسے قتل کروں گا۔ مجھے اس کے معنی نہیں آتے کہ میں نہیں کر سکتا یا کوئی نہیں ہے۔ میں جہاں بھی ہوں گا' معمولی بات پر سروں کا فصل کاٹ لیا کروں گا"۔

"مختصر بات یہ ہے کہ میں سخت گیر اور خون کا پیاسا ہوں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو داستانیں آپ نے میرے متعلق سنی ہیں' نہ تو وہ خیالی ہیں اور نہ ہی ان میں کوئی مبالغہ ہے۔ میرے لیموں کے درخت کے نیچے کوئی سایہ نہیں ہے۔ میں نے یہ شہرت متعدد برسوں کی ملازمت کے بعد حاصل کی ہے جس کے دوران میں نے وزیر کے حکم کی تعمیل سر آنکھوں پر کی۔ میں خدا پر بھروسا رکھتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میں یہ کام جو میرے سپرد ہوا ہے' پایۂ تکمیل کو پہنچا سکوں گا اور یہ کام مکمل ہو جانے پر جب میں یہاں سے جاؤں گا تو خیال ہے کہ میرے متعلق جو کچھ آپ نے سن رکھا ہے' اس سے کہیں زیادہ سخت اور تاریک داستانیں مجھ سے آگے آگے جائیں گی"۔

اس غیر معمولی تمہید کے بعد جو سب نے آنکھیں جھکا کر خاموشی سے سنی' عابد آغا نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ معاملہ ایک بڑی اہمیت کی حامل تعمیر سے متعلق تھا۔ یہ ایسی تعمیر ہو گی' جو امیر سے امیر ملکوں کو بھی کبھی نصیب نہیں ہوئی ہو گی' اسے مکمل کرنے میں پانچ سال کا عرصہ لگے گا' مگر وزیر کی خواہش کی تکمیل میں نہ تو سرمو فرق پڑے گا اور نہ ایک منٹ کی التوا ہو گی۔ اس کے بعد اس نے ان کے سامنے وہ ضروریات رکھیں جن کی توقع وہ مقامی ترکوں سے رکھتا تھا اور جن کا مطالبہ اس نے رعایا (عیسائی غلاموں) سے کیا۔

اس کے ہمراہ توسن آفندی بیٹھا تھا۔ یہ پستہ قد' زرد رو یونانی جزائر میں پیدا ہوا تھا اور مستری تھا' اس نے محمد پاشا کی متعدد فرمائشیں استنبول میں تعمیر کی تھیں۔ اس دوران وہ خاموش اور بے پروا بیٹھا رہا' گویا وہ عابد آغا کی تقریر سرے سے سن ہی نہیں رہا تھا۔ اگر سن رہا تھا' تو سمجھ نہیں رہا تھا' وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتا جاتا تھا اور کبھی کبھی آنکھیں اٹھا کر اوپر دیکھ لیتا تھا۔ جب وہ اوپر دیکھتا' تو اس کی بڑی بڑی' سیاہ' خوبصورت' کوتاہ بین آنکھیں جن میں مخملی چمک تھی' نظر آتی تھیں۔ یہ آنکھیں ایسے آدمی کی تھیں جو صرف اپنے کام پر نگاہ رکھتا ہو اور جو نہ دیکھتا ہو' نہ محسوس کرتا ہو اور نہ زندگی میں یا دنیا میں کسی اور چیز کو سمجھتا ہو۔

تمام بلائے ہوئے ممتاز شہری دل برداشتہ اور مغموم سے اس چھوٹے بند بند خیمے سے قطار میں نکل کر چلے گئے۔ انھیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے تشریفاتی لباس کے نیچے پسینہ بہہ رہا ہو اور ان میں سے ہر آدمی پر خوف و پریشانی کی چادر پڑ گئی۔

اس قصبے اور تمام ضلع پر ایک ایسی ناقابل فہم آفت نازل ہو گئی تھی جس کے خاتمے کے متعلق کوئی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی تھی۔ سب سے پہلے جنگلات کی کٹائی اور لکڑی کے ڈھونے کا کام شروع ہوا۔ درینہ کے دونوں کناروں پر پاڑ کے لیے اس قدر بے تحاشا لکڑی استعمال کی گئی کہ بہت عرصے تک لوگوں کا خیال تھا کہ یہ پُل لکڑی کا بنے گا۔ اس کے بعد مٹی کا کام شروع ہوا اور پھر کھدائی کا اور دریا کے چاک کے کناروں پر دیواریں لگنی شروع ہوئیں۔ یہ زیادہ تر بیگار کے ذریعہ بن رہی تھیں۔ یہ کام خزاں کے آخری حصے تک جاری رہا جب کہ کام مکمل طور پر کچھ عرصے کے لیے روک دیا گیا اور تعمیر کا پہلا حصہ مکمل ہو گیا۔

یہ سارے کا سارا کام عابد آغا اور اس کے لمبے نیلے رنگ کے ڈنڈے کی نگرانی میں ہوا تھا' جو ایک افسانوی کردار کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ جب کوئی آدمی اس کی نظر میں آ جاتا جو کام سے بچنے کی کوشش کر رہا ہوتا یا صحیح طور پر کام نہ کرتا تو

وہ اس ڈنڈے سے جس کی سمت اشارہ کرتا سپاہی اسے پکڑ لیتے اور موقع پر خوب پیٹتے اور پھر اس کے بے حس اور خون رستے جسم پر پانی ڈال کر دوبارہ کام پر بھیجتے۔ جب گزشتہ خزاں کے موسم میں عابد آغا قصبے سے رخصت ہوا تو اس نے دوبارہ ممتاز شہریوں کو بلوا بھیجا اور بتلایا کہ وہ موسم سرما گزارنے کے لیے ایک اور مقام پر جا رہا ہے، مگر اس کی آنکھ پھر بھی دیکھتی رہے گی۔ سب لوگ ہر ایک چیز کے ذمہ دار ہوں گے۔ اگر یہ معلوم ہوا کہ تعمیر کے کسی حصے کو نقصان پہنچا ہے یا پاڑ میں سے ایک لکڑی بھی غائب ہوئی ہے، تو وہ تمام قصبے پر جرمانہ عائد کر دے گا۔ جب انھوں نے قدرے جرات کر کے سوال کیا کہ اگر کوئی نقصان سیلاب سے پہنچا تو اس پر اس نے تامل کیے بغیر سرد مہری سے کہا: یہ ضلع تمہارا ہے اور یہ دریا بھی تمہارا ہے لہٰذا دریا سے نقصان بھی تمہارا ہی ہو گا۔

چنانچہ سردیوں کے سارے موسم میں قصبے کے لوگ سامان کی نگہداشت کرتے رہے اور تعمیری کام پر بھی انھوں نے نظریں جمائے رکھیں۔ جب موسم بہار آیا تو عابد آغا دوبارہ آن پہنچا۔ اس کے ہمراہ توسن آفندی کے علاوہ ڈالیشیا کے سنگتراش بھی آئے جنہیں لوگ لاطینی استاد کہا کرتے تھے۔ شروع میں یہ قریباً تیس آدمی تھے جن کی قیادت الٹینی (Ulcinj) کے رہنے والا ایک عیسائی ماسٹر واین ٹونیو کرتا تھا۔ یہ شخص دراز قد اور خوبصورت تھا اور اس کی آنکھیں تیز اور حساس تھیں۔ یہ جرات مند نگاہ اور خمدار ناک رکھتا تھا۔ اس کے بال کندھوں تک دراز تھے اور مغربی شرفا کی طرز کا لباس زیب تن کرتا تھا۔ اس کا معاون ایک اصلی حبشی تھا جو نوجوان اور خوش باش تھا اور اسے سارا قصبہ عرب کے عرفی نام سے پکارتا تھا۔

پاڑ کی لکڑیوں کے ڈھیر سے جہاں پچھلے برس لوگ یہ اندازہ لگاتے تھے کہ عابد آغا لکڑی کا پل بنانے کا ارادہ رکھتا ہے، وہاں اب ان کو یوں دکھائی دیا جیسے آغا یہاں درینہ پر نیا استنبول بنانا چاہتا ہے۔ اس کے بعد پتھر کی کانوں سے پتھر لانے کا کام شروع ہوا۔ یہ کانیں قصبے سے کوئی ایک گھنٹے کی دوری پر بانجا (Banja) کی پہاڑیوں میں کھودی گئی تھیں۔

اگلے برس وشی گراڈ کے گھاٹ کے پاس نہایت غیر معمولی قسم کی بہار آئی۔ اس تمام نباتات کے علاوہ جو ہر سال اس موسم میں زمین سے اگتی اور پھول لاتی تھی۔ جھونپڑیوں کی بھی ایک پوری بستی اُگ آئی اور اس کے ساتھ ہی سڑکیں اور پانی کے کنارے تک راستے بھی نمودار ہو گئے۔

لاتعداد بیل گاڑیاں اور باربرداری کے گھوڑوں کے گلے ہر طرف نظر آنے لگے۔ میدان (Mejdan) اور اوکولشٹے (Okoliste) کے باشندوں نے دیکھا کہ کس طرح ہر روز دریا کے پاس مصروف آدمیوں کے ٹھٹھ، جانوروں کے گلے اور ہر قسم کے تعمیراتی سامان کے ڈھیر کسی فصل کی طرح تیزی سے اُگ رہے ہیں۔

دریا کے گہرے کناروں پر ماہر سنگ تراش کام میں مصروف تھے اور پتھروں کی خاک سے سارا علاقہ زردی مائل رنگ اختیار کر چکا تھا۔ اس سے ذرا آگے ریتلے میدان کے ساتھ ساتھ زرد رو اور خستہ حال مقامی مزدور چونے کی بھٹیوں سے نکلنے والے سفید دھوئیں میں چونا بجھانے کا کام سرانجام دے رہے تھے۔ بھاری سامان لانے اور لے جانے والی گاڑیوں نے سڑکوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ گھاٹ کی کشتی تمام دن تعمیراتی سامان، اوور سیروں اور مزدوروں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے پہنچاتی رہتی۔ کمر کمر تک سردپانی میں سے گزر کر خاص مزدور لکڑی کے شہتیر اور نوک دار کھمبے گاڑتے اور مٹی سے بھرے ہوئے دھات کے سلنڈروں کو اپنے اپنے مقام پر جماتے تاکہ پانی کے بہاؤ کو روکا جائے۔

وہ لوگ جو اب تک درینہ گھاٹ کے قریب ڈھلان پر اپنے اپنے منتشر گھروں میں رہ رہے تھے، وہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہے تھے اور یہ ان کے لیے اچھا ہوتا اگر وہ صرف دیکھتے رہتے، مگر یہ کام بہت جلد اتنا وسیع ہو گیا اور اس کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی تھی کہ نہ صرف قصبے میں بلکہ کافی دور تک بھی ہر جاندار اور بے جان چیز بھنور کے اندر کھینچ لی گئی۔ دوسرے برس مزدوروں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ وہ قصبے کے تمام مزدوروں کے برابر ہو گئی۔ تمام گاڑیاں، تمام گھوڑے اور بیل صرف پل کے لیے کام کرتے تھے۔ ہر وہ چیز جو رینگ کر یا لڑھک کر چل سکتی تھی کام پر لگا دی گئی (اور بعض مزدوری پر اور بعض بیگار میں)

گو روپیہ پہلے سے عام ہو گیا تھا، لیکن پیداوار میں کمی اور قیمتوں میں اضافہ روپے کے بہاؤ سے تیز تر تھا، چنانچہ جب آدمیوں کے ہاتھ میں روپیہ پہنچتا تو اس کی قیمت آدھی رہ جاتی تھی۔ قیمتوں میں اضافے اور پیداوار میں کمی سے بھی بدتر وہ بے چینی، بد نظمی اور عدم تحفظ تھا جس نے اب سارے قصبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جس کا سبب باہر سے لاتعداد مزدوروں کی آمد تھا۔ باوجود عابد آغا کی سختی کے

مزدوروں کے درمیان لڑائی جھگڑا عام ہو گیا اور باغوں اور گھروں کے صحنوں سے چوری کی متعدد وارداتیں ہوئیں۔ مسلمان خواتین اپنے گھر کے صحنوں کے اندر بھی چہروں پر نقاب ڈالے رہتیں تا کہ لاتعداد مقامی اور غیر مقامی مزدوروں کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔

قصبے کے ترک اسلامی رسومات کی بہت حد تک سختی سے پابندی کرتے تھے' اس لیے بھی کہ وہ سب کچھ ہی عرصہ ہوا مسلمان ہوئے تھے اور ان میں سے بمشکل کوئی ایسا ہو گا جسے اپنا باپ یا دادا یاد نہ ہو جو عیسائی تھا یا حال ہی میں مذہب تبدیل کر کے ترک ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پرانے لوگ جو اسلامی قانون پر چلتے تھے' وہ علی الاعلان اپنی برہمی کا اظہار مزدوروں کی اس تنظیم اور گڈمڈ تعداد کی طرف' بار برداری کے جانوروں کی طرف' لکڑیوں' مٹی اور پتھروں کی طرف پیٹھ موڑ کر کرتے تھے جو الجھے ہوئے اور بے تحاشا انداز میں گھاٹ کی دونوں جانب بڑھتے ہی جاتے تھے اور تعمیرات کے نیچے سہارا دینے کے عمل کے دوران' ان کی گلیوں' صحنوں اور باغوں میں گھس جاتے تھے۔

ابتدا میں سب فخر کرتے تھے کہ وزیر نے ان کے ضلع میں ایک بڑا منصوبہ تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس وقت انھیں یہ احساس نہیں تھا جیسا کہ اب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ان شاندار عمارات کے بنتے وقت کتنی بدنظمی' بے چینی' جدوجہد اور اخراجات ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کتنی اچھی بات ہے کہ ان کا تعلق ایک پاک حکمران مذہب سے ہے اور ان کا اپنا ہم وطن وزیر' استنبول میں ہے اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ان کے دریا پر ایک مضبوط اور گراں بہا پُل تعمیر ہو رہا ہے' لیکن اب جو کچھ ہو رہا تھا' وہ بالکل برعکس تھا۔ ان کے قصبے کو جہنم میں تبدیل کر دیا گیا تھا جہاں ناقابل فہم تعمیرات دھواں' خاک' شوروغل اور ہنگاموں سے یوں محسوس ہوتا تھا' جیسے یہ سب کچھ شیطانی چکر ہے۔ سال گزرتے گئے' کام پھیلتا گیا اور بڑھتا گیا' لیکن یہ ختم ہوتا نظر نہیں آتا تھا اور پُل کے علاوہ یہ ہر وہ چیز نظر آتا تھا جو آپ چاہیں۔

عابد آغا کے سپاہی اور گھڑسوار ہر جگہ دیہات اور قصبوں سے' لوگوں کو پکڑ کر لے جاتے تا کہ وہ پُل پر کام کریں۔ عام طور پر لوگوں کو اچانک سوتے میں جا دبوچتے اور مرغوں کی طرح ان کے پر باندھ لیتے۔ تمام بوسنیا میں ایک مسافر دوسرے مسافر سے کہہ دیتا کہ وہ دریںہ کی طرف نہ جائے' کیونکہ جو کوئی وہاں گیا ہے' بیگار میں پکڑا گیا ہے اور پھر کسی نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے؟ کیا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ گاؤں کے نوجوان بھاگ کر جنگلوں میں جانے کی کوشش کرتے' مگر سپاہی ان کے گھروں سے اکثر عورتوں کو پکڑ کر بھاگنے والوں کی جگہ پر غمالی بنا لیتے۔

یہ تیسرا خزاں کا موسم تھا کہ لوگوں کو پُل پر بیگار کرتے گزر رہا تھا اور یہ کسی طور پر بھی معلوم نہ ہو تا کہ کام آگے بڑھ رہا ہے یا ان کی مصیبتوں کے خاتمے کا وقت قریب ہے۔ موسم خزاں پورے جوبن پر تھی۔ بارش سے سڑکیں ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں۔ دریںہ کا پانی تند ہو گیا تھا اور وہ چڑھ رہا تھا اور درختوں کے جھنڈ سست پرواز پہاڑی کوؤں سے بھرے ہوئے تھے' لیکن عابد آغا نے کام بند نہ کیا۔ نومبر کی پیلی زرد دھوپ میں کسان بے چارے لکڑی کی گیلیاں اور پتھر کھینچتے۔ ننگے پاؤں یا تازہ چمڑے کے بنائے ہوئے چپل پہنے' وہ کیچڑ والی سڑکوں کے ساتھ ساتھ پانی میں چلتے۔ سخت محنت کی بدولت ان کے جسم پسینے سے شرابور ہوتے یا سرد ہوا سے سن ہو جاتے۔ اپنے جسموں کے گرد وہ اپنے انگرکھے لپیٹے جن میں پرانے پیوند اور تازہ سوراخ ہوتے' موٹے کھدر کے اپنے کرتوں کے پھٹے ہوئے کناروں کو گانٹھیں لگا دیتے جو بارش' کیچڑ اور دھوئیں سے سیاہ ہوئے ہوتے اور جنہیں ڈر کے مارے وہ دھونے سے گریز کرتے کہ کہیں پانی میں ریزہ ریزہ نہ ہو جائیں۔ ان سب کے اوپر عابد آغا کا ڈنڈا گشت کرتا رہتا۔

"دن چھوٹے ہیں' ہمیشہ چھوٹے رہیں گے' لیکن تم کتیا کے بچے روٹی حرام کی کھا رہے ہو"۔

بیگار میں پکڑے جانے والے مزدوروں میں ایک آدمی ریڈ ساف نامی تھا جو قصبے کے بالکل ہی قریب کے ایک گاؤں یونشتے (Uniste) کا رہنے والا تھا۔ اس پستہ قد آدمی کا چہرہ سانولا اور آنکھیں بے قرار تھیں۔ قدرے جھک کر اور ٹانگیں پھیلا کر یہ آدمی تیز تیز چلا کرتا۔ چلتے وقت اس کے سر اور کندھے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کو یوں حرکت کرتے جیسے گندم کا بیج بو رہا ہو۔ وہ اتنا غریب نہ تھا' جتنا نظر آتا تھا اور نہ ہی اتنا سادہ تھا جتنا کہ اس نے اپنے آپ کو بنایا ہوا تھا۔ اس کا خاندان ہیراتی (Herachi) کے نام سے مشہور تھا۔ ان کی زمین اچھی تھی اور کنبوں میں مردوں کی تعداد بھی زیادہ تھی' مگر چونکہ پچھلے چالیس برسوں سے تقریباً سارے کا سارا گاؤں مسلمان بنا لیا گیا تھا' اس لیے وہ تنہا اور

گاؤں سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ یہ چھوٹے قد کا جھکا ہوا ریڈی ساف ان خزاں کی راتوں میں ایک اصطبل سے دوسرے اصطبل میں چوری چھپے داخل ہوتا اور بغاوت پھیلاتا۔ یہ کسانوں میں بام مچھلی کی طرح گھل مل جاتا اور بیک وقت صرف ایک سی سرگوشیاں کرتا اور مشورے دیتا جو کچھ وہ کہتا تھا وہ موٹے موٹے الفاظ میں یوں ہے:

"بھائی ہمارے ساتھ بہت ہو چکی ہے' ہمیں اپنی حفاظت کرنا چاہیے' آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ تعمیری کام ہم سب کے لیے موت کا پیغام لائے گا۔ یہ ہم سب کو کھا جائے گا۔ اگر ہم میں سے کوئی زندہ بچا' تو ہمارے بچوں سے بھی اس پُل پر بیگار لی جائے گی۔ ہمارے لیے یہ کام اپنے آپ کو ختم کرنے سے کم کسی صورت نہیں۔ ایک پُل صرف ترکوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ ہم غریبوں اور رعایا کے لیے اس کی کوئی افادیت نہیں۔ ہمارے لیے کشتی ہی ضرورت سے زیادہ ہے۔ پس ہم میں سے چند آدمیوں نے آپس میں یہ طے کر لیا ہے کہ رات کے کسی تاریک ترین حصے میں جائیں اور جو کچھ تعمیری کام ہوا ہے' اس کا جتنا حصہ ممکن ہو' تباہ کر دیں اور پھر یہ افواہ پھیلائیں کہ یہ کام Vila پانی کی دیوی کا ہے اور وہ پُل کی تعمیرات کو اس لیے تباہ کر رہی ہے کہ وہ دریا پر پُل نہیں چاہتی۔ ہم دیکھیں گے کہ اس سے مطلب براری ہوتی ہے یا نہیں۔ ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں اور کچھ تو ہم کو کرنا ہی ہو گا"۔

جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے' ان میں کچھ آدمی کمزور دل اور ناقابل اعتبار تھے جن کا خیال تھا کہ یہ بیکار سوچ ہے' کیونکہ مکار اور طاقت ور ترک اپنے ارادے سے باز نہیں آئیں گے اور اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا' تو انھیں اس سے بھی زیادہ بیگار کرنی پڑے گی۔ انھیں خراب حالات کو خراب تر ہرگز نہیں بنانا چاہیے۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو یہ محسوس کرتے تھے کہ اس وقت تک غلامی کرتے رہنے سے جب کپڑے ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں اور طاقت کا آخری اونس بھی عابد آغا کی ناکافی خوراک کے سامنے جواب دے دے' ہر چیز سے بہتر ہے' لہٰذا انھیں ہر اس آدمی کے پیچھے چلنا چاہیے جو انتہا پسند ہو۔ یہ زیادہ تر نوجوان طبقہ تھا' مگر ایسے متین' شادی شدہ اور بال بچے دار آدمی بھی تھے جو کسی جوش اور ولولے کے بغیر متفق تھے اور جو فکر مند ہو کر کہتے تھے:

"آؤ! ہم اسے توڑ دیں' خدا کرے اس کا اپنا خون اسے کھا جائے۔ بجائے اس کے کہ وہ ہمیں چٹ کر جائے اور اگر اس سے کام نہ بنا تو...."

اور اس نکتے پر وہ اپنے ہاتھوں کو مایوسی سے ملتے' چنانچہ خزاں کے ان ابتدائی ایام میں یہ افواہ مزدوروں میں اور پھر قصبے کے اندر پھیلنی شروع ہوئی کہ پانی کی دیوی نے پُل کے کام میں مداخلت شروع کر دی ہے اور اس نے راتوں رات وہ تمام تعمیر توڑ پھوڑ دی ہے جو دن کے وقت مکمل ہوئی تھی اور اس طرح سارے کا سارا منصوبہ یوں دھرے کا دھرا رہ جائے گا اور اس کے ساتھ ہی رات کے وقت پشتوں کے اگلے حصے اور بذات خود چنائی کے کام کو ناقابل بیان نقصان پہنچنا شروع ہو گیا۔ اب تک مستری جن آلات کو پشتوں پر چھوڑ آئے تھے' وہ غائب ہونے شروع ہو گئے اور پشتوں کے سامنے والے حصے گرنا شروع ہو گئے اور انھیں پانی بہا کر لے جانے لگا۔

چنانچہ یہ افواہ دور دراز تک پھیل گئی کہ پُل کبھی بھی مکمل نہیں ہو سکے گا۔ دونوں ترکوں' اور عیسائیوں نے یہ افواہ پھیلائی اور آہستہ آہستہ اس نے پختہ عقیدے کی شکل اختیار کر لی۔ عیسائی' رعایا بغلیں بجاتی پھر رہی تھی۔ گو بظاہر اشاروں سے چوری چھپے اور سرگوشیوں کے ذریعے بات کرتے تھے' مگر پھیلاتے وہ اسے دل کی گہرائیوں سے تھے۔ مقامی ترک باشندوں نے جو ابتدا میں وزیر کے تعمیری کام کو بڑے فخر سے دیکھا کرتے تھے' اب حقارت آمیز طریقے پر آنکھیں مارنی اور ہاتھ ہلانے شروع کر دیے۔

عوام کہانیاں فوراً گھڑ لیتے ہیں اور انھیں تیزی سے پھیلا بھی دیتے ہیں۔ ایسی کہانیوں میں حقیقت کو بڑے عجیب انداز میں اس طرح گڈمڈ کر کے افسانوں کے اندر بن دیا جاتا ہے کہ اسے جدا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کسان کہتے کہ پانی کی دیوی Vila نے' جو پُل کو برباد کر رہی تھی' عابد آغا سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنا تباہ کرنے کا عمل اس وقت تک نہیں روکے گی' جب تک ستویا (Stoja) اور اوستویا (Ostaja) نامی جڑواں بچے بنیادوں میں نہیں چنے جاتے۔ بہت سے لوگ قسمیں کھاتے تھے کہ انھوں نے ان سپاہیوں کو دیکھا ہے جو دیہات میں ایسے جڑواں بچوں کو تلاش کر رہے تھے (سپاہی دیہات میں جاتے ضرور تھے' مگر وہ بچوں کو تلاش نہیں کر رہے تھے۔ وہ افواہیں سنتے تھے اور لوگوں سے پوچھ گچھ کرتے تھے تاکہ ان نامعلوم اشخاص کا پتا چلایا جا سکے جو پُل تباہ کر رہے تھے۔

تھوڑا عرصہ قبل دشی گراڈ سے اوپر ایک گاؤں میں

ایک واقعہ ہوا۔ لکنت کی ماری ہوئی ایک غریب اور نیم پاگل لڑکی کو جو کسی کی نوکرانی تھی، حمل ٹھہر گیا۔ وہ خود بھی نہ بتاتی تھی یا نہ بتا سکتی تھی کہ کس سے حمل ٹھہرا ہے۔ یہ ایک انوکھا واقعہ تھا جو کبھی بھی سننے میں نہیں آیا تھا کہ اس قبیل کی ایک لڑکی کو حمل ٹھہرے اور پرلطف بات یہ ہے کہ اس بچے کے باپ کا بھی پتا نہ چلے۔ یہ واقعہ باہر دور دور تک سنا گیا۔ مقررہ میعاد پر لڑکی کے ہاں کسی بھی اصطبل وغیرہ میں جڑواں بچے پیدا ہوئے جو دونوں مرے ہوئے پیدا ہوئے تھے۔ گاؤں کی عورتوں نے جو اس غیر معمولی مشکل زچگی کے وقت زچہ کی امداد کر رہی تھیں، مردہ بچوں کو آلوچے کے باغیچے میں دفن کر دیا، لیکن تیسرے روز یہ بدنصیب ماں اٹھ کھڑی ہوئی اور گاؤں میں ہر جگہ اپنے بچوں کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

اسے بتایا گیا کہ دونوں بچے مردے پیدا ہوئے تھے اور دفن کر دیئے گئے تھے، مگر یہ بتلانا بیکار ثابت ہوا۔ اس کے مسلسل سوالات سے تنگ آ کر اسے کسی نے کہہ دیا یا اشاروں کنائیوں سے بتایا کہ اس کے بچوں کو نیچے قصبے میں اس جگہ لے گئے ہیں جہاں ترک پل تعمیر کر رہے ہیں۔ کمزور اور پاگل ہوتی ہوئی بے چاری لڑکی نیچے قصبے میں جا پہنچی اور گھاٹ اور تعمیراتی کاموں کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے، وہاں خوفناک طور پر آدمیوں کی آنکھوں میں گھورتی اور ناقابل فہم کٹے پھٹے الفاظ میں اپنے بچوں کے متعلق سوالات کرتی۔ آدمی اسے حیران ہو کر دیکھتے یا اسے وہاں سے بھگا دیتے تاکہ ان کے کام میں حرج کا باعث نہ بنے۔

جب یہ دیکھتی کہ لوگ اس کی بات سمجھ نہیں پائے کہ وہ کیا چاہتی ہے تو وہ کسانوں والی موٹے کپڑے کی شمیز کے بٹن کھول کر اپنے سوجے ہوئے اور تکلیف دہ پستان دکھاتی جن کے سر پھٹنے شروع ہو گئے تھے اور جو دودھ از خود بہنے سے خون کی طرح سرخ تھے۔ کسی کو سجھائی نہیں دیتا تھا کہ اس کی امداد کس طرح کی جائے، اور سچ بتا دیا جائے کہ اس کے بچے پل میں نہیں چنے گئے۔ وہ تمام میٹھے بولوں اور تسلیوں، بددعاؤں اور دھمکیوں کے جواب میں صرف تکلیف دہ طور پر ہکلاتی اور تیز شکی نگاہوں سے ہر کونے کو دیکھتی۔ آخر میں لوگوں نے اسے ستانا بند کر دیا اور کھلی چھٹی دے دی کہ وہ تعمیراتی کاموں کے گرد ادھر ادھر گھوم پھر سکتی ہے، مگر ہمدردانہ تاسف سے لوگ اس سے ضرور کنی کتراتے تھے۔ باورچی اسے کھانے کے لیے مزدوروں کے لیے پکا ہوا دلیہ دے دیتے تھے جو دیگ کے پیندے میں جل جاتا تھا۔ وہ لوگ اسے پاگل النکا (Ilinka) کہہ کر پکارتے تھے، اس کا یہ نام بعد میں قصبے میں بھی پھیل گیا۔ خود عابد آغا بھی اس کے قریب سے گزرتا تو برا بھلا نہ کہتا، البتہ اپنا سر توہم کی وجہ سے پھیر لیتا اور حکم دیتا کہ اسے خیرات دی جائے۔ اس طرح اس نے وہاں تعمیراتی کاموں کے پاس ایک بے ضرر مخبوط الحواس کی طرح رہنا شروع کر دیا۔ اس کی بدولت یہ کہانی چلتی رہی کہ ترکوں نے اس کے بچوں کو پل میں چن دیا تھا۔ کچھ لوگ یہ بات سچ سمجھتے تھے اور باقی یقین نہیں کرتے تھے، پھر بھی یہ افواہ بہت دہرائی گئی اور اس کی گونج دور دور تک پہنچی۔

اس عرصے میں کبھی تھوڑا، کبھی زیادہ نقصان ہوتا رہا اور اس کے ساتھ ہی افواہیں بڑی ڈھٹائی سے پھیلائی گئیں کہ پانی کی دیویاں (Vilas) دریائے درینہ پر پل باندھنے کی اجازت نہیں دیں گی۔

عابد آغا غضب ناک ہو گیا۔ اس کو غصہ اس لیے بھی آ رہا تھا کہ اس کی ضرب المثل سختی کے باوجود جسے اس نے فخر کے لیے خاص مضمون کے طور پر اختیار کیا تھا، کوئی ایسا بھی ہے جو اس کے کام یا ارادوں کے خلاف قدم اٹھانے کی جرأت رکھتا ہے۔ ان تمام لوگوں (مسلمان اور عیسائی دونوں) سے اسے نفرت ہو گئی تھی، کیونکہ وہ اپنے کام میں ست تھے اور بے ہنر تھے، لیکن وہ ہنسی مذاق اور گستاخی میں تیز تھے اور صرف یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کس طرح نقالی کی جائے اور ہر اس چیز پر جسے نہ وہ سمجھتے تھے اور نہ کر سکتے تھے، خواہ مخواہ نکتہ چینی کی جائے۔ اس کے بعد مٹی کے کام کا نقصان تو بند ہو گیا، مگر دریا کے اندر بھی تعمیری کام کا نقصان جاری رہا۔ صرف چاندنی راتوں کو کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا۔

اس بات سے عابد آغا کے اس یقین کی توثیق ہو جاتی تھی کہ پانی کی دیوی ویوی کچھ چیز نہیں اور یہ کہ خاص دیوی کوئی غیر مرئی چیز بھی نہیں جو آسمان سے اتر کر آتی ہو۔ ایک لمبے عرصے تک وہ ان لوگوں کی بات نہ مانتا تھا اور نہ مان سکتا تھا جو یہ کہتے تھے کہ یہ کسانوں کی عیاری تھی، مگر اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ بات درست ہے اور اس سے اس کے غصے کو اور فروغ ملتا تھا، پھر بھی وہ جانتا تھا کہ اسے خاموشی اختیار کرنا چاہیے اور غصے کو چھپانا چاہیے تاکہ وہ ان کیڑے مکوڑوں کو جال میں پھانس لے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان قصوں کا خاتمہ کر دے جو پل پر کام بند کرنے کے سلسلے میں دیویوں (Vilas) سے منسوب تھے، کیونکہ یہ قصے خطرناک حالات پیدا کر سکتے تھے۔ اس نے گارڈ کے سپاہیوں کے کمانڈر

کو بلایا جو پلیولیڑی (Plevlje) کا باشندہ تھا۔ یہ زرد رو اور بیمار آدمی استنبول میں بڑا ہوا تھا۔

"سنو! اے او احمق! تم ان سؤر کے بچوں کے ساتھ بڑے ہشیار ہو، تم ان کی زبان جانتے ہو اور ان کے تمام بندروں والے کرتب بھی۔ باوجود اس بات کے تم ابھی تک اس خارش زدہ کتے کا پتا لگانے میں ناکام رہے جس کی یہ جرات ہے کہ وہ وزیر کا کام تباہ کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم خود بھی ان کی طرح خارش زدہ کتے ہو۔ سب سے بڑا خارش زدہ کتا تو وہ ہے جس نے تم کو لیڈر اور کمانڈر بنایا ہے اور اسے ایسا آدمی نہیں ملا جو تمھیں وہ انعام دے، جس کے تم مستحق ہو، چنانچہ یہ کام میں کروں گا، کیونکہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔ یہ جان لو کہ میں تمھیں منوں مٹی کے نیچے دبا دوں گا، تاکہ تم اتنا سایہ بھی نہ ڈال سکو، جتنا کہ گھاس کا ایک تنکا ڈالتا ہے۔ اگر تعمیرات کا تمام نقصان تین دن کے اندر اندر بند نہ ہوا، اگر تم نے اس شخص کو نہ پکڑا جو یہ نقصان پہنچاتا ہے اور کام بند کرنے سے متعلق پانی کی دیویوں کے بیہودہ قصے ختم نہ ہوئے، تو میں تمھیں اونچی جگہ نوک دار کھمبے پر زندہ لٹکا دوں گا تاکہ تمھیں سب دیکھ کر عبرت پکڑیں اور اپنے دماغوں میں عقل کے لیے گنجائش رکھیں۔ جو کچھ میں کہتا ہوں، اپنے سر اور دین کی قسم کھا کر کہتا ہوں اور یہ میں عام طور پر نہیں کھایا کرتا۔ آج جمعرات ہے، تمھارے لیے اتوار تک مہلت ہے۔ اب دفع ہو جاؤ اور جاؤ اس خبیث روح کے پاس جس نے تمھیں میرے پاس بھیجا ہے۔ جاؤ! چلے جاؤ!"

پلیولیڑ کا آدمی عابد آغا کی دھمکی کا مطلب قسم کے بغیر بھی اچھی طرح سمجھتا تھا، کیونکہ وہ تو خواب میں بھی اس کی نگاہ اور الفاظ سے لرز جایا کرتا تھا۔ اب اس پر خوف و دہشت زدگی کا دورہ پڑ گیا، اور باہر نکلتے ہی مایوسی کے عالم میں فوراً کام پر چلا گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بلا بھیجا اور دفعتاً نرمی اور سستی کے انداز کو خیرباد کہہ کر غصے سے پاگل ہو کر بددعائیں دینے لگا:

"ناکارہ اندھو!" غصے میں پلیولیڑ کے آدمی نے یوں مخاطب کیا جیسے وہ پہلے ہی نوک دار کھمبے پر زندہ لٹکا دیا گیا ہو اور اب گارد کے ہر سپاہی کے سامنے چیخ رہا ہو:

"کیا تم اس طرح پہرہ دیتے اور سلطان کے مفاد کا خیال رکھتے ہیں؟ تم جب کھانے کے لیے جاتے ہو، تو اس وقت بڑے تیز اور جاندار بن جاتے ہو، لیکن جب تم ڈیوٹی پر ہوتے ہو تو تمھاری ٹانگیں سیسے کی ہو جاتی ہیں، اور دماغ پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ میرا چہرہ تمھاری بدولت جل رہا ہے، لیکن اب میری ملازمت میں تم غفلت نہیں برت سکو گے۔ اب اگر دو دن کے اندر یہ سلسلہ بند نہ ہوا اور ان حرام زادوں کو پکڑ کر قتل نہ کیا تو میں تم سب کو تہ تیغ کر دوں گا اور تم میں سے ایک بھی اپنے کندھوں پر سر برقرار نہ رکھ سکے گا۔ زندہ رہنے کے لیے تمھارے پاس اب بھی دو دن ہیں۔ میں یہ سب کچھ اپنے دین اور قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہوں"۔

اس طرح وہ زیادہ وقت تک چلاتا رہا۔ پھر یہ دیکھ کر کہ اب اور کچھ انھیں کہنے اور دھمکیاں دینے کے لیے نہیں رہا ہے، تو اس نے ان میں سے ہر ایک پر تھوک دیا۔ جب وہ رعب جھاڑ چکا اور اپنے آپ کو خوف (اس کے خوف نے غصے کی حالت اختیار کر لی تھی) سے رہائی دلا چکا تو وہ اسی وقت جان پر کھیل جانے والے جذبے کے ساتھ کام میں لگ گیا۔ رات اس نے اپنے آدمیوں کی معیت میں دریا کے کناروں کے ساتھ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے گشت کرتے کرتے گزار دی۔ رات کے وقت انھیں یوں معلوم ہوا جیسے کوئی چیز دور دریا میں پاڑ پر دستک دے رہی ہو، چنانچہ وہ تیزی سے بھاگم بھاگ اس جگہ جا پہنچے۔ انھیں ایک تختے کے ٹوٹنے کی اور دریا میں ایک پتھر کے گرنے کی آواز آئی، لیکن جب وہ عین اس مقام پر پہنچے، تو انھوں نے دیکھا کہ ایک پاڑ ٹوٹا پڑا ہے اور پتھروں کی چنائی کا ایک حصہ بھی گرا پڑا ہے، مگر تخریب کاروں کا کوئی پتا نہ چل سکا۔

دوسری رات پلیولیڑ کے آدمی نے خوب اچھی طرح گھات لگائی۔ اس نے اپنے کچھ آدمی پار کنارے پر بھی بھیجے اور جب رات ہو گئی، تو اس نے سپاہیوں کو پاڑ کے بالکل سرے پر چھپا دیا اور خود دو آدمی لے کر کشتی میں بیٹھ گیا جسے وہ رازدارانہ طور پر اندھیرے میں چلا کر بائیں کنارے لے گیا تھا جہاں سے چند چپو مار کر وہ دو ستونوں میں سے ایک پر پہنچ سکتا تھا جن کی تعمیر شروع ہو چکی تھی۔ اس طرح وہ تخریب کاروں تک دونوں اطراف سے پہنچ سکتا تھا جو اڑ کر نکل جانے یا پانی کے اندر چلے جانے کے بغیر کسی صورت میں بچ نہ سکتے تھے۔

چنانچہ پلیولیڑ کے آدمی نے تمام سرد رات کشتی میں پڑ کر اور بھیڑ کے چمڑے سے جسم ڈھانپ کر گزاری۔ سارا وقت اس کے دماغ میں یہ اذیت ناک خیالات چکر لگاتے رہے کہ کیا عابد آغا واقعی اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنائے گا اور اس کی جان لے لے گا جو اس جیسے افسر کے تحت زندگی نہیں

بلکہ محض اذیت اور دہشت بن کر رہ گئی ہے۔ اس رات تمام تعمیراتی کاموں کے ساتھ ساتھ سرسراہٹ تک بھی سنائی نہ دی' البتہ نہ نظر آنے والے پانی کی چپڑچپڑ اور شڑاپ شڑاپ کی ایک ہی قسم کی آوازیں آتی رہیں۔ جب پو پھٹی تو پلیویئرٹ کے آدمی نے اپنے اکڑے ہوئے جسم میں محسوس کیا کہ اس کی زندگی تاریک اور مختصر ہوتی جارہی ہے۔

اس سے اگلی تیسری اور آخری رات بھی ویسے ہی انتظامات اور پہرہ بٹھایا گیا اور ویسی ہی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ آدھی رات گزر گئی۔ پلیویئرٹ کے آدمی پر موت کی بے حسی طاری تھی۔ اسی لمحے اسے پانی پر تیرنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور پھر شاہ بلوط کے ان شہتیروں پر زوردار وار کی آواز سنائی دی جو دریا میں رکھے ہوئے تھے اور جن پر چبوترے کھڑے کیے گئے تھے۔ پھر سیٹی کی ایک تیز آواز آئی' لیکن لیڈر کی کشتی پہلے ہی حرکت میں آ چکی تھی' بالکل سیدھے کھڑے ہو کر اس نے اندھیرے میں دیکھا اور اونچی آواز میں چلا کر ہاتھ ہلا تا رہا:

''چپو چلاؤ' چپو چلاؤ''۔

اس کے آدمیوں نے جو آدھے آدھے سوئے ہوئے تھے' زور سے چپو چلائے' مگر پانی کے ایک تیز دھارے نے کشتی کو وقت سے بہت پہلے پکڑ لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ چبوتروں کی طرف جانے کے بجائے کشتی دریا کے نیچے کی طرف چل نکلی۔ دھارے کے مقابلے میں وہ بے بس ہو گئے اور اگر کوئی چیز انھیں غیر متوقع طور پر روک نہ لیتی' تو ہو سکتا تھا کہ پانی انھیں دور بہا لے جاتا۔

دریا کے عین بیچوں بیچ بڑے دھارے میں جہاں نہ تو کوئی شہتیر تھے اور نہ کوئی باڑ ان کی کشتی کسی وزنی چیز سے کھڑاک کی آواز کے ساتھ ٹکرائی۔ اس وقت انھیں محسوس ہوا کہ ان سے اوپر باڑ پر گارد کے سپاہی کسی چیز سے ہاتھاپائی میں ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ گارد جو مقامی تھے' تمام بیک وقت چلا رہے تھے۔ اندھیرے میں وہ ایک دوسرے کے اوپر گرے ہوئے تھے اور ناقابل فہم اور ٹوٹی پھوٹی آوازوں کا ایک مرکب سنائی دیتا تھا:

''تھامے رکھو' جانے نہ دینا۔
آؤ' بھائی یہاں
یہ میں ہوں''۔

ان آوازوں کے درمیان کوئی چیز یا انسانی جسم پانی میں ہاتھ پاؤں مارتا سنائی دیتا تھا۔ پلیویئرٹ کا آدمی چند لمحوں کے لیے گم سم ہو گیا کہ وہ کہاں ہے اور ہو کیا رہا ہے' لیکن جوں ہی اس کے ہوش بجا ہوئے' اس نے ایک لمبے ڈنڈے کے ساتھ جس کے سرے پر لوہے کی کھونٹی تھی' ان شہتیروں کو ایک طرف کیا جن سے اس کی کشتی ٹکرا کر رک گئی تھی اور کشتی کو اوپر کی جانب باڑوں کے نزدیک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ جلد ہی وہ شاہ بلوط کی گیلیوں کے چبوترے پر پہنچ گیا اور حوصلہ کر کے جتنا زور لگا سکتا تھا لگا کر چلایا:

''روشنی کرو' وہاں ایک مشعل جلاؤ' میری طرف رسہ پھینکو''۔

ابتدا میں کسی نے جواب نہ دیا' لیکن بہت چیخ پکار کے بعد جسے نہ تو کسی نے سنا اور نہ ہی اسے سمجھ سکا' ایک کمزور سی مشعل جو دھیمی دھیمی جل رہی تھی' اوپر کی طرف نظر آئی۔ روشنی کی پہلی چمک نے آنکھوں کو مزید دھوکے میں ڈال دیا۔ وہ اس طرح کہ آدمی' چیزیں اور ان کے سائے اور پانی پر سرخ عکس بے قرار چکر بن گئے' لیکن پھر ایک اور مشعل دوسرے ایک ہاتھ میں اٹھی۔ روشنی جب ٹھہر گئی' تو آدمی ایک دوسرے کے نزدیک آئے اور پہچاننے لگے' جلد ہی ہر چیز عیاں اور واضح ہو گئی۔

پلیویئرٹ کے آدمی کی کشتی اور باڑ کے درمیان صرف تین تختوں کا ایک ٹھاٹھ موجود تھا جس کے اگلے حصے پر ایک چپو تھا جو ایک حقیقی ٹھاٹھ ران کا چپو تھا جو صرف چھوٹا اور کمزور تھا۔ یہ ٹھاٹھ درخت کے چھال کے رسے سے باڑ کے نیچے ایک شہتیر سے باندھ دیا گیا تھا اور دریا کا تیز اور تند پانی جس کی موجیں ٹھاٹھ کے گرد سر ٹکراتی تھیں' اپنی پوری تندی اور طاقت کے باوجود اسے نیچے کی طرف بہا لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھیں۔ چبوترے پر گارد کے سپاہی اپنے لیڈر کو ٹھاٹھ عبور کرا کے اپنے پاس لانے میں مدد دے رہے تھے۔ سارے کے سارے سپاہیوں کے چہرے اترے ہوئے تھے اور وہ ہانپ رہے تھے۔ تختوں پر ایک عیسائی کسان لیٹا ہوا تھا جس کی چھاتی بڑی تیزی سے پھیل اور سکڑ رہی تھی اور اس کی آنکھوں کی سفیدی سے خوف اور دہشت کے آثار نمایاں تھے۔

گارد کے چار سپاہیوں میں سے بڑے نے اپنے مشتعل لیڈر کو بتایا کہ ہم چبوتروں کے مختلف مقامات پر پہرہ دے رہے تھے۔ جب ہم نے اندھیرے میں چپوؤں کی آواز سنی' تو ہم نے سوچا کہ یہ ہمارے لیڈر کی کشتی ہو گی' لیکن ہم نے ہوشیاری یہ کی کہ اپنے آپ کو ظاہر ہونے نہیں دیا' بلکہ

انتظار کیا کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ پھر ہم نے دو کسانوں کو دیکھا جو ستونوں تک آ پہنچے اور بڑی مشکل سے اپنی ٹھاٹھ کو ایک ستون سے باندھ دیا۔ پھر ہم نے انھیں اوپر چڑھ آنے دیا اور جب ہمارے درمیان پہنچے' تو ہم نے ان پر کلہاڑی سے حملہ کردیا اور ان پر قابو پا کر باندھ دیا۔ ان میں سے ایک کو جو کلہاڑی سے زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا' ہم نے آسانی سے باندھ دیا' لیکن دوسرا جس نے اپنے آپ کو نیم مردہ ظاہر کیا ہوا تھا' ہماری گرفت سے مچھلی کی طرح پھسل کر تختوں کے درمیان سے پانی میں چلا گیا۔

گارد کا خوفزدہ سپاہی اپنی کہانی بیان کرتے کرتے رک گیا اور پلیویر کا آدمی چلایا: "کس نے اسے جانے دیا؟ مجھے بتاؤ کس نے اسے جانے دیا' ورنہ میں تم سب کو ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا"۔

وہ آدمی خاموش کھڑا رہا اور جھلملاتی ہوئی لال روشنی میں آنکھیں جھپکاتا رہا' جبکہ ان کا لیڈر اردگرد یوں چکر کاٹتا رہا جیسے وہ اندھیرے کی تلاشی لے رہا ہو اور انھیں ایسی ایسی مغلظات سناتا رہا جو انھوں نے اس سے دن کے وقت کبھی بھی نہیں سنی تھیں۔ پھر یک لخت چل پڑا اور بندھے ہوئے کسان پر یوں جھک گیا جیسے وہ اس کا قیمتی ذخیرہ ہو اور اپنے دانتوں میں دبی پتلی رونے والی آواز میں کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا:

"اس کی تو حفاظت کرو' اس کی اچھی طرح حفاظت کرو حرام زادو! اگر اسے چھوڑ دیا تو تم میں سے کوئی بھی اپنے کندھوں پر سر برقرار نہیں رکھ سکے گا"۔

گارد کے سپاہی کسان کے گرد اکٹھے ہو گئے' اس کے بعد دوسرے کنارے سے دو اور سپاہی بھی آکر ان میں شامل ہو گئے۔ پلیویر کے آدمی نے انھیں حکم دیا کہ قیدی کو مضبوط طور پر باندھ دیا جائے' چنانچہ وہ اسے یوں اٹھا کر کنارے پر لے گئے جیسے کسی مردے کو آہستہ اور حفاظت سے لے جایا جاتا ہے۔ پلیویر کا آدمی ان کے ساتھ اس طرح گیا کہ اپنے قدموں پر نظر رکھنے کے بجائے سارا راستہ اس کی نظریں بندھے ہوئے آدمی پر گڑی رہیں۔ اسے یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر قدم کے ساتھ ساتھ اس کا سر اونچا ہو رہا تھا اور اس نے صرف اسی لمحے سے زندہ رہنا شروع کر دیا ہے۔

دریا کے کنارے مشعلوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا۔ قیدی کسان کو مزدوروں کی بارک میں لے جایا گیا' جہاں آگ جل رہی تھی اور پھر انگیٹھی سے رسیاں اور زنجیریں نکال کر اسے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ یہ کسان اونشٹے (Uniste) کا رہنے والا اریڈی ساف تھا۔

پلیویر کا آدمی قدرے پر سکون ہوا' اب نہ وہ چیخ رہا تھا اور نہ قسمیں کھا رہا تھا' لیکن وہ خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے گارد کے سپاہیوں کو دریا کے کنارے بھیجا تاکہ اس آدمی کو ڈھونڈیں جس نے دریا میں چھلانگ لگادی تھی۔ یہ بالکل صاف بات تھی کہ اگر وہ ڈوبا نہیں تو پھر اسے ڈھونڈنا یا پکڑنا ناممکن نہ ہوگا۔ سخت مشتعل حالت میں وہ حکم پر حکم صادر کرتا چلا جارہا تھا اور خود آنے اور آکر لوٹ جانے کے عمل میں مصروف تھا۔

اس نے بندھے ہوئے کسان سے پوچھ گچھ شروع کر دی' لیکن جلد ہی یہ کام بھی چھوڑ دیا۔ وہ زیادہ تر اپنی اعصابی بے چینی کو چھپانا اور اس پر قابو پانا چاہتا تھا' کیونکہ اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا' یعنی عابد آغا کا انتظار! چنانچہ اسے زیادہ دیر تک انتظار کی زحمت نہ اٹھانا پڑی۔

عابد آغا کی یہ عادت تھی کہ جونہی وہ نیند کا پہلا حصہ پورا کرلیتا' تو آدھی رات کے فوراً بعد جاگ اٹھتا اور پھر اسے نیند نہ آتی۔ وہ اپنی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر باہر اندھیرے میں دیکھتا رہتا۔ دن کے وقت وہ اپنی جانشین (بالکونی) سے بکاواک (Bikovae) اور دریا کی تمام وادی اور تمام تعمیراتی کاموں کو بارکوں' پن چکیوں' اصطبلوں اور ان کے اردگرد گری پڑی اور ملبے سے اَٹی جگہوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ اندھیرے میں' اب اسے ان کی موجودگی کا احساس ہوا اور یہ تلخ خیال اس کے ذہن میں گھوما کہ کام کی رفتار کس قدر آہستہ تھی اور کس طرح جلد یا بدیر یہ بات وزیر کے کان تک پہنچ جائے گی۔ کسی نے تو اسے دیکھنا ہے۔ اگر اور کوئی نہ ہوا تو بھی صاف اور ٹھنڈے دماغ والا مکار توسن آفندی تو ہے اور ہو سکتا ہے کہ میں (عابد آغا) وزیر کی نظروں میں گر جاؤں۔ یہ وہ چیز تھی جو اسے سونے نہیں دیتی تھی اور اگر وہ سو بھی جاتا تو بھی خواب میں لرز اٹھتا تھا' اسے اپنی خوراک زہر نظر آتی۔ آدمی نفرت انگیز اور اپنی زندگی کے متعلق جب بھی وہ سوچتا' اسے تاریک نظر آتی تھی۔

"بے عزتی! اس کا مطلب یہ ہے مجھے وزیر کی قربت سے محروم کردیا جائے گا اور میرے دشمن مجھ پر ہنسیں گے۔ (آہ! کاش کوئی اور بات ہو' مگر یہ نہ ہو) میں کچھ بھی نہیں رہوں گا اور میری حیثیت ایک چیتھڑے سے زیادہ نہ ہوگی جو

نہ صرف اوروں کی نظر میں بلکہ اپنی نظر میں بھی بیکار ہو گا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو گا کہ مجھے میری محنت سے کمائی ہوئی دولت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے یا اگر میں نے اسے کسی طرح پاس رکھنے کا انتظام کر لیا تو اسے خفیہ طور پر استنبول سے دور کسی گمنام اور بھولے بسرے، فالتو، مضحکہ خیز اور بدنصیب صوبے میں بھیجنا پڑے گا۔ نہیں اور کوئی چیز ہو سکتی ہے، مگر ایسا نہیں ہو گا۔ اس سے بہتر تو یہ ہو گا کہ نہ سورج کو دیکھوں اور نہ سانس لوں۔ یہ سوگنا اچھا ہو گا، اگر میں کچھ بھی نہ ہوں اور میرے پاس کچھ بھی نہ ہو۔

یہ وہ خیال تھا جو دن میں کئی مرتبہ آ آ کر اس کے خون کو مجبور کر دیا کرتا تھا کہ اس کی کھوپڑی اور کنپٹی میں زور زور سے حرکت کرے جس سے اسے درد محسوس ہو، لیکن باقی وقت بھی وہ اس خیال سے مکمل طور پر چھٹکارا حاصل نہ کر سکا، بلکہ اس خیال نے اس کے اندر ایک سیاہ بادل کی طرح ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ یہ تھی وہ صورت جو بے عزتی سے پیدا ہو سکتی تھی اور بے عزتی ہر روز کیا بلکہ ہر گھنٹے ممکن تھی، کیونکہ ہر آدمی کوشش کر رہا تھا کہ بے عزتی سے اس کا سر منڈھ جائے۔ صرف وہ خود واحد شخص تھا جو اس کے خلاف کام کر رہا تھا اور اپنا دفاع کر رہا تھا۔ دراصل یہ ایک واحد آدمی تھا جو ہر آدمی اور ہر چیز کے خلاف تھا، وہ سوچتا تھا:

"پندرہ برس کے اس طویل عرصے میں وزیر نے اسے یہی پہلا اور بڑا اور اہم کام سپرد کیا ہے، اسے کون برداشت کر سکتا ہے؟ کون بھلا آرام اور سکون کی نیند سو سکے گا؟"

اگرچہ موسم خزاں کی نمناک اور ٹھنڈی رات تھی، پھر بھی عابد آغا نے کھڑکی کھولی اور اندھیرے میں دیکھنے لگا، کیونکہ اسے بند کمرے میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسی دوران اس نے دیکھا کہ پاڑوں اور دریا کے کناروں پر روشنی کے ساتھ ساتھ آدمیوں کی حرکت بھی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ بہت سے آدمی اکٹھے ہو رہے تھے، تو اس نے سوچا ضرور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے، چنانچہ اس نے کپڑے پہنے، نوکر کو جگایا اور خود روشنی والے اصطبل میں اس وقت جا پہنچا جب پلیولیرؔ کا آدمی یہ جاننے سے قاصر تھا کہ ب اور کس طرح بے عزتی کرے، کسے حکم دے اور وقت کو کم کرنے کے لیے کیا کرے۔

عابد آغا کی غیر متوقع آمد سے وہ بری طرح بوکھلا گیا، وہ س لمحے کا کتنا متمنی تھا، لیکن اب جب کہ یہ لمحہ سر پر آ گیا، تو وہ بجھ نہیں سکتا تھا کہ کس طرح اس سے اپنی امید کے مطابق فائدہ اٹھائے۔ جوش میں آ کر اس نے ہکلانا شروع کر دیا اور بندھے ہوئے کسان کو بھول گیا۔ عابد آغا نے اسے بے اعتنائی سے دیکھا اور پھر سیدھا قیدی کے پاس چلا گیا۔ اصطبل میں ایک بڑی آگ جل رہی تھی جس میں گارد کے سپاہی مزید لکڑیاں ڈال دیتے تھے اور اس طرح اصطبل کا ہر کنارہ روشن نظر آتا تھا۔

اپنے لمبے قد کی وجہ سے عابد آغا قیدی پر کھڑا جھک کر دیکھتا رہا۔ وہ خاموشی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ ہر آدمی اس انتظار میں تھا کہ وہ کچھ بولے، جب کہ وہ اپنے دل میں سوچ رہا تھا:

"یہ ہے وہ آدمی جس کے خلاف مجھے پلیولیرؔ کے اس بدبخت نیم پاگل غدار سے اور رعایا کی اس ناقابل فہم اور ضدی جوں سے جنگ لڑنا پڑی"۔ پھر اس نے اپنے آپ کو حرکت دی اور احکام صادر کرنے کے ساتھ ساتھ قیدی سے پوچھ گچھ شروع کی۔

اصطبل گارد کے سپاہیوں سے بھر گیا اور باہر جاگے ہوئے اوورسیئر اور مزدوروں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ عابد آغا نے اپنے سوالات پلیولیرؔ کے آدمی کے ذریعے کیے:

ریڈی ساف نے پہلے کہا کہ وہ اور ایک اور آدمی نے بھاگ جانے کا فیصلہ کیا تھا اور انھوں نے اس مقصد کے لیے ایک چھوٹا ٹھاٹھ تیار کیا تھا اور دریا کے نیچے کی جانب چل پڑے تھے۔

جب انھوں نے اس بیان کی بے ہودگی کی طرف اشارہ کیا کہ اندھیرے میں دریا کے نیچے کی جانب تند و تیز دریا میں جو بھنوروں، چٹانوں اور دیگر خطرات سے بھرا پڑا ہے، سفر کرنا ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ جو لوگ بھاگ جانا چاہتے ہوں، وہ پاڑ پر نہیں چڑھتے اور نہ تعمیر کو نقصان پہنچاتے ہیں، تو وہ خاموش ہو گیا اور ناراضگی سے بڑبڑایا:

"اچھا میں تمھارے ہاتھوں میں ہوں، جو جی میں آئے کرو"۔

"آپ کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں"۔ عابد آغا نے فوراً جواب دیا۔

گارد والوں نے زنجیریں ہٹالیں اور کسان کو چوتڑوں تک ننگا کر دیا۔ انھوں نے زنجیریں آگ کے بیچ میں ڈال دیں اور انتظار کر رہے تھے، چونکہ زنجیریں دھوئیں سے سیاہ ہوئی ہوئی تھیں اور ان کے ہاتھ بھی سیاہ ہوئے ہوئے تھے، چنانچہ دھوئیں کے سیاہ سیاہ دھبے ان کے ہاتھوں پر اور کسان کے ننگے جسم پر پڑ گئے۔ جب زنجیریں بالکل سرخ ہو گئیں تو

مرجان (Merdjan) خانہ بدوش آیا اور ان کا ایک سرا ایک لمبے چمٹے سے پکڑا' جب کہ دوسرا سرا گارد کے ایک سپاہی نے تھاما۔

پلیویرٹ کے آدمی نے عابد آغا کے الفاظ کو یوں ترجمہ کیا:
"شاید اب تم تمام حقیقت بتادو گے"۔

"میرے پاس آپ کو بتانے کے لیے کیا ہے؟ آپ کو ہر بات معلوم ہے اور آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں"۔

دونوں آدمی زنجیریں اٹھالائے اور کسان کی بالوں والی چوڑی چھاتی کے گرد لپیٹ دیں' جلتے ہوئے بالوں نے سوں سوں شروع کردی۔ اس کا منہ اینٹھا' گردن کی رگیں پھول گئیں' اس کی پسلیاں جیسے باہر کو نکل آئی ہوں اور اس کے پیٹ کے پٹھوں نے یوں سکڑنا اور پھیلنا شروع کیا' جیسے قے کرتے وقت آدمی کا پیٹ پھیلتا اور سکڑتا ہے۔ درد سے وہ کراہ اٹھا۔ جن رسوں سے وہ بندھا ہوا تھا' تن گئے۔ وہ پیچ و تاب کھا کر اپنے بدن کو گرم سرخ لوہے سے بچانے کی بے کار کوشش کر رہا تھا' اس کی آنکھیں بند تھیں اور آنسو نکل کر چہرے پر بہہ رہے تھے۔ انھوں نے زنجیر ہٹالی۔

"یہ صرف ابتدا ہے' کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ اس کے بغیر آپ بات کریں"۔

کسان نے صرف ناک تک گہرا سانس لیا اور خاموش رہا۔

"تمھارے ساتھ کون تھا؟"

"اس کا نام جووان (Jovan) ہے' لیکن مجھے نہ اس کے گھر کا اور نہ گاؤں کا پتا ہے"۔

زنجیریں دوبارہ آگئیں اور بال اور جسم جل کر آواز دینے لگے۔ دھوئیں سے کھانستے ہوئے اور درد سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کسان نے جھٹکوں سے بولنا شروع کیا:

صرف یہی دو آدمیوں نے اس بات کا متفقہ فیصلہ کیا تھا کہ پُل کے کام کو تباہ کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اسے کیا جانا چاہیے اور انھوں نے اسے کردیا اور کسی فرد کو بھی اس کی خبر نہ تھی اور نہ ہی اس میں کسی نے حصہ لیا تھا۔ شروع میں وہ کناروں سے مختلف سمتوں کو روانہ ہو جاتے تھے اور بہت کامیاب تھے' لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ وہاں کے پاڑوں کے اوپر اور دریا کے کناروں کے ساتھ ساتھ گارد کے سپاہی موجود تھے' تو انھوں نے تین تختے اکٹھے باندھ کر ٹھاٹھہ بنانے کی ترکیب سوچی اور اس طرح تعمیرات تک رسائی بغیر کسی رکاوٹ کے دریا میں سے ہوتی رہی۔ یہ تین دن پہلے کا واقعہ ہے۔ پہلی رات وہ قریب قریب پکڑے گئے تھے' مگر وہ بچ نکلے۔ دوسری رات وہ بالکل باہر نہیں گئے۔ جب انھوں نے دوبارہ ٹھاٹھہ کے ذریعے اس رات کوشش کی' تو وہی کچھ ہوا جو ہو چکا ہے"۔

"پس یہ ہے وہ کہانی کہ کیا کچھ تھا اور کیا کچھ ہم نے کیا۔ اب جو کچھ آپ چاہتے ہیں کریں"۔

"نہیں' نہیں' یہ وہ نہیں ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ بتاؤ کہ تم کو کس نے ایسا کرنے کو کہا ہے؟ جو کچھ اذیت تمھیں اب تک پہنچی ہے' وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو تمھیں بعد میں پہنچے گی"۔

"اچھا کرو' جو تمھارا جی چاہتا ہے"۔

اب مرجان ایک زنبور لے کر قریب آیا اور بندھے ہوئے آدمی کے سامنے جھک کر اس کے ننگے پاؤں سے ناخن اکھیڑنے لگا۔ کسان خاموش رہا اور اپنے دانت بھینچتا تھا' مگر بندھا ہونے کے باوجود ایک خاص قسم کے لرزے سے کمر تک اس کا سارا وجود ہل جاتا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ درد کس شدید نوعیت کا ہوگا۔ چند لمحوں بعد کسان نے اپنے بھینچے ہوئے دانتوں سے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ بمشکل نکالے۔ پلیویرٹ کا آدمی جو کسان کے ہر لفظ کا انتظار کرتا تھا اور سرگرمی سے کسی قسم کی اجازت کا منتظر تھا' جپسی (خانہ بدوش) کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا' اور فوراً پوچھا:

"کیا بات ہے؟ کیا کہا تم نے؟"

"کچھ نہیں' میں نے صرف یہ کہا ہے کہ خدا کے لیے کیوں آپ مجھے اذیتیں پہنچا کر اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں؟"

"ہمیں بتاؤ' کس نے تم سے یہ کام کروایا؟"

"مجھ سے کس نے کروایا؟ کہوں' شیطان نے"۔

"شیطان نے"۔

"ہاں شیطان نے' یقیناً اسی شیطان نے جس نے آپ لوگوں کو یہاں آکر پُل تعمیر کرنے پر آمادہ کیا"۔ کسان نرمی سے بولا' مگر صاف اور فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"شیطان!" ایک عجیب لفظ' جو اتنی تلخی سے اتنے غیر معمولی موقع پر کہا گیا۔

"شیطان! شیطان' یقیناً اس خیال میں کہیں ہے" پلیویرٹ کے آدمی نے کہا جو اپنا سر جھکائے کھڑا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے بندھے ہوئے قیدی نے اس سے پوچھ گچھ شروع کر رکھی ہو' نہ کہ یہ بندھے ہوئے آدمی سے سوال کر رہا ہے۔ یہ الفاظ اس کے دماغ اور دل کے حساس ترین حصے

ٹکرائے اور یک لخت اس کے اندر تمام خوف اور پریشانیاں اپنے پورے بانکپن اور قوت سے جاگ اٹھیں اور یوں محسوس ہونے لگا' جیسے وہ مجرم کی گرفتاری پر بھی دور نہیں ہوئیں۔ شاید عابد آغا سمیت یہ سب کچھ اور بذات خود پُل کی تعمیر اور پاگل کسان' شیطان کا ہی کام تھا۔ شیطان! شاید وہ اکیلا ہی تھا جو شیطان سے ڈرتا تھا۔

پلیویلرٹ کا آدمی کانپ گیا اور اپنے آپ کو جھٹکا دیا۔ اسی لمحے عابد آغا کی اونچی اور غصہ سے بھری ہوئی آواز اسے اپنے آپ میں لے آئی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ بیکار انسان' کیا تم سو رہے ہو؟" عابد آغا نے دھاڑ کر کہا۔

خانہ بدوش ہاتھ میں زنبور پکڑے اب بھی جھکا ہوا' مگر سہما ہوا اور دبکا ہوا اوپر کی طرف اپنی چمک دار آنکھوں سے قد آور عابد آغا کو دیکھ رہا تھا۔ گارڈ کے سپاہیوں نے گرجتی ہوئی آگ کو اکٹھا کیا اور یوں ساری جگہ روشن ہو گئی۔ گو یہ بھٹی کے مانند تھی' لیکن کسی طور سنجیدہ تھی۔ اس شام جو عمارت مغموم اور عام نظر آ رہی تھی' وہ یک لخت تبدیل ہو کر بڑی اور کھلی ہو گئی تھی۔ اصطبل میں اور اس کے اردگرد ایک قسم کے سنجیدہ جذبات اور خاص خاموشی کی فضا تھی' جیسا کہ ایسی جگہوں میں ہوا کرتا ہے' جہاں سچ اگلوایا جاتا ہے' جہاں ایک زندہ انسان کو اذیتیں دی جاتی ہیں یا جہاں فیصلہ کن چیزیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

عابد آغا' پلیویلرٹ کے آدمی اور بندھے ہوئے آدمی کی حرکات اور بات چیت ایکٹروں کی طرح تھیں اور باقی سب آنکھیں نیچی کیے ہوئے پنجوں کے بل چلتے تھے اور مجبوراً اگر کوئی بات کرنا ہوتی تھی' تو وہ صرف سرگوشی کرتے تھے۔ ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ وہ کہیں اور ہوتا اور اس جگہ یہ کام نہ کر رہا ہوتا' لیکن چونکہ یہ ممکن نہ تھا' اس لیے ان سب نے گفتگو دھیمی آواز میں کی اور حرکت بھی اتنی کم کرتے تھے جتنی ممکن ہو' تاکہ وہ اپنے آپ کو اس مقام سے اتنا دور محسوس کر سکیں جتنا ممکن ہو؟

مرجان نے ہر چیز تیار رکھی تھی اور ڈھنڈورچی نے قصبے کے ہر حصے میں منادی کرنی تھی تاکہ دوپہر کے وقت تمام لوگ یہ دیکھ سکیں کہ ایسے لوگوں کا کیا حشر ہوا جو پُل کی تعمیر کے کام کو روکتے تھے۔ اس منظر کو دیکھنے کے لیے آبادی کے تمام مردوں کو (ترک اور رعایا دونوں) بچوں سے لے کر بوڑھے آدمیوں تک دریا کے اس پار یا اس پار جمع ہو جانا چاہیے۔

شروع ہونے والا دن اتوار تھا' اتوار کے روز کام اسی طرح جاری رہتا تھا جس طرح کسی اور دن لیکن اس روز اوور سیئر بھی کام کو توجہ نہیں دے رہے تھے۔ جوں ہی دن کافی چڑھ آیا' تو مجرم کی گرفتاری کی خبر پھیل گئی اور اس کے ساتھ ہی جو اذیتیں دی گئی تھیں اور اب دی جانے والی سزائے موت کی خبر بھی لوگوں نے سنی۔ اصطبل والا خاموشی اور سنجیدگی کا سماں تعمیراتی کاموں کے اردگرد سب علاقے پر طاری ہو گیا۔ بیگار میں پکڑے ہوئے مزدور خاموشی سے کام کرتے رہے اور ان میں سے ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ وہ اپنے ساتھ والے کی آنکھ سے آنکھ نہ ملائے۔ ہر آدمی اپنے سامنے کام کو یوں دیکھتا تھا جیسے وہ اس کی دنیا کی ابتدا اور انتہا ہوں۔

دوپہر سے ایک گھنٹہ قبل قصبے کے لوگ' زیادہ تر ترک' پُل کے پاس ایک ہموار جگہ پر جمع ہو گئے تھے۔ بچوں کو تعمیراتی پتھروں پر بٹھا دیا گیا جو پاس ہی تھے۔ مزدور' تنگ بنچوں کے گرد جمع ہوئے' جہاں کم مقدار میں انھیں زندہ رکھنے کے لیے خوراک عموماً تقسیم کی جاتی تھی۔ خاموشی سے خوراک چباتے ہوئے وہ انھیں بے قراری سے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد عابد آغا بمعہ توسن آفندی' ماسٹر اینٹونیو اور ایک یا دو ممتاز ترکوں کے نمودار ہوا۔ یہ تمام ایک چھوٹے خشک ٹیلے پر کھڑے ہو گئے جو پُل اور اصطبل کے درمیان تھا جہاں سزائے موت پانے والا قیدی تھا۔

عابد آغا ایک مرتبہ اور اصطبل میں گیا' جہاں اسے بتایا گیا کہ ہر چیز تیار ہے۔ وہاں شاہ بلوط کی کوئی آٹھ فٹ لمبی نوک دار بلی پڑی ہوئی تھی۔ اس کی نوک پر پتلا مگر تیز لوہا چڑھا ہوا تھا اور جس پر اچھی طرح چربی مل کر چکنا کر دی گئی تھی۔ پاڑ کے اوپر بلاک تھے جن میں بلی کو رکھ کر میخیں گاڑ دینی تھیں۔ ایک لکڑی کا ہتھوڑا تھا جو آدمی کو پرونے کے لیے تھا' رسے اور باقی سب چیزیں جو ضروری تھیں۔

پلیویلرٹ کا آدمی گھبرایا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ مٹی کے رنگ کا ہو گیا تھا اور اب بھی وہ عابد آغا کی شعلہ بار نظریں برداشت نہیں کر سکتا تھا:

"سنو تم! اگر ہر کام تسلی بخش طریقے پر نہ ہوا اور اگر تم نے مجھے لوگوں میں بے عزت کیا' تو نہ تم اور نہ تمہارا حرام زادہ خانہ بدوش دوبارہ کبھی میرے سامنے آ سکے گا' کیونکہ میں تم دونوں کو دریا میں کتے کے دو اندھے پلوں کی طرح ڈبو دوں گا"۔

پھر لرزتے ہوئے خانہ بدوش کی طرف مڑ کر بڑی مہربانی سے کہا:

"تمھیں اس کام کے لیے چھ گردش ملیں گے اور چھ گردش اس کے علاوہ بھی ملیں گے۔ اگر وہ رات ہونے تک زندہ رہے' خیال رکھنا!"

موذن نے مارکیٹ کی بڑی مسجد سے تیز اور صاف آواز میں اذان دی۔ جمع ہوئے لوگوں میں بے چینی پھیلی اور چند لمحے بعد اصطبل کا دروازہ کھلا۔ گارد کے دس سپاہی دو قطاروں میں تیار کیے گئے۔ ہر قطار میں پانچ پانچ سپاہی تھے۔ ان کے درمیان ریڈی ساف تھا جو پاؤں سے اور سر سے ننگا تھا' مگر چوکس اور ہمیشہ کی طرح دہرا ہوا ہوا' لیکن اب وہ پاؤں گھسیٹ کر نہیں' بلکہ عجیب طریقے پر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا چل رہا تھا۔ اپنے زخمی پاؤں کے ساتھ جن میں ناخنوں کی جگہ اب خون رستے سوراخ تھے' وہ یوں چلتا تھا جیسے رسی پھلانگ رہا ہو' اپنے کندھوں پر وہ ایک سفید لمبی اور تیز بلی اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کے پیچھے مرجان تھا جس کے ہمراہ دو اور خانہ بدوش بھی سزا دینے کے سلسلے میں اس کی امداد کے لیے تھے۔ اچانک کہیں سے پلیولیرؒ کا آدمی بھی آ پہنچا اور جلوس کی قیادت سنبھال لی جس نے قریباً سو قدم جا کر پہلے پاڑ پر پہنچنا تھا۔

لوگ گردنیں نکال کر پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے تا کہ اس آدمی کو دیکھیں جس نے یہ منصوبہ بنایا تھا اور تعمیراتی کام کیا تھا۔ وہ سب اس کی گھٹیا اور مصیبت زدہ شکل دیکھ کر حیران رہ گئے' کیونکہ جو کچھ اپنے ذہنوں میں انھوں نے اس کے متعلق نقشہ قائم کیا' یہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ قدرتی طور پر کسی کو بھی یہ خبر نہ تھی کہ وہ کیوں اس بھدے طور پر اچھل اچھل کر اور بلا سوچے سمجھے چھوٹے چھوٹے قدموں پر چل رہا ہے۔ اسی طرح ان میں کوئی بھی اس کی چھاتی پر زنجیروں سے جلنے کے وہ داغ نہ دیکھ سکا جو بڑی پٹیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے' مگر انھیں اس کی قمیص اور جبے نے چھپا رکھا تھا۔ اس لیے وہ ان تمام لوگوں کو بالکل بدھو اور غیر اہم لگا جس نے یہ کارنامہ کیا ہو اور جسے سزائے موت کے لیے لائے ہوں۔ صرف لمبی سفید بلی نے اس دہشت ناک منظر کو شان بخشی جس پر سب کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔

جب وہ دریا کے کنارے اس مقام پر پہنچے' جہاں کھدائی کا کام شروع ہوا تھا تو پلیولیرؒ کا آدمی گھوڑے سے اترا اور ایک قسم کے سنجیدہ اور ڈرامائی طریقے پر بائیں سائیس کو تھما دیں اور خود دوسروں سمیت گہرے کیچڑ والے راستے میں غائب ہو گیا جو نیچے پانی کے کنارے پر جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لوگوں نے انھیں دوبارہ اسی ترتیب سے چبوترے پر آتے دیکھا جو آہستہ آہستہ اور احتیاط سے اوپر چڑھ رہے تھے۔ تختوں اور شہتیروں کے بنے ہوئے تنگ راستوں پر گارد کے سپاہی ریڈ ساف کو اپنے قریب تنگ گھیرے میں رکھتے تھے تا کہ وہ دریا میں چھلانگ نہ لگا دے۔ وہ آہستہ آہستہ راستہ طے کرتے گئے اور اوپر ہی اوپر چڑھتے گئے' حتیٰ کہ وہ چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہاں پانی کی سطح سے بہت بلند ایک چھوٹے کمرے جتنی جگہ تھی جو تختوں کی بنی ہوئی تھی۔ یہاں انھوں نے اپنی اپنی جگہیں یوں سنبھال لیں جس طرح کسی اسٹیج پر فنکار سنبھالتے ہیں۔ یہ تھے ریڈی ساف اور پلیولیرؒ کا آدمی' تین خانہ بدوش اور گارد کے باقی ماندہ سپاہی جو ان کے ارد گرد ڈیوٹی پر کھڑے تھے۔ تماشائیوں نے گھبراہٹ سے تھوڑی بہت حرکت کی اور اپنی اپنی جگہیں تبدیل کیں۔ تختوں سے انھیں صرف سو قدم کا فاصلہ جدا کیے ہوئے تھا اور وہ ہر آدمی کو اور ہر حرکت کو دیکھ سکتے تھے' مگر الفاظ نہ سن سکتے تھے اور نہ تفصیل میں امتیاز کر سکتے تھے۔ بائیں کنارے پر لوگ بصورت تماشائی ارد گرد گھوم کر اپنے لیے بہتر جگہ تلاش کر رہے تھے تا کہ وہ اچھی طرح دیکھ اور سن سکیں' لیکن یہ کچھ بھی نہ سن سکے' وہ پہلے پہل بہت ہی معمولی اور بے لطف سا معلوم ہوا' مگر آخر میں اتنا خوفناک ہو گیا کہ انھوں نے اپنے منہ موڑ لیے اور بہت سے تماشائی فوراً گھر واپس چلے گئے اور اپنے یہاں آنے پر اپنے آپ کو کوستے رہے۔

جب انھوں نے ریڈی ساف کو لیٹ جانے کا حکم دیا' تو اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر خانہ بدوشوں اور گارد کے سپاہیوں سے ہٹ کر یوں نظر ڈالی' جیسے وہ وہاں موجود نہیں تھے اور پلیولیرؒ کے آدمی کے قریب ہو کر یوں رازدارانہ طور پر بات کی' جیسے وہ کسی دوست سے بات کر رہا تھا۔ اس نے نرم اور بھاری آواز میں کہا:

"سنو! اس دنیا سے اگلی دنیا تک پوری کوشش کر کے مجھے چھیدنا تا کہ میں ایک کتے کی طرح تکلیف نہ جھیلوں"۔

پلیولیرؒ کا آدمی اس پر چلایا' گویا وہ اس نہایت دوستانہ درخواست کے خلاف اپنی مدافعت کر رہا ہو۔

MarchVlack تم نے جو سلطان کے کام کو تباہ کر کے ہیرو کا کردار ادا کیا ہے' اب عورت کی طرح رحم کی درخواست کرتے ہو۔ اب وہی کچھ ہو گا' جس کا حکم دیا گیا ہے

اور جس کے تم مستحق ہو۔

ریڈی ساف نے اپنا سر اور بھی جھکا دیا اور خانہ بدوشوں نے اس کی قمیص اور جبہ اتارنا شروع کر دیا۔ اس کی چھاتی پر زنجیروں کے زخم صاف دکھائی دینے لگے جو سرخ اور متورم تھے' بغیر کسی اور لفظ کے کسان اسی طرح منہ نیچے کی طرف کر کے لیٹ گیا جس طرح اسے حکم ملا تھا۔ خانہ بدوش نزدیک ہوئے اور پہلے نے اس کے ہاتھ اس کی کمر پر باندھ دیے۔ پھر انھوں نے اس کی ہر ٹانگ کے ٹخنوں کے گرد رسی باندھی اور ٹانگوں کو ایک دوسری سے علیحدہ باہر کی جانب یہاں تک کھینچا کہ وہ بالکل تن گیا اور ٹانگیں پھیل گئیں۔

اسی دوران مرجان نے بلی کو لکڑی کے دو چھوٹے ٹکڑوں پر اس طرح رکھا کہ اس کی نوک کا رخ کسان کی ٹانگوں کے عین درمیان تھا۔ پھر اس نے اپنی پیٹی سے ایک چھوٹا چوڑا چاقو نکالا۔ وہ پھیلے ہوئے آدمی کے نزدیک دو زانو ہوا اور اس کے اوپر بیٹھ کر اس کا پاجامہ پھاڑ دیا اور وہ سوراخ چوڑا کیا جس میں سے بلی نے اس کے جسم کے اندر داخل ہونا تھا۔ خوش قسمتی سے اس خونیں ڈرامے کا یہ سب سے خوفناک پارٹ تماشائیوں کی نظر سے اوجھل تھا' وہ صرف بندھے ہوئے جسم کو چاقو کی غیر متوقع کاٹ سے لرزتا دیکھ سکتے تھے جو آدھا اونچا ہو جاتا تھا۔ جونہی یہ کام مکمل ہوا' خانہ بدوش نے چھلانگ لگائی' لکڑی کا ہتھوڑا سنبھالا اور آہستہ آہستہ نپی تلی ضربوں سے بلی کے دوسرے سرے کو ٹھونکنا شروع کر دیا۔ دو وار کر کے وہ کچھ دیر کے لیے رک جاتا تھا اور پہلے جسم کو دیکھتا تھا جس کے اندر بلی داخل ہو رہی تھی اور پھر ان دو خانہ بدوشوں کی طرف دیکھتا جس کا مطلب انھیں کسان کو آہستہ اور یکساں طور پر کھینچنے کی یاد دہانی کرانا ہوتا تھا۔ کسان کا جسم چوڑا ہو ہو جاتا اور درد کی شدت سے پیچ و تاب کھاتا۔ ہتھوڑے کے ہر وار سے اس کی ریڑھ بل کھاتی اور جھک جاتی' لیکن رسیاں اسے کھینچ کر سیدھا رکھتیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر اس قدر خاموشی تھی کہ نہ صرف ہر ایک وار کی آواز بلکہ اس کی گونج بھی صاف سنی جا سکتی تھی جو گہرے کنارے کے ساتھ کہیں پیدا ہوتی تھی۔ جو لوگ قریب تھے' وہ سن سکتے تھے کہ کس طرح کسان اپنا ماتھا تختوں پر پٹخ رہا تھا اور اس سے بھی زیادہ ایک اور غیر معمولی آواز سنائی دیتی تھی جو نہ تو چیخ تھی' نہ فریاد' نہ کراہنے کی صدا نہ کوئی ایسی چیز جو انسانی ہو۔ یہ پھیلتے اور بل کھاتے جسم سے نکلنے والی چرچراہٹ اور تڑپنے کی آواز تھی جو اس طرح آ رہی تھی جیسے کوئی جنگلا توڑا جا رہا ہو یا کوئی درخت گرایا جا رہا ہو۔ ہر دوسری ضرب پر خانہ بدوش پھیلے ہوئے جسم کی طرف جاتا اور اس کے اوپر جھک کر دیکھتا کہ کیا بلی صحیح سمت میں جا رہی تھی اور جب وہ تسلی کر لیتا کہ یہ اہم اندرونی اعضاء سے نہیں ٹکرا رہی تو وہ واپس ہو کر اپنا ٹھکائی کا کام دوبارہ شروع کر دیتا۔

کناروں پر تماشائیوں کو یہ سب کچھ سنائی نہیں دیتا' چہ جائیکہ وہ سب کچھ عمل دیکھ سکیں' لیکن سب کھڑے کانپ رہے تھے۔ ان کے چہرے خوف سے سفید پڑ گئے تھے اور انگلیاں سردی سے بے حس ہو گئی تھیں۔

کچھ دیر کے لیے ہتھوڑا چلنا بند ہو گیا۔ مرجان نے دیکھا کہ اب داہنے کندھے کے پاس پٹھے اور چمڑہ تن کر سوج گئے ہیں۔ وہ فوراً لپکا اور سوجی ہوئی جگہ کو دو صلیبی نشانوں کی صورت کاٹ دیا۔ پھیکے رنگ کا زردی مائل خون ابل پڑا۔ پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیز تیز۔ مزید دو تین ہلکی اور محتاط ضربیں لگانے سے بلی کے لوہا چڑھے ہوئے تیز نوک دار سرے نے اس جگہ سے سر نکالنا شروع کیا جو کاٹ دی گئی تھی۔ اس نے چند مرتبہ اور ٹھونکا اور بلی کا سرا کندھے کے بیچ میں سے نکل کر دائیں کان کے برابر پہنچ گیا۔

کسان کو بلی میں اس طرح پرو دیا گیا جس طرح ایک بھیڑ کے بچے کو بھوننے کے لیے پرو دیا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہوا کہ بلی منہ کے راستے نکلنے کے بجائے پیٹھ کے راستے نکلی اور اس طرح انتڑیاں شدید طور پر زخمی ہونے سے بچ گئیں اور دل اور پھیپھڑے بھی بالکل محفوظ رہے۔ اب مرجان نے لکڑی کا ہتھوڑا نیچے پھینک دیا اور قریب آ گیا۔ اس نے بے حرکت جسم کا جائزہ لیا اور اس عمل کے دوران اس خون سے اپنے آپ کو بچاتا رہا جو بلی کے اندر داخل ہونے اور خارج ہونے والے دونوں مقامات سے بہتا ہوا نیچے تختوں پر چھوٹے چھوٹے تالاب بنا رہا تھا۔ دونوں خانہ بدوشوں نے اکڑے ہوئے جسم کو پیٹھ کے بل لٹایا اور ٹانگوں کو بلی کے سرے سے باندھنا شروع کر دیا۔

اسی دوران مرجان نے کسان کا معائنہ کیا تاکہ دیکھے کہ واقعی وہ ابھی تک زندہ تھا۔ اس نے کسان کے چہرے کا بغور معائنہ کیا جو اچانک سوج گیا تھا اور ساتھ ہی چوڑا اور بڑا بھی ہو گیا تھا' آنکھیں صاف اور کھلی اور بے چین تھیں' لیکن آنکھوں کے پپوٹے بے حرکت تھے۔ منہ پورا کھلا تھا' لیکن دونوں ہونٹ سخت اور سکڑے ہوئے تھے اور ان کے

درمیان بھنچے ہوئے سفید دانت چمک رہے تھے۔ چونکہ کسان کا اب اپنے چہرے کے کچھ پٹھوں پر قابو نہیں رہا تھا' اس لیے اس کا چہرہ ایسا لگتا تھا جیسا کوئی نقاب لگا رکھا ہو۔ دل گرانی سے حرکت کر رہا تھا اور اس کے پھیپھڑے تیزی سے مگر رک رک کر سانس لیتے تھے۔ دونوں خانہ بدوشوں نے اسے یوں اٹھانا شروع کیا جس طرح کسی بھیڑ کو الاؤ پر بھوننے کے لیے۔ مرجان نے چلا کر انھیں ہدایت دی کہ احتیاط برتیں اور اس کے جسم کو جھٹکا نہ دیں۔ یہ کہہ کر وہ خود بھی اس سلسلے میں ان کی مدد کرنے کو آگے بڑھ آئے۔ پھر انھوں نے بلی کا نچلا موٹا سرا دو بیموں میں دے کر اسے بہت بڑی بڑی میخوں سے نصب کر دیا اور پھر اسی بلندی پر تمام چیزوں کو ایک چھوٹی آڑواڑ کا سہارا دے کر اسے میخ کے ذریعے بلی اور چبوترے کے ایک تختے سے ملا دیا۔

جب یہ بھی ہو چکا تو خانہ بدوش نیچے اتر آئے اور گارد کے سپاہیوں میں شامل ہو گئے اور اس کھلی جگہ پورا آٹھ فٹ اوپر کو اٹھا ہوا اور بلی میں پرویا ہوا آدمی کا اکیلا اکڑا ہوا اور کمر تک ننگا جسم رہ گیا۔ دور سے صرف یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بلی جس کے ساتھ اس کی ٹانگیں ٹخنوں سے بندھی ہوئی تھیں' اس کے جسم کے عین وسط میں سے گزری تھی' چنانچہ لوگ اسے ایک بت کے طور پر دیکھتے تھے جو دریا سے بہت اونچا چبوترے کے کنارے ہوا میں بلند ہوا تھا۔

دریا کے کناروں پر تماش بینوں کے درمیان بڑبڑاہٹ اور حرکت کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ بعض لوگوں نے تو اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اور دوسرے پیٹھ موڑ کر فوراً گھر چلے گئے' لیکن اکثر اس انسان نما چیز کو جو غیر فطری طور پر اکڑی ہوئی خلا میں سیدھی کھڑی تھی گونگوں کی طرح دیکھتے رہے۔ خوف اور دہشت سے ان کی انتڑیاں سرد ہو گئیں اور ٹانگیں جواب دینے لگیں' لیکن پھر بھی وہ نہ وہاں سے ہل سکے اور نہ ان کی آنکھیں اس منظر سے ہٹ سکیں اور اس دہشت زدہ مجمع کے درمیان النکا (llinka) گھوم پھر رہی تھی اور ہر آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی اور ان کی نظروں کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ ان سے معلوم کرے کہ اس کے شہید بچے کہاں دفن ہیں۔

پھر پلیویئر کا آدمی' مرجان اور گارد کے دو سپاہی اوپر پروئے ہوئے آدمی کے پاس گئے اور بہت قریب سے اس کا معائنہ کرنے لگے۔ خون کی فقط ایک پتلی سی لکیر بلی سے نیچے بہہ رہی تھی۔ وہ زندہ تھا اور ہوش میں تھا' اس کی پسلیاں اوپر نیچے حرکت کر رہی تھی۔ گردن کی رگوں میں خون گردش کر رہا تھا اور اس کی آنکھیں آہستہ مگر متواتر گھوم رہی تھیں۔ بھنچے ہوئے دانتوں کے بیچ میں سے کراہنے کی ایک لمبی سی آواز سنائی دی جس میں چند الفاظ بڑی مشکل سے چلے پڑ سکے۔

"ترک .... ترک....." بلی پر پروئے ہوئے آدمی نے کراہتے ہوئے کہا:

"ترک پُل پر.... خدا کرے تم کتوں کی موت مرو.... کتوں کی طرح"۔

خانہ بدوشوں نے اپنے اوزار اٹھا لیے اور پھر بمعہ پلیویئر کے آدمی کے چبوترے سے اتر کر کنارے پر آ گئے۔ لوگوں نے ان کے لیے راستہ چھوڑا اور خود منتشر ہونا شروع ہو گئے' البتہ بچے جو پتھروں کے ڈھیروں اور ننگے درختوں پر چڑھے ہوئے تھے' کچھ زیادہ دیر اس لیے ٹھہرے کہ انھیں معلوم نہ تھا کہ آیا اس ڈرامے کا یہی انجام ہے یا ابھی اور بھی کچھ ہوگا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس عجیب انسان کو اور کیا پیش آئے گا' جو پانیوں کے اوپر لگاتار چکر لگاتا تھا اور پھریوں لگا' جیسے اپنی چھلانگ کے درمیان وہ یک دم منجمد ہو گیا ہو۔

اب پلیویئر کا آدمی عابد آغا کے پاس آیا اور رپورٹ کی کہ ہر کام صحیح اور تسلی بخش طریقے پر انجام پا گیا تھا اور مجرم ابھی تک زندہ تھا اور اندازہ یہ ہے کہ جب تک اس کے اندرونی اعضاء کو نقصان نہ پہنچا' تب تک وہ زندہ رہے گا۔ عابد آغا نے کوئی جواب نہ دیا' البتہ اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس کا گھوڑا لایا جائے اور اسی دوران توسن آفندی اور ماسٹر وائیٹو یو کو الوداع کہنا شروع کر دیا۔ تمام آدمی منتشر ہونا شروع ہو گئے۔ مارکیٹ میں قصبے کا ڈھنڈورچی اعلان کرتا سنائی دے رہا تھا کہ سزا دے دی گئی ہے اور اسی طرح کی سزا یا اس سے بھی بدتر ہر اس شخص کے لیے جو آئندہ ایسا کام کرے گا۔

☆☆☆

تمام لوگوں نے جو سزا کے وقت وہاں موجود تھے' قصبے اور ارد گرد کے دیہات میں خطرناک رپورٹیں پھیلانا شروع کر دیں۔ قصبے کے باشندوں اور مزدوروں کو ناقابل بیان خوف لاحق ہو گیا۔ جب آہستہ آہستہ اور بتدریج لوگوں کو ہوش آیا اور جو کچھ ان کے درمیان نومبر کے ایک چھوٹے دن پیش آیا تھا' وہ سب سمجھ گئے۔ تمام بات چیت کا مرکزی نکتہ پاڑے اوپر ٹنگا ہوا آدمی تھا جو بلی پر ابھی تک زندہ تھا۔ ہر

آدمی ارادہ کرتا تھا کہ اس کی بات نہیں کرے گا، لیکن اس کا کیا فائدہ، جب ان کے خیالات متواتر اس کی طرف جاتے تھے اور تمام نگاہیں اس مقام پر مرکوز ہو جاتی تھیں۔

جھٹپٹا جلدی آ گیا اور مزدور عجلت کے ساتھ اپنے اپنے جھونپڑوں میں چلے گئے تاکہ اس چبوترے سے جتنی جلد ممکن ہو فوراً دور ہو جائیں۔ اندھیرا ہونے سے قبل مرجان اور عابد آغا کا ایک قابل اعتماد نوکر ایک مرتبہ اور چبوترے پر چڑھے اور حتمی طور پر تصدیق کی کہ ریڈی ساف اس وقت (سزا کے چار گھنٹے بعد) بھی زندہ اور ہوش میں تھا۔ شدید بخار میں وہ اپنی آنکھیں آہستہ اور تکلیف سے گھماتا تھا۔ جب اس نے خانہ بدوش کو اپنے نیچے دیکھا تو اس نے زیادہ اونچی آواز میں کراہنا شروع کر دیا۔ اس کے اس کراہنے میں جس سے زندگی کا خاتمہ قریب معلوم ہوتا تھا، فقط چند بے ربط الفاظ سننے ممکن ہوئے:

"ترک.... ترک.... پل"۔

تسلی کرنے کے بعد وہ عابد آغا کے گھر بکاواک (Bicavac) لوٹ گئے اور راستے میں جس سے بھی ملے، اسے بتاتے گئے کہ مجرم اب تک زندہ ہے اور چونکہ وہ دانت پیستا ہے اور بلی پر سے صاف اور اچھی طرح بولتا ہے، اس لیے کافی حد تک امید ہے کہ دوسرے روز دوپہر تک زندہ رہے گا۔ عابد آغا کی بھی تسلی ہو گئی اور حکم دیا کہ مرجان کے ساتھ جس انعام کا وعدہ ہوا تھا، وہ دیا جائے۔

اس رات قصبے میں اور پل کے ارد گرد ہر جاندار شے خوف اور دہشت سے سوئی۔ بعض آدمیوں کو تو نیند آ گئی، لیکن بہتیرے ایسے تھے جنھیں نیند سرے سے آئی ہی نہیں۔ اگلا دن سوموار تھا اور اس دن نومبر کی صبح کو دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ تمام قصبے یا تعمیرات کے ارد گرد ایک آنکھ بھی ایسی نہ تھی جو پانی کے اوپر اس پیچیدہ اور آڑے ترچھے شہتیروں اور تختوں کے کام کی طرف نہ اٹھی ہو، جس کے دوسرے سرے پر سیدھا اور جدا ایک آدمی بلی پر ٹنگا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ جاگ اٹھنے کے بعد بھی یہ خیال کر رہے تھے کہ کل انھوں نے جو کچھ پل پر دیکھا تھا، وہ خواب تھا اور اب جب وہ اٹھے، تو انھوں نے اپنے کابوس کو بدستور جاری رکھا، جو سورج کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔

مزدوروں میں اب بھی وہ کل والی خاموشی تھی جس میں ہمدردی اور تلخی ملی ہوئی تھی۔ قصبے میں اب بھی وہی کانا پھوسی اور تشویش تھی۔ مرجان اور عابد آغا کا وہی نوکر چبوترے پر ایک مرتبہ اور چڑھے اور سزا یافتہ آدمی کا معائنہ کیا۔ انھوں نے ایک دوسرے سے بات کی، آنکھیں اٹھائیں اور کسان کے چہرے کو دیکھا اور پھر دفعتاً مرجان نے اپنا پاجامہ سنبھالا۔ جس انداز سے وہ نیچے اتر کر آئے اور دریا کے کنارے پر خاموشی سے مزدوروں کے درمیان سے گزرے، ہر ایک نے بھانپ لیا کہ کسان بالآخر دم توڑ چکا ہے۔ ان میں جو سربیا کے رہنے والے تھے، انھیں کچھ یوں روحانی تسکین کا احساس ہوا جیسے انھیں وہ فتح حاصل ہوئی تھی جو بظاہر نظر نہیں آتی تھی۔

اب وہ جرأت سے چبوترے کو اور اس آدمی کو دیکھنے لگے جسے موت کی سزا دی گئی تھی۔ انھوں نے محسوس کیا، گویا تقدیر ترکوں کے خلاف مسلسل ہاتھاپائی اور زور آزمائی کے بعد اب ان کی جانب جھک گئی تھی۔ اس کھیل میں موت ہی سب سے بڑی فتح ہے، وہ منہ جو اب تک خوف سے سکڑے ہوئے تھے، کھلنے شروع ہو گئے۔ مٹیالے، تر، ڈاڑھیاں بڑھی ہوئی اور زرد رو کسان جو بانژا کے پتھروں کی بڑی بڑی چٹانیں چیل کے لکڑ کے کھمبوں سے لڑھکا رہے تھے کچھ لمحوں کے لیے ہتھیلیوں پر تھوکنے کے لیے کام روک کر ایک دوسرے سے دبی آواز میں کہتے:

"خدا اسے معاف کرے اور اس پر رحم کرے"۔

"آہ شہید! ہم جیسے آدمیوں کے لیے یہ بہت مشکل ہے"۔

"کیا آپ نہیں دیکھتے کہ وہ ولی بن گیا ہے"۔

بیگار میں پکڑے ہوئے مزدور اسے دیکھ کر اپنے سینوں پر نظریں بچا کر صلیبی نشان بنایا کرتے تھے۔ میدان میں عورتیں صحنوں میں سے نکل آتیں اور لمحہ بھر کے لیے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر کے رو پڑتیں اور پھر یک لخت واپس دوڑ پڑتیں کہ کہیں دوپہر کا کھانا چولہے پر نہ جل گیا ہو۔ ان میں سے ایک نے دیا جلا دیا، فوراً ہی تمام گھروں کے کمروں کے چھپے ہوئے کونوں میں دیئے جل اٹھے۔ اس سنجیدہ فضا میں بچے آنکھیں جھپکاتے ہوئے اپنے بڑوں کے ٹوٹے پھوٹے اور ناقابل فہم فقرے سنتے تھے:

"ارے خدا ہماری حفاظت کر اور بچا! آہ شہید! اسے خدا نے یوں چن لیا ہے جیسے کہ وہ بڑے بڑے گرجا گھر بناتا تھا۔ اے خدا اور یسوع مسیح ہماری امداد کر، تو پاک ہے۔ دشمن کو بھگا دے اور اسے مزید مدت کے لیے ہم پر حکومت کرنے کی توفیق عطا نہ کر!"

یہ مسلسل پوچھتے رہتے تھے کہ شہید کون تھا؟ اور کون گرجا گھر بناتا تھا اور کہاں؟ سب سے چھوٹے بچے تو خاص طور پر تجسس کرتے تھے، مگران کی مائیں چپ کرادیتی تھیں:
"کتے کو کتوں کے آگے ڈال دو"۔

وہ رات جو اچانک آئی، موسم بہار کی طرح فرحت بخش اور نمناک تھی۔ اس میں ناقابل فہم بڑبڑاہٹ اور مزدوروں کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ جو لوگ تباہی کی بات بھی سننا گوارا نہیں کرتے تھے اور مزاحمت کے لیے تیار نہیں تھے، اب ہر کام اور ہر قربانی کے لیے تیار ہو گئے۔ پروئے ہوئے آدمی نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف اس طرح مبذول کرالی جس طرح کہ ولی کرالیتا ہے۔ تھکاوٹ سے چور چور سینکڑوں آدمی ہمدردی اور پرانے رسم و رواج پر مبنی اندرونی قوت کے زیر اثر فطری طور پر اس جدوجہد میں شامل ہو گئے جس کا مقصد شہید کی لاش حاصل کرنا، اسے مزید توہین سے بچانا اور رسم و رواج کے مطابق اس کی تجہیز و تکفین کرنا تھا۔

جھونپڑیوں اور اصطبلوں میں محتاط طور پر سرگوشیوں میں مشورے کرنے کے بعد بیگار میں پکڑے ہوئے لوگوں نے آپس میں چندہ اکٹھا کر کے سات گروش پیدا کر لیے تاکہ اس سے مرجان کو رشوت دی جا سکے۔ اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لیے انھوں نے تین چالاک اور ہشیار قسم کے آدمی چنے اور جلاد سے رابطہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تھکے ہوئے اور پسینے سے شرابور یہ تین آدمی ٹھہر ٹھہر کر اور مکاری سے اپنے مطلب کے گرد چکر لگاتے ہوئے مرجان سے سودا چکاتے رہے۔ تیوری چڑھا کر، سر کھجا کر اور جان بوجھ کو ہکلاتے ہوئے کسانوں میں سب سے معمر آدمی نے خانہ بدوش سے کہا:

ٹھیک ہے۔ یہ معاملہ اب ختم ہو گیا ہے۔ مقدر میں یہ ہونا لکھا تھا، پھر بھی آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں سے ایک ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، تم جانتے ہو، میرا مطلب کیا ہے.....! درندوں کو اسے کھانے نہیں دینا چاہیے، اور نہ ہی کتوں کو اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنے دینا چاہیے۔

مرجان کو پتا تھا کہ یہ کیا چاہتے تھے، اس نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہٹ دھرمی کے بجائے افسوس کا اظہار کیا:
"نہیں، اس کا ذکر بھی نہ کریں۔ آپ میرا کباب بنوا دیں گے، آپ نہیں جانتے کہ عابد آغا کتنا درندہ آدمی ہے"۔
کسان کو یہ سن کر تکلیف ہوئی اور اس نے تیوری چڑھائی اور اپنے آپ سے کہا:
"یہ آدمی خانہ بدوش ہے، جس کا نہ دین ہے نہ ایمان۔ اسے دوست یا برادر کوئی بھی نہیں بنا سکتا، اس کا کوئی لفظ بھی قابل اعتبار نہیں"۔

کسان نے اپنے جبے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سات گروش تھام لیے۔
"مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ آپ کے لیے آسان نہیں۔ آپ سے کسی کو بھی کوئی شکوہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے پاس یہ کل چار گروش ہیں جو آپ کے واسطے ہیں، ہمارا خیال ہے، کافی ہوں گے"۔
"نہیں، نہیں! میری زندگی مجھے دنیا کے تمام خزانوں سے عزیز ہے۔ عابد آغا مجھے زندہ کبھی نہیں چھوڑے گا، وہ ہر ایک چیز دیکھ لیتا ہے، اگر سو رہا ہو تب بھی۔ مجھے تو صرف یہ خیال ہی بے جان کر دیتا ہے"۔
"چار گروش، چلو پانچ! اور یہی کچھ ہے جو ہم کر سکتے ہیں۔ ہم اس رقم کو بھی زیادہ سمجھتے ہیں"۔ کسان نے خانہ بدوش کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔
"میں جرأت نہیں کر سکتا! میری ہمت نہیں پڑتی"۔
"بہت اچھا، چلو، آپ کو تو حکم ہے کہ فلاں لاش کو کتوں کے آگے پھینک دیا جائے، آپ ایسا کر دیں گے، لیکن کیا ہو گا اس کے بعد۔ اس سے تو آپ کا کوئی تعلق نہ ہو گا اور نہ آپ سے اس کے متعلق کوئی کچھ پوچھ سکے گا۔ دیکھو نا! اگر مثال کے طور پر اسے لے لیں.....یعنی لاش کو اور اپنے قانون کے مطابق اسے کہیں دفن کر دیں۔ میرا مطلب ہے خفیہ طور پر تاکہ کسی بھی فرد بشر کو پتا نہ چل سکے، تو اس حالت میں تم دوسرے دن، مثال کے طور پر، یہ تو کہہ سکو گے کہ لاش کو کتے اٹھا لے گئے ہیں۔ کوئی بھی آپ کو کچھ نہیں کہے گا اور آپ کو آپ کا حصہ بھی مل جائے گا"۔

کسان نے بڑی احتیاط اور دوربینی سے کام لیا۔ وہ صرف لفظ لاش سے پہلے کچھ بے چینی سے رکا۔
"میں اپنا سر پانچ گروش کی خاطر کٹوا دوں؟ نہیں، نہیں، ناہیں۔ ہیں"۔
"کیا چھ کے لیے ٹھیک ہیں؟" کسان نے چپکے سے کہا۔
خانہ بدوش ٹھیک ہو کر بیٹھ گیا، اپنی بانہیں پھیلائیں اور اخلاص کے ساتھ جذبات کا اظہار ان لوگوں کی طرح کیا جو جھوٹ اور سچ میں تمیز نہیں کر سکتے۔
وہ کسان کے سامنے یوں کھڑا ہو گیا جس طرح وہ جج تھا

اور کسان ایک مجرم۔

"چونکہ یہ میری تقدیر ہے، لہٰذا میرا سر جانے دو اور میری بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم ہونے دو۔ اگر آپ مجھے سات گروش دے دیں، لاش لے جائیں، لیکن یہ خیال رکھنا ہوگا کہ نہ تو کوئی دیکھ پائے اور نہ کسی کو پتا چل سکے"۔

کسان نے سر کو جنبش دی اور نہایت افسوس کیا کہ یہ خارشتی تو آخری فاردنگ تک لے لے گا۔ خانہ بدوش نے تو گویا کسان کی بند مٹھی میں ساری رقم دیکھ لی تھی۔

اس کے بعد انھوں نے ایک معاہدہ کیا جس کی آخری تفصیل تک طے کرلی گئی۔ مرجان نے لاش لانا تھی، جب وہ باڑ سے لاش کو دریا کے بائیں کنارے لے جائے گا تو وہ اسے سڑک کے کنارے ایک پتھریلے حصے پر پھینک دے گا تاکہ اسے عابد آغا کے نوکر بھی دیکھ لیں اور کوئی راہ گیر وغیرہ بھی۔ تینوں کسان قدرے دور جھاڑیوں میں چھپے ہوں گے۔ جونہی اندھیرا چھا جائے گا، وہ لاش اٹھالے جائیں گے اور اسے کسی خفیہ مقام پر دفن کردیں گے اور کوئی ظاہری نشان نہیں چھوڑیں گے جس سے قبر کا پتا چل سکے، کیونکہ اس طرح یہ بات صحیح معلوم ہوگی کہ راتوں رات کتے اسے کھینچ لے گئے تھے اور چٹ کر گئے تھے۔ تین گروش پیشگی دینے ہوں گے اور بقایا چار اس وقت جب کام مکمل ہوجائے گا۔

اسی رات معاہدے کے مطابق تمام کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، جھٹ پٹے میں مرجان لاش لے آیا اور اسے سڑک کے کنارے پھینک دیا (اب یہ اس جسم سے مشابہت نہیں رکھتا تھا جسے سب لوگوں نے پچھلے دو دنوں سے دیکھا تھا، یعنی بلی پر سیدھا اور اکڑا ہوا جسم۔ یہ اب دوبارہ وہی چھوٹے قد کا اور جھکا ہوا ریڈی ساف تھا، صرف خون اور زندگی سے محروم تھا) اس کے بعد وہ بمعہ اپنے معاونین کے کشتی کے ذریعہ سے دوسرے کنارے پر قصبے کو لوٹ گیا۔

کسان جھاڑیوں میں منتظر تھے۔ ایک یا دو ایسے مزدور گزرے جو دیر تک کام کرتے رہے تھے اور ایک ترک بھی اسی راستے قصبے کو اپنے گھر جانے کے لیے گزرا۔ اس کے بعد سارے دیہاتی علاقے پر خاموشی اور اندھیرے کا راج ہوگیا۔ کتے آنے شروع ہوگئے۔ ان میں مضبوط، خارشتی، بھوکے اور ڈرپوک قسم کے آوارہ کتے تھے، جن کا نہ کوئی مالک ہو اور نہ گھر۔ جھاڑیوں میں چھپے ہوئے کسانوں نے کتوں کو پتھر مارے اور بھگادیا۔ وہ دمیں ٹانگوں میں دبا کر مردے سے کوئی بارہ، چودہ قدم دور چلے گئے اور انتظار کرنے لگے کہ اب اس کے بعد کیا ہوگا۔ ان کی سرخ اور چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ جب تسلی ہوگئی کہ اتنی رات گئے اب اور کسی کے آنے کی امید نہیں رہی، تو کسان جھاڑیوں میں سے باہر نکل آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک بیلچہ اور ایک کدال تھی۔ وہ اپنے ساتھ دو تختے بھی لائے جن پر انھوں نے لاش کو رکھا اور اٹھا کر لے گئے۔ انھوں نے جلدی جلدی خاموشی سے اور بغیر بات چیت یا آواز کے ایک گہری قبر کھودی۔ یہ قبر اس برساتی نالے کی خشک گزرگاہ میں بڑے بڑے پتھروں کو ہٹا کر کھودی گئی جو موسم سرما اور خزاں کی بارشوں میں پہاڑی سے نیچے بہنے والے پانی کو دریائے درینہ میں ڈال دیتا ہے۔ اس قبر میں انھوں نے ٹھنڈے، اکڑے ہوئے اور مڑے تڑے جسم کو ڈال دیا۔ سب سے زیادہ عمر والا کسان قبر میں کود گیا۔ اپنے جسم پر احتیاط سے کئی مرتبہ صلیبی نشان بنائے۔ پہلے ایک لکڑی کو آگ لگائی اور پھر مڑی تڑی موم بتی جلائی جس کو ہوا سے بچانے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ اس کے آگے دیوار بنادیے۔ موم بتی اس نے مردے کے سر پر رکھی اور اپنے جسم پر جلدی اور اونچی آواز میں تین مرتبہ صلیبی نشان بنائے:

"باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام پر"۔

اس کے ساتھ جو آدمی تھے، انھوں نے بھی اندھیرے میں قبر سے باہر اپنے جسموں پر صلیبی نشان بنائے۔ پھر کسان نے مردے کے اوپر اپنے ہاتھ کو حرکت دی گویا وہ اپنے خالی ہاتھ سے خیالی شراب ڈال رہا تھا اور آہستہ اور تعظیماً" دو مرتبہ کہا:

"او یسوع مسیح! اپنے غلام کی روح کو اولیاؤں جیسا سکون نصیب کر"۔

اس کے بعد چند اور الفاظ سرگوشی میں کہے۔ یہ گوکٹے ہوئے اور ناقابل فہم تھے، لیکن سنجیدہ اور تعظیمی دعائیں تھیں۔ قبر سے باہر جو دو آدمی تھے، وہ مسلسل اپنے جسموں کے اوپر صلیبی نشان بناتے رہے۔ جب وہ کام ختم کرچکا، تو انھوں نے دونوں تختے نیچے کیے تاکہ وہ مردے کے اوپر چھت بن جائیں۔ اب کسان نے ایک مرتبہ اور اپنے اوپر سے صلیبی نشان بنایا، موم بتی گل کردی اور قبر سے باہر آگیا۔ اس کے بعد انھوں نے آہستہ آہستہ اور احتیاط کے ساتھ قبر میں مٹی ڈالی اور اوپر سے خوب دباتے چلے گئے تاکہ کوئی ابھار نظر نہ آئے۔ یہ کرچکنے کے بعد انھوں نے پتھر دوبارہ تازہ کھودی ہوئی مٹی کے آرپار رکھ کر پانی کی گزرگاہ بحال کردی۔ اپنے جسموں پر ایک مرتبہ اور صلیبی نشان بنائے اور گھر چلے گئے۔

گھر جاتے وقت انھوں نے ایک لمبا چوڑا چکر کاٹا تاکہ سڑک پر وہ ایسے مقام سے داخل ہوں جو ایک ممکن حد تک دور ہو۔
اس رات ہوا کے بغیر نرم بارش برسی اور جب صبح طلوع ہوئی، تو تمام دریائی وادی دودھیا کہر اور نمی کی کثرت سے بھری ہوئی تھی۔ اس سفید درخشانی میں جو کبھی اٹھتی اور کبھی بیٹھ جاتی، سورج کہر میں سے سر نکالنے کے لیے ناکام جدوجہد کر رہا تھا۔ تمام سماں اداس، نیا اور عجیب سا تھا۔
دسمبر کے اس پندرھواڑے میں ایسا پالا پڑا اور ایسے برفانی جھکڑ چلے جو اس سے قبل سننے میں نہیں آئے تھے۔ پتھر زمین میں جم کر رہ گئے اور لکڑی پھٹ گئی۔ اوزاروں اور جھونپڑیوں کو باریک برف کے ذرات ڈھانپ دیتے تھے اور دوسرے روز ہوا ترنگ میں آ کر اسے اڑا لے جاتی اور دوسرے حصے کو ڈھانپ دیتی۔ کام آخر کار خود بخود بند ہو گیا اور عابد آغا کا خوف گھٹتے گھٹتے بالکل ختم ہو گیا۔ عابد آغا نے بہتیری کوشش کی کہ موسم کا مقابلہ کیا جائے مگر ہار کر بیٹھ گیا۔ اس نے مزدوروں کو چلتا کر دیا اور کام بند کر دیا۔
رخصت ہونے سے قبل عابد آغا نے ممتاز ترک شہریوں کو دوبارہ طلب کیا۔ وہ اپنے بے بس اور کمزور غصے سے دل برداشتہ تھا۔ اس نے ان سے وہی کہا جیسا کہ پچھلے سال اس نے کہا تھا کہ وہ چیز ان کے ہاتھوں میں چھوڑے جا رہا تھا اور کہ یہ ذمہ داری اب ان کی تھی۔
"میں جا رہا ہوں، لیکن میری آنکھیں یہاں رہیں گی، خیال رکھیں۔ اگر آپ لوگ بیسیوں نافرمان سر کاٹ ڈالیں، تو بہتر ہو گا بہ نسبت اس کے کہ سلطان کی ایک میخ بھی ضائع ہو جائے۔ جونہی موسم بہار پھوٹے گا، میں ایک مرتبہ پھر یہاں آ جاؤں گا اور ہر آدمی سے حساب لوں گا"۔
آخر جب موسم بہار آیا تو اس دفعہ عابد آغا کے بجائے وزیر کا نیا نمائندہ عارف بیگ نامی بمعہ توسن آفندی آیا۔ جس بات کا اسے زیادہ ڈر تھا، وہی عابد آغا کو پیش آئی۔ کسی نے جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا اور جو اس کے پاس کام بھی کر چکا تھا، وزیر اعلیٰ کو وشی گراڈ پل کے کام کے متعلق مفصل رپورٹ لکھ بھیجی تھی۔
وزیر کو صحیح اطلاع ملی تھی کہ پچھلے دو برسوں میں ہر روز دو سو سے تین سو کے درمیان مزدور بیگار میں پکڑے جاتے رہے۔ انھیں ایک پیسہ بھی مزدوری نہیں ملتی تھی اور اکثر اوقات وہ اپنا کھانا خود اپنے گھر سے ساتھ لاتے تھے اور یہ کہ عابد آغا نے وزیر کا سارا روپیہ خود ہی ہضم کر لیا تھا۔

محمد پاشا نے جس نے اپنی ساری زندگی سرکاری ملازمین کے غبن کے معاملوں اور بددیانتوں کے خلاف جدوجہد میں گزار دی تھی، اپنے نالائق نوکر کو حکم دیا تھا کہ ساری رقم واپس کرے اور جو رقم اور حرم میں عورتیں بچ جائیں، وہ لے لے اور فوراً اناطولیہ کے ایک چھوٹے سے قصبے میں چلا جائے اور پھر کبھی بھی اپنی صورت دکھانے کی کوشش نہ کرے، ورنہ اس کا حشر بہت برا ہو گا۔
عارف بیگ کے آنے کے دو دن بعد ماسٹر اینٹونیو بھی پہلے مزدوروں کے ساتھ ڈالیشیا سے آ گیا۔ توسن آفندی اپنے نئے چیف کے پاس حاضر ہو گیا اور اپریل کے ایک گرم دن انھوں نے تعمیراتی کاموں کا معائنہ کیا اور ترجیحی کاموں کا پروگرام مرتب کیا۔ جب عارف بیگ دوسرے دونوں کو کنارے پر اکیلے چھوڑ کر واپس ہوا، ماسٹر اینٹونیو نے توجہ سے توسن آفندی کے چہرے پر نظر ڈالی جو ایسے دھوپ والے روز بھی کھلے سیاہ چغے میں گٹھڑی بنا ہوا تھا۔
"یہ بالکل مختلف قسم کا آدمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ میں خود اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ کون بہادر اور ہوشیار انسان تھا جس نے وزیر کو اطلاع پہنچائی اور اس جانور کو ہٹوایا"۔
توسن آفندی نے اپنے سامنے سیدھے دیکھا اور چپکے سے بولا: "اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اس سے بہتر ہے"۔
"یہ آدمی ضرور ایسا ہو گا جو عابد آغا کے معاملوں کو جانتا ہو گا اور ساتھ ہی اس کی وزیر تک رسائی بھی ہو گی اور اس کا اعتماد بھی حاصل ہو گا"۔
توسن آفندی نے بغیر اوپر دیکھے اور اپنا جبہ اپنے گرد اور زیادہ کھینچ کر لپیٹتے ہوئے کہا: "یقیناً یہ آدمی بہتر ہے"۔
اب کام نئے چیف عارف بیگ کے ماتحت شروع ہوا۔
یہ بے شک مختلف قسم کا آدمی تھا، بہت زیادہ اونچا، آگے کو جھکا ہوا، سر سے گنجا، چہرے کی ہڈیاں نمایاں اور شگاف کے مانند سیاہ ہنستی آنکھیں۔ لوگوں نے فوراً ہی اسے "مصری بابا" کا عرف عطا کر دیا "یعنی گنجا بوڑھا"۔ یہ شخص بغیر چلائے، بغیر ڈنڈے کے اور بغیر بڑا بول بولے یا ظاہری کوشش کے حکم دیتا تھا اور خوش طبعی سے اور کبھی کبھی اعتماد کے ساتھ اختیارات استعمال کر کے ہر چیز ٹھیک ٹھاک کر دیتا تھا۔ نہ وہ کبھی کسی چیز کو نظر انداز کرتا تھا اور نہ کبھی کسی چیز کے تعاقب میں کوتاہی کرتا تھا۔
وہ اپنے ساتھ ایک احساس لایا تھا کہ ہر اس چیز کو پوری

توجہ دی جائے جو وزیر کی خواہش یا حکم ہو، مگر یہ سب کام چپ چاپ، دیانت دار اور عام آدمی کی طرح کیا جائے کیونکہ اس نے نہ کچھ چھپانا تھا اور نہ اسے کسی قسم کا خوف تھا، لہٰذا اسے کسی کو ڈرانے دھمکانے یا اذیت دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ کام اسی تیز رفتاری سے ہوا جس طرح کہ وزیر چاہتا تھا۔ کام میں نقائص کے لیے اسی طرح سنگین سزا تھی، مگر مزدوری کی ادائیگی کے بغیر کام کرانے کا سلسلہ اسی روز سے بند ہو گیا۔ تمام کارکنوں کو مزدوری کے علاوہ راشن میں آٹا اور نمک بھی ملتا تھا، چنانچہ تمام کام عابد آغا کے زمانے کے مقابلے میں زیادہ سرعت کے ساتھ اور اچھی طرح ہونے لگا۔ پاگل اِلنکا بھی اب دیہات میں کہیں غائب ہو گئی تھی۔

تعمیری کام بڑھتا گیا اور پھیلتا چلا گیا۔

اب یہ دکھائی دینے لگا کہ وزیر کی آرزو صرف پُل تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ اس کی آرزو میں قافلہ سرائے بھی شامل تھی جس میں رات کو سفر کرنے والے دور دراز سے آئے ہوئے مسافر جو پُل عبور کرنا چاہیں گے، خود اپنے لیے، گھوڑوں کے لیے اور اپنے سامان کے لیے پناہ ڈھونڈ سکیں گے۔ عارف بیگ کے حکم پر اس قافلہ سرائے کا کام شروع ہو گیا۔ پُل سے دو سو قدم کے فاصلے پر مارکیٹ میں داخل ہونے کے مقام پر جہاں میدان کی سڑک کی چڑھائی شروع ہوتی ہے، ایک جگہ ہموار تھی جہاں اس وقت تک بدھ کے روز مویشیوں کا میلہ لگا کرتا تھا۔ اس ہموار جگہ پر نئی قافلہ سرائے کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ کام گوست رفتار سے شروع ہوا تھا، مگر یہ اندازہ پہلے ہی دن سے لگایا جا سکتا تھا کہ یہ ایک ٹھوس اور عالی شان عمارت ہو گی جو بڑے پیمانے پر بنے گی۔ لوگوں کو بتا ہی مشکل سے چلا کہ کس طرح آہستہ مگر یقینی طور پر پتھروں کی بنی ہوئی ایک قافلہ سرائے کھڑی ہو گئی تھی۔ لوگوں کو پتا اس لیے نہ چل سکا کہ ان کی ساری توجہ پُل پر لگی ہوئی تھی۔

سال گزر گئے، گرمیاں اور خزائیں، سردیاں اور بہاریں ایک دوسرے کے پیچھے آتی اور جاتی رہیں۔ مزدور اور ماہر مستری آئے اور چلے گئے۔ اب تمام دریتہ فتح ہو چکا تھا، مگر پُل سے نہیں، لکڑی کے پاڑوں سے فتح ہوا تھا جو چیل کے شہتیروں اور تختوں کی پیچیدہ اور بیہودہ سی کھچڑی تھی۔ دونوں کناروں سے لکڑی کے اونچے دمکلے (کرین) اٹھے جو مضبوطی سے نصب کیے ہوئے ٹھاٹھوں پر باندھے گئے تھے۔ دریا کے دونوں کناروں سے آگ کا دھواں دکھائی دیتا تھا،

جہاں سیسہ پگھلایا جا رہا تھا، تاکہ اسے پتھر کے بلاکوں کے سوراخوں میں ڈال کر انھیں ایک دوسرے سے یوں منسلک کر دیا جائے کہ ظاہری طور پر نظر نہ آئے۔

تیسرے سال کے خاتمے پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے بغیر بڑی عمارتیں بہت ہی کم پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ مرکزی ستون جو باقی ستونوں سے اونچا اور زیادہ چوڑا تھا، کیونکہ پر کیپا بننا تھا، یہ ابھی مکمل ہونے کو تھا کہ پتھر کی ایک وزنی اور بڑی سل لانے کے دوران یک لخت بند ہو گیا۔ مزدور پتھر کی اس مستطیل سل کے گرد جمع ہو گئے جو موٹے موٹے رسوں سے جکڑی ہوئی تھی اور ان کے سروں کے اوپر لٹک رہی تھی۔ دمکلا اسے اٹھا کر بالکل اس کے صحیح مقام پر نہ پہنچا سکا۔ ماسٹر اینٹونیو کا معاون 'عرب' بے صبری سے دوڑتا ہوا آن پہنچا اور غصے سے چلا کر (زبانوں کا یہ وہ مرکب تھا، جو دنیا کے تمام حصوں کے آدمیوں کے درمیان سالہا سال کی مدت کے دوران تیار ہو گیا تھا) ان آدمیوں کو حکم دینے لگا جو دمکلا (کرین) کو نیچے پانی پر چلاتے تھے۔ اس لمحے بغیر کسی ظاہری وجہ کے رسے کھل گئے اور سل پہلے ایک کونے میں گری اور پھر اپنے پورے وزن کے ساتھ مشتعل عرب پر گری جو نیچے صرف پانی کو دیکھ رہا تھا اور جس نے یہ تکلیف نہ کی تھی کہ وہ اپنے سر سے اوپر بھی دیکھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ سل عین اپنی پوزیشن میں گری، لیکن گرنے کے دوران اس نے عرب کو پکڑ لیا اور اس کے جسم کے تمام نچلے حصے کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ ہر ایک نے ادھر ادھر دوڑنا شروع کیا، تاکہ خطرے کا اعلان کرے اور امداد کے لیے پکارے۔ ماسٹر اینٹونیو جلدی پہنچ آیا۔ نوجوان حبشی اپنی پہلی بے ہوشی کے بعد ہوش میں آگیا تھا اور اس نے بھینچے ہوئے دانتوں سے کراہتے ہوئے یاس انگیز اور خوف کے عالم میں ماسٹر اینٹونیو کی آنکھوں میں دیکھا۔ چیں بجبیں اور زرد چہرہ لیے ماسٹر اینٹونیو نے مزدور بلانے کا حکم دیا تاکہ اوزار لائیں اور سل کو اٹھائیں، لیکن اس کا فائدہ کچھ بھی نہ ہوا۔ خون یک لخت بہنا شروع ہو گیا۔ نوجوان آدمی کا سانس گھٹ گھٹ کر آنے لگا اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور ماسٹر اینٹونیو کے ہاتھ بے چینی میں اپنے ہاتھوں میں دبائے وہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر مر گیا۔

عرب کا جنازہ مذہبی رسوم کا ایک واقعہ تھا جو مدت تک یاد رکھا گیا۔ تمام مسلمان مرد جنازہ اٹھانے کے لیے آپہنچے۔ ان میں سے ہر ایک اس تابوت کو چند قدم تک کندھا دیتا تھا۔

اس تابوت میں نوجوان کے جسم کا صرف اوپر والا آدھا حصہ پڑا تھا۔ باقی آدھا پتھر کی سل کے نیچے رہ گیا تھا۔ ماسٹر اینٹونیو نے عرب کی قبر پر اسی پتھر کی بنی ہوئی ایک عمدہ یادگار تعمیر کروائی' جس سے پُل کی تعمیر ہوئی تھی۔ اس نوجوان آدمی کی موت نے ماسٹر اینٹونیو کو غم کی گہرائیوں میں ڈال دیا' کیونکہ اسے اس نے السٹینز (Ulcinj) سے جہاں چند حبشی خاندان اب بھی رہتے ہیں' ایک افلاس زدہ بچے کی صورت میں اٹھا کر پالا تھا۔ اس سانحہ کے باوجود کام ایک لمحے کے لیے بھی نہ رکا۔

وہ سال اور اس سے اگلا سال ہلکے اور نرم تھے' اس لیے کام دسمبر کے نصف تک جاری رہا۔ کام کا پانچواں سال شروع ہوا اور اب وہ لکڑی کا چوڑا اور بے قاعدہ دائرہ' پتھر امدادی سازوسامان اور ہر قسم کا مواد گھٹنا شروع ہوا۔ میدان روڈ کے پاس ہموار جگہ پر پاڑ ہٹ جانے کے بعد نئی سرائے کھڑی تھی۔ یہ ایک بہت بڑی عمارت تھی جو اسی قسم کے پتھر سے بنائی گئی تھی جس سے کہ پُل بنایا گیا تھا۔

اسی مدت میں دریا پر آڑے ترچھے شہتیروں اور پشت پناہوں کے بے شکل ملبے کے ڈھیر کا سائز گھٹنا شروع ہوا' اور جو وہ رہ گیا تھا' اس میں سے خود بانژا (Banja) کے پتھروں کا بنا ہوا پُل زیادہ سے زیادہ نظر آنے لگا۔ مزدور فرداً فرداً اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اب بھی اس کام پر لگے ہوئے تھے جو لوگوں کو بے ہودہ اور بے ربط معلوم ہوتا تھا' لیکن اب قصبے کے سارے اور سب سے زیادہ شکی لوگوں پر بھی واضح ہو گیا تھا کہ ان انفرادی کاموں کے علاوہ اس تمام کام میں سے ایک ہی ڈیزائن کے نادر پُل کا وجود ظاہر ہوا ہے۔ پہلے محرابوں کی تھوڑی سی بلندی اور پھیلاؤ ظاہر ہوا جو کناروں کے قریب تھے اور پھر ایک ایک کرکے اور نظر آئے حتیٰ کہ آخری حصے سے بھی پاڑ ہٹ گئے اور سارا پُل بمعہ 11 محرابوں کے دکھائی دیا جو اپنی خوبصورتی میں مکمل اور حیرت انگیز تھا اور قصبے کے لوگوں کی آنکھوں میں اس کی حیثیت ایک نئی اور عجیب چیز کی تھی۔

چونکہ وہ اچھائی اور برائی دونوں سے جلد متاثر ہوتے تھے' اس لیے وشی گراڈ کے لوگ اپنے شکوک اور بے یقینی پر نادم اور شرمندہ تھے۔ وہ اب اپنے سمند شوق کو روکنا اور حیرانی کو چھپانا نہیں چاہتے تھے۔ پُل پر سے گزرنے کی ابھی اجازت نہیں دی گئی تھی' لیکن لوگ دونوں کناروں پر اکٹھے ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر داہنے کنارے پر جہاں مارکیٹ اور شہر کا بڑا حصہ واقع تھا اور مزدوروں کو اوپر سے گزرتے دیکھتے تھے اور ساتھ ہی ان کا کام دیکھتے تھے کہ کس طرح وہ پشتے کے لیے پتھروں کو صاف کرتے تھے اور کیپیا کی سیٹیں بنا رہے تھے۔

وشی گراڈ کے ترک باشندے اس کام کو کسی اور کے ذریعے اور کسی اور کے خرچ پر دیکھتے رہے۔ پانچ سال تک اس کا مذاق اڑاتے رہے اور پیشین گوئیاں کرتے رہے کہ اس کا انجام بہت ہی برا ہوگا۔

قصبے کے باشندوں کا جوش بڑھتا چلا گیا جو آس پاس کے دیہات تک پھیل گیا۔ اکتوبر کے ابتدائی دنوں میں عارف بیگ نے پُل کا کام ختم ہونے کے سلسلے میں ایک بڑی ضیافت کا اہتمام کیا۔ یہ نوابی اسلوب کا آدمی بے رحمانہ طور پر سخت اور حد درجے کا ایماندار تھا۔ اس نے وہ تمام روپیہ جو اسے کام کے لیے ملا تھا' خرچ کر دیا تھا اور اس میں سے ایک کوڑی بھی اپنے لیے نہیں رکھی تھی' چنانچہ لوگوں میں یہ حاکم اس بڑے کارنامے کا اعلیٰ کردار متصور ہوتا تھا۔ چونکہ وزیر کی نسبت لوگ اس کی زیادہ تعریف کرتے تھے' اس لیے اس کی ضیافت تابناک' عمدہ اور شاندار طور پر منعقد ہوئی۔

یہ ضیافت عام جس میں جو آدمی شریک ہونا چاہتا تھا' ہو سکتا تھا دو دن تک جاری رہی' اس میں نگرانوں (Oversears) اور مزدوروں کو روپے اور کپڑے لتے کے تحائف دیئے گئے۔ وزیر کا جام صحت گوشت' شراب' موسیقی' رقص اور گانوں سے منایا گیا۔ گھوڑوں اور آدمیوں کی دوڑیں ہوئیں' اور غرباء میں گوشت اور مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ اس چوک میں جو پُل کو مارکیٹ سے ملاتا تھا' دیگوں میں حلوہ پکایا جو گرم گرم' لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ حلوہ قصبے کے آس پاس گاؤں تک جا پہنچا اور جس کسی نے کھایا' اس نے وزیر کی صحت اور اس کی عمارات کی سلامتی اور پائیداری کی دعائیں کیں۔ ایسے بچے بھی تھے جو دیگوں کے پاس چودہ چودہ مرتبہ گئے تھے' حتیٰ کہ پکانے والوں نے انہیں پہچان کر اپنے لمبے چوبی چمچوں سے بھگا دیا۔ ایک خانہ بدوش بچے کی موت بہت زیادہ گرم حلوہ کھانے سے واقع ہو گئی۔

ایسی چیزیں ایک طویل مدت تک یاد رکھی گئیں اور پُل کی تعمیر کے متعلق جب بھی کہانیاں سنائی جاتیں' تو ان چیزوں کا ذکر بھی آتا۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ فیاض وزیر اور ایماندار حکام بعد کے برسوں میں مر کھپ گئے اور ایسی ضیافتیں نایاب سے نایاب تر ہو گئیں اور پھر ان کا نام بھی مکمل

طور پر انجانا بن گیا اور آخر کار وہ ایسے افسانوں میں تبدیل ہو گئیں جیسے پانی کی دیویاں (Vilas) ستویا (Stoja) اور اوستویا (Ostoja) اور اسی قسم کے دیگر عجوبے۔

جبکہ ضیافت جاری تھی، لوگ عام طور پر ان ابتدائی دنوں میں پُل کو لاتعداد مرتبہ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک عبور کرتے تھے۔ بچے دوڑ کر یا تیز تیز گزر جاتے، مگر ان کے بزرگ ایک دوسرے سے باتوں میں منہمک آہستہ آہستہ رفتار سے چلتے رہتے یا اسی آہستہ روی سے ایسے نئے نظاروں کو جو پُل نے ان کے لیے کھول دیئے تھے بغور دیکھتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ چونکہ کوئی آدمی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس نئی چیز سے وہ محروم ہو یا اس میں اس کا حصہ نہ ہو، چنانچہ مجبور و بے بس لوگ، لنگڑے، لولے اور بیمار آدمی بھی پُل پار کرنے کے لیے ڈولیاں اور سٹریچر استعمال میں لانے لگے۔ قصبے میں نچلے درجے کے لوگ بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کے اختیارات میں یک لخت کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے جیسے کچھ عجیب مافوق البشر کارنامہ ان کے اختیارات کے دائرے کے اندر اور روزمرہ کی زندگی کی حدود کے اندر رکھ دیا گیا تھا جیسے تین مشہور عناصر، مٹی، پانی اور ہوا کے علاوہ ایک اور عنصر بھی اسے میسر آگیا تھا اور جیسے کسی نیک کوشش سے ان میں سے ہر ایک فوری طور پر اپنی ساری خواہشات (پانی کے اوپر سے گزرنا اور خلد پر فتح پانا) میں سے ایک جو کہ انسان کا پرانا خواب ہے، یک لخت پوری کر سکے گا۔

ترک نوجوانوں نے حلوے کی دیگوں کے گرد "کولو" رقص شروع کیا اور اسے پُل کے پار لے گئے، کیونکہ انھیں یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اڑ رہے ہیں اور ان کے پاؤں ٹھوس زمین کو نہیں چھو رہے۔ رقص کپیا کے ارد گرد حلقوں میں ہوتا رہا۔ رقاص اپنی ایڑیاں اور پاؤں زور سے نئے فرشی پتھروں پر مارتے، گویا وہ پُل کی پختگی کا امتحان لے رہے تھے۔ یہ "کولو" رقص نوجوان جسموں کا رقص تھا جس میں رقاص ان تھک طور پر ایک ہی تال سر سے اوپر نیچے کودتے تھے۔ "کولو" رقص کے اس حلقے کے گرد بچے کھیل رہے تھے جو رقص کرنے والوں کے پاؤں میں سے یوں اندر باہر آتے جاتے جیسے کسی متحرک جنگلے سے گزر رہے ہوں جو کولو کے مرکز میں کھڑا ہو۔

بہت سے لوگ دور تک نیچے دریا میں گئے جو قریباً آدھے گھنٹے کا پیدل فاصلہ تھا اور کلاٹا یا میزالین سے پُل کو دیکھنے لگے جو سیاہ پہاڑیوں کے بیچ نیلے پانی پر عجیب نقش و نگار سے مرصع اپنی گیارہ محرابیں سنبھالے نازک اور سفید چادر اوڑھے کھڑا تھا۔ اسی دوران ایک بڑی سفید تختی بھی لائی گئی تھی جس پر کھدائی کی ہوئی کوئی تحریر تھی۔ یہ تختی کپیا پر سرخی مائل پتھروں کی اس دیوار میں نصب ہوئی جو پُل کی دیوار سے چھ فٹ اونچی کھڑی تھی۔ لوگ اس تحریر کے گرد جمع ہو گئے اور اسے دیکھنے لگے۔ اسی دوران ایک درس گاہ کا یا قرآن کا طالب علم انھیں مل گیا جس نے اپنی تھوڑی بہت قابلیت کے مطابق کافی کے ایک پیالے پر یا تربوز کی ایک قاش کے عوض یا محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر اس تحریر کو جہاں تک ممکن تھا پڑھا۔

اس نظم کے اشعار ان دنوں سینکڑوں مرتبہ پڑھے جاتے تھے۔ یہ نظم کسی بدیع (Badi) نے لکھی ہے جس میں اس نے اس ہستی کا نام اور عہدہ بھی بتایا ہے جس نے کہ یہ خواہش کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ مبارک سال یعنی 979ھ یا عیسائی کیلنڈر کے مطابق 1571ء بھی درج ہے جس میں یہ خواہش مکمل ہوئی۔ بدیع (Badi) اچھے پیسے وصول کر کے آسان اور پراثر اشعار لکھتا تھا اور یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ ایسے بڑے آدمیوں کے گلے کس طرح مڑھے جا سکتے ہیں جو بڑی عمارتیں تعمیر کرواتے یا بحال کرواتے ہیں۔ جو لوگ اسے جانتے تھے (اور اس کے فن پر رشک کرتے تھے) مذاق میں کہا کرتے تھے کہ صرف آسمان کی قوسی عمارت ہی ایسی عمارت ہے جس پر بدیع کے قلم سے تعریفی نظم نہیں لکھی گئی۔ باوجود اچھی کمائی کے بدیع مفلس اور مفلوک الحال ہی رہا کرتا تھا۔ شاعری کے ساتھ عموماً ایک خاص قسم کا کنگال پن ہوتا ہے جسے معقول سے معقول معاوضہ اور تنخواہ بھی کم نہیں کر سکتی، چنانچہ بدیع بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا اور وہ اکثر عجیب عجیب دھندے کیا کرتا تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ لوگوں کا شوق ختم ہو گیا، وہ کافی حیران ہو چکے تھے اور کافی حد تک اوپر سے گزر چکے تھے اور پتھر کی تختی پر کندہ نظم جی بھر کر سن چکے تھے۔ نو دنوں کا عجوبہ ان کی روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکا تھا اور اب وہ پُل کو عجلت کے ساتھ، بے توجہی سے، شوق سے اور غیر حاضر دماغی سے عبور کرتے تھے اور اس کے نیچے جو شوریدہ سر پانی بہہ رہا تھا، وہ گویا ان بے شمار سڑکوں میں سے ایک تھی، جسے وہ اور ان کے جانور اپنے پیروں تلے روندتے تھے۔ اب یہ تختی بھی اپنی کندہ تحریر کے ساتھ ایسی خاموش ہو گئی جیسے دیگر پتھر۔

اب دریا کے بائیں کنارے والی سڑک کو پار والے

کنارے کی کھلی سڑک کے سرے سے براہ راست ملا دیا گیا تھا۔ سیاہ اور دیمک کی چاٹی ہوئی گھاٹ کی کشتی اور اس کا سنکی ملاح اب نہیں تھے۔ پُل کی آخری محرابوں سے بہت نیچے وہ ریتلی چٹانیں اور گہرے کنارے رہ گئے تھے، جن پر چڑھنا اور اترنا ایک جیسا مشکل تھا اور جن پر مسافر مایوسی کے عالم میں انتظار کیا کرتے تھے۔ اور ایک کنارے سے دوسرے پر ملاح کو بلانے کی ناکام کوشش کیا کرتے تھے۔ اس تکلیف کے علاوہ دریا کی طغیانی پر بھی جادو کی طرح قابو پالیا گیا تھا۔ لوگ اب بہت اوپر سے سیدھے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کھلے اور پہاڑ کی طرح مضبوط اور پائیدار پُل کے ساتھ ساتھ جو گھوڑوں کے سموں تلے یوں گونجتا گویا یہ پتھر کی ایک ہی تختی کا بنا ہوا ہے، یوں گزر جاتے تھے گویا پروں سے اڑ رہے ہیں۔

وہ لکڑی کی پن چکیاں بھی ختم ہو گئیں اور یہی حشر ان کھلے چھپروں کا بھی ہوا، جن میں ضرورت کے وقت مسافر رات گزارا کرتے تھے۔ ان کی جگہ ایک مضبوط اور کروفر والی کارواں سرائے کھڑی تھی جو مسافروں کو جن کی تعداد میں روزانہ اضافہ ہو رہا تھا، خوش آمدید کہتی تھی۔ مسافر سرائے میں ایک کھلے راستے سے داخل ہوتے، جس کی سڑکوں میں ہم آہنگی تھی۔ اس کے ہر طرف ایک بڑی کھڑکی تھی جس میں جالی لگی ہوئی تھی۔ یہ جالی لوہے کی نہیں، بلکہ پتھر کے ایک ٹکڑے سے کاٹ کر بنائی ہوئی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے مستطیل صحن میں تاجروں کے مال و اسباب اور تھیلوں کے لیے جگہ تھی اور اس کے گرد 36 کمروں کے دروازوں کا سلسلہ چلتا تھا۔ اس کے پیچھے پہاڑی سے نیچے اصطبل تھے۔ عام حیرانی کی بات ہے کہ یہ بھی پتھر کے بنے ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا گویا سلطان کے سانڈ گھوڑے کے لیے تعمیر ہوئے ہیں۔ اس جیسی کوئی دوسری سرائے سارا ژیوو (Sarojevo) سے لے کر ایڈریانوپل تک نہیں تھی۔ اس سرائے میں ہر مسافر ایک دن اور رات ٹھہر سکتا تھا۔ رہائش کے دوران ہر مسافر آگ، پناہ گاہ اور ربانی خود اپنے لیے اپنے نوکروں اور جانوروں کے لیے مفت حاصل کرنے کا مجاز تھا۔

یہ سب کچھ اور پُل بذات خود وزیر اعلیٰ محمد پاشا کی وصیت تھی۔ محمد پاشا کوئی ساٹھ سال قبل اوپر والے علاقے میں پہاڑوں کے پیچھے ایک پہاڑی دامن میں آباد سوکولوویٹی (Sokolovici) نامی گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ اسے بچپن ہی میں سربیا کے دیگر کسان لڑکوں کے گروہ کے ہمراہ بطور خونی خراج استنبول لے جایا گیا تھا۔ اس کارواں سرائے کے چلانے کے اخراجات وقف ادا کرتا تھا۔ مذہبی وقف کی بنیاد محمد پاشا نے نئے نئے مفتوحہ ہنگری کے علاقوں سے قبضہ میں آئی ہوئی قیمتی جائدادوں سے رکھی تھی۔

اس طرح پُل اور سرائے کی تعمیر سے بہت سی تکلیفیں اور دکھ دور ہو گئے۔ یہ کام مکمل ہو جانے سے وزیر کا وہ عجیب درد بھی دور ہو گیا جو وزیر اپنے ساتھ بچپن میں بوسنیا سے اور وشی گراڈ کے گھاٹ سے لایا تھا۔ اس تاریک اور تیز درد کے دوروں سے جو وقتاً فوقتاً اس پر پڑا کرتے تھے، یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کی چھاتی کے دو ٹکڑے کر دیں گے، لیکن مقدر کو یہ بات منظور نہ تھی کہ محمد پاشا درد کے ان دوروں کے بغیر بھی زندگی گزارے یا اپنی وشی گراڈ کی وصیت پر کچھ لمبے عرصے تک خوشی منا سکے۔ اس کام کی آخری تکمیل کے فوراً بعد جب کارواں سرائے نے پوری طرح کام شروع کر دیا تھا اور پُل سے دنیا متعارف ہو چکی تھی، محمد پاشا نے ایک مرتبہ پھر اپنے سینے میں وہی "سیاہ چھری" محسوس کی اور یہ احساس آخری ثابت ہوا۔

ایک جمعہ کے روز وہ اپنے سٹاف کے ہمراہ نماز ادا کرنے کے لیے مسجد گیا۔ چیتھڑوں میں ملبوس ایک نیم پاگل درویش اپنا بایاں ہاتھ خیرات کے لیے پھیلائے ہوئے اس کے پاس پہنچا۔ وزیر مڑا اور اپنے سٹاف کے ایک رکن سے کہا کہ اسے خیرات دے، مگر درویش نے فوراً ہی قصابوں کا مڑا چھرا اپنی داہنی آستین سے نکال کر زور سے وزیر کی پسلیوں میں گھونپ دیا۔ اس کے سٹاف نے درویش کو دوسرے جہان رخصت کر دیا، مگر وزیر اور اس کے قاتل نے بیک وقت دم توڑا۔ مردہ قاتل جس کا چہرہ بڑا اور سرخ تھا، بانہیں اور ٹانگیں پھیلائے ہوئے یوں پڑا تھا جیسے اپنے احمقانہ وار کے جذبے سے وہ اب بھی فرحت محسوس کر رہا ہو۔ اس کے پاس وزیر اعلیٰ پڑا تھا جس کے چغے کے سینے کے بٹن کھلے تھے اور اس کی پگڑی اچھل کر دور جا پڑی تھی۔ اپنے آخری ایام میں وہ لاغر ہو گیا تھا، اس کی کمر جھک گئی تھی اور خد و خال زیادہ تر مرجھائے ہوئے اور کھردرے ہو گئے تھے اور اب ایسی حالت میں کہ آدھی چھاتی سے ننگا، سر سے ننگا، بدن سے خون کا جریان بل کھایا ہوا اور چرمرایا ہوا وہ زیادہ سوکولوویٹی (Sokolovici) کا بوڑھا پٹا ہوا کسان لگتا تھا، بہ نسبت حاکم کے جو تھوڑی دیر پہلے تک تمام ترک سلطنت کا نظم و نسق

چلا تا تھا۔

کئی مہینے گزر جانے کے بعد وزیر کے قتل کی اطلاع قصبے میں پہنچی۔ اس وقت بھی یہ واضح اور حتمی حقیقت کے طور پر نہیں 'بلکہ رازدارانہ سرگوشی کے ذریعے جو ممکن تھا' صحیح ہو یا نہ ہو۔ وجہ یہ تھی کہ ترک سلطنت میں اس بات کی اجازت نہ تھی کہ المیوں سے متعلق اور دیگر بری خبروں اور گپ شپ کو پھیلایا جائے' چاہے وہ کسی نزدیک کے ملک سے تعلق رکھتی ہوں' چہ جائیکہ وہ اپنے ملک سے تعلق رکھتی ہوں---- اور پھر اس المیے کے متعلق خاص بات یہ تھی کہ وزیر اعلیٰ کی موت کی بابت زیادہ بات چیت سے کسی کو فائدہ نہیں ہوتا۔

اس کے مخالفین کی پارٹی جو آخر کار اسے گرانے میں کامیاب ہو گئی تھی' امید رکھتی تھی کہ اس کے جنازے کے ساتھ ہی اس کی شگفتہ یاد بھی دفن ہو جائے گی اور استنبول میں محمد پاشا کے لواحقین' معاون اور ساتھی اپنے دور کے وزیر اعلیٰ کے متعلق کم از کم بات کرنے پر کوئی اعتراض بھی نہیں کرتے تھے' کیونکہ اس طرح نئے حکمرانوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے اور اپنا پچھلا ریکارڈ نظرانداز کروانے کے مواقع بڑھ جاتے تھے' مگر دریبنہ پر دو عمدہ عمارتوں نے پہلے ہی تجارت اور مواصلات پر وشی گراڈ کا قبضہ شروع کر دیا تھا اور یہ عمارتیں زندوں اور مردوں کا اور اقتدار سنبھالنے والوں اور اقتدار سے ہاتھ دھونے والوں کا خیال کیے بغیر اثر انداز ہوتی رہیں۔ جلد ہی قصبہ پہاڑی کے دامن سے نیچے دریا کے کنارے کی طرف کھسکنا شروع ہو گیا۔ ترقی کرتا ہوا یہ زیادہ سے زیادہ پُل کی جانب اور سرائے کے گرد پھیل گیا' جسے لوگ سٹون این (StoneInn) (پتھر کی سرائے) کے نام سے پکارتے تھے۔

اس طرح پُل اور اس کے ساتھ کیپیا کی تخلیق ہوئی اور یہ ہیں وہ حالات جن کے نتیجے میں قصبہ اس کے ارد گرد پھیل گیا۔ اس کے بعد کوئی تین سو سال سے زیادہ عرصے تک اس کا کردار قصبے کی ترقی میں اور لوگوں کی زندگی میں اسی طرح اہم رہا جس طرح کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اور اگر سچ کہا جائے تو اس کی اہمیت کا اور اس کے وجود کا دارومدار اس کی پائیداری پر تھا۔ قصبے کی ترتیب میں اس کے چمکتے ہوئے خطوط تبدیل نہیں ہوئے تھے' بالکل اسی طرح جس طرح آسمان کے سامنے پہاڑوں کے خاکے' انسانی نسلوں کی تیز رفتار ترقی اور تبدیلیوں کے باوجود یہ بالکل ویسے کا ویسا ہی رہا' جیسے وہ پانی جو اس کے نیچے بہہ رہا تھا۔ گو فطری تقاضے کے بموجب پرانا پن بھی ہو گیا' لیکن وقت کے اس پیمانے پر جو نہ صرف انسانی زندگی کی طوالت سے' بلکہ نسلوں کے تمام سلسلوں کے ختم ہونے سے بھی بڑا ہے۔ پس ان حالات میں اس کا بڑھاپا انسانی آنکھ نہ دیکھ سکی۔ اس کی زندگی جو اگرچہ فانی تھی' ابدیت سے مشابہت رکھتی تھی' اس کا انجام نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

پہلی صدی گزر گئی جو آدمیوں کے لیے اور بہت سے ان کے کاموں کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی' لیکن جو عمارات اچھی طرح سوچ کر اور مستحکم بنیادوں پر کھڑی کی گئی تھیں' ان کے لیے یہ صدی غیر اہم رہی۔ دریبنہ کاپل کیپیا سمیت اور اس کے نزدیک کارواں سرائے بدستور قائم رہے اور لوگ ان سے اسی طرح فائدہ اٹھاتے رہے' جس طرح کہ ابتدا سے حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح دوسری صدی بھی ختم ہو جاتی جو موسمی اور انسانی نسل کی تبدیلیوں کی متحمل ہوتی اور یہ عمارات اسی طرح قائم رہتیں' لیکن جو چیز وقت نہ کر سکا' وہ دور دراز کے ناپائیدار اور اس قسم کے حالات نے کر دیے جن کے متعلق پیش گوئی ممکن نہ تھی۔

اس وقت سترہویں صدی کے آخر میں ہنگری کے متعلق بہت کچھ سرگوشیاں ہوتی تھیں۔ قصے بیان ہوتے تھے اور گانے گائے جاتے تھے' کیونکہ یہاں سے ترکوں کی فوج اپنے سو سالہ قبضے کے بعد واپس جانے والی تھی۔ بوسنیا کے بہتیرے سپاہی (زمیندار جن کے پاس فوجی خدمات کے عوض زمینیں ہوتی تھیں) ترکی فوجوں کی واپسی سے قبل اپنی جائیدادوں کی حفاظت کی خاطر لڑی جانے جنگوں میں اپنی ہڈیاں ہنگری کی سرزمین پر چھوڑ آئے تھے۔ خیال کیا جاتا ہو گا کہ یہ لوگ ان بہت سارے سپاہیوں کے مقابلے میں خوش قسمت تھے جو صرف دو ہاتھ اور دو پیر لے کر بوسنیا میں اپنے پہلے گھروں کو لوٹے جہاں ہنگری کی بڑی بڑی اور وسیع جائیدادوں پر نوابوں جیسی ٹھاٹھ باٹ کی زندگی گزارنے کے بعد کم زمین اور افلاس زدہ زندگی کی مشکلات سے ان کا سامنا ہوا۔

یہ دور کی غیر یقینی گونج وشی گراڈ تک آ پہنچی' لیکن وہاں تو اس بات کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہنگری جیسا دور افتادہ ملک کا جسے افسانوی سرزمین کہا جاتا ہے' قصبے کی حقیقی روزمرہ کی زندگی سے بھی کوئی تعلق ہو سکتا ہے' لیکن ترکوں

کی ہنگری سے پسپائی کے وقت سلطنت کی سرحدوں کے باہر وقف کی جائیدادیں بھی رہ گئی تھیں جن کی آمدن سے وشی گراڈ کی قافلہ سرائے کا خرچ چلتا تھا۔

قصبے کے لوگ اور مسافر پچھلے سو برسوں سے سٹون این (پتھر کی سرائے) سے استفادہ کر رہے تھے' اس کے عادی ہو گئے تھے اور یہ انھوں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ سرائے کن ذرائع کی بدولت چلتی ہے' آمدن کی بنیاد کیسے رکھی گئی ہے یا کن ذرائع سے یہ آمدن ہوتی ہے۔ سب نے اسے استعمال کیا تھا اور اس طرح فائدہ حاصل کیا تھا جس طرح سڑک کے کنارے کوئی زرخیز اور بابرکت باغ ہو جو کسی کا بھی نہیں تھا اور سب کا تھا۔ وہ مشین کی طرح دہراتے تھے: "اللہ وزیر کی روح کو سکون عطا کرے"۔ لیکن یہ کوئی نہ سوچتا تھا کہ وزیر کو مرے ہوئے سو برس بیت چکے ہیں' اور نہ یہ پوچھتا تھا کہ اب شاہی اراضی اور وقف کا کون محافظ تھا۔ کسی کے خیال میں یہ بات آ سکتی تھی کہ دنیا کے امور ایک دوسرے پر ایسا انحصار رکھتے تھے اور باوجود بڑے بڑے فاصلوں کے یہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔

پہلے پہل قصبے میں کسی نے اس بات کا نوٹس بھی نہ لیا کہ سرائے کی آمدن بند ہو گئی تھی۔ نوکر چاکر بدستور کام کرتے رہے اور سرائے میں مسافر پہلے کی طرح آتے رہے۔ خیال یہ کیا جاتا رہا کہ سرائے کے خرچ کے لیے جو روپیہ ملتا ہے' اس میں پہلے کی طرح پھر تاخیر ہو گئی ہے' لیکن مہینے گزر گئے اور مہینوں کے بعد سال مگر روپیہ نہ آیا۔ متولیا (وصیت کا ناظم) ڈاتھوڑہ متویلٹ (لوگ اس کے عہدے اور عرف کو ملا کر ڈاتھوڑہ متویلٹ کہا کرتے تھے) نے ہر آدمی کو جس کے متعلق وہ سوچتا تھا' درخواست دی مگر اسے کہیں سے بھی جواب نہ ملا۔ مسافر خود اپنی ضرورتوں کا خیال رکھنے لگے اور اپنے آرام کے لیے سرائے کو جتنا صاف ضروری سمجھتے تھے' کرتے تھے' لیکن جونہی ایک مسافر چلا جاتا تھا' وہ اپنے پیچھے کھاد اور الٹ پلٹ چیزیں چھوڑ جاتا' جسے دوسرے اسی طرح صاف اور ٹھیک ٹھاک کر دیتے جس طرح اس نے آ کر کی تھیں' لیکن ہر مسافر کے بعد گندگی کچھ تھوڑی زیادہ مقدار میں رہ جاتی تھی جتنی کہ اس نے خود دیکھی تھی۔

بے چارے ڈاتھوڑا نے سرائے کو بچانے اور چلانے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس کے بس میں تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے اپنا ذاتی روپیہ خرچ کیا اور پھر رشتہ داروں سے قرض لینا شروع کیا' چنانچہ وہ سال بہ سال گزارہ کرتا رہا اور اس قیمتی عمارت کی خوبصورتی کو برباد ہونے سے بچاتا رہا۔ جو لوگ اسے ملامت کرتے کہ کیوں وہ اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہے اور ایسی عمارت کو محفوظ رکھنے کی سعی کر رہا ہے جو محفوظ نہیں رکھی جا سکتی' تو وہ جواب دیتا کہ وہ اپنے پیسوں کی صحیح طور پر سرمایہ کاری کر رہا ہے' وہ خدا تعالیٰ کو قرض دے رہا تھا اور وہ (متولیا) آخری آدمی ہو گا جو اس وصیت کو چھوڑے گا' حالانکہ باقی سب اسے چھوڑ گئے تھے۔

اس عقل مند اور خدا ترس' اپنی بات پر اڑنے والے اور ضد کے پکے آدمی نے جسے قصبہ ایک عرصے تک یاد کرتا رہا' کسی کو اس بات کی اجازت نہ دی کہ اسے اس کی ناکام کوشش سے باز رکھے۔ اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر کے وہ ایک مدت سے اس خیال سے سمجھوتہ کر بیٹھا تھا کہ اس زمین پر ہمارے مقدر میں لکھا ہے کہ زوال' موت اور تحلیل ہونے کے خلاف جدوجہد کی جائے اور آدمی کو یہ جدوجہد برابر جاری رکھنی چاہیے' خواہ یہ بالکل ہی بیکار کیوں نہ ہو۔ سرائے کے سامنے جو کہ گر گر کر تباہ ہو رہی تھی' وہ بیٹھ کر ان سب کو جواب دیتا جو اسے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے یا اس پر ترس رکھتے تھے۔

"میرے متعلق افسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' کیونکہ ہم سب نے صرف ایک مرتبہ مرنا ہے' جبکہ بڑے آدمی دو بار مرتے ہیں۔ ایک دفعہ جب وہ اس جہان کو چھوڑتے ہیں اور دوسری مرتبہ جب ان کی زندگی کے کام مٹ جاتے ہیں"۔

جب وہ مزدوروں کو دہاڑ داری دینے کے قابل نہ رہا' تو بڑھاپے کے باوجود اس نے سرائے کے آس پاس سے گھاس پھوس خود اپنے ہاتھوں سے اکھیڑنا اور عمارت کی چھوٹی موٹی مرمت کرنا شروع کر دی۔ پھر ایک روز جب وہ چھت پر ٹوٹی ہوئی ایک سلیٹ کی مرمت کے لیے چڑھا' تو اس کو موت کے آہنی پنجے نے دبوچ لیا۔ یہ قدرتی بات ہے کہ ایک چھوٹے قصبے کا ہوجا (Hodja) اس عمارت کو قائم نہیں رکھ سکتا تھا جسے وزیر اعلیٰ نے تعمیر کروایا تھا اور جسے تاریخی واقعات نے تباہی کی سزا دے دی تھی۔

ڈاتھوڑا کی موت کے بعد سرائے نے تیزی سے کھنڈرات میں تبدیل ہونا شروع کر دیا۔ زوال کے آثار ہر جگہ نمودار ہونے لگے۔ گٹر پھٹنے شروع ہو گئے اور ان سے متعفن بدبو خارج ہونے لگی۔ چھتوں سے بارش کا پانی اندر ٹپکنے لگا۔ دروازوں اور کھڑکیوں سے ہوا اندر داخل ہونے

لگی اور اصطبل کھاد اور گھاس پھوس سے بھر گئے، لیکن باہر سے یہ مکمل عمارت اب بھی بغیر کسی تبدیلی کے خاموش اور خوبصورتی میں لازوال دکھائی دیتی تھی اور نچلی منزل میں بڑی محرابی کھڑکیاں جن میں فیتے کی طرح نازک جالیاں لگی ہوئی تھیں جو نرم پتھر کے ایک ٹکڑے سے کاٹ کر بنائی گئی تھیں، باہر کی دنیا کو امن پسندانہ نظر سے دیکھ رہی تھیں، لیکن اوپر کی منزل میں سادہ کھڑکیاں پہلے ہی سے غربت و افلاس، بے توجہی اور اندرونی بدنظمی کا پتا دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ مسافروں نے قصبے میں رات بسر کرنے سے گریز کرنا شروع کر دی۔ اگر وہ ٹھہرتے بھی تو استاموویٹ کی سرائے میں ٹھہرتے، جہاں وہ رات بسر کرنے کا کرایہ ادا کرتے۔ وہ کارواں سرائے میں بہت ہی کم آتے تھے، اگرچہ انھیں یہاں کرایہ ادا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ جو آتے تھے، وہ صرف وزیر کی روح کو ایصال ثواب پہنچانے آتے تھے۔

آخر کار جب یہ بات صاف ہو گئی کہ روپے کے آنے کی کوئی صورت نہیں تو ہر آدمی نے عمارت کی دیکھ بھال کی طرف بے پرواہی کے متعلق بہانے ترک کر دیئے، یہاں تک کہ نیا متولیا (Mutevelia) بھی بے بس ہو گیا اور کارواں سرائے خاموش اور ویران ہو کر ایسی تمام عمارتوں کی طرح کھنڈر بن گئی، جہاں نہ کوئی رہتا ہے اور نہ کوئی دیکھ بھال کرتا ہے۔ جنگلی جڑی بوٹیاں، گھاس پھوس اور گوکھرو (خاردار پودا) اس کے اردگرد اگ آئے۔ پہاڑی کووں نے چھت میں گھونسلے بنا لیے اور عام کووں کے کالے کالے غول یہاں جمع ہونا شروع ہو گئے۔

اس طرح اپنے وقت سے پہلے اور غیر متوقع طور پر غیر آباد (ایسی تمام چیزیں غیر متوقع طور پر وقوع پذیر ہوا کرتی ہیں) وزیر کی سرائے گر گر کر کھنڈر بننا شروع ہو گئی۔

جہاں کارواں سرائے غیر معمولی حالات کی وجہ سے مجبور ہو کر اپنا مقصد پورا نہ کر سکی اور وقت سے پہلے کھنڈر بننا شروع ہو گئی، وہاں پل جسے نہ تو نگرانی کی ضرورت تھی اور نہ چالو رکھنے کی، بالکل ٹھیک ٹھاک رہا اور اس میں کوئی تغیر رونما نہ ہوا۔ اس نے اسی طرح دریا کے دونوں کناروں کو ملائے رکھا اور دریا پار کرنے والوں کے زندہ یا مردہ وزن اسی طرح دریا پار پہنچاتا رہا جیسا کہ یہ اپنے اوائل ایام میں کیا کرتا تھا۔

اس کی دیواروں میں پرندوں نے گھونسلے بنا لیے تھے اور وقت نے جو باریک شگاف ڈالے تھے، ان میں گھاس کے گچھے اُگ آئے تھے۔ اس کے زردی مائل مسام دار پتھر جن سے یہ بنا تھا، گرمی اور رطوبت کی تبدیلیوں کے زیر اثر سکڑتے اور سخت ہوتے رہے۔ پھر مستقل طور پر ہواؤں کے مسلسل تھپیڑوں سے جو دریا کی وادی کے اوپر اور نیچے والے حصوں میں چلا کرتی تھیں، بارشوں سے دھل جانے اور موسم گرما کی تیز تپش سے خشک ہو جانے کے عمل سے رفتہ رفتہ یہ پتھر کپڑے کی طرح پھیکا سفید ہو گیا اور جھٹ پٹ میں یوں چمکتا تھا جیسے اندر سے روشن ہو۔ بڑے بڑے سیلابوں کی کثرت جو قصبے کے لیے بہت بڑی مصیبت تھی، پل کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ وہ ہر سال بہار اور خزاں میں آتے رہے، مگر یہ سب کے سب پل کے پاس قصبے کے لیے خطرناک اور نقصان رساں نہ تھے۔

ہر سال ایک یا دو مرتبہ درینہ میں طغیانی آتی اور اس کا کیچڑ والا پانی غراتا اور گرجتا ہوا پل کی محرابوں سے گزر کر کھیتوں کی باڑیں توڑ دیتا۔ درختوں کے تنے جڑوں سے اکھاڑ دیتا اور یہ مٹی والا سیاہ پانی دریا کے کناروں کے جنگلات کے پتوں اور شاخوں سے بھر جاتا۔ دریا کے نزدیک گھروں کے جو صحن، باغیچے اور گودام ہوتے انھیں نقصان پہنچتا، لیکن یہ سب کچھ وہیں ختم ہو جاتا۔ بعض بڑے سیلاب جو بیس اور تیس برس کے بے قاعدہ وقفوں سے آتے، وہ بعد میں اسی طرح یاد رکھے جاتے جیسے بغاوتیں یا جنگیں اور لمبی مدت تک وقت کے تعین کے لیے تاریخ کے طور پر استعمال ہوتے رہتے، مثلاً لوگوں کی عمریں یا زندگی کے کچھ حصوں کا یوں حساب لگایا جاتا: "بڑے سیلاب سے پانچ یا چھ سال قبل"۔ "بڑے سیلاب کے دوران" وغیرہ وغیرہ۔

☆☆☆

سیلابوں کے علاوہ پل اور اس کے کپیا پر اور حملے بھی ہوئے اور ان کا سبب واقعات کی ترقی اور انسانی جھگڑے تھے، مگر یہ پل کو نقصان پہنچانے یا اسے مستقل طور پر تبدیل کرنے میں بے لگام پانی سے کم ہی تھے۔

پچھلی صدی کے شروع میں سربیا کے علاقے میں بغاوت پھیل گئی۔ یہ قصبہ جو بوسنیا اور سربیا کی سرحد پر واقع تھا، ہمیشہ قریبی اور مستقل طور پر ہر اس چیز سے وابستہ رہا ہے جو سربیا میں واقع ہوتی رہی ہے اور پھر اس سے اس طرح پیوست رہا جیسے انگلی سے ناخن۔

جب سے سلطنت وجود میں آئی تھی، ایسی افواہیں اڑتی رہتی تھیں، کیونکہ سازشوں اور بغاوتوں کے بغیر حکومت

نہیں ہوتی' جس طرح کام اور پریشانی کے بغیر جائیداد نہیں ہوتی' لیکن وقت کے ساتھ ساتھ سربیا کی بغاوت نے بوسنیا کے سارے پشالک کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرنا شروع کر دیا' خاص طور پر اس قصبے کی زندگی کو جو سرحد سے صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا۔

جونہی سربیا میں جدوجہد نے زور پکڑا' بوسنیا کے ترکوں سے زیادہ سے زیادہ مطالبے کیے گئے' انھیں کہا گیا کہ وہ فوج میں آدمی بھیجیں اور جنگ کے سازوسامان میں اپنا حصہ ادا کریں۔ ایک موسم گرما میں بغاوت ان ضلعوں میں پھیل ہی گئی۔ اوژیتی (Uzice) کے گرد چکر کاٹ کر باغی قصبے سے دو گھنٹے کی مسافت تک پہنچ گئے۔

قصبے میں دونوں' ترکوں اور سربوں نے قسمیں کھائیں کہ انھوں نے اپنے کانوں سے "کراجارج" کی توپوں کی گھن گرج سنی تھی (قدرتی طور پر بالکل مختلف احساسات کے ساتھ) لیکن اگر اس معاملے میں کچھ بھی شک تھا کہ کیا سرب باغیوں کی توپوں کی گونج اتنی دور سنائی دیتی تھی' جتنا کہ یہ قصبہ کیونکہ ایک آدمی اکثر خیال کرتا ہے کہ وہ جس چیز سے ڈرتا ہے یا اس کی امید رکھتا ہے' اسے وہ سن سکتا ہے' تو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ باغی رات کے وقت دینیو فو اور گاسٹیلڈے کے درمیان پانوس کی ننگی پہاڑی کی چوٹی پر آگ روشن کیا کرتے تھے جس پر بہت بڑے بڑے چیل کے درخت قصبے کے اندر سے دیکھ کر گنے جاسکتے تھے۔

ترک اور سرب دونوں صاف طور پر یہ آگ دیکھتے تھے' اگرچہ دونوں یہ ظاہر کرتے تھے کہ انھوں نے نہیں دیکھی۔ اپنے تاریک کمروں کی کھڑکیوں میں سے اور گھنے باغات کے سایوں میں سے دونوں بڑی توجہ سے یہ بات نوٹ کیا کرتے تھے کہ آگ کب اور کہاں جلائی گئی اور کب بجھائی گئی۔ سربیا کی عورتیں اندھیرے میں اپنے جسم پر صلیبی نشان بناتیں اور ناقابل بیان جذبات سے رو پڑتیں' لیکن اپنے آنسوؤں میں سے وہ اس بغاوت کی آگ کا عکس دیکھتیں جس طرح وہ پراسرار شعلے جو ایک مرتبہ ریڈی ساف کی قبر پر پڑے تھے اور جنھیں ان کے بزرگ تقریباً تین صدیاں پیشتر اسی میدان میں اپنے آنسوؤں میں سے دیکھ چکے تھے۔

یہ جھلملاتے اور ناہموار شعلے جو گرمیوں کی رات کے سیاہ پس منظر کے ساتھ بکھرے ہوئے تھے اور جن میں آسمان اور پہاڑ ملے ہوئے تھے' سربوں کو یوں دکھائی دیتے جیسے ستاروں کا کوئی نیا جھرمٹ جس میں وہ شوق سے واضح آثار پڑھتے اور لرزتے ہوئے اپنی قسمت کا اور آنے والے واقعات کا اندازہ لگاتے۔ ترکوں کے لیے وہ آگ کے سمندر کی پہلی لہر تھے جو سربیا میں پھیل رہی تھی اور جوان کے خیال میں قصبے کے اوپر پہاڑوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی۔ موسم گرما کی ان راتوں میں دونوں کی خواہشات اور دعائیں انھی شعلوں کے گرد گھوما کرتی تھیں' گو ان کی سمتیں بھی مختلف تھیں۔

جب سینٹ الیاس (St.Elias) کی ضیافت کے فوراً بعد پانوس سے آگ غائب ہو گئی اور بغاوت کو اوزیٹے (Uzice) ضلع سے پیچھے دھکیل دیا گیا' تو ایک مرتبہ پھر دونوں اطراف سے اپنے اپنے جذبات کے اظہار کا سلسلہ بند ہو گیا اور یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ دونوں فریقین کے سچے جذبات کیا تھے؟ ترک شکر ادا کر رہے تھے کہ بغاوت اب ان سے بہت دور تھی اور امید رکھتے تھے کہ یہ بالکل ختم ہو جائے گی اور اس کا انجام بھی وہی ہو گا' جو تمام دہریت کی اور برائی کی تحریکوں کا ہوا ہے۔

ان دنوں بوسنیا کے پاشالوک اور سربیا کے درمیان پُل کی اہمیت بحیثیت ایک یقینی کڑی کے بہت بڑھ گئی تھی۔ اب قصبے میں ایک مستقل فوجی طاقت رکھی گئی تھی جو دریند پر پُل کی حفاظت کرتی تھی اور جو ضلع کے لمبے زمانے میں بھی سبکدوش نہیں کی گئی تھی۔ کم سے کم مزدوروں کے ساتھ یہ کام اچھی طرح سرانجام دینے کے لیے سپاہیوں نے پُل کے مرکز میں لکڑی کا قلعہ کھڑا کرنا شروع کر دیا۔ اس تنگ انسانیت تعمیر کی شکل' پوزیشن اور سامان بھونڈے پن کے مظہر تھے (لیکن دنیا کی تمام فوجیں اپنے خاص مقاصد اور وقتی ضروریات کے لیے ایسی عمارتیں تعمیر کرتی ہیں جو بعد میں پرامن اور عام حالات میں نامعقول اور ناقابل فہم دکھائی دیتی ہیں)

یہ دراصل ایک دو منزلہ مکان تھا جو بھدا اور گھناؤنا تھا۔ اسے بھدے قسم کے شہتیروں اور ایسے تختوں سے تیار کیا گیا تھا جو رندے نہیں گئے تھے۔ اس کے نیچے ایک سرنگ نما کھلا راستہ تھا۔ یہ قلعہ نما مکان مضبوط بیموں پر استوار کیا گیا تھا' تاکہ یہ پُل کو باندھے رکھے اور صرف کیپیا پر اس کے دونوں سروں پر سہارے دیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک بائیں جانب اور دوسرا دائیں روش پر تھا۔ اس کے نیچے گاڑیوں' گھوڑوں اور پیادہ چلنے والوں کے لیے راستہ تھا' مگر اوپر کی چھت سے جس میں سپاہی ہوتے تھے اور جسے کھلی

سیڑھیاں نچلے حصے سے ملاتی تھیں' ہر گزرنے والے کی' اس کے کاغذات اور سامان کی جانچ پڑتال ہر وقت ممکن تھی اور انھیں ضرورت پڑنے سے روکا جا سکتا تھا۔

اس قلعے نے پُل کی شکل و صورت یقیناً تبدیل کر دی' دل کش کپیا اب ایک لکڑی کی تعمیر کے نیچے چھپا ہوا تھا جو اس کے اوپر لکڑی کے شہتیروں کے ساتھ یوں چوکڑی مارے بیٹھی تھی جیسے کسی قسم کا کوئی بہت ہی بڑا دیو ہیکل پرندہ ہو۔

جس دن لکڑی کا قلعہ تیار ہوا' اس سے بری طرح گندے بروزے کی تیز بو آ رہی تھی اور اس کے اندر قدموں کی آواز گونج پیدا کرتی تھی۔ پہرہ دار سپاہیوں نے اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ پہلے ہی روز قلعے نے پوپھٹتے پھٹتے ایک شکار دام میں پھنسا لیا۔

علی الصبح ہلکی گلابی دھوپ میں قلعے کے نیچے کچھ سپاہی اور کچھ قصبے کے مسلح آدمی اکٹھے ہوئے جن میں ترک بھی تھے جو فوج کی امداد کے لیے قصبے کے گرد رات کے وقت گارڈ کی ڈیوٹی بجا لاتے تھے۔ اس گروپ کے درمیان ایک کوتاہ قد بوڑھا آدمی کھڑا تھا جو بے خانماں آوارہ گرد مذہبی زائر تھا۔ یہ شخص راہب اور گداگر کے بین بین تھا' لیکن نرم اور امن پسند تھا۔ اپنی غربت میں بھی وہ ستھرا اور پر کشش تھا اور سفید بالوں اور جھریوں کے باوجود وہ مطمئن تھا اور مسکرا رہا تھا۔ یہ ایک سنکی بوڑھا آدمی تھا جس کا نام ڈیلیسیرشے (Oostilje) تھا اور یہ چیرشنج کا رہنے والا تھا۔ برسوں سے یہ آدمی اِدھر اُدھر سیاحت کر رہا تھا۔ نرم مزاج' تقدس نما اور مسکراتا ہوا یہ آدمی ہمیشہ گرجا گھروں' خانقاہوں' مذہبی مجلسوں اور میلوں کے چکر لگایا کرتا' کفارہ ادا کرتا اور روزے رکھا کرتا۔

یہ بوڑھا آدمی روگاٹیٹسا (Rogatica) سے آنے والی سڑک کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ بدقسمتی سے وہ اس دن پہلا مسافر تھا جس دن پُل پر لکڑیوں کا قلعہ مکمل ہو گیا تھا اور پہلی گارڈ نے وہاں چوکیاں سنبھالی تھیں۔ درحقیقت اس نے بہت خراب وقت کا انتخاب کیا تھا۔ پو ابھی پوری طرح پھٹی نہیں تھی۔ اس نے موم بتی کی طرح اپنے سامنے ایک قسم کا موٹا عصا اٹھا رکھا تھا جو عجیب سے نشانات اور حروف سے مزین تھا' قلعے نے اسے یوں نگل لیا جیسے مکڑی مکھی کو۔

انھوں نے اس سے روکھے پن سے پوچھ گچھ کی۔ پوچھا کہ وہ کون ہے؟ کیا کام کرتا ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ اور حکم دیا کہ عصا پر جو جو حروف اور نشانات ہیں' ان کی وضاحت کرے۔ اس نے آزادی سے اور بلا تامل ایسے سوالات کے بھی جوابات دیے جو اس سے پوچھے نہ گئے تھے۔ وہ یوں جواب دے رہا تھا جیسے قیامت کے روز خدا کے سامنے ہے اور نہ کہ ابلیس ترکوں کے ایک گروہ کے سامنے۔ اس نے کہا کہ وہ کچھ بھی نہیں اور کوئی چیز نہیں' بلکہ اس زمین پر ایک مسافر ہے' ایک عارضی دنیا میں ایک عارضی شے ہے۔ سورج کی روشنی میں ایک سایہ ہے' لیکن وہ اپنے چند مختصر دن دعا میں اور ایک خانقاہ سے دوسری خانقاہ کو جانے میں صرف کر رہا ہے' حتیٰ کہ وہ سب مقدس مقامات کی زیارت کر لے اور سربیا کے تمام زاروں اور امراء وغیرہ کے ترکے اور مقبرے دیکھ لے۔ جہاں تک نشانات اور حروف کا تعلق ہے' یہ سربیا کی آزادی' عظمت' ماضی اور مستقبل کی نمائندگی کرتے ہیں' "کیونکہ" بوڑھے آدمی نے ذرا سا مسکرا کر ڈرتے ہوئے کہا:

"حشر نشر کا وقت جلد آ رہا ہے اور جو کچھ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے اور جو کچھ زمین پر اور آسمانوں میں دیکھا جائے گا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حشر اب بالکل قریب ہے۔ بادشاہت دوبارہ پیدا ہو چکی ہے۔ آزمائشوں سے نجات دلائی جا چکی ہے اور سچ پر بنیاد رکھ دی گئی ہے"۔

"دوستو! میں جانتا ہوں کہ آپ کی ساعت کو یہ باتیں خوش گوار محسوس نہیں ہوئی ہوں گی اور مجھے یہ باتیں آپ کے سامنے کرنی بھی نہیں چاہئیں' لیکن چونکہ آپ نے مجھے روکا ہے اور کہا ہے کہ میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں' جہاں جہاں بھی یہ میری رہنمائی کرے' خدا سچائی ہے اور خدا ایک ہے اور اب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنے راستے پر جانے دیجیے' کیونکہ آج میں نے بانڑا (Banda) میں مقدس باپ' خدا اور اس کے بیٹے کی خانقاہ پر حاضری دینی ہے۔

مترجم شیٹکو جس کا ترکی زبان کا علم بہت کمزور تھا' ان تجریدی عقائد کے لیے متبادل الفاظ ڈھونڈنے کی بے فائدہ کوشش کرتا رہا۔ گارد کا کپتان جو ایک بیمار اناطولوی تھا اور نیند سے ابھی پوری طرح بیدار بھی نہیں ہوا تھا' مترجم کے خلط ملط اور بے ربط الفاظ سنتا رہا اور وقتاً فوقتاً بوڑھے آدمی پر ایک نظر ڈال دیتا تھا جو بغیر کسی خوف کے یا شیطانی خیالات کے کپتان کو دیکھتا اور اپنی آنکھوں سے تصدیق کرتا کہ جو کچھ مترجم نے بتلایا ہے' وہ ٹھیک ہے' حالانکہ خود وہ ترکی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا۔ کپتان کے ذہن کے کسی کونے میں یہ

بات صاف تھی کہ یہ آدمی کوئی فاترالعقل کافر درویش ہے جو اچھی فطرت کا اور بے ضرر پاگل ہے۔ بوڑھے آدمی کا عصا کئی جگہ سے کاٹ دیا گیا تاکہ اس کی کھوکھ میں اگر کوئی خفیہ پیغام وغیرہ چھپا ہوا ہو تو حاصل کر لیا جائے' مگر انھیں کچھ بھی نہ مل سکا' لیکن شیشکو کے ترجمے میں بوڑھے آدمی کے الفاظ سے شک ظاہر ہوتا تھا اور ان سے سیاست اور بغاوت کی بو آتی تھی۔ جہاں تک کپتان کی ذات کا تعلق ہے' وہ اس کم عقل حیوان کو اپنے راستے پر جانے دیتا' لیکن باقی سپاہی اور سول گارد وہاں جمع ہو گئے تھے' جو تفتیشی کارروائی کو بھی سن رہے تھے۔

جونہی اس بڈھے کو باندھا گیا اور کپتان شہر جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا تاکہ اسے اس کی موت کا منظر نہ دیکھنا پڑے' ترک پولیس کے سپاہی اور چند شہری آ موجود ہوئے جو پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس سربیا کے ایک نوجوان کو ہانک لائے تھے' اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے' اور اس کے چہرے اور ہاتھوں پر خراشیں تھیں۔ اس کا نام مائیل (Mile) تھا اور یہ غریب لیزشکو (Lijesko) کا رہنے والا تھا جو اوسوژنیٹا (Osojnica) کے مقام پر ایک پن چکی میں اکیلا رہتا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ انیس برس کا تھا جو بہت مضبوط اور حد درجے کا صحت مند تھا۔

اس صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے مائیل نے پن چکی میں کچھ جو پیسنے کے لیے رکھے' پھر اس نے بڑا دھارا کھول دیا اور جنگل میں لکڑی کاٹنے کے لیے چلا گیا۔ وہ بڑی کلہاڑی گھما گھما کر برچ کی نرم شاخوں کو یوں کاٹ رہا تھا جیسے تنکے۔ وہ صبح کی تازگی سے اور کام کی آسانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ خود اپنی حرکت بھی اس کے لیے خوشی تھی۔ اس کی کلہاڑی تیز تھی اور پتلی لکڑی اس کی جسمانی طاقت کے مقابلے میں بہت نازک تھی۔ اس کے کسی اندرونی جذبے نے اس کی چھاتی پھلا دی اور اس نے ہر حرکت پر زور سے چلانا شروع کیا' اس کی آواز میں ہم آہنگی اور اٹھان بڑھتی چلی گئی۔ لیزشکو کے تمام باشندوں کی طرح مائیل کو بھی نہ تو گانا سننے کا شوق تھا اور نہ ہی اسے پتا تھا کہ گانا کس طرح گایا جاتا ہے' چنانچہ گھنے اور سایہ دار جنگل میں وہ گاتا کم رہا اور چلاتا زیادہ رہا۔

سورج کی کرنیں ابھی پہاڑوں کی چوٹیوں پر پڑی ہی تھیں' مگر اس سایہ دار جگہ میں ابھی تک بالکل اندھیرا تھا۔ مائیل اوس سے تر تھا' مگر رات پر سکون نیند کر لینے' گرم کھانا کھا لینے اور کام کر لینے سے وہ گرم تھا۔ اس نے کلہاڑی گھمائی اور پتلے برچ پر اس کی جڑوں کے قریب وار کیا' لیکن درخت خم کھا کر اس نوجوان دلہن کی طرح جھک گیا جو شادی میں اسے لے جانے والے کم (Kum) کے ہاتھ کو بوسہ دینے کے لیے جھکا کرتی ہے۔ برچ پر ٹھنڈی اوس بارش کی طرح چھڑکی گئی اور وہ جھکا رہا' کیونکہ ارد گرد کی جھاڑیوں اور پودوں کی کثرت سے وہ گر نہ سکا۔ پھر اس نے کھیلتے ہوئے کلہاڑی ایک ہاتھ میں لے کر سبز شاخیں کاٹ دیں۔ اس دوران اس نے پورے زور سے گایا۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اظہار نے اس کی طاقت بحال کر دی ہے اور انھیں اور زیادہ زور سے دہرا دیا تھا' تو دن نکلنے کے وقت مائیل نے یہ گانا گایا' حتیٰ کہ اس نے شاخیں کاٹ چھانٹ لیں اور اپنا کام ختم کر دیا۔ اس کے بعد وہ گیلے ڈھلان پر اپنے پیچھے اپنے تازہ بوجھ کو کھینچنے لگا۔ پن چکی کے سامنے کچھ ترک تھے' انھوں نے اپنے گھوڑے باندھ دیئے تھے اور کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ دس آدمی تھے' وہ دوبارہ اپنے آپ میں آیا اسی طرح جس طرح لکڑیوں کے لیے جانے سے پیشتر تھا۔ بھدا' جسم پر چیتھڑے اور پریشان حال' جس کے سامنے نہ کراجارج تھا' نہ دوشیزہ اور نہ پرچم۔ ترکوں نے انتظار کیا۔ جب اس نے کلہاڑی نیچے رکھ دی' تو وہ اس پر تمام اطراف سے پل پڑے اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس کے گلے میں رسی ڈال کر باندھ دی اور قصبے لے گئے۔ راستے میں انھوں نے اسے مارا پیٹا اور اس کی ٹانگوں کے درمیانی حصے پر لاتیں ماریں۔

قلعے کے نیچے کپیا پر جہاں انھوں نے ابھی ابھی نیم پاگل بڈھے کو باندھا تھا' قصبے کے کچھ بدکن بھی سپاہیوں سے آملے تھے' حالانکہ دن ابھی ابھی چڑھا تھا۔ ان میں بعض سربیا سے آئے ہوئے پناہ گزیں بھی تھے جن کے گھر وہاں جلا دیے گئے تھے۔ سب کے سب مسلح تھے اور اس طرح سنجیدہ تھے جس طرح کوئی بڑا واقعہ یا کوئی فیصلہ کن جنگ زیر بحث تھی۔ ان کے جذبات میں سورج کے چڑھنے کے ساتھ ساتھ تیزی آگئی۔ سورج گولیش (Goles) کے اوپر افق پر چمکتی ہوئی کہر کے درمیان تیزی سے اوپر آ رہا تھا۔ ترکوں نے خوف زدہ نوجوان کے لیے یوں انتظار کیا جیسے وہ کوئی انقلابی لیڈر ہو حالانکہ وہ چیتھڑوں میں ایک افلاس زدہ نوجوان تھا جو دریا کے بائیں کنارے سے لایا گیا تھا جہاں کوئی بغاوت نہیں تھی۔

ایک غریب آدمی تھا جو پن چکی کی نگہداشت کرتا تھا اور کہ وہ لکڑیاں کاٹتا تھا اور اسے معلوم نہیں تھا کہ اسے

کیوں یہاں لایا گیا تھا۔ وہ خوف سے کانپ رہا تھا اور حقیقت میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ہوا کیا تھا اور کس طرح ہوا تھا' نیچے ندی کی تازگی سے جب وہ کیف آور موڈ میں آیا' تو اسے یک لخت معلوم ہوا کہ وہ بہت سے لوگوں کے سامنے ایک جواب دہ کی حیثیت سے کپیا پر بندھا ہوا مارا پیٹا جا رہا تھا جو تمام دلچسپیوں کا مرکز تھا۔ وہ خود بالکل بھول گیا تھا کہ اس نے کبھی کوئی معصوم ترین گیت بھی گایا ہے۔

لیکن ترک اپنے بیان پر مصر تھے کہ وہ اس وقت باغیانہ گیت گا رہا تھا جس وقت وہ گزر رہے تھے' کہ اس نے ان کی مزاحمت کی جس وقت وہ اسے باندھ رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اس بات کی کپتان کے سامنے حلفیہ تصدیق کی جو ان سے پوچھ گچھ کر رہا تھا:

"کیا تم اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتے ہو؟"

"میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہوں!"

"کیا یہ بیان سچا ہے؟"

"یہ بیان سچا ہے"۔

اس طرح اسے تین مرتبہ دہرایا گیا۔ پھر انھوں نے نوجوان کو یلیسیرڈے کے پاس بٹھایا اور جلاد کو بیدار کرنے چلے گئے جو ایسا دکھائی دیتا تھا کہ خوب گہری نیند سویا ہے۔

بڈھے آدمی نے نوجوان کو دیکھا جو گھبرایا ہوا اور شرمسار آنکھیں جھپکا رہا تھا' کیونکہ وہ اس بات کا عادی نہیں تھا کہ دن کے وقت وہ پُل پر بہت سے لوگوں میں گھرا ہوا سب کی توجہ کا مرکز ہو۔

"کیا نام ہے آپ کا؟" بڈھے نے پوچھا۔

"مائیکل!" نوجوان نے انکساری سے کہا' گویا وہ اب بھی ترکوں کے سوالات کے جوابات دے رہا تھا۔

"مائیکل! میرے بیٹے' آؤ! ایک دوسرے کو بوسہ دیں"۔ اور بڈھے نے سفید سر مائیکل کے کندھے پر جھکا دیا۔ "آؤ بوسہ لیں اور صلیبی نشان بنائیں۔ باپ' بیٹے اور روح القدس کے نام پر۔ باپ' بیٹے اور روح القدس کے نام پر۔ آمین!"

پس اس نے اپنے آپ پر اور نوجوان پر صرف لفظوں سے نشان بنایا' کیونکہ ان کے ہاتھ اس لیے جلدی سے باندھ دیے گئے تھے کہ جلاد پہلے ہی پہنچ آیا تھا۔

جلاد سپاہیوں میں سے ایک تھا جس نے اپنا کام بڑی تیزی سے ختم کر دیا۔ یہ دن یوم مارکیٹ تھا اور سب سے پہلے آنے والے لوگ جو پہاڑوں سے اتر آئے اور پُل عبور کیا'

انھوں نے دیکھا کہ نئی بلیوں پر دو سر قلعے پر ٹنگے ہوئے تھے اور ایک جگہ جس پر خون کے دھبے تھے' اس پر بجری وغیرہ ڈال کر ہموار کر دی گئی تھی۔ پُل پر یہ جگہ تھی' جہاں ان کے سر کاٹے گئے تھے۔ اس طرح قلعے نے اپنا کام شروع کر دیا۔

اس دن کے بعد تمام لوگ جن پر شک ہوتا تھا یا وہ بغاوت کے مجرم تھے' کپیا پر لائے جاتے تھے' چاہے وہ پُل کی اوپر پکڑے جائیں یا کہیں سرحد پر پکڑے جائیں۔ ایک مرتبہ کپیا پر پہنچنے کے بعد شاذ و نادر ہی وہ زندہ لوٹتے تھے۔ وہ لوگ جن کا تعلق بغاوت سے ہوتا تھا یا وہ یونہی بدقسمت ہوتے تھے' ان کے سر قلم کرنے کے بعد قلعے کے گرد رکھی گئی بلیوں پر لٹکائے جاتے تھے اور ان کے جسم دریائے درینہ میں پھینک دیے جاتے تھے' اگر کوئی وارث اس وقت حاضر ہو کر فدیہ ادا کر کے سر کے بغیر لاش حاصل نہ کر لیتا۔

یہ بغاوت اپنے تھوڑے اور لمبے عرصے کی عارضی صلح کے ساتھ برسوں تک جاری رہی اور ان برسوں کے دوران جو لوگ دریا میں پھینکے گئے کہ وہ بہتے بہتے کوئی اور بہتر اور زیادہ مناسب سرزمین ڈھونڈ لیں' ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ تقدیر نے فیصلہ کر دیا تھا کہ' تقدیر جو کمزور اور بے پروا لوگوں کو کچل ڈالتی ہے جیسے یہ دو سادہ آدمی' یہ جوڑا جو لاکھوں اَن پڑھ' افلاس زدہ اور معصوم عوام میں سے تھا' جلوس کی قیادت کریں' کیونکہ ہمیشہ ایسے ہی انسان ہوتے ہیں' جو بڑے واقعات کے بھنور میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور جنھیں یہ بھنور ناقابل مزاحمت کشش سے کھینچ کر غرقاب کر دیا کرتا ہے۔

اس طرح نوجوان مائیکل اور بڈھا یلیسیرڈے جو ایک ہی مقام پر اور ایک ہی وقت میں سروں سے فارغ کر دیے گئے تھے' بھائیوں کی طرح آپس میں مل گئے۔ پہلے اپنے سروں سے کپیا پر قلعہ سجایا جو اس دن کے بعد سے جب تک بغاوت رہی' عملی طور پر کبھی بھی ایسی سجاوٹ سے خالی نہ رہا' چنانچہ یہ دو جنھیں تب سے پہلے نہ کسی نے دیکھا تھا اور نہ سنا تھا' ایسی یاد میں اکٹھے رہے جو بہتیرے دیگر اور زیادہ اہم ستم رسیدہ لوگوں کی یاد سے زیادہ صاف اور دیرپا ہے۔

چنانچہ کپیا اس خونیں اور بری شہرت والے قلعے کے نیچے غائب ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی تمام جلسے' ملاقاتیں' گپ شپ' موسیقی اور لطف اندوزی کے مواقع بھی ختم ہو گئے۔ خود ترک بھی اس راستے سے بددلی سے گزرتے تھے' جبکہ وہ سرب جنھیں پُل عبور کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا' جلدی

جلدی سر نیچا کر کے گزرا کرتے تھے۔

جلاد کا کام لمبے عرصے تک ہمیشہ وہی سپاہی کیا کرتا تھا۔ وہ موٹا اور سیاہ چمڑی والا اناطولین تھا' اس کی آنکھیں زردی مائل تھیں۔ ہونٹ حبشیوں جیسے اور چہرہ مٹیالا اور چمک دار تھا۔ یہ شخص ہمیشہ مسکراتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ ایک اچھے کھاتے پیتے اور خوش طبع آدمی جیسی تھی' اسے مرید الدین کہتے تھے جو بہت جلد تمام قصبے میں اور سرحد کے پار بھی مشہور ہو گیا۔ وہ اپنی ڈیوٹی تسلی اور ایمان داری سے بجالاتا تھا اور یقینی بات ہے کہ وہ حد سے زیادہ تیز اور ماہر تھا۔ قصبے کے لوگ کہا کرتے تھے کہ اس کا ہاتھ قصبے کے حجام محسن سے ہلکا تھا۔ تمام بوڑھے اور جوان اسے کم از کم ضرور جانتے تھے۔ یہ نام خوف کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں میں اشتیاق بھی پیدا کر دیتا تھا۔ صاف دنوں میں وہ تمام دن پل پر لکڑی کے قلعے کے نیچے سائے میں بیٹھا یا لیٹا رہتا۔ وقتاً فوقتاً وہ اٹھ کر بلیوں پر سروں کا اس طرح معائنہ کرتا' جیسے کوئی مارکیٹ کا مالی اپنے ہندوانوں کا معائنہ کرتا ہو۔ وہ پھر سائے میں اپنے تختے پر لیٹ جاتا اور کسی گڈریے کے بڈھے کتے کی طرح جمائیاں لیتا اور جسم کو سکیڑتا اور پھیلاتا رہتا۔ پل کے سرے پر بچے تجسس کے انداز میں اکٹھے ہو جاتے اور اسے ڈرتے ڈرتے دیکھتے رہتے۔

لیکن جب اس کا کام آجاتا تو مرید الدین چوکنا ہوتا اور چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے متعلق بھی محتاط ہوتا۔ اگر کوئی اس کے کام میں دخل اندازی کرے' تو وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا اور یہ کام بغاوت کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ جب باغیوں نے قصبے سے کچھ گاؤں جلا دیے تو ترکوں کا غصہ تمام حدود پھلانگ گیا۔ نہ صرف انھوں نے تمام باغیوں اور جاسوسوں کو یا جنھیں وہ ایسے سمجھتے تھے گرفتار کیا اور پل پر کپتان کے پاس لے آئے بلکہ اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے وہ انھیں سزا دینے میں خود بھی حصہ لینے کی خواہش کرتے۔

اس طرح ایک دن ایسا بھی چڑھا کہ وشی گراڈ کے پیرش کے پادری کا سر قلعے کی دیوار پر ٹنگا نظر آیا۔ یہ وہی پادری پوپ میلیو تھا جس نے بڑے سیلاب کی رات کو ملا اور ربی کے ساتھ مذاق کرنے کی جرأت کی تھی۔ سرب لوگوں کے خلاف عام طیش اور غیظ و غضب کے سلسلے میں وہ بھی مارا گیا تھا' حالانکہ وہ بے گناہ تھا۔ خانہ بدوش بچوں نے اس کے مردہ منہ میں سگار دے دیا۔

مرید الدین ایسی کارروائی کا سختی سے مخالف تھا اور اگر بن پڑتی' تو انھیں ایسا کرنے سے روکتا تھا۔

جب ایک دن غیر متوقع طور پر موٹا اناطولین بھڑتپ سے مر گیا' تو ایک نیا جلاد جو اپنے کام سے درحقیقت بہت ہی ناواقف تھا کئی برسوں تک یہ کام کرتا رہا۔ سربیا میں بغاوت فرو ہونے کے بعد بھی ہمیشہ دو تین سر کپیا پر ٹنگے ہوتے تھے۔ ایسے دور میں لوگ جلد سخت جان اور بے حس ہو جایا کرتے ہیں۔ جلد ہی وہ ایسے عادی ہو گئے کہ وہ ان کے پاس سے بے پروا سے گزر جایا کرتے اور کوئی توجہ نہ دیتے تاکہ جب سروں کی نمائش بند ہو جائے تو وہ یکدم یہ عمل محسوس کرنے نہ پائیں۔

جب سربیا میں اور سرحد پر بغاوت ختم ہوئی تو قلعے کی اہمیت اور اس کی موجودگی کے اسباب بھی ختم ہو گئے' لیکن گارد کے سپاہی وہاں سوتے رہے' حالانکہ پل کا عبور کرنا اب آزاد تھا اور بغیر کسی نگہداشت کے تھا۔ ہر فوج میں چیزیں آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی ہیں' مگر ترکی فوج میں دیگر فوجوں کی نسبت بہت ہی آہستہ ہوتی ہیں اور خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ قلعہ گارد کے استعمال میں اور کتنی مدت رہتا' اگر ایک بھولی ہوئی موم بتی سے ایک رات اس میں آگ نہ لگ گئی ہوتی۔ قلعہ گندے بیروزے والے تختوں سے بنا ہوا تھا اور دن کی گرمی کے بعد ابھی تک گرم تھا' چنانچہ یہ بنیادوں تک جل گیا یا یوں کہئے کہ کپیا کے بنیادی پتھر تک جل گیا۔

قصبے کے گھبرائے ہوئے لوگوں نے اس بڑی آگ کو دیکھا جس نے نہ صرف پل کو روشن کر دیا تھا بلکہ اردگرد کے پہاڑوں کو بھی روشن کر دیا تھا اور اس کا عکس پانی کی سطح پر تھرتھراتی ہوئی سرخ روشنی کی شکل میں پڑتا تھا۔ جب صبح طلوع ہوئی' تو پل دوبارہ اپنی پہلے والی شکل میں نمودار ہوا' جو اب لکڑی کی اس بھدی دیو ہیکل چیز سے جس نے برسوں تک اس کے کپیا کو چھپا رکھا تھا' آزاد ہو گیا۔ سفید پتھر داغ دار اور دھوئیں سے بھرے ہوئے تھے' مگر بارشوں اور برفوں نے اسے دھو کر دوبارہ صاف کر دیا تھا' اس طرح قلعے کا اور ان خونیں واقعات کا جو اس سے منسلک تھے' خاتمہ ہو گیا ماسوائے چند تلخ یادوں کے جو رفتہ رفتہ زرد ہو کر آخر اس دور کی نسل کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو گئیں۔

چنانچہ کپیا ایک مرتبہ پھر قصبے کے لوگوں کے لیے انہی اہمیتوں کا حامل بن گیا جن کا یہ پہلے تھا۔ قصبے سے آتے ہوئے بائیں روش پر ایک قہوہ ساز نے ایک مرتبہ پھر اپنی انگیٹھی

گرم کی اور برتن سجا دیئے۔ صرف فوارے کو نقصان پہنچا تھا۔ سانپ کا سر جس سے پانی پھوٹا کرتا تھا' کچل دیا گیا تھا۔ لوگوں نے ایک مرتبہ پھر صوفہ پر چہل قدمی شروع کر دی اور وہاں اپنا وقت گپ شپ میں' تجارتی بات چیت میں یا اونگھ اور بسور کر گزارنا شروع کر دیا۔ گرمیوں کی راتوں میں نوجوان لڑکے ٹولیوں کی صورت میں وہاں گاتے یا تنہا بیٹھ کر محبت کے جذبات کو دباتے رہتے یا دنیا میں دور کہیں جا کر بڑے بڑے کارنامے سرانجام دینے اور بڑے بڑے اہم واقعات میں حصہ لینے کے متعلق خیالی پلاؤ پکاتے رہتے۔ ایسے خیالات عموماً ان نوجوانوں کو اکثر ستاتے رہتے ہیں جو تنگ ماحول میں پل کر بڑے ہوتے ہیں--- بیس یا بیس سے کچھ اوپر برسوں میں ایک نئی نسل سطح پر آ گئی۔

اس نسل کو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ یہاں لکڑی کے قلعے کا ایک بد وضع ڈھانچہ کھڑا تھا یا رات کے وقت مسافروں کو ٹھہرانے کے لیے گارد سمع خراش چیخیں مارا کرتے تھے یا مریدالدین نامی جلاد ہوا کرتا تھا یا کٹے ہوئے سر جنہیں اس نے بڑی پیشہ ورانہ مہارت سے کاٹا تھا۔ صرف کچھ بوڑھی عورتیں جب گلی کے بچوں کو شفتالو چراتے دیکھتیں اور انھیں بھگاتیں تو اونچی آواز میں بددعائیں دیتیں:

"اللہ مریدالدین کو بھیجے جو تیرے بال کاٹ دے"۔

"اللہ کرے کہ تیری ماں تیرے سر کو کپیا پر شناخت کرے"۔

لیکن بچے جو باڑیں پھلانگ کر بھاگ نکلتے' ان بددعاؤں کا اصلی مطلب نہ سمجھ پاتے' اگرچہ وہ یہ ضرور جانتے تھے کہ اب بددعاؤں کا مقصد ان کے مناسب حال نہیں ہو سکتا۔

پس اس پُل کے پاس نسلیں بدلتی رہیں اور پُل نے اپنے اوپر سے دھول کی طرح وہ تمام نشانات صاف کر دیئے جو عارضی انسانی واقعات نے اس پر چھوڑے تھے اور جب یہ سب کچھ ختم ہو گیا' تو وہ اسی طرح مستقل اور نہ بدلنے والا تھا۔

☆☆☆

اس پُل پر وقت برسوں اور عشروں میں گزر گیا۔ انیسویں صدی کے نصف میں چند عشرے ایسے تھے جن میں ترک سلطنت کو دھیمے بخار نے چاٹ لیا تھا۔ ایک ہم عصر کی آنکھ سے دیکھنے پر وہ برس نسبتاً پرامن اور سنجیدہ تھے' اگرچہ ان کے حصے میں پریشانیاں اور ڈر تھے' اور خشک سالیوں' سیلابوں' وباؤں اور تمام قسم کے برانگیختہ کرنے والے واقعات کو جانتے تھے۔ صرف یہ تمام چیزیں اپنے وقت پر طویل خاموشیوں کے بعد مختصر دوروں میں آتیں۔

بوسنیا اور ہیو گراڈ کی دو پاشالوکوں کے درمیان جو سرحد قصبے سے تھوڑا اوپر ایک مقام سے گزرتی تھی' اس کی صحیح نشاندہی ان برسوں میں ہونا شروع ہو گئی اور اس نے ملک کی سرحد کی شکل اور اہمیت اختیار کرنا شروع کر دی۔ اس سے تمام ضلع اور قصبے کی زندگی کے حالات بدل گئے اور اس سے تجارت' مواصلات اور ترکوں اور سربوں کے باہمی تعلقات بھی متاثر ہوئے۔

زمانے کے الٹ پھیر میں واقع ہونے والی جنگیں' وبائیں اور لوگوں کی نقل مکانی جیسے عوامل ہی پُل کی تباہی کا باعث نہیں بنے' جس سے کپیا کی زندگی میں خلل واقع ہوا ہو۔ ان کے علاوہ دوسرے غیر معمولی واقعات بھی رونما ہوئے جنہیں وقت نے بڑی اہمیت دی اور جو کافی عرصہ تک ذہنوں میں محفوظ رہے۔

کپیا کی دائیں اور بائیں دونوں سمتوں میں پُل کے کناروں پر پتھر کی بنی ہوئی حفاظتی دیوار کی بالائی سطح وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ملائم ہوتی گئی اور اس کا رنگ بھی باقی حصے کی نسبت کسی قدر سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سینکڑوں برسوں سے کسان پُل عبور کرتے وقت اپنا اپنا بوجھ اس پر اتار کر دم لیتے رہے۔ یا وہاں ستانے والے لوگ دوسروں کے انتظار میں گفتگو کرتے وقت اپنے کندھے اور کہنیاں اس پر ٹکا دیتے یا اپنی دھن میں مگن لوگ فرداً فرداً اپنی کہنیوں پر جھک کر نیچے گہرائی میں تیزی سے بہتے ہوئے جھاگ دار پانی کو دیکھتے رہتے جس کا منظر اگرچہ ہر بار نیا ہوتا' پھر بھی اس کی کیفیت ہمیشہ کی طرح ایک سی رہتی۔

لیکن ان بہت سے فارغ اور متجسس لوگوں نے دیوار پر جھک کر پانی کی سطح کو دیکھتے وقت اس معمے کا حل کبھی نہیں سوچا جو اس ماہ اگست کے آخری دنوں میں پیدا ہوا۔ بارشوں کی وجہ سے پانی کی مقدار میں زوردار اضافہ ہو جاتا' مگر یہ صرف موسم گرما کے آخری دنوں میں ہوتا۔ پُل کے محرابوں کے نیچے گردابوں میں سفید جھاگ بن جاتا جو شاخوں' گھاس پھوس اور کوڑا کرکٹ کو ساتھ لیے دائروں میں تیرتا رہتا۔ فرصت کے اوقات میں وہاں کہنیوں کے سہارے ٹھہرنے والے شہری درحقیقت پانی کی سطح کو نہیں دیکھتے تھے۔ یہ پانی تو ان کا دیکھا بھالا تھا اور اس کے پاس ان کی الجھن کا کوئی حل نہ تھا' اگرچہ ان کی نظر پانی کی سطح پر رہتی' لیکن وہ اپنی گفتگو کے

ذریعے اپنے لیے کچھ اطمینان بخش اظہار چاہتے تھے۔ وہ اپنی تقدیر کے مدھم اور بدنصیب تارے کی واضح نشان دہی چاہتے تھے جو ان دنوں کے لیے تکلیف اور تعجب کا باعث بنا ہوا تھا۔

ان دنوں کپیا میں ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا جس کی یاد عرصہ تک رہے گی اور جس کے دوبارہ واقع ہونے کا امکان نہ تھا۔ جب تک دریتہ کا شہر اور ریل سلامت تھے' اس واقعہ نے شہریوں کی زندگی میں ہلچل پیدا کر دی تھی اور اس کی کہانی شہر سے باہر دوسرے مقامات اور ضلعوں میں بھی پھیل کر ایک روایت بن چکی تھی۔

در حقیقت یہ وسگارڈ کی دو بستیوں وتیلچے لگ اور نیزو کی کہانی تھی۔ یہ دونوں بستیاں اس مدور علاقے کے آخری کناروں پر واقع تھیں جو شہر کے سیاہ پہاڑوں اور دامن کوہ سے گھرا ہوا تھا۔

وادی کی شمال مشرقی طرف سٹرازسکے کا بڑا گاؤں شہر سے قریب ترین تھا۔ اس کے مکانات' کھیت اور باغات کئی پہاڑیوں کے دامن میں پھیلے ہوئے تھے اور جابجا درختوں کے کنج واقع تھے۔ ان پہاڑیوں میں سے ایک گول پہاڑی کے کنارے پر پندرہ مکانات تھے جو آلوچوں کے باغات سے گھرے تھے اور ان کے چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے۔ یہ وتیلچے لگ کی بستی تھی جو نہایت پرامن' زرخیز اور خوبصورت بستی تھی اور ڈھلانوں پر واقع تھی۔ بستی کا تعلق سٹرازسکے کے گاؤں سے تھا' لیکن یہ اپنے گاؤں کے مرکزی نسبت شہر سے زیادہ قریب تھا' کیونکہ وتیلچے لگ کے باشندے مارکیٹ تک آدھ گھنٹہ میں پیدل چل کر پہنچ سکتے تھے' وہاں ان کی دکانیں تھیں اور وہ عام شہریوں کی طرح کاروبار کرتے تھے۔ ان کے اور شہریوں کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہ تھا سوائے اس کے کہ ان کی جائیدادیں زیادہ ٹھوس اور پائیدار تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ وہ پختہ اور بالائی زمین پر رہتے تھے' جہاں سیلاب کا کوئی خطرہ نہ تھا' وہاں کے لوگ زیادہ بااخلاق تھے اور شہریوں کی طرح ان میں بری عادات نہ تھیں۔ وتیلچے لگ کی زمین زرخیز' پانی صاف اور لوگ خوبصورت تھے۔

وسگراڈ میں عثمانی خاندان کی ایک شاخ آباد تھی' لیکن اس کے باوجود شہری کافی مال دار تھے اور تعداد میں بھی زیادہ تھے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ انحطاط پذیر ہو گئے تھے اور حقیقی عثمانی وتیلچے لگ کے رہنے والے تھے' جہاں یہ خاندان شروع میں آکر آباد ہوا تھا۔ وہ ایک عمدہ انسانی نسل کے لوگ تھے جو حساس ہونے کے علاوہ اپنی اصلیت پر فخر کرتے تھے۔ ان کا مکان ضلع بھر میں سب سے بڑا تھا۔ اس کا رخ جنوب مشرق کی طرف تھا اور یہ پہاڑی کی چوٹی سے ذرا نیچے واضح طور پر سفید نظر آتا تھا۔ اس کی سفیدی ہمیشہ تازہ بتازہ رہتی۔ اس کی چھت سیاہ پرال کی تھی اور اس میں شیشے کی پندرہ چمک دار کھڑکیاں تھیں۔ وسگارڈ کی طرف آنے والے ہر مسافر کی نظر پہلے اسی مکان پر پڑتی اور یہاں سے جاتے وقت بھی آنکھوں سے اوجھل ہونے والی آخری چیز یہی مکان ہوتا۔۔۔ چمکتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں جو لجشٹن کی پہاڑی کے پیچھے سے اسی مکان پر پڑتیں جس سے اس کی پیشانی چمک اٹھتی۔ کپیا کے شہری مدتوں سے یہ منظر دیکھنے کے عادی تھے اور یہ دیکھ دیکھ کر اندازہ لگاتے رہتے کہ ان عثمانی طرز کی کھڑکیوں سے ڈوبتا سورج کس طرح منعکس ہوتا اور کس طرح روشنی رفتہ رفتہ ایک ایک کھڑکی سے غائب ہوتی جاتی۔ غروب آفتاب کے وقت جب شہر تاریکی کی لپیٹ میں آنا شروع ہوتا تو سورج کی آخری کرنیں جب بادلوں سے گزر کر آخری کھڑکی پر پڑتیں' تو تاریک شہر میں یہ چند لمحوں کے لیے ایک بڑے سرخ تارے کی طرح چمکتی رہتیں۔

اس گھر ہی کی طرح اس کا صاحب خانہ اوداگا عثمانی بھی سب سے مشہور اور معزز شخص سمجھا جاتا۔ وہ ایک دلیر اور جوشیلا انسان تھا۔ ذاتی زندگی میں بھی اور کاروبار میں بھی۔ منڈی میں اس کی ایک دکان تھی جس میں ہلکی سی روشنی رہتی۔ اس میں مکئی' خشک آلوچوں اور اناس کی پھانکیں تختوں اور دھاری دار چٹائیوں پر بکھری ہوتیں۔ اوداگا تھوک فروش تاجر تھا' اس لیے ہر روز اس کی دکان نہیں کھلتی تھی' لیکن مارکیٹ کے دنوں میں تجارتی ضروریات کے مطابق یہ باقاعدگی سے ہفتہ بھر کھلی رہتی۔ دکان میں ہمیشہ اوداگا کے بیٹوں میں سے کوئی بھی ایک بیٹا بیٹھتا اور وہ خود ہمیشہ دکان کے باہر ایک بنچ پر بیٹھ جاتا۔ وہاں وہ گاہکوں اور واقف کاروں سے خوش گپیاں کرتا رہتا۔ وہ بھاری بھرکم اور متاثر کرنے والا شخص تھا۔ اس کا چہرہ سرخی مائل تھا۔ اس کی ڈاڑھی اور مونچھیں بالکل سفید تھیں' اس کی آواز سخت گیر اور بھاری تھی۔ سالہا سال سے وہ ظالم دمے کے مرض کا شکار چلا آ رہا تھا۔ جب کبھی بات چیت کرتے وقت غصے میں آتا' تو وہ اپنی آواز بلند کر لیتا اور یہ اس کا اکثر معمول تھا' اس کی سانس اکھڑ جاتی' گردن کی نسیں پھول جاتیں' چہرہ سرخ ہو جاتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے' بلغم کے سبب چھاتی سے خر خر کی آواز آنے لگتی اور گلے سے ایسی

خرخراہٹ بلند ہوتی جیسے پہاڑی پر طوفان آگیا ہو۔ جب کھانسی اور دمے کا حملہ ختم ہو جاتا' تو وہ اپنی قوت کو یکجا کرتا' ایک گہری سانس لیتا اور پھر نرم اور دھیمی رفتار سے گفتگو وہیں سے شروع کردیتا جہاں سے اس نے چھوڑی ہوتی۔ شہر اور مضافات میں وہ ایک کرخت کلام شخص کے طور پر مشہور تھا' لیکن وہ سخی اور بہادر بھی تھا۔

یہ اوصاف وہ ہر جگہ استعمال کرتا' یہاں تک کہ کاروبار میں بھی خواہ اس میں اسے نقصان ہی اٹھانا پڑتا۔ اکثر وہ دلیرانہ قول سے مکئی یا آلوچوں کا نرخ گھٹا بڑھا دیتا چاہے اس میں اس کا اپنا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اس کا قول مستقل طور پر قابل تسلیم سمجھا جاتا اور منڈی میں اسے قبول کرلیا جاتا' حالانکہ یہ بات بھی تسلیم شدہ تھی کہ وہ اپنے فیصلوں میں جلد باز بھی تھا اور اپنی ذات کو اہمیت بھی دیتا تھا۔ جب کبھی وہ ویلجے لگ سے نیچے آکر اپنی دکان کے باہر بیٹھتا' تو وہ کبھی اکیلا نہ ہوتا' کیونکہ لوگ اس کی باتیں سننا اور رائے معلوم کرنا پسند کرتے تھے۔ وہ بے تکلف اور زندہ دل انسان تھا' گفتگو کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا اور خوبی سے اپنا دفاع بھی کرتا۔ وہ دوسروں کی بہترین رائے کو خاموشی سے قبول کرلیتا۔ اس کی گفتگو میں دمے اور کھانسی کے شدید حملے کسی وقت بھی مخل ہو جاتے' لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس سے کوئی خرابی پیدا نہ ہوتی' بلکہ اس سے اس کی رائے اور بھی وزنی معلوم ہوتی۔ اس کے اظہار کا طریقہ ایسا تھا کہ وہ تکلیف دہ حد تک اپنا وقار برقرار رکھتا' حالانکہ ایسا کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

اوداگا کے پانچ شادی شدہ بیٹے تھے اور سب بیٹوں سے چھوٹی ایک لڑکی تھی جو اب پوری طرح جوان اور شادی کے قابل تھی۔ اس کا نام "فتح" تھا اور یہ بات خاصی مشہور تھی کہ وہ انتہائی خوبصورت ہے۔ وہ اپنے باپ کی ہوبہو نقل تھی۔ تمام شہر اور کسی حد تک سارے ضلع کے لوگ اس کی شادی کے مسئلہ پر بحث کرتے رہتے۔ خاندان میں یہ روایت چلی آئی ہے کہ ہر نسل میں سے کم از کم ایک لڑکی اپنی خوبصورتی' صفات اور شرافت کی وجہ سے قصہ کہانیوں اور گیتوں کی جان بن جاتی رہی۔ چنانچہ اس وقت وہ زندگی کے اس حصے میں تھی جو تمام خواہشات کا مرکز ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی مثال تھی جو کسی کی دسترس سے باہر تھی۔ اس کا نام لیتے وقت تصورات میں ہلچل پیدا ہو جاتی اور وہ جوشیلے جوانوں اور حاسد عورتوں کے جھرمٹ میں گھری رہتی۔ وہ ایسی لڑکی تھی جسے قدرت نے امتیازی خصوصیات ودیعت کی تھیں اور اس کی انفرادی حیثیت کو خطرناک بلندیوں پر پہنچا دیا۔

اوداگا کی یہ بیٹی باپ سے نہ صرف شکل و صورت میں مشابہ تھی' بلکہ وہ تیز فہم اور خوش کلام بھی تھی۔ وہ نوجوان جو شادی بیاہ یا جلسہ جلوسوں میں سستی خوشامد سے اس کی محبت جیتنے یا اسے کھلے مذاق سے ستانے کی کوشش کرتے' انھیں اس کی صفات معلوم تھیں۔ اس کی ذہانت اس کے حسن سے کسی طرح کم نہ تھی' لہٰذا اوداگا کی بیٹی فتح کے بارے میں گیت مشہور ہوئے اور اس قسم کی ممتاز شخصیتوں کے بارے میں گیت خود بخود جنم لے لیا کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں یہ گیت گایا جاتا تھا:

بلاشبہ زمانے میں بلا کی تم حسین ہو'
اوداگا کی فتح ہو تم یا مہ جبین ہو
ذہین ہو' متین ہو

چنانچہ لوگ شہر میں زور و شور سے اس کے گیت گاتے اور دل کھول کر اس کے حسن کی تعریف بیان کرتے' لیکن کسی کو اتنی جرأت نہ ہو سکی کہ وہ ویلجے لگ سے آکر اس کی خواست گاری میں کامیابی حاصل کر سکے۔ جب وہ سب کے سب ایک ایک کر کے نامنظور قرار دے دیے گئے تو فتح کی زندگی میں ایک ناقابل عبور خلا پیدا ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں ایک پرجوش حلقہ نفرت اور رقابت کی وجہ سے پیدا ہوا جس کی امیدیں پست اور توقعات ذلیل تھیں۔ اس قسم کا حلقہ اکثر ان ہستیوں کو گھیرے رکھتا ہے' جنھیں قدرت امتیازی صفات سے مالا مال کرتی ہے اور جن کا مقدر انتہائی طور پر بلند تر ہوتا ہے۔ ایسی ہستیاں جن کے بارے میں بہت کچھ کہا اور گایا جاتا ہے اور جلد ہی وہ اپنی امتیازی تقدیر کے سبب سب سے الگ ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے پیچھے ایک کامیاب زندگی کے بجائے ایک گیت یا کہانی چھوڑ جاتی ہیں۔

چنانچہ ہم میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ لڑکیاں جن کے بارے میں بہت کچھ کہا سنا جاتا ہے' انھیں اپنی زندگی کے ساتھی کی تلاش میں بڑی دقت پیش آتی ہے اور مناسب جوڑ نہ ملنے کے سبب کوئی ان سے جلدی یا آسانی سے شادی نہیں کر سکتا۔ "فتح" کے بارے میں ایسا نہیں ہوا' اس کے لیے ایک شریک حیات تلاش کر لیا گیا تھا جس کے دل میں اس کے حصول کی خواہش اور اپنے مقاصد کے لیے اہلیت موجود تھی۔

اس بے قاعدہ دائرے میں جو وسگارڈ کی وادی سے بنا تھا' ویلجے لگ کے عین مقابل میں نیزوکے کی بستی واقع تھی۔

پُل کے اوپر ندی کی مخالف سمت کو ایک گھنٹہ جو پیدل سفر نہ تھا' سیاہ پہاڑوں کے دائرے کے درمیان ایک دیوار کی وجہ سے دریائے درینہ میں ایک فوری موڑ آجاتا ہے۔ یہاں پتھریلے دریائی ساحل کے پاس ایک عمدہ اور زرخیز زمین کی پٹی تھی۔ یہ زمین دریا کی لائی ہوئی مٹی سے بنی تھی۔ یہ مٹی بارش اور طوفانوں کے ذریعے بلند ترین پہاڑی چوٹیوں اور بنگوود کی چٹانوں سے نیچے بہہ کر آئی تھی۔ اس زمین میں کھیتوں اور باغات کی افراط تھی۔ اس سے ذرا اوپر کی بلندی پر ڈھلواں سبزہ زار تھے جن میں وافر گھاس موجود تھی اور جو کہیں کہیں کھردرے پتھروں کے ڈھیروں اور سیاہ خود رو گھاس پھوس سے اَٹے پڑے تھے۔ یہ تمام بستی حمزہ خاندان کی ملکیت تھی جنہیں ترکودی کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ بستی کے نصف میں سرخیوں کے پانچ یا چھ خاندان رہتے تھے اور باقی حصے میں حمزہ برادران کے مکانات تھے اور ان کے سر پر مستاج بیگ حمزائی کا مکان تھا۔ یہ بستی دور اور روپوش جگہ پر تھی جہاں نہ تو سورج کی روشنی پڑتی اور نہ ہی ہوا چلتی تھی۔ یہاں گندم کے بجائے پھل اور گھاس کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔ یہ بستی چاروں طرف سے کھڑی پہاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ دن کا زیادہ تر حصہ سائے اور خاموشی میں گزرتا۔ نتیجہ یہ کہ گڈریوں کی ہر آواز اور مویشیوں کے گلے کی گھنٹیوں کی آوازیں پہاڑ سے ٹکرا کر صدائے بازگشت کی صورت میں سنائی دیتیں۔ صرف ایک راستہ یہاں تک آتا تھا۔ شہر سے آتے وقت جب کوئی شخص پُل عبور کرتا اور بڑی سڑک چھوڑ دیتا' جو دائیں جانب نیچے دریا کو چلی جاتی ہے' تو اسے ایک تنگ اور پتھریلے راستے پر آنا پڑتا جو درینہ سے اوپر کی طرف دریا کے کنارے ایک بنجر اور پتھریلی زمین کے ٹکڑے کی بائیں طرف تھا۔ یہ راستہ کالی ڈھلانوں پر ایک لکیر کی طرح دکھائی دیتا جو نیچے دریا کی طرف اتر جاتا۔ اگر کوئی شخص گھوڑے پر سوار ہو کر یا پیدل اس راستہ پر چلتا' تو پُل سے اوپر دیکھنے پر یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پانی اور پتھر کے درمیان ایک درخت کے تنگ تنے پر جا رہا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے والے سائے کا عکس سبز اور خاموش پانی میں دیکھا جاسکتا تھا۔

یہی وہ راستہ تھا جو شہر سے نیزوکے کو جاتا تھا اور نیزوکے سے آگے جانے والا کوئی راستہ نہ تھا' کیونکہ وہاں سے کہیں جانے کو کوئی جگہ ہی نہ تھی۔ مکانوں سے اوپر کھڑی ڈھلانوں میں جہاں درختوں کی بہتات نہ تھی' پانی میں سے دو گہرے سفید راستے کٹے ہوئے تھے اور انہی راستوں سے گڈریے اپنے مویشیوں کو پہاڑی سبزہ زاروں میں چرانے کے لیے لے جاتے تھے۔

وہاں ایک بڑا سفید مکان تھا جو سب سے بڑے حمزائی خاندان کے ایک شخص مستاج بیگ کی ملکیت تھا۔ یہ مکان بھی وتیلچے لگ میں عثمانی خاندان کے سفید مکان سے کسی طرح کم نہ تھا۔ لیکن اس میں یہ فرق ضرور تھا کہ دریائے درینہ کے ساتھ ساتھ جو نشیبی خلا تھا' اس میں یہ بالکل نظر نہ آتا تھا۔ اس کے اردگرد پندرہ اونچے سرو نما درخت کھڑے تھے جو نیم دائرے کی شکل میں تھے۔ ان کی سرسراہٹ اور جنبش اس محصور اور ناقابل رسائی مکان کو زندگی بخشتی تھی۔ اس کے نیچے ذرا چھوٹے اور کم تر درجے کے مکان تھے جو حمزائی خاندان ہی کے دوسرے دو بھائیوں کے تھے۔ تمام حمزائیوں کے بہت سے بچے تھے جن کی جلد بڑی صاف تھی' وہ دراز قد اور مضبوط تن و توش کے تھے' وہ سنجیدہ اور متین بھی تھے۔ اپنے کاروبار پر ان کی گرفت مضبوط تھی اور وہ اپنے معاملات میں متحد اور سرگرم تھے۔ وتیلچے لگ کے امیر آدمیوں کی طرح شہر میں ان کی بھی دکانیں تھیں اور نیزوکے میں وہ جو چیزیں تیار کرتے' وہاں بیچنے کے لیے لے آتے۔ سال کے ہر حصے میں وہ اور ان کے سرف بھائی درینہ کے پیچھے والے تنگ پتھریلے راستے پر ہجوم در ہجوم چلتے رہتے۔ اس سفر میں وہ نئی نئی چیزیں فروخت کے لیے لے جاتے یا وہاں سے لوٹتے نظر آتے۔ وہ اپنی تجارت کا مال بیچ کر اور روپیہ اپنی جیبوں میں ڈال کر پہاڑیوں کے درمیان اپنے روپوش گاؤں کو واپس چلے جاتے۔

ہر ایک ہی راہی مستاج بیگ حمزائی کا عظیم سفید مکان دیکھ کر خوشگوار حیرت میں ڈوبا ہوا تھا کہ یہ مکان اس پتھریلے راستے کے سرے پر تھا اور یوں محسوس ہوتا جیسے اس سے آگے وہ کہیں نہیں جا رہا۔ مستاج بیگ کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا' اس کا نام نیل تھا۔ نیل بیگ نیزوکے کے ایک معزز گھرانے کا واحد بیٹا تھا اور وہ پہلا شخص تھا جس نے وتیلچے لگ میں فتح کو ایک نظر دیکھا تھا۔ اس نے کسی شادی یا کسی دوسرے موقع پر ایک نیم وا دروازے سے اسے دیکھ کر اس کے حسن و جمال کی تعریف کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ مکان کے باہر نوجوانوں کا ایک گروہ اسے یوں تاڑ رہا ہے' جیسے کہ انگوروں کا گچھا ہو۔ جب اسے "فتح" کو دوبارہ دیکھنے کا موقع ملا' تو وہ اپنی ہم جولیوں کے جھرمٹ میں تھی' اور اس نے

اسے ایک دلیرانہ مذاق کیا:

"خدا کرے کہ مستاج بیگ تمہیں ایک خوبصورت دلہن کا نام بخشے"۔

یہ سن کر "فتح" نے ایک گھٹی گھٹی سی طنزیہ ہنسی ہنسی۔

پرجوش نوجوان نے نیم کھلے دروازے میں سے کہا:

"ہاں اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں' خدا نے چاہا تو یہ بجو بہ بھی ایک دن ہو کے رہے گا"۔

"ہاں یقیناً ایسا ہی ہو گا' جب وتیلچے لگ کی بستی یہاں سے اٹھ کر نیزوکے کے پاس پہنچ جائے گی"۔

لڑکی نے ایک اور قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا اور اپنے جسم کو اس غرور سے خصوصی جنبش دی جو اس جیسی حسین اور ہم عمر نوجوان عورتیں دیا کرتی ہیں اور اس جنبش کے معانی اس کے الفاظ اور ہنسی سے زیادہ واضح تھے۔

یہ ایک امر حقیقی ہے کہ اس قسم کے لوگ جنہیں قدرت خصوصی صفات کی دولت عطا کرتی ہے' وہ اکثر بڑی دلیری سے مگر بلا سوچے سمجھے اپنی تقدیر کو آواز دیتے ہیں۔ وہ جواب جو اس نے نوجوان حمزائی شخص کو دیا تھا' بچے بچے کی زبان پر چڑھ گیا جیسے اس لڑکی نے جو کچھ کہا یا کیا اس کا مطلب ہی مختلف تھا۔

لیکن حمزائی خاندان کے جوان ایسے کم ہمت لوگ نہ تھے جنہیں آسانی سے نظرانداز کر دیا جائے یا جو پہلی ہی مشکل پر ہمت چھوڑ دیں۔ وہ تو زندگی کے معمولی معاملات میں بھی جلد بازی سے کوئی فیصلہ کرنے کے عادی نہ تھے' چہ جائیکہ اس اہم معاملہ میں وہ دل چھوڑ دیں۔ ایک کوشش شہر میں رہنے والے رشتہ داروں کے ذریعے بھی کی گئی' لیکن کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ تب بوڑھے مستاج بیگ حمزائی نے اپنے بیٹے کی شادی کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے عثمانیوں کے ساتھ تجارت کی رو سے گہرے تعلقات قائم تھے۔

اوداگا کو حال ہی میں اس کے پرجوش اور مغرورانہ رویہ سے تجارت میں کافی سخت نقصان اٹھانا پڑا تھا اور مستاج بیگ نے اچھے تاجر کی حیثیت میں اس کی مدد اور حمایت کی تھی۔ اس نے اس مشکل وقت میں اس کی بے لوث مدد از راہ ہمدردی اور بلا کسی غرض کے کی تھی۔ ایسا کرتے وقت اس نے قدرتی طور پر غیر ضروری الفاظ کہہ کر احسان بھی نہیں جتایا تھا۔

ان ٹھنڈی اور نیم روشن دکانوں میں اور ان کے سامنے پڑے ہوئے ملائم بنچوں پر نہ صرف تجارتی وقار کے معاملات کے فیصلے کیے جاتے تھے' بلکہ انسانی تقدیر اور مستقبل کے بارے میں بھی فیصلہ کن گفتگو کی جاتی تھی۔ اوداگا عثمانی اور مستاج بیگ حمزائی میں کیا بات چیت ہوئی؟ مستاج بیگ اپنے "نیل" کے لیے فتح کا ہاتھ مانگنے کے لیے اوداگا کے پاس کب اور کیسے آیا؟ اور مغرور اور دلیر اوداگا نے کیوں کر لڑکی اسے دے دی؟ کوئی شخص ان سوالوں کے جواب کبھی معلوم نہیں کر سکے گا۔ کوئی شخص یہ راز بھی نہیں جان سکے گا کہ وتیلچے لگ میں باپ بیٹی کے درمیان یہ معاملہ کس طرح طے پا گیا جبکہ وہ اس کی واحد' حسین تر اور ذہین تر بیٹی تھی۔ قدرتی بات ہے کہ لڑکی نے اپنے طور پر اس معاملہ کی کوئی مخالفت نہ کی ہوگی۔

اس معاملہ پر ہر اس شخص کو اذیت ناک حیرت ہوئی کہ وہ مغرور لڑکی جو اپنے جسم کے انگ انگ سے انکار کا اظہار کرتی رہی' اپنے باپ کی خواہشات کے سامنے کس طرح گونگی بن گئی اور بغیر کسی زور' ضابطہ یا احتجاج کے مطیع ہو گئی اور باپ کے سامنے لب تک ہلا نہ سکی اور ان معاملات میں جیسا کہ ہمارے یہاں پہلے بھی اور اب بھی رواج رہا ہے' یہ معاملہ تو گویا یوں ہوا جیسے اس نے خواب میں چپ چاپ اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لیا۔

اور نہ ہی نیزوکے سے اس بارے میں ایک لفظ بھی بیرونی دنیا تک پہنچ سکا۔ دانشمند حمزائیوں نے دوسرے لوگوں سے تصدیق تک نہ چاہی کہ کم از کم وہ خالی الفاظ ہی سے ان کی کامیابیوں کی تعریف کریں۔ انھوں نے اپنا گوہر مقصود پا لیا تھا اور وہ اپنے طور پر اپنی کامیابی پر مطمئن تھے۔ ان کی اس طمانیت میں شریک ہونے کے لیے کسی دوسرے شخص کی ضرورت ہی نہ تھی' جیسا کہ انھوں نے اپنی ناکامیوں اور مشکلات کے موقع پر کبھی کسی سے اظہار ہمدردی کی توقع نہ کی تھی۔

لیکن اس کے باوجود لوگوں نے جیسا کہ ان کی عادت ہے' اس معاملے پر بلا سوچے سمجھے بڑے پیمانے پر بحث و تمحیص شروع کر دی۔ لوگوں نے تمام شہر اور ارد گرد کے مضافات میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ حمزائیوں نے جو کچھ چاہا انھیں مل گیا اور اوداگا کی حسین و جمیل' پرغرور اور زیرک بیٹی نے جس کے لیے سارے بوسنیا میں موزوں ترین ساتھی نہ مل سکا تھا' یہ کیا کھیل کھیلا۔ باوجود اس بات کے وتیلچے لگ اب نیزوکے پہنچے گا۔ فتح نے سرعام یہ اعلان کیا تھا کہ ایسا کبھی

نہ ہو گا' کیونکہ لوگ ان کے بارے میں جنہیں بلند تر مرتبہ و
مقام حاصل ہو اور جو کمال کی چوٹیوں کو چھو لیں' زوال اور
توہین کی باتیں چٹخارے لے لے کر بیان کرنا پسند کرتے ہیں۔

ایک ماہ تک لوگوں نے مزے لے لے کر ایسی ایسی
کہانیاں گھڑیں اور بیان کیں جو فتح کی توہین کا باعث تھیں'
ایسی ذلت آمیز باتیں کرتے وقت وہ اتنی فرحت محسوس
کرتے جیسے وہ کوئی روح افزا مشروب پی رہے ہوں اور اس
کے ساتھ ساتھ ایک ماہ تک نیزو کے اور وتیلجے لگ میں
تیاریاں بھی جاری رہیں۔

ادھر فتح بھی ایک ماہ تک اپنے دوستوں' رشتہ داروں
اور ملازموں سے اپنے منگیتر کے بارے میں باتیں کرتی
رہی۔ لڑکیوں نے فرط مسرت سے جی بھر کر گیت گائے۔ وہ
خود بھی ان گانوں میں عملی طور پر شریک ہوتی' بلکہ ایسا کرنے
سے اس کے دل کو بڑی تقویت حاصل ہوتی اور اس نے اپنا
گانا گاتے ہوئے توجہ سے بھی سنا' حالانکہ وہ اپنے تصورات
کے قلزم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اپنی سوئی سے بیل بوٹے
بناتے وقت وہ اس تذبذب میں مبتلا ہو جاتی کہ وہ یا اس کی
کڑھائی کی تیار شدہ چیزیں کبھی نیزو کے نہ جا سکیں گی اور یہ
خیال ایک لمحے کے لیے بھی اس کے ذہن سے محو نہ ہوتا۔
اس طرح کام کاج کرتے وقت اور خوشی کے نغمات گانے کے
دوران اسے بے قراری میں یوں محسوس ہوتا' جیسے نیزو کے
اور وتیلجے لگ میں بہت طویل فاصلہ ہے اور اس مقصد کے
لیے ایک ماہ کا عرصہ بہت لمبا عرصہ ہے۔ اس کی کیفیت راتوں
کو بھی یہی رہتی۔ بوقت شب یہ بہانہ بناتے ہوئے کہ اسے
کچھ کام کرنا ہے' وہ دانستہ طور پر خلوت اختیار کر لیتی۔ تنہائی
میں وہ دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے کھیلتی۔ آنکھوں میں
حسین و جمیل اور روح پرور روشنی کی چکاچوند محسوس کرتی۔
وہ اس عجیب و غریب اور مسرت بخش تبدیلی پر سر تا پا بے
خودی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

وتیلجے لگ کی راتیں بڑی سرگرم اور تر و تازہ تھیں۔
آسمان کے ستارے اسے بہت قریب اور ناچتے گاتے دکھائی
دیتے۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ ستارے ایک دودھیا
اور ٹمٹماتی ہوئی روشنی کی ڈور سے آپس میں منسلک ہیں۔ فتح
کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر رات کے دل پذیر منظر کا گہرا
جائزہ لے رہی ہے۔ بدن کے انگ انگ سے ترنگیں اٹھ
رہی ہیں۔ انگڑائی پر انگڑائی آ رہی ہے۔ اپنے گداز جسم میں
وہ مخصوص اور ناقابل بیان لذت' لطافت اور ہلچل محسوس
کرتی ہے۔ اس کی ٹانگوں' بازوؤں اور لبوں پر ارتعاش
طاری تھا' خاص طور پر اس کی چھاتیوں میں قیامت خیز
گدگدی ہو رہی تھی۔ اس کی چھاتیاں بھری بھری' معمول
سے زیادہ بڑی' مگر تنی ہوئی تھیں۔ پستانوں کی ابھری ہوئی
نوکیں کھڑکی کے چوکھٹے کو چھو رہی تھیں اور اس جگہ اس
نے ہر چیز جو کہ اس میں تھی' غور سے دیکھی۔ کچے گھروں'
پکی عمارات اور کھیتوں کا منظر دیکھتے وقت وہ گرم اور لمبے لمبے
سانس لیتی اور شفاف آسمان اور وسیع رات کا سماں دیکھ دیکھ کر
سینے میں زیر و بم محسوس کرتی۔ اس کے زور زور سے سانس
لینے سے کھڑکی کا ایک پٹ آگے پیچھے حرکت کرنے لگتا جس
سے وہ اس کی چھاتیوں سے آ آ کر ٹکراتا۔ کبھی وہ ذرا پرے
ہٹ جاتا اور کبھی قریب آ کر چھاتیوں کی نوکوں سے پھر ٹکرا
جاتا اور یہ عمل بار بار دیکھنے میں آتا رہا۔

بے شک دنیا بہت عظیم ہے۔ دنیا اس روز بھی عظیم تھی
جب وسگارڈ کی وادی چلچلاتی دھوپ میں کانپ رہی تھی اور
ایک ناظر گندم کے پکنے کی آواز تک سن سکتا تھا اور سفید شہر
دریا کے سبز پانی کے کنارے کھڑا تھا اور نیلے اور کالے پہاڑ تنے
ہوئے نظر آ رہے تھے' لیکن رات کے وقت صرف رات کے
وقت آسمان زندگی بخشی کا منظر پیش کرتا اور لا محدود نظر آتا
اور اس دنیا کی طاقت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ایک
زندہ انسان گم ہو جائے اور اسے احساس تک نہ ہو کہ وہ کیا
ہے؟ وہ کہاں جا رہا ہے؟ یا وہ کیا چاہتا ہے یا اسے کیا کرنا
چاہیے؟ اس دنیا میں حقیقی طور پر وہی امن و امان سے اور لمبے
عرصہ تک جیا ہے جو اس خلا میں گم ہو گیا ہے۔ کنج عدم میں وہ
اب بات چیت نہیں کر سکتا جو اسے زندگی بھر کے لیے المیہ
سے دو چار رکھے۔ اب وہ منحوس اور بے معنی وعدوں پر نہیں
جئے گا۔ یا ایسی نازک صورت حال پیدا نہیں ہو گی جس سے
وہ بھاگ نہ سکے یا مستقل طور پر بہے جانے والے وقت کے
سنگ دل دھارے میں بہتا جائے۔ دنیا کی طرح اب اس کی
زندگی چار روزہ نہیں ہو گی جس میں زندہ رہنے کا فقط یہی
انجام ہے' موت یا ندامت! بے شک اس ابدی خلا میں
صورت احوال ایسی نہیں ہے جو یہاں ہمیں روز مرہ زندگی
میں پیش آتی ہے جہاں جو کچھ کہا جا چکا ہے' وہ ناقابل منسوخی
ہو یا جس چیز کا وعدہ کیا گیا' اس سے نجات ممکن نہ ہو۔ وہاں تو
زندگی بڑی آزاد اور دوامی ہے۔ بے نام اور خاموش زندگی'
جہاں کوئی الم نہیں' کوئی الجھن نہیں۔

پھر --- اس زندگی کے نیچے --- یہاں --- بہت ہی دور

سے آنے والی آواز--- بھاری بھرکم--- گہری اور گھٹی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے:

"آہاہاہا..... آہاہاہا..... کاکاخاخا"۔

نیچے سب سے پہلی منزل میں اوداگا پر رات کے وقت کھانسی کا شدید حملہ ہوا ہے اور وہ اس کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

فتح اپنے والد کی کھانسی کی آواز سن رہی تھی' وہ اسے صاف طور سے دیکھ رہی تھی اس طرح جیسے وہ بالکل اس کے سامنے ہے جب وہ اٹھ کے بیٹھا اور تمباکو پینے لگا۔ اسی سے اس پر کھانسی کا دورہ پڑا' اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ یہ سب کچھ وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں کو دیکھ رہی تھی جو ایک حسین تروتازہ سبزہ زار کی طرح نظر آرہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بالکل فتح کی اپنی آنکھوں کی طرح تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے باپ کی آنکھوں پر بڑھاپے کے سائے پھیل چکے تھے اور ان میں آنسو تیرتے رہتے تھے۔ پھر بھی وہ آنکھیں مسکراتی اور ٹمٹماتی نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں فتح کو اس روز پہلی بار اپنی ناگزیر تقدیر جھلکتی نظر آئی جب اسے بتایا گیا کہ اس کا رشتہ حمزائیوں کو بیاہ دینے کا قول دے دیا گیا ہے اور یہ کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر اپنی تیاریاں مکمل کر لے۔

"خاخاخا.... آہاہاہا"۔

خوبصورت رات کے حسن و جمال کے سامنے لمحاتی مسرت و انبساط کا چراغ اور دنیا کی عظمت کا خورشید اچانک بجھ جاتا ہے۔ دنیاوی زندگی میں سانس کی خوشبو آنی ختم ہو گئی۔ لڑکی کی چھاتیاں لمحاتی اینٹھن سے اکڑ کر رہ گئیں۔ چمکتے ستاروں اور دنیا کی وسعت کی سب دلکشی مٹ گئی۔ صرف تقدیر کا عمل پورا ہو رہا تھا۔ اس کی منحوس تقدیر کا عمل وقت گزرنے اور احساس کی بھٹی کے شعلوں کے ساتھ ساتھ جمود اور خاموشی میں غیر محسوس طریقے سے اس خلا کی طرف بڑھ رہا تھا جو اس دنیا کی دوسری طرف واقع ہے۔

نیچے کی منزل سے کھانسی کی آواز ایک بار پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ باپ اسے نظر بھی آرہا تھا اور اس کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ٹھیک اس طرح جیسے اس کا باپ اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ وہ اس کا اپنا پیارا اور طاقت ور باپ تھا۔ یہ صرف اس کا باپ ہی تھا جس کی روح سے وہ اپنی روح کو متحد اور پیوست سمجھتی تھی۔ وہ دونوں ایک تھے اور جس دن سے اس نے ہوش سنبھالا تھا' وہ باپ اور خود کو ناقابل تقسیم سمجھتی تھی۔ وہ اس کی خوفناک کھانسی کی آواز سن کر یوں محسوس کرتی جیسے یہ تکلیف اس کے اپنے سینے میں ہو رہی ہے۔ حقیقی صورت حال تو یہ تھی کہ اس کے رشتے کے سلسلے میں اس کے باپ کے منہ سے "ہاں" نکل گئی تھی' لیکن اس کے برعکس اس کے منہ سے "نہ" نکلی تھی' لیکن وہ ہر بات میں اس کے ساتھ تھی' یہاں تک کہ اس معاملے میں بھی اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس کی "ہاں" کو بھی وہ اپنی ہی "ہاں" سمجھتی تھی اور اسے اہمیت اتنی ہی دیتی تھی جتنی کہ اپنی "نہ" کو۔ لہٰذا اس کی تقدیر ظالم' غیر معمولی اور اٹل تھی' اس لیے اس سے نجات کی کوئی راہ نہ تھی اور اس بارے میں وہ کسی کی مدد بھی حاصل نہ کر سکی' کیونکہ کوئی مددگار موجود ہی نہ تھا' لیکن ایک بات وہ بخوبی جانتی تھی۔ باپ کی "ہاں" میں "ہاں" ملانے کی وہ اتنی ہی پابند تھی جتنی کہ اپنی "نہ" میں تھی۔

اس نے یہ طے کر لیا کہ وہ مستاج بیگ کے لڑکے کے ساتھ نکاح کے لیے قاضی کے سامنے ضرور جائے گی' کیونکہ وہ اگر ایسا نہ کرے' تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ اوداگا عثمانی نے اپنا عہد پورا نہیں کیا' لیکن اسے اس بات کا بھی اچھی طرح یقین تھا کہ نکاح کی تقریب کے بعد اس کے پاؤں اسے نیزدکے کبھی نہیں لے جائیں گے' کیونکہ اگر وہ نیزدکے چلی جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس نے اپنا قول ہار دیا ہے۔ یہ بات بھی قابل فہم تھی' اس لیے کہ یہ قول بھی ایک عثمانی کا تھا۔ اس مقام پر وہ عجیب و غریب تذبذب اور تعطل کا شکار تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ باپ کی "ہاں" اور اپنی "نہ" کے درمیان وتیلچے لگ اور نیزدکے کے درمیان کہیں نہ کہیں اسے اس ناگزیر اور محصور قلعے سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ لازماً ڈھونڈ نکالنا ہو گا۔ اب تک وہ یہی کچھ سوچ سکی تھی۔ اس رنگ برنگی عظیم دنیا کی وسعتوں کی بات نہیں اور نہ ہی وتیلچے لگ سے نیزدکے تک کے تمام راستے کی بات ہے' بلکہ بات صرف اس بدبخت لکیر نما چھوٹی سی سڑک کی ہے جو اس کے گھر کے دالان سے جس میں بیٹھ کر قاضی اس کا نکاح مستاج بیگ کے بیٹے سے کرے گا' پل کے سرے تک جاتی ہے اور وہاں سے پتھریلی ڈھلان کے نیچے اس تنگ پگڈنڈی تک پہنچتی ہے جو نیزدکے کی طرف جاتی ہے' اس کے بارے میں اسے سو فی صد پختہ یقین تھا کہ اس پر وہ اپنا قدم ہرگز نہیں رکھے گی۔ سڑک کے اس چھوٹے سے حصے پر اس کے تصورات لگاتار ایک سرے سے دوسرے سرے تک اوپر

نیچے پرواز کرتے رہے۔ ٹھیک اس طرح جیسے جولاہے کی تانی میں اٹکا ہوا شٹل اِدھر سے اُدھر آتا جاتا ہے۔ اس کے خیالات دالان سے منڈی تک اور پھر پُل کے خاتمے تک گھومتے رہتے اور حسب سابق وہاں کھڑے رہ کر جیسے کہ وہ ناقابل عبور کھڈ کے سامنے ہوں اور اس کے آگے جانا ممکن نہ ہو' وہ پُل عبور کرتے اور منڈی میں سے ہوتے ہوئے گھر کے دالان میں پہنچ جاتے اور اتنے دنوں تک تصورات کا یہ سفر آگے سے پیچھے اور پیچھے سے آگے تک جاری رہا۔ یہی وہ راستہ تھا جس پر فتح کی تقدیر کا تانابانا بنا جا رہا تھا۔

اور اس کے ان خیالات کا سلسلہ نہ تو بند ہوتا اور نہ ہی کوئی حل سمجھ میں آتا۔ ان کا مرکز زیادہ تر کپیا کے اس پرلطف اور چمک دار صوفے پر رہتا جس پر شہر کے لوگ بیٹھ کر آپس میں گفتگو کرتے اور نوجوان رس بھرے گیت گاتے اور جس کے نیچے گہرائی میں دریا کا تیز سبز پانی شور مچاتا ہوا رواں ہوتا۔ پھر اس قسم کے فرار سے خوفزدہ ہو کر کہ کیا اس معمے کا یہی آخری حل ہے' خیالات پھر سے تتر بتر ہو جاتے اور یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نحوست نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور جب اسے اس کے سوا اور کوئی حل نہ سوجھتا' تو اس کے تصورات کا وہی سفر ایک سرے سے دوسرے تک شروع ہو جاتا اور اس کی توجہ اسی کپیا کے صوفے پر ایک بار پھر جم جاتی۔

ہر رات کو بھی اس کے خیالات زیادہ تر اور زیادہ دیر تک اسی جگہ منڈلاتے رہتے اور ہر روز یہی سوچ اسے بے قرار رکھتی کہ اسے اس راہ پر جانا چاہیے اور پُل کے سرے پر پہنچنے سے پہلے کوئی حل نکال لینا چاہیے۔ اس سے اس پر موت کا خوف طاری ہو جاتا یا وہ ندامت کی زندگی کی وحشت کا شکار ہو جاتی۔ وہ اپنے آپ کو بے بس اور مجبور پانے لگتی' لہٰذا وہ فیصلہ کر لیتی کہ ان خیالات کا خوف دل سے نکال دینا چاہیے یا کم از کم آج کے لیے اس خیال کو ملتوی کر دینا چاہیے۔

لیکن دن گزرتے گئے۔ وقت کی رفتار نہ اتنی تیز رہی نہ آہستہ' بلکہ وہ باقاعدگی سے اور بدمزگی سے لمحہ لمحہ ماضی کے قلزم میں ڈوبتا رہا اور آخر کار شادی کا دن بھی آ پہنچا۔

ماہ اگست کی آخری جمعرات ایک منحوس ترین دن تھا۔ حمزائیوں کی برات گھوڑوں پر سوار ہو کر آئی تاکہ وہ لڑکی کو بیاہ کر لے جائیں۔ فتح کو ایک دبیز سیاہ برقعہ پہنا کر گھوڑے پر بٹھایا گیا اور اسے شہر بھر میں پھرایا گیا۔ اس اثناء میں دالان میں دولہا کو گھوڑے پر بٹھایا گیا۔ پھر قاضی کے سامنے شادی کا اعلان کیا گیا۔ اس طرح اوداگا نے مستاج بیگ کے لڑکے کو لڑکی بیاہ دینے کا جو وعدہ کیا تھا' وہ پورا ہو گیا۔ پھر اس کے بعد یہ مختصر سی برات واپس نیزوکے کی طرف روانہ ہوئی جہاں شادی کی پر تکلف رسومات کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔

وہ منڈی میں سے گزرتے گئے۔ یہ سڑک کا وہ حصہ تھا جس پر فتح نے اپنے تصورات میں بارہا سفر کیا تھا اور جس میں فرار کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ آج کے اس سفر کی نسبت فتح کے لیے تصورات کے گھوڑے پر سفر کرنا زیادہ آسان تھا۔ آج تو اس کے تصور میں ستارے اور افلاک کی وسعت نہیں تھی۔ آج اسے باپ کی پیچ دار کھانسی بھی نہیں ستا رہی تھی۔ آج اسے یہ خواہش بھی نہیں تھی کہ براتی زیادہ تیز رفتاری سے جائیں یا سست رفتاری سے۔ جب وہ پُل پر پہنچے' تو لڑکی کو ایک بار پھر گرما کی ان راتوں کی یاد آ گئی جب وہ اپنی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوا کرتی تھی جب اس کے جسم کا انگ انگ تن جاتا اور الگ الگ محسوس ہوتا خاص طور پر اس کی چھاتیوں کو کھچاؤ محسوس ہوتا جیسے اس نے زرہ بکتر پہن رکھی ہو۔

برات کا کچھ حصہ کپیا پر پہنچ گیا۔ جیسا کہ لڑکی نے اپنے تصورات میں گزری ہوئی راتوں کو ایسا بارہا کیا تھا' وہ آگے کو جھکی اور سرگوشی میں اپنے چھوٹے بھائی سے درخواست کی جو اس کے پیچھے جا رہا تھا کہ وہ اس کے رکابوں کو ذرا اور چھوٹا کر دے' کیونکہ اب وہ پُل کے نیچے اس ڈھلواں راستے سے پتھریلی پگڈنڈی کی طرف مڑ رہے تھے جو نیزوکے کی طرف جاتی تھی۔ وہ کھڑے ہو گئے۔ پہلے وہ دونوں پھر کچھ فاصلے پر باقی براتی بھی رک گئے۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات پیش نہ آئی اور نہ ہی یہ کوئی نئی بات تھی۔ یہ پہلی یا آخری کوشش نہیں تھی کہ کوئی برات وہاں کپیا پر رکی ہو۔

اس کا بھائی گھوڑے پر سے اترا۔ وہ گھوڑے کے گرد پھرا اور اس کی باگیں اپنے بازو پر پھینک دیں۔ دلہن نے اپنے گھوڑے کو پُل کے کنارے پر جانے کے لیے مجبور کیا۔ اپنا دایاں پاؤں حفاظتی دیوار پر رکھا' پھر گھوڑے کی زین پر اس زور سے اچھلی' جیسے اس کے پر لگے تھے۔ پھر وہ حفاظتی دیوار پر جھکی اور اپنے آپ کو پُل سے نیچے دریا کی شوریدہ سر لہروں میں پھینک دیا۔ بھائی اس کے پیچھے دوڑا اور پوری قوت سے اُچھل کر حفاظتی دیوار پر چڑھا۔ اس نے سر توڑ کوشش کی کہ لہراتے ہوئے برقعے کو پکڑ لے' مگر وہ ناکام رہا۔ یہ حادثہ دیکھ کر شادی کے دوسرے مہمانوں نے جھٹ پٹ اپنے گھوڑوں سے نیچے چھلانگیں لگا دیں۔ ان کے منہ سے

بے اختیار ہولناک قسم کی چیخیں نکل گئیں اور وہ دوڑ کر حفاظتی دیوار کے ساتھ مبہوت کھڑے ہو گئے جیسے کہ وہ خود بھی پتھر بن گئے تھے۔

اسی روز شام سے قبل شدید اور غیر معمولی بارش ہوئی جس سے سخت سردی ہو گئی۔ دریائے درینہ میں سیلاب آگیا اور اس کی موجیں انتہائی برہم ہو گئیں۔ دوسرے دن سیلاب کے پیلے پانی نے کلا تا کے نزدیک فتح کی لاش کو ایک جھنڈ میں پھینک دیا۔ وہاں اسے ایک ماہی گیر نے دیکھا اور فی الفور پولیس چیف کو اطلاع دے دی۔ اس کے کچھ دیر بعد پولیس چیف مع مختار اور ماہی گیر کے پہنچ گیا۔ ان کے ساتھ ماہی گیر کا کتا سالکو بھی تھا کہ ایسے معاملات اس کے بغیر علم میں نہیں آسکتے۔

لاش بھیگی ہوئی ریت میں پڑی تھی۔ پانی کی لہریں اسے آگے پیچھے بہاتی رہیں اور گاہے گاہے جھاگ دار پانی اسے دھوتا ہوا گزر جاتا۔ وہ نیا سیاہ برقعہ جسے پانی کی لہریں پھاڑنے میں کامیاب نہ ہو سکیں، پیچھے کی طرف اس کے سر پر پڑا تھا۔ برقعے کا نقاب اس کے گھنے بالوں میں الجھا ہوا تھا اور اس کے لطیف اور سفید جسم پر جو شادی کا جوڑا تھا، اسے پانی کی لہریں پھاڑ چیر کر ساتھ بہا لے گئی تھیں۔ سالکو اپنے جبڑے کھولے ہوئے غرا رہا تھا۔ سالکو اور ماہی گیر بڑی دقت سے ریت سے گزر کر لاش تک پہنچے اور ننگی لاش کو بڑی احتیاط سے اس طرح پکڑا جیسے وہ ابھی زندہ ہو۔ اسے بھیگی ریت سے اٹھا کر جس میں وہ برابر نیچے دھنستی جا رہی تھی، ساحل پر لے آئے، اور اسے اس کے کیچڑ سے لتھڑے ہوئے برقعے سے ڈھانپ دیا۔ اسی روز لڑکی کی لاش کو اس پہاڑی کے دامن میں جس پر ویلیچے لگ کی بستی واقع تھی، ایک قریبی مسلم خاندان کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا اور شام ہونے سے پہلے شہر کے غریب لوگ سالکو اور ماہی گیر کے گرد بڑی ناگوار اور عجیب حیرانی سے جمع ہو گئے۔ یہ صفت ان لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہے جن کی زندگی خالی خولی ہوتی ہے، جو زندگی کے حسن سے محروم ہوتے ہیں اور واقعات میں کسی قسم کا جذباتی ہیجان پیدا نہیں ہو پاتا۔ انھوں نے آلوچوں سے کشید کی ہوئی برانڈی سے ان کی تواضع کی اور انھیں پینے کے لیے تمباکو پیش کیا تاکہ وہ لاش اور اس کے کفن دفن کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر سکیں، لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ سالکو نے بھی کچھ نہ کہا۔ وہ لگاتار، تمباکو پیتا رہا اور اپنی ایک آنکھ سے اس دھوئیں کو دیکھتا رہا جو وہ زور سے دور تک پھونک کر چھوڑتا رہا۔ صرف سالکو ماہی گیر وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتے۔ انھوں نے خاموشی سے اپنے چھوٹے چھوٹے فلاسک اٹھائے جیسے وہ کوئی غیر مرئی قسم کھا رہے ہوں اور غٹا غٹ پی گئے۔

چنانچہ یہ وہ غیر معمولی اور ناگوار واقعہ تھا جو کپیا پر رونما ہوا۔ ویلیچے لگ نیزو کے تک نہ جا سکا اور اوداگا کی فتح ایک حمزائی کی بیوی نہ بن سکی۔

اس کے بعد اوداگا کبھی شہر تک نہ گیا۔ وہ اسی سال موسم سرما میں کھانسی کے حملے سے دم توڑ گیا اور اس نے مرنے سے قبل کسی شخص سے ایک لفظ تک نہ کہا کہ اس کی بیٹی کا غم اس کی موت کا باعث بنا ہے۔

دوسرے ہی سال موسم بہار میں مستاج بیگ نے برینکو ویسی کی بستی میں اپنے بیٹے کی شادی ایک لڑکی سے کر دی۔

کچھ عرصے کے لیے شہر کے لوگ اس حادثہ کا تذکرہ کرتے رہے اور اس کے بعد اسے بھولنے لگ گئے۔ جو کچھ باقی رہا، وہ صرف ایک گیت تھا جو اس لڑکی کے بارے میں تھا، جس کا حسن اور دانائی دنیا بھر میں روشنی کے مستقل مینار کی طرح چمکنے لگی، جیسے وہ غیر فانی تھی۔

☆☆☆

کارا جارج کی بغاوت کے تقریباً ستر برس بعد سربیا میں پھر جنگ چھڑ گئی اور سرحدوں پر اس کا رد عمل بغاوت کی صورت اختیار کر گیا۔ زلیبا، گوشتیلے، کرنیزے اور ویلوتو کے مقامات پر ترکیوں اور سربیوں کے کچھ اور مکانات شعلوں کی لپیٹ میں آگئے۔ ایک طویل مدت کے بعد سربوں کے کٹے ہوئے سر ایک بار پھر کپیا میں بکھرے ہوئے دیکھے گئے۔ یہ دبلے پتلے چہروں اور چھوٹے چھوٹے بالوں والے کسانوں کے سر تھے جن کے چہرے استخوانی اور مونچھیں لمبی لمبی تھیں۔ ان کی کیفیت آج بھی تقریباً ویسی ہی تھی جیسی کہ ستر برس پیشتر تھی، لیکن یہ صورت حال زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی۔ جونہی سربوں اور ترکوں میں جنگ ختم ہوئی، لوگ پھر امن میں آگئے، لیکن حقیقت میں یہ امن بڑا بے سکون اور مخدوش امن تھا۔ اس کے پس منظر میں خوفناک اور اشتعال انگیز افواہیں اور تشویش ناک سرگوشیاں سننے میں آ رہی تھیں۔ اس خدشے کا زیادہ سے زیادہ اور کھلے طور پر اظہار کیا جانے لگا کہ آسٹریا کی فوج بوسنیا میں داخل ہو گئی ہے۔

1778ء کے موسم گرما کے آغاز میں ترکی کی باقاعدہ فوج کی یونٹیں سرادو سے پریبو جاتے ہوئے شہر میں سے

گزریں۔ اس سے شہر میں عام طور پر یہ احساس پھیل گیا کہ ممکن ہے سلطان بغیر کسی مزاحمت اور مقابلہ کے بوسنیا چھوڑ دے۔

جولائی کے شروع میں پلیوے کا مفتی مٹی بھر جمعیت اپنے ساتھ لے کر وہاں آگیا۔ اس کے دل میں غیر متزلزل عزم یہ تھا کہ وہ بوسنیا میں آسٹریوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کا بندوبست کرے گا۔ وہ ایک سنجیدہ، خاموش طبع مگر ترش مزاج انسان تھا۔ وہ کپیا میں ٹھہرا اور گرمیوں کے ایک پرلطف روز اس نے شہر کے ترک لیڈروں کو طلب کیا اور انھیں آسٹریوں کے خلاف جنگ میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔

لیکن اس ترغیب پر لوگوں کی طرف سے اسے جس بزدلانہ ردعمل کا سامنا کرنا پڑا، وہ اس کے لیے زیادہ حیرت انگیز نہ تھا۔ ایسی صورت حال میں جب وہ اپنے آپ پر قابو نہ پاسکا تو اس نے انھیں ڈرانا دھمکانا شروع کردیا کہ وہ کم از کم اپنے مظلوم عوام سے انصاف کریں اور خدا کا خوف کھائیں۔ پھر اس نے عثمان آفندی، کرمان علی کو اپنے نائب کے طور پر وہاں چھوڑ کر کہا کہ وہ وسگارڈ کے عوام کو قائل کرنے کی کوشش کریں تاکہ وہ جنگ میں شریک ہونے کے لیے خود کو تیار کرسکیں۔

مفتی صاحب سے بحث و مباحثہ کے دوران سب سے زیادہ مخالفت علی ہدیٰ متولی کی طرف سے کی گئی۔ اس کا خاندان شہر بھر کے قدیم تر اور معزز ترین خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ اپنی خوش نصیبی کی وجہ سے نہیں، بلکہ دیانت داری اور صاف دلی کی وجہ سے مشہور تھے۔ اگرچہ وہ خودپسند اور ہٹ کے پکے لوگ تھے، لیکن اور لوگوں کی طرح ان میں رشوت خوری، بزدلی یا خوشامد کی عادت نہ تھی۔ نہ ہی وہ کسی اور سماجی برائی یا گراوٹ کا شکار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے خاندان کا معمر ترین بزرگ شہر میں محمود پاشا کی املاک کا متولی سرپرست اور منتظم چلا آرہا تھا۔ وہ پُل کے نزدیک مشہور سٹون این کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ہنگری کے کھو جانے کے بعد ہم نے دیکھا کہ سٹون این سے کس طرح محصول کی آمدن ختم ہوگئی جس سے اس کی مرمت اور دیکھ بھال کی جاتی تھی۔

پھر یہ زمانے کی دستبرد اور ستم ظریفیوں سے ایک ویرانے اور کھنڈر میں تبدیل ہوگیا۔ علی ہدیٰ کے دونوں بڑے بھائی جنگوں میں مارے گئے تھے۔ ایک روس میں اور دوسرا مانٹے نیگرو میں۔ علی ہدیٰ خود ابھی تک نوجوان تھا۔

زندہ دل، صحت مند اور خوش مزاج، ایک حقیقی متولی کی حیثیت سے وہ ہر معاملے میں متضاد رائے رکھتا تھا۔ وہ اپنی رائے کا بڑی مضبوطی سے دفاع کرتا اور بڑی سختی سے اس پر جما رہتا۔ اپنی صاف دلی اور آزادی خیال کی وجہ سے اکثر اوقات اسے مقامی علماء مسلم معززین سے کھٹ پٹ اور الجھن کا سامنا رہتا۔ اس کا خطاب اور عہدہ ایک "ہدیٰ" کا تھا، لیکن اس نے اس منصب پر فائز ہونے کے باوجود کبھی کوئی فریضہ انجام نہ دیا اور نہ ہی اس سے کوئی آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ اس خیال سے کہ وہ زیادہ سے زیادہ خود مختار رہے، وہ باپ کی چھوڑی ہوئی دکان کی ذاتی طور پر نگرانی کرتا تھا۔

وسگارڈ کے مسلمانوں کی اکثریت ہی کی طرح علی ہدیٰ بھی کسی مسلح مدافعت کے خلاف تھا، چنانچہ ایک شام کو وسگارڈ کے مقتدر ترک لیڈر کپیا پر ایک دائرے کی شکل میں ٹانگ پر ٹانگ دھرے بیٹھے تھے۔ ان کے وسط میں عثمان آفندی بیٹھا تھا جو ایک دراز قد، دبلا پتلا اور زرد رو آدمی تھا۔ اس کے چہرے کا ہر پٹھا غیر قدرتی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں علیل نظر آتیں اور اس کی پیشانی اور گال ہر جگہ سے ایک جذامی کی طرح داغ دار تھے۔ اس کے سامنے ہدیٰ کھڑا تھا جس کا چہرہ سرخی مائل تھا اور قد بوتا تھا۔ اس کے باوجود وہ کسی قدر اثر انگیز لہجہ رکھتا تھا اور اپنی باریک اور نوکیلی آواز میں سوال پر سوال کیے جارہا تھا۔ ان کے پاس کتنی فوج تھی؟ انھیں کہاں جانا تھا؟ ان کے وسائل کیا تھے؟ کس طرح؟ کس لیے؟ ناکامی کی صورت میں کیا ہوگا؟ وغیرہ۔ وہ کسی قدر سخت اور عالمانہ طریقے سے معاملہ پر گفتگو کررہا تھا۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ عیسائیوں کے غلبے پر اپنی تشویش اور غصہ پر پردہ ڈالے اور ظاہری طور پر ترکوں کی کمزوری اور بدنظمی کی بھی وضاحت کرے، لیکن تنک مزاج اور مغموم عثمان آفندی ایسا آدمی نہ تھا جو ایسی باتوں پر کان دھرے یا انھیں خاطر میں لائے۔

عثمان آفندی کا مزاج تند اور شدید تھا۔ اس کی نسیں تن گئیں اور وہ صبر و تحمل کھو بیٹھا اور سخت برہمی سے علی ہدیٰ پر برس پڑا۔ اس کی ہر حرکت پر اسے شبہ ہونے لگا اور اس کے تذبذب اور لڑکھڑاہٹ سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھی ایک ثوابی ہے۔ ہدیٰ نے اسے غصہ دلایا اور اس نے اسے سخت سست کہا اور بڑی بڑی گالیاں دیں۔ اس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ دشمن کو اپنے میں بغیر مزاحمت کے داخل ہونے کی

اجازت نہیں دینی چاہیے اور اس بارے میں جو شخص بہت سے اور طرح طرح کے سوال کر رہا ہے' وہ ایک نیک قومی مقصد کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے اور دشمن کی مدد کر رہا ہے۔ آخرکار وہ پوری طرح بے قابو ہو گیا اور علی بدیٔ کے ہر سوال کا شدید نفرت سے جواب دیا:

"اب مرنے کا وقت آ پہنچا ہے' ہم وطن کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ ہم آخری آدمی تک سب کے سب کٹ مریں گے"۔

اس پر بدیٔ نے بات کاٹتے ہوئے کہا: "میرا خیال یہ تھا کہ آپ ثوابیوں کو بوسنیا سے باہر دھکیلنا چاہتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ آپ نے ہمیں یہاں جمع کیا ہے۔ اگر یہ صرف مرنے کا سوال ہے' تب ہم بھی جانتے ہیں کہ مرا کس طرح جاتا ہے اور مرنے کے لیے ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں مرنے سے زیادہ آسان کام اور کوئی نہیں"۔

یہ دونوں بدتر اور بے مثال قسم کے حریف تھے اور مقابلے میں ان کا کوئی جوڑ ہی نہ تھا۔ ان سے عام تشویش کو فروغ دینے اور جھگڑے پر جھگڑا کھڑا کرنے کے سوا اور کسی بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ صورت حال افسوس ناک تھی' لیکن اس کا کوئی حل نہ تھا۔ اس قسم کے سیاسی بحران اور ناگزیر تغیر کی صورت میں ان صفات والے اشخاص اکثر ذہنی عدم توازن اور برہمی کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔ وہ یونہی باتوں کو الٹتے پلٹتے رہتے ہیں یا گمراہی اختیار کر لیتے ہیں اور یہ بدنظمی کے زمانے کی چند نشانیوں میں سے ایک نشانی سمجھی جاتی ہے۔

یہ تمام لڑائی اس وقت ختم ہوئی جب آسٹریا کی فوج لجسکا کی ڈھلان سے اترتی دیکھی گئی۔ اس وقت یہ پوری طرح واضح ہو گیا کہ اب حقیقت میں شہر چھوٹا' اسے کارواں سرائے کا وہ ابھرا ہوا خطابی چبوترہ چھوڑ دینا پڑا جو اس نے دو توپیں وہاں گھسیٹ کر لے جانے کے بعد بنایا تھا' لیکن شہر سے جانے سے پیشتر اس نے اپنی دھمکی پر عمل درآمد کا حکم دیا۔ اس نے اپنے ایک نوکر سے' جو پیشہ ور لوہار تھا اور جو قد و قامت میں دیوہیکل شخص تھا' مگر دماغ ایک چڑیا جیسا تھا' کہا کہ وہ علی بدیٔ کو باندھے اور کیپیا پر پتھر کی سیڑھیوں کے درمیان لگے ہوئے تختے سے اس کے دائیں کان میں کیل گاڑ کر ٹھونک دے۔

پل پر اور منڈی میں عام شور و غل کے باوجود یہ حکم جو کرمان علی نے اونچی آواز میں دیا تھا' سب نے اچھی طرح سنا' لیکن کسی کو یہ وہم و گمان تک بھی نہ تھا کہ اس پر اسی جذبے کے ساتھ عمل بھی کیا جائے گا جیسا کہ اس کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن یہ تاثر اور خیال کہ علی بدیٔ کو کیپیا میں کیل سے گاڑ دیا جائے گا' چاروں طرف پھیل گیا۔

شہر کے لوگ جو اس بات پر غصہ بھی کھا رہے تھے اور شش و پنج میں بھی مبتلا تھے' وہ اس گومگو کی حالت میں تھے کہ آیا یہ بات کہاں تک ممکن ہے کہ علی بدیٔ کے جرم کی سزا کے حکم پر عمل درآمد کیا جاتا ہے یا نہیں؟ کیا واقعی ایسا کیا جائے گا؟ پہلے پہل لوگوں میں سے اکثریت نے اس معاملہ کو' جیسا کہ یہ تھا' بے معنی' ناروا اور ناممکن قرار دیا' لیکن عام غصہ اور غیظ و غضب کے عالم میں کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہی ہے جو ایک عظیم اور غیر معمولی واقعہ ہوتا ہے اور یہی ایک معاملہ ایسا تھا جسے وقوع پذیر ہونا تھا۔ کیا واقعی ایسا کیا جائے گا؟ یا ایسا نہیں کیا جائے گا؟ یہی سوال سب کی پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا۔ اس پر عمل درآمد کا امکان قوی تر نظر آیا اور گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ یہ امکان زیادہ روشن اور قدرتی دکھائی دینے لگا' کیوں نہیں؟

لوگوں نے دیکھا کہ دو آدمیوں نے علی بدیٔ کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے' لیکن اس نے اپنی زیادہ مدافعت نہ کی۔ انھوں نے اس کے دونوں ہاتھ اس کی پیٹھ کے پیچھے باندھ دیئے' لیکن اب بھی یہ معاملہ اس احمقانہ اور خوفناک حقیقت سے دور نظر آتا تھا' لیکن یہ حقیقت سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ اچانک وہ ہتھوڑا اس نے ہاتھ میں لیا جس سے وہ کچھ پیشتر توپوں کی کیلیں ٹھونک رہا تھا۔ اس خیال نے کہ ثوابی بس پہنچا ہی چاہتے ہیں اور جو شہر سے نصف گھنٹہ کے فاصلے پر ہیں' اسے یہ حوصلہ دے دیا کہ وہ یہ کام کر ہی ڈالے اور علی بدیٔ نے اس دردناک خیال کے سبب اپنی روایتی ضد قائم رکھی یہاں تک کہ وہ اس مجنونانہ' ناحق اور شرمناک سزا کے خلاف تھا جس کے ذریعے اسے اس طرح ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

چنانچہ چند لمحوں کے بعد وہ واقعہ رونما ہو ہی گیا' جو بظاہر ناممکن اور ناقابل یقین نظر آتا تھا۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے اس سزا کو مناسب یا ممکن خیال کیا ہو' تاہم ان میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی طرح یہ کردار ضرور ادا کیا جس کے نتیجے میں علی بدیٔ کو کیل سے بیم کے ساتھ گاڑ دینے کی سزا ملی اور جب ہر شخص ثوابیوں کی شہر میں آمد سے قبل مختلف سمتوں کو بھاگ نکلا تھا' علی بدیٔ ایک عجیب و غریب اور مضحکہ خیز حالت

میں وہاں باقی رہا۔ وہ ذرا بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ عالم اس کے لیے انتہائی طور پر اذیت ناک تھا۔ اور درد کا تقاضا یہ تھا کہ وہ کان کو پھاڑ کر اپنے آپ کو آزاد کر لے، لیکن یہ کام اسے پہاڑ سے بھی بڑا اور بھاری محسوس ہوا۔ اس نے بہت شور وغل برپا کیا، لیکن اس کی پکار سننے یا اس کی مدد کرنے کے لیے وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا، کیونکہ ہر شخص خوف کی وجہ سے یا تو گھروں میں گھس گیا تھا یا دور دراز گاؤں میں روپوش ہو گیا تھا۔ انھیں ایک تو ثوابیوں کے آنے کا ڈر تھا اور دوسرا باغیوں کا خوف تھا جو مایوس جا رہے تھے۔

شہر پر موت کے سائے پھیل گئے تھے اور پُل بھی اپنی ویرانی اور تنہائی کا ماتم کر رہا تھا۔ کوئی زندہ یا مردہ شخص پُل کو بچانے کے لیے موجود نہ تھا۔ صرف کیپیا پر علی ہدیٰ بے حس و حرکت تختے کے ساتھ ٹانکا ہوا درد سے کراہ رہا تھا۔ وہ اس حالت میں بھی کرمان علی کے خلاف تازہ ثبوت بہم پہنچانے کی فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

رفتہ رفتہ آسٹریا کی فوج قریب آتی گئی۔ دریا کے پرلے کنارے سے ان کی گشت کے آدمیوں نے کارواں سرائے کے سامنے دو توپیں پڑی ہوئی دیکھیں۔ وہ فوراً ہی وہاں رک گئے اور اپنی پہاڑی توپوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ تقریباً نصف النہار کے وقت انھوں نے ایک چھوٹی سی جھاڑی کی آڑ سے ویران کارواں سرائے پر توپ کے چند گولے فائر کیے۔ انھوں نے پہلے سے تباہ شدہ "این" کو برباد کر دیا اور کھڑکیوں کی غیر معمولی طور پر نفیس چوکھٹوں کو تباہ کر دیا جنھیں نہایت ملائم پتھر کے ایک ہی ٹکڑے سے کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ انھوں نے رینج میں لا کر دونوں ترکی توپوں کو الٹ دیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ وہاں کوئی شخص موجود نہیں جو ان کے حملے کا جواب دے سکے، تو انھوں نے فائر بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ پوری احتیاط کے ساتھ پُل اور شہر کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ دشمن کے کچھ سپاہی رائفلوں کو فائر کی تیاری کی حالت میں لیے کیپیا کی طرف بڑھے، پھر جب انھوں نے ہدیٰ کو ٹانگے ہوئے دیکھا تو غیر یقینی کے عالم میں رک گئے۔

علی ہدیٰ دشمن کے توپ کے گولوں کی گونج اور دھماکوں سے بے حد خوف زدہ ہو گیا تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے کان میں ٹھونکے ہوئے کیل کا درد بھول گیا۔ جب اس نے دشمن کے قابل نفرین سپاہیوں کو دیکھا جنھوں نے اپنی رائفلوں کی نالیں اس کی طرف تولی ہوئی تھیں وہ قابل رحم حالت میں رونے لگا اور لمبے لمبے ہنکورے بھرنے لگا، کیونکہ یہی ایک ایسی زبان ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ اس حالت میں انھوں نے اس پر گولی نہ چلائی اور وہ مرنے سے بچ گیا۔ کچھ سپاہیوں نے آہستہ رفتار سے قدم بہ قدم پُل کی طرف پیش قدمی جاری رکھی، جبکہ دوسرے سپاہی اس کے پاس رک گئے اور اسے زیادہ قریب سے بغور دیکھنے لگے اور اس کی یہ کیفیت ان کی سمجھ میں نہ آئی۔

جب ہسپتال کا ایک نرسنگ اردلی وہاں پہنچا، تو اس نے کہیں سے پلاس حاصل کیا اور بڑی احتیاط سے کیل کو نکال دیا۔ یہ کیل ویسا ہی تھا جن سے گھوڑوں کی نعل بندی کی جاتی ہے۔ اس طرح علی ہدیٰ کو نجات مل گئی۔ وہ اتنا اکڑ چکا تھا کہ اس کی طاقت جواب دے گئی تھی، چنانچہ وہ پتھر کی سیڑھی پر گر پڑا۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا اور سرد آہیں کھینچ رہا تھا۔ نرسنگ اردلی نے اس کے زخم پر دوا لگا کر مرہم پٹی کر دی۔ دوا لگنے سے اسے سخت چبھن محسوس ہوئی۔ علی ہدیٰ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ اس نے دشمن کے سپاہی کے بائیں بازو پر ایک سفید پٹہ دیکھا جس پر سرخ مواد سے ایک بڑا اور باقاعدہ کراس بنا ہوا تھا۔ ایسے ڈراؤنے اور ہزیمت ناک منظر انسان شدید بخار کی حالتوں میں دیکھا کرتا ہے۔ یہ کراس اس کی اشک آلود آنکھوں میں تیرتا اور ناچتا رہا جیسے کہ وہ ایک خواب کے عالم میں ہے۔ پھر نرسنگ اردلی نے اس کے زخم کو باندھ دیا اور پٹی کے اوپر اس کی پگڑی لپیٹ دی۔ اس حالت میں علی ہدیٰ نے اپنے آپ کو پاؤں پر گھسیٹا اور کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ پُل کی حفاظتی دیوار پر ٹیک لگا کر کچھ دیر کے لیے جھکا رہا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی قوت کو یکجا کیا اور کسی قدر دوبارہ سکون حاصل کیا۔

اس کے سامنے کیپیا کی دوسری طرف پتھر پر کھدی ہوئی ترکی عبارت کے نیچے سپاہی نے ایک بڑا سفید کاغذ چپکا دیا:

"بوسنیا اور ہرزی گووینا کے عوام! اپنے آپ کو پورے اعتماد کے ساتھ آسٹریا اور ہنگری کے جھنڈوں تلے حفاظت میں لے آیئے۔ ہمارے سپاہیوں کا دوستوں کی طرح استقبال کریں۔ حکام کی اطاعت قبول کریں اور اپنے اپنے کام پر چلے جائیں۔ آپ کی محنت کے ثمر کی پوری حفاظت کی جائے گی"۔

ہدیٰ نے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا، ایک ایک جملے پر غور کیا، گو اسے ہر لفظ کی سمجھ تو نہ آئی، لیکن ہر لفظ نے اسے دکھ

ضرور پہنچایا۔ یہ دکھ درد ایک مخصوص قسم کا تھا۔ یہ درد اس درد سے قطعی طور پر مختلف تھا جو اس کے زخمی کان سریا پٹھوں میں محسوس ہو رہا تھا۔ صرف اس موقع پر اس شاہی حکم نامے کے الفاظ سے یہ بات فوری طور پر اور پہلی بار واضح طور پر محسوس ہوئی کہ ان کے لیے ہر چیز کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ جو کچھ کہ اس کا تھا یا وہاں کے عوام کا تھا' ایک عجیب و غریب طریقے سے ہمیشہ کے لیے موقوف ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں روشنی باقی تھی۔ لبوں پر بولنے کی سکت تھی۔ انسان زندہ تو ہے 'مگر زندگی--- حقیقی زندگی کا وجود ہی نہ باقی رہا۔ ایک غیر ملکی طاقت نے ان پر اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے۔

اور غیر ملکی مذہب کی عمل داری قائم ہو گئی ہے۔ یہ سب کچھ اعلان کے ان موٹے موٹے الفاظ اور غیر واضح احکام سے صاف ظاہر ہو رہا تھا اور اس سے زیادہ یہ سینے میں سلگتے ہوئے اس درد سے بھی واضح ہو رہا تھا جو بے حد ظالمانہ اور ناقابل برداشت درد تھا۔ یہ درد ہر انسانی درد سے زیادہ دردناک تھا جسے انسان خیال میں لا سکتا ہے۔

یہ عثمان کرمان علی جیسے ہزاروں احمقوں جیسی بات نہ تھی جو کچھ کر سکتا یا صورت حال میں تبدیلی لا سکتا (اس طرح بدئی دل ہی دل میں بڑبڑاتا رہا) ہم سب مر مٹیں گے' ہمیں کٹ مرنا چاہیے۔ اب اس قسم کے بے معنی شور و غل کا بھلا کیا فائدہ تھا جبکہ تباہی سر پر آ چکی ہو جس میں نہ تو زندہ رہنا آسان ہو نہ مرنا۔ وہ تو بس زمین میں دبی ہوئی ایک لکڑی کے مانند ہے جو روز بروز تباہ ہو رہی ہو اور انسان اور کسی کا ہو' تو ہو اپنا ہرگز نہیں رہتا۔

اگرچہ علی بدئی کا سر چکرا رہا تھا' وہ اپنی حیرانی پر قابو نہ پا سکا اور اس سفید اشتہار کو دیکھنے لگا۔ یہ سربی اور ترکی زبان میں جنرل فلیپووک کا ایک اعلان تھا جو بوسنیا میں آسٹریا کی فوج کے داخلہ کے موقع پر بوسنیا اور ہرزی گووینا کے عوام کے نام جاری کیا گیا تھا۔ اپنی دائیں آنکھ کھول کر علی بدئی نے ترکی زبان میں لکھی ہوئی عبارت کے موٹے موٹے الفاظ پڑھنے شروع کیے:

"آسٹریا کے شہنشاہ اور ہنگری کے بادشاہ کی فوج نے آپ کے ملک کی سرحدوں کو پار کر لیا ہے۔ یہ فوج بطور دشمن کے یہاں کے علاقہ پر زبردستی قبضہ کرنے نہیں آئی۔ یہ صرف دوست کی حیثیت میں آئی ہے۔ اس کا مقصد اس بد نظمی کو ختم کرنا ہے جو سالہا سال سے نہ صرف بوسنیا اور ہرزی گووینا میں افراتفری کا باعث تھی' بلکہ آسٹریا اور ہنگری کے سرحدی اضلاع میں بھی گڑبڑ کا موجب تھی"۔

شہنشاہ معظم یہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ان کی مملکت کے ہمسائے میں کشیدگی اور بد نظمی کا دور دورہ رہے اور ان کے ملک کی سرحدوں پر اضطراب اور بدبختی دستک دیتی رہے۔ بادشاہ نے آپ کی حالت کے بارے میں یورپی ملکوں کی توجہ دلائی ہے اور اقوام کی کونسل میں یہ متفقہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ آسٹریا اور ہنگری آپ کو امن اور خوش حالی کی دولت دوبارہ واپس دلائے جس سے آپ ایک عرصے سے محروم چلے آ رہے ہیں۔

ملک معظم نے' جو دل سے آپ کا دوست ہے' یہ محسوس کیا ہے کہ آپ کو اپنے مقتدر دوست کنگ 'ایمپرر کی حفاظت میں دے دے۔

کنگ ایمپرر نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ اس ملک کے تمام لوگ قانون کے مطابق حقوق پائیں گے اور ان کی جان و مال اور مذہبی اعتقاد کا تحفظ کیا جائے گا۔

یہ ایسی عظیم بدبختی تھی جو ہر قسم کے کرمان ملیوں کے ذہن میں نہ آ سکی اور نہ وہ اسے سمجھ سکے اور سمجھ کے اس فقدان سے حالات زیادہ سنگین اور شرمناک صورت اختیار کر گئے۔

علی بدئی سوچ کے اس سمندر میں غرق تھا کہ وہ پل پر سے آہستہ آہستہ روانہ ہو گیا اور اتنا بھی محسوس نہ کر سکا کہ آسٹریا کے ریڈ کراس کا آدمی دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے۔ جب سے اس نے شاہی فرمان کے الفاظ پڑھے تھے' اس کے کان کا درد جاتا رہا تھا۔ اب درد کے شعلے اس کے سینے سے اٹھ رہے تھے جو اس کے لیے ناقابل برداشت بن گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پل سے گزر کر دریا کے دوسرے کنارے تک کبھی نہ جا سکے گا۔ یہ پل جو کہ شہر کے لیے باعث فخر پونجی تھا اور اپنی تعمیر سے لے کر آج تک اس شہر سے منسلک رہا تھا' جس پر وہ چھوٹے سے بڑا ہوا تھا اور جس کے پاس اس نے اپنی زندگی گزاری تھی' آج اچانک وہ درمیان سے ٹوٹ چکا تھا۔ ٹھیک 'کپیا پر سے جہاں اعلان کا سفید کاغذ چسپاں کیا گیا تھا۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی خاموش دھماکے نے پل کو دو ٹکڑے کر دیا تھا۔ اب اس کے پائے دراڑ کے دائیں اور بائیں جانب کے حصوں کی طرف کھڑے تھے اور پل پار کرنے کی کوئی صورت باقی نہ تھی' کیونکہ پل دریا کے دونوں کناروں سے منسلک نہ رہا تھا اور اب یہ صورت حال تھی کہ

حو شخص جس طرف بھی ہے' وہیں رہے گا اور دوسری طرف نہیں جا سکے گا۔
علی ہدیٰ آہستہ آہستہ چلتا رہا' وہ شدید اذیت ناک خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ یوں نظر آ رہا تھا' جیسے کہ بری طرح زخمی ہو اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ وہ ہچکچاتے ہوئے چل رہا تھا جیسے کہ وہ ایک بیمار بھکاری ہو جیسے وہ پُل کو پہلی بار پار کر کے ایک اجنبی شہر میں داخل ہو رہا ہو' اس کے پیچھے ابھرنے والی کچھ آوازوں نے اسے متوجہ کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے کچھ سپاہی چل رہے تھے۔ ان میں وہ موٹا' خوش فطرت اور ہنس مکھ شخص بھی تھا جس کے بازو پر ریڈ کراس بنا ہوا تھا اور جس نے اس کے کان سے کیل نکالا تھا' وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیا اور اس کی پٹی کی طرف اشارہ کر کے اس نے ناقابل فہم زبان میں اس سے کچھ پوچھا۔
علی ہدیٰ نے سوچا کہ وہ اس کی کچھ مدد کرنا چاہتا ہے۔ وہ اچانک تن گیا اور بیزاری و نفرت سے کہا:
"میں خود ہی کر سکتا ہوں.... مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں"۔
پھر وہ تیزی اور مستقل مزاجی سے قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔
☆☆☆
رسمی اور سرکاری طور پر آسٹریا کی فوج دوسرے دن شہر میں داخل ہوئی۔ شہر پر گویا ایسا سکوت مرگ طاری تھا جس کا ذکر الفاظ میں لانا محال ہے۔ گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں' حالانکہ یہ آخر اگست کا ایک گرم ترین دن تھا۔ گلیاں سنسان تھیں اور سیر و تفریح کے مقامات اور باغیچوں پر موت کی سی ویرانی چھائی تھی۔ ترکوں کے گھروں میں مایوسی' بے چینی اور گومگو کی کیفیت طاری تھی۔ عیسائیوں کے گھروں میں احتیاط اور بے اعتمادی کا احساس پایا جاتا تھا' لیکن ہر جگہ اور ہر کسی کے دل میں خوف گھر کر گیا تھا۔ آسٹریا کی داخل ہونے والی فوج کو گھات کا ڈر تھا۔ ترک آسٹریوں سے خوفزدہ تھے۔ سربیوں کو ترکیوں اور آسٹریوں دونوں سے خطرہ تھا۔ یہودی ہر بات ہر کسی سے خائف تھے' کیونکہ خاص طور پر زمانہ جنگ میں ہر شخص ان سے زیادہ مضبوط اور توانا ثابت ہوا تھا۔ گزشتہ دن چلی ہوئی توپوں کی گھن گرج ابھی تک کانوں میں گونج رہی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے رہے اور اپنے ہی خوف کی لہروں کو محسوس کر رہے تھے۔ ایسے میں کسی زندہ انسان کو اتنی ہمت نہ ہو سکی کہ وہ دروازے کی دراڑ سے تاک باہر نکال کر صورت حال کا جائزہ لے۔ لوگوں پر اب غیر ملکی آقا مسلط تھے۔ آسٹریوں کی فوج جو گزشتہ روز شہر میں داخل ہوئی تھی' اس نے پولیس کے چیف اور اس کے حامیوں کو شکست دے کر تہس نہس کر دیا۔
آسٹری فوج کے کمانڈر نے پولیس چیف کو اس کی تلوار واپس کر دی اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنے فرائض جاری رکھے تاکہ شہر میں امن و امان برقرار رہے۔ اس نے اسے کہا کہ کل دوپہر سے ایک گھنٹہ قبل ہماری فوج کا کمانڈنٹ جو ایک کرنل ہے یہاں آئے گا اور شہر کے سرکردہ لیڈروں یعنی تینوں مذاہب کے نمائندوں کو اس کی آمد پر اس سے ملاقات کرنا ہو گی۔ پولیس چیف نے سر تسلیم خم کیا اور فی الفور ملا ابراہیم' سکول ماسٹر حسین آغا' پوپ نکولا اور ربی (یہودی عالم) ڈیوڈلیوی کو بلا بھیجا اور انہیں بتایا کہ بطور ممتاز شہریوں کے کل دوپہر کو کپیا پر آسٹری کمانڈنٹ کی آمد پر انہیں اس کے استقبال کے لیے موجود ہونا چاہیے۔ ان کا یہ استقبال تمام شہریوں کی جانب سے ہو گا اور وہ شہر کی منڈی تک اس کے ہمراہ جائیں گے۔
اس طرح شہر میں بغیر کسی قربانی کے پُل کی تباہی اور علی ہدیٰ کی شہادت کے سوا اور کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد حالات معمول کے مطابق ہونے لگے اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ خود علی ہدیٰ نے بھی کمر ہمت باندھ لی اور پُل کے نزدیک دوسرے تاجروں کی طرح اپنی دکان کھول لی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنی پگڑی قدرے دائیں کو نیچے کی طرف کھسکا کر باندھنی شروع کی تاکہ اس کے زخمی کان کا نشان نظر نہ آ سکے۔ وہ شدید اور مخفی دباؤ جو اس نے آسٹریا کے نرسنگ اردلی کے بازو پر ریڈ کراس کا نشان دیکھ کر اور شاہی الفاظ پڑھ کر محسوس کیا تھا' حقیقت میں ابھی کم نہ ہوا تھا' بلکہ یہ تسبیح کے دانے کی طرح قدرے چھوٹا ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ زندہ رہنا کسی قدر ممکن ہو گیا تھا اور علی ہدیٰ ہی واحد آدمی تھا جسے یہ دباؤ محسوس ہو رہا تھا' بلکہ اس کے ساتھی اور بھی بہت سے تھے۔
چنانچہ آسٹریوں کے قبضہ کے بعد تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا جسے عوام روک لینے کے قابل تو نہ تھے' لیکن خیال کرتے تھے کہ یہ دور عارضی ہو گا۔ قبضہ ہو جانے کے تین سال بعد تک پُل پر سے کیا کچھ نہیں گزرا! پہلی پہلی فو

گاڑیاں لمبے کانوائے کی شکل میں پُل پر سے دندناتی ہوئی گزرتیں جن میں خوراک' لباس' فرنیچر' اوزار کے علاوہ ایسے پرزہ جات بھی لائے گئے جن کے بارے میں لوگوں نے اس سے پیشتر نہ سنا ہی تھا اور نہ دیکھا ہی تھا۔

پہلے پہل صرف فوج دیکھنے میں آئی۔ سپاہی پانی کی طرح زمین سے اُبلنے لگے۔ وہ ہر کونے اور ہر جھاڑی میں موجود تھے۔ منڈی ان سے بھری ہوئی تھی اور وہ شہر کے دوسرے حصوں میں موجود تھے۔ دن کے تقریباً ہر لمحے کوئی نہ کوئی خوفزدہ عورت غیر متوقع طور پر اپنے دالان میں یا اپنے گھر کے پیچھے آلوچوں کے باغ میں کسی غیر ملکی فوجی کو اچانک دیکھ کر چلانا اور چیخنا شروع کر دیتی۔ اپنی گہری نیلی وردی میں ملبوس جو دو ماہ کے لگاتار مارچ اور جنگ میں شرکت کے سبب داغدار ہو گئی تھی' وہ اس بات پر خوش تھے کہ وہ زندہ بچ نکلے اور اب وہ آرام اور تفریح چاہتے تھے اور اسی مقصد کے لیے وہ شہر اور اس کے مضافات میں گھوم رہے تھے۔ شہریوں میں سے اب کوئی کوئی ہی کپیا کی طرف جاتا' کیونکہ اب یہ غیر ملکی فوجیوں سے بھرا پڑا تھا' وہ وہاں بیٹھ جاتے' مختلف زبانوں میں گانے گاتے اور اپنی نیلے چمڑے کی ٹوپیوں میں فروٹ خرید کر ڈالتے۔ ان کی ٹوپی پر ایک زرد رنگ کی دھات کا نشان تھا جس پر شاہی حروف (ال F) کھدے تھے۔

جب خزاں کا موسم آیا' تو سپاہی واپس جانے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ اور بغیر نظر آئے چپکے چپکے سے چلے گئے اور وہاں بہت ہی کم تعداد میں باقی رہ گئے۔ صرف پولیس کے کچھ دستے باقی رہ گئے تھے۔ انہوں نے ایک لمبی مدت کے قیام کے لیے مکانات کرایہ پر حاصل کر لیے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ سرکاری افسروں کی آمد شروع ہو گئی۔ ان کے بعد سول کے سرکاری ملازمین اپنے کنبوں کے ساتھ آتے گئے۔ پھر طرح طرح کے ماہر ہنرمندوں کا تانتا بندھ گیا جن کا وجود شہر میں پہلے سے نہیں پایا جاتا تھا۔ ان میں یوگوسلاویہ' پولینڈ' کروشیا' ہنگری اور آسٹریا کے لوگ تھے۔

پہلے پہل تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ لوگ اتفاقیہ آ گئے ہیں جیسے انہیں ہوا اڑا کر لائی ہے اور جیسے کہ وہ مختصر سے عرصے کے لیے آئے ہیں اور کم و بیش ایسی ہی زندگی گزاریں گے جس طرح کہ وہاں کے لوگ اس علاقے میں زندگی گزارتے رہے ہیں' اگرچہ سول کے حکام کو کچھ عرصہ کے لیے اپنا قیام طویل کر دینا پڑا اور فوج نے علاقہ پر اپنا قبضہ جمانا شروع کر دیا' لیکن گزرنے والے ہر ماہ کے بعد نئے آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا' تاہم شہر کے لوگوں کو جس بات نے حیرت اور بے اعتمادی میں ڈال رکھا تھا' وہ ان کی تعداد نہیں تھی' بلکہ ان کی لاتعداد اور ناقابل فہم تجویزیں تھیں اور وہ رازداری تھی جس سے وہ اپنی منصوبہ بندی کا تانا بانا بن رہے تھے اور انہیں عملی جامہ پہنانے میں مصروف تھے۔ نئے آنے والے نہ تو خود امن سے رہے اور نہ ہی انہوں نے دوسروں کو امن و چین سے رہنے دیا۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی غیر محسوس روش اور اس کے ساتھ ساتھ کھلے عام قوانین' ضابطوں اور احکامات پر عمل درآمد کا پختہ عزم رکھتے تھے۔ وہ ان سے زندگی کا ہر مروجہ طریقہ' رعایا' مویشیوں اور چیزوں کا ناک نقشہ ہی تبدیل کر دینا چاہتے تھے' بلکہ وہ ہر پرانی چیز کو ایک نیا رنگ دینے کے خواہشمند تھے' یعنی شہر کی ظاہری صورت میں بھی انقلاب لانا چاہتے تھے' اور مہد سے لحد تک تمام انسانی رسم و رواج کو نئے طور طریقوں سے بدل دینا چاہتے تھے۔

لیکن ترکیوں اور سربیوں کے گھروں میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ وہ حسب سابق یعنی پرانے دستور کے مطابق زندگی کے معمولات اور تفریحات میں شریک ہوتے رہے۔ آٹا بدستور پراتوں میں گرم کر کے سوڈے سے دھویا جاتا' جس سے عورتوں کی انگلیاں زخمی ہو جاتیں۔ وہ بدستور طنبوروں اور کھڈیوں میں کپڑا بنتے رہے۔ دعوتوں' شادیوں اور تعطیلات پر تقریبات پرانے طریقوں اور رسم و رواج کے عین مطابق ہوتیں۔ وہ رواج جو نووارد اپنے ساتھ لائے تھے' ان کے بارے میں یہ سرگوشیاں سننے میں آتیں جیسے کہ یہ قطعی بے معنی اور ناقابل عمل ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کا طرز زندگی اور کام کاج اور کاروبار حسب سابق جاری رہا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے غیر ملکی قبضہ کے پندرہ یا بیس برس بعد تک بھی زندگی کے یہی معمولات جاری رہیں گے۔

اس کے برعکس شہر کی ظاہری ڈیل ڈول اور عمل دخل میں تیزی سے واضح تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ جو لوگ اپنے گھروں میں پرانے نظام پر چل رہے تھے' وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس میں کسی تبدیلی کا امکان ہے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے بہت سی تبدیلیوں کو اپنانا شروع کر دیا اور اگرچہ وہ کچھ عرصہ تک ان تبدیلیوں پر حیرانی اور اعتراض کے عالم میں رہے اس کے باوجود انہیں آسانی سے قبول کر لیا۔ قدرتی طور پر حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی زندگی نے جدید اور قدیم طرز کی ایک درمیانی صورت اختیار کر لی۔ قدیم خیالات

اور قدریں' جدید خیالات اور قدروں سے ٹکرانے لگیں۔ کچھ ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں اور کچھ ایک دوسرے کے مقابل چلتی رہیں اور یہ احساس ہو تا رہا کہ دیکھیں کون سی قدر کس قدر کو مٹا دیتی ہے۔ لوگ ناپ تول کے پرانے نظام کو چھوڑ کر نیا نظام اپنانے لگے۔ خرید و فروخت' ادائیگی کے طریقے اور جدید کیلنڈر پر عمل در آمد شروع کر دیا گیا۔ کہیں کہیں پرانے طریقے بھی قائم رہے۔ لوگ قدرتی طور پر ہر نئی بات کی مخالفت کرتے' لیکن وہ اس میں انتہا تک نہ گئے' کیونکہ ان کے نزدیک خود زندگی ہر چیز سے اہم تھی اور زندگی کے طور طریقے ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ کچھ مخصوص افراد ایسے ضرور تھے جو نئے اور پرانے میں تمیز کے سچے اور کھرے علم بردار تھے۔ ان کے نزدیک زندگی کے طریقے ناقابل تقسیم تھے اور غیر مشروط طور پر وہ زندگی سے وابستہ تھے۔

ان اشخاص میں سے ایک شمسی بیگ تھا جو کہ شہر کا امیر ترین اور معزز ترین شخص خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے چھ بیٹے تھے' ان میں سے چار شادی شدہ تھے۔ ان کے مکانات' کھیتوں' آلوچوں کے باغوں اور جھاڑیوں سے گھرے ہوئے تھے۔ شمسی بیگ ایک غیر متنازعہ شخصیت تھا' جو اس خاندان کا خاموش اور سخت گیر آقا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا اور بڑھاپے کی وجہ سے کمر میں جھکاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے سر پر سنہری بیل بوٹوں والی پگڑی پہنتا تھا۔ وہ ہر جمعہ کو نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے منڈی کی مسجد میں جایا کرتا تھا۔ غیر ملکی تسلط کے پہلے ہی دن سے وہ شہر ہی کا ہو کے رہ گیا۔ وہ نہ تو کسی سے بات کرتا اور نہ ہی کسی سے ملتا جلتا۔ نئے کپڑے یا لباس کا کوئی ٹکڑا نئے اوزار یا نئی زبان کا کوئی لفظ اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دیتا۔ اس کے بیٹوں میں سے کسی ایک کو بھی نئے حکام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے پوتوں کو اسکول جانے کی اجازت نہ تھی۔ شمسی بیگ کا خاندان بھی اس سے متاثر تھا۔ بوڑھے باپ کی ضد کی وجہ سے اس کے بیٹوں اور پوتوں میں بے اطمینانی پائی جاتی تھی' لیکن ان میں سے کسی کو بھی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اس بارے میں کوئی لفظ کہے یا اشارہ تک کرے۔

منڈی کے وہ ترک جو نوواردوں کے ساتھ کام کرتے اور ان سے گھل مل گئے تھے' جب شمسی بیگ کو منڈی میں سے گزرتا دیکھتے' تو ایک عجیب بے زبانی سے اس کا استقبال کرتے' جس میں احترام تو ہوتا' مگر اس میں خوف' تعریف اور ضمیر کی بے چینی بھی ملی ہوتی۔ بزرگ ترین اور باوقار لوگ اکثر بڑے اہتمام سے کرنیس جاتے اور شمسی بیگ کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے۔ یہ ملاقاتیں ان لوگوں کی تھیں جو آخر دم تک مدافعت کے پر زور حامی تھے اور کسی طرح بھی حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ حقیقت میں بات چیت کے یہ اجلاس بڑے طویل ہوتے جس میں باتیں بہت کم کی جاتیں اور ان کا کوئی خاص نتیجہ بھی نہ نکلتا۔

شمسی بیگ ایک سرخ نمدے پر بیٹھ کر تمباکو پیتا رہتا۔ وہ گرمیوں میں بھی سردیوں کی طرح چوغہ پہنتا اور اس کے بٹن بند رکھتا اور مہمان اس کے ارد گرد بیٹھے رہتے۔ ان کی گفتگو اکثر اوقات قابض حکام کے تازہ ترین اور ناقابل فہم اور منحوس اقدام کے بارے میں ہوتی یا ان کا موضوع سخن وہ ترک ہوتے جو نئے نظام کو رفتہ رفتہ اپناتے جا رہے تھے۔ وہ لوگ اپنی تلخی اپنے خدشات اور غیر یقینی صورت حال کو اس سخت گیر اور معزز انسان کے سامنے رکھ کر اپنے جذبات کی نکاسی کرتے۔ ہر مکالمہ کے آخر میں سوال پیدا ہو جاتے: یہ طوفان کس طرف جا رہا ہے اور یہ کہاں جا کر رکے گا؟ یہ اجنبی کون ہیں؟ اور کیا ہیں؟ جنہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ آرام اور تفریح کیا چیز ہیں؟ انہیں اقدامات کا پتا ہے نہ ہی ان کی حدود کا' وہ کیا چاہتے ہیں؟ وہ کیا منصوبہ سامنے رکھ کر یہاں آتے ہیں؟ یہ بے چینی کیسی ہے جو ایک لعنت کی طرح برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے؟ یہ جو نئے کام اور منصوبے شروع کیے گئے ہیں' ان کا کوئی انجام کیوں نظر نہیں آتا' وغیرہ وغیرہ۔

شمسی بیگ سوال کرنے والوں کی طرف صرف دیکھتا رہتا اور زیادہ تر وقت کے لیے خاموش رہتا۔ اس کا چہرہ دھوپ کی وجہ سے نہیں بلکہ اندرونی خیالات کے سبب سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ اس کی نظر گو سخت تھی' لیکن توجہ کھوئی ہوئی تھی' اس کی آنکھیں بوجھل تھیں اور سیاہ پتلیوں کے گرد سفید اور سرخی مائل دائرے پڑ گئے تھے جیسا کہ ایک زیادہ عمر کے عقاب کی آنکھوں میں عموماً ہوتے ہیں۔ اس کا منہ بڑا تھا' لیکن ہونٹ بڑی مشکل سے نظر آتے تھے وہ اپنا منہ اور ہونٹ بہت کم ہلاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ جو الفاظ زبان سے لب تک آنے نہیں دیتا' انہیں دماغ ہی میں سوچتا رہتا ہے جنہیں اذن گویائی کبھی نہیں ملتا۔

شہر کی ظاہری شکل و صورت یقینی طور پر تیزی سے بدل رہی تھی' کیونکہ غیر ملکی نووارد لوگوں نے پرانے درخت کاٹ کر نئے درخت لگانے شروع کر دیے۔ پرانی گلیوں کی

مرمت کی اور نئی گلیاں بنائیں۔ پانی کی نکاسی کے لیے نالیاں بنائیں اور نئی پبلک عمارتیں تعمیر کیں۔ پہلے چند برسوں میں انھوں نے مارکیٹ سے پرانی اور فرسودہ دکانوں کو گرا دیا' اگرچہ وہ جدید حالات کے مطابق نہ تھیں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی کے لیے بھی کسی تکلیف کا باعث نہ تھیں۔ پرانے ڈھب کی دکانوں میں لکڑی کے کاؤنٹروں کی جگہ نئے کاؤنٹر بنا دیے گئے۔ ان کی چھتیں ٹائلوں کی تعمیر کی گئیں اور ان کا سامنے کا منظر دل کش بنا دیا گیا۔ دروازوں کے رولر دھات کے بنا دیے گئے۔

علی ہدیٰ کی دکان بھی ان تبدیلیوں کی زد میں آئی۔ علی ہدیٰ نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اس نے اس سلسلے میں عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا۔ اس نے زبردست احتجاج کیا اور معاملے میں کافی کھینچا تانی کی نوبت بھی آئی۔ نتیجہ یہ کہ فیصلہ علی ہدیٰ کے حق میں ہو گیا' چنانچہ اس کی دکان جہاں تھی اور جیسی بھی تھی' ویسی ہی چھوڑ دی گئی۔ منڈی کو ہموار کر کے اسے وسعت دی گئی۔ ایک نیا چبوترا کھڑا کیا گیا۔ ایک وسیع و عریض عمارت تعمیر کی گئی جس میں قانونی عدالتوں اور مقامی انتظامیہ کے دفتر رکھے گئے۔ فوج بھی اپنے طور پر سول حکام ہی کی طرح تیزی سے اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس نے نئی رہائشی بارکیں تعمیر کیں۔ بنجر زمین کو آباد کیا اور اس میں طرح طرح کے درخت لگائے اور تمام پہاڑیوں کا نقشہ ہی بدل کے رکھ دیا۔

غیر ملکی نووارد بدستور اپنے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک کے بعد دوسرا منصوبہ بڑی تیز رفتاری اور منطقی ترتیب و سلیقہ سے انجام دیتے رہے۔ ان کے یہ منصوبے رازداری میں رکھے جاتے اور انہیں بڑی عمدگی سے تیار کیا جاتا جس سے شہریوں کے تعجب اور حیرانی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ اب غیر متوقع طور پر اور تیزی سے ویران اور متروک کارواں سرائے کی باری بھی آ گئی جسے پُل کا ایک لازمی حصہ خیال کیا جاتا تھا' کیونکہ اس کی حیثیت گزشتہ تین سو برس سے یہی چلی آ رہی تھی۔ حقیقی بات تو یہ تھی کہ جسے ستون این کہا جاتا تھا' وہ بہت عرصہ سے ویرانے میں تبدیل ہو چکی تھی' دروازے گل سڑ چکے تھے اور کھڑکیوں کے چوکھٹے جو ملائم پتھر کاٹ کر بنائے گئے تھے' ٹوٹ چکے تھے۔ چھت بیچ میں گر چکی تھی اور اس پر طرح طرح کی بے نام جڑی بوٹیاں اگ آئی تھیں' لیکن اس کی بیرونی دیواریں ابھی تک صحیح و سالم کھڑی تھیں۔ پتھر کی بنی ہوئی یہ خوش نما مستطیل ابھی تک بڑی شان و شوکت سے قائم تھی۔ شہر کے لوگوں کی نظر میں شروع سے آخر تک یہ ایک عظیم ویرانہ تھا' لیکن پُل کی تکمیل کو وہ شہر کا ایک لازمی اور جزو لاینفک سمجھتے تھے۔ اسے وہ اپنے گھروں کی طرح عزیز رکھتے تھے اور کسی شخص کو وہم و گمان تک بھی نہ تھا کہ اسے بھی تبدیلی کی زد میں آنا ہو گا یا اس کی مرمت بھی ضروری سمجھی جائے گی۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ حالات میں کسی قسم کی تبدیلی یا خوشگواری پیدا ہونے کا امکان نہ تھا۔

لیکن خلاف توقع ایک دن اس کی باری بھی آ گئی۔ سب سے پہلے انجینئروں نے جو ایک طویل عرصہ تک کھنڈرات کی پیمائش میں لگے رہے تھے' اس کے بعد کارکن اور مزدور جو خشت کے خشت اور سنگ کے بعد جماتے ہوئے اسے تعمیر کرتے رہے' ان پرندوں اور طرح طرح کے جانوروں کو وہاں سے ڈرانے اور بھگانے لگے جنھوں نے ان کھنڈرات میں اپنے گھونسلے بنا لیے تھے۔ پُل کے پاس منڈی کے ذرا اوپر جو ہموار زمین تھی' وہ تیزی کے ساتھ خالی اور بنجر ہو گئی اور ان میں سے جو کچھ باقی تھا' وہ یہی عمدہ قسم کے پتھروں کا ایک ڈھیر تھا جسے بڑی احتیاط سے وہاں جمع کر دیا گیا۔

ایک سال کے کچھ عرصہ بعد سفید پتھر کی سابقہ کارواں سرائے کی جگہ وہاں دو منزلہ بڑی بڑی بارکیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ ان کا رنگ زرد اور نیلا تھا' ان کی چھتیں لوہے کی چادروں سے بنائی گئی تھیں جن کے کونوں پر سوراخ نکلے ہوئے تھے' سپاہی کھلے میدان میں دن بھر فوجی قواعد کی تربیت پاتے اور اپنے اپنے انسٹرکٹروں کے حکم پر کبھی اپنی ٹانگیں اور بازو پھیلا دیتے یا اپنے اپنے سر گرد و غبار میں ڈال دیتے۔ شام کے وقت اس عمارت کی کھڑکیوں سے سپاہیوں کے ناقابل فہم غیر ملکی زبان میں گانے بجانے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ یہ گانا بجانا اس وقت تک جاری رہتا' جب بگل کی گہری اور مایوس کن آواز بلند نہ ہو جاتی اور آواز پر شہر کے تمام کتے بھونکنا شروع کر دیتے۔ سپاہیوں کی آوازیں بھی بند ہو جاتیں اور کھڑکیوں میں نظر آنے والی روشنی بھی بجھ جاتی۔ اس طرح اندھیرا چھا جانے سے وزیر کی یہ میراث بھی غائب ہو جاتی اور اسی طرح بارکیں بھی تاریکی میں ڈوب جاتیں اور وہ لوگ جو قدیم رسم و رواج کی سچی لگن رکھتے تھے' انھوں نے ستون این کو پکارنا شروع کر دیا کہ اس کے برابر میں پُل کے پاس زندگی کے معمولات پھر شروع ہو گئے ہیں' لیکن ماحول کی دوسری چیزوں سے ان کا کوئی ربط قائم نہیں رہا۔

اصل میں بات یہ تھی کہ پُل پر بھی کچھ واقعات وقوع پذیر ہونے لگے تھے جہاں لوگوں کے اٹل اور پرانے رسم و رواج نوواردوں کے لائے ہوئے زندگی کے جدید طور طریقوں سے ٹکرانے لگے اور ان میں جو رواج قدیمی اور مقامی ہوتا' اسے وقت کے ساتھ بدل جانے پر مجبور کر دیا جاتا۔ کپیا میں رات کی زندگی میں پہلے پہل تغیر و تبدل اور غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ نئے حکام نے شہر میں مستقل روشنی کا حکم جاری کر دیا تھا۔ قبضہ کے پہلے سال وہ سبز اونچے پولوں پر لالٹینیں روشن رکھتے۔ بڑی گلیوں اور چوراہوں میں پیٹرول کے لیمپ جلائے جاتے۔ ان لیمپوں کو صاف کرنے' تیل بھرنے اور جلانے کے فرض پر فرحت نامی ایک شخص مقرر تھا جو انتہائی کثیرالاولاد تھا اور وہ بلدیہ میں ملازم تھا۔ اس کے علاوہ وہ ماہ رمضان میں لوگوں کو سحری کے وقت جگانے کا انتظام بھی کرتا اور اس طرح کے کئی اور کام بھی وہ بلا اجرت کیا کرتا تھا۔ پُل پر بھی کپیا سمیت کئی لیمپ روشن کیے جاتے تھے۔ اور لیمپ کی بلندی بڑ کے اس بیم کے مطابق مقرر کی جاتی جو عرصہ سے وہاں موجود چلا آ رہا تھا۔ کپیا میں یہ لالٹین ایک زمانہ سے مقامی جوکروں کے تمسخر کا نشانہ بنتی چلی آ رہی تھی' جس کے پاس وہ پہلے پہل اندھیرے میں محبت کے گیت گاتے یا سگریٹ پیتے یا کپیا پر گپ شپ لگاتے یا محبوب کی یاد میں تنہائی میں آلوچوں کی شراب کے ساغر چڑھایا کرتے۔ لیمپ کی وہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی ان کا منہ چڑاتی' چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ انہوں نے اس لالٹین اور اس میں جلنے والے لیمپ کو غصے کے عالم میں پتھر پر مار کر پرزے پرزے کر دیا۔

سال میں صرف ایک بار پُل پر بڑے پیمانے پر چراغاں کیا جاتا۔ ہر سال ۱۸ اگست کے دن شہنشاہ معظم کے یوم پیدائش کے موقع پر مقامی حکام پُل کو طرح طرح کے ہاروں جھنڈیوں اور چیڑ کے درختوں کی ٹہنیوں سے سجاتے۔ جونہی رات پڑ جاتی بہت سی لالٹینیں روشن کر دی جاتیں۔ اس کے علاوہ فوجیوں کے ہزاروں راشن ٹینوں میں تیل اور چربی ڈال کر انہیں قطار در قطار پُل کی حفاظتی دیوار پر روشن کر دیا جاتا۔ وہ پُل کے مرکز میں روشنی جلاتے اور پُل کے دونوں سروں اور ستونوں کو تاریکی ہی میں گم رہنے دیتے۔ اس طرح چراغاں شدہ حصہ یوں نظر آتا جیسے وہ خلا میں تیر رہا ہے' لیکن ہر روشنی تیزی سے جل کر ختم ہو جاتی اور اس طرح ہر منظر بھی جلد غائب ہو جاتا۔ دوسرے دن پُل کی وہی حالت ہو جاتی جیسے کہ ہمیشہ رہتی۔ صرف کچھ بچوں کی نظر میں رات کے کھیل تماشے کے دوران روشنی کا کچھ منظر باقی رہ جاتا' لیکن یہ بالکل عارضی اور گزشتنی ہوتا جیسے کہ ایک خواب کی یاد ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔

قبضہ اور غیرملکیوں کے وارد کے بعد ایک اور جدت یہ واقع ہوئی کہ عورتوں نے کپیا میں آنا جانا شروع کر دیا۔ یہ اس ملک کی تاریخ میں پہلا موقع تھا' جب خواتین کپیا تک آنے جانے لگیں۔ سرکاری افسروں کی بیگمات اور بیٹیاں' ان کی نرسیں اور نوکرانیاں اپنے فوجی یا سول محافظوں کی نگرانی میں تعطیلات یا فارغ اوقات میں وہاں آ کر بیٹھتیں اور آپس میں گپ شپ لگاتیں۔ اگرچہ ایسا اکثر نہیں' بلکہ کبھی کبھار ہوتا' لیکن یہ معاملہ بڑے بوڑھوں کے لیے خاصی پریشانی کا باعث بن گیا جو دریا پر پرامن اور خاموش ماحول میں تمباکو نوشی کرتے۔ یہ بات نوجوانوں کے لیے بھی خاصی الجھن اور تکلیف کا موجب بن گئی۔

یہ فارغ اور خوش مزاج ہنستی کھیلتی عورتیں سب کے لیے ایک معمے کی صورت بن گئی تھیں۔ کسی کے لیے کم اور کسی کے لیے زیادہ۔ عوام نے ایک عرصہ تک تعجب کا اظہار کیا اور اس عمل کو اپنے لیے توہین کا سامان سمجھا' لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا' وہ اس کے بھی اسی طرح عادی ہو گئے جس طرح کہ انہوں نے دوسری کئی جدتوں کو اپنا لیا تھا' حالانکہ وہ دل سے انہیں پسند نہ کرتے تھے۔

حقیقت میں اب یہ کہا جا سکتا تھا کہ پُل کے ارد گرد واقع ہونے والے یہ واقعات انتہائی معمولی غیراہم اور بے معنی ہیں۔ وہ بہت سی دوسری اہم تبدیلیاں جو شہریوں کی روح اور عادات پر اثر انداز ہو چکی تھیں اور جن سے شہر کا ظاہری نقشہ تک بدل گیا تھا' یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کہ یہ اس طرح آئیں کہ ان سے پُل کا ماحول متاثر نہیں ہوا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سفید اور قدیم پُل جس پر سے لوگ تین صدیوں تک گزرتے رہے تھے' اس پر کسی تبدیلی کا نشان نئے شہنشاہ معظم کی حکومت میں بھی نہیں پڑ سکا اور تغیر و تبدل اور جدت کا موجودہ طوفان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا جیسا کہ اس نے وقت کے عظیم ترسیلابوں کا مقابلہ کیا ہے اور واقعات کی تند و تیز موجوں کی سرکشی کے باوجود اس کا وجود آج بھی اسی طرح قائم دائم ہے۔

اب کپیا میں زندگی زیادہ دلچسپ اور رنگا رنگ صورت اختیار کر گئی۔ وہاں متفرق لوگوں کا ایک جم غفیر یک جا ہو جاتا۔ ان لوگوں میں مقامی بھی ہوتے اور غیرملکی نووارد

بھی' جوان بھی اور بوڑھے بھی۔ یہ لوگ دن بھر وہاں آتے رہتے۔ یہاں تک کہ گئی رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ انہیں دوسروں سے زیادہ اپنا احساس ہوتا اور وہ اپنے ہی خیالات' جذبات اور احساسات میں ڈوبے کپیا آپہنچتے۔ انہیں راہ چلتے مسافروں تک کا بھی احساس نہ ہوتا۔ یہ مسافر بھی اپنے ہی خیال میں کھوئے سر جھکائے یا بے دھیانی کی نظر ڈالتے' پل پر سے گزر جاتے۔ وہ دائیں بائیں مڑ کر کپیا میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف بھی کوئی توجہ نہ کرتے۔

ان راہ نوردوں میں ایک شخص گلاسیانین بھی تھا جو اد کولستے کا رہنے والا تھا۔ وہ دراز قد' دبلا پتلا' زرد رو اور کمر خمیدہ شخص تھا۔ اس کا تمام جسم شفاف اور بے وزن معلوم ہوتا تھا۔ پھر بھی کمزور پاؤں پر جب وہ چلتا' تو یوں محسوس ہوتا جیسے جلوس کے دوران کسی بچے کے ہاتھوں میں چرچ کا جھنڈا تھمایا ہوا ہے۔ اس کے بال اور مونچھیں ایک بڈھے کی طرح سفید تھیں اور اس کی نظریں نیچے رہتیں۔ اس نے کچھ محسوس نہ کیا کہ کپیا میں کوئی تبدیلی واقع ہوگئی ہے یا وہاں کے لوگوں میں کوئی انقلاب آگیا ہے اور جب وہ پل پر سے گزرتا' تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگ جو اپنے اپنے مشاغل میں مصروف رہتے' اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیتے۔ لوگوں کے اس ہجوم میں کچھ گانا بجانا کرتے۔ کچھ تجارت میں کمی بیشی کا حال چھیڑتے۔ کوئی محض گپ شپ میں مصروف رہتے اور کوئی تو فقط وقت گزاری کے لیے ادھر آنکلتے۔ بڑے بوڑھے اسے فراموش کر چکے تھے۔ نوجوانوں نے اسے یاد کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔ وہ خاموش شہر پر موسم خزاں کے آثار دیکھ رہا تھا۔ اس وقت جب وہ چکر لگا رہا تھا' اس نے اچانک سڑک پر سے ایک دھندلی سی تصویر گزرتے دیکھی جو بعد میں اس کی طرف مڑی اور اس کے مکان کے سامنے رک گئی۔

اجنبی نے اونچی آواز میں کہا: اے میرے اچھے پڑوسی السلام علیکم! میلان نے آواز پہچان لی' یہ وہی اجنبی کھلاڑی تھا جو سرائے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ شخص واضح طور پر اس سے ملاقات کرنے اور اظہار خیال کی خاطر آیا تھا' میلان جنگلے تک قریب آگیا۔

"آج رات تم سرائے میں کیوں نہیں آئے؟" اجنبی نے بڑی متانت اور ٹھنڈے دل سے پوچھا۔

"آج میرا موڈ کچھ ٹھیک نہ تھا' کیا دوسرے ساتھی وہاں موجود ہیں؟"

"وہاں کوئی نہیں رہا۔ وہ آج خلاف معمول جلدی چلے گئے ہیں۔ آؤ چلیں اور اپنی تقدیر آزمائیں؟"

"اب بہت دیر ہو چکی ہے اور جانے کی اب کونسی جگہ ہے؟"

"آؤ ہم نیچے چل کر کپیا میں بیٹھیں' جلد ہی چاند نکل آئے گا"۔

"لیکن یہ وقت کھیلنے کے لیے ٹھیک نہیں"۔ میلان نے اعتراض کیا۔ اس کے لب خشک تھے اور اس کے کہے ہوئے الفاظ سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ اس کے بجائے کسی اور شخص نے کہے ہوں۔

اجنبی برابر انتظار میں کھڑا رہا' اسے یقین تھا کہ اس کی تجویز منظور کرلی جائے گی۔

اور پھر میلان نے اپنی چال تیز کی اور اس شخص کے پیچھے چل پڑا' جیسا کہ اس کے دلی عزم' خیالات' کوششیں اور احتراز کے باوجود اس شخص کی طاقت سے کھچا چلا گیا اور اپنے آپ کو اس کی کشش سے آزاد نہ کر سکا۔ باوجود اس کے کہ اس اجنبی شخص کے رویے سے اسے بے حد ندامت بھی ہوئی' اس نے اس کے دل میں مدافعت اور مقابلہ کی کیفیت پیدا کردی تھی

میلان کا باپ نکولا گلاسیانین اس وقت شہر آباد ہوا تھا جب سربیا میں بغاوت اپنے عروج پر تھی۔ اس نے اوکولستے' میں اعلیٰ قسم کی جائیداد خریدی تھی۔ عام طور پر اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ کہیں سے بھاری مگر ناجائز رقم اڑا کر بھاگ آیا ہے' لیکن کسی کے پاس اس کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہ تھا اور ہر شخص اس ضمن میں غیر یقینی صورت حال سے دوچار تھا' لیکن کبھی کسی نے اس سے انکار نہیں کیا۔ اس نے دوبار شادی کی' لیکن اس کے باوجود اس کے چند بچے تھے۔ اس نے صرف ایک بیٹے کی پرورش کی جس کا نام میلان تھا' اس کے پاس ظاہر یا مخفی' جتنی بھی جائیداد تھی' وہ اسی کے لیے چھوڑ گیا۔ میلان کا بھی فقط ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کا نام پیٹر تھا۔ اس کی جائیداد بھی کافی تھی اور وہ اپنے بیٹے کے لیے بہت کچھ چھوڑ جاتا' اگر جوئے بازی کی لت نہ ہوتی۔

اس کی رہائشی جگہ استاموسرائے تھی جو وسگارڈ کی مارکیٹ کے آخری سرے پر تھی۔ وہاں ایک تنگ و تاریک کمرے میں جس کی کوئی کھڑکی تک نہ تھی' ایک موم بتی دن رات جلتی رہتی تھی۔ وہاں تین چار آدمی ہمیشہ دیکھے جاتے جن کے نزدیک دنیا میں قمار بازی سے زیادہ محبوب تر چیز کوئی

نہیں تھی۔ اس کمرے میں، جو باقی دنیا سے الگ تھلگ تھا، وہ تمباکو پی پی کر دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے، باہمی ہوا پھانکتے اور اپنے شغل میں مصروف رہتے۔ ان کی آنکھیں سرخ، منہ خشک اور ہاتھ لرزاں رہتے تھے۔ وہ اکثر دن کو یا رات کو وہاں ملتے اور ان کے دل میں یہ جذبہ، جذبہ شہادت سے بھی زیادہ شدید تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں میلان نے اپنی جوانی کا زیادہ تر حصہ گزارا تھا اور وہاں اس نے اپنی سب طاقت اور جائیداد تک لگادی تھی۔

اس کی عمر بمشکل تیس برس ہوگی جب اس میں تبدیلی واقع ہوئی جس نے اس شدید اور غالب جذبے سے اسے نجات دے دی، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے اس کی تمام زندگی میں انقلاب برپا کردیا اور وہ ایک نئی وضع کا انسان بن گیا۔

چودہ سال قبل موسم خزاں میں وہ ایک اجنبی سرائے میں آیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا تھا۔ نہ بدصورت تھا اور نہ ہی ایسا خوبصورت۔ وہ میانہ قد کاٹھ کا آدمی تھا اور اس کی آنکھیں ہمیشہ خاموش اور مسکراتی رہتیں۔ وہ کاروباری آدمی تھا اور اس مقصد میں دیوانہ تھا جس کے لیے وہ آیا تھا۔ اس نے سرائے میں رات بسر کی اور شام کے وقت چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا جس میں جوئے باز شروع دوپہر سے بند پڑے کھیل رہے تھے۔ انہوں نے بے اعتمادی سے اس کا استقبال کیا۔ اس نے بھی ان سے نرمی اور محبت کا برتاؤ کیا اور انہوں نے محسوس تک نہیں کیا جب اس نے بھی پتوں پر داؤ لگانا شروع کردیا۔ اس نے جتنے پیسے جیتے اس سے زیادہ ہار دیے۔ وہ غیر یقینی طور پر غصے میں تھا اور بے دلی و بے یقینی سے اندر کی جیب سے چاندی کا ایک سکہ ٹٹول کر نکالا۔ جب وہ کافی رقم ہار چکا، تو انہوں نے اسے پتے بانٹنے کو کہا۔ شروع شروع میں اس نے آہستہ اور احتیاط سے پتے بانٹے۔ اس کے بعد کچھ تیزی اور بے تکلفی سے۔ وہ اپنے احساسات ظاہر کیے بغیر کھیل رہا تھا، لیکن وہ حدود سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے چاندی کے سکوں کا ڈھیر بڑھتا گیا، اور کھلاڑی ایک ایک کرکے اٹھتے چلے گئے۔ ان میں سے ایک نے ایک کارڈ پر اپنی سونے کی چین داؤ پر لگانا چاہی، لیکن اس اجنبی کھلاڑی نے سرد مہری سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہ صرف پیسوں کا کھیل کھیلتا ہے۔

جب آخری نماز کا وقت آیا، تو کھیل بند کردیا گیا، کیونکہ کسی کے پاس بھی داؤ لگانے کو رقم نہ رہی تھی۔ یہاں گلاسیانین آخری آدمی تھا، لیکن آخرکار اسے بھی کھیل بند کر دینا پڑا۔ اجنبی نے بڑی نرمی سے اجازت لی اور اپنے کمرے میں آرام کرنے چلا گیا۔

دوسرے دن وہ پھر کھیلے۔ اجنبی بھی کبھی ہارتا اور کبھی جیتتا رہا، لیکن جتنے پیسے وہ ہارتا، اس سے زیادہ جیت لیتا اور اس طرح ایک بار پھر شہریوں کے پاس کھیلنے کے لیے پیسے نہ رہے۔ وہ اس کے ہاتھوں اور آستینوں پر نظر جمائے رہے۔ وہ ہر زاویے سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ نئی تاش لائے۔ اپنی اپنی جگہ بدلی، لیکن اس سے ان کا مقصد حل نہ ہوا۔ وہ نہایت سادہ اور بدنام کھیل کھیل رہے تھے جسے اکتیس کا کھیل کہتے تھے جسے وہ بچپن سے جانتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ نووارد کھلاڑی کے داؤ پیچ کو نہ سمجھ سکے۔ کبھی وہ انتیس لے لیتا اور کبھی تیس اور کبھی تو پچیس ہی پر ڈٹ جاتا۔ وہ ہر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا داؤ قبول کر لیتا۔ وہ انفرادی کھلاڑیوں کی معمولی بے اصولیوں کو نظر انداز کردیتا اور یہ ظاہر کرتا جیسے کہ اسے ان کا پتا ہی نہ چلا ہو، لیکن وہ ان کی سنگین غلطیوں پر بڑی سختی اور غصے سے انہیں ڈانٹ دیتا۔

سرائے میں اس اجنبی کھلاڑی کی موجودگی میلان گلاسیانین کو بڑی ناگوار گزری جس سے وہ بیخ پا ہو رہا تھا۔ بہر حال اس وقت وہ خالی جیب ہونے کی وجہ سے سخت بیزاری کی حالت میں تھا۔ اس نے دل میں اپنے آپ سے یہ عہد کیا کہ وہ اب اور نہیں کھیلے گا، لیکن وہ پھر کھیلنے آگیا اور آخری سکہ تک ہار گیا، وہ مایوسی اور شرمندگی کا مارا گھر چلا گیا۔

چوتھی اور پانچویں شام کو اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور گھر ہی پر رہا۔ اس نے لباس پہنا اور کچھ رقم جیب میں ڈالی، لیکن اس نے نہ کھیلنے کا عزم پختہ کرلیا اور نہ کھیلا اور اس کے سر میں درد ہو رہا تھا اور اس کے سانس کی آمد بڑی بے ترتیب ہوگئی۔ اس نے جلدی جلدی شام کا کھانا کھایا لیکن پریشان خیالی میں اسے پتا ہی نہ چلا کہ وہ کچھ کھا رہا ہے۔ آخرکار وہ کمرے سے باہر نکل آیا اور سگریٹ پینے لگا۔ پھر اپنے مکان کے سامنے ادھر سے ادھر کئی چکر لگاتا رہا۔ چاندنی اور تاریکی سے متاثر پل کی سطح بٹی ہوئی تھی اور ان سے ایک طرح کا نقشہ بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ تمام کا تمام پل تھوڑی مدت کے لیے روشنی اور تاریکی کا ایک چتکبرا نقش بن گیا تھا۔

اس وقت کپیا میں کوئی زندہ چیز موجود نہ تھی۔ وہ بیٹھ

گئے۔ اجنبی نے جیب میں سے تاش نکالی۔ میلان نے کہنا شروع کیا کہ یہ وقت انتہائی ناموزوں ہے کہ نہ تو وہ پتوں کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی سکوں کو پہچان سکتے ہیں' لیکن اجنبی نے اس کی کہی اَن سنی کر دی' ان دونوں نے کھیلنا شروع کر دیا۔

شروع شروع میں تو وہ کبھی کبھار کوئی بات آپس میں کر لیا کرتے تھے' لیکن جب کھیل میں تیزی آ گئی' تو وہ بالکل خاموش ہو گئے۔ وہ صرف سگریٹ نکال نکال کر ایک کے بعد دوسرا جلا کر پیتے رہے۔ پتے بار ہا ایک ہاتھ سے دوسرے میں جاتے رہے اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ آخر کار یہ پھر اجنبی کے ہاتھ آجاتے۔ روپے پیسے کے سکے بغیر کسی آواز کے پتھروں پر گرتے جن پر شبنم کے خوبصورت قطرے نظر آ رہے تھے۔ میلان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اب وہ وقت آچکا ہے جب اجنبی اس سے انتیس یا تیس کی بازی جیت لے گا' اس کا گلا خشک ہو گیا اور نظر تاریک ہونے لگی' لیکن اجنبی کا چہرہ چاندنی میں ہمیشہ کی طرح پرسکون نظر آ رہا تھا۔ ایک گھنٹہ تک کے کھیل میں اب میلان کے پاس جتنی رقم تھی' وہ ہاری جا چکی تھی۔ اجنبی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ گھر جا کر اور رقم لے آئے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس کے ساتھ جائے گا۔ وہ دونوں وہاں جا کر پیسے لے آئے اور پھر سے کھیلنا شروع کر دیا۔ میلان اس طرح کھیل رہا تھا جیسے وہ اندھا اور گونگا ہو۔ وہ پتوں کا اندازہ لگا تا رہا اور ایسے اشارے کرتا رہا ‎ٍس سے ظاہر ہو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ تقریباً یہ ظاہر ہو رہا تھا یسے پتے ان کے درمیان ایک حادثاتی عمل کا باعث بن رہے ہیں۔ خاص طور پر اس مایوس کن اور ناقابل مدافعت کھیل کا مانہ بن گئے ہیں۔

جب اس کے پاس رقم پھر ختم ہو گئی' تو اجنبی نے اسے حکم دیا کہ وہ گھر جا کر مزید رقم لے آئے' جب کہ وہ خود کیپیا ں میں سگریٹ پیتا رہا۔ اس دفعہ اس نے اس کے ساتھ جانا ضروری نہ سمجھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ میلان اس کی حکم رولی نہیں کرے گا یا وہ اسے فریب دینے کے لیے گھر میں یں بیٹھ رہے گا۔ میلان نے حکم کی تعمیل کی' وہ بغیر کسی حیل حجت کے چلا گیا اور رقم لے کر بڑی سعادت مندی سے اپس آگیا۔ تب قسمت نے اچانک پلٹا کھایا۔ میلان نے وہ ب کچھ واپس جیت لیا جو کچھ بھی اس نے ہارا تھا۔ اس کے گلے کی گانٹھ اور مضبوط ہو گئی اور اس کے جذبات اور حوصلہ ی تر ہو گیا۔ اجنبی نے داؤ کی رقم پہلے دگنی' پھر تگنی کر دی۔

اب کھیل بہت تیز اور گھمبیر ہوتا چلا گیا۔ پتے ان کے ہاتھوں میں سونے اور چاندی کا جال بن رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے' صرف میلان زور زور سے سانس لے رہا تھا' وہ پسینے میں شرابور تھا اور ہلکی چاند رات میں وہ کبھی کبھی سردی محسوس کرنے لگا۔ وہ پتے پھینٹتا اور کھیلتا رہا' لیکن وہ کھیل کے لطف کی وجہ سے نہیں' بلکہ مجبوری سے ایسا کرتا رہا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ اجنبی شخص اس کی ساری رقم ہتھیا لینا چاہتا ہے' یہی نہیں' بلکہ وہ رفتہ رفتہ اس کی ہڈیوں کا گودا اور شریانوں سے خون کا قطرہ قطرہ تک نچوڑ لینا چاہتا ہے اور جیسے ہر نئے نقصان پر اس کے جسم کی توانائی اور قوت ارادی جواب دینے لگی ہے۔

وقتاً وقتاً وہ چوری سے اپنے حریف پر ایک نگاہ ڈال لیتا۔ اسے اس کا چہرہ شیطانی' دانت تیکھے اور ننگے اور آنکھیں دہکتے ہوئے سرخ انگاروں کی طرح نظر آنے لگیں' لیکن اس کے برعکس اس کے سامنے اجنبی کا وہی عام چہرہ موجود تھا جس پر پختہ عزم کے نشانات نظر آتے تھے اور جو ہر روز کا کام ختم کر لینے کا عادی تھا۔ اسے ہاتھ میں آئے ہوئے کام کو انجام تک پہنچانے کی جلدی تھی' لیکن یہ کام نہ تو اتنا آسان تھا اور نہ ہی ایسا خوشگوار۔

ایک بار میلان پھر اپنی ساری رقم ہار بیٹھا۔ تب اجنبی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے مویشی' زمین اور دوسری جائیداد سے داؤ کھیلے۔

میں کاٹھی سمیت تمہارے گھوڑے کے لیے چار ہنگری کے سکے پیش کرتا ہوں' کیا تمہیں منظور ہے؟

چنانچہ گھوڑا جاتا رہا اور اس کے بعد دو باربردار گھوڑے' پھر گائیں اور بچھڑے بھی جاتے رہے۔ ایک انتہائی محتاط اور باریک بین تاجر کی طرح' اجنبی نے میلان کے اصطبل کے تمام مویشیوں کا حساب لگا رکھا تھا اور ایک ایک چیز کی قیمت پہلے ہی سے ٹھیک ٹھیک طے کر رکھی تھی' بالکل اس طرح جیسے وہ اسی گھر میں پیدا ہوا اور وہیں پلا پوسا ہو۔

"یہ لو میں تمہیں اس کھیت کے لیے جسے تم سلکوشا' کہتے ہو' تیرہ سکے پیش کرتا ہوں"۔

"کیا تم زبان دیتے ہو؟"

اجنبی نے پتے بانٹے' میلان کے پانچ پتوں کے نمبروں کا مجموعہ اٹھائیس بنا۔ اجنبی نے بڑے سکون سے پوچھا: "اور بھی؟"

"ہاں صرف ایک"۔ میلان ایسی آواز بولا جو مشکل سے سنی جا سکی اور یہ کہتے ہوئے اس کا تمام خون دل کی طرف دوڑنے لگا۔

اجنبی نے آہستہ سے ایک پتہ نکالا۔ یہ دو نمبر کا خوش نصیب پتہ تھا۔ میلان اپنے دانت کھولے بغیر بڑبڑایا۔

"کافی ہے"۔

اس نے اپنے پتے یکجا کیے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انہیں چھپالیا۔

اس نے اپنی آواز اور طرز اظہار کو مختلف بنانے کی کوشش کی تاکہ اس کا حریف یہ اندازہ لگانے میں ناکام رہے کہ وہ کس صورت حال سے دوچار ہے۔

تب اجنبی نے کھلے پتوں سے سب کچھ سمیٹنا شروع کر دیا۔ جب اس کی میزان ستائیس ہو گئی تو وہ رک گیا اور میلان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا' لیکن میلان نے اپنی نظر دوسری طرف پھیر لی۔ اجنبی نے ایک اور کارڈ الٹا۔ یہ کارڈ دو کا تھا۔ اس نے جلدی سے ایک سرد آہ کھینچی جو مشکل سے سنی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتیس پر رک جائے گا اور خوشی کے احساس سے میلان کے دماغ کی طرف دوران خون تیز ہو گیا۔ تب اجنبی نے کھیل شروع کیا۔ اپنی چھاتی پھلائی اور اپنے سر کو پیچھے کی طرف پھینکا' یہاں تک کہ اس کی آنکھیں اور پیشانی چاندنی میں چمکنے لگیں۔ اس نے ایک اور پتہ سیدھا کیا۔ یہ بھی دو کا پتہ تھا۔ یہ ناممکن دکھائی دے رہا تھا کہ تینوں پتے یکے بعد دیگرے دو نمبر کے یک جا ہوں' لیکن حقیقت میں تھا ایسا ہی۔ الٹے ہوئے پتے پر میلان کو اپنا کھیت نظر آیا جیسا کہ موسم بہار میں اس میں ہل چلایا گیا ہو اور اس کی بہترین حالت ظاہر ہو رہی ہو۔ کھیت میں ہل کی لکیریں اس کے دماغ کے چکراؤ کے ساتھ گھومنے لگیں اور اجنبی نے پرسکون آواز میں اپنے آپ سے کہا:

"اوزوبیر کا کھیت اب میرا ہے"۔

اس کے بعد دوسرے کھیتوں کی باری آئی۔ پھر دونوں مکانوں اور اوسونیکا میں بڑ کے درختوں کے جھنڈ کی بھی بولی بول دی گئی۔ وہ دونوں ان چیزوں کی قیمت پر بلاکم و کاست رضامند ہو گئے۔ کبھی کبھار میلان بھی جیت جاتا اور سکے سمیٹ لیتا۔ اس کی آنکھوں میں امید کی ایک سنہری کرن روشن ہوتی۔ دو تین بازیوں کے بعد اس کی جیب پھر خالی ہو گئی اور اس نے جائیداد کی بازی لگانا شروع کی۔

جب بازی کے نتیجے میں ہر چیز دریا کی موج کی طرح بہہ گئی' تو دونوں جواری ایک لمحے کے لیے رک گئے۔ سانس لینے کے لیے نہیں' کیونکہ ایسا کرنا دونوں کے لیے خطرناک تھا' بلکہ وہ یہ سوچنے کے لیے رکے کہ اب کس چیز کی بازی لگائی جائے۔ اجنبی ایک محنتی کارکن کی طرح مطمئن اور پرسکون تھا جس نے اپنے شغل کا ایک حصہ مکمل کر لیا تھا اور اب جلدی سے دوسرے حصے کی تکمیل کا خواہاں تھا۔ میلان برف کی طرح سرد اور منجمد تھا۔ خون کی دھڑکن اسے کانوں میں محسوس ہو رہی تھی اور وہ پتھر کی جس نشست پر بیٹھا ہوا تھا' اس پر جیسے زلزلہ آ گیا تھا۔ تب اجنبی نے پرہول' ہموار اور غنغنی آواز میں کہا:

دوست کیا تمہیں معلوم ہے اس کے بعد ہمیں کیا کرنا ہے؟ آؤ ہم ایک بازی پھر لگائیں اور جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے وہ سب داؤ پر لگا دیں۔ یعنی میں نے آج رات جو کچھ بھی جیتا ہے وہ سب ایک ساتھ داؤ پر لگا دوں اور تم تمہاری زندگی! اگر تم جیت گئے تو پھر سب کچھ تمہارا جیسا کہ یہ پہلے تمہارا تھا' مثلاً روپیہ' مویشی اور جائیداد۔ اور اگر تم ہار گئے' تو پھر تم کپیاپر سے دریائے ڈرینا میں چھلانگ لگا دو گے۔

اس نے یہ سب کچھ اسی خشک اور کاروباری زبان میں کہا جیسا کہ اس نے اور باتیں بھی ایسے ہی انداز میں کی تھیں' جیسا کہ دو جواریوں کے درمیان کھیل کے نشے میں یہ کوئی معمولی شرط کا سوال تھا۔

میلان نے اب یہ خیال کیا کہ نوبت اب میری زندگی کے جانے یا بچ نکلنے کی آ پہنچی ہے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو اس ناقابل تصور بھنور سے نکالنے کے بارے میں سوچا جس نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا اور اب اسے ایک ناقابل مدافعت قوت کا سامنا تھا' لیکن اجنبی نے ایک نظر ڈال کر اسے اپنی جگہ پر واپس بھیج دیا۔ گویا کہ وہ سرائے میں ایک خطرناک کھیل کھیل رہے تھے۔ اس نے اپنا سر نیچے کیا اور اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ دونوں نے تاش کاٹی۔ اجنبی نے چار پر اور میلان نے دس پر۔ اب تاش بانٹنے کی باری اس کی تھی جس نے اسے کسی قدر امید دلا دی تھی۔ اس نے تاش بانٹی اور اجنبی نے مکمل طور پر نئی بازی لگانے کے لیے کہا:

اور' اور' اور۔

اجنبی نے پانچ پتے لیے اور اس کے بعد کہا: کافی ہے۔

اب میلان کی باری تھی۔ جب وہ اٹھائیس پر پہنچا' تو ایک سیکنڈ کے لیے رک گیا۔ اجنبی کے ہاتھ میں پکڑے

ہوئے پتوں پر نظر ڈالی اور اس کے پراسرار چہرے پر بھی۔ وہ یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ اجنبی کتنے نمبروں پر رکا ہے' لیکن یہ بات اغلب تھی کہ اس کے پاس اٹھائیس سے زیادہ نمبر ہیں۔ اس کی پہلی اور بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ شام سے لے کر اب تک کم نمبروں پر کبھی نہ رکا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس پانچ پتے تھے۔ اپنی تمام قوت کو یکجا کرتے ہوئے میلان نے ایک اور پتہ اٹھایا' اس کا مطلب یہ تھا کہ کل مجموعہ بتیس تھا' وہ ہار گیا۔

اس نے پتوں پر نظر ڈالی' لیکن اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ بات اسے ناممکن نظر آئی کہ وہ ہر چیز اتنی جلدی جلدی ہارتا جائے۔ اس پر اس کے پاؤں سے لے کر سر تک ایک شرر انگیز لہر سی بلند ہوئی۔ اچانک ہر چیز صاف ہو گئی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ زندگی کتنی بیش قیمت چیز ہے اور آدمی ہونا کتنی بڑی بات ہے اور بدنامی کی لعنت کتنی بری ہے اور دوستوں اور اجنبیوں' اپنی ذات اور اپنے ارد گرد والوں سے جوا بازی کرنا کتنا رسوا اور ذلیل اقدام ہے۔ سب کچھ واضح ہو جانے پر اس کی طبیعت ہلکی ہو گئی' گویا کہ اس پر دن روشن ہو گیا تھا اور اسے خیال آنے لگا کہ اس نے جوا کھیلنے اور ہارنے کا جو عمل کیا ہے' وہ محض ایک خواب تھا' لیکن اس پر سچائی واضح ہو چکی تھی۔ جو کچھ ہو چکا تھا' وہ ناقابل تلافی تھا۔ اس نے مدد کے لیے چیخنا چلانا چاہا' لیکن سوائے ایک سرد آہ کھینچنے کے وہ کچھ نہ کر سکا' کیونکہ وہ اپنی بکھری ہوئی قوت کو یکجا نہ کر سکا۔

اس کے سامنے اجنبی انتظار میں کھڑا تھا۔

تب اچانک دریا کے ساحل پر کسی مرغ نے اذان دی جو اونچی اور صاف تھی۔ اس کے فوراً بعد اس نے دوسری اذان دی۔ وہ مرغ اتنا نزدیک تھا کہ اس کے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز تک سنائی دی۔ عین اس وقت بکھری ہوئی تاش کے پتے اڑنے لگے جیسے کوئی آندھی اڑائے لیے جا رہی ہو۔ پیسے بھی وہاں بکھرے پڑے تھے اور جیسے تمام کیپیا میں زلزلہ برپا ہو گیا تھا۔ میلان نے خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سوچا کہ اس کا آخری وقت آپہنچا ہے۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں' تو دیکھا کہ وہ اکیلا ہے' اس کا حریف صابن کے بلبلے کی طرح غائب ہو چکا تھا اور اپنے ساتھ پتے اور روپے لے کر رفو چکر ہو گیا تھا۔

اُفق سے زرد رو چاند اچانک نمودار ہونے لگا۔ تازہ ہوا چلنی شروع ہوئی۔ نیچے گہرائی میں پانی کی آواز تیز ہو گئی۔

میلان نے ہاتھ سے پتھر کی نشست کو چھو کر محسوس کیا جس پر کہ وہ بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا جائزہ لیا' اور یاد کرنے لگا کہ وہ کہاں ہے اور اس پر کیا کچھ بیتی ہے۔ اس نے اپنا بوجھل جسم سنبھالا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اوکولستے میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا' لیکن اسے یوں محسوس ہوا' جیسے وہ کسی دوسرے شخص کی ٹانگوں پر چل رہا ہے۔

وہ چیختا چلاتا اور گرتا پڑتا بصد مشکل اپنے گھر کے دروازے تک گیا اور ایک زخمی پرندے کی طرح گر گیا۔ اس نے اپنے جسم کے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر والے اس کی آواز سے جاگ اٹھے اور اسے اپنے بستر پر لٹا دیا۔

دو ماہ تک وہ بخار کی حالت اور موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ یہ خیال کیا جاتا رہا کہ وہ اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ پھر پوپ نکولا آیا اور اس نے دم درود کیا۔ آخر کار وہ صحت یاب ہو کر دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا' لیکن اب وہ پہلے سے ایک مختلف انسان بن چکا تھا۔ اب وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔ ایسا تارک الدنیا جو باقی لوگوں سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ وہ بہت کم بات چیت کرتا اور دوسرے لوگوں سے بہت کم ملتا جلتا۔ اس کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہیں آتی تھی' بلکہ گہرے غور و خوض اور تفکر کے نشانات ملتے تھے۔ وہ صرف اپنے ہی گھر کا ہو کے رہ گیا اور صرف اپنے کام سے کام رکھتا' جیسا کہ اس نے جوئے بازی اور تاش وغیرہ کے بارے میں کچھ سنا تک بھی نہ ہو۔

اپنی بیماری کے دوران اس نے پوپ نکولا کو وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو کچھ اس رات کیپیا میں اس سے پیش آیا تھا اور بعد میں اس نے اپنے دو دوستوں سے بھی اس کا ذکر کیا' کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اپنے دل و دماغ میں اس راز کو چھپائے رکھنا ممکن نہیں۔ لوگوں نے اس واقعہ کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اور قیاس آرائیاں سنیں' جیسا کہ واقعاتی طور پر جو کچھ ہوا' اس کی کچھ اہمیت ہی نہ تھی۔

انہوں نے اس کے ساتھ مزید تفصیلات کا اضافہ کر دیا اور کہانی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا شروع کر دیا اور جیسا کہ دنیا کا دستور ہے' اس نے اپنی توجہ کسی اور طرف لگائی اور میلان کے واقعہ اور تجربہ کے بارے میں سب کچھ فراموش کر دیا۔

میلان جس وقت اپنے گھر کے دروازے کے سامنے بے ہوش پڑا تھا اس وقت وہ زیادہ تر یہی سوچتا رہا کہ آیا وہ کیپیا کی رات کا افسانہ محض ایک خواب تھا اور اس کی بیماری کا باعث نہیں' بلکہ نتیجہ تھا۔ حقیقت کہنے کی یہ ہے کہ

پوپ نکولا اور اس کے دونوں دوست جن پر اس نے اعتماد کا اظہار کیا تھا' اس بات کے حق میں تھے کہ میلان کی تمام کہانی محض بخار کی وجہ سے پیدا ہونے والے خواب و خیال اور ہذیان کا نتیجہ ہے۔ ان میں سے کسی کا بھی یہ خیال نہ تھا کہ شیطان اوز بیر کا علاقہ ہتھیالے یا کسی کو کیپیا پر لے جا کر تباہ کر دے' لیکن ہمارے تجربات اکثر اتنے وسیع اور گھمبیر ہوتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات نہیں رہتی کہ انسان شیطان کو اپنے معاملات میں مداخلت کا باعث سمجھنے لگتا ہے۔

لیکن چاہے یہ غلط ہو یا صحیح' شیطان کی مدد سے ہو یا اس کے بغیر خواب ہو یا حقیقت پر یہ بات یقینی تھی کہ میلان گلاسیانین جو راتوں رات اپنی صحت' جوانی اور مال و زر گنوا چکا تھا' ایک معجزے کے ذریعے اس مذموم جرم سے ہمیشہ کے لیے نجات پا گیا۔ اور بات صرف یہیں تک محدود نہیں۔ میلان گلاسیانین کی حکایت میں مختلف نوعیت کا ایک اور واقعہ بھی شامل کر دیا اور اس کی ابتدا بھی کیپیا ہی سے ہوئی۔

اس رات کے دوسرے دن جب میلان گلاسیانین نے (چاہے خواب میں' چاہے بیداری میں) کیپیا میں وہ خوفناک آخری بازی لگائی تھی' موسم خزاں کا ایک گرم دھوپ کا دن تھا۔ یہ سنیچر کا روز تھا اور جیسا کہ دستور تھا وسگارڈ کے یہودی تاجر ہر سنیچر کو اپنی نرینہ اولاد لے کر کیپیا میں جمع ہوا کرتے تھے۔ وہ فرصت کے اوقات میں اپنے روایتی لباس میں ہوتے۔ ان کی پتلونیں ساٹن کی اور کمر کوٹ اونی ہوتے۔ سروں پر سرخ ترکی ٹوپی اور وہ بڑے اہتمام سے یوم سبات مناتے۔ دریا کے کنارے کنارے وہ اس طرح چلتے جیسے وہ پانی میں کسی کو تلاش کرتے پھرتے ہوں' لیکن وہ زیادہ تر وقت کیپیا ہی پر بیٹھ کر ہسپانوی زبان میں بلند آواز میں بڑی خوش دلی سے محو گفتگو رہتے۔ وہ سربی زبان میں اس وقت بولتے جب انہیں کسی معاملہ میں قسم اٹھانا پڑتی۔

اس روز صبح کے وقت کیپیا میں آنے والوں میں بکوس گاؤن نامی شخص بھی تھا جو اور رام گاؤن نامی حجام کا بیٹا تھا۔ یہ حجام بڑا غریب تھا' لیکن بڑا دیانت دار اور پرہیزگار آدمی تھا۔ اس کی عمر سولہ برس کی تھی۔ اسے ابھی تک کوئی مستقل ملازمت نہ ملی' نہ ہی اس نے کوئی باقاعدہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ یہ نوجوان شخص برادری کے دوسرے افراد سے مختلف مزاج کا تھا۔ اس کا دماغ منتشر اور لاابالی قسم کا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کوئی معقول رویہ اختیار نہ کر سکا۔ نہ ہی کسی ہنر کو دل جمعی سے اپنا سکا۔ طبیعت کا یہ تضاد اسے جگہ جگہ کسی بہتر اور بلند تر پیشہ کی تلاش میں لیے لیے پھرتا رہا۔ جب وہ بیٹھنا چاہتا تھا' تو پہلے دیکھ کر یقین کر لیتا کہ جگہ صاف ہے یا نہیں۔ اسی تجسس کی عادت کا سبب تھا کہ اس نے کیپیا میں دو پتھروں کے درمیان ایک شگاف دیکھ لیا۔ یہ ایک باریک سی زرد رنگ کی لکیر کی شکل میں تھا۔ یہ زرد اور چمک دار لکیر سنہری تھی جسے انسانی آنکھ بڑی توجہ اور رغبت سے دیکھتی ہے۔ اس نے اسے قریب سے ہو کر غور سے دیکھا۔ یہ بات بلاشبہ درست ثابت ہوئی کہ شگاف میں کوئی سنہری سکہ کسی طرح گر گیا تھا۔ نوجوان نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی' یہ یقین کرنے کے لیے کہ کوئی شخص دیکھ تو نہیں رہا پھر اس نے کسی ایسی چیز کی تلاش شروع کر دی جس سے وہ شگاف میں سے سکہ باہر نکال سکے۔

تب اچانک اسے خیال آیا کہ آج سنیچر کا دن ہے اور ان کے عقیدے کے مطابق اس روز کسی قسم کا کام کرنا ندامت اور گناہ کا باعث ہوتا ہے' لہٰذا وہ بڑا مضطرب اور بے چین ہو گیا۔ اور اس جگہ دوپہر تک جم کے بیٹھا رہا۔ جب دوپہر کے کھانے کا وقت آیا' تو تمام یہودی' کیا چھوٹے کیا بڑے' اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ تب اس نے جو کی ایک مضبوط سی تیلی لی اور مقدس دن یا گناہ کا خیال کیے بغیر اس نے پتھروں کے شگاف میں سے سکہ نکال لیا۔ یہ خالص ہنگری کا نہایت باریک سکہ تھا' اس کا وزن ایک خشک پتے سے زیادہ نہ تھا۔ وہ دوپہر کے کھانے پر نہ جا سکا۔ جب وہ ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا جس کے اردگرد وہ تیرہ کے تیرہ (گیارہ بچے دو مائیں اور باپ) بیٹھے تھے' اس نے نہیں سنا کہ کس بری طرح اس کے باپ نے اسے ڈانٹ پلائی اور اسے ایک ست الوجود اور بے فکرا شخص کہا جو کھانے پر بھی درست وقت پر نہ پہنچ سکا۔ اس کے کانوں میں آوازیں آنے لگیں اور آنکھیں روشنی سے چندھیانے لگیں۔ اس کے ذہن میں ان دنوں کی یاد آنے لگی جب اس نے ان دیکھی عیش و عشرت کی باتیں سن رکھی تھیں اور جس کے بارے میں اکثر اس نے سنہرے خواب دیکھے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ سورج کو اپنی جیب میں لیے ہوئے تھا۔

دوسرے دن زیادہ تاثرات کے بغیر' بکوس استامو سرائے میں گیا اور اس چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گیا جہاں دن یا رات کے کسی بھی وقت قمار بازی جاری رہتی تھی۔ اس نے ہمیشہ جوا کھیلنے کے خواب دیکھے تھے' لیکن کبھی اسے اتنی رقم مہیا نہ ہوئی کہ وہ وہاں جانے کی جرأت کرے

اور اپنی قسمت آزمائے۔ اب وہ اس خواب کو پورا کر دکھانے کی پوزیشن میں تھا۔ وہاں اس نے چند گھنٹے بڑی بے قراری اور جذبات کے اتار چڑھاؤ میں گزارے۔

پہلے پہل ان سب نے اسے نفرت اور بے اعتمادی سے دیکھا۔ جب انہوں نے اسے ہنگری کا وہ سکہ تڑواتے ہوئے دیکھا' تو انہوں نے جلد یہ خیال کیا کہ اس نے یہ کسی کا چرالیا ہے' لیکن ان سب نے اسے بطور کھلاڑی کے قبول کر لیا' کیونکہ جوئے باز اگر بازی پر اعتراض کرنے لگ جائیں' تو کھیل بھی کبھی شروع نہ ہو سکے' لیکن اس نئے کھلاڑی کے لیے تازہ مصیبتیں شروع ہو گئیں۔ کبھی وہ جیت جاتا' تو دوران خون کا زور دماغ کی طرف ہونے لگتا اور اس کی آنکھیں پسینے اور حرارت کے جزیرے بن جاتیں۔ جب وہ زیادہ رقم ہار جاتا' تو اس کا سانس رکنے لگتا اور دل ڈوب ڈوب جاتا' لیکن ان مصیبتوں کے باوجود جن میں سے ہر ایک مصیبت لاینحل دکھائی دیتی' وہ اس شام سرائے چھوڑ کر چلا گیا' جبکہ اس کی جیب میں صرف چار سکے باقی رہ گئے تھے۔

اگرچہ وہ شکستہ دل تھا اور اس کے جذبات مجروح تھے' اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے کسی نے دہکتی ہوئی لوہے کی سلاخوں سے پیٹ ڈالا ہو۔ اس کے باوجود وہ بڑے پروقار انداز سے سیدھا چلتا رہا۔ اس کے پرشکوہ تصورات کے سامنے بڑے شاندار اور غنیمت مواقع جھلملانے لگے جو اس کی غربت پر بڑی چمک دار چادر ڈالنے لگے۔ وہ بڑے بارعب اور مطمئن انداز سے چلتا رہا' جیسے کہ وہ نشے کے عالم میں ہو۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ نہ صرف سونے کی چمک اور آواز محسوس کی' بلکہ اس کا وزن بھی معلوم ہوا۔

اسی موسم خزاں میں جب کہ ابھی کہیں کہیں ہریاول باقی تھی' بکوس ایک آوارہ قسم کا جواری بن گیا اور اپنا خاندان اور گھر چھوڑ دیا۔ اس کے باپ کو اپنے بڑے بیٹے کی اس حرکت پر بڑی ندامت اور غم محسوس ہوا' بلکہ تمام یہودی برادری کو اس کی اس بدبختی کا صدمہ ہوا جیسے کہ یہ ان سب کا اپنا صدمہ ہو۔ بعد میں اس نے شہر چھوڑ دیا اور ایک جواری کا شیطانی کردار لے کر نہ جانے دنیا کے کس کونے میں روپوش ہو گیا۔ اس کے بعد چودہ برس تک اس کے بارے میں کوئی خبر نہ مل سکی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس ساری بدنصیبی کا باعث وہی شیطانی سکہ تھا جو اسے کپیا میں پتھروں کے شگاف میں سے ملا تھا اور جو اس نے یوم سبت کو کرید کر نکالا تھا۔

☆☆☆

غیر ملکی تسلط ہوئے چار برس گزر چکے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا' جیسے ہر معاملہ کسی نہ کسی طرح سے ٹھنڈا پڑ چکا ہے اور زندگی معمول کے مطابق گزر رہی ہے' اگرچہ ترکوں کے عہد جیسا شاندار دور امن بحال نہیں ہو سکا تھا' پھر بھی کم از کم نئے حالات کے مطابق نظم و ضبط اور امن و امان قائم کیا جا چکا تھا' لیکن ایک بار پھر ملک میں مصیبت نے دستک دی اور غیر متوقع طور پر تازہ غیر ملکی فوج آ پہنچی اور پہلے کی طرح کپیا میں ایک بار پھر گارڈ ماؤنٹ کی گئی۔ اب یہ ایک معمول بن چکا تھا۔

نئے حکام نے اس سال بوسنیا اور ہرزی گووینا میں بھرتی شروع کر دی۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں شدید اشتعال اور احتجاج کی فضا پیدا ہو گئی۔ خاص طور پر ترک اس سے بہت متاثر تھے۔ پچاس برس قبل جب سلطان نے پہلی ترکی باقاعدہ فوج کا نظام پیش کیا تھا اور فوج کو یورپی طرز کی وردی' جنگی ساز و سامان اور فوجی قواعد سکھانے شروع کیے تھے' تو انہوں نے بغاوت کر دی تھی اور اس کے خلاف چھوٹی چھوٹی مگر خونریز جنگیں لڑنی شروع کر دی تھیں۔ انہیں کافروں کی وردی ناپسند تھی۔ وہ اپنی چھاتی پر وہ ترچھی بیلٹ باندھنے سے انکار کرنے لگے جس سے کسی حد تک قابل نفرین صلیب کی ترجمانی ہوتی تھی' چنانچہ اب انہیں وہی تنگ قسم کی وردی پہننی پڑتی تھی اور یہ کہ انہیں ایک غیر ملکی حکمران کے تحت خدمت انجام دینا تھی جس کا عقیدہ بھی مختلف تھا۔

قبضہ کے بعد شروع کے کئی سال تک جبکہ حکام نے گھروں کو نمبر لگانے اور مردم شماری کا انتظام کیا تھا' تو ان اقدامات سے ترکوں کے دل میں سخت بے اعتمادی پیدا ہو گئی تھی اور ان کے ذہن میں ناقابل تشریح قسم کی غلط فہمیاں جنم لینے لگی تھیں۔

جیسا کہ ایسے معاملات میں اکثر ہوتا آیا ہے' وسگارڈ کے پڑھے لکھے اور معزز ترک چوری چھپے مل بیٹھتے اور ان اقدامات کی اہمیت پر بحث و تمحیص کیا کرتے اور یہ بھی طے کرتے کہ اس بارے میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔

مئی کی ایک صبح کو یہ لیڈر کپیا میں جمع ہوئے۔ اس طرح جیسے کہ یہ محض ایک اتفاقی امر تھا اور وہ صوفے کی تمام نشستوں پر بیٹھ گئے۔ وہ مطمئن اور پرسکون طور پر کافی پیتے اور نظر کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے سرگوشیوں میں حکام کے ان نئے اور مشکوک اقدامات کے بارے میں تبادلہ خیال

کرتے رہے۔ وہ نئے خیالات کے بارے میں سخت سیخ پا تھے' کیونکہ نوعیت کے اعتبار سے یہ ان کے خیالات' نظریات اور اطوار کے بالکل منافی تھے۔ لوگوں میں ہر شخص حکام کے اقدامات کو گویا اپنے ذاتی معاملات اور خانگی زندگی میں ایک مداخلت خیال کرتا۔ اسے وہ غیر ضروری اور ناقابل فہم توہین تصور کرتا' لیکن کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ وہ اس نمبر شماری کی ترجمانی کیسے کرے اور نہ ہی کوئی شخص اس کے سدباب کا طریقہ تجویز کر سکا۔ ان لوگوں میں علی ہدئی بھی تھا جو کپیا کی طرف بہت کم آتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جونہی وہ صوفے کی طرف جانے والی پتھر کی سیڑھیوں پر ایک نظر ڈالتا' تو اس کا دایاں کان بڑی اذیت سے پھڑکنے لگتا۔

اسی طرح دو برس گزر گئے۔ مردم شماری کے سلسلے میں تمام مظاہرہ اس وقت ختم ہو گیا' جبکہ بلالحاظ عقیدہ و فرقہ کے نوجوانوں کی فوج میں بھرتی کا پروگرام شروع کر دیا گیا۔ اس پر مشرقی ہرزی گوویتا میں کھلی بغاوت شروع ہو گئی جس میں نہ صرف ترکوں ہی نے بلکہ سربیوں نے بھی حصہ لیا۔ بغاوت کی قیادت کرنے والے لیڈروں نے بیرونی ممالک خصوصاً ترکی سے تعلقات قائم کیے اور دعویٰ کیا کہ قبضہ کرنے والے حکام نے ان اختیارات سے کھلا تجاوز کیا ہے جو انہیں برلن کانگرس کی رو سے حاصل تھے اور یہ کہ انہیں مقبوضہ ضلعوں میں جبری بھرتی کا کوئی حق حاصل نہیں جو ابھی تک ترکی کی برائے نام حکومت کے تحت آتے تھے۔ بوسنیا میں بغاوت کے لیے کوئی منظم تنظیم موجود نہ تھی۔ پھر بھی "فوسا" اور "گورازدا" کے انتظام کے تحت وسگارڈ کے ضلعوں تک بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ انفرادی طور پر اٹھنے والے سرکش ٹولے یا شکست خوردہ افواج کے بقیہ حصے وسگارڈ کائل عبور کر کے سنجاک یا سربیا میں پناہ لینے لگے جیسا کہ ایسے حالات میں اکثر ہوتا ہے۔ بغاوت کے علاوہ راہزنی اور قزاقی بھی نشوونما حاصل کرنے لگی۔

چنانچہ بہت سے برسوں کے بعد ایک مرتبہ پھر کپیا میں گارڈ ماؤنٹ کی گئی۔ اگرچہ یہ سرما کا موسم تھا اور شدید برف پڑی ہوئی تھی' دو پولیس کے دستوں نے کپیا کو دن رات زیر نگرانی رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے پل پر سے گزرنے والے اجنبی مسافروں یا مشتبہ لوگوں کو روک کر ان کے مال و اسباب کی تلاشی اور پوچھ گچھ شروع کر دی۔

دو ہفتے بعد سٹریف کور کا ایک دستہ شہر میں داخل ہو گیا جس نے کپیا میں پولیس کے دستوں کی جگہ لے لی۔ سٹریف کور اس وقت قائم کی گئی تھی' جب ہرزی گوویتا کی بغاوت نے سنجیدہ اور خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ یہ طوفانی قسم کی متحرک فورس تھی اور اس نے مشکل علاقوں میں حالات پر قابو پانے کے لیے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر مسلح کرنا شروع کر دیا اور اپنی طاقت کو زرخرید رضاکاروں سے بڑھا لیا۔

تمام موسم سرما کے دوران شدید سردی اور برف باری کے باوجود پل پر سٹریف کور کے دو آدمی گارڈ کے طور پر مقرر رہے۔ عام طور پر گارڈ میں ایک غیر ملکی اجنبی اور ایک مقامی سپاہی ہوتا تھا۔ انہوں نے کوئی بلاک ہاؤس تعمیر نہیں کیا تھا جیسا کہ ترکوں نے سربیا میں کاراجارج کی بغاوت کے دوران بنایا تھا۔ اس وقت کوئی قتل کی واردات پیش آئی نہ ہی کسی کا سر اتارا گیا' لیکن اس عرصے میں جبکہ کپیا بند رہا' ایسے غیر معمولی واقعات پیش آئے جن کے اثرات تیزی سے شہر میں پھیل گئے' کیونکہ مصیبت کے اوقات میں کسی نہ کسی کو ایسی بدبختی کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔

سٹریف فورس کے آدمیوں میں' جنہوں نے کپیا میں گارڈ ماؤنٹ کی' ایک نوجوان آدمی کریگر فیدوں بھی تھا جس کا تعلق مشرقی گالیسیا سے تھا۔ اس نوجوان کی عمر اس وقت تیس برس کی تھی جو بھاری بھرکم جسم والا تھا' لیکن معصوم ذہن کا مالک تھا۔ وہ ایک ریچھ کی طرح مضبوط و توانا اور ایک لڑکی کی طرح باحیا تھا۔ جب اس کی رجمنٹ بوسنیا کو بھیجی گئی' تو وہ اپنی فوجی تربیت مکمل کر چکا تھا۔ اس نے ملاج میں اور گلاسنیا کے پہاڑوں پر جنگ میں حصہ لیا تھا اور اٹھارہ ماہ تک مشرقی بوسنیا میں گیریژن ڈیوٹی پر متعین رہا تھا۔

اس نوجوان نے اپنی باری پر گارڈ ماؤنٹ کی اور یہ محسوس کیا کہ کس طرح موسم بہار کے آثار زمین اور پانی پر ظاہر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ آثار آہستہ آہستہ خود اس کے جسم و جان اور حواس میں ہلچل پیدا کرنے لگے۔ وہ پہرہ بھی دیتا رہا اور زیر لب کچھ گیت بھی گنگناتا رہا جیسے کہ اس کے اپنے ملک میں گائے جاتے تھے۔ جوں ہی وہ گیت گاتا' تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کہ موسم بہار کے ایک ایک دن وہ اس کھلے اور ہوادار ماحول میں کسی محبوب کی آمد کا انتظار کر رہا ہو۔

یہ بات آسان نہیں کہ کوئی نوجوان انسان اپنی تمام تر توجہ صرف ایک ہی نقطہ پر مرکوز رکھے جبکہ اس کی عمر تئیس برس ہو اور جبکہ اس کا جسم جوانی کی آب و تاب کا گہوارہ ہو' جبکہ موسم بہار کی رنگینیاں اس پر اثر انداز ہو رہی ہوں' جبکہ ماحول پر رنگ و بو کا افسوں طاری ہو۔

ایک روز ظہرانے کے وقت ایک ترک لڑکی گارڈ کے سامنے سے گزری۔ وہ لڑکی اس عمر کی تھی' جب ترک لڑکیوں کو بھاری نقاب تو نہیں اوڑھایا جاتا تھا لیکن وہ اپنا چہرہ ڈھانپے بغیر باہر کہیں نہ جا سکتی تھیں' اور وہ اپنے آپ کو ہلکی اور باریک شال میں لپیٹ لیتی تھیں جس سے تمام بدن چھپ جاتا' یعنی آنکھیں' بال' ہاتھ' ٹھوڑی اور ماتھا وغیرہ' لیکن اس سے چہرے کا کچھ حصہ پھر بھی عریاں رہتا' یعنی آنکھیں' ناک' منہ اور رخسار۔ وہ ابھی چھوٹی عمر میں تھی' یعنی بچپن اور جوانی کے مابین تھی' جب مسلم لڑکیاں معصومیت سے اپنے آپ کو بے حجاب رکھتی ہیں اور ان کی چال نہایت طفلانہ ہوتی ہے اور ان کے نسوانی نقوش کو جلد ہی زیر نقاب کر دیا جاتا' لیکن وہ اس عمر میں پردے کی پابندی سے بے نیاز رہتیں۔

فیدوں نے لڑکی کو ڈرتے ڈرتے بڑی احتیاط سے دیکھا۔ اس نے اپنے گرد ایک شوخ رنگ کی چادر لپیٹی ہوئی تھی جو سورج کی روشنی میں جھلملاتی اور آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی۔ یہ چادر ہوا کی جنبش سے لہرا لہرا کر اس کی رفتار سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ اس کا پر سکون اور پیارا سا چہرہ چاروں طرف سے چادر سے باقاعدگی سے کسا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں گو نیچی تھیں' مگر چمک رہی تھیں' چنانچہ وہ اس کے سامنے سے گزری اور دیکھتے دیکھتے پل سے گزر کر مارکیٹ میں گم ہو گئی۔

آدھ گھنٹہ کے بعد پل پر دوپہر کی خاموشی ابھی تک نہیں ٹوٹی تھی کہ ترک لڑکی مارکیٹ سے پھر واپس آئی اور اس نوجوان کے جذبات میں زلزلہ برپا کر گئی۔ اس بار فیدوں نے اس لڑکی پر کچھ زیادہ جرأت سے دیر تک نظر نکائے رکھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس لڑکی نے بھی غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک مختصر مگر روشن سی نگاہ ڈالی۔ اس کے ساتھ اس نے کچھ نیم مسکراہٹ بھی بکھیری۔ یہ مسکراہٹ اگرچہ مکارانہ تھی' مگر اس میں اس نے معصومانہ سا فریب دکھایا جیسے معصوم لڑکے ایک دوسرے سے اپنے اپنے کھیل میں زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اس نے ایک جنبش لی اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ پھر وہ چلتے چلتے اس کی نظروں سے جلد او جھل ہونے لگی۔ اس نے چلتے ہوئے کئی بل کھائے اور جو کھلی چادر اپنے جسم پر اوڑھی ہوئی تھی' اس میں اس نوجوان اور پر کشش صورت نے طرح طرح کی حرکات و سکنات دکھائیں۔ اس چادر کا مشرقی کونہ اور اس کے شوخ رنگ مکانات سے دور ساحل تک نظر آتے رہے۔

اس روز دن بھر فارغ وقت میں یا گارڈ ڈیوٹی پر اس نوجوان ترک لڑکی کا تصور اس کے دل و دماغ میں ناچتا رہا۔ دوسرے دن دوپہر کو جبکہ پل پر بہت کم آدمی تھے' وہ ایک بار پھر وہاں سے گزری۔ فیدوں نے اس کا چہرہ شال میں چاروں طرف سے لپٹا ہوا دیکھا۔ یہ صورت حال بالکل ویسی ہی تھی' جیسے ایک دن قبل تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کی نگاہیں پہلے سے زیادہ تیز' شوخ اور جرأت مندانہ تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا' جیسے وہ دونوں مل کر کوئی کھیل کھیل رہے ہوں۔

انسان صرف خواب کے عالم میں ایسی جرأت کر سکتا ہے۔ جب لڑکی دور ساحل پر پھر نظروں سے او جھل ہو گئی' تو نوجوان سپاہی خوف سے کانپنے لگا۔ یہ بات ناقابل یقین تھی کہ ایک ترک لڑکی کے دل میں آسٹریا کے کسی فوجی کو دیکھنے کا خیال پیدا ہو۔ اس قسم کی انہونی اور بے نظیر بات صرف خواب میں واقع ہو سکتی ہے یا پھر کیپیا کے موسم بہار میں ایسا ہونا ممکن ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس سرزمین میں کسی مسلمان لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کرنا یا اسے چھونا کس قدر خطرناک بات ہے۔ یہ بات لوگوں نے اسے اس وقت بتائی تھی' جب وہ فوج میں تھا یا پھر سٹریف کور میں۔ اس قسم کی حرکت کی سزا بہت بھاری تھی۔ ایسے معاملات بھی دیکھنے میں آئے جب کئی لوگ ترکوں کی توہین کے سبب ان کے غصے کا شکار ہوئے۔ اس کے نتیجے میں انہیں زندگی تک سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یہ سب کچھ وہ جانتا تھا اور بڑی اخلاص مندی سے چاہتا تھا کہ وہ تمام احکامات اور قوانین کی پابندی کرے' لیکن اس کے باوجود اس نے ان کی خلاف ورزی کی۔ بد بخت انسانوں کی بد بختی صرف اس وقت واقع ہوتی ہے کہ وہ باتیں جوان کے لیے ناممکن اور ممنوع ہوتی ہیں' ایک لمحے میں آسان اور قابل حصول بن جاتی ہیں یا کم از کم ایسی نظر آتی ہیں۔ پھر بھی جب یہ باتیں ان کی خواہشات میں پختگی سے داخل ہو جاتی ہیں' وہ ایک بار پھر ایسی نظر آتی ہیں جیسی کہ وہ پہلے ناقابل حصول اور ممنوع دکھائی دیتی تھیں اور کچھ لوگ نتائج سے باخبر ہونے کے باوجود ان کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔

تیسرے دن بھی دوپہر کے وقت ترک لڑکی پھر آئی اور جیسا کہ خواب میں ہوتا ہے' وہ اس کی خواہش کے مطابق حقیقی طور پر واقع ہوا جیسے باقی ہر چیز پر اسی بات کو اولیت

حاصل ہے۔

یہ خطرناک اور حیرت انگیز کھیل جاری رہا۔ چوتھے روز لڑکی پھر آئی اور ایک لمحہ غنیمت جان کر کہ اس وقت کیپیا میں کوئی اور شخص موجود نہ تھا' اس سے سرگوشی میں پوچھا کہ وہ کب گارڈ ڈیوٹی پر ہو گا۔ اس نے اسے جواب دیا کہ وہ شام کے جھٹپٹے کے وقت پھر گارڈ ڈیوٹی پر آئے گا۔

میں اپنی بوڑھی دادی کو مارکیٹ تک اپنے ساتھ لاؤں گی اور اسے وہاں چھوڑ کر اکیلی واپس آجاؤں گی۔ لڑکی نے آہستگی سے اس کی طرف گردن موڑے بغیر جواب دیا' لیکن اس نے دندناتے ہوئے بڑی دل کش اور حسین نظر ڈالی اور اس کے ان معمولی الفاظ میں اس نے بلا کی مسرت اور کشش محسوس کی کہ وہ جلد ہی اسے ملنے کے لیے آئے گی۔

چھ گھنٹے بعد فیدوں ایک بار پھر اپنے نیند پرست ساتھی کے ساتھ کیپیا پہنچ گیا۔ بارش کے بعد موسم کچھ کھل گیا اور اسے امید بندھ گئی کہ ترک لڑکی اپنا وعدہ نبھانے کے لیے شاید آجائے۔ آنے جانے والے راہیوں کی تعداد کم سے کم تر ہوتی گئی۔ پھر اوسونیکا سڑک پر سے ترک لڑکی آتی ہوئی نظر آئی۔ حسب معمول اس نے شال اوڑھ رکھی تھی اور اس کے نقش و نگار شام کے جھٹپٹے میں مدھم ہونے لگے تھے۔ اس کے ساتھ ایک ضعیف ترک عورت موٹے سیاہ برقعے میں گٹھڑی کی طرح چلی آ رہی تھی۔ وہ اتنی جھکی ہوئی تھی جیسے وہ چوپایوں کی طرح دونوں بازوؤں اور ٹانگوں پر چل رہی ہو۔ اس نے سہارے کے لیے دائیں ہاتھ میں ایک لاٹھی پکڑ رکھی تھی اور لڑکی کے بائیں پہلو پر جھکی ہوئی تھی۔

وہ دونوں فیدوں کے پاس سے گزریں۔ لڑکی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس کی رفتار اپنی بوڑھی ماں کی رفتار کے مطابق تھی اور وہ ماں کی راہنمائی کو آگے آگے چل رہی تھی۔ اس نے اپنی نظریں فیدوں کی نظروں میں گاڑ رکھی تھیں' اس طرح جیسے وہ اس کے سوا کسی اور طرف دیکھنا نہیں چاہتی۔ جب وہ مارکیٹ میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں' تو نوجوان کے جسم پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا اور وہ تیزی سے اِدھر اُدھر پہرے پر چکر لگانے لگا۔ اس کے جذبات بھڑکے ہوئے تھے اور محبت اور خوف کے ملے جلے احساس سے لڑکی کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا ساتھی سٹیون سو رہا تھا۔

نوجوان نے دل میں خیال کیا: "اب وہ میرے پاس سے گزرے گی' تو کیا کہے گی؟ کیا وہ یہ تجویز پیش کرے گی کہ وہ رات کو کسی خاموش مقام پر ملیں"۔ وہ خوشی سے جھوم رہا تھا اور اس کے اس پرجوش خیال میں خطرے کا شدید احساس بھی پایا جاتا ہے۔

ایک طویل گھنٹہ تک وہ شدید انتظار کا شکار رہا۔ اس کے بعد اسی طرح آدھ گھنٹہ مزید گزر گیا' مگر لڑکی نہ آئی' لیکن اس انتظار میں بھی ایک لذت اور مسرت موجود تھی۔ جونہی اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا' اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ آخرکار لڑکی کی جگہ اس کی جگہ لینے والے سنتری آ گئے۔ اس دفعہ نہ صرف سٹریف کور کے دو سنتری ہی پہرہ پر تعینات رہنے کے لیے وہاں آئے' بلکہ ذاتی طور پر ان کا سارجنٹ میجر درازانوو بھی ان کے ساتھ آیا۔ وہ ایک سخت گیر آدمی تھا' اس کے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی بھی تھی۔ اس نے فیدوں اور سٹیون کو تیز اور کرخت لہجے میں حکم دیا کہ سونے والی بارک میں چلیں اور دوسرے حکم تک وہاں سے نہ ہلیں۔ اس حکم پر فیدوں کا چہرہ خوف سے سرخ ہو گیا۔ اس شبہ میں کہ جانے کس الزام پر یہ نوبت پیش آئی ہے۔

ایک گھنٹہ کے بعد جب وہاں سب سے پہلے سونے والے سپاہیوں میں کچھ سپاہی آئے' تو ایک کارپورل نے بڑی کرخت اور پاٹ دار آواز میں انہیں اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔ اس کے ہر انداز سے ان دونوں نے اندازہ لگایا کہ ان کے خلاف سختی بڑھ رہی ہے اور اس صورت حال کا نتیجہ اچھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جوں ہی وہ خواب گاہ سے نکلے' انہیں الگ کر دیا گیا اور پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی' شہر کی آخری روشنیاں تک بجھ چکی تھیں' لیکن بارکوں کی کھڑکیوں سے ابھی تک روشنی جھلک رہی تھی۔ وقتاً فوقتاً بڑے گیٹوں پر ایک گھنٹی بجنے کی آواز آتی۔ کبھی چابیوں کی چھنک اور کبھی بڑے اور بھاری دروازوں کے بند ہونے کی آواز بلند ہوتی۔ اردلی آجا رہے تھے۔ رات کی تاریکی میں لوگ تیزی سے کوئی فرض انجام دینے یا بیرکوں میں اور "کوناک" پر جس کی پہلی منزل پر چراغ روشن تھے' سونے جا رہے تھے۔ ان حرکات و سکنات سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ عنقریب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے۔

جب رات کے تقریباً گیارہ بجے فیدوں کو سارجنٹ میجر کے دفتر میں لایا گیا تو اسے محسوس ہوا جیسے کیپیا کے ان لمحات سے اب تک کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ میز پر دھات کا ایک لیمپ جل رہا تھا اور اس کا شیڈ سبز رنگ کا تھا۔ اس کے پاس

میجر کریمار بیٹھا تھا۔ روشنی کہنی تک اس کے بازو پر پڑ رہی تھی، لیکن سر سمیت اس کے جسم کا اوپر والا حصہ سبز شیڈ کی وجہ سے سائے میں تھا۔ نوجوان شخص اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا چہرہ زرد، پورا اور عورتوں جیسا تھا۔ اس نے شیو بنائی ہوئی تھی۔ اس کی مونچھیں بڑی خوبصورت تھیں اور آنکھوں کے گرد کالے حلقے پڑے ہوئے تھے۔

سپاہیوں کو اس بڑے اور پرسکون افسر کے آہستہ مگر بھاری بھر کم الفاظ سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ان میں سے صرف چند سپاہی ایسے تھے جو زیادہ دیر تک اس کی نظر سے نظر ملانے کی ہمت رکھتے تھے اور کچھ ہی لوگ تھے جو اس کی بھوری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے سوالوں کا جواب دیتے وقت لڑکھڑا نہیں پڑتے تھے، جب کہ اس کے سوالوں کا ایک ایک لفظ شروع سے آخر تک بڑی نرمی، صفائی اور وضاحت سے الگ الگ ادا کیا جاتا تھا۔ اس طرح جیسے سکولوں یا تھیٹر میں ادا کیا جاتا ہے۔ میز سے کچھ ہی دور فاصلے پر سارجنٹ میجر درازانو کھڑا تھا۔ اس کے بھی جسم کے اوپر والا حصہ سائے میں تھا اور صرف اس کے ہاتھوں پر تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کی انگلی میں سونے کی ایک بڑی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

درازانو نے مکالمے کا آغاز اس طرح کیا:

"ہمیں یہ بتاؤ کہ تم نے پانچ بجے سے سات بجے تک کا وقت کیسے گزارا، جبکہ تم سٹریف کور کے معاون ساتھی پرائیویٹ سٹیون کلاکان کے ساتھ کپیا میں گارڈ ڈیوٹی پر تھے؟"

اس سوال پر فیدوں کا دوران خون سر کی طرف زور کر گیا۔ ہر شخص نے اپنا وقت وہاں بہتر طریقے سے گزارا، لیکن کبھی کسی کو گمان تک نہ گزرا کہ اسے ایک روز ایک سخت گیر جج کے سامنے ایک ایک لمحے میں واقع ہونے والی تفصیلات یہاں تک کہ انتہائی مخفی خیالات تک کو بیان کرنا ہو گا۔ جی ہاں! کوئی بھی ایسا نہیں سوچ سکتا تھا، یہاں تک کہ وہ شخص بھی نہیں جس کی عمر تیئس سال ہو اور جس نے موسم بہار کپیا میں گزارا ہو۔ اسے کس بات کا جواب دینا تھا؟ گارڈ ڈیوٹی پر وہ دو گھنٹے ہمیشہ کی طرح حسب معمول گزرے جیسے خاموش رہنا بھی اس کے لیے اذیت ناک تھا اور اسے جواب دینے میں جلدی کرنی چاہیے، کیونکہ وقت گزر رہا تھا اور اس صورت حال سے صرف اس کے خلجان اور بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اب تو اسے خاموش کھڑے کافی وقت گزر چکا تھا۔

"اچھا"۔ میجر نے کہا۔ ہر شخص میجر کے انداز سے واقف تھا۔ اس نے "اچھا" کا لفظ صاف، نرم اور پرزور لہجے میں اس طرح کہا تھا جیسے یہ کسی زوردار، پیچیدہ اور عمدہ طریقے سے چلنے والی مشین نے کہا ہو۔

فیدوں خوف زدہ ہو کر یوں لڑکھڑانے لگا جیسے وہ شروع ہی میں جرم کا ارتکاب کر چکا ہو۔ رات اور گہری ہو رہی تھی، لیکن روشنیاں نہ تو بیرکوں سے بجھائی گئیں اور نہ ہی کوناک کی عمارت سے۔ پوچھ گچھ، شہادت اور گواہوں کی جرح ایک ایک کر کے جاری رہی۔ وہ دوسرے سپاہی جنہوں نے اس روز کپیا میں گارڈ ماؤنٹ کی تھی۔ ان سے بھی پوچھ گچھ جاری رکھی گئی، لیکن یہ بات واضح تھی کہ جال فیدوں اور سٹیون کے ارد گرد بنا جا رہا تھا۔ یہ ساری بات چیت اس بوڑھی ترک عورت کے بارے میں تھی جسے ایک نوجوان ترک لڑکی پل پر سے گزار کر لے گئی تھی۔

جب سپیدۂ سحر طلوع ہوا، فیدوں کو ایک بار پھر اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اب اس کے دفتر میں میجر اور درازانو کے علاوہ مسلح پولیس کا ایک آدمی اور ایک عورت بھی تھی جو پہلی نظر میں نوجوان کو غیر حقیقی نظر آئی۔ روشنی بجھا دی گئی۔ کمرے کا دروازہ شمال کی طرف تھا اور یہ سردی اور نیم تاریکی میں ڈوب گیا۔ نوجوان آدمی نے محسوس کیا جیسے یہ فقط ایک خواب ہے، جو ابھی تک دیکھ رہا ہے اور یہ دن کی روشنی کے باوجود ختم ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔

"کیا یہ وہی آدمی ہے، جو گارڈ پر تھا؟" درازانو نے عورت سے پوچھا۔

فیدوں نے اس وقت بڑی تکلیف دہ کوشش کے ساتھ عورت پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ یہ وہی گزشتہ روز والی مسلمان لڑکی تھی، اس کا سر ننگا تھا اور اس نے اپنی شال بھی نہیں اوڑھی ہوئی تھی۔ اس نے صرف ایک رومال اپنے سر پر باندھا ہوا تھا۔ اس نے شوخ رنگ کی ترکی پتلون پہن رکھی تھی، لیکن اس کی باقی پوشاک سربیا کے گاؤں میں سطح مرتفع پر رہنے والی لڑکیوں کی طرح تھی۔ شال کے بغیر وہ زیادہ عمر کی چاق چوبند دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ اسے مختلف نظر آیا۔ اس کا منہ بڑا تھا اور وہ چڑچڑے مزاج کی تھی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سرخ اور آنکھیں روشن تھیں جیسا کہ کل کے سائے ان میں سے بھاگ چکے تھے۔

"یہ وہی ہے"۔ عورت نے بھاری آواز میں جواب

دیا۔ یہ آواز فیدوں کے لیے اس طرح نئی تھی جیسا کہ اس کا موجودہ تمام حلیہ مختلف تھا۔ درازانوو نے اس سے دریافت کیا کہ اس نے کل کتنی بار پُل عبور کیا تھا۔ اس نے فیدوں سے اور فیدوں نے اس سے کیا کہا تھا؟ اس نے زیادہ تر سوالوں کا جواب مختصر مگر غرور اور تمکنت کے ساتھ دیا۔

"بہت اچھا جلینکا۔ اور اس نے تم سے اس وقت کیا کہا تھا جب آخری بار پُل عبور کیا؟"

"اس نے کچھ کہا' لیکن مجھے ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ اس نے کیا کہا' کیونکہ میں نے توجہ سے نہیں سنا تھا' بلکہ میں صرف یہ سوچ رہی تھی کہ میں جوکوو سے کیسے ملوں؟"

"اچھا! تم یہ خیال کر رہی تھیں؟"

"ہاں...." عورت نے بے دلی سے جواب دیا۔

وہ صاف طور پر تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی اور وہ زیادہ بات کرنا ضروری خیال نہیں کرتی تھی' لیکن سارجنٹ میجر بہت ہی سنگدل تھا۔ اس نے دھمکی آمیز آواز میں جو اس کے یقین کو متزلزل کر رہی تھی کہا کہ وہ اس کے سوالوں کا جواب بغیر کسی دلیل کے دے۔ اس نے عورت کو مجبور کیا کہ کوناک میں اس نے پہلی پوچھ گچھ کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے' اسے ایک بار پھر دہرائے۔

اس نے اپنا دفاع کیا اور اپنے بیان کو مختصر کر لیا اور اپنے پہلے بیان کے کچھ حصوں کو چھوڑ دیا' لیکن سارجنٹ میجر نے اس پر اعتراض کیا اور تیز اور ماہرانہ سوالات سے اسے اپنا بیان پوری طرح دہرانے پر مجبور کیا۔

رفتہ رفتہ تمام حقیقی صورت حال سامنے آ گئی۔ اس کا نام جلینکا تھا اور اس کا تعلق ابرلجسکا کے گاؤں تاسیک سے تھا۔ گزشتہ خزاں میں ہیڈوک جاکوو سکریلا اس کے ضلع میں سرما گزارنے آیا تھا اور وہ اس کے گاؤں کے اصطبل میں چھپا رہا۔ لوگ اس لڑکی کے گھر سے اسے کھانا اور کپڑے لا کر دیا کرتے۔ اکثر اوقات یہ کام وہ لڑکی خود ہی کیا کرتی۔ انہیں ایک دوسرے کے چہروں کا جلوہ بہت ہی پسند تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے تھے۔ جب برف پگھلنے لگی اور شریف کور کی فورس زیادہ تر نظر آنے لگی' تو جاکوو نے ہر قیمت پر سرحد پار کر کے سربیا میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ سال کے اس حصے میں دریائے درینہ کو پار کرنا مشکل تھا' چاہے اس پر کوئی گشت پارٹی ہوتی۔ پھر پُل پر کوئی مستقل گارڈ بھی متعین نہ تھی۔ وہ اس کے ساتھ گئی اور اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا' چاہے اس میں اس کی زندگی ہی کیوں نہ چلی جائے۔ وہ پہلے لجسکا تک اترے۔ پھر وہ اوکولستے کی ایک غار میں آ گئے۔ شروع میں گلاسینا میں جاکوو نے ایک ترک عورت کے کپڑے کسی خانہ بدوش سے حاصل کر لیے تھے' ان میں ایک برقع' ترکی پتلون اور ایک شال شامل تھے۔ تب اس لڑکی نے اس کی ہدایت کے مطابق ایسے وقت میں پُل پار کرنے کی کوشش شروع کی جب پُل پر زیادہ ترک موجود نہ ہوں' کیونکہ ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ یہ اجنبی لڑکی کون ہے؟ اور اس لیے بھی کہ شاید گارڈ بھی اس سے مانوس ہو جائے' چنانچہ اس نے تین دن پُل دوڑ کر پار کیا اور اس کے بعد جوکوو کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔

"اور تم اسے اسی وقت کیوں اس پار لے گئیں' جب یہ مخصوص سپاہی گارڈ پر تھا؟"

"کیونکہ وہ مجھے سب سے زیادہ ملائم نظر آیا"۔

"اچھا یہ بات ہے"۔

"ہاں بالکل"۔

سارجنٹ میجر کے اصرار پر لڑکی نے اپنا بیان جاری رکھا:

"جب تمام انتظام مکمل ہو چکا تھا' تو جوکوو نے اپنے آپ کو برقعے میں لپیٹا اور اس وقت جب عنقریب اندھیرا چھانے والا تھا' میں اسے اپنی دادی کے بہروپ میں پُل پر لے آئی اور گارڈ کے سامنے سے گزار لے گئی۔ گارڈ نے کچھ بھی نوٹس نہ لیا' کیونکہ یہ نوجوان اس (لڑکی) پر نظریں جمائے ہوئے تھا نہ کہ بوڑھی عورت پر' جبکہ دوسرا بوڑھا سنتری صوفہ پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا"۔

جب وہ مارکیٹ میں پہنچے تو انہوں نے یہ احتیاط کی کہ وہ اس میں سے سیدھے نہ گزریں' بلکہ انہوں نے پہلو کی گلیاں استعمال کیں۔ ان سے ان کا بھانڈا ہی پھوٹ گیا۔ وہ شہر کا راستہ بھول گئے جو دونوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا اور اس کوشش میں کہ وہ پُل پر جائیں اور وہ سڑک پکڑیں جو شہر سے دونوں سرحدوں کو جاتی ہے' انہوں نے اپنے آپ کو ایک ترک کیفے کے سامنے پایا۔ اس وقت کچھ لوگ کیفے سے باہر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص ترکی پولیس کا تھا جو اسی شہر میں پیدا ہوا تھا۔ یہ لپٹی لپٹائی بوڑھی عورت اور لڑکی جنہیں اس نے اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھا تھا' اسے مشتبہ معلوم ہوئیں۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس نے رضاؤ تک انہیں اپنی نظر میں رکھا۔ تب وہ یہ پوچھنے کے لیے ان کے قریب آیا کہ وہ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ جوکوو نے جو اسے اپنے برقعے کی نقاب سے بڑی توجہ سے دیکھتا رہا' یہ

لحہ بھاگ جانے کو غنیمت جانا۔ اس نے اپنا برقع اتار پھینکا اور جلینیکا کو اس کی طرف اس زور کا دھکا دیا کہ دونوں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے (کیونکہ اس کا قد چھوٹا ہے اور دیکھنے میں معمولی نظر آتا ہے' لیکن وہ چٹان کی طرح مضبوط اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ دلیر اور جرأت مند ہے) وہ عورت' جیسا کہ اس نے پرسکون طریقے سے صاف اعتراف کر لیا' پولیس کے اس سپاہی کی ٹانگوں میں الجھ گئی۔ اس وقت تک جب پولیس مین نے اس عورت سے اپنے آپ کو چھڑایا' جوکوو تیزی سے رضاوٴ کی طرف بھاگ گیا۔ گویا کہ یہ ایک ندی تھی اور اگرچہ پانی اس کے گھٹنوں سے اوپر تھا' وہ اس کی دوسری طرف بید کے جھنڈ میں روپوش ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اس لڑکی کو تاک لے گئے۔ اسے مارا پیٹا اور دھمکیاں دیں' لیکن اس کے پاس کہنے کو اور کچھ نہ تھا اور نہ ہی وہ کچھ اور کہنے کے لیے تیار تھی۔

سارجنٹ میجر بے کار ادھر ادھر کے سوال کرتا رہا۔ کبھی اس کی خوشامد کرتا اور کبھی دھمکیاں دیتا تاکہ وہ کسی طرح لڑکی سے زیادہ معلومات کرید سکے یا ان لوگوں کے بارے میں کچھ اطلاعات اخذ کر سکے جو قزاقوں کو پناہ دیتے یا ان کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ یا کم از کم جوکوو کے متعلق معلوم کر سکے کہ اس کے کیا ارادے ہیں۔ ان ساری باتوں کا اس لڑکی پر ذرا برابر اثر نہ ہوا۔ اس نے جو کچھ کہنا تھا' اس بارے میں کافی باتیں انہیں بتا چکی تھی' لیکن درازنوو کی کوششوں کے باوجود وہ اس سے ایک لفظ بھی نہ اگلوا سکے جس کے متعلق وہ کچھ نہ کہنا چاہتی تھی۔

یہ تمہارے حق میں بہتر ہے کہ اس بارے میں جو کچھ تم جانتی ہو' وہ ہمیں بتا دو۔ بجائے اس کے کہ ہم سوال پر سوال کرتے رہیں اور جاکوو کو اذیت پہنچائیں جو یقینی طور پر اب تک سرحد پر پکڑا جا چکا ہے۔

"کون پکڑا جا چکا ہے.....وہ.....ہاہاہا"۔

لڑکی نے سارجنٹ میجر کی طرف بڑے افسوس ناک انداز میں دیکھا' کیونکہ وہ ایسا آدمی تھا جسے معلوم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اس کے اوپر والے ہونٹوں کا دایاں کونا حقارت آمیز لہجے میں ابھرا۔ حقیقت میں اس کا اوپر کا ہونٹ جو کانپتی ہوئی جونک کی طرح محسوس ہوا' اس کی حرکت سے نفرت کے احساس کا اظہار ہو رہا تھا اور ان حرکات و سکنات سے اس کے جذبات الفاظ سے بھی زیادہ موثر ثابت ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے کی شکنوں اور جھریوں کی حرکات سے

ایک لمحے کے لیے ایک خوبصورت اور باقاعدہ چہرے پر تکلیف اور ناگواری کے نشانات نمودار ہوتے رہے۔ پھر کچھ معصومانہ اور پرجوش اظہار سے جو بدنما شکنوں کے بالکل برعکس وہ ایک دہقان کی طرح کھڑکی سے باہر اس طرح دیکھتی جیسے وہ فصل پر موسم کے اثرات کا اندازہ کرنا چاہتی ہو۔

"خدا تمہاری مدد کرے۔ اب تو صبح صادق پھوٹ آئی ہے۔ گزشتہ شب سے اب تک اس کے پاس کافی وقت تھا کہ وہ تمام بوسنیا پار کر چکا ہو گا۔ صرف سرحد پار کرنے کا توذکر ہی کیا جو محض ایک دو گھنٹے کی مارچ میں پار کیا جا سکتا ہے۔ میں تو بس اسی قدر جانتی ہوں آپ مجھے مار پیٹ سکتے ہیں۔ آپ مجھے جان سے مار سکتے ہیں۔ میں اسی مقصد کے لیے اس کے ساتھ آئی تھی' لیکن تم اسے پھر کبھی نہ دیکھو گے۔ تم خواب میں بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے.....ہاہاہا۔

اس کا اوپر والا لب سکڑتا اور پھیلتا رہا اور اچانک اس کا تمام چہرہ ضعیف نظر آنے لگا۔ کبھی وہ زیادہ متین' واضح اور بدنما دکھائی دیتا' لیکن جب اس کا لب اچانک حرکت بند کر دیتا تو اس کا چہرہ ایک بار پھر طفلانہ اظہار اور معصومانہ جرأت مندی اور دلیری کا مظہر بن جاتا۔

جب درازنوو نہ سمجھ سکا کہ وہ اور کیا کرے' اس نے میجر کی طرف دیکھا۔ میجر نے اشارے سے کہا کہ وہ لڑکی کو باہر جانے دے۔ تب اس نے فیدوں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ نہ صرف میجر کے الفاظ جن پر بے رحم اور سفاکانہ فیصلہ مبنی تھا' بلکہ ان کی اپنی شدت کے سبب جو دبادبا درد تھا' وہ بھی نوجوان کو اس کی غفلت اور بے حسی سے نہ جگا سکا۔

کریمار نے جرمن زبان میں کہا: فیدوں! میں نے تمہیں ہمیشہ ایک سنجیدہ نوجوان سپاہی تصور کیا تھا جو اپنے فرائض اور اپنی زندگی کے مقصد سے بہرہ ور ہے اور میرا خیال تھا کہ ایک دن تم ایک مکمل سپاہی بن جاوٴ گے جو ہماری یونٹ کے لیے ایک باعث فخر سرمایہ ہو گا' لیکن تمہیں پہلی ہی خاتون نے اندھا کر دیا اور وہ ایک طرح سے تمہاری رسوائی کا موجب بنی۔ تم نے نہایت ہی کمزور کردار کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک ایسے انسان کی طرح جسے کوئی سنجیدہ کام سونپا نہیں جا سکتا۔ میں تمہیں فوجی عدالت کے سپرد کرنے پر مجبور ہوں۔ تمہیں اس سے کوئی بھی سزا ملے' لیکن تمہارے لیے سب سے بڑی سزا یہ ہو گی کہ تم یہ جان سکو گے کہ تم نے اس اعتماد کا خود کو اہل ثابت نہیں کیا' جو تم پر کیا گیا تھا اور یہ کہ صحیح وقت پر جب تم پوسٹ پر تھے' تم ایک انسان اور ایک سپاہی کی طرح

مناسب رویہ اختیار کرنے میں ناکام رہے ہو۔ اب تم چلے جاؤ۔

فیدوں پر نگرانی کا کام کوئی ایسا سخت نہ تھا۔ وہ اسے ناشتا کھانے کو دیتے۔ جب وہ اسے کھاتا، تو محسوس ہوتا جیسے وہ کسی اور شخص کے منہ سے کھا رہا ہے۔ انہوں نے اسے اپنا ذاتی سامان پیک کرنے کا حکم دیا۔ اسے کہا گیا کہ وہ ہتھیار اور دوسرا سرکاری سامان جمع کرا دے اور پولیس کے سپاہی کے ہمراہ دس بجے تک سراجیوو جانے والے ڈاکیے کی ہمراہی میں روانہ ہونے کے لیے تیار رہے جہاں اسے چھاؤنی میں فوجی عدالت کے سپرد کر دیا جائے گا۔

جب وہ نوجوان اپنے بستر کے اوپر والے شیلف سے اپنی چیزیں نیچے اتار رہا تھا، تو اس کے دوسرے ساتھی ابھی تک اپنی خواب گاہ میں آرام کر رہے تھے۔ وہ آہستہ سے دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ اس کے گرداگرد تنہائی اور خاموشی کا ایک دائرہ کھچا ہوا تھا۔ یہ دائرہ ایک بیمار جانور کی طرح ہر اس شخص کے گرد بن جاتا ہے جو بد بختی کا شکار ہو گیا ہو۔ سب سے پہلے اس نے ہک سے اپنے نام کی وہ چھوٹی سی تختی اتاری جس پر اس کا نام، نمبر، عہدہ، سیکشن اور یونٹ کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ یہ لکھائی جرمن زبان اور واٹر کلر میں کی ہوئی تھی۔ اس نے اس تختی کو اپنے گھٹنوں پر رکھا جبکہ لکھائی نیچے کی طرف تھی۔ اس سیاہ تختی کی دوسری طرف اس نے جلدی جلدی چاک کے ایک ٹکڑے سے لکھا: "میری جو چیز بھی یہاں رہ جائے، مہربانی کر کے اسے کولومیا میں میرے باپ کے پاس بھیج دینا۔ میں اپنے دوستوں کو خدا حافظ کہتا ہوں اور اپنے سینئر افسروں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔ جی... فیدون"۔

تب اس نے کھڑکی سے ایک بار پھر باہر کے منظر کا جائزہ لیا جو وہ اکثر کھڑکی کے تنگ فریم سے دیکھا کرتا تھا۔ پھر اس نے اپنی رائفل اتاری اور اس میں صرف ایک راؤنڈ لوڈ کیا، جبکہ رائفل ابھی تک گریس آلودہ تھی۔ پھر اس نے اپنے جوتے اتارے اور اپنے چاقو سے پاؤں کے انگوٹھے پر سے سٹاکنگ کو کاٹ دیا۔ اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ گیا اور رائفل کے گرد اپنے بازو اور ٹانگیں اس طرح مضبوطی سے پیوست کر لیں کہ رائفل کا بیرل اس کی ٹھوڑی کے ٹھیک نیچے آ گیا۔ اس نے اپنی دائیں ٹانگ کھسکائی۔ یہاں تک کہ سٹاکنگ میں کیا ہوا سوراخ ٹریگر کے اوپر آ گیا۔ اس نے جھٹکے سے اسے دبا دیا۔ پھر گولی چلنے کی آواز بارکوں میں حیرت سے سنی گئی۔

ایک بڑے فیصلے کے بعد ہر کام سادہ اور آسان ہو جاتا ہے۔ پھر ڈاکٹر آ گیا اور ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھا دیا گیا اور اس کی رپورٹ کے ساتھ فیدوں سے پوچھ گچھ کے ریکارڈ کی دو کاپیاں نتھی کر دی گئیں۔

سٹریف کور کے اس بد نصیب نوجوان کا نام کسی کو بھی معلوم نہ تھا جو کیپیا میں بہار کے چند دل فریب لمحات میں فرض سے عدم توجہ کے سبب جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا۔ یہ ان حادثات میں سے ایک حادثہ تھا جس میں شہر کے لوگوں نے خاصی دلچسپی لی اور اسے عرصہ تک اپنی یادوں میں محفوظ رکھا اور اس کا افسوس ناک انداز میں تذکرہ کرتے رہے۔ اس حساس اور بد بخت نوجوان کی یاد کیپیا پر موجود رہنے والی گارڈ سے بھی زیادہ لمبے عرصے تک باقی رہی۔

اگلی خزاں تک ہرزی گووینا میں بغاوت فرو ہو گئی۔ مسلمانوں اور سربیوں کے چند اور سرکردہ رہنماؤں سے کچھ رہنما مانٹی نیگرو یا ترکی کو فرار ہو گئے۔ وہاں صرف چند بدوک رہ گئے جن کا حقیقت میں بغاوت سے کچھ زیادہ تعلق نہیں تھا اور نہ ہی وہ جبری بھرتی کے حق میں تھے۔ وہ صرف اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کام کرتے رہے۔ وہ بھی یا تو گرفتار کر لیے گئے اور یا وہاں سے باہر نکال دیئے گئے۔ ہرزی گووینا میں امن و امان قائم ہو گیا۔ بوسنیا نے بغیر کسی مزاحمت کے ریکروٹوں کی بھرتی دینا شروع کی، لیکن شروع شروع میں ریکروٹوں کی رخصت نہ تو سادہ تھی اور نہ ہی آسان۔

آخر کار یہ تکلیف دہ ایام بھی گزر گئے۔ لوگ اپنے اپنے گاؤں کو چلے گئے اور قصبے میں امن قائم ہو گیا۔ جب ویا نا سے ان کے بیٹوں کے خط اور پہلی تصویریں آنی شروع ہوئیں، تو ماحول بڑا پرسکون اور قابل برداشت ہو گیا۔ عورتیں کافی عرصہ تک وہ خطوط اور تصاویر دیکھ دیکھ کر روتی اور بین کرتی رہیں، لیکن ان میں اب پہلی سی شدت اور بے تابی نہیں رہی تھی۔ آخر سٹریف کور توڑ دی گئی جس سے بارکیں خالی ہو گئیں اور ایک طویل عرصہ تک کیپیا میں کوئی گارڈ متعین نہ رہی اور قصبہ کے لوگ پہلے کی طرح وہاں جا جا کر بیٹھتے اور آپس میں تبادلہ خیال کرتے رہتے۔

دو سال بہت تیزی سے گزر گئے۔ موسم خزاں میں ویانا گئے ہوئے ریکروٹ آخر واپس آ گئے۔ وہ صاف ستھرے، ملبوس، توانا اور موٹے تازے تھے۔ جب وہ فوجی زندگی کی کہانیاں بیان کرتے، تو لوگوں کا ایک ہجوم ان کے گرد جمع ہو جاتا۔ ان کہانیوں میں بڑے بڑے شہروں، لوگوں، اجنبی

ناموں اور نامانوس زبانوں کے الفاظ کا ذکر آتا۔ جب یہ ریکروٹ دوبارہ بلائے گئے تو شوروغوغا اور احتجاج پہلے کی نسبت بہت کم ہوا۔ اس کے بعد حالات معمول کے مطابق بحال ہو گئے۔ نوجوان زیادہ عمر کے ہو گئے اور انہیں ترکی دور کے واقعات کی یاد نہ رہی۔ اور انہوں نے زندگی کے نئے طور طریقوں کو قبول کر لیا' لیکن کپیا میں زندگی قدیم زمانے کے مطابق ہی رہی اور وہی پرانے رسم ورواج قائم رہے۔

☆☆☆

شہر میں پُل کے علاوہ بھی زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ ہر شے پہلے سے زیادہ منظم اور پرسکون دکھائی دینے لگی۔ زندگی کا وہ توازن جو آج تک مفقود رہا' وہ توازن جس کی ہر زمانے میں اور ہر جگہ میں ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور جو شاذونادر ہی جزوی اور عارضی طور پر حاصل کیا جاتا ہے' قائم ہوا۔

دور دراز کے شہروں میں جن سے قصبوں کے لوگ ابھی تک ناواقف تھے' جہاں کے ضلعوں میں اس وقت اقتدار اور انتظام پوری طرح جاری تھا' انیسویں صدی کے آخری چوتھائی حصہ میں انسانی تعلقات اور سماجی واقعات میں ایک مختصر عرصہ تک عجیب قسم کی خاموشی اور ویرانی چھائی رہی۔ اس خاموشی کے اثرات دور دراز کے ضلعوں پر بھی تھے' ٹھیک اس طرح جیسے سمندر میں ایک پرسکون ٹھہراؤ آگیا ہو اور دور پار کی ذرا سی آواز بھی صاف سنائی دینے لگے۔

جس طرح جسم میں دوران خون جاری رہتا ہے' اسی طرح وہاں ان گنت تعداد میں روپے پیسے کا اجراء کر دیا گیا۔ یہ ایک بڑا کام تھا جسے کھلے بندوں' ظاہری طور پر اور دیدہ دلیری سے کیا گیا۔ سونے چاندی کے سکوں اور نوٹوں کی اس پرجوش گردش سے ہر شخص نے اپنی مٹھی اور جیب گرم کی یا کم از کم اس کی آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوئی۔ اس صورت حال سے غریب سے غریب آدمی نے یہ خیال کرنا شروع کیا کہ اس کی مفلسی اور بدبختی عارضی ہے جو عنقریب ختم ہو جانے والی ہے۔

بارکوں کے سامنے جنہوں نے سٹون این کی جگہ لی تھی' بلدیہ کے دفتر تعمیر کیے گئے۔ مقامی انتظامیہ اور عدالت قائم کی گئی۔ ان کے بعد شہر میں سب سے بڑی عمارت زالر ہوٹل کی تھی۔ یہ پُل کے قریب ہی دریائے درینہ کے دائیں کنارے پر بنایا گیا تھا۔

سرکاری طور پر اس ہوٹل کا نام پُل کی قربت کی وجہ سے پُل والا ہوٹل رکھا گیا تھا لیکن شہر کے لوگ ہر چیز کا نام اپنی مخصوص منطق اور اس کی حقیقی اہمیت کے مطابق رکھتے تھے۔ ہوٹل کے دروازے پر ایک ماہر سپاہی فنکار نے بڑے حروف میں ہوٹل "زربرو" کا نام پینٹ سے لکھا ہوا تھا جو جلد ہی مدھم پڑ گیا۔ عوام نے اس کا نام لوٹے ہوٹل رکھا جو باقی رہ گیا۔ ہوٹل کو چلانے والا ایک موٹا یہودی زالر تھا۔ اس کی ایک علیل سی بیوی تھی جس کا نام ڈیبورہ تھا۔ مینا اور آرمینا اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں' لیکن ہوٹل کی حقیقی پروپرائٹر اس کی خواہر نسبتی تھی جس کا نام لوٹے تھا۔ یہ ایک نوجوان اور خوبصورت بیوہ تھی جو بڑی خوش بیان تھی اور مردانہ ڈیل ڈول رکھتی تھی۔

شہر کے شاہ خرچوں کی دو نسلیں لوٹے ہوٹل کو اپنے لیے باعث کشش سمجھتیں اور وہ جو کھیل بھی وہاں کھیلتیں' ان میں اپنے ہوش وحواس سے کام لیتیں' وہ متعدد افراد جو اس عورت سے کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھاتے' لیکن وہ اس پوزیشن میں نہ تھے کہ یہ بتا سکیں کہ وہ مقامی کہانیوں کا کس قدر موضوع بنتے۔

یہ جاننا کوئی آسان معاملہ نہ تھا کہ شہر کے متمول اور شرابی لوگوں سے معاملات کو کس طرح نبھایا جائے جن میں اکثر غیر مشتبہ اور مکروہ خواہشات بھڑک اٹھتیں' لیکن لوٹے جو ایک سرد اور اَن تھک عورت تھی اور جس کے جذبات برف کی طرح یخ بستہ تھے جو تیز حس اور ذہین تھی اور جو مردانہ دل رکھتی تھی' ہر مشکل سے محفوظ گزر جاتی۔ وہ بے قابو جذبات والے لوگوں کے مطالبات پر انہیں اپنے مضبوط جسم کی ناقابل تشریح حرکات سے خاموش کر دیتی۔ اس کی پرفریب اور دلیرانہ شخصیت ہمیشہ ان کے اور اپنے درمیان ضروری فاصلہ رکھنے میں کامیاب رہتی۔ اس سے ان کے جذبات میں آگ بھڑک اٹھتی اور اس کی اپنی قدروقیمت میں بھی اضافہ ہو جاتا۔ وہ ان سرکش لوگوں کے احساسات سے کھیل جاتی۔ جب وہ انتہائی شدید نشے اور غصے کی حالت میں ہوتے' جیسے ایک بپھرے ہوئے بیل کا سانڈنی سے مقابلہ ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے لیے جلد ہی یہ جان لینا ضروری ہو تاکہ وہ ان لوگوں کے لیے کیا سلوک کرے۔ ان ظالم اور حساس جذباتیوں پر قابو پانے کے لیے جن کے مطالبات ظاہری طور پر بڑے پیچیدہ ہوتے' وہ ان کے تمام کمزور پہلوؤں کا پتا چلا لیتی۔ وہ انہیں ہر چیز کی پیش کش کرتی۔ وہ وعدہ بہت سی چیزوں کا کرتی' مگر دیتی بہت کم یا بعض صورتوں

میں بالکل کچھ بھی نہ دیتی' کیونکہ ان کی خواہشات ان کی فطرت کے مطابق ایسی ہوتیں' جن کی تکمیل سرے سے ممکن ہی نہ ہوتی اور آخر کار انہیں بہت ہی کم چیزوں پر صبر و شکر کر لینا پڑتا۔ وہ اپنے بہت سے مہمانوں سے اس طرح سلوک کرتی' جیسے وہ بیمار آدمی ہیں اور جو وقتاً فوقتاً طبعی بحران اور ہذیان کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ کوئی 1885ء کی بات ہے جب لوٹے اپنے اقتدار کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ اس کے ہوٹل میں امراء کے بیٹے اپنے شب و روز گزارا کرتے تھے۔ جب وہ اوپر اپنے کمرے میں ہوتی تو نیچے ہوٹل میں ہر چیز میں گڑبڑ پیدا ہو جاتی۔ مہمان آپس میں تو تو میں میں کرنے لگتے۔ کرینس کا ایک شخص جو نوجوان اور زرد رو تھا' جونہی شراب پیتا' تو اس کا گھونٹ گھونٹ تھوک دیتا۔ ہر بات کا تلخی سے جواب دیتا اور مہمانوں یا ہوٹل کے عملے سے لڑنے جھگڑنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا۔ وہ صرف مختصر وقفوں کے لیے چپ رہتا۔ وہ مسلسل کئی روز سے ہوٹل میں شراب نوشی کرتا چلا آ رہا تھا۔ وہ لوٹے کا پیچھا بھی کرتا تھا' لیکن اس نے اتنی شراب پی رکھی تھی اور محبت میں اتنا ڈوب چکا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شدید اور عظیم المیہ جس کی اسے قطعاً کوئی خبر نہیں' اس کے در پر دستک دینے والا ہے۔ اس کا یہ المیہ ٹارنوو کی اس حسین یہودن کی بے پناہ محبت اور اس کے غیر معمولی حسد و رقابت سے بھی کہیں زیادہ شدید تھا۔

لوٹے بے خوفی اور دلیری سے اس کے پاس گئی۔ اس کا انداز نرم اور قدرتی تھا۔ اس نے اس سے پوچھا:

"ایوب یہ کیا ہے؟ تم نے یہ شور و غل کس لیے برپا کر رکھا ہے؟"

اس نے شراب کے نشے میں لڑکھڑاتے ہوئے قابل نفریں آواز میں اس کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے جیسے کہ وہ ایک فرشتہ ہے' کہا:

"تم کہاں رہی ہو؟..... میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کہاں رہی ہو؟ یہ لوگ مجھے پینے کے لیے جو شراب دیتے ہیں' وہ زہر معلوم ہوتی ہے' وہ مجھے زہر پلا رہے' لیکن انہیں علم نہیں کہ میں... اگر میں...."

"بیٹھ جاؤ.... خاموشی سے بیٹھ جاؤ"۔ عورت نے اس نوجوان شخص کے چہرے کے سامنے اپنا سفید اور خوشبودار ہاتھ لہراتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"اب بیٹھ بھی جاؤ میرے دوست! اگر تم اپنی پسند کی چڑیا کا دودھ بھی چاہو تو میں تمہیں وہ بھی لا دوں گی' میں یہ تمہارے لیے خود جا کر لاؤں گی"۔

اس نے بیرے کو بلایا اور جرمن زبان میں اسے کچھ آرڈر دیا۔

"تم میرے سامنے وہ مت بولو جو میں نہیں سمجھ سکتا۔ یہ فرٹو فرٹو میں نہیں جانتا.... اور میں.... اور میں.... تم تو مجھے جانتی ہی ہو...."

"مجھے یہ بتاؤ کہ تم کس کے ساتھ رہی ہو؟"

شرابی اور اس صابر عورت میں گفتگو کا یہ سلسلہ بغیر کسی مطلب یا نتیجہ کے جاری رہا۔ اس مکالمے میں عقل و دانش کی کوئی بات نہ تھی۔ ان کے سامنے کچھ قیمتی شراب اور دو گلاس پڑے تھے۔ ایک لوٹے کے لیے لب لباب بھرا ہوا تھا اور دوسرا ایوب کے لیے جو لگاتار بھر بھر کر خالی کیا جاتا رہا۔

اسی شب کے دوران' شراب نوشوں کی ناؤ نوش اور شور و غوغا جاری رہا اور یہ ہنگامہ طرح طرح کی صورتیں اختیار کرتا رہا جن کا لوٹے کو پوری طرح علم تھا۔ پھر بھی وہ چند غنیمت لمحے نکال کر اوپر اپنے کمرے میں چلی جاتی اور کمرے کے دودھیا لیمپ کی روشنی میں یا تو آرام کرتی یا خط کتابت کا کام اس وقت تک جاری رکھتی' جب تک کہ نیچے کوئی تازہ ہنگامہ برپا نہ ہو جاتا یا وہ اسے وہاں طلب نہ کر لیتے۔

دوسری شب کو بھی شرابیوں کی ہاؤ ہو اور ناؤ نوش کا ہنگامہ اسی طرح برپا رہا اور لوٹے کے لیے اسی قسم کی تشویش ناک صورت حال قائم رہی۔ وہ اپنے ہنستے ہوئے چہرے سے بھرپور مسکراہٹیں بکھیرتی رہیں' لیکن محفل میں مدوجزر کی سی وہی کیفیت طاری رہی' کبھی ہنگامہ تھم جاتا' اور کبھی طوفانی موجیں لہرا اٹھتیں۔

ان تمام مشکلات کے باوجود ہر روز کسی نہ کسی طرح ایک یا دو گھنٹے علی بیگ پاسک کے لیے بھی نکال لیتی۔ وہ ایسا شخص تھا جس کے بارے میں شہر والوں کا خیال تھا کہ صرف اس نے لوٹے کی ہمدردیاں معقول حد تک جیت لی ہیں اور آزادانہ طور پر کوئی مفاد حاصل کرنے کے امکانات پیدا کر لیے ہیں۔

وہ شہر بھر میں بڑا محتاط اور کم گو شخص تھا۔ وہ پاسک برادران میں چاروں سے بڑا تھا۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ شہر والوں کا خیال تھا کہ اس نے لوٹے کی وجہ سے شادی نہیں کی۔

بڑے ہال کمرے میں آنے والے مہمانوں سے لوٹے کا

بہت کم رابطہ رہتا۔ اس کا انتظام دو خواتین کے سپرد تھا۔ اس کا نام ملیکا اور دوسری کا زاکلنیر گستاؤ تھا۔ ملیکا ہنگری کی ایک ذہین لڑکی تھی۔ تمام شہر کے لوگ اسے اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی شیر سدھانے والے شخص کی بیوی ہو اور گستاؤ چھوٹے قد اور سرخ رنگ کی چیکو' جرمن نژاد لڑکی تھی' اس کی آنکھیں سرخ' ٹانگیں مخروطی اور پاؤں چپٹے تھے' وہ دونوں ہوٹل میں آنے والے تمام گاہکوں سے واقف تھیں۔

خلاف معمول اگر بعض اوقات کوئی شخص کسی بدتمیزی پر اتر آتا یا اگر کوئی شخص کسی گھٹیا ہوٹل میں شراب نوشی کے بعد نشے کی حالت میں زبردستی کمرے میں داخل ہو جاتا' تب اس مشکل کے حل کے لیے ہوٹل کا ایک ملازم میلان جھٹ آموجود ہوتا' وہ لیکا کا ایک بلند قامت' چوڑے کندھوں اور گھنے بالوں والا شخص تھا جس کے تن و توش میں بلا کی قوت تھی۔ وہ بولتا بہت کم تھا' مگر ہر قسم کے مشکل اور ناگوار کام کر لیتا تھا۔ اس ناگوار اور ناپسندیدہ عمل کے لیے ایک آزمودہ اور کارگر نسخہ استعمال کیا جاتا جو مدتوں سے زیرِ استعمال چلا آ رہا تھا۔ گستاؤ برہم اور بہکے ہوئے شرابی کو باتوں میں مصروف رکھتی اور میلان اس شخص کے پیچھے آکر کھڑا ہو جاتا۔ زاکلینز اچانک ان کے راستے سے ہٹ جاتی۔ میلان شرابی کو پیچھے سے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیتا' وہ اپنا ایک بازو اس کی کمر میں اور دوسرا گردن میں حمائل کر دیتا۔ یہ کام وہ اتنی پھرتی اور ہنرمندی سے کرتا کہ کوئی شخص یہ اندازہ نہ لگا سکتا کہ اس کی گرفت کس قدر مضبوط ہے۔ پھر وہ اس زور کا دھکا دیتا کہ شہر کے مضبوط ترین پہلوان بھی کپڑے کی گڑیا کی طرح دروازے میں سے تیزی سے اُڑتا ہوا باہر نکل جاتا۔ اس موقع پر ملیکا ایک مخصوص انداز اور صحیح وقت پر دروازہ کھول کر پکڑ رکھتی تاکہ اسے ہوٹل کے اخراج میں آسانی ہو اور وہ اس سے نکل کر گلی میں جا پڑتا۔ تب گستاؤ اس کا ہیٹ' چھتری اور دوسرا سامان اس کی طرف پھینک دیتی۔ پھر میلان دروازہ بند کر کے اپنے جسم کی پوری طاقت سے دھات کی چٹخنی نیچے گرا دیتا۔ یہ سارا کام پلک جھپکنے میں انجام پا جاتا۔ باہمی تعاون اور آسانی سے اس عمل میں ذرا دشواری واقع نہ ہوتی' یہاں تک کہ دوسرے گاہکوں کے نظر اٹھا کر دیکھنے سے پیشتر ہی وہ ناپسندیدہ شخص باہر گلی میں ہوتا۔

لیکن اس پرانی وضع کی سرائے میں بھی جہاں الگ کمرے اور ملازم نہ تھے' وہاں سنجاک کا کوئی نہ کوئی شخص موجود ہوتا جو لوگوں کو شراب پیش کرتا' اس سے نئی اور پرانی طرز کی عادات آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔

دور دراز کے کونوں میں آلوچوں کی برانڈی پینے والے بدنام اور عادی شرابی خاموشی سے بیٹھ جاتے۔ وہ سائے اور خاموشی کے دلدادہ تھے۔ وہ آلوچوں کی برانڈی سامنے رکھ کر یوں بیٹھتے جیسے یہ کوئی بڑی مقدس چیز ہے۔ انہیں شور و غل اور ہنگاموں سے سخت نفرت تھی۔ ان کے پیٹ جلے ہوئے اور تلی آتش زدہ تھی۔ ان کی نبضیں بے قاعدہ تھیں۔ وہ بے پرواہ قسم کے شخص تھے۔ ان کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی ہوتی۔ دنیا کے ہر شخص سے ان کا رویہ مختلف تھا اور وہ اپنے لیے بھی ایک بوجھ تھے۔

ان میں سے زیادہ شوریدہ سر اور باتونی نوآموز شرابی ہوتے۔ یہ زیادہ تر مقامی امیروں کے شہزادے ہوتے۔ وہ نوجوان لڑکے جو زندگی کے ان خطرناک برسوں میں تباہی کی راہ پر گامزن ہو جاتے۔

جب وہاں زندگی کے نئے طور طریقے شروع ہوئے اور لوگوں کو بغیر کسی جبر و تشدد' دباؤ یا لحاظ کے بہتر کام اور بہتر اجرتیں ملنے لگیں تو سمبو نام کا ایک خانہ بدوش جس نے تیرہ سال سے شہریوں کی مجلسوں میں حصہ لیا تھا' اپنے ساز زرلویا دیہاتی کلارنٹ سے دل بہلاتا رہا۔ اب وہاں سرائے میں فرانز فرلان نام کا ایک شخص بھی اپنے ساز کے ساتھ اکثر آنے لگا۔ وہ ایک دبلا پتلا سرخ رنگ کا آدمی تھا اور اس کے دائیں کان میں سونے کا ایک بڑا چھلا پڑا ہوا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ بڑھئی تھا جو لکڑی میں نقش و نگار اور بیل بوٹے بنانے کا کام کرتا' لیکن وہ حد سے زیادہ شراب اور موسیقی کا عاشق تھا۔ فوجی سپاہی اور غیر ملکی کارکن اکثر اس کے گیت سننے کے مشتاق رہتے۔

اکثر ایسا ہوتا کہ وہاں ایک اکتارہ بجانے والا بھی موجود رہتا (یہ ایک تار کا ایک قسم کا ساز ہوتا ہے) وہ مانٹی نیگرو کے باشندوں کی طرح ایک تارک الدنیا شخص کے مانند نحیف معلوم ہوتا۔ اس کا لباس میلا کچیلا ہوتا' لیکن چال ڈھال میں پرغرور ہوتا۔ وہ باوقار مگر شرمیلا تھا' مغرور تھا' لیکن خیرات قبول کرنے پر مجبور تھا۔

سرائے میں وہ وقت بہت پرمنظر ہوتا' جب نوجوان اشخاص' جو مقامی معززین اور امراء کی اولاد ہوتے' شراب نوشی کے لیے مل بیٹھتے' تب سمبو' فرانز فرلان' ایک آنکھ والے کورکن اور خانہ بدوش سالا کے لیے کچھ نہ کچھ کام

نکل آتا۔

وہ لوگ جو ان کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے' اب بدل چکے تھے' لیکن کورکن' سمبو اور ساہا میں کسی قسم کی تبدیلی نہ آ سکی۔ وہ ویسے کے ویسے باقی رہے۔ وہ موسیقی' مذاق اور آلوچوں کی برانڈی پر مرتے تھے۔ ان کا کام دوسروں کا وقت ضائع کرنا اور ان کا صلہ دوسروں کے اسراف میں تھا۔

جب آسٹریوں کے قبضہ کے بعد شہر میں پہلی مرتبہ سرکس آیا' تو کورکن رسہ پر چلنے والی ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا اور اس کی وجہ سے اس نے اس دیوانگی اور کج روی کا مظاہرہ کیا کہ اس کو بری طرح زدوکوب کیا گیا اور بعد میں جیل میں ڈال دیا گیا اور مقامی معززین جنہوں نے اسے گمراہ کیا اور بدمزاج بنانے میں اس کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں بھاری جرمانے ادا کرنے پڑے۔

اس کے بعد چند برس اور گزر گئے۔ لوگ بہت سی چیزوں کے عادی ہو گئے تھے۔ عجیب و غریب قسم کے فنکاروں' بازی گروں' مسخروں اور جادوگروں سے لوگ اب زیادہ متاثر نہیں ہوتے تھے جیسا کہ پہلے سرکس کے آنے پر ہوئے تھے' لیکن لوگوں کو جرمن ڈانسر سے کورکن کی محبت کا قصہ ابھی تک یاد تھا۔

موسم خزاں کی بارانی راتوں میں زارجے کی سرائے میں لوگ اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے۔ ان کی سوچیں ڈھیلی پڑ جاتیں اور وہ سب اداس اور ناگوار واقعات سے دوچار ہو جاتے۔ وہ تقریر میں مشکل محسوس کرتے جو محض پھیکی اور تکلیف دہ قرار دی جاتی۔ چہرے سرد' ذہن غیر حاضر اور بے اعتماد بن جاتے۔ یہاں تک کہ آلوچوں کی برانڈی بھی ان کے مزاج میں چستی نہ پیدا کر سکتی۔ سرائے کے کونے میں ایک بنچ پر بیٹھا ہوا کورکن تھکاوٹ کی وجہ سے غنودگی کا شکار تھا' کیونکہ اس نے شراب کا پہلا جام چڑھایا تھا اور وہاں حبس کی وجہ سے شدید گرمی بھی تھی اور باہر موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔

اس کے بعد بڑی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے ایک اداس گاہک نے محض اتفاق کے طور پر سرکس کی ڈانسر اور کورکن کی بے لطف محبت کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ سب نے کونے پر نظر ڈالی' لیکن کورکن نے ذرا بھی حرکت نہ کی اور یہ بہانہ کیا کہ گویا وہ سو رہا ہے۔ اس نے رات کو شدید شراب نوشی کے بعد اگلی صبح کو یہ پختہ فیصلہ کر لیا تھا کہ سب لوگ جو کچھ بھی کہنا چاہیں' کہتے رہیں۔ وہ ان کے استہزاء اور تضحیک کا کوئی جواب نہیں دے گا' لیکن وہ انہیں نارواندا ق کی اجازت بھی نہیں دے گا' جیسا کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے گزشتہ شب اسی سرائے میں کیا تھا۔ انہوں نے ذیل کی گفتگو کی تھی:

"میرا خیال ہے کہ وہ ایک دوسرے کو خط لکھیں گے"۔ ایک نے کہا۔

"چنانچہ تم دیکھ رہے ہو' وہ بدمعاش ایک کو محبت کے خطوط لکھ رہا ہے اور دوسری یہاں گھٹنوں کے بل اس کے پاؤں پڑ رہی ہے"۔ دوسرے نے طنزاً کہا۔

کورکن نے اپنے آپ کو لاتعلق رکھنے کی بھرپور کوشش کی' لیکن اس گفتگو نے اسے جوش اور غصہ دلا دیا۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے سورج پوری حدت سے اس کا چہرہ جلا رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی واحد آنکھ کھلنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہے اور اس کے چہرے کے تمام پٹھے ایک خوش گوار قہقہے کے لیے پھیلنے لگے ہیں۔ وہ اب اس پوزیشن میں نہ تھا کہ اپنی بے حرکت خاموشی قائم رکھ سکے۔ پہلے اس نے اپنا ہاتھ لہرایا اور پھر بولا:

"وہ تمام معاملہ اب گزر چکا ہے' اس کو گزرے مدت ہو چکی ہے"۔

"گزر چکا ہے' کیا واقعی ایسا ہی ہے' یہ کورکن دیکھو تو کتنا بدکردار آدمی ہے۔ ایک لڑکی اس کے عشق میں کہیں دور سوکھ رہی ہے جبکہ ایک دوسری یہاں اس پر دیوانی ہو رہی ہے۔ ایک کا قصہ تمام ہو چکا ہے اور یہ جو یہاں ہے اس کا بھی عنقریب وہی حال ہو گا اور پھر تیسری کی باری آ جائے گی۔ تم کس قسم کے انسان ہو' تم بہت بدچلن ہو کہ ایک کے بعد دوسری لڑکی بدلتے چلے جا رہے ہو؟"

کورکن اپنے پاؤں پر اچھلا اور میز کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی غنودگی' تھکاوٹ اور گفتگو میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ بھول چکا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ چھاتی پر رکھ کر مہمانوں کو یقین دلایا کہ اس ناکام محبت میں قصوروار وہ نہیں اور یہ کہ وہ اتنا عظیم عاشق بھی نہیں اور نہ وہ اتنا ماہر گمراہ کن شخص ہے۔ اس کے کپڑے ابھی تک بھیگے ہوئے تھے اور چہرہ داغدار اور میلا تھا' کیونکہ اس کی سستی ترکی ٹوپی کا رنگ بہہ رہا تھا' لیکن اس پر شراب کی خوشی کی چمک دکھائی دے رہی تھی' وہ میز کے قریب بیٹھ گیا۔

"کورکن کے لیے رم لاؤ"۔ سانٹو پاپو نے اونچی آواز میں کہا۔ وہ ایک موٹا اور چکنی قسم کا یہودی تھا' وہ مٹے پاپو کا بیٹا اور مورڈے پاپو کا پوتا تھا جو لوہے کے سامان کا ایک نامور

تاجر تھا۔

اس کے سامنے ایک بوتل پڑی ہوئی تھی اور گویا وہ زبان خاموش سے اس سے گفتگو کر رہا تھا جسے کوئی شخص سن نہیں سکتا تھا' لیکن وہ شخص جس نے پہلے پہل اسے گفتگو میں شریک ہونے پر مجبور کیا تھا اس نے اس سے پوچھا:

"تم اس لڑکی کے بارے میں کیا خواب دیکھ رہے ہو' تم بڑے بدکردار ہو' کیا تم اسے اپنی بیوی بنانے والے ہو' یا اس سے وہ کھیل کھیلو گے جو تم اس سے پہلے کئی لڑکیوں سے کھیل چکے ہو؟"

یہ لڑکی دوشے کے کسی پاشا خاندان سے تھی۔ وہ شہر بھر میں خوبصورت ترین غریب اور یتیم لڑکی تھی اور اپنی ماں کی طرح درزن کا کام کرتی تھی۔

بے شمار تفریحی پروگراموں اور شراب نوشی کی محفلوں میں گزشتہ برس نوجوان کنواروں نے پاشا اور اس کے ناقابل رسائی حسن کے بارے میں گیت بھی گائے اور بات چیت کے دوران اس کی تعریفیں کی تھیں۔ ان کی باتیں سن سن کر کورکن بھی متاثر ہوا اور ناگزیر حد تک اس کے دل میں بڑا جوش و خروش پیدا ہو گیا' لیکن وہ خود بھی نہیں جان سکا تھا کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوا' چنانچہ لوگ اسے پاشا کی محبت کے ضمن میں چھیڑتے رہتے تھے۔

اس رات وہ دریا کے کنارے اخروٹوں کے درختوں کے نیچے سحر ہونے تک شراب پیتے رہے۔ کورکن آگ کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ سنجیدہ اور متفکر تھا' کبھی خوش نظر آتا اور کبھی اچانک اداس ہو جاتا۔ اس رات لوگوں نے اسے شراب پینے کی زحمت نہ دی اور اسے کافی یا کھانے کی چیزیں تیار کرنے میں بھی مصروف نہ رکھا۔ ان میں سے کسی ایک شخص نے کہا:

"کیا تم ایک لڑکی کی طرف سے پھول پھینکے جانے کا مطلب نہیں سمجھتے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاشا تم سے کہہ رہی ہے' میں تمہارے عشق میں ٹھیک اس توڑے ہوئے پھول کی طرح مرجھا رہی ہوں' لیکن تم نے کبھی میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی مجھے کسی دوسری طرف جانے دیتے ہو' یہ ہے جناب پھول پھینکے جانے کا مطلب"۔

وہ سب کے سب پاشا کے بارے میں اس سے طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ پاشا اتنی پیاری اور اتنی دل نواز لڑکی تھی کہ دنیا بھر میں اس کی مثال نہ تھی۔ وہ اس ہاتھ کا انتظار کر رہی تھی جو پھول کی طرح اسے توڑ لے اور وہ جس ہاتھ کے انتظار میں تھی' وہ کورکن اور صرف کورکن کا ہاتھ تھا۔

چنانچہ کورکن اپنی اس محبت اور جرمنی کی ڈانسر لڑکی کے الزام محبت کے بعد ایک تازہ اور پرجوش محبت کے دام میں گرفتار ہو گیا اور تمام امیر اور فارغ لوگوں کو ایک تماشا ہاتھ آ گیا اور وہ بڑے ظالمانہ اور مذاقیہ انداز میں آنے والے کئی ماہ د سال تک کورکن پر قہقہے لگاتے اور اس کا مذاق اڑاتے رہے۔

یہ وسط گرما کی بات ہے' لیکن موسم خزاں اور موسم سرما بھی گزر گیا اور خوبصورت پاشا سے کورکن کی محبت کے تذکروں سے شامیں بڑی پرلطف ہو جاتیں۔

کورکن صرف سنتا رہتا' وہ شراب پیتا اور آہیں بھرتا۔ شدت غم نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ایک مجبور و مظلوم ہستی ہے جسے اس شہر میں اور دور افتادہ خوبصورت شہر دونوں جگہ لوٹا گیا اور دھوکہ دیا گیا۔ اس کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ اس کا ٹھٹھا اڑاتے اور اس کے بروسہ جانے کے لیے سفر کی تیاریاں کرتے نظر آتے۔ ان کا ختم نہ ہونے والا مزاح بڑا تلخ اور تکلیف دہ ہوتا۔ ایک رات انہوں نے اس کے پاسپورٹ تیار کرنے کا ڈھونگ رچایا۔ وہ اس کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہنسی' مذاق اور قہقہوں کے شور میں وہ اسے گھماتے رہے تاکہ اس کے ذاتی جسمانی خصائص کا معائنہ کرتے رہیں اور پاسپورٹ پر ان کا اندراج کیا جا سکے۔ ایک موقع پر اس کے سفر کے اخراجات اور بروسہ میں طعام و قیام کے بندوبست کا سوچتے رہے۔

جب وہ سنجیدہ ہوتا' تو ان سب باتوں کی صداقت کو شک کی نگاہ سے دیکھتا اور اسے یقین نہ آتا' لیکن جب رم کا نشہ چڑھ جاتا' تو اسے پھر یہ باتیں درست لگتیں' کیونکہ نشے کی حالت میں وہ ان کے سچ یا جھوٹ کے بارے میں بالکل نہ سوچتا۔

"ڈوب مرو' ڈوب مرو"۔ کورکن چلایا۔ "تم کیا سمجھتے ہو' میں نے خود یہ نہیں سوچا۔ سو بار میں نے سوچا کہ درینہ میں ڈوب کر اپنے آپ کو ختم کر ڈالوں' لیکن کوئی طاقت مجھے ایسا کرنے سے روک دیتی ہے"۔

"کس نے تمہیں روکا' کورکن تم بزدل ہو"۔

شور و غوغے میں کورکن نے چھلانگ لگائی۔ وہ اپنا سینہ پیٹنے لگا اور اپنے سامنے پڑی ہوئی روٹی سے ایک ٹکڑا کاٹا اور اسے مہاجا کے جذبات سے عاری' سپاٹ چہرے کے نیچے

ٹھونس دیا۔ "دیکھ رہے ہو' مجھے اس رزق کی قسم۔ یہ خوف نہیں تھا لیکن...." اچانک وہ دھیمی آواز میں گنگنانے لگتا:
"اور اب تمہارے چہرے کو روشن نہیں کرتیں"
ہر کسی نے گانے کے ساتھ آواز ملائی اور مہاجا کی آواز ڈوبتی چلی گئی:
"ڈوب.... ڈوب.... ڈوب.... مرو"۔
اس طرح گاتے ہوئے ان پر ایک کیف ساطاری ہو گیا جس میں وہ کورکن کو لے جانا چاہتے تھے۔ وہ شام بڑی جنوں پرور ثابت ہوئی۔ فروری کی ایک رات اسی طرح صبح تک جاگتے رہے اور اپنے مذاق کے شکار کورکن کے ساتھ خود بھی اس کی سادگی کا شکار ہوتے رہے۔ سرائے سے باہر نکلے' تو دن نکل چکا تھا۔ نشے کی حرارت اور تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ پُل کی طرف نکل آئے جو برف کے شفاف پردے تلے ڈھکا ہوا تھا۔
قہقہوں کے اس شور میں راہ گیروں سے بے نیاز انہوں نے آپس میں شرط لگائی کہ کون پُل کو پار کرنے کی جرأت کرے گا۔ برف تلے چھپے ہوئے پُل کی فصیل کے تنگ کنارے پر سے نشے میں دھت ایک آدمی نے کہا: "کورکن کرسکتا ہے"۔
"تمہاری جان کی قسم' کورکن نہیں کرسکتا"۔
"کون نہیں کرسکتا' میں--- وہ کچھ کرسکتا ہوں جو کوئی اور زندہ شخص نہیں کرسکتا"۔ کورکن نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔
"تمہارے اندر اتنی جرأت نہیں' اگر ہے تو کر گزرو"۔
"خدا کی قسم مجھ میں اتنی جرأت ہے"۔
"کورکن کرسکتا ہے"۔
"جھوٹا"۔
یہ شرابی اور بڑ ہانکنے والے چلا چلا کر باتیں کر رہے تھے۔ ان کے قدم پُل کے اوپر بمشکل سیدھے پڑتے' وہ لڑکھڑاتے' جھومتے جھامتے ایک دوسرے کا سہارا لیے چلے جا رہے تھے۔
انہیں یہ بھی پتا نہ چلا کہ کورکن کب اُچھل کر پُل کی فصیل پر چڑھ گیا۔ انہوں نے اچانک دیکھا کہ وہ ان کے اوپر' نشے میں ہونے کے باوجود' سیدھا کھڑا ہو کر' پتھر کی دیوار پر سے گزر رہا تھا۔ پُل اس کی بائیں طرف تھا اور پُل پر اس کے قدموں کے نیچے شرابیوں کا ٹولہ' اس کے قدم کے ساتھ قدم ملائے چل رہا تھا۔ وہ چلا چلا کر اسے کچھ کہہ رہے تھے جو وہ بالکل نہ سمجھ سکتا۔ دائیں طرف تک ایک خلا تھا۔ اس خلا میں کہیں دور نیچے' دریا بہتا تھا۔ دریا کی سطح سے دھند کی ایک دبیز تہہ دھوئیں کی طرح اٹھتی اور اس یخ بستہ صبح کی ہوا میں مل جاتی۔
کچھ راہ گیر ٹھہر کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک شرابی کو پُل کی تنگ فصیل پر چلتے ہوئے دیکھتے اور خوفزدہ ہو جاتے۔ کورکن خلا میں معلّق' اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے پاگلوں کی طرح اپنے بازو پھیلائے ہوئے تھا۔ نشے میں چور شرابیوں کے اس ٹولے میں کچھ سنجیدہ اور متین لوگ بھی تھے جو اس خطرناک کھیل کو دیکھ رہے تھے۔ دوسرے جو احساس سے عاری تھے' فصیل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے' شور مچاتے اس شرابی کا ساتھ دے رہے تھے جو توازن قائم رکھتے ہوئے' لڑکھڑاتا' رقص کرتا' قلعے کے اوپر سے گزر رہا تھا۔
کورکن گاتے ہوئے خود ہی سر کا ساتھ دیتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ راستہ پار کر گیا' اس کی ٹانگیں گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھیں' وہ اپنی گردن بائیں کبھی دائیں گھماتا۔
اس غیر معمولی خطرناک حالت میں وہ سب سے بلند تر' اب کورکن نہیں رہا تھا جو شہر اور سرائے والوں کے لیے تضحیک کا سامان تھا' بلکہ کوئی مافوق الفطرت دیو تھا۔ اس کے قدموں تلے اب وہ تنگ' پھسلواں پتھری فصیل نہ تھی جس پر وہ ہزاروں دفعہ بیٹھا اپنی روٹی کترتا رہتا تھا اور نیچے بہتی ہوئی موت کا خوش گوار احساس لیے کیپیا کے سائے تلے خوابوں میں کھو چکا تھا۔
یہ اس کی بستی کی طرف سفر تھا جس کی دوسری طرف اس کے خوابوں کا شہر بروسہ تھا۔ اپنی تمام تر دنیاوی دولت اور اس کی قانونی وراثت کے ساتھ ڈوبتا ہوا سورج' پاشا' اس کے بچے کو پہلو میں لیے' پاشا اس کی بیوی اور اس کا بچہ--- اس طرح خوشی کے بھرپور احساس کے ساتھ رقص کی حالت میں وہ پُل کی سنگین فصیل پار کر گیا۔ وہ نیچے کود گیا۔
"شاباش! کورکن ہمارے عقاب' شاباش"۔
"کورکن کے لیے رم کا گلاس لاؤ"۔ سانتو پاپو خالص اسپینی لہجے میں بولا' یوں جیسے ابھی تک وہ سرائے میں ہے۔ اس شور شرابے میں کسی نے مشورہ دیا کہ آج کورکن کے اعزاز میں شراب کے خم لنڈھائے جائیں اور دن اکٹھے

گزارا جائے۔

آٹھ نو سال کی عمر کے چھوٹے چھوٹے بچے جو سردی میں پُل پر سے گزرتے ہوئے اپنے اسکولوں کو جا رہے تھے' اس عجیب نظارے کو دیکھنے کے لیے رک گئے۔ حیرانگی سے ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے جن سے بھاپ کے بادل اٹھ رہے تھے۔ اپنی کتابیں اور سلیٹیں بغل میں دبائے چھوٹے چھوٹے بچے ان بڑی عمر کے لوگوں کی تفریح کو سمجھنے سے قاصر تھے' لیکن بقیہ عمر اپنے پرانے پُل کے ساتھ ایک آنکھ والے کورکن کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ایسا شخص جو ان کے لیے جانا پہچانا تھا' اور جس نے بڑی جرأت کے ساتھ ہنسی خوشی رقص کرتے ہوئے پُل کو پار کیا تھا۔ ایسا خطرناک راستہ جس پر چلنا ممنوع تھا اور جس پر چلنے کی ابھی تک کسی نے جرأت نہ کی تھی۔

کئی سال گزرے جب پہلی بار آسٹرین فوجی گاڑی پُل پر سے گزری۔ بیس سالہ قبضہ' جو دنوں اور مہینوں کا لمبا سلسلہ تھا' اس طویل مدت کے دوران ہر دن اور ہر مہینہ اپنے طور پر غیر یقینی اور عارضی تھا' لیکن مجموعی طور پر یہ عرصہ' امن اور مادی ترقی کا دور تھا جو شہر والوں کو ہمیشہ یاد رہے گا۔

اس نسل کی زندگی کا زیادہ عرصہ جو قبضے کے وقت جوان اور باشعور ہو چکی تھی' اس ترقی کو دیکھ چکی تھی۔

یہ عرصہ بظاہر خوش حالی اور امارت کا زمانہ تھا۔ مائیں اپنے بچوں کو دعائیں دیتی تھیں:

"خدا میرے بچے کی عمر دراز اور رزق کشادہ کرے"۔

یہاں تک کہ گلیوں اور سڑکوں کے لیمپوں کو روشن کرنے والے فرحت کی بیوی' جو سدا کا غریب تھا اور جسے اپنے کام کے عوض 12 فلورن ماہوار ملتے تھے' فخریہ کہتی تھی: "شکر ہے خدا کا' میرا فرحت بھی حکومت کا ملازم ہے"۔

انیسویں صدی کے آخری سال جو بغیر کسی اہم واقعے اور طوفان کے گزرے' ایک پرسکون دریا کی طرح اپنی نامعلوم منزل کی طرف گزرتے رہے۔ ان سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یورپی لوگوں کی زندگی میں خلل ڈالنے والے لمحات ختم ہو چکے ہیں' یا کم از کم پُل کے ساتھ آباد شہر کے لوگوں کی زندگی پرسکون گزر رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسے حادثات جو دنیا کے دوسرے حصوں میں ہیں' رونما ہوتے' وشے گراڈ تک نہ پہنچتے۔ وہ بہت دور اور قصبے کے لوگوں کے لیے ناقابل فہم ہوتے۔

بہر حال اتنے برسوں کے بعد موسم گرما کے ایک دن کپیا پر ایک سرکاری اشتہار نمودار ہوا۔ یہ سیاہ حاشیئے کے ساتھ ایک چھوٹا سا نوٹس تھا جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ ملکہ عالیہ الزبتھ جنیوا میں انتقال کر گئی ہیں۔ انہیں ایک اطالوی دہشت پسند لوچینی نے قتل کر دیا۔ اعلان میں آسٹرو ہنگری شہنشاہیت کی رعایا کی طرف سے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا تھا اور یہ اپیل کی گئی تھی کہ عوام بڑے اتفاق اور اتحاد کے ساتھ شاہی تخت کے گرد جمع رہیں تاکہ غمزدہ بادشاہ کی دل جوئی ہو سکے۔

انیسویں صدی کے آخر میں زندگی بڑی پرسکون اور ہمیشہ کے لیے خوش گوار دکھائی دیتی' مگر اس کے وسیع و عریض پردے کے نیچے ہر چیز چھپی ہوئی تھی۔ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ اس صدی میں پرامن صنعت شروع ہو گئی ہے جو کسی انجانے مستقبل کی طرف زندگی کی رہنمائی کر رہی ہے۔ وہ نہ ختم ہونے والی اور ناقابل روک سرگرمیاں جن کو غیر ملکی حکمران نفرت سے دیکھتے اور جن کے بارے میں مقامی لوگ مشکل سے ذہنی طور پر متفق ہوتے' اگرچہ یہ ان کی خوش حالی اور روزگار کی ضمانت تھیں' گزشتہ بیس برسوں میں بہت سی چیزوں میں تبدیلی لا چکی تھیں۔ قصبہ کی ظاہری حالت شہریوں کے لباس اور رسم و رواج بدل چکے تھے۔ یہ قدرتی امر تھا کہ وہ پُل پر بھی اثر انداز ہوتیں جو ازل سے اسی طرح دکھائی دیتا تھا۔

اس موسم گرما میں کپیا کی گہما گہمی معطل رہی اور پُل کے ارد گرد زندگی کے معمول میں خلل آ گیا۔ پُل پر ریت اور سیمنٹ لانے والے گھوڑوں اور چھکڑوں کا ہجوم رہتا اور مزدوروں سے کام لینے والے اہل کاروں کا شور ہر طرف سے سنائی دیتا۔ کپیا پر بھی لکڑی کی ایک شیڈ ہتھیاروں کے لیے بنائی گئی۔ قصبے کے باشندے پریشانی کی حالت تک پُل پر کام ہوتے دیکھتے رہتے۔ کچھ اس کا مذاق اڑاتے۔ بعض محض بازو لٹکائے گزر جاتے اور ان سب کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ اجنبی اس لیے یہ کام کر رہے ہیں' کیونکہ وہ کچھ نہ کچھ کرنے کے عادی ہیں۔ کام ان کے لیے سب کچھ تھا' وہ کام کیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ اس چیز کا صرف احساس ہی تھا' زبان سے کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔

ان بیس برسوں میں ہدیٰ نے تین شادیاں کیں۔ اس کی موجودہ بیوی اس سے عمر میں بہت چھوٹی تھی۔ لوگوں کی زہریلی باتیں اس بارے میں کہتی تھیں کہ ہدیٰ کی بدمزاجی کا سبب اس کی جوان بیوی تھی۔ ان تین بیویوں سے اس کے

چودہ بچے تھے' اس کے گھر میں ہمیشہ شور وغل رہتا اور لوگ ازراہ مذاق کہتے کہ ہدئی خود بھی اپنے بچوں کے نام نہیں جانتا۔ اس بارے میں وہ ایک لطیفہ سناتے کہ ایک دفعہ اس کا ایک لڑکا اسے گلی میں مل گیا۔ بچے نے آداب کے بعد دست بوسی کی' لیکن ہدئی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا: "خدا تمہیں صحت دے' لیکن یہ بتاؤ تم کس کے بیٹے ہو؟"

کافی حد تک شہر کے لوگ پُل کی مرمت سے لاتعلق رہے' جیسا کہ وہ ہر اس چیز کے بارے میں رویہ رکھتے تھے جو غیر ملکی کئی برسوں سے شہر میں کرتے رہتے تھے۔ صرف بچے مایوس ہو گئے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مزدور سیڑھی کے ذریعے اس تاریک سوراخ میں داخل ہو گئے جو ان کے طفلانہ عقیدے کے مطابق ایک عرب کا مسکن تھا۔ وہاں سے مزدوروں نے پرندوں کی بیٹوں کی ٹوکریاں بھر بھر نکالیں اور دریا میں پھینک دیں' لیکن وہ نمودار نہ ہوا۔ بچے یہ دیکھنے کے لیے اسکول سے لیٹ ہو جاتے کہ ابھی اس سوراخ سے عرب نکلے گا اور داخل ہونے والے مزدور کے سر پر زور سے ڈنڈا مارے گا۔ وہ اس قوت سے ضرب لگائے گا کہ مزدور چوٹ کھا کر ہوا میں گھومتا ہوا دریا میں گر جائے گا۔ وہ اس پر بہت پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا۔ کچھ آوارہ لڑکے یہ تاویل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایسا پہلے ہو چکا ہے' لیکن انہیں یقین نہ آیا۔

ایک بار پھر پُل پر شور وغل اور گہما گہمی شروع ہو گئی۔ پانی کے پائپ لیے پتھر کے ستون اور کھائیاں کھودی گئیں۔ آگ جلا کر تارکول اور سیسہ پگھلایا جانے لگا۔ رسے بٹے جانے لگے۔ شہر کے باشندے بے یقینی کے ساتھ اپنی عادت کے مطابق یہ سب کھیل دیکھتے رہے۔

اسی موسم خزاں میں ریلوے کی تعمیر شروع ہو گئی۔ یہ بہت طویل اور اہم منصوبہ تھا۔ شروع میں اس کا پُل سے کوئی تعلق دکھائی نہ دیتا تھا' لیکن یہ ظاہری طور پر تھا۔ جوں ہی پُل کی مرمت کا کام ختم ہو گیا' پانی کی فراہمی کے منصوبے پر کام شروع ہو گیا۔ اس وقت قصبے میں لکڑی کے چشمے بنے ہوئے تھے جن میں دو جو میدان کے اوپر تھے' صاف پانی مہیا کرتے تھے۔ باقی سب دریا سے درینہ یا رضویہ کے ذریعے ملے ہوئے تھے۔ جب دریا کا پانی گدلا ہو جاتا تو ان کا پانی بھی بادل رنگ بن جاتا۔ موسم گرما میں دریا کی سطح گرنے سے چشمے خشک ہو جاتے۔ اب ماہرین نے دیکھا کہ یہ پانی صحت کے لیے مفید نہیں۔ نئے منصوبے میں پانی براہ راست درینہ کی دوسری طرف پہاڑوں سے لایا گیا' اس لیے پانی کے پائپوں کو پُل پر سے گزار کر قصبے تک لانا پڑا۔

چوتھے سال کے موسم گرما میں جھنڈیوں اور شاخوں سے سجی ہوئی پہلی ریل گاڑی قصبے سے گزری۔ یہ بڑا خوشی کا موقع تھا۔ مزدوروں کو پنیر کے ساتھ مفت کھانا کھلایا گیا۔ انجینئروں نے انجن کے گرد کھڑے ہو کر فوٹو کھنچوائے' سارا دن ٹرین پر مفت سفر کرایا گیا (ایک دن مفت اور باقی ساری صدی پیسے دے کر)۔ علی ہدئی ان لوگوں کا مذاق اڑاتا تھا' جنہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔

اب جبکہ ریلوے ٹرین چل پڑی تھی اور کام ختم ہو چکا تھا' تو پتا چلا کہ پُل کے ساتھ اس کا تعلق تھا اور قصبے کی زندگی پر اس کا کیا اثر پڑا۔ لائن میدان سے ہوتی ہوئی درینہ کی طرف جاتی۔ پہاڑی کے ایک طرف سے ہوتی ہوئی شہر کے گرد گھومتی ہوئی رضویہ کے کنارے بنے گھروں کے پاس سے گزرتی میدان کی طرف نکل جاتی' جہاں ریلوے اسٹیشن تھا۔ ہر قسم کی نقل و حمل مسافروں اور سامان سمیت سراجیوو اور سراجیوو سے پرے مغربی علاقوں کو ملاتی ہوئی درینہ کے دائیں کنارے سے گزرتی۔ بایاں کنارہ پُل سمیت اب بے رونق ہو گیا۔ صرف بائیں کنارے کی طرف آباد دیہاتوں سے آمدورفت پُل پر سے ہوتی۔ کسان گھوڑا گاڑیوں پر اپنا سامان لادے یا لکڑی سے بھرے ہوئے چھکڑے وہاں سے گزرتے اور اسٹیشن کی طرف جاتے۔ وہ سڑک جو پُل سے ہوتی ہوئی لائی جیکا سے سمیچے کی طرف جاتی اور وہاں سے گالینیک اور رومانیہ کی طرف جا کر سراجیوو پہنچ جاتی اور جو کسی زمانے میں چرواہوں اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سے گونجتی رہتی تھی' ویران ہو گئی۔ اس پر گھاس اور کائی اُگنے لگی جو آہستہ آہستہ کسی بلڈنگ یا سڑک کی ویرانی کا سبب بن جاتی ہے۔ سڑک پر سے اب مسافر نہ گزرتے۔ کپیا پر الوداع کہنے والے اکٹھے نہ ہوتے' اور گھڑسوار شراب کا گھونٹ پینے کے لیے اب پُل پر نہ ٹھہرتے۔

وہ اپنی پرانی جگہوں پر جا کر بیٹھ جاتے' لیکن شک اور بے یقینی کے ساتھ' سیٹی کی آواز پر یا کسی مبہم مشورہ پر وہ پھر دبک جاتے اور پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جاتے' انہیں پھر واپس دھکیل دیا جاتا اور صبر کی تلقین کی جاتی' کیونکہ جس قدر انہیں سمجھایا جاتا' ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ مشین کوئی ایسی تیز رفتار' عجیب و غریب اور پرفریب چیز نہیں جسے غیر ملکیوں نے ایجاد کیا اور جو پلک جھپکنے میں گزر جاتی ہے اور جس کا

صرف ایک ہی کام ہے کہ دیہاتیوں کو دھوکہ دے کر نکل جائے۔

لیکن یہ سب کچھ علی ہدئی کی بدمزاجی اور دیہاتیوں کی سادہ لوحی کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ لوگ ان کا مذاق اڑاتے اور ساتھ ہی ریلوے سے مانوس ہوتے گئے' جس طرح ہر نئی آسان اور فائدہ مند چیز سے ہوا جاتا ہے---وہ اب بھی پل کی طرف نکل جاتے۔ کپیا پر بیٹھ کر گپ بازی کرتے۔ روز مرہ کے کاموں کے سلسلے میں پل پر سے گزرتے۔ اب یہ معمولات وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے گئے۔ بہت جلد انہیں یہ احساس ہو گیا کہ پل پر سے گزرنے والی سڑک اب بیرونی دنیا کی طرف نہیں جاتی تھی اور پل اب وہ پل نہ تھا جو کچھ عرصہ پہلے تھا' مشرق و مغرب کے درمیان رابطہ' بلکہ بہت سوں نے اب اس کے بارے میں سوچنا ترک کر دیا تھا۔

لیکن پل بدستور پہلی جگہ پر قائم تھا' دائمی طور پر قائم و دائم۔ انسانی ہاتھ کا عظیم شاہکار جو وقت کی دستبرد سے محفوظ اور انقلاب زمانہ سے ناآشنا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ دنیا کی فانی اشیاء سے اس کی تقدیر مختلف تھی۔

لیکن پل پر جس کی شہر کے ساتھ وابستگی تھی۔ نیا دور بار آور ہو رہا تھا۔ 1908ء کا سال اپنے ساتھ بڑی بے چینیاں اور مبہم قسم کا خوف لے کر آیا جن کا بوجھ شہر والوں کے سینے سے کبھی نہ اترا۔ دراصل اس کی ابتداء موجودہ صدی کے اوائل میں ہو چکی تھی' جب ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی۔ قیمتوں میں اضافے اور ناقابل فہم انداز میں حکومت کے حصص اور ایکسچینج میں اتار چڑھاؤ کے ساتھ سیاست کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔

سراجیوو میں مذہبی اور قومی تنظیموں کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ سربین اور مسلمانوں نے فوراً وشے گراڈ میں اپنی سب کمیٹیاں بنائیں۔ سراجیوو میں نئے اخبارات نکلنے لگے جو شہر میں پہنچنے شروع ہو گئے۔ دارالمطالعہ اور مذہبی انجمنوں کی بنیاد رکھی جانے لگی۔ پہلے سربین' پھر مسلم اور بعد میں یہودی دی آتا اور پریگ کی یونیورسٹیوں سے طلباء رخصتوں میں گھر آتے' تو اپنے ساتھ نئی کتابیں' پمفلٹ اور زندگی کے نئے انداز لاتے۔ وہ نئی پود کو بتاتے کہ انہیں ہمیشہ اپنے منہ بند نہیں رکھنے پڑتے' نہ ہی اپنے بڑوں کی طرح خیالات اپنے آپ تک محدود رکھنے پڑتے ہیں۔ نئی نئی تنظیموں کے نام لوگوں کی زبانوں پر آنے لگے۔ قومی اور مذہبی انجمنیں وسیع بنیادوں اور مقاصد کے ساتھ اور آخر میں مزدور تنظیمیں منظر عام پر آنا شروع ہو گئیں۔ پھر پہلی بار "ہڑتال" کا لفظ شہر والوں نے سنا۔ زیر تربیت نوجوان سنجیدہ ہو گئے۔ شام کے وقت وہ چوک میں بیٹھ کر باتیں کرتے جو دوسروں کے لیے ناقابل فہم تھیں۔ وہ آپس میں کچھ پمفلٹ تقسیم کرتے جن کے عنوانات کچھ اس قسم کے ہوتے: "سوشلزم کیا ہے؟" "آٹھ گھنٹے مشقت' آٹھ گھنٹے آرام اور آٹھ گھنٹے ذاتی مقاصد کے لیے"۔ دنیا کے محنت کشوں کے مقاصد اور طریق کار"۔

اب خارجی واقعات کی بازگشت قصبے تک سنائی دینے لگی۔ سب سے پہلے سربیا میں شاہی خاندان کی تبدیلی اور پھر ترکی میں حکومت کا بدلنا' وہ قصبہ جو یمن سربین سرحد پر واقع تھا اور ترکی حدود سے زیادہ دور نہ تھا اور جو دونوں مملکتوں سے گہرے اور غیر مرئی رشتوں میں بندھا ہوا تھا' ان تبدیلیوں کو محسوس کرتا تھا۔ اگرچہ ہر محسوس کرنے اور سوچنے والی بات زبان پر نہیں لائی جاتی تھی۔

ریلوے کی بدولت سفر آسان ہو گیا اور سامان کی رسد و رسل جلدی اور آسان ہو گئی' لیکن اس کے ساتھ واقعات کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ شہر کے باشندوں کے لیے یہ تبدیلیاں غیر محسوس تھیں' کیونکہ ہر چیز بتدریج ہو رہی تھی اور وہ سب ان کا حصہ تھے۔ سنسنی خیز خبروں کے وہ عادی ہو چکے تھے۔ ایسی خبریں ان کی روز مرہ زندگی کا حصہ بن چکی تھیں۔ زندگی پوری رفتار سے جاری و ساری تھی۔ پہاڑی ندی کی طرح جو تیزی سے بہتی ہوئی ڈھلواں چٹانوں سے پھسلتی آبشار کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔

صرف چار سال پہلے جب پہلی ٹرین قصبے میں آئی' اکتوبر کی ایک صبح ایک سفید رنگ کا بڑا اشتہار چوک میں ترکی زبان میں کھدی ہوئی تختی کے نیچے چسپاں کیا گیا۔ یہ اشتہار میونسپلٹی کے ملازم ڈریگو نے چسپاں کیا۔

ظہر کے بعد علی ہدئی بھی اپنی دکان بند کرنے آ گیا۔ اس بار اعلان ترکی زبان میں نہیں تھا' اس لیے ہدئی اسے پڑھنے سے معذور تھا۔ ایک لڑکا بلند آواز میں اسکول کے سبق کی طرح پڑھ رہا تھا:

اعلان

بوسنیا اور ہرزی گووینا کے لوگوں کے نام

"مابدولت' فرانز جوزف' شہنشاہ آسٹریا' شاہ بوہیمیا و ہنگری بوسنیا اور ہرزی گووینا کے باشندوں سے مخاطب ہیں:

"ایک نسل گزری جب ہماری فوجوں نے تمہاری سرزمین کی سرحدیں عبور کیں"۔

علی بدیٰ کا دایاں کان اس کی پگڑی کے نیچے پھڑکنے لگا۔ اس نے یوں محسوس کیا کہ جیسے کرمان علی کے ساتھ اس کا جھگڑا ابھی کل کی بات ہے۔ اس وقت جو ہنگامہ ہوا' اس کے آنسوؤں میں آنکھوں کے ساتھ ریڈ کراس تیرنے لگا۔ آسٹرین سپاہی کیل اکھاڑ رہے تھے۔ نوجوان نے اعلان پڑھنا جاری رکھا:

"اس وقت تمہیں یقین دلایا گیا تھا کہ وہ تمہارے دشمن نہیں' بلکہ دوست بن کر آئے ہیں اور ان تمام برائیوں کو دور کریں گے جو مدت سے تمہاری محکومی کا باعث بنی ہوئی ہیں۔

"اس نازک وقت پر تم سے کیا گیا وعدہ موجود ہے۔ ہماری حکومت ہمیشہ اس کے لیے فکر مند رہی ہے اور امن و سکون برقرار رکھنے کی کوشش کرتی رہی ہے تاکہ تمہاری مادر وطن خوش حالی کی طرف ترقی کر سکے۔ ہم یہ کہنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور کھلے بندوں اعلان کرتے ہیں کہ اس وقت کے بوئے ہوئے بیج اچھا پھل لائے ہیں۔ تم لوگوں کو یہ بھی محسوس کرنا چاہیے کہ تشدد و ظلم کی جگہ امن و سکون نے لے لی ہے۔ زندگی کا کاروبار مسلسل ترقی کر رہا ہے۔ اس کے زیر اثر ثقافت کے مواقع بڑھ گئے ہیں۔ ایک منظم انتظامیہ کے زیر حفاظت ہر شخص کو اپنی محنت کا پھل مل رہا ہے۔

"ہم سب کا یہ مقدس فرض ہے کہ اس فریضے کو جاری رکھیں۔ اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان دونوں ممالک کے باشندوں کو اس بات کا ثبوت دیا جائے کہ ہم ان کی سیاسی پختگی پر کتنا ایمان رکھتے ہیں۔ بوسنیا اور ہرزی گووینا کو بلند تر سیاسی سطح پر لانے کے لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ انہیں آئینی تحفظ دیا جائے جو ان کے موجودہ حالات اور مشترکہ مفاد سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس طرح ان کی خواہشات اور مفادات کو ایک قانونی بنیاد مہیا کی جائے۔ مستقبل میں تمہارے وطن کے بارے میں اگر کوئی فیصلہ کیا جائے' تو تم لوگوں کی رائے کا خیال رکھا جائے اور تمہارے ملک کو پہلے کی طرح الگ انتظامیہ کے تحت رکھا جائے' لیکن اس قومی آئین کے نفاذ سے پہلے ضروری ہے کہ ان دونوں ممالک کی قانونی حیثیت کی وضاحت کر دی جائے۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر اور ان تعلقات کو مد نظر رکھتے ہوئے جو ہمارے عظیم پیش رووں جو ہنگری کے تخت کے وارث تھے اور ان علاقوں کے درمیان موجود تھے' ہم بوسنیا اور ہرزی گووینا کو اپنی حکومت اور سلطنت کا حصہ بناتے ہیں۔

"ہماری یہ خواہش ہے کہ ان ممالک کے رہنے والے ہمارے اس حق کی توثیق کریں' جو ہمارے خاندان کا جائز حق ہے۔ اس طرح دونوں ممالک کے باشندے ان فوائد کے حصہ دار بن جائیں گے جو ان تعلقات کی دائمی استواری کی ضمانت ہیں جن سے وہ ہمارے ساتھ وابستہ ہیں۔ نئی صورت حالات اس بات کی ضامن ہو گی کہ ثقافت اور خوش حالی تمہارے وطن میں ترقی کرتے رہیں گے۔

"بوسنیا اور ہرزی گووینا کے رہنے والو! وہ بے شمار تفکرات جو ہمارے تخت و تاج کو گھیرے ہوئے ہیں اور جن کا تعلق تمہاری مادی اور اخلاقی خوش حالی سے ہے' آخری نہیں ہوں گے۔ قانون کی نظر میں سب کا برابر کا عظیم تصور' ملکی قوانین اور انتظامیہ میں سب کی برابر شرکت' تمام مذاہب کی برابر حفاظت' زبان اور قومی ثقافت کا تحفظ' ان تمام فوائد سے تم لوگ پورا پورا استفادہ کرو گے۔ انفرادی آزادی اور معاشرے کی بہبود ہماری حکومت کے رہنما اصول ہوں گے"۔

آدھ کھلے منہ اور جھکے ہوئے سر کے ساتھ علی بدیٰ ان ناقابل فہم اور غیر معروف باتوں کو سنتا جا رہا تھا۔ وہ الفاظ جو نامانوس معلوم نہیں ہوتے تھے' اس وقت اس کی فہم سے بالاتر تھے۔

"اس طرح تیار کی گئی زمین میں کاشت شدہ بیج..... اس مقامی آئین کے نفاذ کے لیے ضروری شرائط .... ہماری حکومت کے رہنما اصول...."

ہاں! ایک بار پھر یہ شاہی الفاظ..... ان سب نے علی بدیٰ کی اندرونی آنکھ کے سامنے دور افتادہ' غیر معمولی اور وحشت ناک افق روشن کر دیے' مگر اسی لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے خوفناک دبیز پردے سے چھا جاتے۔ وہ متضاد تصورات میں کھو جاتا۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر' بغیر کسی نتیجے کے اس دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔ معجزات کسی وقت بھی رو پذیر ہو سکتے ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی چیز پر عمیق غور و فکر کے باوجود انسان اس کے فہم و ادراک سے عاجز رہتا ہے' لیکن جب ان تفصیلات کو یکجا کر کے دیکھتا ہے تو کلی طور پر اس کی گرفت میں حقیقت آ جاتی ہے۔ وہ بیج... وہ ستارہ... تخت و تاج کی پریشانیاں... اگرچہ ان کا اظہار ایک اجنبی زبان میں کیا گیا۔ اس کے باوجود بدیٰ ان سب باتوں کو خوب سمجھ گیا کہ ان کا کیا مقصد تھا اور کیا کہنا چاہتے تھے۔

پچھلے تیس برسوں سے یہ شہنشاہ عوام کو خطاب کرتے رہے ہیں۔ ان کے ایسے اعلانات کا ہر لفظ معانی سے بھرپور ہوتا تھا' کیونکہ ان ممالک کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا گیا۔ ایسے اعلانات کی بدولت لوگوں کی گردنیں کٹتی رہیں۔ اسی لیے وہ عوام کے سامنے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ان کے چہرے بے نقاب ہو جائیں اور حقائق منظر عام پر آ جائیں۔ علاقے اور صوبہ جات اور ان کے ساتھ ان کے باشندے چھوٹی ریزگاری کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں آتے رہے۔ ایک اچھے کردار اور شریف انسان کو دنیا کے کسی حصے میں سکون نہ مل سکا۔ اسے اتنا ہی مشکل سے میسر ہو سکا جس پر وہ زندہ رہ سکے' اس کی خواہشات اور ارادوں کے خلاف اس کی معاشی اور سماجی حالت بدلتی رہی۔

علی ہدئی ہمہ تن گوش تھا۔ اس نے ایسے الفاظ کا تیس سال پہلے جیسا ہی بوجھ محسوس کیا۔ وہی پیغام کہ ترکوں کا زمانہ لد گیا اور ترکی شمع گل ہو گئی' لیکن ان کا دہرانا ضروری تھا' کیونکہ وہ ان کو سمجھ نہ سکیں گے بلکہ خود فریبی سے کام لیں گے کہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

"....لہٰذا تم اپنے آپ کو اس اعتماد کا اہل ثابت کرو جو تم پر کیا گیا ہے تاکہ حاکم اور محکوم کے درمیان باہمی موافقت جو کسی مملکت کی ترقی کے لیے پیمانے کا کام کرتی ہے' ہماری مشترکہ کوششوں کے شامل حال رہے۔

مابدولت کی شاہی مہر کے ساتھ

بوداپسٹ سے جاری ہوا

فرانز جوزف!

چمڑے کی جیکٹ والا نوجوان رک گیا اور اس نے یکایک زور سے نعرہ لگایا: بادشاہ سلامت--- میونسپل کمیٹی کا ملازم' طویل قامت فرحت جواب میں چلایا: "زندہ باد"۔ دوسرے لوگ خاموشی سے منتشر ہو گئے۔ غروب آفتاب سے پہلے پہلے کسی نے اعلان کو پھاڑ کر دریائے درینہ میں پھینک دیا۔ اگلے دن کچھ سربین نوجوانوں کو شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا۔ اعلان کی ایک نئی نقل چسپاں کر دی گئی اور ایک سپاہی اس کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا گیا۔

اکتوبر کے اواخر تک فوج کی آمد شروع ہو گئی۔ نہ صرف ٹرین کے ذریعے بلکہ قدیم سڑک کے راستے بھی۔ تیس سال پہلے بھی اسی طرح سراجیوو سے فوج آئی تھی جو ہتھیاروں سے لیس پُل کے راستے شہر میں داخل ہوئی۔ گھڑسوار دستوں کے علاوہ ہر قسم کے فوجی دستے آرہے تھے۔

بارکوں میں جگہ نہ رہی تھی اور فوج کو خیموں میں رکھا گیا۔ تازہ دم فوجی دستے مسلسل آرہے تھے۔ وہ کچھ دن قصبے میں ٹھہرتے اور پھر سربیا کی سرحدوں پر واقع دیہاتوں کی طرف چلے جاتے۔ سپاہی زیادہ تر ریزرو فوج سے تعلق رکھتے تھے' جن کا تعلق مختلف قومیتوں سے تھا اور جن کے پاس کافی روپیہ پیسہ تھا۔ وہ ذاتی استعمال کی چھوٹی چھوٹی اشیاء خریدتے اور چھوٹی دکانوں سے پھل اور مٹھائی خرید کرتے۔ قیمتیں چڑھنے لگیں۔ سوکھی گھاس اور غلہ نایاب ہو گیا۔ شہر کے گرد قلعہ بندی کا کام شروع ہو گیا۔ پُل پر ایک نیا ہی کام شروع ہو گیا۔ پُل کے عین درمیان مزدوروں نے جو خصوصاً اسی کام کے لیے لائے گئے تھے' ایک ستون میں مربع سوراخ کرنا شروع کر دیا۔ اس جگہ کو خیمے کے اندر چھپا لیا گیا۔ جوں جوں سوراخ گہرا ہوتا جاتا ہتھوڑوں کی آوازیں نچلی طرف سے سنائی دیتیں۔ اس طرح کھودا گیا پتھر دیوار کے اوپر سے دریا میں پھینک دیا گیا' لیکن جتنا اس منصوبے کو خفیہ رکھا گیا' شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ ہنگامی حالات میں پُل کو اڑانے کے لیے اس میں بارودی سرنگیں بچھائی جا رہی ہیں۔ لمبی آہنی سیڑھیاں سوراخ میں ہوتی ہوئی تہ تک جاتی تھیں اور جب سب کام ختم ہو گیا' تو سوراخ کو ایک ڈھکنے سے بند کر دیا گیا۔ چند دنوں کی مدت میں ڈھکنا گرد و غبار سے ڈھک گیا۔ اوپر چھکڑے گزرنے لگے' گھوڑے دوڑنے لگے اور شہر کے رہنے والے اس سے بے خبر کہ نیچے بارودی سرنگ ہے' اپنے کاروبار کے سلسلے میں آتے جاتے رہے۔ صرف اسکول کے بچے اسکول جاتے وقت وہاں ٹھہر جاتے۔ ڈھکنے کو بجا کر دیکھتے کہ اس کے نیچے کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہانیاں گھڑ لیں کہ پُل کے نیچے ایک عرب رہتا ہے۔ وہ آپس میں بحث کرتے کہ دھماکہ چیز کیا ہوتی ہے اور وہ اتنی بڑی عمارت کو اڑا سکے گی؟

بڑی عمر کے لوگوں میں صرف علی ہدئی کو تجسس تھا۔ کام کے دوران وہ سبز رنگ کے خیمے کو مشکوک نظروں سے دیکھتا اور پھر آہنی ڈھکنے پر غور کرتا۔ وہ سرگوشیوں اور باتوں کو سنتا رہتا کہ ستونوں کے اندر ایک کنواں کھود کر اس میں بارود بھر دیا گیا ہے جس کو بجلی کی تار سے ملا کر دریا کے کنارے پہنچا دیا گیا تاکہ کمانڈر جب چاہے' رات یا دن کے وقت پُل کو اڑا دے۔ یوں جیسے وہ پتھر کا نہیں' بلکہ چینی کا بنا ہوا ہے۔

وہ ان سب باتوں کو سنتا' اپنا سر جھٹکتا' دن کے وقت

اپنے حجرے میں محبوس ہو کر سوچتا اور رات کے وقت سونے کے بجائے اس پر غور کرتا۔ ایسے احمقانہ اور کافرانہ خیالات کو کبھی قبول کرتا اور کبھی رد کر دیتا، لیکن وہ مسلسل ایک ذہنی کرب میں مبتلا تھا، یہاں تک کہ ایک رات خواب میں محمد پاشا کی وقف املاک کے متولی آئے اور اس سے باز پرس کی کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے اور پُل پر کیا ہنگامہ ہے۔ وہ بار بار اپنی پریشانیوں پر غور کرتا۔ اس بارے میں وہ کسی سے پوچھنا بھی نہیں چاہتا تھا، کیونکہ مدت ہوئی کوئی معقول آدمی ایسا نظر نہیں آتا جس سے کام کی بات کی جائے۔ چونکہ سب لوگ یا تو دیوانے ہو گئے ہیں یا اسی کی طرح ذہنی انتشار میں مبتلا تھے۔

اس کے باوجود اسے ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ کرنچے کے بیگ خاندان سے تعلق رکھنے والا محمد جو وی آنا میں فوجی ملازمت کر چکا تھا اور سارجنٹ میجر کے عہدے تک ترقی یافتہ تھا، اس سال رخصت پر گھر آیا۔ وہ محمد شمس بیگ کا پوتا تھا جس نے قبضے کے فوراً بعد اپنے آپ کو کرنچے میں محبوس کر لیا اور غم کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گیا۔ بوڑھے ترک ابھی تک اس کی غیرت اور حمیت کی مثالیں دیتے رہتے۔

محمد جب اس کی دکان پر آیا، خیریت دریافت کرنے کے بعد کافی کا ایک کپ پیا، تو علی ہدیٰ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے محمد سے اپنی ذہنی پریشانیوں کے بارے میں وضاحت چاہی۔ اس نے اپنے خدشات بیان کیے۔ پُل پر کیا گزری، لوگ اس بارے میں کیا کہتے ہیں اور کیا یہ ممکن ہے کہ رفاہ عامہ کے ایسے عظیم کام کو تباہ کر دیا جائے گا۔

"تمہاری گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کوئی چیز پس پردہ ہے، لیکن میری نصیحت پر عمل کرو اور ایسے سوالات نہ پوچھو، کیونکہ فوجی قانون کے تحت یہ باتیں سرکاری راز ہیں، وغیرہ وغیرہ"۔

"اس بارے میں کوئی راز نہیں رہ سکتا، جبکہ اسکول کے لڑکے بھی اس بارے میں باتیں کرتے ہیں"۔ علی ہدیٰ جھنجلا کر بولا۔ "جنگ کے ساتھ اس پُل کا کیا تعلق ہے؟"

سارجنٹ میجر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "اس کا بہت تعلق ہے"۔ اس نے ہدیٰ پر وضاحت کی، لیکن اختصار کے ساتھ جیسے کسی بچے کو سمجھا رہا ہو کہ یہ سب کچھ ملازمت کے ضوابط میں شامل ہے کہ یہ سب کچھ انجینئروں اور پُل بنانے والوں کی ڈیوٹی ہے اور یہ کہ شاہی فوج میں ہر کوئی اپنے کام سے سروکار رکھتا ہے اور دوسرے شعبہ جات میں دخل نہیں دیتا۔

علی ہدیٰ غور سے سنتا اور دیکھتا رہا، مگر زیادہ سمجھ نہ سکا، لیکن وہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا وہ یہ نہیں چاہتے کہ یہ ایک وزیر کی خواہش ہے، جو لوگوں کے فائدے کے لیے، اس کی اپنی روح کی بخشش اور خدا کی شان کو بالا کرنے کے لیے پوری کی گئی۔ اس جگہ سے ایک پتھر تک اکھیڑنا گناہ عظیم ہے۔

سارجنٹ میجر ہاتھ جھٹک کر رہ گیا۔ اس نے اپنے کندھے اچکے اور ہونٹ بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں، یہاں تک کہ اس کے چہرے سے مکاری اور عیاری ٹپکنے لگی۔ جذبات سے خالی، سپاٹ چہرہ جو ایسے لوگوں کی خصوصیت بن جاتی ہے جو فرسودہ اور زوال پذیر انتظامیہ کے ساتھ طویل عرصے تک منسلک رہے ہوں، جہاں دور اندیشی، بے حسی کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور فرمانبرداری بزدلی۔ ایک سادہ کاغذ ایسے چہرے کی نسبت زیادہ بامعنی ہوتا ہے۔ دوسرے لمحے اس کے اندر شاہ پرست نے انگڑائی لی، بازو نیچے لٹکائے اور اس کے چہرے پر اعتماد آ گیا اور وہ سنجیدہ ہو گیا جس میں وی آنا کا شگفتہ مزاج اور ترکی شائستگی آپس میں ملے ہوئے تھے۔ گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے اس نے ہدیٰ کی مزاج پرسی کی اور انہی دوستانہ جذبات کے ساتھ رخصت ہو گیا جن کے ساتھ وہ آیا تھا۔

علی ہدیٰ پہلے کی طرح پریشانی اور اضطراب کا شکار تھا۔ اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے دکان پر بیٹھے بیٹھے اس نے مارچ کے پہلے دن کی خوش گوار صبح کو دیکھا۔ اس کے سامنے ذراہٹ کر پُل اپنی ازلی حالت میں موجود تھا۔ اس کی محرابوں کے نیچے دریینہ کا سبزی مائل، چمکدار، بل کھاتا ہوا پانی نظر آ رہا تھا۔ یوں جیسے دور نگا تاج سورج کی روشنی میں چمک رہا ہو۔

وہ سیاسی کشیدگی جسے بیرونی دنیا نے الحاقی بحران کا نام دیا اور جس کے منحوس سائے پُل اور شہر کے رہنے والوں پر پڑتے رہے، تیزی سے دور ہو گیا۔ کہیں باہر طرفین کے درمیان ایک پر امن سمجھوتہ طے پایا۔ سرحدیں جو کہ باہمی کشیدگی کے لیے بڑی حساس تھیں، اب بالکل پر امن رہیں۔ بہار کے شروع میں جو فوجیں شہر میں اور سرحدی گاؤں میں بیٹھی ہوئی تھیں، واپس جانا شروع ہو گئیں لیکن ہمیشہ کی طرح، بحران کی لائی ہوئی تبدیلیاں موجود رہیں۔ شہر کے اندر فوج کی تعداد پہلے کی نسبت بہت زیادہ کر دی گئی۔ پُل پر بارودی سرنگیں بدستور موجود رہیں، سوائے علی ہدیٰ کے اور کسی نے کبھی پُل کے بارے میں نہ سوچا۔

پُل کی بائیں طرف پرانی فصیل کے اوپر زمین کے ٹکڑے پر جو پارک کے طور پر استعمال ہوتا تھا' فوجی حکام نے قبضہ کر لیا۔ پارک کے وسط میں پھل دار درختوں کو کاٹ کر ایک خوبصورت عمارت تعمیر کر دی گئی۔ یہ آفیسرز میس تھا' کیونکہ پہلی ایک منزلہ عمارت جو میس کے طور پر استعمال ہوتی تھی' افسروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے بہت چھوٹی تھی۔ اس طرح پُل کی دائیں طرف لوٹے کا ہوٹل اور بائیں طرف آفیسرز میس تھا۔ سفید رنگ کی دو ایک جیسی عمارتیں' ان کے وسط میں چوک جس کے چاروں طرف دکانیں تھیں اور چوک سے تھوڑی اوپر بارکوں کی قطار جسے لوگ ابھی تک محمد پاشا کی کارواں سرائے کی یاد میں ستون این کے نام سے یاد کرتے تھے' لیکن اب اس کا نام و نشان مٹ گیا تھا۔

چیزوں کی قیمتیں جو گزشتہ موسم خزاں میں سپاہیوں کی آمد کی وجہ سے آسمانوں چڑھ گئی تھیں' ویسے کی ویسے رہیں اور جن کے بڑھنے کا مزید امکان تھا۔ اس سال ایک سربین اور ایک مسلم بنک کھل گئے۔ لوگ منی آرڈروں کا استعمال دوائیوں کی طرح کرنے لگے۔ ہر کوئی بلا جھجک قرضہ اٹھانے لگا' لیکن آدمی جتنا پیسے والا ہوگا' اسی قدر اس کی ضروریات بڑھ جائیں گی۔ زندگی ان لوگوں کو آسان اور خوش گوار محسوس ہوتی تھی جو آمدنی سے زیادہ خرچ کرتے تھے لیکن تاجر اور کاروباری لوگ زیادہ پریشان تھے۔ ادائیگی کی شرائط ہمیشہ کی نسبت تھوڑی ہو گئیں۔ اچھے اور قابل اعتماد گاہک نایاب ہوتے جا رہے تھے۔ جن اشیاء کی قیمتیں لوگوں کی قوت خرید سے زیادہ تھیں' تعداد میں بڑھنے لگیں۔ کاروبار نچلی سطح پر آ گیا' کم قیمت اشیاء کی مانگ بڑھنے لگی۔ صرف نادہندگان آزادانہ خرید و فروخت کرتے۔ محفوظ اور باعتماد کام صرف فوجی ٹھیکے رہ گیا' لیکن وہ ہر کسی سے نہ ملتا تھا۔ حکومت کی طرف ٹیکس اور بلدیاتی واجبات کی تعداد بڑھ گئی۔ ٹیکس وصول کرنے والوں کا رویہ سخت ہو گیا۔ ایکسچینج کا اتار چڑھاؤ خود بخود نظر آنے لگا۔ اس سے آنے والا منافع نامعلوم ہاتھوں میں جانے لگا جبکہ نقصانات مملکت کے آخری کونے تک پہنچنے لگے جن سے متاثر ہونے والوں میں خوردہ فروش اور خوردہ خرید تھے۔

اسی طرح سال پر سال گزر گئے' چھوٹی بڑی' سنسنی خیز خبریں آتی رہیں۔ پھر 1912ء اور 1913ء میں جنگ ہائے بلقان اور سربین فتوحات کی خبریں آئیں۔ یہ خبریں جن کا تعلق پُل اور وہاں کے رہنے والوں کے ساتھ بہت زیادہ تھا' لوگوں نے غیر محسوس انداز میں خاموشی سے سنیں۔

شفق آلود صبحوں اور شاموں کے ساتھ' سنہری دوپہروں والے اکتوبر کے دن گزرتے رہے۔ لوگ مکئی کی فصل اور شراب کشید کرنے کے موسم کا انتظار کر رہے تھے۔ کپیا میں دوپہر کو بیٹھنا ابھی تک خوش گوار لگتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وقت دم لینے کے لیے قصبے میں ٹھہر گیا ہو' عین اس وقت یہ واقعات پیش آئے۔

پیشتر اس کے کہ پڑھے لکھے لوگ متضاد اخباری رپورٹوں سے کچھ معنی اخذ کرتے۔ ترکی اور بلقان ریاستوں کے درمیان جنگ چھڑ چکی تھی اور پرانے راستوں پر جاری تھی۔ پیشتر اس کے کہ لوگ اس جنگ کی اہمیت جان سکتے' جنگ سربیا اور عیسائیوں کی فتح کی صورت میں ختم ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ دشتے گراؤ سے دور رونپذیر ہوا۔ سرحدوں پر توپوں کی گھن گرج کشت و خون کے بغیر ختم ہو گئی۔ تجارتی اور معاشی واقعات کی طرح ہر واقعہ ناقابل یقین سرعت کے ساتھ رونپذیر ہو گیا۔ دنیا میں کہیں دور کسی نے پانسا پھینکا' جنگ ہوئی اور قصبے کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔

اوچے کے مقام پر جہاں آسٹریا' ہنگری اور ترکی کے درمیان دریائے اودچ سرحد کا کام کرتا ہے اور جہاں ایک لکڑی کا پُل' آسٹرین بارکوں کو ترکی کے کوارٹروں سے الگ کرتا تھا' ترک آفیسر اپنے دستے کے ساتھ آسٹرین سرحد کو پار کر کے دوسری طرف گیا۔ وہاں بڑے ڈرامائی انداز میں اس نے اپنی تلوار پُل کی فصیل پر رکھ کر توڑ دی اور آسٹروی فوجیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

اسی لمحے خاکی وردی میں ملبوس سربین پیدل فوج پہاڑی سے اتر آئی اور بوسنیا اور سنجاک کے درمیان ساری سرحد پر پرانی طرز کے عساکر کی جگہ تعینات کر دی گئی۔ آسٹریا' ترکی اور سربیا کے درمیان تکون غائب ہو گئی۔ ترکی سرحد جو ایک دن پہلے قصبے سے صرف نو میل پر تھی' 600 میل دور چلی گئی: ایڈریانوپل سے دور پرے۔

ایسی بہت سی تبدیلیوں اور انقلابات نے شہر کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

درینہ کے پُل کے لیے یہ تبدیلی بڑی فیصلہ کن تھی۔ سراجیوو کے ساتھ ریلوے کا رابطہ مغرب تک رہ گیا تھا اور اب ایک لمحے میں یہ رابطہ مشرق سے بھی کٹ گیا۔ دراصل مشرق جس نے یہ رابطہ قائم کیا تھا اور کچھ دیر پہلے موجود تھا' بری طرح درہم برہم ہو گیا تھا اور کسی چھلاوے کی طرح غائب

ہو گیا تھا۔ اب پُل شہر کے دو حصوں کے درمیان یا ارد گرد کے دیہاتوں کے درمیان رابطہ کا کام کر رہا تھا۔

لوگوں کے اندر جو جمود اور ٹھہراؤ سا تھا' پُل کی طرح ساکت و جامد' اب اچانک حرکت میں آ گیا اور ان کی روزمرہ زندگی پر اثر انداز ہوا' ان کی انفرادی زندگی اچانک حرکت میں آ گئی۔

1913ء کی گرما کے پہلے دن برسات کی وجہ سے بڑے اداس تھے۔ چوک میں دن کے وقت شہر کے مسلمان بیٹھے رہتے۔ اداس اور غمگین! قریباً ایک درجن بڑی عمر کے لوگ ایک نوجوان کے گرد بیٹھے اخبار سن رہے تھے۔ غیر ملکی ناموں اور جگہوں پر بحث کرتے۔ سب خاموشی سے تمباکو نوشی کرتے اور سامنے خلاؤں میں گھورتے رہتے' لیکن اپنے اندرونی کرب کو مکمل طور پر چھپا نہ سکتے۔ اپنے اندرونی جذبات کو چھپاتے ہوئے وہ سامنے نقشہ رکھے بلقان ریاستوں کی متوقع تقسیم کو دیکھتے' اپنے سامنے نقشہ رکھے' انہیں آڑی ترچھی قوسوں میں کچھ نظر نہ آتا' مگر وہ ہر چیز سمجھتے بوجھتے تھے' کیونکہ ان کا جغرافیہ ان کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔

طلباء اپنے ساتھ نئی طرز گفتار اور طرز مزاج لے کر آئے۔ وہ جدید رقص کرتے جو گزشتہ موسم سرما کا خصوصی رقص ہوتا۔ وہ سربین' چیک اور جرمن زبانوں میں نئے رسائل اور کتابیں لے کر آتے۔

آسٹرین قبضے کے شروع کے برسوں میں بھی بہت سے نوجوان تعلیم کی خاطر گئے تھے' مگر اتنی تعداد میں نہیں جاتے تھے اور نہ ہی ان میں اس قدر جوش و جذبہ نظر آتا تھا۔ اس وقت شروع کے برسوں میں بہت کم نوجوان سراجیوو میں ٹیچرز ٹریننگ کالج سے فارغ التحصیل ہوئے۔ دو یا تین نے وی آنا میں فلسفے کی تعلیم بھی حاصل کی' لیکن ایسے لوگ بہت کم تھے۔ متوسط طبقے کے نوجوان جو خاموشی سے امتحانات پاس کرتے' سرکاری ملازمتوں کے چکر میں پڑ جاتے' لیکن کچھ عرصہ سے قصبے سے تعلیم کی خاطر جانے والے نوجوانوں کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ گئی۔ قومی ثقافتی اداروں کی مدد سے کسانوں اور معمولی دستکاروں کے بیٹے یونیورسٹی میں داخلے کے لیے گئے۔ طلباء کے جوش عمل اور کردار میں بے پناہ انقلاب آ گیا۔

نوجوانوں کی یہ نئی پود منفرد کردار کی حامل تھی جو مختلف صوبوں اور شہروں سے تعلیم یافتہ تھے اور مختلف خیالات و افکار سے متاثر تھے۔ بڑے بڑے شہروں' یونیورسٹیوں اور درس گاہوں سے یہ نوجوان جرأت اور بے باکی کے نشے سے مخمور لوٹتے۔ وہ انسانی حقوق' آزادی اور انفرادی عزت و وقار جیسے خیالات سے لیس ہوتے۔ ہر سال موسم گرما کی رخصتوں کے دوران اپنے ساتھ سماجی اور مذہبی آزاد خیالی کے افکار و خیالات لے کر آتے۔ بلقان جنگوں میں سربیا کی فتح کے نتائج کے زیر اثر ایک پرجوش قومیت پرستی کے جذبات جو ایک عالمگیر حقیقت بن چکی تھی' یہ نوجوان ایثار و عمل کی تصویر بن چکے تھے۔

ایسے نوجوان چوک میں اکٹھے ہوتے اور رات کے کھانے کے بعد تک بیٹھے رہتے۔ رات کے اندھیرے یا تاروں بھری رات کے سائے تلے ان کے گیتوں' مزاحیہ فقروں' شور و غل اور بحث و مباحثے کی آوازیں گونجا کرتیں۔ ان مباحث میں جدت' سادگی' اخلاص اور ایثار ہوتا۔

تہذیب و ثقافت کے بارے میں ہر انسانی نسل اپنے خاص تصورات اور نظریات رکھتی ہے۔ کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کی ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں' جبکہ دوسرے اس کو مٹتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ دراصل مقام اور نقطۂ نظر کے مطابق تہذیبیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ موجودہ نسل جو تاروں کی چھاؤں میں کپیا پر بیٹھی فلسفہ اور سماجی اور سیاسی مسائل پر محو گفتگو نظر آتی ہے اپنے بھرپور تصورات کے سوا ہر لحاظ سے اپنی پیش رو نسل سے مختلف ہے۔ یہ ایک طرف تو نئی تہذیب کی شمعیں روشن کرتی ہے اور دوسری طرف پرانی تہذیب کی بجھتی ہوئی شمع کو بجھا رہی ہے۔

ان کے بارے میں خصوصی طور پر جو بات کہی جا سکتی تھی' یہ تھی کہ ان سے پہلے کوئی ایسی نسل نہ گزری تھی جس نے اتنی بے باکی اور جرأت کے ساتھ زندگی' مسرت اور آزادی کے بارے میں اظہار خیال کیا ہو اور جس کے حصے میں زندگی کی خوشیاں کم آئی ہوں۔ زیادہ پرمشقت زندگی گزاری ہو اور ان سے زیادہ قربانیاں دی ہوں' لیکن 1913ء کے موسم گرما کے اواخر میں ہر چیز غیر متعین اور غیر یقینی تھی۔ اس قدیم پُل پر ہر چیز ایک نیا مشغلہ معلوم ہوتی تھی۔ جولائی کی چاندنی راتوں میں پُل ہمیشہ کی طرح روشن' صاف اور پرشباب نظر آتا تھا' مضبوط' خوبصورت اور قائم و دائم۔

☆☆☆

اس رات پورے قصبے میں زندگی کی علامت ہوٹل کی

پہلی منزل کے کمرے کی کھڑکی تھی' جہاں لوٹے مقیم تھی۔ رات کافی گزر چکی تھی' مگر وہ اب بھی اس میز کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی جو اشیاء کی کثرت سے لدا پڑا تھا۔ اس کے لیے یہی سلسلہ ایک عرصہ سے جاری تھا۔

یہ سلسلہ تب سے جاری تھا' جب وہ آج سے بیس سال پہلے محض اس لیے آئی تھی کہ وہاں اسے لحہ بھر ہوٹل کے شور وغل سے سکون کا سانس حاصل ہو سکے۔ آج اس ماحول سے صرف یہ بات مختلف تھی کہ اب سیڑھیوں کے نیچے ہر طرف تاریکی اور خاموشی محیط تھی۔

وہ ہوٹل کے اس کمرے میں رات کے دس بجے شب باشی کے لیے داخل ہوئی تھی' تاہم سونے کے لیے بستر پر لیٹنے سے قبل وہ کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی تا کہ وہاں دریا کی تازگی سے لطف اندوز ہو سکے اور سونے سے قبل ایک بار اس محراب کو ایک نظر دیکھے جو ابد سے اسی طرح وہاں موجود تھی۔ یہ منظر آج بھی اس کی کھڑکی سے ہمیشہ کی طرح وہی تھا جس طرح اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اب اسے پرانے لین دین کا خیال آیا۔ وہ اس کا جائزہ لینے بیٹھ گئی۔ وہ حساب کتاب میں اس قدر کھو گئی کہ اس میں اسے پورے دو گھنٹے لگ گئے۔ مسلسل دو گھنٹے میز کے سامنے بیٹھی حساب کی پڑتال میں مصروف رہی۔

آدھی رات گزرے کافی دیر ہو چکی تھی۔ لوٹے ابھی تک بیدار تھی اور حساب کتاب میں مگن تھی۔ رقوم کی الٹ پلٹ جاری تھی اور ایک صفحے کے بعد دوسرا پلٹایا جا رہا تھا۔

لوٹے تھک چکی تھی۔ دن بھر تو وہ کام اور باتیں کرتی رہی تھی' مگر اب رات کو جب وہ تنہا بیٹھی تھی' تو اسے اپنے وجود پر بیت چکے برسوں کا بوجھ محسوس ہوا۔ اب وہ بوڑھی ہو چکی تھی۔ اس کا حسن و شباب ڈھل چکا تھا' صرف آثار باقی تھے' وہ دبلی پتلی ہو چکی تھی اور اس کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ اس کے بالوں کی چمک غائب ہو چکی تھی اور وہ اس کے سر پر بہت کم رہ گئے تھے۔ اس کے دانت جو کبھی موتیوں کی طرح چمکتے تھے اور لوہے کی طرح مضبوط تھے' اب پیلے پڑ چکے تھے اور ان کے درمیان کی دراڑیں نمایاں ہو گئی تھیں' مگر اس کی سیاہ چمکتی ہوئی آنکھیں ابھی تک جاندار دکھائی دیتی تھیں' خاص طور پر اداسی اور غم کی حالت میں۔

لوٹے تھک چکی تھی' مگر اس کا سبب وہ شیریں اور فرحت بخش تھکاوٹ نہ تھی جو بھاری محنت سے پیدا ہوتی ہے' مگر جس سے بے حد فوائد حاصل ہوتے ہیں جس کی تلاش میں وہ کبھی کبھار آرام و سکون کی خاطر اس کمرے میں بیٹھ جایا کرتی تھی' بڑھاپا شروع ہو چکا تھا اور اچھا وقت بھی رخصت ہو چکا تھا۔

اس پر جو کچھ بیت رہی تھی' اس کا اظہار وہ نہ تو الفاظ میں کر سکتی تھی اور نہ ہی اب کسی تاویل سے دل بہلا سکتی تھی' لیکن وہ ہر لحہ یہ محسوس کرتی تھی کہ وقت اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ لوٹے وہ عورت تھی جس نے صرف اپنی اور اپنے خاندان کی بھلائی کو پیش نظر رکھا تھا۔ تیس سال قبل وہ بوسنیا آئی تھی۔ اس نے وہاں کام کا آغاز کیا تھا۔ ہر طرف سکون کا دور دورہ تھا' زندگی اس کی خواہشات کے مطابق رواں دواں تھی۔ کام تھا اور خوش حال گھرانہ۔ ہر چیز اپنی مناسب جگہ پر تھی اور ہر چیز کے لیے جگہ موجود تھی اور ہر چیز پر ایک قانون' ایک ضابطہ محیط تھا۔ یہ ضابطہ بڑا مسلمہ بھی تھا' کڑا اور سخت بھی۔ اس وقت دنیا کا رنگ ڈھنگ اور ہی تھا' مگر اب ہر چیز بدل چکی تھی' درہم برہم ہو چکی تھی۔ افراد کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ نفع نقصان کا لافانی قانون جو ہمیشہ انسانی نقل و حرکت پر حاوی رہا ہے' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ بے جان ہو چکا تھا' کیونکہ بہت سے لوگ ایسے کاموں' تحریروں اور بحثوں میں مصروف تھے جن کا اسے کوئی مقصد اور مفہوم دکھائی نہ دیتا تھا اور جن کا انجام بدبختی کے سوا کہیں تمام نہ ہوتا تھا۔ زندگی لرزیدہ اور انتشار پذیر تھی۔ اسے ایسا معلوم دکھائی دیتا تھا جیسے نئی نسل زندگی کی نسبت زندگی پر اظہار رائے کو زیادہ اہم سمجھتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ سب کچھ پاگل پن تھا اور ناقابل تسلیم بھی' تاہم یہ ضرور تھا' اس لیے زندگی اپنی قدر کھو چکی تھی اور محض الفاظ میں ضائع ہو رہی تھی۔ لوٹے کو ہر لحہ اور ہر قدم یہی محسوس ہوتا تھا۔

اس کا کاروبار جو کبھی اس کی آنکھوں کے سامنے موسم بہار کی بھیڑوں کے غلہ کی طرح پھل پھول رہا تھا' اب یہودی قبرستان میں قبروں پر ایستادہ پتھروں کی طرح جامد اور مردہ ہو چکا تھا۔ گزشتہ دس سال سے ہوٹل کا کاروبار مدہم پڑ گیا تھا۔ قصبہ کے ارد گرد جو جنگلات کھڑے تھے' انہیں گرایا جا رہا تھا۔ جنگلات کاٹنے کا یہ سلسلہ روز بروز طول پکڑتا جا رہا تھا' اس کے ساتھ ہی ہوٹل کے گاہکوں کا طویل سلسلہ اور اس سے بھاری منافع سب رخصت ہو رہے تھے۔

لوٹے کے اپنے ذاتی جائزے بھی اس کے کاروبار کی طرح حوصلہ افزا نہ تھے۔ پہلے پہل جب اس نے ہوٹل کا کاروبار شروع کیا تھا' تو کافی پس انداز ہو جاتا تھا کہ وہ اسے

کسی اور کاروبار کے حصے میں صرف کر سکے۔ اس وقت یہ بات بھی یقینی تھی کہ جو روپیہ اس طرف صرف کیا گیا ہے' وہ صحیح صرف کیا گیا ہے۔ اس وقت تو صرف یہ دیکھنا مقصود تھا کہ اس طرف صرف کیے گئے روپے پر کتنا منافع حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت ابھی ابھی ہوٹل کا کام شروع ہوا تھا۔ ابھی تو لوٹے کے پاس زیادہ فالتو سرمایہ جمع نہ ہوا تھا' مگر جب اس نے دولت جمع کر لی' تو حصص کی فروخت کی منڈی میں صورت حال یکسر بدل چکی تھی۔ ایک تاریخی بحران نے آسٹریائی' ہنگری شہنشاہیت کو انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ لوٹے کے سٹاک اور حصص تیز آندھی میں گرد و غبار کی طرح اڑنے لگے تھے۔ جب وہ دی آنا مرکز میں حصص کی قیمتوں کا مطالعہ کرتی' تو وہ غصہ سے تقریباً رو پڑتی تھی۔ اس کے خریدے ہوئے حصص کی قدریں جس قدر نمایاں ہو چکی تھیں' اسے ہوٹل کے وہ سب منافع بھی جس کا کاروبار ابھی جوبن پر تھا' پورا نہ کر سکتے تھے۔ اس وقت اس پر شدید اعصابی بحران کا دورہ پڑا تھا جو تقریباً دو سال جاری رہا۔ وہ درد و اذیت سے نڈھال ہو جاتی تھی۔ وہ لوگوں سے یہ سمجھے بغیر کہ وہ کیا کہہ رہی ہے یا وہ کیا کہہ رہے ہیں' باتیں کرتی تھیں' وہ ان کے چہروں پر نگاہیں جمائے ہوتی تھی' مگر وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوتے تھے۔ اس کے ذہن پر اخبار مرکز کے کالموں کی وہ باریک تحریریں چھائی ہوئی تھیں' جن سے اسے خوش بختی یا بد نصیبی کا پیغام ملتا ہوتا تھا۔ اس کے بعد اس نے لاٹری ٹکٹ خریدنے شروع کر دیئے تھے اور جس ملک سے بھی لاٹری کا اعلان ہوتا تھا' وہ اس کے ٹکٹ ضرور خریدتی تھی۔ اس نے تو عظیم ہسپانوی کرسمس لاٹری کے ایک چوتھائی ٹکٹ خریدنے کی کامیابی حاصل کر لی تھی جس کا پہلا انعام ایک کروڑ پچاس لاکھ ہسپانوی سکوں پر مشتمل تھا۔ وہ ہر وقت خدا سے دست بدست رہتی تھی کہ کسی یزدانی معجزہ کی بدولت وہ پہلا انعام جیت جائے مگر اسے کبھی پہلا انعام حاصل نہ ہوا۔

سات سال قبل لوٹے کے برادر نسبتی فاہلر نے چند پنشن یافتہ امراء کے ساتھ مل کر قصبے میں ایک "ماڈرن ملک کوآپریٹو" کے نام سے کاروباری ادارہ قائم کیا تھا جس میں لوٹے نے تین چوتھائی سرمایہ فراہم کیا تھا۔ ان لوگوں کے عزائم بڑے پیمانے پر کاروبار چلانے کے تھے۔ توقع یہ کی گئی تھی کہ یہ ادارہ ابتدائی مراحل میں بھی اپنے بے شمار منافعوں سے اس قدر پرکشش صورت اختیار کرلے گا کہ سرمایہ بوسنیا کے کاروباری حلقوں اور بوسنیا کے باہر تک سے خود بخود کھنچا چلا آئے گا۔ یہ ادارہ ابھی اپنے ابتدائی مراحل پر ہی تھا کہ الحاق کا عمل جاری ہو گیا۔ اس سے تازہ سرمایہ فراہم ہونے کے سب مواقع ختم ہو گئے۔ سرحدی اضلاع اس قدر غیر محفوظ ہو گئے کہ اس میں پہلے سے لگایا گیا سرمایہ بھی بھاگنے لگا۔ دو سال کے عرصہ کے بعد یہ کوآپریٹو کا ادارہ دیوالیہ ہو گیا جس سے اس میں لگایا گیا پورے کا پورا سرمایہ تباہ ہو گیا۔ لوٹے سراجیوو بروری سالوتیج موڑا فیکٹری کے حصص کی طرح خسارہ بھرنے کے لیے اپنے بہترین اور محفوظ ترین حصے بیچنے پر مجبور ہو گئی۔

گھریلو مصائب اور بد نصیبیاں بھی اس کے متوازی اور ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ یہ درست ہے کہ فاہلر کی ایک بیٹی غیر متوقع طور پر جلد شادی کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی (جس کا جہیز لوٹے نے مہیا کیا تھا) مگر بڑی بیٹی پیچھے رہ گئی تھی۔ چھوٹی بہن کی پہلے شادی ہو جانے سے چڑ کر وہ وقت سے پہلے ہی تیز زبان اور چڑچڑی اور بوڑھی بن چکی تھی جسے گھر میں اور ہوٹل میں کام کرنا اتنا بڑا بوجھ محسوس ہوتا تھا جتنا بوجھ دراصل وہ نہ تھا۔ فاہلر جو کبھی ہنس مکھ و حاضر جواب تھا' اب وہ بھی غیر فیصلہ کن اور فکر مند ہو چکا تھا۔ اب وہ گھر میں اس گونگے مہمان کی حیثیت سے رہنے لگا تھا جس سے نہ تو کوئی ضرر پہنچتا ہے اور نہ کوئی فائدہ۔

اس کا ایک بھتیجا البرٹ جس پر لوٹے کو ناز تھا اور جو خاندان کی امید تھا' کالج اور یونیورسٹی سے نمایاں حیثیت کے ساتھ امتحانات پاس کر چکا تھا' مگر وہ نہ تو ڈپلوما حاصل کر سکا تھا اور نہ ہی امتیازی حیثیت سے پاس ہونے کا انعام' چونکہ وہ یہودی تھا۔ لوٹے کا خیال تھا کہ اور کچھ نہ سہی تو وہ وی آنا کا ممتاز قانون دان بن ہی جائے گا۔ چونکہ وہ یہودی ہونے کی وجہ سے اعلیٰ درجے کی سرکاری نوکری حاصل نہ کر سکتا تھا' مگر اس معاملے میں بھی لوٹے کو تکلیف دہ مایوسی کا شکار ہونا پڑا۔ یہ نوجوان ڈاکٹر اولاً صحافت کا پیشہ اختیار کر بیٹھا اور سوشلسٹ پارٹی کا رکن بن گیا۔ یہ وہ سوشلسٹ پارٹی تھی جو وی آنا کی 1960ء کی عام ہڑتال کرانے میں بدنام ہوئی تھی۔ لوٹے کو یہ خبر خود اپنی ہی آنکھوں سے وی آنا کے اخبارات میں پڑھنا پڑی تھی کہ وی آنا کو بیرونی تخریبی عناصر سے پاک کرنے کی مہم میں مشہور شرپسند ڈاکٹر البرٹ ایمفلیمو کو بیس برس کی سزا سنانے کے بعد ملک بدر کر دیا گیا تھا جس کا مطلب قصبہ کے لوگوں کی عام زبان میں یہ تھا کہ گویا وہ ڈاکو تھا۔ اس

کے کچھ ماہ بعد اسے اپنے پیارے البرٹ کا یہ خط موصول ہوا تھا کہ وہ بونبوس ہجرت کر گیا تھا۔

ان دنوں اسے اپنے کمرے میں بھی سکون محسوس نہ ہوتا تھا۔ خط کو اپنے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے وہ اپنے برادر نسبتی اور بہن کے پاس جاتی تھی جو جذبات میں ہوش وحواس کھو کر رو بھی نہ پاتی تھی جبکہ لوٹے غصہ میں خوب شوروغل برپا کرتی تھی۔

ڈوبراہ کی سمجھ سے باہر تھا کہ وہ لوٹے کے سوالات کا کیا جواب دے۔ وہ روئے جاتی تھی اور آنسو اس کے رخساروں سے زار و قطار رواں ہوتے تھے۔ اپنے سوالوں کا جواب لوٹے کے پاس بھی موجود نہ تھا۔ وہ تاسف سے ہاتھ ملتی تھی اور آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھتی تھی' مگر وہ ڈوبراہ کی طرح گھبرائی ہوئی رو نہیں رہی تھی' اس میں آگ بھری ہوئی تھی۔

"وہ سوشلسٹ ہو گیا ہے' کیا یہ کم نہیں کہ ہم یہودی ہیں' تاہم اسے یہ بھی بننا تھا۔ اے خدائے عظیم اور واحد! ہم نے کیا گناہ کیے ہیں جس کی تو ہمیں اس طرح سزا دے رہا ہے' ایک سوشلسٹ"۔

وہ البرٹ کے لیے اس طرح آہ و بکا کرتی تھی جیسے وہ مر چکا تھا اور پھر اس نے اس کا ذکر ترک کر دیا۔

تین سال بعد اس کی بھتیجی جو البرٹ کی بہن تھی' اس نے پسٹ میں شادی کر لی تھی۔ اس شادی نے تارنوو کے عظیم گھرانے ایمغلیمو کے لیے کئی اخلاقی الجھنیں کھڑی کر دی تھیں۔ ایمغلی مرکا یہ گھرانہ صرف بچوں کی بہتات میں فارغ البال تھا اور مذہبی روایات کا کٹر پابند تھا۔ اس شادی میں لوٹے نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ جس شخص سے لوٹے کی بھتیجی شادی کرنے والی تھی' وہ یوں تو بورز کا امیر سٹہ باز تھا' مگر تھا عیسائی اور اس نے شادی کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ لڑکی شادی سے پہلے عیسائی مذہب قبول کر لے۔ سب رشتہ دار اس کے خلاف تھے' مگر لوٹے ایسا نہ سوچتی تھی۔ اسے خاندان کی بھلائی مقصود تھی۔ وہ کہتی تھی کہ جس کشتی پر بہت سے افراد سوار ہوں' اسے ڈوبنے سے بچانے کے لیے کوئی چیز پرے پھینکنا بھی پڑتی ہے تاکہ باقی چیزیں بچائی جائیں۔ اس نے لڑکی کی حمایت کی اور اس کا فیصلہ سب کو قبول کرنا پڑا۔

لوٹے کا یہ خیال تھا کہ نئے رشتہ داروں کی مدد سے وہ اپنے مناسب عمر کے کسی نہ کسی بھتیجے یا بھتیجی کو پسٹ کی کاروباری دنیا سے متعارف کرانے میں کامیاب ہو جائے گی' مگر بدنصیبی نے وہاں بھی اس کا پیچھا کیا۔ وہ امیر سٹہ باز شادی کرنے کے پہلے سال کے اندر ہی وفات پا گیا۔ اس کی نوجوان بیوہ غم سے تقریباً پاگل ہو گئی' کئی مہینے گزر گئے' مگر اس کا زخم نہ بھرا۔ نوجوان بیوہ اب چار سال سے پسٹ میں مقیم تھی۔ وہ ابھی تک اپنے غیر قدرتی غم میں مبتلا تھی۔ اس کا غم کسی طرح بھی پاگل پن کے غیر مترادف نہ تھا۔ وہ امیرانہ ٹھاٹھ سے بھرپور گھر سیاہ پوش کر دیا گیا تھا۔ وہ ہر روز قبرستان جاتی تھی اور گھنٹوں قبر کے سرہانے بیٹھ کر اس روز کے منڈی کے بھاؤ ایک سرے سے آخری سرے تک پڑھ کر سناتی تھی۔ اسے جو کچھ بھی سمجھایا جاتا تھا اس کا وہ یہ جواب دیتی تھی کہ مرنے والا اس بات کو سب سے زیادہ پسند کرتا تھا اور یہی اس کے لیے شیریں ترین موسیقی کا درجہ رکھتا تھا۔

دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے ایک بجایا۔ لوٹے اپنے کولہوں پر ہاتھ رکھے ہوئے مشکل سے اٹھی۔ اس نے اپنے پاس رکھی ہوئی میز سے بڑی احتیاط کے ساتھ سبز روشنی کے لیمپ کو بجھایا اور بوڑھی عورت کے بھاری قدموں کی چاپ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے ہوئے جو وہ اس وقت اٹھایا کرتی تھی جب وہ صرف اپنے کمرے میں ہوتی تھی' سونے کے لیے بستر پر لیٹ گئی۔ سوئے ہوئے قصبے پر مکمل اور عالمگیر اندھیرا محیط تھا۔

اب یہ 1914ء ہے۔ درینہ ٹِل کی تاریخ کا آخری سال۔ یہ سال بھی اسی طرح وارد ہوا' جس طرح اس سے پہلے کے سال آتے رہے تھے۔ یہ سال حسب معمول سردیوں کے پاؤں کی خاموش آہٹ سے وارد ہوا تھا۔ پھر غیر معمولی واقعات کی گھن گرج سے جو بالکل تازہ بہ تازہ نو بہ نو واقعات تھے' سمندر کی لہروں کی طرح نت نئے واقعات جمع ہونے لگے۔ قصبے پر بہت سے سال گزر چکے تھے اور بہت سے سال اور گزر جائیں گے۔ سال جو بیت گئے اور سال جو بیتنے والے تھے۔ یہ ہر طرح اور ہر قسم کے برس تھے مگر 1914ء کا سال! جنہیں یہ برس دیکھنا نصیب ہوا انہوں نے دیکھا کہ یہ سال اپنی جداگانہ نوعیت کا سال تھا۔ انہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا ہے' وہ اسے بیان نہ کر سکیں گے۔ یہ انسانی نصیبوں کی داستان تھی جو نتائج سے لبریز تھی' مگر ابھی واقعات اور وقت کے پردے تلے ڈھکی پڑی تھی۔ یہی وہ واقعات تھے جنہیں بعد ازاں لکھا یا بیان کیا جاتا تھا۔ انہیں اپنی مجموعی لرزہ خیزیوں سمیت کیسے احاطہ تحریر میں لایا جا سکتا تھا یا ان کی وضاحت کی جا سکتی تھی۔ یہ

لرزہ خیزیاں اچانک ساری نوع انسان اور پوری ذی حیات دنیا کو متاثر کرنے والی تھیں۔ اسی پر اکتفا نہیں۔ ان سے تو بے جان اشیاء عمارتیں اور ضلعوں پر ضلع متاثر ہونے والے تھے۔ ان چکرا دینے والے واقعات کو کیسے بیان کیا جا سکتا تھا جو بے زبان جانوروں کے خوف و ہراس سے نکل کر ہلاکت خیز جذبات میں بدلنے والے تھے جو خونچکاں اور تباہی کے ادنیٰ احساسات سے اٹھ کر انسان کی عظیم اور پروقار قربانیوں کی صورت اختیار کرنے والے تھے۔

یہ وہ واقعات تھے جن میں انسان لمحہ بھر کے لیے اور ہی طرح کے ضوابط کے ساتھ عظیم دنیا میں جا پہنچتا ہے۔ یہ وہ واقعات ہیں جنہیں کبھی بیان نہیں کیا جا سکے گا' کیونکہ جن پر یہ واقعات گزرے یا جنہوں نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا' بولنے کی سکت کھو چکے ہیں اور جو مر گئے ہیں' وہ کوئی بات نہیں کر سکتے۔ یہ ایسی باتیں تھیں جو کہی نہیں جاتیں بلکہ بھلا دینے والی باتیں ہیں' چونکہ انہیں بھلا نہ دیا ہوتا تو انہیں بار بار کیسے دہرایا جاتا۔

اس موسم گرما کے 1914ء میں جب انسانی قسمتوں کے حکمرانوں نے انسانوں کو حق رائے دہندگی کے میدانوں سے پہلے سے تیار کردہ جبری بھرتی کے فوجی عہد میں دھکیل دیا۔ ویزگراڈ کا قصبہ اس مرض کی معمولی مگر منہ بولتی مثال پیش کر رہا تھا جس نے بہت جلد پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لینا تھا اور پھر اس نے ساری دنیا پر چھا جانا تھا۔ یہ وقت تھا کہ جب ایک عہد ختم ہو رہا تھا اور دوسرے کا آغاز ہو رہا تھا۔ جب ہر کوئی اس دور کی نسبت جو آ رہا تھا' اس عہد کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا جو ختم ہو رہا تھا۔ پھر اس خونچکانی اور بربریت کو حق بجانب ٹھہرانے کے لیے تاریخ کے رومانی خزانے سے مثالیں ادھار لی جا رہی تھیں۔ جو کچھ رونما ہوا تھا' اس میں ابھی نئے پن کا وقار اور کشش کے بظاہر نشان موجود تھے' مگر یہ اتنی ہولناک' اتنی مختصر اور اتنی ناقابل بیان کشش تھی جو بعد ازاں اس قدر مکمل طور پر غائب ہو گئی کہ وہ لوگ بھی جنہوں نے اس وقت بڑی شدت سے اسے محسوس کیا تھا' اس کی یادداشت دوبارہ بیدار نہ کر سکتے تھے۔

1914ء کا موسم گرما جنہیں دیکھنا نصیب ہوا' ان کے لیے ان کی یادداشت میں یہ حسین ترین موسم گرما تھا' چونکہ وہ ان کے شعور میں اس مصائب و آلام کے عظیم اور تاریک آسمان پر شعلے کی طرح چمکا تھا جو ابد تک جا پھیلا تھا۔

یہ موسم گرما دراصل بہت اچھی طرح شروع ہوا۔ یہ پہلے گزرے ہوئے موسم گرما سے بھی زیادہ اچھا تھا۔ شگوفے پھوٹ پڑے تھے اور گندم سے اچھی فصل پیدا ہونے کی امید تھی۔ دکھوں اور مصیبتوں میں گزارے ہوئے دس برسوں کے بعد لوگوں کو توقع تھی کہ انہیں کم از کم یہ مسرت آمیز اور پرسکون برس نصیب ہو گا اور یہ ایسا سال ثابت ہو گا جو گزشتہ برسوں میں گزری ہوئی مصیبتوں اور نامرادیوں کا مداوا ہو گا (انسان کی سب سے زیادہ خامی اور قابل افسوس کمزوری یہ ہے کہ وہ مستقبل کی مکمل طور پر پیش بینی کرنے کے ناقابل ہے)

☆☆☆

وڈزان پر سربیا والے باقاعدہ پکنک منا رہے تھے۔ اخروٹ کے درختوں تلے جہاں دریائے درینہ اور دریائے رزاؤ آپس میں آن ملتے تھے' اونچے سرسبز کناروں پر خیمے نصب تھے جن میں رنگارنگ مشروبات فروخت ہو رہے تھے اور ہلکی ہلکی آگ پر دنبے الٹے لٹکا کر بھونے جا رہے تھے۔ جو خاندان اپنے کھانے اپنے ساتھ لائے ہوئے تھے وہ درختوں کے سائے تلے آرام کر رہے تھے۔ تازہ شاخوں کے جھنڈ تلے آرکسٹرا دھنیں بجانے میں مصروف تھا۔ ناچ میں صرف بیکار اور نوجوان مصروف تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو علی الصبح گرجا کی عبادت سے فارغ ہو کر سیدھے ادھر چلے آئے تھے۔ اصل میلہ تو بعد از دوپہر شروع ہوا۔ کولو ناچ ناچا جا رہا تھا۔ یہ بڑا خوش گوار اور پرجذبات ناچ تھا۔ یہ اس وقت سے زیادہ پرجوش تھا جب اور لوگ آ جائیں گے اور شادی شدہ عورتیں' غیر مطمئن بیوائیں اور بچے سب اس میں آشامل ہوں گے۔ جب ہر چیز ایک طویل اور خوش کن' مگر بے ترتیب و بے ربط پھولوں کا ہار بن جائے گی۔

اس لمحہ جب تفریح کا ابھی آغاز ہوا تھا' اچانک چراگاہ پر سپاہی نمودار ہوئے۔ ان کی وردیاں اور ہتھیار دوپہر کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ان کی گنتی اس تعداد سے زیادہ تھی جو عام طور پر میلوں کی نگرانی پر متعین ہوتی تھی۔ وہ سیدھے اس مقام پر پہنچے جہاں موسیقار موسیقی بجا رہے تھے۔ یکے بعد دیگرے بے ڈھنگے طور پر موسیقی تھم گئی۔ کولو ناچ میں گڑبڑ مچ گئی' ناچ رک گیا۔ جوانوں کی پر احتجاج چیخیں بلند ہوئیں۔ ناچنے والے ہاتھوں میں ہاتھ لیے کھڑے تھے۔ کچھ موسیقی کی دھن تال میں اس قدر کھو چکے تھے کہ وہ اس انتظار میں بدستور ناچتے رہے کہ ابھی پھر موسیقی شروع ہو گی' مگر پیانو اور باجے بجانے والے جلدی سے اٹھے اور

تیزی سے پیانو اور باجے سنبھالنے لگے۔ سپاہی اور آگے بڑھے۔ وہ ان خیموں اور اہل خانہ تک جا پہنچے جو گھاس پر استراحت فرما رہے تھے۔ اس جگہ سارجنٹ نے دھیمی کرخت آواز میں اپنی بات کہی اور جادو کی طرح موسیقی تھم گئی، ناچ ختم ہو گیا اور باتیں بند ہو گئیں۔ وہ جسے بھی ملا وہ اس جگہ سے جہاں وہ اس وقت تھا، رخصت ہو گیا۔ وہ سب کچھ بھول گیا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ اس نے اپنا سارا سامان اور چیزیں لپیٹیں اور چل پڑا۔ جو سب سے آخر میں رخصت ہوئے وہ کولو ناچ ناچنے والے مرد اور عورتیں تھیں۔ وہ ناچ نہ چھوڑنا چاہتے تھے۔ یہ بات ان کے سر میں نہ سما سکی کہ ناچ و خوشی اور تفریح کا آخری وقت آ پہنچا تھا، مگر جب انہوں نے سارجنٹ کے سفید چہرے پر نظر ڈالی اور اس کی آنکھوں میں خون اترا دیکھا تو جگردار سے جگردار افراد بھی رخصت ہو گئے۔

لوگ میزلین سے پریشان اور مایوس بڑی کھلی سڑک کے راستے لوٹ پڑے۔ جوں جوں وہ قصبے کے اندر پہنچتے رہے، سراجیوو کے قتل کے بارے میں مبہم اور خوف زدہ کرنے والی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ اس صبح سراجیوو کو قتل کر دیا گیا تھا اور آرچ ڈیوک فرڈی ننڈ فرانز اور اس کی بیوی موت کے گھاٹ اتر چکے تھے اور اہل سرب کی اذیت رسانی شروع ہو چکی تھی۔ بلدیہ کے دفاتر کے سامنے انہی افراد کا سامنا ہوا جنہیں گرفتار کیا جا چکا تھا۔ ان میں جواں سال پادری میتھالوجی بھی تھا جسے جیل پہنچا دیا گیا تھا۔

اس طرح موسم گرما کا دوسرا دن، جسے تہوار کا دن ہونا چاہیے تھا، پریشان، تلخ اور خوفزدہ کرنے والی توقعات کا روپ دھار چکا تھا۔

کپیا پر کام سے فارغ مردوں کی خوش و خرمی اور چہل پہل کی فضا کے بجائے موت کا گہرا سکوت طاری تھا، وہاں پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ نئی وردی میں ملبوس ایک فوجی گشت پر مامور تھا۔ وہ پل کے پتھروں سے بنے ہوئے پایہ سے لے کر لوہے کے مین ہول تک آ جا رہا تھا۔ وہ ان پانچ چھ قدموں کی جگہ پر مسلسل آ جا رہا تھا اور اس کے ہر بار گھومنے پر اس کی بندوق دھوپ میں سگنل کی طرح چمکتی تھی۔ دوسرے روز ترکی زبان میں دیوار پر ایک سرکاری نوٹس چسپاں دکھائی دیا۔ یہ بڑے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ایک موٹے سیاہ حاشیہ نے اسے گھیر رکھا تھا۔ اس میں سراجیوو میں ولی عہد شہزادہ کے قتل کیے جانے کا اعلان دیا گیا تھا اور اس کج حرکت پر ناراضی کا اظہار کیا گیا تھا۔ وہاں سے گزرنے والا کوئی بھی اسے پڑھنے کے لیے کھڑا نہ ہوتا تھا، بلکہ سر جھکائے پہرہ پر لگے ہوئے سپاہی کے پاس سے ممکن جلدی کے ساتھ وہاں سے گزر جاتا تھا۔

اس کے بعد سے پل پر گارڈ موجود رہی۔ قصبہ کی مساوی زندگی میزلین پر کولو ناچ اور جولائی کے اس دن کی طرح جسے تہوار کی خوشیوں کا دن ہوتا تھا، اچانک درہم برہم ہو گئی۔

آنے والے دن بہت عجیب و غریب تھے۔ یہ دن اخبارات کے مطالعہ، خوف و ہراس، سرگوشیوں، مزاحمت اور سربوں اور مشتبہ مسافروں کی گرفتاریوں اور فوجی بھرتیوں اور کارروائیوں کے دن تھے۔ گرما کی راتیں گیتوں کے بغیر اور کپیا پر جوانوں کی ملاقاتوں کے بغیر اور تاریکی میں چھپ کر جوڑوں کی سرگوشیوں کے بغیر گزر گئیں، قصبہ میں زیادہ فوج گشت کرتی دکھائی دیتی تھی۔ رات کو نو بجے جب پیکاوک چھاؤنی اور دریا کی عظیم بارکوں کے بگلر اپنی آخری ڈیوٹی کا بگل بجاتے تھے، شہر کی گلیاں بالکل سنسان پڑی ہوتی تھیں۔ یہ محبت کرنے والے نوجوانوں کے لیے برا وقت تھا۔

صرف اس وقت سربوں کی حقیقی اذیت رسانی کا دور شروع ہوا۔ لوگ دو حصوں میں بٹ گئے۔ اذیت رسانی کرنے والوں اور اذیت کا شکار بننے والوں میں۔ وہ وحشی جانور جو انسان کے اندر چھپا ہوتا ہے اور اس وقت تک باہر نہیں نکلتا، جب قانون اور رسم و رواج کی پابندیاں ختم نہیں ہو جاتیں، اب آزاد کر دیا گیا تھا، سگنل دے دیا گیا تھا، رکاوٹیں ہٹا دی گئی تھیں۔ انسانی تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے نام پر قتل و غارت گری اور تشدد و لوٹ مار کی کارروائیوں کے لیے چپ چاپ اجازت ہو جاتی ہے۔ دنیا کے مسلمہ قاعدے یہی تھے کہ کسی ایک خاص قسم اور عقیدہ کے مالک محدود لوگوں کے خلاف ظلم کے دروازے کھلتے رہے ہیں۔ وہ وقت جس انسان کو دیکھنا نصیب ہوا، اگر اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں تو وہ معجزہ رونما ہوتا اور اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا کہ کس طرح پورے کا پورا سماج یوم واحد میں سر سے پاؤں تک بدل کر رہ جاتا ہے۔ چند لمحوں میں کاروباری مرکز جو صدیوں کی روایات کی بنیادوں پر قائم تھا، مکمل طور پر مٹا کر رکھ دیا گیا تھا۔

یہ درست ہے کہ اس سے پہلے بھی چھپے ہوئے حسد، مذہبی رقابتیں اور دشمنیاں موجود تھیں، مگر اس وقت

جرأت مندی اور باہمی احترام اور نظم و ضبط کے لیے جذبات بھی موجود تھے' جو انسان کے ان حیوانی جذبات کو قابو کرنے کا کام کرتے تھے' آخر کار انہیں ٹھنڈا کر دیتے تھے اور انہیں مشترکہ زندگی کے تابع رکھتے تھے۔ وہ انسان جو تجارتی مرکز میں گزشتہ سال سے برگزیدہ حیثیت کے مالک تھے' ایک ہی رات میں ختم کر کے رکھ دیئے گئے جیسے وہ سب اچانک مر گئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی وہ عادات' ادارے اور رسم و رواج جن کے وہ مالک تھے' فنا کر کے رکھ دیئے گئے۔

سربیا پر اعلان جنگ کے بعد سوز کارلیس کا ایک فوجی دستہ شہر کا گشت کرنے لگا تھا۔ یہ فوجی دستہ جسے بڑی جلدی میں سربیوں کو گھیر لینے کے لیے منظم اور ہتھیار بند کیا گیا تھا' خانہ بدوشوں پر مشتمل تھا۔ یہ سب لوگ شرابی اور بری شہرت کے افراد تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو عرصہ تک سوسائٹی اور قانون کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ایک ہو سو کو سار نامی خانہ بدوش جو بدنام شخص تھا اور کوئی کام کاج نہ کرتا تھا اور جو جوانی میں ایک شرمناک بیماری کا شکار ہو کر اپنے ناک سے محروم ہو چکا تھا' اس دستہ کی سربراہی پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ دستہ پرانی وضع کی ان رائفلوں سے مسلح کیا گیا تھا جن کے لمبے لمبے کندے تھے۔ یہ ہر وقت مارکیٹ میں منڈلاتا رہتا تھا۔

تجارتی مرکز بے مقصد نقل و حرکت اور خفیہ مشوروں سے بھرا ہوا تھا۔ علی ہدیٰ کی دکان میں اہم ترک فروکش تھے۔ ان میں نیل بیگ' ترکیویک' عثمان گا' سابانو یک اور سلجاگا شامل تھے' وہ پیلے پڑ گئے تھے اور پریشان تھے۔ ان کے چہروں کی اسی طرح ہوائیاں اڑ رہی تھیں جو ہمیشہ ان چہروں سے اڑی ہوتی ہیں' جو یہ جانتے ہیں کہ جب غیر معمولی اور اہم تبدیلیاں متوقع ہوں' تو انہیں ضرور کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔

پُل اور ہدیٰ کی دکان کے درمیان کا چوک گھوڑا گاڑیوں' گھوڑوں ہر قسم کے فوجی سپاہیوں اور ان ریزرو فوجیوں کے ہجوم سے اٹا پڑا تھا جو ڈیوٹی پر حاضر ہونے آئے تھے' کبھی کبھی فوجی سپاہی سربوں کے ان جتھوں کو لیے وہاں سے گزرتے تھے جنہیں انہوں نے گرفتار کر رکھا ہوتا تھا۔ فضا گرد و غبار سے آلودہ تھی۔ ہر کوئی شور و غل مچاتا اس تیزی سے جس کی ضرورت نہ تھی' وہاں سے گزر رہا ہوتا تھا۔ چہرے گرد آلود اور پسینوں سے بھرے ہوتے تھے۔ بددعائیں ہر زبان پر صاف سنائی دیتی تھیں۔ آنکھیں شراب کے نشہ میں چمکتی اور بے نیند راتوں اور پریشان کن تشویش سے بھری معلوم ہوتی تھیں جو خطرات اور خونخوار واقعات میں موجود ہوتی ہے۔

چوک کے وسط میں ہنگری کے فوجی سپاہی بالکل نئی وردیوں میں ملبوس کچھ بیم کاٹ رہے تھے۔ ہتھوڑوں کی صدائیں بلند تھیں اور آرے کاٹنے میں مصروف تھے۔ ان کے گرد بچوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہدیٰ اپنی دکان سے یہ دیکھ رہا تھا کہ دو بیم سیدھا کیے رکھے گئے تھے۔ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک ہنگری کا سپاہی ان پر جا چڑھا اور اس نے دو بیموں پر تیسرے بیم کو اُفقی طور پر رکھ دیا۔ وہاں لوگوں کا اس قدر جمگھٹا ہو گیا تھا جیسے حلوہ تقسیم ہو رہا ہو۔ ان میں زیادہ فوجی سپاہی تھے' تاہم کچھ ترک باشندے بھی تھے اور کچھ قصبہ کے خانہ بدوش آوارہ لوگ تھے۔ جب سب کچھ تیار ہو چکا' ہجوم کاٹ کر ایک راستہ بنایا گیا' دو کرسیاں منگوائی گئیں۔ ایک آفیسر کے لیے تھی اور دوسری اس کے کلرک کے لیے۔ پھر انتظامیہ دو کسانوں اور ایک قصباتی آدمی کو سامنے لائی۔ کسان دیہاتی غلام تھے جو سرحدی گاؤں یوزڈرلک اور کمنٹیا سے پکڑ کر لائے گئے تھے اور شہری کولیکا سے لایا گیا تھا۔ وہ وہاں عرصہ ہوا ایک ٹھیکیدار کی حیثیت سے مقیم تھا اور وہیں اس نے شادی کر لی تھی۔ یہ تینوں بندھے ہوئے تھے۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور خاک آلود تھے۔ ایک ڈھولچی پاس کھڑا تھا۔ وہ اس بات کا منتظر تھا کہ حکم ملنے پر وہ ڈھول کی آواز بلند کرے جو گرجتے بادلوں کی گرج کی طرح سنائی دیتی تھی۔ پھانسی کے گرد ہجوم پر خاموشی چھا گئی۔ آفیسر نے جو ہنگری کی ریزرو فوج سے تعلق رکھتا تھا اور لیفٹیننٹ تھا' جرمن زبان میں موت کی سزا کا فیصلہ کھردری آواز میں سنایا۔ پھر سارجنٹ نے اس کا ترجمہ کیا۔ سمری فوجی عدالت نے ان تینوں کو موت کی سزا کا حکم سنایا تھا۔ گوانہوں نے حلف اٹھا کر اس بات کی شہادت دی تھی کہ انہوں نے ان کو سربی سرحد کی طرف روشنی سے پیغامات رسانی کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ پھانسی پُل کے سامنے والے چوک میں سرعام دی جاتی تھی۔ کسان خاموش تھے۔ حیرت میں گم کہ یہ کیا ہو رہا تھا۔ واجو لیکا کا رہنے والا تھا۔ اس نے اپنا پسینہ پونچھا اور صاف آواز میں چلایا:

"میں بے گناہ ہوں"۔ اس نے اپنی غصیلی آنکھوں سے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا جیسے وہ کسی خاص فرد کی تلاش کر رہا ہو جسے اس نے یہ سنانا تھا۔

عین اس لمحہ جب سزا پر عمل کیا جانے والا تھا' تماشہ دیکھنے والے ہجوم سے ایک فوجی باہر نکلا۔ اس کا چھوٹا سا قد

تھا' رنگ سرخ تھا اور اس کی ٹانگیں اندر کو مڑی ہوئی تھیں۔ وہ کسی وقت لوٹنے کے ہوٹل میں ملازم رہا تھا اور اب زیریں تجارتی مرکز میں کافی ہاؤس کا مالک تھا۔ وہ باقاعدہ وردی میں ملبوس تھا جس پر کارپورل کے فیتے جڑے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے سے جوش نمایاں تھا اور اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ چمک رہی تھیں۔ اس نے چلانا شروع کیا۔ سارجنٹ نے اسے باہر دھکیل دینا چاہا' مگر توندوالا کافی ہاؤس کا یہ مالک اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

"میں یہاں پندرہ سال سے محکمہ سراغ رسانی میں کام کر رہا ہوں"۔ وہ تیشلی لڑکھڑاتی آواز میں جرمن زبان میں چلایا۔ "مجھے اعلیٰ ترین فوجی حلقوں کا اعتماد حاصل ہے۔ گزشتہ سے پیوستہ سال وی آنا میں مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ میں دوسرے باشندوں کو اپنے ہاتھوں سے پھانسی دے سکوں گا۔ تمہیں معلوم نہیں' تمہارا واسطہ کس شخص سے ہے۔ یہ میرا حق ہے....اور اب تم...."

بھیڑ میں چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں ہونے لگیں۔ سارجنٹ حیران اور پریشان کھڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ گستاؤ اور جوشیلا ہو گیا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ وہ دو آدمی اس کی تحویل میں دے دیئے جائیں تا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے انہیں پھانسی چڑھائے۔ اس لمحے ایک دبلا پتلا سیاہ رو لیفٹیننٹ کسی شریف انسان کے انداز سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے چہرے پر خون کی کوئی جھلک دکھائی نہ دیتی تھی اور ایسی مایوسی پھیلی ہوئی تھی جیسے وہ خود بھی ان افراد میں شامل تھا' جنہیں پھانسی دی جانے والی تھی۔ گستاؤ اگرچہ خوب پیے ہوئے تھا' مگر اسے دیکھ کر اٹینشن ہو گیا۔ آفیسر اس کے قریب آیا اور اپنا سر اس کے اتنے قریب لے گیا کہ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے وہ اس کے منہ پر تھوکنے والا ہو۔

"اگر تم فی الفور یہاں سے دفع نہ ہوئے تو میں حکم دوں گا کہ تمہیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جائے۔ کچھ سمجھ بں آیا' دفع ہو جاؤ' دوڑو"۔

لیفٹیننٹ نے جرمن میں بات کی تھی' اس کا لہجہ ہنگری کے لوگوں جیسا تھا' مگر باتیں اتنی جچی تلی اور وزن دار تھیں کہ شراب میں مست کافی اونر نے بھی اسے خوب سمجھ لیا روہ ہجوم میں غائب ہو گیا۔

یہ سب کچھ ہو چکا تو ہجوم کی توجہ پھر سزا پانے والے زراد کی طرف منعطف ہوئی۔ دونوں کسان جو بال بچوں کے پ تھے' دونوں کا طرز عمل یکساں تھا۔ وہ بھیڑ اور سورج کی حرارت سے تپ رہے تھے جیسے انہیں اذیت پہنچانے والی صرف یہی بات تھی' مگر واجو نے کمزور لڑکھڑاتی آواز میں اپنی بے گناہی کے دعوے کو پھر دہرایا۔ اس نے کہا کہ اس کے حاسد نے اسے اس الزام میں پھنسایا ہے' اس نے کبھی فوج میں کام نہیں کیا اور زندگی بھر اسے اس بات کا علم ہے کہ روشنی سے سگنل دیئے جا سکتے ہیں۔ وہ تھوڑی بہت جرمنی بولنا جانتا تھا اور مایوسی کے عالم میں ایک لفظ سے دوسرا لفظ ملا کر بول رہا تھا۔ وہ اس کوشش میں مصروف تھا کہ اپنے قائل کر دینے والے اظہار بیان سے اس پاگل طوفان کو روک دے جو اسے گزشتہ روز اپنی لپیٹ میں بہا لایا تھا اور جو اسے روئے زمین سے مٹا دینے والا تھا' اگرچہ وہ بے گناہ تھا۔

"لیفٹیننٹ! خدا کی قسم میں بے گناہ ہوں' میرے بہت سارے بچے ہیں.... بے گناہ .... جھوٹا بیان .... سب جھوٹ"۔

واجو ڈھونڈ ڈھونڈ کر الفاظ نکال رہا تھا جیسے وہ ایسے الفاظ تلاش کر رہا ہو جو صحیح ہوں اور اس کی نجات کا سبب بن سکیں۔

سپاہی پہلے کسان کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اس نے جلدی میں اپنے سر پر سے ٹوپی اتاری۔ اس کا رخ میجادان کی طرف تھا جہاں خدا کا گھر گرجا تھا۔ اس نے تیزی سے سینہ پر دوبار صلیب بنائی۔ آفیسر نے اشارہ کیا کہ پہلے واجو کو ختم کرو۔ پھر لیکا کے اس انسان نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اب اس کی باری ہے' آسمان کی طرف التجا بھرے انداز میں ہاتھ اٹھائے اور چلایا: "بے گناہ...." مگر سپاہی اسے ٹانگوں اور کمر سے پکڑ کر پھانسی کے پھندے کے پاس گھسیٹ لائے۔

بھیڑ سانس روکے ہوئے یہ سب دیکھ رہی تھی جیسے یہ کوئی بدنصیب ٹھیکیدار اور لیفٹیننٹ کے درمیان کھیلا جانے والا کوئی کھیل تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے ان کے دل سینے سے باہر آ رہے تھے کہ کون ہارے گا اور کون جیتے گا۔

ہدئی نے ابھی باتوں کا شور ہی سنا تھا' اسے معلوم نہ تھا کہ ان تماشائیوں کے گھیرے میں کیا رونما ہو رہا ہے' مگر جب اس نے لوگوں کے سروں کے اوپر سے واجو کا خوفزدہ چہرہ دیکھا تو باوجود اس بات کے کہ ملٹری حکام نے دکانیں کھلی رکھنے کا حکم جاری کر رکھا تھا' وہ فوراً اپنی دکان بند کرنے کو لپکا۔

شہر میں تازہ دم فوج وارد ہونے لگی تھی اور ان کے جلو میں بارود' اسلحہ' سازوسامان نہ صرف سراجیوو کی پرانی

ریلوے لائن کے ذریعہ برآمد ہونے لگا تھا' بلکہ روگیٹیکا سے آنے والی پرانی چھکڑوں کی سڑک پر بھی آمدورفت جاری تھی۔ رات اور دن گھوڑے اور چھکڑے پُل کو عبور کر رہے تھے۔ پُل پر سے گزرتے ہوئے جو چیز انہیں سب سے پہلے نظر آتی تھی' وہ پھانسی پر لٹکے ہوئے تین آدمیوں کی لاشیں تھیں۔ چونکہ کارواں میں آگے جانے والوں کو شہر کی بہت زیادہ بھیڑ میں رک رک کر چلنا پڑتا تھا' اس لیے اس کارواں کا بڑا حصہ پُل پر یا چوک میں جہاں ان کی لاشیں لٹکی ہوئی تھیں' اس وقت تک رک رک کر کھڑا ہو جاتا تھا جب تک اگلا حصہ اپنے لیے راستہ صاف نہیں کر لیتا تھا۔ سارجنٹ اپنے گرد آلود سرخ چہرے اور غضب ناک چیخ پکار آگ بھبھوکا گھوڑے پر سوار ان چھکڑوں اور سامان لدے گھوڑوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ وہ راستہ بتانے کو ہاتھوں سے اشارے کر رہا تھا اور آسٹروی اور ہنگری بادشاہت کی تمام تسلیم شدہ قسمیں کھا رہا ہوتا تھا۔

مسلسل بمباری کی وجہ سے پُل پر دن کو آمدورفت بند ہو گئی تھی۔ سول کے لوگ آزادی سے پُل کو عبور کرتے تھے۔ اکادکا فوجی سپاہی بھی گزر جاتا تھا' مگر جب آمدورفت بڑھنے لگی تو پانوس سے پھر چاند ماری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چند روز بعد بمباری ایک قاعدہ سے ہونے لگی۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ کس وقت آگ زیادہ برستی ہے' کب کم اور کب بالکل تھم جاتی ہے۔ لوگوں نے اپنے کام کاج کا دستور بھی اسی مناسبت سے بنا لیا تھا۔

پانوس کی پہاڑی بیٹری صرف دن کو فائر کرتی تھی' مگر گولاس کے پیچھے کا توپ خانہ رات کو آگ برساتا تھا اور پُل کے دونوں طرف سپلائی اور لوگوں کی آمدورفت میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتا تھا۔

جن شہروں کے باسیوں کے گھر قصبہ کے وسط میں واقع تھے وہ اپنے اہل و عیال سمیت میدان یا دوسرے دور دراز محفوظ مقامات کی طرف سے اپنے عزیز و اقارب یا دوستوں کے پاس بمباری سے بچنے کے لیے چلے گئے تھے۔ اپنے بچوں اور نہایت ضروری اشیائے خانہ کے ساتھ ان کا فرار ان خوفناک راتوں کی یاد دلاتا تھا' جب بڑے سیلاب نے شہر کو آ لیا تھا۔ صرف اس بار مختلف عقائد کے لوگ باہم شیر و شکر نہ تھے یا مشترکہ مصیبت کے احساس سے آپس میں جڑے ہوئے نہ تھے اور پرانے وقتوں کی طرح باہمی تسکین اور مدد کے لیے اکٹھے نہ مل بیٹھے تھے۔ ترک ان گھروں میں پناہ گزیں ہوئے جہاں ترک رہتے تھے اور سرب طاعون زدہ انسانوں کی طرح سربوں کے گھروں کی طرف بھاگتے تھے۔

اگرچہ وہ اس طرح جدا اور علیحدہ ہو گئے تھے' مگر زندگی سب ایک طرح کی تھی۔ دوسرے لوگوں کے مکانوں میں دھکیلے جاتے ہوئے اور یہ نہ جانتے ہوئے کہ انہیں کیا کرنا ہے' دلوں میں وسوسے اور پریشان کن خیالات لیے اپنے سروں پر وقت کی پرچھائیں منڈلاتے دیکھ کر پناہ گزینوں کی طرح خالی الذہن اور بیکار' اپنی زندگیوں کے خطرہ کا خوف لیے انہیں متعدد اندیشوں اور توقعات نے پریشان کر رکھا تھا' مگر یہ خطرات کا تقاضا تھا کہ انہوں نے ان سب باتوں کو دل میں چھپا رکھا تھا۔

بڑے سیلاب کے وقت ترکوں اور سربوں کے بڑے بزرگ اپنے ساتھ کے لوگوں کو کہانیاں اور لطیفے سنا کر دلجوئی کی کوشش کرتے رہتے تھے' مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس قسم کی بدنصیبی میں یہ پرانی چالیں اور پرانے لطیفے بیکار ہو کر رہ گئے تھے۔ پرانی کہانیاں پھیکی پڑ چکی تھیں اور طنز و مزاح اثر کھو چکے تھے۔ اب ان کی جگہ اور گھڑ لینا اور تیار کرنا یہ بہت سست عمل تھا۔

رات کو وہ سب سونے کو اکٹھے ہو جاتے تھے' اگرچہ کوئی آنکھ بند نہ کر سکتا تھا۔ وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے' اگرچہ وہ خود بھی یہ نہ جانتے تھے کہ جب توپیں گھن گرج سے (کبھی سربوں کی طرف سے اور کبھی آسٹریوں کی طرف سے) چل رہی ہوتی تھیں' کانوں پڑی آواز سنائی بھی نہ دیتی تھی۔ پھر وہ کیوں سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے۔ ان کے دلوں میں یہ خوف جاگزیں تھا کہ "کہیں وہ دشمن کو سگنل نہ دے چکے ہوں"۔ اگرچہ وہ یہ تک نہ جانتے تھے کہ سگنل کے لیے کیا کرنا ہوتا ہے اور وہ کس طرح دیا جاتا ہے' تاہم وہ اس قدر خوفزدہ تھے کہ کوئی دیا سلائی کی تیلی تک جلانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ اگر کسی کو تمباکو نوشی کی حاجت ہوتی تھی' تو وہ کسی ایسے چھوٹے سے کمرہ میں گھس کر ایسا کرتا تھا جس کے روشن دان یا کھڑکیاں نہ ہوتی تھیں۔ گرمی کے دن جس سے ان کا دم گھٹنے لگتا تھا' ہر کوئی پسینہ میں نہایا ہوتا تھا' مگر وہ سب دروازے اور کھڑکیاں اور شٹر بند رکھتے تھے۔ قصبہ اس بدنصیب انسان کا منظر پیش کر رہا تھا جو اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیتا ہے اور پھر اس مار کا انتظار کرنے لگتا ہے جس سے وہ خود کو بچا نہیں سکتا۔ سب گھر ماتم کدہ بنے ہوئے تھے' چونکہ جو کوئی زندہ رہنا چاہتا تھا' اسے ایسا رہنا

پڑتا تھا جیسے وہ مردہ ہو' اس کے بغیر کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔

مسلمان گھروں میں کچھ زیادہ زندگی تھی۔ ان کے خون میں جو جدلیاتی جنگجویانہ جذبات تھے' ان میں بہت کچھ ابھی باقی تھے' مگر اس بد نصیبی کی گھڑی میں وہ ان سے کیا کام لے سکتے تھے کیونکہ ایک ایسا معرکہ جاری تھا جس میں دونوں اطراف کا توپ خانہ حصہ لے رہا تھا اور دونوں طرف عیسائی تھے۔ یہی بات انہیں زیادہ حیران اور پریشان کرنے والی تھی۔ ان کے دل پوشیدہ خطرات کا مخزن بنے ہوئے تھے۔ وہ ایسی مصیبت میں پھنس گئے تھے جس سے نکل جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

علی ہدیٰ اور پالف رانکوک کی دکانوں کی طرح جو پُل کے ساتھ واقع تھیں جو ہر لمحہ بمباری کی زد میں ہونے کی وجہ سے ہمیشہ بند رہتی تھیں' یہی کیفیت لوٹے کے ہوٹل کی تھی۔ وہ ویران اور بند پڑا تھا۔ اس کی چھت اور دیواریں گولوں کی بارش اور گولیوں کی بوچھاڑ سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔

علی ہدیٰ دوسرے تیسرے روز پہاڑی سے اتر کر یہ دیکھنے ضرور آجاتا تھا کہ کیا ہر چیز اسی طرح جوں کی توں رکھی ہے' یہ دیکھ کر وہ پھر گھر لوٹ جاتا تھا۔

پُل پر بمباری ہونے کے پہلے دن ہی سے لوٹے اور اس کا سارا کنبہ ہوٹل کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ وہ دریا عبور کر کے اس کے بائیں کنارے پر واقع ایک ترک کے مکان میں پناہ لینے چلے گئے تھے۔ یہ گھر سڑک سے کافی دور تھا اور گھنے درختوں کے باغات میں چھپا ہوا تھا جہاں سے صرف اس کی سرخ چھت دکھائی دیتی تھی۔ اس کا مالک اپنے پورے خاندان کے ساتھ دیہات کی طرف چلا گیا تھا۔

وہ ہوٹل سے شام کے وقت روانہ ہوئے۔ اس وقت معمول کے مطابق بمباری میں تھم چکی تھی۔ عملے میں جو باقی بچا تھا' وہ وفادار اور ناقابلِ تبدیلی میلان تھا۔ وہ بوڑھا کنوارا تھا' مگر ایک عرصہ سے ہوٹل میں کوئی ایسا فرد موجود نہ تھا جو اس کو وہاں سے نکال سکتا۔ باقی سب شہر میں پہلا گولا گرنے کے ساتھ ہی بھاگ چکے تھے۔ حسبِ معمول اس نقل مکانی میں ہر چیز کا انتظام لوٹے نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا۔ یہ خود اس نے فیصلہ کیا تھا کہ کیا کچھ ساتھ لے جانا بہت ضروری تھا اور کیا پیچھے چھوڑ کر رکھنا چاہیے تھا۔ کس نے کس رنگ کا لباس پہننا ہے۔ ڈوبراہ کے اپاہج بچے کو کون اٹھائے گا؟ ڈوبراہ کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ خوف و ہراس سے حواس باختہ مینا کو کیسے سنبھالنا ہے؟

چنانچہ موسم گرما کی گرم رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ سب یعنی لوٹے' ڈوبراہ' ڈبلر اور مینا اپنے معمولی سے سامان کے ساتھ اور اپاہج بچے کو ہاتھ سے دھکیلنے والی گاڑی پر ڈالے ہوئے اور ہینڈ بیگ اور سوٹ کیس ہاتھوں میں لیے پُل عبور کر گئے۔ تیس سال کی زندگی میں پہلی بار ہوٹل اب مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا اور اس میں اس وقت کوئی بھی ذی روح موجود نہ تھا۔ بموں اور گولوں سے برباد شدہ یہ ہوٹل آثار قدیمہ کا کھنڈر دکھائی دیتا تھا۔ خود وہ سب بوڑھے اور جوان' اپاہج یا توانا' چلنے سے ناآشنا یا لنگڑے جب پُل عبور کرنے لگے' تو وہ اچانک ان یہودیوں کی صورت اختیار کر گئے تھے جو پناہ کی تلاش میں دنیا بھر کی سڑکوں سے گزر رہے تھے۔

پس اس طرح انہوں نے پُل عبور کیا اور وہ رات گزارنے کے لیے وسیع ترک مکان میں جا داخل ہوئے' وہاں لوٹے نے ہر چیز کا انتظام کیا اور ہر چیز کو اپنے ہاتھوں سے ترتیب اور قرینے سے جگہ بہ جگہ رکھا' مگر جب اس نیم خالی اجنبی کمرے میں اپنی چیزوں اور کاغذات کے بغیر جن میں وہ اپنی زندگی صرف کر چکی تھی' سونے کا وقت آیا' اس کا دل بیٹھ گیا اور زندگی میں پہلی بار جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا' اس کی چیخیں خالی ترکی ہاؤس سے بلند ہو کر آسمان تک جا پہنچیں۔ یہ ایسی بات ہوئی تھی جس کا کوئی وہم و گمان بھی نہ کر سکتا تھا۔

لوٹے بے تحاشا رونے لگی تھی' وہ ناقابل برداشت اذیت کے ساتھ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ سب خاندان حیرت زدہ ہو گیا تھا۔ پہلے تو وہ سب سکتے میں آ کر یہ سب کچھ دیکھتے رہے' پھر وہ خود بھی لوٹے کے ساتھ زار و قطار رونے لگے تھے۔ ان کے لیے چچی لوٹے کی قوتوں کا جواب دے بیٹھنا' جنگ کے حملے سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور گھر اور مال و متاع کھو جانے سے زیادہ دردناک تھا' کیونکہ اس کے ساتھ ہر بات پر غلبہ پالینا ممکن تھا' مگر اس کے بغیر وہ نہ کچھ سوچ سکتے تھے' نہ کچھ کر سکتے تھے۔

جو راستہ پُل پر سے گزرتا تھا' وہاں سے ریلوے لائن بھی کاٹ دی گئی تھی۔ پھر فوج دریا کے دائیں کنارے سے بھی واپس بلا لی گئی۔ پیچھے صرف انجینئر یونٹ اور پہرہ دینے والے یونٹ رہ گئے تھے' پھر ان کے واپس بلائے جانے کے احکامات بھی جاری ہو گئے۔

پُل وہیں پڑا رہا جیسے اسے موت کی سزا کا حکم صادر ہو چکا ہو۔ پھر بھی دو لڑنے والے حریفوں میں وہ ابھی تک سلامت کھڑا تھا۔

رات کو آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے جیسے یہ موسم خزاں ہو' بادل پہاڑیوں کی چوٹیوں سے لہرا لہرا کر وادیوں میں گھوم رہے تھے۔ آسٹریا کی فوجی کمان رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اپنے آخری دستے کو پیچھے ہٹا چکی تھی۔ دن طلوع ہونے سے پیشتر وہ نہ صرف دریائے درینہ پر پہنچ چکے تھے' بلکہ لاجنک سلسلوں کی چوٹیوں کے پیچھے سربی توپ خانہ کی بمباری کی پہنچ سے دور اور آنکھوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

دن کے طلوع ہوتے ہی خزاں کی خوش گوار جھڑی برسنے لگی تھی۔ اس بارش میں پہرہ پر مامور آخری پیٹرول نے آخری بار یہ دیکھنے کے لیے شہر کی گشت شروع کی کہ کہیں کوئی شہر میں رہ تو نہیں گیا۔ انہوں نے پُل کے پاس سب گھروں اور دکانوں کی چھان بین کی۔ ہر چیز پر موت کا سکوت طاری تھا۔ لوٹے کا ہوٹل' تباہ شدہ بارکیں' ہر مارکیٹ کے پاس وہ چار پانچ دکانیں' کہیں بھی زندگی کے آثار موجود نہ تھے' مگر علی ہدیٰ کی دکان کے سامنے انہیں علی ہدیٰ ملا جو ابھی اپنے گھر سے ہو کر دکان پر آیا تھا۔ اس نے دکان کے پٹ کھول دیئے تھے۔ فوج کے سپاہی جو اس سے اچھی طرح روشناس تھے اور یہ جانتے تھے کہ وہ 'من موجی آدمی ہے' انہوں نے سخت الفاظ میں متنبہ کیا کہ وہ اسی وقت اپنی دکان بند کر دے۔ چونکہ پُل کے قرب وجوار لمحہ بھر بھی موجود رہنا زندگی کھو بیٹھنے کے خطرے سے خالی نہیں اور اس سے سختی سے منع بھی کیا جا چکا تھا' علی ہدیٰ نے ان کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ شرابی تھے اور انہیں معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ یہ جواب دینا چاہتا تھا کہ ہر کوئی تقریباً مر ہی چکا ہے۔ اور ہر کوئی طویل عرصے سے مر چکا تھا۔ وہ صرف دفنائے جانے کی باری کا انتظار کر رہا تھا' مگر وہ گزشتہ چند دنوں کے تجربے سے سبق حاصل کر چکا تھا۔ اس نے انہیں جواب دیا کہ وہ دکان سے ضروری اشیاء لینے آیا تھا اور فوراً گھر واپس ہو جائے گا۔ سپاہیوں نے اسے ایک بار پھر متنبہ کیا کہ وہ وہاں سے فوراً رخصت ہو جائے۔ وہ جلدی میں تھے۔ وہ یہ کہہ کر چکر کے راستے پُل کی طرف روانہ ہو گئے۔ علی ہدیٰ انہیں مارچ کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اب بھی انہیں پُل عبور کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پُل کے جنگلے سے چھپے ہوئے صرف ان کی بندوقوں کے کندے ان کے سر اور کندھے دکھائی دے رہے تھے۔ دھوپ کی پہلی کرنیں پکا وا چٹانوں پر پڑ رہی تھیں۔

اس لمحہ علی ہدیٰ نے محسوس کیا کہ جس کرسی پر وہ بیٹھا ہوا ہے' وہ ہوا میں تیرنے لگی ہے اور اس نے اسے ایک کھلونے کی طرح اوپر اٹھا پھینکا ہے۔ اس کی میٹھی میٹھی خاموشی چور چور ہو چکی تھی اور اچانک ایک زبردست تباہی میں تبدیل ہو چکی تھی جس سے ساری فضا آلودہ ہو گئی تھی۔ اس نے کانوں کے پردے پھاڑ کر رکھ دیئے تھے اور یہ تباہی ہمہ گیر اور ناقابل برداشت بن چکی تھی۔ سامنے دیوار سے لگے ہوئے شیلف چکنا چور ہو گئے' ان پر رکھی ہوئی چیزیں اس طرح اس پر ڈھیر ہو گئیں جس طرح وہ ان پر جا ڈھیر ہوا تھا۔

اہ... علی ہدیٰ چیخا' اس نے خیال کیا' وہ شاید اس لیے چیخا ہے کہ اس میں چیخنے اور سماعت کی سکت فوت ہو گئی ہے جیسے اس کے لیے زمین پر جگہ نہ رہی ہو' ہر چیز آواز سے گنگ ہو گئی تھی اور اس کے گرد چکر کھانے لگی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دو دریاؤں کے درمیان کی زمین جس پر شہر کھڑا کیا گیا تھا' ہولناک آواز کے ساتھ روئے ارض سے باہر نکال پھینک دی گئی ہو' اور خلا میں اچھال دی گئی ہو جس میں وہ اب بھی اڑ رہی تھی یا یہ کہ دونوں دریا اوپر آسمان کی طرف اپنے پاتالوں کے ساتھ خلا میں صرف اس لیے اٹھا لیے گئے تھے تا کہ ان کے پانی کے ازدحام دوبارہ آبشاروں کی صورت میں زمین پر گرا دیئے جائیں جو آبشاریں ابھی رواں تھیں' ابھی تھمی تھیں' کیا یہ قیامت تھی یا وہ روز حساب تھا جن کا کتابوں میں ذکر کیا گیا تھا اور جس کا دانا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ روز حساب جس میں یہ نیچے پڑی ہوئی دنیا آنکھ کی ایک جھپک میں بھسم کر دی جائے گی' لیکن اللہ تعالیٰ کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی! وہ تو اتنی قدرت کا مالک ہے کہ اس کی ایک نگاہ ایسے کئی جہان پیدا کرنے اور انہیں مٹا دینے کے لیے کافی تھی' اسے ایسی افراتفری برپا کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ یہ خدا تعالیٰ کا کام نہ تھا۔ اگر ایسا نہ تھا' تو پھر انسانی ہاتھوں میں ایسا کرنے کی کہاں سے طاقت آ گئی تھی' تو اس ہولناک مصیبت کا انسان کیسے جواب دہ تھا۔ یہ ایسا عذاب تھا جس کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جس سے ہر چیز برباد ہوتی' ٹوٹتی پھوٹتی اور دم توڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی' وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا طاقت تھی جس نے اسے اوپر اچھال دیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں اڑ رہا تھا یا وہ کہاں ٹھہرے گا' مگر وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ علی ہدیٰ تھا جو ہمیشہ سچائی پر قائم رہا تھا اور جس نے

ہمیشہ راستی کا دامن تھامے رکھا تھا۔
باہر اب پورا دن روشن تھا۔
وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ وہاں اسی حالت میں کتنی دیر پڑا رہا تھا۔ جس چیز نے اسے گہری بے ہوشی سے بیدار کر دیا' وہ روشنی اور اس کے ساتھ ہی آوازوں کی آہٹ تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے حواس درست کر سکا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ مکمل اندھیرے میں گرا پڑا تھا۔ پھر بھی تنگ راستے سے روشنی کی ایک کرن دکان سے وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ کس طرح دنیا گرج اور چیخ پکار سے بھر گئی تھی جس میں انسان کی سماعت ختم ہو گئی تھی اور اس کا خون اس کی رگوں میں منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ اب ایک بار پھر خاموشی چھا گئی تھی' مگر یہ خاموشی اس سے مختلف تھی جو اس طوفان سے قبل کتنی میٹھی تھی جس نے اسے یوں گرا کر رکھ دیا تھا۔ یہ خاموشی اس خاموشی کی شیطان بہن کی طرح تھی۔ یہ سکوت کتنا گہرا تھا۔ اس کا احساس اسے ان دھیمی آوازوں سے ہوا جو کہیں دور سے سنائی دے رہی تھیں اور جن سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اس کا نام لے کر اسے پکار رہا ہو۔
جب اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ ابھی زندہ ہے اور اپنے کمرے میں گرا پڑا ہے' تو علی ہدیٰ نے ان اشیاء کے انبار تلے سے جو شامتوں سے گر کر اس کے اوپر ڈھیر ہوئی پڑی تھیں' اپنے آپ کو علیحدہ کیا' وہ درد سے تلملا اور چیخ رہا تھا۔ اب اس کو سڑک سے آنے والی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھا اور تنگ سوراخ سے رینگتا ہوا دکان میں جا پہنچا۔ دکان چوپٹ کھلی تھی' چونکہ وہ دروازے جنہیں وہ کنڈی لگائے بغیر بند کیے چھوڑ گیا تھا' دھماکے سے گرے پڑے تھے۔
دکان میں جس افراتفری اور بے ترتیبی سے اشیاء بکھری پڑی تھیں' ان کے درمیان ایک پتھر گرا پڑا تھا جس کا جسم کسی طرح بھی انسان کے سر سے کم نہ ہو گا۔ یہ واضح بات تھی کہ پتھر دکان کی کمزور چھت کو توڑتے ہوئے ہوا میں اڑ کر آیا تھا۔ علی ہدیٰ نے پھر پتھر کا جائزہ لیا۔ یہ پتھر سفید رنگ کا تھا۔ ہموار اور مسام دار تھا جس کے دو طرف گھڑے ہوئے تھے اور دو طرفین بے ڈھنگے پن سے ٹوٹی پھوٹی ہوئی تھیں' اس کا ماتھا ٹھنکا--- اہو--- ئیل--- مگر سڑک سے آنے والی آوازیں اب اسے اور بھی زور سے پکار رہی تھیں۔ انہوں نے اسے پیش آگاہی سے کہا کہ وہ اسے کچھ سوچنے نہ دیں گی۔

وہ چوٹوں سے چور چور ہو چکا تھا اور ابھی تک پوری طرح ہوش میں نہیں آیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ پانچ چھ جوان دکان کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ مٹی میں لتے پتے ہوئے تھے۔ ان کی حجامتیں بڑھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے خاکی وردیاں' سروں پر سپاہیوں کی ٹوپیاں اور پاؤں میں دیہاتی سینڈلیں پہن رکھی تھیں۔ وہ سب مسلح تھے اور سب ہی نے گلوں میں چھوٹی چھوٹی گولیوں کی پیٹیاں لٹکا رکھی تھیں۔ ان کے ساتھ قفل ساز ولادو مارک بھی تھا۔ اب اس کے سر پر پرانی ٹوپی نہ تھی۔ اس نے فر کا ہیٹ پہن رکھا تھا اور اپنی چھاتی کے گرد ویسی ہی پٹی لپیٹ رکھی تھی۔ ان میں سے ایک جو ان کا لیڈر معلوم ہوتا تھا' اس کی سیاہ مونچھیں تھیں اور وہ خوش شکل گبھرو جوان تھا۔ اس نے اپنے کندھے پر شکاریوں کی رائفل اٹھا رکھی تھی اور ہاتھ میں کلہاڑی تھام رکھی تھی جس کا پتلا دستہ اس کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ اس نے فوراً علی ہدیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:
"او' تم.... کیا تم ہمیشہ ہی اپنی دکان کھلی چھوڑ کر چلے جاتے ہو۔ اگر کوئی چیز گم ہو گئی تو کہو گے کہ اسے میرے سپاہیوں نے چوری کیا ہے۔ کیا تم مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں تمہاری چیزوں کی حفاظت پر پہرہ دیتا رہوں"۔
اس جوان کا چہرہ سنجیدہ تھا' مگر اس کی آواز سے غصہ عیاں تھا اور ہاتھ میں سنبھالے ہوئے دستے کو وہ دھمکی کے انداز میں اوپر اٹھائے ہوئے تھا۔ ولادو مارک آگے بڑھا اور آہستہ سے اس کے کان میں سرگوشی کی:
"اچھا' تو شاید یہ نیک اور ایمان دار آدمی ہے لیکن اگر میں نے پھر دیکھا کہ اس نے دکان کو کھلا چھوڑ رکھا ہے' تو اسے اتنی آسانی سے نہیں بخشا جائے گا"۔
مسلح افراد نے اپنی راہ لی۔
ہدیٰ نے دل میں کہا: "یہ اور میں"۔
وہ شہر میں پہنچ کر مجھ سے نرم کیوں ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک ہر شے میرے سر پر نہیں آگرتی' اس شہر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔
وہ منہ کھولے اپنی شکستہ دکان کے سامنے کھڑا تھا' اس کا سر بھاری تھا اور جسم چور چور ہو چکا تھا۔ اس کے سامنے وہ چوک تھا جو صبح کی دھوپ کی روشنی میں میدان جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا جس پر چھوٹے اور بڑے پتھروں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ اس کی نگاہ پُل کی طرف اٹھی۔
کپیا وہیں تھا جہاں وہ ہمیشہ سے موجود تھا' مگر کپیا سے

پرے پُل چھوٹا ہو کر رہ گیا تھا' اس کا ساتواں پایہ غائب ہو گیا تھا۔ چھٹے اور آٹھویں پائے کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو گئی تھی جس سے دریا کا سبز پانی بہتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ آٹھویں پایہ سے آگے پُل ایک بار پھر دریا کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا.... ہموار' بدستور اور سفید جیسا کہ وہ گزشتہ روز تھا یا ہمیشہ سے چلا آ رہا تھا۔

ہدیٰ نے جو کچھ دیکھا' اس کا اسے یقین نہیں آ رہا تھا' اس نے اپنی آنکھیں کئی بار جھپکیں' پھر انہیں بند کیا۔ اپنے اندر کی بصارت سے اسے وہ سپاہی یاد آئے جنہیں اس نے چھ سال پہلے دیکھا تھا اور جو سبز خیمہ میں چھپے اسی پایہ کی کھدائی کر رہے تھے۔ پھر اس کے ذہن میں اس مین ہول کا منظر اُبھرا جس نے گزشتہ چند برسوں سے اس بارود بھرے پایہ کی سرنگ کو ڈھکنے سے چھپا رکھا تھا۔ وہ چل پڑا۔ اس نے پھر آنکھیں کھولیں۔ اس کے سوا کسی چیز میں بھی کوئی ردوبدل نہ ہوا تھا۔ ہر چیز ویسے ہی تھی جیسے وہ پہلے تھی۔ چوک پر چھوٹے موٹے پتھروں کے ڈھیر بکھرے پڑے تھے اور پُل کی حالت یہ تھی کہ اس کا ایک پایہ ضائع ہو چکا تھا اور دو شکستہ محرابوں کے درمیان خلیج نمایاں ہو چکی تھی۔

یہ ایسا منظر تھا جسے صرف خوابوں میں دیکھا جا سکتا ہے یا تجربہ کیا جا سکتا ہے' لیکن جوں ہی وہ اس ناقابل یقین منظر سے پرے ہٹا' اسے اپنے سامنے اپنی دکان دکھائی دی اور اس میں بکھری پڑی اشیاء میں وہ بڑا پتھر دکھائی دیا جو اس ساتویں پایہ کا ایک حقیر ترین حصہ تھا۔ اگر یہ خواب تھا' تو ہر جگہ ایسے ہی تھا۔

چوک کی نچلی جانب سے اونچی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ سربی کمانڈر کے بآواز بلند احکامات کی صدائیں تھیں۔ اس کے ساتھ ہی سپاہیوں کے قدموں کی چاپ تھی جو قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ علی ہدیٰ نے جلدی سے دکان کے پٹ بند کیے' انہیں قفل لگایا اور پہاڑی کی جانب گھر کو چل پڑا۔

اس سے پہلے بھی اس پر یہ واردات گزر چکی تھی کہ جب پہاڑی پر اپنے گھر کی جانب جا رہا تھا' تو اس کا دم پھولنے لگا اور دل کی حرکت تیز ہو گئی تھی' مگر ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جب سے اس کی عمر پچاس سال سے اوپر ہوئی تھی' وہ ایسا محسوس کرنے لگا تھا جیسے گھر کے راستے کی ڈھلان اور نشیبی ہوتی چلی گئی ہو اور راستہ روز بروز لمبا ہوتا جا رہا ہو' لیکن آج وہ راستہ جتنا لمبا ہو گیا تھا' پہلے وہ اتنا طویل نہ تھا۔ آج وہ بے تابی سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ جلد سے جلد جتنا جلد ممکن ہو اپنے گھر پہنچ جائے' اس کے دل کی دھڑکن اس طرح تیز ہو گئی تھی جس طرح اسے نہیں ہونا چاہیے تھا' اس کا دم پھول گیا اور وہ ٹھہر جانے پر مجبور ہو گیا۔

وہاں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گار ہے ہوں' وہیں نیچے پُل بھی تھا' برباد شدہ پُل جسے نہایت بے رحمی سے ہولناک انداز میں عین درمیان سے دولخت کر دیا گیا تھا' اسے سڑ جانے کی ضرورت نہ تھی (اور دنیا میں وہ کبھی بھی کسی بات سے پھرا نہیں تھا) اور وہاں پُل کو کسی بڑے درخت کے تنے کی طرح ہزار ہا حصوں میں کاٹ کر رکھ دیا گیا تھا اور اس کے دائیں اور بائیں جانب کی محرابیں وحشیانہ طور پر توڑ پھوڑ دی گئی تھیں۔ شکستہ محرابیں دردناک انداز میں ایک دوسری کی طرف جھکی کھڑی تھیں۔

زندگی میں وہ کبھی بھی اپنے پاؤں پر پیچھے کی طرف پھرا نہیں تھا' مگر وہ پہاڑی کے اوپر چڑھنے کی ہمت کھو بیٹھا تھا' چونکہ اس کا دل لحہ بہ لحہ بیٹھا جا رہا تھا اور ٹانگیں اس کے کام کی تعمیل سے انکار کر بیٹھی تھیں' اب وہ اور گہرے سانس لینے لگا تھا۔ یہ بات ہمیشہ اس کی مددگار ثابت ہوئی تھی۔ اس نے اب بھی اس کی مدد کی اور اس کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ گہرے سانسوں اور دل کی متوازن دھڑکن کے درمیان اس نے توازن پیدا کر لیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا اور گھر اور بستر کا تصور اسے آگے دھکیلنے لگا۔ وہ بڑی اذیت اور آہستگی سے چل رہا تھا۔ ٹوٹے ہوئے پُل کا پورا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے آگے آگے حرکت کر رہا تھا' جس چیز سے اسے اذیت ہوتی تھی' اس سے آنکھیں پھیر لینے سے بات ختم نہیں ہوتی تھی' کیونکہ جب وہ آنکھیں بند بھی کر لیتا تھا' وہ پُل بند آنکھوں سے بھی اسے نظر آتا تھا۔

علی ہدیٰ نے پرجوش انداز میں سوچا۔ وہ اب ذرا آسانی سے سانس لینے لگا تھا۔ اسے سمجھ آ گئی تھی کہ ان کے اوزاروں اور ان کے سازوسامان کس مقصد کے لیے تھے' اور کس لیے وہ اتنی تیزی دکھا رہے تھے۔ (وہ ہمیشہ سچائی پر قائم رہا تھا۔ ہمیشہ ہر بات میں اور ہر ایک کے ساتھ) لیکن یہ بات اب اسے تسکین دینے کے قابل نہ رہی تھی۔

یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ وہ بات بے معنی ثابت ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ سیدھے راستے پر رہا تھا۔ برسوں سے وہ دیکھ رہا تھا کہ ان کا ہمیشہ ہی پُل سے واسطہ برقرار رہا تھا۔ وہ اسے صاف ستھرا کرتے تھے' اس پر رنگ و روغن کرتے

تھے۔ اس کی بنیادوں سے لے کر اوپر تک مرمت کرتے تھے۔ اس کے اوپر سے پینے کا پانی لے کر جاتے تھے۔ اسے بجلی کے قم قموں سے روشن کرتے تھے اور پھر ایک دن اسے آسمانوں میں اڑا کر رکھ دیا گیا جیسے وہ کسی پہاڑی چٹان کی کان سے نکالے چند پتھر ہوں اور حسن و ترتیب اور رقدر کا مجسمہ نہ ہوں۔ پھولوں کا گلدستہ نہ ہو۔ اب یہ راز فاش ہو چکا تھا کہ وہ کیا ہے اور کیا چاہتے تھے۔ وہ پہلے ہی جانتا تھا' مگر جس طرح آج سب کچھ جان گیا تھا' پہلے اسے معلوم نہ تھا۔ دنیا میں جو سب سے مضبوط اور دیرپا چیز تھی' وہ اسے برباد کرنے کے لیے اس پر حملے کرتے رہے تھے۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ خدا سے بنائی ہوئی چیزوں کو بھی دور لے جائیں۔ کون جانتا ہے وہ کہاں رکیں گے' وزیر کا پل بھی مالا کے دانوں کی طرح بکھرنے لگا تھا اور جب یہ کام شروع ہو گیا تھا' اسے روک لینا ممکن نہ تھا۔

بدیٰ پھر رک گیا' اس کا سانس جواب دے گیا اور اسے پاؤں تلے کی ڈھلان اور بھی نشیبی معلوم ہونے لگی۔ پھر اسے اپنے دل کی حرکت کو گہرے سانس لے لے کر متوازن کرنا پڑا۔ ایک بار پھر وہ اپنا سانس بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کیا۔ وہ زیادہ تیز رفتاری سے آگے بڑھا۔

اس نے جی میں سوچا' اسے ہو لینے دو۔ اگر وہ یہاں توڑتے ہیں' تو کہیں تعمیر کا عمل بھی جاری ہو گا۔ یقیناً دنیا میں اب بھی پرامن ممالک موجود ہیں اور اچھے انسان بھی موجود ہیں جن کے دلوں میں خدا کی محبت موجزن ہے۔ اگر خدا نے دریائے درینہ کے کنارے واقع اس شہر کو تنہا چھوڑ دیا ہے' تو اس نے آسمانوں کے نیچے بسنے والی ساری دنیا کو تو نہیں ترک کر دیا۔ وہ ہمیشہ تو ایسا نہیں کرتے رہیں گے' مگر کون جانتا ہے؟

اہو' اگر وہ گہرا سانس لے سکتا' اسے اور ہوا مل جاتی۔ کون جانتا ہے۔ شاید یہ ناپاک کافر اعتقاد جو ہر چیز میں نظم پیدا کرتا ہے' ہر چیز کو پاک و صاف کرتا ہے' ہر چیز کی مرمت کرتا اور اس پر رنگ آمیزی کرتا ہے تاکہ اسے تہس نہس اور برباد کرے' ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ وہ خدا کی ساری بستی کو اپنی لغو تعمیر اور مجرمانہ تباہی کا میدان بنا کر رکھ دے یا اُسے اپنی نہ مٹنے والی بھوک اور ناقابل فہم مطالبات کی چراگاہ بنا کر رکھ دے۔ یہ ہر چیز رونما ہو سکتی ہے' مگر ایک چیز نہیں ہو سکتی۔ وہ یہ کہ پاکیزہ اور وسیع دلوں کے مالک دانا اور عظیم انسان جو خدا تعالیٰ کی محبت میں عمارتیں تعمیر کریں گے تاکہ دنیا اور حسین ہو اور انسان اس میں آسودہ زندگی بسر کر سکے۔ کیا وہ ہمیشہ اور ہر کہیں روئے ارض سے معدوم ہو جانا چاہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ دنیا سے خدا تعالیٰ کی محبت غائب اور ختم ہو گئی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو گا۔

علی بدیٰ اپنے خیالات میں گم گہرے سانس لیتا آہستہ آہستہ آگے آگے بڑھتا رہا۔

اب مارکیٹ کی جگہ سے گانے کی آوازیں صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ اس کے دل میں صرف ایک آرزو باقی رہ گئی تھی کہ وہ اپنے اندر اور ہوا لے سکتا' گھر پہنچ گیا ہوتا۔ اپنے دیوان پر لیٹ گیا ہوتا۔ اس کے اپنے اس کے پاس ہوتے اور وہ اپنے دل کی حرکت اور اپنے سانس کے درمیان نازک توازن برقرار نہ رکھ سکتا تھا۔ اس کا دم اس کے منہ کو آ چکا تھا۔ خوابوں میں اس کے ساتھ ایسا پیش آ چکا تھا' مگر اس خواب سے سکھ کی بیداری ختم ہو چکی تھی۔

اس نے اپنا منہ کھول دیا' اسے اپنی آنکھیں اپنے سر میں حرکت کرتی محسوس ہوئیں۔ وہ ڈھلان جو اس سے پیشتر نشیب کی طرف اترتی ہوئی دکھائی دیتی تھی' اب اس کے چہرے کے سامنے آ چکی تھی۔ اس کی بصارت کا سارا میدان خشک کھردری سڑک بن چکا تھا جس نے تاریکی بن کر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اس ڈھلان پر جو اوپر میدان سے جا ملتی تھی' علی بدیٰ گرا پڑا تھا اور چھوٹے چھوٹے سانسوں میں دم دے چکا تھا

(ختم شد)

اُن لازوال ناولوں میں سے ایک
جن پر وقت کی گرد کبھی نہیں جمتی

فرانس کے ایک شہرہ آفاق ادیب کے خزینے سے

تائیس

ایک راہب کا فسانہ۔ وہ ایک طوائف
کو صراطِ مستقیم دکھانا چاہتا تھا

اناطول فرانس / مولوی عنایت اللہ

دریائے نیل کا پھول

جس زمانے کا یہ قصہ ہے، مصر میں تھیبی کا صحرا عیسائی راہبوں سے آباد تھا۔ دریائے نیل کے دونوں کناروں پر دور دور تک جھونپڑیاں پڑی تھیں، جو ان راہبوں نے مٹی اور پتوں سے بنائی تھیں اور ان میں اتنا اتنا فصل رکھا تھا کہ ان کے رہنے والوں کو تنہائی بھی نصیب رہے اور اگر ضرورت ہو تو وقت پر ایک دوسرے کی مدد کو بھی آسانی سے آ سکیں۔ جھونپڑیوں سے کچھ اونچے نکلے ہوئے گرجا بھی جابجا موجود تھے۔ ان کی چوٹیوں پر صلیبیں نصب تھیں۔ عشائے ربانی اور اسرار مسیحی کی رسوم کے موقعوں پر یہ تارک الدنیا عیسائی ان گرجاؤں میں جمع ہوا کرتے تھے۔ دریا کے کناروں سے ملے ہوئے مسیحی زاہدوں کے گھر تھے۔ یہ سب اپنے اپنے تنگ و تاریک حجروں میں علیحدہ علیحدہ رہتے تھے مگر باہمی اتحاد بھی رکھتے تھے جس کی غرض صرف یہ تھی کہ جو طریقہ گوشہ نشینی کا اختیار کیا ہے، وہ خوش اسلوبی سے ہمیشہ برقرار رہ سکے۔

یہ زاہد اور راہب بڑے پرہیز گار ہوتے تھے۔ جب تک آفتاب غروب نہ ہو کچھ کھاتے پیتے نہ تھے اور کھانے میں بھی سوائے روٹی، نمک اور زوفے کے ساگ کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ ان میں بعض راہب بالکل ہی ریگستان میں جاکر آباد ہوئے تھے۔ کسی نے کسی غار کو اور کسی نے کسی ٹوٹے ہوئے مقبرے کو اپنا گھر بنا لیا تھا اور یہاں اور بھی زیادہ تنہائی میں زندگی بسر کرتے تھے۔

یہ سب لوگ ایک بہت نیچا کرتا پہنتے تھے، جس کی پشت پر ایک رومال سا ہوتا تھا، جس کو الٹ کر سر ڈھک لیتے تھے۔ رات کو بہت دیر تک وظیفے اور عبادت میں مصروف رہتے اور خدا کی حمد گانے کے بعد زمین پر بغیر فرش کے سو جاتے تھے اور ہر روز گناہوں کی تلافی میں کوئی نہ کوئی عجیب جسمانی تکلیف اٹھاتے تھے۔ آدم کے سب سے پہلے گناہ کے کفارے میں انہوں نے اپنے جسم کو ہر طرح کی راحت و آسائش سے محروم کر دیا تھا اور یہی نہیں بلکہ اپنے تن بدن کی اتنی خبر بھی نہ رکھتے تھے، جو ہر انسان کے لئے بالکل ضروری ہے۔ سمجھتے تھے کہ بدنی امراض جس قدر زیادہ ہوں، اسی قدر روح کی اصلاح بھی زیادہ ہوتی ہے اور جسم کی زینت کے لئے پھوڑے پھنسیوں سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ بلکہ ان کے ان ہی زخموں سے انبیائے بنی اسرائیل کے اس قول کی تصدیق ہوتی تھی کہ "صحرا پھولوں سے ڈھک دیئے جائیں گے۔"

اس بیابان مقدس میں جو لوگ دنیا چھوڑ کر بسے تھے، ان میں بہت سے لوگ تو صرف ریاضت اور نفس کشی میں اپنا کل وقت صرف کرتے تھے اور بہت سے ایسے تھے جو کچھ روزی پیدا کرنے کے لئے درختوں کی چھالیں اتار کر ان کے ریشوں سے رسیاں بٹا کرتے تھے یا جب فصل تیار ہو جاتی تھی تو پاس کے زمینداروں کے ہاں جا کر مزدوری کر لیتے تھے۔ بت پرست سمجھتے تھے کہ یہ چور اور اٹھائی گیرے ہیں اور جو رہزن قافلوں کو لوٹا کرتے ہیں، ان سے ملے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں غلط تھیں۔ ان راہبوں کو روپے پیسے سے بالکل نفرت تھی، وہ خدا کے نیک بندے تھے، جن کی نیکیاں خوشبو بن کر آسمان تک پہنچا کرتی تھیں۔

فرشتے نوجوانوں کے بھیس میں مسافروں کی طرح ہاتھ میں عصاء لئے ان راہبوں کی بستیوں میں آیا کرتے تھے اور شیاطین بھی حبشیوں اور جنگل کے جانوروں کا روپ بھر کر گمراہ کرنے کے لئے ان میں گشت لگایا کرتے تھے اور جب صبح کے وقت یہ راہب اپنے اپنے برتن لے کر چشمے سے پانی لینے جاتے تو بھوتوں اور عفریتوں کے نقش قدم ان کو ریت پر نظر آیا کرتے تھے۔ مذہبی نظر سے دیکھنے والوں کے نزدیک تھیبی کا مقدس بیابان ایک میدان کارزار تھا، جہاں عرش اور تحت الثریٰ کے رہنے والوں میں ہمیشہ بالخصوص رات کے وقت بڑے بڑے ہنگامے برپا کرتے تھے۔

شیاطین کی فوجیں رات دن ان غریب راہبوں پر یورشیں کیا کرتی تھیں۔ مگر یہ خدا کے نیک بندے فرشتوں کی مدد اور خدا کے فضل سے سخت روزے رکھ کر اور جسم کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچا کر شیاطین کے حملوں کا جواب دیا کرتے تھے۔ بعض وقت نفس کی خواہشیں ان پر ایسی غالب ہوتی تھیں کہ تکلیف سے چلانے لگتے تھے اور اس وقت ان کی آواز ایسی ہوتی تھی، جیسے بھوک میں بھیڑیے چیختے ہوں، خبیث روحیں اچھی اچھی صورتیں بنا کر ان کے پاس آیا کرتی تھیں، گو دراصل وہ کریہہ منظر ہوتی تھیں، لیکن اپنی بری طبیعت کو

چھپانے کے لئے اچھی صورت بنالیتی تھیں اور صحرائے تھیبی کے تارک الدنیا اپنی اپنی جھونپڑیوں میں عیش و عشرت کے وہ وہ نقشے دیکھا کرتے تھے' جو اس زمانہ کے عیاشوں اور بدکاروں کے ذہن میں بھی نہ آتے ہوں گے۔ لیکن چونکہ صلیب کا سایہ ان پر تھا' اس لئے کسی بری بات کی تحریص ان کو نہ ہوتی تھی اور صبح ہوتے ہی یہ خبیث روحیں اپنی اصلی صورتیں اختیار کر کے دل میں نہایت شرمندہ و خجل بھاگ جایا کرتی تھیں۔ بلکہ اکثر دن نکلنے پر کسی راہب کو نظر آتا کہ ان ہی ناپاک روحوں میں سے ایک روح روتی پیٹتی بھاگی جاتی ہے اور جب سبب پوچھا جاتا ہے تو کہتی ہے کہ "یہاں ایک راہب رہتا ہے' اس نے مجھے ڈنڈے مار کر اور بہت بے عزت کر کے اپنے گھر سے نکال دیا ہے۔"

صحرا کے سن رسیدہ راہب خوب جانتے تھے کہ گنہ گاروں پر ان کا کس قدر رعب چھایا رہتا ہے۔ بعض وقت دنیا داروں کے ساتھ ان بڈھے راہبوں کی نیکیاں بھی نہایت خطرناک ہوتی تھیں۔ خدائے برحق کے مقابلہ میں خطاکاروں کو سزائیں دینے کا اختیار ان کو "مسیحی رسولوں" سے ودیعت ہوا تھا۔ جس کسی کو خاطی سمجھ لیتے تھے پھر اس کو کہیں پناہ نہ ملتی تھی۔ شہروں شہروں' یہاں تک کہ اسکندریہ میں بھی لوگ بہت خوف زدہ ہو کر کہا کرتے تھے کہ ان بڈھوں کا ڈنڈا جس پر پڑ گیا' پھر زمین شق ہو کر اس کو نگل ہی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے تمام بدکار خاص کر نقال اور مسخرے' متاہل پادری اور کسبیاں ان سے لرزتی رہتی تھیں۔

ان دیرینہ سال زاہدوں کے اعمال ایسے اچھے تھے کہ وحشی جانور بھی ان کا حکم مانتے تھے۔ مشہور تھا کہ جب ایک راہب بیمار ہو کر مرنے کو ہوا تو جنگل سے ایک شیر اس لئے آیا کہ بیمار کی قبر اپنے پنجوں سے کھود کر تیار کر دے۔ شیر کے آتے ہی راہب سمجھ گیا کہ خدا اب اس کو اپنے پاس بلانے والا ہے' چنانچہ وہ اپنے سب بھائیوں سے گلے ملا اور پھر زمین پر دراز ہوا تا کہ خداوند کے سایہ میں میٹھی نیند سو جائے۔

جب سے قسیس اعظم انطونی نے جس کی عمر اب سو برس سے زائد تھی کوہ کلزین پر گوشہ نشینی اختیار کی تھی اور اس کے دونوں مشہور شاگرد مکاروس اور اماشوس بھی صحرا چھوڑ کر اس کے ساتھ رہنے لگے تھے' اس وقت سے تھیبی کی وسیع اقلیم میں انصینو کے قسیس پفنوتوس سے بڑھ کر خدا کی راہ میں نیک کام کرنے والا کوئی باقی نہ رہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ افریم اور اسرافیوں بھی صحرا کے مشہور اکابر میں شمار ہوتے تھے' جن کی ماتحتی میں راہبوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور اپنی اپنی خانقاہوں کے دینی و دنیوی انتظام میں بھی بہت شہرت حاصل کر چکے تھے' لیکن عبادت' ریاضت میں پفنوتوس ان دونوں سے فضیلت رکھتا تھا۔ روزے نہایت سخت قسم کے رکھتا تھا۔ بعض اوقات تین تین دن تک کچھ کھاتا پیتا نہ تھا۔ بھیڑ کے بالوں کا بنا ہوا ایک نیچا پیرہن پہنتا تھا اور صبح و شام اپنے ہاتھ سے اپنی پیٹھ پر کوڑے مارا کرتا تھا اور اکثر چہرے کے بل زمین پر پڑا رہتا تھا۔

پفنوتوس کی جھونپڑی کے پاس ہی اس کے چوبیس شاگردوں نے اپنی جھونپڑیاں بنالی تھیں اور جس طرح یہ راہب جسمانی ایذائیں اٹھاتا تھا' وہی اس کے شاگرد بھی کرتے تھے۔ مسیح کی بدولت اس کو اپنے شاگردوں سے بے انتہا محبت تھی اور نفس کشی کی ان کو ہمیشہ ہدایت کرتا رہتا تھا۔ اس کی اس روحانی اولاد میں ایسے لوگ بھی تھے جو برسوں قزاقی کا پیشہ کرتے رہے تھے۔ لیکن پفنوتوس کی نصیحتوں سے وہ راہ راست پر آئے اور دنیا کی مکروہات سے انہوں نے اپنا دامن کھینچ لیا۔ ان ہی شاگردوں میں ملکہ حبش کا ایک باورچی تھا' جسے پفنوتوس نے رہبانیت کی تعلیم دی اور پھر اس شاگرد کو سوائے گریہ و زاری کے دوسرا کام نہ رہا۔ اسی طرح فلے ویان جو کلیسا میں شماس کا درجہ رکھتا تھا اور بڑا عالم اور فصیح مانا جاتا تھا' پفنوتوس کی ہدایت سے تارک الدنیا ہوا۔ لیکن اس کے تلامذہ میں سب سے بڑا درجہ ایک نوجوان کاشتکار کو ملا تھا' جس کا نام پال تھا۔ اس کا لقب "سادہ لوح" رکھ دیا گیا تھا کیونکہ وہ بہت ہی بے عقل تھا اور لوگ اس کی صورت دیکھ کر ہنسا کرتے تھے۔ لیکن خدا کی نظروں میں وہ بہت پیارا تھا۔ عالم رویا میں ہر چیز کی حقیقت کو پہچاننے اور پیشین گوئی کرنے کی قدرت اس کو عطا ہوئی تھی۔

پفنوتوس بڑا عالم باعمل تھا۔ اپنے شاگردوں کو ترک دنیا اور نفس کشی کا سبق دینے کے علاوہ وہ کتب مقدسہ کے دقیق مضامین پر اکثر غور کیا کرتا تھا اور الفاظ کے ظاہری

مفہوم سے قطع نظر کر کے ان کے پوشیدہ معنی تلاش کرنے میں مصروف رہتا تھا اور اسی وجہ سے گو ابھی نوجوان تھا' اس میں بہت سی نیکیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ بھوت پریت صحرا کے تمام راہبوں کو تنگ رکھتے تھے' لیکن اس کے پاس تک کوئی نہ آ سکتا۔ رات کے وقت سات چھوٹے چھوٹے گیدڑ اس کی جھونپڑی کے دروازے کے سامنے کان لگائے چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے۔ مشہور تھا کہ یہ ابلیس کی ذریات ہیں' جن کو پفنوتوس نے خدا پرستی کی قوت سے اپنے دروازے کے سامنے قید کر رکھا ہے۔

پفنوتوس اسکندریہ کے شہر میں شریف ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ دنیوی علوم میں ادب کی کتابیں اس کو بہت غور سے پڑھائی گئی تھیں۔ شاعروں کے مبالغوں پر جان دیتا تھا اور بالکل پرستی کا یہ حال تھا کہ وکالیون کے طوفان میں بنی نوع انسان کے غرق ہو جانے کا یقین رکھتا تھا اور جو لوگ اس کے ہم مکتب تھے' ان سے خدا کی فطرت اور اس کی صفات بلکہ وجود باری پر بھی مخالفانہ بحثیں کیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں اس کی زندگی بالکل لہو و لعب کی تھی اور یہی حال اس وقت اور بت پرستوں کا تھا۔ اب پفنوتوس اپنے پچھلے حالات یاد کر کے نہایت شرمندہ اور پریشان رہا کرتا تھا اور اپنے دینی بھائیوں سے کہا کرتا تھا کہ اس کی زندگی کا وہ زمانہ ایسا تھا کہ جیسے دنیا کی لذتوں میں ایک دیگ چڑھی ہو اور یہ بھی ان ہی لذتوں میں جوش کھاتا ہو۔ اس فقرے سے اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ اس زمانہ میں بڑے بڑے خوش ذائقہ کھانے کھایا کرتا تھا اور حماموں میں جہاں سب طرح کے لوگ آیا کرتے تھے' خوب نہایا کرتا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ اس نے بیس برس کی عمر تک بے دین بت پرستوں میں زندگی بسر کی تھی' جس کو زندگی کیا موت کہنا بہتر تھا۔ لیکن جب مکار وس تلمیذ انطونی نے اس کو مذہب کی تعلیم دی تو وہ بالکل ایک نیا آدمی ہو گیا۔

مذہب کی حقیقت اور سچائی نے اس کے دل پر بے حد اثر کیا تھا۔ بلکہ وہ کہا کرتا تھا کہ یہ چیزیں تلوار کی طرح اس کے سینے میں اتر گئی تھیں۔ وہ عیسائی مذہب قبول کر کے مسیح مصلوب کی پرستش کرنے لگا۔ اصطباغ لینے کے بعد وہ بدستور ایک برس تک بت پرستوں میں رہا' لیکن ایک دن گرجا میں گیا تو پادری کی زبان سے انجیل کی یہ عبارت سنی کہ "اگر تو کامل بننا چاہتا ہے تو جا اور جو کچھ تیرے پاس ہے اس کو بیچ ڈال اور مسکینوں کو دے دے۔" اتنا سن کر وہ اپنے گھر آیا اور جس قدر مال و اسباب رکھتا تھا اس کو بیچ کر قیمت غریبوں میں تقسیم کر دی اور خود دنیا چھوڑ بیٹھا اور اب دس برس سے لذائذ دنیا کی دیگ میں ابلنے کے بدلے توبہ و تاسف کے روغن سے گناہوں کے زخموں کو مندمل کیا کرتا تھا۔

ایک دن حسب معمول وہ ان وقتوں کو یاد کر رہا تھا' جو اس نے خدا سے دور رہ کر بسر کئے تھے' اپنی خطاؤں کو ایک ایک کر کے یاد کرنے لگا' تاکہ اس کی سنگینی اور شدت کا اندازہ کرے۔ اسی حال میں اس کو یاد آیا کہ برسوں ہوئے اسکندریہ کے تماشا خانے میں اس نے ایک تماشا کرنے والی کو دیکھا تھا جو بہت ہی حسین تھی اور اس کا نام تائیس تھا۔ یہ عورت تماشے دکھایا کرتی تھی اور ایسے ناچ ناچنے میں اس کو مطلق شرم نہ تھی' جنہیں دیکھ کر شہوانی قواء کو تحریک ہوتی تھی یا وہ ایسی بے شرمی کی حرکتوں کی نقلیں اتارا کرتی تھی' جو بت پرستوں کے ہاتھوں میں بڑی بڑی دیویوں مثلاً وینس' لیدا اور پاسیفی سے منسوب تھیں۔ ان نقلوں سے وہ تماشائیوں کے دلوں میں تعیش کی آگ بھڑکا دیتی تھی اور جب عاشق مزاج خوبرو نوجوان یا مالدار بڈھے ہمیشہ کے تماش بین اس کے دروازے پر پھولوں کے کنٹھے لٹکانے آتے تھے' تو ان کو اندر بلا کر بہت ہی خاطر و مدارات سے پیش آتی تھی اور جس طرح اپنا دین و ایمان غارت کیا تھا' ان لوگوں کا دین و ایمان بھی غارت کرتی تھی۔

پفنوتوس بھی اس عورت کے عاشقوں میں تھا۔ وصل کے ارمان نے اس کے خون میں بھی ایک جوش پیدا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن بے تاب ہو کر تائیس کے دروازے تک پہنچ گیا۔ لیکن چونکہ ابھی بہت نو عمر تھا (پندرہ برس کا سن تھا) مکان کے اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی اور یہ ڈر ہوا کہ کوئی وہاں سے نکال نہ دے۔ غرض اس طرح خدا کے فضل و کرم سے ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ وہ ایک بڑے گناہ سے بچ گیا۔ لیکن خدا کے اس فضل کی اس وقت قدر نہ ہوئی تھی' کیونکہ ابھی تک اپنے حقیقی فائدوں اور مضر خواہشوں میں اسے تمیز کرنے کی

سمجھ نہ تھی۔

پفنوتوس ان پرانے قصوں کو یاد کرتے کرتے دفعتاً چونکا اور لکڑی کی صلیب کے سامنے جس میں مسیح مصلوب کی مورت اس طرح لٹک رہی تھی، گویا میزان عدل میں ایک طرف دنیا کے گناہ اور دوسری طرف ان کا کفارہ تولا جارہا ہو۔ زمین پر گھٹنے ٹیک کر کھڑا ہوا اور اپنے گناہوں کو یاد کرنے میں تائیس کا خیال دل میں جمایا کیونکہ اس عورت کا شمار بھی اس کے گناہوں میں تھا۔ رہبانیت کے قواعد مجبور کرتے تھے کہ نفس کی لذتوں کے خوفناک نتائج پر ہمیشہ غور کیا جائے۔ چونکہ جہل و معصیت کے زمانہ میں اس عورت نے اس کے نفس کو لذت کی ترغیب دی تھی، اس لئے دیر تک وہ اس کے خیال میں مستغرق رہا۔ چند گھنٹے اسی حال میں گزرنے کے بعد تائیس اس کو اپنی اصلی شکل و صورت میں نظر آنے لگی۔ دیکھا تو اس کا حسن و جمال وہی ہے جو پہلے تھا۔ شروع میں وہ اس طرح نظر آئی کہ لیدا دیوی کی طرح سنبل کی سیج پر لیٹی ہے۔ منہ اونچا کئے ہوئے ہے۔ آنکھیں روشن اور نم ہیں۔ نتھنوں کو حرکت ہوتی ہے۔ چھاتیاں ابھری ہوئی ہیں اور دونوں بازو اس طرح پھیلے ہیں، جیسے عشق والفت کے دو چشمے رواں ہوں۔ یہ دیکھ کر پفنوتوس نے اپنا سینہ کوٹ لیا اور کہا: ”اے خدا میں تجھ کو گواہ کرتا ہوں کہ اب میں نے اپنے گناہ کی شدت کو سمجھ لیا۔“

تائیس کی صورت اب بدلنی شروع ہوئی۔ دونوں باچھیں نیچے کو جھک کر منہ کھل گیا اور رفتہ رفتہ ایک عجیب کیفیت درد والم کی چہرے سے ظاہر ہونے لگی۔ آنکھوں میں چمک تھی اور آنسو بھی بھرے تھے اور سینہ سے سانس اس طرح آتا تھا، جیسے طوفان سے پہلے ہوا کے تیز جھونکے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یکلخت آتے ہوں۔ یہ حالت دیکھ کر پفنوتوس کے دل پر تیر سا لگا۔ طبیعت میں ایک گداز پیدا ہوا۔ زمین پر اسی طرح گھٹنے ٹیکے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور خدا سے اس طرح فریاد کی: ”اے تو جس نے ہمارے دلوں میں رحم اس طرح ڈالا ہے، جیسے سبزے پر صبح کی شبنم گرتی ہے۔ اے عادل و رحیم! تیری حمد ہر وقت زبان پر ہے۔ میرے دل کے اس گداز کو جس سے نفس کو تحریص ہوتی ہے، دور کردے اور صرف اپنی راہ میں مخلوق کی محبت میرے دل میں پیدا کر، کیونکہ مخلوق فانی ہے اور تجھ کو ہمیشگی ہے۔ اس عورت کے لئے اگر میرے دل میں درد ہے تو صرف اس لئے ہے کہ وہ تیرے ہی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ایک چیز ہے۔ فرشتے بھی دردمندی سے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ خداوندا کیا تیرے ہی نفس پاک نے اس میں روح نہیں پھونکی تھی؟ پھر ہر کس و ناکس کے ساتھ اس کا مبتلائے گناہ ہونا بند کردے۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آتا ہے۔ اس کے گناہ نہایت مکروہ اور سنگین ہیں، جن کے خیال سے مجھ پر خوف طاری ہوتا ہے اور بدن کے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جس قدر اس کے گناہوں میں ترقی ہوتی ہے، اتنا ہی میرا ترس اس کے لئے بڑھتا جاتا ہے۔ جس وقت خیال آتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ کیسے سخت عذاب میں مبتلا ہوگی تو زار زار روتا ہوں۔“

دوسرے دن وظیفے و عبادت سے فارغ ہوتے ہی وہ ایک بڑے خدا رسیدہ راہب کے پاس گیا، جو یہاں سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ اس راہب کا نام بلمون تھا۔ دیکھا کہ وہ بہت ہی بشاش ہے۔ ہنستا چہرہ ہے اور حسب معمول باغیچہ میں زمین کھود رہا ہے۔ یہ راہب بہت بڈھا تھا اور یہ باغیچہ بھی اسی کا تھا۔ جنگل کے وحشی جانور اس سے مانوس تھے اور قریب آکر اس کے ہاتھ چاٹنے لگتے تھے۔ شیاطین بھی اس کو مطلق نہ ستاتے تھے۔

پفنوتوس کو دیکھتے ہی بلمون نے کدال چلانی بند کی مگر اسی طرح جھکے ہوئے کدال کے دستے پر ہاتھ ٹیک کر بولا: ”سب تعریف خدا کی ہے بھائی پفنوتوس۔“

پفنوتوس نے جواب دیا: ”سب تعریف اسی پروردگار کی ہے۔ تجھ پر سلامتی ہو۔ بھائی بلمون۔“

بلمون اب سیدھا کھڑا ہوا اور پیشانی کا پسینہ ہاتھ سے پونچھ کر بولا: ”اور تجھ پر بھی سلامتی ہو۔ بھائی پفنوتوس۔“

اس طرح سلام و جواب ختم ہونے کے بعد پفنوتوس نے کہا: ”بلمون! چونکہ ہماری گفتگو کا مقصد ہمیشہ اس ذات اقدس کی تعریف ہوتی ہے، جس نے وعدہ فرمایا ہے کہ اپنے ان بندوں پر ظاہر ہوگا جو اس کا نام لیتے ہوئے ایک ہی جگہ جمع ہوا کریں گے۔ اس لئے میں تمہارے پاس آیا ہوں کہ اپنا ایک ارادہ ظاہر کروں، جس سے مراد خداوند کے نام کی بزرگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔“

بلمون: "ہفنوتوس! خدا تمہارے ارادے میں ایسی ہی برکت دے، جیسے میری کیاری کے ساگ پات میں وہ برکت دیتا ہے۔ ہر روز میرے اس چھوٹے سے باغ کو اپنی رحمت کی اوس برسا کر وہ رونق بخشتا ہے اور جو ترکاریاں میری ان کیاریوں میں بہ افراط ہوتی ہیں، وہ بھی سب اسی کا احسان و کرم ہیں اور اسی کی حمد ہر وقت بجالاتا ہوں۔ آؤ بھائی خدا سے التجا کریں کہ وہ ہمیشہ ہمارے قلب کو مطمئن رکھے کیونکہ بے قاعدہ خواہشوں سے جو فکر و پریشانی انسان کو ہوتی ہے، ان سے ہمیشہ ڈرنا چاہیے۔"

ہفنوتوس: "تو پھر اے برادر مہربان سنئے۔ ایک خیال نے میرے دل کو نہایت غمگین کر رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسکندریہ کے شہر میں ایک تماشے والی ہے، جس کا نام تائیس ہے۔ وہ خود گناہوں میں مبتلا ہے اور لوگوں کو بھی گنہگار کرتی ہے۔"

بلمون: "یہ تو بڑی ناپاکی ہے۔ بے دینوں میں بہت سی عورتیں اسی طرح زندگی بسر کرتی ہیں، تو کیا تم نے اس کا کوئی علاج سوچا ہے؟"

ہفنوتوس: "ہاں میرا ارادہ ہے کہ اسکندریہ جا کر اس عورت کو تلاش کروں اور خدا کی مدد سے اسے نیک راستے پر لاؤں۔ یہی میرا مقصد ہے۔ آپ اس کو پسند کرتے ہیں یا نہیں؟"

بلمون: "بھائی ہفنوتوس! میں تو ایک گنہگار بندہ ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔ لیکن قسیس اکبر انطونی کا قول مجھے یاد ہے کہ "جہاں کہیں بھی تم ہو وہاں سے دوسری جگہ جانے میں جلدی نہ کرو۔"

ہفنوتوس: "تو کیا بھائی بلمون! آپ کو میرے اس ارادے میں کوئی بات کھٹکتی ہے؟"

بلمون: "خدا وہ دن نہ لائے کہ میں کسی بھائی کے ارادہ کو بدگمانی کی نظر سے دیکھوں۔ لیکن ہمارا مقدس انطونی کہا کرتا تھا کہ "جب مچھلیاں پانی سے نکال کر زمین پر ڈال دی جاتی ہیں تو وہ مر جاتی ہیں۔ اسی طرح راہب جب اپنی جھونپڑیوں اور حجروں سے نکل کر دنیا کے لوگوں میں جاتے ہیں تو وہ اپنے پاک مقصد سے ہٹ جاتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر بلمون نے پھر اپنی کدال سنبھالی اور ایک انجیر کے درخت کی جڑ کے پاس مٹی کو نرم کرنے لگا جس میں کثرت سے پھل آئے ہوئے تھے۔ اس کام میں مصروف تھا کہ ایک ہرنی جو باغیچہ کی باڑ کود کر اندر آ چکی تھی کچھ دور ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور پھر دو چوکڑیاں بھر کر بلمون کے پاس آئی اور اس کی گود میں اپنا منہ ڈال دیا۔

بلمون بولا: "صحرا کے ان غزالوں کو دیکھ کر بھی خدا کی تعریف کرو۔"

اس کے بعد وہ اپنی جھونپڑی میں گیا۔ خوبصورت ہرنی بھی پیچھے پیچھے گئی۔ راہب نے کچھ روٹی نکالی اور ہرنی اس کے ہاتھ سے روٹی کھانے لگی۔

ہفنوتوس دیر تک زمین کی طرف دیکھتا ہوا کسی خیال میں غرق رہا۔ پھر آہستہ قدم اپنی جھونپڑی کی طرف چلا اور بلمون سے جو کچھ سنا تھا، اس پر برابر غور کرتا رہا۔

دل میں کہنے لگا: "یہ راہب بڑا آزمودہ کار ہے۔ مزاج میں بہت احتیاط ہے، اس نے میرے ارادے کو درست نہیں سمجھا، بہرکیف تائیس کو یونہی شیطان کے قبضے میں رہنے دینا اب تک ایک ظلم معلوم ہوتا ہے۔ خدا میرا رہنما بنے اور مجھ کو نیک ہدایت دے۔"

یہی سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ دیکھا ریت پر چڑی مار کے جال میں ایک پرندہ پھنس گیا ہے۔ صورت دیکھ کر پہچانا کہ وہ بگلے کی مادہ ہے۔ اتنے میں اس کا نر تیز اڑتا ہوا آیا اور اپنی چونچ سے جلدی جلدی جال کے پھندے کو توڑنے لگا۔ یہاں تک کہ جال میں ایک بڑا سوراخ ہو گیا اور بگلے کی مادہ قید سے آزاد ہو کر اڑ گئی۔ خدا پرست راہب نے اس واقعہ پر غور کیا اور اپنے نفس کی پاکیزگی سے جو معنی اس میں مخفی تھے، ان کو آسانی سے سمجھ گیا۔ خیال ہوا کہ جال میں پھنسے ہوئے پرندے سے مراد سوائے تائیس کے اور کوئی نہیں ہے، جو اس وقت قعر عصیاں میں ڈوب رہی ہے اور جس طرح اس وقت بگلے نے اپنی چونچ سے جال کے پھندے توڑے ہیں، اسی طرح پند و نصیحت کی قوت سے ان ناپدید بندشوں کو توڑ ڈالنا چاہیے، جنہوں نے تائیس کو گناہوں میں جکڑ رکھا ہے۔ اس خیال کے آنے پر اس نے خدا کی تعریف کی اور اپنے ارادہ میں بالکل پختہ ہو گیا۔ لیکن جب پیچھے مڑ کر دیکھا کہ جس پرندے نے جال کو توڑا تھا، خود اس کے پنجے جال میں پھنس گئے ہیں تو اس کو اپنے ارادے میں تذبذب ہوا۔

رات بھر ہفنوتوس کو نیند نہ آئی' صبح ہونے سے پہلے اس نے خواب میں دیکھا کہ تائیس پھر اس کے سامنے آئی ہے اور آج اس کے چہرے پر کوئی علامت جس سے ہوا و ہوس پیدا ہوتی ہو نہیں پائی جاتی۔ لباس بھی اس کا باریک نہیں ہے۔ بلکہ ایک موٹی چادر میں سر سے پاؤں تک لپٹی ہے۔ سارا بدن چھپا ہے' صرف آنکھیں نظر آتی ہیں' جن میں آنسو بھرے ہیں۔

یہ دیکھ کر ہفنوتوس بھی رونے لگا اور سمجھا کہ خواب میں یہ شکل خدا کی طرف سے اس پر ظاہر کی گئی ہے۔ پس اس کا تذبذب بالکل جاتا رہا اور ایک لکڑی جو اوپر سے کچھ ٹیڑھی تھی (اور نصرانیت کا نشان سمجھی جاتی تھی) ہاتھ میں لے جھونپڑی سے باہر آیا۔ دروازہ احتیاط سے بند کیا تاکہ کتاب مقدس جو سرہانے رہا کرتی تھی' اس کو صحرا کے چوپائے اور پرندے اندر آکر خراب نہ کریں۔ پھر اس نے اپنے چوبیس شاگردوں میں سے فلے ویان کو طلب کیا اور باقی تیئیس شاگردوں کی نگرانی و نگہداشت اس کے سپرد کی اور کمبل کا نیچا کرتا پہنے دریائے نیل کی طرف اس ارادہ سے چل پڑا کہ دشت لبیا کی جانب جو کنارہ دریا کا چلا گیا ہے' اس کی ریتی ریتی چل کر اسکندر مقدونی کے بسائے ہوئے شہر میں پہنچ جائے۔ سورج نکلتے ہی ریتی میں چلنا شروع کر دیا۔ نہ تکان کی پروا تھی' نہ بھوک اور پیاس کی۔ یہاں تک کہ آفتاب افق مغرب کے قریب پہنچا۔ آسمان پر شفق پھولی اور دیکھا کہ جن پہاڑیوں کے بیچ میں سے دریا گزرا تھا' وہ آگ کا شعلہ یا سونے کا ڈلا بن گئی ہیں اور دریا کی موجوں پر کسی نے خون کی افشان کر دی ہے۔ اسی حال میں دریا کے کنارے کنارے سفر جاری رکھا۔ جب بھوک بہت ستاتی تھی اور ایسی جھونپڑیاں رستے میں ملتی تھیں' جو عشق خدا میں ایک دوسرے سے بے تعلق دور دور ڈالی گئی تھیں' تو ان کے دروازے پر جا کر روٹی مانگتا تھا۔ اگر روٹی کے بدلے جواب میں گالیاں یا انکار یا دھمکیاں سننی پڑتیں' تو ان کو بہت خوشی سے گوارا کر لیتا۔ اسے قزاقوں کا ڈر تھا نہ جنگلی درندوں کا۔

کبھی شاہ راہ چھوڑ کو وہ دوسرے رستوں سے سفر کرتا تھا۔ جب شام ہو جاتی تھی اور املیوں کے گھنے درخت ہوا سے جھومنے لگتے تھے' تو یہ کیفیت دیکھ کر وہ خود بھی کانپ جاتا تھا اور جلدی سے منہ ڈھانک لیتا تھا کہ قدرت کی حسین چیزوں پر نظر نہ پڑے۔ چھ دن سفر کرنے کے بعد وہ ایک مقام پر پہنچا جسے سلسلی کہتے تھے۔ یہاں دریائے نیل ایک تنگ گھاٹی میں سے گزرتا تھا۔ دونوں طرف کناروں سے قریب سنگ مارا کے اونچے اونچے پہاڑ کھڑے تھے۔ اسی مقام پر مصر قدیم کے لوگوں نے جبکہ وہ شیاطین اور بلیات کی پرستش کرتے تھے' اپنے معبودوں کی سنگی مورتیں بڑی بڑی چٹانوں کو تراش کر بنائی تھیں۔ ان ہی بتوں میں ایک بہت بڑا سر ابوالہول کا نظر آیا جو پہاڑوں کے بیچ میں ایک بڑی چٹان کو کاٹ کر بنایا تھا۔ راہب ڈرا کہ کہیں کسی شیطانی اثر سے یہ سر زندہ نہ ہو جائے۔ اس نے فوراً اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور مسیح کا نام لیا۔ اس نام کے لیتے ہی اس سر کے کان میں سے ایک چمگادڑ نکل کر اڑ گئی۔ ہفنوتوس سمجھا کہ اس بت میں جو بلائے بد صدہا برس سے مقید تھی' وہ مسیح کا نام لیتے ہی فرار ہوئی۔ جوش ایمان اور بڑھا اور ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس نے ابوالہول کے چہرے پر مارا۔ پتھر کے لگتے ہی یہ چہرہ اس درجہ غمزدہ معلوم ہونے لگا کہ ہفنوتوس کو اس پر بے اختیار رحم آیا۔ حقیقت میں اس چہرہ سے ایسا غم والم ظاہر ہونے لگا تھا کہ بے درد سے بے درد کا دل بھی اسے دیکھ کر ہل جاتا۔ غرض ہفنوتوس نے اس پتھر کے ابوالہول سے کہا:

"اے جانور! مسیح کے خدا ہونے کا قائل ہو۔ پھر میں باپ بیٹے اور روح القدس کا نام لے کر تجھے برکت دوں گا۔"

اتنا کہتے ہی ابوالہول کے چہرے پر ایک سرخ روشنی چمکی اور اس کی آنکھوں کے موٹے موٹے پپوٹوں میں حرکت پیدا ہوئی اور پتھر کے ہونٹوں سے مسیح کا نام ایسی آواز میں سنائی دیا جو انسان کی ایک صدائے بازگشت معلوم ہوتی تھی۔ اس پر ہفنوتوس نے فوراً اپنا داہنا ہاتھ بلند کیا اور ابوالہول کے حق میں دعا کی۔

اس کے بعد آگے چلا۔ جب تنگ گھاٹی سے باہر آیا تو ایک عظیم الشان شہر کے صدہا کھنڈر نظر آئے۔ سترہ دن تک وہ سفر کرتا رہا۔ جنگلی پھل زمین سے اٹھا کر کھا لیتا تھا اور رات کو برباد محلوں میں کہیں پڑ رہتا تھا' جہاں فرعونوں کے جنگلی بلاؤ اور چوہے ایسی عورتوں کے ساتھ رہا کرتے تھے' جن کا نیچے کا دھڑ فلس دار ماہی کا سا ہوتا تھا۔

ﷺفنوتوس کو خوب معلوم تھا کہ یہ عورتیں دوزخ سے نکل کر یہاں آباد ہوئی ہیں' چنانچہ جہاں اس کو ان کی ذرا بھی آہٹ معلوم ہوتی فوراً صلیب کا نشان بنا کر ان کو دور کر دیتا تھا۔

اٹھارویں دن اس کا گزر ایک بہت ہی زدہ حال جھونپڑی سے ہوا' جو کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے قریب کوئی گاؤں تھا نہ بستی اور چاروں طرف ہوا سے ریت کے اتنے ڈھیر ہو گئے تھے کہ وہ بالکل زمین میں گڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ﷺفنوتوس سمجھا کہ اس میں کوئی بڑا ہی بزرگ راہب رہتا ہو گا۔ غرض وہ جھونپڑی کے قریب آیا۔ دروازہ اس میں نہ تھا۔ باہر ہی سے نظر آیا کہ اندر پانی کا ایک گھڑا اور کونے میں ایک طرف کو کچھ پیاز کی گٹھیاں پڑی ہیں اور ایک بچھونا سا خشک پتوں کا بچھا ہے۔

ﷺفنوتوس نے دل میں کہا کہ "گھر کا یہ سامان تو کسی بڑے ہی عابد و زاہد کا معلوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ گھر سے دور نہیں جایا کرتے۔ یہیں کہیں آس پاس ہو گا اور جلد ملاقات ہو جائے گی اور جب اس سے ملاقات ہو گی تو اسے سلام کر کے اس کی پیشانی کا بوسہ لوں گا اور اس میں' میں اپنے قسیس محترم انطونی کی مثال کا تتبع کروں گا' کیونکہ جب وہ اس صحرا کے ایک مشہور راہب پولوس کی جھونپڑی کے پاس سے گزرا تھا تو تین مرتبہ اس سے بغل گیر ہوا تھا' میں بھی اس راہب سے ملتے ہی معانقہ کروں گا اور پھر ہم دونوں مل کر خدا کی باتیں کریں گے اور کیا عجب ہے کہ اس وقت خداوند کسی کوے کو چونچ میں روٹی لئے ہوئے ہمارے پاس بھیجے اور یہ راہب مجھ کو بھی ایک ٹکڑا اس میں سے دے۔"

اسی شوق میں ارادہ کیا کہ جھونپڑی کے گرد ایک چکر لگانا چاہیے۔ شاید راہب سے ملاقات ہو جائے۔ اس قصد سے کوئی سو قدم گیا ہو گا کہ دریا کے کنارے ایک آدمی بیٹھا دکھائی دیا۔ سر سے پاؤں تک بالکل برہنہ۔ ڈاڑھی اور سر کے بال جیسے بگلے کے پر اور بدن کا رنگ ایسا جیسے لوہے پر زنگ آ گیا ہو۔ اب ذرا شبہ نہ رہا کہ جھونپڑی کا رہنے والا یہی بڈھا ہے۔ فوراً قریب گیا اور راہبوں کے طریقہ کے مطابق اس پیر سال خورد کو اس طرح سلام کیا۔

ﷺفنوتوس: "برادر' تجھ پر سلام ہو اور جنت کے شیریں میوے کھانے نصیب ہوں۔"

بڈھے نے کچھ جواب نہ دیا اور جس طرح بیٹھا تھا اسی طرح دم سادھے بیٹھا رہا۔ بلکہ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ ﷺفنوتوس سمجھا کہ شائد یہ خاموشی اس حالت وجدان کی ہے' جو مسیحی درویشوں پر اکثر طاری ہو جایا کرتی ہے۔ بہرکیف اس بڈھے کے سامنے وہ اپنے دونوں ہاتھ سینہ پر رکھ کر گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا اور شام کی عبادت کے وقت تک یونہی کھڑا رہا۔ جب دیکھا کہ اس بزرگ کو کسی طرح جنبش ہی نہیں ہوتی تو کہنا شروع کیا:

"بابا! اگر آپ اپنے مراقبہ سے فارغ ہو چکے ہوں تو خداوند یسوع مسیح کا نام لے کر مجھے برکت دیجئے۔"

اب بڈھے نے بغیر گردن پھیرے جواب دیا: "اے اجنبی! نہ میں تیری بات کا مطلب سمجھتا ہوں اور نہ میں خداوند یسوع مسیح کو جانتا ہوں کہ وہ کون ہے۔"

ل اتنا سنتے ہی ﷺفنوتوس تعجب سے چلا کر بولا۔ "ہائیں یہ کیا کہتے ہو؟ یسوع مسیح تو وہ ہے جس کی خبر نبیوں نے دی تھی۔ ہزارہا لوگ اس کے نام پر شہید ہوئے۔ خود قیصر نے اس کی پرستش کی اور ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ میں نے سلسلی کے ابوالہول کو اس کا نام پکارتے ہوئے سنا ہے' کیا یہ ممکن ہے کہ تم خداوند کے نام کو نہ جانتے ہو؟"

بڈھا: "اے عزیز! یہ بالکل ممکن ہے اور اگر یقین کا وجود دنیا میں ہوتا تو یہ امکان بالکل یقینی ہوتا۔"

ﷺفنوتوس کو اس بڈھے کی لاعلمی پر سخت تعجب اور افسوس ہونے لگا' وہ بڈھے سے کہنے لگا: "اگر تم یسوع مسیح کو نہیں جانتے تو تم کو اس ریاضت سے کیا نفع ہو سکتا ہے۔ بغیر خداوند کو جانے تم ہمیشہ کی زندگی کبھی نہیں پا سکو گے۔"

بڈھے نے جواب دیا: "پانا نہ پانا' زندگی اور موت میرے لئے سب ہیچ ہیں۔"

ﷺفنوتوس: "ہائیں! تو کیا تمہیں ہمیشہ کی زندگی کی بھی پروا نہیں۔ کیا تم اس صحرا میں ایک راہب کی طرح جھونپڑی میں نہیں رہتے ہو؟"

بڈھا: "ظاہر تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

ﷺفنوتوس: "کیا تم ہر قسم کے سامان سے محروم اور

برہنہ نہیں ہو؟"

بڈھا: "ظاہر تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

پفنوتوس: "کیا تم جڑی بوٹی گھاس پتی کھا کر نہیں جیتے ہو؟"

بڈھا: "بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔"

پفنوتوس: "کیا تم نے دنیا کی باطل اور فضول باتوں سے کنارہ نہیں کیا ہے؟"

بڈھا: "یہ سچ ہے کہ میں نے ایسی باطل اور فضول چیزوں سے پرہیز کیا ہے، جن کے حاصل کرنے کی اکثر لوگ کوشش کرتے ہیں۔"

پفنوتوس: "تو پھر تم ایسے ہی ہوئے جیسا کہ میں ہوں، یعنی مفلس، پاک باز اور تارک الدنیا۔ لیکن میری طرح عشق معبود کا سایہ اور آسمان کی نگاہ مہر تم پر نہیں ہے۔ اگر تم یسوع مسیح پر ایمان نہیں رکھتے تو پھر تمہاری ان نیکیوں سے کیا حاصل؟ اگر تم کو آسمان پر نعمتیں ملنے کی توقع نہیں تو پھر دنیا کی نعمتوں سے کیوں اپنے تئیں محروم کیا؟"

بڈھا: "اے اجنبی! میں نے اپنے تئیں کسی چیز سے محروم نہیں کیا۔ صرف مجھے ایک ایسا طریقہ زندگی بسر کرنے کا معلوم ہو گیا جو میری تسکین کے لئے کافی ہے۔ گو واقعہ یہ ہے کہ یہ طرز زندگی اچھا ہے نہ برا۔ کوئی بات بذات خود قابل فخر ہے نہ قابل شرم، اس میں انصاف ہے نہ بے انصافی، وہ خود گوار ہے نہ ناگوار۔ یہ فقط انسان کا خیال ہے جو ہر شے میں اس کی صفات اس طرح پیدا کر دیتا ہے جیسے نمک کھانوں میں ذائقہ پیدا کر دیتا ہے۔"

پفنوتوس: "تو پھر کیا تمہارے خیال میں یقین کا دنیا میں وجود ہی نہیں۔ کیا تم کو اس حقیقت سے انکار ہے، جس کی تلاش میں بت پرست تک رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہالت تم پر اس طرح چھائی ہے جیسے تھکا ہوا کتا کیچڑ میں بے خبر سوتا ہو۔"

بڈھا: "فلسفیوں کو برا کہنا بھی ایسا ہی بیکار ہے، جیسے کتوں کو برا سمجھنا۔ ہم کو نہیں معلوم کہ کتاب کیا ہے اور ہم خود کیا ہیں۔ ہم کو تو کسی چیز کا بھی علم نہیں۔"

پفنوتوس: "ارے بڈھے، تو پھر کیا تو اس مسخرے فرقے کا آدمی ہے، جس کو متشکک کہتے ہیں۔ کیا تو بھی ان کور بخت احمقوں میں ہے، جن کو حرکت اور سکون دونوں سے انکار ہے اور جن کی بصارت اتنی بھی نہیں کہ دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے میں تمیز کر سکیں؟"

بڈھا: "اے عزیز! اس میں کلام نہیں کہ میں متشکک ہوں اور مجھے ایسے فرقے سے تعلق ہے، جس کو تو مسخرا اور میں اچھا سمجھتا ہوں، کیونکہ ایک ہی شے مختلف صورتوں میں نظر آیا کرتی ہے۔ منف کے اہرام طلوع آفتاب کے وقت گلابی روشنی کے مخروط معلوم ہوتے ہیں، مگر وہی اہرام غروب کے وقت جب آسمان پر شفق ہوتی ہے، ایک مشتعل سطح پر سیاہ مثلث نظر آتے ہیں، لیکن ان کی اندرونی کیفیت کسی پر ظاہر نہیں۔ تو صورتوں کے انکار پر مجھے ملامت کرتا ہے، حالانکہ میں صرف صورت ہی کو حقیقت مانتا ہوں۔ آفتاب مجھ کو روشن معلوم ہوتا ہے، مگر اس کی ماہیت سے میں آگاہ نہیں۔ جانتا ہوں کہ آگ جلا دیتی ہے، لیکن کس طرح اور کیوں جلا دیتی ہے، اس سے ناواقف ہوں۔ اے میرے عزیز تو مجھے بہت برا خیال کرتا ہے مگر تیرے اس خیال سے میرا کچھ بنتا بگڑتا نہیں۔"

پفنوتوس: "اس صحرا میں سوکھی کھجوریں اور جنگلی پیاز کھا کر کیوں گزر کرتے ہو؟ کیوں اپنے نفس پر اس طرح کی سختیاں جھیلتے ہو؟ میں بھی تمہاری طرح دنیا چھوڑ کر پرہیزگاری سے زندگی بسر کرتا ہوں، لیکن یہ طریقہ میں نے خدا کو خوش کرنے کے لئے اختیار کیا ہے تاکہ ازلی مسرت مجھے نصیب ہو۔ یہ ایک معقول وجہ ہے۔ کسی بڑے انعام کے لئے تکلیفیں اٹھانا عقل کی بات ہے۔ برعکس اس کے یہ جنون ہے کہ انسان جان بوجھ کر ایسی تکلیفیں برداشت کرے، جن سے کچھ حاصل نہ ہو۔ اگر میں ایمان نہ رکھتا ہوتا (اور اے نور قدیم وازلی تو اس کفر بکنے پر مجھے معاف کرے گا) اگر میں خدا کی نسبت جو تعلیم مجھے دی گئی ہے، اسے نبیوں کے کلام اور ابن اللہ کی مثال اور "رسولوں" کے اعمال اور مسیحی مجالس کے احکام اور شہیدوں کی گواہی کی بنیاد پر یقین نہ کرتا ہوتا، اگر مجھ کو علم نہ ہوتا کہ جسم کو آزار پہنچانے سے روح کی اصلاح ہوتی ہے، اگر میں تیری طرح اسرار نصرانیت سے ناآشنا ہوتا تو فوراً دنیا کی طرف پلٹ جاتا۔ دولت کمانے کی فکر کرتا۔ زندگی کا حظ اٹھاتا اور عیش و نشاط کی ذریات سے کہتا۔ "آؤ۔ آؤ۔ میری بیٹیو! میرے ملازمو۔ آؤ اور اپنی اپنی شرابیں اور عرقیات اور عطریات میرے سامنے رکھو۔"

لیکن تم ایسے عقل کے دشمن ہو کہ تمام لذائذ سے بلاوجہ محروم ہو گئے۔ نقصان تم اٹھاتے ہو اور فائدہ کچھ نہیں حاصل کرتے۔ اپنی چیز دوسرے کو مستعار دیتے ہو اور اس کی توقع نہیں رکھتے کہ وہ واپس ملے گی۔ ہم عابدوں اور راہبوں کی نقل تم اس طرح اتارتے ہو جیسے کوئی بندر ایک دیوار پر اپنے پنجوں سے چھاپے مارے اور سمجھے کہ وہ کسی باکمال مصور کی تصویر کی نقل اتار رہا ہے۔ اے بے وقوفوں کے سردار بتا تو کہ وہ کیا اسباب و دلائل ہیں' جن کی بنا پر تو نے اپنا یہ درجہ کیا ہے؟"

سفنوتوس نے یہ جملے بہت ہی جوش و خروش میں کہے تھے' لیکن بڈھے پر مطلق اثر نہ ہوا اور وہ بہت ہی نرمی سے بولا:

"یار عزیز۔ کیچڑ میں سوئے ہوئے کتے یا ایک شریر بندر کے پاس اسباب و دلائل ہوں تو کیا' اور نہ ہوں تو کیا؟"

سفنوتوس کی غرض اس گفتگو سے محض خدا کے نام کو بزرگی دینی تھی۔ اب اس کا غصہ جاتا رہا۔ شرمندہ ہوا اور اپنے نفس کو ملامت کر کے بڈھے سے کہنے لگا: "تو میرا بھائی ہے۔ اگر حق کے کہنے میں مجھ سے تجاوز ہوا تو مجھے معاف کر۔ خدا میرا شاہد ہے کہ مجھے تیری ذات سے کسی طرح کی پرخاش نہیں۔ صرف تیری خطاو غلطی سے نفرت ہے کیونکہ میں مسیح کے طفیل تجھ سے محبت رکھتا ہوں اور تیری نجات میری دلی تمنا ہے۔ اب بتا کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر تو نے یہ حالت اختیار کی۔ مجھ کو ان کے سننے کی ضرورت ہے تاکہ میں ان کی غلطی ثابت کر سکوں۔"

بڈھے نے بہت نرمی سے جواب دیا:

"بولنے کو بھی ایسا ہی جی چاہتا ہے جیسا چپ رہنے کو۔ میں اپنے اسباب و دلائل تیرے سامنے بیان کر دوں گا' لیکن تیرے دلائل سننے کی مجھے خواہش نہیں کیونکہ مجھے کسی طرح کی دلچسپی تیرے ساتھ نہیں۔ مجھے تیری خوشی کا خیال ہے نہ رنج کا اور جو کچھ تیرے خیالات میری نسبت ہیں وہ میرے حق میں بالکل بے اثر ہیں کیونکہ میں کسی سے عداوت رکھ سکتا ہوں نہ دوستی۔ عداوت اور ہمدردی دونوں ایک عاقل کے لئے صفر ہیں۔ لیکن جب تو پوچھتا ہے تو سن۔ میرا نام تیموکلیس ہے۔ میں کوس کے شہر میں ایسے ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوا تھا' جنہوں نے تجارت سے بہت دولت پیدا کی تھی۔ میرا باپ جہازوں کے لئے لڑائی کا سامان مہیا کیا کرتا تھا۔ ذہانت اور ہوشیاری میں وہ سکندر کی مثل تھا' لیکن ویسا عمق نہ رکھتا تھا۔ میرے دو بھائی تھے۔ انہوں نے بھی ہتھیار اور جنگی سامان بیچنے کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ لیکن میں تحصیل فنون کی طرف مائل ہوا۔ میرے باپ نے میرے ایک بھائی کی شادی کوریا کی ایک عورت سے جبراً کر دی۔ اس عورت کا نام تمیسا تھا۔ میرے بھائی کو وہ اس قدر ناپسند ہوئی کہ وہ اس کے ساتھ نہ رہ سکا اور اس کا اسے مطلق افسوس بھی نہ ہوا۔ اب میرے دوسرے بھائی کو تمیسا کے ساتھ ناپاک عشق پیدا ہوا اور اس کی حالت دیوانگی تک پہنچ گئی لیکن تمیسا کو میرے دونوں بھائیوں سے نفرت تھی۔ اس کو دراصل ایک بانسری بجانے والے سے عشق تھا اور رات کو چھپ کر وہ اس کے پاس بھی آیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اسی طرح شب باش رہنے کے بعد جب وہ صبح ہوتے ہی اٹھ کر چلا تو اپنی تاج نما ٹوپی جو وہ محفلوں میں پہنا کرتا تھا' وہیں بھول گیا۔ جب میرے دونوں بھائیوں کو تمیسا کے کمرے میں یہ ٹوپی ملی تو انہوں نے اس بانسری والے کو ہلاک کرنے پر قسم کھائی اور دوسرے دن اس کو پکڑ کر اتنے کوڑے مارے کہ وہ مر گیا۔ اس کی منت سماجت آہ و زاری کی مطلق پروا نہ کی۔ میری بھاوج کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ دیوانی ہو گئی اور اس کا اور میرے دونوں بھائیوں کا یہ حال ہوا کہ بالکل مجنوں ہو کر وحشی جانوروں کی طرح شہر کے گرد پھرنے لگے۔ بھیڑیوں کی طرح چیخا کرتے تھے اور منہ سے کف جاری رہتے تھے اور آنکھیں زمین پر گڑی رہتی تھیں۔ شہر کے لڑکوں کی ایک بھیڑ پیچھے پیچھے ہوتی تھی اور یہ لڑکے ان دیوانوں کو پتھر مارا کرتے تھے۔ غرض اسی حال میں کچھ دن بعد یہ تینوں مر گئے' میرے باپ نے ان کو دفن کیا۔ تھوڑے دن کے بعد میرا باپ بیمار پڑا۔ اس کا معدہ کسی طرح کی غذا قبول نہ کرتا تھا' یہاں تک کہ وہ محض فاقوں سے مر گیا۔ حالانکہ دولت اس کے پاس اس قدر تھی کہ اگر چاہتا تو وہ ایشیا کے تمام بازاروں میں جس قدر کھانے پینے کی چیزیں تھیں' سب خرید لیتا۔ مرتے وقت اس کو افسوس تھا کہ اپنی دولت وہ میرے لئے چھوڑے جاتا ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کا روپیہ میں نے سیر و سفر میں صرف کرنا شروع کیا۔ اطالیہ' یونان'

افریقہ میں پھرتا رہا۔ لیکن کہیں عقلمند اور خوش رہنے والا انسان نہیں ملا' ایتھنز اور اسکندریہ میں قیام کرکے حکمت و فلسفہ کی تحصیل کی اور ان علوم پر لوگوں کی بحثیں سنتے سنتے تنگ آگیا۔ آخرکار ہندوستان پہنچا۔ وہاں گنگا کے کنارے ایک ننگے جوگی کو دیکھا کہ آسن مارے بالکل دم بخود بیٹھا ہے اور تیس برس اسی حال میں گزرے ہیں۔ درختوں کی بیلیں اس کے خشک و لاغر جسم پر چڑھ گئی ہیں اور سر کے بال بڑھ کر اتنے پھولے ہیں کہ پرندوں نے اپنے آشیانے ان میں بنا لئے ہیں۔ مگر باوجود اس کے یہ آدمی زندہ ہے' یہ کیفیت دیکھ کر مجھے تمیسا اور اس کے آشنا اور اپنے دونوں بھائیوں اور باپ کا خیال آیا اور یہ سمجھ میں آیا کہ دنیا میں اگر صاحب عقل کسی کو کہا جا سکتا ہے تو وہ یہی جوگی ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ انسان کی تکلیف کا باعث یا تو یہ ہوتا ہے کہ جس چیز میں اسے نفع کا یقین ہوتا ہے' اس سے محروم کردیا جاتا ہے یا اگر کوئی نفع حاصل ہے تو اس کے ضائع ہو جانے کا خوف پیدا ہوتا ہے یا اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ بلاوجہ بدسلوکی کی گئی ہے غرض ان باتوں کا یقین فی الحقیقت اس کی تکلیف کا موجب ہوتا ہے۔ پس اگر اس یقین ہی کو دل سے نکال دیا جائے تو تکلیفیں ظاہر ہے کہ خود بخود مٹ جائیں گی۔ اس خیال کے آتے ہی جوگی کی مثال کو پیش نظر رکھ کر میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب کسی چیز کو سودمند نہ سمجھوں گا اور دنیا کے ساز و سامان سے علیحدہ رہنے کو اپنا طریقہ قرار دے کر بالکل تنہائی اور بے حسی کی حالت میں زندگی بسر کروں گا۔"

پفنوتوس بڈھے کے قصے کو بغور سن کر کہنے لگا:

"تیمو کلیس! اتنا میں ضرور تسلیم کروں گا کہ جس طریقہ سے زندگی بسر کرنے کا فیصلہ تم نے کیا' اس کی سب باتیں غلط نہ تھیں۔ مثلاً یہ دانشمندی تھی کہ دنیا کی مکروہات سے تم نے نفرت کی' لیکن جو ذات ازلی و ابدی ہے اس کو کچھ نہ سمجھا اور خدا کا غضب اپنے اوپر لینا سراسر جنون و دیوانگی ہے۔ مجھ کو تمہاری جہالت پر افسوس ہے اور میں چاہتا ہوں کہ حق بات تم کو سکھاؤں اور وہ یہ ہے کہ خدا موجود ہے' تین اقنوموں میں اور اس خدا کی اطاعت تم پر ایسی ہی فرض ہے' جیسے بیٹے پر باپ کی فرمانبرداری۔"

اتنا سنتے ہی بڈھے نے پفنوتوس کی بات کاٹ کر کہا:

"اے اجنبی! اپنے مذہب کی باتیں بیان کرنے سے باز رہ اور اپنے عقائد اختیار کرنے پر مجھے مجبور نہ کر۔ بحث مباحثہ سب بیکار ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ انسان کو کوئی رائے رکھنی ہی نہیں چاہیے۔ جب تک میں ایک چیز کو دوسری چیز پر مرجح نہیں سمجھتا تمام تکلیفوں سے بری ہوں۔ پس اے راہب اپنی راہ لے اور مجھے اس حالت بے حسی سے نکالنے کی کوشش نہ کر۔ مجھ کو اسی میں راحت ہے۔ جیسے ایک تھکا آدمی گرم پانی میں غوطہ لگا کر آرام پاتا ہے' وہی کیفیت اس حالت استغراق میں میری ہے۔"

پفنوتوس عیسوی مذہب کا بڑا عالم تھا اور لوگوں کے دلوں کی کیفیت خوب پہچانتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس بڈھے کو خدا کی برکت نصیب نہیں ہوئی اور اس کی روح کے لئے جو عدم نجات کے خطرہ سے نا آشنا ہے' ابھی تک نجات کا دن نہیں آیا۔ پس پفنوتوس نے اس خیال سے جواب دینا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں موعظت حسنہ کا اس شخص پر الٹا اثر نہ ہو' کیونکہ بعض وقت بے دینوں کو نصیحت کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے سعادت حاصل کرنے کے وہ اور زیادہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جو لوگ حق بات جانتے ہیں' ان کو اس کی اشاعت میں بہت احتیاط کرنی پڑتی ہے۔

پفنوتوس نے کہا: "اچھا میں رخصت ہوتا ہوں' مگر تیمو کلیس تم بڑے بدنصیب ہو۔"

اتنا کہہ کر پفنوتوس نے ایک آہ سرد بھری اور تاریکی میں اپنا سفر جو خدا کی راہ میں اختیار کیا تھا پھر شروع کردیا۔

پفنوتوس آگے بڑھا اور اسکندریہ کے شہر میں شمسی دروازہ سے داخل ہوا۔ یہ دروازہ سنگی تھا اور اس کی بلند و پرشکوہ عمارت پر ایک غرور برس رہا تھا مگر اس کے سایہ میں نہایت غریب اور اپاہج لوگ بیٹھے راہ چلنے والوں کے ہاتھ انجیر اور سیب بیچتے تھے یا فقیر رو رو کر بھیک مانگتے تھے۔

ایک طرف کو ایک غریب بڑھیا بدن پر چیتھڑے لگائے پشت خم کئے کھڑی تھی۔ جب پفنوتوس اس کے پاس سے گزرا تو اس نے راہب کے دامن کو چوم کر کہا:

"اے اللہ والے۔ مجھ کو برکت دے تاکہ خدا بھی

تجھ کو برکت دے۔ میں نے اس دنیا میں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ مرنے کے بعد آرام چاہتی ہوں۔ اے نیک مرد، تو خدا کے پاس سے آتا ہے۔ تیرے قدموں کی خاک سونے کے ذروں سے زیادہ قیمتی ہے۔"

پفنوتوس نے سنتے ہی کہا: "خدا کے نام کو بزرگی ہو۔" اور اتنا کہہ کر بڑھیا کے سر پر اس نے نجات کا نشان بنایا۔

اس کے بعد شائد بیس قدم آگے گیا ہوگا کہ بازار میں لڑکوں کا ایک غول ملا۔ انہوں نے فوراً پتھر برسانے اور پکار پکار کر کہنا شروع کیا:

"ارے او شریر راہب۔ تیرا رنگ کوے سے زیادہ کالا ہے اور تیری داڑھی بکرے کی داڑھی سے بھی لمبی ہے اور تو کاٹ بھی کھاتا ہے۔ یارو! آؤ کسی کھیت میں چل کر اسے پھانسی پر لٹکائیں۔ پھر چڑیاں ڈر کے مارے کھیت نہ کھائیں گی۔ نہیں تو یہ اولے برسائے گا اور سیب کے درختوں میں جتنے پھول آئے ہیں، سب گر جائیں گے۔ یہ بڑا نحس قدم ہے، چلو اس کی بوٹیاں کاٹ کر کوؤں کو کھلا دیں۔" ان فقروں کے ساتھ ساتھ پتھروں کی بوچھاڑ بھی جاری رہی۔

پفنوتوس نے دبی زبان سے کہا۔ "خدا رحم کرے ان نادانوں پر۔"

غرض اسی حال میں چلا جاتا تھا اور دل میں کہتا تھا: "دیکھو۔ اس غریب بڑھیا نے میری تعظیم و توقیر کی اور ان لڑکوں نے مجھے گالیاں دیں اور پتھر مارے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی چیز کو انسان کیسے مختلف پہلوؤں سے دیکھتا ہے، حالانکہ اس کو اپنے کسی فیصلہ پر پورا اطمینان نہیں ہوتا اور غلطی کرنا تو اس کی فطرت میں ہے۔ یہاں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بے دینوں میں وہ بڈھا تیمو کلیس بالکل ہی ناسمجھ نہیں۔ یہ اس کی بصارت کا نقص ہے، جس کی وجہ سے سمجھتا ہے کہ وہ روشنی سے محروم کر دیا گیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز مثل سراب ہے۔ ریگ رواں ہے۔ اثبات صرف خدا کی ذات کو ہے۔"

شہر میں سے وہ کسی قدر تیز رفتاری سے گزرا۔ گو دس برس کے بعد یہاں آیا تھا مگر یہاں کی ایک ایک اینٹ اور پتھر کو پہچانتا تھا اور ہر پتھر اس کے لئے ایک داغ بدنامی تھا جو کسی نہ کسی گناہ کو یاد دلاتا تھا۔ اس لئے وہ گلی کوچوں کے سنگی فرش پر اور بھی زور زور سے اپنے ننگے پاؤں مارتا ہوا چلا اور جب ایڑیاں زخمی ہو گئیں اور ان کا خون پتھروں پر دیکھا تو دل میں خوش ہوا۔ بت خانہ سراپیس کے بلند پیش طاق کو بائیں طرف چھوڑ کر وہ ایک کوچے میں سے گزرا جس کے دونوں طرف نہایت عالیشان مکان تھے۔ ان میں سے طرح طرح کی خوشبوئیں آرہی تھیں۔ صنوبر، قرآش اور دیودار کے درختوں کی چوٹیاں مکانوں کے اونچے سرخ کنگروں اور سونے کے کلسوں سے بھی اوپر کو نکلی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ کسی کسی مکان کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ اس میں سے نظر آتا تھا کہ اندر پیتل کے نہایت خوبصورت بت سنگ مرمر کے طاقوں میں رکھے ہیں۔ گھر کے باغوں میں پانی کی نہریں جاری ہیں۔ غل اور شور کسی قسم کا نہیں، البتہ شہنائی کی اڑتی سی صدائیں کبھی کبھی سنائی دیتی ہیں۔ پفنوتوس چلتے چلتے ایک مکان کے سامنے رکا۔ یہ ایک مختصر سی عمارت تھی مگر اس کی ہر چیز میں تناسب اعلیٰ درجہ کا تھا اور اس کے برآمدے سرو قد حسین عورتوں کی شکل کے مجسمہ ستونوں پر قائم تھے۔ مشہور مشہور حکمائے یونان کی برنجی مورتوں سے یہ مکان آراستہ تھا۔

ان میں افلاطون، سقراط، ارسطو، ابی قور، زینو کے مجسّمے بھی تھے۔ دروازے پر دستک دی اور جب تک جواب ملے سوچنے لگا: "ان عارفان باطل کے نام کو بزرگی دینا پیتل اور پتھر کے لئے عبث تھا۔ ان کا کذب و دروغ ایک خلط مبحث ثابت ہو چکا ہے اور ان کی روحیں قعر جہنم میں پڑی جل رہی ہیں اور ان ہی میں کا وہ نامور افلاطون جس نے دنیا کو اپنی فصاحت سے مسخر کر رکھا تھا، اب شیاطین سے مجادلے و مناظرے میں مصروف ہے۔"

اتنے میں ایک غلام نے دروازہ کھولا اور یہ دیکھ کر کہ آدمی ننگے اور میلے پاؤں لئے سنگ مرمر کے پاکیزہ فرش پر کھڑا ہے، بہت ہی بگڑ کر بولا:

"دور رہو راہب، تو بڑا ہی بدتمیز ہے۔ بھیک مانگنی ہے تو کہیں اور جا کر مانگ۔ اس کا انتظار نہ کر کہ میں لکڑی لے کر تجھے نکالنے آؤں۔"

انطینو کے پاک نفس قسیس نے جواب دیا: "بابا! صرف اتنی درخواست ہے کہ تم مجھے اپنے آقا نیکیاس تک پہنچا دو۔"

نیکیاس ابھی غسل کر کے باہر آیا تھا۔ یہ ایک بڑا دریا دل خندہ پیشانی رئیس تھا مگر چہرے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ طبیعت میں شوخی اور طنز موجود ہے۔ جونہی اس نے راہب کو دیکھا اٹھا اور ہاتھ پھیلائے آگے بڑھ کر کہنے لگا:

"پفنوتوس' دوست' بھائی' مکتب کے پرانے یار' تم کہاں؟ کیوں کیسا پہچانا ہے۔ گو انسان سے .مفلہ جانور ہو گئے ہو مگر تاڑنے والے تاڑ جاتے ہیں۔ آؤ' گلے تو ملو' بھلا وہ طالب علمی کا زمانہ بھی یاد ہے جب ہم تم صرف نحو' معانی و بیان' فلسفہ و حکمت کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے یار عزیز تم اس وقت بھی بڑے ہی خشک اور وحشی مزاج تھے' لیکن دوستی کے ایسے سچے تھے کہ میں تو بالکل ہی تم پر فدا رہتا تھا' وہ فقرہ بھی یاد ہے جب ہم سب مل کر کہا کرتے تھے کہ پفنوتوس دنیا کے اس کھڑاک کو آدمی کی آنکھوں سے نہیں بلکہ گھوڑے کی وحشی نظروں سے دیکھتا ہے۔ جب ایسی باتیں سن کر تم ہم سے بدگمان ہو جاتے تھے تو ہم کو مطلق تعجب نہ ہوتا۔ نرمی و شائستگی تمہاری طبیعت میں اس وقت بھی کم تھی' لیکن تمہاری سخاوت کی انتہا نہ تھی۔ روپیہ کو روپیہ سمجھتے تھے نہ جان کو جان۔ پھر یہ کہ تمہاری طبیعت میں کچھ عجیب جوش و جذبہ تھا۔ اسی وجہ سے مجھے تمہارے ساتھ ایک خاص انس ہو گیا تھا۔ آج دس برس کے بعد تم سے مل کر بہت ہی دل خوش ہوا۔ کہو صحرائی زندگی سے چھٹکارا ہوا۔ عیسائیوں اور عیسائی مذہب کے تعصبات سے نجات ملی اور اب پھر پرانے طریقہ پر زندگی بسر کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ واہ واہ آج کا دن تو قابل یادگار ہے۔" یہ کہہ کر نیکیاس نے اپنی دو کنیزوں کو آواز دی۔

"کربیلی' مرتالی۔ چلو میرے اس عزیز مہمان کے ہاتھ پاؤں اور داڑھی پر عطر ملو۔"

دو کنیزیں حکم سنتے ہی سلفچی' آفتابہ' عطر کی شیشیاں اور ایک فولادی آئینہ لے کر آئیں' لیکن پفنوتوس نے نہایت تنفر سے اشارہ کر کے منع کیا اور آنکھیں نیچی کر لیں' کیونکہ یہ دونوں کنیزیں ننگی تھیں۔ بہرکیف نیکیاس نے مہمان کو آرام سے بیٹھنے کے لئے تکیے پیش کئے۔ طرح طرح کے خوش ذائقہ کھانے اور پینے کی چیزیں منگوائیں مگر پفنوتوس نے بہت رعونت سے ان چیزوں سے انکار کر کے کہا:

"نیکیاس! جس مذہب کو تم نے غلطی سے عیسائیوں کا تعصب کہا ہے' اس کو میں نے ترک نہیں کیا۔ مسیحی دین تمام حقیقتوں کی حقیقت ہے۔ ابتدا میں کلمہ تھا اور کلمہ خدا کے ساتھ تھا اور کلمہ خدا تھا۔ ہر چیز اسی نے بنائی ہے اور کوئی چیز بغیر اس کے نہیں بنی جو بنی۔ اسی میں زندگی تھی اور زندگی انسان کے لئے روشنی تھی۔"

نیکیاس اس وقت ایک پرتکلف لباس پہننے میں مصروف تھا اور پفنوتوس کی باتیں بھی سنتا جاتا تھا۔ جب یہ مذہبی گفتگو سنی تو کہنے لگا: "پفنوتوس! کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسے اکمل بے جوڑ الفاظ دہرانے سے تم مجھ پر کوئی حیرت طاری کر دو گے؟ ایسی بے سری الاپوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیا تم بھول گئے کہ میں تھوڑا بہت فلسفی ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ امیلیوس کی کتاب میں سے ادھر ادھر کے چند جملے ایسے شخص کی تشفی کر سکتے ہیں' جس کو خود امیلیوس بلکہ فرفوریوس اور افلاطون کی تصنیفات بھی جن کے اعلیٰ ہونے میں کلام نہیں مطمئن نہ کر سکی ہوں۔ دنیا کے دانشوروں نے جو نظام ہائے حکومت بیان کئے ہیں وہ محض کہانیاں ہیں' جو نسل آدم کے بچپن میں اس کے بہلانے کے لئے گھڑی گئی تھیں۔ جیسے ملطیہ والوں کی کہانیوں پر ہنسی آتی ہے' ایسے ہی ان قصوں پر ہنسنا چاہیے۔" اتنا کہہ کر مہمان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے وہ ایک بڑے عالی شان کمرے میں آیا۔ یہاں ہزارہا مٹھے چھالوں کے کاغذ پر لکھے ہوئے ٹوکروں میں بھرے تھے۔ نیکیاس نے کہا: "پفنوتوس! یہ میرا کتب خانہ ہے۔ اس میں حکمت کے صرف چند ہی نظام جو اس عالم کی توجیہ میں فلاسفہ نے لکھے ہیں' آپ کو ملیں گے لیکن کل مذاہب حکمت جو تحریر میں آ چکے ہیں وہ اتنے ہیں کہ آپ کو سراپیوم کے کتاب خانہ میں بھی دستیاب نہیں ہو سکتے' گو علمی خزانوں سے وہ مالا مال ہے۔ افسوس ہے۔ ان فلسفیوں اور حکیموں کے کل افکار ایک بیمار کے خواب پریشان سے زیادہ نہیں۔"

نیکیاس نے اپنے دوست کو بہ اصرار ایک ہاتھی دانت کی کرسی پر بٹھایا۔ پفنوتوس نے نگاہ افسوس سے اس کتب خانہ کی کتابوں کو دیکھ کر کہا:

"یہ سب پھونک دینی چاہئیں۔"

نیکیاس نے جواب دیا: "مگر یہ تو ایک نقصان عظیم

ہو گا۔ بیماریوں کے خواب بعض اوقات دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے حکماء کے یہ افکار و خیالات تلف کر دئے گئے تو پھر دنیا کی تمام صورتیں اور رنگ بھی فنا ہو جائیں گے اور ہم سب ایک نہایت افسوسناک حماقت کی نیند سو جائیں گے۔"

پفنوتوس نے جو خیال ظاہر کیا تھا' اسی کے سلسلے میں کہا: "یہ سچ ہے کہ بت پرستوں کے خیالات ایک مہمل خواب ہیں' لیکن خدا نے جو برحق ہے اپنے تئیں معجزات کے ذریعے سے انسان پر ظاہر کیا۔ وہ مجسم کیا گیا اور ہم میں آ کر آباد ہوا۔"

نیکیاس: "یار عزیز! یہ تم نے بالکل درست کہا کہ اس کو جسم دیا گیا۔ ایسا خدا جو اس دنیا میں آ کر سوچتا بھی ہو' کام کاج بھی کرتا ہو' بولتا اور چلتا پھرتا بھی ہو' جیسے کہ قدیم یولیسیز کا طریقہ تھا تو پھر ایسا خدا تو قریب قریب انسان کے برابر ہوا۔ یونان کے پرانے دیوتا جو پیٹر میں بھی یہی صفات تھیں' لیکن برقلس کے دور حکومت میں ایتھنز کے احمقوں نے ان ہی انسانی صفات رکھنے کی بنا پر پرانے جو پیٹر کو خدا ماننا چھوڑ دیا۔ جب اس پرانے دیوتا کا یہ حال ہوا تو اب آپ کے اس نئے جو پیٹر کو کون مانے گا۔ لیکن اس بحث کو چھوڑو۔ خدا کے تین اقنوموں پر مباحثہ کے لئے تو آپ یہاں آئے نہیں ہیں۔ یہ فرمایئے کہ میرے لائق کیا خدمت ہے جسے بجا لاؤں؟"

پفنوتوس: "ایک بہت ہی نیک خدمت ہے۔ وہ یہ کہ جیسا معطر لباس آپ اس وقت پہنے ہیں' ویسا ہی ایک مجھے بھی دیجئے۔ اس کے ساتھ طلائی نعلین ہوں اور ایک شیشی میں خوشبودار روغن ہو' جسے میں اپنے بالوں اور داڑھی میں مل سکوں۔ اگر ان سب کے ساتھ ایک ہزار درہم کی تھیلی بھی عنایت ہو تو بہت ہی خوشی ہو۔ پس یہی وہ چیزیں ہیں جو عشق خدا میں ایک کار خیر کے لئے آپ سے مطلوب ہیں۔ ایک نیک کام اور پرانی دوستی کا خیال کر کے یہ چیزیں مجھے دیجئے۔"

نیکیاس نے فرمائش سنتے ہی فوراً حکم دیا اور اس کی دونوں کنیزیں کربیلی اور مرتالی دوڑ کر ایک بڑی پر تکلف عبا لائیں۔ اس پر عیسائی طرز کے پھولوں اور جانوروں کی تصویریں زردوزی کے کام میں بنی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کنیزوں نے عبا کو پھیلا کر اس طرح اٹھایا کہ اس کے گل بوٹے خوب چمکتے ہوئے معلوم ہوئے۔ سمجھی تھیں کہ پفنوتوس اپنی کمبل کی کفنی جو گلے سے لے کر پاؤں تک پہنچی ہوئی تھی' اتار کر عبا پہننے کے لئے آگے بڑھے گا' لیکن وہ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا اور کہا کہ بدن کی کھال اتر جائے' لیکن رہبانیت کا پیرہن گلے سے نہیں اتر سکتا۔ غرض دونوں باندیوں نے کسی نہ کسی طرح کفنی کے اوپر ہی عبا پہنا دی۔ یہ دونوں عورتیں چونکہ بہت حسین تھیں' اس لئے مردوں سے نہ ڈرتی تھیں گو کہنے کو زر خرید لونڈیاں تھیں۔ اب جو انہوں نے راہب کو ایک عجیب وضع میں دیکھا تو ہنسنا شروع کیا۔ ایک نے آئینہ دکھا کر کہا: "یہ تو کسی ایرانی علاقے کے حاکم بالا معلوم ہوتے ہیں۔" دوسری نے داڑھی پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ پفنوتوس اس وقت آنکھیں بند کئے عبادت میں مصروف تھا۔ اس نے ان حرکتوں کو مطلق نہ دیکھا۔ غرض طلائی کفشیں پہن اور درہم کی تھیلی کمر میں باندھ چلنے کو ہوا۔ نیکیاس مسکراتے چہرے سے اپنے مہمان کی صورت دیکھ رہا تھا۔ پفنوتوس اب اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا:

"نیکیاس! تم میری ان باتوں کو کسی برائی پر نہ محمول کرنا۔ میں اس لباس اور ان طلاکار نعلین اور کیسہ زر سے ایک بڑا نیک کام کرنے والا ہوں۔"

نیکیاس نے کہا: "ہرگز نہیں۔ ان چیزوں سے میرے دل میں تمہاری طرف سے کسی برائی کا گمان نہیں ہو سکتا' کیونکہ میرا یقین ہے کہ برائی کرنا یا بھلائی کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ کسی چیز کو برائی یا بھلائی سمجھنا محض انسان کی رائے پر موقوف ہے۔ جو صاحب عقل ہیں وہ دنیا چلانے کے لئے رواج اور عادت کے پابند ہو جاتے ہیں اور میں خود بھی ان طریقوں کا پابند ہوں جو اسکندریہ میں رائج ہیں۔ اچھا اب آپ جاتے ہیں۔ جایئے اور خوش رہیے۔"

پفنوتوس کو اس وقت خیال آیا کہ جس قصد سے یہاں تک آیا ہوں' بہتر ہے کہ وہ نیکیاس پر ظاہر کر دیا جائے' چنانچہ وہ کہنے لگا:

"نیکیاس! تم تائیس کو جانتے ہو گے جو تماشا گاہ میں تماشا دکھایا کرتی ہے؟"

نیکیاس نے جواب دیا: "خوب جانتا ہوں۔ بے حد حسین عورت ہے۔ ایک زمانہ میں' میں بھی اس کا عاشق

زار تھا اور اسی تعلق کی بدولت ایک پن چکی اور دو کھیت اناج کے بیچنے پڑے اور تین دیوان اس کی تعریف میں نظم کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسن کے برابر دنیا میں کسی چیز کو طاقت نہیں۔ اگر کہیں یہ ہمیشہ رہا کرتا تو پھر آپ کے ان ربانی کلمات اور تجلیات اور فلاسفہ کی ہذیان سرائیوں پر انسان کی توجہ بہت ہی کم رہ جاتی۔ لیکن مشفق۔ مجھ کو حیرت ہے کہ اس وقت تھیبی کے صحرائے دور ودراز سے آپ یہاں آ رہے ہیں اور تائیس کا ذکر آپ کی زبان پر ہے۔ حیرت سی حیرت ہوتی ہے۔" اتنا کہہ کر نیکیاس نے ایک آہ سرد بھری۔

پفنوتوس نے یہ واقعہ سن کر کہ نیکیاس کی آشنائی تائیس سے رہ چکی ہے، نہایت ہی نفرت اور غصے کی نظر سے اس کو دیکھا اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اتنے بڑے گناہ کا اقرار کوئی شخص کیوں کر ایسی بے تکلفی سے دوسرے کے سامنے کر سکتا ہے۔

پفنوتوس نے اٹھ کر بڑے متین لہجے میں کہا:

"نیکیاس! میرا قصد ہے کہ خدا کی مدد سے اس تائیس کو حب دنیا کی نجاست سے نکال کر مسیح کی دلہن بنا دوں۔ روح القدس نے اگر میرا ساتھ نہ چھوڑا تو آج ہی اسکندریہ سے نکال کر اس عورت کو راہبات کی کسی خانقاہ میں پہنچا دوں گا۔"

نیکیاس نے کہا: "وینس کو ناراض کرنے سے ڈرو۔ یہ حسن و عشق کی دیوی بڑی ہی زبردست ہے۔ اگر اس کے دربار کی اس حسین خادمہ کو تم نے یہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کی تو وہ تم سے خفا ہو جائے گی۔"

پفنوتوس: "خدا مجھے محفوظ رکھے گا۔ نیکیاس خدا ایسا کرے کہ تمہارے دل میں بھی خدا کا نور چمکے اور تم اس ورطہ ظلمت سے نکلو، جس میں غوطے کھا رہے ہو۔"

اتنا کہہ کر پفنوتوس مکان سے باہر آنے کو ہوا۔ نیکیاس پیچھے پیچھے آیا اور دروازے کے قریب پہنچ کر راہب کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کے کان میں کہا:

"دیکھو حسن و عشق کی دیوی کو ناراض کرنے سے پرہیز کرو۔ اس کا انتقام بلا کا ہوتا ہے۔"

پفنوتوس نے اس تنبیہہ کی کچھ پروا نہیں کی۔ دروازے سے باہر آیا اور پھر مڑ کر بھی اس گھر کو نہ دیکھا، جہاں سے نکلا تھا۔ نیکیاس کی باتوں نے اس کے دل میں سخت نفرت و حقارت پیدا کر دی تھی۔ جس وقت خیال آتا تھا کہ تائیس نیکیاس سے ہمکنار ہوئی ہوگی، تو اس کا غصہ ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔ اس عورت کے ساتھ بالخصوص کسی کے ملوث ہونے کو وہ ایک ایسا گناہ سمجھتا تھا، جس سے بڑھ کر کوئی دوسرا گناہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ناپاک تعلقات سے اس کو ہمیشہ سے نفرت تھی، لیکن جیسی نفرت اس تعلق کا حال سن کر ہوئی، ایسی کبھی پہلے نہیں ہوئی تھی۔ گنہگار بندوں پر مسیح کے عتاب اور فرشتوں کے ملال کا احساس جس شدت سے آج اس کو ہوا کبھی پہلے نہ ہوا تھا۔

اب اس قصد میں کہ بت پرستوں کی صحبت سے تائیس کو کسی طرح نکالنا چاہیے جوش و خروش پیدا ہو گیا اور اس حسین عورت اور اس کو گناہوں سے بچانے کے لئے دل کو اور بھی بے قراری رہنے لگی۔ تائیس سے اس کے گھر پر ملاقات کرنے کے لئے ضروری تھا کہ دن ڈھلنے کا انتظار کیا جائے۔ ابھی دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی۔ وقت گزارنے کے لئے شہر کے بڑے بڑے بازاروں میں پھرتا رہا۔ یہ ارادہ کر لیا تھا کہ جب تک مراد حاصل نہ ہوگی، کچھ کھائے گا نہ پیئے گا تاکہ جو چیز خدا سے مانگی ہے، اس کے ملنے کی زیادہ توقع ہو جائے۔ شہر کے کسی گرجا میں جا کر بھی دم نہ لیا، کیونکہ اکثر گرجاؤں میں اریوسی عقائد کے عیسائیوں نے اپنا عمل دخل کر رکھا تھا۔ صحیح الاعتقاد عیسائیوں کے نزدیک یہ بد عقیدہ لوگ وہ تھے، جنھوں نے خداوند کی میزوں کو توڑ ڈالا تھا۔ شہنشاہ قسطنطنیہ نے ان اریوسی عیسائیوں کو گرجاؤں میں بڑے بڑے مناصب دے رکھے تھے اور بطریق اسکندریہ اثناشوش کو اس کے عہدے سے معزول کر کے شہر کے عیسائیوں میں ایک تہلکہ ڈال دیا تھا۔

پفنوتوس کو کسی خطرے کا ڈر نہ رہا تھا۔ دیر تک سڑکوں پر پریشان پھرتا رہا۔ کبھی کسر نفسی سے آنکھیں زمین کی طرف ہوتی تھیں اور کبھی حالت جذب میں آسمان کی طرف۔ اسی حال میں پھرتا پھراتا سمندر کے کنارے بندرگاہ میں پہنچا۔ یہاں بے شمار جہاز اور کشتیاں لنگر ڈالے موجود اور ان سے کچھ دور سمندر کی سطح روپہلی اور فیروزی موجوں میں اپنی تڑپ دکھلا رہی تھی۔ اتنے میں ایک کشتی نظر آئی، جس کے سکان والے سرے

پر سمندر کی ایک پری کا چہرہ بنا ہوا تھا۔ اس کشتی نے ابھی ابھی لنگر اٹھایا تھا اور ملاحوں نے پتوار چلانے کے ساتھ گانا بھی شروع کر دیا تھا۔ راہب کی نظروں میں یہ سمندر کی پری جس پر پانی کے قطرے موتی نثار کر رہے تھے' بہت جلد کسی عورت کا سامنے سے گزرتا ہوا حسین چہرہ بن گئی۔ کشتی رہنما کی مدد سے تنگ پانی میں سے نکل کر خلیج میں داخل ہوئی اور پھر وہاں سے بڑے سمندر میں چلنے لگی اور پیچھے پیچھے سفید جھاگوں کی ایک لکیر سی بناتی گئی۔

پفنوتوس دل میں کہنے لگا' ایک زمانہ تھا کہ میں بھی دنیا کے سمندر پر گاتا ہوا کشتی میں سوار ہونا چاہتا تھا لیکن میں اپنی غلطی سے جلد آگاہ ہو گیا اور سمندر کی پریاں مجھے نہ لبھا سکیں۔

اسی طرح باتیں سوچتا ہوا چلتے چلتے رسوں کے ایک ڈھیر پر بیٹھ گیا اور پھر لیٹ کر غافل سو گیا۔ خواب میں دیکھا ایک شخص صور پھونک رہا ہے اور اس کی تیز آواز کانوں کے پار ہوئی جاتی ہے۔ آسمان خونیں رنگ ہو گیا ہے۔ سمجھا کہ قیامت آن پہنچی۔ بہت گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگنے لگا۔ دعا میں مصروف تھا کہ دیکھا ایک نہایت مہیب جانور اس کے قریب آ رہا ہے۔ اس جانور کی پیشانی پر روشنی کی ایک صلیب چمک رہی ہے۔ فوراً سمجھ گیا کہ یہ سلسلی کا ابوالہول ہے۔ اس جانور نے قریب آتے ہی اس کو اپنے دانتوں سے پکڑ لیا' مگر کوئی دانت اس کے چبھا نہیں اور اس طرح اٹھا کر لے چلا جیسے بلی اپنے بچوں کو منہ میں لٹکائے ہوئے لے جاتی ہے۔ اسی حالت میں پفنوتوس نے بہت سی اقلیمیں اور سلطنتیں طے کیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اور دریا عبور کئے۔ یہاں تک کہ ایک نہایت ہی برباد و خوفناک مقام نظر آیا' جہاں ہر طرف کالے کالے پہاڑ کھڑے تھے اور ہر جگہ جلتی ہوئی راکھ بچھی تھی۔ زمین میں جابجا سوراخ تھے اور ان میں سے شعلے نکلتے تھے۔ جانور نے پفنوتوس کو آہستہ سے زمین پر ٹکا کر کہا:

"دیکھو۔"

پفنوتوس جھک کر ایک تاریک گھاٹی کو دیکھنے لگا' جو نیچے دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بیچوں بیچ آگ کا ایک دریا کالی کالی چٹانوں میں سے پیچ و خم کھاتا شعلے اٹھاتا بہہ رہا تھا۔ ادھر ادھر جلتی زمین پر دوزخ کے عفریت مردوں کی روحوں کو عذاب دے رہے تھے۔ ان روحوں کے جسم وہی تھے' جن میں وہ پہلے رہ چکی تھیں۔ یہاں تک کہ بعض کے بدن پر کپڑوں کے چیتھڑے بھی کہیں کہیں لٹکے نظر آتے تھے۔ مگر باوجود سخت اذیتوں اور عذابوں کے ان کے چہروں سے اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔ ایک بڑے قد آور مرد ضعیف کی روح نے جس کے سر پر تاج اور ہاتھ میں عصاء تھا اپنی خوشنوائی سے اس ویرانے کو نغمہ زار بنا رکھا تھا۔ دیوتاؤں اور سورماؤں کی تعریفیں الاپ رہا تھا۔ شیاطین گرم سلاخوں کی نوک سے کبھی اس کے لبوں کو چھیدتے تھے اور کبھی لمبی سلاخیں اس کے حلق میں ڈال دیتے تھے۔ مگر ہومر کی روح اسی طرح نغمہ سرائی میں مصروف رہی۔ قریب ہی یونان کا بڈھا حکیم اناغورس جس کے سر پر ایک بال نہ تھا اور بڑھاپے سے بدن کی نسیں ابھر آئی تھیں' ہاتھ میں پرکار لئے زمین پر ریاضی کی شکلیں بنا رہا تھا۔ دوزخ کا ایک کارندہ کھولتا ہوا تیل اس کے کانوں میں ڈالتا تھا لیکن حکیم کے علمی افکار میں کسی طرح کا خلل نہ پیدا کر سکتا تھا۔ اس کے بعد پفنوتوس نے دیکھا کہ دریائے آتش کے ہولناک کنارے پر بہت سے لوگ چہل قدمی کر رہے ہیں اور اس طرح کچھ پڑھتے تقریریں کرتے جاتے ہیں' جس طرح ایتھنز کی اکادمی میں استاد و شاگرد درس و تدریس میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ایک طرف تیموکلیس بھی نظر آیا کہ ہر چیز کے انکار میں گردن ہلا رہا ہے اور تاریکی کا ایک فرشتہ ایک تیز مشعل اس کی آنکھوں کے سامنے لاتا ہے اور جدھر گردن پھرتی ہے' ادھر ہی یہ مشعل آنکھوں کے سامنے کر دی جاتی ہے۔ لیکن تیموکلیس نہ مشعل کو دیکھتا ہے اور نہ فرشتے کو۔

پفنوتوس اس منظر کو دیکھ کر حیرت سے گنگ ہو گیا اور منہ پھیر کر اس جانور کو دیکھنا چاہا جو اس کو یہاں تک لایا تھا۔ لیکن ابوالہول غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک عورت سر سے پاؤں تک برقع میں لپٹی ہوئی کھڑی تھی اور پفنوتوس سے کہتی تھی:

"غور سے دیکھو اور سمجھو۔ ان کافروں کی ہٹ ایسی سخت ہے کہ جہنم میں بھی یہ انہی دھوکوں کا شکار ہیں جو دنیا میں ان کی گمراہی کا باعث ہوئے تھے۔ موت بھی ان کی غلط بینی کا علاج نہ کر سکی۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ خدا

کے دیدار کے لئے صرف مرجانا ہی کافی نہیں ہے۔ جن لوگوں کو تم دیکھ رہے ہو چونکہ یہ انسانی پیکر میں حق سے غافل رہے تھے' اس لئے ہمیشہ اس سے غافل رہیں گے۔ یہ بھوت کون ہیں جو ان روحوں کو عذاب پہنچا رہے ہیں؟ یہ عدل الٰہی کے کارکن ہیں۔ چونکہ خدا کے عدل سے یہ روحیں ناواقف تھیں' اس لئے اب وہ ان عذابوں کو بھی نہ دیکھ سکتی ہیں اور نہ سمجھ سکتی ہیں۔ ہر قسم کے حقائق سے بیگانہ رہ کر ان کو اپنے معتوب و مغضوب ہونے کا علم تک نہیں ہے اور خدا بھی مجبور نہیں کر سکتا کہ اس عذاب کا انہیں احساس ہو۔"

پفنوتوس نے یہ کلمہ کفر سن کر کہا: "نہیں' خدا کے اختیار میں سب کچھ ہے' وہ قادر مطلق ہے۔"

برقع والی نے کہا: "لیکن کوئی عبث کام خدا سے ظہور میں نہیں آسکتا۔ ان کو سزا دینے کے لئے لازمی تھا کہ پہلے حق بات ان کے دل میں بٹھا دی جاتی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ خدا کے مردود نہیں بلکہ منتخب بندوں میں سے ہوتے۔"

پفنوتوس کی حالت خوف و اضطراب کی تھی۔ ایک مرتبہ پھر جھک کر گھاٹی کی طرف دیکھا اور نظر آیا کہ آگ سے جھلسے ہوئے درختوں کے نیچے نیکیاس کی روح کھڑی مسکرا رہی ہے۔ پیشانی پر پھولوں کا ایک ہار لپٹا ہے اور قریب ہی ملیطس کی مشہور حسینہ اسپاسیا نازک لباس پہنے عشق و حکمت کی باتیں شریفانہ ادا سے بڑے شیریں لہجہ میں بیان کر رہی ہے۔ آگ کی ہلکی ہلکی بوندیاں برس رہی ہیں مگر ان میں وہ فرحت و تازگی ہے' جیسے صبح کی شبنم کے قطروں میں ہوتی ہے اور یہ دونوں جلتی زمین پر اس طرح ٹہل رہے ہیں' جیسے کسی سبزہ زار میں ہوا کھاتے ہوں۔ نیکیاس کی روح کو دیکھتے ہی پفنوتوس کو ایسا طیش آیا کہ وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا:

"اے خدا! اس کو مار' ایسا مار کہ وہ روئے اور آہیں بھرے اور دانت پیسے۔ یہ وہ ہے جس نے تائیس کے ساتھ گناہ کیا ہے۔"

اتنے میں پفنوتوس کی آنکھ کھل گئی اور دیکھا کہ ایک بڑا طاقتور ملاح اس کو سمندر کے کنارے سے گھسیٹ کر ریت کی طرف لا رہا ہے اور زور زور سے کہتا ہے: "کیا ہے' کیا ہے' ہوشیار ہو' کیوں نیند میں اتنا بکتے ہو۔ بھلے کو میں پہنچ گیا ورنہ تم اس وقت سمندر کی تہ میں ہوتے۔ اس وقت میں نے تمہاری جان بچالی اور یہ ایسی ہی سچی بات ہے جیسے میری ماں نمک لگی مچھلیاں بیچا کرتی تھی۔"

پفنوتوس نے جواب میں صرف اتنا کہا۔ "خدایا! تیرا شکر ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوا اور جدھر منہ اٹھا ادھر ہی چلنا شروع کیا اور جو خواب اس وقت دیکھا تھا' اس پر غور کرنے لگا۔ دل میں کہتا تھا کہ "یہ سچا خواب نہیں ہو سکتا۔ یہ رویائے کاذبہ ہے۔ اس میں خدائے مہربان کو نامہربان کرنے کے لئے دوزخ اس طرح دکھائی گئی تھی کہ گویا اس کی کچھ اصلیت ہی نہیں ہے۔ یقینی یہ سب شیطان کی حرکتیں ہیں۔"

پفنوتوس نے اس خواب کو شیطان کی طرف سے اس لئے سمجھا کہ اس کو اچھے اور برے خوابوں میں تمیز کرنی آتی تھی اور بہت جلد سمجھ جاتا تھا کہ کون سا خواب خدا کی طرف سے ہے اور کون سا شیطان یا خبیث روحوں نے دکھایا ہے۔ اس قسم کی پہچان کا ہونا راہبوں کے لئے ضروری تھا' کیونکہ روحوں سے رات دن ان کو واسطہ رہتا تھا اور ظاہر ہے کہ جو آدمیوں سے بھاگا اس کو روحوں ہی سے سابقہ رہے گا۔ تمام صحرا ان سے بھرا ہوا تھا۔ مشہور تھا کہ جس وقت مسیحی زائرین اس برباد قلعے کے قریب پہنچتے تھے جہاں انطونی گوشہ نشین ہوا تھا تو ان کو ایسی آوازیں سنائی دیتی تھیں جیسے کہیں دور کوئی شہر چراغاں کیا گیا ہو اور خلقت کا ایک غل ہو رہا ہو اور یہ سب آوازیں راہب انطونی کی گمراہی کے لئے شیاطین بنایا کرتے تھے۔

پفنوتوس یہی سوچتا اور شکوہ کرتا ہوا کہ آج خدا نے اپنی نگاہ کرم پھیر کر اس کو شیطان کے قابو میں آنے دیا چلا جاتا تھا کہ آدمیوں کی ایک بھیڑ ملی۔ جدھر یہ راہب جا رہا تھا' ادھر ہی یہ آدمی بھی جاتے تھے۔ شہروں میں چلنے کی اب عادت نہ رہی تھی۔ لوگوں کی دھکم پیل میں کبھی ادھر آ رہتا تھا اور کبھی ادھر پہنچ جاتا تھا۔ لباس بھی اتنا نیچے تھا کہ اس میں الجھ کر گر گر پڑتا تھا۔ مگر اسی حال میں معلوم کرنا چاہا کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ چنانچہ ایک آدمی سے پوچھا۔ "یہ بھاگڑ کیسی ہے؟"

اس آدمی نے جس کا نام دوریان تھا' جواب دیا: "اے اجنبی! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس وقت کھیل تماشے شروع ہونے والے ہیں اور تائیس بھی آج تماشا کرے

گی۔ یہ سب لوگ تماشا گاہ کو جا رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔ کیا آپ بھی وہیں چلتے ہیں؟"

فوراً خیال آیا کہ تائیس کو اس موقع پر دیکھنا اس کے مقصد کے لئے مفید ہوگا' پفنوتوس اس نئے ملاقاتی کے ساتھ ہو لیا۔ تماشے کی عالی شان عمارت دس پانچ قدم پر سامنے ہی تھی۔ اس کے برآمدے طرح طرح کے مصنوعی چہروں سے آراستہ تھے اور اس کے احاطہ کی مدور دیوار پر پتھر کے بے شمار بت جابجا نصب تھے۔ اب پفنوتوس اور دوریان دونوں ساتھ ساتھ ایک تنگ چھتے میں سے گزرے' جس سے نکلتے ہی تماشا خانے کے اندر پہنچ گئے' جو روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ تماشائیوں کی صفیں نصف دائرہ کی صورت میں واقع ہوئی تھیں۔ ایک صف میں یہ دونوں بھی جا کر بیٹھ گئے۔ سامنے ایک وسیع گول صحن تماشا کرنے کے لئے تھا۔ یہ بہت آراستہ تھا مگر ابھی اس میں کوئی تماشا کرنے والا نہ تھا۔ صحن کے بیچ میں ایک چبوترہ سا تھا اور اس کی شکل ایسی تھی جیسے پرانے سورماؤں کے مرنے پر ان کی یادگاریں یا قبریں قدیم زمانہ کی قومیں بنایا کرتی تھیں۔ اس چبوترے کے گرد ایک لشکر گاہ بنائی گئی تھی۔ خیموں کے سامنے نیزے قطاروں میں رکھے تھے اور سائبانوں کے ستونوں میں جن پر بلوط کے پتوں اور پھولوں کے ہار پڑے ہوئے تھے' بہت سی سونے کی چمکتی ہوئی ڈھالیں لٹک رہی تھیں۔ ابھی تک سب طرف نیند کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن تھوڑی دیر میں تماشائیوں کی صفوں سے ایسی آواز آنی شروع ہوئی جیسے چھتے کے پاس مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے۔ ارغوانی لباسوں کے عکس سے سب کے چہرے سرخ معلوم ہوتے تھے اور اب تماشائیوں کی نگاہیں صحن کی طرف اٹھیں' جس کے بیچ میں چبوترہ اور چبوترہ کے گرد لشکر گاہ تھی۔

پفنوتوس چپکے چپکے کوئی دعا پڑھ رہا تھا اور کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ مگر دوریان جس کے ساتھ وہ یہاں آیا تھا برابر باتیں کرتا رہا اور کہنے لگا:

"ایک زمانہ تھا کہ بڑے بڑے استاد تماشا گر منہ کو مصنوعی چہروں سے چھپائے مشہور شعرائے یونان میاندر اور یوریدلیس کے اشعار بڑی آب و تاب سے پڑھا کرتے تھے۔ اب جتنے ناٹک کئے جاتے ہیں' ان میں شاعر کے کلام کو دخل نہیں۔ کل مضمون صرف حرکتوں سے ادا کیا جاتا ہے' زبان سے کام نہیں لیتے۔ پہلے میکشوں کے دیوتا بکس کے تہوار میں جو عجیب عجیب چیزیں تماشوں میں نہ دیکھی اور سنی جاتی تھیں' ان کی جگہ اب یہی گونگی حرکتیں اور اشارے رہ گئے ہیں جو ایک گنوار کی سمجھ میں بھی آ سکتے ہیں۔ اب وہ تماشے کہاں جن میں انسان کی فطرت کے شدید جذبات کا نقشہ کھینچا جاتا تھا اور جن میں تماشا گر جس وقت شعرائے سلف کا کلام سناتے تھے تو تلواروں کی جھنکار میں ان کی آواز اور گونجنے اور گرجنے لگتی تھی اور تماشا کرنے میں ایسی ادائیں دکھاتے تھے کہ خود دیوتا معلوم ہونے لگتے تھے۔ افسوس ناٹک میں وہ پہلا سا سوز و گداز اور شاعروں کی سحر بیانیاں اب نام کو نہیں رہیں۔ سوائے نقالوں اور ناچنے والیوں کے اب کچھ باقی نہیں۔ اگر آج ایتھنز کے لوگ برقلس کے زمانہ کے زندہ ہوتے اور ناٹک میں کوئی عورت تماشا کرنے کو آتی تو معلوم نہیں کیا کہتے۔ سب کے سامنے عورت کو بے پردہ ہو کر آنے کی اجازت دینا سخت معیوب حرکت ہے۔ اسی سے ہمارا تنزل ظاہر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت مرد کی دشمن ہی نہیں بلکہ وہ اس دنیا کی مجسم بے غیرتی ہے۔"

پفنوتوس نے کہا: "یہ بات تم نے عقل کی کہی۔ عورت کے برابر ہمارا کوئی دشمن نہیں' وہ لذت و سرور کا ذریعہ ہے اس لئے اس سے ڈرنا چاہیے۔"

دوریان بولا: "میرا قول تو یہ ہے کہ وہ لذت و سرور کا ذریعہ نہیں بلکہ مصیبت رنج و تشویش کا ذریعہ ہے۔ مرد کے لئے عورت کے عشق کے برابر کوئی آزار نہیں۔ آپ کو میں ایک قصہ سناؤں۔ ارگولس کے علاقے میں ایک شہر ترزینا ہے۔ جوانی میں مجھے ایک مرتبہ وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں مرتل کا ایک بڑا درخت دیکھنے میں آیا جس کے ہر پتے میں بے شمار چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو یہ قصہ سنا کہ جب ملکہ فیدرا کو اپنے سوتیلے بیٹے ہپولیتس سے عشق ناجائز پیدا ہوا تو وہ اسی درخت کے نیچے اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اس بیکاری و تکلیف کی حالت میں اس نے ایک دن اپنے بالوں کے جوڑے میں سے ایک سونے کی سوئی نکالی اور اس درخت کے پتوں کو اس سے چھیدنا شروع کیا۔ انتظار کی مدت اتنی بڑھی کہ درخت کے تمام پتے چھید ڈالے۔

جب یہ ملکہ اپنی مراد کو نہ پہنچی تو ہپولیتس کو اس نے مار ڈالا اور خود بھی بہت اذیت سے مری۔ یعنی اپنے عروسی کمرے میں جا کر کمر سے زری کا پٹکا کھول اس سے اپنے تئیں پھانسی دے لی۔ یہ واقعہ سن کر دیوتاؤں نے فیصلہ کیا کہ اس مرتل کے درخت میں چونکہ وہ ملکہ فیدرا کے عشق حرام کا شاہد رہ چکا ہے، آیندہ جس قدر پتے نکلیں، وہ سب سوراخ دار ہوں۔ یہ قصہ سن کر میں نے اس درخت کا ایک پتا توڑ لیا اور گھر آ کر اس کو اپنے پلنگ کے سرہانے لٹکا دیا تاکہ یہ واقعہ ہمیشہ یاد رہے اور عشق کا آزار اپنے پیچھے کبھی نہ لگاؤں اور حکیم ابی قور کے اس قول کا کہ نفس کی خواہشوں سے ہمیشہ خوف کرنا چاہیے اور بھی دل سے یقین کرنے لگوں۔ سچ تو یہ ہے کہ عورت سے عشق کرنا اپنے دین و ایمان کو ایک روگ لگانا ہے اور پھر یہ روگ کمبخت ایسا ہے کہ اس سے ہمیشہ بچا رہنا بھی تو یقینی نہیں۔"

پفنوتوس نے پوچھا: "دوریان تم کو کن چیزوں سے مسرت حاصل ہوتی ہے؟"

دوریان نے بہت ہی کچھ غمگین بن کر کہا: "مسائل حکمت پر غور کرنے سے البتہ دل خوش ہوتا ہے، مگر اس کو بھی ایک مجبوری سمجھئے، کیونکہ جب انسان کا معدہ ضعیف ہو گیا ہو تو پھر یہ خیال کرنا کہ غور و فکر کے سوا بھی کسی چیز میں حظ مل سکتا ہے، ایک فضول بات ہے۔"

اتنا سن کر پفنوتوس نے اس مقلد ابی قور کو ایسی روحانی مسرتیں بتانا چاہیں، جو خدائی ذات پر غور کرنے سے حاصل ہوتی ہیں، چنانچہ اس نے کہنا شروع کیا:

"حق بات سنو اور اس سے اپنے قلب کو روشن کرو۔"

یہ جملہ پفنوتوس نے ایسا کڑک کر کہا کہ بہت سے لوگ اپنے اپنے ہاتھ بڑھا کر کہنے لگے: "خبردار، خاموش رہو۔" اس وقت ہر طرف ایک سناٹا سا تھا مگر پھر بہت سے ساز و باجے یکلخت بجنے لگے۔

تماشا شروع ہو گیا۔ سپاہی اپنے اپنے ڈیروں میں سے نکلے اور ایسی حرکتیں کرنے لگے کہ گویا کل فوج کوچ کو ہے۔ اتنے میں بیچ کے چبوترے پر دھوئیں کا ایک بادل سا چھا گیا۔ پھر یہ بادل ہٹ گیا اور چبوترے پر اکیلیز کی روح طلائی زرہ بکتر لگائے نمودار ہوئی اور اس نے ہاتھ اٹھا کر لشکر کے سرداروں سے اشاروں میں کہنا شروع کیا: "اے یونان والو! کیا تم وطن کو واپس جا رہے ہو، جہاں مجھ کو اب جانا نصیب نہ ہو گا۔ کیا میری قبر پر کوئی چڑھاوا بھی نہ چڑھاؤ گے۔ یونہی چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔" اتنا سنتے ہی یونان کے جس قدر نامور سردار تھے، سب اکیلیز کی قبر کے قریب آ گئے۔

اکامس، نستور، اگاممنون تاج اور عصاء شاہی لئے اکیلیز کی طرف دیکھنے لگے۔ اکیلیز کا جوان لڑکا پرہوس باپ کی روح کے سامنے خاک پر پڑا تھا۔ یونان کا سب سے بڑا عاقل دیوتا یولی سیز بھی موجود تھا۔ اس نے اپنے بشرے سے ظاہر کیا کہ اکیلیز کی قبر پر ضرور کوئی نذر چڑھانی چاہیے اور اس بات پر اگاممنون سے اشاروں میں بحث کرنے لگا۔ یہ اشارے اس قدر صاف تھے کہ بحث کا کل مضمون تماشائیوں کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

یولی سیز گویا کہتا تھا کہ یونانیوں میں اکیلیز سب سے زیادہ عزت کا مستحق ہے۔ یہ وہ جوان مرد ہے، جس نے بڑی شان سے اپنے ملک و وطن پر جان قربان کی ہے۔ اب وہ چاہتا ہے کہ مغلوب بادشاہ تروجہ یعنی پرائم کی دوشیزہ لڑکی پولی زینہ اس کی قبر پر قربان کی جائے۔ یونانیو! تمہارا فرض ہے کہ اکیلیز جس چیز کو تم سے طلب کرے، اسے پیش کرو تاکہ تحت الثریٰ میں اس کی روح آرام سے رہے۔

اگاممنون نے اس تقریر سے اختلاف کیا اور اشاروں میں کہا:

"یونانیو! تروجہ کی کنواری لڑکیوں کو جان سے نہ مارو۔ یہ وہ ہیں جنہیں ہم بت خانوں کے حرم سے پکڑ لائے ہیں۔ وہاں بھی ان کو پناہ نہ دی۔ آخر پرائم کے خاندان اور قوم پر کہاں تک ظلم توڑے جائیں گے؟"

اگاممنون نے یہ سفارش اس بنا پر کی تھی کہ اس کو پولی زینہ کی بہن کسندرہ سے عشق تھا۔ اس پر یولی سیز نے اگاممنون کو ملامت کی اور کہا: "حیف ہے کہ کسندرہ کی سیج کو اکیلیز کی تلوار پر ترجیح دی جاتی ہے۔"

یونان کے لوگوں نے تلواریں جھنکار کر یولی سیز کی رائے سے اتفاق کیا اور یہ فیصلہ کر دیا کہ اکیلیز کی روح کو تسکین دینے کے لئے بادشاہ پرائم کی دوشیزہ لڑکی ذبح کر دی جائے۔ یہ فیصلہ سنتے ہی اکیلیز کی روح غائب ہو گئی۔

باجے اور ساز تماشا کرنے والوں کی حرکات و سکنات کے مطابق کبھی تیز اور کبھی آہستہ بجتے تھے۔ تماشائیوں کی صفوں سے بھی اس فیصلہ کی تائید میں آوازیں بلند ہوئیں۔

ہفنوتوس جو میزان حق میں ہر چیز کو تول کر بات کرتا تھا پکار اٹھا:

"اس قصہ سے معلوم ہوا کہ جھوٹے مذہبوں کے ماننے والے کیسے ظالم و جفاکار ہوتے تھے۔"

یہ فقرہ سن کر دوریان بولا: "ابتدا میں سب ہی مذہبوں کی بنیاد ظلم و جفاکاری پر رکھی گئی تھی۔ یہ شکر کا مقام ہے کہ حکیم ابی قور علم و دانش کا استاد دنیا میں پیدا ہو گیا اور عالم غیب کے متعلق جس قدر خوف انسان کے دل میں چلے آتے تھے ان کو دور کر دیا۔"

اتنے میں ملکہ ہکوبہ بال کھولے، پیرہن چاک، جس خیمہ میں قید تھی، اس سے باہر نکلی۔ جس وقت مظلومی و بدقسمتی کی یہ زندہ تصویر سامنے آئی تو سب کے دل ہل گئے۔ یہ پولی زینہ کی ماں تھی۔ اسے خواب میں معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی قربان کی جائے گی۔ اس لئے وہ پہلے ہی سے اپنی اور اپنی بیٹی کی بدقسمتی پر آہ و زاری کرتی آئی۔ یولی سیز اس کے قریب آیا اور پولی زینہ کو قربانی کے لئے اس سے مانگا۔ بڑھیا ماں نے چھاتی پیٹ کر سر کے بال نوچے۔ ناخنوں سے چہرے کو زخمی کر لیا۔ یولی سیز کی بہت منت و سماجت کی۔ اس کے ہاتھ چومے، مگر یولی سیز کو رحم نہ آیا اور اشاروں میں کہنے لگا:

"اے ملکہ! ذرا عقل کو کام میں لایئے۔ ضرورت کے سامنے سر جھکا دیجئے۔ بہت سی بڑھیا مائیں ہمارے گھروں میں بھی ایسی موجود ہیں، جن کی اولاد اس میدان میں خاک کا پیوند ہو چکی ہے اور جس کو وہ آج تک رو رہی ہیں۔"

کسندرہ جو تھوڑا زمانہ ہوا ایشیا کی ملکہ تھی اور آج دشمن کے ہاتھ میں ایک لونڈی کی حیثیت رکھتی ہے، سر پر خاک ڈالتی ہوئی سامنے آئی۔

یہ موقع تھا کہ ایک خیمے کے سامنے سے پردہ ہٹا اور دوشیزہ پولی زینہ ظاہر ہوئی۔ تعریف کی ایک آواز ہر طرف گونج اٹھی اور تماشائیوں نے فوراً پہچان لیا کہ تائیس پولی زینہ بنی ہے اور ہفنوتوس کو بھی آج پھر وہ صورت نظر آئی جس کی تلاش تھی۔ تائیس ایک ہاتھ سے بھاری پردے کو سر سے تھامے ایک حسین بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑی رہی، لیکن نرگسی آنکھیں ہر طرف میٹھی و مغرور نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور ہر تماشائی کے دل میں اس کے حسن کا جادو اپنا کام کر رہا تھا۔

یکلخت تماشائیوں کی زبان سے تعریف کے نعرے بلند ہوئے۔ ہفنوتوس نے بے تاب ہو کر دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیا اور ایک آہ سرد کھینچ کر کہنے لگا:

"خدایا! تو نے اپنی کل مخلوق میں سے صرف اس ایک نازک جان کو اتنی قوت کیوں کر بخش دی؟"

دوریان جس پر کچھ زیادہ اثر نہیں معلوم ہوتا تھا، کہنے لگا:

"حقیقت تو یہ ہے کہ جن ذروں سے یہ عورت بنی ہے، ان کا حسن ترکیب غضب کا ہے۔ اس کو بھی قدرت کا ایک کھیل سمجھئے۔ خود ان ذروں کو علم نہیں کہ مل کر کیا چیز بنائی ہے اور جس بے پرواہی سے یہ ذرے کبھی ملے تھے، اسی بے پرواہی سے ایک دن جدا ہو جائیں گے۔ آپ ہی فرمایئے کہ جن ذرات نے لیاس اور قلوپطرہ جیسی حسین عورتوں کو بنایا تھا وہ کدھر غائب ہو گئے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ بعض وقت عورتیں حسین ہوتی ہیں، مگر بہرحال ان کو ذلیل کیا جاتا ہے اور قابل نفرین تہمتیں ان پر ڈالی جاتی ہیں اور اتنا خیال بھی صرف ان لوگوں کو ہوتا ہے جنہیں غور و فکر کی عادت ہے، ورنہ عام لوگوں کو اس بات سے کچھ بحث ہی نہیں ہوتی۔ عورت مرد کے دل میں جذبہ عشق پیدا کرتی ہے، گو عورت سے عشق کرنا عقل و دانش کے بالکل خلاف ہے۔"

غرض یہ شان تھی، جس میں یونان کے ایک حکیم اور صحرا کے ایک راہب نے تائیس کا جلوہ دیکھا اور دونوں اپنے اپنے خیال کے مطابق اس کیفیت کو سوچتے رہے اور اس حالت میں ایسے محو ہوئے کہ ملکہ ہکوبہ کو اپنی بیٹی پولی زینہ کے قریب آتے بھی نہ دیکھا اور نہ ملکہ کو بیٹی سے یہ کہتے سنا:

"بیٹی! کوئی جتن ایسا کر کہ یولی سیز کو تجھ پر ترس آ جائے۔ اپنے آنسوؤں سے اپنی جوانی اور حسن سے کہہ تیری جان بخشی کے لئے فریاد کریں۔"

تائیس یا یہ کہئے کہ پولی زینہ خیمے کا پردہ اپنے گورے

گورے ہاتھ سے چھوڑ کر ایک قدم باہر آئی اور سب کے دل اس کی نذر ہو گئے۔ شاہانہ تمکنت سے وہ پولی سیز کی طرف بڑھی۔ رفتار کے انداز اور بانسریوں کی آواز میں کچھ ایسا تال میل تھا کہ آج تائیس دنیا کے تمام نغموں کا سرچشمہ معلوم ہوتی تھی۔ تماشائیوں کی یہ کیفیت تھی کہ ان کو سوائے تائیس کے کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ اس کے حسن نے اور سب چیزوں کو گہنا دیا تھا۔ تماشا جاری رہا۔

مغرور پولی سیز نے پولی زینہ کو آتے دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیا اور اپنے ہاتھ بھی چادر میں چھپا لئے کہ پولی زینہ کے لب اس کے ہاتھ کو بوسہ دے کر اپنی انصاف طلب نظروں سے کہیں اس کے دل میں رحم نہ پیدا کر دیں۔ پولی زینہ اشاروں میں پولی سیز سے کہتی معلوم ہوئی:

"پولی سیز مجھ سے ڈریئے نہیں۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ میری موت ضروری ہے تو میں حاضر ہوں کیونکہ میں تو خود ہی مرنے کی تمنا رکھتی ہوں۔ پرائم کی بیٹی ہوں اور ہکٹر کی بہن۔ جس کی سیج کی آرزو بادشاہوں کو ہوئی' وہ ایک ظالم قوم کی لونڈی بن کر نہیں رہ سکتی۔ میں خوشی سے اپنی جان دینے کو تیار ہوں۔"

ہکوبہ خاک پر بے ہوش پڑی تھی۔ دفعتاً سنبھل کر اٹھی اور گلے میں باہیں ڈال کر بیٹی کو لپٹ گئی۔ پولی زینہ نے آہستہ سے ماں کی باہیں اپنے گلے سے نکالیں اور اشاروں میں کہا:

"اے مادر مہربان! دشمن کا جور و ستم کیوں اور اپنے اوپر بڑھاتی ہو۔ کیا سمجھتی ہو کہ وہ مجھ کو تم سے زبردستی نہ چھڑا لیں گے؟ پیاری اماں! اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ اور میرے لبوں تک اپنے لب لاؤ۔"

غم کا حسن اس وقت تائیس کے چہرے پر تھا اور تماشائی محو حیرت تھے کہ زندگی کے واقعات کو یہ عورت کیسی اصلیت و خوبصورتی سے ادا کرنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ پفنوتوس نے تائیس کے غرور حسن کو اس خیال سے معاف کر دیا کہ عاجزی و انکساری کا وقت قریب آ رہا ہے۔ دل میں خوش تھا کہ وہ عنقریب ایک گنہگار عورت کو راہبہ بنا کر خدا کے حضور میں پیش کرنے والا ہے۔

تماشا اس وقت خوب زور پر تھا۔ ملکہ ہکوبہ بیٹی سے جدا ہوتے ہی زمین پر اس طرح گری گویا دم نکل گیا۔ پولی زینہ پولی سیز کے پیچھے پیچھے چلی اور جو مقام اکیلیز کی قبر تصور کیا گیا تھا' وہاں آئی۔ یونان کے بڑے بڑے اہل سیف جنہوں نے جنگ تروجہ میں نام پیدا کیا تھا' اس مصنوعی قبر کے گرد کھڑے تھے۔ ترانہ موت کی صداؤں میں پولی زینہ قبر کے چبوترے پر چڑھی۔ اکیلیز کا لڑکا سونے کا پیالہ ہاتھ میں لئے باپ کے مزار پر پانی اور پھول چڑھا رہا تھا۔ جس وقت قربانی کرنے والوں نے پولی زینہ کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ اس کو قتل کریں تو فوراً اشاروں میں اس نے اجازت چاہی کہ موت کا طریقہ اس کی مرضی پر چھوڑا جائے کیونکہ یہ طریقہ بادشاہوں کی اولاد کے لئے زیبا ہے۔ یہ کہہ کر گریباں چاک کر کے اپنا سینہ کھول دیا۔ اکیلیز کا لڑکا پرہوس قریب آیا اور منہ موڑ کر اپنی تلوار پولی زینہ کے سینہ میں اتار دی۔ فوراً خون کا ایک فوارہ اس دوشیزہ کے گورے گورے سینہ سے نکلتا ہوا معلوم ہوا۔ چکرا کر زمین پر گری۔ موت کی زردی چہرے پر کھنڈی اور دم نکل گیا۔

یونان کے سرداروں نے لاش کو بے عزت کیا۔ پھر سرخ و سپید پھولوں سے اسے ڈھک دیا۔ خوف اور نالہ و زاری کی صدائیں ہر طرف بلند تھیں۔ اسی حالت میں پفنوتوس اٹھا اور بڑی گرجتی ہوئی آواز میں اس نے یہ پیشین گوئی کی:

"بت پرستو! بھوتوں کو پوجنے والو' اور اے اریوسی عیسائیو جو بت پرستوں سے بھی بدتر ہو' سنو میں کیا کہتا ہوں۔ یہ جو کچھ تم نے دیکھا ہے ایک رمز خداوندی ہے۔ اس واردات میں کچھ اور ہی معنی مخفی ہیں' وہ عورت جس نے پولی زینہ کا روپ بھرا تھا' حقیقت میں قربان ہونے والی ہے اور یہ قربانی اس کی خوشی اور مرضی سے خداوند یسوع مسیح کے لئے ہوگی جو قبر سے زندہ ہو کر اٹھا تھا۔"

تماشے کی عمارت سے اب سب لوگ اٹھ کر باہر نکل رہے تھے۔ پفنوتوس کسی طرح دوریان سے علیحدہ ہو کر باہر آیا۔ دوریان پفنوتوس کی پیشین گوئی پر اب تک حیرت میں تھا۔

اس تمام واقعے کے ایک گھنٹے کے بعد پفنوتوس تائیس کے دروازے پر کھڑا تھا۔

سکندر کے مقبرے کے قریب رقوطس کے محلہ میں یہاں صرف دولتمندوں کے مکان تھے۔ تائیس کی عالیشان حویلی تھی۔ اس حویلی کے اندر ایک بڑا خوبصورت باغ

تھا' جس میں جابجا مصنوعی پہاڑ بنے تھے اور ایک نہر جاری تھی' جس کے دونوں طرف سایہ دار درخت تھے۔ ایک بڈھے حبشی نے جو کانوں میں سونے کے بالے پہنے تھا دروازہ کھولا اور پوچھا کہ کیا چاہیے؟

پفنوتوس نے جواب دیا: "میں تائیس سے ملنا چاہتا ہوں اور میرا خدا شاہد ہے کہ صرف اسی سے ملنے یہاں تک آیا ہوں۔"

پفنوتوس اس وقت نیکیاس کی دی ہوئی زرق برق عبا پہنے تھا اور اس کی آواز پر بھی امارت برستی تھی' اس لئے غلام نے اس کو مکان کے اندر آنے دیا اور کہا:

"تائیس اس وقت جل پریوں والے گوشے میں تشریف رکھتی ہیں۔ آپ وہیں ان سے ملاقات کر سکتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

قصب البردی

تائیس مفلس ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوئی تھی' جو آزاد تھے' کسی کے غلام نہ تھے۔ بت پرستی ان کا مذہب تھا۔ تائیس کے بچپن ہی سے اس کا باپ ایک سرائے کا مالک تھا' جو شہر کے قمری دروازہ کے قریب واقع تھی۔ اس میں اسکندریہ کے ملاح اکثر آمد و رفت رکھتے تھے۔ بچپن کی بعض باتیں تائیس کے دل پر ایسی نقش تھیں' جن کو وہ کبھی بھول نہ سکتی تھی۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ اس کا باپ سرائے کے ایک گوشے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا رہتا تھا۔ بھاری بھر کم چپ چاپ سا آدمی تھا اور صورت ایسی تھی کہ دیکھ کر دوسروں کے دل میں خوف پیدا ہوتا تھا۔ یہ انداز اس میں پرانے فرعونوں میں سے ایک فرعون کا تھا' جس کو شہر کے چوراہوں پر اندھوں کی شکوہ آمیز صدائیں انیک یاد دلایا کرتی تھیں۔ تائیس کو یہ بھی یاد تھا کہ اس کی دبلی سوکھی غم زدہ ماں ایک بھوکی بلی کی طرح چیختی چلاتی آنکھیں مچکاتی سارے گھر میں ادھر کی ادھر ماری ماری پھرا کرتی تھی۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ وہ جادوگرنی ہے اور رات کو اپنے یاروں سے ملنے کے لئے الو بن جاتی ہے۔ مگر یہ جھوٹ بات تھی۔ تائیس خوب جانتی تھی کہ اس کی ماں کو جادو سے کچھ سروکار نہ تھا۔ لالچ اس کے مزاج میں البتہ اس قدر تھا کہ دن میں جو کچھ آمدنی ہوتی تھی' رات بھر بیٹھی اس کا حساب کیا کرتی تھی۔ غرض ایک بے پروا باپ اور لالچی ماں نے بیٹی کی کچھ خبر نہ رکھی اور آزاد کر دیا کہ جانوروں کی طرح یہ بھی اپنا کوئی طرز زندگی پیدا کرے۔ ابھی بچہ ہی تھی کہ شرابی ملاحوں کی جیبوں سے پیسے نکال لینے میں خوب مشاق ہو گئی تھی۔ گندے گندے گیت گا کر ان کو خوش کرتی تھی' حالانکہ ایک لفظ بھی ان کا وہ نہ سمجھتی تھی۔ کبھی ایک ملاح کی گود میں جا بیٹھتی' کبھی دوسرے ملاح کے گھٹنے پر چڑھ بیٹھتی تھی۔ شرابی نشے میں اسے پیار کرتے تھے اور ان کے آلودہ ہونٹوں سے اس کے گال چپ چپا جاتے تھے۔ کبھی ان کی داڑھیوں کے سخت بالوں سے اس کے کلوں پر کھرنچیں لگ جاتی تھیں مگر اسی حالت میں ان کی کمر سے پیسے نکال کر بھاگ جاتی تھی اور گھر سے نکل کر شہر کے دروازے میں جو پوپلی بڑھیا شہد بیچا کرتی تھی' اس سے شہد لے کر چاٹا کرتی تھی۔ سرائے میں روز یہی کیفیت رہا کرتی تھی' ملاح نشے کی ترنگ میں بڑے جوش و خروش سے سمندر کے خطروں اور طوفان کا حال بیان کیا کرتے تھے۔ کبھی جواء کھیلتے تھے' کبھی گالیاں دے دے کر شراب مانگتے تھے۔

شرابیوں میں رات کو ایسی لڑائیاں ہوتی تھیں کہ تائیس سوتے سوتے چونک پڑتی تھی۔ کھانے کی میز پر کیکڑوں کی ہڈیاں جو پڑی رہ جاتی تھیں' ان کو اٹھا کر وہ ایک دوسرے کی طرف زور زور سے پھینکتے تھے اور اس نشانے بازی میں ان کے چہرے زخمی ہو جاتے تھے۔ بعض وقت آپس میں چھری چل جاتی تھی اور یہ لڑکی چراغوں کے پاس چھریوں کی چمک دیکھ کر ڈر جاتی تھی اور شرابی زخموں سے لہولہان ہو جاتے تھے۔

بچپن میں اگر حقیقت میں کوئی اچھا اور نیک بخت آدمی تائیس کو ملا تو وہ احمس تھا۔ اس کے سامنے یہ لڑکی سب شوخیاں بھول کر بڑی عاجز و مسکین بن جاتی تھی۔ احمس اس گھر کا غلام تھا۔ نوبیہ کا رہنے والا تھا اور اس کا رنگ ان پتیلوں کے پیندوں سے بھی زیادہ سیاہ تھا' جن کے مانجھنے کی خدمت اس کے سپرد تھی۔ تائیس کے لئے وہ ایسی ہی آرام کی چیز تھا' جیسے اندھیری رات ہو' جس میں خوب مزے کی نیند آئے۔ وہ اکثر اس بچی کو اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ ان میں ایسے زر

پرست بادشاہوں کا حال ہوتا تھا' جنہوں نے اپنے خزانے رکھنے کے لئے بڑے بڑے سنگین تہ خانے بنوائے تھے اور جب وہ بن چکے تو بنانے والوں کو قتل کردیا۔ بعضی کہانیوں میں چوروں کا حال ہوتا تھا' جنہوں نے بادشاہوں کی بیٹیوں سے بیاہ کیا اور ان پرانی کسبیوں اور بیسواؤں کا ذکر بھی ہوتا تھا' جنہوں نے مصر کے اہرام تعمیر کرائے تھے۔
تائیس کو بچپن میں احمس سے ایسی محبت تھی' جیسے کوئی لڑکی اپنے ماں باپ یا کھلائی یا اپنے کتے سے محبت کرے۔ ہر وقت اس سے چمٹی رہتی تھی۔ اگر احمس شراب کے مٹکوں والی اندھیری کوٹھڑی میں جاتا تو اس کے ساتھ ساتھ ہوتی۔ اگر صحن میں چھری چمکاتا کسی مرغی کو پکڑنے دوڑتا اور مرغیاں ادھر ادھر پھڑپھڑاتی پھرتیں تو اس تماشے میں بھی تائیس اس کے پیچھے پیچھے لگی رہتی۔ رات کو سب کاموں سے فارغ ہو کر جو وقت سونے کے لئے ملتا تھا' اس میں بھی احمس آرام نہ کرتا تھا' بلکہ پھونس کے بچھونے پر بیٹھا تنکوں کی چھوٹی چھوٹی پن چکیاں اور جہاز مع ساز و سامان کے تائیس کے کھیلنے کے لئے بنایا کرتا۔
تائیس کے باپ نے اس غلام پر بڑے بڑے ظلم کئے تھے۔ ایک کان تو پہلے ہی اڑا دیا تھا اور اب بدن پر مار کے بیسیوں نشان رہا کرتے تھے۔ باوجود اس کے احمس کے چہرے پر ایک اطمینان اور بشاشی برستی تھی۔ کوئی شخص اس سے یہ نہ پوچھتا تھا کہ یہ اطمینان اور خوشی اسے کیوں کر میسر رہتی ہے۔ طبیعت اس کی بالکل معصوم بچوں کی سی تھی۔ جب گھر کا کام کاج کرتا ہوتا تھا تو گرجاؤں میں جو گیت خدا کی تعریف میں گائے جاتے تھے' ان کو کرخت آواز سے گاتا رہتا تھا۔
احمس حقیقت میں عیسائی تھا۔ اسے اصطباغ مل چکا تھا۔ عیسائیوں کے مذہبی جلسوں میں اس کا نام تھیدرو لیا جاتا تھا۔ رات کو چھٹی کا وقت وہ ان جلسوں میں صرف کیا کرتا تھا۔

یہ زمانہ مصر میں عیسائیوں کے لئے بڑی گردش اور آزمائشوں کا تھا۔ شہنشاہ کے حکم سے ان کے اکثر گرجے گرا دئے گئے تھے۔ انجیلیں جلا دی گئی تھیں۔ کلیسا کے شمع دان اور قیمتی ظروف سب آگ میں ڈال کر گلا دئے گئے تھے۔ جب عیسائیوں کی ایسی چیزیں جنہیں وہ اپنی عزت و وقعت کا باعث سمجھتے تھے' غارت کردی گئیں تو پھر ان کو سوائے موت کے اور کسی چیز کا انتظار نہ ہو سکتا تھا۔
اسکندریہ کے عیسائیوں کی حالت بھی سخت خوف و خطرے کی تھی۔ یہ لوگ ڈرے سہمے ہوئے آپس میں چپکے چپکے کہا کرتے تھے کہ ایذا رسانی کے ہولناک آلے' تازیانے' شکنجے' وحشی درندے جمع کئے جا رہے ہیں کہ پادریوں اور عیسائیوں کی کنواری لڑکیوں کو اذیتیں دے کر ہلاک کیا جائے یا درندوں سے پھڑوا ڈالا جائے۔ یہی حالت خوف ہر طرف سب پر طاری تھی کہ مقدس انطونی جس کی عبادت و ریاضت کا شہرہ عام تھا کوہ کلزین سے اتر کر اسکندریہ میں اس تیزی سے پہنچا' جیسے پہاڑ کی چوٹی سے عقاب جھپٹ کر آئے۔ مصری عیسائیوں کے گرجاؤں میں جا کر لوگوں میں دین کی حمایت کا وہی جوش موجزن کر دیا جو خود اس کے دل میں تھا۔ بت پرستوں کو وہ نظر نہ آ سکا' مگر عیسائیوں میں اس نے وہ قوت اور احتیاط پیدا کر دی جو خود اس میں موجود تھی۔ عیسائی غلاموں پر سخت ظلم ہو رہے تھے۔ بہت لوگ ایسے تھے جنہوں نے جان و مال کے خیال سے عیسائی مذہب ترک کر دیا تھا۔ ہزارہا لوگ وہ تھے' جو شہر چھوڑ کر صحرا میں اس لئے چلے گئے تھے کہ یا تو خدا کی یاد میں زندگی کے دن کاٹیں گے یا قزاقی کا پیشہ اختیار کریں گے۔ احمس اس زمانہ میں حسب معمول عیسائیوں کے مذہبی جلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ عیسائی قیدیوں سے قید خانے میں جا کر ملتا تھا اور جو مسیحی شہید کر دئے جاتے تھے' ان کو دفن کرتا تھا اور خوش ہو کر اپنے مسیحی دین کا سب کے سامنے اظہار کرتا تھا۔ انطونی نے احمس کی دینی خدمتوں پر نظر کی اور صحرا کو واپس جانے سے پہلے وہ اس حبشی غلام سے بغلگیر ہوا اور سلامتی دینے کے لئے اس کا بوسہ لیا۔
تائیس کی عمر جب سات برس کی ہوئی تو ایک دن احمس اس سے خدا کی باتیں اس طرح کہنے لگا:
"خداوند خدا' آسمان پر اس طرح رہتا تھا' جیسے حریم کے خیموں میں اور باغوں کے درختوں کے نیچے مصر کے پرانے بادشاہ رہا کرتے تھے۔ وہ قدیموں میں سب سے قدیم تھا اور اس زمین و آسمان سے بھی زیادہ پرانا تھا۔ اس کا ایک اکلوتا بیٹا تھا' جس کا نام شہزادہ یسوع تھا۔ خدا کو وہ دل سے عزیز تھا اور اس کا حسن و جمال فرشتوں اور دوشیزہ لڑکیوں سے بھی بڑھ کر تھا اور خدا نے شہزادہ یسوع سے

کہا: "میرے حریم اور میرے محلوں سے، میرے خرمے کے درختوں اور میرے باغ کے چشموں سے رخصت ہو اور آدمیوں کی بھلائی کے لئے نیچے دنیا میں جا۔ وہاں پہلے تو ایک بچے کی شکل ہو گا اور مسکینوں میں ایک مسکین کی طرح رہے گا۔ مصیبت تیری روز کی روٹی ہو گی اور تیرے آنسو اتنے ہوں گے کہ ان سے دریا بہ نکلیں گے، جن میں تھکے ہارے غلام نہائیں گے اور خوش ہوں گے۔ اے میرے فرزند جا۔"

"شہزادہ یسوع نے خدا کے اس حکم کو مانا اور وہ اس دنیا میں آیا اور یہودیہ کے مقام بیت اللحم میں آسمان سے اترا اور میدانوں میں چلا، جن پر پھولوں کا فرش تھا اور اپنے ساتھ والوں سے اس نے کہا: "مبارک ہیں وہ جو بھوکے ہیں، کیونکہ وہ میرے باپ کے ساتھ کھانے بیٹھیں گے۔ مبارک ہیں وہ جو پیاسے ہیں، کیونکہ آسمان کے چشموں سے وہ پانی پئیں گے۔ مبارک ہیں وہ جو روتے ہیں، کیونکہ ان کے آنسوؤں کو میں خشک کروں گا حریر کے پارچوں سے جو مصر کی ناچنے والیوں کی نقاب سے بھی زیادہ نازک و نرم ہوں گے۔"

یہ باتیں سن کر مفلسوں کو یسوع سے بہت محبت ہو گئی اور اس پر وہ ایمان لے آئے۔ لیکن مالداروں نے اس سے نفرت کی اور ڈرے کہ کہیں یسوع مفلسوں کو ان پر غالب نہ کر دے۔ اس زمانہ میں مصر کی ملکہ قلوپطرہ اور روما کے قیصر کو زمین پر ہر طرح کی قدرت حاصل تھی۔ مصر کی ملکہ کے حکم سے شام کے حاکموں نے ایک اونچے پہاڑ پر صلیب کھڑی کی اور اس پر یسوع کو ہلاک کیا۔ پھر عورتوں نے اس کی لاش کو غسل دیا اور اس کو دفن کیا۔ پھر شہزادہ یسوع اپنی قبر کا پتھر ہٹا کر اپنے باپ خدا کے پاس آسمان پر چلا گیا۔

اس وقت سے جتنے آدمی یسوع پر ایمان رکھتے ہوئے مرتے ہیں وہ آسمان پر چلے جاتے ہیں اور خداوند خدا ہاتھ بڑھا کر ان سے کہتا ہے: "مبارک ہے تمہارا آنا، کیونکہ تم میرے فرزند سے محبت رکھتے ہو۔ آؤ، نہاؤ اور کھاؤ۔"

پھر وہ نہاتے رہیں گے اور گانے کی آوازیں آتی رہیں گی اور جب تک وہ کھاتے رہیں گے، حوریں ان کے سامنے رقص کرتی رہیں گی اور وہ قصے اور داستانیں سنتے رہیں گے۔ خداوند خدا ان کو اپنی آنکھوں کے نور سے زیادہ عزیز رکھے گا اور چونکہ وہ اس کے مہمان ہوں گے، اس لئے خدا کے باغ سے ان کو میوے اور انار دیئے جائیں گے۔"

احمس اکثر ایسی باتیں سنا کر تائیس کو حق سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ تائیس ان باتوں کو سن کر خوش ہوتی تھی اور کہتی تھی: "انار تو میں ضرور کھاؤں گی۔"

احمس جواب دیتا:

"آسمان کے میوے صرف انہی کو چکھنے کو ملتے ہیں، جنہیں مسیح کے نام سے اصطباغ دیا گیا ہو۔" یہ دیکھ کر کہ تائیس کو مسیح کی برکت اور وسیلہ سے نجات کی امید ہے، احمس اور بھی شوق و توجہ سے اس لڑکی کو عیسائی مذہب کی باتیں سکھاتا تھا، تاکہ اصطباغ پاتے ہی گرجا میں داخلہ کی مستحق ہو جائے۔ اس طرح تائیس اپنے غلام احمس کی روحانی بیٹی بن کر اور بھی اس سے محبت کرنے لگی۔

تائیس کو ماں باپ کی بے انصافیوں سے ایسی نفرت ہو گئی تھی کہ جہاں وہ سوتے تھے، وہاں یہ سوتی بھی نہ تھی، بلکہ گھر کے اصطبل میں ایک کونے میں پھونس بچھا کر رات کو پڑ رہتی تھی۔ احمس گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اس کے پاس چلا آتا تھا۔

تائیس کے بچھونے کے پاس چپکے چپکے آ کر آلتی پالتی مار کر زمین پر بیٹھ جاتا تھا۔ اس کے بدن اور چہرے کی سیاہی اس بلا کی تھی کہ اندھیرے میں پتا بھی نہ چلتا تھا کہ کدھر بیٹھا ہے، البتہ آنکھوں کی سفیدی تاریکی میں ایسی نظر آتی تھی، جیسے کسی دروازے کے سوراخوں میں صبح کی روشنی چھنتی ہو۔ بات چیت میں اس کے لہجے میں ان پردرد اور شیریں نغموں کا سا سوز و گداز ہوتا تھا جو شام کے وقت اکثر گلی کوچوں میں سنائی دیا کرتے تھے اور جب رات کے وقت تائیس کے بستر کے قریب وہ انجیل گا گا کر پڑھتا تھا تو کبھی کبھی کسی بیل یا گدھے کی آواز بھی تاریک روحوں کے طائفہ کی طرح اس غریب غلام کی لے میں لے ملانے لگتی تھی، مگر احمس کی آواز جوش عقیدت اور امید رحمت سے لبریز تاریکی سے نکل کر ہر طرف پھیلتی تھی اور اس عالم عبرت میں کہ گھپ اندھیری رات اور مسیحی اولیاء کے اسرار ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ تائیس نصرانیت کی نو آموز لڑکی احمس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر اور اس کے منہ سے پاک لوریاں سن کر اپنے

تخیل کی دھندلی دھندلی صورتیں دیکھتی ہوئی مسکراتی صورت سے میٹھی نیند سو جایا کرتی تھی اور آسمان کا ایک چمکتا تارا اصطبل کی ایک جھری سے اس معصومہ کے چہرے پر اپنی روشنی ڈالتا تھا۔

احمس اس طرح اس لڑکی کو ایک سال تک عیسائی مذہب کی تلقین کرتا رہا۔ یہاں تک کہ عید فسح کا زمانہ آیا۔ اس عید میں عیسائی سات دن تک بڑی خوشیاں منایا کرتے تھے۔ ان ہی دنوں میں ایک رات سوتے سوتے تائیس کی آنکھ کھلی، دیکھا کہ احمس اسے اپنی گود میں اٹھا رہا ہے۔ آج اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب چمک ہے اور معمول کی طرح پھٹے پرانے کپڑے بھی اس کے بدن پر نہیں ہیں، بلکہ ایک بہت سفید لمبا جبہ پہنے ہے اور کہتا ہے: "آ میری جان! آ میری آنکھوں کے نور، آ میرے ننھے سے جی، تجھے اصطباغ کا پیرہن پہناؤں۔"

یہ کہہ کر تائیس کو گود میں اٹھا اور اپنے جبہ کے دامن سے اسے اچھی طرح ڈھک کر گلے سے لگا کہیں جانے لگا۔ تائیس بچہ تھی۔ ڈرتی بھی تھی اور ہر چیز کے دیکھنے کا شوق بھی تھا۔ کپڑے سے منہ تو باہر نکال لیا تھا، لیکن احمس کے گلے میں باہیں ڈال کر خوب زور سے چمٹ گئی تھی۔ اسی حالت میں احمس اندھیری گلیوں میں چلتا رہا۔ یہودیوں کے محلے سے گزر ہوا۔ پھر ایک قبرستان کے پاس سے نکلا اور یہاں سے ایک مردہ خور جانور کی منحوس آواز سنی۔ چوراہوں پر دیکھا کہ صلیبیں گڑی ہیں اور مجرم ان پر میخوں سے ٹھکے ہوئے لٹک رہے ہیں اور ان کے بازوؤں پر کوے بیٹھے بسیرا لے رہے ہیں۔ یہ چیزیں دیکھ کر تائیس نے احمس کے کپڑوں میں منہ چھپا لیا اور پھر منہ باہر نہ نکالا۔ دفعتاً اسے معلوم ہوا کہ احمس کہیں نیچے زمین کے اندر اتر رہا ہے۔ تائیس نے اپنا منہ کھولا اور دیکھا کہ وہ ایک تنگ اور لمبے سے کمرے میں ہے اور اس میں بہت سی مشعلیں روشن ہیں۔ دیواروں پر قد آدم تصویریں بنی ہیں جو مشعلوں کے دھوئیں میں حرکت کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ سب تصویریں مردوں کی ہیں، مگر وہ بڑی نیچی نیچی عبائیں پہنے ہیں۔ ہاتھوں میں کھجور کے پتے ہیں اور ادھر ادھر بھیڑوں کے بچے، قمریاں اور انگور کی بیلیں بنی ہیں۔

ان تصویروں میں تائیس نے ناصرۃ کے یسوع کو پہچان لیا، کیونکہ اس کے قدموں کے پاس پھول کھلے تھے۔

کمرے کے بیچ میں ایک سنگی حوض تھا، جو اوپر تک پانی سے بھرا تھا اور اس کے پاس ایک بڈھا پادری سر پر پادریوں کی ٹوپی رکھے اور ایک سرخ رنگ کا چغہ پہنے جس پر زری کا کام تھا کھڑا تھا۔ اس کی داڑھی بہت گھنی تھی۔ گو لباس بہت بارعب تھا، مگر پادری کی صورت پر نرمی اور شرافت برستی تھی۔ اس بڈھے پادری کا نام ویوانتوس تھا۔ یہ افریقہ کے شہر کارینی کا کسی زمانہ میں اسقف اعظم تھا، مگر جب وہاں سے جلا وطن کیا گیا تو اسکندریہ میں چلا آیا اور یہاں جلاہے کا پیشہ اختیار کیا۔ بھیڑ بکریوں کے بالوں کا موٹا جھوٹا کپڑا بنا کرتا تھا، دو بہت مفلس بچے اس کے پاس کھڑے تھے اور قریب ہی ایک حبشن ہاتھ میں ایک سفید کرتا لئے موجود تھی۔ تائیس کو گود سے اتار کر احمس نے اسقف اعظم کو تعظیم دی اور کہا: "یا ابی! یہی وہ چھوٹی سی جان میری روحانی بیٹی ہے۔ اسے آپ کے پاس لایا ہوں کہ اگر مناسب ہو تو اس وقت حسب وعدہ اس کو اصطباغ دیا جائے۔"

اتنا سن کر اسقف نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ معلوم ہوا کہ اس کی انگلیاں کٹی ہوئی ہیں۔ جس زمانے میں عیسائیوں پر ظلم ہو رہے تھے تو بت پرستوں نے اقرار نصرانیت کے جرم میں اس پادری کی انگلیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ تائیس کٹی ہوئی انگلیاں دیکھ کر ڈری اور دوڑ کر احمس سے چمٹ گئی، لیکن پادری نے اس سے ایسی پیار کی باتیں کیں کہ تائیس کا ڈر نکل گیا۔ پادری اس لڑکی سے کہنے لگا:

"پیاری بیٹی ڈرو نہیں، اس دنیا میں احمس تیرا روحانی باپ ہے، جسے ہم مسیح پر ایمان رکھنے والے تیدرو کہتے ہیں اور اس روحانی باپ کے علاوہ تیری ایک روحانی ماں بھی ہے، جس نے تیرے لئے ایک سفید پیرہن اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہے۔" پادری نے اب حبشن بڑھیا کی طرف دیکھ کر کہا: "اس کا نام نی تیدا ہے۔ اس دنیا میں وہ ایک لونڈی ہے، لیکن آسمان پر یسوع اس کو اپنی دلہن بنائے گا۔" پھر پادری نے تائیس سے سوال کیا: "تائیس بتاؤ، تم خدا پر جو قادر مطلق ہے اور اس کے اکلوتے بیٹے پر جس نے ہماری نجات کے لئے اپنی جان دی اور ان سب باتوں پر جو "رسولوں" نے سکھائیں ایمان رکھتی ہو؟"

حبشی اور حبشن نے جو تائیس کے ہاتھ پکڑے ہوئے

تھے' جواب دیا: "ہاں۔"
اب پادری کے کہنے پر حبشن نے جھک کر تائیس کے سب کپڑے اتار ڈالے سوائے گلے کے تعویذ کے' بدن پر کچھ نہ رہا۔ پھر پادری نے اس لڑکی کو تین مرتبہ اصطباغ والے حوض میں غوطہ دیا۔ ملازموں نے تیل اور نمک پیش کیا۔ پادری نے تائیس کے بدن پر تیل ملا اور نمک کی ایک کنکری اس کے منہ میں دی۔ پھر اس کے بدن کو خشک کر کے جس کے مقدر میں بڑی بڑی آزمائشوں کے بعد ازلی زندگی لکھی تھی' بڑھیا حبشن نے اس کو سفید پیرہن جس کا کپڑا اس نے خود بنا تھا' پہنایا۔

پادری نے پھر سب کو سلامتی دے کر ایک ایک کا بوسہ لیا اور جب رسم ختم ہوئی تو اس نے وہ ٹوپی اور چغہ جو اصطباغ کے وقت پہنا تھا اتار دیا۔ جب سب لوگ کمرے سے باہر نکلے تو احمس نے کہا:

"آج ہم سب کو خوش ہونا چاہیے' کیونکہ آج ہم نے ایک روح خداوند کو نذر دی ہے۔ پادری دیوانتوس اگر اجازت ہو تو ہم سب آپ کے گھر چلیں اور جتنی رات رہ گئی ہے' اس میں خوشیاں منائیں۔"

پادری نے کہا: "بہت مناسب ہے۔"

اب دیوانتوس ان سب کو ساتھ لئے اپنے گھر آیا' جو بہت ہی پاس تھا۔ اس پورے گھر سے مراد صرف ایک کمرہ تھا' جس کے سامان میں ایک پرانے قالین کا ٹکڑا' ایک بڑی میز اور دو کرگھے تھے۔ اندر پہنچ کر احمس نے کہا:

"نی تیدا۔ ذرا تیل کی ہنڈیا اور کڑاہی تو اٹھا لاؤ' کہ کچھ پکائیں اور مزے لے لے کر کھائیں۔"

یہ کہہ کر احمس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چند چھوٹی چھوٹی مچھلیاں جن کو معلوم نہیں کب سے چھپا رکھا تھا نکالیں۔ آگ جلائی اور کڑاہی میں مچھلیاں تلنی شروع کیں۔ جب مچھلیاں تیار ہو گئیں تو پادری اور دونوں غریب لڑکے' تائیس' احمس اور حبشن حلقہ باندھ کر زمین پر بیٹھے مچھلیاں کھاتے جاتے تھے اور خدا کا شکر کرتے جاتے تھے۔

اس طرح تائیس کی رسم اصطباغ ختم ہوئی

تائیس کھیل تماشے بہت پسند کرتی تھی۔ جوں جوں بڑی ہوتی گئی' دل میں طرح طرح کے برے شوق پیدا ہوتے گئے۔ گلیوں میں جو لڑکے آوارہ پھرتے تھے' ان کے ساتھ دن دن بھر ناچا اور گایا کرتی تھی اور اسی طرح ناچتی ہوئی گھر واپس آیا کرتی تھی۔

اب اس کو احمس کی جگہ لڑکوں اور لڑکیوں کی صحبت زیادہ پسند تھی۔ اس کا خیال تک نہ آتا تھا کہ اب احمس اس کے پاس بہت کم آتا ہے۔ عیسائیوں پر ظلموں کا سلسلہ کچھ عرصہ سے بند ہو گیا تھا اور ان کی مذہبی مجلسیں باقاعدہ ہونے لگی تھیں۔ ان سب میں یہ حبشی غلام ضرور شریک ہوتا تھا۔ اس کا مذہبی جوش بہت بڑھتا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ایسے کلمے منہ سے نکالتا تھا کہ دولتمند ان کو ایک قسم کی دھمکیاں سمجھتے تھے۔ ایک موقع پر کہہ اٹھا کہ اب مالدار اپنے مال پر قبضہ نہ رکھ سکیں گے۔ جہاں جہاں مفلس عیسائی جمع ہوا کرتے تھے' وہاں پہنچتا تھا اور وہیں ایسے تنگ دست عیسائیوں کو بھی بلا لاتا تھا جو سڑک کے کنارے دیواروں کے سایہ میں خستہ حال پڑے سوتے تھے اور پھر سب سے کہتا تھا: "گھبراؤ نہیں' جتنے غلام ہیں' سب آزاد ہونے والے ہیں۔ انصاف کا دن قریب آ گیا ہے۔" ایک دن کہنے لگا:

"خدا کی بادشاہت میں جس وقت غلام اچھی اچھی شرابیں اور مزیدار میوے کھاتے ہوں گے' اس وقت مالدار ان کے قدموں کے پاس کھڑے کتوں کی طرح منہ تکتے ہوں گے کہ کوئی ٹکڑا ان کے ہاتھ سے گرے اور وہ اسے نگل جائیں۔"

ایسی باتیں بھلا کب چھپی رہ سکتی تھیں۔ سارے شہر میں ان کی شہرت ہو گئی اور آقاؤں کو ڈر ہوا کہ کہیں ان کے غلام ایسی باتیں سن کر ان سے باغی نہ ہو جائیں۔ احمس کا آقا بھی دل میں اس کا دشمن تھا مگر کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔

ایک دن ایک چاندی کا نمک دان جو دیوتاؤں کی پوجا کے وقت کام میں آتا تھا' سرائے سے چوری ہو گیا۔ اس بنا پر کہ احمس اپنے آقا کا بدخواہ ہے اور سلطنت کے دیوتاؤں سے بھی نفرت رکھتا ہے' اس پر چوری کا الزام لگایا گیا۔ اس الزام کا مطلق کوئی ثبوت نہ تھا۔ احمس نے بھی اس حرکت سے قطعی انکار کیا تھا' مگر کسی نے نہ سنا اور اسے پکڑ کر عدالت میں لے گئے۔ چونکہ ہر شخص سمجھتا تھا کہ وہ ایک ذلیل غلام ہے' حاکم نے بھی ایسا ہی سمجھ کر اس کو سزائے موت کا حکم سنا دیا اور کہا:

"تمہارے ہاتھ جن سے تم نے اچھے کام نہیں کئے' صلیب پر رکھ کر ان میں لوہے کی کیلیں جڑ دی جائیں گی۔"

احمس نے اس حکم کو بالکل اطمینان سے سنا اور سن کر نہایت ادب سے حاکم کو سلام کیا۔ اس کے بعد سپاہی اس کو قید خانے میں لے گئے۔ تین دن تک وہ وہاں رہا اور اس عرصے میں قیدیوں کو انجیل سناتا رہا' چنانچہ بعد کو مشہور ہوا کہ اس کے کلام میں ایسا اثر تھا کہ نہ صرف قیدی بلکہ قید خانے کا داروغہ بھی مسیح مصلوب پر ایمان لے آیا۔

چوتھے دن اس حبشی غلام کو اس چوراہے پر لے گئے جہاں سے وہ دو برس پہلے اپنی پیاری تائیس کو گود میں لئے گزرا تھا۔ جس وقت اس کے ہاتھوں میں لوہے کی میخیں ٹھونکی گئیں تو اس کے منہ سے اف تک نہ نکلی۔ البتہ بعد کو کئی مرتبہ اتنا ضرور کہا: "میں پیاسا ہوں۔"

یہ سزا تین دن اور تین رات تک جاری رہی۔ یہ باور کرنا کہ اتنی مدت تک ایسی سخت اذیت کو انسان کیوں کر برداشت کر سکتا ہے' ناممکن ہے۔ کئی مرتبہ لوگ سمجھے کہ وہ ختم ہو گیا۔ مکھیوں نے آنکھوں کو زخمی کر دیا تھا' مگر پھر بھی بعض وقت یہ خون آلودہ آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ چوتھے دن صبح کے وقت وہ مسکرایا اور کہنے لگا:

"دیکھو یہ آئے خدا کے فرشتے۔ یہ میرے لئے شراب اور میوے لائے ہیں۔ ان کے پروں کی ہوا کیسی روح پرور ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ جاں بحق ہوا۔

احمس کے مردہ چہرے پر ایک روحانی مسرت پائی جاتی تھی۔ سپاہی جو صلیب کے گرد پہرہ دے رہے تھے اس کی تعریفیں کرتے تھے۔ پادری ویوانتوس چند عیسائیوں کو ساتھ لئے لاش مانگنے آیا۔ لاش لے کر یوحنا شہید کی قبر کے پاس اس کو دفن کر دیا اور اس نیک غلام کو احمس کے نام سے نہیں بلکہ تھیدرونوبی شہید کے لقب سے کلیسا نے نہایت تعظیم کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھا۔

اس واقعہ کے تین برس بعد شہنشاہ قسطنطین نے اپنے حریف مقابل مازن تیوس کو شکست دے دی تو تمام عیسائیوں سے کہہ دیا گیا کہ سلطنت قیصری میں ان کی جان و مال کو بالکل حفاظت و سلامتی میسر رہے گی۔ اس وقت سے عیسائیوں پر بت پرستوں کے ظلم بند ہو گئے۔ اس کے بعد ان پر اگر کوئی سختی ہوئی تو وہ اپنے ہی مذہب کے اہل بدعت کی طرف سے ہوئی۔

جس وقت احمس اذیت کے ساتھ صلیب پر ہلاک ہوا تھا' اس وقت تائیس کا سن گیارہ برس کا تھا۔ اس کی روحانی تعلیم ابھی تک اس بات کے سمجھنے کے لئے کافی نہ تھی کہ احمس نے جس طرح اپنی زندگی بسر کی تھی یا جس طریقہ سے اس کی موت کا واقعہ پیش آیا تھا' ان دونوں باتوں نے اب اس کو ایک مبارک ہستی بنا دیا ہے' بلکہ اس کی چھوٹی سی سمجھ میں یہ بات آئی کہ دنیا میں نیک رہنے کے لئے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ چونکہ اس کا نازک جسم تکلیف نہ اٹھا سکتا تھا' اس لئے وہ نیکی سے ڈرنے لگی۔

تائیس ابھی پوری جوانی کو بھی نہ پہنچی تھی کہ بندرگاہ کے بہت سے جوان لڑکے اس کے عاشق بن گئے۔ اچھی عمر والے جو شام کے وقت شہر کے باہر چکر لگایا کرتے تھے' تائیس ان کے پیچھے پیچھے جانے لگی۔ جتنا روپیہ ان سے ملتا تھا' اس سے کپڑے اور زیور خریدا کرتی تھی۔

تائیس اپنی کمائی گھر لے جا کر ماں کو نہ دیتی تھی' اس لئے ماں اس کو خوب مارا کرتی تھی۔ اس مار پیٹ سے بچنے کے لئے وہ ننگے پاؤں بھاگ کر شہر کی فصیل پر پہنچتی اور وہاں کسی ٹوٹی دیوار کی آڑ میں چھپ کر بیٹھتی۔ یہاں پتھروں کی جھریوں میں چھپ کلیوں کو دیکھ کر ڈرا بھی کرتی تھی۔ اس حال میں بیٹھے بیٹھے وہ ان امیر زادیوں کو رشک کی نظر سے دیکھا کرتی تھی' جو اچھے اچھے کپڑے پہنے ڈولوں میں سوار ادھر سے گزرا کرتی تھیں اور ایک غول نوکروں اور غلاموں کا ان کے ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔

ایک دن جب ماں نے بہت ہی مارا تو وہ گھر سے نکل کر شہر کے دروازے میں ایک پتھر پر جا بیٹھی۔ اتنے میں ایک بڑھیا چلتے چلتے اس کے سامنے آ کر رکی اور کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگی:

"واہ کیا پھول سی صورت ہے۔ کس غضب کا روپ ہے۔ بڑے نصیب والا ہو گا' وہ باپ جس کی تو بیٹی ہے اور بڑی بھاگوان ہو گی وہ ماں جو تجھے اس دنیا میں لائی۔"

تائیس نیچی نظریں کئے چپ بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں روتے روتے لال ہو گئی تھیں۔

بڑھیا نے پھر کہا: "پیاری لڑکی، جس ماں نے ایسی دیوی کو گودوں پالا ہوگا کیا وہ خوش نصیب نہ ہوگی۔ کیا تیرے باپ کا دل تجھے دیکھ کر باغ باغ نہ ہوتا ہوگا؟"

تائیس نے نظر تک اونچی نہ کی اور جس طرح کوئی خود باتیں کرتا ہو کہا: "باپ شرابی ہے اور ماں بخیل۔"

بڑھیا نے اس خیال سے کہ کوئی دیکھتا نہ ہو، پہلے دائیں بائیں نظر ڈالی پھر بہت ہی اخلاص سے کہنے لگی: "پیاری نرگس، آ میرے ساتھ چل۔ پھر ناچنے اور خوش رہنے کے سوا دوسرا کام نہ ہوگا۔ میں تجھے شہد کھلایا کروں گی اور میرا بیٹا تو تجھے اپنی آنکھوں پر بٹھائے گا، وہ بڑا ہی خوبصورت اور نازک اندام ہے، جوانی ابھی شروع ہی ہوئی ہے۔"

تائیس نے جواب دیا: "اچھا چلو۔" یہ کہہ کر اٹھی اور بڑھیا کے ساتھ شہر سے باہر نکلی۔

یہ بڑھیا جس کا نام میرو تھا، ایک قحبہ تھی۔ غریب آدمیوں کے لڑکے یا لڑکیاں کہیں مل جاتے تھے تو انہیں بہلا پھسلا کر اپنے گھر لے جاتی تھی اور ناچنا گانا سکھا کر انہیں امیروں کے جلسوں میں کرایہ پر چلاتی تھی۔

یہ سمجھ کر کہ یہ لڑکی تھوڑے ہی دنوں میں بلا کا روپ نکالے گی، اس پر بڑی محنت کی اور سخت ظلم کے کوڑے مار مار کر اس کو گانا بجانا سکھایا اور ناچنے میں اگر کہیں تال سر سے پاؤں باہر پڑتا تھا تو چمڑے کے تسموں سے خبر لیتی تھی۔ میرو کا لڑکا ایک بڑا ہی کریہہ صورت جوان تھا۔ اس کا برتاؤ تائیس کے ساتھ بہت برا تھا۔ عورتوں سے اسے نفرت تھی اور اس نفرت کے ظاہر کرنے کے لئے تائیس کو تختہ مشق بنا رکھا تھا۔ ناچنے والیوں کو اپنا ہم پیشہ سمجھ کر ان ہی کے ناز و انداز خود بھی اختیار کر لئے تھے۔ گونگے تماشوں میں جن میں کل مضمون اشاروں سے ادا کیا جاتا ہے وہ بڑا ہی مشاق تھا۔ یہ فن بالخصوص عشق و محبت کی باتیں اشاروں میں کرنی، اس نے تائیس کو خوب سکھا دی تھیں اور اسے نو آموز سمجھ کر ایسی ایسی باتیں بگھارتا تھا کہ معلوم ہوا اس فن میں اس کے برابر کوئی استاد نہیں۔

تائیس کی خوبصورتی سے بہت جلتا تھا اور یہ سوچ کر کہ اس آفت روزگار نے مردوں ہی میں اپنا جوبن لٹوانے کو دنیا میں قدم رکھا ہے، کبھی اس کے گال نوچ لیتا تھا، کبھی چٹکیاں لیتا تھا اور کبھی شریر لڑکیوں کی طرح پیچھے سے آ کر سوئی چبھو دیتا تھا۔ بہرکیف ناچنے گانے اور نقالی میں جس قدر سبق ملے، انہوں نے کچھ دنوں میں تائیس کو ایک بے مثل رقاصہ و نقالہ بنا دیا۔ تائیس کو استاد کی سختیوں پر کچھ تعجب نہ ہوتا تھا، کیونکہ تکلیف کو اس نے اپنی قسمت کا لکھا پہلے ہی سے سمجھ رکھا تھا۔ بڑھیا نائکہ کی وہ کسی قدر عزت بھی کرتی تھی، کیونکہ وہ گانے بجانے میں فی الواقع سب کی استاد تھی اور یونانی شراب بھی خوب پیا کرتی تھی۔ اب زمانہ وہ آیا کہ یہ بڑھیا اپنی نوچیوں کو لے کر انطاکیہ کے شہر میں پہنچی۔ یہاں امیروں رئیسوں میں دن رات جلسے رہتے تھے۔ بڑھیا خوب روپیہ وصول کر کے اپنی ناچنے اور بانسریاں بجانے والیوں کو ان جلسوں میں بھیجتی تھی۔ تائیس یہاں خوب ناچا کرتی تھی اور ہر وقت خوش رہتی تھی۔ بڑے بڑے بد تمیز مہاجن دعوت کھا کر اس کو اپنے ساتھ دریا کے کنارے باغوں میں لے جاتے تھے۔ تائیس سچی محبت کی قیمت نہیں جانتی تھی، اس لئے سب کے لئے ہر وقت حاضر تھی۔ ایک رات کسی محفل میں بڑے بڑے رنگیلے نوجوانوں کے سامنے ناچ کر بیٹھی ہی تھی کہ حاکم شہر کا لڑکا جوانی و عیش پرستی میں مست اس کے قریب آیا اور ایسے لہجے میں جو بات بات پر بوسوں کا طلب گار معلوم ہو، کہنے لگا:

"تائیس! پیاری تائیس، کیا میں تیرے سر کا تاج نہیں ہوں، جو اس وقت تیری پیشانی کی زینت ہے؟ کیا میں وہ لباس نہیں ہوں، جو تیرے تن سیمیں پر چست ہے؟ کیا میں تیرے خوب صورت پاؤں کی جوتی نہیں ہوں؟ پیاری تو مجھے اس طرح پامال کر جیسے تیرے پاؤں پاپوش کو پامال کرتے ہیں۔ جی یہ چاہتا ہے کہ میرا بوس و کنار تیرے جسم کا لباس اور سر کا تاج ہو۔"

جس وقت یہ نوجوان جس کا نام لالوس تھا یہ باتیں کہہ رہا تھا، تائیس اس کا منہ تک رہی تھی اور دل میں کہتی تھی کہ واہ کیسا خوبصورت سجیلا جوان ہے۔ دفعتاً اس کو اپنی پیشانی پر پسینہ آتا معلوم ہوا۔ چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اٹھی تو لڑکھڑاتی ہوئی۔ آنکھوں کے سامنے ایک غبار سا آ گیا لیکن لالوس کے ساتھ اس کے گھر جانے سے انکار کرتی رہی۔ یہاں تک کہ جب اس نے تائیس کا بازو پکڑ کر زبردستی اٹھانا چاہا تو اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس پر لالوس منت و سماجت کرتے کرتے رونے لگا۔ لیکن معلوم نہیں

کہ اس وقت تائیس پر کون سی نئی اور انجانی قوت اپنا عمل کر رہی تھی کہ اس نے لالوس کی ایک بھی کوشش کو نہ چلنے دیا۔
یہ حالت دیکھ کر جلسے کے یار بول اٹھے: "واہ ذرا اس حماقت کو تو ملاحظہ کیجئے۔ لالوس خاندان کا شریف صورت کا اچھا' گھر کا امیر' پھر بھی ایک بانسری بجانے والی ناک بھوں چڑھا رہی ہے اور اس کے ساتھ نہیں جاتی۔"
لالوس اکیلا ہی اپنے گھر آیا۔ ساری رات تائیس کے عشق میں تڑپ تڑپ کر کاٹی۔ صبح اٹھا تو چہرے پر زردی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ اسی حال سے تائیس کے دروازے پر پھولوں کے کنٹھے لٹکانے لگا لیکن تائیس پر کچھ ایسا خوف طاری تھا اور وہ کچھ ایسی بے چین تھی کہ اس نے لالوس سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ تائیس کی حالت تکلیف کی تھی' مگر ابھی تک یہ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ شکایت کیا ہے جس کی یہ تکلیف ہے۔ اپنے دل سے پوچھتی تھی کہ "آخر کیا ہوا ہے جو میں اس قدر بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہوں۔ کیوں اس قدر افسردگی مجھ پر چھائی جاتی ہے؟" گھر میں حسب معمول عاشقوں کی بھیڑ لگی مگر یہ کسی سے بھی نہ ملی اور ان سب لوگوں سے اس کو ایک قسم کی کراہت اور ایک طرح کا خوف معلوم ہونے لگا۔ تاریک خواب گاہ سے نکل کر روشنی میں آنے کو جی نہ چاہا۔ دن بھر بچھونے پر پڑی تکیوں میں منہ چھپائے سسکیاں لے لے کر روتی رہی۔ لالوس نے کسی ترکیب سے اس کی خواب گاہ کا دروازہ کھول لیا تھا۔ بار بار اس کے پاس آتا تھا' منتیں کرتا تھا۔ کبھی اس کی ہٹ پر برا بھلا کہتا تھا۔ مگر تائیس اس سے ایسی جھجکتی تھی جیسے کوئی کنواری لڑکی غیر مرد سے جھجکے اور بار بار یہی کہتی تھی: "نہیں' میں نہیں جاؤں گی۔ ہرگز نہیں جاؤں گی۔"
جب دو ہفتے اس طرح گزر لئے تو تائیس کو معلوم ہوا کہ وہ تو لالوس کو اپنا دل کبھی کا دے چکی ہے۔ بے تکلف اس کے گھر چلی گئی اور پھر اس سے جدا نہ ہوئی۔ زندگی کے دن لطف سے کٹنے لگے۔ سارا سارا دن ایک دوسرے کا منہ تکتے اور بچوں کی طرح باتیں کرنے میں گزر جاتا۔ شام کو دریا کے کنارے جہاں کوئی نہ ہوتا تھا' ٹہلنے نکل جاتے تھے یا کسی پھولوں پٹے جنگل میں راستہ بھول جایا کرتے۔ کبھی صبح بہت سویرے اٹھ کر پہاڑ کے دامن پر نرگس کے پھول چنا کرتے۔ ایک ہی پیالہ سے دونوں شراب پیتے تھے اور کبھی تائیس انگور کا ایک دانہ اٹھا کر اپنے منہ میں رکھتی تو لالوس جھٹ لب سے لب ملا کر انگور اس کے منہ سے چھین لیتا۔
اس عیش و آرام میں ایک دن بڑھیا تانکہ بڑی آگ بگولا بنی لالوس کے گھر آئی اور کہا: "بس اب تائیس کو میرے حوالے کیجئے۔ جس لڑکی کو آپ نے چھین رکھا ہے' وہ تو میری جائی ہے۔ میرا گوشت پوست ہے۔ میرے باغ کا پھول ہے۔"
لالوس نے بہت سی اشرفیاں دے کر بڑھیا کو رخصت کیا لیکن تھوڑے دن بعد پھر وہ آن موجود ہوئی کہ کچھ اور وصول کرے۔ لالوس کو بہت غصہ آیا اور اس نے فوراً اسے گرفتار کروا دیا۔ عمال شہر کو جس کے سامنے اس کا مقدمہ گیا معلوم ہوا کہ اس پر ایک ہی جرم نہیں بلکہ بہت سے جرائم ہیں۔ ماخوذ ہو سکتی ہے۔ غرض انہوں نے اس کے لئے موت کی سزا تجویز کر دی اور وہ درندوں کے سامنے ڈال دی گئی' جنہوں نے اس کو فوراً پھاڑ کھایا۔
تائیس جوش تخیل اور احساس معصومیت میں جس پر خود حیرت کرتی تھی' لالوس پر دل و جان سے فدا ہو رہی تھی۔ ایک دن بہت ہی پیار سے کہنے لگی:
"لالوس میں تو تمہاری ہمیشہ ہی سے تھی۔"
لالوس نے جواب دیا: "عورتوں میں تم جیسا دنیا میں کوئی نہیں۔"
عشق کا یہ جادو چھ مہینے تک چلتا رہا۔ پھر یکلخت وہ کافور ہو گیا۔ دفعتاً تائیس کو معلوم ہوا کہ دنیا میں کوئی بھی اس کا ساتھی نہیں۔ دل پر نظر کی تو عشق و محبت سے اسے بالکل خالی پایا۔ اب وہ لالوس کو پہچانتی بھی نہ تھی کہ یہ کون ہے' مگر سوچتی بھی تھی کہ:
"میرے دل میں اس کی صورت اتنی جلد کیوں بدل گئی۔ اب مجھ کو اس میں اور دیگر لوگوں میں کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا۔ کیا بات ہوئی ہے جو مجھے وہ اپنی پہلی صورت شکل میں نظر نہیں آتا؟"
تائیس لالوس کے گھر سے چلی گئی' مگر اتنا ارمان ضرور دل میں لیتی گئی کہ جب اس عاشق میں وہ پہلا سا عشق نہیں رہا تو ممکن ہے کہ آئندہ کسی شخص میں وہ نظر آنے لگے۔ ممکن ہے جس سے پہلے کبھی عشق نہ ہوا ہو اس کے

ساتھ زندگی اتنی بے لطف نہ ہو جتنی ایسے شخص کے ساتھ جس کے عشق سے دل خالی ہو چکا ہے۔ اب تائیس بڑے بڑے مالدار عیاشوں کے ساتھ بت پرستوں کے مذہبی جلسوں میں جانے لگی۔ یہاں بت خانوں میں عورتیں ننگی ناچا کرتی تھیں اور رنڈیوں کے غول کے غول دریا تیر کر پار جایا کرتے تھے۔ انطاکیہ کے نفیس مگر بدکار شہر میں جس قدر کھیل تماشے ہوا کرتے تھے' تائیس ان میں شریک ہوا کرتی۔ خاص کر ایسے تماشا گھروں میں ضرور جایا کرتی تھی' جہاں بہت دور دور کے اشاروں میں نقل اتارنے والے حسن پرست تماشائیوں کو اپنا کمال دکھا کر داد لیا کرتے تھے۔

بڑی بڑی مشہور ناچنے گانے والیاں یا ایسی عورتیں جو گونگے تماشوں میں اپنا کمال دکھاتی تھیں' جس قدر شہر میں آتیں' ان کو بہت غور سے دیکھتی۔ بالخصوص ایسے تماشے والیوں کی حرکات و سکنات پر بہت ہی توجہ کرتی جو آدم زاد نوجوانوں پر عاشق ہونے والی دیویوں کا سوانگ بھرتی تھیں یا ان حسین عورتوں کی نقل اتارتی تھیں' جن پر آسمان کے دیوتا کبھی عاشق ہوئے تھے۔

جب ان کے سب گر معلوم ہو گئے کہ کیوں کر وہ اپنی اداؤں سے تماشائیوں کو محو حیرت کرتی ہیں تو تائیس دل میں کہنے لگی کہ جب خوبصورتی میں' میں ان سب سے زیادہ ہوں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان کے فن میں ان سے بہتر کمال نہ دکھا سکوں۔ صرف مشق کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ایک دن وہ گونگے تماشے والوں کے افسر کے پاس گئی اور کہا کہ میں آپ کے طائفے میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔ تائیس کا حسن اور بڑھیا میروے نے جو فن سکھائے تھے' وہ سب اس موقع پر سفارشی ہوئے اور افسر طائفہ نے اس کو اپنے طائفہ میں شامل کر لیا۔ اب تائیس نے ان کے فن میں مہارت شروع کی اور ایک رات تھیس کی ملکہ درکی کی نقل اتاری کہ سوتیلے بیٹوں نے کس طرح ایک جنگلی بیل سے اس خوبصورت ملکہ کو باندھ کر اس بیل کو دوڑایا' یہاں تک کہ گھسٹتے گھسٹتے وہ مر گئی۔

چونکہ ابھی پوری مشق نہ تھی' تماشائیوں میں ایسا جوش پیدا نہ ہوا کہ بات بات پر واہ واہ ہوتی' اس لئے کامیابی اوسط درجے کی رہی۔ کچھ دنوں تک غیر معروف دیویوں اور عورتوں کے سانگ بھرتی رہی۔ لیکن پھر تو یکلخت اس کا حسن اسٹیج پر ایسا پھٹ پڑا کہ تمام شہر میں غل مچ گیا۔ شہر کی تمام خلقت تماشا دیکھنے کو امنڈ آئی۔ عمال شاہی اور بڑے بڑے رئیسوں اور امیروں نے اس قدر عمدہ رائے قائم کی کہ مجبور ہو کر روز تماشے میں حاضر ہونے لگے۔ گھروں کے مفلس نوکروں چاکروں' غریب پیشہ ور مزدوروں بلکہ خاکروبوں تک کا یہ حال ہوا کہ پیٹ کے لئے روٹی اور پیاز کی گٹھی تک مول لینی چھوڑ دی کہ کہیں تماشے کے لئے دام نہ تھڑ جائیں۔ شاعروں نے قصیدے لکھنے شروع کر دئے اور ہر شخص کے غور کرنے کے لئے تائیس ایک مضمون بن گئی۔ مدرسوں کے پاس سے جب اس کی سواری نکلتی تو بڑے بڑے دراز ریش فلسفی اس پر معترضانہ بحث شروع کر دیتے۔ پادری اور قسیس منہ پھیر لیتے۔ مگر اس کے دروازے کو دیکھئے تو اس پر بے شمار پھولوں کے ہار اور کنٹھے لٹکے ہوتے تھے اور دہلیز پر خون کی بوندوں کی افشاں ہوتی تھی۔ عشاق سے دولت سمیٹنے کی اب کوئی انتہا نہ تھی۔ بزرگوں کی کمائی عمر بھر کی محنت اور جز رسی کے اندوختے پانی کی طرح تائیس کے قدموں میں بہنے لگے۔ اس وقت تائیس کا رواں رواں خوش تھا۔ لوگوں کی تعریفوں اور دیوتاؤں کے کرم سے نہایت مطمئن ہو کر کبر و پندار کے مزے لوٹ رہی تھی اور یہ دیکھتے دیکھتے کہ اغیار اس کے عشق میں جان دیئے ڈالتے ہیں' خود بھی اپنے اوپر مرنے لگی تھی۔

کچھ برسوں انطاکیہ کے شہر والوں کی قدر شناسی اور عشق و محبت کے لطف اٹھا کر اب جی میں آیا کہ اسکندریہ چل کر اپنے جلوے دکھائے۔ یہ شہر وہ تھا' جس کی خاک اڑتی سڑکوں پر بچپن میں بھوکی پیاسی لاغر و ناتواں پھرا کرتی تھی۔ شرم رہی تھی نہ غیرت۔ بہرکیف اسکندریہ پہنچی۔ اس مشہور اور مالدار شہر نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا اور اپنی دولت اس پر برسانی شروع کر دیا۔ ہر تماشے میں اس کا جلوہ حسن و عشق کا ایک کرشمہ ہوتا تھا۔ گھر کے دروازے پر عاشقوں اور تعریف کرنے والوں کی گنتی نہ تھی۔ سب سے بے رخی سے ملتی تھی اور اب یہ ارمان بھی دل سے نکل چکا تھا کہ کسی عاشق میں لالوس پھر مل جائے گا۔

عاشقوں کا تانتا بندھا رہتا تھا کہ ایک دن نیکیاس فلسفی بھی عشق کا دم بھرتا ہوا اس کے دربار میں حاضر ہوا۔ ظاہر

یہی کرتا تھا کہ کسی اور بات کی ہوس نہیں ہے۔ یہ شخص بڑا دولت مند تھا اور باوجود صاحب دانش ہونے کے طبیعت میں نرمی و شرافت تھی۔ لیکن اس کے علم و فضل یا حسین خیالات کا جادو تائیس پر ایک نہ چلا۔ تائیس کو اس سے عشق نہ ہوا۔ بلکہ بعض وقت اس کی طنز آمیز گفتگو سے گھبرانے لگتی۔ اس کے فلسفیانہ شکوک سنتے سنتے دل مجروح ہو گیا۔ نیکیاس کو کسی بات کا یقین نہ تھا۔ تائیس کو ہر بات کا یقین تھا۔ اس کو خدا کی کار سازی، شیاطین کی قوت، قسمت و تقدیر، جادو و سحر، خدا کے عدل و انصاف ان سب چیزوں کا اعتقاد تھا۔ وہ یسوع مسیح پر ایمان رکھتی تھی اور اس کے ساتھ ہی وینس دیوی کی بھی معتقد تھی جو دنیا میں عورتوں کو حسن بخشتی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ سحر اور آسیب کی دیوی رات کے وقت مردوں کی روحوں کو ساتھ لئے جب چوراہوں سے گزرتی ہے تو کتے اس پر بھونکا کرتے ہیں، وہ اس بات کو بھی مانتی تھی کہ اگر ایک پیالے میں بھیڑ کی خون آلودہ اون ڈال کر اس میں شراب انڈیلی جائے تو عشق کا آزار پیدا ہو جاتا ہے، وہ ہمیشہ کسی بن دیکھی اور انجانی قوت کو دیکھنے کی پیاسی رہتی تھی، اس کا دل ایسی قوتوں سے فریاد کیا کرتا تھا، جن کا نام تک وہ نہ جانتی تھی۔ ایک امید و انتظار کی حالت اس پر ہمیشہ طاری رہتی تھی۔ مستقبل میں جو کچھ نہاں تھا، اس سے ڈرتی تھی اور اس کو معلوم کرنا چاہتی تھی، اس کے گرد و پیش ایسوس دیوی کے مجاور، کلدانیا کے ساحر، ملکوں ملکوں کے سیانے اور نجومی رہا کرتے تھے، یہ سب اس کو ہمیشہ دھوکا دیتے تھے، مگر ان کا ساتھ نہ چھوٹتا تھا۔ موت سے ڈرتی تھی اور ہر جگہ موت اس کو نظر آتی تھی۔ جب عیش و عشرت کے نشے میں چور ہوتی تھی تو دفعتاً معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس کے برہنہ شانے پر برف سے زیادہ ٹھنڈی انگلی رکھ دی ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ چونک پڑتی تھی۔ رنگ زرد پڑ جاتا تھا اور خوف سے چیخنے لگتی تھی۔

نیکیاس ایک دن کہنے لگا: "تائیس اگر ہمارا مقدر یہی ہے کہ سفید بال اور پژمردہ چہرے لے کے شب ازل کی ظلمت میں غائب ہو جائیں یا آج کا دن جو دھوپ میں چمک رہا ہے، ہماری زندگی کا آخری دن ہے تو ہم کو ان باتوں سے غرض ہی کیا ہو سکتی ہے؟ ہمارا کام تو یہ ہے کہ آؤ زندگی کا حظ اٹھائیں۔ لذت و نشاط کی چند ساعتیں جمود و بے حسی کی ایک عمر دراز کے برابر ہیں۔ حواس خمسہ کے سوا کوئی قوت ادراک نہیں اور عشق محض ایک ادراک ہے۔ جس چیز کا علم ہم کو نہیں وہ ہیچ ہے اور ہیچ کے لئے کاوشوں میں پڑنا فضول ہے۔"

تائیس نے بہت ہی برہم ہو کر جواب دیا:

"میں ایسے لوگوں سے بیزار ہوں، جن کے دل میں خوف ہے نہ امید۔ میں جس چیز کو ڈھونڈتی ہوں وہ یہ ہے کہ کسی طرح اس زندگی کا بھید مجھ پر کھل جائے اور میں اس پہیلی کو کسی طرح بوجھ لوں۔"

غرض اس ہستی ناپائدار کی چیستان کو حل کرنے کے شوق میں تائیس نے فلسفے کی کتابیں پڑھنی شروع کیں، مگر خاک سمجھ میں نہ آئیں اور اب یہ حال رہنے لگا کہ بچپن کا زمانہ جس قدر دور ہوتا جاتا تھا، اتنا ہی قریب معلوم ہو کر یاد آنے لگا۔ بھیس بدل کر گلی کوچوں میں پھرنے اور ایسے موقعوں پر جانے کا جہاں عام مجتمے رہتے تھے، ہمیشہ سے شوق تھا کیونکہ اس کی پرورش بھی ایک سرائے میں ہوئی تھی، جہاں ہر قسم کے لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ماں باپ کے مرنے کا اسے افسوس تھا لیکن زیادہ قلق اس بات کا تھا کہ کبھی اس کو ان سے محبت نہ ہوئی۔ اگر راستے میں کہیں پادریوں کو دیکھ لیتی تھی تو اپنا اصطباغ پانا یاد آ جاتا تھا اور دل بے چین سا ہو جاتا تھا۔ ایک رات سر کے بالوں کو ایک سیاہ رومال میں چھپا کر اور ایک بھت نیچی عبا پہن کر حسب معمول شہر کے باہر گشت لگا رہی تھی کہ اتفاق سے ایک گرجا کے سامنے سے گزر ہوا۔ وہیں کھڑی ہو گئی۔ گرجا بہت کم حیثیت کا تھا اور یوحنا اصطباغی کے نام سے مشہور تھا۔ اندر سے گانے کی آواز آئی اور دروازے کی جھریوں سے معلوم ہوا کہ اندر خوب روشنی ہو رہی ہے۔ یہ اب کوئی نئی بات نہ تھی، کیونکہ بیس برس سے یعنی جب سے شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیوں کو اپنی پناہ میں لیا تھا، وہ اپنی تمام مذہبی رسوم بے روک ٹوک کیا کرتے تھے۔

گانے کی آواز کچھ ایسی تھی کہ دل میں اتری جاتی تھی۔ بند دروازے کے ایک کواڑ کو آہستہ سے کھول کر اندر گئی اور اسرار مسیحی کی رسم جو اس وقت ادا کی جاتی تھی، اس میں بطور ایک مہمان کے شریک ہو گئی۔ دیکھا تو

بہت سی عورتیں، بچے، بڈھے قبر کے سامنے زمین پر گھٹنے ٹیکے دعا میں مصروف ہیں۔ قبر کا تعویذ ایک سنگی حوض ہے، جس سے اصطباغ بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس کے پتھروں پر کہیں کہیں انگور کی بیل مع خوشوں کے بھدے طور پر کندہ ہے، لیکن آج کھجور کے ہرے ہرے پتوں اور سرخ گلاب کے پھولوں سے قبر خوب آراستہ کی گئی ہے۔ جابجا کثرت سے موم بتیاں روشن ہیں۔ لوبان جلایا جاتا ہے، جس سے سفید دھوئیں کے بقے اس طرح اٹھ رہے ہیں، جیسے فرشتوں کا لباس ہوا میں اڑتا ہو۔ دیواروں پر عرش کی دو صورتیں نقش ہیں، جو دین مسیحی کے بزرگوں کو عالم رویا میں کبھی نظر آئی تھیں۔ پادری سفید پیرہن پہنے قبر کے سامنے منہ کے بل پڑے ہیں اور جس حقانی گیت کو مل کر گا رہے ہیں، ان میں وہ راحتیں بیان ہوئی ہیں، جو نیک بندے خدا کی راہ میں ایذائیں اٹھانے سے محسوس کرتے ہیں۔ اس نغمے میں شادی و غم، نصرت و ہزیمت کو ایسا شیر و شکر کر دیا تھا کہ تائیس سنتی تھی اور اسے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے حواس سوتے سوتے چونک پڑے ہیں اور ان میں زندگی کی لذتیں اور موت کی تکلیفیں دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے دوڑ رہی ہیں۔

گانے بند کرتے ہی سب لوگ اٹھے، تاکہ ایک ایک آگے بڑھ کر قبر کو بوسہ دے۔ یہ سب لوگ سیدھے سادے غریب پیشہ ور تھے۔ صورتیں دل کی صفائی پر گواہ تھیں۔ نیچی نظریں کئے، چہرے غمگین، لب سے لب جدا۔ بھاری چال سے ایک ایک آگے بڑھا اور قبر کے پاس گھٹنے زمین پر ٹیک کر قبر کو بوسہ دیا۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو گود میں اٹھالیا اور ان کو جھکا کر قبر کے پتھر سے ان کے رخساروں کو مس کر دیا۔ تائیس یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ حیرت میں تھی، دل بے چین تھا۔ آخر نہ رہا گیا کہ ایک پادری سے پوچھنے لگی کہ یہ کیا تقریب ہے؟

پادری بولا: "عورت! کیا تو نہیں جانتی کہ آج ہم شہید تھیودورنوبی کی مبارک یاد میں عید منا رہے ہیں۔ یہ خدا کا ایک نیک بندہ تھا، جس نے شہنشاہ ڈیوک لیشن کے دور حکومت میں عیسائی مذہب کے لئے اپنی جان قربان کی تھی۔ اس کی زندگی بے داغ تھی اور وہ دین کی شہادت دیتا ہوا مصلوب ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم سفید لباس پہن کر سرخ رنگ کے گلاب اس کے مزار پر چڑھا رہے ہیں۔"

اتنا سنتے ہی تائیس نے زمین پر گھٹنے ٹیک دیئے اور سر پکڑ کر زار و قطار رونے لگی۔ احمس کی بھولی بسری صورت کچھ کچھ یاد آنے لگی اور اس دھندلے سے نقش کو جو دل گداز اور پردرد تھا، چراغوں کی روشنی، لوبان کے دھوئیں، پھولوں کی مہک، زائرین کی سادگی اور عقیدت نے اور بھی متبرک کر دیا۔ تائیس دل میں کہنے لگی:

"احمس اس وقت خوش اعمال اور پاک نفس تھا اور اس وقت برگزیدہ و حسین ہے۔ اس کا مرتبہ اب انسان سے بالاتر ہے۔ آخر کوئی بتائے کہ وہ بن بوجھی اور انجانی چیز کیا ہے جو دولت اور لذت سے بھی زیادہ قیمتی ہے؟"

تائیس آہستہ سے کھڑی ہوئی اور اس شہید کے مزار کی طرف، جو کبھی زندگی میں اس کی نرگسی آنکھوں پر نثار تھا اور جن میں اس وقت آنسوؤں کے قطرے شمع کی روشنی میں چمک رہے تھے، رخ کر کے سر نیچا کئے عاجزی و انکساری کے ساتھ چپکے چپکے آگے بڑھی اور آخری کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ان لبوں سے جس پر نفس کی خواہشیں مچلی رہتی تھیں، احمس غلام کی قبر کو بوسہ دیا۔

گھر واپس آئی تو دیکھا نیکیاس اس کے انتظار میں ہے۔ سر کے بال معطر ہیں۔ گریبان کھلا ہے اور علم اخلاق پر ایک کتاب مطالعہ میں ہے۔ تائیس کو دیکھتے ہی ہاتھ پھیلا کر اٹھا اور ہنس کر کہنے لگا:

"تم بھی آفت ہی ہو۔ کیا گھر نہ آنے کی قسم ہی کھائی تھی۔ میں خالی بیٹھا کیا کرتا۔ سب سے بڑے رواقی حکیم کا ایک قلمی نسخہ پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ جانتی ہو اس میں کیا پڑھا؟ نیکیوں کا بیان اور غرور حسن کے مسائل۔ بلکہ یوں سمجھو کہ کتاب کے ہر صفحے پر تم جیسی ہزارہا صورتیں نظر آنے لگیں۔ ایک انگشت سے زیادہ ان کا قد و قامت نہ تھا، لیکن ہر ایک کا حسن بلا کا تھا اور سب کا حسن مل کر تمہارا حسن واحد بن جاتا تھا۔ ان میں کوئی صورت ارغوانی لباس پہنے تھی۔ بہت سی بادلوں کے سفید گالوں کی طرح باریک ہوا سے کپڑے پہنے فضا میں اڑ رہی تھیں۔ بہت سی بے حس و حرکت برہنگی میں خدا کی قدرت کا نمونہ بنی کھڑی تھیں۔ ان کو دیکھ کر بجز ہوا و ہوس کے اور کوئی بہتر خیال دل میں نہ آتا تھا۔ سب سے اخیر میں دو صورتیں ایسی نظر آئیں، جو ہاتھ میں ہاتھ دیئے

کھڑی تھیں اور اس قدر ہم شکل تھیں کہ ان میں تمیز کرنی مشکل تھی۔ یہ دونوں مسکرا رہی تھیں۔ ایک کہتی تھی کہ میں عشق ہوں۔ دوسری کہتی تھی کہ میں موت ہوں۔"

اتنا کہہ کر نیکیاس نے تائیس کو گلے لگالیا۔ یہ نہ دیکھا کہ جو آنکھیں اس وقت زمین کی طرف گڑی تھیں' ان میں کیسا غضب بھرا تھا۔ مسائل حکمت تو زبان سے ایک پر ایک نکلے چلے آتے تھے' مگر اتنا خیال نہ آتا تھا کہ کوئی ان کو سنتا بھی ہے یا نہیں۔ اسی سلسلہ تقریر میں کہنے لگا:

"جس وقت میں اس عبارت پر پہنچا کہ روح کی تربیت جاری رکھنے میں کسی چیز کو مخل نہ ہونے دو' تو میں نے اس کی جگہ یہ پڑھا کہ تائیس کے بوسے شہد سے زیادہ شیریں اور شعلوں سے زیادہ سوزاں ہیں۔ تائیس! یہ ہماری گرمی صحبت کا نتیجہ ہے کہ ایک فلسفی بھی اپنے فن کی کتابوں کو ایسے عجیب معنوں میں پڑھنے لگا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جو کچھ بھی ہم ہوں اپنے ہی خیالات دوسروں کے خیالات میں پڑھتے ہیں اور کتابوں کو بھی اسی رنگ......"

تائیس اس گفتگو کا ایک حرف بھی نہ سنتی تھی۔ اس کا دل حبشی غلام کی قبر میں پڑا تھا۔ جب اس کے منہ سے ایک آہ نکلی تو نیکیاس نے اس کا منہ چوم لیا اور کہا:

"پیاری! کیوں اس قدر افسردہ ہو؟ دنیا میں سب سے بڑی مسرت یہ ہے کہ انسان دنیا کی تکلیفوں کو بھول جائے۔ یہی بڑا راز ہستی ہے۔ آؤ زندگی کو دھوکا دیں۔ یہ اسی لائق ہے۔ چلو۔ بس۔ عشق و محبت کے نشہ میں چور ہو جائیں۔"

تائیس نے نیکیاس کو جھٹک دیا اور رو کر کہنے لگی:

"عشق! نہ تمہیں آج تک کسی سے عشق ہوا اور نہ مجھے تم سے عشق ہے' بلکہ بجائے عشق کے نفرت ہے۔ جاؤ میں تم سے بیزار ہوں۔ لعنت ہے اور نفرین ہے ان پر جو خوش رہتے ہیں اور دولت مند ہیں۔ جاؤ' بس جاؤ...... بھلائی نیکی اگر ہے تو مفلسوں اور کم نصیبوں میں ہے۔ تمہیں کیا معلوم جب میں بچہ تھی' تو ہمارے گھر میں ایک حبشی غلام تھا جسے دشمنوں نے صلیب پر چڑھا دیا۔ وہ نیک تھا۔ محبت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس زندگی کا بھید اس کو معلوم تھا۔ تم تو اس قابل بھی نہ تھے کہ اس کے پاؤں دھو کر پیتے۔ جاؤ! بس! اب میں تم سے کبھی نہ ملوں گی۔"

یہ کہہ کر اپنی خواب گاہ میں آئی اور بچھونے پر منہ کے بل رات بھر روتی رہی۔ ارادہ کر لیا کہ آئندہ سے تھیدور شہید کی طرح سادگی اور افلاس میں اپنی زندگی بسر کرے گی۔

دوسرے دن تائیس ان کھیل تماشوں میں شریک ہو گئی' جن کی تاریخیں پہلے سے مقرر ہو چکی تھیں۔ دل میں سوچا کہ یہ خوبصورتی کوئی دن کی مہمان ہے۔ بہتر ہے کہ جس قدر مسرت اور شہرت اس سے حاصل ہو سکے' وہ حاصل کر لی جائے۔ چنانچہ تماشوں میں اب وہ اور بھی تن دہی کے ساتھ اپنا فن دکھانے لگی۔ بڑے بڑے باکمال شاعروں' مصوروں اور بت تراشوں کے خیالات کو اپنے حسن سے زندہ کر دکھایا۔ کیا فلسفی اور کیا عالم اس کے طرز ادا اور حرکات میں موزونیت کو دیکھ کر اس خیال میں محو ہو جاتے کہ یہ بھی ایک ملا ہوا سر اسی ساز حقیقی کا ہے' جس کی دھن پر یہ کائنات چل رہی ہے اور بے اختیار اس نازنین کو حسنات حکمیہ میں شمار کرنے لگتے تھے۔ کہتے تھے کہ علوم ریاضیہ کی بھی وہ استاد معلوم ہوتی ہے۔ جاہل ان پڑھ مفلسوں اور محتاجوں کو بھی کبھی کبھی مفت تماشا دکھاتی اور یہ سب اس کے کمال کو دیکھ کر تعریفیں کرتے اور دعائیں دیتے' رخصت ہوتے تھے۔ گو تعریفیں چاروں طرف سے برستی تھیں' مگر دل کی افسردگی کم نہ ہوتی تھی۔ موت کا خیال ہر وقت غالب رہتا تھا۔ کسی چیز سے تسکین نہ ہوتی تھی۔ گھر میں چین تھا نہ گھر کے باغ میں' حالانکہ یہ دونوں چیزیں اسکندریہ کے شہر میں اپنی خوبی و خوشنمائی میں مثال کے طور پر بیان ہوا کرتی تھیں۔

ایک روز تماشے سے فارغ ہو کر پری گوشہ میں آرام کرتی تھی۔ آئینہ سامنے تھا۔ صورت دیکھ رہی تھی کہ زوال حسن کی سب سے پہلی علامت نظر آئی۔ ڈر گئی اور اس وقت کا نقشہ ذہن میں جما جبکہ بال سفید ہو جائیں گے اور چہرے پر جھریاں پڑنے لگیں گی۔ گو یہ معلوم تھا کہ ایک منتر پڑھ کر خاص خاص بوٹیوں کی اگر دھونی لی جائے گی تو حسن پھر تازہ ہو جائے گا' مگر کچھ دل کو یقین نہ آتا تھا۔ اسی حالت میں ایک بے رحم آواز غیب سے یہ کہتی سنائی دی:

"تائیس تو بڑھیا ہو جائے گی۔ بڑھیا ہو جائے گی۔"
خوف سے پیشانی کا پسینہ برف کی طرح سرد ہو گیا۔ پھر آئینہ اٹھا کر صورت دیکھی۔ اب معلوم ہوا کہ نہیں اس کا حسن تو وہی ہے جو پہلے تھا اور اب تک اس قابل ہے کہ عاشق اس پر جان دیا کریں۔ ہنس کر کہنے لگی کہ اس شہر میں ایک عورت بھی ایسی نہیں جو میرا سا تناسب اعضاء رکھتی ہو۔ میری رفتار میرے ناز و ادا کا مقابلہ کر سکے یا اس کے بازو میرے بازوؤں کی طرح خوبصورت ہوں۔ اے پیارے آئینے! یہی گورے گورے بازو عشق کی زنجیریں اور طوق ہیں۔
ایسے ہی خیال دل میں آ رہے تھے کہ دفعتاً ایک عجیب و غریب شکل کا آدمی سامنے کھڑا نظر آیا' جس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ داڑھی پر گرد پڑی تھی۔ ایک زرق برق عبا گلے میں تھی۔ آئینہ پھینک تائیس نے ایک چیخ ماری۔
پفنوتوس بالکل بے حس و حرکت کھڑا رہا اور تائیس کی خوبصورتی دیکھ کر بے اختیار دعا مانگنے لگا:
"خدایا! اس عاجز بندے کی دعا قبول کر' اس عورت کا حسن و جمال میری فضیحت کا موجب نہ ہو' بلکہ میری نضیلت کا باعث ہو۔"
پھر کسی قدر کوشش کے ساتھ اس نے یہ گفتگو کی:
"تائیس! میں ایک بڑے دور دراز مقام کا رہنے والا ہوں۔ تیرے حسن کی شہرت مجھ کو یہاں تک لائی ہے۔ مشہور ہے کہ تو تماشاگری میں یکتائے زمانہ ہے اور ایسی عورت ہے جس کے ہاتھوں سے دل بچنا ممکن نہیں۔ تیری دولت مندی کے حالات اور تیری عشق بازیوں کے چرچے حیرت انگیز افسانے بن گئے ہیں اور مصر قدیم کی اس خوبصورت و بد اعمال نازنین کی یاد دلاتے ہیں' جس کی سخاوت اور محبت کی داستانیں دریائے نیل کے ملاحوں کو اب تک ازبر ہیں۔ اس لئے تجھ سے ملاقات کا شوق جنوں بن کر میرے سر پر سوار ہوا اور اب معلوم ہوا کہ جو کچھ سنا تھا وہ کم تھا اور جو دیکھا وہ زیادہ ہے تو اپنی شہرت سے ہزار چند زیادہ ہوشمند و حسین ہے۔ تجھے دیکھنے کے بعد دل کہتا ہے کہ ممکن نہیں کہ تیرے قریب آنے میں انسان کے پاؤں ایک رند خراباتی کی طرح نہ لڑکھڑانے لگیں۔"

یہ تعریف ایک طور پر تشنیع سے کم نہ تھی' لیکن راہب نے جوش پارسائی میں واقعی خلوص کے ساتھ اسے ادا کیا تھا۔ تائیس ناخوش نہیں ہوئی اور اس عجیب شکل کو دیکھتی رہی' جس نے اسے پہلے ڈرا دیا تھا اور پفنوتوس نے اپنی صحرائی صورت اور وحشت زدہ آنکھوں سے جن سے آگ نکلتی معلوم ہوتی تھی' اسے متعجب کر دیا تھا۔ چونکہ ایسا عجیب آدمی پہلے نہ دیکھا تھا' اس لئے شوق ہوا کہ اس کے حالات دریافت کرے' چنانچہ اسے بنانے کے لئے نرمی سے کہنے لگی:
"اے اجنبی حضرت! میری تعریف میں اتنی عجلت نہ فرمایئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری برق افگن نگاہیں آپ کے خرمن ہستی کو جلا کر خاک کر دیں۔ ذرا ہوش درست کر کے میرے عشق کا دم بھریئے گا۔"
پفنوتوس نے کہا: "تائیس مجھ کو تجھ سے الفت ہے اور ایسی الفت ہے جو مجھ کو اپنی جان اپنی ذات سے بھی نہیں ہے۔ تیری خاطر میں نے اپنے پیارے صحرا کو چھوڑا۔ تیرے لئے اس زبان پر جس نے چپ رہنے کی قسم کھائی تھی ناپاک الفاظ آنے لگے۔ تیرے لئے وہ چیزیں دیکھیں جن کو نہ دیکھنا چاہیے تھا اور وہ باتیں سنیں' جن کا سننا مجھ پر حرام کیا گیا تھا۔ میری روح تیرے لئے بے قرار ہے۔ دل کے بند ٹوٹ کر خیالات ان سے پھوٹ نکلے ہیں اور بہتے چشمے بن گئے ہیں' جن سے قمریاں پانی پیتی ہیں۔ تیرے لئے رات اور دن ایسے بیابانوں اور ریگ زاروں میں چلا ہوں جہاں زہریلے حشرات الارض اور درندے رہتے ہیں۔ تیرے لئے یہ برہنہ پاؤں زندہ سانپوں اور بچھوؤں پر پڑ پڑ گئے ہیں۔ بے شک مجھے تجھ سے عشق ہے اور میرا عشق ان لوگوں کا سا نہیں ہے جو نفس کی خواہشوں سے بے تاب ہو کر مست سانڈوں یا پھاڑ کھانے والے بھیڑیوں کی طرح تیرے پاس آتے ہیں۔ ان کا عشق تیرے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا شیر کا آہو کے ساتھ۔ اے عورت سن لے۔ ان کی شہوانی خواہشیں تیری روح کو غارت کئے دیتی ہیں۔ میری الفت تیرے لئے حقیقت ازلی اور روح سرمدی کی بنا پر ہے۔ میرا عشق تیرے ساتھ خدائے ذوالجلال کے واسطہ اور تعلق سے ہے جو ہمیشہ رہے گا اور ہمیشہ۔ میرے دل میں تیرا عشق ایک خیر محض اور جذبہ حقیقی ہے۔ میں جس چیز کا تجھ سے وعدہ کرتا ہوں

وہ پھولوں کی مہک میں' یا شراب کی مستی میں نہیں ہے اور نہ وہ ایک چھوٹی سی رات کا خواب گریزپا ہے۔ میرا وعدہ تجھ سے عقد روحانی اور ضیافت عشق حقیقی کا ہے۔ جو عیش میں تیرے لئے لایا ہوں وہ کبھی ختم نہ ہو گا۔ اس کا اندازہ کرنا محال اور اس کو بیان کرنا غیر ممکن ہے۔ وہ عشق ایسا ہے کہ اس دنیا کے لذت پرست اگر اس کی پرچھائیں بھی دیکھ لیں تو حیرت سے مرجائیں۔"

تائیس بدعقیدہ بن کر ان باتوں پر ہنس پڑی اور کہنے لگی:

"کرم فرما! یہ تو بتایئے کہ جس عشق کا آپ ذکر کرتے ہیں' اس کا اتا پتا کیا ہے۔ یہ جنس کہاں ملتی ہے؟ ذرا جلد فرمایئے۔ تقریر کو طول دینے سے میرا حسن میلا ہوتا ہے۔ وقت ضائع نہ کیجئے۔ جس عیش و نشاط کی خبر آپ لے کر آئے ہیں' میں اس کے معلوم کرنے کی بے حد مشتاق ہوں۔ لیکن اگر آپ صاف صاف کہلواتے ہیں تو سن لیجئے۔ میں ایسے عیش و نشاط سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ آپ کے یہ سب دعوے آپ کے فقروں تک ہی رہیں گے۔ ایسے عشق کا وعدہ کرنا جو ہمیشہ رہے آسان ہے' مگر اس کا ایفا مشکل ہے۔ دنیا میں ہر شخص کوئی نہ کوئی وصف رکھتا ہے۔ آپ کا جوہر کشف ہے۔ آپ ایسے عشق کی خبر دینے آئے ہیں جس کا آج تک کسی کو پتا ہی نہ چلا۔ سنئے! یہاں تو بازار حسن میں بوسوں کا لین دین اتنی مدت سے جاری ہے کہ کسی قسم کا عشق بھی ایسا نہیں جس کا راز ہم پر نہ کھل گیا ہو۔ یہ باتیں عاشقوں سے پوچھئے۔ آپ جادو ٹونکے کے آدمی ان باتوں کا کیا جانیں۔"

پفنوتوس نے جواب دیا:

"تائیس ہنسی نہ اڑاؤ۔ میں تمہارے سامنے وہ عشق پیش کرتا ہوں جس کے بھید سے تم قطعی ناواقف ہو۔"

تائیس: "مہربان! آپ یہاں بہت دیر میں پہنچے' وہ کون سا عشق ہے جس سے میں واقف نہ ہو چکی ہوں۔"

پفنوتوس: "جو عشق میں تم تک لایا ہوں' اس میں جمال خداوندی شامل ہے اور جن عشقوں سے تم واقف ہو ان کی بنیاد بے شرمی پر رکھی گئی ہے۔"

یہ فقرہ سن کر تائیس نے راہب کو غصے کی نظر سے دیکھا اور اس کی خوب صورت جبین پر بل پڑ گیا۔ کہنے لگی:

"واہ جناب! آپ کا یہ انداز گفتگو اور وہ بھی ایک میزبان کے ساتھ حقیقت میں عجیب ہے۔ ذرا میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھئے۔ کیا میں آپ کو بے شرم معلوم ہوتی ہوں' نہیں ہرگز نہیں۔ میں اپنی کسی بات پر بھی شرمندہ نہیں ہوں اور نہ وہ عورت جو میری طرح رہتی ہیں' اپنی کسی بات سے خجل ہیں' گو دولت اور حسن میں' وہ مجھ سے کم ہیں۔ میں اس زندگی میں قدم قدم پر عیش و نشاط کے بیج بوتی گئی ہوں۔ اس لئے ایک عالم مجھ کو جانتا ہے۔ دنیا میں جو بڑے صاحب قوت مانے جاتے ہیں' ان سے میری قوت بڑھی ہوئی ہے۔"

پفنوتوس: "انسان کی نظر میں جو چیز شاندار ہے وہ خدا کی نظر میں ذلیل ہے۔ اے عورت! ہم دونوں کی پرورش ایسے مختلف حالات میں ہوئی ہے کہ ہماری زبان اور ہمارے خیالات ایک سے نہیں ہو سکتے۔"

"کون ہے جو میرے دل سے سلوم کا پاک چشمہ جاری کرے' جس میں تو نہا کر اپنی ابدی پاکیزگی حاصل کرے۔ کہاں ہے وہ جو مجھے اردن کے دریا میں تبدیل کر دے اور اس کا پانی تیرے سر سے گزر کر ہمیشہ کی زندگی تجھے بخشے؟"

تائیس کا غصہ جاتا رہا اور وہ سوچنے لگی:

یہ آدمی ہمیشہ کی زندگی کا ذکر کرتا ہے اور بات بھی اس طرح کرتا ہے جیسے کوئی طلسم پڑھتا ہو۔ مجھے تو اب ذرا بھی شبہ نہیں کہ یہ کوئی جادوگر ہے اور اس کے پاس ضرور بڑھاپے اور موت سے بچنے کا کوئی منتر ہو گا۔

تائیس نے ارادہ کر لیا کہ اس جادوگر سے ملوث ہو جانا چاہیے۔ کچھ ڈر کر شرما کر تین چار قدم پیچھے ہٹی اور پھر جلدی سے اپنی زرنگار مسہری کی پٹی پر پاؤں لٹکا کر ہو بیٹھی۔ سینہ کا لباس بڑے انداز سے درست کیا اور بالکل خاموش آنکھیں نیچی کئے انتظار کرنے لگی۔

خوبصورت آنکھوں کی بڑی بڑی پلکوں کا سایہ رخساروں پر پڑتا تھا۔ گورے گورے برہنہ پاؤں زمین سے اونچے تھے۔ چہرے پر شرم تھی اور صورت سے معلوم ہوتا تھا' جیسے کوئی بھولا بچہ دریا کے کنارے بیٹھا ہو۔

پفنوتوس یہ سب کچھ دیکھا کیا' مگر آگے نہ بڑھا۔ گھٹنے تھر تھر کانپنے لگے۔ قریب تھا کہ گر پڑے۔ منہ میں زبان

خشک ہو گئی۔ حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ دماغ میں ایک عجیب کشمکش اور تذبذب پیدا ہوا۔ آنکھوں کے سامنے بادل کی طرح ایک غبار چھا گیا۔ سمجھا کہ مسیح نے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیا ہے کہ یہ عورت نہ دکھائی دے۔ اس امداد غیبی نے گناہ سے بچنے کے لئے اس کا دل مضبوط کر دیا اور بڑی متانت سے جو صحرا کے ایک راہب کو زیب دے سکتی ہے کہنے لگا:

"کیا تمہارا ایسی بات کے لئے آمادہ ہو جانا خدا کی نظروں سے چھپا رہے گا؟"

تائیس نے سر ہلا کر کہا:

"کیا خوب! خدا کو کس نے مجبور کیا ہے کہ میرے ہی خلوت کدہ کو ہمیشہ گھورتا رہے' اگر کوئی بات اسے ناراض کرتی ہے تو نہ دیکھے۔ ہٹ جائے۔ پہلے اس کی حقیقت تو پہچان لو۔ تم کون ہو جو اس کے وکیل بن کر میرے پاس آئے ہو؟"

اس سوال پر پفنوتوس نے جو عبا اوپر پہنے تھے' اس کا ایک حصہ ہٹا کر نیچے کا سیاہ کمبل کا کرتا یعنی رہبانیت کا پیرہن اسے دکھایا اور کہا: "میں انصینو کا قسیس' صحرائے تھیبی کا راہب پفنوتوس ہوں اور بیابان مقدس سے یہاں آیا ہوں۔ جس ہاتھ نے ابراہیم سے کالدیہ اور لوط سے صدوم چھڑوایا تھا' اسی نے یہ دنیا مجھ سے چھڑا دی ہے۔ میرا وجود اب انسان کے لئے کالعدم ہے' لیکن تیری صورت مجھ کو اپنے ریگستان کے یروشلم میں نظر آئی۔ میں جانتا تھا کہ تو گناہوں میں مبتلا ہے اور تیری زندگی زندگی نہیں بلکہ ایک روحانی موت ہے' بس اے عورت سمجھ لے کہ میں اس وقت تیری قبر کے کنارے کھڑا ہوں اور کہہ رہا ہوں: "تائیس اٹھ۔"

اول تو پفنوتوس کا نام پھر اس کے ساتھ قسیس اور راہب کے الفاظ سنتے ہی تائیس خوف سے زرد پڑ گئی۔ یونہی شانوں پر بال بکھرائے ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھی اور راہب کے قدموں میں گر کر بڑی عاجزی سے رو رو کر کہنے لگی:

"خدا کے لئے مجھے کسی آفت میں نہ پھنسا دیجئے گا۔ آپ کیوں آئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ میرے ساتھ کوئی برائی نہ کیجئے گا۔ میں جانتی ہوں کہ صحرا کے خدا پرست لوگ مجھ جیسی عورتوں سے جو مردوں کو خوش کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہیں' سخت نفرت رکھتے ہیں۔"

پفنوتوس نے تائیس کو اٹھنے کا اشارہ کر کے کہا:

"یقین کر لے کہ میرا برتاؤ تیرے ساتھ کبھی نفرت و حقارت کا نہ ہو گا۔ میں تیرے پاس اس کی طرف سے آیا ہوں' جس نے کوئیں کی مینڈ پر سامری عورت کی صراحی سے جو اس نے پیش کی تھی پانی پیا تھا اور جس نے شمعون کے گھر میں کھانا کھانے کے وقت مریم کے ہاتھ سے عطر لیا تھا۔ میں بے گناہ نہیں ہوں کہ پہلا پتھر اپنے ہاتھ سے تجھے ماروں۔ میں خدا کی دی ہوئی کثیر نعمتوں کو بدکاری میں صرف کر چکا ہوں۔ مجھے غصہ نہیں ہے۔ یہ محض رحم ہے جو میرا ہاتھ پکڑ کر تجھ تک لایا ہے اور مجھے اس قابل کیا کہ عشق و محبت کے الفاظ بغیر جھوٹ ملائے زبان پر لا کر تیرا قرب حاصل کروں۔ یہ میرے دل کا سچا جذبہ ہے' جس نے مجھے تجھ تک پہنچایا ہے۔ بھلائی اور خیر کرنے کے لئے میرا دل بے قرار ہے۔ تیری آنکھیں جو ہمیشہ ظاہر بینی میں مصروف رہی ہیں' اگر اس قابل ہوں کہ چیزوں کے مخفی معنی بھی دیکھ سکیں تو میں تجھے اس جلتی ہوئی جھاڑی سے گھسیٹ کر نکالی ہوئی ایک شاخ معلوم ہوں گا' جو خدا نے موسیٰ کو طور پر دکھائی تھی' تاکہ عشق حقیقی کی معرفت اسے حاصل ہو' یعنی اس عشق کی جو ہمیں ہمیشہ جلتا رکھتا ہے مگر خاک نہیں ہونے دیتا' جس کا خاتمہ کجلائے ہوئے انگاروں اور راکھ کی ڈھیریوں میں نہیں ہوتا' بلکہ جس چیز میں وہ سرایت کرتا ہے' اسے ہمیشہ کے لئے محفوظ و مبارک کر دیتا ہے۔"

یہ سن کر تائیس نے کہا: "اے راہب خدا شناس! جو کچھ آپ نے کہا' میں نے اسے دل سے یقین کیا۔ اب مجھے آپ کی طرف سے کسی دھوکے یا نقصان کا خوف نہیں ہے۔ صحرا کے اکثر راہبوں کا حال سنتی رہی ہوں۔ انطونی اور پال کے سوانح سن کر مجھے سخت حیرت ہوئی تھی اور آپ کا نام بھی میں نے سنا تھا۔ کسی نے کہا تھا کہ گو آپ ابھی جوان ہیں' لیکن بڑے بڑے مسن راہبوں سے نیک بختی میں بڑھے ہوئے ہیں۔ گو نام کے سوا اور کچھ نہ جانتی تھی' لیکن اس وقت صورت دیکھتے ہی سمجھی تھی کہ آپ کوئی معمولی شخص نہیں ہیں۔ کیا میرے حق میں آپ کوئی تدبیر ایسی کر سکتے ہیں ہو جو ہرمیس اور جونو کے مجاوروں اور کالدیا اور بابل کے ساحروں سے بھی بن نہ

پڑی۔ اے راہب اگر آپ کو مجھ سے عشق ہے تو کوئی بات ایسی کیجئے کہ مجھے موت نہ آئے۔"

پفنوتوس نے جواب دیا: "اے عورت سن لے' صرف وہ ہی لوگ زندہ رہ سکتے ہیں' جو زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ دنیا کی ناپاک لذتوں سے جو ہمیشہ کی موت ہیں پرہیز کر۔ اپنے جسم کو جسے خدا نے بنایا تھا اور اپنی روح اس میں دم کی تھی' شیاطین کے قبضے سے نکال کیونکہ وہ ایک دن اسے نہایت بے دردی سے جلا ڈالیں گے۔ دنیا کی تھکن سے تو نڈھال ہو رہی ہے۔ آ' تنہائی اور عزلت کی روح پرور ہوا میں تازگی حاصل کر۔"

تائیس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی دور کی بات سوچ رہی ہے۔ پوچھنے لگی:

"اگر میں دنیا کی لذتوں سے تائب ہو جاؤں اور ان سے قطعی توبہ کر لوں تو کیا یہ سچ ہے کہ اسی جسم اور اسی حسن کے ساتھ آسمان پر پھر پیدا ہوں گی؟"

پفنوتوس نے جواب دیا: "تائیس! میں تیرے لئے ہمیشہ کی زندگی لایا ہوں۔ میرا یقین کر' کیونکہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ سچ ہے۔"

تائیس: "اس کی سند کیا ہے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں وہ سب سچ ہے؟"

پفنوتوس: "داؤد اور مسیح کے رسول' انجلیس اور وہ حیرت انگیز چیزیں جو تو مشاہدہ کرے گی۔"

تائیس: "میں آپ کا یقین کرتی ہوں۔ اس دنیا میں مجھے خوشی کبھی نصیب نہیں ہوئی' گو میری قسمت شہزادیوں سے بھی بہتر ہوئی' لیکن جیتے جی ایسی ایسی تکلیفیں اٹھائی ہیں کہ ان کو سہتے سہتے اب ہار گئی ہوں۔ کوئی عورت ایسی نہیں جس کو مجھ پر رشک نہ آتا ہو۔ لیکن میرا یہ حال ہے کہ شہر کے دروازے میں جو پوپلی بڑھیا کبھی شہد بیچا کرتی تھی' اس کی حالت کو اپنی حالت سے بہتر سمجھتی ہوں۔ اب تو یہ خیال دل میں رہتا ہے کہ غریب اور مفلس ہی سب سے اچھے ہیں۔ یہی سب سے زیادہ خوش نصیب ہیں اور ان ہی کو سب سے زیادہ خیر و برکت ملی ہے۔ عاجزی اور فروتنی کی زندگی میں جو تسلی ہے' وہ کسی اور زندگی میں نہیں۔ آپ کی توجہ سے میری روح پر جو طولانی موجیں اٹھ رہی تھیں' وہ دب گئی ہیں اور جو چیزیں تہ میں بیٹھی ہوئی تھیں' اب وہ سطح پر آنے لگی ہیں۔ افسوس' صد افسوس' کس پر ایمان لاؤں۔ میرا کیا درجہ ہونے والا ہے۔ یہ زندگی آخر کیا چیز ہے؟"

تائیس جس وقت یہ کلمے زبان سے نکال رہی تھی' پفنوتوس بالکل حیرت زدہ ہو کر اس کی صورت دیکھتا تھا اور خود اس کے چہرے پر ایک روحانی مسرت کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔

تائیس نے دیکھا کہ راہب کے چہرے پر یسوع زندہ کی شکل جھلک رہی ہے۔ فوراً زار و قطار رو کر کہنے لگی:

"اے میرے بچپن کے بیتے ہوئے دنو' اے میرے روحانی باپ احمس جس نے صلیب پر اپنے دین کی شہادت دی' میں بدنصیب اسی دن کیوں نہ مر گئی' جس دن تو مجھے اصطباغ دلوا کر اپنی گود میں اٹھائے اور اپنے پیرہن میں لپیٹے نور کے تڑکے گھر لایا تھا۔"

پفنوتوس یہ آخری جملہ سن کر چونک پڑا اور چلا کر کہنے لگا: "تائیس! کیا تجھے اصطباغ مل چکا ہے؟"

اے عقل ربی! اے حکمت الٰہی' تیری کارسازی کے قربان۔ اب معلوم ہوا کہ وہ کیا قوت تھی جو تائیس کے پاس مجھے لائی۔ جس نے تائیس کو میری نظروں میں ایسا حسین اور پیارا بنا دیا۔ تائیس یہ اصطباغ کے پانے کا فیض تھا' جس نے مجھے مجبور کیا کہ خدا کا سایہ چھوڑ کر جس میں' میں رہا کرتا تھا' تجھے ڈھونڈتا ہوا اس دیر خرابات میں آؤں' جس کی ہوا میں زہر ملا ہے' کچھ شک نہیں کہ جس پانی سے تجھے اصطباغ ملا تھا' اس کی کوئی چھینٹ میری پیشانی تک بھی پہنچی تھی۔ آ میری بہن اپنے بھائی کے لبوں کو اپنی پیشانی کا بوسہ دے۔

اس طرح ایک راہب پاکباز نے ایک فاحشہ کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

تائیس روتی رہی۔ آنسو تک نہ پونچھے۔ اتنے میں اس کی حبشی کنیز بناؤ سنگھار کا سامان' عطر اور پھولوں کے ہار لے کر اندر آئی۔

کنیز کو دیکھتے ہی تائیس نے مسکرانے کی کوشش کر کے کہا: "رونا ٹھیک نہیں ہے۔ آنسوؤں سے آنکھیں میلی ہو جاتی ہیں اور ان کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ آج رات کو بہت سے دوستوں کے ساتھ ایک ضیافت میں شریک ہونا ہے اور خوب بن سنور کر جانا ضرور ہے' کیونکہ وہاں عورتیں بھی ہوں گی۔ اگر ذرا بھی صورت مضمحل معلوم

ہوئی تو کہیں گی معلوم نہیں کیا بات ہوئی ہے۔ بابا یہ لونڈیاں مجھ کو کپڑے پہنانے آئی ہیں۔ آپ ذرا ہٹ جائیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے کام میں بڑی ہوشیار اور باتمیز ہیں۔ میں نے انہیں بڑے داموں میں مول لیا تھا۔ یہ چھوکری جس کے کانوں میں سونے کے بالے پڑے ہیں اور اجلے اجلے دانت نکوسے کھڑی ہے' اس کو میں نے حاکم مصر کی بیگم سے خریدا تھا۔"

پہلے تو پفنوتوس نے سوچا کہ تائیس کو ضیافت میں ہرگز نہ جانے دے۔ پھر احتیاط سے کام لینا مناسب سمجھا اور پوچھنے لگا: "وہاں کن لوگوں سے ملاقات ہوگی۔"

تائیس نے جواب دیا کہ اس ضیافت میں میزبان تو لوقس قوطا امیر اساطیل ہے اور جو لوگ مدعو ہیں' ان میں نیکیاس کے علاوہ اور کئی فلسفی ہیں۔ شاعر قلقر اطیس اور سراپس کا سردار کاہن اور چند نوجوان جن کو گھوڑوں کا بہت شوق ہے' وہاں ہوں گے۔ کچھ عورتیں بھی ہوں گی جن کی نسبت صرف اتنا بتانا کافی ہے کہ ان کا حسن ان کی سب سے بڑی تعریف ہے۔"

اتنا سنا کر پفنوتوس نے ایسے لہجے میں جیسے کسی پر وحی اترتی ہوگی کہا: "ان لوگوں میں جا' تائیس' جا۔ مگر میں تیرا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ میں اس ضیافت میں تیرے ساتھ چلوں گا اور تیرے پہلو میں خاموش بیٹھا رہوں گا۔"

یہ سن کر تائیس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگی: "جب لوگ دیکھیں گے کہ عیسی کا ایک راہب مجھ پر عاشق ہوا ہے تو کیا کہیں گے۔"

ضیافت

جس وقت تائیس' پفنوتوس کو ساتھ لئے ضیافت کے عالی شان کمرے میں پہنچی تو سب مہمان جمع ہو چکے تھے۔ کمرے کے بیچ میں ایک گول میز بچھی ہوئی تھی اور اس کے کنارے نہایت پر تکلف کوچوں پر لوگ تکئے لگائے بیٹھے تھے۔ میز پر چمکتے ہوئے برتن چنے تھے اور ان کے بیچ میں چاندی کا ایک نہایت خوشنما اونچا ظرف تھا جس کے چاروں گوشوں پر چار مورتیں چھوٹے چھوٹے مشکیزوں سے نیچے ایک طاس میں سرکہ ڈالتی تھیں اور جوش کی ہوئی مچھلیاں سرکہ میں تیر رہی تھیں۔ تائیس کو دیکھتے ہی سب مہمانوں نے تعریف کے جملوں کے ساتھ اس طرح اسے سلام کرنے شروع کئے:

"دنیا کی سجانے اور سنوارنے والی دیویوں کی ماں جائی کو سلام۔"

"خاموش دیوی پلوینی کو سلام جس کی نگاہیں سب کچھ کہہ جاتی ہیں اور جس کی چتون میں ساری کتھا بھری ہے۔"

"دیوتاؤں اور آدمیوں کی محبوبہ کو سلام۔"

"سلام اس کو جس کے سب مشتاق ہیں۔"

"اور اس کو جو درد پیدا کر کے خود ہی درد کی دوا بنتی ہے۔"

"اور اس کو جو رقوطش کا انمول موتی ہے۔"

"اور اس کو جو اسکندریہ کا گلاب ہے۔"

تائیس گھبرائی ہوئی یہ سب تعریفیں سنتی رہی اور جب وہ ختم ہوئیں تو میزبان کی طرف بڑھ کر کہنے لگی:

"لوقس! میں صحرا کے ایک بڑے راہب کو اپنے ساتھ لائی ہوں۔ ان کا نام پفنوتوس ہے اور یہ انصینو کے قسیس بھی ہیں۔ بڑے خدا رسیدہ شخص ہیں اور تقریر میں وہ سوز ہے کہ جو لفظ منہ سے نکلتا ہے آگ کا ایک شرارہ معلوم ہوتا ہے۔"

لوقس ارلس قوطا امیر اساطیل اپنی جگہ سے اٹھا اور کہنے لگا: "پفنوتوس! شیدائے دین عیسوی' آپ کا تشریف لانا ہمارے لئے مبارک ہے۔ جو دین ہمارے شہنشاہ کا مذہب ہو چکا ہو اس کی عزت میں تہ دل سے کرتا ہوں۔ آپ کے مذہب والوں کو ہمارے قیصر قسطنطین نے سلطنت کے ہوا خواہوں میں سب سے اونچا درجہ دیا تھا۔ لاطینی عقل و دانش کے لئے لازم تھا کہ وہ جناب مسیح کو اپنی بزم اصنام میں جگہ دے۔ ہمارے بزرگوں کا مقولہ ہے کہ ہر دیوتا میں کوئی نہ کوئی خدائی صفت موجود ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت اس گفتگو کا کیا موقع ہے۔ آیئے شراب پئیں اور خوش ہوں کیونکہ ابھی پیمانہ عمر لبریز نہیں ہوا ہے۔"

پفنوتوس سے کہنے لگا: "اے راہب صحرا نشین۔ آپ یہاں بہت سی صورتیں دیکھتے ہیں' جو حقیقت میں ملنے اور محبت کے لائق ہیں۔" پھر ایک ایک مہمان کی طرف اشارہ کرکے ان کی تقریب اس طرح کرائی: "آپ ہرمودس صنم خانہ سراپس کے کاہن اعظم ہیں اور ان صاحبوں میں آپ دوریان' آپ نیکیاس اور آپ

زینو ثمیس مشہور فلسفی ہیں اور آپ تلقر اطیس شاعر بے بدل ہیں' یہ دونوں خوشرو نوجوان کاراس اور ارسطوبلس میری جوانی کے ایک بڑے عزیز دوست کے فرزند ہیں اور ان کے قریب ہی نازنین فانیہ اور دروشہ بیٹھی ہیں' یہ اپنے اپنے حسن و جمال میں شہرہ آفاق ہیں۔"

اتنے میں نیکیاس نے ہفنوتوس کو دیکھ لیا۔ فوراً اٹھا اور دوڑ کر بغل گیر ہوا اور کان میں کہنے لگا:

"کیوں مشفق! میں نہ کہتا تھا کہ وینس بڑی زبردست دیوی ہے۔ دیکھئے اسے یونہی ساخفا کیا تھا کہ آپ کی سب پارسائی بالائے طاق رہ گئی اور آپ بہ نفس نفیس اس محفل میں رونق افروز ہو گئے۔ آپ کے عابد و زاہد ہونے میں تو بھلا کس کا کلام ہو سکتا ہے۔ مگر اتنا یاد رہے کہ اگر حسن و عشق کی دیوی کو سب دیوتاؤں کی ماں سمجھ کر نہ پوجا تو بہت جلد آپ کا تہس نہس ہو جائے گا۔ شائد آپ نے نہ سنا ہو گا۔ میلا نطوس ایک بڑا ریاضی دان گزرا ہے' وہ کہا کرتا تھا کہ اگر وینس میری مدد نہ کرتی تو میں ایک مثلث کے خواص تک نہ بیان کر سکتا۔"

دوریان کچھ دیر سے ہفنوتوس کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً بول اٹھا: "آہا حضرات! یہ تو وہی بزرگ ہیں' آنکھیں' داڑھی' یہ بھڑکیلی پوشش' سب چیزیں بتا رہی ہیں کہ آج ہی صبح تماشا خانے میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ تائیس اس وقت اپنے گورے گورے بازوؤں سے بڑے بڑے کمال دکھا رہی تھی۔"

فانیہ اور دروشہ دونوں حسین عورتیں تائیس کو اپنی نظروں سے کھائے جاتی تھیں۔ تائیس اس وقت اپنے خوش رنگ بالوں کے جوڑے پر بنفشہ کے پھولوں کا ایک تاج رکھے تھی' جس کا ہر پھول اپنا رنگ دکھا کر انکسار کے ساتھ تائیس کی آنکھوں کا رنگ بتاتا تھا' یہاں تک کہ پھول ایک چشم نیم باز کی نگاہیں اور آنکھیں چمکتے پھول معلوم ہوتے تھے۔

فانیہ اور دروشہ جن کو اپنی خوبروئی پر کچھ کم ناز نہ تھا' تائیس کے لباس اور بناؤ کی دل میں تعریف کرتی تھیں گو منہ سے کچھ نہ کہتی تھیں۔

آخرکار فانیہ بولی: "تائیس! آج تو تم پر بلا کا جوبن ٹوٹ پڑا ہے۔ یہ بات تو اس وقت بھی نہ تھی' جب شروع شروع میں یہاں آئی ہو۔ میری اماں کو تمہارا اس شہر میں آنا خوب یاد تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ اسکندریہ میں ایک عورت بھی ایسی نہ تھی' جس سے تمہاری خوبصورتی کا مقابلہ کرنا ممکن ہوتا۔"

اتنے میں دروشہ کہنے لگی: "یہ تو آپ فرمایئے کہ یہ آپ کے نئے چاہنے والے کون ہیں؟ عجیب وحشی صورت پائی ہے۔ ہاتھیوں کے رکھوالے شاید اسی شکل و صورت کے ہوا کرتے ہوں گے۔ تائیس' بتاؤ تو انہیں کہاں سے پکڑ لائی ہو۔ یہ پہاڑی غاروں والے کہیں تحت الثریٰ میں دوزخ کے پاس تو نہیں رہتے تھے جو دھوئیں سے منہ پر اتنی کلونس چڑھی ہے۔"

فانیہ نے جھٹ دروشہ کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا:

"چپ رہو! عشق و محبت کی باتیں راز کی باتیں ہوا کرتی ہیں' وہ کسی پر ظاہر نہیں کی جاتیں اور ان کو پوچھنا بھی درست نہیں ہے۔"

تائیس بولی: "دیکھو دونوں خبردار رہو۔ یہ داڑھی والے بڑے جادوگر ہیں۔ ان کو بیسیوں طلسم یاد ہیں' تم کتنی ہی چپکے چپکے باتیں کرو یا دل میں خیال کرو۔ ان پر سب حال کھل جاتا ہے۔ کسی دن سوتے میں سینہ چاک کر کے دل نکال لیں گے اور اس کی جگہ اسفنج کا ایک ٹکڑا رکھ دیں گے۔ دوسرے دن جب پانی پیو گی تو دم گھٹ کر مر جاؤ گی۔"

"احباب پر تمکین! اپنی اپنی جگہ تشریف لے آیئے۔ غلامو' مئے گلرنگ سے ساغر بھر دو۔"

میزبان کے یہ جملے سنتے ہی سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر آ گئے اور اب اس نے اپنا جام شراب اٹھا کر کہا: "سب سے پہلا جام صحت شہنشاہ قسطنطیوس کے نام سے نوش فرمایئے جو سلطنت قیصری کی روح رواں ہے۔ پھر اپنے آبائی ملک کا درجہ ہے جو دیوتاؤں پر بھی سبقت رکھتا ہے' کیونکہ خود دیوتا اس میں رہتے ہیں۔"

تمام حاضرین نے اپنے اپنے لبریز ساغر اٹھا کر نوش کئے۔ ہفنوتوس نے کسی کا جام صحت نہ پیا' کیونکہ شہنشاہ وقت اس کے نزدیک وہ تھا' جس نے مجمع نیقیہ کے مسیحی عقائد والوں پر ظلم و ستم کئے تھے اور عیسائیوں کا آبائی ملک آسمان تھا نہ کہ یہ دنیا۔

دوریان نے جام صحت پینے کے بعد دبی زبان سے کہا:

"آبائی ملک آخر کیا چیز ہے؟ ایک بہتا دریا ہے جس کے

کنارے بدلتے رہتے ہیں اور جس کی سطح پر موجیں تھپیڑے مارا کرتی ہیں۔"

اس پر ہرمودس بت خانہ سراپس کا کاہن بولا: "دوریان کا سوال یہ تھا کہ آبائی ملک کیا چیز ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ جہاں اپنے دیوتاؤں کے استھان اور بزرگوں کی چھتریاں ہوں وہ ہی باپ دادا کا ملک ہے۔ اپنے مشاہیر اور اکابر اور ان سے اپنے تعلقات اور آپس کی وابستہ توقعات ہی انسان کو انسان کا ہم وطن بناتی ہیں۔"

اس موقع پر ایک بڑی بردبار صورت کا بڈھا' لباس بے احتیاطی سے پہنے مگر انداز میں خودداری آہستہ قدم ضیافت کے کمرے میں داخل ہو کر مہمانوں کی طرف بڑھا۔ لوقس نے فوراً اشارہ کرکے اس کو اپنے پاس بٹھالیا اور کہا:

"اقریطوس! مبارک ہیں آپ کے قدم۔ فرمایئے' اس مہینے کوئی نیا رسالہ شائع کیا۔ میرے حساب سے تو یہ آپ کا بانواں رسالہ ہوگا' جسے وادیٔ نیل کے قلم نے ایک باکمال یونانی کے ہاتھ میں آکر حسن تحریر بخشا ہوگا۔"

اقریطوس نے اپنی سپید داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا: "بلبل کا کام چہچہانا اور میرا کام ازلی دیوتاؤں کو سراہنا ہے۔"

دوریان نے مہمانوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"صاحبو! آداب بجا لاؤ۔ آپ اقریطوس ہیں۔ بڑے واجب التعظیم بزرگ ہیں۔ رواقی حکماء میں بس اب آپ ہی کا دم باقی ہے۔ سپیدہ پیری کے نور میں' آج اس طرح ظاہر ہوئے ہیں جیسے اسلاف میں کسی کی روح یکلخت نمودار ہو۔ اس دنیا کی بھیڑ میں آپ سب سے الگ ہیں اور جو کچھ فرماتے ہیں' وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

اقریطوس: "دوریان تم غلطی پر ہو۔ فلسفہ خیر' دنیا سے معدوم نہیں ہوا' اسکندریہ' روما' قسطنطنیہ میں میرے بہت سے شاگرد موجود ہیں۔ قیصروں کے عزیزوں اور غلاموں میں بہت سے ایسے ہیں جو اپنے نفسوں کو قابو میں لا کر آزاد رہنا اور پرہیزگاری سے بے انتہا مسرت اٹھانا جانتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو حکیم اپکٹیطوس اور مرقس ارلوس کو اپنے میں زندہ پاتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سچ بھی ہو کہ خیر دنیا سے ناپید ہو جائے گی تو ہوا کرے۔ اس سے ہماری مسرت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے'

کیونکہ خیر کی مدت کہ کب تک وہ رہے گی اور کب تک نہ رہے گی' مجھ پر موقوف نہیں۔ دوریان وہ لوگ احمق ہیں جو مسرت کو اپنے اختیار سے باہر جانتے ہیں۔ دیوتاؤں کی مشیت میں جو چیز نہیں اس کی مجھے خواہش نہیں' اور جو کچھ ان کی مشیت میں ہے وہ سب میری خواہش ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے میں دیوتاؤں کی مثل ہو سکتا ہوں اور ان ہی کا سا استغناء مجھ میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر خیر یا نیکی مرنا چاہے تو میں اس کی موت پر راضی ہوں اور اس رضامندی میں مجھ کو وہی مسرت ملتی ہے جو اپنی عقل و ہمت کی انتہائی کوشش میں حاصل ہو سکتی ہے۔ تمام باتوں میں میری عقل حکمت الٰہی کی نقل اتارنا چاہتی ہے اور میری یہ نقل اصل سے زیادہ قیمتی ہے' کیونکہ اس میں محنت و احتیاط زیادہ درکار ہے۔"

نیکیاس: "اچھا میں سمجھا آپ ربانیت میں شرکت چاہتے ہیں' لیکن اقریطوس اگر خیر سے مراد کوشش اور وہ جدوجہد ہے' جس سے حکیم زینو کے تلامذہ دیوتاؤں کے مانند ہو جانے کا دعوی کرتے تھے' تو پھر ایک مینڈک جو اپنے تئیں پھلاتے پھلاتے بیل کے برابر بنا دے وہ آپ کے نزدیک حکمت رواقیین کی ایک صنعت بالغہ کا نمونہ ہوگا۔"

اقریطوس: نیکیاس! تم کو تو مذاق سوجھتا ہے' حسب عادت ہر چیز کی ہنسی اڑانے میں استاد بننا چاہتے ہو' لیکن جس بیل کو آپ اس بحث میں لائے ہیں اگر حقیقت میں وہ کوئی دیوتا ہے' جیسے کہ ایپس اور تحت الثریٰ والے بیل جن کے پجاری یہاں موجود ہیں' دیوتا مانے جاتے ہیں اور اگر مینڈک اپنی عقل سے متاثر ہو کر اپنے تئیں بیل کے برابر بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو کیا یہ مینڈک فی الواقع اس بیل سے زیادہ صاحب خیر نہیں مانا جا سکتا اور وہ کون ہے جو ایسے ہمت والے چھوٹے سے جانور کی تعریف میں لوگوں کی زبان بند کر سکتا ہے؟

اتنے میں چار نوکر ایک بہت بڑے جانور کا مسلم کباب لئے کمرے میں آئے اور اس کے ساتھ اور عجیب عجیب شکل کے کھانے میز پر چن دئے گئے۔

زینو تمیس نے راہب کی طرف اشارہ کرکے لوقس میزبان سے کہا کہ یہ صاحب خود ہی ضیافت میں تشریف لائے ہیں۔ آپ مشہور پفنوتوس ہیں جو صحرا کی تنہائی میں

حیرت انگیز زندگی بسر کرتے ہیں۔ آپ کا قدم رنجہ فرمانا ہمارے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔"

لوقس نے کہا: "زینو تھمیس! ان مہمان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہیے۔ اس بزم احباب میں پہلی جگہ آپ ہی کے لئے ہے کیونکہ آپ نے بلا مدعو ہوئے ہم پر کرم فرمایا ہے۔"

نیکیاس: "خیر کیا چیز ہے اور شر کیا چیز ہے؟"

اس سوال پر کچھ دیر تک سب لوگ خاموش رہے، اسی اثناء میں ہرمودس نے جس کے ہاتھ میز پر پھیلے ہوئے تھے، ایک کور ننھی دھات کا بنا ہوا گدھا اٹھا لیا، جس کی پیٹھ پر دو بورے لدے تھے۔ ایک بورے میں زیتون کے سفید پھل تھے اور دوسرے میں سیاہ۔ اس کھلونے کو اٹھا کر ہرمودس نے کہا:

"ذرا ان پھلوں کو دیکھئے، سیاہ و سپید رنگ پاس پاس ہونے کی وجہ سے وہ کیسے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان پھلوں کو ادراک اور گویائی ملے تو سفید پھل کہیں گے کہ زیتون کے لئے یہی اچھا ہے کہ اس کا پھل سفید ہو۔ سیاہ ہونا اس کے لئے برا تھا۔ جن لوگوں کے پاس سیاہ پھل ہوں گے وہ سفید پھل والوں کو نفرت سے دیکھیں گے۔ لیکن ہم ان لوگوں کی بہ نسبت بہتر طریقہ پر اس بحث کا فیصلہ کر سکتے ہیں، کیونکہ ان میں اور ہم میں وہی فرق ہے جو ہم میں اور دیوتاؤں میں ہے۔ انسان کے لئے جو ہر چیز کے صرف ایک پہلو کو دیکھ سکتا ہے، برائی بھی ایک نعمت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بدصورتی بدصورتی ہے، خوبصورتی نہیں، لیکن اگر ہر چیز خوبصورت ہوا کرتی تو وہ خوبصورت نہ ہوتی، اس لئے برائی کا موجود ہونا اور وہ بھی بھلائی سے زیادہ مقدار میں ہونا ایک امر خیر ہے۔"

اقریطوس: اس بحث میں بھلائی کو زیادہ ملحوظ رکھئے۔ برائی اس کائنات کے لئے نہیں، جس کی ساخت میں وہ کوئی نقصان پیدا نہیں کر سکتی، بلکہ وہ گنہگار کے ساتھ مخصوص ہے جو برائی کرتا ہے مگر ہو نہیں سکتی۔

لوقس: "یہ دلیل واقعی بہت باریک ہے۔"

اقریطوس: "دنیا ایک شاعر کا لکھا ہوا پر درد ناٹک ہے۔ خدا نے جو اس کا مصنف ہے ہم سب کو ایک سانگ بھرنے کے لئے دے رکھا ہے۔ اگر اس نے چاہا کہ یہ فقیر بنے، وہ شاہ بنے۔ یہ لنگڑا اور اپاہج رہے تو ہر حال میں ہمارا فرض ہے کہ جو سانگ بھرنے کو ملا ہے اسے اچھی طرح بھریں۔"

نیکیاس: "کیا خوب فرمایا ہے۔ واقعی اس ناٹک میں لنگڑے کے لئے یہی اچھا ہے کہ ہمیشہ لنگڑاتا رہے، دیوانے کے لئے یہی بھلا ہے کہ ہمیشہ پاگل رہے۔ حرام کار عورتوں کی خیر اسی میں ہے کہ حرام کاری کرتی رہیں۔ اسی طرح مکار کے لئے مکاری، دغاباز کے لئے دغابازی، قاتل کے لئے خون ناحق! یہ سب بھلائیاں ہی بھلائیاں ہیں اور جب سانگ پورا بھر لیا جائے تو فقیر اور بادشاہ، عادل اور ظالم، پاک دامن لڑکیاں اور بے شرم جوروئیں، فیاض تونگر اور کمینے قاتل سب کے سب شاعر کی زبان سے تعریف کا ایک ہی سا حصہ پانے کے مستحق ہو جائیں۔"

اقریطوس: "آپ میرے مفہوم کو الٹ دیتے ہیں، گویا ایک خوشنما چیز کو بدنما بنا کر کے دیکھتے ہیں۔ دیوتاؤں کی فطرت اور ان کے عدل و آئین سے آپ قطعی ناواقف ہیں اور آپ کا یہ جہل مرکب قابل افسوس ہے۔"

زینو تھمیس: "حضرات سنئے، میں خود بھلائی اور برائی، خیر و شر کی اصلیت کا قائل ہوں۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ انسان کا کوئی فعل بذات واحد ایسا نہیں جس میں اس کی نجات کا تخم موجود ہو۔ خواہ یہ فعل یہودا اسکریوتی کا بوسہ ہی کیوں نہ ہو۔ انسان کی نجات بدرجہ غایت جن چیزوں سے ظہور میں آ سکتی ہے اس میں برائی بھی شریک ہو کر اپنا عمل کرتی ہے اور اسی بنا پر یہ سمجھنا چاہیے کہ برائی بھلائی سے پیدا ہو کر جو خوبی بھلائی میں ہوتی ہے، اس سے اپنا حصہ لیتی ہے۔ اس اصول کو عیسائیوں نے یسوع کے اس شاگرد کے قصے میں خوب دکھایا ہے، جس نے استاد کا بوسہ لے کر اس کو دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار کرایا تھا۔ اسکریوتی کے اس فعل نے ابنائے آدم کی نجات کو ایک یقینی امر کر دیا۔ پس یسوع کے اس شاگرد پر پولوس کے بعض مریدوں نے جو نفرین کی ہے، وہ میرے نزدیک سراسر بے انصافی اور غلطی پر مبنی ہے، انہوں نے اس کا مطلق خیال نہیں کیا کہ اسکریوتی نے سلام کر کے جو بوسہ لیا تھا، اس کی خبر خود یسوع پہلے سے دے چکا تھا اور مذہب عیسوی کے مطابق اس واقعہ کا پیش آنا انسان کی نجات کے لئے ضروری تھا۔ اگر یہ بدنصیب شاگرد استاد

کے گرفتار کرانے کے لئے اس کے دشمنوں سے تیس تولے چاندی نہ تلوا لیتا تو حکمت الٰہی کا بطلان ہو جاتا۔ پروردگار دھوکے میں پڑتا اور یہ دنیا بالکل فساد اور شر، جہالت اور موت کا لقمہ ہو جاتی۔''

ہرمودس: ''یہ قصہ مجھے بھی معلوم ہے۔ کسی نے بیان کیا ہے کہ تاریخ کے دور میں ہیلن جبکہ شہنشاہ طبریوس کا زمانہ تھا، ایک مشہور جادوگر سلیمون کی داشتہ عورت بنی تھی، لیکن میں اب تک یہی سمجھتا تھا کہ ہیلن کا زوال خود اس کے قصد کا نتیجہ نہ تھا بلکہ فرشتوں نے اپنی تباہی میں اس کو بھی لپیٹ لیا تھا۔''

قلقراطیس: ''لیکن زینوشمیس یہ فرمایئے کہ یہ بار بار زندہ ہونے والی ہیلن آج کل کس ملک میں کس نام و شکل سے موجود ہے؟''

زینوشمیس: ''اس بھید کو پہنچنے کے لئے بڑی عقل چاہیے اور قلقراطیس عقل ایسی شے ہے، جو شاعروں کو نہیں ملی، یہ لوگ تو اس کمینی دنیا کی بھونڈی صورتوں پر جیتے ہیں اور نادان بچوں کی طرح بے حقیقت شکلوں اور باطل صداؤں سے جی بہلایا کرتے ہیں۔''

قلقراطیس: ''زینوشمیس! ذرا دیوتاؤں کے عتاب سے بچے رہئے گا۔ شاعر ان کو بہت عزیز ہیں۔ یہ شعر ہی تھا، جس میں دیوتاؤں نے اپنے سب سے پہلے قانون لکھوائے تھے۔ ندائے غیب بھی ہمیشہ نظم ہی کی صورت میں سنائی دی ہے۔ خدا کی تعریف بھی شعر ہی کی شکل میں خدا کے کانوں کو بھلی معلوم ہوئی تھی۔ کون کہتا ہے کہ شاعر بصیرت نہیں رکھتے۔ ان کی نظر سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں، چونکہ میں شاعر ہوں اور اپولو کے پھولوں کا تاج میرے سر پر رہ چکا ہے، اس لئے بتاتا ہوں کہ آخری جنم یونیہ نے کس میں لیا ہے۔ سنئے، ہیلن آپ سے بہت قریب ہے، وہ ہمیں دیکھتی ہے اور ہم اسے! کوچ پر تکیہ لگائے جو کوئی بیٹھا ہے، کیا آپ اس کو نہیں دیکھتے۔ حسن میں کیسی بھرپور ہے۔ مگر دل ٹھکانے نہیں معلوم ہوتا۔ آنکھوں میں آنسو ہیں اور لبوں پر بوسے۔ پرائم کے زمانہ کو خیال کیجئے مگر ہیلن اب تک اپنے اسی حسن لا زوال اور ایشیا کی شان پُر جمال میں زندہ ہے۔ دوستو! سنئے! یونیہ آج کل تائیس ہے۔''

فانیہ: ''قلقراطیس آپ نے کیا کہا! اگر ہماری تائیس پرائم کے زمانہ میں موجود تھی تو پھر الیوم کے میدان میں بڑے بڑے شہسواروں سے ملاقات کر چکی ہوگی۔ تائیس پیاری! سچ کہنا کیا تروجہ والا گھوڑا بہت ہی بڑا تھا؟''

ارسطوبلس: ''گھوڑے کا نام کس نے لیا ہے۔''

کارس نشہ میں چور اپنی کرسی سے گر کر لڑھکتا ہوا میز کے نیچے پہنچا اور وہیں سے کہنے لگا: ''واہ آج تو تھریسیا کے شرابیوں سے بھی بازی لے گیا۔ خم کے خم لنڈھا دیئے ہیں۔''

قلقراطیس نے شراب کا پیالہ منہ سے لگا کر کہا: ''اگر آج بے حساب پی کر مرے تو پھر ہماری جان کا خون بہا کچھ نہیں ہے۔''

لوقس میزبان چوڑے چکلے شانوں پر گردن اور چمکتے سر کو سیدھا تانے آنکھیں بند کئے آرام کرتا رہا۔

دوریان کے لئے کچھ عرصہ سے فلسفے کا خرقہ پارسائی تکلیف دہ ہو چلا تھا۔ آخر کار نہ رہ سکا۔ تائیس کی کوچ کے قریب آ کر کہنے لگا:

''تائیس! مجھے تم سے عشق ہے۔ گو ایک عورت سے عشق رکھنا میرے لئے سخت نازیبا ہے۔''

تائیس: ''مگر یہ عشق کبھی پہلے آپ کے دل میں پیدا نہیں ہوا؟''

دوریان: ''کیا بتاؤں' معدے میں شراب نہ تھی۔''

تائیس: ''کیا خوب! تو پھر مجھے اس عشق شراب آفریدہ سے معاف رکھا جائے۔ میں نے صرف پانی پیا ہے۔''

دوریان نے تائیس کا پورا جواب بھی نہ سنا اور دروشہ کی طرف کھسک گیا۔ دروشہ نے اشارہ کر کے کہا کہ اپنے دوست کارس کو میز کے نیچے سے نکالے۔ اب دوریان کی جگہ خالی پاتے ہی زینوشمیس فلسفی تائیس کے پہلو میں آ بیٹھا اور اس کے لبوں کا بوسہ لے لیا۔

تائیس: ''میں تو سمجھی تھی کہ آپ اوروں سے زیادہ نیک بخت ہیں۔''

زینوشمیس: ''میں کامل ہوں اور جو کامل ہو وہ ہر قانون سے آزاد ہے۔''

تائیس: ''لیکن کیا آپ کو اس کا ڈر نہیں کہ ایک عورت کا بوس و کنار آپ کی روح کو نجس کر دے گا۔''

زینوشمیس: ''جسم خواہش سے مغلوب ہو جائے' مگر

روح پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔"
تائیس: "تو پھر تشریف لے جایئے۔ مجھے ایسا عاشق درکار ہے، جو روح اور جسم دونوں کو معشوق پر فدا کر دے۔ سچ ہے، یہ جتنے فلسفی ہوتے ہیں، نرے بکرے ہی ہوتے ہیں۔"
چراغ ایک ایک کر کے سب گل ہو گئے۔ صبح کی زردی مائل روشنی پردوں کی جھریوں سے اندر آ کر مہمانوں کی سوجی ہوئی آنکھیں اور چہروں کی نیلگوں سرخی دکھانے لگی۔ ارسطوبلس کے پاس کارس مدہوش پڑا تھا۔ کبھی کبھی گھونسے بنا کر دکھاتا تھا اور اس طرح للکارتا تھا کہ گویا اپنے سائیسوں کو ڈانٹ رہا ہے۔ زینو تھمیس زرد صورت فانیہ کو بغل میں لئے سوتا تھا۔ دوریان فلسفی دروشہ کے ننگے گلے پر شراب کے قطرے ٹپکاتا تھا اور جب یہ یاقوت کی سی بوندیں بہتی ہوئی نیچے آتی تھیں تو گدگدی سے ہنسی اور ہنسی سے سینہ اوپر نیچے ہوتا تھا اور یہ فلسفی شراب کے بہتے ہوئے قطروں کو گوری گوری جلد سے چاٹنے کے لئے اپنی زبان دوڑاتا تھا۔ اتنے میں اقریطوس اٹھا اور نیکیاس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کمرے کے اخیر حصے کی طرف گیا اور وہاں نیکیاس سے ہنس کر پوچھنے لگا:
"عزیز من! اس وقت جس بات کے خیال میں ہو، میرے سامنے بیان کرو۔"
نیکیاس: "میں یہ سوچتا تھا کہ عورتوں کو جب عشق ہوتا ہے تو اس کی مثال ایڈونس والے باغیچوں کی سی ہوتی ہے۔"
اقریطوس: "اس سے کیا مطلب ہوا؟"
نیکیاس: "کیا آپ کو نہیں معلوم کہ عورتیں ہر سال اپنے اپنے گھروں میں ہرے ہرے پودے مٹی کے برتنوں میں لگا کر وینس دیوی کے عاشق ایڈونس کی یادگار میں چھوٹے چھوٹے باغ تیار کیا کرتی ہیں۔ لیکن یہ پودے دو چار دن ہرے رہ کر مرجھا جاتے ہیں۔"
اقریطوس: "پھر اس میں ہمارا کیا بگڑا؟ ایسی چیز جو گزرنے والی ہو، اس کا شوق بیکار ہے۔"
نیکیاس: "لیکن اگر حسینوں کا حسن ایک چلتی پھرتی چھاؤں ہے تو ان سے ملنے کا شوق بھی ایک نور کی شعاع ہے، جو ڈھل جائے گی۔ نہ اس کو دوام ہے نہ اس کو۔ پھر حسینوں کی چاہت کو کیوں بیکار سمجھا جائے۔ اس میں تو کوئی بے عقلی کی بات نہیں ہے کہ ایک گزرنے والی چیز ایسی چیز کا شوق رکھے، جسے خود ثبات نہیں اور روشنی اپنی کرن دوڑا کر اترتی چھاؤں کا بالکل ہی خاتمہ کر دے۔"
اقریطوس: "نیکیاس! تمہارا حال تو بالکل بچوں کا سا ہے۔ کھلونوں سے کھیلا کرتے ہو۔ میری بات مانو، آزاد ہو جاؤ۔ مرد بننے کا یہی طریقہ ہے۔"
نیکیاس: "جب تک اس جسم میں روح مقید ہے، آزادی چہ معنی دارد۔"
اقریطوس: "صاحبزادے! کچھ دور نہیں ہے۔ ابھی دیکھ لو گے۔ کوئی دم جاتا ہے کہ کہو گے اقریطوس آزاد ہو گیا۔"
یہ جملے منہ سے نکلے ہی تھے کہ فوراً جیب سے برہنہ خنجر نکال کر اپنے سینے میں بھونک لیا۔
جو لوگ قریب کھڑے تھے، انہوں نے فوراً ہاتھ کو پکڑ لیا مگر خنجر کی نوک دل کے پار ہو چکی تھی۔ اقریطوس عدم میں پہنچ گیا۔ ہرمودس اور نیکیاس نے اس کی خون آلودہ لاش ایک کوچ پر رکھی۔ عورتیں یہ ماجرا دیکھ کر چیخنے لگیں۔ سوتے ہوئے مہمان چونک کر چلانے لگے، یہاں تک کہ پردوں کی آڑ میں جو لوگ عیش و سرور میں چپکے چپکے ہنستے یا باتیں کرتے تھے، وہ بھی خاموش ہو گئے۔ لوقس میزبان کے کان میں جب کچھ آواز پہنچی تو وہ فوراً ایک سپاہی کی طرح نیند سے ہوشیار ہو گیا۔ لاش کے قریب آ کر زخم کو دیکھا اور پکارا:
"میرے طبیب ارسطوس کو بلاؤ۔"
نیکیاس نے کہا: "اب کیا ہوتا ہے، اقریطوس گزر گئے۔ عاشق اپنے معشوق کے وصال کا بھی ایسا شائق نہ ہوتا ہوگا، جیسے یہ موت کے متمنی تھے۔ ہم لوگوں کی طرح یہ بھی اس دنیا میں کسی ایسی چیز کی تلاش میں رہے، جسے کبھی وہ بیان نہ کر سکے۔ اب وہ دیوتاؤں کی مثل ہو گئے جو ہر چیز سے مستغنی ہیں۔"
لوقس نے اپنا ماتھا کوٹ کر کہا:
"موت، موت کی تمنا! جب تک انسان سلطنت کی خدمت کر سکتا ہے، اس وقت تک موت کی آرزو ایک مہمل بات ہے۔"
پفنوتوس اور تائیس پاس پاس بالکل خاموش کھڑے

رہے۔ یہ دونوں اس وقت نفرت' خوف اور امید سے بے حد متاثر تھے۔

دفعتاً راہب نے تماشے والی کا ہاتھ پکڑا اور شرابیوں کو جو فرش پر پڑے تھے پھلانگتا ہوا اور ان عورتوں اور مردوں سے بچتا ہوا جو لیٹے پڑے تھے' کسی طرح تائیس کو اس شراب اور خون کے خرابے سے باہر نکال لایا۔

دن نکلنے کو تھا۔ سڑک کے کنارے دونوں طرف اونچے اونچے ستونوں والے برآمدے دور تک چلے گئے تھے اور ان کے خاتمہ پر سکندر کے مقبرے کا کلس شعاع آفتاب سے چمکنا شروع ہو گیا تھا۔ رستے میں جا بجا نچے کھچے پھولوں اور پتوں کے ہار اور بجھی ہوئی مشعلیں پڑی تھیں۔ سمندر سے تازہ تازہ ہوا آ رہی تھی۔ پفنوتوس اب تک نیکیاس کی دی ہوئی عبا پہنے ہوئے تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اس کو فوراً اتارا اور اس کی دھجیاں دھجیاں کر کے اسے پاؤں میں خوب روندا اور کہنے لگا:

"تائیس تو نے دیکھا کہ ان بدبختوں نے کیسی ناپاک اور غلط تقریریں کی تھیں۔ کس طرح خالق کائنات کو جہنم کے شیطانوں کا سردار بنا کر دکھایا۔ نہایت بے غیرت بن کر خیر و شر سے انکار کیا۔ یسوع کی جناب میں گستاخیاں کیں اور یہودا اسکریوتی کی تعریف کی اور ان سب میں سب سے بڑھ کر روسیاہ اندھیرے کا گیدڑ' بدبودار جانور' وہ اریوسی عیسائی مرقوس تھا' جس نے گفتگو کے لئے اپنا منہ اس طرح کھولا' جیسے کسی سڑے ہوئے مردے کی متعفن قبر کھل جائے۔ تائیس تو نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ یہ گندے نجس کیڑے کس طرح رینگتے ہوئے تجھ تک پہنچے تھے' کہ اپنی کثافت سے تیرے دامن کو ناپاک کریں۔"

آج کی شب بے ہودہ حرکتوں میں عورتوں کی نالائقی اور مردوں کی بے اعتدالی اور سنگدلی دیکھ کر اور یہ خیال کر کے کہ اس رات کا ایک ایک لحہ کیسا گراں گزرا ہے' تائیس کا دل سخت بے زار و متنفر تھا۔ ایک آہ سرد بھر کر کہنے لگی:

"میں تو اب ان سب چیزوں سے تنگ آ کر لب گور پہنچ چکی ہوں۔ بابا! یہ بتایئے کہ چین بھی کہیں نصیب ہو سکتا ہے۔ میرا ماتھا جل رہا ہے۔ سر بالکل خالی خالی معلوم ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں شل ہیں' اتنی طاقت بھی نہیں کہ اگر خوشی کو کوئی میری ہتھیلی پر رکھ دے تو اسے اٹھا سکوں۔"

یہ سن کر پفنوتوس نے تائیس کو مہربانی کی نظر سے دیکھا اور کہا:

"بہن! ہمت نہ ہار۔ چین و آرام کا وقت تیرے لئے قریب آ رہا ہے۔ دیکھ ان جھیلوں اور باغوں سے بخارات کا جو اجلا اجلا دھواں اٹھتا معلوم ہوتا ہے' بس اب تو بھی ایسی ہی اجلی اور پاک ہو جائے گی۔"

اب چلتے چلتے تائیس اپنے مکان کے قریب پہنچی۔ پفنوتوس ساتھ تھا۔ پریوں والے گوشے کے آس پاس جو صنوبر کے درخت تھے' ان کی چوٹیاں چار دیواری سے اونچی نکلی ہوئی نظر آنے لگیں۔ ان کے اوس بڑے پتے ہلکی ہلکی صبح کی ہوا میں ہلتے تھے۔ سامنے ایک سنگی چوک تھا جہاں اس وقت کوئی آدمی نہ تھا۔ چوک کے چاروں طرف ستونوں کی صفیں تھیں اور جا بجا پتھر کے خوبصورت بت نصب تھے۔ دوسرے سرے پر سنگ مرمر کے چند گول تخت بچھے ہوئے تھے۔ تائیس بالکل ماندہ و خستہ ایک تخت پر بیٹھ گئی اور بڑی حسرت سے راہب کی صورت دیکھ کر کہنے لگی: "بتایئے اب کیا کروں؟"

راہب نے جواب دیا: "بس یہی کہ جو تمہاری تلاش میں یہاں تک آیا ہے اس کا کہنا مانو' وہ تم کو دنیا سے اس طرح توڑ لے گا' جس طرح مے فروش انگور کے خوشوں کو جو درخت پر رہ کر سڑ جاتے ہیں' درخت سے توڑ لیتا ہے اور ان کا شیرہ نکال کر نہایت خوشبو دار شراب تیار کرتا ہے۔ سنو! اسکندریہ سے مغرب کی جانب بارہ گھنٹے کی مسافت سے سمندر کے کنارے راہبات کا ایک دیر ہے۔ اس میں سکونت رکھنے کے قواعد نیکی اور عقل کا ایک نمونہ ہیں' وہ اس قابل ہیں کہ نظم میں لکھے جائیں اور نفیری اور طنبورہ کے ساتھ ان کو گایا جائے جو عورتیں ان قواعد کی پابند ہو کر وہاں رہتی ہیں' ان کے قدم دنیا میں ہوتے ہیں اور چہرے آسمان پر۔ اس دنیا میں وہ فرشتوں کی طرح رہتی ہیں' وہ مفلس رہنا چاہتی ہیں تاکہ یسوع ان سے الفت رکھے' وہ سادگی اور غیرت اختیار کرتی ہیں' تاکہ یسوع کی ان پر نظر پڑے' وہ پاک دامن اور عفیف رہتی ہیں' تاکہ یسوع انہیں اپنی دلہن بنائے۔ یسوع روز ایک باغبان کی شکل میں ننگے پاؤں ہاتھ بڑھائے ان کے

پاس آتا ہے' بالکل اسی شکل میں جیسے کہ قبر سے اٹھ کر جاتا ہوا وہ مریم مگدلینی کو نظر آیا تھا۔ بس آج اس دیر راہبات میں' میں تمہیں پہنچا دوں گا۔ جو پارسا عورتیں وہاں رہتی ہیں' ان کی صحبت سے تم فیض پاؤ گی۔ یہ سب تمہاری سگی بہنوں کی طرح اس وقت تمہاری منتظر ہیں۔ دیر کے دروازے پر ان کی رئیسہ جسے سب ماں کہتے ہیں' یعنی مشہور عابدہ الیسنا موجود ہو گی' جو تمہیں سلامتی دے کر تمہاری پیشانی کا بوسہ لے گی اور کہے گی کہ آ' بیٹی' آ' تیرا آنا مبارک ہے۔"

یہ سن کر تائیس کے منہ سے بے اختیار نکلا:

"الیسنا! قیصروں کی لخت جگر' شہنشاہ کاریوس کی نواسی۔"

راہب: "ہاں وہی الیسنا جو شاہوں کے قصر میں دیبا و حریر پہنتی تھی' اب ٹاٹ کا کرتا پہنتی ہے اور ایسے گھرانے کی بیٹی جو دنیا پر حکومت کا ڈنکا بجا رہا ہے' رتبہ میں بلند ہو کر مسیح کی لونڈی بنی ہے۔"

تائیس کھڑی ہو گئی اور کہا: "مجھے الیسنا کے گھر لے چلئے۔"

جس قدر کامیابی باقی رہ گئی تھی' اس کو مکمل کرنے کے لئے پفنوتوس نے کہا: "میں درحقیقت تجھے وہیں لے جاؤں گا اور وہاں تجھے ایک حجرے میں بند کر دوں گا' جہاں اپنے گناہوں پر تجھے رونا پڑے گا' کیونکہ الیسنا کی بیٹیوں سے تیرا ملنا اس وقت تک مناسب نہیں ہے' جب تک تیرے گناہوں کے داغ دھبے سب دھل کر پاک صاف نہ ہو جائیں۔ اس حجرے کے دروازے پر میں اپنی مہر کر دوں گا اور اس زندان میں ایک خوشدل قیدی کی طرح تو رہا کرے گی' حتیٰ کہ خود یسوع وہاں آئے گا اور اس مہر کو توڑ دے گا۔ یہ علامت ہو گی کہ تیرے گناہ معاف کئے گئے۔ تائیس کیا تجھے یسوع کے آنے میں شبہ ہے؟ نہیں' وہ ضرور آئے گا اور جب اپنی نور کی انگلیاں تیری آنکھوں پر رکھ کر تیرے آنسو پونچھے گا تو تیرے سارے جسم پر کیسا لرزہ چھٹ جائے گا۔"

تائیس نے دوبارہ کہا: "بابا! مجھ کو الیسنا کے گھر لے چلئے۔"

پفنوتوس کا دل خوش ہو گیا۔ چاروں طرف خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو بلاخوف و خطر دیکھ کر ایک لطف و لذت حاصل کرنے لگا۔ خدا کے پھیلائے ہوئے نور سے اس کی بصارت محظوظ ہوئی اور جبین نیاز پر ہلکے ہلکے کسی کا دم کرنا محسوس ہوا۔ یکایک اس چوک کے ایک گوشہ کی طرف ایک دروازے پر نظر پڑی' جو تائیس کے مکان کی طرف کھلتا تھا۔ شیشم اور صنوبر کے درختوں کی چوٹیاں دیکھ کر جن کو ہوا میں جھومتے ہوئے ابھی دیکھ چکا تھا' خیال آیا کہ یہ تائیس کے باغ کے درخت ہیں' اس خیال کے ساتھ ہی ان نجس باتوں کو یاد کیا' جنہوں نے وہاں کی ہوا کو جو آج کیسی صاف و خوشگوار تھی' ناپاک کر رکھا تھا۔ اتنا خیال آتے ہی راہب کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور کہنے لگا:

"تائیس! ہم کو یہاں سے بھاگنا چاہیے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی ٹھیک نہیں' لیکن تیرے گھر کا مال و اسباب جو تیرے گزشتہ گناہوں کا شاہد رہ چکا ہے' جتنی چیزیں تیری بے شرمی اور بے حیائی میں شریک رہی ہیں' ان سب کو خاک میں ملا دینا ضروری ہے۔ تائیس! جلدی کر' شہر ابھی سو رہا ہے۔ اپنے غلاموں کو حکم دے کہ اس چوک میں لکڑیوں کا ایک انبار لگائیں اور ان کو سلگا کر تیرے گھر کی جس قدر دولت ہے اس پر رکھ کر پھونک دیں۔"

تائیس نے رضامندی ظاہر کی اور کہا:

"بابا! جو کچھ آپ بہتر سمجھیں وہی کریں۔"

یہ کہہ کر تائیس سنگ مرمر کے تخت سے اٹھی اور راہب کے پیچھے پیچھے اپنے گھر کے دروازے پر آئی جہاں اس کے قدر دان پھولوں کے ہار لٹکا جایا کرتے تھے۔ دروازہ کھلوا کر دربان کو حکم دیا کہ گھر کے سب نوکر چاکر غلام اور باندیاں فوراً حاضر کی جائیں۔

جب سب نوکر اور غلام آ لئے تو تائیس نے پفنوتوس کی طرف اشارہ کر کے ان سب سے کہا:

"یہ راہب جو کچھ حکم دیں وہی کرو۔ ان میں خدا کی روح ہے' اگر تم نے ان کا حکم نہ مانا تو یہیں مر کر زمین کا پیوند ہو جاؤ گے۔"

"اس گھر کی ہر چیز کو بھسم کر دو۔" راہب نے حکم دیا۔

یہ حکم سن کر سب لوگ ششدر رہ گئے۔ زبان سے کوئی کچھ نہ کہتا تھا' مگر تائیس کا منہ دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے سوال کرتے تھے کہ کیا کریں۔

اتنے میں راہب نے ڈانٹ کر کہا: "حکم کی تعمیل کرو۔"

ان خادموں میں بعض عیسائی تھے، حکم کا مطلب سمجھ گئے اور فوراً مکان کے اندر جا کر لکڑیاں اور مشعلیں ڈھونڈنے لگے۔ بعض نوکر جو بہت مفلس تھے، وہ اس حکم سے ناخوش نہیں ہوئے۔ یہ لوگ اپنی مفلسی کی وجہ سے دولتمندوں کو بری نظر سے دیکھتے تھے۔ اس لئے غارتگری کا شوق ان میں قدرتاً موجود تھا۔ غرض جب لکڑیوں کا انبار چبوترے پر لگادیا گیا تو پفنوتوس نے تائیس سے کہا:

"اے عورت! اپنے گھر میں جا اور جو بے شرمی کا نجس لباس اس وقت پہنے ہے، اسے اتار دے اور ذلیل سے ذلیل لونڈی جو گھر میں ہو اس سے التجا کر کہ وہ اپنے پرانے سے پرانے کپڑے دے کر تجھ پر احسان کرے۔"

تائیس راہب کا حکم بجا لائی۔ رکابدار جھکے ہوئے لکڑیوں پر دھونکنیاں چلا رہے تھے۔ حبشی غلام سرو و صنوبر کی لکڑیوں کے صندوق، عاج و آبنوس کے صندوقچے اٹھا اٹھا کر آگ میں پھینکتے تھے، جو گرتے ہی ٹوٹ جاتے تھے اور ان میں سے مرصع ہار، سونے کے طرے اور جڑاؤ سرپیچ نکل پڑتے تھے۔ آخرکار لکڑیوں کے اس اونچے انبار سے سیاہ دھوئیں کا ایک ستون سا اس طرح اٹھا جیسے عہد نامہ عتیق کی مقبول قربانیوں سے کبھی اٹھا کرتا تھا۔ آگ سلگتے سلگتے دفعتاً بھڑکی اور ایسا شور ہوا جیسے کوئی درندہ غراتے غراتے یکلخت دہاڑنے لگے اور تیز شعلوں نے جو نظر نہ آتے تھے، اس گراں بہا ایندھن کو جلا کر خاک کرنا شروع کیا۔

تائیس بال کھولے جن کی لٹیں کمر تک آتی تھیں، ننگے پاؤں ایک موٹے جھوٹے کپڑے کا بدقطع نیچا کرتا پہنے ہوئے آئی۔ کیا عجب ہے کہ محض اس کے جسم کے مس سے اس ذلیل لباس کو ہوائے نفسانی اور لذت روحانی دونوں کی ملی جلی کیفیت محسوس ہو رہی ہو۔

ہمسائے شور سن کر جاگے۔ ایک ایک کر کے سب نے اپنے بالا خانے کی کھڑکیاں کھولیں اور آنکھیں مل کر دیکھنے لگے کہ یہ دھواں کدھر سے اٹھا ہے۔ پھر جلدی سے الٹے سیدھے کپڑے پہن، جہاں یہ آگ روشن تھی وہاں آئے اور سوچنے لگے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔

ان میں بعض لوگ سوداگر تھے، جن سے تائیس عطر اور خوشبو کی چیزیں خریدا کرتی تھی۔ ان سب نے بہت ہی بدحواس ہو کر اپنے گنجے گنجے سر اور لمبی لمبی گردنیں آگے بڑھا کر اس معاملہ کو غور سے دیکھنا اور سمجھنا چاہا۔ بہت سے نوجوان عیاش جو رات بھر جلسے دیکھ کر نوکروں اور غلاموں کی بھیڑ ساتھ لئے ادھر سے جا رہے تھے، اس ہنگامے کو دیکھ کر ٹھہر گئے۔ ان کے سروں پر پھولوں کے ہار لپٹے تھے اور قباؤں کے بند کھلے تھے۔ آگ کا ڈھیر دیکھتے ہی انہوں نے غل مچانا شروع کیا۔ لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا اور بہت جلد سب کو معلوم ہو گیا کہ انصینو کے تیسس کے کہنے سے تائیس آج اپنے گھر کی دولت پھونک کر کسی دیر میں داخل ہونے والی ہے۔

سوداگروں نے سوچا: "تائیس اور شہر چھوڑ دے۔ اس خیال ہی سے ہوش اڑے جاتے ہیں۔ اس کے بغیر ہم لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ اس کمبخت راہب نے اسے پاگل بنا دیا ہے۔ یہ لمبی داڑھی والا ہم کو تباہ کر کے چھوڑے گا۔ آخر قانون کس دن کے لئے ہے۔ کیا اسکندریہ میں اب کوئی حاکم کوئی منصف نہیں رہا۔ تائیس کو ہمارے غریب بال بچوں کا بھی کچھ خیال نہیں۔ یہ کام اس کا قانونی جرم کی حد تک پہنچتا ہے۔ وہ جو چاہے سو کرے، مگر شہر میں اسے زبردستی رہنا ہوگا۔"

جوان عیش پرستوں نے خیال کیا:

"اگر تائیس نے کھیل تماشے دکھانے، عاشقی معشوقی کے چرچے چھوڑ دیئے تو پھر ہماری زندگی کا لطف تو گیا گزرا ہوا۔ تماشا گاہ کی رونق اسی کے دم سے تھی۔ امیروں کا تو کیا ذکر ہے، ایسے غریبوں کے حق میں بھی جن کی رسائی اس تک نہ تھی، وہ مسرت کا ایک ذریعہ تھی۔ عیش و نشاط کے جلسے کہیں ہوں اور کسی میں ہوں، تائیس کا اثر ہر جگہ موجود تھا۔ وہ لذتوں کی لذت تھی اور محض اس خیال سے کہ شہر میں وہ ہمارے ساتھ رہتی ہے، ہر وقت طبیعت پر ایک سرور رہتا تھا۔"

شوقین اور عیش پرست ان ہی خیالات میں مصروف تھے، کہ ایک شخص جس کا نام قیرون تھا اور کسی زمانہ میں تائیس سے واسطہ بھی رکھ چکا تھا، سخت برہم ہو کر کہنے لگا: "یارو سنتے ہو۔ یہ پادری ایک عورت کو بھگائے لئے جاتا ہے۔" راہبوں کو برا کہتے کہتے وہ مسیح کی نسبت بھی گستاخانہ الفاظ زبان پر لانے لگا۔ غرض ہر حلقے میں جہاں

چار آدمی جمع تھے' تائیس کی اس حرکت پر کہ پادری کے ساتھ بھاگ رہی ہے' نہایت افسوس اور غصہ ظاہر کیا جاتا تھا۔ ہر شخص اپنے اپنے خیال کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور کہتا تھا:

"اس طرح شہر چھوڑ کر بھاگنا نہایت شرمناک ہے۔"

"یہ راہب بڑا کمینہ ہے' جو تائیس سے شہر چھڑوا رہا ہے۔"

"تائیس ہمارے منہ کا نوالہ ہم سے چھین رہی ہے۔"

"ہماری بیٹیوں کو اب جہیز کیونکر نصیب ہو گا۔"

"جو زیور میں نے اس کے ہاتھ بیچا ہے' کم سے کم اس کی قیمت تو دیتی جائے۔"

"اور ساٹھ جوڑے کپڑوں کے جو تیار کرائے ہیں' ان کے دام کون دے گا۔"

"وہ تو سب کی قرض دار ہو رہی ہے۔"

"ہائے! ہائے! تائیس چلی گئی تو پھرا گینہ' ایلکترہ اور پولی زینہ بن کر کون تماشے دکھائے گا۔ مانا کہ پولیبوس کا تماشا اچھا ہے مگر تائیس کو کوئی نہیں پہنچتا۔"

"تائیس کا دروازہ بند ہوتے ہی زندگی دوبھر ہو جائے گی۔"

"وہ تو اسکندریہ کے آسمان کا تارا تھی۔ چاند کی ہلکی ہلکی چاندنی تھی۔"

اتنے میں شہر کے پرانے پرانے فقیر اور کنگلے' اندھے اور لنگڑے' جذامی اور مفلوج بھی جمع ہو گئے اور اس جلتی ہوئی دولت کی روشنی میں گھسٹتے ہوئے آ کر روتے پیٹتے کہنے لگے:

"جب تائیس ہی روٹی نہ دے گی' تو ہمارے پیٹ کو ٹکڑا کہاں سے ملے گا۔ اس کے دستر خوان کا بچا ہوا کھانا تو دو سو بھوکوں کا روز پیٹ بھرا کرتا تھا' اور جب اس کے چاہنے والے اس کے گھر سے نکلتے تھے تو مٹھیاں بھر بھر روپے پیسے ہم بھوکوں کو دے جاتے تھے۔"

اس بھیڑ میں چور اور اٹھائی گیرے بھی موجود تھے۔ یہ سب سے زیادہ شور مچاتے تھے۔ لوگوں کو ادھر ادھر دھکے دیتے تھے کہ ہنگامہ اور بڑھے اور موقع ملے تو جلتے ڈھیر سے کوئی چیز نکال کر چلتے بنیں۔

ایک بڈھا تاجر تادیوس بھی وہاں موجود تھا' یہ ملطیہ سے اون اور تارن تم سے سن منگوا کر شہر میں بیچا کرتا تھا۔ تائیس پر اس کا بہت سا روپیہ چڑھا ہوا تھا۔ یہ اس طوفان بے تمیزی میں چپ کھڑا ایک ایک بات کو غور سے سنتا تھا۔ بکرے کی سی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا جاتا تھا اور صورت سے بے حد فکر مند معلوم ہوتا تھا۔ آخر کار وہ نوجوان قیرون کے پاس آیا اور اس کی آستین کھینچ کر آہستہ سے کہنے لگا: "آپ کے برابر تو تائیس کسی کو نہ سمجھتی تھی۔ پھر آپ بڑھ کر اس پادری کو کیوں نہیں روکتے؟"

قیرون نے بڑے جوش سے جواب دیا۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ مجال ہے اس پادری کی کہ تائیس کو یہاں سے لے جائے۔ میں خود تائیس سے بات چیت کرتا ہوں۔ اس میں کچھ اپنی تعریف نہیں ہے لیکن میرا یہ خیال ہے کہ میری بات سن کر وہ اس پہاڑی بھجنگے کے ساتھ جانا پسند نہ کرے گی۔ ہٹو' بد معاشو ہٹو۔"

اب قیرون ادھر ادھر لوگوں کو گھونسے مارتا' بڑھیا عورتوں کو گراتا' بچوں کو کچلتا تائیس کے قریب پہنچا اور اس کو الگ لے جا کر کہنے لگا:

"اے نازنین! میری طرف دیکھ' کچھ یاد ہے یا بالکل ہی دل سے بھلا دیا؟"

پفنوتوس فوراً قیرون اور تائیس کے بیچ میں آ گیا اور للکار کر بولا:

"بدبخت! اگر تو نے تائیس کو ہاتھ لگایا تو پہلے اپنی جان سے ہاتھ دھولے۔ یہ عورت پاک ہے اور خدا کی چیز ہے۔"

قیرون نے غضب ناک ہو کر کہا: "جا! مردود' سگ دماغ' مجھے بات کر لینے دے ورنہ داڑھی پکڑ کر تیری لاش کو اس دہکتی آگ میں جھونک کر زندہ کباب کر ڈالوں گا۔"

یہ کہہ کر قیرون نے تائیس کی طرف ہاتھ بڑھایا' لیکن راہب نے اچانک اس زور سے گھونسا رسید کیا کہ قیرون چکر کھا کر چار قدم دور وہاں جا کر گرا جہاں آگ کے انبار سے بجھے ہوئے انگارے اور کوئلے اڑ اڑ کر آتے تھے۔

مگر بڈھے تادیوس کو قرار نہ تھا۔ کہیں غلاموں میں جا کر ان کے کان کھینچتا تھا۔ کہیں بڑے آدمیوں میں جا کر خوشامد کے مارے ان کے ہاتھ چومتا تھا۔ غرض اس نے کسی طرح اشتعال دے دلا کر ایک چھوٹا سا گروہ ایسا تیار کر

لیا جو ہاتھ پاؤں سے درست ہو پادری کے مقابلے کو آگے بڑھا، جو ایک عورت کو بھگائے لئے جاتا تھا۔ قیرون کا منہ کوئلوں سے کالا ہو گیا تھا۔ سر کے بال کچھ جھلس رہے تھے۔ غصے کے مارے منہ سے کف جاری تھا۔ دیوتاؤں کو برا بھلا کہتا ہوا اس گروہ میں شامل ہو، سب کے آگے ہو لیا۔ اس کے پیچھے پیچھے فقیر اور کنگلے جن میں بعض لنگڑے بھی تھے، سروں پر لاٹھیاں پھراتے ہوئے چلے اور ٭فنوتوس کے گرد بہت جلد ان چیختے چلاتے بانڈی بازوں کا ایک حلقہ بندھ گیا اور ہر طرف سے جان سے مار ڈالنے کی آوازیں آنے لگیں۔

"اس راہب کی بوٹیاں کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دو۔"

"نہیں نہیں، پکڑ کر آگ میں ڈال دو اور جیتے کے کباب لگاؤ۔"

راہب نے یہ حالت دیکھتے ہی اپنے حسین شکار کو سینے سے چمٹا لیا اور بہت کڑک کر کہا:

"ارے چنڈالو! اس قمری کو خداوند کے عقاب سے چھڑانے کی کوشش نہ کرو، بلکہ اس عورت کی تقلید کرو اور اپنی ناپاک مٹی کو کندن بنا لو۔ اس کی طرح تم بھی جھوٹے خداؤں کو چھوڑ دو جن پر تم ایمان رکھتے ہو اور اپنے مال و دولت سے ہاتھ کھینچو، جس پر تم کو بھروسا ہے۔ دیر نہ کرو، وہ دن قریب آنے والا ہے کہ جب صبر خداوندی کو تاب نہ رہے گی۔ نادان ہو، اپنی بے شرمی کا اقبال کرو۔ گریہ کرو اور دعا مانگو۔ اپنے گناہوں سے نفرت کرو، جو اس عورت کے گناہوں سے کسی طرح کم نہیں۔ تم میں کون ہے امیر ہو یا غریب، سوداگر ہو یا سپاہی، آقا ہو یا غلام جو خدا کے سامنے کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک بدکار قحبہ سے بہتر ہے۔ تم سب مجسم نجاست و ناپاکی ہو اور یہ محض خداوند کا لطف و کرم ہے کہ تم سے نجات اس طرح نہیں بہتی جیسے موری سے غلیظ پانی بہتا ہو۔"

٭فنوتوس جس وقت یہ تقریر کر رہا تھا، تو اس کی آنکھوں سے شعلے اور منہ سے انگارے نکلتے معلوم ہوتے تھے اور سب لوگ اس کی باتیں اپنی طبیعت اور مزاج کے خلاف سن رہے تھے۔

مگر بڈھے تادیوس کو چین نہ تھا۔ پتھر اور سوکھی ہڈیاں چن کر اپنے دامن میں جمع کرنے لگا۔ اتنی ہمت تو نہ ہوئی کہ خود نشانے بازی کرتا مگر جتنے پتھر اور کنکر چنے تھے، وہ فقیروں اور کنگلوں کو دے دیئے اور اب پادری پر پتھراؤ شروع ہوا۔ ایک بڑی سی ہڈی کسی نے ایسی سیدھ باندھ کر پھینکی کہ ٹھیک ٭فنوتوس کے ماتھے پر لگی اور اس شہید وفا کے چہرے سے خون بہ کر تائیس کے سر پر ٹپکنے لگا گویا یہ دوسرا اصطباغ تھا جو پانی کے بدلے لہو سے ایک گناہوں سے توبہ کرنے والی عورت کو دیا جاتا تھا۔ ٭فنوتوس نے تائیس کو اس زور سے اپنے سینے سے چمٹا رکھا تھا کہ وہ گھبرائی جاتی تھی اور پادری کے کھردرے کمبل کے پیرہن سے اس کے چہرے کی نازک جلد چھلی جاتی تھی۔ وہ بے حد خوف زدہ ہو کر سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔

اس موقع پر ایک بہت خوش پوشاک آدمی مشکل سے راستہ نکالتا ہوا حلقہ کے بیچ میں آیا اور چلا کر کہنے لگا:

"لوگو! ذرا دم لو، یہ کیا کرتے ہو۔ یہ راہب میرا بھائی ہے۔" یہ آواز نیکیاس کی تھی۔ ضیافت میں اقر۔ملوس فلسفی کی موت کا واقعہ دیکھ کر اپنے مکان کو جاتا تھا کہ چوک میں لکڑیوں کا ایک انبار اور اس سے دھواں اٹھتا دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ تائیس موٹے جھوٹے کپڑے پہنے ہے اور ٭فنوتوس کو لوگ پتھر مارتے ہیں۔ نیکیاس کو اس پر کچھ حیرت نہیں ہوئی، کیونکہ کوئی چیز اس کی طبیعت میں حیرت پیدا نہ کر سکتی تھی۔

نیکیاس نے دوبارہ للکار کر کہا:

"ٹھہرو ٹھہرو! میرے پرانے مکتب کے یار ٭فنوتوس کو پتھر نہ مارو، بلکہ اس کی عزت کرو۔"

چونکہ فلسفیوں کے جلسوں میں بیٹھ کر نہایت نازک اور لطیف گفتگو کرنے کا خوگر تھا، اس لئے اس میں کارفرمائی کی، وہ بارعب قوت موجود نہ تھی، جو عام لوگوں کی طبیعت کو مغلوب کر لیا کرتی ہے۔ لوگوں کو بہت روکنا چاہا مگر کسی نے اس کی بات نہ سنی اور ایک بوچھاڑ ہڈیوں اور پتھروں کی راہب پر اور آئی۔ مگر وہ تائیس پر بالکل چھایا ہوا تھا کہ اسے کسی قسم کا گزند نہ پہنچے اور اس بات پر خدا کی تعریف میں مصروف تھا کہ یہ چوٹیں جو اس کے جسم کو پہنچ رہی تھیں، چوٹیں نہ تھیں، بلکہ خداوند کے پیار کی تھپکیاں تھیں۔ نیکیاس کو اس کی امید مطلق نہ رہی کہ لوگ اس کی بات سنیں گے اور یقین ہو گیا کہ وہ اپنے دوست کو بچانے میں نہ تو زور سے کام لے سکتا ہے اور نہ

سمجھانے سے، اس لئے اس نے راہب کی خیرو سلامتی کو دیوتاؤں کے سپرد کیا، جن پر اس کو کچھ زیادہ اعتقاد بھی نہ تھا۔ انسان کی عزت و وقعت اس کے دل میں نہ تھی اور غالبًا اسی وجہ سے ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ فوراً جیب سے ایک تھیلی نکالی۔ چونکہ بڑا عیش پرست اور فیاض آدمی تھا، اس لئے اشرفیاں اور روپیہ ہروقت پاس رکھتا تھا۔ غرض تھیلی ہاتھ میں لئے ان لوگوں کے قریب پہنچا جو راہب پر پتھر برسا رہے تھے اور ایک ایک کے سامنے جاکر تھیلی کو اس طرح ہلایا کہ ان میں روپے اور اشرفیاں خوب چھنکنے لگیں۔ لوگوں کو اس قدر غصہ تھا کہ پہلے تو کسی نے اس آواز کی طرف توجہ نہ کی، مگر پھر ادھر خیال کرکے پتھر پھینکنے سے ہاتھ روکا اور تھیلی کو گھورنے لگے۔ نیکیاس نے اتنا دیکھتے ہی جھٹ تھیلی کا منہ کھولا اور روپے اشرفیاں لوگوں میں پھینکنے لگا۔ لالچی تو فوراً زمین پر جھک پڑے۔

فلسفی جی میں خوش ہوا اور سمجھا کہ بات بن گئی۔ جس قدر درہم و دینار پاس تھے، چاروں طرف لٹانے لگا۔ سونے چاندی کی چھنکار پتھروں پر سنتے ہی جتنے لوگ پادری کو پتھر مار رہے تھے، اب وہ روپے لوٹنے لگے۔ فقیر، سوداگر، غلام سب ہی اس لوٹ میں شریک ہو گئے۔ شہر کے چند رئیس جو قیرون کے پاس کھڑے تھے، یہ کیفیت دیکھ کر قہقہے لگانے لگے۔ قیرون بھی اپنا غصہ بھول گیا۔

اب نیکیاس دوڑ کر فوراً پفنوتوس کے پاس آیا اور اپنا چغہ اتار کر اس پر ڈال دیا اور پھر اسے اور تائیس کو ایسی تنگ گلیوں میں سے لے چلا جہاں کوئی پیچھا نہ کر سکے۔ تھوڑی دیر تک یہ لوگ چپ چاپ چلتے رہے۔ جب سمجھے کہ اس ہجوم سے دور نکل آئے ہیں تو چال دھیمی کی اور نیکیاس نے کسی قدر رنج مگر طنز کے لہجہ میں کہا:

"آخر کار جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا۔ تحت الثریٰ کے دیوتا پلوٹو نے زمین کی دیوی پروس پنی کے مزے لوٹ لئے اور میرے وحشی دوست کے ساتھ تائیس چلنے کو تیار ہو گئیں۔"

تائیس نے جواب دیا: "نیکیاس! ہا، اب میں تم جیسے ہنس مکھ پھولوں میں بسے ہوئے خلیق اور مہربان خود بینوں میں رہتے رہتے اکتا گئی ہوں، اب تک جو کچھ معلوم ہوا اس سے بیزار ہوں اور اب جو معلوم نہیں ہے اس کی تلاش میں جا رہی ہوں۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ جس چیز کو خوشی سمجھتی تھی، وہ خوشی نہ تھی۔ اس بات کی تعلیم کہ سچی خوشی فی الحقیقت درد والم میں ہے، ان بزرگ سے ملی ہے جن کی ہر بات کا مجھے یقین ہے، کیونکہ حق سے وہ آگاہ ہیں۔"

نیکیاس نے مسکرا کر جواب دیا: "پیاری تائیس حق سے تو میں بھی آگاہ ہوں۔ یہ بزرگ تو ایک ہی حق کو جانتے ہیں اور میں جتنے حقائق ہیں سب سے واقف ہوں۔ دولت میں بھی ان سے زیادہ ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ نہ ان سے زیادہ مغرور ہوں اور نہ ان سے زیادہ خوش رہتا ہوں۔"

یہ دیکھ کر کہ پفنوتوس اس کو بہت ہی قہر کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، نیکیاس اس سے کہنے لگا:

"یار دیرین، کہیں یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں کوئی حد درجہ کا تماشایا عقل سے بالکل ہی کورا سمجھتا ہوں۔ ہم دونوں میں کون ترجیح کے قابل ہے، اس کا فیصلہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ میں اپنی اور تمہاری زندگی کا مقابلہ کروں۔ اچھا میری زندگی تو یہ ہے کہ اب گھر میں جاؤں گا تو میری دونوں کنیزوں نے میرے لئے غسل کا سامان تیار کر رکھا ہوگا۔ جاتے ہی غسل کروں گا، پھر کھانے بیٹھوں گا۔ تیتر کا کباب تھوڑا سا کھاؤں گا۔ پھر کھانے سے فارغ ہو کر فرفوریوس کا کوئی رسالہ، اپولیوس کی کتاب سے کوئی قصہ نکال کر پڑھوں گا، جسے سو مرتبہ پہلے پڑھ چکا ہوں گا۔ آپ کی زندگی یہ ہے کہ یہاں سے آپ اپنی جھونپڑی کو واپس جائیں گے اور وہاں پہنچ کر ایک نیک بخت اونٹ کی طرح دو زانو ہو کر کوئی دعا یا مناجات پڑھنی شروع کر دیں گے گویا جس چارے کو بارہا ہضم کر چکے ہیں، اس کی جگالی پھر شروع کی جائے گی۔ شام کو آپ مولی کی ترکاری جس میں چکنائی نام کو نہ ہوگی، کھائیں گے۔ مگر یار عزیز! ان سب کاموں میں جن کی صورتیں مختلف ہیں، ہم دونوں ایک ہی خیال کے پابند ہوں گے جو انسان کے اعمال کا اصلی مقصد ہے، یعنی حصول مسرت، ناممکن مسرت، اگر مجھ کو اس کا یقین ہو کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ درست ہے تو پھر یہ کہتا کہ تم خطا پر ہو اپنے اوپر ایک ظلم کرنا ہے۔

"تائیس! مرضی ہو تو جاؤ اور ممکن ہو تو دولت اور عیش سے بڑھ کر پرہیزگاری اور نفس کشی میں خوش رہو،

سب باتوں پر غور کر کے کہتا ہوں کہ تمہاری حالت قابل رشک ہے، کیونکہ اگر میں نے اور پفنوتوس نے اپنی اپنی زندگی میں فطرت کے تابع رہ کر صرف ایک ہی مسرت کو تلاش کیا ہے تو تم نے پیاری تائیس ایسی متضاد مسرتیں حاصل کی ہیں، جو مشکل سے ایک ہی شخص کو ملا کرتی ہیں۔ تمنا تھی کہ ایک ساعت کے لئے میں بھی ایسا ہی پارسا ہو جاتا، جیسے کہ تمہارے یہ دوست پفنوتوس ہیں۔ لیکن مجھے اس کی اجازت نہیں۔ بس الوداع اے تائیس الوداع۔ جاؤ جہاں تک تمہاری فطرت کی پوشیدہ قوتیں اور تمہاری تقدیر تمہیں لے جائے۔ جاؤ اور نیکیاس کی دعائیں بھی ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں۔ میں اس کو ایک فضول بات سمجھتا ہوں۔ لیکن تم ہی بتاؤ کہ ایک افسوس لا حاصل اور چند بے معنی خواہشوں سے بہتر میں کیا چیز اس دلکش دھوکے کی قیمت میں پیش کر سکتا ہوں، جس نے تمہارے کنار الفت میں مجھے عیش نصیب کیا تھا اور جس نشہ کا خمار گو ایک زمانہ گزر چکا ہے، اب تک باقی ہے۔ الوداع اے میری محسنہ، الوداع اے پراسرار نیکی، مردوں کی مسرت الوداع، الوداع اے لائق پرستش حسین مورت جسے فطرت نے نہیں معلوم کس نیت سے اٹھا کر اس مکر و کید کی دنیا میں پھینک دیا تھا۔''

پفنوتوس اور تائیس شہر کے قمری دروازے سے باہر نکل کر سمندر کے کنارے کنارے چلنے لگے۔

راہب نے تائیس سے کہا: ''عورت! یہ سمندر جو سامنے دیکھتی ہے، اس کا کل پانی تیرے گناہوں کو دھونے کے لئے کافی نہیں ہے۔''

یہ جملہ نہایت غصے اور حقارت سے ادا کر کے آگے اس طرح گفتگو کی:

''کتیوں اور سورنیوں سے زیادہ نجس بن کر اس جسم کے ساتھ جسے خدا نے عبادت کے لئے ایک ہیکل بنایا تھا تو بت پرستوں اور بے دینوں کے ساتھ مبتلائے گناہ ہوئی۔

چونکہ حق اب تجھ پر روشن ہو چکا ہے، اس لئے تیری ناپاکیاں تجھے دکھائیں گی کہ جب خدا کے حضور لب بند کئے اور ہاتھ باندھے جانا چاہے گی تو تجھ کو خود اپنے سے کس درجہ نفرت و کراہت معلوم ہوگی۔''

تائیس چپ چاپ راہب کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔

راستہ نہایت ناہموار تھا اور دھوپ بہت تیز تھی۔ تھکن سے گھٹنے ٹوٹے جاتے تھے اور پیاس سے حلق خشک تھا، مگر راہب کے دل میں وہ جھوٹا رحم جو ناپاکوں کے دلوں کو نرم کر دیتا ہے موجود نہ تھا اور جوش پارسائی میں وارفتہ ہو کر چاہتا تھا کہ اس جسم کے پرخچے اڑا دیئے جائیں، جس پر حسن اب تک بدنامی اور رسوائی کی شہادت دینے کو خاص طور پر حاضر تھا۔ فکر و مراقبہ مذہبی گرمجوشی میں اور ہیجان پیدا کر دیتا تھا، جس وقت یہ تصور بندھتا تھا کہ تائیس، نیکیاس کے ساتھ ہم بستر ہو چکی ہے تو اس گناہ سے اس درجہ نفرت معلوم ہوتی تھی کہ بدن کا سارا خون سمٹ کر دل پر آ جاتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اب سینہ شق ہو جائے گا۔ بد دعائیں دل سے نکل کر حلق میں پھنس جاتی تھیں اور پھر دانت پیسنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا تھا۔ اسی حال میں تھا کہ دفعتاً کود کر تائیس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ رنگ زرد تھا۔ صورت پر ہیبت تھی۔ خدا کا جلال تن بدن میں سمایا تھا۔ اسی شکل میں جھک کر تائیس کی روح کا معائنہ کیا اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔

تائیس نے چپ چاپ چہرے سے تھوک پونچھ ڈالا۔ چلتے چلتے ٹھہری تک نہیں۔ اب راہب تائیس کے پیچھے چلنے لگا اور اس کی صورت کو اس طرح دیکھتا تھا، جیسے کوئی جھک کر کسی غار عمیق کو دیکھے۔ اسی روحانی خشم و خلجان میں راہ طے کر رہا تھا کہ تائیس کے پاؤں سے خون کا ایک قطرہ ریت پر ٹپکا۔ اس لہو کی بوند کو دیکھ کر سوچا کہ اس عورت سے مسیح کا انتقام اس طرح لینا چاہیے کہ خود مسیح بھی اس طرح انتقام نہ لیتا، مگر اس خیال کے آتے ہی اس کے قلب کشادہ میں کسی نفس نامعلوم کی تازگی محسوس ہوئی۔ فوراً گر یہ لبوں پر آیا۔ آنسو شدت سے جاری ہو گئے۔ دوڑ کر تائیس کے سامنے آیا اور زمین پر منہ کے بل گر پڑا اور بہن کہہ کر اس کے زخمی پاؤں کو چومنے لگا۔ بار بار یہی جملہ زبان پر تھا:

''میری بہن، میری بہن! میری ماں! پاک اور مقدس۔'' اس کے بعد دعا مانگنے لگا:

''اے آسمان کے فرشتو! اس لہو کی بوند کو اٹھا کر ''معطی نجات'' کی حضور میں پہنچا دو۔ خدا ایسا کرے کہ اس خون کے قطرے سے سیراب ہو کر ایک اعجاز نما پودا لالہ نعمان کا اس زمین پر اگے اور اس میں پھول آئیں اور

جو ان پھولوں کو دیکھے اس کا دل پاک اور روشن ہو جائے۔ اے پاک، پاک اور بہت پاک تائیس۔"

اس دعا میں مشغول تھا کہ ایک لڑکا گدھے پر سوار ادھر سے نکلا۔ پفنوتوس کے حکم سے وہ گدھے پر سے اترا۔ راہب نے تائیس کو اس پر سوار کیا اور لگام اپنے ہاتھ میں لے کر سفر جاری کیا۔ شام ہوتے وہ ایک نہر کے کنارے پہنچے جس پر خوبصورت درخت سایہ کئے تھے۔ راہب نے تائیس کو اتار کر گدھے کو ایک درخت سے باندھ دیا۔ پھر دونوں نرم گھاس کے ایک تختے پر بیٹھ گئے۔ پفنوتوس نے تائیس کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے میں روٹی، نمک اور زوفے کا ساگ تھا۔ تازہ اور میٹھا پانی دونوں نے اوک سے پیا اور خدا کی باتیں کرنے لگے۔ تائیس نے کہا:

"ایسا صاف پانی میں نے کبھی نہیں پیا اور نہ کبھی ایسی صاف اور پاک ہوا میں سانس لیا تھا۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں خدا موجود ہے۔"

پفنوتوس نے جواب دیا:

"بہن دیکھ! یہ شام کا وقت ہے۔ رات کی تاریکی پہاڑیوں پر چھانا شروع ہو گئی ہے اور اب وہ وقت قریب آ رہا ہے کہ روحانی زندگی کا خیمہ نور میں چمکتا ہوا تجھے نظر آنے لگے اور صبح ازل کی گلابی روشنی تیری نظر کے سامنے نمودار ہو۔"

رات بھر یہ دونوں چلتے رہے اور جب پچھلے پہر چاندنی چھٹکی اور اس کی روشنی میں سمندر کی موجیں چمکنے لگیں تو انہوں نے خدا کی تعریفیں شروع کیں اور جب آفتاب طلوع ہوا تو ریگستان ان کے سامنے ایسا پھیلا معلوم ہوا جیسے کسی عظیم الشان شیر کی کھال لبیا کی زمین پر بچھا دی گئی ہو اور اب اسی ریگزار کے کنارے کنارے جہاں کھجوروں کے جھنڈ تھے، صبح کی روشنی میں سفید سفید جھونپڑیاں نظر آنے لگیں۔

تائیس نے ان جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"بابا! کیا روحانی حیات کے خیمے یہی ہیں؟"

پفنوتوس نے جواب دیا: "ہاں! میری بیٹی، میری بہن! تو نے خوب پہچانا، یہی پناہ اور امن کا وہ گھر ہے جہاں میں اپنے ہاتھوں سے تجھے بند کر دوں گا۔"

اب ان دونوں نے دیکھا کہ جھونپڑیوں کے پاس ہر طرف عورتیں اس طرح کام کاج کرتی پھر رہی ہیں جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتوں کے گرد اڑتی نظر آئیں۔ کوئی روٹیاں پکا رہی ہے، کوئی ترکاریاں بھونتی ہے۔ بہت سی بیٹھی چرخہ کات رہی ہیں اور ان سب پر سورج کی روشنی اس طرح پڑ رہی ہے جیسے خدا کا نور چھنتا ہو۔ بہت سی عورتیں املی کے سایہ دار درختوں کے نیچے ہاتھ سیدھے چھوڑے، نظریں نیچی کئے مراقبہ میں مصروف کھڑی ہیں۔ ان کے دلوں میں خدا کی محبت سمائی ہے۔ یہ مریم مگدلینی کا اتباع کرتی تھیں، یعنی سوائے عبادت اور مراقبے اور روحانی کیفیت حاصل کرنے کے انہیں دوسرا کام نہ تھا۔ اسی وجہ سے یہ سب مریم کہلاتی تھیں، جو عورتیں عبادت کے علاوہ معمولی کام کاج بھی کرتی تھیں، ان کو مرتھا کہتے تھے۔ یہ سب نقابوں اور رومالوں سے اپنے سر ڈھکے رکھتی تھیں لیکن ان میں سے جو بہت جوان تھیں، ان کے بال پیشانی پر پڑے رہتے تھے، ممکن ہے کہ بھولے سے ایسا ہوتا ہو کیونکہ بالوں کو اس طرح رکھنا قواعد کے خلاف تھا۔ ایک نہایت ضعیف خاتون بلند قامت گورا رنگ لکڑی ٹیکتی ہوئی کبھی ایک جھونپڑی میں جاتی تھی کبھی دوسری میں۔ پفنوتوس ادب سے اس کے قریب آیا اور اس کی چادر کے ایک کونے کو بوسہ دے کر کہا:

"اے پاک اور معزز البینا! تجھ پر خدا کی رحمت ہو۔ اے مکھیوں کی ملکہ! میں تیرے چھتے کے لئے ایک مکھی ایسی لایا ہوں جو گمراہ تھی اور ایسی راہ میں آوارہ ہو گئی تھی، جس میں پھول نہ تھے۔ میں اس کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی میں بند کر کے اپنے سانس سے اسے گرمی پہنچاتا ہوا یہاں تک لایا ہوں اور اب میں اسے تیرے سپرد کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے تائیس کی طرف اشارہ کیا۔ تائیس اس وقت قیصری گھرانے کی بیٹی البینا کے سامنے ادب سے سر نیچا کئے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیکے کھڑی تھی۔

البینا نے تائیس کو کچھ دیر تک غور سے دیکھا، پھر حکم دیا کہ بیٹی کھڑی ہو۔ جب تائیس سیدھی کھڑی ہوئی تو البینا نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور راہب نے کہا:

"ہم اس کو "مریموں" کی جماعت میں داخل کریں گے۔"

پفنوتوس نے اب البینا سے کل حال کہا کہ یہ عورت اس دیرامن میں کس وجہ سے لائی گئی ہے اور اجازت

چاہی کہ پہلے اس کو کسی جھونپڑی میں تنہا رکھا جائے۔ الیبنا نے اس بات کو منظور کرلیا اور تائیس کو اپنے ساتھ ایک جھونپڑی میں لے گئی، جس کو ایک کنواری زاہدہ لیتا نے اپنی سکونت سے متبرک کیا تھا، لیکن جب سے تپ دق میں مریض ہو کر اس کا انتقال ہوا تھا، یہ تنگ و تاریک جھونپڑی خالی پڑی تھی اور سوائے ایک بستر، ایک میز اور ایک صراحی کے اس میں اور کچھ نہ تھا۔ تائیس نے جب اس کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس کی روح ایک سرور سرمدی سے معمور ہو گئی۔

پفنوتوس نے راہبات کی رئیسہ سے کہا: "اس جھونپڑی کا دروازہ میں اپنے ہاتھ سے بند کرنا اور اس پر اپنی مہر لگانا چاہتا ہوں۔ یسوع جس وقت یہاں آئے گا تو اس مہر کو توڑ دے گا۔"

اتنا کہہ کر وہ کنوئیں کے قریب گیا اور وہاں سے کچھ گیلی مٹی اٹھائی۔ لعاب دہن سے اس پر اپنا ایک بال جمایا اور پھر اس مٹی کو دروازہ بند کر کے اس کی جھری پر تھپ دیا۔ اس کے بعد وہ جھونپڑی کی کھڑکی کی طرف آیا۔ دیکھا کہ تائیس اندر بالکل خاموش مگر نہایت مطمئن کھڑی ہے۔ راہب فوراً گھٹنوں کے بل کھڑا ہوا اور تین بار خدا کی تعریف کر کے کہنے لگا: "کیسی حسین ہے جو روحانی زندگی کی راہوں میں چلتی ہے۔ کیسے خوبصورت اس کے پاؤں ہیں اور کیسا نورانی اس کا چہرہ ہے۔"

یہ کہہ کر وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ سر کو کمبل سے ڈھکا اور آہستہ قدم وہاں سے رخصت ہوا۔

الیبنا نے ایک کنواری راہبہ کو بلایا اور حکم دیا:

"بیٹی جا اور ضرورت کی سب چیزیں، روٹی پانی اور تین سوراخوں والی ایک بانسری اس نئی راہبہ کو پہنچا دے۔"

فرفیون

پفنوتوس نے صحرائے تھیبی کی راہ لی۔ راستے میں ایک مقام پر پہنچا جس کا نام اثری تھا۔ یہ دریائے نیل کے کنارے واقع تھا اور یہاں سے ایک کشتی غلہ بھر کر اسرافیون قیس کی خانقاہ کو جانے والی تھی۔ پفنوتوس اس میں بیٹھ گیا۔ چند روز کے دریائی سفر کے بعد کشتی سے اترا تو تمام مرید استقبال کے لئے کنارے پر حاضر تھے۔ آقا کو دیکھ کر سب باغ باغ ہو گئے۔ کسی نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا لئے، کوئی سجدہ شکر بجا لایا۔ کسی نے راہب کی نعلین کو بوسہ دیا، کیونکہ اسکندریہ میں جو کار خیر اس نے کیا تھا، اس کی خبر سب کو ہو چکی تھی۔ کلیسا کے نیک و بد فتح و شکست کی اطلاع راہبوں کو خفیہ طور پر نہایت جلد پہنچ جایا کرتی تھی اور صحرا میں ایسی خبروں کی رفتار باد سموم کی رفتار سے کم تیز نہ ہوتی تھی۔

پفنوتوس نے کشتی سے اتر کر ریت پر چلنا شروع کیا۔ مرید پیچھے پیچھے خدا کا شکر کرتے چلتے تھے۔ فلے ویان پر جو مریدوں میں سب سے بڑا رتبہ رکھتا تھا، ایسی روحانی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ خدا کی حمد میں زور زور سے گیت گانے لگا۔

جب راہب کی دہلیز پر سب مرید پہنچ گئے تو گھٹنوں کے بل کھڑے ہوئے اور کہا:

"آقا ہم کو برکت دیجئے اور ایک پیمانہ تیل کا دیجئے، تاکہ آپ کی واپسی کی خوشی میں ضیافت کریں۔"

مریدوں میں صرف پال جس طرح کھڑا تھا، اسی طرح کھڑا رہا۔ پفنوتوس کو اس نے نہیں پہچانا۔ اشارہ سے پوچھنے لگا کہ یہ کون آدمی ہے۔ کسی نے اس کی بات کا خیال نہ کیا، کیونکہ سب جانتے تھے کہ گو خدا رسی میں اسے فضیلت حاصل ہے مگر عقل بالکل نہیں رکھتا۔

مرید جب رخصت ہوئے تو انصینو کا قیس اپنی جھونپڑی میں اکیلا ہو کر سوچنے لگا: "آخر کار میں اس گوشہ عافیت میں پہنچ گیا، جہاں آرام اور روحانی تسکین ہمیشہ نصیب ہوتی تھی۔ گویا قناعت اور اطمینان کے قلعہ میں پھر آ گیا۔ لیکن کیا بات ہے کہ اس پھونس کی چھت نے جو مجھے پہلے بہت بھلی معلوم ہوتی تھی، میری کچھ آؤ بھگت نہیں کی اور نہ دیواروں نے کہا کہ "تیرا آنا مبارک ہوا۔" گھر کو جیسا چھوڑ گیا تھا، ویسا ہی پاتا ہوں۔ کسی چیز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ میری میز، یہ میرا بستر وہی ہے جو تھا اور لکڑی کی مورت مسیح مصلوب جس نے مجھ کو ہمیشہ راہ نیک دکھائی ہے، جیسی چھوڑ گیا تھا ویسی ہی ہے۔ یہ انجیل مقدس بھی جن میں خدا کی صورتیں دیکھا کرتا تھا، وہی ہے جو تھی، لیکن باوجود اس کے کہ جو گھر میں چھوڑ گیا تھا، اسے نہیں پاتا، ہر چیز میں جو خیر و برکت پہلے معلوم ہوتی تھی، اب وہ نظر نہیں آتی بلکہ سب چیزیں

ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا آج انہیں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ جب اس میز اور پلنگ کو جنہیں برسوں ہوئے میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا اور مسیح کی تصویر اور ان چھال کے کاغذوں کو جن پر خدا کی باتیں لکھی ہیں' دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سامان کسی مردے کا ہے۔ برسوں ان چیزوں سے مانوس رہنے کے بعد اب میں انہیں پہچانتا تک نہیں۔ افسوس! مگر ان چیزوں میں کوئی چیز بدلی نہیں۔ جو کچھ بدلا ہے' وہ میں خود ہوں۔ میں اب وہ نہیں ہوں جو تھا۔ کوئی اور ہوں اور غالباً وہ مردہ میں ہی ہوں جو یہ سامان چھوڑ گیا ہے۔ اے خدا وہ آدمی جو کبھی یہاں زندہ تھا کدھر گیا۔ کون سی چیز وہ لے گیا اور کون سی چیز وہ چھوڑ گیا۔ آخر میں اب کون ہوں؟"

پفنوتوس کو جس بات نے بہت بے چین کر رکھا تھا وہ یہ تھی کہ اب یہ جھونپڑی اسے بہت ہی تنگ معلوم ہوتی تھی' حالانکہ اگر چشم ایمان سے دیکھتا تو اس کی وسعت بے پایاں نظر آنی چاہیے تھی' کیونکہ خدا کی بے پایانی کا خیال بھی یہیں سے شروع ہوا تھا۔

زمین پر پیشانی رگڑ کر دعا مانگنے لگا۔ پہلے کچھ تسکین ہوئی' لیکن اسی حال میں ایک گھنٹے سے زیادہ گزرنے پر دفعتاً تائیس کی صورت اس کے سامنے ظاہر ہوئی۔ پفنوتوس اسے دیکھتے ہی مسیح کی جناب میں شکر گزار ہوا اور کہنے لگا:

"اے یسوع! یہ تو ہے جس نے تائیس کو میرے پاس بھیجا ہے۔ میں تیرے اس بے انتہا کرم کا منت گزار ہوں' تو چاہتا ہے کہ جس کو میں تیری نذر کر چکا ہوں اس کی صورت میں بھی دیکھتا رہوں تاکہ میرے قلب کو ایک راحت و تسکین حاصل رہے۔ تو میری آنکھوں کو اس کے بے ضرر تبسم اور معصوم حسن جس کا نیش میں نے پہلے ہی نکال دیا ہے' دکھاتا ہے۔ اے خداوند تو مجھے مسرور کرنے کے لئے تائیس کی شکل اسی صورت میں دکھاتا ہے جس میں تیرے ایما کے مطابق میں نے اسے پاک اور آراستہ کر کے تیری حضور میں پیش کیا تھا۔ تیری اس نوازش میں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوست دوسرے دوست سے تحفہ لے کر خوش ہوا ہے اور ہنس کر وہی تحفہ اپنے دوست کو یاد دلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس عورت کو دیکھ کر ایک لذت پاتا ہوں' کیونکہ اس کا دیدار میری نظر میں ایک رویائے صادقہ ہے' جو تو نے مجھے دکھایا ہے۔ اے یسوع! تو اس بات کو بھولنا نہیں چاہتا کہ یہ نذر میری پیش کی ہوئی ہے۔ اس کو اپنے پاس رہنے دے کیونکہ وہ تجھے خوش کرتی ہے اور اس کے نور حسن کو سوائے اپنے دوسروں پر چمکنے نہ دے۔"

پفنوتوس کو ساری رات نیند نہ آئی اور تائیس کی یہ خیالی تصویر اس کو ایسی واضح نظر آئی کہ اس کے خلوت خانے میں اس کی اصلی صورت بھی اس طرح نظر نہ آئی تھی' وہ خود ہی اس بات پر گواہی دینے لگا:

"جو کچھ میں نے کیا وہ خدا کی بزرگی کے لئے تھا۔"

باوجود ان خیالات کے حیرت میں تھا کہ دل کو چین کیوں نہیں آتا۔ بہت ہی افسوس کر کے کہنے لگا: "اے میری روح تو کیوں اس قدر مغموم ہے اور کیوں تو اس قالب میں ایسی مضطرب و بے قرار ہے؟"

اس پر بھی تسکین نہیں ہوئی اور یہ حالت اضطراب تیس دن تک جاری رہی' جو ایک راہب کے حق میں نہایت خطرناک مصیبتوں کا پیش خیمہ تھی۔ تائیس کی صورت رات دن سامنے رہتی تھی۔ کسی طرح نہ ہٹتی تھی اور نہ وہ اسے ہٹانا چاہتا تھا' کیونکہ ابھی تک وہ یہ سمجھتا تھا کہ حالت خواب میں یہ صورت جو نظر آتی ہے' وہ منجانب خدا ہے اور صورت بھی ایک خدا رسیدہ عورت کی ہے۔ ایک رات پچھلے پہر تائیس خواب میں اس سے ملنے آئی۔ سر سے بنفشہ کے پھولوں کے ہار لپٹے تھے۔ حسن میں ملاحت اس غضب کی تھی کہ پفنوتوس بدحواس ہو کر سوتے میں چلا اٹھا۔ جب جاگا تو سارا بدن سرد پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ آنکھوں میں نیند کا اثر ابھی باقی تھا کہ اس کو اپنے چہرے پر کوئی چیز گیلی اور گرم معلوم ہوئی۔ دیکھا کہ ایک چھوٹا سا گیدڑ چارپائی کے سیرو پر اگلے دونوں پنجے رکھے کھڑا ہے اور اپنا متعفن سانس پفنوتوس کے چہرے پر پہنچا کر زور زور سے قہقہے لگاتا ہے۔

پفنوتوس کو سخت حیرت ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ جس اونچے مقام پر کھڑا تھا' وہ مقام مع اس کے زمین میں دھنسا چلا جاتا ہے۔ حقیقت میں اب وہ اپنے ثبات قلب و اعتقاد کی بلندی سے پستی میں گر رہا تھا۔ کچھ دیر تک اس کی یہ حالت رہی کہ سوچنے اور فکر کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ جب حواس کچھ درست ہوئے تو غور کرنے لگا' مگر

جس قدر غور کیا دل کی بے قراری بڑھتی گئی۔
بفنوتوس نے جو شکوک میں مبتلا ہو چلا تھا ارادہ کیا کہ اب کبھی تائیس کا خیال دل میں نہ لائے گا، مگر یہ ارادہ ہیچ تھا۔ غائب صورت پھر حاضر ہو گئی اور اب ہر حال میں چاہے پڑھتا ہو، چاہے عبادت کرتا ہو، چاہے مراقبے میں ہو تائیس سامنے کھڑی اس کو غور سے دیکھا کرتی تھی۔ پہلے ایک ہلکی سی آواز جیسے چلنے میں کسی عورت کے لباس سے پیدا ہو، سنائی دیتی تھی اور پھر اس کی صورت سامنے آ جاتی تھی۔ خیال کا یہ نقش واقعہ سے بھی زیادہ واضح اور صاف ہوتا تھا بلکہ واقعی صورتیں تو متحرک و مدغم ہونے کی وجہ سے زیادہ صاف نظر نہیں آتیں۔ جبکہ خیالی صورتیں اپنی خصوصیات اور شخصیت کو پتھر کا نقش بنا دیتی ہیں اور پھر ان میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان اپنی نگاہ ان سے ہٹا نہیں سکتا۔ اب تائیس مختلف انداز سے اس کے پاس آنے لگی۔ کبھی اس کی صورت افسردہ و مغموم ہوتی تھی۔ گلے میں وہی رو پہلی پھول بوٹوں والا ارغوانی جوڑا ہوتا تھا، جو اسکندریہ میں ضیافت کی رات کو پہنے تھی۔ پیشانی بھی ان ہی پھولوں سے آراستہ ہوتی تھی، جو آخری دن زلفوں پر مرجھائے تھے۔ کبھی یہ صورت شہوت انگیز ہوتی تھی۔ سر سے پاؤں تک لباس ایسا باریک ہوتا تھا، جیسے ہوا یا شبنم کا غبار اور گرمی حسن بھی وہی ہوتی تھی، جس کی بجلیاں پری گوشہ میں کوندا کرتی تھیں۔ کبھی صورت پرشان پارسائی ہوتی تھی۔ ٹاٹ کا خرقہ گلے میں ہے اور چہرے پر روحانی مسرت کا نور برس رہا ہے۔ کبھی صورت مظلوموں کی سی ہوتی تھی۔ منہ پر مردنی چھائی ہے اور موت کی ہیبت میں آنکھوں کی پتلیاں پھرنے کو ہیں۔ سینہ بالکل کھلا ہے اور دل مجروح کا خون پھوٹ کر چھاتیوں پر آ گیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ بے چین کرنے والے خواب وہ ہوتے تھے، جن میں تائیس کے گھر کی وہ بیش بہا اور نادر چیزیں جن کو اس راہب نے اپنے ہاتھوں سے آگ میں جھونکا تھا، زندہ ہو کر فریاد و فغاں کرتی ہوئی سامنے آتی تھیں۔ اب اسے معلوم ہوا کہ ہر شے میں کوئی چیز ایسی رکھی گئی ہے جو فنا نہیں ہوتی۔ ایسے خوابوں کو دیکھ کر بفنوتوس چیخ اٹھتا تھا۔
بفنوتوس میں اب کوئی نیا آدمی گھس بیٹھا تھا۔ اس کی راتیں خوابوں کا ایک طولانی سلسلہ ہوتی تھیں۔ اس کے دن بھی ایسے ہوتے تھے کہ راتوں سے فرق نہ رکھتے تھے، لیکن ایک رات صبح ہوتے اس نے ایک خواب ایسا دیکھا کہ سوتے سوتے چونک پڑا اور اس طرح آہیں کھینچنے لگا، جیسے چاندنی رات میں مقتول مجرموں کی قبروں سے سنائی دیتی ہیں۔ خواب یہ تھا کہ تائیس کی صورت سامنے آئی ہے اور اپنا زخمی پاؤں اسے دکھاتی ہے۔ پاؤں دیکھ کر بفنوتوس رونے لگتا ہے اور وہ صورت چپکے سے اس کے پاس بستر پر چلی آتی ہے۔ اب بفنوتوس کو مطلق شبہ نہیں رہا کہ تائیس کی یہ خیالی صورت کوئی ناپاک روح ہے۔
دل میں ایک نفرت پیدا ہوئی۔ گندے بچھونے سے اٹھا اور شرم کے مارے چہرے کو ہاتھوں سے چھپا لیا کہ دن کی روشنی کو بھی اپنی صورت نہ دکھائے۔ گھنٹوں اسی حال میں گزر گئے مگر شرمندگی کی تکلیف کسی طرح دور نہ ہوئی۔ جھونپڑی میں کوئی اور نہ تھا۔ ایک عرصہ کے بعد یہ پہلا دن تھا کہ وہ یہاں تن تنہا تھا۔ تائیس کی صورت غائب ہو چکی تھی، لیکن اس کا غائب ہو جانا بھی اس کے لئے ایک غضب تھا۔ ہر وقت اسی خواب کی باتیں یاد آتی تھیں جو آج صبح ہوتے دیکھا تھا۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جو ان کو بھلا دیتی۔ بالکل حواس باختہ ہو کر دل میں کہنے لگا:
"کیوں میں نے اسے پاس سے ہٹا نہ دیا۔ کیوں اس کے سرد بازوؤں اور گرم گھٹنوں سے میں نے اپنے تئیں چھڑا نہ لیا۔"
اس نجس بستر کے قریب اب وہ خدا کا نام بھی نہ لے سکتا تھا۔ خیال آیا کہ جب یہ جھونپڑی اس قدر ناپاک ہو گئی ہے تو پھر شیاطین اس میں ہر وقت داخل ہوا کریں گے۔
اس نجس خواب کے اثر کو دور کرنے اور برے خیالات سے پیچھا چھڑانے کے لئے ارادہ کیا کہ اس جھونپڑی کو چھوڑ کر صحرا میں کہیں بہت دور جا کر کسی مقام کو اپنا مسکن بنائے اور وہاں طرح طرح کی ایذائیں اپنے جسم پر برداشت کرے اور نئے نئے طریقوں سے توبہ و استغفار میں مصروف ہو۔ لیکن اس قصد سے پہلے وہ بڈھے راہب بلمون کے پاس مشورے کے لئے گیا۔
بفنوتوس نے اپنے سفر اور سفر سے واپس آنے پر دن میں طرح طرح کی خیالی صورتیں اور رات میں عجیب عجیب خواب دیکھنے کا حال کہا اور جو نجس خواب حال میں

دیکھا تھا اس کا قصہ سنایا۔

بلمون نے جواب دیا: "عزیز بھائی! میں تو ایک غریب گنہگار ہوں اور مجھ کو لوگوں کا حال بھی اچھی طرح معلوم نہیں' کیونکہ میری عمر تو اسی باغیچہ اور جنگل کے ہرنوں ہرنیوں' خرگوشوں اور کبوتروں میں گزری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری اس تکلیف اور شکایت کا سبب یہ ہے کہ دنیا کے شور و شغب سے نکل کر صحرا کی خاموشی میں آنے کے لئے جو احتیاط ضروری تھی وہ تم نے نہیں کی۔ اس قسم کی فوری تبدیلی سے روحانی صحت میں خلل آ جانا ضروری تھا۔ تمہاری مثال ایک ایسے شخص کی ہے' جو بہت گرم موسم سے یکلخت کسی سرد مقام میں آ جائے۔ تم اپنا حال تو دیکھو۔ کف نے تمہارا جوڑ جوڑ ہلا دیا ہے اور بخار نے تمہیں پھونک رکھا ہے۔ بھائی ٭فنوتوس! اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو شہر کی چہل پہل چھوڑ کر اس خوفناک صحرا میں آنے کے بدلے کہیں ایسے کاموں میں مصروف ہو جاتا' جو حقیقت میں ایک راہب اور پارسا قسیس کے لئے ہمیشہ مناسب ہوتے ہیں' یعنی جو خانقاہ قریب سے قریب ملتی وہاں سکونت اختیار کرتا۔ ان خانقاہوں میں بعض کی نسبت سنتا ہوں کہ وہ بہت ہی اعلیٰ درجے کی ہیں۔ بالخصوص دیر اسرافیوں کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں ۱۴۳۲ حجرے ہیں۔ راہبوں کو وہاں کئی جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ان جماعتوں کی تعداد اتنی رکھی گئی ہے' جتنے یونانی ابجد میں حروف ہیں۔ پھر راہبوں کی ذہنی خصوصیات میں اور ان حروف کی شکلوں میں جو ایک خاص مشابہت ہے اس کا خیال بھی رکھا گیا ہے۔ مثلاً جو راہب حرف زیڈ کی جماعت کے ہیں ان کی طبیعت میں تذبذب اور شک کا مادہ موجود ہے۔ اسی طرح جو لوگ حرف آئی کی جماعت والے ہیں پارسائی میں ان کی طبیعتیں بالکل استوار ہیں۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ان باتوں کو بچشم خود دیکھنے کا مجھے شوق پیدا ہوتا۔ جب تک یہ سب چیزیں نہ دیکھ لیتا دل کو چین نہ آتا۔ نیل کے کنارے جس قدر گروہ راہبوں کے آباد نظر آتے' ان میں جاتا اور ہر ایک کی خصوصیات دریافت کرتا اور پھر ایک کا دوسرے سے مقابلہ کرتا۔ یہ کام ایسا تھا جو ایک راہب کے انجام دینے کے لائق تھا۔ تم نے بھی سنا ہوگا کہ افریم قسیس نے اپنی خانقاہ کے لئے بے مثل قواعد وضع کئے ہیں' تم تو بڑے خوشخط ہو۔ کیا ممکن نہ تھا کہ اس سے اجازت لے کر ان قواعد کی کتابت کرتے۔ میں تو لکھنے کا کام نہیں کر سکتا کیونکہ میرے ہاتھ کدال اور بیلچہ چلانے کے خوگر ہیں اور انگلیوں میں وہ لوچ اور نرمی نہیں کہ نرسل کا قلم چھال کے کاغذ پر چلا سکوں' لیکن اے عزیز! تم تو لکھنے پڑھنے میں خوب مشاق ہو اور اس کے لئے تمہیں خدا کا شکر کرنا چاہیے کیونکہ اچھے خط کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ خوش نویسوں اور کتاب کے مطالعہ کرنے والوں کے شغل تو ایسے ہیں کہ انسان کو ناپاک خیالات سے ہمیشہ محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ بھائی راہب تم ہمارے بزرگان ملت پولوس اور انطونی کے مکالمات کی نقل کیوں نہیں لکھا کرتے؟ اگر یہی کام شروع کر دو تو گوشہ نشینی پھر تم کو اچھی معلوم ہونے لگے اور طبیعت اس قابل ہو جائے کہ اس سفر سے پہلے جو روحانی ریاضتیں کرتے تھے ان کو پھر اختیار کر لو۔"

٭فنوتوس نے بلمون کا شکریہ ادا کر کے اس کی نصیحت پر غور کرنے کا وعدہ کیا اور جب اس بڈھے راہب کے باغیچہ سے باہر آیا' جس کے گرد ہرے ہرے نرسلوں کی باڑھ لگی تھی' تو مڑ کر دیکھنے لگا۔ بلمون بدستور کیاری میں پانی دینے لگا تھا۔ قمری بھی اس کے کندھے پر اسی طرح بیٹھی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کا بے اختیار رونے کو جی چاہا۔

رات کو جب سو گیا تو خواب میں پتھر کا ایک بہت اونچا ستون نظر آیا' جس کی چوٹی پر ایک عورت کا سر بنا ہوا تھا۔ وہاں سے آواز آئی:

"اس ستون پر چڑھ جا۔"

جب آنکھ کھلی تو دل کو یقین دلانے لگا کہ یہ خواب اچھا ہے اور خدا نے اس کی ہدایت کے لئے دکھایا ہے۔ فوراً اپنے مریدوں کو جمع کیا اور ان سے کہا:

"اے میرے نور چشمو! میں تم سے پھر رخصت ہوتا ہوں' تاکہ خدا جہاں لے جائے وہاں جاؤں۔ میری غیر حاضری میں فلے ویان کی بدستور اطاعت کرتے رہنا اور اپنے بے عقل بھائی پال کی بھی خبر رکھنا۔ اب میں تمہارے حق میں دعا کرتا ہوں اور تم سب کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ روانہ ہوا۔ سب مرید منہ کے بل زمین پر پڑے رہے۔ جب اٹھے تو دیکھا کہ دور ریگستان کے

کنارے سفنوتوس کی ہیئت ایک سیاہ بادل کے ٹکڑے کی سی نظر آتی ہے۔

سفنوتوس دن رات چلتے چلتے ایک بڑی عالیشان عمارت کے کھنڈروں میں پہنچا۔ یہ ایک بت خانہ تھا' جسے نہایت قدیم زمانہ کے بت پرستوں نے بنایا تھا۔

تیس بلند ستون اس قدیم عمارت میں ایسے موجود تھے' جن کے تاج یا تو انسان کے سر یا کنول کی قطع کے تھے۔ ان پر پٹاؤ کے تھر اور چھتیں قائم تھیں۔ ستونوں کے اس سلسلے کے اخیر میں ایک ستون سب سے علیحدہ تھا' جس پر پٹاؤ کا پتھر تھا نہ کوئی چھت تھی۔ اس کے تاج کا پتھر ایک عورت کی ہنستی ہوئی شکل کا تھا' جس کی آنکھیں کھوئی اور رخسار پھولے ہوئے تھے اور ماتھے پر گائے کے دو سینگ سے نکلے ہوئے تھے۔

اس ستون کو دیکھتے ہی سمجھا کہ یہی وہ مقام ہے جو خواب میں نظر آیا تھا۔ پورے ستون کی بلندی اندازے سے بتیس ہاتھ معلوم ہوئی۔ پاس ہی ایک گاؤں تھا۔ وہاں گیا اور ایک بڑھئی سے اس سے کچھ زیادہ لمبائی کی سیڑھی بنوائی۔ جب یہ سیڑھی ستون پر لگائی گئی تو اوپر گیا اور ستون پر پہنچ کر خدا کو سجدہ کیا اور کہنے لگا:

"اے خداوند! یہ ہے وہ مقام جس کو تو نے میرا مسکن بنانا پسند فرمایا ہے۔ کیا میں مرتے دم تک تیری رحمت کے سایہ میں یہاں رہ سکوں گا؟"

سفنوتوس نے اپنے ساتھ کھانے پینے کی کوئی چیز نہ لی تھی۔ آس پاس کے گاؤں والوں کی خیر خیرات پر بھروسا کر کے خدا پر توکل کیا تھا۔

ستون کی چوٹی پر جگہ اتنی چوڑی چکلی نہ تھی کہ پورے پاؤں پھیل سکتے' اس لئے گھٹنے سمیٹ کر اور سر کو سینہ کی طرف خم کر کے لیٹا اور سو گیا۔ اس کی یہ نیند جاگنے سے بھی زیادہ خستہ کرنے والی تھی۔ صبح ہوتے ہی جب پرند بسیرا لے کے اٹھے تو سب طرف سے آ آ کر اس کو جھپٹے مارنے لگے۔ سفنوتوس سخت حیرانی اور خوف کی حالت میں بیدار ہوا۔

بڑھئی جس نے سیڑھی بنائی تھی' دل میں خدا کا خوف رکھتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ خدا کے اس نیک بندے کو ستون کے اوپر نہ دھوپ سے کچھ بچاؤ ہے اور نہ مینہ سے۔ کسی دن سوتے میں نیچے آن رہے گا' اس لئے وہ تھوڑے سے تختے لایا اور ان کو ستون کی چوٹی پر جڑ کر چاروں طرف ایک کٹہرا سا بنا دیا اور اوپر ایک سائبان ڈال دیا۔

اب یہ عجیب و غریب واقعہ کہ ایک فقیر ستون کی چوٹی پر آ کر رہا ہے گاؤں گاؤں مشہور ہو گیا اور ہر ساتویں دن قرب و جوار کے کسان اور کاشتکار مع جورو بچوں کے "کھمبے والے فقیر" کی زیارت کو آنے لگے۔ شدہ شدہ سفنوتوس کے مریدوں کو بھی خبر لگی کہ آقا کہاں جا کر رہ رہا ہے اور وہ بھی سب کے سب اس کے پاس چلے آئے اور اجازت لے کر ستون کے نیچے ادھر ادھر اپنے رہنے کے لئے جھونپڑیاں ڈال دیں۔ ہر صبح وہ سب حاضر ہوتے اور حلقہ باندھ کر آقا کے سامنے کھڑے ہوتے اور جو پند و نصیحت وہ کرتا اسے گوش دل سے سنتے۔

ایک دن مریدوں سے کہنے لگا: "اے میرے فرزندو! ان معصوم بچوں کی طرح جیو جنہیں یسوع پیار کیا کرتا تھا۔ اسی میں بخشش ہے۔ جسم کا گناہ تمام گناہوں کی جڑ اور ابتدا ہے۔ اسی سے تمام گناہ پیدا ہوئے ہیں' جیسے باپ سے اولاد پیدا ہوتی ہے۔ غرور' طمع' کاہلی' غصہ' حسد یہ سب اسی ایک گناہ کی ذریات ہیں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے اسکندریہ میں کیا دیکھا۔ جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ دولت مندوں میں عیش و عشرت کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے اور ایک گدلے دریا کی طرح ان کو بہا کر تلخ پانی کے سمندر میں ڈبو رہا ہے۔"

خانقاہوں والے قسیسوں نے یعنی افریم اور اسرافیون نے جب اس نئی قسم کی ریاضت اور اصلاح نفس کی خبر سنی تو انہوں نے اس حالت کو بچشم خود دیکھنا چاہا اور سفنوتوس سے ملاقات کے لئے روانہ ہوئے۔ ایک دن جب سفنوتوس نے دریا پر ان کی کشتیوں کے بادبان دور سے دیکھے تو خیال کیا کہ خدا نے واقعی ان عابدوں کے سامنے ایک مثال پیش کرنے کے لئے مجھے اس ستون کی چوٹی پر بٹھایا ہے۔ جب ان دونوں قسیسوں نے راہب کو ستون پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو وہ اپنے تعجب کو چھپا نہ سکے۔ آپس میں کچھ باتیں کر کے دونوں نے یک زبان ہو کر نفس کشی اور توبہ کے اس غیر معمولی طریقہ پر اعتراض شروع کئے اور سفنوتوس سے کہا کہ اتر آؤ۔

"اس قسم کی زندگی ہمارے دستور کے خلاف بالکل

عجائبات سے ہے۔ رہبانیت کے قواعد میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے۔"

سفنوتوس نے جواب دیا: "رہبانیت کی زندگی عجائبات ہی کی زندگی کا نام ہے اور ایک راہب بھی ایسا ہی عجیب ہوتا ہے، جیسے کہ اس کے کام عجیب ہوتے ہیں۔ خدا کے حکم سے میں اس ستون پر چڑھا ہوں اور خدا کے حکم ہی سے میں نیچے اتر سکتا ہوں۔"

اب ہر روز دور دور کے راہبان حاضر ہو کر سفنوتوس سے ارادت حاصل کرنے لگے اور فقیر کے اس معلق تکیہ کے نیچے ادھر ادھر جھونپڑیاں ڈال کر آباد ہو گئے۔ ان میں بعض نے پیر کی تقلید بھی کرنی چاہی اور اس ویرانے کی کسی اونچی منڈیر یا ٹوٹی دیوار کی ممٹی پر جا بیٹھے۔ لیکن جب ان کے ساتھیوں نے ڈانٹا اور خود بھی تکلیف کو برداشت نہ کر سکے تو نیچے اتر آئے۔

زائرین کے غول کے غول ہر طرف سے آنے شروع ہوئے۔ ان میں بعض بڑی بڑی مسافتیں طے کر کے یہاں پہنچتے تھے۔ بھوک پیاس سب کے ساتھ لگی تھی۔ گاؤں کی ایک مفلس بیوہ کو خیال آیا کہ لوگوں کے لئے پانی اور پھلوں کا کچھ بندوبست کرنا چاہیے، جس میں اسے بھی چار پیسے مل جایا کریں، چنانچہ ستون کے قریب ہی اس نے چار بانس کھڑے کر کے اور ان پر نیلی دھاریوں کا ایک کپڑا تان کر تربوزوں کا ایک ڈھیر لگایا اور ایک طرف کورے کورے مٹکوں میں پانی بھر کر آواز لگانی شروع کی: "پیاسو ادھر آؤ۔" اس بیوہ کو دیکھ کر ایک نان بائی بھی کچھ اینٹیں اور مٹی لے کر وہاں پہنچا اور ایک تنور تیار کر کے روٹیاں پکا پکا کر بھوکوں کے ہاتھ بیچنے لگا۔ زائروں کا تانتا اسی طرح بندھا رہا۔ مصر کے بڑے بڑے شہروں کے لوگ فقیر کی زیارت کو آنے لگے تھے۔ ایک شخص نے روپیہ پیدا کرنے کے خیال سے ایک سرائے بھی وہاں بنوا دی، تاکہ امیر رئیس مع حالی موالی کے جس قدر آئیں ان کو آسائش ہو۔ ان کے اونٹوں اور خچروں کے بندھنے کے لئے بھی معقول انتظام ہو۔ اس طرح بہت جلد فقیر کے کھمبے کے سامنے ایک بڑا بازار جمنے لگا۔ دریا کے کنارے کنارے جتنی بستیاں تھیں، وہاں کے ماہی گیر مچھلیاں اور باغبان ترکاریاں اور میوے بیچنے کے لئے لانے لگے۔ اتفاق سے ایک نائی بھی وہاں پہنچ گیا۔ جہاں کوئی فرمائش کرتا، جھٹ کسبت کھول وہیں مونڈنے بیٹھ جاتا اور ہنسی مذاق کی باتیں سنا کر لوگوں کو ہنساتا اور خوش کرتا۔ غرض وہ پرانا بت خانہ جہاں آدمی کا نام و نشان نہ تھا اور جہاں صدہا برس سے ایک ہو کا عالم رہتا تھا، وہاں اب ہزارہا آدمی موجود ہو گئے۔ طرح طرح کے اور دھندے چلنے لگے۔ ہر طرف بھاگ دوڑ اور چہل پہل رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ شراب بیچنے والے بھی وہاں وارد ہوئے۔ بت خانے کے ٹوٹے ہوئے حجروں کو کچھ ٹھیک ٹھاک کر کے اپنی چیزیں ان میں آراستہ کیں اور ایک تختے پر سفنوتوس کی کچھ الٹی سیدھی تصویر بنا اور اس کے نیچے یونانی اور قبطی زبان میں یہ عبارت لکھ کہ "انار اور انجیر کی شراب یہاں فروخت ہوتی ہے۔" اس تختے کو ایک ستون پر جڑ دیا۔

اس عرصہ میں پیمائش کرنے والے بھی جریب اور جھنڈیاں لئے پہنچے۔ انہوں نے ناپ ناپ کر سڑکوں اور کوچوں کی داغ بیل ڈالی۔ معمار آئے، انہوں نے دیر و کلیسا تعمیر کرنے شروع کئے اور چند مہینوں میں یہ ویرانہ ایک پورا شہر بن گیا۔ سرکار کی طرف سے فوج کا ایک دستہ بھی حفاظت کے لئے تعینات ہوا۔ ایک عدالت اور قید خانہ بھی تیار ہو گیا اور ایک اندھے نے جو پہلے کہیں محرری کرتا تھا، ایک مدرسہ بھی بچوں کے پڑھنے کے لئے کھول دیا۔

زائرین کا اب شمار نہ تھا۔ بڑے بڑے اساقفہ واعیان کلیسا سفنوتوس کے دیدار کے لئے حاضر ہونے لگے اور اس کی تعریف میں اپنی زبانیں خشک کرنے لگے۔

ساتویں مہینے اسکندریہ کی دو امیر زادیاں آئیں جو مدت سے بانجھ تھیں۔ اس امید پر کہ فقیر کی دعا اور جس ستون پر وہ بیٹھا ہے، اس کی برکت سے وہ صاحب اولاد ہو جائیں گی یہ دور و دراز سفر انہوں نے اختیار کیا تھا۔ یہاں آ کر ستون کے پتھر سے انہوں نے اپنے کولہے رگڑے۔ مریضوں کی آمد بڑھتی گئی۔

جب اس فقیر کی کرامات دور دور مشہور ہوئیں تو ایک خاص قسم کے مریض اس کے پاس آنے شروع ہوئے۔ ان کی تعداد ہزاروں سے کم نہ ہوتی تھی۔ ان کے مرض کا یونانی نام "غیبی عارضہ" تھا۔ یہ لوگ جونہی ستون کے قریب پہنچتے تھے تو ان کے اعصاب میں ایک تشنج پیدا ہوتا تھا اور وہ زمین پر گر کر لوٹنے لگتے تھے۔ حرکتیں بالکل

مجنونانہ ہو جاتی تھیں، کبھی زمین پر کروٹیں بدلتے، کبھی ہاتھ پاؤں سمیٹ کر گولا بن جاتے۔ اس کیفیت کا اثر پفنوتوس کے مریدوں پر بھی ہو جاتا تھا اور وہ بھی ان ہی کی سی حرکتیں کرنے لگتے تھے اور حالت یہ ہوتی تھی کہ کیا راہب اور کیا زائر کیا مرد اور کیا عورت جسے دیکھئے ہاتھ پاؤں اینٹھے پڑا ہے۔ منہ میں جھاگ بھرے ہیں اور مٹی اٹھا اٹھا کر کھاتا ہے اور آئندہ کی خبریں جھوم جھوم کر سناتا ہے۔ پفنوتوس جب اپنے ستون کی چوٹی سے یہ حالت دیکھتا تو اس کے بدن پر بھی ایک تھرتھری چھوٹ جاتی اور خدا سے پکار پکار کر کہتا:

"خدایا میں تو یہودیوں کا بکرا ہو گیا' جسے تکفیر کے دن سب کے گناہوں کا کفارہ بنا کر جنگل میں چھوڑا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سب لوگوں کے گناہوں نے میرے قلب کو نجس خیالات سے بھر دیا ہے۔"

جب کبھی کسی مریض کو شفا ہو جاتی اور اس کے عزیز و رشتہ دار خوش خوش اسے اٹھا کر لے جاتے تو تمام مرید زور زور سے نعرے لگاتے اور کہتے: "دیکھو ایک سلوم کا کنواں شفا کا چشمہ یروشلم میں تھا اور دوسرا یہاں جاری ہوا ہے۔"

دن ہفتے مہینے گزر گئے، مگر پفنوتوس ستون کی چوٹی پر جس دن سے جس طرح بیٹھا تھا' اسی طرح بیٹھا رہا۔ برسات آئی' باران رحمت سائبان سے اتنا ٹپکا کہ فقیر تربتر ہو گیا۔ دن کی جلتی دھوپ اور رات کی اوس بھری خنکی سے بدن کی جلد پھٹنے لگی۔ پھنسیاں پھوڑے نکل آئے۔ لیکن تائیس کی خواہش کم نہ ہوتی تھی۔ سینے میں ایک آگ پھکی رہتی تھی۔ اسی درد و تکلیف میں رو رو کر کہنے لگا:

"اے قوت اور طاقت والے خدا! کیا یہ جو کچھ مجھ پر گزر رہا ہے کافی نہیں کہ نفس کی ترغیبیں تیز کر کے ناپاک خیالات اور شیطانی خواہشیں میرے قلب میں اور اضافہ کی جاتی ہیں۔ خداوندا! اگر یہی ہے تو انسان کی جتنی شہوت پرستیاں ہیں' وہ مجھ میں بھر دے تاکہ میں ان کا ایک صدقہ بن جاؤں' باطل پرستوں نے یہ قصہ گھڑ رکھا ہے کہ آرگوس کی کتیا ہیلن نے دنیا کے سب گناہ سمیٹ کر اپنے اوپر لے لئے تھے۔"

ایک رات جبکہ اس راہب کے قدموں کے نیچے سارا شہر بے خبر سوتا تھا ایک آواز اس کے کانوں میں یہ کہتی ہوئی سنائی دی:

"پفنوتوس! اب تم اعمال نیک اور تاثیر کلام میں یکتائے روزگار ہو چکے ہو۔ خدا نے اپنی بزرگی کے لئے تمہیں بلند کیا تھا اور تمہارے انتخاب کی غرض یہ تھی کہ تم معجزے دکھاؤ۔ مریضوں کو چنگا کرو۔ بت پرستوں اور ماہی گیروں کو خدا کے رستے پر لاؤ اور اریوسی بدعتیوں کو ذلیل و خوار کرو اور خداوند کے کلیسا میں امن و امان قائم کرو۔"

پفنوتوس نے جواب دیا: "خدا کا حکم ہر حال میں لائق تعمیل ہے۔"

اسی آواز نے پھر کہا: "اچھا! اب اٹھو اور قیصر قسطنطیوس بے دین سے اس کے محل میں ملاقات کرو۔ اس ملحد نے اپنے بھائی قسطنس کے عقاید سے منحرف ہو کر اریوس اور مرقوس کے مذہب کی حمایت شروع کی ہے۔ جاؤ پیتل کے اونچے دروازے تمہارے پہنچتے ہی تم پر کھل جائیں گے اور شاہی محلوں میں قیصروں کے تخت کے سامنے فرش ذہب پر تمہاری نعلین کی آواز سب کو ہشیار کر دے گی۔"

پفنوتوس نے جواب دیا: "مولا کی جو مرضی ہو۔"

یہ کہتے ہی ارادہ کیا کہ کمر سیدھی کر کے ستون سے نیچے اترے' لیکن ندائے غیب کو بھی یہ ارادہ معلوم ہو گیا اور وہ کہنے لگی:

"سیڑھی سے مت اترو۔ یہ تو ایک معمولی انسان کا کام ہے اور ان نعمتوں کا کفران ہو گا جو تم کو ملی ہیں۔ اے فرشتہ صفت پفنوتوس! اپنی قوت کا بہتر اندازہ کرو۔ جو شخص تمہاری طرح خدا تک پہنچ چکا ہو وہ ایک پرندے کی طرح پرواز کر سکتا ہے۔ بس کود پڑو۔ فرشتے سنبھالنے کے لئے نیچے کھڑے ہیں۔ کودو۔"

پفنوتوس نے کہا: "حکم قضاء زمین و آسمان دونوں پر حاوی ہے۔"

اتنا کہہ' دونوں ہاتھ پھیلا کر جیسے کوئی مرن ہار پرندہ اپنے پرنچے بازو پھیلائے' اوپر سے نیچے کودنے کو تھا کہ بڑے زور سے کسی کے قہقہے کی آواز کان میں آئی۔ بالکل سہم کر کہنے لگا: "کون ہنستا ہے۔"

وہی غیبی آواز پھر بولی: "آہاہاہا۔ ابھی میری دوستی آپ

کے ساتھ کم نہیں ہوئی ہے۔ ایک دن آئے گا کہ آپ کا خلوص بھی میرے ساتھ بہت بڑھ جائے گا۔ اے جناب یہ بندہ ناچیز تھا، جس نے آپ کو ستون پر بٹھایا تھا۔ واقعی جس بے زبانی اور توجہ سے آپ نے میری فرمانبرداری کی، اس کی جس قدر تعریف ہو کم ہے۔ پفنوتوس! ہم آپ کے کاموں سے نہایت مطمئن اور خوش ہوئے۔"

یہ تقریر سن کر راہب بدحواس ہو گیا اور ایسی آواز سے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ خوف نے گلا پکڑ لیا ہے، کہنے لگا: "مردود! میرے سامنے سے ہٹ کر پیچھے کھڑا ہو۔ اب میں نے تجھے پہچانا۔ تو وہی ہے جو یسوع کو ہیکل کے کنگرے پر لے گیا تھا اور "وہاں سے دنیا کی ساری بادشاہتیں ایک پل میں اس کو دکھائی تھیں۔"

اتنا کہہ کر اور بالکل مایوس ہو کر پفنوتوس اسی پتھر پر گرا، جس پر بیٹھا رہتا تھا اور دل میں کہنے لگا:

"ہائے میں نے اس لعین کو پہلے ہی کیوں نہ پہچان لیا۔ میں تو ان اندھوں، بہروں اور مفلوجوں سے بھی بدتر ہو گیا، جو علاج کو میرے پاس آتے تھے۔ افسوس! امور فوق الفطرت کا ادراک مجھ سے زائل ہو گیا۔ اب میں دوزخ کے شور اور جنت کی آوازوں میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اب مجھ میں اتنی پہچان بھی نہیں رہی، جتنی ایک نوزائدہ بچے میں ہوتی ہے کہ دایہ کی گود سے جدا ہوتے ہی رونے لگتا ہے۔ میں اب اس کتے سے بھی زیادہ ناسمجھ ہو گیا ہوں جو اپنے آقا کے نقش قدم دیکھتا ہوا اس تک پہنچ جاتا ہے۔"

ستون کے سہارے جو سیڑھی لگی تھی، فوراً اُسے پکڑ کر نیچے اُترنے لگا۔ پہلا ہی قدم نیچے رکھا تھا کہ اس سنگی چہرے سے آنکھیں دوچار ہو گئیں، جس کے سر پر فقیر بن کر بیٹھا تھا۔ یہ پتھر کا چہرہ اس وقت اسے ہنستا ہوا معلوم ہوا۔ اب پفنوتوس کی سمجھ میں آیا کہ جس مقام کو اس نے اپنی روحانی آسائش اور بزرگی کے لئے تجویز کیا تھا، درحقیقت وہی ایک شیطانی آلہ اس کی تکلیف والم کا تھا۔ جلد سیڑھی سے اترتا زمین پر پہنچا۔ چلنے کی عادت نہ رہی تھی۔ ٹانگیں کانپنے لگیں، لیکن اس خبیث ستون کا سایہ اپنے اوپر دیکھ کر جس طرح بن پڑا، وہاں سے بھاگا۔ سب سو رہے تھے۔ بڑے چوک سے گزرا، جس کے چاروں طرف مکان اور سرائیں بنی تھیں اور ایک گلی سے بھاگتا ہوا اس رستے پر ہو لیا، جو لیبیہ کی پہاڑیوں کو جاتا تھا۔ ایک کتا بھونکتا ہوا پیچھے دوڑتا رہا، لیکن جب ریگستان کے کنارے پہنچا تو رک گیا، اب پفنوتوس کو ایسی زمین پر چلنا پڑا، جہاں کوئی سڑک تھی نہ پگ ڈنڈی۔ فقط درندوں کے پنجوں کے نشانوں سے کہیں کہیں ایک لکیر سی دکھائی دیتی تھی۔ ایک جگہ کچھ جھونپڑیاں ملیں، جن میں جھوٹے سکے بنانے والے رہا کرتے تھے۔ ان سے بچتا ہوا ساری رات اور پورا ایک دن چلنے میں گزارا۔

آخرکار بھوک پیاس اور تھکن سے مجبور ہو کر اور اس بات سے لاعلم رہ کر کہ خدا ابھی بہت دور ہے، چلتے چلتے ایک جگہ ٹھہرا۔ یہ ایک ویران اور سنسان شہر تھا جس کی شکستہ عمارات دائیں بائیں حد نظر تک پھیلی تھیں۔ مکانات بہت بہت فصل سے ایک ہی وضع کے بنے تھے۔ ان کی دیواریں سلامی دار تھیں اور مجموعی قطع ایسی تھی، جیسے مصری اہرام کے اوپر کے حصے تراش کر علیحدہ علیحدہ کر دیئے جائیں اور صرف نیچے کے حصے رہنے دیئے جائیں۔ یہ تمام عمارتیں دراصل شاہان سلف کے مقبرے تھے۔ دیواروں کے کواڑ کبھی کے فنا ہو چکے تھے۔ اندر بھیڑیوں اور چرغوں کی مادائیں دیدے چمکا چمکا کر اپنے بچوں کو دودھ پلاتی تھیں۔ دہلیز پر آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ یہ مسافر تھے، جن کو قزاقوں نے جان سے مارا تھا اور ان کا گوشت درندے اکثر جگہ سے کھا چکے تھے۔ اس شہر خموشاں سے نکل کر پفنوتوس باہر آیا اور ایک چشمے کے قریب جس کے گرد کھجوروں کے جھنڈ تھے، ایک مقبرے کے سامنے تھک کر زمین پر گر پڑا۔ اس مقبرے کے اندر بہت سے نقش و نگار بنے تھے، دروازوں پر کواڑ یہاں بھی نہ تھے اور اندر فرش پر بہت سے سانپ کنڈلیاں مارے بیٹھے تھے۔

پفنوتوس اس مقام کو دیکھ کر کہنے لگا: "بس یہی میرا پسندیدہ مسکن ہے اور یہی میری توبہ اور ندامت کا خیمہ ہے۔" یہ کہتا ہوا مقبرے کے اندر گیا۔ سانپوں کو اپنے پاؤں سے ہٹا دیا اور اٹھارہ گھنٹے تک فرش کے پتھروں پر سجدے میں پڑا رہا۔ جب یہ گھنٹے گزر لئے تو چشمے پر گیا اور اوک سے پانی پیا۔ پھر کچھ جنگلی پھلیاں اور کھجوریں زمین پر سے اٹھا کر کھائیں اور اسی طرح زندگی بسر کرنے کو اپنے حق میں بہتر جان کر اسے اپنا قاعدہ بنا لیا۔ صبح سے شام تک سجدے میں پڑا پتھر سے پیشانی نہ اٹھاتا تھا۔

پفنوتوس کو اپنے چہار طرف سوائے تکلیف اور پریشانی کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا اور جب سے خدا نے اپنا سایہ اس کے سر سے ہٹالیا تھا' وہ کسی بات کو سوچنے یا کسی چیز کو دیکھنے سے بھی ڈرنے لگا۔

ایک دن حسب معمول سجدے میں پڑا تھا کہ ایک اجنبی آواز یہ کہتی سنائی دی:

"پفنوتوس! دنیا میں اس قدر متعدد قسم کے انسان آباد ہیں' جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے' اگر میں ان کی صورتیں تمہیں دکھادوں تو خوف سے تمہاری جان نکل جائے۔ بعض انسان ایسے ہیں' جو صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں اور یہ آنکھ ان کے ماتھے پر ہوتی ہے۔ بعض انسان ایک ٹانگ کے ہوتے ہیں اور اچھل اچھل کر چلتے ہیں۔ بعض انسان ایسے ہیں' جن میں مرد عورت اور عورت مرد بن جاتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو آدھے انسان ہیں اور آدھے درخت اور ان کی جڑیں زمین میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بعض آدمی بے سر کے ہوتے ہیں اور دونوں آنکھیں ناک اور منہ ان کے سینہ پر ہوتے ہیں۔ پس کیا تم حقیقت میں اس بات پر ایمان رکھتے ہو کہ تمام لوگوں کی نجات کے لئے یسوع مسیح نے اپنی جان دی تھی۔"

ایک اور موقعے پر اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک بڑا وسیع میدان ہے' دھوپ کھلی ہے اور ایک طرف ایک چوڑی سڑک اونچی ہوتی ہوئی ایک پل کی طرف گئی ہے۔ جابجا باغ لگے ہیں اور چشمے بہ رہے ہیں۔ سڑک پر ارسطوبلس اور کاراس سرپائی گھوڑوں پر سوار ان کو سرپٹ دوڑا رہے ہیں۔ چہروں پر شہسواروں کا سایہ اور جوش و خروش ہے۔ ایک سنگی برآمدے میں تلقراطیس کھڑا اپنے اشعار پڑھتا ہے اور اس کی آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنے کلام پر بہت اطمینان و فخر ہے۔ ایک باغ میں زینو تمیس سونے کے سیب درخت کے نیچے سے اٹھا رہا ہے اور ایک زمردی پروں والا سانپ اس کے قریب اپنی کنڈلی پر قد آدم کھڑا ہے اور زینو تمیس اس کو چمکارتا اور پیار کرتا ہے۔ ایک طرف ہرمودس کاہنوں کی کلاہ زریں سر پر رکھے' پرسی کے ایک درخت کے نیچے مراقبے میں ہے۔ اس درخت میں پھولوں کی جگہ آدمیوں کے سر لگے ہیں' جن کے چہرے خوبصورت ہیں اور مصر کی دیویوں کے سے تاج ان کے سر پر ہیں۔ شاخوں پر شکرے اور گدھ بیٹھے ہیں اور پتوں کے جھرمٹ میں سے قرص ماہ تاب نظر آتا ہے اور سب سے علیحدہ ایک حوض کے کنارے کرہ افلاک سامنے رکھے نیکیاس گردش کواکب پر غور کرتا ہے۔

اتنا ہی خواب دیکھا تھا کہ معلوم ہوا کوئی عورت منہ پر نقاب ڈالے ہاتھ میں پھولوں کی ایک شاخ لئے قریب آئی ہے اور کہتی ہے:

"دیکھو! بعض لوگ حسن لازوال تلاش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس حیات چند روزہ میں کسی طرح ہمیشگی پیدا کرلیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں جو اس زندگی میں کسی بات کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ ان کی فطرت نیک جو راہ بتاتی ہے' اسی پر چلتے ہیں' خوش رہتے ہیں اور خوبصورت ہو جاتے ہیں۔ ان کا زندہ رہنا ہی اس امر کی شہادت ہے کہ وہ خالق دوجہان کی صنعت بے مثال پر اس کی شان و بزرگی کے ہر وقت مداح ہیں' کیونکہ انسان درحقیقت اپنے پروردگار کی حمد وثناء کی ایک زندہ نظم ہے۔ یہ لوگ مسرت کو گناہ اور خوش رہنے کو حرام نہیں جانتے۔ پفنوتوس! غور کرو اگر اخیر میں یہ لوگ صحیح نکلے تو تم کیسے نادان اور بیوقوف ثابت ہو گے۔" یہاں یہ خواب ختم ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پفنوتوس پر اس کی روح اور جسم نے مسلسل آزمائشوں سے بڑے ظلم برپا کر رکھے تھے۔ کسی دم اسے چین نصیب نہ تھا۔ جس مقبرے میں اب آ کر رہا تھا' وہاں خبیث روحوں کا گزر اس کثرت سے ہو گیا تھا کہ ایک بڑے شہر کے آباد سے آباد رہگزر پر بھی چلنے والوں کا اتنا ہجوم نہیں ہوتا۔ بھوت پریت ہر وقت اس پر قہقہے لگاتے تھے۔ ہزارہا حشرات الارض زمین پر انسان کی طرح کاروبار کرتے ہوئے دکھائی دیا کرتے تھے۔ شام کو جب چشمے پر جاتا تھا تو شیطان کی زیارت اس کے گرد حلقہ باندھ کر ناچنے لگتی تھیں اور اس کو کھینچ کر اپنے رقص میں شامل کرنا چاہتی تھیں۔ خبیث روحوں کو اب اس راہب کا مطلق خوف نہ رہا تھا' نامعقول حرکتیں کر کے اس سے مذاق کرتی تھیں اور کبھی کبھی دوچار دھپ بھی لگا دیتی تھیں۔ ایک دن ایک ہاتھ بھر کا عفریت آیا اور رسی کا ایک ٹکڑا جس کو پفنوتوس اپنی کمر سے باندھا کرتا تھا' چرا

کے لے گیا۔ پفنوتوس دل میں کہنے لگا:

"اے خیال اور واہمہ کی صورتو! تم مجھے کہاں تک پہنچاؤ گی؟"

جب پریشان خیالی نے بری نوبت کو پہنچایا تو ارادہ کیا کہ اب ہاتھوں سے کچھ کام لینا چاہیے تاکہ جس راحت کی ضرورت ہے وہ میسر ہو۔ چشمے کے قریب کھجوروں کے نیچے کیلوں کے درخت تھے۔ ان کے تنے کاٹ کر مقبرے میں لے آیا اور پتھر سے کوٹ کر ان کے ریشے اس طرح نکالنے شروع کئے جیسے رسیاں بنانے والے نکالا کرتے ہیں۔

ریشوں کو کبھی دھوپ میں اور کبھی اوس میں رکھتا تھا اور صبح ہونے سے پہلے ان کو مقبرے میں لے آتا تھا کہ زیادہ نمی سے سڑ نہ جائیں۔ اس کام میں مصروفیت کا یہ اثر ہوا کہ طبیعت میں ایک طرح کی سادگی اور آسودگی پیدا ہو چلی۔ جب کمر سے باندھنے کی رسی تیار کرلی تو پھر درختوں کی ٹہنیاں جمع کر کے ان کی ٹوکریاں اور بوریے بنانے لگا اور چند روز میں یہ پرانا مقبرہ ایک بوریے بان کی دکان معلوم ہونے لگا۔ اب پفنوتوس کام چھوڑ کر آسانی سے عبادت میں مصروف ہو جاتا تھا۔ لیکن خدا اس پر مہربان نہ تھا کیونکہ ایک رات ایک آواز اس نے سنی، جس کو سنتے ہی وہ سرد ہو گیا اور سمجھ گیا کہ یہ آواز اسی مردے کی ہے جس کا یہ مقبرہ ہے۔

یہ آواز اس قسم کی تھی، جیسے دبی آواز میں کوئی جلدی سے کسی کو بلاتا ہو۔

"ہیلن! ہیلن! جلدی آ۔ میرے ساتھ نہانے چل، جلدی کر۔"

فوراً ایک عورت نے جس کا منہ پفنوتوس کو اپنے کان کے بالکل قریب معلوم ہوا جواب دیا:

"میں اٹھ نہیں سکتی۔ ایک آدمی نے مجھے اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔"

دفعتاً پفنوتوس کو معلوم ہوا کہ اس کا سر ایک عورت کے سینے پر رکھا ہے۔ اس عورت نے پفنوتوس کا سر ہٹا کر اٹھنا چاہا مگر پفنوتوس اس نازنین کو جس کا جسم ایک معطر پھول معلوم ہوتا تھا، لپٹ گیا اور ہوائے نفس سے بے تاب ہو کر کہنے لگا:

"خدا کے لئے نہ ہٹ۔" لیکن وہ عورت کود کر دروازے پر پہنچی اور وہاں کھڑی ہو کر ہنسنے لگی۔ اس کے ہنستے ہوئے چہرے پر چاند کی روشنی پڑتی تھی اور اسی حالت میں کہتی تھی کہ "ہٹوں گی نہیں تو کیا کروں گی، جس قدر شوق اور ولولہ تم میں ہے، وہ ہی اس مردے میں ہے، جسے آپ ایک عکس بے بود کا عکس فرما چکے ہیں۔ اس کے علاوہ جو گناہ آپ سے ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔"

پفنوتوس رات بھر روتا رہا اور صبح ہوتے ہی اس نے ایسے عجز سے دعا مانگی جو شکوے سے بھی زیادہ شیریں تھی۔

"یسوع! میرے یسوع، تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ میرے خطرے کو تو دیکھتا ہے۔ بس میری مدد کو آ۔ تیرے باپ کا فضل و کرم اب مجھ پر نہیں رہا۔ اب میری فریاد وہ نہیں سنتا، اس لئے اب سوائے تیرے میرا کوئی نہیں، خدا کو میرے حق میں کوئی بات منظور ہو، اب یہ ممکن نہیں اور نہ اس کی یہ بے اعتنائی میری سمجھ میں آتی ہے اور نہ اس کو میرے حال پر رحم آتا ہے، لیکن اے یسوع! تو عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہے، اس لئے تیری ذات سے مجھے بہت کچھ امید ہے۔"

یہ دعا ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک زور کا قہقہہ سنائی دیا اور ہنسنے کی یہ آواز وہی تھی، جو پہلے ایک مرتبہ ستون کی چوٹی سے سنی تھی۔ اب یہ آواز نہایت حقارت سے کہتی تھی:

"واہ، واہ! یہ دعا تو ایسی تھی جو مرقوس بدعتی کو مانگنی زیبا تھی۔ اچھا اب معلوم ہوا کہ پفنوتوس بھی ایریوسی ہے۔ پفنوتوس ایریوسی!"

یہ سخت توہین کا فقرہ سنتے ہی راہب بالکل بے جان ہو کر زمین پر اس طرح گرا جیسے بجلی نے مارا ہو۔ جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ بہت سے راہب سیاہ لباس پہنے اس پر جھکے ہوئے منہ پر پانی کے چھینٹے دیتے ہیں اور دعائیں پڑھ کر اس پر دم کرتے ہیں۔ سب کے ہاتھوں میں کھجور کے لمبے لمبے پتے ہیں۔

ان میں سے ایک نے کہا: "جب ہم اس صحرا سے گزرے تو اس مقبرے سے رونے کی آواز آئی۔ جب ہم اندر گئے تو دیکھا کہ آپ پتھروں پر بے ہوش پڑے ہیں۔ یہ دیکھ کر ہم کو مطلق شبہ نہ رہا کہ یہ کام شیطان کا ہے۔

اس نے آپ کو زمین پر پٹک دیا تھا اور ہمارے پہنچتے ہی وہ بھاگ گیا۔"

پفنوتوس نے سر اٹھا کر بہت نحیف آواز سے پوچھا:

"بھائیو! تم کون ہو؟ یہ کھجور کی شاخیں تمہارے ہاتھ میں کیسی ہیں، کیا مجھے دفن کرنے آئے ہو؟"

راہبوں نے جواب دیا:

"برادر! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہمارے قسیس اعظم انطونی کو جس کا سن اب ۱۰۵ برس کا ہو گیا ہے، بشارت ہوئی ہے کہ خدا سے اس کا وصال اب قریب ہے۔ اس لئے وہ کلزین کے پہاڑ سے جہاں اس نے گوشہ نشینی اختیار کی ہے اتر کر آنے والا ہے تاکہ اپنی روحانی اولاد کو جس کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے برکت دے۔ چونکہ اس روحانی باپ کا یہ دیدار ہمارے لئے آخری ہے، اس لئے کھجور کے پتے ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ لیکن اے راہب بزرگ یہ کیا بات ہے کہ اتنے بڑے واقعے کی آپ کو مطلق خبر نہیں۔ کیا کوئی فرشتہ اس مقبرے میں آپ کو اطلاع دینے نہیں آیا؟"

پفنوتوس نے جواب دیا: "افسوس صد افسوس۔ میں اب اتنے لطف و کرم کے لائق نہیں رہا۔ اس مقبرے میں کوئی فرشتہ کیوں آنے لگا! یہاں تو سوائے شیطان اور منحوس چمگادڑوں کے اور کوئی نہیں بستا۔ بھائیو! میرے حق میں دعائے خیر کرو۔ میں انصینو کا قسیس پفنوتوس ہوں اور بندگان خدا میں سب سے زیادہ مظلوم ہوں۔"

پفنوتوس کا نام سنتے ہی سب نے کھجور کی شاخیں جو ہاتھوں میں لئے تھے بلند کیں اور دبے لہجے میں تعریفیں کرنے لگے اور جس راہب نے اب تک باتیں کی تھیں وہ کہنے لگا:

"کیا آپ وہی پفنوتوس ہیں، جن کے کار خیر دنیا میں مشہور ہیں اور جن کی نسبت لوگوں کا خیال ہے کہ وہ عظمت و بزرگی میں ہمارے ہادی محترم انطونی کے ہم پلہ ہو جائیں گے۔ اے راہب پاک نہاد! کیا آپ ہی وہ فرشتہ خصال ہیں، جنہوں نے اسکندریہ کی ایک مشہور طوائف کو ضلالت کی تاریکی سے نکالا تھا اور اس کے بعد جب ایک بلند ستون کو اپنی فقیری کا تکیہ بنایا تو ایک رات فرشتے آپ کو وہاں سے اٹھا کر لے گئے اور جو لوگ اس ستون کے نیچے پاسبانی کرتے تھے، انہوں نے یہ حالات بچشم خود دیکھے تھے۔ سپید بادلوں کی طرح فرشتوں کے پروں کا سایہ آپ پر تھا اور اپنے دست راست سے آپ غریبوں اور مسکینوں کو برکت دیتے تھے۔ دوسرے دن جب آپ ستون پر نظر نہ آئے تو ہر طرف ایک کہرام مچ گیا۔ مگر آپ کے مرید خاص فلے دیان نے لوگوں کو فوراً آگاہ کیا کہ آپ کو فرشتے اٹھا کر لے گئے اور آپ کے مریدوں کی نگرانی اب اس کے سپرد ہے، لیکن آپ کے ارادت مندوں میں ایک شخص نے جو بے عقل و مجذوب سا معلوم ہوتا ہے اور جس کا نام پال ہے، فلے دیان کے بیان سے اختلاف کیا کہ فرشتے نہیں، بلکہ شیطان آپ کو ستون کی چوٹی پر سے اٹھا لے گیا ہے۔ یہ سن کر لوگ اس قدر برہم ہوئے کہ پال کو سنگسار کرنے کا قصد کر لیا اور مجھے اب تک تعجب ہے کہ اس کی جان کیوں کر بچ گئی۔ یہ میرے ساتھی جو اس وقت آپ کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہیں، ان کا میں قسیس ہوں اور میرا نام زوسیموس ہے۔ ان ہی کی طرح میں بھی آپ کو تعظیم دیتا ہوں تاکہ آپ میرے اور میرے ہمراہیوں کے حق مین دعا کریں۔ اس کے بعد وہ کرامات ارشاد ہوں جو خدا نے اپنی مخلوق پر آپ کے ذریعہ سے ظاہر فرمائی ہیں۔"

پفنوتوس نے جواب دیا: "آپ اس خیال میں ہیں کہ خدا مجھ پر مہربان ہے، مگر یہ صحیح نہیں۔ خدا تو مجھ میں نفس کی نہایت سخت تحریکیں پیدا کر کے میری آزمائش کر رہا ہے۔ مجھے فرشتے اٹھا کر نہیں لے گئے تھے۔ میں اپنے قدموں اتر کر وہاں سے بھاگا تھا۔ ایک سیاہ دیوار تھی جو میری آنکھوں کے سامنے میرے آگے آگے چل رہی تھی۔ ایک خواب کی سی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ سچ یہ ہے کہ جب خدا پاس نہ رہا ہو تو پھر یہ زندگی ایک خواب مہیب و پریشاں سے بھی بدتر ہے۔ جس زمانہ میں اسکندریہ میں تھا، تو وہاں ایک ضیافت میں موجود رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں تھوڑے سے وقت میں بہت سے لوگوں کی تقریریں سننے میں آئیں۔ اس وقت معلوم ہوا کہ خیالات باطل اور اوہام کا ایک لشکر جرار دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک پھیلا پڑا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس لشکر نے پوری قوت سے مجھ پر حملہ کیا اور ایسا حملہ کیا کہ اب تک وہ اپنی تلواریں علم کئے میرے سر پر کھڑا ہے۔"

ہفنوتوس نے اب مصمم ارادہ کر لیا کہ ان راہبوں کے ساتھ ہو کر وہ خود بھی انطونی کے دیدار سے مشرف ہو کر اس سے برکت حاصل کرے' چنانچہ وہ کہنے لگا: "برادر زوسیموس! مجھے بھی کھجور کی شاخ دیجئے کہ آپ کے ساتھ چل کر میں بھی انطونی کی آخری زیارت حاصل کروں۔"

زوسیموس بولا: "نہایت مناسب ہے! یہ آپ کو معلوم ہے کہ راہبان خدا کی ایک فوج ہیں اور فوج ہی کی سی ترتیب میں نقل و حرکت کرنی ان کے لئے مناسب ہے۔ میں اور آپ دونوں قسیس کا درجہ رکھتے ہیں' اس لئے ہم دونوں آگے آگے رہیں اور باقی راہبان خدا کی تعریفیں گاتے پیچھے پیچھے چلیں۔"

غرض فوجی ترتیب سے راہبوں کا کوچ شروع ہوا۔

جب زوسیموس اور ہفنوتوس چلتے چلتے اس مقام پر پہنچے جہاں صحرا کے تمام راہبان زہاد و عباد انطونی سے رخصت ہونے کے لئے جمع ہو رہے تھے تو ایک عجب کیفیت ان کو نظر آئی۔ دیکھا کہ راہبوں کی ایک بے شمار فوج تین صفوں میں آراستہ ہے اور یہ صفیں ایک نہایت وسیع نصف دائرہ کی شکل رکھتی ہیں۔ سب سے آگے کی ردیف میں نہایت سن رسیدہ مسیحی درویش ہیں۔ ان میں ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک صلیب ہے اور ان کی داڑھیاں لٹک کر زمین تک پہنچی ہیں۔ راہبان جن کے افسر افریم اور اسرافیون تھے اور دریائے نیل کے مشہور عابدوں اور زاہدوں کے گروہ دوسری صف میں تھے۔ آخری صف میں وہ تارک الدنیا عیسائی تھے' جو یہاں سے بہت دور کے پہاڑوں میں رہتے تھے۔ ان میں کوئی اپنے لاغر جسم پر کپڑوں کی جگہ محض چیتھڑے لگائے تھا۔ کسی نے ستر پوشی کے لئے محض درختوں کے پتے چھال کے ریشوں سے باندھ رکھے تھے۔ بہت سے بالکل برہنہ تھے مگر خدا کے حکم سے ان کے بدن پر اس قدر بال پیدا ہو گئے تھے جیسے بھیڑ کے بدن پر اون ہوتی ہے۔ ان سب کے ہاتھوں میں کھجوروں کی شاخیں تھیں۔ اس وقت ان راہبوں کو دیکھ کر یا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ آسمان پر سبز دھنک نکلی ہے یا اس سے تشبیہ دی جا سکتی تھی کہ وہ ایک مقبول و منتخب طائفہ خدا کی تعریفیں گانے والوں کا ہے یا یہ کہ ان کی صفیں خدا کے شہر کی زندہ دیواریں اور فصیلیں ہیں۔

اس مجمعے کی ترتیب ایسی مکمل تھی کہ ہفنوتوس کو اپنے مریدوں کو تلاش کرنے میں کچھ دقت نہیں ہوئی۔ سب کے سب ایک ہی جگہ نظر آ گئے اور یہ ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔ لیکن اپنا چہرہ چادر سے ڈھانک لیا کہ کوئی پہچانے نہیں اور انطونی کے انتظار میں جو نیاز مندانہ کیفیت اس وقت طاری ہے' اس میں کسی طرح کا ہرج نہ ہو۔ اتنے میں یک لخت سب کے منہ سے ایک نعرہ بلند ہوا:

"ولی' ولی! وہ ہے ہمارا ولی۔ ہمارا باپ انطونی جس پر شیطان کبھی غالب نہ آ سکا' وہ خدا کا بہت پیارا ہے۔"

اس کے بعد ہر طرف خاموشی ہو گئی اور کوئی پیشانی نہ تھی جو زمین پر نہ رکھی ہو۔

صحرائے لق و دق میں ایک پہاڑ کی چوٹی سے انطونی نیچے اترتا نظر آیا۔ اس کے مشہور تلامذہ مکاروس اور اماشوس دونوں استاد کے ایک ایک ہاتھ کو سہارا دئے ہوئے تھے۔ چال بہت آہستہ تھی مگر قدم خم نہ تھا۔ صورت سے اب بھی کسی زمانہ میں غیر معمولی طاقت رکھنے کے آثار ظاہر تھے۔ سپید بگلاسی داڑھی تمام سینہ پر بکھری ہوئی تھی۔ پیشانی اور سر آفتاب کی طرح چمک رہا تھا۔ نظر میں تیزی عقاب کی سی تھی اور لبوں پر معصوم بچوں کی سی مسکراہٹ۔ انطونی شاگردوں کے سہارے تن کر کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا لئے' جو سو برس کی ریاضت جفاکشی سے اب ناتواں ہو گئے تھے اور پھر زبان سے خلوص و محبت کے یہ جملے ادا کئے:

"یعقوب کیسے خوبصورت ہیں تیرے شامیانے' اور اسرائیل کیسے دلکش ہیں تیرے خیمے۔"

ان جملوں کو سنتے ہی تمام مجمع نے ایک مناجات بڑے موثر لہجے میں گانی شروع کر دی۔

دونوں شاگردوں کا سہارا لئے انطونی پہلے صحرا کے پیرانہ سال درویشوں میں سے اور پھر عابدوں اور زاہدوں کی صفوں میں سے گزرا۔ اس وقت وہ نہایت محبت اور دلی خلوص سے اپنے ہر مرید سے دو دو باتیں کر کے ہمیشہ کے لئے رخصت چاہتا تھا' کیونکہ اس کی مبارک موت جس کا خدا نے آخر کار وعدہ فرما لیا تھا' عنقریب پیش آنے والی تھی۔

افریم اور اسرافیون سے اس نے کہا:
"تمہارے زیر فرمان مسیحی راہبوں کی بے شمار فوجیں ہیں۔ تم خدا کے اس لشکر کے بڑے سالار اور امیر ہو۔ پس آسمان پر پہنچ کر سونے کی زرہ تم زیب تن کرو گے اور ملائکہ سے میکائیل تم کو اپنے لشکر کی سپہ سالاری کا خطاب دے گا۔"

بڈھے راہب بلمون کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور اس کی پیشانی کا بوسہ لے کر کہا:
"دیکھو میرے بچوں میں سب سے زیادہ اچھا اور پیارا بچہ یہ ہے۔ اس کی روح میں ایک تازگی ہے اور اس میں سے ان ہری ہری ترکاریوں اور پھولوں کی خوشبو آتی ہے جو وہ اپنی پیاری کیاری میں بویا کرتا ہے۔"

زوسیمس سے اس نے کہا:
"تم بھی خدا کی رحمت سے ناامید نہیں ہوئے' اس لئے خدا نے تم پر ہمیشہ اپنا فضل و کرم رکھا اور تمہارے گناہوں کی کوڑی پر تمہاری نیکیوں کا درخت لگا دیا' جس میں اب پھول کھل رہے ہیں۔"

ہر شخص سے جو مختصر سا جملہ کہہ دیتا تھا' وہ عقل و دانش کا ایک در بے بہا ہوتا تھا۔

بڈھے درویشوں سے کہا:
"اور پھر خدا کے نبی نے دیکھا کہ خدا کے تخت کے گرد چوبیس بڈھے بیٹھے ہیں' جن کے پیراہن سپید ہیں اور ان کے سروں پر تاج رکھے ہیں۔"

نوجوانوں سے کہا:
"خوش رہو۔ رنج و یاس ان کے لئے چھوڑ دو جو دنیا پر ناز کرتے ہیں۔"

اسی طرح پند و نصیحت کے موتی بکھیرتا وہ اپنی روحانی اولاد کی صفوں میں سے گزرنے لگا۔ پفنوتوس نے جب اس کو اپنے قریب آتے دیکھا تو زمین پر گھٹنے ٹیک کر کھڑا ہوا۔ اس وقت اس کا دل خوف اور امید سے عجب عالم اضطراب میں تھا۔ جب انطونی بالکل ہی قریب آ گیا تو پفنوتوس نہایت ہی عاجزی سے کہنے لگا: "یا ابی' یا ابی! میری مدد کیجئے۔ میں ہلاک ہوا جاتا ہوں۔ تائیس کو گمراہی سے نکال کر خدا کی حضور میں پیش کیا۔ ستون پر فقیر بن کر بیٹھا۔ پھر مقبرے میں جا کر رہا۔ پیشانی زمین پر اتنی رگڑی کہ اس کی جلد مردہ ہو گئی۔ لیکن خدا مجھ میں نہ رہا۔ اے

باپ برکت دیجئے کہ میری نجات ہو۔ زوفے کی جھاڑی کو ہلا دیجئے کہ میرے گناہ دور ہوں اور میں پاک ہو کر مثل برف کے چمکنے لگوں۔"

انطونی نے کچھ جواب نہ دیا اور انصینو کے راہبوں کو ایسی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا' جس کی تاب کسی کو نہ تھی۔ آخر کار اس کی نظر پال پر پڑی جو ایک بے عقل مجذوب تھا۔ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا' پھر اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا۔ ہر شخص کو حیرت تھی کہ اتنا بڑا ولی ایک ایسے شخص کی طرف متوجہ ہوا ہے' جو عقل و ہوش کچھ نہیں رکھتا' مگر انطونی نے ان لوگوں سے کہا:
"خدا نے اس آدمی کو وہ برکت دی ہے کہ تم میں سے کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ اے میرے فرزند پال اپنی آنکھیں اونچی کر اور بتا کہ تو آسمان پر کیا دیکھتا ہے؟"

پال نے نظر اونچی کی۔ اس کے چہرے پر ایک روشنی پیدا ہوئی اور اس کی زبان اس طرح کھلی:
"میں دیکھتا ہوں کہ عرش پر ایک سیج بچھائی گئی ہے۔ تین کنواری لڑکیاں اس کے گرد پاسبانی کرتی ہیں تاکہ ان روحوں کے سوا جو خدا نے منتخب کی ہیں' کوئی روح اس سیج کے قریب نہ آئے کیونکہ ان ہی منتخب روحوں میں سے کسی کے لئے یہ سامان آراستہ کیا گیا ہے۔"

پفنوتوس اتنی بات سن کر سمجھا کہ اسی کی بزرگی کے لئے یہ سیج آسمان پر سجائی گئی ہے۔ بہت خوش ہو کر بہ آواز بلند خدا کا شکر کرنے پر آمادہ ہوا' لیکن انطونی نے اشارے سے کہا خاموش رہو۔ پال جو کچھ کہتا ہے اس کو سنو۔ پال نے اسی حالت جذب میں کہنا شروع کیا:
"تینوں کنواریاں کہتی ہیں کہ اس دنیا سے خدا کی ایک پیاری روح رخصت ہونے والی ہے۔ اسکندریہ کی تائیس مرنے کو ہے۔ ہم نے اس کے جلال کے لئے یہ سیج بچھائی ہے' کیونکہ ہم اس کی نیکیاں ہیں۔ یعنی ایمان' خوف اور خلوص۔"

انطونی نے پوچھا:
"اے پیارے فرزند اور بھی کچھ نظر آتا ہے؟"

پال نے آسمان پر سمت الراس سے سمت القدم تک اور مغرب سے مشرق تک نگاہ دوڑائی' ناگہاں انصینو کے قسیس پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ پال کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور اسی حالت میں کہنے لگا:

"میں دیکھتا ہوں کہ اس آدمی کو تین عفریت نہایت خوش ہو کر گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں ایک اونچا مینار ہے۔ دوسری عورت ہے۔ تیسرا ایک جادوگر ہے۔ ہر ایک کے جسم پر گرم سلاخوں سے اس کا نام داغ دیا گیا ہے۔ پہلے کا نام اس کی پیشانی پر۔ دوسرے کا نام اس کے شکم پر اور تیسرے کا نام اس کے سینہ پر لکھا ہے اور یہ نام تکبر' عیش اور شک ہیں۔ بس جو کچھ مجھے دیکھنا تھا وہ دیکھ چکا۔"

یہ کہہ کر پال گردن ٹیڑھی کر کے پریشان نظری کے ساتھ پھر اپنی بے عقلی کی حالت میں آ گیا۔

انصینو کے راہب نہایت سراسیمہ ہو کر انطونی کی صورت دیکھنے لگے۔ انطونی نے کہا: "خدا نے اپنے عدل و انصاف سے سب کو آگاہ کر دیا۔ بس اب خدا کی تعریف کرو اور کچھ منہ سے نہ نکالو۔"

اب انطونی سب کے حق میں دعا کرتا ہوا پہاڑ کی طرف واپس چلا۔ آفتاب نے افق مغرب کے قریب پہنچ کر رنگ شفق سے تمام عالم کو لالہ زار کر دیا اور آسمان کے نور نے انطونی کا سایہ زمین پر ڈال کر اس کو اتنا دراز کیا کہ ریگ بیابان پر ایک سیاہ غالیچہ تاحد نظر بچھا ہوا معلوم ہوتا تھا اور یہ علامت تھی کہ اتنی ہی مدت دراز تک خدا کے اس ولی کی یاد لوگوں کے دلوں میں زندہ رہے گی۔

پفنوتوس کھڑا تھا مگر ششدر' جیسے کوئی بجلی کا کڑکا سر پر سن کر سہم جائے۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ کچھ دیکھ سکتا تھا نہ کچھ سن سکتا تھا۔ کانوں میں سوائے اس آواز کے کہ "تائیس مرنے کو ہے" اور کوئی آواز نہ تھی۔ دل میں کبھی یہ خیال نہ گزرا تھا کہ تائیس مر جائے گی۔ صلیب پر مسیح مردہ کی تصویر کو دیکھتے ہوئے تیس برس گزرے تھے' مگر اس کا وہم و گمان بھی نہ ہوا کہ موت ایک دن تائیس کی آنکھیں بھی بند کر دے گی۔

"تائیس مرنے کو ہے۔" یہ چند الفاظ کیسے عجیب و خوفناک معنی رکھتے ہیں۔ "تائیس مرنے کو ہے" اگر ایسا ہے تو پھر یہ چاند سورج باغ اور چشمے بلکہ جو کچھ مخلوق ہوا سب بیکار ولا حاصل تھا۔ پھر اس کو پیدا کرنے سے نتیجہ ہی کیا نکلا؟" اتنا سوچ کر ایک دفعہ ہی جست لگائی اور زور سے بھاگنا شروع کیا۔ کچھ خبر نہ تھی کہ کدھر جاتا ہے اور کس حال میں ہے' لیکن عقل حیوانی دلیل راہ بن گئی اور وہ سیدھا دوڑتا ہوا دریائے نیل کے کنارے پہنچا۔ یہاں بادبانی کشتیاں بکثرت موجود تھیں۔ نوبیہ والوں کی ایک کشتی میں بیٹھ گیا۔ کشتی ہواؤں پر تیز چلنے لگی اور پفنوتوس کی نظر فاصلے کو تکنے لگی کہ کب اور کیوں کر ختم ہو گا۔ روتا تھا اور کہتا تھا:

"میں احمق تھا' بے وقوف تھا' موقع ملا تھا کہ تائیس کو اپنا کر لیتا' مگر بات کو نہ پہنچا۔ نادان تھا جو سمجھا کہ دنیا میں تائیس کے سوا بھی کوئی چیز لائق تمنا ہے۔ دیوانہ تھا' مجنوں تھا جو خدا کے خیال میں رہا' روح کو محفوظ رکھنے اور آسمانی زندگی حاصل کرنے کی جستجو کی۔ گویا تائیس کو دیکھنے کے بعد بھی ان چیزوں کی کوئی قیمت تھی۔ کیوں میری سمجھ میں نہ آیا کہ مسرت جاوید تائیس کے بوسوں کے سوا کہیں میسر نہیں ہو سکتی۔ بغیر اس کے زندگی کوئی چیز نہ تھی۔ اگر تھی بھی تو ایک بھیانک خواب تھی۔ ارے احمق! اس جہان میں تائیس جیسی نعمت کو دیکھنے کے بعد بھی تو نے دوسرے جہان میں نعمتیں حاصل کرنے کی آرزو کی۔ ارے بزدل تائیس سے مل کر بھی خدا سے ڈرا کیا۔ خدا' آسمان' یہ کیا ہیں؟ ان کے پاس رکھا کیا تھا جو تجھے کچھ ملتا۔ اگر کچھ ملتا بھی تو تائیس کی داد و دہش کا وہ عشر عشیر بھی نہ ہوتا۔ اے دیوانے! مخبوط الحواس' وہ کون سی آسمانی خیر و برکت تھی جو تائیس کے لبوں کے سوا کہیں اور تلاش کی جاتی۔ اس دن کس نے تیری آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ برا ہوا اس کا جس نے اس وقت تجھے اندھا بنایا۔ تائیس کا وصل' ارے کمبخت! ساری دوزخ کے عذاب کو قیمت میں لگا دیتا اور اس لذت کو ایک آن واحد کے مول لے لیتا' لیکن تجھ سے کچھ نہ ہو سکا۔ تائیس ہاتھ پھیلائے تیری طرف بڑھی' وہ گورے گورے ہاتھ وہ بھرے بھرے بازو' جن میں پھولوں کی خوشبو آتی تھی' مگر تجھے جنبش نہ ہوئی۔ جس سینہ پر بند قبا کھلے ہوئے تھے' اس پر اپنی ہستی کیوں نہ مٹا دی۔ اے کج فہم' رشک رقیب کے حکم پر کہ "پرہیز کر" عمل کرتا رہا اور دھوکا کھایا۔ ہائے افسوس! ہائے پشیمانی! ہائے مایوسی' ایک ساعت کے لئے بھی وہ عیش حاصل نہ کیا' جسے دوزخ میں تا ابد یاد کیا کرتا' تائیس مرنے کو ہے' خدایا! کاش تجھے معلوم ہوتا کہ اب تیری دوزخ پر مجھے کیسی ہنسی آتی ہے۔

ہائے! تائیس مرنے کو ہے' اب مجھ سے کبھی نہ ملے گی۔ ہائے ہائے' کبھی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔"

کشتی بہاؤ پر بڑی تیز رفتاری سے مسافت طے کر رہی تھی اور پفنوتوس دن دن بھر کشتی میں منہ کے بل پڑا رہتا تھا۔

"کیا اب وہ صورت دیکھنی نصیب ہوگی؟ نہیں کبھی نہیں' کبھی نہیں۔"

پھر یکلخت یہ خیال آتا کہ تائیس نے سب کو محظوظ کیا مگر وہ ہی محروم رہا۔ عشق و الفت کی موجیں سب کی طرف پہنچیں مگر اس کے کام ودہان تر کرنے نہ آئیں۔ اس خیال کے آتے ہی ایک خونی مجنوں کی طرح اٹھ بیٹھتا اور زور زور سے چیخنے لگتا۔ کبھی ناخنوں سے سینہ نوچتا' کبھی دانتوں سے ہاتھوں کا گوشت کاٹتا۔

سوچنے لگا: "کیا میں ان لوگوں کو جن سے تائیس ملوث رہی' جان سے نہیں مار سکتا۔ یقیناً میں ان کا خون کر سکتا ہوں"

خون کرنے کے قصد نے دل کو ایک عجیب وحشت کے ساتھ خوش کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نیکیاس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نہایت اطمینان سے اس کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر کھا رہا ہے۔

پھر یہ شدت جنون دفعتاً کم ہو جاتی تھی۔ زار زار رونے لگتا تھا۔

ایک دن علی الصباح البینا دیر راہبات کے دروازے تک آئی کہ انصینو کے قسیس کو خیر مقدم کہے۔ ملاقات ہوتے ہی کہنے لگی:

"اے ابی! اس امن و عافیت کے گھر میں آپ کا قدم رکھنا مبارک ہے' کیونکہ بلاشبہ آپ اس نیک بخت عورت کو برکت دینے آئے ہیں' جسے کچھ عرصہ ہوا آپ اس دیر میں چھوڑ گئے تھے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اب خدائے پاک اپنی رحمت اور شفقت سے اسے اپنے پاس بلانے والا ہے۔ اس کی اطلاع آپ کو بھی ہوئی ہوگی' کیونکہ اس خبر کو فرشتوں نے قاصد بن کر صحرا بصحرا پہنچایا ہے۔ تائیس اب سفر زندگی ختم کر کے منزل راحت میں پہنچنے والی ہے۔ دنیا میں اس کا کام ختم ہوا اور جس طرح وہ اس دیر میں رہی' اس کی مختصر کیفیت میں آپ کو سنائے دیتی ہوں۔ آپ کے رخصت ہونے کے بعد وہ اسی حجرے میں بند رہی' جس کے دروازے پر آپ اپنی مہر لگا گئے تھے۔ میں روزانہ اس کو کھانا اور کھانے کے ساتھ ایک بانسری اسی قسم کی جو اس کی پیشہ والیاں بجایا کرتی ہیں' بھیج دیتی تھی۔ یہ میں اس لئے کرتی تھی کہ اس کی طبیعت افسردہ نہ ہونے پائے اور جب خدا کے سامنے وہ آئے تو اس کا حسن اور اس کا ہنر اس سے کم نہ ہو' جو انسان کے سامنے ظاہر ہوا کرتا تھا۔ میرا یہ خیال درست تھا۔ تائیس روز خدا کی تعریف بانسری کے نغموں میں ادا کرتی تھی اور جو راہبات بانسری سننے کے لئے جمع ہو جایا کرتی تھیں وہ کہا کرتی تھیں کہ "جنت کے باغوں سے بلبل کے چہچہانے کی آواز آ رہی ہے۔ مسیح مصلوب کا بط حالت نزع میں بول رہا ہے۔" غرض تائیس اس طرح اپنے گناہوں سے توبہ کرنے اور ان کی مکافات میں مصروف رہتی تھی' یہاں تک کہ ساٹھ دن گزرنے کے بعد جس دروازے پر آپ مہر کر گئے تھے' وہ از خود کھل گیا۔ کسی انسان کا ہاتھ اس کو نہ لگا تھا۔ اس واقعہ سے میں سمجھ گئی کہ جو آزمائش آپ نے اس کے لئے تجویز کی تھی' وہ پوری ہوئی اور مہر کا خود بخود ٹوٹ جانا' اس بات کی علامت تھی کہ اس گانے والی کے گناہ خدا نے معاف کر دئے' اس وقت سے وہ تمام راہبات کے ساتھ ان کے کاموں اور عبادتوں میں شریک ہونے لگی۔ نہایت شیریں گفتگو اور پاکیزہ اخلاق سے وہ اپنی بہنوں کو خوش کیا کرتی تھی اور اسے دیکھ کر مجھے معلوم ہوتا تھا کہ عورتوں میں حیا اور شرم کی وہ ایک مجسم تصویر ہے۔ کبھی کبھی وہ کسی قدر غمگین ہو جایا کرتی تھی' لیکن یہ ایک عارضی کیفیت ہوتی تھی جو جلد دور ہو جاتی تھی۔ جب میں نے بخوبی دیکھ لیا کہ اس کا ایمان راسخ ہے اور امید رحمت اور عشق حقیقی میں اس کا تعلق خدا سے مستحکم ہے تو پھر مجھے کچھ خوف نہ رہا اور میں نے اسے اجازت دی کہ جس فن میں وہ یکتائے روزگار ہو چکی تھی' اس کے ذریعہ اور اپنے حسن کے اثر سے اپنی بہنوں کو خوش کیا کرے۔ میں نے اس سے فرمائش کی کہ انجیلوں میں جن دلیر عورتوں اور عقلمند کنواریوں کا ذکر آیا ہے' ان کی نقلیں اتار کر اپنی بہنوں کو خوش کیا کرے چنانچہ آسر' دبورہ' یودی' لعرز کی بہن ماریہ اور یسوع کی والدہ جناب مریم کی تمثیلیں نہایت اثر اور خوبی کے ساتھ دکھاتی

رہی۔ اے ابی! میں سمجھتی ہوں کہ اس قسم کے تماشوں کو آپ کے ایمان کا تقید و تشدد جائز نہ سمجھتا ہوگا۔ لیکن اگر آپ ان موقعوں پر موجود ہوتے تو آپ دیکھتے کہ ان تماشوں میں تائیس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں کس طرح جاری ہو جاتی تھیں اور خدا سے ملنے کے لئے کیسی بے تاب ہو کر وہ اپنے ہاتھ پھیلاتی تھی۔ اگر آپ موجود ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ آپ کے دل پر اثر نہ ہوتا۔ عورتوں کی نگرانی و نگہداشت میں میری عمر کا ایک بڑا حصہ گزر چکا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنا یہ قاعدہ رکھا کہ کوئی بات جو عورت کی اصلی فطرت کے خلاف ہو' اسے کبھی نہ کرنا چاہیے۔ سب بیجوں سے ایک ہی طرح کے پھول پیدا نہیں ہوتے۔ ہر شخص کو ایک ہی طریقہ سے پاکیزگی نفس حاصل نہیں ہوتی۔ پھر مجھے اس بات کا بھی خیال تھا کہ تائیس نے زہد و پارسائی اس وقت اختیار کی تھی' جبکہ وہ نہایت حسین تھی اور یہ اتنا مشکل کام ہے' جس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ یہ حسن صورت اس کا ایسا تھا کہ تین مہینے کی شدید تپ کے بعد بھی جس کو اب اس کا مرض الموت سمجھنا چاہیے' زائل نہیں ہوا۔ اس علالت کے زمانہ میں وہ بار بار آسمان کو دیکھنے کے لئے کہا کرتی تھی۔ اس لئے میں نے اجازت دے دی کہ اس کا پلنگ صحن میں انجیر کے درخت کے نیچے جہاں پانی کا چشمہ ہے' روز صبح کے وقت بچھا دیا جایا کرے۔ چنانچہ اب تک یہی ہو رہا ہے۔ اس دیر کی جس قدر عابدہ عورتیں ہیں' وہ اس کی تیمارداری میں شریک رہتی ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو وہیں صحن میں درخت کے نیچے آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن تاخیر نہ فرمایئے۔ کیونکہ خدا کے ہاں اس کی طلبی جلد ہو رہی ہے اور ممکن ہے کہ آج شام تک اس چہرے پر نقاب پڑ جائے' جسے خدا نے اس دنیا کی زینت اور فضیحت دونوں کے لئے پیدا کیا تھا۔"

پفنوتوس البینا کے ساتھ ساتھ خانقاہ کے صحن میں آیا۔ صبح کا وقت تھا۔ صحن خوب روشن تھا۔ چھتوں کی اونچی اونچی منڈیروں پر سفید سفید قمریاں اس طرح پاس پاس بیٹھی تھیں' جیسے کسی نے موتیوں کی جھالر لٹکا دی ہو۔ انجیر کی چھاؤں میں پلنگ پر دونوں ہاتھ سینے پر رکھے تائیس لیٹی تھی۔ رنگ بالکل سپید ہو گیا تھا۔ بستر کے گرد راہبات منہ پر نقابیں ڈالے سکرات کی شدت کو کم کرنے کے لئے یہ دعا پڑھتی تھیں:

"اے میرے خدا! اپنے فضل و کرم سے مجھ پر رحم کر اور اپنی غفاری سے میرے گناہوں کو معاف کر۔"

پفنوتوس نے آواز دی: "تائیس۔"

تائیس نے پلکیں اٹھا کر جدھر سے آواز آئی تھی' ادھر آنکھیں پھیریں۔ البینا نے نقاب والی عورتوں سے کہا کہ چند قدم ہٹ کر کھڑی ہو جائیں۔

پفنوتوس نے پھر آواز دی۔ "تائیس!"

تائیس نے اس آواز پر تکیہ سے کچھ سر اونچا کیا اور اس کے سپید لبوں سے یہ خفیف آواز سنائی دی: "بابا! کیا آپ ہیں؟ وہ چشمہ اور درختوں کے نیچے کھجوروں کا اٹھانا یاد ہے' وہ دن تھا کہ عشق خدا میں حیات جاوید حاصل کرنے کے لئے میں اس دنیا میں از سر نو پیدا ہوئی تھی۔"

اتنا کہہ کر چپ ہو گئی اور سر پھر اسی طرح تکیہ پر رکھ لیا۔

موت قریب تھی۔ پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ آنے لگا تھا۔ ہر طرف بالکل خاموشی تھی کہ اتنے میں ایک قمری نے حق سرہ کی صدا لگائی اور اب راہب کا گریہ راہبات کی اس دعا میں شامل ہوا:

"میرے اعمال دھو دے اور گناہوں سے مجھے پاک کر دے' کیونکہ اس وقت میرے اعمال اور میرے گناہ سب تیرے سامنے ہیں۔"

دفعتاً تائیس لیٹے سے اٹھ بیٹھی اور اس کی خوب صورت آنکھیں پوری کھل گئیں۔ دونوں ہاتھ بڑھا کر دور کی پہاڑیوں کی طرف نظر کی اور نہایت روشن آواز سے کہا:

"دیکھو وہ صبح ازل کی گلابی روشنی نمودار ہو رہی ہے۔"

اتنا کہتے ہی آنکھوں میں نور اور پیشانی پر ہلکی سی سرخی آئی۔ اس وقت اس کا حسن اور حسن کی ملاحت پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ پفنوتوس جھک کر اس سے لپٹ گیا اور ایسی آواز سے جس کو خود نہ پہچانتا تھا' کہنے لگا: "تائیس مر نہیں۔ مجھے تجھ سے عشق ہے' مر نہیں۔ سن! میں نے تجھے دھوکا دیا تھا۔ میں بدنصیب احمق تھا' نہ خدا کچھ ہے' نہ آسمان کوئی چیز ہے۔ دنیا کی زندگی اور دنیا کی محبت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ تائیس میں تیرے عشق میں ڈوب رہا ہوں۔ مر نہیں۔ تو اور مر جائے' یہ کیوں کر ہو سکتا

ہے۔ تیری جان کا مول نہیں۔ آ' میرے ساتھ چل۔ میں تجھے اپنی گود میں اٹھا کر بہت دور تک لے جا سکتا ہوں۔ آ' ہم دونوں عشق و محبت میں زندہ رہیں۔ میری جان! میری بات سن۔ اپنی زبان سے اتنا کہہ دے کہ "ہاں! ابھی جیوں گی۔ جینے کو میرا جی چاہتا ہے۔" تائیس تائیس۔ اٹھ۔"

تائیس نے ایک بات بھی نہ سن۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیر کر یہ کہتی ہوئی سنائی دی:

"عرش کے دریچے کھل گئے ہیں۔ ملائکہ' انبیاء اور خدا کے اولیاء نظر آ رہے ہیں۔ مقدس لیدور شہید' میرا پاک اُمس بھی ان ہی میں ہے اور اس کے ہاتھوں میں پھول ہیں۔ وہ ہنستا ہے اور مجھے پکارتا ہے۔ دیکھو' وہ دو فرشتے بڑھے ہوئے میری طرف آ رہے ہیں۔ لو' وہ آ گئے۔ کیسے خوبصورت ہیں؟ خدا کا دیدار شروع ہو گیا۔"

منہ سے ایک خوشی کا نعرہ نکلا اور سر بے حس ہو کر تکیہ پر گرا۔ تائیس گزر گئی۔ پفنوتوس اس کو چمٹ کر ایسی حرکتیں کرنے لگا' جس میں خواہش غضب اور عشق شامل تھا۔

الپینا یہ حالت دیکھ کر چلائی: "دور ہو خبیث۔"

پفنوتوس پیچھے ہٹ گیا۔ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ آنکھیں ایسی سرخ تھیں' جیسے کسی نے آگ جلا رکھی ہو۔ اسے معلوم ہو رہا تھا کہ زمین شق ہو گئی ہے اور وہ اس کے اندر دھنسا چلا جاتا ہے۔

پفنوتوس کی شکل خود بخود ہیبت ناک ہو گئی تھی اور جب اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو اپنی بدنمائی اسے بھی معلوم ہو گئی۔

ہیمنگوے ہمارے یہاں مقبول کیوں ہے؟ اس کی دو وجوہ فوراً سمجھ میں آ جاتی ہیں: ایک بات تو یہ ہے کہ ہمارے انگریزی داں طبقے نے بالعموم وہ فلمیں ملاحظہ کی ہیں جو ہیمنگوے کے ناولوں کو سامنے رکھ کر امریکہ میں بنائی گئی ہیں۔ مقبولیت کی دوسری وجہ اس کی شخصیت تھی، اپنی تنومندی، واضح مردانگی، سخت جانی اور سیر و شکار سے رغبت کی بناء پر وہ کوئی بانکا معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے ادیبوں سے قطعی طور پر مختلف، لیکن اس کی مقبولیت کی ایک وجہ، میرے خیال میں اور بھی ہے۔ فاکنر یا کافکا جیسے ادیبوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص قسم کا ذوق پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس ہیمنگوے قاری کے سامنے جھٹپٹے یا اندھیرے میں لپٹا ہوا نہیں آتا۔ اس کے لاچار یا بیزار کرداروں کا گرد و پیش، تشدد یا خوف یا موت سے معمور ماجرے، کسی روشن دوپہر کی طرح، صاف اور سیدھے ہوتے ہیں۔ کہانی کی سطح الفاظ و جذبات کی پیچیدگی سے خالی ہوتی ہے، اس پیچیدگی کو ہیمنگوے بڑی ہنرمندی سے ذرا نیچے چھپا دیتا ہے۔

ولیم فاکنر پڑھنے لکھنے میں کمزور تھا اور دسواں درجہ پاس کرنے کے بعد اس نے ہائی اسکول چھوڑ کر دادا کے بینک میں ملازمت کر لی۔ اس کے مطالعے کا دائرہ بہت وسیع تھا، اور وہ نظمیں لکھنے لگا۔ اس نے مصوری کرنے کی کوشش بھی کی۔ یہ نوجوان، جس کا اداس مزاج گھڑی گھڑی بدلتا رہتا تھا، آکسفورڈ والوں کے لیے ایک معمہ تھا۔ 1914ء میں اس نے ایک نوجوان وکیل، فل اسٹون، سے دوستی کا آغاز کیا جس سے اسے ادبی بحثیں کرنے کا موقع ہاتھ آیا اور کونریڈ ایکن، رابرٹ فراسٹ، ایزرا پاؤنڈ اور شیرووڈ اینڈرسن جیسے روز افزوں شہرتوں کے مالک ادیبوں سے واقف ہونے میں مدد ملی۔

چونکہ فاکنر کا وزن اتنا نہ تھا جتنا کہ ہونا چاہیے تھا اور قد صرف پانچ فٹ پانچ انچ تھا، امریکی فوج نے اسے بھرتی کرنے سے انکار کر دیا۔ تاہم وہ ٹورنٹو (کینیڈا) میں رائل فلائنگ کور میں کیڈٹ کے طور پر بھرتی ہونے میں کامیاب رہا۔ 22 دسمبر 1918ء کو جب فوج توڑ دی گئی، وہ اعزازی سکینڈ لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہوا۔ اپنے عہد کے بیشتر ادیبوں کی طرح فاکنر بھی اکثر پہلی جنگ عظیم کے واقعات اور ڈھکے چھپے مفاہیم دونوں پر سوچ بچار میں کھویا رہا ہے۔ اس کی ابتدائی کتابوں کا بھی موضوع یہی ہے۔ (ایم وان اکونر / محمد سلیم الرحمٰن)

شاہی زمانے میں فرانس کے ایک شہر میں، برنابا نامی ایک نٹ رہا کرتا تھا۔ اس کا قاعدہ تھا کہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں گھوم کر اپنے کرتب دکھایا کرتا اور لوگ اس کی مہارت اور صاحب کمال ہونے کا اعتراف کیا کرتے تھے۔ اس طرح اس کا نام دور دور پھیلا ہوا تھا۔

بازار کے روز، برنابا کسی کھلی جگہ اپنی پرانی اور بوسیدہ کملی بچھا کر بیٹھ جاتا اور دلچسپ اور مذاقیہ باتوں سے، جو اس نے ایک خاندانی نٹ سے سیکھی تھیں اور اپنی طرف سے ان میں کوئی ردو بدل نہیں کیا تھا، بچوں اور کھلنڈرا مزاج رکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لینے کے بعد، کھیل شروع کر دیتا اور اس میں عجیب عجیب حرکتیں کرتا ۔۔۔ ناک کی پھننگی پر ایک بڑا سا طباق رکھ کر ناچتا، گھومتا، چکر لگاتا اور طباق اپنی جگہ سے نہ کھسکتا۔۔۔ مگر مجمع اس وقت بے پروائی سے تماشا دیکھتا رہتا۔۔۔ مگر جب دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر، سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے، چھ عدد گیند فضا میں اچھالتا اور ٹانگوں سے انہیں گوچتا۔۔۔ یا جس وقت وہ سر نیچے جھکاتا چلا جاتا، یہاں تک کہ ٹخنوں سے اسے ملا دیتا، اور جسم کو بالکل دائرے کی شکل دے کر دونوں ہاتھوں سے بارہ چھریاں گھماتا، ان سے کھیلتا، اور پھر فضا میں انہیں اچھال دیتا۔۔۔ اس وقت مجمع سے ایک شور بلند ہوتا، نعرہ ہائے تحسین سے فضائیں معمور ہو جاتیں اور ۔۔۔ اور اس کی پھٹی پرانی کملی پر بارش کی بوندوں کی طرح پیسے برسنے لگتے تھے۔

اس کے باوجود برنابا بھی دوسرے فن کاروں کی طرح، جو صرف اپنے ہنر کے سہارے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، بہت تکلیف سے زندگی کے دن گزارتا تھا۔ سر کا پسینہ جب پیروں تک آتا تب اسے پیٹ بھر روٹی نصیب ہوتی تھی۔ آدم کی غلطی سے، انسانی بدنصیبیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اس سے برنابا کے حصے میں اتنا زیادہ بوجھ آ گیا تھا جو اس سے اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔

یہ تو وہ کر ہی نہیں سکتا تھا کہ جب چاہے کرتب دکھائے اور پیسے کما لے۔ صرف گرمیوں کے دنوں میں دھوپ کی حرارت اور دن کی روشنی میں وہ اپنے کمالات دکھا سکتا تھا، درختوں کی طرح، جو

فرانسیسی ادب کے دفینے سے

نٹ

ایک بازی گر کی کہانی، وہ مقدس مریم کی پاکی اپنے طریقے سے بیان کرنا چاہتا تھا

اناطول فرانس / محمد رضا انصاری

گرمیوں میں پھل پھول دیتے ہیں۔۔۔اور جاڑوں میں اس کی حالت اس درخت کی سی ہو جاتی تھی جس کے سب پتے جھڑ چکے ہوں، اور اب وہ خود بھی گرنا ہی چاہتا ہو۔۔۔اس زمانے میں برف سے پٹی زمین اسے کمالات دکھانے سے مانع ہوتی تھی۔۔۔اس طرح جاڑے کے دنوں میں سردی اور بھوک کی مسلسل تکلیف، برنابا کو اٹھانا پڑتی تھی، مگر ذاتی شرافت اور فطری معصومیت کی وجہ سے، صبر وشکر کے ساتھ یہ زمانہ بسر کر لیتا تھا۔

اس کو پونجی جمع کرنے کا کبھی خیال تک نہ آتا تھا، آتا بھی کیسے؟ اس کا تو عقیدہ یہی تھا کہ اس دنیا میں تکلیف اٹھا لینے کے بعد دوسری دنیا میں ضرور آرام ملے گا، اور اسی امید کے سہارے وہ جیتا اور خوش رہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ برنابا ان لوگوں کی طرح جو اپنے کو شیطان کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں، مال و دولت کا حریص تھا ہی نہیں! وہ خدا کو ہر وقت یاد رکھتا تھا۔ وہ صاف دل، نیک نیت اور شریف الطبع انسان تھا۔ باوجودیکہ اس نے شادی نہیں کی تھی مگر کبھی بھول کر بھی اس نے پڑوسی کی بیوی کو بری نظر سے نہیں دیکھا، دراصل اسے عورتوں سے نفرت تھی۔ وہ کہتا تھا کہ "عورتیں طاقتور مرد کی دشمن ہوا کرتی ہیں۔" جیسا کہ توراۃ میں جبار شمشون اور اس کی محبوبہ دلیلہ کے قصے سے ظاہر ہوتا ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ نسوانی لذتوں کی طرف اس کا ذہن جاتا ہی نہیں تھا۔ ایک عام شراب نہ ملنے کی اسے کہیں زیادہ تکلیف ہوتی تھی بہ نسبت اس کے کہ وہ حسین عورت سے محروم رہے۔

شراب پینے کو، وہ بھی گرمیوں کے زمانے میں، جب اس کے پاس پیسے ہوتے تھے، وہ پسند کرتا تھا بشرطیکہ پینے میں اعتدال ملحوظ رہے۔۔۔غرض برنابا ایک پرہیزگار آدمی تھا، جو ہر وقت خدا کو یاد رکھتا۔ کنواری مریم کی پاکی اور طہارت بیان کیا کرتا اور ان کو اپنا پشت پناہ سمجھا کرتا تھا۔ اس کا قاعدہ تھا کہ جب کسی گرجے میں جاتا تو کنواری مریم کے مجسمے کے سامنے گھٹنے ٹیک کر خاص دردمندانہ شان سے یہ دعا مانگتا:

"اے میری ملکہ! مجھے اپنی حفاظت میں رکھ، جب تک خدا کے حکم سے میری موت، اپنی حفاظت میں نہ لے لے۔"

☆☆☆

ایک شام کو ناخوشگوار بارش کے بعد، برنابا سر جھکائے، اداس اداس ایک بازار سے گزر رہا تھا۔ اپنی بغل میں گیند، چھریاں اور پھٹی پرانی کملی دبائے، وہ ایسی سرائے کی تلاش میں تھا، جہاں رات بھر پڑا رہنے کا انتظام ہو۔ رات کے کھانے کا نہیں۔ اچانک ایک راہب سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ برنابا نے ادب کے ساتھ سرنگوں ہو کر اسے سلام کیا۔ دونوں ایک ہی طرف جا رہے تھے، راستے میں باتیں چھڑ گئیں، راہب نے پوچھا:

"یہ رنگین لباس پہنے تم کہاں جا رہے ہو؟ کسی مذہبی تمثیل میں شرکت کرنے؟"

"نہیں اے باپ! میں جو آپ کے سامنے کھڑا ہوں، مجھ ہی کو لوگ برنابا کہتے ہیں۔ میں مداری کا پیشہ کرتا ہوں۔ یہ پیشہ تو دنیا کے تمام پیشوں سے بہتر ہے، اگر اس سے روزانہ پیسے ملتے رہیں۔"

"میرے بیٹے برنابا! سوچو تم کیا کہہ رہے ہو!۔۔۔تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے بہتر پیشہ دنیا میں صرف یہی ہے کہ تم راہب ہو جاؤ، ہم لوگ خدا کی اور کنواری مریم کی پاکی بیان کیا کرتے ہیں، ایک راہب کی زندگی مستقل نغمہ سرائی کے سوا اور کچھ نہیں۔"

برنابا نے جواب دیا:

"محترم باپ! مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ایک جاہل آدمی کی ایسی بات کہہ دی، آپ کے پیشے کا میرے اس ذلیل پیشے سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے، یہ کتنی ہی بڑی بات کیوں نہ ہو کہ میں اپنی ناک کی پھننگی پر لمبا سا بانس رکھ کر جس کے دوسرے سرے پر چھوٹا سا سکہ رکھا ہو، پہروں ناچتا ہوں اور سکہ گرنے نہیں پاتا، مگر یہ بات کبھی بھی آپ کی بزرگی اور عظمت کی برابری نہیں کر سکتی۔ کاش میں آپ کی طرح ہو جاؤں، روزانہ خدا کے حضور میں جاؤں، خاص کر کنواری مریم کی خدمت میں جن کے لئے میرے دل میں عقیدت اور احترام کا ایک دریا موجزن ہے، کاش! میں آپ کے پیشے میں شامل ہو سکتا! میرے لئے راہب بننے کی کوئی صورت نکل سکتی تو میں یہ پیشہ چھوڑنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا۔۔۔یہ پیشہ جس کی بدولت آج میں چھ سو شہر اور گاؤں میں مشہور ہوں۔"

اس کی معصومیت اور بھولا پن، راہب کے دل پر اثر کر گیا، اس نے بھانپنے والی نظر برنابا پر ڈالی اور یہ یقین کر لینے کے بعد کہ برنابا خدا کے نیک بندوں میں ہے، اس نے کہا:

"تم میرے ساتھ چل سکتے ہو برنابا! میں تم کو اپنے گرجے میں رکھوں گا۔ خدا نے مجھے تمہاری ہدایت کے لیے منتخب فرمایا ہے۔"

اس طرح برنابا کی آرزو پوری ہوگئی اور وہ راہبوں میں شامل ہو گیا۔

گرجے میں رہ کر اس نے دیکھنا شروع کیا کہ تمام راہب کس طرح کنواری مریم کی عبادت کرتے ہیں، کچھ لوگ ان کی فضیلت اور بزرگی بیان کرنے کے لئے لمبے چوڑے خطبے تیار کرتے ہیں۔ کچھ لوگ کنواری مریم کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت تصویریں بناتے

ہیں۔۔۔بعض تصویریں ایسی ہوتی ہیں جن کے سر پر نورانی ہالہ ہوتا ہے اور قدموں کے نیچے وہ روحیں ہوتی ہیں جو کنواری مریم کو اپنا شفیع بنانے کی کوشش کر رہی ہیں، تاکہ خدا ان پر رحم فرمائے اور ان کی لغزشوں کو معاف فرمادے۔

کچھ راہب ایسے بھی ہیں جو کنواری مریم کے مجسمے بنا کر کبھی فصیح و بلیغ لاطینی زبان میں اور کبھی اپنی ٹھیٹھ جادو بھری بولیوں میں ان کی پاکی بیان کرتے ہیں۔۔۔ ہر ایک اپنے اپنے انداز میں عبادت میں لگا رہتا ہے۔

برنابا یہ سب کچھ دیکھتا اور دل ہی دل میں اپنے ان پڑھ ہونے کا افسوس کیا کرتا اور کبھی کبھی یہ احساس زیادہ ستانے لگتا تو وہ گرجے کے پائیں باغ میں چلا جاتا، اور اپنے ہی آپ سے کہا کرتا:

''کتنا بدنصیب ہوں میں، یہ بھی نہیں کر سکتا کہ اپنے ساتھیوں کی طرح کنواری مریم کی اس طرح عبادت کروں جو میرے پیشے اور کنواری مریم کی عظمت کے موافق ہو۔ افسوس میں بالکل گنوار ہوں! اے میری ملکہ ایسی دعائیں، ایسے خطبے، ایسی نادر تصویریں، ایسے حسین مجسمے اور ایسے ایسے عمدہ قصیدے، میں تیری خدمت میں پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ آہ! میں جاہل ہوں۔۔۔ ہائے افسوس مجھے کچھ نہیں آتا۔۔۔!!''

ایک شام کو، جب کہ تمام راہب کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے، برنابا نے ایک شخص کی زبانی ایک کہانی سنی:

''ایک راہب تھا، جو بالکل پڑھا لکھا نہیں تھا، اپنے ان پڑھ ہونے پر دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا اور اس کے ساتھی اسے طعنے دیا کرتے تھے۔ اس نے خود ایک دعا بنائی تھی جو کنواری مریم کی عبادت کے وقت پڑھا کرتا تھا، جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے منہ سے چار خوب صورت پھول پھوٹ نکلے جو ان چار حرفوں کی طرف اشارہ کرتے تھے جن سے ''مریم'' کا لفظ بنا ہے۔۔۔ اس واقعے نے تمام راہبوں کو متاثر کیا اور وہ سب اس کی بزرگی کے قائل ہو گئے۔''

اس قصے نے برنابا کے دل پر بہت گہرا اثر ڈالا، وہ اور زیادہ کنواری مریم سے خوش عقیدگی کا اظہار کرنے لگا۔ لیکن اس ان پڑھ راہب کے مرنے اور اس کے منہ سے چار پھولوں کے پھوٹ نکلتے ہی جیسے اس کو کوئی خاص تسلی نہیں ہوئی۔۔۔ دراصل وہ خود اپنے لئے کوئی ایسا ہی طریقہ تلاش کرنا چاہتا تھا جس کے پیچھے اس کی زندگی ایک مستقل عذاب بنی ہوئی تھی۔

مگر ایک دن جب وہ سو کر اٹھا تو اس کا دل مسرت سے لبریز تھا۔۔۔ وہ دوڑتا ہوا ''ہیکل مقدس'' تک گیا اور فوراً ہی واپس آ گیا، پھر دوپہر کے وقت وہاں پہنچا۔۔۔ اب وہ خوش تھا شاید وہ طریقہ اسے معلوم ہو گیا تھا۔۔۔ اب روزانہ وہ ایسے وقت ''مقدس ہیکل'' کی زیارت کو جاتا، جب گرجے میں چھٹی ہوتی تھی، اور تمام راہب اپنے اپنے کمروں میں ہوتے، اور وہ اتنی ہی دیر وہاں لگاتا جتنی اس کے ساتھی اپنی اپنی عبادت میں لگاتے تھے۔ برنابا کے دل سے تمام کلفتیں دور ہو چکی تھیں، اب وہ اپنی زندگی سے خوش تھا۔

اس تبدیلی کا راز دوسرے راہبوں کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھا کرتے:

''برنابا چھٹی کے وقت بھی گرجے ہی میں رہتا ہے، اتنی زیادہ ریاضت کی کوئی وجہ بظاہر سمجھ میں نہیں آئی ہے۔''

بڑے پادری کے فرائض میں راہبوں کے طرز عمل اور ان کے حالات کی نگرانی کرتے رہنا ہے۔ برنابا کے موجودہ طرز عمل نے سب کو شبہ میں ڈال دیا تھا، ایک دن بڑے پادری نے دو راہبوں کے ساتھ ''مقدس ہیکل'' کے دروازے سے جھانک کر اندر دیکھا تو برنابا کنواری مریم کے مجسمے کے سامنے سر کے بل کھڑا اپنی بارہ چھریوں اور چھ گیندوں سے وہی کرتب دکھا رہا تھا جو لوگوں کو سب سے زیادہ پسند تھے۔

دونوں راہب یہ منظر دیکھ کر کانپ اٹھے۔ ایک ساتھ دونوں نے کہا:

''یہ تو صریحی کفر ہے!''

بڑا پادری جانتا تھا کہ برنابا نیک نیت اور بھولا بھالا معصوم انسان ہے۔ اسے خیال ہونے لگا کہ شاید اسے جنون کا دورہ پڑ گیا ہے۔۔۔ اس لئے دونوں ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ واپسی کے لئے مڑنے لگا۔۔۔ اچانک تینوں کی نظریں کنواری مریم پر پڑیں۔ وہ ''ہیکل مقدس'' کی سیڑھیوں سے اترتی ہوئی برنابا کے پاس آئیں اور اپنی نیلی چادر کے کونے سے اس کے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگیں۔

پادری کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ نیم بیہوشی کے عالم میں زمیں بوس ہونے کے لئے جھکا، وہ زیر لب کہہ رہا تھا:

''خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو بھولے اور معصوم ہیں۔ وہ اپنے پروردگار کو دیکھ لیتے ہیں۔'' دونوں ساتھیوں نے زمین بوس ہوتے ہوئے کہا:

''سچ ہے اے محترم باپ!''

فرانسیسی ادب کے خزینے سے

سیاہ روٹیاں

فلورنس کے ایک بینکار کی کہانی، مرنے کے بعد اس کے اعمال میزان میں رکھے گئے

اناطول فرانس / وجاہت مسعود

"تم نے اپنی حماقت کے لئے متاع دنیا کے انبار جمع کر رکھے ہیں اور ضرورت مندوں کو روٹی کا ایک ٹکڑا دینے میں بھی تمہیں عار ہے مگر وہ دن قریب ہے جب تمہیں دردناک شعلوں میں جلایا جائے گا اور تم ایک قطرۂ آب کے لئے التجائیں کرو گے!"

Ship of fools: Sebastian Brandt

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب نکولس نیرلی نامی ایک شخص فلورنس کے عالی شان شہر میں بینکار تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنی میز کے سامنے جا بیٹھتا۔ سہ پہر کا گھڑیال بج اٹھتا مگر نکولس وہیں مورچہ لگائے پستکون میں درج اعداد و شمار سے الجھتا رہتا۔ شہنشاہ سے لے کر پوپ تک سبھی اس کے مقروض تھے۔ اسے رقم ڈوبنے کا خدشہ نہ ہوتا تو وہ شیطان کو بھی قرض دیتا۔ نکولس نیرلی دھانسو قسم کا شخص تھا۔ دوسروں کی جمع جتھا پر ہاتھ صاف کر کے اس نے بے اندازہ دولت سمیٹ لی تھی۔ اسی لئے اسے فلورنس شہر میں بے حد عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا گھر ایک بڑے محل کی صورت میں وسیع و عریض قطعہ اراضی پر پھیلا ہوا تھا جہاں دن کے وقت بھی سورج کی روشنی صرف تنگ کھڑکیوں کے ذریعے ہی اندر پہنچ پاتی تھی۔ یہ بھی اس کی عقل مندی کی دلیل تھی کیونکہ امیر آدمی کا گھر ایک قلعہ ہونا چاہیے تاکہ مکاری سے ہتھیائی ہوئی دولت کی حفاظت طاقت سے کی جا سکے۔

اسی طرح کھڑکیوں میں آہنی سلاخیں لگائی گئی تھیں اور دروازوں پر زنجیر سر شام ہی چڑھا دی جاتی تھی۔ گھر کی بیرونی دیواروں پر زہین، ہنرمندوں سے نقاشی کرائی گئی تھی۔ اس میں نیکی کی نسوانی شبیہیں تھیں نیز قبائلی سرداروں، بنی اسرائیل کے بادشاہوں اور پیغمبروں کی تصویر کشی کی گئی تھی، کمروں میں آویزاں پردوں پر سکندر اعظم اور اسی قبیل کے دیو مالائی کرداروں کی عکاسی تھی۔ نکولس نیرلی نے پل، چاہ اور تالاب کی صورت شہر میں نام کے اسباب کھڑے کر رکھے تھے۔ شہر پناہ سے باہر ایک عالی شان سرائے تعمیر کی تھی جس کی دیواروں پر اس کی اپنی زندگی کے کارہائے نمایاں کی عکاسی کی گئی تھی۔ سانتا میریا کے گرجے کی تعمیر میں اس نے جس طور دل کھول کر چندہ دیا اس کی شکر گزاری کے لئے گرجا میں نمایاں جگہ پر اس کا مجسمہ نصب کیا گیا۔ اس مجسمے میں نکولس نیرلی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، مقدس مریم کے قدموں میں، گھٹنوں کے بل جھکا تھا اور اپنی سرخ ٹوپی، پشمینے کے عمامے اور شاہی چہرے کے طول و عرض میں غرق گول گول آنکھوں سے صاف پہچانا جاتا تھا۔ اس کی نیک بیوی بھی مقدس مریم کے دوسری طرف سرنگوں تھی۔ اس خاتون کی صورت پر ایسی سوگواری برستی تھی کہ اس کی صحبت سے تلذذ اٹھانے کی خواہش ہی دیکھنے والوں کے دل میں دم توڑ دیتی تھی۔

نکولس نیرلی کو سرکار دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ اس نے کبھی کسی قانون کے خلاف زبان نہیں کھولی تھی۔ غریب غربا سے اسے طبعاً تنفر تھا۔ ملک و قوم کے باغیوں سے اسے کوئی واسطہ نہیں تھا

چنانچہ اپنی بے پناہ دولت کے بل پر اس نے جو عزت کمائی تھی، وہ روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

سردیوں کی ایک شام وہ گھر کو لوٹ رہا تھا۔ اسے معمول سے کچھ دیر ہو چکی تھی۔ گھر کی دہلیز پر نیم عریاں درویشوں کے ایک ہجوم نے اسے گھیر لیا اور ہاتھ پھیلائے بھیک مانگنے لگے۔

اس نے سخت سست کہہ کر اپنی جان چھڑانا چاہی مگر وہ مارے بھوک کے بھیڑیوں کی طرح نڈر ہو رہے تھے۔ انہوں نے اس کے گرد دائرہ بنا لیا اور اپنی پھٹی ہوئی قابل رحم آوازوں میں روٹی کا مطالبہ کرنے لگے۔ وہ جھک کر انہیں مارنے کے لئے پتھر اٹھانا چاہتا تھا۔ اچانک اس کی نظر اپنے ملازم پر پڑی جو روٹیوں کی ٹوکری سر پر اٹھائے گھر سے نکل رہا تھا۔ یہ روٹیاں اصطبل کے سائیسوں، خانساموں اور مالیوں کے لئے جا رہی تھیں۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے ملازم کو بلایا اور دونوں ہاتھ ٹوکری میں ڈال کر کچھ روٹیاں نکالیں اور بھوکوں کی طرف اچھال

دیں۔ گھر میں داخل ہو کر وہ بستر کی طرف گیا اور تکیے پر سر رکھتے اسے نیند آ گئی۔ رات کے وقت اس پر مرگی کا حملہ ہو گیا۔ اس کی موت اس سرعت سے حملہ آور ہوئی کہ وہ اپنے خیال میں ابھی بستر پر ہی تھا کہ اس نے خود کو کال کوٹھری جیسی کسی جگہ پر پایا، جہاں فرشتہ مائیکل اپنے وجود سے نکلتی روشنی میں نہایا بڑے انہماک سے ترازو ہاتھ میں تھامے پلڑوں میں کچھ رکھ رہا تھا۔

نکولس نے دیکھا کہ نیچے جھکے پلڑے میں کچھ جواہرات تھے جو بیوہ عورتوں نے اس کے پاس رہن رکھوائے تھے سونے کے وہ ٹکڑے تھے جو وہ گاہکوں کے زیورات سے چھیل لیا کرتا تھا۔ سونے کے سکے تھے جو اس نے سود یا دھوکہ دہی سے کمائے تھے۔ نکولس نیرلی کو یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ خود اس کی زندگی کا ما آل تھا، جس کی منصفی اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہی تھی۔

''جناب عالی!'' اس نے کہا۔ ''اگر آپ کی طبیعت پر بار نہ ہو تو یہ عرض کروں کہ اگر آپ ایک پلڑے میں میرے افعال بد رکھ رہے ہیں تو دوسرے پلڑے میں میری وہ نیکیاں رکھنا نہ بھولیں جن کا ایک عالم میں شہرہ تھا۔ سانتا میریا کے گرجا گھر کو مت بھولئے جس کی تعمیر کے ایک تہائی اخراجات میں نے برداشت کئے تھے اور پھر شہر پناہ سے باہر وہ سرائے جسے میں نے اپنی جیب سے تعمیر کروایا۔''

''فکر مت کرو، نکولس نیرلی۔'' فرشتے نے جواب دیا۔ ''مجھے بھولنے کی عادت نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سانتا میریا کا گرجا اور منقش دیواروں والی سرائے اٹھا کر دوسرے پلڑے میں ڈال دی مگر پلڑے میں کوئی جھکاؤ پیدا نہ ہوا۔

فلورنس کا بینکار کچھ پریشان ہو گیا۔

''محترم سینٹ مائیکل! دوبارہ توجہ فرمایئے! آپ نے پلڑے میں مقدس پانی کا وہ فوارہ تو رکھا ہی نہیں جو میں نے سان گیوانی کے گرجا گھر میں بنوایا تھا اور سینٹ اینڈریا کا وہ منبر بھی مجھے نظر نہیں آ رہا جس پر یسوع مسیح کے بپتسمہ کی قد آدم عکاسی تھی۔ اس منبر کے لئے مجھے فنکار کو خاصی رقم دینا پڑی تھی۔''

فرشتے نے منبر اور فوارہ اٹھا کر سرائے کے اوپر رکھ دیئے مگر میزان میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ نکولس نیرلی کو لگا اس کا ماتھا ٹھنڈے پسینے سے بھیگتا جا رہا تھا۔

''محترم! کیا آپ کو یقین ہے کہ میزان میں کوئی خرابی نہیں ہے؟''

فرشتے نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بتایا کہ یہ پیرس کے آڑھتیوں یا وینس کے تاجروں کا میزان نہیں تھا لہٰذا اس کے درست ہونے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔

''خوب!'' نکولس نے گہری سانس لے کر کہا۔ اس کا رنگ چونے کی طرح سفید پڑتا جا رہا تھا۔ ''گویا گرجا، فوارہ، منبر اور بے شمار بستروں والی سرائے کا وزن کسی پرندے کے پر کے برابر بھی نہیں ہے۔''

''تم خود ہی دیکھ لو!'' فرشتے نے جواب دیا۔ ''تمہاری گمراہیوں کے مقابلے میں تمہاری بر خود غلط نیکیاں پر کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتیں۔''

''پھر تو مجھے جہنم میں جانا ہو گا۔'' نکولس تقریباً رو دیا۔ دہشت کے مارے اس کے دانت بجنا شروع ہو گئے۔

''صبر! نکولس نیرلی، صبر!'' منصف فرشتے نے بڑے رسان سے کہا: ''ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا۔ ابھی کچھ افعال کا وزن ہونا باقی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے وہ سیاہ روٹیاں اٹھائیں جو نکولس نے درویشوں میں بانٹی تھیں اور نیکیوں والے پلڑے میں ڈال دیں۔ یکا یک میزان میں حرکت پیدا ہوئی۔ ایک پلڑا اوپر کو اٹھا دوسرا نیچے جھکا اور دونوں پلڑے متوازن ہو گئے۔ ترازو کی ڈنڈی افقی سطح کے عین متوازی تھی، عموداً کھڑی ہوئی ظاہر کر رہی تھی کہ دونوں پلڑے میں ایک جیسا وزن تھا۔

بینکار کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر مہربان فرشتہ بڑی سنجیدگی سے گویا ہوا:

''سنو نکولس نیرلی! تمہارے اعمال ظاہر کرتے ہیں کہ تم ابھی جنت اور جہنم میں سے کسی کے بھی حقدار نہیں ہو۔ فلورنس واپس چلے جاؤ اور شہر والوں میں وہی روٹیاں بانٹو جو تم نے پچھلی رات کے جھٹپٹے میں اس وقت گداگروں کو دی تھیں جب کوئی تمہیں دیکھنے والا نہیں تھا۔ تمہاری نجات ہو جائے گی۔ خدا کی رحمتیں لامحدود ہیں۔ اگر وہ توبہ کرنے والے چور کو بخش سکتا ہے آنسو بہانے والی فاحشہ کی مغفرت کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ کوئی شخص محض اپنی دولت کے کارن جہنم میں چلا جائے مگر وہ روٹیاں تقسیم کرنا نہ بھولنا جنھوں نے آج میرے میزان کو تلپٹ کر دیا تھا۔ بس اب چلتے بنو!''

اور نکولس اپنے بستر میں بیدار ہو گیا۔ اس نے اپنے دل میں عہد کیا کہ پوری ایمانداری سے فرشتے کی نصیحت پر عمل کر کے جنت میں داخلے کا استحقاق حاصل کرے گا۔

اس پہلی موت کے بعد وہ مزید تین برس جیا۔ اس عرصے میں وہ ناداروں کا دوست رہا اور دل کھول کر ان کی مدد کرتا رہا۔

دنیا کے عظیم افسانوں میں سے ایک

دیوار

ایک انقلابی کی سرگزشت،
اس نے تقدیر کے مقابل تدبیر آزمائی

جین پال سارتر / صغیر ملال

آخر کار انہوں نے ہمیں ایک بڑے سفید کمرے میں دھکیل دیا۔ کمرے کے وسط میں ایک میز کے پیچھے چار آدمی سر جھکائے کاغذات کی جانچ پڑتال میں مصروف تھے۔ کمرے کے کونے میں بہت سے گرفتار شدگان سر جھکائے کھڑے تھے۔ پہلی قطار میں دو بھورے بالوں والے غیر ملکی قیدی تھے۔ ان کی شکلوں میں خاصی مماثلت تھی۔ غالباً دونوں فرانسیسی تھے۔ چھوٹی عمر والا غیر ملکی، خوف دور کرنے کے لیے بار بار اپنی پتلون کو کھینچ کر اوپر کر رہا تھا۔

کارروائی مکمل ہونے میں تقریباً تین گھنٹے صرف ہوئے۔ تھکن کے باعث میرا بدن نڈھال اور دماغ سوچنے سے عاری ہو چکا تھا۔ چوبیس گھنٹے تک سردی کی شدت سے کانپنے کے بعد اب اس کمرے کی حرارت مجھے بہت خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔

سپاہی ایک ایک کر کے قیدیوں کو میز کے سامنے لے جا رہے تھے، جہاں ان سے کم و بیش یکساں باتیں پوچھی جا رہی تھیں۔

''پورا نام کیا ہے؟''

''کہاں کہاں گئے اور کیا کرتے رہے؟''

عام طور پر یہی دو سوال کئے جاتے۔ کبھی کبھی ان سوالات سے تجاوز کیا جاتا۔

''اسلحے کی تباہی میں تم بھی شریک تھے؟''

''نو تاریخ کی صبح تم کہاں تھے؟''

وہ جواب سننے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ سوال کرنے کے بعد وہ سامنے کھڑے قیدی کو غور سے دیکھتے اور پھر سر جھکا کر کاغذوں پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔

''تم انٹرنیشنل بریگیڈ کے لئے کام کرتے رہے ہو؟'' انہوں نے ٹام سے پوچھا، اور جواب سنے بغیر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

جون سے انہوں نے صرف اس کے نام کی تصدیق چاہی اور پھر دیر تک کاغذوں پر کچھ تحریر کرتے رہے۔

''میرا بھائی ان کے لئے کام کرتا رہا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میرا کسی جماعت سے تعلق نہیں۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' جون بولتا رہا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں بتا رہا ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ دوسروں کے اعمال کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔'' جون کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ایک گارڈ اسے کھینچتا ہوا لے گیا۔ اس کے بعد میری باری تھی۔

''تمہارا نام پابلو ہے؟''

''ہاں''۔ میں نے جواب دیا۔

''ریمون کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''چھ سے انیس تک تم نے اسے اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔''

''آپ کو غلط اطلاع ملی ہے۔''

وہ سر جھکائے قلم چلانے لگا۔ اور ایک گارڈ مجھے دھکیلنے لگا۔

بڑے کمرے میں ٹام اور جون دو گارڈز کے درمیان میرا انتظار کر رہے تھے۔

''یہ ابتدائی کارروائی تھی یا مقدمہ ختم ہو گیا؟'' ٹام نے گارڈز سے پوچھا۔

''یہ مقدمہ تھا۔'' ایک گارڈ نے جواب دیا۔

''تو اب۔۔۔ اب کیا ہوگا؟''

''تمہاری کوٹھڑی میں فیصلہ سنا دیا جائے گا۔''

ہماری کوٹھڑی میں بے پناہ ٹھنڈ تھی۔ ہم نے ساری رات کانپتے ہوئے گزاری صبح کے وقت بھی درجہ حرارت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ جون تمام وقت خاموش بیٹھا رہا۔ کم سنی اور ناتجربہ کاری کے باعث وہ خوف سے گنگ ہو گیا تھا البتہ ٹام ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔

کوٹھڑی میں ایک بنچ اور چار کمبل پڑے تھے۔ عدالت سے آ کر ہم الگ الگ کمبلوں پر بیٹھ گئے تھے۔

''غالباً ہم ٹھکانے لگ گئے۔'' ٹام نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر چھوٹا بابا بے ڈر رہا ہے۔ اسے وہ کچھ نہیں کہیں گے۔''

''کسے؟ جون کو؟ ہاں، یہ جوزے کا چھوٹا بھائی ہے۔ جوزے نے ان کے خلاف جان کی بازی لگا دی ہے۔''

میں نے جون کی سمت دیکھا۔ وہ بدستور سکتے کے عالم میں دیوار پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔

کوٹھڑی کے جن سوراخوں سے صبح کی روشنی اندر آئی، اچانک انہی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے داخل ہو کر ہلچل مچا دی۔ جون سردی سے کانپنے لگا۔

''خدا کی پناہ!'' وہ دانت کٹکٹا کر بولا۔ ''میں تو سزا پانے سے پہلے سردی سے اکڑ کر مر جاؤں گا۔''

ٹام نے خود کو گرم کرنے کے لیے ورزش شروع کر دی۔ ٹام مضبوط جسم کا مالک تھا مگر عمر ڈھلنے کے ساتھ اس کے بدن پر موٹاپے کے آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ اسے ورزش کرتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ کل کسی وقت اس کے فربہ وجود میں گولیاں اور سنگینیں یوں اتریں گی جیسے مکھن کی ٹکیہ میں چھری اترتی ہے۔

شدید سردی کے باعث مجھے کبھی یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے میرے بازو میرے وجود سے الگ ہو گئے ہوں۔ ایسے لمحوں میں مجھے اپنا جیکٹ یاد آتا جو انہوں نے مجھ سے چھین لیا تھا۔ انہوں نے ہمارے سارے کپڑے اتروا کر اپنے سپاہیوں کو پہنا دیئے تھے اور ہمیں اس سوتی پاجامے کرتے میں ملبوس کر دیا تھا جو ہسپتال کے مریضوں کا گرمیوں کا لباس ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر ورزش کے بعد، ٹام سانس درست کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔

''کچھ گرمی آئی؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں۔'' اس نے برا منہ بنا کر کہا۔ ''مگر سانس پھول گیا۔''
آٹھ بجے کے قریب ایک فوجی افسر سپاہیوں کے ساتھ ہماری کوٹھڑی میں آیا۔
''ان تین کے نام کیا ہیں؟'' افسر نے ہمارے گارڈ سے سوال کیا۔
''ٹام، جون اور پابلو۔'' گارڈ نے جواب دیا۔
افسر نے عینک درست کی، اور ہاتھ میں تھامی فہرست کو غور سے دیکھا۔
''ٹام۔۔۔ ٹام۔۔۔ یہ ہے۔ ٹام، تمہیں موت کی سزا دی گئی ہے۔ کل صبح تمہیں گولی ماردی جائے گی۔''
یہ کہہ کر وہ پھر فہرست پر جھک گیا۔
''اور۔۔۔ تم دونوں کو بھی۔ جون اور پابلو۔ سزائے موت۔'' اس نے فہرست پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔
''یہ ناممکن ہے۔'' جون چیخ پڑا۔
افسر نے اسے حیرت سے دیکھا۔
''تمہارا نام کیا ہے؟''
''جون مربل۔''
''یہ۔۔۔ یہاں تمہارا نام ہے۔'' افسر نے اطمینان سے تصدیق کی۔
''۔۔۔ اور تمہیں موت کی سزا دی گئی ہے۔''
''لیکن میں نے کچھ نہیں کیا۔'' جون کی آواز میں وحشت تھی۔
افسر نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور ہم دونوں کی جانب رخ کر کے بولا۔ ''کچھ دیر میں تم لوگوں کے پاس ایک ڈاکٹر آئے گا۔ اسے رات بھر تمہارے پاس رہنے کی اجازت ہے۔''
یہ کہہ کر افسر فوجی انداز میں ایڑیوں پر گھوم کے چلا گیا۔
''میں نے کیا کہا تھا۔'' ٹام فوراً بولا۔ ''ہم ٹھکانے لگ گئے ہیں۔''
''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''مگر چھوٹے کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔''
میں نے یہ بات کہہ تو دی تھی مگر حقیقت یہ تھی کہ مجھے چھوٹے پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ خوف کی زیادتی سے ٹیڑھا ہو گیا تھا اور نقوش عجیب انداز میں مسخ ہو گئے تھے۔ اس کی یہ حالت مجھے بے چین کر رہی تھی جس کے باعث مجھے اس پر غصہ آنے لگا تھا۔ تین دن پہلے تک وہ محض ایک بچہ تھا لیکن اب وہ کسی دوسرے سیارے کی بوڑھی مخلوق لگ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب اگر اسے رہائی مل بھی گئی تو وہ دوبارہ کبھی بچہ نہیں لگے گا۔ ممکن ہے وہ ہمدردی کا مستحق ہو لیکن مجھے ہمدردی کرتے ہوئے متلاہٹ ہوتی ہے۔ سزا سننے کے بعد وہ خاموشی سے زرد ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ ٹام نے رحم کے جذبے سے مغلوب ہو کر اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کرنا چاہا مگر اس نے خود کو نہایت شدت سے کونے میں سمیٹ لیا اور چہرہ بگاڑ کر ٹام کو گھورا۔
''اسے چھوڑ دو ٹام۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''یہ دھاڑیں مارنے والا ہے۔'' ٹام چاہتا تھا کہ چھوٹے کو تسلی دے، اس سے ہمدردی کرے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس عمل میں مصروف رہنے کے باعث خود اس کا دل بھی بہلا رہے گا۔ اور یوں وہ اپنے بارے میں سوچنے سے بچ جائے گا۔ مجھے ٹام کی یہ حرکت بری لگ رہی تھی۔ میں نے بھی پہلے کبھی موت کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔
پہلے کبھی موت واضح طور پر میرے سامنے آئی ہی نہیں تھی، مگر اب جبکہ موت سامنے تھی میں اس کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ میں اپنے جسم میں داخل ہوتی گولیوں کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ مرنے سے پہلے چیخ مارنے کی فرصت ملتی ہو گی یا نہیں؟ تمام گولیاں جسم پار کرتی ہوئی دوسری سمت نکل جاتی ہیں یا۔۔۔؟ مجھے جلدی نہیں تھی ان باتوں پر غور کرنے کے لئے میرے پاس تمام رات پڑی تھی۔
کچھ دیر بعد ٹام بھی خاموش ہو گیا۔ میں نے کنکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ بھی پیلا پڑ رہا تھا۔ میں نے سر اٹھایا اور چھت کے سوراخ سے ایک ستارہ چمکتے دیکھا۔ سرد اور شفاف رات کی ابتداء ہو چکی تھی۔
دروازہ کھلا اور دو گارڈز داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ بھورے بالوں والا ایک وردی پوش شخص تھا۔ ''میں ڈاکٹر ہوں۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔ ''جہاں تک ممکن ہوا، میں اس دردناک صورت حال میں آپ کی مدد کروں گا۔''
''تم کیا کرو گے؟'' میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔
''جو تم کہو گے۔ تمہاری زندگی کے آخری چند گھنٹے خوشگوار بنانے کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں ہمدردی تھی۔
''تم ہمارے ہی پاس کیوں آئے؟ اور بہت سے ہیں۔ قید خانہ بھرا ہوا ہے۔''
''مجھے یہاں بھیجا گیا۔ میں یہاں آ گیا۔'' اس کی آواز دھندلا گئی۔ پھر وہ فوراً سنبھل گیا۔ ''تم سگریٹ پیتے ہو؟ میرے

پاس سگریٹ ہیں۔ سگار بھی ہیں۔''

''نہیں۔ شکریہ۔'' میں نے سگریٹ لینے سے انکار کر دیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔

میں چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا اور پھر یکا یک اس کی موجودگی سے لاتعلق ہو گیا۔ دونوں گارڈز فرش پر بچھے ایک کمبل پر بیٹھ گئے۔ طویل القامت گارڈ جس کا نام پیڈرو تھا اپنی انگلیاں چٹخا رہا تھا جب کہ دوسرا گارڈ نیند کے غلبے سے نجات حاصل کرنے کے لئے بار بار اپنا سر جھٹک رہا تھا۔

میں نے پشت سیدھی کی اور اپنے دونوں ساتھیوں پر نظر دوڑائی۔ ٹام اپنا سر گھٹنوں پر رکھے بیٹھا تھا۔ جون قابل رحم حالت میں تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور نتھنے پھول رہے تھے۔

ڈاکٹر نے جون کی کلائی تھام کر اس کی نبض کی رفتار معلوم کرنی چاہی۔ جون نے خاموشی سے اپنا بازو ڈاکٹر کی جانب بڑھا دیا اور بدستور کھلے منہ کے ساتھ نتھنے پھلاتا رہا۔

معلوم نہیں کیوں میں ڈاکٹر کی اس حرکت پر جھنجھلا گیا۔ ''کتے کا بچہ۔'' میں نے خود کو بڑبڑاتے سنا۔ ''میرے پاس آیا تو حرامی کا جبڑا توڑ دوں گا۔''

وہ میرے پاس تو نہیں آیا مگر چھوٹے سے فارغ ہو کر بہت دیر تک مجھے دیکھتا رہا۔ میں حیران ہوا کہ وہ مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہا ہے۔

''بہت ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ کیا خیال ہے۔'' اس نے عجیب انداز میں مجھ سے پوچھا۔

''مجھے تو محسوس نہیں ہو رہی۔'' میں نے جواب دیا لیکن وہ حسب سابق مجھے غور سے دیکھتا رہا۔

اچانک مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھو کر دیکھا۔ میرا چہرہ پسینے میں تر تھا۔ یہ عجیب انکشاف تھا۔ اس قدر سردی میں میرا بدن پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ میرے سر کے بال گیلے ہو کر اکڑ گئے تھے۔ کپڑے جسم سے چسپاں تھے۔ میں تقریباً ایک گھنٹے سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ لیکن اپنی حالت سے بے خبر تھا۔ ڈاکٹر نے میرے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکتے دیکھے تھے اور سمجھ گیا تھا کہ میں خوف کی شدت سے پگھل رہا ہوں۔ وہ خاموشی سے میری اس حالت کا تجزیہ کر رہا تھا۔

میرا جی چاہا کہ ڈاکٹر کا چہرہ نوچ لوں۔ میں اس ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر اچانک مجھے میرا غصہ بے جا معلوم ہوا۔ اور میں نے خود پر لاتعلقی کی کیفیت طاری ہوتے محسوس کی۔ میں نے کندھے اچکائے اور بنچ پر بیٹھ گیا۔

بنچ پر بیٹھ کر میں اپنے جسم کا پسینہ پونچھنے لگا۔ جلد ہی میرا رومال لبریز ہو گیا مگر میرے بدن سے پسینہ بدستور نمودار ہوتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے پسینہ خشک کرنے کی کوشش ترک کر دی اور خود کو ایڑی سے چوٹی تک بھیگتے محسوس کرنے لگا۔

''تم ڈاکٹر ہو۔ ہیں؟'' یکلخت جون نے سوال کیا۔

''ہاں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''بہت دیر تک تکلیف ہوتی ہے۔ ہیں؟''

''کب؟ اوہ، اس وقت۔ نہیں'' ڈاکٹر نے ہمدردی سے کہا۔

''سب کچھ جلدی ہو جاتا ہے۔''

''لیکن میں۔۔۔ کچھ لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ کبھی کبھی۔۔۔ کبھی کبھی دوسری مرتبہ بھی فائر کرنا پڑتا ہے۔''

''کبھی کبھی، ہاں، پہلی مرتبہ چلائی جانے والی گولیاں اہم اعضاء کو چھوئے بغیر پار ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں۔ کبھی کبھی۔ ہاں۔''

''تو پھر وہ اپنی بندوقوں میں دوبارہ گولیاں بھرتے ہوں گے۔''

''ہاں''

''مگر اس میں وقت لگتا ہے۔'' چھوٹے کی آواز میں لرزش تھی۔ چھوٹا جسمانی اذیت کے خیال سے خوف زدہ تھا۔ یہ اس کی عمر کا تقاضا تھا۔ مجھے ایسی کوئی تشویش نہیں تھی۔ پسینہ آنے کی کوئی اور بھی وجہ ہو سکتی ہے۔

میں نے ٹام کی جانب نظریں دوڑائیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ بھی پسینے میں بھیگا ہوا ہے۔ اس منظر سے بچنے کے لیے میں نے سر اٹھایا تو چھت کے سوراخ سے آسمان نظر آیا۔ کہکشاں اسی ترتیب کے ساتھ موجود تھی۔ لیکن آج ستارے مختلف دکھائی دیتے تھے۔ جب میں اپنے گھر سے آسمان دیکھا کرتا تھا تو میرے احساسات اور ہوتے تھے۔ صبح کے وقت آسمان کا گہرا نیلا رنگ دیکھ کر مجھے بحر اوقیانوس کے روشن اور خوبصورت ساحلوں کا خیال آتا تھا۔ دوپہر کے وقت مجھے دور افتادہ جزیرے کا وہ چھوٹا سا مے خانہ یاد آتا جہاں منہ کا ذائقہ درست رکھنے کے لئے شراب کے ساتھ زیتون کا اچار پیش کیا جاتا تھا۔ شام کے وقت جب سائے دراز ہوتے تو میں کھیل کے اس میدان کے بارے میں سوچتا جس کے نصف حصے میں چھاؤں پھیل جاتی تھی اور نصف حصہ روشن رہتا تھا۔ اور جب مجھے خیال آتا کہ زمین بھی یونہی آدھی روشن اور آدھی تاریکی میں ڈوبی آسمان کی وسعت میں گھوم رہی ہے تو میرے سینے میں درد کی لہر اٹھتی تھی۔ مگر اس کوٹھڑی سے آسمان دیکھنے پر مجھے ماضی

کی کوئی چیز یاد نہیں آئی تھی۔ میں نے آسمان سے نظریں ہٹا کر ایک گہرا سانس لیا اور ٹام کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔

بالآخر ٹام نے بولنا شروع کیا۔ خیالات کی یلغار سے بچنے کے لئے وہ گفتگو کرنے پر مجبور ہو گیا تھا وہ میری جانب دیکھے بغیر دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ میرا رنگ زرد ہو گیا تھا اور میں پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ٹام کا بھی یہی خیال تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے آئینہ بن گئے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ میری طرف دیکھے بغیر باتیں کر رہا تھا۔ البتہ کبھی کبھی وہ ڈاکٹر کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت کوٹھڑی میں فقط ڈاکٹر ایک زندہ شخص ہے۔

''تمہاری سمجھ میں آ رہا ہے؟ میں تو کچھ نہیں سمجھ پا رہا۔'' ٹام نے طویل گفتگو کے اختتام پر کہا۔

''کیا سمجھنا چاہ رہے ہو۔''

''ہمارے ساتھ کچھ ہونے والا ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''فکر مت کرو۔ سب سمجھ میں آ جائے گا۔'' میں نے کہا۔

اچانک مجھے ٹام کے پاس سے عجیب سی مہک اٹھتی محسوس ہوئی۔ عام حالات میں میری ناک اتنی حساس نہیں تھی۔ میں نے نتھنے پھلا کر حقیقت معلوم کرنی چاہی۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' ٹام مسلسل بول رہا تھا۔ ''میں بزدل نہیں ہوں لیکن کچھ پتہ تو چلے۔ دیکھو میں جانتا ہوں وہ ہمیں احاطے میں لے جائیں گے۔۔۔ ٹھیک ہے؟؟ تمہارا کیا خیال ہے کتنے لوگ ہوں گے؟''

''کیا؟ ہاں، لوگ!! معلوم نہیں۔ پانچ۔۔۔ یا آٹھ۔ اس سے زیادہ تو نہیں ہوں گے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ فرض کیا وہ آٹھ ہوں گے۔ کوئی چیخ کر انہیں نشانہ باندھنے کا حکم دے گا۔ ٹھیک ہے؟ فوراً مجھ پر آٹھ بندوقیں تن جائیں گی۔ میں دیوار کے دوسری طرف نکل جانے کی کوشش کروں گا۔ پوری طاقت لگا دوں گا۔ لیکن دیوار ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے گی۔ جیسے ڈراؤنے خوابوں میں ہوتا ہے۔۔۔ میں جانتا ہوں ہمارے ساتھ کیا ہوگا۔ مگر سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''مت سوچو۔'' میں نے کہا۔ ''سب جانتے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔''

''بہت مشکل ہوتی ہوگی۔ سنا ہے چہرہ بگاڑنے کے لئے خاص طور پر آنکھوں اور منہ کا نشانہ لیتے ہیں۔ کتے۔'' ٹام کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔ ''مجھے تو ابھی سے اپنے بدن میں سوراخ ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔۔۔ ایک گھنٹہ ہو گیا چہرے اور گردن میں درد ہو رہا ہے۔ اصل میں تو یہ درد کل محسوس ہوگا۔ اور اس کے بعد۔۔۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ ہیں؟''

میں جانتا تھا وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے، مگر میرے لیے انجان بنے رہنا بہتر تھا۔ جہاں تک درد کا تعلق تھا میں خود اپنے بدن میں سوراخ ہوتے محسوس کر رہا تھا۔ اس لحاظ سے میں بھی اس جیسا تھا۔

ٹام دوبارہ بولنا شروع ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بدستور ڈاکٹر پر گڑی تھیں، جبکہ ڈاکٹر ہر چیز سے لاتعلق تھا۔ میں ڈاکٹر کے آنے کا مقصد جانتا تھا۔ وہ ہماری باتیں سننے نہیں آیا تھا۔ وہ ہمارے جسموں کی نگہداشت پر مامور تھا۔ ہمارے جسم، جو زندگی ہی میں مر رہے تھے۔

''بالکل جس طرح بھیانک خوابوں میں ہوتا ہے۔'' ٹام بولے چلا جا رہا تھا۔ ''ٹھوس چیزیں ہاتھ سے نکل جاتی ہیں۔ دھوئیں کی طرح یا جیسے ہوا یا بادل۔ یا کوئی بھی چیز۔ کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آتا۔ گولیاں اور سوراخ اور درد۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، مگر کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ میں خود اپنی لاش دیکھنے لگتا ہوں۔ عام بات نہیں ہے۔ خود اپنی لاش اپنی آنکھوں سے۔ اپنی لاش کون دیکھنا چاہتا ہے؟ میں کچھ نہیں دیکھنا چاہتا۔ آنکھیں بند کر لوں؟ میں تو کچھ سننا بھی نہیں چاہتا۔ دنیا دوسروں کے لئے قائم رہے، مجھے کیا ہے۔ میں نے دو راتیں جاگ کر گذاری ہیں۔ حد ہوتی ہے آدمی بکھر جاتا ہے۔ پابلو یقین کرو۔ میں کسی چیز کا انتظار کر رہا ہوں، مگر یہ وہ چیز نہیں ہے۔

وہ چیز تو ہمیں پیچھے سے پکڑ لے گی۔ بے خبری میں۔۔۔''

''بکواس بند کرو۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''پادری کو بلاؤں؟ وہی تمہاری سنے گا۔''

مجھے ٹام کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اب اگر ہمیں ساتھ مرنا پڑ رہا تھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں اسے پسند کرنے لگوں۔ اس وقت ریمون میرے ساتھ ہوتا تو صورت حال مختلف ہوتی۔ ریمون میرا دوست تھا۔ ٹام اور جون کے درمیان میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔

ٹام اب بھی بڑبڑا رہا تھا۔ میں اس کا مسئلہ سمجھ رہا تھا۔ وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے مسلسل بول رہا تھا۔ اس طرح مرنا غیر فطری تھا اور غیر فطری موت کے اس قدر نزدیک پہنچ کر مجھے ہر چیز غیر فطری لگ رہی تھی۔ بجھے ہوئے کوئلوں کا ڈھیر، بنچ، ڈاکٹر کا چہرہ۔ سب کچھ غیر فطری تھا۔ ٹام کے اور میرے احساسات ایک جیسے تھے مگر میں اس کی طرح کا رویہ نہیں اپنانا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود میں

جانتا تھا کہ ہم تمام رات ایک طرح کی باتیں سوچتے رہیں گے۔ ہمارے دھیان میں ایک جیسی چیزیں آئیں گی۔ ہم دونوں زرد پڑتے رہیں گے۔ لرزیں گے اور پسینے میں نہا جائیں گے۔ میں نے کنکھیوں سے ٹام کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر موت کا سایہ تھا۔ میری انا کو دھچکا لگا۔ ہم چوبیس گھنٹے سے ساتھ تھے۔ میں نے اس سے باتیں کی تھیں، اس کی گفتگو سنی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہم میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے اس کے باوجود اب ہم جڑواں بھائیوں کی طرح ایک جیسے نظر آ رہے تھے۔ اس لئے کہ ہمیں ساتھ مرنا تھا۔

ٹام نے میری جانب دیکھے بغیر میرا ہاتھ تھام لیا۔

''پابلو۔ حیرت ہوتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہم مرتے ہیں تو ختم ہو جاتے ہیں۔ بالکل ختم۔ ہمیشہ کے لیے۔''

میں نے کوئی جواب دیئے بغیر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''نیچے دیکھو۔ غلیظ آدمی۔''

ٹام گیلے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کی پتلون سے قطرے ٹپک رہے تھے۔

''کیا! یہ کیا ہے؟؟'' اس نے اپنے نیچے دیکھ کر خوف اور حیرت سے کہا۔

''تم اپنی پتلون گیلی کر رہے ہو۔'' میں نے اسے بتایا۔

''ناممکن ہے۔'' وہ غرایا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ میں تو کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا۔''

میں نے ڈاکٹر پر نظر ڈالی۔ وہ لاتعلقی سے گیلے فرش کو دیکھ رہا تھا۔ ''اس کی گرفت کمزور ہو گئی ہے۔'' چند لمحوں بعد ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ رائے دی۔

''میں نہیں جانتا یہ کیا ہے۔'' ٹام نے سختی سے کہا: ''میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ خدا کی قسم خوفزدہ نہیں ہوں۔''

ڈاکٹر کوئی جواب دیئے بغیر سر جھکا کر اپنی نوٹ بک میں کچھ تحریر کرنے لگا۔

میں اور ٹام ڈاکٹر کو دیکھ رہے تھے جو ن بھی ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ ہم تینوں کی نظریں ڈاکٹر پر گڑی تھیں، کیونکہ ڈاکٹر زندہ تھا۔ فقط وہ زندہ آدمیوں کی طرح مصروف تھا۔ اس کا تجسس زندگی کی نشانی تھا۔ ڈاکٹر کو سردی لگ رہی تھی۔ اس کا بدن زندہ آدمیوں کی طرح موسم سے متاثر ہو رہا تھا جبکہ ہمیں اپنے جسموں کو محسوس کرنے کے لئے خود کو چھونا پڑ رہا تھا۔ وقفے وقفے سے مجھے خیال بھی آ رہا تھا کہ شاید اب میں بھی گیلے فرش پر بیٹھا ہوں مگر شرمساری سے بچنے کے لیے میں نیچے نہیں دیکھ رہا تھا۔ ایسی صورت حال میں ہم سوائے ڈاکٹر کو دیکھنے کے اور کیا کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر اپنی ٹانگوں پر مضبوطی سے کھڑا تھا۔ اسے اپنے جسمانی اعمال پر کنٹرول تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ کل شام اور پرسوں صبح کو اس کی مصروفیات کیا ہوں گی۔ ڈاکٹر زندہ تھا اور ہم تین سائے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کے جسم سے حرارت اور خون چوس کر دوبارہ زندہ ہونا چاہتے تھے۔

اچانک میں بلند آواز سے ہنسنے لگا۔ میرے قہقہے نے ایک گارڈ کو چونکا کر دیا۔ دوسرا بدستور کھلی آنکھوں کے ساتھ سو یا رہا۔ سوئے گارڈ کی آنکھوں کا سفید حصہ نظر آ رہا تھا اور منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔

میں بیک وقت تھکن اور اضطراب کا شکار تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا کہ صبح کیا ہوگا۔ موت کے خیال سے بچنے کے لیے میں بار بار سر جھٹک رہا تھا۔ لیکن جونہی میری توجہ کسی اور چیز پر مرکوز ہوتی، مجھے بندوق کی نالیاں دکھائی دیتیں جو دھیرے دھیرے میرے چہرے کی سمت اٹھنے لگتیں۔ متعدد مرتبہ گولیاں میرے وجود کو چیرتی چلی گئیں۔ ایک بار تو مجھے بالکل یوں لگا جیسے میں واقعی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہوں۔ میں اونگھ گیا تھا۔ وہ مجھے دیوار کی سمت کھینچ رہے تھے۔ میں پوری قوت سے مزاحمت کر رہا تھا۔ نڈھال ہونے پر میں ان سے رحم کی بھیک مانگنے لگا۔ مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہو۔ گولیوں سے چھلنی ہوتے ہی میں نے چیخ مار کر آنکھیں کھول دیں۔ حواس بحال ہوتے ہی میں نے کنکھیوں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ مجھے ڈر تھا کہ شاید ڈاکٹر نے مجھے چیختے ہوئے سن لیا ہے۔ مگر ڈاکٹر ایک کونے میں بیٹھا لاتعلقی سے اپنی مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ میں پچھلے اڑتالیس گھنٹے سے جاگ رہا تھا اور اب میری آنکھوں میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ اگر میں چاہتا تو اس لمحے گہری نیند سو سکتا تھا مگر میں اپنی زندگی کے آخری چند گھنٹے سو کر نہیں گذارنا چاہتا تھا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ وہ مجھے لینے آئیں گے۔ اور میں غنودگی کے عالم میں سر جھکائے ان کے ساتھ چل دوں گا۔ شاید میں ان سے یہ نہ پوچھ سکوں گا کہ مجھے جانوروں کی طرح کیوں ہلاک کیا جا رہا ہے۔ میں مرنے سے پہلے سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے نیند کے دوران ڈراؤنے خوابوں کا بھی اندیشہ تھا۔ میں نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ موت کے خیال سے بچنے کے لئے میں ماضی کے خوشگوار لمحے دھیان میں لایا۔ کتنے دلکش چہرے تھے۔ کیسی دلچسپ باتیں تھیں، چھٹیاں، تہوار اور میلے اور جھولے، چھوٹے ماموں اور ریمون۔ شاید ریمون کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ وہ کیسا عجیب دن تھا۔ جب میں نے احتجاجی جلوس میں شرکت کی تھی اور غرناطہ کی وہ رات جو میں نے ایک بنچ پر جاگ کر گذاری

تھی۔ اس کے باوجود صبح کے وقت میں اسے مسکرا کر ملا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور آزادی کی زندگی اور خوبصورت عورتیں۔ میں نے دیوانہ وار ان کا پیچھا کیا تھا۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ میں اسپین کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ میں آزادی کی تحریک کے لئے اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ نعرے لگاتا رہا تھا۔ تقریریں کرتا پھرا تھا۔۔۔ اور اس دوران موت کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔

اب جبکہ زندگی ختم ہو رہی تھی ان ساری چیزوں کا کیا مطلب تھا؟ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ میں لڑکیوں کی صحبت میں اس قدر خوش تھا۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ میں اس طرح مروں گا تو میں تمام زندگی اپنے بستر سے اٹھنے کی زحمت بھی نہ کرتا۔ میری پوری زندگی میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ اب سب کچھ اختتام کو پہنچ گیا تھا۔۔۔ مجھے کسی بات کا زیادہ دکھ بھی نہیں تھا۔ ممکن ہے عام حالات میں مجھے کچھ چیزیں چھوڑنے کا افسوس ہوتا۔ اپنے پسندیدہ کھانوں کا ذائقہ یاد آتا۔ یا میں اس پرسکون جھیل کے تصور سے افسردہ ہوتا جہاں میں گرمیوں کی دوپہروں میں تیرا کرتا تھا۔ لیکن موت نے تمام چیزوں کی دلکشی چھین لی تھی۔

''دوستو!'' اچانک ڈاکٹر نے ہمیں مخاطب کیا''۔۔۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارا آخری پیغام تمہارے پیاروں تک پہنچا دوں گا۔''

''میرا کوئی نہیں ہے۔'' ٹام ناگواری سے بولا۔

میں خاموش رہا۔

ٹام میری خاموشی پر حیران ہوا۔

''کانشہ! تم ''کانشہ'' کے نام کوئی پیغام نہیں بھجواؤ گے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

آج میرے لیے کانشہ کی اہمیت مختلف تھی۔ کل تک میں اس سے پانچ منٹ بات کرنے کے لئے اپنا بازو کٹوانے پر رضامند ہو جاتا۔ اسی لئے میں نے کل ٹام سے کانشہ کا ذکر کر دیا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اب کانشہ میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ بات کرنا تو درکنار اب میں کانشہ کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جب سے میرا بدن پیلا پڑا تھا، اور میں پسینے میں نہا گیا تھا، مجھے اپنے بدن سے کراہت آنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کانشہ کے بدن کی یاد سے بھی متلاہٹ ہونے لگی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جب اسے میری موت کی اطلاع ملے گی تو وہ روئے گی زندگی میں اس کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ کئی دنوں تک وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلے گی۔ مگر بہرحال وہ زندہ رہے گی۔۔۔ جبکہ میں مر رہا تھا۔ مجھے اس کی خوبصورت آنکھیں یاد آئیں۔ جب وہ میری طرف پیار سے دیکھتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی نہایت لطیف چیز اس کے وجود سے نکل کر مجھ میں داخل ہو رہی ہے لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس لمحے وہ مجھے دیکھے گی تو مجھ پر اس کی نظروں کا قطعی کوئی اثر نہیں ہو گا۔۔۔ اس مرحلے پر میں تنہا تھا۔

ٹام بھی تنہا تھا۔ گو اس کی تنہائی کا انداز مختلف تھا۔

اس وقت وہ بنچ کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے بازو بڑھا کر لکڑی کو چھوا۔ اور پھر فوراً ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے چہرے پر خوف کا ایسا تاثر ابھرا جیسے اس نے نادانستگی میں کوئی چیز توڑ دی ہو۔ وہ دوبارہ کانپنے لگا۔ مجھے ٹام کی حالت پر حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے خود یہ احساس ہو رہا تھا کہ چیزیں مضحکہ خیز انداز میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ دیواروں کا رنگ بھی پیلا پڑ رہا تھا۔ بنچ کی لکڑی، لالٹین یا کوئلوں کی راکھ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ ہم مرنے والے ہیں۔ تمام چیزیں ایک فاصلے پر کھڑی سر جوڑے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بستر مرگ پر پڑے مریض کے تیمار دار کمرے کے ایک کونے میں دائرہ وار کھڑے دبے لہجے میں اس کی موت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں۔

میں اس حالت کو پہنچ چکا تھا کہ اب اگر بتایا جاتا کہ مجھے آزاد کر دیا گیا ہے تو میں اپنی جگہ منجمد ہو جاتا۔ ایک مرتبہ اپنے فانی ہونے کا احساس ہو جائے تو موت میں چند گھنٹے یا چند برسوں کی تاخیر ایک ہی بات لگتی ہے۔ ایک لحاظ سے میں بالکل مطمئن ہو چکا تھا۔ اب کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن خوفناک بات یہ تھی کہ میرا بدن میری مرضی کے بغیر کانپ رہا تھا اور میرے کپڑے پسینے میں یوں تر بتر تھے جیسے میرا وجود اندر ہی اندر پگھل کر ختم ہو جائے گا۔ میں نے خود کو چھوا، ہاتھ سے محسوس کیا، یوں جیسے میں کسی اور کے بدن کو ہاتھ لگا رہا ہوں۔ یہ میرا جسم تھا۔ اس میں ایک دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ چیزیں جسم سے باہر آ رہی تھیں کچھ اپنی جگہ ٹھہری ہوئی تھیں۔ پورا وجود ایک انجانے بھاری پن میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ساتھ چمٹ جانے والا مکروہ جاندار۔ یکلخت مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی کیڑے کے اندر قید ہوں۔

''ساڑھے تین بج گئے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

ہم چونک گئے۔ ہم بھول گئے تھے کہ وقت گذر رہا ہے۔ رات ایک سیاہ عفریت کی طرح ہمیں اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ شام کب اختتام کو پہنچی؟ رات کب شروع ہوئی؟

جون ہاتھ ہلا ہلا کر چیخنے لگا۔ ''میں مرنا نہیں چاہتا۔۔۔ میں کیوں مروں؟ میں نہیں مروں گا۔''

اس نے اپنے بازو ہوا میں بلند کئے اور کوٹھڑی میں ادھر ادھر

بھاگنے لگا۔ پھر وہ سسکیاں لیتا ہوا ایک کونے میں ڈھیر ہو گیا۔ ہر چند کہ جون پاگلوں کی طرح شور مچا رہا تھا لیکن حقیقت میں وہ مجھ سے اور ٹام سے زیادہ اچھی حالت میں تھا۔

وہ اس بیمار آدمی کی طرح تھا جو اپنی بیماری کا مقابلہ اپنے بلند ہوتے درجہ حرارت سے کرتا ہے لیکن جب مریض کی حرارت بھی اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہو تو یہ زیادہ خطرناک علامت ہوتی ہے۔ میں اور ٹام ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔

جون رو رہا تھا۔ اسے خود پر رحم آ رہا تھا۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ ایک لمحے کے لئے میرا جی چاہا کہ میں بھی اپنی حالت پر دھاڑیں مار کر روؤں۔ مگر اس کے برعکس میں نے چھوٹے کو غور سے دیکھا اور محسوس کیا کہ میں غیر انسانی طور پر لاتعلق ہو چکا ہوں۔

''میں باوقار انداز میں مروں گا۔'' میں نے خود کو کہتے سنا۔

صبح کے آثار دیکھنے کے لئے ٹام چھت کے سوراخ کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ جب سے ہمیں ڈاکٹر نے وقت بتایا تھا ہم اپنی زندگی کو قطرہ قطرہ ختم ہوتے دیکھ رہے تھے۔

''سن رہے ہو؟'' ٹام کی وحشت زدہ آواز آئی۔

''ہاں''

''ابھی رات باقی ہے، لیکن انہوں نے احاطے میں چلنا شروع کر دیا ہے معلوم نہیں کم بختوں کا کیا ارادہ ہے۔ بہرحال اندھیرے میں تو گولی نہیں ماریں گے۔''

''روشنی ہونے میں بھی زیادہ دیر نہیں ہے۔'' میں نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ مجھے آسمان پر اندھیرے کی گہرائی کم ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

کچھ دیر میں ماحول کا رنگ بدلنے لگا۔ دور کہیں گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ٹام نے ڈاکٹر سے سگریٹ طلب کی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر دروازے کی آہٹ سن کر خاموش ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور ایک افسر چار سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

''ٹام؟'' افسر نے پوچھا۔

ٹام خاموش رہا۔ مگر گارڈ نے اس کی سمت اشارہ کر دیا۔

''جون؟''

''وہ۔۔۔ وہ جو فرش پر بیٹھا ہے۔'' گارڈ بولا

''اٹھو۔'' افسر نے جون سے کہا۔

جون نے خود کو مزید سمیٹ لیا۔ سپاہیوں نے اس کی بغلوں میں بازو ڈالے، اور گھسیٹ کر کھڑا کر دیا۔ لیکن جونہی سپاہی ہٹے جون پھر ڈھیر ہو گیا۔ سپاہیوں نے افسر کی جانب دیکھا۔

''اسے اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔'' افسر نے کہا، اور پھر ٹام کی سمت گھومتے ہوئے بولا۔ ''چلو۔ تم میرے ساتھ چلو۔''

ٹام دو سپاہیوں کے درمیان افسر کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ بقیہ دو سپاہیوں نے چھوٹے کو اٹھا لیا۔ وہ بیہوش نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں اور رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں بن رہی تھیں۔ میں کھڑا ہوا تو افسر نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔

''تمہارا نام پابلو ہے؟''

''ہاں۔''

''تم یہیں رکو۔ تمہیں بعد میں لے جائیں گے۔''

ڈاکٹر اور دونوں گارڈ بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اب میں بالکل تنہا تھا۔ مجھے وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہر آواز پر میں کانپ اٹھتا۔ میرا جی چاہا کہ میں اپنے بال کھینچوں اور زور زور سے چیخوں۔ لیکن میں نے اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈال لئے اور ہونٹوں کو سختی سے دبا لیا۔ میں باوقار انداز میں مرنا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے۔ کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور اس قدر گرم تھا کہ سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ یہاں دو افسر اپنے گھٹنوں پر کاغذات پھیلائے بیٹھے تھے۔

''تمہارا نام پابلو ہے؟''

''ہاں''

''ریمون کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''یہاں آؤ۔'' پہلا سوال کرنے والے افسر نے اشارہ کیا۔

میں نزدیک گیا تو اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور مجھے پوری طاقت سے جھنجھوڑا۔ وہ مجھے خوف زدہ کر کے مجھ پر حاوی ہونا چاہتا تھا۔ چند لمحوں تک ہم دونوں اسی حالت میں خاموش کھڑے رہے۔ اچانک مجھے ہنسی آنے لگی، جو مرنے والا ہو اسے ڈرانا بہت مشکل کام ہے۔ ان کی ترکیب ناکام ہو رہی تھی۔ اس نے جھٹکے سے مجھے پرے دھکیلا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم دونوں میں سے کسی ایک کو مرنا ہے۔'' اس نے سختی سے کہا۔ ''اگر تم نے ریمون کا پتہ بتا دیا تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔''

''یہ دونوں افسر بھی ایک دن مر جائیں گے۔'' مجھے خیال آیا۔

''میرے کچھ عرصے بعد سہی، مگر بہرحال یہ دونوں بھی جو اس وقت اتنی شان سے اکڑ کر بیٹھے ہیں ایک دن خاک ہو جائیں گے۔

لیکن یہ بے خبر ہیں۔ یہ جو دوسروں کے نام تلاش کر رہے ہیں انہیں ڈھونڈ رہے ہیں تاکہ انہیں ہلاک کر سکیں۔۔۔ ملکی امور پر ان کی اپنی رائے ہے دوسرے معاملات پر بھی ان کی ذاتی پسند اور ناپسند ہے مگر انہیں نہیں معلوم کہ ان کی یہ تمام سرگرمی اور جوش وخروش کس قدر بے معنی اور مضحکہ خیز ہے۔ انہیں اپنے پاگل پن کا ابھی قطعی علم نہیں ہے۔"

وہ افسر جس نے مجھے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا تھا، مجھے اب تک گھور رہا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ اپنے ہاتھ میں تھامی چھڑی اپنے جوتوں پر مار کر کانوں کو چبھنے والی آواز پیدا کر رہا تھا۔ وہ اپنی ہر حرکت سے خود کو خطرناک اور خونخوار ثابت کرنا چاہتا تھا۔

"تو؟۔۔۔ پھر؟۔۔۔ تم سمجھ گئے؟" اس کی آواز میں دھمکی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم ریمون کہاں ہے؟" میں نے چڑ کر کہا۔

"اسی شہر میں کہیں ہوگا۔"

دوسرے افسر نے تھکن ظاہر کرنے کے لئے اپنا ہاتھ آہستہ سے اٹھا کر پیشانی پر رکھا۔ دراصل وہ مجھے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس سارے معاملے سے عاجز آ چکا ہے۔ وہ بھی اداکاری کر رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بالغ لوگ کیوں کر بچوں کی سی حرکتیں کرتے ہیں۔

"تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لئے پندرہ منٹ ہیں۔" اس نے کہا اور پھر گھوم کر سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "اسے چھوٹے کمرے میں لے جاؤ۔ پندرہ منٹ بعد واپس لے آنا۔ اگر یہ اپنی ضد پر قائم رہا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔"

میں جانتا تھا ان کا مقصد کیا ہے۔ میں نے پوری رات انتظار میں گذار دی۔ پھر مجھے انہوں نے ایک گھنٹے تک کوٹھڑی میں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ مجھے دوبارہ تنہا بند کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آدمی کے اعصاب بالآخر جواب دے جاتے ہیں۔ اور اگر میرے اعصاب ختم ہو گئے تو میں بول پڑوں گا۔ انہیں سب کچھ بتا دوں گا۔

چھوٹے کمرے میں داخل ہوتے ہی کمزوری کے باعث میں نیچے بیٹھ گیا۔ میں نے از سر نو چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میں جانتا تھا ریمون کہاں ہے۔ وہ شہر کے مضافات میں اپنے چچازاد بھائی کے گھر چھپا ہوا تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے اس کا پتہ حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ جسمانی اذیت کی بات اور ہوتی ہے ممکن ہے میں جسمانی اذیت کے سامنے بے بس ہو جاتا، لیکن لگتا تھا کہ وہ مجھے جسمانی اذیت پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔۔۔ میں اس صورت حال کا تجزیہ کرنا چاہتا تھا۔ میں مر جاؤں گا لیکن ریمون سے غداری نہیں کروں گا۔۔۔ لیکن کیوں؟؟ مجھے تو اب ریمون سے کوئی لگاؤ بھی نہیں رہا تھا۔ صبح کے وقت جب "کانشہ" سے میری محبت اختتام کو پہنچی تھی تو زندگی سے میری وابستگی بھی ختم ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ریمون سے دوستی کا تصور بھی معدوم ہو گیا تھا۔ ایک وقت تھا جب میں اسے پسند کرتا تھا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کی جگہ میں مر جاؤں۔ اس کی زندگی میری زندگی سے زیادہ قیمتی کیسے ہو سکتی ہے؟ کسی کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ کسی بھی آدمی کو دیوار کے سامنے کھڑا کر کے اس پر گولیاں چلائی جا سکتی ہیں۔ جسے بھی گولیاں لگیں گی وہ منہ کے بل زمین پر آ گرے گا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہلاک ہونے والا آدمی میں ہوں یا ریمون ہے، یا کوئی اور ہے۔ ممکن ہے ملک کی تحریک آزادی کے لئے ریمون کی زندگی میری زندگی سے زیادہ قیمتی ہو۔ لیکن ملک کا کیا مطلب ہے؟ آزادی سے کیا ہوتا ہے؟ کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے اس کے باوجود میں مر رہا ہوں۔ جب کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے تو ریمون کا پتہ بتا کر میں اس مضحکہ خیز صورت حال سے نکل کیوں نہیں جاتا۔ میری ضد اب تک کیوں قائم ہے؟

"میں اپنی انا سلامت لیے جا رہا ہوں۔" میں نے سوچا، اور مجھے عجیب طرح کی طمانیت کا احساس ہوا۔

کچھ دیر بعد وہ مجھے دوبارہ افسروں کے سامنے پیش کرنے کے لئے چل پڑے۔ راہداری سے گزرتے ہوئے اچانک ہمارے قدموں تلے سے ایک چوہا نکل کر دوسری طرف بھاگا۔ مجھے یہ منظر بہت دلچسپ لگا۔

"چوہا! تم نے دیکھا؟ چوہا تھا۔" میں نے ایک سپاہی سے کہا۔ سپاہی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق تھا مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ لیکن مجھے ڈر تھا کہ ایک مرتبہ میں ہنس پڑا تو ہنستا چلا جاؤں گا۔ رک نہیں سکوں گا۔ ہنسی سے بچنے کے لئے میں نے بڑی مونچھوں والے سپاہی کو غور سے دیکھا۔ اور کہا۔ "احمق، تمہیں اپنی مونچھیں کاٹ دینی چاہئیں۔"

اس نے نیم دلی سے مجھے لات مارنے کی کوشش کی، مگر کچھ بولنے سے گریز کیا۔

"تم نے اچھی طرح سے سوچ لیا؟" دوبارہ سامنا ہونے پر موٹے افسر نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے افسروں کو غور سے دیکھا۔ وہ ایسے کیڑے لگ رہے تھے جو صرف مخصوص موسموں میں دکھائی دیتے ہیں۔

"میں جانتا ہوں ریمون کہاں ہے۔" میں نے روانی سے

حد سے زیادہ محتاط روی بھی بری ہے۔ ان چیزوں کا سامنا کرنے سے احتراز جن سے آپ خطرہ محسوس کرتے ہوں' ناخوشگوار نتائج کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ دانش مندی کا تقاضا ہے کہ خطرناک دکھائی دینے والے تجربے کا مردانہ وار سامنا کیا جائے اور اس تصادم میں سخت چوٹوں اور خراشوں کی پروا نہ کی جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ تجربہ آپ کی توقع سے زیادہ سخت ثابت ہو' لیکن اس سے آپ یہ حقیقت تو پالیں گے کہ آپ میں اس پر قابو پانے کی صلاحیت موجود ہے۔
(نارمن ونسنٹ پیلے۔)

بہت سے لوگ جزوی خود کشی کرتے ہوئے' زندگی گزارتے ہیں----- یعنی اپنی تخلیقی صلاحیتوں' اپنی توانائیوں اور اپنی خوبیوں کو اپنے ہاتھوں تباہ کرلینا۔
(جوشوا آلوتھ لیمین)

کہا۔ ''وہ مرکزی قبرستان میں چھپا ہوا ہے۔ کسی دھنسی ہوئی قبر کے اندر یا گورکن کی چاردیواری میں۔''

بس میرا جی چاہا تھا کہ ان سے مذاق کروں۔ وہ میرے ہاتھوں بیوقوف بنیں۔ اچھل اچھل کر پیٹیاں کسیں۔ ٹوپیاں سیدھی کریں اور ...بے معنی احکامات جاری کریں۔

اور وہ واقعی اچھل پڑے تھے۔

''خوب! ٹھیک ہے! اچھا! پندرہ آدمی تیار کرلو۔ فوراً۔''

''اور تم۔'' موٹے افسر نے روانگی سے قبل مجھے مخاطب کیا۔

''اگر تم نے سچ بولا ہے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا ورنہ تم پچھتاؤ گے۔''

وہ شور مچاتے رخصت ہوگئے اور میں اطمینان سے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے تصور کیا کہ اس لمحے وہ قبروں کے پتھر الٹ رہے ہوں گے۔ گورکن کی چاردیواری میں کود رہے ہوں گے۔ اپنی ناکامی پر برے برے منہ بناتے، قبرستان کی جھاڑیوں میں اچھلتے کودتے وردی پوش۔ میں بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کر رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد موٹا افسر اکیلا واپس آیا۔ اس نے میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ میں اپنی سزا سننے کے لیے پہلے سے تیار تھا۔

''اسے بیرونی احاطے میں لے جاؤ۔ فوجی کارروائی ختم ہونے کے بعد، اس کا فیصلہ شہری انتظامیہ کرے گی۔''

مجھے یوں لگا، جیسے میں نے غلط سنا ہو۔

''تو...تو مجھے گولی نہیں ماری جائے گی۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''لیکن...کیوں؟''

اس نے لاعلمی کے اظہار کے لئے کندھے اچکائے اور خاموش ہوگیا۔ سپاہی مجھے باہر کی جانب گھسیٹنے لگے۔ بیرونی احاطے میں سینکڑوں کی تعداد میں بچے، عورتیں اور بوڑھے قیدی جمع تھے۔ قیدیوں کے درمیان چلتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میں آہستہ آہستہ پاگل ہو رہا ہوں۔ دوپہر کے وقت ہمیں کھانا دیا گیا۔ کھانے کے دوران مجھے ہوش نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔

شام کے وقت چند نئے قیدی احاطے میں دھکیلے گئے۔ میں نے اپنے محلے کے دکاندار کو پہچان لیا۔ اس کا نام گارشیا تھا۔

''تم زندہ ہو؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہی حیرت سے پوچھا۔

''مجھے موت کی سزا سنائی گئی ہے۔ پھر انہوں نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ معلوم نہیں کیوں۔''

''مجھے دو بجے گرفتار کیا گیا۔'' گارشیا نے بتایا۔

''کیوں تمہارا تو سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔''

''جو بھی ان کی طرح نہیں سوچتا، وہ اسے گرفتار کر رہے ہیں۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گارشیا دبے لہجے میں بولا: ''وہ ریمون کی تلاش میں کامیاب ہوگئے۔''

مجھ پر لرزہ طاری ہوگیا۔

''کب؟''

''آج صبح۔ ریمون نے عجیب احمقانہ حرکت کی۔ وہ چچا کے لڑکے سے کسی بات پر خفا ہو کر گھر سے نکل گیا۔ اسے کئی لوگ پناہ دینے کو تیار تھے مگر وہ کہنے لگا کہ پابلو ہوتا تو میں اس کے گھر رہتا۔ وہ میرا دوست تھا مگر جب وہ گرفتار ہوگیا تو اب میں دوسروں کا احسان کیوں لوں۔ میں قبرستان میں چھپ جاؤں گا۔''

''قبرستان میں ؟''

''ہاں۔ بس ریمون سے یہی غلطی ہوئی۔ صبح وہ وہاں آ گئے۔ یہ ہونا ہی تھا۔ ظالموں نے اسے دیکھتے ہی گولیوں سے اڑا دیا۔''

''قبرستان میں؟''

''ہاں۔''

ہر چیز دائرہ وار گھومنے لگی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں زمین پر بیٹھا تھا۔ اچانک میں اتنی زور سے ہنسا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

☆☆☆☆☆☆

اوکتاویو پاز/ وجاہت مسعود

لاطینی امریکہ سے مختصر مختصر

نیلا گلدستہ

ایک آدم زاد کا تحیر، کسی راہزن کو
اس کی نیلی آنکھیں درکار تھیں

نیند سے جاگا تو میرا سارا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ سرخ اینٹوں کی روش سے، جس پر ابھی ابھی چھڑکاؤ کیا گیا تھا، گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ سرمئی پروں والی ایک تتلی زرد روشنی کے گرد دائرے میں منڈلا رہی تھی۔ میں چھلانگ لگا کر بستر سے باہر نکلا اور اس احتیاط کے ساتھ ننگے پاؤں چلتے ہوئے کہ گرمی سے گھبرا کر اپنے بل سے باہر آنے والے کسی بچھو پر قدم نہ رکھ دوں، کھڑکی کے پاس جا کر کھلی فضا میں سانس لینے لگا۔ پہلی رات کی بھرپور ہوا میں نسائیت کی خوشبو رچی تھی۔ کھڑکی سے ہٹ کر واپس کمرے میں آیا۔ صراحی کا سارا پانی جستی چلمچی میں انڈیلا اور تولیہ بھگو کر اپنی ٹانگوں اور چھاتی پر پھیرنے لگا۔ بدن ذرا خشک ہونے پر کپڑے پہنے مگر یہ دیکھنا نہیں بھولا کہ کہیں لباس کی تہوں میں کھٹمل نہ چھپے ہوں۔ یوں تیار ہو کر میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا جن پر روغن کیا گیا تھا۔ مکان کے دروازے پر یک چشم مگر خاموش طبع مالک مکان کا سامنا ہو گیا وہ بید کے سٹول پر بیٹھا اپنی واحد آنکھ سکیڑے، سگریٹ پی رہا تھا۔ بھاری آواز میں اس نے پوچھا: "کدھر جا رہے ہو؟"

"ذرا ٹہلنے جا رہا ہوں۔ کمرہ تو دوزخ کی طرح گرم ہو رہا ہے۔"

"ہوں ـــــ دکانیں تو سب بند ہو چکیں۔ سڑک پر روشنی بھی نہیں، بہتر تھا کہ کمرے میں ہی رہتے۔"

میں نے شانے اچکائے اور "جلدی واپس آ جاؤں گا" کہتے ہوئے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ شروع میں تو واقعی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں بجری کی سڑک پر لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ایک دفعہ رک کر میں نے سگریٹ سلگایا۔ عین اسی وقت سیاہ بدلی کی اوٹ سے چاند نمودار ہو گیا اور سامنے ایک سفید دیوار کو روشن کرنے لگا جو جگہ جگہ سے تڑخی ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تابناکی نے مجھے گویا مبہوت کر کے رکھ دیا۔ ہوا ہولے ہولے سیٹیاں بجا رہی تھی۔ میں املی کے درختوں سے ہو کر آتی ہوا میں سانس لیتا رہا۔ پتوں اور کیڑوں مکوڑوں کی آوازیں رات کی گنگناہٹ میں ڈھل رہی تھیں۔ لمبی گھاس میں جھینگر شور مچا رہے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ستاروں نے بھی چھاؤنی ڈال رکھی تھی۔ مجھے لگا جیسے کائنات، علامتوں کا ایک وسیع نظام تھی جس کے ذریعے مافوق

الفطرت قوتیں محوِ گفتگو تھیں۔ میرے انفعال، جھینگروں کے شور اور ستاروں کی ٹمٹماہٹ کی حیثیت، وقفوں، بے معنی آوازوں اور اس مکالمت کے بے ربط اجزا سے زیادہ نہیں تھی۔ مجھے خیال آیا کہ میں جس لفظ کا صوتی رکن تھا، وہ بذاتِ خود کیا تھا؟ بولنے والا کون تھا اور کس کی ساعت آسودہ ہوتی تھی؟ میں نے سگریٹ فٹ پاتھ کی طرف پھینکا۔ ایک روشن قوس بناتے ہوئے وہ جب زمین سے ٹکرایا تو کسی چھوٹے سے دمدار ستارے کی مانند ننھی ننھی چنگاریاں اڑیں اور اگلے ہی لمحے جل بجھیں۔

میں یونہی آہستہ آہستہ دیر تک چلتا رہا۔ کائنات کے خوش کلام ہونٹوں کے درمیان آزادی اور تحفظ کا عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ لگتا تھا رات ایک باغ ہے جس میں ان گنت آنکھیں اگی ہیں۔ گلی پار کرتے ہوئے پیچھے سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا مگر اندھیرے میں کچھ سجھائی نہ دیا۔ میں تیزی سے چلنے لگا۔ چند ہی لمحوں بعد پتھر کی گرم سڑک پر ایک بار پھر بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی۔ میں رکے بغیر چلتا رہا۔ تعاقب کرنے والے کا سایہ ہر قدم پر مجھ سے قریب ہو رہا تھا۔ میں نے دوڑنے کی کوشش کی مگر دوڑ نہ سکا۔ اچانک مجھے رکنا پڑا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا دفاع کر سکتا میں نے چاقو کی نوک اپنی پشت پر محسوس کی۔ کسی نے بے حد نرم لہجے میں کہا: ''مسٹر ہلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ چاقو گھونپ دوں گا۔''

میں نے مڑے بغیر پوچھا: ''کیا چاہتے ہو؟''

''تمہاری آنکھیں!'' اسی تکلیف دہ حد تک نرم آواز نے جواب دیا۔

''میری آنکھیں؟ مگر تم میری آنکھیں لے کر کیا کرو گے؟ دیکھو! میرے پاس کچھ رقم ہے۔ بہت زیادہ تو نہیں مگر ایسی کم بھی نہیں۔ میرے پاس جو کچھ ہے لے لو اور مجھے جانے دو۔ مجھے قتل مت کرو۔''

''خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، مسٹر! میں تمہیں ماروں گا نہیں، صرف تمہاری آنکھیں لوں گا۔''

''لیکن آخر تمہیں میری آنکھوں کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟''

''میری دوست ضد کر رہی ہے کہ اسے نیلی آنکھوں کا گلدستہ پیش کیا جائے اور اس علاقے میں نیلی آنکھوں والے بہت کم ہیں۔''

''میری آنکھوں سے تمہاری مشکل آسان نہیں ہوگی۔ میری آنکھیں نیلی نہیں بھوری ہیں۔''

''مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے معلوم ہے تمہاری آنکھوں کا رنگ نیلا ہے۔''

''دیکھو اپنے جیسے ایک انسان کو آنکھوں سے محروم نہ کرو۔ کچھ اور مانگ لو۔''

''زیادہ پارسا بننے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے سختی سے کہا: ''میری طرف مڑو۔''

میں گھوم گیا۔ میرے سامنے ٹھگنے قد کا ایک منحنی سا شخص کھڑا تھا جس نے اپنا ہیٹ آدھے چہرے پر کھینچ رکھا تھا اس کے دائیں ہاتھ میں چاقو تھا جس کا چوڑا پھل چاندنی میں چمک رہا تھا۔

''مجھے اپنا چہرہ دیکھنے دو!'' حکم ہوا۔

میں نے ماچس جلائی اور اسے اپنے چہرے کے قریب لے آیا۔ شعلے کی چمک سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے میرے پپوٹے کھول کر دیکھنا چاہے مگر اچھی طرح سے دیکھ نہیں سکا وہ پنجوں کے بل کھڑا گھورتا رہا۔ شعلے سے میری انگلیاں جلنے لگیں۔ میں نے ماچس کی تیلی نیچے گرا دی لمحہ بھر خاموشی رہی۔

''اب تو تمہیں یقین آ گیا ہوگا کہ میری آنکھوں کا رنگ نیلا نہیں۔''

''خاصے چالاک ہو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''چلو ایک اور تیلی جلاؤ۔''

میں نے ایک اور ماچس جلائی اور اسے اپنی آنکھوں کے قریب لے آیا۔

''نیچے جھکو!'' میری آستین کھینچتے ہوئے اس نے کہا میں نیچے جھک گیا اس نے ایک ہاتھ سے میرے بال پکڑ کر میرا سر پیچھے کیے رکھا اور مجھ پر جھک کر متجسس اور بے چین نظروں سے میری آنکھیں دیکھتا رہا اس کا چاقو نیچا ہوتے ہوتے میری پلکوں کو چھو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

''آنکھیں کھلی رکھو!'' اس نے حکم دیا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ شعلہ میری پلکیں جلاتا رہا۔ اچانک اس نے میرے بال چھوڑ دیے۔

''ٹھیک ہے! تمہاری آنکھیں نیلی نہیں ہیں۔ لعنت ہو۔'' اور وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں نے اپنا سر تھام کر دیوار کا سہارا لے لیا۔ آخر میں نے خود کو سنبھالا اور گرتا پڑتا کھڑا ہو گیا۔ ایک گھنٹے تک میں اجاڑ قصبے میں دوڑتا رہا۔ گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ مالک مکان ابھی تک دروازے کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں بغیر کچھ کہے اندر داخل ہو گیا۔ اگلے روز میں نے وہ قصبہ چھوڑ دیا۔

پولینڈ کے ایک عظیم تخلیق کار کی عطا

موت

ایک گھر کی کہانی، اس کے مکین ایک بوجھ
اتارنا چاہتے تھے۔۔۔۔ جیتا جاگتا بوجھ!

ولادی سلاوریموں / محمد سلیم اختر

ولادی سلاوریموں۔۔۔پولینڈ کا عظیم تخلیق کار! ریڈم نامی قصبے کے نواح میں 1868ء میں پیدا ہوا۔ مذہبی تفریق کے اعتبار سے کیتھولک عیسائیوں میں شمار ہوتا تھا لیکن انسانیت کو اپنا دھرم کرم مانا اور خود کو کسی اور تنگ دائرے میں محبوس نہ رکھا۔ ایک پیشہ ور مصنف کی حیثیت سے منظر عام پر آنے سے قبل اپنی مضطرب جوانی کے شب و روز کئی دوسرے پیشوں کی نذر کیے، لیکن تخلیق کاری گھٹی میں پڑی تھی، چنانچہ جب اولیں ناول

منصۂ شہود پر آیا تو اس وقت بھی موصوف جز وقتی مشغلے کے طور پر ایک ریلوے سیکشن کے انچارج تھے۔ اس کے بعد تو اظہار ذات کا ایک سلسلہ تھا کہ جو تھما نہیں اور یکے بعد دیگرے کئی ناول اور بہت سے افسانے لکھے۔ کسان۔۔۔ درماندہ، لاچار، بےبس اور غریب کسان اور ان کی قابل رحم زندگی ریموں کی کہانیوں کا ایک عمومی موضوع تھا جو اس طبقے کے ساتھ ریموں کی گہری وابستگی اور ان کی زندگی کے عمیق مشاہدے کا مظہر ہے۔ کسانوں کی حالت زار کے بیان میں ریموں نے جس بےرحم حقیقت نگاری کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا سب سے عمدہ نمونہ زیر نظر افسانے ''موت'' میں ملتا ہے جس کا شمار پولش فکشن کے عظیم ترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ ریموں کی سیماب صفت طبیعت کسی نوع کی قدغن کی متحمل نہ تھی، چنانچہ ازدواجی بندھن میں بندھنا بھی گوارا نہ ہوا۔ ساری زندگی ادب کی خدمت کے لیے وقف اور شاعری کی نذر کر دی۔ ریموں کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 1924ء کا نوبل ادب انعام ان کے حصے میں آیا جو ان کی چار جلدوں پر مشتمل رزمیہ ''The Peasants'' پر دیا گیا۔ اس رزمیہ میں پولینڈ کا لینڈ اسکیپ اپنی تمام تر خوبصورتی اور کروفر کے ساتھ موجود ہے۔ دیگر تصنیفات میں کامیڈین اور موعودہ دھرتی وغیرہ شامل ہیں۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ انسانیت متعدد نقطوں پر ملتی ہے اور درد و غم اور فہم و بصیرت کے رنگ دنیا کے جس جس خطے میں بھی ہوں، ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے اور انسانیت اپنی بصیرت اور درد کے لمحے میں بالعموم یکساں لہجے میں پکارتی ہے۔۔۔ تو ٹھیک ہی کہا ہے۔ ریموں کے افسانے موت اور پریم چند کے کفن میں لہجے کی یہی یکسانی نظر آئے گی۔ گو ریموں نوبل انعام پانے کے ایک برس بعد وارسا میں انتقال کر گیا، لیکن اس نے دنیائے ادب کے لیے جو ورثہ چھوڑا ہے، اس میں اس کی بقائے دوام کا راز پنہاں ہے۔ (ادارہ)

''ابا۔۔۔ اے ابا۔۔۔ چلو اب اٹھ جاؤ۔۔۔ سنا نہیں تم نے؟ ۔۔۔ اے، اب چلتے پھرتے دکھائی دو۔''

''آہ آہ ہم خدایا! آہ مقدس مریم!'' بوڑھا درد سے کراہ اٹھا۔ بھیڑ کی کھال کے لبادے میں سے اس کا ستا ہوا نڈھال جھریوں بھرا چہرہ نمودار ہوا جس کی رنگت اس زمین کی طرح خاکستری تھی جس پر اس نے برسوں تک ہل چلایا تھا۔ سر کے بال کھیتوں کی ان برف زدہ منڈیروں کی طرح سفید تھے جن میں موسم خزاں میں ہل چلایا گیا تھا۔ اس نے ایک گہرا، طویل سانس لیا۔ آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔ ہونٹ سردی سے نیلے ہو رہے تھے اور ان پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ ادھ کھلے منہ سے اس کی زبان باہر لٹک آئی تھی۔

''اے۔۔۔ اٹھو۔۔۔ و۔۔۔ و۔۔۔'' اس کی بیٹی پوری قوت سے چلائی۔

''نانا!'' قریب کھڑی ایک ننھی سی بچی نے بسورتے ہوئے کہا۔ اس کی قمیض کے اوپر سوتی ایپرن کسا ہوا تھا۔ ریں ریں کرتے ہوئے وہ اپنے نانا کا چہرہ دیکھنے کے لیے ایڑیوں کے بل ہو گئی۔

''نانا!'' وہ پھر بلکی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور چہرہ اداسی میں بھیگا ہوا تھا۔ ''نانا!'' اس نے ایک بار پھر بوڑھے کو پکارا اور اس کا سرہانہ کھینچا۔

''چپ ہو جاؤ!'' اس کی ماں چنگھاڑی اور اسے گدی سے پکڑ کر چولہے میں دھکیل دیا۔

''دفع ہو جاؤ خبیث کتیا!'' وہ اس بوڑھی نیم اندھی کتیا پر چلائی جو قریب کھڑی بستر سونگھ رہی تھی اور عورت اس سے ٹکرا گئی تھی۔ ''باہر دفع ہو جاؤ۔۔۔ جاتی ہو یا نہیں! مردار!'' اس نے اپنی چوبی جوتی کے ساتھ کتیا کو اتنے زور کی ٹھوکر ماری کہ وہ لڑھکتی چلی گئی اور چیاؤں چیاؤں کرتی چولہے کے پاس کھڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی مٹھیوں سے اپنی ناک اور آنکھیں ملیں۔

''ابا! جب تک میرا مزاج درست ہے تم اٹھ جاؤ۔''

بیمار بوڑھا خاموش تھا۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا اور سانس بتدریج بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں زندگی کے زیادہ آثار نہیں تھے۔

''چلو اٹھو! کیا منصوبہ ہے؟ کیا تم سوچ رہے ہو کہ تم یہیں مرنے کا پروگرام کرو گے؟ نہیں، میں سب جانتی ہوں۔ جاؤ، اپنی جولینا کے پاس جا کے مرو بوڑھے کتے! اپنی ساری جائیداد تو تم نے جولینا کو دے دی ہے۔ اب وہی تمہاری تیمارداری بھی کرے گی

--- چل اب اٹھ--- میں اب بھی تمہیں نرمی سے کہہ رہی ہوں---"

"اوہ میرے پروردگار--- مقدس مسیح! ہائے مقدس مریم---"

پسینے اور اضطراب میں بھیگا ہوا بوڑھے کا چہرہ تشنج کے ایک اچانک جھٹکے سے کھنچ گیا۔ اس کی بیٹی نے ایک وحشیانہ جھٹکے سے لحاف کھینچ لیا اور بوڑھے کو کمر کی دونوں طرف سے پکڑ کر بستر سے باہر گھسیٹا۔ وہ آدھا بستر کے اندر اور آدھا باہر ہو گیا۔ نچلا دھڑ نیچے لٹک رہا تھا جبکہ شانے اور سر بستر پر ڈھے گئے تھے۔ وہ چوبی کندے کی طرح بے حس و حرکت تھا: بے جان سا، اکڑا ہوا!

"پادری--- ہائے خدایا!" بھاری سانسوں کے درمیان وہ بڑبڑایا۔

"میں ابھی تمہارے پادری کو بلاتی ہوں بوڑھے کم بخت! تم سور خانے میں مرو گے شیطان--- کسی کتے کی طرح۔" اس نے بوڑھے کی بغل میں ہاتھ دے کر اسے اوپر اٹھایا، لیکن پھر فوراً ہی نیچے چھوڑ دیا اور رضائی سے اچھی طرح ڈھک دیا کیونکہ کھڑکی میں اس نے کسی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ کوئی گھر کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ بوڑھے کے پیر دوبارہ بستر میں دھکیل سکے۔ اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا۔ غصے سے پاگل ہوتے ہوئے اس نے بستر پر زور سے لات رسید کی اور بستر کو اطراف سے دبا دیا۔

وجیاک نامی کسان کی بیوی اندر آئی: "یسوع مسیح رحم کرے!"

"تا ابد!" سامنے والی بڑبڑائی اور اپنی آنکھوں کے گوشوں سے وجیاک کی بیوی کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھا۔

"کیا حال ہیں؟ کیا ہو رہا ہے؟"

"شکر ہے خدا کا--- گزر رہی ہے---"

"بوڑھے کا کیا حال ہے؟ ٹھیک تو ہے؟" وہ دروازے کے قریب کھڑی اپنی چوبی جوتیوں سے برف جھاڑ رہی تھی۔

"آہ! وہ کیسے ٹھیک ہو گا! اب تو بے چارہ اچھی طرح سانس بھی نہیں لے سکتا۔"

"نہ بہن! ایسے مت کہو--- نہ نہ---" یہ کہہ کر وہ بوڑھے کو دیکھنے کے لیے اس کے بستر پر جھک گئی۔

"پا---دری---" بوڑھا کراہا۔

"اوہ خدایا--- دیکھو تو--- وہ مجھے پہچان ہی نہیں رہا--- بے چارہ پادری کو بلانا چاہتا ہے۔ یہ تو مر رہا ہے--- اسے اب ختم ہی سمجھو۔ کیا تم نے کسی کو پادری لانے کے لیے بھیجا ہے؟"

"کیا میرے پاس کوئی ہے جسے بھیجوں؟"

"کہیں تمہاری یہ مراد تو نہیں کہ ایک عیسائی کو بغیر مذہبی رسوم کے مرنے دیا جائے؟"

"میں اسے اکیلے چھوڑ کر کہاں بھاگتی پھروں؟ اور ممکن ہے --- یہ ٹھیک ہو جائے!"

"کیا تمہیں یقین نہیں--- ہو ہو--- ذرا اس کے سانسوں کی آواز تو سنو! اس کا مطلب ہے یہ اندر سے مرجھا گیا ہے۔ اس کی حالت بالکل میرے مالک جیسی ہے جب وہ گزشتہ برس اس طرح بیمار ہو گیا تھا۔"

"ٹھیک ہے--- اچھا--- سنو! تم ذرا جلدی سے پادری کے پاس چلی جاؤ۔ جاؤ گی؟"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ بے چارہ! لگتا ہے کہ اب یہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ میں جلدی جاتی ہوں--- میں چلی!" اس نے اپنے ایپرن کو سر پر زیادہ کس کر باندھ لیا۔

"خدا حافظ! انتکو وا!"

"خدا کی امان میں!"

وجیاک کو وا باہر نکل گئی جبکہ دوسری عورت کمرے کی درستی میں لگ گئی۔ اس نے فرش پر جمی مٹی کھرچی، جھاڑو دی، لکڑیوں کی راکھ جھاڑی اور اپنے برتن صاف کر کے انہیں قطار میں سجا دیا۔ وقفے وقفے سے وہ نفرت بھری نگاہوں کے ساتھ بستر کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی، وہ نفرت سے تھوکتی، اپنی مٹھیاں بھینچتی اور مایوسی و بے بسی کے عالم میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتی۔

"پندرہ ایکڑ زمین، سور، تین گائیں، فرنیچر، کپڑے--- ان میں سے آدھا حصہ یقیناً چھ ہزار کا تو ہو گا--- میرے خدا!"

اور جیسے ایک بڑی رقم کے خیال نے اس میں غصے کی نئی لہر بھر دی ہو، اس نے دیگچیاں اتنے زور سے رگڑیں کہ شور سے دیواریں گونج اٹھیں، پھر اس نے دیگچیوں کو زور سے تختے پر پٹخ دیا۔

"تمہیں تو--- تمہیں تو---" اس نے اپنی گنتی جاری رکھی۔

"مرغیاں، بطخیں، بچھڑے، کاشت شدہ زمین! سب کا سب اس چھنال کو ملا--- تم پر خدا کا عذاب! تمہاری قبر میں کیڑے پڑیں، تم نے جو میرے ساتھ زیادتی کی اور مجھے ایک یتیم کی طرح کر دیا۔"

اس کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ وہ طیش کے عالم میں لپک کر بستر کی طرف بڑھی اور پوری قوت سے چیخی: "اٹھ جاؤ کم بخت!" اور جب بوڑھے نے کوئی حرکت نہ کی تو اس نے اپنی

مٹھیاں لہراتے ہوئے اسے دھمکایا اور چہرے کے اوپر منہ کر کے چیخی: ''تم اس لیے یہاں آئے ہو کہ یہاں آ کر مرو اور مجھے تمہارا کفن دفن کرنا پڑے، میں تمہارے لیے کلاہ والا کفن خریدوں۔۔۔ یہی سوچا تھا نا تم نے؟ لیکن میں اس طرح نہیں سوچتی۔ تم مجھے یہ سب کچھ کرتے دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔ اگر جو لیتا تمہیں اتنی ہی عزیز ہے تو تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ جلدی سے اٹھو اور اس کے پاس چلے جاؤ۔ اس ضعیفی میں تمہاری دیکھ بھال کو میں ہی رہ گئی تھی! وہ تمہاری پیاری ہے اور اگر تم سمجھتے ہو کہ۔۔۔''

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ اسے گھنٹی کی ٹنکار سنائی دی تھی اور پھر چند ثانیے بعد مذہبی رسوم کے لیے درکار ساز و سامان کے ساتھ پادری اندر آ گیا۔

انتکو وا اپنے قدموں پر جھک گئی۔ غصے کے سبب آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو اس نے پونچھا، پھر ٹوٹے ہوئے تسلے میں اس نے پاکیزہ پانی انڈیلا، موصلی کا برش قریب رکھا اور باہر گلیارے میں نکل گئی جہاں پادری کے ساتھ آنے والے کچھ لوگ انتظار میں تھے۔

''یسوع مسیح رحم فرمائیں!''

''تا ابد!''

''کیا ہوا ہے؟''

''اوہ، کچھ نہیں! سوائے اس کے کہ وہ مرنے کے لیے یہاں چلا آیا ہے۔۔۔ ہمارے پاس۔۔۔ جن کے ساتھ اس نے زیادتیاں ہی کی ہیں۔۔۔ اور اب وہ مر کے نہیں دے گا۔۔۔ اوہ۔۔۔ ہائے۔۔۔ میں دکھیاری!''

اس نے گریہ زاری شروع کر دی۔

''یہ تو سچ ہے۔ وہ سسک سسک کر مرے گا اور تم کڑھ کڑھ کے جیو گی۔'' ان سب نے ایک آواز میں کہا اور اپنے سر ہلائے۔

''وہ بھی اپنا ہی باپ!'' وہ پھر شروع ہو گئی۔ ''کیا ہم نے۔۔۔ انتیک اور میں نے اس کا خیال نہیں رکھا؟ اس کے لیے کام نہیں کیا؟ اس کے لیے پسینہ نہیں بہایا؟ اتنا ہی جتنا کہ دوسروں نے؟ ایک انڈہ تک میں نے نہ بیچا اور نہ کبھی مکھن کا ایک آدھ پونڈ! بلکہ سب اس کے حلق میں ٹھونسا۔ اپنی بچی کے منہ سے دودھ کا ایک ایک قطرہ چھین کے میں نے اسے دیا کیونکہ بوڑھا تھا اور پھر میرا باپ۔۔۔ اور اسے دیکھو! گیا اور سب کچھ تو مک کو دے آیا۔ پندرہ ایکڑ زمین۔۔۔ مکان۔۔۔ گائیں۔۔۔ سارے سور۔۔۔ بچھڑے۔۔۔ بیل گاڑیاں۔۔۔ سارے کا سارا فرنیچر۔۔۔ کیا یہ کچھ بھی نہیں؟ مجھ پر رحم کرو۔۔۔ کیا اس دنیا میں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں؟۔۔۔ ہائے۔۔۔ آہ!''

وہ دیوار کے ساتھ لگ گئی اور اونچی آواز میں سسکنے لگی۔

''نہ رو، بہن نہ رو! خدا رحیم و کریم ہے، لیکن ہمیشہ غریبوں کے لیے نہیں۔ ایک دن وہ تمہاری فریاد ضرور سنے گا۔''

''بے وقوف! اس طرح کی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟'' بولنے والی کے شوہر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''جو غلط ہے، وہ غلط ہے۔ بوڑھا چلا جائے گا، لیکن غریبی نکی رہے گی۔''

''جب بیل پیر اٹھانے کو تیار نہ ہو تو اس سے ہل جتوانا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' ایک اور آدمی نے دانش مندانہ انداز میں کہا۔

''آہ۔۔۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آدمی ہر چیز کا عادی ہو جاتا ہے حتیٰ کہ جہنم کا بھی۔'' ایک تیسرا شخص بڑبڑایا اور اپنے دانتوں کے درمیانی خلا میں سے تھوک کی پچکاری پھینکی۔

اس کے بعد اس مختصر سے ہجوم پر خاموشی چھا گئی۔ تیز ہوا سے دروازہ کھڑکھڑایا اور درزوں میں سے برف اڑ کر اندر فرش پر آ گئی۔ کسان اپنے ننگے سر لیے کسی گہری سوچ میں غرق کھڑے تھے اور پیروں کو گرم رکھنے کی خاطر انہیں بار بار زمین پر مار رہے تھے۔ عورتیں جن کے ہاتھ ان کی سوتی ایپرنوں میں دبکے ہوئے تھے، وہ ایک دوسری کے ساتھ جڑی، بے چینی سے رہائشی کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

آخر کار گھنٹی بجی اور انہیں کمرے میں آنے کا اذن ملا۔ وہ ایک دوسرے کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے ایک ایک کر کے کمرے میں داخل ہونے لگے۔ جاں بہ لب بوڑھا اپنی پشت کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سر تکیے میں گہرا دھنسا ہوا تھا۔ اس کا زرد سینہ سفید بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور کھلی قمیص میں سے دکھائی دے رہا تھا۔ پادری اس کے اوپر جھک گیا اور عشائے ربانی کی ٹکیا اس کی باہر لٹکتی ہوئی زبان پر رکھ دی۔ کمرے میں موجود بھی افراد گھٹنوں کے بل جھک گئے۔ ان کی آنکھیں چھت کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور وہ اپنی چھاتیاں پیٹ رہے تھے۔ وہ آہیں بھرتے ہوئے گریہ زاری کر رہے تھے۔ عورتیں زمین پر جھک گئیں اور بین کرنے لگیں: ''یسوع مسیح کی بھیڑ جس نے دنیا کو گناہوں سے نجات دلانے کی خاطر اپنی جان دے دی۔''

اندھی کتیا گھنٹی کی مسلسل ٹنکار سے پریشان ہو کر کمرے کے ایک کونے میں جا کر غرانے لگی۔ پادری نے آخری رسم ادا کی اور دم مرگ بوڑھے کی بیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: ''تمہارا آدمی کہاں ہے انتکو وا!؟''

''وہ کہاں ہوگا مقدس باپ! اپنے روزانہ کے کام پر ہی گیا ہے۔''

ایک پل کے لیے پادری متامل کھڑا رہا۔ اس نے اپنے اردگرد لوگوں کے اجتماع کو دیکھا، اپنے قیمتی فر کے فرغل کو شانوں پر کھینچا، لیکن وہ موقع کی مناسبت سے کہنے کو کوئی موزوں الفاظ نہ سوچ سکا اور فقط سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ کمرے سے باہر نکلنے لگا اور اپنا سرخ وسپید ہاتھ اجتماع کی طرف بڑھا دیا۔ سب گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو باری باری عقیدت سے بوسہ دینے لگے۔ اس کے بعد پادری باہر نکل گیا۔

پادری کے جاتے ہی سارا اجتماع منتشر ہو گیا۔ دسمبر کا مختصر سا دن اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ ہوا کی تیزی میں اب کمی آ گئی تھی، لیکن برف اب موٹے موٹے بھاری گالوں کی صورت میں گر رہی تھی۔ شام کا دھندلکا کمرے میں اتر آیا تھا۔ انتکو وا آگ کے سامنے بیٹھی تھی اور خشک لکڑیوں کو ایک ایک کر کے توڑتی ہوئی بے دھیانی سے آتش دان میں پھینکتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی کسی خاص پہلو پر غور کر رہی ہے کیونکہ گاہے گاہے اس کی نگاہیں کبھی بستر اور کبھی کھڑکی کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ بیمار آدمی خاصی دیر سے ایک ہی عالم میں دراز تھا۔ وہ بے چین ہو گئی، اپنی جگہ سے اچھلی، تھوڑی دیر تک ساکت سی کھڑی رہی، اپنے اردگرد کا جائزہ لیا، کچھ سن گن لینے اور دیکھنے کی کوشش کی اور واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

رات تیزی سے اتر رہی تھی۔ کمرے میں گہرا اندھیرا ہو گیا تھا۔ ننھی لڑکی آتش دان کے قریب سمٹی بیٹھی اور اونگھ رہی تھی۔ آتشدان میں آگ مدہم پڑتی جا رہی تھی۔ دہکتے کوئلوں سے خارج ہونے والی سرخ روشنی عورت کے گھٹنوں اور فرش کے ایک حصے پر پڑ رہی تھی۔ اندھی کتیا چیاؤں چیاؤں کر کے دروازہ کھرچنے لگی۔ سیڑھی پر بیٹھی مرغیاں کبھی آہستہ اور کبھی اونچی آواز میں کڑکڑ کرنے لگتیں۔ اب کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ گیلے فرش سے سیلی ہوئی ٹھنڈ کا اخراج ہو رہا تھا۔ اچانک انتکو وا اٹھی اور کھڑکی کے قریب جا کر باہر گلی میں جھانکنے لگی۔ گلی ویران تھی۔ بھاری برف گر رہی تھی جس کے سبب چند قدم کے فاصلے پر موجود چیزیں بھی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی تھیں۔ بے خیالی میں وہ مڑی اور ایک بار پھر بستر کے قریب آ کر رک گئی، لیکن فقط ایک ثانیے کے لیے، پھر اچانک ہی اس نے بڑی بے رحمی سے رضائی کھینچی اور اسے دوسرے بستر پر اچھال دیا۔ اس نے دم مرگ بوڑھے کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اوپر اٹھا لیا۔

''ماگدا! دروازہ کھولو!''

ماگدا خوفزدہ ہو کر اپنی جگہ سے اچھلی اور دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔

''یہاں آؤ۔۔۔اسے پیروں سے پکڑو!''

ماگدا نے آگے بڑھ کر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے نانا کے پیر تھام لیے اور سوالیہ نگاہوں سے اپنی ماں کی جانب دیکھا۔

''چلو۔۔۔اسے اٹھا کر لے جانے میں میری مدد کرو۔۔۔ اس طرح مت گھورو۔۔۔چلو۔۔۔اٹھاؤ اسے۔۔۔بس تمہیں یہی کرنا ہے۔'' اس نے سختی کے ساتھ حکم دیا۔

بوڑھا آدمی وزنی تھا، لیکن مکمل طور پر لاچار! صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ ہوش سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ وہ اس احساس سے بےخبر دکھائی دیتا تھا، جو کچھ کہ اس کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ عورت نے اسے سختی سے تھام رکھا تھا۔ اس نے بوڑھے کو اٹھایا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے چلی کیونکہ ننھی لڑکی نے دہلیز سے ٹھوکر کھائی تھی۔ نانا کے پیر اس کے ننھے ننھے ہاتھوں سے چھوٹ گئے تھے اور برف پر دو لکیریں کھنچتی جا رہی تھیں۔

اس وقت ہڈیوں تک میں سرایت کر جانے والی ٹھنڈ کے باعث جاں بہ لب بوڑھے کو ہوش آ گیا کیونکہ صحن میں آ کر اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بڑبڑانا شروع کر دیا تھا: ''جولیشا۔۔۔اوہ خدا۔۔۔جو۔۔۔''

''تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم چیخو۔۔۔ جتنا چیخ سکتے ہو چیخو، کوئی تمہاری آواز نہیں سنے گا چاہے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخو۔'' وہ اسے صحن کے پار گھسیٹ لے گئی اور اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے سور خانے کا دروازہ کھولا، بوڑھے کو اندر کھینچا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ سورنی گھر گھراتی ہوئی آگے بڑھی، اس کے پیچھے اس کے پلے لپکے۔

''مالوشیا! مالو، مالو، مالو!''

سور، باڑے میں سے باہر نکل آئے اور عورت نے دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا، مگر پھر فوراً پلٹی اور بوڑھے کی قمیص پھاڑ کر اس کے سینے پر آویزاں مالا والی تھیلی کھینچ کر علیحدہ کی اور اسے اپنے لبادے میں چھپا لیا۔

''اب یہاں مرو کوڑھی!'' اس نے بوڑھے کی برہنہ پنڈلی پر زور کی لات رسید کی کیونکہ بوڑھے کی پنڈلی دروازے میں اٹکی ہوئی تھی۔ اب اس نے دروازہ بند کیا اور واپس ہولی۔

سور صحن میں اودھم مچا رہے تھے۔ اس نے گلیارے میں مڑ کر نہ دیکھا۔

''مالوشا، مالو، مالو، مالو!''

سور بھاگتے ہوئے اس کے پاس گئے۔ وہ آلوؤں کا تسلا بھر

کر لائی اور سوروں کے آگے خالی کر دیا۔ سورنی نے وحشیانہ انداز سے آلوؤں پر منہ مارنا شروع کر دیا۔ سورنی کے بچے بھی اپنی گلابی تھوتھنیاں گھسیڑ رہے تھے۔ ان کی کھینچا تانی اس وقت تک جاری رہی جب تک سب کچھ ختم نہ ہو گیا۔ اب ان کے چٹخارے لینے کی اونچی آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔

اتکلو وا نے آتش دان کے اوپر بنی کارنس پر ایک چھوٹا سا لیمپ جلایا اور مالا والی تھیلی کھول کر دیکھنے لگی۔ وہ کھڑکی کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ تھیلی کھولتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھر آئی۔ چاندی کے دو روبل اور کچھ بنک نوٹ تھیلی میں سے برآمد ہوئے تھے۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ یونہی نہیں کہتا تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ اس نے اپنی تجہیز و تکفین کے لیے پیسے رکھے ہوئے ہیں۔'' اس نے نوٹ اور سکے کپڑے میں لپیٹے اور صندوق میں رکھ دیے۔

''دھوکے باز! خدا کرے تم ہمیشہ کے لیے اندھے ہو جاؤ۔'' عورت نے بددعا دی۔ اس نے برتنوں کو سیدھا کیا اور دھیمی ہوتی ہوئی آگ کو تیز کرنے کی کوشش کی۔

''لعنت ہو اس منحوس لڑکے پر! اس کی وجہ سے گھر میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں۔'' وہ باہر آئی اور حلق پھاڑ کر چیخنے لگی: ''اگنات!'' لیکن لڑکے کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہ تھا۔ تقریباً نصف گھنٹہ گزرنے کے بعد چوری چوری اٹھتے قدموں تلے برف چرمرائی۔ ایک پرچھائیں کھڑکی کے قریب دکھائی دی۔ اتکلو وا نے ادھ جلی لکڑی اٹھائی اور نیم وا دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ تقریباً نو برس کا ایک لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔

''حرام خور، آلسی! آوارہ! سارے گاؤں میں کتے کی طرح گھومتے پھرتے ہو اور گھر میں پانی کی ایک بوند نہیں۔'' لڑکے کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی لکڑی سے وہ اسے بری طرح پیٹنے لگی۔

''اوئی ماں! اب نہیں جاؤں گا۔۔۔ ماں، مجھے چھوڑ دے ۔۔۔ماں۔۔۔''

ماں نے اچھی طرح اس کی دھنائی کی اور اپنا سارا غصہ اس پر نکال دیا۔

''ماں۔۔۔اوئی۔۔۔ہائے۔۔۔کوئی مجھے بچائے۔۔۔یہ مجھے مار دے گی!''

''کتے، آوارہ! سارا دن پھرتے رہتے ہو اور گھر میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں اور نہ جلانے کی لکڑی۔۔۔ کیا میرا یہی کام رہ گیا ہے کہ تم نکمے کو پیٹ بھرنے کو دیتی رہوں اور اس کے بدلے میں تم مجھے پریشان کرتے رہو؟'' اس نے زور سے لکڑی کی ایک اور ضرب لگائی۔

آخر کار لڑکے نے خود کو چھڑایا، کھڑکی میں سے باہر کودا اور آنسوؤں بھری آواز میں ماں پر چلایا: ''کتی، کمینی! خدا کرے تیرے ہاتھ کہنیوں تک گل سڑ جائیں۔ تم سورنی! خدا کرے تم پر بجلی گرے! جب تک میں تمہارے لیے پانی لاؤں، تم انتظار کرتے کرتے مر جاؤ اور مٹی کا ڈھیلا بن جاؤ۔۔۔ کتی ماں!'' وہ روتا چیختا گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔

کمرہ اچانک ہی عجیب طریقے سے خالی خالی لگنے لگا۔ آتشدان کے اوپر بنی کارنس پر رکھے لیمپ کی لو کپکپا رہی تھی۔ ننھی لڑکی سسکیاں لے رہی تھی۔

''تم کیوں ٹسوے بہا رہی ہو؟''

''ماں۔۔۔وہ۔۔۔وہ۔۔۔نانا۔۔۔'' وہ جھکی مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔ لگتا تھا اسے بخار آ رہا ہے۔ اس نے اپنی ننھی ننھی مٹھیوں سے اپنی آنکھیں ملیں اور نیند میں ڈوب گئی۔ نیند میں بھی وہ گاہے گاہے ہچکیاں لے رہی تھی۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد شوہر گھر لوٹ آیا۔ وہ ایک کیم شحیم شخص تھا۔ اس نے بھیڑ کی کھال کا لبادہ پہن رکھا تھا اور مفلر اپنی ٹوپی کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ سردی سے اس کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور مونچھیں برف کی تہہ جمنے سے کسی برش کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے اپنے بوٹوں سے برف جھاڑی، سر سے ٹوپی اور مفلر اتارے اور لبادے پر سے برف گرائی۔ اس نے سردی سے سن اپنے ہاتھ بغلوں میں دبائے اور بنچ گھسیٹ کر آگ کے قریب لاتے ہوئے اس پر دھم سے بیٹھ گیا۔

اس نے بند گوبھی سے بھری دیگچی آگ پر سے اتاری اور اسے اپنے شوہر کے آگے رکھ دیا۔ اس نے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا کاٹا اور چمچ کے ساتھ اپنے شوہر کو تھما دیا۔ کسان خاموشی سے کھانا کھانے میں جت گیا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے اپنے لبادے کے بٹن کھولے، ٹانگیں پساریں اور پوچھا: ''کھانے کو کچھ اور ہے؟''

عورت نے شوہر کو دوپہر کا بچا ہوا دلیہ دیا۔ اس نے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا لیا اور چمچ سے دلیہ کھانے لگا، پھر ادھر سے فارغ ہو کر اس نے اپنی جیب میں سے ایک تھیلی نکالی اور تمباکو کے ساتھ ایک سگریٹ بنائی۔ اس نے سگریٹ سلگائی، آتش دان میں کچھ اور لکڑیاں پھینکیں اور آگ کے قریب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کمرے میں نگاہ دوڑائی اور پوچھا: ''بوڑھا کہاں ہے؟''

''اسے کہاں ہونا چاہیے؟ سور خانے میں!''

کسان نے سوالیہ نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھا۔

''میں نے سوچا بستر میں لیٹے لیٹے وہ سستی کیوں پھیلائے اور بستر کی چادریں گندی کرے؟ اگر اس نے مرنا ہی ہے تو وہاں جلدی مر سکے گا۔۔۔ کیا اس نے مجھے پھوٹی کوڑی بھی دی ہے؟ وہ میرے پاس آیا کس لیے ہے؟ کیا میں اس کے کفن دفن اور کھانے پینے پر خرچہ کرنے کے لیے رہ گئی ہوں؟ اور اگر وہ اب نہیں مرتا۔۔۔ اور میں تمہیں بتادوں کہ وہ بڑا سخت جان ہے۔۔۔ تو وہ ہمیں اس گھر اور گھاٹ سمیت ہڑپ کر جائے گا۔ اگر جو لینا ہی کو سب کچھ ملنا ہے تو وہی اس کی دیکھ بھال بھی کرے۔۔۔ میں کیوں یہ سب کچھ بھگتوں؟''

''کیا میرے اس باپ نے۔۔۔ ہمیں دھوکا نہیں دیا۔۔۔ مجھے نہیں پروا۔۔۔ بوڑھا منصوبہ باز کہیں کا!''

اتنک نے سگریٹ کا دھواں اپنے معدے میں اتارا اور کمرے کے وسط میں تھوک دیا۔

''اگر وہ ہمیں دھوکا نہ دیتا تو ہم اس موقع پر۔۔۔ ایک منٹ رکنا ذرا۔۔۔ ہمارے پاس۔۔۔ پانچ۔۔۔ اور۔۔۔ سات۔۔۔ اور آدھا۔۔۔ کتنے ہوئے۔۔۔ پانچ اور۔۔۔ سات۔۔۔''

''ہاں، ساڑھے بارہ! میں نے پہلے ہی گن رکھے تھے۔ تب ہم ایک گھوڑا اور تین گائیں رکھ سکتے تھے۔۔۔ ہائے۔۔۔ کم بخت!''

اس نے پھر زور سے تھوکا۔

عورت اٹھی، گود کی بچی کو بستر پر لٹایا، صندوق میں سے بوڑھے کی مالا والی پوٹلی نکالی اور شوہر کے ہاتھ میں دے دی۔

''یہ کیا ہے؟''

''ذرا دیکھو تو!''

شوہر نے پوٹلی کھولی۔ اس کے چہرے پر حریصانہ تاثر پھیل گیا۔ وہ آگ کی جانب جھک گیا تاکہ پیسے چھپا سکے۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ رقم گنی۔

''کتنے ہیں؟'' عورت نے پوچھا۔ اسے پیسوں کی قدر کا اندازہ نہیں تھا۔

''چون روبل!''

''اوہ خدایا! اتنے زیادہ۔'' اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور پیسوں کی پوٹلی کو سہلانے لگی۔

''یہ تمہارے ہاتھ کہاں سے لگ گئے؟''

''آہ۔۔۔ میرے ہاتھ۔۔۔ کیسے؟ تمہیں یاد نہیں بوڑھے نے گزشتہ برس ہمیں بتایا تھا کہ اپنی تجہیز و تکفین کے لیے اس کے پاس خاطر خواہ پیسے ہیں۔''

''ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اس نے کہا تھا۔''

''یہ اس نے اپنے گلے کی مالا کے ساتھ سی رکھے تھے۔ میں نے یہ اس سے لے لیے۔ مقدس چیزوں کو سور باڑے جیسی گندی جگہ پر تو نہیں پڑے رہنا چاہیے! یہ بات گناہ ہے۔ میں نے کپڑے میں سے چاندی کو محسوس کر لیا اور بوڑھے کے گلے سے پھاڑ کر رقم اتار لی۔ یہ اب ہمارے ہیں۔ اس نے کون سا ہمارے ساتھ کم زیادتیاں کی ہیں؟''

''یہ خدائی سچ ہے۔ یہ پیسے اب ہمارے ہیں۔ چلو کچھ نہ کچھ تو آخر کار ہمارے پاس واپس آیا۔ انہیں بھی دوسرے پیسوں کے ساتھ رکھ دو۔ ان سے ہمارا کام چل سکتا ہے۔ ابھی کل ہی سمولوج نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے ایک ہزار روبل ادھار لینا چاہتا ہے۔ اس کے بدلے میں ضمانت کے طور پر وہ اپنے کاشت شدہ پانچ ایکڑ کھیت، جو جنگل کے قریب ہیں، مجھے دے دے گا۔''

''کیا تمہارے پاس اتنے پیسے ہیں؟''

''میرا خیال ہے، ہیں تو سہی!''

''کیا بہار آنے پر تم خود ان کھیتوں میں بیج بوؤ گے؟''

''شاید۔۔۔ اگر میرے پاس اتنے پیسے نہ بنے تو میں سورنی بیچ دوں گا۔ اگر اس کے بچے بھی بیچنا پڑے تو بیچ دوں گا۔ مجھے ہر صورت میں اسے پیسے ادھار دینے ہیں۔ اس میں قرض چکانے کی سکت نہیں۔'' اس نے بات آگے بڑھائی۔ ''مجھے پتا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ہم دونوں وکیل کے پاس جائیں گے اور اشٹام پر لکھوائیں گے کہ اگر اس نے پانچ برس کے اندر اندر قرض نہ چکایا تو زمین میری ہو جائے گی۔''

''کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟''

''بالکل کر سکتا ہوں میں ایسا۔ تم نہیں جانتی ہو کہ دومن نے وجیاک کے کھیت کس طرح ہتھیا لیے تھے؟ چلو چھوڑو۔۔۔ یہ لو۔۔۔ یہ چاندی کے سکے تم رکھ لو۔ جو دل چاہے بنوا لینا۔ اگنات کہاں ہے؟''

''پتا نہیں، کہیں بھاگ گیا ہے۔ میں کیا کروں، گھر میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں۔''

ایک لفظ کہے بغیر کسان اٹھا، مویشیوں کو دیکھا، اندر اور باہر گیا اور پانی ایندھن لے آیا۔

دیگچی میں رات کے کھانے کے لیے سالن ابل رہا تھا۔ اگنات محتاط انداز سے کمرے میں رینگ آیا۔ کسی نے اس سے کچھ نہ کہا۔ سب کے سب خاموش تھے اور عجیب سی بے چینی میں ڈوبے

ہوئے تھے۔ بوڑھے آدمی کا کسی نے ذکر نہ کیا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

اتنک اپنے پانچ ایکڑوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ پانچ ایکڑ اب اس کے ہو گئے ہیں۔ ایک پل کے لیے اس کے دماغ میں بوڑھے کا خیال آیا، لیکن فوراً ہی اس کا دھیان اس سورنی کی طرف چلا گیا جس کے بارے میں اس نے سوچ رکھا تھا کہ جیسے ہی وہ اپنے بچوں کو دودھ پلانا بند کرے گی، وہ اسے مار دے گا۔ اس کی نگاہیں جب بھی بوڑھے کے خالی بستر پر پڑتیں، وہ تھوک دیتا جیسے کسی ناگوار خیال سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔ وہ پریشان تھا۔ رات کا کھانا بھی اس نے ادھورا ہی چھوڑ دیا اور کھانا کھاتے ہی بستر پر سونے کے لیے جا لیٹا۔ دیر تک وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ آلو، بند گوبھی اور دلیہ ڈبل روٹی کھانے سے اسے بدہضمی کا احساس ہو رہا تھا، لیکن جلد ہی وہ پرسکون ہو گیا اور اسے نیند نے آ لیا۔

جب ہر سو خاموشی چھا گئی تو اتنکو وا نے آہستگی سے بغلی کمرے کا دروازہ کھولا جہاں پٹ سن کے گٹھے رکھے ہوئے تھے۔۔ ان گٹھوں کے نیچے سے اس نے ایک پوٹلی نکالی اور اس میں لپٹے ہوئے نوٹوں کو احتیاط سے باہر نکالا۔ اس نے اپنے نوٹ بھی ان پیسوں میں رکھ دیے۔ اس نے پیسوں کو کئی بار سہلایا، پوٹلی کو کئی بار کھولا اور بند کیا اور اس وقت تک یہ عمل دہراتی رہی جب تک اس کا دل نہیں بھر گیا۔ اس کے بعد اس نے بتی بجھائی اور اپنے شوہر کے پہلو میں آ کر لیٹ گئی۔

اسی دوران سور خانے میں پھینکا ہوا بوڑھا آدمی مر گیا۔ سور خانے میں شاخوں اور گھاس پھونس سے بنے تختوں کی اوٹ اسے موسم کی شدت اور ہوا کی سختی سے بچا نہ سکی۔ بے چارگی سے کپکپاتی ہوئی، بوڑھے آدمی کی داد، فریاد کسی نے نہ سنی۔ بند دروازے تک گھسٹ کر آتے اور دروازہ کھولنے کی کوشش میں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی سعی کرتے اسے کسی نے نہ دیکھا۔ اس نے موت کو خود پر فتح پاتے محسوس کیا۔ اسے یوں لگا موت ایڑیوں سے ہوتی ہوئی اس کی چھاتی تک آ پہنچی ہے۔ موت نے اسے سختی سے بھینچ لیا اور پکڑ کر بری طرح جھٹکے دیے۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے اور بھنچتے چلے گئے، حتیٰ کہ وہ انہیں کھولنے اور مدد کے لیے چیخنے کے قابل نہ رہا۔ اس کی شریانیں اکڑنے لگیں حتیٰ کہ آہنی تاروں کی طرح ہو گئیں۔ کمزوری کے باوجود اس نے خود کو آگے کی طرف گھسیٹا، آخر دہلیز پر آ کر وہ ہمت ہار گیا۔ اس کے ہونٹوں پر جھاگ جم گیا تھا۔ سردی میں مرنے کے لیے چھوڑ دیے جانے کے باعث اس کی پھٹی آنکھوں میں دہشت منجمد ہو گئی تھی۔ ایک منجمد چیخ کی طرح درد کے تاثر نے اس کے چہرے کو مروڑ دیا تھا۔ وہیں نیم وا دروازے میں وہ مرا پڑا تھا۔

اگلی صبح اجالا ہونے سے پہلے اتنک اور اس کی بیوی بیدار ہو گئے۔ اتنک کے دماغ میں سب سے پہلا خیال ہی یہ آیا کہ بوڑھے کا کیا بنا ہوگا!

وہ بوڑھے کو دیکھنے گیا، لیکن سور خانے کا دروازہ نہ کھل سکا۔ اندر لاش دروازے کے پٹ کو کسی شہتیر کی طرح روکے ہوئے تھی۔ آخر کار بہت کوشش کے بعد وہ اتنا سا دروازہ کھول پایا کہ کھسک کر اندر جا سکے۔۔۔ لیکن فوراً ہی وہ دہشت زدہ ہو کر باہر نکل آیا۔ خوف سے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے تیزی سے صحن عبور کیا اور گھر کے اندر چلا آیا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس کا جسم یوں کانپ رہا تھا جیسے زور کا بخار چڑھا ہو۔ وہ دروازے کے قریب کھڑا ہانپتا رہا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔

اس وقت اتنکو وا اپنی بچی ماگدا کو دعا سکھا رہی تھی۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھا۔

"تمہارا احساب کیا جائے گا" وہ بے خیالی میں بھنبھنائی۔

"تمہارا احساب۔۔۔" بچی نے دعا ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا جائے گا۔۔۔"

"کیا جائے گا۔۔۔" گھٹنوں پر جھکی بچی نے کسی بازگشت کی طرح دعا کے الفاظ دہرائے۔"

"کیا وہ مر گیا؟" عورت نے شوہر سے پوچھا، پھر بچی سے کہا: "زمین پر۔۔۔"

"ہاں، وہ دروازے کی اوٹ میں پڑا تھا۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"۔۔۔جیسے کہ آسمان پر۔۔۔"

"لیکن ہم اسے وہاں نہیں چھوڑ سکتے۔ لوگ کہیں گے ہم نے جان چھڑانے کے لیے اسے وہاں پھینک دیا۔ ہم اسے وہاں نہیں۔۔۔"

"تم کیا چاہتے ہو مجھے اس کے ساتھ کیا کرنا ہوگا؟"

"مجھے کیا پتا! تمہیں کچھ کرنا پڑے گا۔۔۔ شاید ہم اسے یہاں لا سکتے ہیں۔" اتنک نے مشورہ دیا۔

"دیکھو۔۔۔ اسے وہیں سڑنے دو۔ اسے یہاں لے آئیں؟ نہیں۔۔۔ اگر۔۔۔"

"بے وقوف! اسے دفنانا تو پڑے گا۔"

"تو کیا ہمیں اس کے کفن دفن کا خرچہ بھی اٹھانا پڑے گا؟ ۔۔۔لیکن ہمیں برائی اور شر سے بچا۔۔۔ اور تم یہ کیا آنکھیں مٹکا رہی ہو چڑیل؟ چلو دعا پڑھو!"

"ہمیں۔۔۔شر۔۔۔سے۔۔۔بچا۔۔۔"

"میں کفن دفن کے خرچے کے بارے میں کیوں سوچوں؟ قانونی طور پر تو یہ تو مک کا فرض ہے۔"

"آمین!"

"آمین!"

عورت نے بچی کے سینے پر کراس کا نشان بنایا، اپنی انگلیوں سے اس کی ناک صاف کی اور اپنے شوہر کے پاس گئی۔

"ہمیں اسے لازماً یہاں لانا ہوگا۔" شوہر نے سرگوشی کی۔

"گھر کے اندر۔۔۔یہاں؟"

"تو اور کہاں؟"

"گائے کے چھپر تلے! ہم بچھڑے کو باہر نکال کر اسے بنچ پر لٹا دیں گے۔ وہاں سیدھا پڑا رہے گا۔۔۔ چاہے تو۔۔۔ وہ ہے بھی تو ایسا ہی۔"

"موزیکا!"

"ہاں!"

"ہمیں چاہیے کہ اسے یہاں لے آئیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر اسے یہاں لے آؤ۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔لیکن۔۔۔"

"کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟"

"احمق، خر دماغ!"

"تو پھر اور کیا بات ہے؟"

"ابھی اندھیرا ہے۔"

"اگر تم دن چڑھنے کا انتظار کرو گے تو لوگ دیکھ لیں گے۔"

"آؤ، دونوں چلتے ہیں۔"

"تمہیں اتنا شوق ہے تو اکیلے ہی جاؤ۔"

"تم آتی ہو یا نہیں بدذات عورت!" وہ اپنی بیوی پر برسا۔

"وہ تمہارا باپ ہے، میرا نہیں۔" وہ پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

عورت بغیر کوئی لفظ منہ سے نکالے اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔

جب وہ سور خانے میں داخل ہوئے تو دہشت سے ٹھٹک گئے۔ ایک خوفناک بو سے ان کا دم گھٹنے لگا جیسے لاش میں سے بخارات اٹھے ہوں۔ بوڑھا آدمی برف کی طرح وہاں منجمد پڑا تھا۔ اس کا آدھا دھڑ فرش پر جم گیا تھا۔ دونوں نے زور لگا کر اسے فرش سے علیحدہ کیا اور دہلیز پر سے گھسیٹتے ہوئے صحن میں لے آئے۔

اسے دیکھتے ہی انتکو وا نے خوف سے بری طرح کانپنا شروع کر دیا۔ صبح کے ملگجے اجالے میں، برف کی سفید چادر سے ڈھکا وہ بہت ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ درد سے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ زبان باہر لٹک رہی تھی اور بتیسی اس میں اس طرح پیوست تھی کہ خوف آتا تھا۔ اس کی جلد پر نیلے نیلے داغ ابھر آئے تھے اور وہ سر سے پیر تک گندگی میں لتھڑا ہوا تھا۔

"پکڑو اسے۔" انتک نے جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ "یہ سردی سے کتنا خوفناک ہو گیا ہے!"

طلوع آفتاب سے پہلے کی یخ ہوا کے تھپیڑے ان کے چہروں پر پڑ رہے تھے۔ جھولتی شاخوں پر سے برف کڑکڑاتی ہوئی نیچے گر رہی تھی۔ سیاہ آسمان کے پس منظر میں یہاں وہاں اکا دکا ستارے ابھی تک ٹمٹما رہے تھے۔ گاؤں کی جانب سے ہوا کے دوش پر پانی کھینچنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور مرغ یوں بانگیں دے رہے تھے جیسے تبدیلی موسم کی نوید سنا رہے ہوں۔

بوڑھے کو پیروں سے پکڑ کر اٹھانے سے پہلے انتکو وا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہاتھوں پر اپنا ایپرن لپیٹ لیا۔ بوڑھا بہت بھاری تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اسے اٹھایا۔ جونہی انہوں نے بوڑھے کو بنچ پر لٹایا، انتکو وا نے اپنے شوہر کی طرف ایک پھٹی ہوئی چادر پھینکی تا کہ وہ لاش ڈھانپ سکے اور گھر کی طرف بھاگ گئی۔

بچے آلو چھیلنے میں مصروف تھے۔ وہ دروازے سے لگی انتظار کرتی رہی۔

"ہو گیا ختم۔۔۔ چلو اندر آ جاؤ۔۔۔ خدایا! تم نے کتنی دیر لگا دی۔"

"اسے غسل کرانے کے لیے ہمیں کسی کو بلانا پڑے گا۔" شوہر اندر آیا تو عورت نے اس کا ناشتا لاتے ہوئے کہا۔

"میں اس گونگے بہرے کو لے آؤں گا۔"

"آج کام پر مت جاؤ۔"

"جاؤں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں میں۔۔۔"

اس کے بعد دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی اور بغیر رغبت کے انہوں نے اپنا ناشتا ختم کر لیا۔ روزانہ کی طرح انہوں نے مل کر شوربے کا ایک بڑا پیالہ ختم کیا۔

جب وہ صحن میں گئے تو تیز تیز قدم اٹھاتے آگے بڑھے، انہوں نے دوسری طرف دیکھنے کے لیے سر گھمانے کی کوشش نہ کی۔

وہ پریشان تھے، لیکن نہیں جانتے تھے کہ کیوں؟ انہیں کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ شاید یہ لاش کا ایک مبہم سا خوف تھا یا موت کی دہشت! جس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا اور وہ بالکل خاموش تھے۔

دن چڑھا تو اتنک گاؤں کے گونگے بہرے کو بلا لایا۔ گونگے بہرے نے لاش کو غسل دیا، کفن پہنایا اور باہر لٹا کر اس کے سرہانے ایک مقدس موم بتی جلا دی۔ اس کے بعد اتنک پادری کو بوڑھے کی موت کی خبر دینے اور گاؤں کے سرپنچ کو یہ بتانے چل دیا کہ مرحوم کے کفن دفن کے اہتمام کی اس کی حیثیت نہیں۔ ''تومک ہی اس کی تجہیز و تکفین کے اخراجات برداشت کرے گا۔ اسی کو سارا پیسہ اور جائیداد ملی ہے۔''

جلد ہی بوڑھے کے مرنے کی خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی صورت میں لاش دیکھنے جمع ہو گئے۔ وہ مناجات بدبداتے اور سر ہلاتے بوڑھے کی موت کے بارے میں گفتگو کرتے چلے جا رہے تھے۔

تیسرے روز، تدفین سے تھوڑی دیر قبل تومک کی بیوی آ پہنچی۔ گلیارے میں وہ اپنی بہن کے روبرو آ گئی جو پانی کی بالٹی اٹھائے گائے کے باڑے کی طرف جا رہی تھی۔

''یسوع مسیح رحم فرمائیں!'' دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ منمنائی۔

''دیکھا۔۔۔ دیکھا۔۔۔ اب آ گئی ہے یہ جوڈا کی روح!'' اتنکووا نے بالٹی نیچے رکھ دی۔ ''اب آ گئی ہے ہماری جاسوسی کرنے! آخر اس بوڑھے سے تم نے پیچھا چھڑا ہی لیا ناں؟ ہے ناں؟ اس نے سب کچھ تو تمہارے حوالے کر دیا ہے۔۔۔ پھر بھی تمہیں اپنی منحوس شکل لے کر یہاں آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ گشتی آوارہ کہیں کی! اب تم وہ چیتھڑے سمیٹنے آئی ہو جو وہ بوڑھا چھوڑ گیا ہے؟ بولو؟''

''میں نے شہر سے اسے صدری خرید کر دی تھی۔ وہ اسے پہن سکتا تھا، لیکن بھیڑ کی کھال کا لبادہ مجھے واپس چاہیے۔ وہ میں نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے خریدا تھا۔'' تومیکووا نے آہستگی سے کہا۔

''واپس چاہیے؟ خارش زدہ کتیا، تمہیں وہ واپس چاہیے؟'' اتنکووا چیخی۔ ''ٹھہرو ذرا، میں تمہیں واپس دیتی ہوں۔۔۔ ذرا دیکھو تو، تمہیں کیا چیز ملتی ہے۔۔۔'' اس نے اردگرد کسی ایسی چیز کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں جو اس کا مقصد پورا کر سکے۔

''لے جاؤ واپس! ہمت ہے تو لے جاؤ واپس! تم نے اس بڈھے کی چاپلوسی کی اور نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ اس کا دماغ چل گیا اور اس نے ہر چیز تمہیں سونپ دی، میری حق تلفی کی اور پھر۔۔۔''

''سب کو پتا ہے کہ زمین ہم نے اس سے خریدی تھی۔ کئی گواہ ہیں اس بات کے۔۔۔''

''خریدی تھی؟ ذرا اسے دیکھو، بڑی آئی خریدنے والی! تمہارا مطلب ہے کہ خدا کی جیتی جاگتی آنکھوں کے نیچے تمہیں جھوٹ بولتے ہوئے کوئی ڈر نہیں لگتا؟ خریدی تھی؟ دھوکے باز! چور، کتیا، کمینی! پہلے تم نے اس کے پیسے چرا لیے اور پھر۔۔۔ کیا تم اسے سوروں والے برتن میں کھانا نہیں دیتی تھیں؟ خدا گواہ ہے کہ اسے سوروں والی بالٹی میں سے آلو کھانا پڑے تھے۔ تم اسے گائے کے باڑے میں سلاتی تھیں کیونکہ تم کہتی تھیں اس سے بدبو آتی ہے۔ جس سے کھانا تمہارے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ پندرہ ایکڑ زمین۔۔۔ اور اس طرح کی محتاج زندگی۔۔۔ اتنی جائداد کے بدلے! اور تم اس کی پٹائی بھی کرتی تھیں۔ تم سورنی، بندریا!''

''اپنی گندی زبان کو لگام دو، ورنہ میں اسے اس طرح بند کروں گی کہ ساری زندگی یاد رکھو گی سورنی، کنجری!''

''تو پھر آؤ، سامنے آؤ بھوکی ننگی!''

''میں بھوکی ننگی؟''

''ہاں، تم! تم گندی نالی میں سڑو گی۔ اگر تومک تم سے شادی نہ کرتا تو تمہاری لاش کیڑے کھاتے۔''

میں بھوکی ننگی اور تم گندی مردار!

دونوں ایک دوسرے پر لپکیں، انہوں نے ایک دوسرے کے بال پکڑ لیے اور تنگ گلیارے میں لڑنے لگیں۔ وہ کرخت آواز میں ایک دوسرے پر چلا رہی تھیں۔

''تم گشتی، رنڈی، بازاری عورت! یہ لو۔۔۔ یہ ایک تمہارے لیے۔۔۔ اور یہ ایک میرے پندرہ ایکڑ کے لیے اور یہ ایک ان تمام زیادتیوں کے لیے جو تم نے میرے ساتھ کیں، گندی کتیا!''

''خدا کے لیے بند کرو یہ لڑائی! چھوڑو، چھوڑو ایک دوسرے کو۔ یہ گناہ ہے اور باعث شرم بھی!'' ہمسائے چلائے۔

''مجھے جانے دو کوڑھی! چھوڑو مجھے جانے دو!''

''میں مار مار کے تیرا بھرکس نکال دوں گی۔ میں تمہارے ٹوٹے کر دوں گی، غلاظت!''

دونوں نیچے گر پڑیں۔ وہ ایک دوسرے کو اندھا دھند ٹھوکریں مار رہی تھیں۔ وہ بالٹی پر گر پڑیں اور لڑھکتی ہوئی گندے پانی میں لتھڑ گئیں۔ آخرکار وہ غصے سے گنگ ہو گئیں، ان کے سانس پھول گئے۔ وہ ایک دوسرے کو پیٹ رہی تھیں۔ لوگ انہیں علیحدہ کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے انہوں نے دونوں کو جدا کیا۔ ان کے چہرے سرخ ہو گئے تھے اور ان پر خراشیں پڑ گئی تھیں۔

وہ غلاظت میں لتھڑ گئی تھیں اور بالکل بھوتنیاں لگ رہی تھیں۔ ان کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے پر ایک بار پھر لپکیں اور لوگوں نے انہیں دوبارہ علیحدہ کیا۔

آخر کار اتنکو والی نے غصے اور تھکاوٹ سے وحشیانہ انداز میں چیخنا شروع کر دیا۔ اس نے دیوانوں کی طرح اپنے بال کھینچے اور واویلا کرنے لگی: ''اوہ یسوع مسیح! اوہ مقدس مریم! اس خبیث عورت کو دیکھو! ان ظالموں پر لعنت۔۔۔ اوہ۔۔۔ اوہ۔۔۔'' وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر روئے جا رہی تھی۔ گھر سے باہر تو میکووا چیخ چلا اور لعنت پھٹکار کر رہی تھی۔ اس نے زور زور سے اپنی ایڑیاں دروازے میں ماریں۔

تماشائی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کھڑے ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہوئے اپنے پیر برف میں مار رہے تھے۔ عورتیں دیوار پر لگے سرخ دھبوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ بدن کو چیر دینے والی سرد ہوا سے بچنے کے لیے انہوں نے اپنے گھٹنے سکوڑ رکھے تھے۔ وہ گاہے گاہے ایک دوسرے کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگتیں اور چرچ کی طرف جانے والی سڑک پر نگاہیں جما دیتیں۔ درختوں کی ٹنڈ منڈ شاخوں کے عقب میں چرچ کی چوٹیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ہر ایک دو منٹ بعد کوئی نہ کوئی لاش دیکھنے چلا آتا، چنانچہ لوگوں کی آمد مسلسل جاری تھی۔ نیم وا دروازے میں سے موم بتیوں کے ننھے زرد شعلے دکھائی دے رہے تھے اور اس لرزتے اجالے میں تابوت میں لیٹے بوڑھے آدمی کی ایک ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دے جاتی۔ ہوا میں سلگتی ہوئی اگربتی کی مہک گھل رہی تھی۔ دعاؤں کی بھنبھناہٹ اور گونگے بہرے کی خرخراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔

آخر کار پادری آرگن نواز کے ساتھ آ پہنچا۔ چیڑھ کا سفید تابوت اٹھایا گیا اور چھکڑے پر لاد دیا گیا۔ عورتوں نے روایتی گریہ زاری شروع کر دی اور مخصوص بین کرنے لگیں۔ اجتماع گاؤں کی لمبی لمبی گلیوں میں سے گزرتا ہوا قبرستان کی طرف بڑھنے لگا۔

پادری نے مرحوم کی مغفرت کے لیے اولیں الفاظ کہے۔ وہ اجتماع کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس نے اپنے لبادے کے اوپر فر کا فرغل پہن رکھا تھا اور سر پر کالی چوکور ٹوپی اوڑھے ہوئے تھا۔ تیز ہوا سے اس کے فرغل کا کونا پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے لاطینی مناجات کے الفاظ اس طرح وقفے وقفے سے نکل رہے تھے جیسے وہ جم گئے ہوں۔ وہ اکتاہٹ کا شکار، بیزار اور بے چین دکھائی دیتا تھا اور اس کی نگاہیں دور کسی نقطے پر بھٹک رہی تھیں۔ تیز ہوا تابوت کے غلاف کو اڑا رہی تھی جس پر بنی جنت اور دوزخ کی تصاویر باہم گڈمڈ ہو رہی تھیں اور آگے پیچھے پھڑپھڑا رہی تھیں، جیسے دونوں طرف بنی جھونپڑیوں کی قطاروں کو اپنا نظارہ کرانے کے لیے مضطرب ہوں۔ ان جھونپڑیوں کے آگے عورتیں سروں پر شالیں لیے جبکہ مرد ننگے سر باہم جڑے کھڑے تھے۔ جنازہ آگے بڑھا تو مرد و زن احترام سے جھک گئے۔ انہوں نے اپنے اپنے سینے پر کراس کا نشان بنایا اور اپنی چھاتیاں پیٹنے لگے۔ جھاڑیوں کے عقب سے کتے بے تحاشا بھونک رہے تھے۔ ان میں سے کچھ تنگ دیواروں پر چڑھ گئے اور لمبی آواز میں رونے لگے۔ ننھے منے متجسس بچوں نے بند کھڑکیوں کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ ان کے ساتھ کھڑے پوپلے منہ والے خستہ بوڑھوں کے چہرے بھی دکھائی دے رہے تھے جن کے چہرے کی جھریاں پت جھڑ میں ہل چلائے کھیتوں کی طرح تھیں۔

پادری کے پیچھے پیچھے لڑکوں کی ایک ٹولی دوڑ پڑی۔ ان لڑکوں نے سوتی پتلونیں اور پیتل کے بٹنوں والی نیلی جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ ان کے پیروں میں چوبی سینڈل تھے۔ وہ تابوت کے غلاف پر بنی، جنت اور دوزخ کی تصاویر کو گھورنے کے ساتھ ساتھ اپنی باریک کپکپاتی آوازوں میں مناجات بھی پڑھ رہے تھے۔ وہ اس وقت تک مناجات گاتے رہے جب تک کہ آرگن نواز نے لے نہ بدل دی۔

اگنات سب سے آگے آگے، ایک ہاتھ میں غلاف تھامے احساس تفاخر کے ساتھ بلند آواز میں گا رہا تھا۔ سردی اور سرگرمی سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، لیکن وہ رکا نہیں جیسے یہ ظاہر کرنے کو بے تاب ہو کہ صرف اسے ہی مناجات گانے کا حق حاصل ہے، کیونکہ یہ اس کا نانا ہے جسے قبرستان کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔

جنازے کے شرکا گاؤں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ تیز ہوا اتنک کے ضخیم جثے سے ٹکرا رہی تھی جو سب سے اونچا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے، لیکن وہ تیز ہوا کو خاطر میں نہ لایا۔ اس کی پوری توجہ گھوڑوں اور تابوت کو سیدھا رکھنے پر تھی جو سڑک کے ہر گڑھے پر خطرناک انداز میں ایک طرف کو جھک جاتا تھا۔

دونوں بہنیں تابوت کے بالکل پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ وہ دعائیں بدبدا رہی تھیں اور کھا جانے والی نگاہوں سے ایک دوسری کو گھور بھی رہی تھیں۔

''شوشو! گھر جاؤ!۔۔۔ فوراً گھر جاؤ بدذات!'' ایک ماتم گسار نے پتھر اٹھانے کے لیے ہاتھ نیچے کیا۔ گاڑی کے پیچھے آتی ہوئی کتیا نے یہ دیکھ کر اپنی دم ٹانگوں کے بیچ دبائی اور سڑک کنارے پتھروں کے ڈھیر کے پیچھے دبک گئی۔ جنازہ تھوڑا سا آگے بڑھا تو وہ پتھروں کے ڈھیر کے پیچھے سے نکل کر تیزی سے آئی اور گھوڑوں کے ساتھ

لگ کر جلنے لگی۔ پھر اسے کسی نے نہ بھگایا۔
لاطینی مناجات اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ عورتوں نے چیختی آوازوں میں پرانی مناجات گانا شروع کر دی: ''وہ جو پروردگار کی پناہ میں رہتا ہے۔'' لیکن اب کے آواز دھیمی ہی رہی۔ تیزی سے بڑھتے ہوئے برفانی موسم نے گیت کی لے کو بلند نہ ہونے دیا۔ جھٹ پٹا چھار ہا تھا۔ تیز برفانی ہوا حد نظر تک پھیلے ڈھلواں میدانوں سے برف کے بادل اڑائے لا رہی تھی۔ ان میدانوں میں یہاں اور وہاں ٹنڈ منڈ درخت ایستادہ تھے۔ برفانی ہوا جنازے کے شرکا پر کوڑے برسا رہی تھی۔ چاروں طرف پتھروں، درختوں حتیٰ کہ سڑک کے آر پار برف کے بڑے بڑے ڈھیر لگنے شروع ہو گئے تھے۔
موسم کی شدت کے سبب جنازے کے شرکا جب بے چین ہو کر ارد گرد بڑھتی ہوئی برف کی سفید چادر کو دیکھتے تو بار بار ان کے گانے کا سلسلہ ٹوٹ جاتا۔ ہوا کے تھپیڑے جب برف کی اس چادر پر پڑتے تو کبھی وہ ساتھ ساتھ متحرک دکھائی دیتی اور کبھی ساحل سے ٹکرانے والی بڑی بڑی موجوں کی طرح ریزہ ریزہ ہوتی دکھائی دیتی اور ماتم گساروں کے برہنہ چہروں پر ہزاروں سوئیاں بن کر آ چبھتی۔ موسم کی شدت میں اضافے کے پیش نظر کچھ لوگ تو آدھے راستے ہی سے لوٹ گئے جبکہ دوسرے اپنی رفتار تیز کرتے ہوئے جلدی جلدی قبرستان کی طرف بڑھنے لگے۔ اب وہ تقریباً دوڑ رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی قبرستان میں پہنچے۔ قبر تیار تھی۔ انہوں نے تیز تیز مناجات گائی۔ پادری نے تابوت پر مقدس پانی چھڑکا۔ مٹی اور برف کے منجمد ڈھیلے قبر میں لڑھکائے اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔
تومک نے سب لوگوں کو اپنے گھر مدعو کیا تھا کیونکہ عزت مآب پادری نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو یہ مذہبی رسم پبلک ہاؤس میں غیر مذہبی انداز سے انجام پذیر ہوگی۔ اس دعوت کے جواب میں انتک نے اس پر لعنت بھیجی۔ وہ چاروں بشمول اگنات اور کسان سمولوج سرائے کی جانب مڑ گئے۔ انہوں نے چار کوارٹ شراب کے پئے، سموسے کھائے اور رقم کے لین دین کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ کمرے کی گرمی اور شراب کی حرارت نے انتک کو ہوش سے بیگانہ کر دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا گھر کی طرف اس حالت میں آ رہا تھا کہ اس کی بیوی نے اسے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ قرض ملنے کی امید میں ایک اور جام چڑھانے کی غرض سے سمولوج سرائے میں رک گیا، لیکن اگنات سر پر پاؤں رکھ کر گھر کی طرف بھاگا کیونکہ اسے بہت سردی لگ رہی تھی۔
''دیکھو تو۔۔۔ اے ماں!'' انتک نے کہا۔ ''پانچ ایکڑ میرے ہیں۔۔۔ آ ہا۔۔۔ میرے۔۔۔ تم نے سنا؟۔۔۔ پت جھڑ کے دوران میں ان کھیتوں میں گندم بیجوں گا۔۔۔ جو اگاؤں گا۔۔۔ اور بہار آنے پر آلو کاشت کروں گا۔۔۔ میرے ہو گئے۔۔۔ سب میرے۔۔۔ مجھے۔۔۔ اللہ۔۔۔ کا۔۔۔ سہارا۔۔۔ وہ۔۔۔ کہتا۔۔۔'' انتک نے اچانک گانا شروع کر دیا۔
طوفان بڑھتا جا رہا تھا۔ تیز ہوا چنگھاڑ رہی تھی۔
''چپ ہو جاؤ! گر جاؤ گے اور سب کچھ یہیں ختم ہو جائے گا۔''
''۔۔۔ اس کے فرشتے۔۔۔ نگرانی۔۔۔ کرتے ہیں۔۔۔''
وہ کہتے کہتے ایک دم رک گیا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ دو فٹ کے فاصلے پر بھی کچھ دکھائی دینا مشکل ہو گیا تھا۔ طوفان اپنی پوری شدت پر تھا۔ ہوا کا شور بڑھ گیا تھا۔ گڑگڑاہٹ کان پھاڑے دے رہی تھی اور میاں بیوی کو یوں لگ رہا تھا جیسے برف کے پہاڑ ان کے اوپر گر رہے ہوں۔
جب وہ تومک کی جھونپڑی کے سامنے سے گزرے تو مرحوم کی آخری رسومات کی مناجات اور اونچی اونچی آوازیں ان کے کانوں میں پڑیں، لیکن دونوں آگے سے گزر گئے۔
''یہ کتنے کمینے! یہ چور! تم تھوڑا انتظار کرو، میں تمہیں اپنے پانچ ایکڑ دکھاؤں گا۔۔۔ پھر میرے پاس دس ہو جائیں گے۔۔۔ تب تمہارا مجھ پر رعب نہیں ہوگا۔۔۔ کتے کی ذات!۔۔۔ آ ہا۔۔۔ میں کام کروں گا۔۔۔ میں غلامی کروں گا، لیکن میں یہ حاصل کر کے رہوں گا۔۔۔ آہ۔۔۔ ماں؟۔۔۔ کیا یہ ہمیں مل جائیں گے؟'' اس نے اپنے سینے پر مکے مارے اور اپنی مخمور آنکھیں گھما ئیں۔
تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بڑبڑاتا رہا، لیکن جیسے ہی میاں بیوی اپنے گھر پہنچے، بیوی نے اسے گھسیٹ کر بستر پر پھینک دیا جہاں وہ کسی مردے کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا، لیکن وہ سویا نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ چلایا: ''اگنات!''
لڑکا سہما ہوا محتاط انداز سے آگے بڑھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں باپ لات رسید نہ کر دے۔
''اگنات! کتے، مردار! اگنات! تم اول درجے کے کسان بنو گے نہ کہ دو کوڑی کے بھک منگے پیشہ ور۔ سمجھے تم!'' وہ اول فول بکتا رہا اور اس کا ہاتھ بستر سے نیچے ڈھلک گیا۔
''پانچ ایکڑ میرے ہیں۔۔۔ میرے۔۔۔ سالے بدیشی۔۔۔ تیری تو ایسی کی تیسی۔۔۔''
بڑبڑاتا ہوا وہ گہری نیند سو گیا۔
☆☆☆☆☆

فنونِ لطیفہ کے دیس سے

نرم گھاس

ایک بوڑھے کا سوزِ دروں، وہ
آخری عمر میں یتیم ہو گیا تھا

لیوگی پرانڈیلو / وجاہت مسعود

سب لوگ ساتھ والے کمرے میں اس سے یہ پوچھنے گئے کہ وہ تابوت پر ڈھکن رکھے جانے سے قبل اپنی بیوی کا آخری دیدار کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بڑی سی کرسی پر سو رہا تھا۔

''بہت اندھیرا ہے۔ کیا وقت ہوا ہے؟'' اس نے پوچھا

صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے مگر بادلوں کے باعث روشنی بہت کم تھی۔ جنازے کے لیے دس بجے کا وقت رکھا گیا تھا۔

سینور پادری سپاٹ آنکھوں سے سب کو گھورتا رہا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ رات بھر ایسی اچھی نیند سویا رہا تھا۔ ابھی تک نیند اور

گزشتہ چند روز کے صدمے سے وہ ماؤف سا ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر مدھم روشنی میں کرسی کے گرد کھڑے ہمسایوں سے اپنا چہرہ چھپا لے، مگر دیر تک سونے سے سارا جسم سیسے کی طرح بھاری ہو رہا تھا۔ اس کے پنجوں میں کھڑا ہونے کی اکساہٹ پیدا ہوئی مگر فوراً ہی دم توڑ گئی۔ اس کے منہ سے اچانک بلند آواز میں ایک لفظ نکلا: ''ہمیشہ!'' اس کا لہجہ ایسا تھا گویا کوئی کسمسا کر پھر سے چادر منہ پر ڈال لے اور سو جائے۔ سب سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ''ہمیشہ'' کیا؟''

وہ کہنا چاہتا تھا کہ دن کے وقت بھی ہمیشہ اندھیرا ہی چھایا رہتا تھا مگر پھر یہ بات اسے بڑی بے معنی لگی۔ بیوی کی موت سے اگلا دن اس کی تدفین کا دن۔ وہ ہمیشہ اس ملگجی روشنی اور گہری نیند کو یاد رکھے گا اور یہ حقیقت کہ ساتھ والے کمرے میں اس کی بیوی کی میت رکھی تھی، غالباً کھڑکیاں؟

کھڑکیاں ابھی تک بند تھیں۔ انہیں رات کو کھولا ہی نہیں گیا تھا۔ بڑی بڑی موم بتیوں سے رات بھر موم ٹپکتی رہی تھی، اور ابھی تک کمرے میں کچھ حرارت موجود تھی۔ نعش کو چار پائی سمیت کمرے سے لے جایا جا چکا تھا۔ اب زردی مائل سفید ساٹن کے کفن میں ملبوس اکڑی ہوئی اور رکھا رکھا نعش گدے دار تابوت میں رکھی تھی۔

نہیں بہت ہو چکی۔ میں اس کا چہرہ دیکھ چکا ہوں۔ اس نے آنکھیں موند لیں جو پچھلے کئی دنوں سے مسلسل رونے کے باعث جل رہی تھیں۔ بہت ہو چکی۔ اس نیند میں سب کچھ ڈھل چکا۔ دکھ بھرے خلا کا اک احساس تو ضرور ہے مگر دکھ کی چبھن کند ہو چلی ہے۔ بس اب یہ ادگ تابوت کو بند کر دیں اور اس میں رکھی ہوئی میری متاعِ حیات کو لے چلیں۔

''مگر وہ ابھی تک برابر والے کمرے میں پڑی ہے۔'' کوندے کی طرح اک خیال لپکا۔

وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور لڑکھڑاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ انہوں نے اس کے بازو تھام لئے۔ اس کی آنکھیں نیم بند ہو رہی تھیں۔ وہ اسے کھلے ہوئے تابوت کی طرف لے چلے۔ اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور اس کا نام لے کر اسے پکارا۔ صرف وہی اسے اس نام سے پکارا کرتا تھا۔ ایک ساتھ گزاری ہوئی زندگی کے سارے رنگ اس نام سے وابستہ تھے۔ اس نے غصے سے ارد گرد کھڑے لوگوں پر ایک نظر ڈالی جو اس کی مردہ بیوی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس عورت کے متعلق کیا جانتے تھے؟ وہ تو یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے تھے کہ اس سے کیا چیز چھن گئی تھی۔ وہ چیخنا چاہتا تھا۔

اس کے تاثرات دیکھ کر اس کا بیٹا آگے بڑھا تا کہ اسے تابوت سے پرے لے جائے۔ بیٹے کا مقصد جان کر ایک سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اسے لگا جیسے وہ اس ہجوم میں ننگا ہو گیا ہو۔ اسے اپنے جذبات حتیٰ کی رات کی نیند پر بھی خجالت محسوس ہوئی۔ بس اب جلدی کرنا چاہیے تا کہ جو دوست جنازے کے ساتھ گرجا گھر تک جانا چاہتے ہیں انہیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔

''جانے دو پاپا، ہوش کرو!''

خفگی بھری مگر رحم آلود نظریں لئے دکھ زدہ شخص پھر سے اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

ہاں۔ ہوش کرنی چاہیے۔ اندر سے ابلتے دکھ پر چلانا بے کار تھا۔ اس اذیت کو الفاظ یا افعال میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس شوہر کے دکھ کا جس کی محبت ابھی زندہ ہو اور بیوی بچھڑ جائے اس بیٹے کے دکھ سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا جس کے لیے عمر کے ایک خاص حصے میں یتیم ہونا فطری بات ہوتی ہے۔ بیٹے کے لیے تو یہ موت بہت بروقت تھی۔ وہ اب شادی کرنے ہی والا تھا۔ تین ماہ کا سوگ ختم ہونے پر وہ شادی کر لے گا اب تو اس کے پاس ایک جواز بھی تھا کہ باپ بیٹے کو گھر کے کام کاج کے لئے ایک عورت کی ضرورت تھی۔

''پادری، پادری!'' باہر والے کمرے سے کوئی پکار رہا تھا۔ یہ جان کر وہ اور بھی سرد پڑ گیا کہ اس کے بجائے اس کے بیٹے کو اس نام سے پکارا جا رہا تھا۔ آج کے بعد بیٹا ہی اس خاندانی نام کا زیادہ حق دار ہو گا۔ یہ یاد کر کے اسے سخت ندامت محسوس ہوئی کہ سب کے سامنے اس نے اپنی بیوی کا محبت کا نام پکار کر گویا اس کی بے حرمتی کی تھی۔ تھی نا احمقوں والی بات۔ بالکل بے کار۔ رات بھر کی نیند نے گویا اس کی عقل پر پتھر ڈال دیئے تھے۔

اب جینے میں اس کی ایک ہی دلچسپی باقی تھی۔ اسے تجسس تھا کہ گھر کا نیا بندوبست کیسا ہو گا۔ مثال کے طور پر اب وہ اسے کہاں سلائیں گے؟ بڑا ڈبل بیڈ تو پہلے ہی اس کے کمرے سے ہٹایا جا چکا تھا۔ کیا اسے چھوٹا پلنگ ملے گا۔ اس کے بیٹے والا پلنگ۔ اور اس کے ڈبل بیڈ پر اس کا بیٹا اپنی بیوی سے ہاتھ بھر کے فاصلے پر سوئے گا۔ وہ خود اپنے چھوٹے سے پلنگ پر بازو پھیلائے گا تو سرد ہوا کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

مختلف چیزیں اس کے بے حس ہوتے ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ اس کے اندر اور باہر خلا کی سی کیفیت تھی۔ دیر تک بیٹھے رہنے سے جسم سن ہو رہا تھا۔ اسے یقین سا ہو رہا تھا کہ اگر اس نے کھڑا ہونے کی کوشش کی تو اس خلا میں اس کا جسم پروں کی طرح ہلکا ہو گا۔
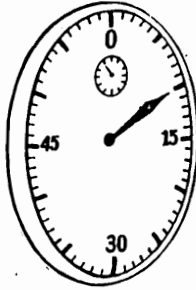
البیر کامیو کا شمار دنیائے ادب کے ان عظیم مصنفین میں ہوتا ہے، جنہوں نے اپنے افکار کی بدولت ایک عالم کو متاثر کیا۔ فرانس کا یہ شہرہ آفاق فلسفی، مضمون نگار، ڈرامانویس، ناول نگار اور افسانہ گو 1913ء میں ایک غریب کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوا۔ مارنی کی جنگ میں اپنے والد کی ہلاکت کے بعد اس کے کنبے پر بڑا کڑا وقت آیا۔ کامیو کا بچپن ایک ایسے ماحول میں گذرا جو غربت و عسرت کے عفریب سے سہا ہوا تھا، تاہم ان مصائب کے باوجود جو بچوں کے ہاتھوں سے کتاب چھین کر انہیں کشکول تھما دیتے ہیں، کامیو نے ایک ذہین اور خوددار بچے کی حیثیت سے اپنی تعلیم جاری رکھی اور اپنی محنت و ذہانت کے بل بوتے پر ہر درجے میں تعلیمی وظیفہ حاصل کیا۔ جب وہ الجیریا یونیورسٹی میں داخل ہوا تو وہاں اسے بڑے بڑے صاحبان علم اساتذہ اور دوسرے ذہین طلباء کی صحبت میسر آئی، جن کی مجالس نے اس کے ذہن کو جلا بخشی۔ یونیورسٹی میں اس نے فلسفہ کے مضمون کو اختیار کرنا پسند کیا اور تحصیل علم کے دوران دوسرے فلسفیوں اور مفکروں کے ساتھ مل کر فلسفہ میں ایک نئے مکتب فکر وجودیت (Existentialism)'' کی بنیاد ڈالی۔ کامیو کے الفاظ نے فلسفہ کے جدید رجحانات پر جس طرح اپنے اثرات مرتب کئے، اس میدان کے طالب علم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ فلسفہ کے علاوہ اس نے نثری ادب کو بھی لائق توجہ سمجھا اور مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی، بالخصوص ناول نویسی کے میدان میں کامیابی کے ایسے جھنڈے گاڑے کہ بڑے بڑے ادباء انگشت بدنداں رہ گئے، اس کے ناولوں خصوصاً اجنبی، طاعون اور سلطنت نے عالم گیر شہرت حاصل کی اور بیرونی دنیا میں نقاد و قارئین ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ 1957ء میں جب اس کی عمر محض چوالیس برس تھی، اسے ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ اتنی کم عمری میں یہ اعزاز حاصل کرنے والا وہ اولین ناول نگار تھا۔ کامیو نے شاہکار ناول ہی تصنیف نہیں کئے، نقش گر کہانیاں اور افسانے بھی تخلیق کئے۔ اس کی اکثر کہانیاں فرانس کی نوآبادی الجیریا کے حالات و ماحول کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں، جہاں اس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا اور جس سرزمین سے کہ اسے دلی لگاؤ تھا۔

اس کی زندگی اپنی حقیقت کھو چکی تھی۔ اس میں اور اس کی کرسی میں شاید ہی کوئی فرق باقی بچا ہو۔ پھر بھی کرسی چاروں ٹانگوں پر اعتماد سے کھڑی تھی اور خود اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کے پاؤں اور ٹانگیں کہاں تھے یا یہ کہ وہ اپنے ہاتھوں کا کیا کرے۔ اب اسے اپنی زندگی کی پرواہ بھی کہاں تھی۔ اسے تو اب دوسروں کی زندگی سے بھی کوئی خاص واسطہ نہیں رہا تھا مگر پھر بھی جینا پڑے گا۔ نئے سرے سے ایسی زندگی کا آغاز کرنا ہوگا جس کا کوئی دھندلا سا خاکہ بھی اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ ایسی زندگی جس کے بارے میں وہ کبھی سوچنا بھی گوارا نہ کرتا اگر اس کی دنیا یوں بدل نہ چکی ہوتی۔ وہ بے بس سا ہو رہا تھا۔ بوڑھا تو نہیں مگر جوان بھی تو نہیں رہا تھا۔

مسکرا کر اس نے کندھے اچکائے یوں اچانک ہی وہ بیٹے کے لئے بچہ بن گیا تھا مگر ہر کوئی جانتا ہے کہ جوان بیٹوں کے لئے باپ بچے ہی تو بن جاتے ہیں۔ امنگوں سے بھرے جوان بیٹے جو کامیابی سے زندگی میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور باپ فارغ بیٹھے اس خدمت کی وصولی کرتے ہیں جو انہوں نے اولاد کے بچپن میں کی تھی۔

مگرا کیلا پلنگ!

اور پھر انہوں نے اسے وہ چھوٹا کمرہ بھی نہ دیا جو کبھی بیٹے کے پاس ہوتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس کے بجائے صحن کے ایک کونے میں چھپے ہوئے ایک کمرے میں اسے زیادہ آزادی محسوس ہوگی۔ وہاں وہ جو چاہے گا کر سکے گا۔ اس کمرے میں انہوں نے بہترین فرنیچر لا کر رکھ دیا تاکہ کسی کو یہ احساس نہ ہو کہ کبھی اس کمرے میں ملازم رہا کرتا تھا۔

شادی کے بعد گھر میں سامنے والے تمام کمرے نئے فرنیچر اور نت نئے سامان سے اچھی طرح سجا دیئے گئے حتیٰ کہ قالین بھی بچھائے گئے۔ گھر میں ایک بھی نشانی ایسی نہ چھوڑی جو پرانے دنوں کی یاد دلاتی۔ نوجوان جوڑے کی زندگی سے الگ تھلگ، چھوٹے سے تاریک کمرے میں اپنے پرانے فرنیچر کے درمیان بھی وہ بے چین رہتا تھا، تاہم حیران کن طور پر اسے یوں پرانے فرنیچر کے ساتھ اس کمرے میں پھینکے جانے کی بے عزتی پر کوئی خفگی نہیں تھی اسے گھر کی نئی ترتیب پسند تھی اور بیٹے کی کامیابی پر اطمینان تھا۔

اطمینان کی ایک اور گہری مگر قدرے غیر واضح وجہ بھی تھی۔ ایک اور زندگی کی امید۔ روشن اور رنگا رنگ زندگی کی امید جو گزرے دنوں کی یاد محو کرتی جا رہی تھی۔ اس کے دل میں کہیں یہ امید چھپی تھی کہ اسے بھی ایک نئی زندگی مل سکتی تھی۔ لاشعوری طور پر اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کی پشت پر ایک روشن دروازہ نمودار ہو گیا ہے اور وہ جب چاہے اسے کھول سکتا تھا۔ اب جبکہ کسی کو اس کی پرواہ نہیں تھی اور اسے اپنے چھوٹے سے کمرے میں من مرضی کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا، یہ سب اور بھی آسان لگتا تھا۔ وہ ہوا سے بھی زیادہ ہلکا پھلکا محسوس کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ہر شے کو رنگ بخشتی حیرت کے دروازے کھول رہی تھی گویا وہ سچ مچ پھر سے بچہ بن گیا ہو۔ بچوں کی طرح زندگی سے بھرپور کھلی ہوئی آنکھوں سے وہ ایسی دنیا کا مشاہدہ کر رہا تھا جو اس کے لیے بالکل نئی تھی۔

اس نے صبح سویرے اٹھ کر سیر کے لئے جانے کی عادت ڈال لی۔ یوں وہ تعطیلات کے ہر دن کا آغاز کرتا اور یہ تعطیلات اتنی ہی طویل تھیں جتنی اس کی باقی ماندہ زندگی۔ تمام ذمہ داریاں ختم ہو چکی تھیں چنانچہ اس نے اپنے اخراجات کے لئے پنشن میں سے ہر مہینے کچھ رقم اپنے بیٹے کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ رقم نہایت معمولی تھی۔ اگر چہ اسے پیسوں کی ضرورت نہیں رہی تھی مگر اس کے بیٹے کا خیال تھا کہ اسے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ رقم اپنے پاس رکھنا چاہیے تھی۔ مگر کیسی ضروریات؟ اسے تو یہی اطمینان کافی تھا کہ وہ زندگی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

تجربے کے بھاری بھرکم بوجھ سے نجات حاصل کرنے کے بعد اسے بڑوں کی دنیا کے آداب بھول گئے تھے، وہ جہاں تک ممکن ہوتا ان سے دامن بچاتا۔ نوجوان لڑکے اسے بہت بوڑھا سمجھتے تھے اس لئے وہ بچوں کے پارک میں جا کر بیٹھ رہتا۔

چنانچہ اس نے نئی زندگی کا آغاز سبزہ زار میں گھاس پر کھیلتے بچوں کے درمیان کیا۔ گھاس کی خوشبو میں عجیب جادو تھا درختوں کے پیچھے بہتی کسی جھرنا کی آواز میں پتوں کی سرسراہٹ سنائی نہیں دیتی تھی۔ یکا یک بچوں نے اپنے کھیل کو بھول کر جوتے اور جرابیں اتار دیں۔ تازہ اور نرم گھاس میں ننگے پاؤں ڈبونے میں کتنا لطف تھا۔

اس نے بھی ایک جوتا اتار ڈالا اور چپکے چپکے دوسرا جوتا اتار رہا تھا کہ ایک نوجوان لڑکی اس کے سامنے آ گئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''سور!'' وہ شعلے برساتی آنکھوں سے چلا کر بولی۔

لڑکی کے لباس کا سامنے والا حصہ جھاڑی میں الجھ کر اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے اسے کھینچ کر ٹانگوں کے برابر کیا کیونکہ زمین پر بیٹھا بوڑھا شخص اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ سن ہو کر رہ گیا۔ اس لڑکی نے کیا سوچا تھا۔ وہ تو صرف بچوں کے معصوم کھیل سے لطف اندوز ہونا چاہ رہا تھا۔ جھک کر اس نے دونوں ہاتھ اپنے ننگے اور کھردرے پیروں پر رکھ دیئے۔ آخر اس لڑکی نے ایسی کیا غلط بات دیکھ لی تھی۔ کیا وہ اتنا بوڑھا تھا کہ گھاس پر ننگے پاؤں چلنے کی بچوں جیسی مسرت بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا؟ کیا بوڑھا ہونے کا مطلب یہ تھا کہ آدمی صرف برائی ہی کے بارے میں سوچ سکتا تھا؟ اگر وہ چاہتا تو ایک لمحے میں بچے سے مرد کا روپ دھار سکتا تھا۔ آخر وہ ابھی جوان تھا گو وہ اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے بالکل بچہ بن کر اپنے جوتے اتارے تھے، اس کم بخت لڑکی نے اس طرح اس کی توہین کر کے کیسی غلطی کی تھی۔ وہ اوندھے منہ گھاس پر لیٹ گیا۔ اس کے دکھ، صدمے اور روزمرہ کی تنہائی نے اس واقعے کو جنم دیا تھا جسے دیکھیئے تو صرف گھٹیا بدظنی کا ایک مظاہرہ تھا۔ اس کے غصے میں نفرت اور تلخی آ گئی۔ اگر وہ ایسا چاہتا۔۔۔ اس کا بیٹا بھی مانتا تھا کہ اس کی کچھ ''خواہشات'' ہو سکتی تھیں۔۔۔ تو اس کے پاس ایسی ضروریات کے لئے وافر رقم موجود تھی۔

غضب ناک ہو کر وہ اٹھ بیٹھا۔ جھینپتے ہوئے، کانپتے ہاتھوں سے اس نے دوبارہ جوتے پہنے۔ اس کے جسم کا سارا خون اس کے سر میں اکٹھا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے پیچھے خون کی گردش میں حرارت آ گئی تھی۔ ہاں۔ مجھے معلوم ہے ایسے کاموں کے لئے کہاں جاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں۔

کچھ دیر دم لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کی طرف چل دیا۔ کمرے میں ادھر ادھر ٹھنسے ہوئے سامان کے درمیان (جو لگتا ہے اسے پاگل کرنے کے لئے وہاں رکھا گیا تھا) اس نے خود کو پلنگ پر گرا دیا اور دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔

ایک مختلف نوعیت کی سوانح عمری

یادیں Memoirs

تلخ، ترش اور شیریں لمحات کی بازگشت
رسیلے، کڑوے، کسیلے اور پتھریلے ایام کی باتیں

پابلو نرودا

ہسپانوی سے انگریزی میں ترجمہ ہارڈی مارٹن
انگریزی سے اردو میں ترجمہ انور زاہدی

میں اپنے بچپن کے گزرے برسوں اور بیتے ایام سے اپنی کہانی کا آغاز کروں گا۔ آتش فشاں پہاڑوں کے دامن میں، برف پوش چوٹیوں کے قریب، نیلگوں جھیلوں کے آبی کٹوروں کے درمیان ۔۔۔ چلی کا پرسکون مہکتا ہوا گھنا جنگل آج بھی اپنی تمام تر شادابی سمیت میری یادوں میں لہلہاتا ہے۔ کوئی بھی شخص جو چلی کے جنگلات میں نہیں رہا، اس سیارے کو نہیں جانتا اور اس کے آب وگل اور مخصوص سکوت سے ناآشنا ہے۔

بارش میرے لیے ایک ناقابل فراموش حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔ میں نے پہلے پہل اپنی آنکھیں زندگی، زمین، شاعری اور بارش کے لیے کھولیں۔ بعض اوقات سارا مہینہ بلکہ تمام سال ہی بارش ہوتی۔ ہم سڑک کے ساتھ ناپختہ فٹ پاتھ پر سردیوں اور بارش کے باوجود پیدل اسکول جایا کرتے تھے۔ ہوا ہماری چھتریاں اڑا لے جاتی۔ برساتیاں مہنگی تھیں اور دستانے مجھے ناپسند تھے۔ میرے جوتے بارش میں تربتر ہو جاتے، پھر سیلاب آتے اور دریا کناروں پر غریبوں کی بستیاں بہا لے جاتے، آتش فشاں لیما پر روشنی کی چٹان نمودار ہوتی اور آتش فشاں کھولنے لگتا۔

نی میو کو نامی چھوٹے سے قصبے میں ہمارا گھر تھا۔ یہ قصبہ چلی کی جنوبی سرحدوں پر انتہائی آخری چوکی تھی جو ایک طویل خونچکاں تاریخ کا پس منظر رکھتی تھی۔ میرے والدین پرال سے آئے تھے۔ میری ماں ڈونا روزا مجھے جنم دینے کے کچھ دنوں کے بعد ابدی زندگی کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ میں وسطی چلی میں، جہاں انگوروں کی شاندار فصل ہوتی اور بے تحاشا شراب کشید کی جاتی تھی، 12 جولائی 1904ء کو پیدا ہوا اور ایک مہینے بعد اگست میں میری ماں تپ دق کے مرض

سے چل بسی۔

میرے دادا کے پاس تھوڑی سی زمین اور بہت سے بچے تھے۔ مجھے اپنے چچاؤں کے نام یوں لگتے تھے جیسے وہ سب دور دیس کے شہزادوں کے نام ہوں، مثلاً آموس، بادیس، جوئیل، اوسیس وغیرہ۔ میرے باپ کا نام جوز کارمین تھا۔ اس نے کم عمری ہی میں دادا کی زمینوں پر کام کرنا چھوڑ دیا اور بحیثیت مزدور ٹل شوانو کی بندرگاہ پر ملازم ہوگیا۔ بعدازاں اس نے ٹی میوکو ریلوے میں نوکری کر لی۔ وہاں وہ ایک تجرباتی ریل گاڑی میں ملازم تھا۔ تجرباتی ریل گاڑی کو پتھر کی کانوں سے نکالا جاتا اور ٹوٹا ہوا پتھر کھلے ڈبوں میں لادا جاتا تھا۔ اس قسم کی ریل گاڑی پر کام کرنے والے عملے کے افراد آہنی تن و توش کے مالک ہوتے۔ یہ لوگ کھیتوں، اردگرد کی آبادیوں اور جیلوں سے آتے۔ کمپنی انہیں تکلیف دہ حد تک کم معاوضہ دیتی۔ میرا باپ کنڈیکٹر تھا۔۔۔ احکامات لینے اور دینے کا عادی! کبھی کبھار وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتا۔ ہم کان سے پتھر لادتے اور سرحدی علاقے کے قلب میں واقع جگہ بوروا تک لے جاتے، جہاں کے مناظر فطرت مجھے خوشی سے بے حال کر دیتے۔

اپنے گھر کے بارے میں تفصیل سے بیان کرنا خاصا مشکل ہے۔ یہ ان سرحدی مکانوں جیسا ایک مکان تھا، جو سب آپس میں مربوط اور دیہات کے تمام مشاغل کی جان ہوتے تھے۔ میرے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس کی دوسری بیوی کا نام ڈونا ٹرینی ڈاڈ تھا۔ یہ میری سوتیلی ماں تھی، جو بے حد چاہنے اور پیار کرنے والی عورت تھی۔ ایک دیہاتی عورت کی طرح مزاح کی کیفیت سے مکمل طور پر آشنا، اس خاتون میں ایک بے پایاں شفقت تھی۔ جونہی میرا باپ گھر میں قدم رکھتا، وہ ایک سائے کے مانند خاموش ہوجاتی جیسا کہ ان دنوں تمام عورتوں کا انداز تھا۔

گھر میں ہمارے پاس ایک صندوق تھا، جو دلچسپ چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب میں بڑا ہوا تو صندوق کو آسانی سے کھولنے لگا۔ اس صندوق میں خوبصورت پنکھے اور ایک رومانی داستان کی نشانیاں موجود تھیں، جس نے پہلی بار میرے جذبات کو متاثر کیا۔ اس میں کسی کے ارسال کردہ سینکڑوں پوسٹ کارڈ تھے، جن پر البرٹو کے دستخط تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ سب کس ماریا کے نام تھے۔ کارڈ بہت خوبصورت تھے اور ان سب پر اپنے وقت کی عظیم اداکاراؤں کی تصاویر تھیں، جس میں سے اکثر پر شیشے کے ٹکڑے چسپاں تھے۔۔۔ لیکن یہ تمام خطوط میری ماں کے صندوق میں کیوں کر موجود تھے؟ یہ میں کبھی نہ جان سکا۔

1910، ایک یادگار برس تھا۔ اس برس میں نے اسکول جانا شروع کیا۔ شکستہ سی عمارت پر مشتمل اس اسکول کے کمروں میں برائے نام فرنیچر تھا۔ اس اسکول نے چھ برس کی عمر کے بچے پر لامحدود امکانات روشن کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

جب ذرا بڑا ہوا تو کتابوں سے رغبت ہوگئی۔ بفیلو بل کی مہمات اور سالگری کے سفرنامے مجھے خوابوں کی دور دراز دنیاؤں میں لے جاتے۔ انہی دنوں اسکول کا ایک لڑکا اپنی ایک ہم جماعت کے عشق میں سرتاپا گرفتار ہوگیا۔ یہ ایک لوہار کی بیٹی بلانکا تھی، جسے عشقیہ خطوط ملنے شروع ہوگئے تھے۔ ایک روز اتفاقاً اس لڑکی سے میری ملاقات ہوگئی۔ اس نے اپنے محبوب کے خطوط مجھے دکھاتے ہوئے مجھ سے ایک سوال کر ڈالا جس کے جواب میں مجھے اقرار کرنا پڑا کہ میں نے ہی وہ خطوط لکھے تھے۔

بچپن کی ان یادوں میں صحیح طور سے وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ میں بہت سے غیر معمولی واقعات کا ذکر کروں گا، جو میرے لیے خاصے اہم ہیں اور جنہوں نے مجھے تحریک بخشی۔

ہمارے گھر کے بالمقابل دولڑکیاں رہا کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھتیں کہ میرا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ شاید وہ قبل از وقت بالغ ہو چکی تھیں اور جتنا میں شرمیلا تھا، اتنی ہی وہ حرافہ تھیں۔ ایک روز میں اپنے دروازے میں کھڑا تھا۔ انہوں نے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ جب میں قریب گیا تو انہوں نے مجھے جنگلی پرندے کا ایک گھونسلا دکھایا۔ سبز جنگلی جھاڑی اور پروں سے بنے اس گھونسلے میں گہرے نیلے رنگ کے ننھے ننھے انڈے تھے۔ جب میں نے ان انڈوں کو دلچسپی سے دیکھنا شروع کیا تو ایک لڑکی بولی کہ پہلے وہ کپڑوں میں سے مجھے محسوس کریں گی۔ میں نے خوف سے کانپنا شروع کر دیا اور وہاں سے کھسکنا چاہا، لیکن ان خوبصورت بلاؤں نے میرا پیچھا کیا۔ تعاقب کے دوران میں ایک ایسی گلی میں چلا گیا، جو ایک بیکری کی طرف جاتی تھی۔ یہاں پہنچ کر وہ میری پتلون اتارنے لگیں۔ اتنے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور ہم سب نے سانس روک لیے۔ اسی جدوجہد میں وہ گھونسلا گر کر ٹوٹ گیا۔

کب شاعری نے مجھ میں جنم لیا؟

میں یاد کرنے کی کوشش کروں گا۔۔۔ بچپن میں ایک شدید جذبہ مجھ میں پیدا ہوا اور میں نے کچھ الفاظ آدھے وزن میں ترتیب دیئے۔ یہ ایک نظم تھی، اپنی سوتیلی مہربان ماں کے لئے! میرے باپ نے یہ کاغذ پڑھا تو کہا: ''یہ تم نے کہاں سے نقل کی ہے۔''

اس زمانے میں ایک طویل القامت خاتون ٹی میوکو میں وارد

ہوئی۔ وہ بغیر ایڑی کے جوتے اور لمبے لباس پہنتی تھی۔ وہ لڑکیوں کے اسکول کی نئی پرنسپل تھی۔ میں نے اسے بے حد پروقار خاتون پایا۔ اس کے گہری رنگت والے انڈین چہرے میں، جو آرکینیا کے خوبصورت گھڑے کے مانند تھا، اس کے بے حد شفاف دانت مسکراتے ہوئے چمکتے تھے اور سارے کمرے روشن کر دیتے۔ میں اس سے دوستی کے لیے بہت چھوٹا اور بے حد شرمیلا تھا۔ ہر بار وہ مجھے کچھ کتابیں دیتی، جو میں لے کر چلا آتا۔ یہ کتابیں کم وبیش روسی ناول ہوتے۔ اس طرح، ٹالسٹائی، دوستوفسکی اور چیخوف نے میری ذات میں خاص جگہ بنالی۔

تین عظیم عورتیں:

ایک مرتبہ مجھے گیہوں کی چھٹرائی کے لیے بلایا گیا تھا۔ وہ جگہ جہاں مجھے جانا تھا، پہاڑوں میں بہت بلندی پر اور میرے قصبے سے خاصی دور تھی۔ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر میں نے ''باجوامیریل'' کو پیچھے چھوڑتے ہوئے دریا کے رتیلے ساحل پر سفر شروع کیا۔ وہاں بحرالکاہل آزاد ہو کر پہاڑوں کی چٹانوں اور ان پر موجود جھاڑیوں کے جھنڈ میں سے بار بار حملہ آور ہوتا تھا اور مغرب میں جھیل کے دہانے تک بھاگتا چلا گیا تھا۔ چلی کے یہ ساحل، جو عموماً کٹے پھٹے ہوتے، اچانک ریشمی دھجیوں میں تبدیل ہو جاتے اور آدمی کئی دن اور کئی راتیں ریت پر سمندری جھاگ کے قریب چلتا رہتا۔

دیر ہو گئی تھی۔ میں جھیل کے کناروں کو خیر باد کہہ چکا تھا اور سڑک کی تلاش میں پتھریلے راستے پر گامزن تھا۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں نے اپنا راستہ کھو دیا ہے۔ رات اور جنگل جو مجھے خوشی سے بے حال کر دیتے تھے، اب ناگوار گزر رہے تھے۔ مجھے خوف نے آ لیا، لیکن خوش قسمتی سے اس ویرانے میں ایک اجنبی مسافر سے میری ملاقات ہو گئی۔ گھوڑے پر سوار یہ مسافر اجڈ کسانوں میں سے ایک تھا، جو ایسے اندھیرے راستوں پر اکثر و بیشتر نمودار ہو جاتے تھے۔ اس نے مجھے تین بیوہ عورتوں کے مکان کا پتہ سمجھایا اور میں اس کے بتائے ہوئے تنگ راستے پر کسی بھولی بسری روح کے مانند ہو لیا۔

ایک کنوارہ خم کھایا ہوا چاند، بالکل تازہ کٹے ہوئے ناخن کے ٹکڑے کے مانند آسمان میں اوپر کی طرف چڑھائی کے سفر کا آغاز کر رہا تھا۔ رات کے تقریباً نو بجے مجھے روشنیاں نظر آنے لگیں۔ جلد ہی میں ان تین بیواؤں کے مکان کی دہلیز پر تھا۔ میری دستک کے جواب میں سفید بالوں والی ایک نازک اندام خاتون نے دروازہ کھولا۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔ اس نے بھوتوں کی سی پر اسرار آواز میں پوچھا: ''کیا چاہتے ہو۔''

''طالب علم ہوں اور جنگل میں اپنا راستہ کھو بیٹھا ہوں۔ مجھے چھٹرائی کے لیے پہاڑ پر جانا ہے۔ رات گزارنے کے لیے ایک گوشہ چاہیے۔ صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔''

وہ مجھے گھر کے اندر لے گئی، جہاں اسی جیسی دو اور خواتین نے مجھے خوش آمدید کہا۔ جلد ہی کمرے کے وسط کی گول میز پر چاندی کے ظروف اور نقرئی شمع دانوں میں ایستادہ موم بتیوں کی روشنی میں کھانا سجا دیا گیا۔ میں خستہ حال اور گرد آلود تھا، جبکہ یہ اہتمام کسی شہزادے کے شایان شان تھا۔ مجھے لگا کہ ملکہ وکٹوریہ کے محل میں مدعو ہوں۔ میری میزبان خواتین پکانے کے فن کی ماہر اور اپنے اجداد کی روایات کی عاشق لگتی تھیں۔ ہر ڈش میرے لیے ایک حیرت تھی۔ پھر وہ پرانی شراب لے آئیں اور نئے نئے عجائبات کے بارے میں گفتگو شروع ہو گئی۔ گزشتہ تین برسوں میں اس دور دراز گھر میں ان کے ہاں ستائیس مسافر آئے تھے۔ میں یہ سن کر ششدر رہ گیا کہ ان خواتین کے پاس ان میں سے ہر مسافر کی ذاتی فائل موجود تھی، جس میں مہمان کی آمد کا وقت، تاریخ اور اس کے لیے تیار کیے جانے والے کھانے کی تفصیل درج تھی۔ میزبان خواتین نے بتایا کہ ''ہم خوراک کی تفصیل لکھ لیتی ہیں تاکہ کسی بھی وقت اگر ان دوستوں میں سے کوئی دوبارہ آئے تو یہ کھانا دہرایا نہ جائے۔''

صبح کو میں وہاں سے روانہ ہوا تو دل گوارا نہ کرتا تھا کہ ان مہربان خواتین کو الوداع کہا جائے۔ یہ میرے آغاز شباب کی بات ہے، نصف صدی پرانی۔ بعد ازاں اس کنوارے جنگل کے قلب میں آباد ان دیس بدر خواتین پر کیا گزری؟ مجھے نہیں معلوم۔ شاید جنگل ان زندگیوں کو کھا گیا! بہت محترم تھیں وہ اداس عورتیں جنہوں نے بغیر کسی عملی وجہ کے ایک پرانی دنیا کے وقار کو برقرار رکھنے کی خاطر جنگل کی تنہائی میں جدوجہد کی، جنہوں نے ایک عمدہ ثقافت کے باقیات کو جسے ان کے اجداد نے فراموش کر دیا تھا، دور ویرانے میں دنیا کے تنہا پہاڑوں کی ناقابل تسخیر حدوں پر محفوظ رکھا۔

خمار گندم:

دوپہر سے پہلے میں ہرنانڈیز کیمپ پہنچ گیا۔ میں بہت تازہ دم اور خوش باش تھا۔ رات کی اچھی نیند نے میرے جوان چہرے کو ایک خاص قسم کی چمک عطا کر دی تھی۔ مناظر فطرت نے میرا دل موہ لیا۔ درخشاں سورج ایک ناتراشیدہ ہیرے کے مانند پہاڑوں کو جھلملاتا تھا۔ گھوڑوں کے ذریعے گندم، جو، اوٹ وغیرہ کی چھٹرائی کا عمل

اپنے اندر بے حد کشش رکھتا تھا۔۔۔اس سنہری تہوار میں شور و غل اور حرکت و عمل تھا: کھانا پکاتی عورتیں، بھاگتے گھوڑے، بھونکتے کتے، چیختے بچے!

ہرنانڈیز ایک بالکل مختلف قبیلہ تھا۔ بغیر قمیصوں کے باریش اجڈ مرد جن کی پیٹیوں میں پستول اڑسے رہتے تھے۔ باپ، بیٹے، بھتیجے، سب ایک جیسے نظر آتے تھے۔ وہ گھنٹوں تھریشر کی چھت پر مصروف رہتے۔ ان کے پاس بات کرنے کو کوئی موضوع نہ تھا۔ وہ ہر چیز کے بارے میں مذاق کرتے ماسوائے جب وہ لڑائی میں الجھ جاتے۔

وہ سرحدی لوگ تھے، ایسے لوگ جنہیں میں پسند کرتا تھا۔ زرد بڑھاپو قسم کے لوگوں کو ان طاقتور وحشیوں کے سامنے میں نے ہمیشہ بونے سمجھا، نہ جانے کیوں! ان لوگوں نے بھی ہمیشہ میری عزت کی، جو بالعموم وہ دوسروں کی نہیں کرتے تھے۔ کھلیانوں میں گائے کا گوشت بھوننا، سرخ شراب پینا اور گٹار کی دھنوں پر رقص کرنا انہیں بے حد مرغوب تھا۔

رات سرد، شفاف اور جسم میں اتر جانے والی تھی۔ آسمان پر چاند نہ تھا، لیکن ستارے جیسے بارش میں نہا کے نکلے تھے اور ارد گرد خوابیدہ لوگوں سے بے پروا آسمان کی گود میں صرف میرے لیے ٹمٹماتے تھے۔ سیدھے لیٹے لیٹے میری کھلی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور میں سو گیا۔ جانے کیا وقت ہوا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی چیز میری جانب آ رہی تھی۔ ایک اجنبی جسم بھوسے سے میری طرف سرک رہا تھا، میرے نزدیک آ رہا تھا۔ میں ڈر گیا۔ وہ جسم آہستہ آہستہ میرے قریب ہوئے جا رہا تھا۔ بھوسوں کے تنکوں کی مدھم سرسراہٹ ابھر رہی تھی، جو اس انجان وجود کے بوجھ سے چٹخے جا رہے تھے۔ میرا بدن اکڑ گیا۔ میں سانس روکے اس کا منتظر رہا۔ جلد ہی اس کی سانسوں کی موسیقی میری سماعت میں رس گھولنے لگی، پھر ایک گداز ہاتھ منہ پر پھسل گیا۔ یہ ایک عورت کا ہاتھ تھا، جو میری بھنوؤں، آنکھوں اور چہرے پر پیار سے آزادانہ گھومنے لگا تھا۔ منہ پر سرشاری طاری ہونے لگی، پھر ایک حریص منہ میرے منہ سے چمٹ گیا اور مجھے احساس ہوا کہ ایک عورت کا بدن میرے جسم پر اوپر سے نیچے پاؤں تک دباؤ ڈال رہا ہے۔ شدید خوشی کے عالم میں میرے سراپے میں جنبش ہوئی۔ میرا ہاتھ لہریں لیتے ہوئے بالوں پر سے پھسلا اور گل لالہ کی طرح ملائم آنکھوں اور نرم بھنوؤں کو دریافت کرنے لگا۔ میں نے بھری بھری اور سخت چھاتیاں محسوس کیں، بڑے بڑے کولہے اور ٹانگیں جنہوں نے میری ٹانگوں کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ میری انگلیاں پہاڑی سبزے جیسے، پیڑو کے بالوں میں اتر گئیں، لیکن اس نامعلوم منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔

بھوسے کے اس پہاڑ میں جہاں سات آٹھ مرد اور بھی سو رہے تھے اور جنہیں دنیا کی کسی بھی شے کے عوض جگانا مناسب نہ تھا، بغیر آہٹ پیدا کیے ہم بستری کرنا کس قدر دشوار کام تھا! لیکن انسان بہت کچھ کر سکتا ہے، شاید اس میں خاص توجہ کا عمل دخل ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد اجنبی عورت میرے نزدیک ہی سوئی تو میں اس صورت حال سے ڈر گیا۔ میں نے سوچا جلد ہی صبح ہو جائے گی اور کام کرنے والے مرد ایک برہنہ عورت کو چھڑائی کے فرش سے میرے پہلو میں لیٹے دیکھ کر جانے کیا ردعمل ظاہر کریں۔ انہی سوچوں میں مجھے بھی نیند آ گئی۔

صبح اٹھ کر میں نے اپنا ہاتھ پھیلایا تو وہاں محض ایک گرم خلا باقی تھا۔ جلد ہی سارا جنگل پرندوں کی چہچہاہٹ سے بھر گیا اور مرد عورتیں اپنے اپنے کام کی تیاری کرنے لگے۔ چھڑائی کا ایک نیا دن طلوع ہو گیا تھا۔

دوپہر کو کام سے فارغ ہو کر ہم نے بڑے بڑے تختوں سے بنی عارضی میز پر کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں کن انکھیوں سے یہ جائزہ لیتا رہا کہ رات کو میرے پاس آنے والی عورت کون ہو سکتی ہے؟ یہاں کچھ عورتیں بہت بوڑھی تھیں اور کچھ بے حد دبلی۔ زیادہ تر نوجوان لڑکیاں سارڈائن مچھلی کے مانند تھیں، جبکہ میں ایک مضبوط، بھرے بھرے جسم، لہریں لیتے بالوں اور بڑی بڑی چھاتیوں والی عورت کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اچانک ایک عورت اپنے خاوند کے لیے بھنے گوشت کا ایک پارچہ لے کر آئی۔ یہ ہرنانڈیز قبیلے کا ایک مرد تھا۔ یقیناً یہی وہ عورت تھی! میں نے اس لمبے بالوں والی دل فریب عورت کو خود پر ایک نظر ڈالتے اور خفیف انداز میں مسکراتے دیکھ لیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے مسکراہٹ میرے وجود کی گہرائیوں کھولتی اطراف واکناف پر محیط ہو رہی ہے۔

شہر کی بھول بھلیاں:

اسکول میں کئی برس کی تعلیم اور ہر دسمبر میں ریاضی سے پنجہ آزمائی کرنے کے بعد بظاہر میں اس قابل ہو گیا تھا کہ سانتیاگو کی یونیورسٹی میں داخلہ لے سکوں۔ بظاہر میں نے اس لیے کہا کہ میرا دماغ کتابوں اور خوابوں سے معمور تھا اور نظمیں شہد کی مکھیوں کی طرح میرے ارد گرد بھنبھناتی تھیں۔ پھر ایک دن میں آہنی صندوق اٹھائے سانتیاگو جانے والی گاڑی کے درجہ سوم کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ یہ گاڑی چوبیس گھنٹے کے سفر کے بعد سانتیاگو پہنچتی تھی اور

مختلف علاقوں اور موسموں کو عبور کرتی تھی۔ اس گاڑی میں بار ہا سفر کے باوجود یہ میرے لیے اب بھی دلچسپی کا محور تھی۔

درجہ سوم کے ڈبے میں جیسے زندگی مکمل طور پر میرے سامنے بے نقاب ہو گئی۔ مرغیوں سے لدی ٹوکریاں اٹھائے اور گیلے پونچوؤں میں ملبوس کسان اور روکھے مزاج کے قبائلی انڈین مسافروں میں سے بہت سے بغیر ٹکٹ، سیٹوں کے نیچے سفر کر رہے تھے۔ ٹکٹ چیکر کی آمد پر عجیب سی تبدیلی ظہور پذیر ہوتی۔ کچھ مسافر غائب ہو جاتے اور کچھ خود کو پونچو میں چھپا کر میز بن جاتے، جس پر دو مسافر تاش کھیلنا شروع کر دیتے۔

اس زمانے میں طالب علموں کے لیے ایک ہوسٹل میں رہنا فاقوں مرنے والی بات تھی، چنانچہ آرگیسولیس اسٹریٹ میں اساتذہ کے ادارے کے قریب میں نے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا، جہاں مجھے مکمل آزادی اور خودمختاری حاصل تھی۔ اس گلی میں ایک کھڑکی پر ''کرائے پر کمرے'' کا بورڈ آویزاں تھا۔ مالک مکان سامنے کے کمرے میں رہتا تھا۔ صورت شکل سے وہ ایک شریف آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے سر کے بال سفید ہو چلے تھے۔ وہ بے حد جذباتی اور فن کنستہ میں طاق شخص تھا۔

میں نے اپنی کتابوں اور چند جوڑے کپڑوں پر مشتمل سرمایہ صندوق سے نکال کر کمرے میں سجا دیا اور فخر و انبساط کے جذبات کے ساتھ اپنی آزادی اور تنہائی سمیت وہاں رہنے لگا۔

یہ سانتیاگو کی سخت سردیوں کا موسم تھا۔ ہسپانوی نوآبادیاتی نظام نے میرے ملک کو فطرت کے جھٹکے نہیں اور انہیں ناپسند کرنے کی صلاحیت ورثے میں عطا کی ہے۔ ٹھنڈک نے کھڑکیوں کے شیشے نیلے کر دیے تھے۔ میری گلی کے درخت سردی سے کانپتے تھے اور پرانی گاڑیاں کھینچنے والے گھوڑوں کے نتھنوں سے بھاپ نکلتی تھی۔ عدم سے آنے والی دہشت ناک اطلاعات کے ساتھ اس گھر میں رہنے کے لیے موسم انتہائی بدترین تھا۔

مالک مکان نے بتایا تھا کہ اس کی بیوی چار مہینے قبل مر گئی تھی، چنانچہ مرنے والے کے لیے یہ ایک آزمائش ہے کیونکہ مردہ لوگوں کی روحیں اکثر وہاں جاتی ہیں، جہاں وہ مرنے سے پہلے رہتی رہی ہوں، لیکن ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ مالک مکان نے مجھے ایک چالاک شخص سمجھا اور میری آمدورفت کی نگرانی شروع کر دی۔ میری مہمان خواتین کے آنے پر مختلف ضابطے نافذ کر دیے اور میری کتابوں، میرے خطوط کی جاسوسی کرنے لگا۔ اپنی سہمی سکڑی آزادی کو بچانے کے لیے میں نے نئی جگہ کی تلاش شروع کر دی اور سخت سردیوں کے باوجود نامہربان گلیوں کے چکر لگانے لگا۔ میری

یہ کوشش رنگ لائی اور کچھ فاصلے پر ایک لانڈری کے عقب میں واقع کمرہ مجھے مل گیا۔ یہاں کی مالکہ کو دنیائے عدم میں جانے والوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ پشت پر ایک اونچی چھت والا کمرہ تھا۔ میں کمرے میں رہائش پذیر رہا۔

ہم طالب علم شاعر ایک وحشیانہ زندگی گزارتے ہیں، اپنے کمرے کے اندر میں اپنا انداز دیہاتی رکھتا، روزانہ کئی کئی نظمیں لکھتا اور ہمیشہ چائے کے کپ پیتا رہتا، جو میں خود ہی بناتا تھا۔ میرے کمرے اور گلیوں سے دور ادیبوں کی تلون زندگی ایک خاص دلچسپی کی حامل تھی۔ ادیب چائے خانوں کے بجائے شراب خانوں اور چھوٹی سراؤں میں بیٹھا کرتے۔ نظمیں اور بحث مباحثہ صبح تک جاری رہتا۔ میری تعلیم اس سب سے متاثر ہو رہی تھی۔

اسی زمانے میں غیر اتفاقی طور پر میری دوستی ایک بیوہ خاتون سے ہو گئی، جو ہمیشہ کے لیے میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں اپنے مرحوم محبوب شوہر کو یاد کرتے وقت دھندلا جاتی تھیں۔ اس کا شوہر ایک نوجوان ناول نگار تھا، جس کی انفرادیت اس کا خوبصورت جسم تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی ایک خوبصورت جوڑا تھے، عورت اپنے گہرے گداز و حسین جسم، گہری نیلی آنکھوں اور گہرے سیاہ بالوں، جبکہ مرد طویل قامت اور کھلاڑیوں جیسے جثے کے باعث۔ میں سمجھا بے پناہ شراب نوشی اس خوبصورت جسم والے ناول نگار کی موت کا باعث بنی، لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اس کی موت میں نیلی آنکھوں والی بیوی کے بے پناہ شہوانی مزاج کو بھی دخل تھا۔ اس نے ماقبل پنسلین کے زمانے میں اپنے محبوب شوہر کو چند ہی ماہ کے عرصے میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس خوبصورت بیوہ نے اب تک گہرے رنگ کا ملبوس میرے روبرو نہ اتارا تھا۔ سیاہ اور عنابی رنگ کے ریشمی پیرہن میں وہ بالکل اس سفید برفیلے پھل کی مانند دکھائی دیتی جس کی چاروں طرف ماتمی رنگ چھایا ہو۔ آخرکار ایک روز لانڈری کی پشت پر واقع میرے کمرے میں وہ لباس اتر گیا۔ ہم بستری کا فعل تکمیل کو پہنچنے والا تھا کہ میں نے اس کی بند آنکھوں پر غور کیا۔ وہ ایک فطری مستی کے عالم میں ''رابرٹو، رابرٹو'' کی آہیں بھر رہی تھی۔

میری جوانی اور امنگوں کے باوجود یہ حسین بیوہ میرے لیے ضرورت سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کی خواہشات روز افزوں بڑھتی گئیں اور اس کا روحانی دل مجھے قبل از وقت تباہی کی طرف لے جانے لگا۔ اس قدر فراواں محبت، نقاہت اور فاقہ کشی کے لیے ٹھیک نہیں۔

شرمیلا پن:

آئندہ برسوں میں، میں بس ایک گونگے بہرے کی طرح رہا۔ گزشتہ صدی کے سچے شاعروں کی طرح مجھ پر یہ مبہم تاثر طاری تھا کہ میں قطعی برانظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود لڑکیوں کا تعاقب کرنے کے بجائے میں ان کے پاس سے گزر جانے کو ترجیح دیتا۔ میں احساس کے جذبے سے کوسوں دور تھا۔ لڑکیاں میرے لیے ایک گہرا راز تھیں۔ خود کو اس آگ یا پانی میں پھینکنے کی جرات مجھ میں نہیں تھی اور نہ ہی مجھے کوئی ایسا نظر آتا تھا، جو مجھے دھکا دے سکے، چنانچہ میں اطراف میں نگاہ ڈالے بغیر اس دل نشین راستے پر مسکراتے ہوئے گامزن رہا۔

شرمیلا پن روح میں ایک خاص قسم کا بل ہے۔ یہ ایک موروثی دکھ بھی ہے جیسے ہماری دو جلدیں ہوں اور نیچے والی جلد بغاوت کر دے۔ بارش سے مسحور میری پسماندگی اور اپنی ذات میں طویل فراریت اس سے کہیں زیادہ رہی جتنا کہ اسے رہنا چاہیے تھا۔ جب میں دارالحکومت پہنچا تو آہستہ آہستہ میں نے دونوں اصناف کے دوست بنا لیے۔ لوگ جس قدر میری طرف کم توجہ دیتے اتنا ہی میرے لیے دوست بنانا زیادہ آسان تھا۔

انسانیت کے بارے میں اس وقت میں زیادہ تجسس نہ رکھتا تھا۔ میں نے خود کو یقین دلایا کہ دنیا میں ہر ایک کو جاننا ممکن نہیں۔ اس کے باوجود اس نئے شاعر کی وجہ سے، جس کی عمر بمشکل سولہ برس سے زیادہ نہ تھی، کچھ حلقوں میں تجسس پھیل گیا تھا۔ میری صحبت کو پسند کرنے والے مقامی لوگوں میں سے پیلو اور اس کی بیوی مینا نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہ دونوں ایک حسین تصوراتی زندگی کی مکمل مادی شکل تھے اور گرم، مدھم روشنیوں، خوبصورت فرنیچر اور کتابوں سے سجے ہوئے گھر میں رہتے تھے۔

• پیلو اور اس کی بیوی جیسے لوگ میں نے دوبارہ نہیں دیکھے۔ ان کے شاندار ملبوسات ایک غریب شاعر کے جذبہ رشک کو، جو خود سانتیاگو کے مضافات میں اجنبی تھا، تحریک دیتے تھے۔ آئندہ کئی برس میں ان میاں بیوی سے نہ مل سکا۔ بعد میں پتہ چلا کہ مینا نے روسی سرکس کے ایک بازی گر کی خاطر اپنے خاوند اور اس کے مدھم روشنیوں والے گھر کو چھوڑ دیا۔ وہ آسٹریلیا سے برطانوی جزائر تک اس بازی گر کی خاطر ٹکٹ فروخت کرتی رہی اور آخر میں جنوبی فرانس کے ایک صوفی گروہ میں پھنس کر ختم ہو گئی۔

طلبہ تنظیم:

ٹی میوکو میں طلبہ کے رسالے ''کلیری ڈاڈ'' کے لیے میں نامہ نگار تھا۔ اس جریدے کی تقریباً دو درجن کاپیاں میں اپنے اسکول کے ساتھیوں میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ 1920ء میں ٹی میوکو پہنچنے والی ایک خبر نے میری نسل کے لوگوں پر خونی نشانات چھوڑ دیئے۔ ''گولڈن یوتھ'' نامی ایک تنظیم نے، جو چند لوگوں پر مشتمل حکومتی اولاد تھی، طلبہ تنظیم کے ہیڈکوارٹر پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ نوآبادیاتی نظام کے پروردہ ارباب اقتدار نے حملہ آوروں کے بجائے مجروح پارٹی کو جیل میں بند کر دیا۔ چلی شاعری کی جوان امید روجاز کو اذیتیں دی گئیں، جس کے نتیجے میں وہ پاگل ہو گیا اور ایک تہہ خانے میں مر گیا۔ ایک چھوٹے سے ملک کی قومی سطح پر اس گھناؤنے جرم کے بعد پیدا ہونے والے حالات عملی طور پر غرناطہ میں فریڈریکو گارسیا لورکا کے قتل کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال کی طرح گہرے اور دوررس تھے۔

21 مارچ 1921ء کو جب میں سانتیاگو یونیورسٹی میں داخلہ لینے پہنچا تو چلی کے دارالحکومت کی آبادی پانچ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ شہر کی فضا میں گیس کا دھواں اور کافی کی بو رچی ہوئی تھی۔ ہزاروں عمارتیں اجنبی لوگوں اور کھٹملوں کا مسکن تھیں۔ عوامی بار برداری کے لیے چھوٹی چھکڑا نما ٹیکسیاں تھیں، جو لوہے اور گھنٹیوں کے ملے جلے شور کے ساتھ ہمہ وقت جدوجہد میں مصروف رہتیں۔

شاہراہ آزادی سے شہر کی دوسری سمت مرکزی اسٹیشن کے قریب جہاں میرا کالج تھا، میرا سفر رہتا۔ طلبہ کی تنظیم کے ہیڈکوارٹر میں باغی طلبہ کی مشہور شخصیتیں آتی رہتیں، جو تصوراتی طور پر وقت کی مضبوط ترین انارکسٹ تحریک سے وابستہ تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم جان گنڈلفو تھا، جس کی سیاسی بصیرت اور بے پناہ جرات سے سب ڈرتے تھے۔ وہ پست قامت اور گول چہرے کا مالک تھا اور قبل از وقت گنجے پن کا شکار تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ اپنی موجودگی کا احساس کرا دیتا۔

البرٹو روجاز بھی میرے قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ وہ قرطبی انداز کا ہیٹ پہنتا اور غرناطی فیشن کے لیے گل مچھے رکھتا تھا۔ اس میں ایک نمائشی خوش لباس نوجوان کی تمام خصوصیات موجود تھیں، مثلاً ہتک کا رویہ اور زندگی میں ہر چیز کے لیے رغبت وغیرہ۔ وہ ہر چیز کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا، جیسے کتابیں، لڑکیاں، شراب کی بوتلیں، جہاز، سفر کے راستے، جزیروں کے گروہ اور اپنی معلومات کا اظہار وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں کرتا رہتا۔ وہ کہانیوں کے شہزادے کی طرح ناقابل قیاس اور ناقابل یقین حد تک فیاض تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی چیزیں بانٹ دیا کرتا: ہیٹ، قمیص، کوٹ حتیٰ کہ

جوتے۔ اس کی نظمیں جدید انداز میں لکھی ہوتیں۔ جدیدیت پسند لوگوں کے خیالات کے مطابق اس نے شاعری کے ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھی، جسے اس نے ''آ گو'' کا نام دیا۔ اسے وہ انسان کی پہلی فتح نومولود بچے کی پہلی نظم کہتا تھا۔

روجاز کی حد سے بڑھی ہوئی فیاضی لوگوں کی توجہ مبذول کرا لیتی تھی۔ ایک روز ایک اجنبی نے اس کے پاس آ کر کہا: ''جناب! میں آپ کو ستارہا ہوں اور آپ مجھے بے حد پسند آئے ہیں۔ کیا میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟''

''پوچھو!'' روجاز نے اسے بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے اپنے اوپر سے پھلانگنے دیں گے؟''

''کیا؟'' شاعر حیران رہ گیا۔ ''کیا تم اس قدر طاقتور ہو کہ اس میز پر میرے بیٹھنے کے باوجود تم مجھے پھلانگ لو گے؟''

''نہیں جناب!'' اجنبی بولا: ''میں بعد میں، جب آپ تابوت میں آرام کر رہے ہوں گے، آپ کو پھلانگنا چاہتا ہوں۔ اپنے دلچسپ ملنے والوں کے لیے میری تعظیم کا یہی طریقہ ہے کہ میں ان کی اجازت سے ان کی موت کے بعد انہیں اوپر سے پھلانگتا ہوں۔ میں ایک تنہا آدمی ہوں اور یہی میرا واحد مشغلہ ہے۔'' اس نے اپنی ڈائری نکال کر مجھے ان لوگوں کی فہرست دکھائی جن پر سے وہ پھلانگ چکا تھا۔

روجاز نے خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے اس کی یہ عجیب و غریب پیشکش قبول کر لی۔ برسوں بعد چلی کے موسم برسات میں روجاز مر گیا۔ معمول کے مطابق وہ اپنی جیکٹ سانتیاگو شہر کے کسی شراب خانے میں بھول کر صرف قمیص میں ملبوس اپنی بہن روزیتا کے گھر گیا۔ انٹارکٹک کے موسم سرما میں فقط دو دن بعد اسے نمونیا کے مرض نے وجود سے عدم کی طرف روانہ کر دیا۔ اس رات روجاز کے دوستوں کو اس اجنبی مہمان سے سابقہ پڑا۔ موسلا دھار بارش گھروں کی چھتوں پر برس رہی تھی۔ بجلی کی چمک اور ہوا کے جھکڑ دیو قامت درختوں کو ہلا رہے تھے۔ اچانک دروازہ کھلا اور سیاہ لباس پہنے ایک شخص اندر آیا۔ وہ بارش میں شرابور تھا۔ کسی کو علم نہ تھا کہ وہ کون ہے؟ دوستوں کی متجسس نگاہوں کے سامنے اس اجنبی شخص نے اپنا جسم تولا اور تابوت کے اوپر سے پھلانگ گیا۔ اس کے بعد جیسے وہ آیا تھا ویسے ہی ایک لفظ کہے بغیر رات کے اندھیرے اور برستی بارش میں غائب ہو گیا۔ اس طرح البرٹو روجاز کی دلچسپ زندگی ایک ایسی پراسرار رسم سے سربہ مہر ہو گئی جس کا معما آج تک کوئی حل نہ کر سکا۔

بیونس آئرس میں مجھے ارجنٹائن کے ایک بے حد خبطی ادیب سے ملنے کا موقع ملا۔ یہ عمرو گنول تھا۔ ایک مرتبہ وسطی قصبے کے ایک ریستوران میں، جہاں اس نے رات کے کھانے پر مجھے مدعو کر رکھا تھا، اس نے میری جانب مڑ کر کہا: ''بیٹھ جاؤ عمرو گنول!'' میں بے چینی کی کیفیت میں بیٹھ گیا اور پوچھا: ''تم اپنا نام لے کر مجھے کیوں مخاطب کر رہے ہو؟ تم جانتے ہو میں پابلو نرودا ہوں۔''

''درست!'' اس نے کہا۔ ''لیکن اس ریستوران میں بے شمار لوگ ہیں جو مجھے محض نام سے جانتے ہیں اور ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو میرے اندر سے دن کی روشنی نکال دینا چاہتے ہیں۔ میں چاہوں گا کہ ایسا وہ تمہارے ساتھ کریں۔''

گنول ارجنٹائن کے ایک صوبے میں کاشت کار رہ چکا تھا اور اپنے ہمراہ ایک گائے لے آیا تھا جو اس کی نہ جدا ہونے والی دوست بن گئی۔ وہ بیونس آئرس میں ہر جگہ اپنی گائے کی رسی تھامے اسے ہمراہ لیے پھرتا۔ اسی زمانے میں اس کی کچھ کتابیں بھی شائع ہوئیں جن کے نام بھی بڑے عجیب و غریب تھے، مثلاً ''گائے کیا سوچتی ہے؟'' اور ''میں اور میری گائے'' وغیرہ۔

جب Pen کلب کی پہلی بین الاقوامی ادبی کانفرنس بیونس آئرس میں منعقد ہوئی تو اس کے سربراہ اوکیمپو اور تمام ادیب یہ سوچ کر کانپ رہے تھے کہ گنول وہاں اپنی گائے کے ہمراہ آ جائے گا۔ انہوں نے حکام بالا کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا اور پولیس نے پلازہ ہوٹل کے اطراف کی تمام سڑکوں کی ناکا بندی کر دی، لیکن یہ سب بے کار ثابت ہوا۔ تقریبات پورے زور شور پر تھیں کہ عظیم گنول اپنی گائے کے ہمراہ کانفرنس ہال میں آ دھمکا اور طرفہ تماشا یہ کہ گائے نے بھی چیخنا شروع کر دیا جیسے وہ بھی مباحثے میں شریک ہونا چاہتی ہو، وہ گائے کو شہر کے وسط تک ایک بند ویگن میں لایا تھا جس پر چوکس پولیس کو ذرہ برابر بھی شک نہ ہو سکا۔

جنگ عظیم کی شروعات تھیں جب پیرس میں مصور الوارو سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ یورپ میں جی گویرا کے نام سے معروف تھا۔ وہ ایک محنتی مصور اور الگ تھلگ رہنے والا شخص تھا جو ہمیشہ مصروف رہتا تھا۔ ایک روز اس نے فون پر مجھ سے کہا کہ فوراً چلے آؤ ضروری بات کرنی ہے۔ میں نے اس سے ملنے کی ٹھانی۔ ملاقات پر اس نے کہا: ''تم نازیوں کے خلاف کانگریس کا خیال چھوڑ کر زیادہ سنجیدہ کام پر لگ جاؤ۔ ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں ہے۔''

''الوارو! میرے پاس واقعی وقت بہت کم ہے۔ مجھے بتاؤ کہ وہ سنجیدہ کام کیا ہے۔''

اس نے مجھے سختی سے گھورا۔ اس کا چہرہ جھاڑیوں جیسی گھنی

بھنوؤں کے ساتھ ایک سابق مکہ باز کا تھا۔ اس نے ایک خاصا ضخیم مسودہ نکال کر سامنے رکھتے ہوئے کہا: ''پابلو! میرا خیال دراصل تین ایکٹ کے اس کھیل میں واضح ہوگا جسے میں تمہارے مطالعے کے لیے لایا ہوں۔''

میں نے وقت کی تنگی کا بہانہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ خود ہی اپنے منصوبے کے بارے میں مختصراً بتا دے۔ اس پر گویرا نے کہا: ''اگر تم ایک آلو کاشت کرو تو اس سے تمہیں کتنے آلو ملیں گے؟''

''ممکن ہے چار یا پانچ!'' میں نے جواب دیا۔

''نہیں!'' اس نے کہا۔ ''اس سے کہیں زیادہ۔ چالیس اور بعض اوقات سو سے زیادہ۔ تصور کرو کہ ہر شخص ایک آلو کاشت کرتا ہے۔ چلی میں کتنے لوگ ہیں؟ اسی لاکھ! اسی لاکھ آلوؤں کو سو سے ضرب دو۔ یہ بھوک اور جنگ کا اختتام ہے۔ چین میں کتنے لوگ ہیں؟ پچاس کروڑ! ہر چینی ایک آلو کاشت کرتا ہے۔ پچاس کروڑ آلوؤں کو اگر چالیس سے ضرب دی جائے تو انسانیت بچ جاتی ہے۔''

جی گویرا کو پیرس میں ایک کہر آلود سرد رات کو اس کے گھر سے گرفتار کرلیا گیا، پھر وہ اسے قیدیوں کے ایک کیمپ میں لے گئے اور جنگ کے خاتمے تک اس کے بازو پر ایک نشان کھود کر اسے وہاں قید میں رکھا۔ وہ اس جہنم سے ایک ڈھانچے کی صورت میں واپس آیا اور کبھی بھی صحت یاب نہ ہوسکا۔ چلی وہ آخری مرتبہ آیا جیسے اپنے ملک کو خدا حافظ کہنے آیا ہو، پھر واپس فرانس چلا گیا جہاں موت نے اس کا کام تمام کردیا۔

میں نے اپنی پہلی کتاب 513 ماروی اسٹریٹ میں مکمل کی۔ میں روزانہ دو، تین بلکہ چار یا پانچ نظمیں لکھا کرتا تھا۔ میری کتاب کے درمیانی حصے کا نام ''ماروی کی شفق'' تھا۔ کسی نے کبھی بھی مجھ سے یہ دریافت نہ کیا کہ ماروی کا کیا مطلب ہے؟ ممکن ہے بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ ایک معمولی سی سڑک کا نام تھا جس میں غیر معمولی شفق کے مناظر نظر آتے تھے۔

1923ء میں میری پہلی کتاب منظر عام پر آئی۔ پہلی اشاعت کا معاوضہ ادا کرنے میں ہر روز مجھے ناکامیوں اور کامیابیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ میں نے فرنیچر اور اپنے باپ سے ملنے والی گھڑی فروخت کردی۔ میرا شاعرانہ سوٹ اس کے بعد بکا۔ ناشر بے حد سخت انسان تھا۔ آخر میں جب کتاب چھپ کر تیار ہوگئی اور جلد بندی ہوچکی تو اس نے بڑے شیطانی انداز میں کہا: ''تم مجھے پورا معاوضہ دیے بغیر کوئی کتاب لے کر نہیں جاسکتے۔'' نقاد آلون نے آخری رقم مجھے دی جسے ناشر نے مجھ سے چھین لیا اور میں اپنی کتابیں کندھے پر اٹھائے سوراخ شدہ جوتے پہنے خوشی سے سرشار سڑک پر ہولیا۔

میری نظموں میں سے ایک نظم ''الوداع'' اس ناپختہ کتاب سے نکل گئی جسے بہت سے لوگ اب بھی یاد رکھتے ہیں اور بعض اوقات بے حد غیر معمولی جگہوں پر سنانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ مجھے یہ برا بھی لگتا ہے کہ جیسے ہی کسی جگہ مجھے متعارف کرایا جاتا، کوئی لڑکی اس نظم کی ذہن پر طاری رہنے والی سطروں سے اپنی آواز بلند کر دیتی۔ کئی برس بعد اسپین میں گارسیا لورکا نے مجھے بتایا کہ خود اس کے ساتھ اس کی نظم کے بارے میں کیا ہوتا رہا۔ اس نظم کا نام ''بے وفا بیوی'' تھا۔

1923ء ہی میں میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں ٹی میوکو میں اپنے گھر واپس آیا تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ سونے سے قبل میں نے اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ آسمان نے مجھے بھونچکا کر دیا۔ تمام آسمان جیسے زندہ و تابندہ تھا اور ہزاروں ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ رات جیسے تازہ نہا کر آئی تھی اور انٹارکٹک کے ستارے ایک ترتیب کے ساتھ میرے سر پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان ستاروں نے مجھے مدہوش کر کے رکھ دیا۔ میں اپنی میز کی طرف دوڑا اور دھڑکتے دل کے ساتھ نئی کتاب کی پہلی نظم لکھنی شروع کی۔ اس کتاب کے کئی نام رکھنے کے بعد آخر ایک نام چن لیا گیا۔ میرے لیے یہ بالکل ایسے ہی آسان تھا جیسے میں خود اپنے پانیوں میں تیر رہا ہوں۔

والپاریزو میں آوارگی:

والپاریزو، سانتیاگو سے خاصا قریب ہے، لیکن اس کے باوجود کوئی ایسی قابل تعریف چیز ضرور ہے جو والپاریزو کو سانتیاگو سے الگ رکھتی ہے۔ سانتیاگو برف کی دیواروں میں مقید ایک شہر ہے جبکہ والپاریزو نے اپنے دروازے وسیع و عریض سمندر کی جانب کھول رکھے ہیں۔

پھوٹی کوڑی سے بھی محروم جیب کے ساتھ خودسر جوانی کے نشے میں ہم اچانک صبح سویرے تیسرے درجے کی گاڑی میں سوار ہوجاتے۔ ہم شاعر اور مصور تھے اور سب کے سب بیس برس کی عمر میں۔ ایک بل کھاتے ہوئے والپاریزو کی پہاڑیوں پر غربت جھرنوں کی طرح ابلتی ہے۔ سبھی کو علم ہے کہ پہاڑوں پر پھیلے ان گنت لوگ کیا کھاتے اور کیا پیتے ہیں۔ گھروں کے باہر سوکھنے کے لیے ڈالے گئے دھلے کپڑوں کے پرچم اور ننگے پیروں کے جمگھٹ میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ سمندر کے قریب سطح زمین پر

بالکونیوں والے گھروں کی کھڑکیاں ہمیشہ بند رہتی ہیں۔ پہاڑیوں پر غربت خوشی اور دکھ کے وحشیانہ جھٹکوں میں پنپتی ہے۔ انسانوں کے کام، آنے جانے والی خوشیوں کے نقاب سے بندرگاہ کو ڈھکتے تھے۔

کبھی کبھار والپاریزو ایک زخمی وہیل کی طرح بل کھاتا ہے۔ وہ ہوا میں اچھلتا، عذاب میں مرتا اور پھر سے زندہ ہوتا ہے۔ شہر کا ہر مکین اپنی یادوں میں ایک زلزلے کا سرمایہ لیے پھرتا ہے۔ ہر شخص اپنے پیدا ہونے سے پہلے ہی ایک ہیرو ہے، کیونکہ بندرگاہ کی یاد میں بذاتِ خود شکست کا بسیرا ہے۔

میں والپاریزو کی مہکتی ہوئی زخمی پہاڑیوں میں رہا ہوں۔ ان لاتعداد پہاڑیوں میں زندگی سانپ کی طرح ان گنت بل کھاتی اور بگل کے حلقوں کی مانند مڑتی ہے، اور یہی غریب بستیاں دل کو آزردہ کرتی ہیں۔ انہی موڑوں پر آپ کو نارنجی رنگ کا ایک ''میری گوراؤنڈ'' منظر ملے گا: ننگے پیر چلتی ایک لڑکی جس کا چہرہ تربوز میں چھپا ہوگا، ملاحوں اور عورتوں کے جمگھٹے، ایک ننھا سا سرکس، پیازوں سے بھری اوپر کو جاتی لفٹ، بلندی کی طرف پانی لے جاتے سات گدھے، آتش زدگی کی لپیٹ میں آنے والی عمارت سے واپس آتی فائر بریگیڈ کی گاڑی اور اسٹور کی کھڑکی۔۔۔ والپاریزو کی پہاڑوں کے بے شمار نام ہیں جن کے مابین سفر کبھی ختم نہیں ہوتا کیونکہ والپاریزو میں سفر نہ زمین پر ختم ہوتا ہے اور نہ ہی دنیا میں۔۔۔ میں اتنی جگہوں پر نہیں جا سکتا تھا۔

والپاریزو کو ایک نئے سمندری عفریت کی احتیاج ہے جس کی آٹھ ٹانگیں ہوں، ایک جس کی مدد سے وہ ان سب سے نمٹ سکے۔ میں اس کی بہت دور تک کی وسعت کو بیان کرتا ہوں، اس کی مانوس وسعت لیکن پھر بھی میں اس کے تمام رنگ دار دائیں حصے کو قابو میں نہیں کر سکتا، اور سبز باغات سے بھرا ہوا اس کا بایاں حصہ، اس کی چوٹیاں اور اس کی گہرائیاں۔۔۔ اس سب پر مستزاد اس کے نام! کیونکہ یہی اس کی جڑیں، اس کی ہوا، تاریخ اور غنائی تمثیل ہیں اور انہی کے حروف میں سرخ خون بہتا ہے۔

اسکول میں ادبی انعام، نئی کتابوں کے باعث کچھ مقبولیت اور ہر دم کندھے پر رہنے والی میری رسوائے زمانہ بے آستین کی قبا نے مجھے فنکاروں کے حلقے میں عزت کی تھوڑی سی رمق عطا کر دی تھی، لیکن صدی کی دوسری دہائی میں ثقافتی زندگی یورپ پر انحصار کرتی تھی۔ برسرِ اقتدار طبقے سے تعلق رکھنے والے مصنفین پیرس میں رہا کرتے تھے۔ مجھے بھی جوانی میں جونہی ذرا سی شہرت ملنے لگی تو لوگوں نے مجھ سے کہنا شروع کر دیا: ''بھئی تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں فوراً پیرس جانا چاہیے۔''

اسی سلسلے میں ایک دوست نے وزارتِ خارجہ کے ایک افسرِ اعلیٰ سے میرے لیے بات کی جس نے مجھے ملاقات کے لیے بلا بھیجا۔ یہ افسر میری نظموں کے بارے میں جانتا تھا۔ دو برس تک وقتاً فوقتاً میں اس کے دفتر کے چکر لگاتا رہا اور ہر بار وہ چاپلوسی کر کے مجھے واپس بھیج دیتا۔ میں یقین کر لیتا کہ وہ خلوص سے بولتا ہے لیکن فوراً ہی وہ اعلیٰ نسل کے کتوں کا ذکر شروع کر دیتا، پھر انگریزی ناول اور علم الانسان پر چھلانگ لگاتا اور روحانیات پر بات کرنے کے بعد اپنی گفتگو کو حسب نسب اور طمطراق پر ختم کر دیتا۔

ایک روز میرے دوست نے، جو خود منسٹر رہ چکا تھا اور وزارتوں کے اندرونی و بیرونی طریق کار سے بخوبی واقف تھا، مجھ سے پوچھا: ''کیا ابھی تک تمہارا پروانہ تقرری نہیں آیا؟'' میرے انکار پر اس نے مجھے بازو سے تھاما اور ہم سنگ مرمر کے زینے چڑھتے اوپر چلے گئے۔ میرے دوست نے وزیر سے کہا کہ میں چلی چھوڑنے کے لیے بہت بے چین ہوں۔ وزیر نے اپنی بہت سی گھنٹیوں میں سے ایک کو بجایا، پھر مجھ سے پوچھا: ''پابلو! تم کہاں جانا چاہتے ہو؟''

''رنگون!'' میں نے بلا تامل جواب دیا۔

''اسے فوراً تقرری کا پروانہ دو۔'' وزیر نے گھنٹی کے بلاوے پر حاضر ہونے والے اپنے نائب سے کہا، چنانچہ کچھ ہی دیر بعد میری تقرری کے احکام آ گئے۔ وزیر کے دفتر میں رکھے گلوب پر میرا دوست اور میں دیر تک رنگون شہر کو ڈھونڈتے رہے۔ پرانے نقشے پر ایشیا کے منطقے میں ایک گہرا گڑھا پڑا تھا۔ بعد میں دریافت کرنے پر یہ رنگون شہر نکلا۔ بحیثیت قونصل میری تقرری پر شاعر دوستوں نے مجھے مبارک باد دی تو میں انہیں فقط یہ بتا سکا کہ جہاں میرا تقرر ہوا ہے وہاں نقشے میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہے۔

1927ء میں جون کے ایک دن ہم نے رنگون کے طول طویل سفر کے لیے کمر کس لی۔ بیونس آئرس میں ہم نے اپنے درجہ اول کے ٹکٹوں کو درجہ سوم کے ٹکٹوں میں تبدیل کرایا اور بیڈان بحری جہاز پر سفر کا آغاز کر دیا۔ میرا رفیق سفر الوارو تھا۔ اس نے فوراً ہی جہاز کی خاتون مسافروں کی درجہ بندی کر لی، وہ بہت دل پھینک واقع ہوا تھا۔ وہ عورتوں کو ہمیشہ دو گروہوں میں تقسیم کرتا۔۔۔ ایک وہ جو مردوں کا شکار کرتی ہیں اور دوسری وہ جو ہنٹر کی اطاعت کرتی ہیں۔ وہ خواتین کے عرشے پر نمودار ہوتے ہی میری ہتھیلی کا مطالعہ کرنے لگتا، جس کے نتیجے میں خواتین رک کر اس سے اپنا ہاتھ دیکھنے کی درخواست کرتیں۔ وہ فوراً ہی ان کے ہاتھ تھام لیتا اور تادیر سہلاتے

ہوئے انہیں ان کے مستقبل کے بارے میں بتاتا رہتا، جو کہ ہمیشہ ہمارے کیبن میں ان کی آمد پر منتج ہوتا۔

پیرس پہنچے تو چلی کا ایک شاہ خرچ ادیب ہمیں ایک مشہور روسی شراب خانے میں لے گیا جس کی دیواریں کوہ قاف کے ملبوسات سے بنی تھیں۔ جلد ہی ہم روسی اور نیم روسی لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھر گئے۔ باہر نکلے تو ٹیکسی میں ایک لڑکی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ الوارو نے اسے اپنے ہوٹل میں پیاز کا سوپ پینے کی دعوت دے دی۔ غور کیا تو دیکھا کہ وہ واقعی خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی اوپر کو اٹھی ہوئی ناک جو پیرس کی لڑکیوں کی ایک نمایاں خصوصیت تھی، اسے انفرادیت عطا کرتی تھی۔ وہ الوارو کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی اور میں اپنے بستر میں تھکا ہارا بے سدھ ہو کر گر پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد الوارو نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا: ''سنو!'' وہ کہنے لگا۔ ''یہ لڑکی حیران کن حد تک ایک خاص چیز ہے۔ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا، تمہیں خود اسے آزمانا ہوگا۔''

کچھ لمحوں بعد وہ لڑکی میرے بستر میں تھی۔ نیم خوابیدہ لیکن اظہار ممنونیت کے ساتھ اس سے ہم بستری کرتے وقت مجھے اس کے پراسرار تحفے کا ثبوت مل گیا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جسے لفظوں میں بیان نہیں کر پاؤں گا۔۔۔ کوئی ایسی چیز جو اس کے ہاں کہیں اندر سے اوپر کو آتی تھی، کوئی چیز جو پہلی لہر کی اٹھان کے ساتھ مسرت کی ابتدا سے وینس کے شہوانی رازوں تک واپس چلی جاتی تھی۔ الوارو نے ٹھیک ہی کہا تھا!

میری یادوں میں وہ ریل گاڑی ہمیشہ محفوظ رہے گی جو ہمیں مارسیلز تک لے گئی۔ یہ گاڑی پھولوں سے بھری ٹوکری کے مانند تھی ۔۔۔ لوگوں کا ہجوم، دیہاتی لڑکیاں، ملاح اور ان کے اکارڈین، سب مل کر گیت گاتے ہوئے!

ہم بحیرہ روم کی جانب بڑھ رہے تھے، روشنی کے دروازوں کی سمت! میں مارسیلز سے بے حد متاثر تھا۔ اس کی کمرشل رومانویت اور بندرگاہ پر موجود جہازوں کا اپنے انداز میں جھومنا مسحور کر دیتا تھا، لیکن جس بحری جہاز میں ہم سنگاپور روانہ ہوئے وہ بذات خود سمندر میں چھوٹا سا فرانس تھا۔ اس کے علاوہ بحیرہ احمر میں جبوتی کی بندرگاہ نے مجھے متاثر کیا، مگر اصل چیز جو دیکھنے والی تھی وہ شنگھائی شہر کی رات میں روشنیاں تھیں۔ خراب شہرت والے شہر آپ کو ایک مردہ عورت کی طرح اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

شنگھائی نے اپنی رات کے بند قبا ہمارے لیے کھول دیے اور ہم ایک ایک کر کے تمام بڑے شبینہ کلبوں میں گئے جہاں زار کے روس کی دبلی پتلی خواتین تاریک کونوں سے باہر نکل آئیں اور انگڑائیاں لے لے کر ہم سے شیمپین پینے کا تقاضا کرنے لگیں۔ پس ہم سے کچھ گناہ اور سرزد ہوئے اور جب رات بھیگنے پر ہم باہر نکلے تو تیز بوچھاڑ کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ ہم عجلت میں ایک رکشے میں سوار ہو گئے۔ ابھی ایک اور افتاد ہماری منتظر تھی۔ ایک ویران جگہ پر اچانک رکشہ رک گیا اور سات آٹھ چینی ہمیں گھیرے میں لے کر ''پیسے پیسے'' کا شور مچانے لگے۔ میرے دوست نے مزاحمت کی کوشش کی تو ہم پر گھونسوں کی بارش شروع ہو گئی۔ برق رفتاری سے انہوں نے ہماری جیبوں کی تلاشی لے ڈالی۔ لباس کا کوئی انچ ایسا نہ تھا جسے بغور نہ دیکھا گیا ہو۔ ہمارے پاس چھوٹی ریزگاری میں سے کچھ باقی نہ رہا تھا لیکن شنگھائی کے اچکوں کی روایت کے احترام میں انہوں نے ہمارے پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات کی عزت کی۔

جاپان پہنچے تو ہم نے قونصل خانے سے رجوع کیا۔ چلی سے ارسال کیے جانے والے پیسے ہمیں یہیں سے ملنے تھے۔ یہاں ہم بھوسے کے اذیت ناک گدوں پر سوئے۔ برف پڑ رہی تھی اور کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ٹھنڈ ہماری ہڈیوں میں اتری جاتی تھی، لیکن کسی نے ہماری پروا نہ کی۔ اس پر مستزاد یہ کہ چلی کا قونصل جنرل ہمیں یوں نخوت سے ملا جیسے ہم اچھوت تھے۔ اس کے پاس ٹیلی فون نہ تھا۔ یوکوہاما میں بھلا فون کی کیا ضرورت ہے؟ پیسوں کے بارے میں اس نے ہمیں مایوس کن خبر دی اور درشت لہجے میں کہا: ''میں تم لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہیں وزارت سے رابطہ کرنا ہوگا۔''

اچانک مجھے ایک خیال سوجھا اور میں نے کہا: ''سینور! میں پیسے کی خاطر اپنے وطن کے بارے میں کچھ لیکچر دینے پر مجبور ہوں۔ مجھے ایک ہال، ترجمان اور ضروری اجازت نامہ دے دو۔'' اس بات پر پہلے وہ برافروختہ ہوا، پھر ڈر گیا اور غصے سے کانپتے ہوئے اس نے ہم سے رسیدوں پر دستخط کرائے اور ہمیں پیسے دے دیے۔ دس روز بعد میں نے اسے رنگون سے ایک چیک بھیجا جو سود کے بغیر تھا۔

عرشے سے جوں جوں جہاز رنگون کے نزدیک ہوتا گیا، مجھے بڑے پگوڈا کے سنہرے مینار نظر آنے لگے۔ جیٹی پر اجنبی لباس کی ایک کثیر تعداد کے ہیجان خیز رنگوں کا اجتماع تھا۔ وہیں ایک بڑے کثیف دریا کا دہانہ مارتابان کی خلیج میں خالی ہوتا تھا۔ اس دریا کا نام دنیا کے تمام دریاؤں سے خوبصورت تھا۔۔۔ دریائے اراوادی۔۔۔ اور اس کے پانیوں کے نزدیک میری زندگی شروع ہوا چاہتی تھی۔

درخشاں تنہائی:

آگے چلنے سے پہلے کچھ اور مناظر جو میری یادوں میں محفوظ ہیں مثلاً 1929ء کی ایک رات! مسلمانوں کی چھٹی کا دن ہے اور گلی کے وسط میں ان کا اجتماع ہے، کوئلے دہک رہے ہیں۔ ایک شخص نمودار ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر سرخ اور سفید رنگ ملا ہوا ہے۔ وہ عالم خمار ہیں۔ ''اللہ اللہ'' چیختا ہوا دہکتے کوئلوں پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ سارا مجمع اس منظر میں گم ہے۔ تب ایک اور آدمی ہجوم چیر کر آگے آتا ہے اور اپنے چپل اتار کر اسی طرح ننگے پیر دہکتے کوئلوں پر چلتا ہے۔ دیگر لوگ بھی آگے آتے ہیں اور جلتے کوئلوں پر چلتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں جلتا۔

ایک اور منظر میں مقدس دریا کے قریب کالی کا مندر ابھرتا ہے۔ کالی موت کی دیوی ہے۔ اس کی عنایات کے طالب سینکڑوں زائرین کے ہمراہ ہم مندر میں داخل ہوتے ہیں۔ برہمن کالی دیوی کے سات پردوں میں سے ایک پردہ اٹھاتے ہیں اور اسی دم ایک تھال کا ایسا گرج دار دھاکا ہوتا ہے کہ جس سے مردے بھی جاگ اٹھیں۔ زائرین گھٹنوں کے بل گر جاتے ہیں اور ہاتھ باندھ کر اپنی اطاعت کا اظہار کرتے ہیں۔ ہاتھ ان کی پیشانیوں کو چھوتے ہیں اور وہ دوسرے پردے تک پہنچتے ہیں۔ پروہت انہیں صحن میں دھکیلتا ہے جہاں وہ بکریوں کے سر ان کے دھڑ سے کلہاڑی کے ایک ہی وار سے الگ کر دیتے ہیں اور نئے اعزازات وصول کرتے ہیں۔

شاعر میرے ارد گرد اپنے گیت اور نظمیں گانے کے لیے جمع تھے۔ ان میں بہت سے نوجوان شاعر تھے جن سے میں سارے ہندوستان میں ملا۔ ان کی پھٹی ہوئی آنکھیں میں کبھی فراموش نہیں کر پاؤں گا۔ بمبئی اور اس کے مضافات میں لاکھوں لوگ ہر رات سڑکوں کے کنارے سوتے ہیں۔ وہ وہیں پیدا ہوتے ہیں، وہیں سوتے ہیں اور انہی سڑکوں کے کنارے مر جاتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی گھر نہیں، روٹی نہیں، دوا نہیں۔ مہذب مغرور انگلستان اپنی نوآبادیاتی قلمرو کو اس حالت میں چھوڑ کر گیا ہے کہ اس کی سابق رعایا کے دامن میں اسکولوں، کارخانوں، گھروں، اسپتالوں کے بجائے جیل خانوں اور خالی وہسکی کی بوتلوں کے پہاڑ بچے ہیں۔

یہ ایک اور مندر ہے جو پنانگ شہر کے مضافات میں واقع ہے جسے کبھی انڈو چائنا کہا جاتا تھا۔ اسے ناگ مندر کہتے ہیں۔ اس کا ذکر سیاحوں اور صحافیوں نے بار ہا کیا ہے۔ بے شمار جنگوں اور بار بار کی تباہ کاریوں کے باوجود یہ مندر ابھی تک موجود ہے۔ اس میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں چھوٹے چھوٹے ناگ شمع دانوں کے گرد لپٹے ہوئے ہیں۔ چینی کے بے شمار پیالے ادھر ادھر رکھے ہیں۔ کچھ میں دودھ بھرا ہے اور کچھ میں انڈے پڑے ہیں۔ درجنوں کورل سانپ ہیں جن کے گلابی حلقے ان کے سریع الاثر زہر کی علامت ہیں۔ کیا ان سانپوں کو یہاں لایا گیا تھا؟ کس طرح ان کا گزر ہوتا ہے؟ ہمارے سوالات کا جواب ایک مسکراہٹ سے دیا گیا۔

یہ ایک فتح مند دن ہے۔ ہم انڈین نیشنل کانگریس پارٹی کے اجتماع میں موجود ہیں۔ ہندوستانی قوم آزادی کی خاطر جنگ لڑ رہی ہے۔ میں وقت کے ایک سرکردہ رہنما گاندھی اور پنڈت موتی لعل نہرو سے ملتا ہوں۔ اس کا سجیلا جوان بیٹا جواہر لعل حال ہی میں انگلستان سے لوٹا ہے۔ نہرو آزادی کا خواہاں ہے جبکہ گاندھی پہلے قدم کے طور پر صوبائی خود مختاری چاہتا ہے۔ گاندھی ایک چالاک لومڑی کی واضح تصویر ہے۔ ایک عملی انسان، ہمارے پرانے عہد کے کریول رہنماؤں کی وضع کا سیاست دان! ایک شاطر اور عیار ذہن!

کانگریس کی قد آور شخصیات میں سے ایک شخصیت سبھاش چندر بوس کی تھی، جو اپنے ملک کا ایک شدت پسند جذباتی سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ سامراجیوں کا شدید مخالف اور ہندوستان کا ایک پسندیدہ سیاسی رہنما تھا۔ 1914ء کی جنگ میں جاپانی حملے کے دوران اس نے برطانوی سامراج کے خلاف حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا، پھر وہ گرفتار ہوا، اس پر مقدمہ چلایا گیا اور بغاوت کا جرم ثابت ہونے پر ہندوستان میں برطانوی عدالت نے اسے سزائے موت کا حکم سنایا۔ اس سزا کے خلاف ابھرنے والی احتجاجی آواز نے تحریک آزادی کو دوچند کر دیا۔ آخر کار بہت سی قانونی لڑائیوں کے بعد اس کے وکیل نہرو نے اس کے لیے آزادی کو جیت لیا۔ اسی لمحے وہ بے پناہ مقبول شخصیت بن گیا۔

مشرقی ممالک کے تمام پراسرار فلسفے جب حقیقی زندگی کا سامنا کرتے ہیں تو اضطراب، اعصابیت، ذہنی پیچیدگی اور مغرب کی مفاد پرستی کا پیدا کردہ نتیجہ نظر آتے ہیں جو سرمایہ داری کے رہنما اصولوں کا بحران ہے۔ اس عہد کے ہندوستان میں کسی کے لیے بھی خود اپنی ذات پر توجہ دینے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ نوآبادیاتی صورتحال ذلت آمیز انداز میں ہیضہ، چیچک، بخار اور بھوک کے ہاتھوں مرنے والوں کی بے چارگی پر قائم تھی۔ اس پر ہندوستان کے جاگیردارانہ ماحول، بے تحاشا آبادی اور صنعتی کسمپرسی نے زندگی پر ایک ایسی خوفناک مہر لگا دی تھی کہ صوفیانہ طرز حیات کا اظہار غائب ہو گیا تھا۔ صوفیانہ مراکز بالعموم مغرب سے آنے والے مہم جو حضرات پر چل رہے تھے۔ بلاشبہ ان میں سے کچھ لوگ اس بارے میں سنجیدہ فکر رکھتے تھے لیکن بیشتر تعداد ارزاں بازاری ہتھکنڈوں میں ملفوف ماورائی قسم کی گفتگو کو بڑے پیمانے پر فروخت کرنے کا دھندا کرتی

تھی۔ یہ لوگ ہمیشہ یوگا اور دھرما کے بارے میں تقریریں کرتے اور مذہبی قلابازیوں میں بلند بانگ لیکن کھوکھلے نعرے لگاتے۔ ان وجوہ کی بنا پر مشرق مجھے ایک بڑے بدنصیب انسانی خاندان کی طرح لگا جس نے میرے لاشعور میں اپنے دیوتاؤں اور رسومات کے لیے کوئی جگہ نہ چھوڑی۔ ذات کی تقسیم کے نظام نے ہندوستانی لوگوں کو ایک ایمفی تھیٹر کی شکل میں سجا رکھا تھا جسے لوہے کی نالیاں مختلف حصوں میں منقسم کرتی ہیں۔ اس تھیٹر میں ایک دوسرے پر ان کے دیوتا براجمان تھے۔ انگریزوں نے بھی اسی طرح اپنی ذات کے نظام کو برقرار رکھا تھا جو چھوٹی دکانوں کے کلرکوں سے شروع ہو کر پیشہ وروں اور دانشوروں سے ہوتا ہوا مال برآمد کرنے والے تاجروں تک اس نظام کی چھت پر ختم ہوتا جہاں سول سروس کے اعلیٰ عہدیدار اور امپائر کے بڑے بڑے بینکر متمکن ہوتے۔

یہ دو دنیائیں کبھی ایک دوسرے کو نہ چھو پائیں۔ ملک کے اصل باشندے انگریزوں کی مخصوص جگہوں پر نہ جا سکتے تھے اور انگریز ملک کی دھڑکتی نبضوں سے بہت دور رہائش پذیر تھے۔ اس صورت حال نے میرے لیے خاصے مسائل پیدا کر دیئے۔ میرے برطانوی دوستوں نے مجھے گھوڑا گاڑی میں دیکھ کر مشورہ دیا کہ ایک قونصل کو اس قسم کی گاڑی کا استعمال زیب نہیں دیتا۔ انہوں نے مجھے ایرانی ریستورانوں میں جانے سے منع کیا، جہاں میں نے چھوٹی چھوٹی شفاف پیالیوں میں دنیا کی بہترین چائے پی تھی۔ ان آخری انتباہات کے بعد انہوں نے مجھے کبھی مدعو نہ کیا۔

ایسی لاتعلقی مجھے کبھی بھی خوش نہ کر سکتی تھی۔ وہ ناقابل برداشت یورپی بالکل دلچسپ نہ تھے، پھر یہ بھی تھا کہ میں مشرق میں اپنی زندگی ان عارضی نوآبادیاتی حکمرانوں کے ساتھ گزارنے تو نہیں آیا تھا۔ میں تو دنیا کی اس قدیم ترین روح اور اس بڑے بدنصیب انسانی خاندان کے ساتھ رہنے آیا تھا۔ میں مقامی طرز معاشرت اور زندگی میں اتنا گہرا اتر گیا کہ ایک مقامی لڑکی کو اپنا دل دے بیٹھا۔ وہ انگریزی ملبوسات پہنتی اور اپنا نام جوزی بتاتی تھی۔ ایک روز میرے گھر کے تنہا گوشوں میں اس کا انگریزی ملبوس ایک شاندار سارنگ کے بدلے اتر گیا۔ دل پذیر جوزی آہستہ آہستہ اس قدر متقاضی اور مجھ پر حاوی ہوتی چلی گئی کہ اس کے جلاپے کے دوروں نے بیماری کی صورت اختیار کر لی۔ مجھے اس کے ننگے پیروں اور سیاہ بالوں سے عشق تھا لیکن اس کے غیظ و غضب نے اسے وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی جب تم مرو گے تو میرے خدشات ختم ہو جائیں گے۔ اگلے ہی روز وہ پراسرار رسومات دہراتی تاکہ مجھے اپنا وفادار رکھ سکے۔ وہ یقیناً کسی روز مجھے مار ڈالتی لیکن خوش قسمتی سے مجھے سیلون منتقلی کا سرکاری خط مل گیا۔ میں نے خفیہ طور پر وہاں جانے کی تیاری شروع کر دی اور ایک روز اپنے کپڑے کتابیں وہیں چھوڑ کر بحری جہاز پر سوار عازم سیلون ہوا۔ جوزی ایک ایسا برمی چیتا تھی جسے میں دکھی دل کے ساتھ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ بحری جہاز بمشکل خلیج بنگال میں داخل ہوا ہو گا کہ میں نے ایک دکھ بھری نظم لکھنا شروع کی جو ایک ایسی عورت کے نام منسوب تھی جو مجھ سے بچھڑ گئی تھی اور جس نے مجھے کھو دیا تھا محض غصے کے اس آتش فشاں کے باعث جو مسلسل اس کے لہو میں گھومتا رہتا تھا۔

تب وہ رات مجھے بہت طوفانی اور زمین بہت تنہا لگی!

1929ء میں سیلون دنیا کے سب سے بڑے اور خوبصورت جزیروں میں سے ایک تھا جو برما اور ہندوستان ہی کی طرح نوآبادیاتی صورت حال رکھتا تھا۔ انگریزوں نے خود کو اپنے کلبوں، لاتعداد موسیقاروں، غلاموں، جولاہوں، کمہاروں، زرد لباس والے پنڈتوں اور پتھروں میں ڈھلے ان گنت خداؤں کی ہمسائیگی میں محصور کر رکھا تھا۔ ہر شام میں ڈنر جیکٹ میں ملبوس انگریزوں اور ہندوؤں کے مابین پھنسا کبھی ان کی من گھڑت بڑائی تک پہنچنے کے بارے میں امید نہ کر سکتا تھا۔

میرے پاس سوائے تنہائی کے کچھ نہ تھا۔ میری پالتو نیولا اور کتا میرے واحد ساتھی تھے۔ نیولا میرے بستر میں سوتی اور میرے ساتھ میز پر کھانا کھاتی تھی۔ وہ میرے روزمرہ کاموں سے واقف تھی اور سارے ہمسائے میں مشہور ہو گئی تھی۔ زہریلے کوبرا سے نیولا کی بہادرانہ جنگوں نے انہیں اساطیری عزت بخش دی تھی۔ دیہاتی لوگوں کا خیال تھا کہ لڑائی کے بعد نیولا ایسی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں نکل جاتا ہے جو زہر کا تریاق ہوتی ہیں، بہرحال میری مادہ نیولا کی شہرت ایک روز محلے کے بچوں کو جلوس کی شکل میں میرے گھر لے آئی۔ گلی میں ایک بڑا سانپ نکل آیا تھا اور وہ مجھ سے نیولے کی مدد لینے آئے تھے۔ میں تامل اور سنہالی بچوں کے جلو میں نیولے کو گود میں اٹھائے اس جگہ پہنچا جہاں خطرناک سانپ موجود تھا۔ وہ نالی پر اگی خودرو گھاس میں دم سادھے پڑا تھا۔ میرے پیچھے آنے والے خاموشی سے رک گئے۔ میں نے نیولے کو سانپ سے دو میٹر کے فاصلے پر چھوڑ دیا۔ نیولے نے خطرہ بھانپتے ہوئے سانپ کی طرف پیش قدمی کی۔ میرے ننھے دوست اور میں سانس روکے کھڑے تھے۔ میدان کارزار میں جنگ شروع ہونے والی تھی۔ مادہ نیولا آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور اس عفریت سے چند سینٹی میٹر کے فاصلے پر پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ کیا ہونے والا ہے۔ تب اس نے ایک لمبی جست لگائی اور سانپ اور تماشائیوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی

دوڑی اور میری خواب گاہ میں آ کر دم لیا۔ اس طرح ویلا واٹے کے مضافات میں، میں ذات سے گر گیا۔

کولمبو میں زندگی:

کولمبو میں انقلاب کی کوئی نظر آنے والی علامت موجود نہ تھی۔ ہندوستان کی سیاسی فضا کے برعکس یہاں ہر شے ایک استبدادی سکوت میں ملفوف تھی۔ یہ ملک انگلستان کو سب سے عمدہ چائے فراہم کرتا تھا اور مختلف خانوں میں بٹا ہوا تھا۔ تکون کی نوک پر قابض وسیع باغوں والے انگریز شاندار گھروں میں رہتے تھے جن کی تقلید متوسط درجے کے لوگ کرتے تھے۔ زیریں حصے میں سیلون کی بدھ اور مسلمان آبادی تھی جس کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ اس سے بہت نیچے مزدور پیشہ قلیل آمدنی والے لوگ آباد تھے۔

ان دنوں جیسے واقعی مقدر پر سیاہ بادل چھا گئے تھے۔ اچانک جوزی نے آ کر میرے گھر کے سامنے خیمہ تان دیا۔ سارا وقت وہ سامنے والے دروازے پر موجود رہتی اور آنے جانے والوں کی بے عزتی کرتی۔ ایک پیاری سی یوریشین لڑکی کو، جو مجھ سے ملنے میرے گھر آ گئی تھی، اس نے بری طرح زدوکوب کیا۔ نوآبادیاتی پولیس نے مجھے خبردار کیا کہ اگر میں نے اسے پناہ نہ دی تو وہ اسے وہاں سے اٹھا کر پھینک دیں گے۔

وہ محبت کی ماری ایک تخریب کار تھی جو کچھ بھی کر گزرنے پر قادر تھی۔ تنگ آ کر ایک روز اس نے واپسی کا ارادہ کر لیا اور مجھ سے التجا کی کہ اسے جہاز تک چھوڑ آؤں۔ الوداع کا وقت آیا تو اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا اور میرا چہرہ اپنے بوسوں اور آنسوؤں سے چھپا ڈالا۔ میں اسے اس سفر سے نہ روک سکا۔ میری دوراندیشی نے مجھے ایسا کرنے سے روکا لیکن میرے دل پر ایک ایسا گھاؤ لگا جو آج بھی میرے وجود کا حصہ ہے، وہ اندوہناک دکھ جس کا مداوا نہ ہو سکا۔ اس کے سفید مٹی سے آلودہ چہرے پر بہتے ہوئے وہ آنسو آج بھی میری یاد میں چراغوں کی طرح روشن ہیں۔

کولمبو میں تنہائی ہی اداس کر دینے والی نہ تھی، بلکہ وقت کی رفتار بھی بڑی سست تھی۔ میری تنہا رہائش گاہ کسی بھی رہائشی ٹھکانے سے بہت دور تھی۔ جب میں نے اسے کرائے پر لیا تو مجھے بیت الخلا ڈھونڈنا پڑا تھا۔ وہ شاور کے نزدیک ہونے کے بجائے گھر کے پچھواڑے بنا تھا۔ اسے میں نے تحیر کے ساتھ دیکھا۔ یہ لکڑی کا ایک صندوق تھا جس کے وسط میں ایک گول سوراخ تھا۔ اس گول سوراخ کے نیچے دھات کا بنا ایک برتن پڑا تھا جو ہر صبح صاف ہو جاتا لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ کس طرح اس کی صفائی ہوتی ہے۔

ایک صبح میں معمول سے کچھ پہلے اٹھ گیا اور جو کچھ میں نے دیکھا، اس نے مجھے ششدر کر دیا۔ گھر کے پچھواڑے ایک انتہائی حسین عورت کہ میں نے سیلون میں ایسی ابھی تک دیکھی نہ تھی، ایک تاریک مجسمے کے مانند موجود تھی۔ وہ پردھیا ذات کی تامل تھی۔ اس نے انتہائی سستے کپڑے کی سرخ و سنہرے رنگوں کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس کے عریاں ٹخنوں میں بھاری کنگن موجود تھے اور ناک کی دونوں طرف دو سرخ نقطے چمکتے تھے۔ وہ مجھ پر نظر ڈالے بغیر خاموشی سے چلتی ہوئی بیت الخلا کی جانب گئی اور میرے وجود کی پروا نہ کرتے ہوئے اس غلیظ برتن کو سر پر اٹھائے ایک دیوی کی طرح غائب ہو گئی۔

وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ اس کے اتنے حقیر کام کی نوعیت کے باوجود میں اسے اپنے ذہن سے فراموش نہ کر پایا۔ جنگل کے شرمیلے جانور کے مانند وہ کسی اور ہی دنیا کا ایک مختلف روپ دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن بے سود! اس کے بعد کئی بار میں نے اس کی راہ میں مختلف تحائف رکھے لیکن اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ بے توقیری کا یہ عمل اس کے گہرے رنگ کی دلکشی کے باعث ایک لاتعلق ملکہ کا رسمی فرض بن گیا تھا۔ ایک صبح میں نے ارادہ کر لیا اور اس کی کلائی مضبوطی سے تھام کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس سے ہم کلام ہونے کے لیے میرے پاس کوئی زبان نہ تھی۔ بغیر مسکرائے اس نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور جلد ہی وہ میرے بستر میں بے لباس تھی۔

اس کی کمر کس قدر نازک تھی! اس کے بھرے بھرے کولہے اور اس کی چھاتیوں کے لبریز پیالے۔۔۔ ان سب نے اسے جنوبی ہندوستان کے ہزاروں برس پرانے مجسموں میں ڈھال دیا تھا۔ یہ ایک انسان اور مجسمے کا ملاپ تھا۔ اس دوران اس نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی تھیں جو جذبات سے یکسر عاری تھیں۔ وہ مجھ سے نفرت کرنے میں حق بجانب تھی، چنانچہ یہ تجربہ دوبارہ نہ دہرایا گیا۔

مجھے تار پڑھ کر یقین نہ آتا تھا۔۔۔ وزارت خارجہ کی جانب سے مجھے نئے تقرر کی اطلاع دی گئی تھی جس کی رو سے مجھے کولمبو میں قونصل کے بجائے یہی فرائض سنگاپور اور بٹاویا میں سرانجام دینے تھے۔ اس طرح میں غربت کے ایک دائرے سے نکل کر دوسرے میں داخل ہو گیا تھا۔ کولمبو میں اس وقت تنخواہ 66 ڈالر ماہانہ تھی لیکن اب دو جگہوں میں قونصل کی حیثیت سے تنخواہ دگنی ہو گئی تھی، یعنی کل 333 ڈالر جس کا مطلب یہ تھا کہ اب مجھے کم از کم سفری بستر سے نجات مل جائے گی۔

یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ کس لیے دنیا بھر میں چلی کے قونصل

خانے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ واقعی بے تکا سا لگتا ہے کہ
قطب جنوبی کی ایک چھوٹی سی ریاست اپنے نمائندے آرکی پلاگو
جیسے دور افتادہ ملک اور کرہ ارض کی دوسری جانب بکھرے ساحلوں
پر رکھنے میں قادر ہے۔ درحقیقت جیسا کہ میں نے جانا، یہ قونصل
خانے ہم جنوبی امریکیوں کی خود کو اہمیت دینے اور خام خیالی میں مبتلا
رہنے کی ایک عادت ہے لیکن اس کے علاوہ ان دور افتادہ جگہوں
سے چلی کو پٹ سن، موم بتیاں بنانے کے لیے پرافین اور سب سے
بڑھ کر کثیر تعداد میں چائے مل جاتی تھی۔

سنگاپور میں قونصل خانہ دس برس سے موجود تھا۔ میں اپنے
نوکر، نیوٹے اور تمیں سالہ اعتماد کے ساتھ ساحل پر اتر گیا۔ جہاں
سے ہم سیدھے ریفلز ہوٹل پہنچے۔ میں نے اپنے کپڑے ڈھلائی
کے لیے بھیجے اور آرام کرسی پر دراز ہو گیا، لیکن جب ٹیلی فون
ڈائریکٹری میں اپنے قونصل کا مرکزی دفتر دیکھنا شروع کیا تو اس
میں نام و نشان نہ تھا۔ میں نے فوراً ہی برطانوی سرکاری حکام کے
حوالے سے ایک فوری کال بک کرائی۔ وہاں سے جواب ملا کہ چلی
کے قونصل خانے کا وہاں وجود نہ تھا۔ میں سخت مصیبت میں گرفتار ہو
گیا۔ میرے پاس ہوٹل اور لانڈری کے لیے محض ایک دن کے پیسے
اور تھے۔ تب مجھے اچانک خیال آیا کہ مرکزی دفتر یقیناً بٹاویا میں ہو
گا۔ میں نے فی الفور اسی بحری جہاز پر سوار ہونے کا ارادہ کر لیا جس
سے میں یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ جہاز ابھی تک بندرگاہ میں لنگر انداز
تھا۔ میں نے اپنے کپڑوں کی واپسی کا تقاضا کیا جو بھیگے پڑے تھے۔
نوکر نے گیلے کپڑوں کو ایک بنڈل کی صورت میں لپیٹا اور ہم نے
بندرگاہ کی طرف دوڑ لگادی۔

اسپین میرا دل:

دو ماہ کا ایک طویل سمندری سفر 1932ء میں مجھے واپس چلی
لے آیا جہاں پہنچ کر میں نے اپنی دو کتابیں شائع کرائیں۔ 1933ء
میں مجھے بیونس آئرس میں چلی کا قونصل مقرر کیا گیا جہاں میں
اگست کے مہینے میں پہنچا۔ اسی شہر میں تقریباً اسی وقت گارسیا لورکا
اپنے المیہ ڈرامے کی ہدایات کے لیے آیا ہوا تھا۔ ہم دونوں ایک
دوسرے سے ناواقف تھے۔ ادیبوں اور دوستوں کے توسط سے
ہماری ملاقات ہوئی جو بے شک ہمارے اپنے حادثات کا حصہ تھی۔
نطالیو نامی ایک طاقتور سرمایہ دار کے گھر ہم دونوں مدعو تھے۔ ہمارے
سامنے ایک نازک اندام خاتون شاعرہ تھی جس نے کھانے کے
دوران اپنی سبز آنکھیں گارسیا کے بجائے مجھ پر مرکوز رکھیں۔ خاتون
شاعرہ، گارسیا اور میں کھانے کے بعد میز سے اٹھ کر تیراکی کے روشن
تالاب کی طرف چلے گئے۔ گارسیا بہت خوش تھا۔ خوشی اس کی جلد کی
طرح اس کے وجود کا حصہ تھی۔ تیراکی کے تالاب پر ایک بلند مینار
چمک رہا تھا۔ رات کی روشنیوں میں مینار کی سفیدی دودھیا روشنی
کے مانند درخشاں تھی۔ ہم آہستہ آہستہ مینار کی باہر کی جانب نکلنے
والی بلند ترین جگہ تک چڑھے۔ ہمارے اوپر رات کا سائبان لاتعداد
ستاروں کے جھرمٹ میں اس قدر نزدیک لگتا تھا جیسے ہمارے سر
اس کی گہرائی میں چھپ گئے ہوں۔ میں نے اس بلند قامت سنہری
لڑکی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور جب میں نے اسے چوما تو بے
حد گداز اور مکمل عورت پایا۔ اس وقت فریڈریکو گارسیا کی حیرت کی
انتہا نہ رہی جب ہم دونوں وہیں فرش پر لیٹ گئے اور میں نے اسے
بے لباس کرنا شروع کر دیا۔ فریڈریکو نے دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں
پر یقین نہ آیا۔ ستاروں بھرے آسمان کے لیے قربانی کے طور پر
رات کے حسن کی دیوی سے مینار کی بلندی پر جلد ہی عشق کی تکمیل
ہونے والی تھی چنانچہ میں نے فریڈریکو سے کہا: ''یہاں سے باہر دفع
ہو جاؤ اور دیکھو کہ کوئی اوپر نہ آنے پائے۔''

فریڈریکو تیزی سے باہر سیڑھیوں کی طرف پلٹا مگر بدقسمتی سے
تاریکی میں پھسل کر گر گیا۔ مجھے اور اس خاتون شاعرہ کو اس کی مدد کی
خاطر بمشکل تمام نیچے جانا پڑا، لیکن فریڈریکو اس حادثے کے بعد
تقریباً دو ہفتے صاحب فراش رہا۔

بیونس آئرس کے قونصل خانے میں، میں زیادہ عرصہ نہ رہا۔
1934ء کے آغاز میں مجھے اسی حیثیت میں بارسلونا بھیج دیا گیا۔
اسپین میں چلی کا قونصل جنرل ڈان میکورا میرا افسر تھا۔ اس نے مجھ
سے کہا: ''پابلو! تمہیں میڈرڈ میں جا کر رہنا چاہیے۔ یہاں بارسلونا
میں محض جمع تفریق اور تقسیم ہی ہے جس کے لیے تمہاری ضرورت
نہیں۔ یہ میں خود کر سکتا ہوں۔''

آہ! ان دنوں کا میڈرڈ! میں مصور ماروجا مالو کے ہمراہ
کاریگروں کے علاقوں میں گھومتا رہتا۔ ان گلیوں میں اسپین کی خشک
اشیا کا کاروبار ہوتا تھا۔ یہ چیزیں اسپین کا دل جکڑے رکھتی تھیں۔
اسپین خشک اور سنگلاخ چٹانوں کا ملک ہے اور بلند سورج اس کی
زمینوں پر دھول کے جلتے غبار میں سے چنگاریاں اڑاتا ہے۔ اسپین
کے اصل دریا اس کے شاعر ہیں۔۔۔ کالیڈرون، ارجنولاس اور
گنگورا۔

1925 میں، میں نے ''جیک آف کلبز'' نامی رسالے کا اجرا کیا
تھا۔ اس زمانے میں ہم اوقاف کے بغیر لکھا کرتے تھے اور ڈبلن کی
گلیوں کو ہم نے جیمز جوائس کے حوالے سے دریافت کیا تھا۔

''کبالو وردے'' کا چھٹا شمارہ اشاعت کے مراحل طے نہ کر پایا۔ اس میں اسپین کے بہت سے شاعروں نے ''جولو ہریرہ'' کی تعریف وتوصیف میں لکھا تھا لیکن رسالے کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مرنا پڑ گیا۔ اس رسالے کو 19 جولائی 1936ء کو منظر عام پر آنا تھا لیکن اس روز اسپین کی گلیوں میں گولیاں چل رہی تھیں۔ افریقی گیریژن کا ایک غیر معروف جنرل فرانسسکو فرانکو جمہوریہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

میرے لیے اس کا آغاز 19 جولائی 1936ء کی شام کو ہوا۔ فریڈ گارسیا لورکا اور میں نے بل فائٹنگ کے ایک اکھاڑے میں پہنچنے کا وقت طے کر رکھا تھا، لیکن گارسیا نہ آ سکا۔ اس وقت وہ اپنی موت کی جانب رواں دواں تھا۔ اس کے بعد ہم کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ اس طرح ہسپانوی جنگ جس نے میری شاعری کو بدل ڈالا، میرے لیے ایک شاعر کے غائب ہونے سے شروع ہوئی۔ کیا شاعر تھا وہ! اس جیسی ذہانت اور سلیقہ میں نے نہیں دیکھا۔ فریڈریکو گارسیا لورکا ایک بے مثال انسان تھا۔ وہ اپنے وطن اسپین کی مقبول عام روایات کے مختلف ادوار میں ایک مثال تھا۔۔۔ عرب اور اندلسی ماخذ کا ایک شاندار شخص جو چنبیلی کی طرح مہکتا تھا لیکن افسوس کہ اسپین کی وہ روایت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ فوجی جتھا اسے ایک دن قتل کر دے گی۔

بالآخر ایک روز بحیثیت قونصل میرے فرائض منصبی اختتام کو پہنچے۔ میں نے ہسپانوی جمہوریہ کے دفاع میں حصہ لیا تھا، اس لیے چلی کی حکومت نے مجھے میرے موجودہ منصب سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔

جنگ اور پیرس:

ہم پیرس پہنچ گئے جہاں میں نے رافیل البرٹی اور اس کی بیوی ماریا کے ساتھ مل کر ایک گھر حاصل کر لیا۔ اپنے گھر سے میں ہنری چہارم کے مجسمے اور دریائے سین کے کنارے بیٹھے مچھیروں کو دیکھ سکتا تھا۔ ایک فرانسیسی ادیب آلیجو کارپینٹر بھی وہیں رہتا تھا۔ فرانس میں تب اور بہت سال بعد تک میں فرانس کے دو بڑے مشہور ادیبوں کو اپنا عزیز دوست سمجھنے پر نازاں تھا اور وہ پال الیارڈ اور اراگون تھے۔ بہت کم انسان ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوں گے جیسے کہ یہ دونوں۔

اسپین میں بہنے والے خون نے مقناطیس کا کام کیا اور ایک طویل مدت کے لیے شاعری کو لرزا کے رکھ دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے رسالے کی اشاعت کامیاب رہی یا ناکام کیونکہ اسپین میں جنگ اس وقت اپنے ہولناک انجام کو پہنچی جب دوسری جنگ عظیم کی ہیبت ناک ابتدا ہو رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد مجھے یورپ سے اپنے وطن کے لیے واپس جانا تھا۔ نینسی بھی اپنے بل فائٹر کے ہمراہ چلی کے لیے عازم سفر تھی، وہ میری عزیز دوست تھی اور ان عجیب وغریب لوگوں میں سے تھی جن سے کبھی میرا تعلق رہا۔ وہ لیڈی کیونارڈ کی بیٹی اور کیونارڈ ورثے کی واحد مالکہ تھی۔ 1930ء میں اس نے سیوائے ہوٹل میں بلائے جانے والے جاز بینڈ کے ایک سیاہ فام رکن کے ساتھ بھاگ کر سارے لندن کو ایک اسکینڈل میں پھنسا دیا تھا۔ اس حرکت پر لیڈی کیونارڈ نے اسے جائداد سے عاق کر دیا اور یوں برطانوی شرافت سے عاق شدہ اس جوان لڑکی سے تیسری دنیا میں گھومتے ہوئے میری ملاقات ہوئی۔ اس کی ماں کے ہاں جارج سور (جس کے بارے میں یہ خبر عام تھی کہ وہی نینسی کا اصل باپ ہے) سر تھامس، آلڈس ہکسلے اور مستقبل کا ڈیوک آف ونڈسر آتے رہتے تھے۔

عاق ہونے کے بعد نینسی نے جوابی حملہ کیا۔ اسی برس دسمبر میں اس نے انگریز اشرافیہ کو کرسمس کے تحفے کے طور پر سرخ لفافے میں ملفوف ایک کتابچہ بھیجا جس پر نیگرو مرد اور سفید خاتون درج تھا۔ میں نے اس سے زیادہ تلخ شے کبھی نہ دیکھی تھی۔ سیاہ لوگوں کے دفاع میں نینسی کے دلائل لیڈی کیونارڈ اور انگریز معاشرے پر ڈنڈوں کی طرح برسے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نے کہا تھا:

''فرض کریں کہ آپ کی گوری نسوانیت کو اغوا کر لیا جاتا، پھر اسے مارا جاتا اور ایک زیادہ طاقتور قبیلے کے زیر نگیں پابہ زنجیر کر دیا جاتا اور پھر انگلستان سے کہیں دور غلاموں کی حیثیت میں فروخت کر کے انسانی گندگی کے نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا۔ کوڑے مار کے کام کرایا جاتا اور کم مقدار میں معمولی غذا کھانے کو ملتی تو تمہاری نسل کا کیا باقی رہتا؟''

اس کے بعد نینسی کبھی انگلستان میں نہ رہ سکی اور تبھی سے اس نے مظلوم سیاہ فام نسل کے مقصد کو اپنا مشن بنا لیا۔ ایتھوپیا میں فوجی مداخلت کے دوران وہ عدیس ابابا گئی جہاں سے وہ امریکہ چلی گئی تا کہ سکاٹس برو کے ان سیاہ فام جوانوں کے لیے کچھ کر سکے جن پر نا کردہ جرائم کا الزام تھا۔

میری دوست نینسی 1969ء میں پیرس میں مر گئی۔ موت کے اچانک عذاب نے اس میں ایک عجیب تبدیلی پیدا کی۔ وہ اپنے ہوٹل کی لفٹ میں برہنہ نیچے چلی گئی جہاں پہنچ کر وہ فرش پر گر گئی اور اس کی خوبصورت نازک آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

زبان کے ساتھ جینا:

میں 1904ء میں پیدا ہوا تھا۔ 1921ء میں میری نظموں میں سے ایک نظم ایک رسالے میں شائع ہوئی۔ 1923ء میں میری پہلی کتاب چھپی اور یہ ''یادیں'' میں 1973ء میں لکھ رہا ہوں۔ اس تحریک دینے والے، بے چین کرنے والے لمحے کو پچاس برس کا عرصہ گزر گیا ہے۔ آپ تمام عمر زبان کے ساتھ، اسے اپنی فطرت ثانیہ بنائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہسپانوی زبان کے جاننے میں یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ بولی جانے والی زبان کی مختلف جہتیں ہوتی ہیں۔ لکھی جانے والی زبان غیر معمولی لچک اختیار کرتی ہے۔ زبان کو کپڑوں کی طرح یا اپنے جسم پر جلد کے مانند، اس کی آستینوں، اس کے خون اور پسینے کے دھبوں کی طرح استعمال کرنا ایک مصنف کا کمال فن ظاہر کرتا ہے۔ یہی اسلوب ہے۔

ہماری زبان کبھی کبھار ہم لاطینی امریکیوں کو ہسپانویوں سے جدا کر دیتی ہے، بہر حال کسی بھی چیز سے بڑھ کر یہ زبان کا نظریہ ہے جو اختلاف پیدا کرتا ہے۔ سروانتے (Cervantes) کے بعد ہسپانوی زبان سونے کی بن گئی۔ اس نے درباری شان و شوکت اختیار کر لی اور وہ وحشیانہ قوت گم کر دی جو اسے گونزالوڈی برکیو سے حاصل ہوئی تھی۔

نقادوں کو بھگتنا چاہیے:

نقاد اور اذہان ہیں جو دنیا کی نبض کو اس کی ناک سے محسوس نہیں کرتے حالانکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں انہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ دنیا کی ناک مستقبل میں سونگھتی ہے۔ کچھ نقاد خربوزوں یا کھیروں کی رینگنے والی بیلوں کے مانند ہوتے ہیں جن کی بڑھتی ہوئی ننھی ننھی شاخیں خوف سے سہمی ہوئی کہ وہ کسی چیز کو بھول جائیں گی، فیشن ایبل انداز میں جدید ترین آہ کو حاصل کرتی ہیں جبکہ ان کی جڑیں ماضی ہی میں دفن رہتی ہیں۔ میں حیران ہوں کہ رسالوں کے تبصرہ نگار میری مادی بہتری کے بارے میں زیادہ پریشان ہیں حالانکہ میرے ذاتی معاملات تنقید نگاروں کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے احساس ہے کہ اتفاقاً اگر میں خوش ہوں تو یہ بات بہت سوں کو ناراض کرتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اندرونی طور پر خوش ہوں۔ میرا ضمیر صاف اور میری ذہانت بے چین ہے۔ وہ نقاد جو شاعروں کے بہتر طرز زندگی سے خائف ہیں، ان کے لیے میرا مشورہ ہے کہ وہ اس بات پر فخر کریں کہ شاعری کی کتابیں چھپتی ہیں، بکتی ہیں اور یوں یہ مقصد پورا کرتی ہیں کہ نقادوں کی سوچ بچار کے لیے کچھ میسر آ سکے۔ انہیں خوش ہونا چاہیے کہ ادیبوں کو معاوضہ ملتا ہے اور کچھ اس قابل ہیں کہ وہ اپنی سچی محنت سے گزارہ کر سکتے ہیں۔ نقادوں کو صورت حال خراب کرنے کے بجائے اس سے فخر حاصل کرنا چاہیے۔ کچھ عرصہ پہلے جب میں نے اپنے بارے میں ایک جوان نقاد کی تحریر پڑھی تو مجھے احساس ہوا کہ باوجود ذہین ہونے کے اس کی ذہانت اسے فاش غلطیاں کرنے سے نہیں روک سکی۔ اس کے بقول میری شاعری مسرت کے باعث کمزور ہو گئی تھی۔ اس نقاد نے مجھے دکھوں کا نسخہ دیا تھا۔ اس کے نظریے کے مطابق اپنڈکس کے درد کو خوبصورت نثر تخلیق کرنی چاہیے۔

میری شاعری کو سنجیدہ تنقید اور ہتک آمیز جملوں کا سامنا کرنا پڑا جو ایک فطری سی بات ہے۔ یہ کھیل کا جزو ہے۔ اس حصے میں میری کوئی آواز نہیں، لیکن میری ایک رائے ضرور ہے اس نقاد کے لیے جو اہم باتوں پر زور دیتا ہے۔ میری رائے میری کتابوں میں ہے، میری تمام شاعری میں ہے۔ غیر دوستانہ گپ کے لیے بھی میری رائے ہے اور اس میں میری نہ ٹوٹنے والی تخلیقی کاوش موجود ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں اگر وہ ناکام ہے تو تم درست ہو۔ میرا غرور اس صناع کے مانند ہے جس نے برسوں اپنی صنعت میں ایک لگن اور محنت کے ساتھ کام کیا ہو۔

جب میں نے لکھنا شروع کیا تو شاعروں کی دو قسمیں تھیں۔ ان میں کچھ تو وہ تھے جو اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور پیسے کے بل بوتے پر اپنی عزت کرواتے تھے۔ شاعروں کا دوسرا خاندان ان لوگوں پر مشتمل تھا جو شاعری کے متشدد، آوارہ گرد، شراب خانوں کے اسیر، دلچسپ پاگل لوگ اور مصیبت زدہ، نیند میں چلنے والے تھے۔ ہاں، ان لوگوں کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے، وہ ادیب جو غلاموں کے مانند حکومتی دفتری مہر زدہ کاغذوں کے پہاڑ تلے دبے ہوئے یا اپنے افسران کے دہشت ناک خوف اور مذاق اڑانے کی ذلت کے زیر اثر رہتے۔

شاعری انسان کی اندرونی آواز ہے۔ اس آواز سے پرستش کا رواج مناجات اور مذاہب کا مواد فراہم ہوا ہے۔ شاعر نے ابتدائی زمانوں میں فطرت کے مناظر سے سامنا کیا ہے اور خود کو اپنے پیشے کی خاطر راہب کہلوایا ہے۔ اسی طرح اپنی شاعری کے دفاع کے لیے جدید عہد کا شاعر گلیوں میں اور عوام میں حاصل کئے ہوئے استحکام کو قبول کرتا ہے۔ آج کا سماجی شاعر ابھی تک زمانہ قدیم کے ادیبوں کے گروہ سے متعلق ہے۔ پرانے زمانے میں اس نے تاریکی سے عہد کیا تھا، آج اسے روشنی کی وضاحت کرنی چاہیے۔

شاعر جو حقیقت نگار نہیں، وہ مردہ ہے اور وہ شاعر جو محض حقیقت نگار ہے وہ بھی مردہ ہے۔ وہ شاعر جو صرف غیر منطقی ہے محض خود ہی اپنی شاعری کو سمجھے گا یا اس کی محبوبہ اسے سمجھ سکے گی، اور یہ بات افسوس ناک ہے۔ شاعر جو کلی طور پر منطقی ہے اسے ہر زید عمر بکر سمجھے گا، اور یہ بات بھی افسوس ناک ہے۔

شکستہ شیشہ:

ایک طویل عرصہ باہر رہنے کے بعد تین دن ہوئے میں والپاریزو میں اپنے گھر لوٹ آیا ہوں۔ گھر کا عجب نقشہ ہے۔ دیواروں میں بڑے بڑے شگاف زخموں کی طرح نمایاں تھے۔ زمین بوس محارات متانت کے ساتھ زلزلے کے وقت کا ریکارڈ بن گئے تھے۔ کتنی ہی خوبصورت چیزوں کو مٹیلڈی (میری بیوی) جھاڑو کی مدد سے اب فرش پر سے صاف کر رہی تھی۔ کتنی ہی نادر اشیاء زمین کے جھٹکوں کے باعث اب کوڑے کا ڈھیر بن چکی ہیں۔ ہمیں صفائی کرنا تھی۔ چیزوں کو از سر نو درست کرنا تھا اور سب کچھ پھر سے شروع کرنا تھا۔ ایسی بے ترتیبی میں کاغذ کا ڈھونڈنا مشکل کام ہے اور خود اپنے خیالات کو مجتمع کرنا کہیں اور بھی دشوار!

میرا آخری کام رومیو جولیٹ کا ترجمہ تھا اور ایک طویل نظم جسے قدیم بحر میں لکھا۔۔۔ ایک نظم جو کبھی مکمل نہ ہو سکی، محبت کی نظم!

یہ سچ ہے کہ دنیا خود کو اپنی جنگوں سے پاک نہیں کرتی، خون کو نہیں دھوتی، اپنی نفرت پر قابو نہیں پاتی۔ یہ سچ ہے! اس کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ ہم ایک حقیقت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ متشدد لوگ دنیا کے آئینے میں منعکس ہیں اور ان کے چہرے دیکھنے میں خوش گوار نہیں حتیٰ کہ خود ان کے اپنے لیے بھی نہیں، لیکن میں محبت کے امکان پر اب بھی یقین رکھتا ہوں۔ مجھے اعتماد ہے کہ انسانوں میں خون اور ٹوٹے ہوئے شیشے کے باوجود ایک باہمی تفہیم ضرور ہوگی۔

ستاروں کا موجد:

پیرس کے ہوٹل میں ایک شخص اپنے کمرے میں سو رہا تھا لیکن وہ ایک ناقابل علاج، رات کا الو تھا۔ جب میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ اس وقت دوپہر کے بارہ بجے ہیں اور وہ شخص ابھی تک سو رہا ہے تو اس بات پر قطعاً حیران نہ ہوں۔

اسے جاگنا ہوگا۔ اس کے بائیں سمت کی دیوار گرا دی گئی ہے، پھر اس کے سامنے والی دیوار گر گئی۔ یہ بمباری نہیں تھی۔ سامنے تازہ بنے گڑھوں سے مونچھوں والے مزدور کدالیں ہاتھوں میں لیے سامنے آئے اور خوابیدہ شخص پر طنز کرنے لگے: ''آؤ ہمارے ساتھ مشروب پیو۔''

شیمپین کی بوتل کھولی گئی۔ میرا اپنے سینے پر سہ رنگی پٹی لگائے آ گیا۔ موسیقی کا شور اٹھا۔۔۔ مارسیلز کی دھنیں! ایسی بے تکی باتوں کے پیچھے کیا مقصد تھا؟ بس پیرس کی زیر زمین ریلوے میٹرو کی زیر تعمیر دو لائنیں خوابیدہ شخص کے ہوٹل کے کمرے کے نیچے آپس میں مل گئی تھیں۔ جس لمحے اس شخص نے مجھے اپنی یہ کہانی سنائی، میں نے اسے اپنا دوست بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا یہ دوست، جو ایک عمدہ موسیقار تھا، وہ یہاں چلی میں مر گیا۔ چلی کے اس باشندے کا زندگی میں نام اکاریو تھا۔ مجھے اس شخص کے جنازے پر بولنے کا اعزاز حاصل ہے جس کی یاد کو دفن کرنا ممکن نہیں۔ میں نے کہا تھا: ''آج ہم ایک بے حد اچھے انسان کو سایوں کے سپرد کر رہے ہیں جس نے ہر روز ہمیں ایک ستارہ دیا تھا۔''

عظیم پال ایلوارڈ:

میرا دوست پال ایلوارڈ کچھ عرصہ ہوا مر گیا۔ وہ اتنا مکمل اور اس قدر مضبوط شخص تھا کہ اس کی کمی کو قبول کرنا میرے لیے مشکل ہی نہیں اذیت ناک بھی تھا۔ وہ گلابی رنگت کا نیلا ہٹ مائل نورمن تھا، دیکھنے میں سخت جان لیکن نازک! 1914ء کی جنگ میں دو بار گیس نے اسے نقصان پہنچایا تھا جس کے نتیجے میں زندگی بھر اس کے ہاتھ لرزتے رہے۔ پال ایلوارڈ کی شاعری کھڑکی کے شیشوں پر پڑنے والی بہار کی بارش کی طرح صاف اور شفاف تھی۔ اسے ایک غیر سیاسی شخص تصور کیا جا سکتا تھا، ایک ایسا شاعر جسے سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا۔

فرانس کے عوام اور ان کی جدوجہد کے ساتھ اس کے گہرے روابط تھے۔ پال ایلوارڈ بے حد سخت انسان تھا، ایک قسم کا فرانسیسی مینار جس میں جذباتی لچک بھی ہو۔ اس کی بلند قامت شخصیت سب پانی اور پتھر تھا جس پر انگور کی پرانی بیلیں چڑھ رہی تھیں اور ان پر پھول روشنی کے چہکوں اور شفاف گیتوں کے گھونسلے تھے۔ شفافیت! یہی وہ لفظ ہے جو اس کی شاعری کی پہچان ہے جو سخت چٹان کی طرح نقرئی تھی اور اس کی گنگناتی موج میں ٹھہرا ہوا پانی پرسکون تھا۔

سرزمین روس سے ایک خوفناک تحریر

نیلگوں میدان

ایک غلام کی سرگزشت، اسے اپنی
آئندہ نسلوں پر کوئی اختیار نہ تھا

میخائل شولوخوف/ وجاہت مسعود

میں اور دادا ذاکر ڈان کے کنارے ایک پہاڑی پر سیاہ خار جھاڑی کے نیچے لیٹے ہیں۔ گرمی کی شدت سے ڈان بالکل خشک ہو رہا ہے۔ ایک بھوری پتنگ بادلوں کی ٹکڑیوں کے قریب ڈول رہی ہے۔ جھاڑی پرندوں کے گرے ہوئے پروں سے اٹی پڑی ہے مگر اس کے پتے دھوپ کو روکنے میں مکمل طور پر ناکام ہیں۔ حدت سے میرے کان سنسنا رہے ہیں۔ بل کھائے دریا کے موجیں مارتے پاٹ پر نظر ڈالتے ہوئے اور پھر پاس ہی جھریوں بھرے تربوزوں کو دیکھ کر حلق میں یہ گاڑھا تھوک آتا ہے کہ جسے خشکی کے مارے تھوکا بھی نہ جا سکے۔ نیم خشک جوہڑ کے کیچڑ میں بھیڑیں ایک دوسرے میں گھسی بیٹھی ہیں۔ وہ تھکاوٹ سے دوہری ہوتی ٹانگوں کو جھکائے، اپنی جھبری دموں کو ہلاتی گردوغبار میں چھینکیں مار رہی ہیں۔ جوہڑ سے پرے بند کے قریب ایک ہٹا کٹا مینڈھا پچھلی ٹانگیں زمین پر بچھائے زرد رنگ کی ایک میلی کچیلی بھیڑ کے تھن جھنجوڑ رہا ہے۔ وقفے وقفے سے وہ پیچھے ہٹ کر لیوے میں سینگ مارتا ہے جس سے غریب ماں بلبلا کر پشت کو مزید خم دیتی ہے کہ زیادہ دودھ اس کے حلق میں پہنچ سکے۔ یہاں سے بے چاری بھیڑ کی آنکھوں میں جھلکتی اذیت صاف دکھائی دیتی ہے۔

میرے پاس لیٹے دادا ذاکر کسمسا کر اٹھ بیٹھے ہیں۔ اپنی اونی قمیص اتار کر آنکھوں کے قریب لاتے ہیں اور غور سے اسے دیکھتے ہوئے اس پر ہاتھ پھیرتے ہیں جیسے اس کی تہوں میں کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ دادا اس برس ستر سال کے ہو جائیں گے۔ ان کی ننگی پشت پر جھریوں کا جال بچھا ہے اور کندھوں کی نوکیلی ہڈیاں کھال میں سے جھانک رہی ہیں مگر ان کی آنکھیں ابھی تک نیلی اور جوانی سے بھرپور ہیں۔ کڑ بڑی کمان بھنوؤں کے نیچے ان کی نگاہوں میں تیر کی سی کاٹ ہے۔

انہوں نے اپنی کھردری اور رعشہ زدہ انگلیوں میں بڑی مشکل سے ایک جوں پکڑ رکھی ہے، کچھ دیر نرمی سے پکڑنے کے بعد وہ اسے ہاتھ بڑھا کر زمین پر چھوڑ دیتے ہیں۔ انگشت شہادت سے ہوا میں صلیب کا نشان بنایا اور بھاری آواز میں بولے:

''لو! اب چلتی پھرتی نظر آؤ، زندہ رہنا چاہتی ہو نا! میرا بھی یہی خیال ہے مگر تم نے میرا لہو خوب چوسا۔''

کھانستے ہوئے اور حلق صاف کرتے ہوئے بڑے میاں نے دوبارہ اپنی قمیص پہنی اور سر اونچا کر کے لکڑی کی صراحی سے نیم گرم پانی پینے لگے۔ ہر گھونٹ کے ساتھ ان کی ٹھوڑی کے لٹکے ہوئے گوشت میں حرکت کرتا گلے کا کنٹھ صاف نظر آتا ہے۔ پانی کے قطرے بہہ کر ان کی داڑھی بھگو رہے ہیں اور جھکے ہوئے زعفرانی پپوٹے دھوپ میں سرخ ہو رہے ہیں۔

صراحی ہٹا کر وہ کن اکھیوں سے مجھے دیکھتے ہیں۔ مجھے بھی اپنی طرف دیکھتا پا کر انہوں نے ہونٹ بھینچ لئے اور میدان پر نظریں جما دیں۔

وادی کا دوسرا کنارا چمکتے ہوئے غبار میں جلتا دکھائی دیتا ہے۔ جھلسی ہوئی زمین سے ٹکرا کر آتی ہوا میں جنگلی جھاڑیوں کی شہد جیسی

خوشبو بسی ہے۔ کچھ دیر بڑے میاں خاموش رہے پھر گدڑیوں والا
آنکڑا ہٹاتے ہوئے تمباکو سے بدرنگ ہوتی انگلی میری طرف ہلائی
اور بولے:

''میدان کے پار پاپلر کے ان درختوں کو دیکھ رہے ہو۔ یہ ٹوپو
لیفکا ہے۔ کبھی یہ ٹومی لِن کا تعلقہ تھا۔ اس گاؤں کو بھی ٹوپولیفکا کہتے
تھے۔ گاؤں کے سبھی لوگ غلام تھے۔ میرا باپ بھی انہی میں سے
ایک تھا۔ مرتے دم تک وہ الیفگر اف ٹومی لِن کا گاڑی بان رہا۔ میں
چھوٹا سا تھا تو میرا باپ بتایا کرتا تھا کہ مالک نے اسے اپنے ہمسائے

سے ایک پالتو سارس کے بدلے خریدا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد میں نے اس کی جگہ لے لی۔ مالک خود ساٹھ برس کا ہو رہا تھا مگر یہ ہٹا کٹا اور زوردار جوان، جوانی میں شہنشاہ کے محافظ دستے میں رہا تھا۔ ریٹائر ہو کر ادھر ڈان پر آ بسا۔ کاسکوں نے ڈان پر خاندانی زمین ہتھیا لی تھی مگر معاوضے کے طور پر سارتوف صوبے میں چھ ہزار ایکڑ زمین دے دی۔ ٹومی لن نے یہ زمین سارتوف میں ٹھیکے پر دے رکھی تھی اور خود ٹوپولیفکا میں ہی رہتا تھا۔

عجیب شخص تھا۔ ہمیشہ جارجیا کا اونی چغہ پہنے رہتا۔ کمر بند سے خنجر لٹکا رہتا۔ سیر کرنے جاتا تو ٹوپولیفکا سے باہر نکلتے ہی پکار کر مجھ سے کہتا:

''اے کم بخت! گھوڑے کیسی مریل چال چل رہے ہیں۔''

میں چابک گھماتا اور گھوڑے ایسا سرپٹ بھاگتے کہ مارے سردی کے آنکھوں سے بہتا پانی خشک ہونے میں نہ آتا۔ آن کی آن میں ہم سڑک کے پار برساتی نالے پر پہنچ جاتے۔ موسم بہار میں نالا پانی سے بھرا رہتا گاڑی کے اگلے پہیے تو آسانی سے گزر جاتے مگر پچھلے پہیے چٹخنے لگتے۔ کوئی آدھ میل آگے جا کر وہ پھر چلاتا: ''واپس چلو۔'' اور میں پھر سے برساتی نالے میں گاڑی ڈال دیتا۔ نالے میں سے دو تین بار گزرنے سے یا تو کوئی سپرنگ ٹوٹ جاتا یا پہیہ اتر جاتا۔ مالک غراتا ہوا گاڑی سے اترتا اور پیدل گھر کی طرف چل پڑتا۔ میں بھی پیچھے پیچھے گھوڑوں کو ہنکائے چلا آتا۔

اس کی ایک اور تفریح بھی تھی۔ ہم گھر سے دور نکل آتے تو میرے کوچ بکس کے پاس آ کر مجھ سے چابک لے لیتا اور چلا کر کہتا:

''ہاں بھئی، ذرا اس اگلے والے کو اوپ انجن تو کرو۔'' میں پوری قوت سے اگلے گھوڑے کو تیز بھگاتا حتیٰ کہ گاڑی کے بانس گولی کی سی رفتار سے ہوا کا سینہ چیرنے لگتے۔ مالک اس دوران میں پچھلے گھوڑوں پر چابک برساتا رہتا۔ ان دنوں ایک گاڑی میں تین گھوڑے جوتے جاتے تھے۔ پچھلے گھوڑے ڈان کے اصیل گھوڑے تھے۔ ان کی سانپ جیسی گردنیں نیچے جھکی ہوتیں گویا زمین کو کاٹ کھانا چاہتے ہوں۔

مالک ایک ہی گھوڑے پر چابک برساتا رہتا یہاں تک کہ غریب جانور کی تھوتھنی جھاگ سے بھر جاتی۔۔۔ پھر وہ اپنا خنجر نکالتا اور آگے جھک کر جانور پر ایسے گھاؤ لگاتا گویا استرے سے بال کاٹ رہا ہو۔ گھوڑا کوئی پانچ گز اچھل کر دوبارہ زمین پر آتا۔ اس کے نتھنوں سے خون ابل رہا ہوتا۔۔۔ اور پھر وہ دوسرے گھوڑے کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتا اس دوران میں اگلا گھوڑا بھاگتے بھاگتے بے دم ہو جاتا مگر مالک پر کوئی اثر نہ ہوتا البتہ اس سارے کھیل سے اس کا مزاج قدرے بحال ہو جاتا اور لہو کی سرخی اس کے گالوں میں دوڑنے لگتی۔

سیدھے سبھاؤ سے تو وہ کوئی کام کر ہی نہیں سکتا تھا۔ آج گاڑی کہیں ٹکرا دی تو کل گھوڑے ہلاک کر ڈالے اور پھر قدم مارتے چلے آ رہے ہیں گھر کو۔۔۔ بڑا بزدل شخص تھا۔۔۔ خیر اب تو قصہ ہی ختم ہوا۔ اچھی بری سب اوپر والے کے سامنے ہے۔

مالک میری گھر والی کے ساتھ چھیڑ خانی بھی کیا کرتا تھا وہ مالک کی لونڈیوں میں سے ایک تھی۔ کئی بار جب وہ گھر لوٹتی تو اس کی چولی تار تار ہوتی اور رو رو کر آنکھیں سوجی ہوتیں۔ سینے پر جگہ جگہ خراشیں اور دانتوں سے کاٹنے کے نشان ہوتے۔۔۔ خیر ایک شام مجھے مالک نے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے شہر بھیجا۔ میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اصل میں مالک کی نیت خراب ہو رہی تھی۔ سو میں راستے ہی میں رک گیا اور اندھیرا ہونے پر پچھلی طرف سے تعلقے میں داخل ہوا۔ باغ میں گھوڑے باندھے اور چابک اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ میں نے دروازہ کھولا اور جان بوجھ کے موم بتی جلائے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ بستر پر سے کچھ کھٹ پٹ کی آواز آ رہی تھی۔ جیسے ہی مالک بستر پر سے اترا میں نے اسے چابک پر رکھ لیا۔ چابک کے سرے پر سیسہ لگا ہوا تھا۔ وہ اندھیرے میں کھڑکی کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک اور چابک ماتھے پر جڑا اور وہ کھڑکی سے کود بھاگا۔ میں نے بیوی کو بھی ایک دو چابک لگائے اور بستر پر لیٹ گیا۔

کوئی پانچ چھ دن گزر گئے۔ ہمیں کسی کام سے گاؤں جانا پڑا۔ میں گاڑی ٹھیک کر رہا تھا۔ مالک نے میرا چابک اٹھا لیا اور اسے انگلیوں سے ٹٹولنے لگا آخر اس نے چابک کے سرے پر لگے سیسے کو پا لیا اور بولا: ''ابے سور کے جنے! یہ چابک میں سیسہ تو نے کس لئے لگا رکھا ہے؟''

''آپ ہی نے تو کہا تھا!'' میں نے جواب دیا۔

برساتی نالے تک وہ بغیر کوئی الفاظ منہ سے نکالے بیٹھا رہا۔ بس دانتوں سے سیٹی بجاتا رہا۔ میں نے آنکھ بچا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے ماتھے پر بالوں کی لٹ ڈال رکھی تھی اور ٹوپی کو خوب آگے کی طرف جھکایا ہوا تھا۔ دو سال بعد اس پر فالج گر گیا۔ ہم اسے بڑے ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر بلائے گئے۔ جب وہ لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو مالک فرش پر پڑا تھا اس کا چہرہ سیاہ ہو رہا تھا۔ اس نے جیب سے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں اور انہیں ڈاکٹروں کی طرف اچھالتے ہوئے بولا: ''سورو! مجھے ٹھیک کر دو۔ میں تمہیں

اپنا سب کچھ دے دوں گا۔"

مگر وہ اپنی دولت اپنے فوجی افسر بیٹے کے لئے چھوڑ کر مر گیا۔ خدا اس پر رحم کرے۔ اس کا بیٹا جب چھوٹا سا تھا تو کتے کے زندہ پلوں کی کھال اتروا کر انہیں باغ میں دوڑایا کرتا تھا۔ عین مین باپ پر گیا تھا مگر بڑا ہو کر اس نے یہ حرکتیں چھوڑ دیں۔ تیغ کی طرح لمبا اور پتلا تھا۔ عورتوں کی طرح اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے رہتے تھے۔ ناک پر سونے کی عینک ہوتی جسے وہ چھوٹی سی ڈوری سے باندھے رکھتا۔ جرمنوں کے ساتھ جنگ کے دوران وہ سائبیریا میں قیدیوں کا نگران تھا۔ انقلاب کے بعد وہ پھر اسی علاقے میں آن بسا۔ میرے پوتے جوان ہو رہے تھے۔ ان کا باپ چل بسا تھا۔ میں نے بڑے پوتے سیمون کی شادی کر دی تھی مگر چھوٹا انکئی ابھی کنوارا ہی تھا۔۔۔ بہار کے موسم میں ایک اور انقلاب ہو گیا۔ ہمارے لوگوں نے مالک کو تعلقے سے بھگا دیا اور اسی دن سیمون نے کسانوں کو آمادہ کر لیا کہ مالک کی جائیداد پر قبضہ کر لیا جائے۔ سو یہی ہوا۔ حویلی میں جس کے ہاتھ جو شے لگی اٹھا کر سنک لیا۔ زمین کے ٹکڑے بانٹ لئے گئے اور ہل چلائے جانے لگے۔ کوئی ہفتہ بھر گزرا ہو گا افواہ پھیل گئی کہ مالک کاسکوں کی فوج لئے سب کو قتل کرنے چلا آ رہا تھا۔ گاؤں والے مل بیٹھے۔ دو چھکڑے اسٹیشن سے اسلحہ منگوانے بھیج دیئے گئے۔ ایسٹر کے ہفتے ہمیں سرخ محافظوں کی طرف سے اسلحہ مل گیا۔ ٹوپولیفکا سے لے کر بڑے تالاب تک خندقیں کھد گئیں۔

وہ کھائی سے پرے جھاڑیاں دیکھ رہے ہو نا! ٹوپولیفکا والے یہاں مورچے بنا کر بیٹھ گئے۔ میرے دونوں لڑکے سیمون اور انکئی بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ صبح کے وقت عورتیں انہیں کھانا پہنچا آئیں۔ سورج ابھی پہاڑی تک بلند نہ ہوا تھا کہ گھوڑ سوار آن پہنچے۔ چمکتی تلواریں تولتے ہوئے انہوں نے گھیرا ڈال لیا۔ میں اپنے صحن سے دیکھ رہا تھا۔ سفید گھوڑے پر سوار افسر نے تلوار لہرائی اور بوری سے نکلتے مٹر کے دانوں کی طرح پہاڑی سے نیچے آنے لگے۔ میں مالک کے سفید گھوڑے کی چال پہچانتا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ مالک خود فوج کی کمان کر رہا تھا۔ خیر ہمارے لوگوں نے دو دفعہ کاسکوں کو پسپا کیا مگر پھر وہ چکمہ دے کر پیچھے سے آئے۔۔۔ اور قتل عام شروع ہو گیا۔ سورج ڈھلنے تک سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں گلی میں نکل آیا۔ گھوڑ سوار قیدیوں کا ایک جتھا لئے تعلقے کی طرف جا رہے تھے۔ میں بھی لاٹھی ٹیکتا پیچھے پیچھے ہو لیا۔

صحن میں ہمارے لوگ ریوڑ کی طرح ایک طرف بیٹھے تھے، ارد گرد کاسکوں کا پہرا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنے پوتوں کے بارے میں پوچھا۔ دونوں وہیں موجود تھے۔ میں ان سے بات کر رہا تھا کہ مالک احاطے کی سیڑھیاں چڑھتا نظر آیا۔

"داداذاکر! یہ تم ہی ہو نا" وہ مجھے دیکھتے ہی پکار کر بولا۔

"ہاں مائی باپ!"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں سیڑھیاں چڑھا اور اس کے سامنے جھک گیا۔

"میں اپنے پوتوں کی جان بخشی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ مالک رحم کرو۔ میں نے ساری زندگی آپ کے باپ کی، خدا اس کی مغفرت کرے، خدمت کی ہے۔ مالک، میرے بڑھاپے پر رحم کرو۔"

"سنو، داداذاکر!" اس نے جواب دیا۔ "تم نے میرے باپ کی خدمت کی ہے۔ میں اس بات کا احترام کرتا ہوں مگر میں تمہارے پوتوں کو معاف نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کھلی بغاوت کی ہے۔ بڑے میاں یہ تو کرنی کا پھل ہے۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے پیروں پر سر رکھ دیا: "رحم کرو، مالک۔ میں نے ان ہاتھوں سے تمہیں کھلایا ہے۔ مجھے برباد نہ کرو۔ میرے سیمون کا ایک دودھ پیتا بچہ ہے۔"

اس نے خوشبودار سگریٹ سلگایا اور دھواں پھینکتے ہوئے بولا:

"اچھا جا کر ان حرام زادوں کو میرے کمرے میں لاؤ۔ اگر وہ معافی مانگ لیں تو ٹھیک ہے میں انہیں چار جوتے لگواؤں گا اور اپنے سپاہیوں میں بھرتی کر لوں گا شاید وہ اپنی نمک حرامی کا دھبہ دھو سکیں۔"

میں بھاگتا ہوا اپنے پوتوں کے پاس پہنچا اور ان کے بازو کھینچتا ہوا چلایا: "جاؤ اور مالک سے معافی مانگ لو۔ حرام خورو۔ مالک جب تک معاف نہ کرے زمین سے سر نہ اٹھانا۔"

مگر سیمون نے سر اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا بس پنجوں کے بل بیٹھا چھوٹی سی چھڑی سے زمین کھرچتا رہا۔ میرے انکئی نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور تڑخ کر بولا: "جاؤ اور اپنے مالک سے کہہ دو، داداذاکر ساری عمر گھٹنوں کے بل جھکا رہا۔ اس کے بیٹے نے بھی زندگی بھر یہی کیا مگر اس کے پوتے اب یہ نہیں کریں گے۔ جاؤ اسے بتا دو!"

"تو تم نہیں جاؤ گے۔ کتیا کے بچے۔"

"نہیں میں نہیں جاؤں گا۔"

"ابے بدمعاش، تمہارا کیا ہے، تم جیو یا مرو مگر اپنے ساتھ سیمون کو کس لئے گھسیٹتے ہو۔ اس کی بیوی اور بچے کو کون سنبھالے گا؟"

لکڑی سے زمین کریدتے ہوئے سیمون کے ہاتھ کانپنے لگے مگر اس نے ایک لفظ نہیں بولا۔ بس مٹی کا مادھو بنا بیٹھا رہا۔

''جاؤ دادا! ہمارا حوصلہ نہ توڑو۔'' انگئی نے منت کی۔

''میں نہیں جاؤں گا۔ لعنت ہو تم پر۔ اگر سیمون کو کچھ ہو گیا تو انیسا خود کو مار ڈالے گی۔''

سیمون کے ہاتھ میں پکڑی لکڑی ٹوٹ کر زمین پر جا گری۔ میں انتظار کرتا رہا مگر وہ اب بھی خاموش رہا۔

''سیمون، میرے بیٹے، ہوش میں آؤ۔ میرے سہارے! مالک کے پاس چلے چلو۔''

''ہم ہوش میں آ چکے ہیں، اس لئے مالک کے پاس نہیں جائیں گے۔ تم جاؤ اور ماتھا رگڑو۔'' انگئی نے چمک کر کہا۔

''تو تم مجھے مالک کے سامنے جھکنے کا طعنہ دے رہے ہو۔ خیر میں بوڑھا ہو چکا اب ماں کی چھاتی کی بجائے مالک کا چابک چوستا ہوں۔ میں تو اپنے پوتوں کے سامنے بھی ماتھا رگڑ سکتا ہوں۔''

اور میں وہیں گھٹنوں کے بل ان کے سامنے جھک گیا اور منت کرنے لگا۔ ارد گرد بیٹھے لوگوں نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا گویا مجھے دیکھ نہیں رہے۔

''چلے جاؤ، دادا، چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔'' انگئی نے چلا کر کہا اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور آنکھیں رسی سے بندھے بھیڑیے کی طرح وحشی ہو رہی تھیں۔

میں واپس مڑ کر مالک کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کو اس زور سے پکڑا کہ اگر وہ چاہتا بھی تو مجھے ٹھوکر مار کر پرے نہ ہٹا سکتا۔

میرے بازو سن ہو رہے تھے اور منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔

''کہاں ہیں تمہارے پوتے؟'' اس نے پوچھا۔

''مالک وہ ڈر رہے ہیں۔۔۔''

''ہوں۔۔۔ تو وہ ڈر رہے ہیں۔'' مزید کوئی لفظ کہے بنا اس نے زور سے میرے منہ پر ٹھوکر ماری اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

دادا ذاکر او بھی سانسیں لینے لگے۔ ان کا چہرہ چرمرا کر رہ گیا۔ رنگ پیلا پڑ گیا بڑی مشکل سے انہوں نے اپنی سسکی روکی اور ہاتھ سے خشک ہونٹ پونچھتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ جوہڑ سے پرے ایک چیل نے پر پھیلا کر گھاس پر غوطہ لگایا اور ایک سفید کونج کو پنجوں میں دبائے اوپر اٹھ گئی۔ کونج کے پر برف کے گالوں کی طرح ہوا میں بکھر گئے۔ سبز گھاس پر گرتے سفید پر اور بھی تابناک نظر آتے تھے۔

دادا ذاکر نے ناک صاف کیا اور اونی قمیص کے دامن سے انگلیاں پونچھتے ہوئے پھر سے بولنے لگے:

''میں مالک کے پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا سیڑھیوں تک گیا۔ انیسا اپنے بچے کو بازوؤں میں اٹھائے چلی آ رہی تھی۔ وہ کسی کونج کی طرح ڈولی اور اپنے خاوند کے بازوؤں میں گر گئی۔

مالک نے سارجنٹ میجر کو بلا کر سیمون اور انگئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا۔ سارجنٹ میجر اور چھ کاسک دونوں کو لے کر باغ کی طرف چل پڑے۔ میں بھی پیچھے پیچھے تھا۔ انیسا نے اپنے بچے کو وہیں صحن میں پٹخا اور مالک کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ سیمون سب سے آگے چل رہا تھا۔ اصطبل کے سامنے وہ زمین پر بیٹھ گیا۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' مالک نے پوچھا۔

''میرا جوتا کاٹ رہا ہے۔ اسے اتار رہا ہوں۔'' سیمون نے مسکراتے ہوئے کہا

اس نے جوتے اتار کر میری طرف بڑھا دیئے اور بولا: ''لو اور انہیں پہنو اور خوش رہو ان میں دوہرا تلا لگا ہوا ہے۔''

میں نے جوتے پکڑ لئے اور ہم لوگ چلتے رہے۔ جنگلے کے پاس پہنچ کر کاسکوں نے انہیں کھڑا کر دیا اور بندوقیں بھرنے لگے۔ مالک قریب ہی کھڑا ناخن تراش سے ناخن کاٹ رہا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ برف کی طرح سفید تھے۔

''مالک مجھے ان کے کپڑے لے لینے دو۔'' میں نے کہا۔

''اچھے کپڑے ہیں۔ ہم انہیں پہن لیں گے۔''

''ہاں! ہاں! اتروا لو۔''

چنانچہ انگئی نے اپنی پتلون اتار کر سیدھی کی اور جنگلے پر لٹکا دی پھر اس نے جیب سے سگریٹ کا ٹکڑا نکال کر جلایا اور دھوئیں کے گولے بناتا ہوا ایک ٹانگ آگے بڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ زمین پر تھوکتا رہا۔ سیمون نے بھی اپنے کپڑے اتار ڈالے حتیٰ کہ اونی پتلون بھی اتار دی مگر وہ اپنی ٹوپی اتارنا بھول گیا۔ شاید اسے خود بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہا تھا۔۔۔ میرا یہ حال تھا کہ ابھی جسم حرارت سے پھنک رہا ہے اور ابھی ٹھنڈے پسینے آ رہے ہیں۔ میں نے اپنا ماتھا چھو کر دیکھا پسینے کے قطرے چشمے کے پانی کی طرح ٹھنڈے تھے۔ سیمون کی چھاتی گھنے بالوں سے ڈھکی تھی اور وہ سر پر ٹوپی لئے الف ننگا کھڑا تھا۔ انیسا نے اس کی طرف دیکھا اور روتی پیٹتی اس سے یوں چمٹ گئی جیسے برگد سے بیل لپٹ جاتی ہے۔ سیمون نے اسے پرے دھکیلا:

''دفان ہو جاؤ، ہوش میں آؤ۔ کیا کر رہی ہو؟ تمہیں نظر نہیں آتا میں ننگا کھڑا ہوں، کم بخت شرم کرو!''

انیسا کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ چلا رہی تھی: ''ہم دونوں کو گولی مار دو۔'' مالک نے ناخن تراش جیب میں رکھتے ہوئے پوچھا: ''تو پھر چلائیں گولی۔''

''گولی چلاؤ۔ حرام کی اولاد۔'' وہ مالک کی طرف دیکھتے ہوئے چلائی۔

''اسے خاوند کے ساتھ باندھ دو۔'' مالک نے حکم دیا۔

انیسا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اس نے پیچھے ہٹنا چاہا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ کاسکوں نے قہقہے لگاتے ہوئے اسے رسی سے سیمون کے ساتھ باندھ دیا۔ بے وقوف عورت زمین پر گر گئی اور سیمون بھی اس کے ساتھ ہی نیچے گر گیا۔۔۔ مالک ان کے پاس آیا اور دانت بھینچ کر بولا: ''غالباً اپنے بچے کی خاطر تم معافی مانگنا چاہو گے؟''

''ہاں!'' سیمون نے سسکی لی۔

''خوب! مگر اب مجھ سے معافی مانگنے کا وقت گزر چکا۔ اب خدا سے معافی مانگو۔''

انہوں نے دونوں کو زمین پر پڑے پڑے گولی مار دی۔ جب انکئی کو گولی لگی تو وہ فوراً زمین پر گرنے کے بجائے اپنے قدموں پر تھوڑا سا ڈولا۔ اس کے گھٹنے جھک گئے اور وہ بل کھا کر چت گر گیا۔ مالک نے اس کے پاس جا کر بڑی نرمی سے کہا: ''اگر زندہ رہنا ہے تو معافی مانگ لو۔ میں تمہیں پچاس کوڑے لگوا کر محاذ کے لئے بھرتی کرا لوں گا۔'' انکئی نے تھوکنا چاہا تھوک اس کی داڑھی پر بہہ نکلا۔ غصے سے اس کا رنگ سفید پڑ گیا مگر سب بے کار۔۔۔ تین گولیاں اس کے جسم سے پار ہو چکی تھیں۔

''اسے سڑک پر پھینک دو'' مالک نے حکم دیا۔ کاسکوں نے اسے اٹھایا اور جنگلے سے پرے لے جا کر سڑک پر رکھ دیا۔ عین اسی وقت دو توپیں لئے گھوڑ سوار کاسکوں کی ایک کمپنی ٹوپولیفکا سے نکلی۔ مالک کسی جوان مرغ کی طرح اچھل کر جنگلے پر چڑھ گیا اور چلایا۔

''ابے سرپٹ دوڑو، [illegible] سے بچنے کی کوشش نہ کرو اس کے اوپر سے گزرو۔''

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں سیمون کے جوتے اور کپڑے اٹھائے کھڑا تھا مگر میری ٹانگیں مجھے اٹھانے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ میں وہیں ڈھے گیا۔۔۔ تم جانو! گھوڑے بھی خدا کے حکم سے چلتے ہیں کسی گھوڑے نے میرے انکئی پر قدم نہیں رکھا۔ وہ اسے پھلانگتے ہوئے گزر گئے میں جنگلے سے چمٹا کھڑا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور دانت بھینچ کر رہ گئے تھے۔ توپ کے پہیے انکئی کے اوپر سے گزر گئے۔ خشک روٹی کی طرح ہڈیاں کڑکڑانے لگیں اور پھر کنڈوں کی طرح پس کر رہ گئیں۔۔۔ میں نے سوچا درد سے مر جائے گا مگر اس نے تو آواز بھی نہیں نکالی۔ بس زمین سے مٹھی بھر خاک اٹھائی اور منہ میں ٹھونس لی۔۔۔ مٹی چباتے ہوئے وہ بغیر آنکھ جھپکائے مالک کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں آسمان کی طرح صاف اور چمکدار تھیں۔

خیر اس دن ہمارے مالک ٹومی لن نے بتیس آدمی گولیوں سے بھون ڈالے صرف انکئی اپنی ہمت کے بل پر زندہ بچ رہا۔

دادا ذاکر نے ندیدوں کی طرح صراحی سے پانی پیا۔ مرجھائے ہوئے ہونٹ پونچھے اور آہستہ سے بولے:

''جو ہوا سو ہوا۔ اب تو بس وہ خندقیں باقی ہیں جو ہمارے لوگوں نے تھوڑی سی زمین جوتنے کے لئے کھودی تھیں۔ خندقوں میں گھاس اور جڑی بوٹیاں اگ آئی ہیں۔۔۔ انکئی کی ٹانگیں کٹوانا پڑی تھیں۔ وہ اب ہاتھوں کے بل گھسٹ گھسٹ کر چلتا ہے۔

سردیوں میں مویشی دریا پر پانی پینے جا رہے ہوں تو وہ گلی کے بیچ میں ہاتھ ہوا میں کھڑا کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ بیل اسے دیکھ کر مارے خوف کے گرتے پڑتے برف کی طرح بھاگ نکلتے ہیں اور وہ قہقہے لگانے لگتا ہے۔

صرف ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ بہار کا موسم تھا۔ کمیون کا ٹریکٹر ہل چلانے جا رہا تھا وہ بھی اس پر بیٹھ لیا۔ میں کچھ فاصلے پر بھیڑیں چرا رہا تھا۔ میں نے دیکھا انکئی ہل چلائی ہوئی زمین پر گھسٹتا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا یہ کیا کر رہا ہے؟۔۔۔ خیر انکئی نے ادھر ادھر دیکھا اور اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا۔ ہل سے اکھڑا ہوا ایک ڈھیلا اٹھایا اور اسے ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے چومنے لگا ۔۔۔۔ وہ عمر کے پچیسویں سال میں ہے اور اب کبھی ہل نہیں چلا سکے گا بس یہ بات اسے اداس کر دیتی ہے۔''

دھواں دھواں شام میں نیلگوں میدان اونگھ رہا تھا۔ تاریک ہوتی جھاڑیوں میں شہد کی مکھیاں دن کا آخری شہد جمع کر رہی تھیں۔ رنگ بدلتی گھاس کی پتیاں بڑی شان سے ہوا میں لہرا رہی تھیں بھیڑوں کا گلہ آہستہ آہستہ پہاڑی سے اتر کو ٹوپولیفکا کی طرف جا رہا تھا۔ دادا ذاکر اپنی چھڑی سے جھکے خاموشی سے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ سڑک پر بھی دھول میں دو نشان صاف نظر آ رہے تھے ایک نشان تو کسی بھیڑیئے کا تھا جو لمبے لمبے قدم اٹھاتا یہاں سے گزرا تھا اور ترچھی پٹیوں والا دوسرا نقش ٹوپولیفکا کے ٹریکٹر نے ڈالا تھا۔

گھاس پھوس سے اٹی متروکہ کچی سڑک کے پاس دونوں نشان جدا ہو گئے۔ بھیڑیئے کے قدموں کے نشانات سڑک سے اتر کر جھاڑیوں میں غائب ہو گئے اور سڑک پر ایک ہی نقش نظر آنے لگا، گہرا اور باقاعدہ نشان جس سے جلے ہوئے پٹرول کی بو آ رہی تھی۔

امریکی ادب کا سوز و گداز

روشن گاہ

ذکر کچھ چاک جگر سینے کا سُن سُن اپنے
دیکھ کر زخم کو، میں دیکھوں ہوں ناخن اپنے

ارنسٹ ہیمنگوے / صغیر ملال

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ کیفے تقریباً خالی ہو گیا تھا۔ صرف ایک بوڑھا گاہک اب تک برآمدے میں بیٹھا تھا۔ برآمدے کے درخت کے اوپر بجلی کا بلب تھا جس کی روشنی سے بننے والے پتوں کے سائے بوڑھے کے وجود پر پھیلے تھے۔ دن کے وقت برآمدے اور سڑک پر دھول منڈلاتی تھی، لیکن رات کو اوس کے سبب، گھاس اور پودے نم آلود ہو گئے تھے۔ اور بوڑھا صاف فضا میں دیر تک بیٹھنا پسند کرتا تھا۔ کیفے کے اندر موجود دونوں ویٹرز جانتے تھے کہ بوڑھا نشے میں ہے، اور انہیں ڈر تھا کہ اگر اسے زیادہ نشہ چڑھ گیا تو وہ بغیر بل ادا کئے چل دے گا۔ یوں تو بوڑھا گاہک تھا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ مدہوشی میں وہ کیا کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں ویٹرز اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

''گزشتہ ہفتے اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔'' ایک ویٹر نے کہا۔

''کیوں؟'' دوسرے نے پوچھا۔

''کوئی وجہ نہیں تھی۔''

''تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''یہ بہت دولت مند ہے۔'' پہلا ویٹر فیصلہ کن انداز میں بولا۔

دونوں ویٹرز دروازے کے ساتھ لگے بیٹھے تھے اور مستقل برآمدے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ تمام میزیں خالی تھیں۔ بوڑھا پتوں کے سائے تلے بیٹھا تھا، اور پتے ہوا کے ساتھ مسلسل حرکت کر رہے تھے۔

بوڑھے نے اپنا خالی گلاس، میز سے ٹکرایا۔

نوجوان ویٹر اس کی بات سننے پتوں کے سائے میں چلا گیا۔

''کیا چاہیے؟''

بوڑھا کچھ دیر ویٹر کو دیکھتا رہا۔ ''ایک اور۔۔۔ برانڈی۔''

''تمہیں نشہ چڑھ جائے گا۔'' ویٹر نے کہا۔

بوڑھا بدستور اسے دیکھتا رہا۔ ویٹر کیفے کے اندر چلا گیا۔

''لگتا ہے ساری رات بیٹھے گا۔'' وہ اپنے ساتھی کے پاس پہنچ کر بڑبڑایا۔ ''مجھے تین بجے سے پہلے سونا نصیب نہیں ہوتا۔ کم بخت خودکشی میں کامیاب ہو جاتا تو اچھا تھا۔''

ویٹر نے یوں ہی بڑبڑاتے ہوئے برانڈی کی بوتل اٹھائی اور کیفے سے نکل کر ایک مرتبہ پھر پتوں کے سائے میں پہنچا۔ اس نے برانڈی سے بوڑھے کا گلاس بھر دیا۔

''تم خود کو مار ہی لیتے تو اچھا تھا۔'' ویٹر نے آہستہ سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ بوڑھا اونچا سنتا ہے۔

''۔۔۔اور ڈالو۔'' بوڑھے نے اپنی بات واضح کرنے کے لیے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔

اس مرتبہ ویٹر نے گلاس اتنا بھر دیا کہ تھوڑی سی برانڈی گلاس سے چھلک کر میز کی سطح داغ دار کر گئی۔

''شکریہ۔'' بوڑھے نے بغیر سر اٹھائے کہا۔

ویٹر کیفے میں واپس چلا گیا۔ وہ برانڈی کی بوتل الماری میں رکھ کر دوبارہ اپنے ساتھی کے پاس بیٹھ گیا۔

''اب وہ نشے میں ہے۔'' اس نے کہا۔

''وہ ہر رات نشے میں ہوتا ہے۔''

''اس نے خود کو مارنا کیوں چاہا تھا۔''

''مجھے کیا معلوم۔''

''طریقہ کیا تھا۔''

''گردن میں رسی ڈال کر۔''

''بچا کیسے۔''

''اس کی بھانجی پہنچ گئی تھی۔''

''اس کے پاس پیسے کتنے ہیں۔''

''بہت۔''

''اسی سال کا تو ہو گا۔''

''اتنا تو ہونا چاہیے۔''

''کاش اب یہ گھر چلا جائے۔ میں تین بجے سے پہلے نہیں سو پاتا۔ کیا مصیبت ہے۔''

''اس کو جاگنا پسند ہے۔''

''یہ اکیلا رہتا ہے۔ لیکن میں اکیلا نہیں ہوں۔ میری بیوی میرا انتظار کرتی ہے۔''

''ایک زمانے میں اس کی بھی بیوی تھی۔''

''اب اس کی بیوی ہوتی بھی تو اس کا کیا کر سکتی تھی۔''

''کیا کہہ سکتے ہیں۔ ممکن ہے بیوی کے ساتھ یہ خوش رہتا۔''

''اس کی بھانجی تو ہے جس نے اسے بچایا تھا۔''

''ہاں۔''

''میں کبھی بھی اتنا بوڑھا نہیں ہونا چاہوں گا۔ بوڑھا آدمی ایک مصیبت ہوتا ہے۔''

''سب کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ صاف ستھرا بوڑھا ہے۔ دیکھو اس وقت نشے میں ہے لیکن پھر بھی بغیر چھلکائے پی رہا ہے۔ دیکھو۔''

''دیکھ رہا ہوں۔ کاش یہ اب گھر جائے۔ اسے کسی کا خیال نہیں ہے۔''

بوڑھے نے سر اٹھایا اور کیفے کے اندرونی حصے کی طرف دیکھا۔ دونوں ویٹرز ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک نوجوان تھا، دوسرے کی عمر ڈھل رہی تھی۔

بوڑھے نے ایک مرتبہ پھر میز پر گلاس بجایا۔ ''برانڈی۔۔۔ ایک اور۔۔۔'' اس نے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

گھر جانے کے لئے بے چین ویٹر اس کے پاس آیا۔

''ختم۔'' اس نے نشے میں دھت بوڑھے کو سمجھانے کے لئے جملوں کی بجائے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بند۔ بس۔''

''۔۔۔ایک اور۔۔۔'' بوڑھے نے دوہرایا۔

''ختم، بس۔'' ویٹر نے گلاس اٹھا کر میز کی سطح گیلے کپڑے سے پونچھتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔

بوڑھا کھڑا ہو گیا۔ جیب سے چمڑے کا بٹوا نکال کر اس نے لہراتے جسم کے ساتھ پیسے گنے، بل ادا کیا اور ایک چھوٹا نوٹ بخشش کے طور پر الگ سے ویٹر کے ہاتھ میں رکھ کر باہر کی جانب چل دیا۔

ویٹر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ لڑکھڑانے کے باوجود اعتماد سے چلتا بوڑھا آدمی ضعیف اور اکیلا، مگر باوقار۔

''تم نے اسے مزید کچھ دیر کیوں نہیں ٹھہرنے دیا؟'' ادھیڑ عمر ویٹر نے نوجوان ویٹر سے پوچھا۔ ''ابھی ڈھائی نہیں بجے ہیں۔''

''میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ اپنے بستر پر۔''

''ایک گھنٹہ کیا ہوتا ہے؟''

''اس کے لئے کچھ نہیں ہے۔ میرے لئے بہت ہے۔''

''ایک گھنٹہ تو ایک گھنٹہ ہی ہوتا ہے۔''

"تم خود بوڑھے آدمیوں کی طرح بات کرتے ہو۔" نوعمر ویٹر چڑ کر بولا۔ "اسے اتنا ہی شوق ہے تو بوتل خرید کر گھر لے جائے اور صبح تک پیئے۔ ایک ہی بات ہے۔"

"ایک ہی بات تو نہیں ہے۔"

"ہاں، فرق تو ہے۔" شادی شدہ ویٹر نے خود اپنی ہی بات کی مخالفت میں سر ہلایا۔ وہ غلط بات پر اصرار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ صرف جلدی میں تھا۔

"تمہیں وقت سے پہلے گھر پہنچنے پر کسی ناخوشگوار بات کا خدشہ نہیں ہوتا۔"

"تم میری بے عزتی کر رہے ہو۔" نوجوان سنجیدہ ہو گیا۔

"نہیں، نہیں۔" ادھیڑ عمر ویٹر نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔ "مذاق کر رہا ہوں۔ یقین کرو، محض مذاق۔"

"مجھے کسی ناخوشگوار بات کا ڈر نہیں۔" نوعمر ویٹر کیفے کے دروازے بند کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے اعتماد ہے۔ میرا وجود اعتماد کی مٹی سے بنا ہے۔"

"تمہارے پاس نوجوانی ہے۔ اعتماد ہے۔ نوکری ہے۔" ادھیڑ عمر ویٹر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تمہارے پاس ہر چیز ہے۔"

"تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔"

"سوائے نوکری کے، ہر چیز کی۔۔۔ میں کبھی بھی پر اعتماد نہیں رہا اور اب میں نوجوان بھی نہیں ہوں۔"

چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی۔

"۔۔۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو ہوٹلوں میں دیر تک ٹھہرنا چاہتے ہیں۔" ڈھلتی عمر والے ویٹر کی نظریں خلا میں گڑ گئیں۔ "وہ لوگ جو بستر پر نہیں جانا چاہتے۔ جنہیں رات کے وقت صاف ستھری اور روشن جگہوں کی تلاش ہوتی ہے۔"

"میں تو گھر جا کر سونا چاہتا ہوں۔" چھوٹا اکتاہٹ سے بولا۔

"ہم دو مختلف لوگ ہیں۔۔۔ اور یہ صرف نوجوانی اور اعتماد کی کمی کے باعث نہیں ہے۔ میں ہر رات کیفے بند کرنے سے پہلے سوچتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی کیفے میں بیٹھنے آئے، اور اسے مایوسی ہو۔"

"لیکن پچھلی گلیوں کے شراب خانے تو رات بھر کھلے رہتے ہیں۔"

"تم سمجھ نہیں رہے۔ پچھلی گلیوں کے شراب خانے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ ایک صاف ستھرا اور روشن کیفے ہے۔ اس طرح کی جگہ رات کے اندھیرے اور تنہائی میں بہت خوشگوار محسوس ہوتی ہے۔ اور خاص طور پر ایسے وقت جب پتوں کے سائے پڑ رہے ہوں۔

"شب بخیر۔" چھوٹے نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"شب بخیر۔" بڑے نے جواب دیا۔ بتیاں بجھانے کے دوران وہ مستقل خود کلامی کرتا رہا۔ "اصل چیز تو روشنی ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ جگہ صاف ستھری ہو۔ موسیقی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ موسیقی کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔ پچھلی گلیوں کے شراب خانوں میں تو آدمی صحیح انداز میں کھڑا بھی نہیں ہو سکتا حالانکہ رات بھر ہی کھلے رہتے ہیں۔"

وہ کس چیز سے ڈر رہا تھا؟ نہیں اسے ڈر نہیں کہہ سکتے۔ یہ خوف نہیں تھا۔ یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی کچھ بھی نہیں تھا۔ آدمی خود بھی کچھ نہیں تھا۔ بس اتنی سی بات تھی اور صرف روشنی کی ضرورت تھی۔ روشنی کی اور تھوڑی سی صفائی اور سلیقے کی۔ کچھ ناروا میں رہتے تھے، لیکن اسے محسوس نہیں کرتے تھے۔ مگر وہ جانتا تھا یہ سب ناروا ہے۔ ناروا، خالص ناروا۔ ہمارا ناروا جو ناروا میں ہیں۔ ناروا کی قسم، ناروا کی بستی میں ناروا ہو گا، جیسا کہ ناروا میں ہے۔ ہمیں ناروا دو۔ ہمارا روزانہ کا ناروا۔ اور ہمیں ناروا سے ناروا تک سہل کرو۔ اور ناروا میں ناروا کا عمل روک کر ناروا سے نجات دلاؤ کہ ہم نارواؤں سے الگ ہو کر ناروا سے ایک ہو سکیں۔ قائم رہے کچھ بھی نہیں کہ جو بھرا ہوا ہے کچھ بھی نہیں ہے، اور رہے گا تیرے ساتھ ہمیشہ کچھ بھی نہیں۔

وہ مسکرایا اور اس شراب خانے میں داخل ہو گیا جہاں کافی کی مشین نصب تھی۔

"کیا چاہئے؟" کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے شخص نے پوچھا۔

"ناروا۔ ایک پیالہ۔"

بارمین نے حیرت سے دیکھا اور اس کے لئے کافی انڈیلی۔

"یہاں روشنی تو مناسب ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن دیواروں کو سلیقے سے سجایا نہیں گیا۔ اور صفائی۔"

بارمین اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں بولا۔ اتنی رات گئے، نئے موضوع پر گفتگو کا آغاز بے معنی تھا۔

"کچھ اور چاہیئے؟" بارمین نے پوچھا۔

"نہیں، شکریہ۔" ویٹر نے کہا اور کافی ختم کر کے خاموشی سے روانہ ہو گیا۔ اسے پچھلی گلیوں کے شراب خانے یوں بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ کسی روشن اور صاف ستھری جگہ کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ اب وہ مزید کچھ سوچے بغیر اپنے گھر جائے گا، بستر پر دراز ہو گا اور صبح کی روشنی کے ساتھ آنکھیں موندنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

"مجھے بے خوابی کی شکایت ہے۔" اس نے خود کو یقین دلایا۔ "اکثر لوگوں کو یہ مرض ہوتا ہے۔"
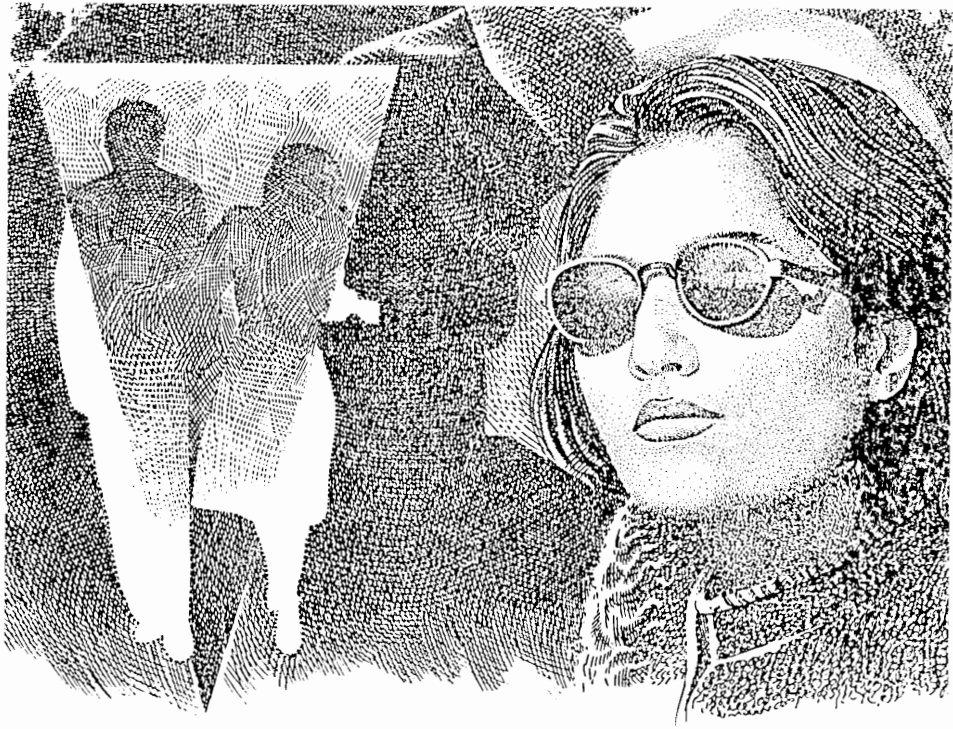
سکینڈے نیوین ادب کی پہچان

شادیٔ مرگ

ایک آدمی کی روداد، سرِ راہ چلتے چلتے اسے کوئی مل گیا تھا

نٹ ہمسن / خاقان ساجد

کوپن ہیگن میں بندرگاہ کی اندرونی گودی کے قریب ایک سڑک ہے، جس کا نام "ویسٹر وولڈ" ہے۔ یہ نسبتاً نئی اور کم آباد سڑک ہے۔ جس کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت ایستادہ ہیں۔ سڑک پر زیادہ گھر تعمیر نہیں ہوئے۔ یہاں گیس لیمپ کے چند ایک کھمبے ہیں اور لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ آج کل سردیوں کے اختتام میں بھی کم ہی کوئی آدمی ادھر چہل قدمی کرتا نظر آتا ہے۔

ہاں! تو کل شام اس سڑک پر مجھے ایک حیران کن تجربہ ہوا۔ میں اس سڑک پر ہواخوری کر رہا تھا۔ سڑک کے کنارے بنے ہوئے راستے پر میں نے ابھی دو چکر لگائے تھے کہ مخالف سمت سے مجھے ایک عورت اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ سڑک پر دور دور تک کوئی اور ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ کھمبوں پر گیس کے لیمپ روشن ہو چکے تھے، مگر پھر بھی مجموعی طور پر سڑک پر اندھیرا ہی تھا۔ اتنا اندھیرا کہ

میں عورت کا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکا۔ ''ہو گی کوئی رات کو دھندا کرنے والی مخلوق۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا اور اس کے پاس سے گزر گیا۔

سڑک کے اختتام پر پہنچ کر میں پلٹا تو میں نے دیکھا کہ دوسری جانب سے وہ بھی پلٹ رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر سامنے تھی۔ ''ہو سکتا ہے وہ کسی کا انتظار کر رہی ہو۔'' میں نے سوچا اور مجھے کچھ کچھ تجسس بھی ہوا کہ دیکھوں وہ کس کی منتظر ہے۔ بہرکیف میں اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل گیا۔

جب تیسری بار میرا اس سے سامنا ہوا تو میں نے اپنا ہیٹ اتارتے ہوئے سر خم کیا اور اس سے مخاطب ہو کر کہا: ''شام بخیر! کیا آپ کسی کی منتظر ہیں؟''

وہ حیرت زدہ ہو گئی اور گڑبڑا کر بولی: ''نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے ہاں۔۔۔ میں کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔''

اس کی گھبراہٹ سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے، چنانچہ میں نے اس سے پوچھا کہ جب تک وہ شخص جس کا وہ انتظار کر رہی ہے، نہیں آ جاتا اسے میرے ساتھ چہل قدمی پر اعتراض تو نہ ہو گا۔ اس نے میری تجویز پر قطعاً کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ شکر گزاری کا اظہار کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد اس نے خود ہی اعتراف کیا کہ وہ کسی کا انتظار نہیں کر رہی تھی، صرف ہوا خوری کے لئے نکلی تھی۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے اور چھوٹے چھوٹے غیر اہم موضوعات پر بات چیت کرنے لگے۔ چلتے چلتے میں نے اسے اپنا بازو بطور سہارا پیش کرنا چاہا۔ ''نہیں شکریہ۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس طرح فضول چہل قدمی کا کوئی فائدہ تو تھا نہیں! میں اسے اندھیرے میں دیکھ بھی نہیں سکتا تھا! چنانچہ میں نے وقت دیکھنے کے بہانے دیا سلائی سلگائی اور اس کے چہرے کے سامنے روشنی کرتے ہوئے اسے بھی دیکھ لیا۔

''نو بج گئے ہیں۔'' میں نے جیسے خود سے کہا۔

وہ ٹھنڈی ہوا سے ہولے سے کانپی تو مجھے موقع ہاتھ آ گیا۔ میں نے بے تکلفی کا سہارا لے کر کہا: ''تم ٹھنڈ محسوس کر رہی ہو؟'' پھر میں نے پوچھا: ''کیوں نہ ہم کسی جگہ چل کر کچھ پئیں؟ ''ٹی وولی'' میں یا ''نیشنوئل'' میں؟''

''مگر، تم خود سوچو، میں اس وقت کہیں نہیں جا سکتی۔'' اس نے جواب دیا۔ اس وقت میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس نے ایک لمبا سیاہ باریک نقاب پہن رکھا تھا۔ میں نے اس سے معذرت کی اور اپنی غلطی پر اندھیرے کو الزام دیا۔ اس نے جس انداز میں میری معذرت فوراً قبول کی، اس سے میرا دل قائل ہو گیا کہ وہ کوئی ایسی ویسی عورت نہیں ہو سکتی۔

''کیا تم میرے بازو کا سہارا پسند کرو گی؟'' میں نے ایک بار پھر تجویز دی۔ ''اس طرح ٹھنڈک کا احساس قدرے کم ہو جائے گا۔''

اس نے میری پیشکش قبول کر لی۔

ہم دونوں نے سڑک کے ایک دو چکر لگائے، پھر اس نے مجھ سے وقت پوچھا۔

''دس بج رہے ہیں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''تم کہاں رہتی ہو؟''

''کیملے گانگی دی میں۔''

میں رک گیا۔

''کیا میں تمہیں تمہارے گھر کے دروازے تک چھوڑ نے چلوں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔'' اس نے جواب دیا ''تمہیں تکلیف ہو گی۔۔۔ تم تو بریڈ گیڈ میں رہتے ہو، کیوں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

''تمہیں کیسے پتہ ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اوہ، مجھے معلوم ہے تم کون ہو۔'' اس نے جواب دیا۔

ایک سکوت چھا گیا۔ ہم دونوں بازوؤں میں بازو ڈالے روشن گلیوں میں آ گئے۔ وہ تیز قدموں سے چل رہی تھی اور اس کا باریک نقاب پیچھے ہوا میں لہرا رہا تھا۔

''ہمیں جلدی کرنی چاہیے۔'' اس نے کہا۔

ہم کیملے گانگی دی میں اس کے گھر کے دروازے پر پہنچے تو اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا جیسے اس کی بحفاظت تک معاونت پر میرا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہو۔ میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا، وہ آہستگی سے اس میں داخل ہو گئی۔ میں نے کندھے سے دروازے کو تھوڑا دھکیلا اور اس کے پیچھے گھر میں داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ہم دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔ میں نے دیکھا احاطے میں ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ ہم دونوں نے سیڑھیوں سے دو منازل طے کیں اور اس کے بعد تیسری منزل پر آ گئے۔ اس نے اپنے اپارٹمنٹ کا بیرونی بند دروازہ چابی سے کھولا، اس کے بعد ایک دوسرا دروازہ کھولا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گئی۔ یہ ڈرائنگ روم لگ رہا تھا جس کی دیوار پر لگے گھڑیال کی ''ٹک ٹک'' واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ گھر میں داخلے کے بعد اس عورت نے لمحہ بھر کا توقف کیا، اور پھر دفعتاً اپنے بازوؤں میں

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ بڑے درجے کے علماء میں سے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میرے گھٹنے میں سات سال سے ایک پھوڑا نکلا ہوا ہے، ہر طرح کا علاج کرا چکا ہوں، بہت سے اطباء سے بھی رجوع کیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے فرمایا: "جاؤ! کوئی ایسی جگہ تلاش کرو جہاں پانی کی قلت ہو اور لوگ پانی کے ضرورت مند ہوں، وہاں جا کر ایک کنواں کھدواؤ، مجھے اُمید ہے کہ وہاں کوئی پانی کا چشمہ جاری ہوگا تو تمہارا خون رُک جائے گا۔" اُس شخص نے ان کے کہنے پر عمل کیا تو تندرست ہو گیا۔

یہ واقعہ علامہ منذریؒ نے امام بیہقیؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے، اسے نقل کرنے کے بعد علامہ منذری فرماتے ہیں کہ اسی جیسا ایک واقعہ ہمارے شیخ ابو عبداللہ حاکمؒ کا بھی تھا، ان کے چہرے پر پھنسیاں نکل آئی تھیں، بہت سے علاج کئے، مگر پھنسیاں ختم نہیں ہوئیں۔ تقریباً سال بھر اس تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد وہ جمعے کے دن امام ابو عثمان صابونی کی مجلس میں پہنچے اور ان سے دُعا کی درخواست کی، امام صابونیؒ نے اُن کے لیے دُعا کی، حاضرین نے آمین کہی۔

اگلے جمعے کو ایک عورت امام صابونی کی مجلس میں ایک پرچہ بھجوایا، اس میں لکھا تھا کہ پچھلے جمعے کو شیخ ابو عبداللہ حاکم کی دعائے صحت کے بعد میں گھر گئی، وہاں جا کر میں نے بھی ان کی صحت کے لیے بہت دعا کی۔ اسی رات مجھے خواب میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، آپؐ نے مجھ سے فرمایا کہ ابو عبداللہ سے کہو کہ وہ مسلمانوں کے لیے وسعت کے ساتھ پانی پہنچانے کا انتظام کریں۔

شیخ حاکم کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے گھر کے دروازے پر ایک سبیل بنا دی جس سے لوگ خوب پانی پیتے تھے، اس واقعہ کو ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا ہوگا کہ شیخ پر شفا کے آثار ظاہر ہونے لگے، پھنسیاں ختم ہو گئیں اور چہرہ پہلے کی طرح صاف اور خوبصورت ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کئی سال زندہ رہے۔

لے کر لرزتے ہوئے، پیار سے، میرا بوسہ لے لیا۔

"بیٹھ جاؤ نا!" اس نے مٹھاس بھرے لہجے میں کہا۔ "صوفہ ادھر ہے۔ میں ذرا روشنی کر دوں۔"

اس نے ایک لیمپ جلا دیا۔

میں نے حیرت اور تجسس سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ میں ایک وسیع، بہت خوبصورتی سے سجے اور فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا جس میں ایک طرف کئی کمروں کے ادھ کھلے دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ میں جس عورت کی معیت میں اس گھر میں داخل ہوا ہوں، وہ کس قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔

"واہ! کیا خوبصورت کمرہ ہے!" میں تعریفی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے کر بولا۔ "کیا یہ تمہارا گھر ہے؟"

"ہاں، میں یہاں رہتی ہوں۔ یہ میرا گھر ہے۔" اس نے جواباً کہا۔

"تمہارا گھر؟ تم اپنے والدین کے ساتھ یہاں رہتی ہو؟"

"ارے نہیں۔" وہ ہنسنے لگی۔ "میں اتنی جوان بھی نہیں۔ ابھی تم دیکھ ہی لو گے!" یہ کہہ کر اس نے اپنا نقاب اتارا، پھر اپنے کپڑوں پر پہنا ہوا نفیس لبادہ کھول کر صوفے پر اچھال دیا۔

"دیکھا! میں نے نہیں کہا تھا کہ میں اتنی جوان نہیں!" اس نے کہا اور ایک بار پھر شدت جذبات اور کسی بے قابو اور بے لگام خواہش سے مغلوب ہو کر مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

وہ بائیس تئیس برس سے زیادہ عمر کی نہیں تھی۔ اس نے ہاتھ کی ایک انگلی میں انگوٹھی پہن رکھی تھی جس سے کچھ کچھ اندازہ یہی ہوتا تھا کہ شادی شدہ ہے۔ خوبصورت؟ نہیں، اس کے چہرے پر چھائیاں تھیں اور بھنویں برائے نام تھیں مگر اس کا بدن زندگی سے بھرپور تھا، یوں امنڈتا ہوا جیسے سوڈے کی بوتل آواز بھری جھاگ کے ساتھ کھل جائے۔ چہرے کے نقوش بہت دلکش تھے۔ تین چار سال پہلے وہ یقیناً ایک خوبرو دوشیزہ رہی ہوگی۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے، اس کا خاوند، اگر کوئی ہے تو، کدھر ہے اور جس گھر میں، میں بیٹھا ہوں یہ کس کا ہے؟ مگر ہر بار میری یہ کوشش اس کی وحشت کی نظر ہو جاتی۔ وہ مجھ پر گر گر پڑتی تھی۔

"میرا نام ایلین ہے۔" اس نے خود ہی بتایا۔ "کیا تم مجھے کچھ پینا پسند کرو گے؟ اگر میں بیل بجاؤں تو کوئی نہیں جاگے گا، بس نوکرانی آئے گی۔ تم اس سے پہلے اس بیڈ روم میں چلے جانا۔" اس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

میں اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ ڈرائنگ روم سے آنے والی روشنی نے کسی حد تک اس کمرے کو بھی روشن کر دیا تھا۔ میں نے اس کمرے میں ساتھ جڑے ہوئے دو بیڈ دیکھے۔ ایلن نے گھنٹی بجائی اور کچھ دیر بعد مجھے ایک نوکرانی کی آواز آئی جو شراب رکھ کر چلی گئی تھی۔ چند لمحوں بعد ایلن بھی بیڈ روم میں آ گئی، مگر دروازے کے پاس رک گئی۔ میں نے اٹھ کر ایک قدم اس کی طرف بڑھایا ہوگا کہ وہ ایک سسکاری بھر کر دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔۔۔ پھر۔۔۔

یہ ہے وہ کل شام کا حیران کن قصہ!

اس کے بعد کیا ہوا؟ صبر صبر! ابھی تو بہت کچھ بتانا باقی ہے! یہ رنگین سنگین رات گزر گئی۔ سحر نمودار ہونے کا وقت آیا تھا کہ میری آنکھ کھلی۔ دن کی روشنی کھڑکی کے پردوں سے آہستہ آہستہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ ایلن بھی بیدار ہو گئی تھی اور تھکی تھکی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے سپید مخملیں بازو اور سینے کا ابھار بہت دلفریب لگ رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں اس سے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے اپنے ہونٹوں سے میرا منہ نرمی سے بند کر دیا۔

دن کی روشنی پھیلتی چلی گئی۔

دو گھنٹے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ایلن بھی اٹھ چکی تھی اور لباس تبدیل کرنے کے بعد تیار ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے جوتے پہنے اور بال ٹھیک کئے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب میں نے ایسی چیز دیکھی جو مجھے اب بھی ایک بھیانک خواب کی طرح لگ رہی ہے۔ میں بیسن پر منہ دھو رہا تھا۔ ایلن کو ساتھ والے کمرے سے کوئی چیز لینا تھی جس کے لئے اس نے درمیان والا دروازہ کھولا۔ اس لمحے میں اچانک مڑا تو میری کمرے میں نظر پڑی۔ میں نے ایک عجیب سرد کر دینے والا منظر دیکھا۔ کمرے کے وسط میں مجھے ایک بڑے میز پر ایک لاش رکھی نظر آئی۔ یہ کفن میں لپٹی ہوئی ایک ادھیڑ عمر آدمی کی لاش تھی جس کی سفید داڑھی تھی۔ کفن کے اندر سے اس کا ایک سوکھا ہوا کمزور سا گھٹنا نظر آ رہا تھا اور چادر سے باہر اس کے کمزور بازو اور بھنچی ہوئی مٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا زرد اور بیمار چہرہ بہت بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔ اچھی خاصی روشنی تھی اس لئے سب کچھ واضح نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنا رخ پھیر لیا اور منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔

کچھ دیر بعد ایلن واپس آئی تو میں تیار ہو چکا تھا اور باہر نکلنے کا منتظر تھا۔ وہ اب بھی مجھ سے لپٹ رہی تھی مگر میں اس کی بے تابیوں کا ساتھ دینے کے لیے اپنی طبیعت آمادہ نہیں پا رہا تھا اور میرے جوابی اقدام نیم دلانہ تھے۔ اس نے اپنے چست لباس پر ایک اضافی لبادہ پہنا اور باریک سیاہ نقاب لگایا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی میرے ساتھ باہر جا رہی ہے۔

ہم دونوں باہر نکلے۔ وہ عمارت کے احاطے سے باہر گلی کے کونے تک مجھے چھوڑنے آئی۔ میں اس کے ساتھ بالکل خاموش چلتا رہا، اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ گلی کے آخر پر دیوار کی اوٹ میں وہ اس طرح کھڑی ہو گئی کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔

''اچھا خدا حافظ۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''کل شام تک کے لیے۔۔۔؟'' میں نے جان بوجھ کر اٹکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، کل شام نہیں۔''

''کل کیوں نہیں؟''

''میری جان زیادہ سوال نہیں کرتے۔ مجھے کل ایک جنازے پر جانا ہے۔ میرا ایک رشتہ دار انتقال کر گیا ہے۔ ادھر گھر پر ہی۔۔۔ تم نے دیکھا ہوگا؟''

''پھر پرسوں؟''

''ہاں، پرسوں ٹھیک ہے، میں دس بجے دروازے پر منتظر ہوں گی۔ اچھا خدا حافظ!''

میں چلا آیا۔

وہ کون تھی؟ وہ لاش کس کی تھی؟ وہ بھنچی ہوئی مٹھیوں اور بیمار چہرے والا بوڑھا کون تھا۔۔۔ اور کس قسم کا بھیانک ڈراما تھا، میں یہ جاننا چاہتا تھا۔ پرسوں وہ پھر میری منتظر ہوگی۔ کیا مجھے جانا چاہیے۔

میں وہاں سے سیدھا برنینا کیفے میں گیا اور ویٹر سے ٹیلی فون ڈائریکٹری طلب کی۔ نمبر دیکھتے ہوئے میں ''کیملے گانگی وی'' کی فہرست پر پہنچا۔ اور۔۔۔ سامنے لکھا ہوا نام دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ تھوڑی دیر بعد صبح کے اخبارات آ گئے۔ کافی پیتے ہوئے میں نے ایک اخبار کے اعلانات والے صفحے پر نظر دوڑانی شروع کی تو ''اعلانات مرگ'' کے نیچے مجھے ایلن کی طرف سے دیا ہوا اعلان سر فہرست لکھا نظر آیا۔ نیچے ڈائریکٹری والا پتہ درج تھا۔ اعلان تھا:

''میرا خاوند، مسٹر ہیمسن بجورنسن، عمر 53 سال، آج صبح طویل بیماری کے بعد انتقال کر گیا ہے۔''

اعلان بھی پرسوں کی تاریخ تھی۔

میں دیر تک وہاں بیٹھا سوچتا رہا۔ ایک مرد شادی کرتا ہے۔ اس کی بیوی اس سے تیس برس چھوٹی ہے۔ ایک دن وہ مر جاتا ہے اور اس کی بیوہ اسے منزل تک پہنچانے سے پہلے خود اپنی منزل حاصل کر لیتی ہے۔۔۔ یعنی ایک تپتا ہوا دن اختتام کو پہنچتا ہے اور تشنگی کی رات ڈھل جاتی ہے۔

☆☆